بذریعہ رجسٹری





جلد ۳۱ نمبر ۱

اپریل ۱۹۷۵ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: کماری سرلا ساہنی

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن (سی) ڈپارٹمنٹ۔ یوپی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

اردو کے نامور شاعر شمیم کرہانی ۱۹ مارچ ۱۹۷۵ء کو اپنے بے شمار مداحوں، دوستوں، شاگردوں، اپنے چاہنے والے عزیزوں اور اپنے بچوں کو ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کے اچانک انتقال کی خبر سننے کے بعد بے ساختہ ان کا یہ شعر زبان پر جاری ہو گیا۔

مرے ہیں عشق میں، زندہ رہیں گے تا بہ ابد
امر بنا گئی ہم کو ہماری موت ہمیں



یہ کوئی شاعرانہ انداز بیاں نہیں، اس آشفتہ دل اور اس سرگشتہ کو، کو اپنے قرابت داروں اور ہمسایوں، اپنے رفیقوں اور ندیموں، اپنے وطن اور ابنائے وطن اور اپنے ملک کے ذرہ ذرہ سے انتہا درجے کا پیار تھا، محبت تھی۔ اسی پیار و محبت میں انھوں نے زندگی گزار دی۔ اسی پیار و محبت میں انھیں موت آ گئی اور بعد ازاں وہ امر ہو گئے۔

شمیم کا درد مند دل کسی کو، اپنے ہوں یا پرائے، مصیبت اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ معمولی سی معمولی بات یا واقعہ پر وہ بے چین ہو جاتے، تڑپ اٹھتے اور کئی کئی دن پریشان رہتے۔ پھر اپنے ملک کی جس سے انھیں اس درجہ پیار تھا، غلامی کو کس طرح گوارا کر سکتے تھے۔ ملک پر غیر ملکی اقتدار ان کے لئے مستقل کوفت کا باعث تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا بڑا حصہ قومی و سیاسی جد و جہد سے متعلق رہا۔ اپنی حب الوطنی اور اپنے قوم پروری کے جذبات و نظریات کے باعث انھیں بہت سی زحمتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا، ان کی کئی نظمیں ضبط بھی ہوئیں۔ لیکن ان کے پائے استقلال میں کوئی جنبش نہیں آئی اور وہ قلمی جہاد میں برابر مصروف رہے۔ ان کی تمنا تھی کہ وطن عزیز سے غربت و افلاس اور لوٹ کھسوٹ کی لعنت سے وہ سامراجی نظام ہی کی دین سمجھتے تھے ختم ہو، دولت کی غیر مساویانہ تقسیم اور امیر و غریب کا غیر فطری فرق مٹے اور دبے کچلے، مقہور و مغموم اور مجبور و بیکس انسانوں کے چہروں سے اداسی اور ناکامی کی گرد دور ہو اور وہ بھی زندگی کا نکھار دیکھیں

چلو ہے جس بات پر زمانہ، وہ اپنی غرض خلوص یہ بھی
یتیم چہرے بھی چوم ڈالیں، غریب دیس بھی پیار دیکھیں

ہمارے اشکوں کو لے کے مل دو، اداس پھولوں کے عارضوں پر
یہ گرد خوردہ حسین چہرے بھی زندگی کا نکھار دیکھیں

جنوں سہی دل کی رہنما، مگر بنتا ہے کیا کریں ہم
کورے سادہ ہتھیلیوں پر حنا کے نقش و نگار دیکھیں

اس وقت اس کا موقع نہیں کہ جناب شمیم کے قومی اور سیاسی افکار و نظریات یا ان کی عظمتِ فن پر کوئی گفتگو کی جائے کیونکہ ان کے اچانک سانحۂ ارتحال سے دل بے قابو اور آنکھیں پرنم ہیں۔ یہ سانحہ میرے لیے اس وجہ سے اور بھی جگر خراش بن گیا ہے کہ شمیم بھائی کو شروع ہی سے ایک والہانہ محبت مجھ سے تھی۔ ویسے تک حدی ہونے کے باعث وہ میرے چچا زاد بھائی تھے لیکن آپس کے تعلقات و یک جہتی نے دونوں گھروں کو ایک بنا رکھا تھا۔ شمیم بھائی نے اس یگانگت و قربت کو نہ صرف پورے آب و تاب کے ساتھ باقی رکھا بلکہ اسے مستحکم بنانے کے کوشاں رہے۔ عمر میں مجھ سے چند سال بڑے تھے اس لیے ان کی والہانہ محبت میں مجھے بڑے بھائی کا پیار بھی ملا اور شفقت بھی۔ پھر بھی ان کے فطری جذبۂ خلوص و محبت اور افتادِ طبیعت نے اسے کبھی گوارا نہ کیا کہ ہمارے درمیان خوردی و بزرگی کی دیوار حائل ہو۔ اس طرح ہم میں ایک قوی تر رشتہ دوستی کا قائم ہو گیا جو شمیم بھائی کی عمر کے آخری لمحات تک استوار رہا۔ اب وہ خلوص، وہ پیار، وہ محبت، وہ شفقت یاد آتی ہے تو دل پر غم کی چھریاں چلنے لگتی ہیں۔

انتقال سے ایک ہفتہ قبل وہ لکھنؤ تشریف لائے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ اپریل کے شروع میں پھر آئیں گے تو تفصیلی ملاقات رہے گی کیا خبر تھی کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔ پھر دوبارہ ملاقات کی آرزو دل میں لیے اس پرمسرت لمحے کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ اچانک یہ خبر بد سننے کو ملی کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے۔ ۱۸ مارچ کو ایوان غالب دلی میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ وہیں طبیعت خراب ہوئی۔ ان کے صاحبزادگان بھی ساتھ تھے۔ فوراً اسپتال پہنچانے کا انتظام کیا گیا اسپتال تک پہنچتے پہنچتے بے ہوش ہو گئے۔ رات بھر بے ہوش رہے۔ صبح ہوتے ہوتے موت نے ان کے دامن حیات کو چاک کر دیا۔ شعلوں کی کہانی، شبنم کی زبانی، سنانے والے اور پیار و محبت کے پھول بکھیرنے والے وہ لب سدا کے لیے خاموش ہو گئے۔

یہ صحیح ہے کہ شمیم بھائی کے سانحۂ ارتحال کا غم میرا ایک بڑا ذاتی غم ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ دنیائے ادب، دنیائے مہر و وفا اور دنیائے اخلاص و مروت کے لیے اس سے بھی بڑا غم ہے اور ارباب ادب، ارباب فن اور ارباب نظر کے دلوں میں ان کی یاد باقی رہے گی۔

خورشید لالہ

اپریل ۱۹۷۵ء

پروفیسر سید حسن

سید مہدی حسن احسنؔ لکھنوی

اُردو کے اصناف ادب میں سب سے زیادہ پس ماندہ صنف "ڈراما" ہے کیونکہ ڈراما اور تھیئٹر کے باہمی تعلق کی وجہ سے اردو ادیبوں نے ڈراما نگاری کے فن کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ تھیئٹر دیکھنا، تھیئٹر کا کاروبار کرنا، یا تھیئٹر کے لیے ڈراما لکھنا، ایک غیر شریفانہ مشغلہ سمجھا جاتا تھا، جب پارسیوں نے اُردو اسٹیج کی بنیاد ڈالی اور انہیں ڈراما نگاروں کی تلاش ہوئی تو انھیں ایسے منشی یا ڈراما نگار ملے جن کی کوئی ادبی حیثیت نہ تھی، بمبئی کے ایسے شہر میں جہاں علم سے زیادہ تجارت مقبول عام تھی ماہر ادیبوں کے خدمات حاصل کرنے کی توقع بھی نہیں تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارسی تھیئٹریکل کمپنیوں نے اپنے منشیوں سے جو ڈرامے لکھوائے ان میں سے اکثر و بیشتر زبان و بیان اور فن کی ناپختگی کے لحاظ سے بہت ہی پست درجے کے ہیں، آرامؔ سے لے کر آغا حشرؔ تک کئی درجن ڈراما نگاروں کے نام ملتے ہیں، لیکن ان میں سے چند ایسے ہیں جنھیں ادبی اور فنی اعتبار سے کچھ اہمیت دی جا سکتی ہے، ان میں سے الف خان حبابؔ رام پوری، احسنؔ لکھنوی اور آغا حشرؔ سرِ فہرست ہیں، اُردو ڈراما نگاری کی ارتقائی منزلوں کو سمجھنے کے واسطے ان تینوں ڈراما نگاروں کے کارناموں کا جائزہ لینا ضروری ہے، الف خاں حبابؔ کے متعلق میرا ایک مبسوط مضمون رسالہ آج کل دہلی[1] میں شائع ہو چکا ہے، آغا حشرؔ کے احوال زندگانی اور کارناموں کے بارے میں مقالے اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں، البتہ احسنؔ لکھنوی کے متعلق جہاں تک مجھے علم ہے کوئی سیر حاصل مضمون ہنوز شائع نہیں ہوا ہے، زیر نظر مضمون میں اسی کمی کو دور کرنا مقصود ہے۔

سید مہدی حسن احسنؔ لکھنؤ کے ایک سادات خاندان[2] کے چشم و چراغ تھے ان کے دادا سید نثار علی افواج شاہی میں کمیدان تھے اور والد میر حسن علی بھی شاہی فوج میں ملازم تھے، میر حسن علی کے دو بیٹے تھے اور ایک بیٹی، بڑے بیٹے سید مہدی حسن تھے جو بعد میں اپنے تخلص احسنؔ سے مشہور ہوئے، چھوٹے بیٹے کا نام واجد حسین تھا۔ احسنؔ کے نانا آغا حسن ازلؔ ایک خوش گفتار شاعر اور بہار کے ایک رئیس نواب اقبال علی خاں کے دوست اور مصاحب تھے، ازلؔ کے بڑے بھائی حکیم تصدق حسین عرف نواب میرزا شوقؔ[3] مصنف مثنوی "زہر عشق" واجد علی شاہ نواب اودھ کے درباری حکیم اور شاعر تھے، احسنؔ[3] کی بہن کی اولاد میں دو بیٹے تھے ایک باقر حسین قیصرؔ اور دوسرے جعفر حسین منظرؔ۔

احسنؔ کی ولادت غالباً ۱۲۸۴ھ (مطابق ۷۱-۱۸۷۰ عیسوی) میں

---

[1] آج کل نومبر ۱۹۵۸ء۔ [2] احسنؔ کے خاندانی اور ذاتی حالات میں سے کچھ تو واقعاتِ انیس سے اخذ کیے ہیں اور کچھ جناب سرادی حسین لائقؔ لکھنوی کے بیانات سے، جناب سرادی حسین لائقؔ خاندانِ انیسؔ کی ایک فرد اور احسنؔ کے داماد کے بھتیجے ہیں، میری درخواست پر جناب ڈاکٹر ولی الحق انصاری فرنگی محلی نے ۱۹۷۰ء میں سرادی حسین صاحب لائقؔ سے حالات دریافت کر کے مجھے لکھ بھیجے تھے۔ اگر میرے بیانات میں کوئی غلطی ہو تو صحیح واقفیت رکھنے والے اصحاب اس کی تصحیح فرما دیں، بہت ممنون ہوں گا۔ سید حسن

[3] نواب مرزا شوقؔ اور سید مہدی حسن احسنؔ لکھنوی کی تصویریں مہاراجکمار محمود آباد جناب امیر حیدر خاں صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ لائقؔ

ہوئی تھی۔ احسن "واقعاتِ انیس" میں لکھتے ہیں کہ "میر انیس کے انتقال کے وقت میری عمر سات سال کی تھی"۔ میر انیس کی وفات ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ کو واقع ہوئی تھی۔ احسن کی شادی کہاں اور کس سے ہوئی تھی یہ معلوم نہ ہو سکا، البتہ یہ معلوم ہے کہ ان کے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں، بیٹے کا نام اور تخلص صادق حسین طرار تھا، بڑی بیٹی کی شادی میر خورشید حسن عرف دولھا صاحب عروج کے صاحب زادے محمد حسن عرف لڈن صاحب فائز سے ہوئی تھی، جو میر انیس کے پڑپوتے تھے، دوسری بیٹی منے میرزا صاحب نثر، مصنف "اردو صرف و نحو" سے بیاہی ہوئی تھیں، نثر صاحب کی بیٹی یعنی احسن کی نواسی دو سال پہلے پاکستان میں بقید حیات تھیں، احسن کا کلام اور تصانیف انھیں کے پاس ہیں، احسن کے بیٹے کی اولاد میں کوئی فرد باقی نہیں ہے۔ بڑی بیٹی یعنی عروج صاحب کی بہو لاولد فوت ہوئیں، "واقعات انیس" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک بیٹا اور بھی تھا جو ایام شیر خواری میں فوت ہو گیا تھا اس کی قبر مقبرہ میر انیس (واقع چوہدری محلہ چوک) میں ہے جہاں میر انیس کی قبر ہے[1]۔ ان کی چھوٹی بیٹی جو نثر کو منسوب تھیں ان کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہو گیا تھا[2]۔

"واقعاتِ انیس" سے ظاہر ہوتا ہے کہ احسن ۱۸۹۱ء میں اپنے والد کے ہمراہ حیدر آباد گئے تھے، اور وہاں انھیں فرمانروائے دکن کے دربار میں حاضر ہونے اور بعض اراکین دولت کی خدمت میں باریاب ہونے کا موقع ملا تھا، ۱۹۰۵ء میں احسن دوسری مرتبہ بسلسلۂ ملازمت حیدر آباد گئے تھے[3]، ۱۹۰۶ء میں اُنھوں نے کلکتہ کا سفر بھی کیا تھا جہاں ان کی ملاقات پرنس مرزا رضا علی بہادر عرف سلطان مرزا سے ہوئی تھی۔

احسن نے اپنی زندگی کا ایک معتدبہ حصہ، عنفوان شباب سے کبر سنی تک، ڈراما نگاری اور تھیٹریکل کمپنیوں کی ملازمت میں گذارا اور خوب نام وری حاصل کی، جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ آخر میں وہ ناٹک نویسی کا پیشہ ترک کرنے کے بعد مہاراجہ محمود آباد کے یہاں بحیثیت لائبریرین مقرر ہوئے۔ اور پھر ان کے دونوں صاحبزادوں کے اتالیق مقرر ہو گئے۔ ان کا آخری ڈراما ۱۹۰۴ء میں تصنیف ہوا تھا۔ اور "واقعات انیس" کے لکھنے کی ابتدا ۱۹۰۵ء میں ہوئی تھی[4] اس سے گمان ہوتا ہے کہ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے تھیٹرکمپنیوں کے لیے ڈراما لکھنے کا کام ترک کر دیا تھا۔

۱۹۲۶ء میں جب انھوں نے نور الٰہی و محمد عمر صاحبان کی تالیف "ناٹک ساگر" پر ایک قیمتی پُراز معلومات تنقیدی مضمون بعنوان "نامۂ احسن" لکھ کر جناب اختر شیرانی مرحوم کو بھیجا تھا، وہ اسی اتالیقی کے عہدے پر مامور تھے۔

احسن کا سال وفات معلوم نہیں، لیکن جناب ہادی حسین لائق کے قول کے مطابق وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً پچھتر سال تھی، اس اعتبار سے ان کا انتقال ۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء میں ہوا ہوگا، ان کی قبر لکھنؤ میں امام باڑہ آغا باقر کے پھاٹک سے مشرق کی جانب ہے اور لوح مزار پر سن و تاریخ انتقال کندہ ہے۔

احسن کا مکان وکٹوریہ اسٹریٹ پر واقع تھا، ان کا بیان ہے کہ "میرا موروثی مکان لب سڑک ایک تفریح گاہ ہے" اور "میرے نانا حکیم نواب میرزا شوق مرحوم سہ پہر کو باہر نشست فرماتے تھے اور اکثر عمائد شہر اور اہل کمال کا مجمع اُن کی صحبت میں رہتا تھا[5]" یہ مکان شہنشاہ منزل کے نام سے ہنوز موجود ہے، لیکن احسن کا انتقال اُن کے اپنے بھانجے جعفر حسین منظر کے مکان واقع محلہ نواز گنج میں ہوا۔

احسن نے بارہ تیرہ برس کی عمر تک کتب درسیہ عربیہ کا اکتساب میر خورشید علی نفیس فرزند انیس سے کیا تھا[6]، اس کے علاوہ فارسی اور انگریزی کی تعلیم بھی گھر پر حاصل کی تھی، انگریزی ادب و تاریخ و فلسفہ کی بعض مشہور کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا، ان کے والد میر حسن علی، میر انیس و میر نفیس کے مرثیوں کے دلدادہ تھے، میر انیس اکثر سہ پہر کو ان کے گھر آتے تھے، اس کے علاوہ ان کے یہاں ہر مہینے کی سولہویں تاریخ کو مجلس ہوتی تھی جس میں کبھی کبھی "میر انیس مرحوم مرزا دبیر مغفور اور میر عشق مبرور" اپنے اپنے اعزا و شاگردوں کے ساتھ تشریف لاتے تھے[7]

---

[1] واقعاتِ انیس صفحہ ۲۹ [2] واقعاتِ انیس صفحہ ۱۴۲ [3] واقعات صفحہ ۲۵ و ۱۱۹ [4] واقعات صفحہ ۱۱۵ [5] واقعات صفحہ ۲۴۱
[6] واقعات صفحہ ۸۳ [7] واقعات صفحہ ۱۵ [8] واقعات انیس ص۸۶۔

ان بزرگوں کی صحبت کے فیض سے احسن کو بھی شعر و سخن سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور شعر کہنے لگے تھے، پہلے تو وہ میر نفیس کے شاگرد ہوئے پھر میر علی محمد عارف کے تلمیذ بنے، انھیں خوش نویسی کا بھی شوق تھا اور اس فن کو حاصل کرنے کے لیے آغا علی شمس منصور نگری کی شاگردی اختیار کی، حیدر آباد میں مرزا داغ سے بھی اردو محاورات اور اصطلاحات کے متعلق بحث کیا کرتے تھے۔ "شاعری کے علاوہ احسن نے موسیقی، سپہ گری، بانک اور پٹہ میں بھی مہارت پیدا کی تھی۔

احسن شوقین مزاج اور ظریف طبع تھے، اٹھارہ سال کی عمر میں سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے، لیکن خضاب اس پابندی اور احتیاط و کمال کے ساتھ لگاتے تھے کہ مرتے دم بھی کوئی نہ سمجھ سکا کہ ان کے بال سفید ہیں، مزاحیہ اشعار بھی کہتے تھے، منظوم خط دہ ظریف لکھنوی کو اور ظریف ان کو لکھا کرتے تھے، موسیقی میں ماہر ہونے کے باوجود شعر تحت اللفظ پڑھتے تھے، خود اعلیٰ درجے کے فنکار تھے لیکن دوسروں کی فنی و علمی صلاحیتوں اور تصانیف کے بھی قدر داں تھے۔ میر انیس اور ان کے خاندان سے احسن کے بزرگوں کو بڑی ارادت تھی اور خود احسن بھی والہانہ عقیدت رکھتے تھے، رشتۂ مصاہرت کے سبب تعلقات میں اور استواری پیدا ہو گئی تھی۔

احسن کے شعری کلام کی تدوین نہیں ہوئی ہے، ان کی غزلیں پیام یار، خدنگ نظر، معیار وغیرہ رسائل میں چھپتی تھیں، اپنے عہد میں لکھنؤ کے بلند پایہ غزل گو شعرا میں شمار ہوتے تھے، سندیلہ میں التفات رسول صاحب تعلقدار کے یہاں بہت شاندار مشاعرہ ہوا کرتا تھا، ایک بار احسن نے بھی شرکت کی تھی اور صفی، عزیز، آرزو، اور دیگر نامور شعرا کی موجودگی میں احسن کی غزل بہترین قرار پائی، اس غزل کے یہ تین شعر لوگوں کو یاد رہ گئے ہیں:

اف کہہ کے دم بخود ترا دیوانہ ہو گیا — دو حرف تھے کہ جس کا اک افسانہ ہو گیا
رسم وفا پہ شمع نے اتنے بہائے اشک — سامان غسل میت پروانہ ہو گیا
ایک ایک سے پوچھتے ہیں وہ میرے جنوں کا حال — دیوانہ بن گیا ہے کہ دیوانہ ہو گیا

احسن کا اصلی جوہر ڈراما نگاری میں نمایاں ہوا جس کی صلاحیت وہ قدرت کی طرف سے لے کر آئے تھے، ڈراما نگاری ہی کی وجہ سے وہ مشہور و معروف بھی ہوئے، ڈاکٹر نامی کا بیان ہے کہ ان کے گھر کے قریب ایک بڑی عمارت بنام افضل محل تھی اس میں ناٹک کمپنیاں قیام کرتیں اور تماشے دکھاتی تھیں، احسن بھی کبھی کبھی تماشے دیکھنے کے لیے چلے جاتے تھے، ایک بار دارا ب شاہ کی کمپنی منشی الف خاں حباب نتح پوری کے ڈرامے غزالہ ماہرو، اور "جشن کنز سین" کو اسٹیج کر رہی تھی۔ ان تماشوں کو دیکھ کر احسن کو بھی ڈراما لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور انھوں نے حباب سے استدعا کی کہ وہ انھیں اپنا شاگرد بنا لیں، لیکن حباب نے نہ معلوم کس وجہ سے اُن کی درخواست مسترد کر دی۔ اس انکار سے احسن کا شوق سرد نہ پڑا، خداداد لیاقت اور شوق نے رہبری کی[۱] اور انھوں نے اپنے نانا شوق لکھنوی کی مثنوی زہر عشق کا ردیا نثر کر کے ۱۸۹۲ء میں ایک ڈراما بنام دستاویز محبت تیار کیا، اور اسے داراب جی کو پیش کیا، داراب جی نے اسے اسٹیج پر دکھایا، جب تماشا دکھایا گیا تو لکھنؤ میں غلغلہ برپا ہو گیا، ایک تو قصہ درد انگیز و تاثیر آفریں، اس کو صرف پڑھنے ہی سے لوگ دیوانے ہو جاتے تھے، اسٹیج پر اس کی نمائش نے تو تہلکہ ہی مچا دیا، اس تماشا دکھانے کے دوران دادا بھائی رتن جی ٹھونٹھی کی وکٹوریہ ناٹک کمپنی لکھنؤ میں وارد ہوئی، رتن جی ٹھونٹھی کو جسے احسن دنیائے ڈراما کا باوا آدم کہتے ہیں، ایک ناٹک کار کی تلاش تھی، کیونکہ ان کی کمپنی کے ڈراما نویس منشی کریم الدین مراد بریلوی دنیا کے اسٹیج سے رخصت ہو چکے تھے، رتن جی ٹھونٹھی نے جب لکھنؤ میں دستاویز محبت، کی شہرت سنی تو احسن سے ملاقات کر کے انھیں کریم الدین کے ناٹک، چترا بکاولی، کا نمونہ پیش کر کے اسی طرز بیان میں ڈراما لکھنے کی فرمائش کی، چنانچہ احسن نے ان کی فرمائش کے بموجب اپنا دوسرا ڈراما "چندراولی" تیار کیا، یہ ڈراما بھی لکھنؤ میں کھیلا گیا اور بہت ہی کامیاب ثابت ہوا، احسن کی قابلیت سے متاثر ہو کر رتن جی ٹھونٹھی نے انھیں اپنی کمپنی میں ڈراما نویسی کے کام پر ملازم رکھ لیا اور اپنے ساتھ ۱۸۹۳ء میں بمبئی لیتے گئے، یہیں سے احسن نے ایک ڈراما نسٹ کی زندگی کا آغاز کیا اور ڈراما نگاری کو ایک مستقل پیشے کے طور پر اختیار کیا۔ نامہ احسن میں خود رقمطراز ہیں:

"شوقیہ طور پر ناٹک کی ابتدا بطور تفریح تھی۔ آخر میں اکتساب

۱؎ اردو تھیٹر جلد دوم

معاش کا ذریعہ ہوگئی۔ اس فن میں دماغ کی مناسبت عدم سے ساتھ لایا تھا، فیضانِ قدرت کو دنیا نے تسلیم کر لیا، سب سے پہلا ڈراما "دستاویزِ محبت" زہرِ عشق مثنوی کا پلاٹ ہے، یہ مثنوی میرے نانا صاحب حکیم نواب مرزا صاحب شوقؔ کی تصنیف ہے۔"

بمبئی پہنچ کر کچھ عرصے تک احسنؔ، رتن جی ٹھوٹھی کے تھیٹر بمبئی ناٹک منڈلی میں ملازم رہے، پھر وہ ۱۸۹۰ء سے کچھ پہلے لکھنؤ چلے گئے، ان کا دوسرا سفر بمبئی ۱۸۹۸ء میں ہوا

دوسری مرتبہ پہنچ کر وہ کاؤس جی کھٹاؤ کی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی میں ناٹک نویس مقرر ہوئے، اس کمپنی کے لیے انھوں نے "خونِ ناحق" اور "بزمِ فانی" ناٹک لکھے، احسنؔ جتنے عمدہ ناٹک نگار تھے ویسے ہی کاؤس جی اچھے اداکار تھے۔

احسنؔ کی زبان و بیان اور کاؤس جی کی ایکٹنگ نے کمپنی کے کاروبار کو خوب چمکایا، اور احسنؔ کی شہرت بڑھنے لگی، لیکن کچھ عرصے کے بعد الفریڈ کمپنی میں پھوٹ پڑ گئی اور اس کے بطن سے ایک نئی کمپنی بنام نیو الفریڈ کمپنی وجود میں آئی۔

احسنؔ اسی کمپنی سے وابستہ ہو گئے، اور اس کے لئے انھوں نے دو ناٹک "دلفروش" اور "بھول بھلیاں" لکھے، بعد میں وہ نوروز جی پیری کے تھیٹر میں کام کرنے لگے اور اس کے واسطے ناٹک "شریف بدمعاش" اور "چلتا پرزہ" تصنیف کیا، سید امتیاز علی تاجؔ مرحوم کا قول ہے کہ "چلتا پرزہ" احسنؔ کا آخری ناٹک تھا[1] لیکن جناب میر ہادی حسین لائقؔ کے قول کے مطابق احسنؔ کا آخری ڈراما "اہلال" تھا، اپنے تصنیف کردہ ناٹکوں کے متعلق احسنؔ لکھتے ہیں کہ "خونِ ناحق، بزمِ فانی، دلفروش، اور بھول بھلیاں ان کی جوانی کے زمانے کے تخلیقات ہیں۔ جن کی شہرت کی مدت بہت مختصر رہی، شریف بدمعاش، اور چلتا پرزہ، بڑھاپے کے یادگار فرزندانِ رشید ہیں۔" جنھوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی، ان کے بیان کے مطابق ان کا آخری ڈراما ہندی زبان میں تھا، لیکن اس کا نام نہیں بتایا ہے، لکھتے ہیں۔

"آخری فرزند جس کے بعد قطعِ نسل کی امید ہوگئی، یہ ہندی زبان کا کامیاب ڈراما لکھ کر اپنے دامن سے "ہندی زبان کی جہالت کا دھبّا مٹایا اور اس دنیا سے ریٹائر ہو گیا۔

(نامۂ احسنؔ)

ناٹک "چلتا پرزہ" میں نے نہیں پڑھا ہے، لیکن ڈاکٹر نامی نے اس کا مختصر پلاٹ اپنی کتاب "اردو تھیٹر" میں بیان کیا ہے۔[2] اگرچہ انھوں نے اس کی زبان کے متعلق کچھ نہیں لکھا لیکن بقرینۂ غالب اس کی زبان ہندی نہیں ہے، ڈاکٹر نامی دو اور ناٹک، کنک تارا، اور اتھیلو کو احسنؔ کی تصنیف بتلاتے ہیں[3]، لیکن خود احسنؔ نے ان کا نام نہیں لیا ہے، بلکہ "کنک تارا"[4] کو عباس علی کی تالیف بتایا ہے۔ ڈاکٹر نامی نے کنک تارا، اور اتھیلو، کے سوا احسنؔ کے سب ناٹکوں کے پلاٹ بیان کر دیے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ان دو ناٹکوں کو خود نہیں دیکھا ہے۔

احسنؔ کو قدرت نے ناٹک نگاری کا ملکہ عطا کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ حبابؔ کا ان کو شاگرد بنانے سے انکار کرنے کے باوجود احسنؔ اس میدان میں داخل ہوتے ہی مشہور ہو گئے، اور اچھے اچھوں کو پیچھے چھوڑ گئے، ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ لکھنؤ کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کی شاعری اور زباندانی مسلّم تھی، حبابؔ[5] نے اپنے ڈرامے 'نشترِ عشق' کے دیباچے میں قدیم ناٹکوں کی زبان پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "ناٹکوں کی زبان وہ ہونی چاہیے جسے اہلِ زبان بولتے ہوں، جو مستند ہو اور لکھنؤ اور دلّی والوں کی ہو۔" احسنؔ کو حبابؔ کے اس مشورے پر عمل کرنے کا پورا موقع تھا۔ کیوں کہ وہ خود اہلِ زبان تھے، لکھنؤ کی صاف شستہ اور بامحاورہ زبان پر انھیں پورا عبور حاصل تھا، کریم الدین مرادؔ کی چتراولی کی چٹخارے دار زبان کے مقابلے میں احسنؔ نے چندراولی لکھی جس پر مرادؔ کی زبان کا جواب موجود ہے۔ وہ مقتضائے وقت کے اعتبار سے اپنے تصانیف کی زبان مقرر کرتے تھے، چنانچہ خود لکھتے ہیں۔

---

[1] بزمِ فانی، از سید امتیاز علی تاجؔ، مطبوعہ ادبی دنیا بابت نومبر ۱۹۴۳ء، [2] اردو تھیٹر جلد دوم صفحہ ۲۰۰، [3] اردو تھیٹر جلد دوم صفحہ ۱۹۳، [4] بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ 'کنک تارا' دراصل احسن لکھنوی ہی کی تالیف ہے اور غالباً وہ ناٹک ہے جس کے متعلق احسن لکھنوی مرحوم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہندی زبان میں لکھا گیا ہے (سید حسن)، [5] ملاحظہ ہو راقم کا مضمون انور خاں حباب، مطبوعہ آجکل نومبر ۱۹۵۵ء۔

"میرے ڈرامے طرزِ نگارش اور سیاق ادبیت میں اس قدر متبائن ہیں کہ ہر شخص یہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہے کہ جس نے چند ناول لکھا ہے اس کے قلم سے "خون ناحق" عالمِ وجود میں آیا ہے"
(نامۂ احسن)

احسن نے اپنے ڈراموں میں جو صحیح، فصیح زبان استعمال کی ہے اسی کی بدولت الفریڈ اور نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنیاں لکھنؤ اور دہلی میں اپنے تماشے دکھا سکیں کیونکہ ان شہروں کے اہلِ زبان، کم زور زبان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، احسن اس سلسلے میں ایک پُر لطف بات لکھتے ہیں،

"دہلی اور لکھنؤ کے نکتہ چین زبان کی ذرا سی کم زوری کے لیے ڈرامے کے گوناگوں محاسن کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں، اور تماشا ختم ہونے کے بعد اسٹیج سے کوئی مصرع یا فقرہ ذم آلود لیے ہوئے باہر نکلتے ہیں خصوصاً اہلِ لکھنؤ کی اس قدر سختی میرے نزدیک خلافِ انصاف ہے۔۔۔ اگر ڈراما اپنی خصوصیات ادب و زبان میں مکمل ہے تو اہلِ لکھنؤ کے لیے سینری پر روپیہ صرف کرنا فضول ہے اور اگر ڈراما میں زبان کی کم زوری ہے تو جواہرات کا لباس اور حیرت انگیز سینری سب بیکار ہے۔"[1]

احسن کی کامیابی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ڈراموں کے پلاٹ شکسپیر کے ڈراموں سے اخذ کیے ہیں۔ شیکسپیر کے پلاٹ اور احسن کی جدت پسند طبیعت اور ادبی و شاعرانہ زبان و بیان نے ان کے ڈراموں کو مقبول و مشہور و معروف بنایا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ شیکسپیر کو اردو میں پہلی مرتبہ پیش کرنے کا فخر احسن ہی کو حاصل ہے، لیکن میرے خیال میں یہ صحیح نہیں، احسن سے پہلے جعفر حسین خاں جعفر "اتھیلو"، مولانا محمد حسین آزاد "میکبتھ" اور بابو بالیشور پرشاد "مرچنٹ آف وینس"، "رومیو جولیٹ" اور "اتھیلو" کے ترجمے پیش کر چکے تھے، احسن کو اس بات سے انکار ہے کہ وہ محض مترجم ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے شیکسپیر سے صرف قصے مستعار لیے ہیں ورنہ زبان و بیان اور پلاٹ سازی ان کی اپنی ہے، بلکہ حسبِ ضرورت کہیں کہیں قصوں میں تصرف بھی کیا گیا ہے، کسی ناقد نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "دلفروش" "احمد" کے ترجمے اور "خون ناحق" منشی جوالا پرشاد برق کے ترجمے کے چربے ہیں، اس رائے کی احسن نے پُر زور تردید کی ہے، کہتے ہیں

"ان مترجموں کا نصب العین لفظی ترجمہ کرنا تھا اور اس پر ان کو فخر و ناز تھا، میرا مقصود شیکسپیر کا پلاٹ حاصل کرنا تھا، میرے ڈراموں میں نثر سے زیادہ نظم ہے اور ان کے ترجموں میں نظم ہے تو وہ بھی لفظی ترجمہ۔"[2]

احسن نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے اردو ڈراما میں انقلاب پیدا کیا۔ خود لکھتے ہیں:

"مجھے بلا تقیہ کہنا پڑتا ہے کہ ہندستان کی اسٹیج پوڈ رامز کی اسٹائل بدلنے کا فخر میرے ناچیز قلم کو حاصل ہے اور یہ انقلابِ عظیم "خون ناحق" نے پیدا کیا۔"[3]

راقم کے خیال میں اس انقلابِ عظیم کے پیش رو حباب ہیں، جنھوں نے ڈراموں کی زبان و بیان کی اصلاح پر زور دیا ہے اور مکالمے کی زبان کو فطری بنانے کی تاکید ہے۔

احسن کا ایک اور قابلِ ذکر کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ناٹکوں میں سنجیدہ پلاٹ کے ساتھ کامک کا پورے طور پر رابطہ پیدا کیا، ان کے قبل کے ناٹک نگار مزاحیہ پلاٹ کو سنجیدہ پلاٹ سے عموماً الگ کر دیتے تھے، احسن کو یہ طریقہ ناپسند تھا، ان کا نظریہ تھا کہ "کامک وہی مرغوب اور لطیف ہے جسے رننگ کامک (RUNNING COMIC) کہتے ہیں، یعنی جو کیریکٹر ٹریجڈی میں کام کریں وہی کامک میں بھی۔

احسن نے لکھنؤ کی رنگین فضا میں پرورش پائی تھی جو رقص و سرود کا مشہور مرکز تھا، لہٰذا موسیقی کا شوق ایک فطری بات تھی، انھوں نے اس فن میں تعلیم بھی حاصل کی تھی، ڈراما نویسی کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد اس میں مزید ترقی ہوئی۔ انھوں نے ڈراما کے گیتوں اور گانوں میں اصلاح کی، یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے، مصنفین

---

[1] نامۂ احسن مطبوعہ رسالہ بہارستان لاہور جنوری، فروری، اپریل ۱۹۲۷ء ، [2] نامۂ احسن ۔ [3] نامۂ احسن

ناٹک ساگرؔ نے ان پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اردو کے زبان داں ہونے کے باوجود اپنے گانوں اور گیتوں میں ہندی الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ احسنؔ نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ۔

" ہمارے نزدیک اردو، فارسی، عربی، ہندی، ہر زبان کے الفاظ کو ناٹک کے گانوں میں داخل ہونے کا حق ہے اور حسب مقتضائے ضرورت ان زبانوں میں گانے ملیں گے لیکن ہمیشہ سے اردو ڈراموں میں ہندی زبان کا اعتدال قائم رکھ کر گانے بنائے گئے ہیں اور بنائے جاتے ہیں، اگر کوئی شخص دریافت کرے کہ وہ اعتدال کیا ہے تو اس کی تعریف الفاظ میں نہیں ہوسکتی، بلکہ مذاق سلیم اس کا فیصلہ کرے گا۔[۱]

ڈراموں میں غیر مناسب موقع پر نظم استعمال کرنے کے خلاف فطرت طریقے کو احسنؔ ناپسند کرتے تھے، اس معاملے میں بھی انھوں نے طریقہ بدلا، ان کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ " گانے بنانے کے لیے بھاشا زبان نہایت موزوں ہے اور ہندی بھاشا اس صنعت میں اردو کا جزو لطیف ہے، اس زبان کی لذت تماشہ دیکھنے والوں کو اسٹیج پر نچا دیتی ہے۔"

۱۹۰۵ء میں احسنؔ نے کئی گیت تصنیف کر کے بمبئی کے سارے مشہور جرائد میں چھپوا کر یہ چیلنج دیا تھا کہ اگر کوئی ان کا جواب دے تو فی گیت سو روپیہ انعام دیں گے، ان گیتوں میں ایک یہ ہے:

کمر پتلی لچک چھب پیاری　　نیناں رسیلی چتون تواری
گوری کلیاں ناجک بتیاں　　بالی عمریا چال نیاری

احسنؔ کا بیان ہے کہ کوئی ان گانوں کا جواب نہ دے سکا، وہ اس بات کے قائل ہیں کہ حمد و نعت کے گیت بھی ہندی الفاظ میں تاثیر آفریں ہو جاتے ہیں، ان کا قول ہے کہ

" ربوبیت کی لہریں مطرب کے تار سے اٹھتی ہوئی سامع کے رگ دل پر مضراب زن ہیں، کچھ اثر کچھ جادو اس زبان میں ضرور ہے، یقینی ہے ورنہ ہندستان کا رہنے والا اریشائیل شاعر رسول ہاشمیؐ کی شان میں یہ نہ کہتا،

" پیا تم مدینے بلیھو کہ ناہیں"
یثرب کا چھیلا سانورو من پیارو لاگو جی"

عبودیت کا فرض ہندی عنصر میں ادا ہوتا ہے، یہ الفاظ متشکل ہیں، ذی روح ہیں، مضطرب ہیں، اب وہ گانا بھی لکھ دوں جس میں فارسی ترکیبوں کا عنصر بھی شریک ہے۔ اس مرکب زبان کی شعلہ آہنگی سامع کو رقص میں لاتی ہے۔

" دل ناداں کو ہم سمجھائے جائیں گے
عشق میں جنکے جان چلی ہے، وہ اہل تم بلوائے جائیں گے
نہ کیا ذبح گیا چھوڑ کے بسمل قاتل
دہن زخم پکارا کیا قاتل قاتل
کسی زخم جگر کے چیر کے دکھائے جائیں گے"[۲]

گانا بنانا ایک خاص علم ہے اور اس کے لیے مذاق صحیح کی ضرورت ہے، مذاق صحیح عطائے وہبی ہے، اکتسابی نہیں ہے....... ہر طبقے کے اصطلاحات و محاورات جدا جدا ہیں اور گانے کی زبان ان خصوصیات کی پابند ہے۔[۳]"

اپنے خط میں احسنؔ نے گیت سازی کے موضوع پر طولانی بحث کی ہے جس کا کچھ حصہ اوپر نقل کیا گیا ہے، مزید نقل کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔

" نامۂ احسنؔ " میں احسنؔ نے اردو کے چند پیش رو اور بعض معاصر ناٹک کاروں کا بھی ذکر کیا ہے، اس سلسلے میں انھوں نے منشی کریم الدین مرادؔ بریلوی، حسینی میاں ظریفؔ، منشی رونقؔ، منشی مراد علی مرادؔ، منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی، پنڈت نراین پرشاد بیتاب، مخلص حیدرآبادی، افسوس بنارسی، منشی میلے کل منشی عبداللطیف شاد، مصنف غافل سفر (نام اور تخلص یاد نہیں آیا) عباس علی، نازاں دہلوی اور آغا حشر کاشمیری کی شخصیت اور کارناموں پر تبصرہ کیا ہے، ان میں سے بعض دنیائے فانی

۱؎ نامۂ احسن، ۲؎ نامۂ احسن، ۳؎ نامۂ احسن

کے اسٹیج سے رخصت ہو چکے تھے اور بعض بقید حیات تھے جو ڈراما نگار مرحوم ہو چکے تھے ان کے خیالات انھیں دوسروں کے ذریعے معلوم ہوئے تھے۔

احسن سب سے زیادہ منشی کریم الدین سے متاثر نظر آتے ہیں، اگرچہ وہ احسن کے بمبئی جانے سے قبل ہی فوت ہو چکے تھے، ان کے ناٹکوں اور گانوں کی تعریف کرتے اور انھیں اپنا استاد روحانی مانتے ہیں، ان کے ناٹک چترا بکاولی سے سبق لینے کا اعتراف کرتے ہیں، انھیں ڈراما نگاری میں طرز جدید کا مخترع بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ڈراما نگاری میں منشی کریم الدین کا وہی درجہ ہے جو شاعری کی دنیا میں میر تقی میر کا"[1]۔

مراد علی مراد کے ساتھ احسن نے کچھ دنوں نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی میں کام کیا تھا اس لیے وہ ان کی علمی و فنی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف تھے، طالب بنارسی کی زبان اور ان کے گانوں کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ان کے ناٹک "لیل و نہار" کی خوبیوں کے معترف تھے، پنڈت بیتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ان کے اردو ڈرامے محاسن زبان اردو سے محروم ہیں، کسی مطبع میں ملازم تھے۔ "قتل نظیر" لکھ کر مشہور ہو گئے۔ کیوں کہ اس ڈرامے میں ایک سچا واقعہ بیان کیا گیا ہے، نظیر دہلی کی ایک طوائف تھی اور قیصر ایک امیر زادہ تھا، یہ سچا واقعہ دہلی کے اسٹیج پر رونما ہوا تھا، بعد میں وہ اردو ڈرامے نہ لکھ سکے، اور ہندی کے دھارمک کھیل، (مذہبی تماشے) لکھنے لگے۔ جس کی وجہ سے خاصی مقبولیت حاصل کر لی، ان کی کامیابی کا ایک اور راز یہ تھا کہ "پنڈت صاحب کی تصنیفات اس وقت منظر عام پر آئیں جب اسٹیج صنف نازک کی کرشمہ سازیوں سے رشک فرانس ہو رہا تھا، ان کے ڈراموں کو مس گوہر اسی پر چاپا ایکٹرس مل گئی جس کی وجہ سے ان کے تماشے مشہور ہو گئے"[2]۔

مخلص حیدرآبادی کے ڈرامے "قیمتی آنسو" کو احسن ان کے کمال کی "جید دستاویز" بتاتے ہیں، افسوں بنارسی کی صلاحیت کے قائل نہ تھے، منشی بے کل کے تماشے "نئی روشنی" میں عامیانہ باتیں زیادہ تھیں، ان سے احسن کی ملاقات ۱۹۱۵ء میں ہوئی تھی۔ منشی عبداللطیف شاد، امیر مینائی کے شاگرد اور علمی قابلیت، فنی استعداد و جوہر انسانیت سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ ان کے ڈرامے "سرفروش" "مجنون رفا" کو مقبول ڈراموں میں شمار کرتے ہیں، نازاں دہلوی کو ایک کامیاب "ڈرامائسٹ" لکھا ہے۔

آغا حشر کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ احسن کے شاگرد تھے، لیکن یہ بات غلط ہے۔ "نامہ احسن" سے یہ ظاہر ہے کہ دونوں ہمعصر تھے اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ دونوں ایک ہی کمپنی میں کام کرتے رہے، بعض دراندازوں نے چاہا کہ لطف اتحاد و یک جائی میں خلل ڈالیں، مگر ذی ہوش شرابی کے دماغ کی تعریف کرنا چاہیے کہ جیسا اپنے کام میں غیر معمولی تھا ویسا ہی معاملے میں سلجھا ہوا تھا[3]۔" احسن اور حشر دونوں دوست تھے، اس دوست کے بارے میں احسن رقم طراز ہیں۔

"آپس میں برتن کبھی نہیں لڑے، ایک نے دوسرے کو جان لیا، پہچان لیا، کیوں لڑنے، ہم دونوں کو زعم تھا کہ کام کا فیصلہ دنیا کرے گی، دام کا فیصلہ قسمت کرے گی، آرام کا فیصلہ اپنی اپنی معاشرت پر منحصر ہے!۔۔۔ آغا نے جب اپنی کمپنی بنائی اور مصروفیت کا سے فرصت نہ پائی تو نظر انتخاب احسن پر ڈالی۔ بس ختم ہو گیا، اس سے زیادہ ثبوت اتحاد و اخلاص کا اور کیا چاہیے، بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آغا صاحب نے ہندی تماشا لکھ کر زبان اردو پر دھبا لگا دیا، یہ اعتراض ان لوگوں تک محدود ہے جو فرائض ملازمت سے بے خبر اور اخراجات زندگی سے مستغنی ہیں، ہم لوگ، مذہبی دیوانے یا قومی پاگل ہوتے تو ڈراما نویس نہ ہوتے[4]"۔

احسن کے ڈراموں کے علاوہ ان کی ایک نثری تصنیف "واقعات انیس" بھی ہے۔ جس میں انھوں نے میر انیس کے حالات زندگی اور کارناموں پر ایک محقق اور نقاد کی نظر سے روشنی ڈالی ہے، اس کے لکھنے کی ابتدا ۱۹۰۵ء میں ہوئی اور ۱۹۰۸ء میں اختتام کو پہنچی،

---

[1] نامہ احسن [2] نامہ احسن [3] نامہ احسن [4] نامہ احسن

اس کے دو حصّے ہیں، پہلے حصّے میں میر انیس کے بعض مرثیوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، اس کتاب سے احسن کی تحقیقی و تنقیدی بصیرت اور اس عقیدت و ارادت کا اندازہ ہوتا ہے جو انھیں میر انیس اور خاندان میر انیس سے تھی۔ "نامۂ احسن" کو بھی ایک اہم نثری تصنیف کا درجہ دینا چاہیے یہ طویل مقالہ اردو ڈرامہ نگاری کے ایک دور کی مختصر مگر بہت ہی قیمتی تاریخ و تنقید ہے، کیوں کہ اسے ایک نامور ڈرامہ نگار نے لکھا ہے۔

احسن ایک اچھے صاحب طرز انشا پرداز بھی تھے، ان کی نثر میں رنگینی اور ظرافت کی چاشنی بھی ہے، ڈراموں کی مقفیٰ و مسجع عبارت کے نمونے "واقعات انیس"، اور "نامۂ احسن"، دونوں میں جا بجا نظر آتے ہیں، ان کی نثر کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

"ایام شباب کی بے چینیاں کسی پہلو قرار نہیں لینے دیتی تھیں، ایک دل تھا اور ہزاروں تمنائیں، ایک سر تھا اور ہزاروں سودے کہیں دلفریب حسن کی تعریف میں رطب اللسانی اور کہیں جذبات عشق کے اظہار میں شیریں زبانی، وقت کا تیز پرواز پرندہ معمولی سُرعت کے ساتھ ہر روز مشرق سے مغرب کی جانب چلا جاتا تھا اور یہاں عالم بیخودی کے مسافر کو ہوش بھی نہ آتا تھا۔

(واقعات انیس)

"ان کی (کریم الدین) کی تقریریں تاثیر سے لبریز ہیں، ان کی نثر فصاحت سے ممزوج ہے، ان کا خیال ترفع سے وابستہ ہے، ان کا کمال محاسن سے مالا مال ہے"

(نامۂ احسن)

مراد علی مراد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اپنے آپ کو کسی سے کم نہیں سمجھتے تھے، شعرائے ماضی و حال کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ دیوانوں سے کام نکال لیا کرتے تھے کہیں کہیں اپنی گرہ کا بھی صرف کرتے تھے، لیکن ذاتی مال خود بتا دیتا تھا کہ میں جناب مراد کی جیب خاص کا سرمایہ ہوں۔

(نامۂ احسن)

★

غزل

ساحر ہوشیارپوری

شمع صورت نہ سرِ بزم پگھلتے رہیے
اپنے احساس کے شعلوں ہی میں جلتے رہیے

زندہ رہنا ہے تو انداز بدلتے رہیے
کوئی سانچہ ہو ہر اک سانچے میں ڈھلتے رہیے

چلتے رہنے ہی سے منزل کا نشاں ملتا ہے
کوئی دیوار ہو، سر پھوڑیے چلتے رہیے

لوگ اک چہرے پہ سو چہرے سجا لیتے ہیں
بند آنکھوں سے نہ بازار میں چلتے رہیے

کیجیے جوہر ذاتی سے چمن کی تزئین
خار بن کر نہ رگِ گل میں مچلتے رہیے

فی زمانہ لبِ منصور کا نعرہ ہے یہی
سچ نگل جایئے اور جھوٹ اگلتے رہیے

جستجو ہے کسی نکھرے ہوئے گلشن کی اگر
عمر بھر تپتے ہوئے دشت میں جلتے رہیے

واہ کیا خوب رہی وعدۂ دیدار کی شرط
حشر تک وعدۂ دیدار پہ ٹلتے رہیے

سانس لینے کا اگر نام ہے جینا ساحر
سانس لینے کے بھی انداز بدلتے رہیے

غزل

فنا نظامی

نہ دشت سے نہ چمن سے نہ دار سے پوچھو
مرا شعورِ جنوں کوئے یار سے پوچھو

یہ بات پھول سے پوچھو نہ خار سے پوچھو
ہمارے خون کی قیمت بہار سے پوچھو

یہ لطف وہ ہے جو ساقی کو بھی نصیب نہیں
سرورِ تشنہ لبی بادہ خوار سے پوچھو

وجود کیا ہے عدم کیا ہے مجھ کو کیا معلوم
میں بے خبر ہوں کسی ہوشیار سے پوچھو

نہ پوچھو خاکِ سرِ رہ سے میرا ذوقِ سفر
جو منزلوں پہ ملے اس غبار سے پوچھو

ہر اک سوال کا تم کو جواب دے دوں گا
مگر جو بات بھی پوچھو وہ پیار سے پوچھو

شراب جتنی پلا سکتے ہو ہمیں رندو
ہمارا ظرف اسی اعتبار سے پوچھو

وہ راہیں جن کا تمھیں آج تک پتہ بھی نہیں
انھیں مری نگہِ انتظار سے پوچھو

ڈاکٹر سلام سندیلوی

میرؔ کی شاعری میں دنیا سے کنارہ کشی کا رجحان

دنیا سے کنارہ کشی کا رجحان دراصل نرگسیت کی ایک قسم ہے۔ کیرن ہارنی نے اس رجحان کو (WITHDRAWAL FROM OTHERS) کا نام دیا ہے[۱]۔ انسان کو جب شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ دنیا سے کنارہ کش ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا سے کنارہ کشی کے رجحان کو الفریڈ اڈلر نے (SECLUSION NESS) کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ شکست خوردہ انسان کی تنہائی اور خلوت پسندی مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ جو شخص سوسائٹی سے الگ ہو جاتا ہے وہ بہت کم گفتگو کرتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کی طرف نظر نہیں اٹھاتا دوسروں کی بات بھی نہیں سنتا ہے[۲]۔

عناصر نفسیات (ELEMENTS OF PSYCHOLOGY) کے مصنفین (KOTHURKAR) اور (HAROLIKAR) نے بھی دنیا سے کنارہ کشی کے رجحان کو شیزو فرنیا (SCHIZOPHRENIA) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ مشکلات کے موقع پر انسان دو راستے اختیار کرتا ہے۔ یا تو وہ خطرات کا مقابلہ ڈٹ کر کرتا ہے یا پھر راہ فرار اختیار کرتا ہے اور دنیا سے قطع تعلق کر لیتا ہے[۳]۔

ناکام انسان کنارہ کشی کا اظہار مختلف حفاظتی طریقوں سے (DEFENSIVE MECHANISM) بھی کرتا ہے۔ ایسے حفاظتی طریقوں میں ایک مشہور طریقہ مراجعت (REGRESSION) ہے[۴]۔ ناکام انسان جب حالات کا مقابلہ کرنے سے قاصر نظر آتا ہے تو وہ اپنے عہد طفلی میں واپس جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ طفلی کا زمانہ غم و آلام سے مبرا ہوتا ہے۔ اسی لیے اس عہد میں واپس جا کر انسان کو سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ مراجعت کی شکل میں ناکام انسان سے بچوں کی جیسی حرکات سرزد ہوتی ہیں۔ خصوصاً وہ مصائب کے موقع پر اشکباری کرنے لگتا ہے۔

ناکامی سے بچنے کے لیے نرگسی انسان کنارہ کشی کا ایک اور طریقہ بناتا ہے۔ جس کو انسداد (REPRESSION) کہتے ہیں[۵]۔ ایسی صورت میں وہ دماغ کی اندرونی تہوں سے غمگین واقعات کے نقوش کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تلخ یادوں کو فراموش کرنے کی جد و جہد کرتا ہے اس کے علاوہ ان خواہشات کی بھی بیخ کنی کرتا ہے جس سے اس کو تکلیف پہنچتی ہے۔ مگر بعض اوقات پرانی یادیں ابھر کر

---

[۱] NEW WAYSIN PSYCHOANALYSIS BY KAREN HORNEY. P. 88,

[۲] UNDER STANDING HUMAN NATURE BY ALFRED ADLER P 233, 234.

[۳] ELEMENTS OF PSYCHOLOGY BY KOTRURKAR AND HAROLIKAR. P 193_195,

[۴] THE PSYCHOLOGY OF PERSONALADJUSTMENT AND BY ROGER W. HEYNS P 70_72,

[۵] THE PSYCHOLOGY OF PORSONALADJUSTMENT BY ROGER W HEYNS P. 30_32

اس کو پریشان کرنے لگتی ہے۔

نرگسی انسان غم کو بھلانے کے لیے کنارہ کشی کا ایک اور حربہ کام میں لاتا ہے۔ وہ ضبط (SUPPRESSION) سے کام لیتا ہے[1] وہ ان خواہشات کو دبانے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتی رہتی ہیں۔ وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ تکلیف دہ واقعات کو ابھرنے کا موقع ہی نہ دے۔

نرگسی انسان آئینۂ دل سے غم کے زنگ کو دور کرنے کے لیے اخراج (DISPLACEMENT) کا طریقہ بھی اختیار کرتا ہے[2]۔ اس ترکیب کے ذریعہ وہ ایک غم کو اس کی اصلی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح سکون قلب حاصل کرتا ہے۔

نرگسی انسان کا سب سے بڑا اور مضبوط حربہ واہمہ (FANTASY) ہے[3]۔ وہ تصورات کی دنیا آباد کرتا ہے اور خود کو اس دنیا کا ہیرو تصور کرتا ہے وہ اپنے کو بعض اوقات تخئیلی طور پر شہزادہ، جنرل، نابغہ اور محقق وغیرہ سمجھنے لگتا ہے واہمہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک تعمیری واہمہ کہلاتا ہے اس واہمہ کے ذریعہ نرگسی انسان اپنے مسائل کا حل تلاش کر لیتا ہے یہ واہمہ بڑی حد تک حقیقی ہوتا ہے۔ واہمہ کی دوسری قسم کو غیر تعمیری واہمہ کہتے ہیں جو تخئیلی ہوتا ہے غیر تعمیری واہمہ کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

پہلی صورت میں ایک شخص خود کو فاتح ہیرو تصور کرتا ہے اور خیالی طور پر تمام ممالک کو فتح کرتا چلا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں انسان خود کو مظلوم و مجبور تصور کرتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ دنیا اس پر ظلم کر رہی ہے۔ اس کو مفتوح ہیرو کہتے ہیں۔

کنارہ کشی کا ایک انداز ہم آہنگی (INTRO JECTION) بھی ہے[4]۔ یہ طریقہ ایک ناکام انسان اس وقت اپناتا ہے جب وہ اپنے مخالف سے تاب مقاومت نہیں رکھتا ہے مجبوراً وہ اس کے نظریات سے ہم آہنگی اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح اپنی زندگی کو خوشگوار بنا لیتا ہے۔

نرگسی انسان اپنی ہستی کو محفوظ رکھنے کے لیے تنسیخ (DISTORTION)[5] کا طریقہ بھی اختیار کرتا ہے۔ وہ خطرے کی اصل صورت کو مسخ کر دیتا ہے اور اس طرح خطرہ اس کو بدلی ہوئی شکل میں نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بعض اوقات استدلال (RATIONALIZATION)[6] سے بھی کام لیتا ہے۔ وہ اپنے دل کو سمجھاتا ہے کہ یہ مخصوص خطرہ اس کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے لوگوں کے لیے ہے اس طرح وہ اپنے دل کو سکون بخشتا ہے۔

دنیا سے کنارہ کشی کا رجحان ہر اس انسان میں پیدا ہو سکتا ہے جو ناکام اور شکست خوردہ ہوتا ہے۔ شاعر کا احساس عام انسان سے زیادہ شدید اور تیز ہوتا ہے۔ اس لیے ناکامی کے وقت وہ عام انسان کی بہ نسبت زیادہ کنارہ کش ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا سے کنارہ کشی کا رجحان اردو کے بہت سے شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے۔ مگر میر کے یہاں یہ رجحان زیادہ شدید ہے۔

میر کی دنیا سے کنارہ کشی کے مختلف اسباب ہیں۔ اوّل تو میر نظری اور پیدائشی طور پر غمگین واقع ہوئے تھے۔ ارنسٹ کریچمر (ERNEST KRETCHMER) کے نظریے کے مطابق انسان پیدائشی طور پر دو قسم کا ہوتا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں کو اس نے سائیکلوئیڈ (CYC LOID) کہا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر خوش و خرم رہتے ہیں۔

---

۱ THE PSYCHOLOGY OF PERSONAL ADJUSTMENT BY ROGER W. HEYNS. P. 40 – 41.

۲ THE PSYCHOLOGY BY STAGNER AND KARWOSKI. P. 500,

۳ ABNORMAL PSYCHOLGY AND MODERN LIFE : BY JAMES COLEMAN P. 97,

۴ THE PSYCHOLOGY BY STAGNER AND KARWOSKI. P. 505

۵ THE PSYCHOLOGY BY STAGNER AND KARWOSKI. P. 503,

۶ THE PSYCHOLOGY BY STAGNER AND KARWOSKI. P. 503,

تھیں۔ مطلب اس سے یہی تھا کہ ہر طرح ان کی طبیعت خوش اور شگفتہ رہے۔ یہ جس دن وہاں آکر رہے کھڑکیاں بند پڑی تھیں کئی برس گزر گئے اسی طرح بند پڑی رہیں کبھی کھول کر باغ کی طرف نہ دیکھا۔ ایک دن کوئی دوست آئے انھوں نے کہا۔ ادھر باغ ہے۔ آپ کھڑکیاں کھول کر کیوں نہیں بیٹھتے۔ میر صاحب بولے کیا ادھر باغ بھی ہے؟ انھوں نے کہا کہ اسی لیے تو آپ کو یہاں لائے ہیں کہ جی بہلتا رہے اور دل شگفتہ ہو۔ میر صاحب کے بیٹے پرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کرکے کہا میں تو اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوں کہ اس باغ کی خبر بھی نہیں۔"[1]

مختصر یہ کہ میر مسلسل حادثات کی بنا پر دنیا سے بڑی حد تک کنارہ کش ہو گئے تھے اور ان کے مزاج پر شیزوفرینیا کے اثرات طاری ہو گئے تھے میر کی زندگی کے علاوہ ان کی شاعری سے بھی دنیا سے کنارہ کشی کے رجحانات واضح ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں ؎

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

اس شعر میں میر نے واضح طور پر خود کو "گوشہ گزیں" قرار دیا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں بھی میر نے خود کو "گوشہ نشین" تسلیم کیا ہے۔ ؎

دیکھو گے کوئی گوشہ نشیں ہو گیا غریب
تیر مژہ اس ابرو کماں کا اگر چلا

میر کی گوشہ نشینی اس میں بھی ملاحظہ فرمایئے۔ ؎

جوں غنچہ میر اتنے نہ بیٹھے رہا کرو
گل پھول دیکھنے کو بھی ٹک اٹھ چلا کرو

میر کو اب فطری مناظر کے مشاہدے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ یہ دنیا سے کنارہ کشی کا نہایت واضح رجحان ہے۔

میر صاحب کو دیکھیے جو بنے
اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

یہ شعر واضح طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ انھوں نے اہل دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ وہ گھر سے بھی بہت کم نکلتے ہیں بلکہ گھر میں بند رہتے ہیں اور تنہائی کی زندگی گزارتے ہیں۔

میر کے یہاں کنارہ کشی کی علامتیں واضح طور پر ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنے اشعار میں جہاں کہیں دشت نوردی کا ذکر کیا ہے اس سے ان کی زندگی سے فراری ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً

ویرانی دشت جنوں ہے کہ بھبھوکا پا کے   میں نے موتی سے پرو رکھے ہیں ہر خار کے بیچ
وہ دشت خوفناک رہا ہے مرا وطن   سن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا
گزرے ہے لہو واں سر ہر خار سے اب تک   جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

مجنوں کا دل ہوں، محمل لیلیٰ سے ہوں جدا
تنہا پھروں ہوں دشت میں جوں نالۂ جرس

میر نے اپنے مختلف اشعار میں "صحرا" کا لفظ استعمال کیا ہے یہ لفظ بھی ان کی فراریت کی غمازی کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

میر اب بہار آئی صحرا میں چل جنوں کر
کوئی بھی فصل گل میں ناداں گھر رہے ہے

اسی طرح انہوں نے اپنے اشعار میں "بیاباں" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے جو ان کی اسی ذہنیت کو بے نقاب کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

ہے تیرہ یہ بیاباں گرد و غبار سے سب
دے راہ کب دکھائی بے رہنمائی دل

میر کی شاعری میں کنارہ کشی کے مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے غم سے بچنے کے لیے مختلف حفاظتی DEFENSIVE MECHANISM اختیار کیے ہیں۔ مثلاً ان کے ہاں مراجعت (REGRESSION) کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں۔ مصیبت پڑنے پر میر بچوں کی طرح اشکباری پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی مندرجہ ذیل غزل ملاحظہ فرمایئے ؎

دامان کوہ میں جو میں ڈھاڑھ مار رویا   اک ابر وہاں سے اٹھ کر بے اختیار رویا
ہر گل زمیں یہاں کی رونے ہی کی جگہ تھی   مانند ابر ہر جا میں زار زار رویا

ایک عجز عشق اس کا اسباب صد الم تھا
کل میر سے بہت میں ہو کر دوچار رویا

---

[1] آب حیات۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ ص ۲۷۰

میر کے یہ اشعار بھی قابل توجہ ہیں۔

روتا رہا ہوں غم سے ترے ہم تمام شب
پڑتی رہی ہے زور سے شبنم تمام شب

یہ اتصال اشک جگر سوز کا کہاں
روتی ہے یوں تو شمع بھی کم کم تمام شب

میر کی مندرجہ ذیل غزل تو آنسوؤں کی ایک لڑی معلوم ہوتی ہے۔ سہ

جو اس شور سے میر روتا رہے گا | تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں | جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح | تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا
بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں | کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہے گا

بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

میر کی شاعری کے گلشن میں ہر طرف شبنم کے قطرے نظر آتے ہیں اور یہ شبنم کے قطرے ان کی مراجعت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اپنے اشعار میں میر "قفس" کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔ یہ مراجعت کی دوسری شکل ہے۔ قفس کی چہار دیواری کے اندر پناہ حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ سہ

ہر ماں تو دیکھ پھول بکھیرے تھی کل صبا
اک برگ گل گرا نہ جہاں تھا مرا قفس

میر نے اپنے اشعار میں "گور" "مزار" اور "زنداں" کے الفاظ استعمال کرکے بھی مراجعت کے رجحان کی نمود کی ہے:

تا گور کے اوپر وہ گل اندام نہ آیا | ہم خاک کے آسودوں کو آرام نہ آیا
وسعت جہاں کی چھوڑ جو آرام چاہے میر | آسودگی رکھے ہے بہت گوشۂ مزار

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

کنارہ کشی کی ایک صورت میر کے یہاں نظر آتی ہے وہ بعض اوقات انسداد (REPRESSION) سے کام لیتے ہیں۔ انھوں نے غم حیات کو لاشعور کی تہوں میں دبا دیا ہے اور اس طرح رنج و الم سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر کبھی کبھی غم لاشعور کی تہوں سے ابھر آتا ہے۔ سہ

اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار
یادِ ایام جب تحمل تھا

کسی زمانے میں میر نے غم کو لاشعور کے تہہ خانے میں بند کر دیا تھا، اور اس طرح تحمل اختیار کر لیا تھا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد وہ تحمل کسی بنا پر ختم ہو گیا اور ان سے صبر و قرار رخصت ہو گیا۔

انسداد کے اظہار میں ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔ سہ

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

انسداد کی یہ کیفیت میر کی مندرجہ ذیل شعر میں بھی ملتی ہے۔

سمجھے تھے میر ہم کہ یہ ناسور کم ہوا
پھر ان دنوں میں دیدۂ خونبار نم ہوا

میر کی شاعری میں ضبط (SUPPRESSION) کی بھی مثالیں پائی جاتی ہیں جن سے ان کا کنارہ کشی کا رجحان نمایاں ہوتا ہے۔ میر نے عمداً غم کو دبانے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ وہ غم سے مقابلہ کی تاب نہیں رکھتے تھے اس لیے انھوں غم کو دبا کر ضبط سے کام لیا چنانچہ کہتے ہیں سہ

تھی مصلحت کہ رک کر ہجراں میں جان دیجے
دل کھول کر نہ غم میں میں ایک بار رویا

مندرجہ ذیل شعر میں بھی انھوں نے ضبط کا اظہار کیا ہے۔ سہ

میں گریۂ خونی کو روکے ہی رہا ورنہ
یک دم میں زمانہ کا یاں رنگ بدل جاتا

میر کی شاعری میں کنارہ کشی منتقلی یا اخراج (DISPLACEMENT) کی صورت میں بھی نمایاں ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ سہ

طالع نے چشم پوشی کی یاں تک کہ ہم نشیں
چھپتا ہے مجھ کو دور سے اب یار دیکھ کر

دراصل محبوب نے میر سے بے اعتنائی برتی ہے۔ اس لیے انکو محبوب سے شکایت ہے مگر وہ اس کے خلاف اظہار جذبات کرنے سے

معذور ہیں۔ اس لیے انھوں نے خود اپنی قسمت کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔

میرؔ کی کنارہ کشی بعض وقت واہمہ (FANTASY) کی شکل میں بھی ابھرتی ہے اور وہ واہمہ کی دنیا آباد کرتے ہیں۔ اس وقت وہ تخیلی طور پر خود کو برتر تصور کرتے ہیں مثلاً۔

میرے سنگِ مزار پر فرہاد
رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

ظاہر ہے کہ فرہاد کا مرتبہ بحیثیت عاشق میرؔ سے بلند ہے۔ مگر میرؔ نے خود کو فرہاد سے بڑا عاشق تصور کر کے خود کو فاتح ہیرو کی شکل میں پیش کیا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں بھی انھوں نے فاتح ہیرو کا روپ اختیار کیا ہے جو صرف واہمہ کا کرشمہ ہے۔ ؎

استادہ جہاں میں تھا میں طبیعت میں
واں رستم اگر آتا تو دیکھ کے ٹل جاتا

میرؔ نے کبھی کبھی خود کو مفتوح ہیرو قرار دیا ہے چنانچہ کہتے ہیں

حد سے زیادہ جور و ستم خوشنما نہیں
ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو

اس شعر میں انھوں نے خود کو مظلوم اور مجبور بنا کر پیش کیا ہے میرؔ کی کنارہ کشی بعض اوقات ہم آہنگی (INTROJECTION) کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

مت نکل گھر سے ہم بھی راضی ہیں
دیکھ لیں گے کبھو سرِ بازار

گویا میرؔ اپنے محبوب سے باقاعدہ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ چشم پوشی کرتا ہے۔ مجبوراً انھوں نے محبوب کے نظریات سے ہم آہنگی اختیار کر لی ہے اور یہ طے کیا ہے کہ جب محبوب کبھی سرِ بازار نظر آئے گا تو وہیں وہ اس کی زیارت کر لیں گے۔

"میرؔ نے بعض اوقات ناکامی کے موقع پر تنسیخ (DISTORTION) سے بھی کام لیا ہے انھوں نے غم کی اصل صورت کو بگاڑ دیا ہے اس طرح ناکامی کے احساس میں کمی واقع ہو گئی ہے کہتے ہیں۔ ؎

ہر طرف ہیں اسیر ہم آواز   باغ ہے گھر ترا تو اے صیاد

میرؔ صیاد کے گھر میں اسیر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسیری ان کے لیے عذابِ جان ہے۔ مگر وہ تنسیخ سے کام لے کر کہتے ہیں کہ اے صیاد تیرے گھر میں ہر طرف ہم صفیر گرفتار ہیں اور چہچہا رہے ہیں اس بنا پر تیرا گھر تو باغ بن گیا۔ اس طرح میرؔ نے قید خانے کو باغ تصور کر لیا ہے اور قید کی شدت میں تخفیف کر دی ہے۔ ایک شعر اور ملاحظہ فرمائیے: ؎

شکر کر داغِ دل کا اے غافل   کس کو دیتے ہیں دیدۂ بیدار

ظاہر ہے کہ داغِ دل تکلیف دہ ہیں۔ مگر میرؔ نے ان کو دیدۂ بیدار تصور کر لیا ہے اور خدا کا شکر ادا کیا ہے۔

احساسِ غم کو گھٹانے کے لیے میرؔ نے استدلال (RATIONALI-ZATION) سے بھی کام لیا ہے۔ کہتے ہیں۔ ؎

بیٹھنا غیر دل میں کب ہے ننگِ یار
پھول گل ہوتے ہی ہیں خاروں کے بیچ

محبوب کا غیروں کے مجمع میں بیٹھنا میرؔ کو ناگوار ہے مگر وہ اس موقع پر استدلال سے کام لیتے ہیں اور عقل کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ باغ میں خاروں کے بیچ پھول ہوتے ہی ہیں۔ یہ تو نظامِ فطرت ہے۔ اس لیے اگر محبوب، جو مثلِ گل ہے غیروں کے درمیان، جو کانٹوں کے مانند ہیں بیٹھا ہے تو کیا حرج ہے؟

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ میرؔ کی شاعری میں کنارہ کشی کی مختلف شکلیں پائی جاتی ہیں۔ ان ساری شکلوں میں میرؔ کا خونِ جگر جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ میرؔ نے ساری عمر ناکامیوں میں بسر کی۔ اس لیے ان کے بہت سے اشعار ناکامیوں کے مرجھائے ہوئے غنچے معلوم ہوتے ہیں۔ جن کو موجِ بہار اور بادِ صبا کھلانے سے قاصر رہی ہے۔

★

تسنیم فاروقی

غزل

نہ تو غم ہی راس آیا نہ خوشی ہی کام آئی
میں جو دل کی بات کہدوں ابھی رو پڑے خدائی

وہ ملے تو مجھ کو لیکن یہ ہے سزا رناگواری
مجھے ان پہ پیار آیا، انھیں احتیاط آئی

یہ طلسم دین و دنیا کسی ایک تک ہی رکھے
یہ نگاہ کا فرانہ یہ غرور پارسائی

مرے پاس کیسے آتا ترا اعتبار جلوہ
تجھے قید آئینہ سے نہ ملی کبھی رہائی

تری بزم سے اٹھا ہوں میں چھپا کے ایسا ساون
جو نچھل سکے نہ بادل جو گھٹا برس نہ پائی

وہی رسم سنگ و شیشہ وہی فکر گل میں صحرا
وہ جنوں کی زندگی کیا جو صلیب تک نہ آئی

یہ نچھے نچھے سے سائے ابھی چھین لے گا سورج
یہاں سو نہ اے مسافر کہ یہ چھاؤں ہے پرائی

عجب اتفاق ہے یہ رہ آرزو میں تسنیم
دل اسی کو چاہتا ہے کہ جسے وفا نہ آئی

غلام مرتضیٰ راہی

غزل

روئے افق سے نورِ سحر کون لے گیا
اس اوج تک کمندِ نظر کون لے گیا

اشجار ہیں کہ نیزے گڑے ہیں زمین میں
وہ برگ و گل وہ شاخ و ثمر کون لے گیا

پہنچے دلوں کو چوٹ تو کوئی پتہ لگائے
ان پتھروں سے موجِ شرر کون لے گیا

اس سطح پہ کیسے تھا مری ذات کا شعور
اتنی تہوں میں آکے گہر کون لے گیا

نزدیک آتے آتے نگاہوں سے چھپ گئی
منزل پہ میری گردِ سفر کون لے گیا

سورج کدھر تھا، چاندستارے کہاں رہے
وہ شام کیا ہوئی وہ سحر کون لے گیا

اتر پردیش میں ہینڈلوم صنعت



اپریل کے مہینہ میں میونسپل کارپوریشن (لکھنؤ) کے ہال میں ہینڈلوم کی نمائش کے موقع پر وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا بنکروں کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے۔ ان کے بائیں جانب وزیر صنعت شری مصطفےٰ حسین بیٹھے دکھائی دے رہے ہیں۔

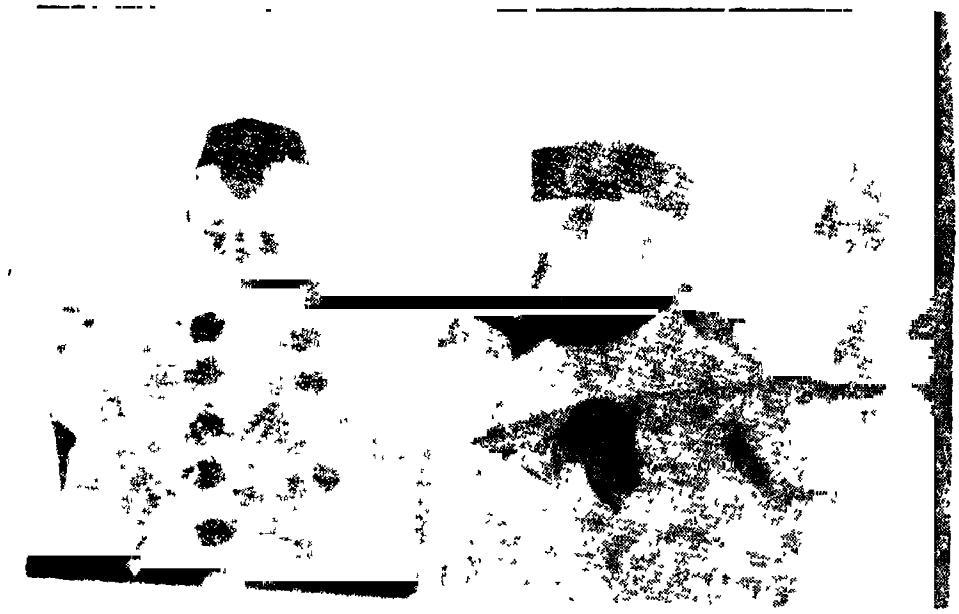
اُتر پردیش میں ہینڈلوم صنعت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ کیونکہ اس گھریلو صنعت سے لاکھوں افراد کو روزگار کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ اس ریاست کی یہ قدیم صنعت اپنے دامن میں تباہی و بربادی کی داستانیں چھپائے ہوئے آج بھی زندہ ہے اور ریاست کے بنکر عوام نے اس صنعت کو جو ترقی دی ہے اور اپنے فن میں جو بیش بہا اضافہ کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔

دورِ غلامی سے لے کر ہندستان کی جنگ آزادی تک اور پھر نئے ہندستان کی تعمیر میں اس صنعت نے جو کردار ادا کیا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزوں نے اس صنعت اور اس کے فنکاروں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بنکروں کے انگوٹھے تک کاٹے گئے تاکہ ان کے ملک کے کپڑوں کے لئے بازار مہیا کیا جا سکے اور ان کا کوئی مقابل نہ رہ سکے۔ کیونکہ ہندستان کے بنکروں کے فن کے سامنے انگریزوں کی فن کاری اور کاری گری ہیچ تھی اور ان کے کپڑوں کی مانگ، ہندستان کے کپڑوں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہاں کے کاریگروں کے فن کو ختم کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی ڈھاکہ کی ململ کی کہانی آج بھی دہرائی جاتی ہے۔ جس کے ساتھ ظلم و ستم کی کہانیاں وابستہ ہیں۔ لیکن تمام کوششوں کے باوجود انگریز اس صنعت کو ختم نہ کر سکے۔ پھر جنگ آزادی میں اس گھریلو صنعت نے جو نمایاں کام انجام دیا اسے تاریخ کبھی جھٹلا نہ سکے گی۔ دنیا میں جب جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی، اس وقت اس صنعت نے کپڑے تیار کر کے ملک میں کپڑوں کی ضرورت کو پورا کیا اور اس دور میں بھی اپنے فرض کو پوری طرح سے نبھایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندستان کی آزادی کے بعد اس صنعت کی طرف اتنی توجہ نہ دی گئی جتنی کہ دی جانی چاہئے تھی اور جس کے لئے یہ صنعت مستحق تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غریب بنکر استحصال کی چکی میں پستا رہا۔ سرمایہ دار اس کی محنت سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اور یہ بیچارہ بنکر غریب کا غریب ہی رہا۔ پھر بھی اس نے اپنے فن کو سینے سے لگائے رکھا۔ سائنس کے ساتھ ساتھ مشینوں کا دور آیا ملیں قائم ہوئیں لیکن یہ ملیں بھی ہاتھ کی کاریگری کو نہ پا سکیں۔ یہ ملیں بھی اپنے کپڑوں میں وہ حسن نہ پیدا کر سکیں جو ہینڈلوم کے کاریگر اپنے کپڑوں میں پیدا کر دیتے ہیں۔ روئی کے دھاگوں کو اطلس و کمخواب روپ دینے والے ان بنکروں کے فن کا لوہا زمانے نے مانا ہے۔ کتنے ہی دور گزر گئے لیکن ان کے فن کی عظمت آج بھی برقرار ہے آج بھی ہاتھ سے بنے ہوئے کپڑوں کی کاریگری اور اس فن کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔

اتر پردیش میں کھیتی کے بعد ہینڈلوم ہی سب سے بڑی گھریلو صنعت ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس ریاست میں ۱۵ لاکھ افراد براہ راست اس صنعت سے وابستہ ہیں۔ اس ریاست میں ہینڈلوم پر تقریباً ۴۵ کروڑ میٹر کپڑا سالانہ تیار کیا جاتا ہے جو کہ ریاست کی کل کپڑے کی ضرورت کا ایک تہائی ہے۔ جہاں ایک طرف اس ریاست کے معاشی اور اقتصادی ڈھانچے میں اس صنعت کو خاص اہمیت حاصل ہے، وہیں ملک کے لیے زر مبادلہ حاصل کرنے میں بھی یہ صنعت بڑا اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔ ۱۹۷۲-۷۳ء

جاذب نظر دستکاری اور حسین فن کاری کے نادر کام کی ریشمی ساڑی، اسکارف، شال، مفلر، ڈریس، آرائشی کپڑے، ٹائیز، لیمپ شیڈ، فیض آباد ضلع میں ٹانڈہ کی اسٹیل شرٹس کی مقبول عام لنگی، چادریں اور جلال پور کے انگوچھے وغیرہ تو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اسی طرح بھدوہی (بنارس) اور مرزاپور کی اونی قالین بھی ممالک غیر میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ سنڈیلہ (ہردوئی) کے پردے، چادریں، گاڑھا اور بیڈ تیج کلاتھ غوث گنج اور ملاواں کی ساڑیاں



تیسرا ۲ (ا ہ دری، میں ہینڈلوم نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر صنعت شری اصطفی حسین

میں ۴۳۵ لاکھ روپے کے ہینڈلوم کپڑے اور ۱۹۷۳-۷۴ء میں تقریباً ۲۵ کروڑ روپے کی قیمت کے قالین غیر ممالک کو برآمد کیے گئے۔

اتر پردیش میں ہینڈلوم اور پاور لوم کے خاص مراکز ہیں جو اپنے اپنے کپڑوں کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ مئو (اعظم گڈھ) کی ہینڈلوم کی فائن اور عمدہ ساڑی، مارکین وغیرہ گورکھپور کی پائدار، خوب صورت اور دل کش ڈیزائن کی چادریں، پلنگ پوش، تولیہ، غلاف تکیہ، رومال وغیرہ، وارانسی کی

وغیرہ بھی بہت مشہور ہیں۔

مرادآباد کی شرٹنگ، بریلی اور بجنور کی سوٹنگس اور گاڑھے کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح میرٹھ ہینڈلوم صنعت کا ایک مشہور اور اہم مرکز ہے، جہاں کے سوٹنگ، شرٹنگ، اور خوب صورت پلنگ پوش اور جدید ڈیزائن کے بیل باٹم وغیرہ اپنی مقبولیت کا سکہ جما چکے ہیں۔

کاسگنج (ایٹہ) اور ہاتھرس ضلع علی گڈھ کے دل کش سوتی ڈریٹ اور نفیس ڈیزائن کی گلدریاں وغیرہ اور مئو رانی پور (جھانسی)

کی حسین چندیری ساڑیاں، ٹیری کاٹ، ٹیری وول، شرٹنگ، سوٹنگ وغیرہ بھی دن بہ دن مقبول ہوتی جارہی ہیں۔ اسی طرح آباده کے دل کش اسٹرائپس والے پردے اور پرنٹس، غلاف تکیہ، اسٹیل کی چادریں، لنگی اور میز پوش وغیرہ بھی بہت مشہور ہو چکی ہیں۔

فرخ آباد اور لکھنؤ کے شہرت یافتہ اور دل کش ڈیزائن کے چھپے کپڑے جیسے لحاف کی فردیں، چادریں، پلنگ پوش وغیرہ بھی ممالک غیر کو برآمد ہونے والے کپڑوں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ اسی طرح بارہ بنکی کے رومال، اسٹیپل کی مضبوط اور پائدار ساڑیاں اور میاں گنج (اناؤ) کے انگوچھے اور لنگی، اس کے علاوہ بانگر مئو کی چادریں، گنج مراد آباد کا گاڑھا، ساڑیاں اور دھوتیاں وغیرہ کافی مشہور ہیں۔

دریوں کے لیے سیتاپور اور آگرہ بہت مشہور رہے۔ کانپور کی بٹے سوت کی مضبوط چادریں، غلاف تکیہ، اسٹرائپس، لنگی اور ایرانی دریاں اپنی خوب صورتی کے لیے مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ مئو آئمہ (الہ آباد) بھی ہینڈلوم اور پاور لوم صنعت کا ایک اہم مرکز بن چکا ہے۔ یہاں کی ساڑیاں اور کھنڈالہ کلاتھ بے حد مشہور ہے۔ اسی طرح فتح پور بھی لحاف کی فردوں اور استر کے کپڑوں کے لیے ایک اہم مرکز بن چکا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق صوبہ میں ۵ لاکھ ہینڈلوم اور ۲۵۰۰۰



بارہ دری میں وزیر صنعت شری اصطفیٰ حسین نمائش میں ہینڈلوم کپڑوں کا معائنہ کرتے ہوئے

پاور لوم ہیں۔ اس کے لیے سوت اور اسٹیپل کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے سرکار نے کچھ اہم منصوبے تیار کیے ہیں۔ ریاست کو سوت کے معاملے میں خود کفیل بنانے کے لیے سرکار نے سوت کتائی ملوں کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔ حکمراں پارٹی نے ریاست کے گذشتہ الیکشن کے موقع پر اپنے انتخابی منشور میں اگلے پنج سالہ منصوبے میں کتائی ملوں کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔ فیض آباد، ہردوئی، رائے بریلی، بارہ بنکی، جھانسی اور نینی تال کے ضلعوں میں اب تک سات سوت کتائی ملوں کا سنگ بنیاد بھی رکھا جا چکا ہے۔ ریاست میں سوت کتائی ملوں کا قیام بنکروں کے مطالبے پر کیا جا رہا ہے۔

اترپردیش سرکار نے بنکروں کے مطالبے پر ہینڈلوم ڈیولپمنٹ اینڈ فائینانسنگ کارپوریشن بھی قائم کیا ہے۔ یہ کارپوریشن جولائی ۱۹۷۳ء میں قائم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہینڈلوم اور پاور لوم کا ایک ڈائریکٹریٹ بھی قائم کیا جا چکا ہے جو صوبہ کی اس گھریلو صنعت کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا۔ وزیر صنعت شری اصطفیٰ حسین نے ۴ نومبر ۱۹۷۴ء کی ایک پریس کانفرنس میں اس بات کا بھی اعلان کیا ہے کہ یہ کارپوریشن تین اہم مرکزوں پر اپنے ڈپو قائم کرے گا جو مال کی نکاسی کا کام کریں گے۔

اس کے علاوہ بنکروں کے ہی مطالبے پر اس صنعت کے

زوال کے اسباب جاننے اور اس کی ترقی کے لیے مشورہ دینے کے لیے ریاستی سرکار نے رام سہائے کمیشن مقرر کیا تھا جس نے اپنی رپورٹ بھی پیش کر دی ہے۔ ریاستی سرکار نے چند باتوں کو چھوڑ کر اس کمیشن کی تمام تجاویز کو تسلیم کر لیا ہے اور انھیں پورا کرنے کا وعدہ کر چکی ہے۔

بنکروں کے مفاد، ترقی اور فروغ کے لیے سرکار نے ۱۹۷۲ء میں اس کا ایک ڈائرکٹریٹ قائم کیا ہے جس کا کام ہینڈ لوم اور ٹیکسٹائل صنعت اور اس کے صنعت کاروں اور بنکروں کی زبوں حالی دور کرنا، نیز ان کی معاشی، سماجی، تعلیمی صلاحیتوں کو بیدار کر کے خوش حالی اور خود اعتمادی سے ہمکنار کرنا ہے۔ انھیں مقاصد کی تکمیل اور حصول کے لیے مندرجہ ذیل طریق کار اپنائے گئے ہیں جو اس ڈائرکٹریٹ کا نصب العین ہے۔

(۱) بنکروں کو خوش اسلوبی سے مال تیار کرنے اور خود کار نظام کے لیے ان کو امداد باہمی انجمنوں میں منظم کرنا۔
(۲) بنکروں کی امداد باہمی انجمنوں کی مالی حالت کی اصلاح اور ان کے لیے بہتر روزگار کے ذرائع فراہم کرنا۔
(۳) جدید ڈیزائن اور عمدہ اقسام کے کپڑے بنانا۔
(۴) ہینڈ لوم کے کپڑوں کی فروخت کا اندرونِ ملک اور غیر ممالک میں بازار فراہم کرنے کا انتظام کرنا۔
(۵) بنکروں کے کمزور طبقوں کو ہر قسم کی امداد اور سہولت فراہم کرنا۔

ان تمام مقاصد کی تکمیل و حصول کے لیے اس ڈائرکٹریٹ میں مندرجہ ذیل شعبے ہیں:

(۱) ہینڈ لوم اسکیم (۲) پاور لوم اسکیم (۳) ٹیکسٹائل کنٹرول اسکیم (۴) اون و سوتی قالین انڈسٹری (۵) ٹیکسٹائل کوآپریٹیو سوسائٹی اسکیم۔

ریاست میں بنکروں کی ۲۲۹۸ امداد باہمی انجمنیں رجسٹرڈ کی جا چکی ہیں۔ ان سوسائٹیوں کو ریزرو بینک آف انڈیا سے رعایتی شرح سود پر قرض فراہم کر کے تیار شدہ مال کی رفتار تیز کی جا رہی ہے۔

گذشتہ تین سالوں میں بنکروں کی امداد باہمی انجمنوں کو رعایتی شرح سود پر جو قرض فراہم کیا گیا وہ درج ذیل ہے:

سال	ہزار روپے میں
۷۲ - ۱۹۷۱ء	۱۹۲۲
۷۳ - ۱۹۷۲ء	۱۵۰۷
۷۴ - ۱۹۷۳ء	۳۶۶۴

قومی بینکوں کے ذریعہ بنکروں کو انفرادی طور پر مالی امداد فراہم کی جا رہی ہے۔ گذشتہ تین سال میں اس اسکیم کے تحت تقریباً بارہ ہزار بنکروں کو امداد دی جا چکی ہے اور بینکوں سے اس کی مزید توسیع کی سفارش کی گئی ہے۔ بنکروں کی امداد و فلاح و بہبود کے لیے ڈائرکٹریٹ ہینڈ لوم اینڈ ٹیکسٹائل سے مندرجہ ذیل اسکیمیں کار فرما ہیں۔

(الف) امداد باہمی انجمنوں کو سہولتیں:
(۱) ہینڈ لوم کپڑے کے سیل ڈپو کھولنے کے لیے مالی امداد
(۲) منیجروں کی تقرری۔
(۳) رنگائی گھر کے قیام کے لیے مالی امداد۔
(۴) ہینڈ لوم کے کپڑوں کی فروخت پر چھوٹ۔
(۵) بنکروں کو امداد باہمی کے اصولوں اور صنعت کے تکنیکی طور طریق کی تربیت۔

(ب) دیگر مراعات اور سہولتیں:
(۱) ڈیزائن کے مراکز کا قیام
(۲) خام مال کی فراہمی
(۳) ٹیکسٹائل کوالٹی مارکنگ وغیرہ۔

۱۹۷۴ء میں لکھنؤ میں ریاست کے ہینڈ لوم کپڑوں کی دو نمائشیں منعقد کی گئیں۔ پہلی نمائش اپریل کے مہینے میں میونسپل کارپوریشن ہال میں اور دوسری نمائش جگہ کی تنگی کی وجہ سے قیصر باغ بارہ دری میں ۴ نومبر سے ۱۱ نومبر تک لگائی گئی تھی۔ یہ دونوں نمائشیں بے حد کامیاب ثابت ہوئیں اور ریاست کے ہینڈ لوم کپڑوں کی

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

نینی تال

دلکش آفریدی

۱
اے وادیٔ کہسار
شہزادیٔ کہسار
تو حسن کا شہکار ہے شہکار ہے شہکار
ہر رنگ کا چہرہ ہے کہ رخسار کنول کا
ہر پھول کا مکھڑا ہے کہ دیوان غزل کا
ہر سایے پہ ہوتا ہے گماں تاج محل کا
ہر ذرے کی تابش ہے کہ سورج کا ہے پندار
تو حسن کا شہکار ہے شہکار ہے شہکار

۲
اے وادیٔ کہسار
شہزادیٔ کہسار
کوئل کی صدائیں یہ پپیہے کی ملہاریں
سنگیت بجاتے ہوئے ساون کی پھواریں
تا حدِ نظر سبز درختوں کی قطاریں
اور سبز درختوں پہ پرندوں کی یہ چہکار
تو حسن کا شہکار ہے شہکار ہے شہکار

۳
اے وادیٔ کہسار
شہزادیٔ کہسار
خیّام کا نغمہ ہے کہ حافظ کا سخن ہے
چکبست کی مستی ہے کہ اقبال کا فن ہے
ٹیگور کی دھڑکن ہے کہ میرا کا بھجن ہے
غزلوں کا تغزل ہے کہ گیتوں کا ہے سنگھار
تو حسن کا شہکار ہے شہکار ہے شہکار

۴
اے وادیٔ کہسار
شہزادیٔ کہسار
یہ چائنا پیک اور ٹفن ٹاپ کا منظر
دیوی کا شوالہ یہ ہنومان کا مندر
مسجد کے یہ مینار یہ محراب یہ منبر
سڑکوں پہ تھرکتے ہوئے یہ پیکر انوار
تو حسن کا شہکار ہے شہکار ہے شہکار

۵
اے وادیٔ کہسار
شہزادیٔ کہسار
یہ بوٹ کلب، تاج ہے جمنا کے کنارے
یہ جھیل کا منظر یہ سفینوں کے طرارے
پانی میں نہاتے ہوئے چاند اور ستارے
رنگین فضاؤں میں یہ ملّاح کے ملہار
تو حسن کا شہکار ہے شہکار ہے شہکار

۶
اے وادیٔ کہسار
شہزادیٔ کہسار
ہر رنگ ہر اک روپ ہر اک حسن ہے موجود
ہر آنکھ ہے شاہد تو ہر اک جلوہ ہے مشہود
ہر چہرہ ہے آذر کا تراشا ہوا معبود
ہر اہلِ نظر ہے تری صورت کا پرستار
تو حسن کا شہکار ہے شہکار ہے شہکار

۷
اے وادیٔ کہسار
شہزادیٔ کہسار
منظر ترا پُرکیف ہے دلکش ہے حسیں ہے
تو ہند کے انمول خزانے کا نگیں ہے
تو خاک نشیں ہو کے بھی افلاک نشیں ہے
حیراں ہے تجھے دیکھ کے ہر صاحبِ افکار
تو حسن کا شہکار ہے شہکار ہے شہکار

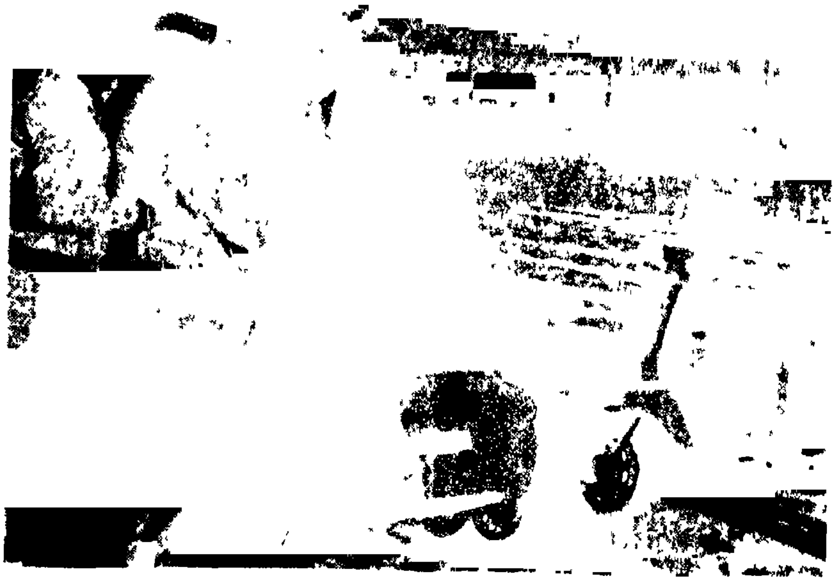
۸
اے وادیٔ کہسار
شہزادیٔ کہسار
تو ملکۂ کہسار ہے پربت کی ہے رانی
رقصاں ترے آنگن میں ہے فطرت کی جوانی
شملہ ہو کہ کشمیر نہیں ہے ترا ثانی
ہے ذکر سوری کا ترے سامنے بیکار
تو حسن کا شہکار ہے شہکار ہے شہکار
اے وادیٔ کہسار
شہزادیٔ کہسار



آج ہندستانی ہاکی ٹیم ۲۲ مارچ کو نئی دہلی میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے ان کی جائے رہائش پر ملاقات کو آئی۔ تصویر اسی موقع کی ہے

مرکزی وزیر تعلیم شری نورالحسن ۱۰ مارچ کو اجودھیا میں آثار قدیمہ
کی کھدائی کا معائنہ کرتے ہوئے
دائیں: کھدائی میں ملنے والی مختلف اشیاء









(دائیں اوپر) وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا ۳۱ مارچ کو عالمی ہاکی کپ
جیتنے والی ہندستانی ٹیم کے کھلاڑیوں کو لکھنؤ اسپورٹس اسٹیڈیم میں
اسکوٹر پیش کر رہے ہیں۔

(وسط میں) فاتح ہندستانی ٹیم کے کھلاڑی ۳۱ مارچ کو راج بھون میں گورنر
ا ریڈیتیں کے ساتھ

(نیچے دائیں جانب) فاتح ہندستانی ہاکی ٹیم کے اراکین اپنے اپنے اسکوٹروں پر سوار
دکھائی دے رہے ہیں

(نیچے بائیں) عالمی ہاکی کا طلائی کپ جیتنے والی ہندستانی ٹیم کو ۳۱ مارچ کو لکھنؤ نگر مہاپالیکا کے
زیر اہتمام شہریوں کی جانب سے دیے گئے استقبالیہ میں وزیر لوکل سلف شری جگدیش سرن
اگروال ٹیم کے کپتان شری اجیت پال سنگھ کو لکھنؤ چکن کے کپڑے پیش کرتے ہوئے۔







وزیراعلیٰ ۲۴ر مارچ کو تلک ہال میں معاز معین آفیسر تیری، ماکانت اومیاں کو اسٹیٹ ایوارڈ دیتے ہوئے

وزیراعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا ،ا ر مارچ کو آگرہ سے ا کیلومیٹر کے فاصلے پر رونہائی میں انڈین یوپی اسٹوریج
کارپوریشن کے زیراہتمام تعمیر کیے جانے والے ایک گودام کا افتتاح کر رہے ہیں



ہریش جتاب

(افسانہ)

پاکٹ مار

"ابے چھوکٹ میں ایک سگریٹ ہی پلا دے"! سیمے نے داری کو کندھا مار کر کہا۔

"سیمے! اپنے کنے تو آج ایک دمڑی بھی نہیں ہے۔ سالے اس شہر کے لوگ اب کچھ زیادہ سمجھدار ہو گئے ہیں ایک بچ گیا ہے ایک بھی شکار ہاتھ نہیں لگا۔ پانچ بسوں میں سوار ہو چکا ہوں۔ آٹھ دس بس اسٹینڈ بھی گھوم لیے ہیں۔ پانچ پانچ سو کے سوٹ اور ساڑیاں پہن کر گھروں سے نکلنے والے امیروں کے پرس میں بھی کنگھے شیشے اور لپ اسٹک کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ صبح ایک بابو کا بٹوا مارا تھا اس میں سے ایک لڑکی کی تصویر اور سوا روپے کا ٹکٹ نکلا ہے۔ اسے لے جا اگر کہیں بکتا ہے تو بیچ کر سگریٹ لے آ۔ ایک میرے لیے بھی لانا۔ بڑی طلب ہو رہی ہے۔"

"کل موٹی رقم ہاتھ لگی تھی نا؟" سیمے نے پوچھا "سالے اکل چھتیس روپے نکلے۔ آدھے کھاٹیوال لے گیا۔ جمعدار نے دیکھ لیا تھا اس کی بھی خدمت کرنا پڑی۔ راستے میں سنتو کھل گیا۔ کہنے لگا داری آج تو دارو ہو جائے۔ میں نے کہا کل دس روپے ہیں گھر میں بیوی انتظار کر رہی ہوگی۔ وہ کہنے لگا سالے تو کون سا لاٹ صاحب کے دفتر میں نوکر ہے جو بیوی تیری تنخواہ کا انتظار کر رہی ہے۔ گورو مہاراج کا مال ہے ان کے بندوں پر خرچ کر دے، گورو مہاراج اور دیں گے۔ چنانچہ کچھ سے ادھیا لیا مچھلی کے پکوڑے لیے او باغ میں بیٹھ کر تھوڑا شغل کر لیا۔ یہ سالا لچھو بھی بے ایمان ہو گیا ہے۔ شراب کی جگہ پانی رنگ کر دے دیتا ہے۔ ادھیا پی کر بھی برابر نشہ نہیں ہوا۔ ہاں رات بھر سینہ جلتا رہا۔ قے بھی ہوتی رہی۔ بیوی الگ گالیاں دیتی رہی۔ جی تو چاہا کہ سالی کو پیٹ ڈالوں پھر سوچا میں کون سا اسے تنخواہ کا چیک لا کر دیتا ہوں۔ گھر میں ایک دن عید تو دوسرے دن روزہ ہوتا ہے۔ کبھی روٹی ہے تو سالن نہیں اور سالن ہے تو آٹا نہیں۔ اس پر بھی وہ میری قے تک صاف کر دیتی ہے۔ پھر اس کے بچہ ہونے والا ہے۔ پٹائی پر اسے بھی چوٹ لگ سکتی تھی۔ جی چاہتا ہے کہ آج پولیس ہی میں رپورٹ کر دوں اور اس لچھو بدمعاش کو گرفتار کرا دوں سالا زہر کی بوتل پانچ روپے میں بیچتا ہے۔"

"داری اس میں لچھو کا بھی کیا قصور ہے۔ وہ کون گھر میں شراب نکالتا ہے۔ ادھر کا مال ادھر کرتا رہتا ہے۔ مال اچھا آگیا تو نشہ دے گیا اور خراب آگیا تو جان لے گیا۔ بول سگریٹ پلائے گا یا نہیں؟"

"سیمے! اگر شریف آدمی شریف آدمی کی بات پر یقین کر لیتا ہے تو ایک بدمعاش کو بھی دوسرے بدمعاش کی بات پر یقین کر لینا چاہیے۔ اس وقت تو جیب میں ایک پیسہ نہیں اگر شام تک کوئی مرغی پھنس گئی تو سگریٹ کیا دارو پلا دوں گا۔ بس اڈے پر بہت بھیڑ ہو رہی ہے۔ کوئی نہ کوئی مرغی ضرور پھنسے گی۔ تو اپنے اڈے پر چل۔ شام کو چھ ٹوٹی ملنا دارو پلاؤں گا۔"

بس آئی لوگ مکھیوں کی مانند اس پر ٹوٹ پڑے۔ داری نے ایک لالہ جی کی پاکٹ ماری اور دھکم پیل کرتا ہوا بس میں گھس گیا۔ بس چل دی بہت سے مسافر منھ دیکھتے رہ گئے جن میں وہ لالہ جی بھی تھے جن کی پاکٹ داری نے صاف کر دی تھی اور جو ایک اور شخص کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے کہ اس نے ان کی جیب میں ہاتھ ڈالا ہے۔

داری بس کی ایک سیٹ میں گھس کر بیٹھ گیا۔ سر نیچا کیے اور کوٹ کالر کو کھڑے۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں کسی سپاہی نے اسے دیکھ نہ لیا ہو اور کالر سے پکڑ کر کھڑا نہ کرے کہ نکال سالے بٹوا۔ بس میں بہت سے لوگ کھڑے بھی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی نے اُسے جیب کاٹتے دیکھ لیا ہو یا ہو سکتا ہے کہ ان لالہ جی کو پتہ چل گیا ہو کہ جیب کترا تو جیب صاف کر کے بس میں سوار ہو گیا ہے۔ اور وہ کسی اسکوٹر یا ٹیکسی میں سوار ہو کر اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ داری کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ سردی میں بھی پسینہ آ رہا تھا۔ وہ اگلے بس سٹاپ میں اترنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں پولیس والے اس کا پیچھا نہ کر رہے ہوں اور وہ کہیں مال گھر لے جانے کی بجائے حوالات نہ پہنچ جائے۔ لہٰذا وہ اس تعلقے کے حلقے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ بٹوہ بھاری تھا اس کی انگلیاں بٹوہ کھولنے کے لیے بیتاب ہو رہی تھیں۔ لیکن اس میں سب کے سامنے بٹوہ کھولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اگلے بس سٹاپ پر اس نے نظر گھما کر دیکھا۔ بہت سے مسافر بس میں کھڑے تھے۔ سب اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔

"ٹکٹ" کنڈکٹر نے داری کا کندھا ہلا کر پوچھا داری ڈر کر گھوما ہو گیا گویا کسی پولیس والے نے اسے پکڑ لیا ہو۔ کنڈکٹر کو دیکھ کر اس کے حواس بجا ہوئے مگر اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ اُسے کہاں جانا ہے۔ بس کے دروازے پر ایک سپاہی کھڑا اندر دیکھ رہا تھا۔

"بس کہاں جائے گی؟" داری نے کنڈکٹر سے پوچھا۔

"لوگوں کو دھکے دے کر سوار تو سب سے پہلے ہو گئے تھے اور اب یہ بھی پتہ نہیں کہ بس کہاں جائے گی؟"

"تو ناراض کیوں ہوتا ہے۔ جہاں تک بس جائے گی وہاں تک کا ٹکٹ دے دے۔" داری نے ہاتھ میں پکڑی پسینے میں شرابور اٹھنی کنڈکٹر کے ہاتھ میں تھما دی ہے۔

داری ٹکٹ لے کر بیٹھ گیا اور ادھر اُدھر کا جائزہ لینے لگا۔ دو نہایت خوبصورت لڑکیاں جن کی آنکھوں میں بڑے بڑے رنگین چشمے تھے جن کے جھولدار ریشمی لباس تتلی کے پروں کی مانند پھڑپھڑا رہے تھے اور جن کے کھلے بال ہوا سے اڑ اڑ کر ساری بس کو مہکا رہے تھے، بڑے اطمینان سے باتیں کر رہی تھیں۔ سرخ ہونٹوں سے خوبصورت ہنسی بکھیر رہی تھیں۔ وہ ایسے خوش تھیں گویا کہیں سے کوئی بڑی پاکٹ مار کر لائی ہوں۔ ایک سردار صاحب ہاتھ میں کتاب پکڑے اپنے آپ ہنستے چلے جا رہے تھے گویا کوئی بہت پُر لطف چٹکلہ پڑھ رہے ہوں۔ اس کے ساتھ کی دو سیٹوں پر بیٹھے دو آدمی لوہے کے بیوپاری تھے جو اسٹیشن سے لمبی چھڑ دانے جا رہے تھے اور بہت خوش تھے کہ ان کا مال آنے سے پہلے ہی بک گیا تھا۔ داری کے پاس ہی چھت سے لگے ہینڈل کو پکڑے ایک عورت پاس کھڑے ننھے بچے کو بہلا رہی تھی کہ وہ آج اسے ضرور سائیکل خرید دے گی۔ بس میں اور کتنے ہی لوگ تھے سب اپنے کاروبار میں مصروف لیکن داری کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ شاید بس میں وہی اکیلا شخص ہے جسے سردی میں بھی پسینہ آ رہا ہے جسے بس کے دروازے پر کھڑے سپاہی کا خوف کھائے جا رہا ہے۔ اس نے دروازے کی جانب دیکھا سپاہی اب بھی اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھٹ سے نظریں جھکا لیں اور جیب سے ایک سستا سا ناول نکال کر دیکھنے لگا۔ وہ بس سے اتر جانا چاہتا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ دروازے پر پہنچتے ہی سپاہی اس پر جھپٹ پڑے گا اور پرس چھین لے جائے گا۔

ناول دیکھتے دیکھتے داری کو اپنے الجھے ہوئے بالوں میں کوئی گدگدا سا ہاتھ الجھتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی سیٹ سے اگلی سیٹ پر ایک مرد اور عورت بیٹھے تھے۔ عورت کی گود میں ایک خوبصورت ننھا بچہ تھا جو سیٹ کی پشت کے ساتھ اس کی طرف منہ کیے کھڑا تھا اور اس کے الجھے ہوئے بالوں میں اپنا ہاتھ الجھا رہا تھا۔ بچے کے سرخ سرخ چہرے پر گول کالی آنکھیں کتنی خوبصورت تھیں اس کے سنہرے بال کیسے چمک رہے تھے۔ وہ اپنے گلابی ہونٹوں کو چپ چپا رہا تھا گویا کچھ کہنا چاہتا ہو مگر ہوں ہاں کے علاوہ کوئی لفظ منہ سے نہ نکال سکتا تھا۔ اس کی بھری بھری کلائیاں اور گورے گورے ہاتھ کتنے خوبصورت تھے۔ بچہ سیٹ کے ہینڈل کو پکڑے پکڑے کیسے اچھل رہا تھا کتنا خوش ہو رہا تھا گویا اسے دونوں جہان کی دولت مل گئی ہو اور دنیا میں کسی چیز کی پرواہ نہ ہو۔

اطمینان قلب کتنی بڑی چیز ہے خوشیوں کا کتنا بڑا خزانہ ہے۔ اس کی جیب میں جو بٹوا ہے اس میں نہ جانے کتنی رقم ہے لیکن وہ اسے تھامے ہوئے پسینہ پسینہ ہوا جا رہا ہے۔ انگلیاں کانپ رہی ہیں۔

آنکھیں سپاہی کو دیکھ کر چندھیا رہی ہیں۔ خون خشک ہو رہا ہے کہ شاید وہ لاجپی سکوٹر پر بس کا پیچھا کر رہے ہوں۔ اس بچے کے دونوں ہاتھ خالی ہیں لیکن جسم میں گویا خوشی کے پھوارے پھوٹ رہے ہوں۔ ٹانگوں میں خون اچھل رہا ہے۔ انگلیاں رقص کر رہی ہیں۔ بچہ اس کی جانب ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ داری نے اپنا گناہ آلود ہاتھ بچے کی جانب بڑھا دیا جو بچے نے پکڑ لیا جیسے سیاہ زمین پر کوئی سفید پھول کھل اٹھا ہو۔ کتنا پیارا لمس تھا بچے کے ہاتھ کا۔ داری کو وہ معصوم ہاتھ پکڑ کر اتنا لطف آیا کہ شاید بڑی سے بڑی رقم ہاتھ لگنے پر بھی نہ آیا ہو۔ بچہ ہوں ہاں کرتا تو داری بھی ویسے ہی جواب دیتا۔ بچہ ہنستا تو داری بھی ہنسنے لگتا۔ بچہ ہاتھ چھڑا کر داری کے ہاتھوں پر مارتا تو داری پھر اس کا ہاتھ تھام لیتا۔ اس پانچ دس منٹ کے کھیل میں داری کو بس میں سوار کسی شخص سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ بس کے دروازے میں کھڑے سپاہی کی موجودگی کو بھی بھول گیا اور بچے کی معصوم شرارت میں کھو گیا۔ ایک خیال اس کے دل و دماغ کو ہلا رہا تھا کہ اگر یہ اس کا ہی بچہ ہو تو کیا وہ اس کے ہاتھ میں جیب کاٹنے کا بلیڈ تھما دے گا۔

"نہیں نہیں؟" وہ کانپ اٹھا۔ جیسے اس نے تازہ اُگے پھول کو اکھاڑ کر نالی میں پھینکنے کی کوشش کی ہو۔ اور اس نے پھر دونوں ہتھیلیاں بچے کے سامنے پھیلا دیں جن پر وہ اپنے بھاری ہاتھ مارنے لگا۔ بچے نے چند ہی لمحوں میں اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ کیا وہ اس بچے کی مانند خوش نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر اس کے پاس کوئی مٹھائی ہوتی تو وہ بچے کے دونوں ہاتھ بھر دیتا۔

اتنے میں بس رک گئی۔ بہت سے مسافر اترنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ داری بھی ایک دم اٹھ کھڑا ہوا جیب سے بٹوا نکال کر بچے کے ہاتھ میں تھما دیا اور جلدی سے بس سے اتر گیا۔ کسی نے اسے دیکھا نہیں سپاہی نے اسے کچھ نہیں کہا۔ وہ سینہ تانے اس کے سامنے سے نکل گیا۔

شام چھوٹی پر سلیم داری کا منتظر تھا۔ "داری! آج تو موٹی رقم ہاتھ لگی ہے۔ آج تو انگریزی شراب ہو جائے استاد!"

"سلیم مال تو موٹا معلوم ہوتا تھا" داری سلیم کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا "مگر بس میں ایک اور جیب کترا مل گیا۔ سالا سب کچھ لوٹ کر لے گیا۔ اپنے توکل سے مٹھی میں مزدوری کرے گا۔

غزل ٭

عاصم بریلوی

قربت میں دھوپ بھی تھی خنک آب کی طرح
اب چاندنی جلاتی ہے تیزاب کی طرح

بخشے ہے روز زخم نیا جسم نیا مجھے
یہ زندگی بھی ہے مرے احباب کی طرح

اے تنگ دل زمانے نہ کل مل سکوں گا میں
رکھ مجھ کو آج گوہرِ نایاب کی طرح

شامِ فراقِ غم کے اندھیروں میں ہم نشین
یادیں ہیں تیری کرمکِ شب تاب کی طرح

کرنے کو الوداع تمھیں کر دیا مگر
دل کانپتا رہا مرا سیماب کی طرح

تنویرِ درد و غم نے نکھارا نہ ہو جسے
وہ زندگی ہے گوہرِ بے آب کی طرح

ترکِ تعلقات کا دل سوز حادثہ
سر سے مرے گزر گیا سیلاب کی طرح

عاصم وہ صبح، صبحِ محبت نہیں جسے
آنکھوں میں تیرتی ہے کسی خواب کی طرح

وجودِ آدمِ خاکی

سحر اعظمی

کبھی تو پھیل کے طوفانِ غم بنا ہوں میں
کبھی سمٹ کے دلوں میں سما گیا ہوں میں
کبھی یہ وہم کہ تحت الثریٰ کا قیدی ہوں
کبھی گماں کہ فلک بوس ہو رہا ہوں میں
کبھی یقین کہ ہوں بندگی سے رشتہ بپا
کبھی یہ وہم کہ بندہ نہیں خدا ہوں میں
کبھی یہ زعم کہ عرفانِ کن فکاں ہے مجھے
کبھی یقین کہ دھوکے میں مبتلا ہوں میں
کبھی یہ خوف کہ نام و نشاں نہ مٹ جائے
کبھی گماں کہ عالم پہ چھا رہا ہوں میں
کبھی یہ وہم کہ نقشِ بر آب ہے ہستی
کبھی خیال کہ فطرت کا مدعا ہوں میں
کبھی اجل نے دکھائی ہے منزلِ مقصود
کبھی حیات کی راہوں میں کھو گیا ہوں میں
کبھی قیودِ عناصر میں ہر جگہ موجود
کبھی حدودِ تصور سے ماورا ہوں میں
کبھی یہ وہم کہ پہلا قدم اٹھایا ہے
کبھی یقین کی منزل پہ آ گیا ہوں میں
کبھی ملال ہے اپنی شکستہ پائی کا
کبھی خوشی ہے کہ عالم کا رہنما ہوں میں
کبھی یہ غم کہ مرے آنسوؤں میں آب نہیں
کبھی گماں کہ ستاروں سے کھیلتا ہوں میں
کبھی یہ ناز کہ پتلا ہوں عقل و دانش کا
کبھی یہ وہم کہ دیوانہ ہو گیا ہوں میں
کبھی خزاں نے جگایا ہے خواب سے مجھ کو
کبھی بہار کے دامن میں سو گیا ہوں میں
کبھی لبوں پہ ہنسی آئی ہے دمِ گریہ
کبھی زراہِ تبسم تڑپ اٹھا ہوں میں
کبھی نسیمِ سحر بھی گئی ہے پژمردہ
کبھی سموم کے جھونکوں سے کھل گیا ہوں میں
کبھی ہوں شاد کہ ان کو خیال ہے میرا
کبھی یہ غم کہ نگاہوں سے گر گیا ہوں میں
وجودِ آدمِ خاکی بس اک معمہ ہے
سحرؔ میں خود بھی نہیں جانتا کہ کیا ہوں میں

سعید عارفی

غزل

دل میں جذبات کے طوفان چھپائے رکھیے
ضبط کو شیوۂ گفتار بنائے رکھیے

دل کا تاریک خرابہ کبھی منور ہوگا
زخمِ احساس کی لَو اور بڑھائے رکھیے

کٹ ہی جائے گا کسی طرح سفر صحراؤں کا
وادیٔ ذہن کو ہر وقت سجائے رکھیے

لاکھ سنگین سہی تیرہ شبی کا عالم
صبحِ امید کو ذہنوں میں بسائے رکھیے

دور تک پھیلے گا داغوں کے اُجالوں کا طلسم
اپنے خوابیدہ خیالوں کو جگائے رکھیے

آنکھ کے آئینے میں عکس نیا گر اُبھرے
اس کو غیروں کی نگاہوں سے بچائے رکھیے

دورِ نو بھی کوئی بازارِ معانی ہے سعید
مول پانا ہے تو الفاظ بچائے رکھیے

کہانی

عتوس امیر

فیصلہ

ستارہ بہت پریشان اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ پچھلی دو راتوں میں وہ ٹھیک سے سو بھی نہ سکی تھی، پھر آج شام تک تو اسے اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کرنا تھا۔ اس کے سامنے دو راستے تھے ان میں سے کوئی ایک راستہ اسے چننا تھا، وہ کس راستے کو اپنائے اس کا فیصلہ وہ ابھی تک نہیں کر پائی تھی۔ آہستہ آہستہ دوپہر ڈھل رہی تھی، پھر شام ہو جائیگی عرفان آجائے گا اور وہ اس سے اس کا فیصلہ پوچھے گا۔ وہ کیا جواب دے گی؟۔ اس نے تو ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا؟

گھر میں وہ اکیلی تھی۔ کوئی نہ تھا۔ اماں اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں گئی ہوئی تھیں، ابو جان دکان پر چلے گئے تھے۔ عرفان اپنے دفتر چلا گیا تھا۔ بس وہ اکیلی تھی۔ سارے گھر میں وہ پاگلوں کی طرح چکر لگاتی پھری، پھر تھک کر وہ اپنے کمرے میں آکر کوئی ناول پڑھنے بیٹھ گئی مگر ناول کے صفحات پر اسے دو چہرے ابھرتے دکھائی دیئے۔۔۔ یہ دونوں چہرے اس کے جانے پہچانے تھے، ان دونوں چہروں سے وہ خوب واقف تھی۔ اس نے گھبرا کر ناول ایک طرف پھینک دی۔

وہ کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ گلی میں سناٹا تھا اور سڑک دھوپ میں تپ رہی تھی، وہ غیر ارادی اور خالی نظروں سے سامنے والے درخت سے گرتے ہوئے پتوں کو دیکھتی رہی۔

اچانک اس کے کانوں میں گلی کے نیچے سے منہارن کی آواز سنائی دی۔

سہاگ کی نشانی رنگ برنگی چوڑیاں۔۔۔

بے اختیار ستارہ کی نگاہیں اپنی سونی کلائیوں پر چلی گئی۔ وہ سہاگن کہاں تھی؟۔ اس کا سہاگ تو ایک دن اچانک لٹ گیا تھا۔ یونہی دیکھتے دیکھتے۔۔۔ وہ بیوہ ہو گئی۔۔۔ اس کے دل پر چوٹ سی لگی، وہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔۔۔۔ ماضی کی یادوں نے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر دیئے۔۔۔۔۔ آہستہ آہستہ وہ پرانی یادوں کے کھنڈروں میں پہنچ گئی،۔۔۔۔۔

ستارہ کو یاد آیا وہ دن ــــ جب اس کی کلائیوں میں رنگ برنگی چوڑیاں موجود تھیں۔ اور کوئی اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے چومتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شرارت سے مسکراتا تھا اور شرما کر اس کے چوڑے چکلے سینے میں اپنا چہرہ چھپا لیتی تھی اور وہ تھا اس کا شوہر خالد ـــ کتنا خوبرو اور خوبصورت تھا وہ ـــ ستارہ نے خالد کو پاکر جیسے دنیا پالی۔ ادھر خالد بھی ستارہ جیسی بیوی پاکر اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا تھا، دیکھنے والے دونوں کی جوڑی دیکھ کر تعریف کرتے ہوئے نہ تھکتے۔ سارا گھر خوشیوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ ستارہ کو جیسا ہنس مکھ اور چاہنے والا شوہر ملا تھا، ویسا ہی ہنس مکھ اور پیار کرنے والا دیور بھی۔۔۔۔۔ عرفان دن بھر اسے چھیڑتا رہتا۔ اور زندگی بھر وہ بھائی کے جس انمول پیار کے لیے ترسی تھی، عرفان کو پاکر اس نے اس پیار کو بھی پا لیا تھا۔ ہر وقت سارے گھر میں عرفان، خالد اور اس کے قہقہے گونجتے رہتے تھے۔

خالد کبھی کبھی خوش ہو کر کہا کرتا تھا، ہم لوگ کتنے خوش قسمت ہیں، ہمارا یہ گھر جنت سے کم نہیں؛ اور ستارہ مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیتی تھی۔ دو سال یونہی گذر گئے، پلک جھپکتے۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلا، خوشی کے لمحات کتنی جلدی گزر جاتے ہیں۔ اچانک اس گھر کو کسی کی نظر کھا گئی۔ قدرت کو اتنی

خوشی برداشت نہ ہوئی اور ..... ایک ہفتہ بیمار رہ کر۔ خالد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ستارہ کو چھوڑ کر چلا گیا! ..... ابھی ان کے پیار کے آنگن میں کوئی ستارہ بھی نہ چمکا تھا! ... پھر یہ اندھیری اماوس کی تاریک رات کہاں سے آگئی؟ کہرام مچ گیا اور سارے گھر میں۔ اماں کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ ... عرفان بچوں کی طرح رو پڑا۔ اور ستارہ ... اس کی تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ اس کی کائنات لٹ گئی تھی ـــ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ ستارہ کو یقین بھی نہ آتا تھا۔ سب نے اسے تسلی دی، اس کی ڈھارس بندھائی مگر جو اپنا سب کچھ ہار چکی ہو، اسے بھلا یہ تسلیاں اور ڈھارس کیا دے سکتی تھیں۔

اور پھر ستارہ کو وہ دل خراش منظر بھی یاد آیا۔ جب خالد کا جنازہ باہر جانے کے لیے تیار تھا، وہ تڑپ اٹھی تھی۔ ... جو کبھی اسے دلھن بنا کر ہمیشہ کے لیے اس گھر کے اندر لایا تھا۔ آج خود ہمیشہ کے لیے اس گھر سے باہر جا رہا تھا ..... خالد۔ دفن کر دیا گیا ہزاروں سیر مٹی کے نیچے۔ اور ستارہ، اس کے پاس صرف آنسو اور چیخیں رہ گئیں۔ وہ روتی رہتی اور روتے روتے بے ہوش ہو جاتی۔

اور تب سے چوڑیاں پہننے کا حق ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو چکی تھی!

چالیسواں ہوا۔ گھر رشتہ داروں سے بھر گیا۔ سب نے خالد کو یاد کم کیا مگر کھایا خوب پیٹ بھر کر ـــ گھر کے اوپر چھائی ہوئی اداسی اور غم کی چادر آہستہ آہستہ سمٹنے لگی تھی۔ عرفان بھی اب ادھر ادھر گھومنے جانے لگا تھا ـــ مگر ستارہ ـــ اس کا غم کبھی دور ہو سکتا تھا؟ ـــ وہ کیسے بھول جائے ..... وہ ہر وقت روتی رہتی، یا پھر سونی آنکھوں سے میز پر رکھی ہوئی خالد کی تصویر کو دیکھتی رہتی اور ماضی کی حسین یادوں کو جمع کرتی رہتی۔

آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھر کے کام بھی چلنے لگے۔ جیسے خالد کا یہاں وجود ہی نہ تھا۔ بس اس کی اتنی ہی یاد رہ گئی تھی جیسے کبھی کوئی مہمان کچھ دنوں کے لیے رہے اور چلا جائے اور اس کی یاد باقی رہ جائے ـــ ستارہ کو بھی کام کرنے پڑتے، مگر اس کا دل سسکتا رہتا۔ وہ کام کرتے وقت بھی کھوئی کھوئی سی رہتی۔ کوئی نہ کوئی غلطی کر بیٹھتی، کبھی چائے میں چینی ڈالنا بھول جاتی اور کبھی سالن میں نمک رہ جاتا۔

اماں بڑبڑاتیں ـــ ایسے کہیں گھر کا کام ہوتا ہے دلھن .... تجھے کیا ہو گیا ہے؟ ۔ عرفان دن بھر کا تھکا ہارا دفتر سے آتا ہے، آخر اسے ڈھنگ کا کھانا بھی نہ ملے گا تو وہ کام کیسے کرے گا؟۔

ستارہ سوچتی، وہ اماں کو کیسے بتائے کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ ـــ خالد کے مرنے سے وہ ایک زندہ لاش بن کر رہ گئی تھی۔ اس سے غلطیاں ہوتی ہیں، اس میں اس کا کیا قصور، اسے اپنے آپ پر قابو ہی کہاں رہا ہے، مگر اسے سمجھتا کون ہے؟ پھر آہستہ آہستہ ستارہ محسوس کرنے لگی کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اماں جی کا برتاؤ اس کے ساتھ اچھا نہ رہا۔ اب وہ پہلے کی طرح ان کی لاڈلی بہو نہیں رہ گئی تھی۔ پڑوسنوں اور دوسری عورتوں سے وہ اسے منحوس اور ڈائن تک کہنے لگی تھیں۔ لیکن عرفان کا برتاؤ ضرور پہلے جیسا تھا۔ وہ اب اپنی بھابی کا پہلے کی طرح خیال رکھتا تھا۔ وہ ہر وقت اسے سمجھاتا رہتا اور خوش رہنے کے لیے کہا کرتا۔ وہ کہتا، بھابی اتنا غم کروگی تو کیسے جیو گی؟ ۔ اور پھر بھیا کی روح کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی، جب وہ تمہیں اتنا دکھی پاتے ہوں گے! ۔ بھابی تم ان کی امانت ہو ہمارے پاس اور میرے رہتے ہوئے تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ مگر خدا کے لیے اب یہ غموں کا بوجھا چھوڑ دو!

ستارہ کہہ دیتی، ..... عرفان ایک تمہارا پیار ہی مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے ورنہ . . . پھر میں انہیں کیسے بھلا دوں؟ ـــ ستارہ اپنے دل کو کافی سمجھاتی مگر دل کہاں مانتا ہے، . . . خالد دنیا سے چلا گیا تھا مگر ستارہ کے دل سے کیسے جا سکتا تھا۔ ایک دم نیچے دروازے کی کنڈی زور سے بجی!۔

ستارہ چونک پڑی ـ کیا اماں لوٹ آئیں؟ ـــ اس نے سوچا نیچے آئی وہ سیڑھیاں اتر کر۔ دروازہ کھولا۔ دھوبن تھی ـــ دھلے کپڑے لائی تھی۔ ستارہ نے کپڑوں کی کاپی نکال کر کپڑے ملائے۔ پھر ان کو ہر ایک کے ٹرنک میں رکھ دیا۔ پھر بولی، اماں کہیں گئی ہیں، پیسے وہی دیں گی، کل آنا ـــ

دھوبن چلی گئی ـــ ستارہ دروازہ بند کر کے پھر اوپر کمرے میں آگئی ـــ کھڑکی کے پاس آکر وہ پھر کھڑی ہو گئی ـــ منہارن اب چلی گئی تھی۔ ستارہ جا کر اپنے بستر پر لیٹ گئی، کروٹ بدلی تو اس کی نظریں سامنے میز پر رکھے خالد کے فوٹو پر جم گئیں ـــ پھر ایک دن کی بات

ستارہ کو یاد آگئی۔ اس دن عرفان اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے چلا گیا تھا ستارہ کو اس دن صبح سے ہی خالد کی بے حد یاد آ رہی تھی، جیسے تیسے کر کے اس نے گھر کا کام ختم کیا اور پھر اپنے کمرے میں آ کر وہ خالد کی تصویر کو سینے سے لگا کر کافی دیر تک روتی رہی تھی۔ بہت دیر تک اس کے آنسو نہیں تھمے۔ ایک بار اماں اوپر آئیں، اسے روتا دیکھ کر وہ ہمدردی کرنے کے بجائے بگڑ گئیں، انھوں نے ستارہ کو خوب ڈانٹا ..... کہا تھا ہر وقت روتی رہتی ہو آخر اب اور کیا کرے گی ... کیا اور کچھ باقی رہ گیا ہے؟۔ ستارہ کے دل پر جیسے تیر لگ گیا۔ اس نے آنسو پونچھ لیے تھے مگر دل ہی دل میں ایک بھیانک فیصلہ کر لیا تھا! — خودکشی کرنے کا فیصلہ۔!!

اور اسی رات کمرے کا دروازہ بند کر کے چھت میں رسی لٹکا کر اس نے خالد کے فوٹو کے سامنے کہا تھا خالد، میں بھی تمھارے پاس آ رہی ہوں، ...... تمھارے بغیر اب اس دنیا میں میرا گزارہ نہیں ہو سکتا ہے — تم چلے گئے تو یہاں سب غیر بن گئے ... اس گھر میں اب میرے لیے پیار نہیں، صرف نفرت ہے، گہری نفرت!!

فوٹو میں خالد جیسے مسکرا اٹھا تھا، جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ پگلی یہ کیا پاگل پن کر رہی ہو؟ — بھول گئیں کہ میں خودکشی کو کتنا برا سمجھتا تھا پھر میں تم سے دور کہاں ہوں، ... ہمیشہ تمہارے پاس ہی ہوں۔

اور ستارہ کشمکش میں پڑ گئی تھی۔ اور تب ہی نیچے سے عرفان کی آواز آئی تھی، بھابی، بھابی ذرا نیچے تو آؤ اور ستارہ کچھ دیر تک عرفان کی پکار کا کوئی جواب نہ دے پائی تھی — عرفان نے ایک دو آوازیں اور لگائیں پھر کوئی جواب نہ پا کر وہ اوپر آ گیا تھا۔ اس نے دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔ بھابی دروازہ کھولو ..... اور پھر ستارہ نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اور اندر آ کر جب عرفان کی نظر رسی پر پڑی تو وہ بولا"، ارے بھابی یہ کیا کر رہی تھیں؟"۔ ستارہ خاموش کھڑی تھی۔ مجرم کی طرح — وہ کیا جواب دیتی؟۔

تم مجھے چھوڑ کر کیوں جانا چاہتی تھیں بھابی! — عرفان نے کہا تھا۔ بھیا تو چلے گئے، اب تم بھی چلی جانا چاہتی ہو! — مجھے بتاؤ، کیا بات ہے! — کیا اماں نے تم سے آج کچھ کہہ دیا۔

نہیں عرفان بھیا — بس ایسے ہی آج ان کی یاد آگئی، اب دل نہیں لگتا ... میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی! آج سوچا ان کے پاس ہی چلی جاؤں گر ...

وہ تو خیریت ہوئی، میرا دل چائے پینے کو چاہ رہا تھا اور میں تمھیں پکار بیٹھا، ورنہ ... اف کیا ہو جاتا؟ —

عرفان ایک لمحہ رک کر پھر بولا۔ بھابی اگر آیندہ تم نے اس قسم کی بات بھی سوچی تو میں بھی اپنی جان دے دوں گا؟

آگے بڑھ کر اس کے منھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ستارہ نے کہا تھا، ایسی بری بات منھ سے نہ نکالو عرفان! —

میں اب ایسی کوئی بات نہیں سوچوں گی، چلو میں تمہارے لیے چائے بنا دوں۔

اور عرفان کے منع کرنے کے باوجود ستارہ نے چائے بنا کر اسے پلائی تھی۔

ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا ستارہ کے گالوں کے پیار کرتا ہوا گزر گیا — ستارہ چونک پڑی، اس نے دیکھا، دیکھتے دیکھتے کھڑکی سے باہر آسمان پر گہرے بادل چھا گئے تھے، ہوا میں خنکی پیدا ہو گئی تھی، شاید کچھ دیر میں بارش بھی ہو جائے۔ وہ پھر اپنے خیالوں میں کھو گئی، چار مہینہ پہلے اپنی بیماری کی بات اسے یاد آگئی۔

شام کا وقت تھا، اس نے ہانڈی چڑھائی تھی کہ اچانک اسے کپکپی لگنے لگی تھی، زور سے چکر آنے لگے تھے — اور پھر اماں سے یہ کہہ کر کہ اس کی طبیعت خراب ہو رہی ہے وہ اوپر جا رہی ہے لیٹنے کے لیے، اوپر کمرے میں چلی آئی تھی — اماں بڑبڑانے لگیں۔ رانی جی کے نخرے تو دیکھو، ذرا سی طبیعت خراب ہوئی اور لیٹنے کو بھاگتی ہے، ارے ہم نے کبھی بیماری میں کام کیا ہے؟ تقدیر اتنی خراب ہے اور ناز و نخرے اس قدر ہیں، میری تو جان آفت میں ہے! اور جانے کیا کیا .....

اب اماں کو بڑبڑاتے کافی دیر ہو گئی تو اس نے جواب دینے کے بجائے چپ چاپ نیچے آ کر دوبارہ کام کرنا شروع کر دیا تھا، تب ہی عرفان آگیا تھا۔ وہ اماں سے الجھ پڑا۔ بھابی کے دکھی دل کو اپنی باتوں سے اور دکھی کیوں کرتی رہتی ہو تم! — خبردار بھابی سے اب تم نے کچھ کہا ...... ورنہ ...

اور اتنا کہہ کر عرفان نے اس کو زبردستی باورچی خانے سے اٹھا کر اوپر بھیج دیا تھا ۔۔۔ ستارہ عرفان کی ضد پر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی تھی اور ۔۔۔ عرفان ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا تھا۔

اور پھر تین ہفتہ تک ستارہ کا بخار نہیں اترا تھا۔

بیماری کے دوران عرفان نے اس کی پوری دیکھ بھال کی تھی، اس کی ہر بات کا خیال رکھا تھا، صبح شام وہ اس کے پاس ہی رہتا۔ رات کو بھی وہ کافی رات گئے اس کے پاس سے اٹھ کر جاتا تھا، پھل، دودھ وہ روز لاتا، طرح طرح سے اس کا دل بہلاتا کئی دن تک وہ دفتر بھی نہیں گیا تھا۔ جب ستارہ کے سر میں درد زیادہ ہوتا تو وہ ہی سر دابتا ۔۔۔ پہلے تو ستارہ جھجکی تھی لیکن پھر عرفان نے اپنی قسم کھلا کر اسے خاموش کر دیا تھا۔ ستارہ کی طبیعت جب زیادہ خراب ہوئی تو اس نے سوچا، اچھا ہے وہ چل ہی بسے ۔۔۔ اسے نجات تو مل جائے گی۔ مگر قدرت کو یہ منظور کہاں تھا۔؟ پھر ستارہ کی طبیعت دھیرے دھیرے اچھی ہونے لگی ۔۔۔ پھر وہ چلنے پھرنے لگی، پھر گھر کا کام کاج کرنے لگی۔ عرفان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بھی دوبارہ لوٹ آئی ۔۔۔ ادھر عرفان نے اس کی بیماری کے دوران جس طرح تیمارداری کی تھی اس کی وجہ سے وہ بھی عرفان کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگی ۔۔۔ ادھر اماں بھی اب زیادہ تر خاموش ہی رہتیں۔

دن گزرتے رہے ۔۔۔ دو ماہ بعد اچانک عرفان بیمار پڑ گیا۔ دوپہر کو وہ دفتر سے جلدی چلا آیا، پھر لیٹ گیا ۔۔۔ شام تک اسے کافی تیز بخار ہو گیا، اماں پریشان ہو گئیں، ستارہ بھی فکر مند ہو گئی تھی ۔۔۔

شام کو اماں محلہ کے ہی ایک ڈاکٹر کو بلا لائیں، ڈاکٹر نے دیکھا اور کہا ملیریا ہے زیادہ فکر کی بات نہیں ۔۔۔ دوا بھی دیدی اس نے۔

اب عرفان کی دیکھ بھال کا کام ستارہ کے کندھوں پر آ پڑا۔ اس نے دل سے عرفان کی دیکھ بھال کی۔ وقت پر دوا دینا اور اس کے کھانے پینے کا خیال رکھنا ۔۔۔ رات، رات بھر وہ عرفان کے سرہانے بیٹھی رہتی۔ ایک رات عرفان کے سر میں شدید درد اٹھا، اس نے ستارہ سے کہا ۔۔۔ بھابی سر پھٹا جا رہا ہے ۔۔۔ ستارہ بام لے آئی، اور ماتھے پر لگا کر وہ کافی دیر تک اس کا سر دابتی رہی جب عرفان سو گیا تو ستارہ نے سر دابنا بند کر دیا ۔۔۔ پھر وہ بھی اپنے بستر پر جا کر سو گئی۔ دوسرے دن جب اماں دوا لینے گئیں تو عرفان نے ستارہ سے پوچھا، بھابی تم میری اتنی خدمت کیوں کرتی ہو؟ ۔۔۔

تم نے کیوں کی تھی میری خدمت؟ ۔۔۔ اس نے کہا تھا ۔۔۔

وہ میرا فرض تھا ۔۔۔ عرفان بولا ۔۔۔ یہ بھی میرا فرض ہے، ستارہ نے جواب دیا تھا ۔۔۔

ایک ہفتہ بعد عرفان اچھا ہو گیا لیکن کافی کمزور ہو گیا تھا ۔۔۔ دو دن تک ستارہ نے ضد کر کے اسے دفتر نہیں جانے دیا ۔۔۔ پھر وہ دفتر بھی جانے لگا۔ ستارہ کے لیے اس کے دل میں عقیدت اور بڑھ گئی۔

ٹن، ٹن، ٹن، ٹن ۔۔۔ نیچے دیوار کی گھڑی نے چار بجائے۔ ستارہ چونک پڑی۔ سوا پانچ بجے عرفان آ جائے گا، اسے شام کی چائے بھی تو بنانی ہے ۔۔۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ وہ عرفان کو کیا جواب دے گی ۔۔۔ اس نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا ۔ ۔ ۔ ۔ پرسوں شام سے عرفان نے اسے عجیب الجھن میں پھنسا دیا تھا ۔۔۔ عرفان نے جو کچھ کہا تھا، اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا ۔۔۔ اماں محلہ میں کہیں گئی ہوئی تھیں۔ عرفان چائے پی کر باہر چلا گیا، واپس آیا تو گھر میں اکیلی تھی، عرفان نے پوچھا ۔۔۔

"اماں کہاں گئیں ہیں؟ ۔۔۔ شاید حسین بوا کے گھر ہوں۔ اس نے جواب دیا ۔۔۔ پھر رات ہونے لگی مگر اماں واپس نہیں آئیں۔ اس نے عرفان سے کہا، تم کھانا کھا لو، میں اماں کے ساتھ کھا لوں گی۔

ٹھہرو بھابی، ۔۔۔ عرفان نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ تنہائی ہو تو تم سے کچھ کہوں؟ ۔۔۔

کیا بات ہے، ستارہ ہنس کر بولی، کیا اپنی شادی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟ ۔۔۔ کیا کوئی لڑکی پسند کر لی ہے؟ ۔۔۔

ہاں ۔۔۔ عرفان بولا ۔۔۔ میں نے ایک لڑکی پسند کر لی ہے، لیکن بھابی، وہ بیوہ ہے، ۔ ۔ ۔ عین جوانی میں بیچاری بیوہ ہو گئی ۔۔۔ مگر بھابی، آجکل تو نوجوان بیواؤں سے شادی کرنا اچھا سمجھا جاتا ہے۔

... بولو تمھاری کیا رائے ہے؟ ــــ

ستارہ کا دل دھک سے رہ گیا، ... ایک نامعلوم اندیشہ اس کے ذہن میں کلبلانے لگا ــــ اس نے عرفان کی طرف دیکھا۔ مگر عرفان کے چہرے سے وہ کچھ نہ پڑھ سکی۔ پھر وہ آہستہ سے بولی ــــ کون ہے وہ لڑکی؟ ــــ

"تم ــــ" عرفان شاید اپنی پوری جرأت یکجا کر کے یہ ایک لفظ منہ سے نکال سکا تھا ــــ

عرفان ــــ ستارہ چیخ پڑی۔

ارے بھابی سنو تو ...... ــــ!

مجھے کچھ نہیں سننا ــــ یہ خیال تمھارے دل میں آیا کیسے؟

اف عرفان تم کو کیا ہو گیا؟ ــــ

بھابی ــــ عرفان اس عرصہ میں خود کو سنبھال چکا تھا ــــ میری بات سن لو بھابی، پھر جو چاہے کہہ لینا ــــ بھیا تمھیں خوش دیکھنا چاہتے تھے، آجکل جو دکھ اور غم تم اٹھا رہی ہو، کیا بھیا کی روح اس سے خوش ہو گی، بالکل نہیں؟ ــــ اسی لیے بھابی ... میں صرف تمھارے ہونٹوں کی مسکراہٹ واپس لانے کے لیے، تمھاری زندگی سے دکھ اور درد کے یہ ہیبت سائے ہٹانے کے لیے اور تمھیں خوش دیکھنے کے لیے، تمھیں پھر سے سہاگن بنانا چاہتا ہوں۔

ستارہ کچھ نہ بولی ــــ وہ سسک پڑی تھی ــــ اس کے پرانے زخم تازہ ہو گئے تھے۔

بھابی یقین کرو، میں نہ تمھاری خوبصورتی سے متاثر ہوا ہوں اور نہ میرے دل میں تمھارے لیے کوئی گندے خیالات پیدا ہوئے ہیں۔ تم تو مریم کی طرح پاکیزہ اور مقدس ہو بھابی، تمھارے لیے میرے دل میں ایک پجاری کی طرح عقیدت بھری ہوئی ہے۔ لیکن اپنی اپنی موجودہ حالت میں رہتے ہوئے ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم دونوں کھل کر ایک دوسرے سے ہنس بول سکیں، کہیں آجا سکیں، گھوم سکیں۔ اس حالت میں ایسا کرنے پر دنیا ہم پر انگلیاں اٹھا سکتی ہے ــــ چاہے ہم دونوں کا رشتہ کتنا ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو، مگر دیکھنے والے کب مانیں گے؟ ــــ مجھے پرسوں شام تک سوچ کر جواب دو، مگر خوب غور کر لینا بھابی تمھارے دکھ اور غموں کا مداوا اب خود تمھارے ہاتھ میں ہے، ... تمھارے سامنے دو راستے ہیں۔ ... ایک کانٹوں سے بھرا ہے اور دوسرا پھولوں سے ..... اب تمھاری مرضی ہے کہ جو چاہے راستہ چن لو۔

اتنا کہہ کر عرفان چلا گیا تھا ــــ اور ستارہ ــــ وہ خاموش پڑی سسکتی رہی ــــ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی، ایک عجیب دوراہے پر اس کی زندگی آ کر کھڑی ہو گئی تھی ــــ اور آج اسے عرفان کو اپنا فیصلہ سنانا تھا۔

نیچے آ کر ستارہ نے آ کر آگ جلائی اور چائے بنانے کی تیاری کرنے لگی ــــ کام کرتے ہوئے بھی وہ سوچتی جا رہی تھی ــــ

سوا پانچ بجے عرفان نے کنڈی کھٹکھٹائی ــــ ستارہ نے دروازہ کھولا۔

عرفان نے ستارہ کی طرف غور سے دیکھا ــــ ستارہ کا ستا ہوا چہرہ، پریشان بال، ویران آنکھیں اس کی الجھن اور کش مکش کا راز فاش کر رہی تھیں ــــ مگر عرفان چپ چاپ اپنے کمرے میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔

ستارہ نے چائے تیار کی ــــ اور پھر اس نے عرفان کو آواز دی۔ ــــ عرفان آ کر چائے پینے لگا، وہ نظریں جھکائے ہوئے خاموشی سے چائے پی رہا تھا ــــ ادھر ستارہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی اور اطمینان صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اپنے لیے راہ منتخب کر چکی ہے ......"

اچانک عرفان نے سگریٹ سلگا کر ستارہ کی طرف دیکھا، پھر وہ آہستہ سے بولا ــــ بھابی تم نے اپنا فیصلہ نہیں بتایا؟ ــــ کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟

ستارہ ــــ نے عرفان کی طرف دیکھا اور پھر وہ چائے کے برتن سمیٹنے لگی، .... بھابی بتاتی کیوں نہیں تم ــــ؟ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ ــــ عرفان نے اب اس کی طرف جھک کر ذرا بلند آواز میں پوچھا ــــ

عرفان ــــ میں مجبور ہوں ــــ عورت زندگی میں اپنے دل پر

(باقی صفحہ ۱۴۱ پر)

شعور بریلوی

غزل

چارہ سازو مریضِ غم کی دوا کچھ بھی نہیں
دردِ فرقت میں تڑپنے کے سوا کچھ بھی نہیں

چاند تارے مرے حالات پہ کجلا سے گئے
کاسۂ شب میں مرے غم کے سوا کچھ بھی نہیں

میں نے سوچا تھا سنور جائے گی تقدیرِ حیات
ان کے غم نے بھی سنوارا پہ بنا کچھ بھی نہیں

ان سے اظہارِ محبت کو خطا کہہ لیجے
ورنہ اس دل کی تباہی کی بِنا کچھ بھی نہیں

آپ محجوب ہیں ناحق، مری بربادی پر
مجھ کو اس دل کی تباہی کا گِلہ کچھ بھی نہیں

آرزو اب کوئی دل میں ہے، نہ ارماں باقی
اک ترے غم کے علاوہ بہ خُدا کچھ بھی نہیں

دُور سناٹے میں آواز سُنی تھی جو شعور
اُن کی آواز کا دھوکہ ہوا، تھا کچھ بھی نہیں

عزیز مرادآبادی

میرے پیارے وطن
میرے نیارے وطن

تو ہے آزاد اب میرے پیارے وطن
اب فضاؤں میں تیری نہیں ہے گھٹن
گوشہ گوشہ بنا ہے مثالِ چمن
تیری دھرتی ہے باغِ اِرم اے وطن
چومتا ہے ہمالہ کو جھک کے گگن
میرے پیارے وطن، میرے نیارے وطن

جسم، بچپن، جوانی ہیں عطیے ترے
زر، جواہر بھی تو نے ہی مجھ کو دیے
راز میں نے ترقی کے تجھ سے لیے
اور نشاں منزلوں کے تجھی سے ملے
شکر کیسے ادا ہو ترا جانِ من
میرے پیارے وطن، میرے نیارے وطن

جان جب تک ہے تیری یہ بخشی ہوئی
تیری خدمت کروں بے خطر ہر گھڑی
سیم و زر کیا نچھاور کروں جان بھی
سرحدوں کا بنوں میں محافظ تری
سر سے مثلِ سپاہی میں باندھوں کفن
میرے پیارے وطن، میرے نیارے وطن

میرے اشعار میں نغمگی تجھ سے ہے
میرے اسلوب میں چاشنی تجھ سے ہے
میرے تخئیل کی زندگی تجھ سے ہے
میرے فن میں جو ہے پختگی تجھ سے ہے
تیری عظمت سے ہے عظمتِ علم و فن
میرے پیارے وطن، میرے نیارے وطن

میرے اشعار عکاسِ جمہور ہوں
اتحاد و اخوت سے معمور ہوں
احترامِ مذاہب کے دستور ہوں
دل کی تاریکیوں کے لیے نور ہوں
میرا ایسا ہو للّٰہ رنگِ سخن
میرے پیارے وطن، میرے نیارے وطن

اترپردیش بجٹ ۷۶-۱۹۷۵ء

وزیر مالیات شری نرائن دت تیواری نے ۱۲ مارچ ۱۹۷۵ء کو ریاستی اسمبلی میں ۷۶-۱۹۷۵ کا بجٹ پیش کیا۔ بجٹ میں ۱۹ کروڑ ۵۸ لاکھ روپے کے خسارے کے باوجود کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا گیا ہے بلکہ اس خسارے کو ٹیکسوں کی انتظامی مشینری کو بہتر بناکر سرکاری واجبات کی وصولی کو مؤثر بناکر اور سرکاری زمرے کے کارخانوں کو زیادہ منافع بخش بناکر پورا کیا جائے گا۔ بجٹ کی خاص خاص باتیں درج ذیل ہیں:

بجٹ کے ۱۹ کروڑ ۵۸ لاکھ روپے کے خسارے کو غیر منصوبہ جاتی اخراجات میں کمی، سرکاری واجبات کے بقائے کی موثر وصولی اور ٹیکسوں سے متعلق انتظامی مشینری کو بہتر بناکر سرکاری آمدنی میں اضافہ کرکے نیز سرکاری زمرے کے کارخانوں کو زیادہ منفعت بخش بناکر پورا کیا جائے گا۔

ملازمین کی فلاح وبہبود

یکم جون ۷۴ء سے مہنگائی بھتہ کی ایک مزید قسط حکومت ہند

بجٹ، ایک نظر میں

کروڑ روپے میں

	۷۵-۱۹۷۴ء نظر ثانی شدہ تخمینے	۷۶-۱۹۷۵ء بجٹ تخمینے
ابتدائی میزان	(-) ۲۸٫۴۱	(-) ۷۷٫۳۵
محاصل		
محاصل سے آمدنی	۷۰۳٫۹۹	۸۱۷٫۱۲
قرضوں سے محاصل (خالص)	۱۷۰٫۳۵	۲۲۶٫۴۶
قرضوں اور پیشگی رقومات سے وصولیابی	۵۰٫۸۹	۴۷٫۷۵
کل محاصل	۹۲۴٫۳۳	۱۰۹۱٫۳۳
اخراجات		
محاصل کے اخراجات	۶۸۳٫۳۱	۷۸۳٫۱۱
سرمایہ کے اخراجات	۱۵۹٫۱۱	۱۵۱٫۰۷
قرضوں اور پیشگی رقومات کی تقسیم	۱۶۲٫۸۶	۱۲۳٫۲۴
کل اخراجات	۱۰۰۵٫۳۸	۱۰۵۷٫۴۲
یکجا فنڈ میں خسارہ (-) یا فاضل (+)	(-) ۷۹٫۰۵	(+) ۳۳٫۹۱
اتفاقیہ مصارف فنڈ (خالص)	(-) ۹٫۴۳	——
پبلک اکاؤنٹ (خالص)	(+) ۳۶٫۵۴	(+) ۲۳٫۵۹
تمام لین دین کے خالص نتائج	(-) ۴۸٫۹۴	(+) ۵۷٫۵۰
اختتامی میزان	(-) ۷۷٫۳۵	(-) ۱۹٫۸۵

کے لازمی ڈپازٹ ایکٹ کی دفعات کی شرائط کے ساتھ منظور کی گئی ہے۔ یکم جون ۱۹۷۴ء سے یکم اپریل ۱۹۷۵ء تک کے بقائے کو ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ میں منتقل کردیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ریاستی خزانے پر ۱۶ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے کا بار پڑے گا۔

پنشن کے قواعد کو آسان بنادیا گیا ہے۔ پنشن کے استحقاق کے لیے ملازمت کی میعاد ۳۰ سال سے بڑھاکر ۳۳ سال کردی گئی ہے۔ پنشن کی شرح ۳۰/۸۰ سے بڑھاکر ۳۳/۸۰ کردی گئی ہے۔ موت اور سبکدوشی کی گریجویٹی کی زیادہ سے زیادہ حد تنخواہ کے پندرہ گنا سے بڑھاکر ۱۶½ گنا کردی گئی ہے۔ پنشن کی رقم کا حساب ۳۶ مہینوں کے بجائے ملازمت کے آخری ۱۲ مہینوں کی اوسط تنخواہ کی بنیاد پر لگایا جائے گا۔ مہینے کی آخری تاریخ سبکدوشی کی تاریخ تصور کی جائے گی۔

زراعت کو سب سے زیادہ اولیت دی گئی ہے کیونکہ یہ ہماری معیشت کی بنیاد بھی ہے اور اسی سے عوام کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے سلسلے میں ہماری صلاحیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ زراعت

اور اس سے متعلقہ کاموں کے لیے ۵۰.۰۴۸۳ لاکھ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ بجلی کے لیے جس پر زراعتی اور صنعتی پیداوار کا انحصار ہے ۱۰۱ کروڑ ۵۰، لاکھ روپے کی رقم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ آبپاشی کے لیے ۷۰ لاکھ ۲۰ لاکھ روپے کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ اس طرح زراعت، آبپاشی اور بجلی کے زمروں کے لیے مجموعی طور سے ۲۰۲ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے اس کے بعد صنعتی زمرہ رکھا گیا ہے جس کے لیے ۳۲ کروڑ ۶۶ لاکھ روپے کی رقم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کمزور طبقوں سے متعلق اسکیموں کی رفتار ترقی سست نہ ہونے پائے۔

ہنڈالکو کو ملنے والی بجلی کی شرح میں اضافہ

ہندستان المونیم کارپوریشن کو سپلائی کی جانے والی بجلی کی شرح دو پیسے فی یونٹ سے بڑھا کر ۵.۱۰ پیسے کر دی جائے گی۔ نئی شرحیں اوبرا تھرمل بجلی گھر اور ریہاند ہائیڈل کمپلکس کی پیداواری لاگت کی بنیاد پر مقرر کی گئی ہیں۔ اس طرح نظر ثانی شدہ شرحوں پر اتنی ہی بجلی کی فراہمی سے چار کروڑ ۵۵ لاکھ روپیہ وصول ہونگے جبکہ ۸۶ لاکھ ۲، ہزار روپے سالانہ وصول ہو رہے تھے۔ ہنڈالکو کو نظر ثانی شدہ شرحوں اور مزید ۳ میگاواٹ بجلی مہیا کی جائے گی تاکہ وہ اپنی پیداوار بڑھا سکے۔

زراعت

ریاست میں ۷۶-۱۹۷۵ء کے لیے غلہ کی پیداوار کا نشانہ ۲۱۲ لاکھ ٹن مقرر کیا گیا ہے۔ زمین کے تحفظ کے پروگراموں کے تحت مزید ایک لاکھ ۱۹ ہزار ہیکٹر کا رقبہ لایا جائے گا۔

× × ×

تحقیق تعلیم اور توسیع کے اقدامات کو مربوط بنانے کی غرض سے تاکہ زراعتی پیداوار کے سلسلے میں وہ زیادہ سے زیادہ موثر ثابت ہو سکیں، منتخب علاقوں میں زراعت کی بھرپور توسیع کے کاموں کی ذمہ داری زراعتی تعلیمی اداروں کو سپرد کی جائے گی۔ چنانچہ ان اداروں کو مالی امداد دینے کی غرض سے ۳۰ لاکھ روپے کا بندوبست کیا گیا تاکہ وہ پروگراموں کو بروئے کار لا سکیں۔

× × ×

وافر مقدار میں عمدہ قسم کے بیجوں کی پیداوار کا بندوبست کرنے کے لیے ترائی ترقیاتی کارپوریشن کے طرز پر کانپور اور فیض آباد کی زراعتی یونیورسٹیوں میں بھی کارپوریشن قائم کیے جائیں گے۔ اس کے لیے بجٹ میں ۲۰ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔

× × ×

ان چھ ضلعوں میں جو سوکھے سے متاثر رہتے ہیں مربوط منطقائی ترقیاتی پروگرام پر عمل درآمد کے لیے چار لاکھ چھ ہزار روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

آبپاشی

موجودہ آبپاشی اسکیموں کو جلد پورا کرنے پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ رام گنگا ذخیرہ آب مزید ۹۹ ہزار ہیکٹر رقبہ کو آبپاشی کی سہولتیں مہیا کرے گا۔ شاردا سہائک پراجکٹ کے دوسرے مرحلے کے تحت گھاگھرا سراج اور معاون نہر کے مکمل ہو جانے پر لکھیم پور کھیری، بارہ بنکی، سلطان پور، سیتاپور، فیض آباد اور اعظم گڑھ ضلعوں میں مزید ایک لاکھ ۲۳ ہزار ہیکٹر رقبہ کی سینچائی متوقع ہے۔ اسی طرح کوسی ذوہری پورہ پراجکٹ سے نینی تال اور رام پور ضلعوں میں مزید ۱۴۴۰ ہیکٹر رقبہ کو آبپاشی کی سہولتیں مہیا ہونگی اس کے علاوہ متعدد دیگر اسکیمیں بھی جزوی طور پر مکمل ہو جائیں گی جس کے نتیجہ میں مزید دو لاکھ ۹۴ ہزار ہیکٹر رقبہ کی آبپاشی کی جا سکے گی۔

× × ×

چھوٹی آبپاشی اسکیموں میں جن نامکمل کاموں کو اولیت دی جائے گی ان میں ان ٹیوب ویلوں تک جن کی ڈرلنگ ہو چکی ہے گولیں اور پائپ لائنیں تعمیر کرنے اور ٹیوب ویلوں کو بجلی مہیا کرنے کے کام شامل ہیں۔

بجلی

موجودہ بجلی گھروں سے زیادہ سے زیادہ بجلی پیدا کرنے کی غرض سے پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لیے ۱۰۱ کروڑ ۵۰، لاکھ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ پیداواری صلاحیت بڑھانے کے سلسلے میں اوبرا تھرمل توسیعی اسکیم کے پہلے مرحلہ سے (۱۰۰ میگاواٹ) جمنا اسکیم کے دوسرے مرحلہ چھبڑھ سے (۱۸۰ میگاواٹ)، کلہل اسکیم سے (۲۰ میگاواٹ) اور رام گنگا ہائیڈل اسکیم سے (۱۳۲ میگاواٹ) جملہ ۴۳۲ میگاواٹ مزید بجلی پیدا کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

صارفین کو بجلی مہیا کرنے کی غرض سے ۶۶ کے وی اور اس سے زیادہ کی ۱۱۱ سرکٹ کیلو میٹر لمبی ترسیلی لائنیں اور ۱۵ ہزار سرکٹ کیلو میٹر لمبی ثانوی ترسیلی لائنیں بچھائی جائیں گی۔

۹۰۰ مواضعات کو برقی روشنی اور ۵۵۰۰ ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو بجلی مہیا کی جائے گی۔

نگہداشت مویشیاں

مویشی دولت صنعتی کارپوریشن کو ابتدائی کاروباری سرمایہ کے طور پر ۲۵ لاکھ روپے کا قرض فراہم کیا جائے گا۔ سنٹرل ڈیری فارم کی ۴۷ لاکھ ۴۰ ہزار روپے کی موجودہ املاک، جس میں حکومت کا ۳۴ لاکھ ۳۳ ہزار روپے کا سرمایہ حصص شامل ہے، کارپوریشن کو منتقل کر دی جائے گی اور مزید ۱۲٫۰۷ لاکھ روپے کا قرض مہیا کیا جائے گا۔

ریاستی حکومت پریاگ، چترکوٹ کرشی گودھن وکاس نگم کو ۴۴ لاکھ روپیہ بطور سرمایہ حصص فراہم کرے گا۔ کارپوریشن چھوٹے کسانوں کی گایوں کی نسل کو بہتر بنانے کے لیے ۱۰۰ مرکز قائم کرنے کی تجویز رکھتا ہے۔

امداد باہمی

امداد باہمی سوسائٹیاں ۱۲۵ کروڑ روپے کے قرضے تقسیم کریں گی جس میں ۸۲ کروڑ کے قلیل مدت کے، ۵ کروڑ روپیہ کے درمیانی مدت کے اور ۳۸ کروڑ روپے کے طویل مدت کے قرضے شامل ہیں۔

تعلیم

غیر رسمی تعلیم کی ایک اسکیم شروع کی جائے گی جس کے تحت ۱۱ سے ۱۴ سال تک کی عمر کے ایسے بچوں کو جن کو وظائف نہیں ملتے ہیں یا جن بچوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا ہے ان کو تعلیم دینے کے لیے جز وقتی کلاس شروع کیے جائیں گے۔ اسی طرح کے کلاس ۱۵ سے ۲۵ سال کی عمر کے لڑکوں کے لیے کھولے جائیں گے۔

× × ×

ہائی اسکول درجات کے لیے دس ہزار اور انٹرمیڈیٹ درجات کے لیے پانچ ہزار ٹیچروں کو سائنس اور ریاضی کے نئے نصاب کی تربیت دی جائیگی۔

× × ×

ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے درجات کی ہندی نصابی کتابوں کو قومیایا جائے گا۔

× × ×

ثانوی تعلیم کی سطح پر پیشہ ورانہ تعلیم کی اسکیم شروع کی جائے گی۔

× × ×

چمبل گھاٹی کے ہتھیار ڈالنے والے ڈاکوؤں کے خاندانوں کے بچوں کو نیز ڈاکوؤں کے ستائے ہوئے خاندانوں کے بچوں کو ہر سطح پر تعلیم کی سہولت بہم پہنچانے کے لیے وظائف دیے جائیں گے۔

× × ×

ثانوی تعلیم کو قومیانے کے مسئلے پر مشورہ دینے کے لیے مقرر کی جانے والی کمیٹی کی رپورٹ پر حکومت غور کر رہی ہے۔

× × ×

امداد یافتہ ڈگری کالجوں کے عملے کو اپریل سے سرکاری ایجنسی کے ذریعہ تنخواہیں دینے کے لیے ایک بل پیش کیا جائے گا۔

میڈیکل اور صحت عامہ

۳۳ آیورویدک اسپتال اور ۳۰ ہومیوپیتھک ڈسپنسریاں دیہی علاقوں میں قائم کی جائیں گی۔ ضلع اور دوسرے سرکاری اسپتالوں میں مزید ۲۰۰ پلنگوں کا بندوبست کیا جائے گا۔ بچوں کے دو کلینک، دانتوں کے علاج کے دو کلینک، ہنگامی خدمات کے دو اور آرتھوپیڈک کے چار سیکشنوں کے کھولنے کی اسکیم زیر غور ہے۔

× × ×

پینے کے پانی کی سہولتیں مزید دو قصبوں اور ۷۸۰ مواضعات میں مہیا کی جائیں گی۔

مکانات

یو، پی ہاؤسنگ اور ڈولپمنٹ بورڈ کو زندگی بیمہ کارپوریشن سے ایک کروڑ دس لاکھ روپیہ کا قرض ملنے کی توقع ہے۔ ۲۳۰ نئے مکانات مکمل کیے جائیں گے۔

پچاس لاکھ روپے کی رقم گندی بستیوں کے سدھار اور ماحول کی اصلاح و صفائی کی اسکیم کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔

× × ×

سماجی فلاح

خواتین امداد باہمی انجمنیں بنانے کے اقدامات کیے جائیں گے تاکہ خواتین اپنے خاندانوں کی آمدنی میں اضافہ کر سکیں۔

جسمانی طور پر معذور لوگوں کے لیے ایک لاکھ ۳ ہزار روپے کی رقم کا بندوبست وظائف اور مصنوعی اعضا اور آلات سماعت خریدنے کے لیے کیا گیا ہے۔ گونگوں اور بہروں کے اسکول کے معیار بلند کرنے کی بھی تجویز ہے۔

صنعت

ہینڈلوم اور پاورلوم مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن، لکھنؤ، کانپور اور دہلی میں اپنے سیلس ڈپو قائم کرے گا۔

× × ×

مجہول ہینڈلوم امداد باہمی انجمنوں کو توڑنے اور دوسری انجمنوں کی نو تنظیم کرکے انھیں سرگرم عمل بنانے کی تجویز ہے۔ ان انجمنوں کی نو تنظیم کا پروگرام وارانسی، بستی، اٹاوہ اور مرادآباد ضلعوں سے شروع کیا جائے گا۔

× × ×

اس بات کا جائزہ لینے کی بھی تجویز ہے کہ روایتی دستکاریوں کو ترقی دینے کے لیے ماہر کاریگروں کی خدمات سے کس حد تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے تاکہ نئی نسل ان کے فن، اور ان کی مہارت نیز جدید تکنیک سے مستفید ہو سکے۔

× × ×

توقع ہے کہ اسکوٹرس انڈیا لمیٹڈ دو پہیوں کے ...۶۰ اسکوٹر تیار کرے گا۔

× × ×

توقع ہے کہ پسماندہ ضلعوں میں مشترکہ زمروں کے نو صنعتی وحدوں میں سامان تیار ہونا شروع ہو جائے گا۔

کوشش یہ ہوگی کہ تین امداد باہمی شکر ملوں میں گنا پیرائی کا کام یقینی طور سے شروع ہو جائے۔

ہریجن فلاح و بہبود

اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کی ہمہ گیر ترقی کے لیے اتر پردیش اقوام و قبائل مندرجہ فہرست مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن قائم کیا جائے گا۔ کارپوریشن تمام اسکیموں کے لیے چار فیصد شرح سود پر قرضہ اور خصوصی اسکیموں کے لیے ۲۵ فیصد امداد دے گا۔

ہریجنوں کو چھوٹی صنعتیں قائم کرنے کی ترغیب دینے کے لیے ایک مخصوص سیل قائم کیا جائے گا۔

انجینیرنگ کالجوں میں داخلہ کے لیے ہریجن طالب علموں کو تربیت دینے کی غرض سے ایک مرکز کھولا جائے گا۔

اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے لڑکوں اور لڑکیوں کی مخصوص کوچنگ کا بندوبست کیا جائے گا تاکہ میڈیکل کالجوں میں محفوظ جگہوں کے لیے داخلہ کے واسطے ان میں ضروری اہلیت پیدا ہو جائے۔

تعلیم نسواں کی ہمت افزائی کے لیے پری میٹرک کلاسوں میں وظائف دیے جائیں گے۔

اقوام مندرجہ فہرست میں صنعتی سرگرمیوں کی توسیع کے لیے کارپوریشن قائم کیا جائے گا۔

اقوام مندرجہ فہرست کے طالب علموں کو وظائف کی منظوری اور فیس کی معافی کے سلسلے میں آمدنی کی حد ۲۵۰ روپے سے بڑھا کر ۵۰۰ روپے کر دی گئی ہے۔

روزگار کے مواقع

انجینیرنگ کے مختلف شعبوں کے گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ بے روزگار منتخب افراد کو وظائف کی بنیاد پر" روزگار کی دستیابی کے لیے بھرپور تربیت کے واسطے ۲۴ ۳ لاکھ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔

نوجوانوں کے لیے پروگرام

نوجوانوں کے لیے زیر عمل مختلف پروگراموں کو مربوط کرنے اور نوجوانوں اور طالب علموں کو اپنے وضع کردہ پروگراموں کو بروئے کار لانے کا موقع فراہم کرنے کے لیے اتر پردیش نوجوان کمیشن قائم کیا جائے گا۔

دیہی علاقوں میں بے روزگاری دور کرنے کے لیے انسانی طاقت کو استعمال کرنے سے متعلق نظامت سرکاری اسکیموں کو بروئے کار لانے کے مقصد سے بھرپور انسانی صلاحیت کو استعمال کرنے کے سلسلے پر غور کرے گی۔ اس سلسلے میں مختلف مدوں کے تحت ۵ کروڑ روپے مہیا

کرنے کی تجویز ہے ترقیاتی محکمے ان اسکیموں کی نشاندہی کریں گے جن پر انسانی طاقت کے استعمال سے متعلق پروگرام کے تحت عمل درآمد کیا جا سکتا ہے۔

لکھنؤ میں ایک کھیل کود کالج کھولا جائے گا جس میں نویں درجے سے بارہویں درجے تک پڑھنے والے ہونہار کھلاڑیوں کو داخلہ ملے گا اور ان کو عام مضامین کی تعلیم کے علاوہ کھیل کود کی بھرپور تربیت دی جائے گی۔ یہ کالج رہائشی ہوگا اور اس میں ۲۰۰ کھیل کود کا ذوق رکھنے والے طالب علموں کے داخلے کی گنجائش ہوگی۔

مزدوروں کی فلاح

مزدوروں کو طبی سہولت بہم پہنچانے کے لیے سو سو پلنگوں کے تین اسپتال اور پچاس پچاس پلنگوں کی چھ ڈسپنسریاں اور آٹھ دیہی ڈسپنسریاں قائم کی جائیں گی۔

× × ×

کم سے کم اجرت ایکٹ کا اطلاق آٹھ دیگر مندرجہ فہرست روزگاروں پر بھی ہوگا جن میں جنگلات اور عمارتی لکڑی، آیوروید اور یونانی مٹی کے برتن اور کاروباری ادارے شامل ہیں۔

بڑھتی ہوئی قیمتوں کے پیش نظر مزدوروں کو صحیح اجرت دلانے کے لیے قیمت اشاریہ کو مصارف زندگی کے بھتے سے مربوط کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ مزدوروں کی اجرت کی شرحوں کا معاملہ جن کاموں اور صنعتوں کے سلسلے میں حکومت کے زیر غور ہے ان میں زراعت، نجی پرنٹنگ پریس، چمڑے کا کام، چمڑے کی مصنوعات، چمڑا کمانا، بیکری، ہوٹل، ریسٹورنٹ، پتھر توڑنے کا کام، سڑکوں کی تعمیر، عمارتوں کی تعمیر اور نی، صابن اور تمباکو کی صنعتیں شامل ہیں۔

قومی یکجہتی

اردو ٹیچروں کی کمی کو دور کرنے کے لیے الہ آباد کے ایشور سرن آشرم میں اردو میں بی، ٹی، سی، تربیت کا بندوبست کیا گیا ہے۔

اردو ٹیچروں کے تقریباً ۱۸۱۶ تعلیمی اداروں کو ملنے والی امداد مزید پانچ لاکھ روپیہ کا بندوبست کر کے دوگنی کی جا رہی ہے۔

× × ×

متفرق

دیہی ترقیاتی فنڈ سے ۱۰ کروڑ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے اس میں آبپاشی کے لیے تین کروڑ روپیہ، دیہی علاقوں کو بجلی فراہم کرنے کے لیے ایک کروڑ روپیہ، گاؤں میں سڑکیں تعمیر کرنے کے لیے دو کروڑ روپیہ، دیہی ڈسپنسریوں کے لیے دو کروڑ روپیہ اور دیہی علاقوں میں پینے کا پانی فراہم کرنے کی اسکیموں کے لیے دو کروڑ روپیہ کی رقمیں شامل ہیں۔

شاردا سہاٹک اسکیم کے لیے ۳۵ کروڑ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔

گنڈک، رام گنگا اور شاردا سہاٹک کمانڈ علاقہ ترقیاتی کارپوریشن میں ۳۰ لاکھ روپیہ بطور سرمایہ حصص لگایا جائے گا۔

× × ×

گنا تحقیق و ترقیاتی فنڈ اور شکر فیکٹریوں کی بحالی جدید کاری اور قیام سے متعلق فنڈ کو منتقل کرنے اور اخراجات کے لیے بالترتیب ۱۶۱ لاکھ ۶۷ ہزار روپیہ اور ۱۷۳ لاکھ ۲۳ ہزار روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔

× × ×

ہندی جرنلسٹوں کی تنظیم کے لیے مالی امداد دینے کے واسطے ایک لاکھ روپیہ فراہم کیا گیا ہے۔

× × ×

ایک امداد باہمی بینک قائم کرنے کے لیے مالی امداد دی جائے گی۔

× × ×

غریب لوگوں کو مفت قانونی امداد مہیا کرنے کی غرض سے دو لاکھ روپیہ دیے جائیں گے۔

× × ×

انجمن ترقی اردو ہند، اترپردیش کو ۹۵ ہزار روپے کی مالی امداد دی گئی ہے اور اقبال صدی قومی تقریبات کمیٹی، نئی دہلی کو ۱۰ ہزار روپے بطور مالی امداد دئے جائیں گے۔

× × ×

ہندی گرنتھ اکاڈمی کو دو لاکھ روپیہ کی مالی امداد دی جائیگی۔

× × ×

مدر ٹیریسا کی زیرنگرانی مشنریز آف چیریٹی کو کوڑھ کے مریضوں اور دوسرے لاعلاج مریضوں کے لیے موہن لال گنج (ضلع لکھنؤ) میں ایک بحالی مرکز قائم کرنے کے لیے ایک لاکھ روپیہ کی مالی امداد دی جائے گی۔

× × ×

لکھنؤ، کانپور سڑک پر واقع نواب گنج جھیل کو ۴۴ لاکھ روپیہ کی مجموعی لاگت سے پرندوں کی پناہ گاہ اور سیاحوں کی تفریح گاہ کی حیثیت سے ترقی دی جائے گی۔

× × ×

مین پوری، بدایوں، فتح پور، ایٹہ، شاہ جہاں پور، لکھیم پور کھیری اور ہردوئی ضلعوں میں خصوصی ترقیاتی پروگرام شروع کیے جائیں گے۔

پھول پور کیمیاوی کھاد کارخانے کے لیے تین کروڑ روپیہ فراہم کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ادارہ جاتی سرمایہ

ریاست میں قومیائے گئے بینکوں کی ۸۰ نئی شاخیں کھلیں گی۔

چٹ فنڈ پر کنٹرول

چٹ فنڈ میں روپیہ جمع کرنے والوں کے مفاد کے تحفظ کے پیش نظر چٹ فنڈوں کو رجسٹرڈ کیا جائے گا اور ان کے کاروبار کو قانون کے ذریعہ منضبط کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں قانون ساز اسمبلی میں ایک چٹ فنڈ بل پیش کیا جائے گا۔

اسٹامپ اور رجسٹریشن

پمپنگ سیٹوں اور ٹیوب ویلوں کے لیے قرض حاصل کرنے کے واسطے تحریر کیے جانے والے رہن ناموں کے سلسلے میں چھوٹ کی حد دس ہزار روپیہ سے بڑھا کر ۲۰۰۰۰ روپیہ کر دی گئی ہے۔

چسپاں ہونے والے خصوصی اسٹامپ لگانے اور دس پیسے کے رسیدی ٹکٹوں کے اجراس کرنے کی سہولت مزید بارہ شہروں میں مہیا کی جائے گی۔ ان کے نام یہ ہیں۔ علی گڑھ، اٹاوہ، بریلی رائے بریلی، مرادآباد، سہارنپور، جھانسی، وارانسی، پوڑی (گڑھوال)، نینی تال، فیض آباد اور گورکھپور۔

سیلس ٹیکس کے قانون اور نظام میں تبدیلی

سیلز ٹیکس کے نام پر قیمتوں میں بے جا اضافہ کی روک تھام کے لیے سیلز ٹیکس کے ڈھانچے اور شرحوں میں جو نمایاں تبدیلیاں کی گئی ہیں ان سے بھی کھاتے کی پیچیدگیاں کم ہو جائیں گی اور ایماندار بیوپاریوں نیز صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

تمام اشیا اور سامان جن پر سنگل پوائنٹ ٹیکس اور ملٹی پوائنٹ سیلز ٹیکس عائد ہوتا تھا اسے بالکل ختم کر دیا گیا۔ تقریباً سات فی صد کی عام شرح سے سنگل پوائنٹ ٹیکس سبھی اشیا اور سامان پر عائد ہوگا۔

بکری ٹیکس کی تشخیص کے معاملے میں بیوپاری سے بکری ٹیکس کی شکل میں وصول کی گئی رقم کو اس کے کاروبار میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

چھوٹے بیوپاریوں کو راحت پہنچانے کی غرض سے قابل ٹیکس آمدنی کی کم سے کم حد ۱۲ ہزار روپے سے بڑھا کر ۲۵ ہزار روپیہ کر دی گئی ہے۔

تیل صنعت کی حوصلہ افزائی کے لیے تلہن پر بکری ٹیکس کی عام شرح ۳ فیصد سے گھٹا کر ۱ فی صد کر دی گئی ہے جو مزید ۱ فی صد شرح ٹیکس کو ملا کر ۲ فی صد ہوگی۔

بناسپتی کے کارخانہ داروں کو ۳۰ جون ۱۹۷۵ء تک خام مال پر ٹیکس سے چھوٹ دی گئی ہے۔

غلہ جس میں اناج اور دالیں شامل ہیں ٹیکس کی شرح ۴ فی صد سے گھٹا کر ۲.۵ فی صد کر دی گئی ہے۔

× × ×

تمام دھاتوں پر اب پہلی فروخت کے مرحلے پر ۲ فی صد کی شرح سے سنگل پوائنٹ ٹیکس عائد ہوگا۔

× × ×

زیورات اور جواہرات پر ٹیکس کی شرح ۴ فی صد سے گھٹا کر ۲ فی صد اور سونے یا چاندی کے دوسرے سامان پر ٹیکس کی شرح

ؤ فی صد سے گھٹا کر ۵ فی صد کر دی گئی ہے۔
گھریلو صنعتوں میں لگے ہوئے کاریگروں، جوتے کی صنعت، ہوزری صنعت، کرانا، کنفکشنری اور یارن کی تجارت وغیرہ کے لیے راحت مہیا کی گئی ہے۔

★

فیصلہ

(صفحہ ۴۳ کا بقیہ)

اختیار صرف ایک مرد کو دیتا ہے، اور اس کے مرنے کے بعد بھی عورت کا دل صرف اس کی محبت کا امین ہوتا ہے، میں ان کی امانت میں خیانت نہ کر سکوں گی۔ ... مجھے زندگی کے یہ دکھ ... اور یہ درد منظور ہیں۔ مگر میں جیتے جی، دوسری شادی نہیں کروں گی، مرد کی کوئی بات نہیں ہے۔ مگر عورت کے لیے دوسری شادی کرنا اب بھی سماجی طور پر اچھا نہیں سمجھا جاتا، دنیا کیا کہے گی۔؟ ــــ عورت کی ساری زندگی ایک دائرے میں پروان چڑھتی ہے، اور اسی دائرے میں ختم ہو جاتی ہے۔ میں اس دائرے سے باہر نہیں آنا چاہتی ــــ مجھے یہ اپنی سونی کلائیاں منظور ہیں مگر، زندگی کی کھوکھلی خوشیاں منظور نہیں ہیں۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں ــــ جیسے ایک بھابی اپنے دیور سے کرتی ہے، یہ پیار تمہارے لیے ہمیشہ میرے دل میں رہے گا ــــ جیسے بڑی بہن اپنے بھائی کو چاہتی ہے، میں بھی تمہیں چاہتی رہوں گی۔ اس سے زیادہ تم مجھ سے اور کچھ پانے کی کوشش نہ کرو۔"

اتنا کہہ کر ستارہ چائے کی پلیٹیں اور پیالیاں لے کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی ــــ اور عرفان بت کی طرح ... خاموش اسے دیکھتا رہا ــــ وہ سوچ رہا تھا کہ بھابی کتنی اٹل ہیں اور کتنی بلند، انھوں نے اپنے پیار کی خاطر اپنی زندگی کی ناؤ کو کنارے لگانے کے بجائے طوفان کے حوالے کر دیا تھا۔

★

اتر پردیش کی ہینڈلوم صنعت

(صفحہ ۴۳ کا بقیہ)

تسلی بخش فروخت ہوئی تھی۔ اپریل کی نمائش میں تقریباً ۷ لاکھ روپے کے کپڑے فروخت ہوئے اور نومبر کی نمائش میں تقریباً بیس لاکھ روپے کے کپڑوں کی فروخت ہوئی تھی۔ ان نمائشوں میں صوبہ کے ہر اہم بنکر مرکزوں کی ہینڈلوم سوسائٹیوں نے اپنے اسٹال لگائے تھے۔ ان نمائشوں کو دیکھنے کے بعد اس بات کا بخوبی احساس ہوا کہ اتر پردیش کے بنکروں نے اپنے فن میں بڑی ترقی کی ہے۔ وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا بھی نمائش کے افتتاحی جلسوں میں شریک ہوئے اور بنکروں کی ہمت افزائی کی۔ وزیر صنعت شری اصطفیٰ حسین تو ان نمائشوں میں تقریباً روز ہی دیکھنے جاتے تھے اور اپنی نگرانی میں سرکاری ملازمین سے کام لیتے تھے۔

ایسے وقت میں جب کہ آسام، تامل ناڈو اور آندھرا میں ہینڈلوم کپڑوں کی نکاسی بند ہے اور بازار کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ایک بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، اتر پردیش نے نمائش منعقد کر کے کپڑوں کی نکاسی میں جو کامیابی حاصل کی وہ قابل تعریف ہے۔ ۔ ۔

۲۸ نومبر سے ۱۱ نومبر تک بارہ دری میں عوام کا ہجوم دیکھنے میں آیا جو ہینڈلوم کپڑوں کی خریداری کر رہے تھے۔ یہ نمائش یو۔ پی ہینڈلوم اینڈ پاور لوم ڈیولپمنٹ اینڈ فائنانسنگ کارپوریشن اور یو۔ پی انڈسٹریل کوآپریٹیو ایسوسی ایشن (یوپیکا) کے تعاون سے لگائی گئی تھی جو ہر اعتبار سے کامیاب ثابت ہوئی۔ اس سے نہ صرف تیار شدہ کپڑوں کی نکاسی میں مدد ملی بلکہ ہینڈلوم صنعت کا خاطر خواہ پرچار بھی ہوا۔

چونکہ اتر پردیش کے اقتصادی ڈھانچے میں اس صنعت کو خاص اہمیت حاصل ہے اس لیے اس صنعت کو بحران سے بچانے اور ریاست کے بنکروں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس جانب خصوصی توجہ دی جائے خاص طور سے تیار شدہ مال کی نکاسی اور سرمایہ کی فراہمی پر زیادہ زور دیا جائے۔ ساتھ ہی خام مال کی فراہمی بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ اگر ان مسائل کو بخوبی حل کر دیا جائے تو اتر پردیش کی ہینڈلوم صنعت ریاست کے اقتصادی ڈھانچے میں اور بھی بہتر کردار ادا کر سکتی ہے۔ اور اس سے خاطر خواہ زر مبادلہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

★

پرسید پال اشک

پانچواں بین اقوامی فلمی میلہ

بھارت کا پانچواں بین اقوامی فلمی میلہ ۳۰ دسمبر ۱۹۷۴ء سے ۱۲ جنوری ۱۹۷۵ء تک نئی دلی میں منعقد ہوا۔ اس کا افتتاح وزارت اطلاعات اور نشریات کے وزیر شری اندر کمار گجرال نے وگیان بھون میں کیا۔ اس میلے کی افتتاحیہ تقریب میں کافی جدت طرازی سے کام لیا گیا تھا۔ اس بار اس میلے میں بھارت کے علاوہ جن ممالک نے شرکت کی ان میں خاص یہ ہیں:

امریکہ۔ برطانیہ۔ فرانس۔ روس۔ پولینڈ۔ یوگوسلاویہ آسٹریلیا نیوزی لینڈ۔ مغربی جرمنی۔ مشرقی جرمنی۔ ایران عراق۔ ترکی۔ جاپان۔ کناڈا۔ اسویڈن۔ الجیریا۔ مراکو۔ بلجیم۔ انڈونیشیا۔ افغانستان۔ ملائشیا اور بنگلہ دیش۔

اس میلے کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا تھا — ۱۔ مقابلہ سیکشن ۲۔ غیر مقابلہ سیکشن۔ ۳۔ مارکیٹنگ سیکشن۔ مقابلہ سیکشن میں بھارت کے علاوہ ۱۹ ممالک کی ۲۴ فیچر فلمیں شامل کی گئی تھیں۔ اور غیر مقابلہ سیکشن میں سو سے زائد فلمیں دکھائی گئیں۔ علاوہ ازیں اس میلے میں چند شارٹ فلمیں بھی دکھائی گئی تھیں۔ اس کے بھی دو سیکشن تھے (۱) مقابلہ سیکشن اور (۲) غیر مقابلہ سیکشن۔ مقابلہ سیکشن میں (۴۳) اور غیر مقابلہ سیکشن میں (۲۴) شارٹ فلمیں شامل کی گئی تھیں۔

اس موقعہ پر ہندستانی فلموں کی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ اس میں چودہ ہندستانی فلمیں دکھائی گئیں۔ علاوہ ازیں چارلی چیپلن کی ۹ کلاسیکل فلمیں بھی پیش کی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ۔ برطانیہ اور روس کی چند فیچر اور شارٹ فلمیں اور اوبرہاسن فلم فیسٹیول کی انعام یافتہ شارٹ فلمیں بھی دکھائی گئیں۔

وگیان بھون کے صحن میں ہندستانی فلموں کے اسٹل فوٹوگراف اور پوسٹروں کی ایک نمائش بھی لگائی گئی۔ اس کے مشاہدے سے ہماری فلم سازی کی تاریخ پر بخوبی روشنی پڑ جاتی تھی۔ ۱۹۶۹ء میں منعقدہ چوتھے بین اقوامی فلمی میلے کی طرح اس بار بھی ایک سمپوزیم کا اہتمام کیا گیا۔ اس بار کا سمپوزیم متوازی سینما کے موضوع پر منعقد ہوا۔ اس میں نامور ملکی اور غیر ملکی فلم ڈائرکٹروں اور فلم نقادوں نے حصہ لیا۔

اس میلے کا تیسرا شعبہ مارکیٹنگ سیکشن تھا۔ اس شعبہ کے سربراہ فلم فیڈریشن آف انڈیا کے پریسیڈنٹ شری سندر لال ناہٹا تھے۔ مارکیٹنگ سیکشن کے قیام کا مقصد ہندستانی اور غیر ملکی فلموں کی خرید و فروخت تھا۔ یہ سیکشن اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ اس کا نشانہ مارکیٹنگ سیکشن کے ذریعہ کل ۲۰ لاکھ روپے کی ہندستانی فلموں کی فروخت تھا۔ جو کافی حد تک پورا ہو گیا۔

اس میلے کی فلمیں وگیان بھون اور ماؤلنکر ہال کے علاوہ دلی کے ۱۳ ممتاز سینما گھروں میں دکھائی گئیں۔ میلے کی کشش کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں اٹلی کی مشہور ایکٹرس جینا لولو بریگیڈا، نامور امریکن فلم ڈائرکٹر کونارڈ ڈیوکس انٹرنیشنل فلم فیڈریشن آف فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر اے برسین کے علاوہ روس۔ امریکہ۔ برطانیہ۔ جاپان۔ فرانس۔ جرمن ایران اور مصر کے صف اول کے پروڈیوسر، ڈائرکٹر، ڈسٹری بیوٹر اور نقاد تشریف لائے۔

مقابلے کی فلموں کا جائزہ لینے اور بہترین فلموں پر اعزازات دیے جانے کا فیصلہ کرنے کے لیے دنیا کی دس ممتاز فلمی شخصیتوں

پر مبنی ایک جیوری مقرر کی گئی۔ اس کے سربراہ بھارت کے شہرۂ آفاق فلم پروڈیوسر اور ڈائرکٹر شری استیہ جیت رے تھے۔ بھارت کی نمائندگی شری ستیہ جیت رے کے علاوہ مشہور بنگالی فلم ایکٹریس اپرنا سین نے کی۔ پہلے ممتاز فلم ایکٹرس پدم شری نرگس دت کو جیوری کے ممبر کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی گئی تھی لیکن جب انھوں نے اظہار معذرت کر دیا تو اُن کی جگہ اپرنا سین کو لیا گیا۔ ان کے علاوہ فلم ڈائرکٹر فرنیک کاپرا امیر رحیت کے فلم پروڈیوسر اور ڈائرکٹر برٹ ہینسا را، جاپان کے فلم پروڈیوسر اور ڈائرکٹر اوشا، پولینڈ کے شہرۂ آفاق نوجوان فلم پروڈیوسر ڈائرکٹر زنوسی اور اٹلی کے [illegible] جیوری کے ممبران میں شامل تھے۔

میلے کے اختتام پر جیوری کے چیرمین شری ستیہ جیت رے نے جیوری کے متفقہ فیصلے کے مطابق ہنگری کا فلم ڈرمینگ اپ تو" کو طلائی مور عطا کیا۔ اس کے ڈائرکٹر جانوس روشا تھے۔ یہ اعزاز ہنگرین سفارت خانے کے کلچرل اتاچی نے قبول کیا۔ برازیل کی فلم "ایلیا" پر اس کے ڈائرکٹر نیلسو دی آنا کو نقرئی مور عطا کیا گیا۔ بہترین اداکاری کے لیے ایرانی فلم تنگ سیر کے ہیرو بہروز وسوغی اور امریکی فلم "دی وے وی ور" کی ہیروئن باربرا اسٹری سینڈ کو نقرئی مور کے اعزازات دیے گئے۔ آخرالذکر اعزاز باربرا اسٹری سینڈ کی طرف سے کولمبیا پکچرز کے ایف کرشنن نے قبول کیا۔ اس کے ساتھ ہی چیکوسلواکیہ کی شارٹ فلم آٹو ٹیک کو بہترین شارٹ فلم قرار دیے جانے پر طلائی مور، مصر کی شارٹ فلم دی پرل آف نیل' کو دوسری بہترین شارٹ فلم قرار دیے جانے پر نقرئی مور اور فن لینڈ کی شارٹ فلم "۱۸۹۵ء" ہا مودیز مود" کو تیسری بہترین شارٹ فلم قرار دیے جانے پر اس کے ڈائرکٹر [illegible] کو کانسے کا مور عطا کیا گیا۔ جیوری کے ممبر اور نامور فلم ڈائرکٹر فرنیک کاپرا نے اعزاز یافتہ فلموں کے لیے تعریفی کلمات کہے اور ان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ اگرچہ اس بار کی فیچر اور شارٹ فلموں کا معیار زیادہ بلند نہ تھا لیکن اس کے باوجود مذکورہ چند فلمیں معزز مقام پانے کی مستحق رہیں۔

اس میلے میں جیوری نے مقابلے کی دیگر فیچر فلموں میں مغربی جرمنی کی پروٹلائزیشن آف فرانز بلم" اسپین کی "آ منی سا فرسٹ"۔ انگلینڈ کی "سٹار ڈسٹ" اور روس کی "ایٹ ہوم امینگ سٹرینجرز" اور شارٹ فلموں میں یوگوسلاویہ کی "نو" برطانیہ کی "پلرز آف اسلام" اور میکسیکو کی ۲۶۰۴ کو تعریفی سرٹی فیکیٹ عطا کیے گئے۔

ان اعزازات کے علاوہ بین اقوامی شہرت کے مالک فلم نقادوں نے چھ نقادوں پر مبنی ایک علٰحدہ جیوری قائم کی اور پانچویں فلم فیسٹول کی تین بہترین فلموں کو اعزازات عطا کیے جانے کا اعلان کیا۔ اس کے چیرمین بمبئی سے شائع ہونے والے ایک انگریزی جریدہ فلم ورلڈ کے ایڈیٹر شری ٹی۔ ایم راما چندرن تھے۔ فلم نقادوں کی اس جیوری نے مغربی جرمنی کی فلم پروٹلائزیشن آف فرانز بلم" ایس۔ ایم سیتھو کی ہندی فلم "گرم ہوا" اور کنڑ فلم "کاڈو" کو بہترین فلمیں قرار دیا۔ "کاڈو" کو دیہی زندگی کی بہترین عکاسی پر اعزاز دیا گیا۔ فلم نقادوں کے یہ اعزازات بھی اس میلے کے آخری دن منعقدہ تقریب میں عطا کیے گئے۔

سرکاری اندازے کے مطابق اس میلے پر آٹھ لاکھ روپے خرچ آیا۔ اور ۵۲ ہزار افراد نے ہر روز یہ میلہ دیکھا۔ میلے کے مقابلہ اور غیر مقابلہ سکشنوں میں شامل چند فیچر اور شارٹ فلموں کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

الومینیشن ۔ (پولینڈ)۔ یہ پولینڈ کی فلم تھی۔ اس کے ڈائرکٹر زنوسی تھے۔ انھوں نے اس فلم فیسٹول میں جیوری کے ایک ممبر کی حیثیت سے بھی شرکت کی تھی۔ اس فلم کو ۱۹۷۳ء کے دوران اعلیٰ نوعیت کے بین اقوامی اعزازات حاصل کرنے کا شرف نصیب ہوا۔ اس فلم میں موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے دعوت فکر و نظر دی گئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ انسان حقیقی مسرت تب ہی حاصل کر سکتا ہے اگر فکر و نظر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ صدق دلی بھی

شامل حال ہو محض ذہنی فضیلت ہی کافی نہیں ہوتی۔ یہ فرکس کے ایک ایسے پروفیسر کی کہانی تھی جسے علم حاصل کرنے کا گن تھی اور جو اپنی خانگی ذمہ داریوں سے بے بہرہ تھے آخرا سے اس کا بھی بے طرح احساس ہونے لگتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ فلم سائنس کے ذریعہ زندگی کے حقائق سمجھنے میں بھی معاون ثابت ہوئی۔ البتہ ایک امر قابل ذکر ہے کہ پچھلے چاروں فلمی میلوں میں مجھے پولینڈ کی فلمیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس میں سیکس یا جنسی کشش نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ مگر یہ فلم دیکھ کر بار بار یہی احساس ہوا کہ نمک کی کان میں رہ کر ہر چیز کو نمک بن ہی جانا پڑتا ہے۔

اس سے قبل یہ فلم پچھلے سال دلی میں منعقدہ پولیش فلم فیسٹیول میں دکھائی گئی تھی۔ پیڈیرسن (مغربی جرمنی) پیڈرسن مغربی جرمنی کی فلم تھی اس کے ڈائرکٹر مائیکل سکل تھے۔ اس فلم میں جنگ کے خلاف جہاد کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ پرانی اور نئی نسل کے متعلق کیا نظریات ہیں۔ موضوع اور ہیئت دونوں اعتبار سے فلم موثر ضرور تھی البتہ چونکا دینے والی کیفیت پیدا نہ ہو سکی۔ دونسلوں کے درمیان اختلاف زیادہ ابھر کر سامنے نہ آ سکا۔ اسی لیے یہ خوبصورت موضوع ایک خوبصورت فلم کے سانچے میں ڈھل سکا۔

ابودبی۔ (مصر) ابودبی مصر کی فلم تھی۔ اس کے ڈائرکٹر نادر جلال تھے۔ فلم کی کہانی مصر کے ایک زمیندار کے کارندے ابودبی کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں دکھایا گیا کہ ابودبی اپنی جان پر کھیل کر کس طرح اپنے مرحوم آقا کی زمین کی حفاظت کرتا ہے اس کا آقا) پتے زمیندار دوست عثمان کو اپنی زمین کسی بھی قیمت پر فروخت کرنے کو رضا مند نہیں ہوتا۔ آخر عثمان اور اس کا لڑکا مراد چڑھ کر اس کے کھلیان کو آگ لگوا دیتے ہیں۔ اپنے گھوڑوں کو بچاتے ہوئے ابودبی کا آقا اس میں جل کر مر جاتا ہے اور اپنی منقولہ اور غیر منقولہ ساری جائداد کا وارث اپنی بھتیجی کو بنا جاتا ہے اور ابودبی جائداد کا محافظ بنتا ہے۔ بھتیجی غیر ممالک سے لوٹ کر اپنی جائداد فروخت کرنا چاہتی ہے لیکن ابودبی ہر قدم پر اس کی مخالفت کرتا ہے ادھر وہ عثمان اور اس کے لڑکے مراد کے چنگل میں پھنس جاتی ہے۔ یہ دونوں ابودبی کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ آخر ان سازشوں کا پردہ کس طرح چاک ہوتا ہے۔ اور کس طرح اس کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ اس فلم میں یہ سب بڑے ڈرامائی انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ ساری فلم ہمارے بمبیا فلمی انداز سے گھومتی تھی۔ اسی طرح کے کردار پیش کیے گئے ہیروئن ہیرو کی اداکاری تھی۔ ویسی ہی موسیقی۔ اور اسکرپٹ میں موضوع کو اسی انداز سے گرفت میں لیا گیا تھا فلم دیکھتے وقت بار بار یہی احساس ہوتا رہا کہ ہم کہیں کوئی ہندستانی فلم تو نہیں دیکھ رہے۔ اگر اس فلم کو ہندی میں پیش کر دیا جاتا تو کسی بھی منظر سے عربی فلم کا شائبہ نہ ہوتا۔ ولن کی حرکتیں تک ہمارے ولن سے کسی درجہ کم نہیں تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصری سینما ہندستانی سینما کے گلیمر سے بے حد متاثر ہے۔

اے ڈاگز لائف۔ (کتے کی زندگی) (یو کے)۔ اے ڈاگز لائف چارلی چپلن کی خاموش فلم تھی۔ اسے دیکھ کر خاموش عہد کی فلموں کے انداز پر بخوبی روشنی پڑ گئی۔ اس فلم میں چارلی چپلن اور کتے کے کردار میں مماثلت پیش کر دی گئی۔ اور بتایا گیا تھا کہ انسان تو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ایک کتا اس کا کس طرح بہترین رفیق ثابت ہوتا ہے۔ فلم میں کہیں کہیں ٹرک فوٹو گرافی کا کمال بھی دیکھنے کو ملا۔ چارلی چپلن کی اداکاری کا جواب نہیں۔ مزاح اور ظرافت کے ایسے ایسے پہلو نمایاں کیے گئے تھے اس فلم میں کہ جنہیں دیکھ کر بے اختیار داد دینے کو جی چاہا اور انسان دوستی کا پہلو جس خوب صورتی کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا اس کو کسی طور بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

کوکو دو۔ (جاپان) کوکو دو جاپانی فلم تھی۔ یہ فلم مقابلے میں شامل تھی۔ اس فلم کے ڈائرکٹر کوتو شیڈو تھے۔ فلم کی کہانی ایک جاپانی ناول پر مبنی تھی جو ایک عشقیہ مثلث کی حامل تھی۔ فلم کا ہیرو ایک کمرہ کرائے پر لیتا ہے۔ وہاں اس کا دوست بھی آ جاتا ہے۔ ان دونوں نوجوانوں کا کمرے کی مالکن کی لڑکی مس آئی سے عشق ہو جاتا ہے۔ اول الذکر دوست اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا

ہے اور آخرالذکر دوست اپنے مقصد میں ناکام رہتا ہے۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکتا اور آخر خودکشی کر لیتا ہے۔ فلم کی کہانی بہت عامیانہ اور کردار سطحی تھے۔ غالباً اسی لیے دل و دماغ پر چھا نہیں سکے لیکن اس فلم سے آج کے جاپانی نوجوانوں کے طرزِ عمل اور رجحان پر روشنی ضرور پڑ گئی۔ ڈائریکٹر نے کہیں کہیں اشارہ اور کنایوں سے کام لینے کی کوشش ضرور کی لیکن مجموعی طور پر اس فلم کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑا۔ البتہ اس کی بے حد حسین اور دل کش فوٹوگرافی کی داد نہ دینا سراسر ناانصافی ہوگی۔

چپاکوا۔ (امریکہ) چپاکوا کے ڈائریکٹر کونارڈ روکس اس فلمی میلے میں بہ نفس نفیس تشریف لائے۔ چپاکوا ان کی ایسی فلم تھی جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ یہ فلم جدید طرز کی حامل تھی۔ فلم کی کہانی ایل۔ ایس۔ ڈی اور دیگر نشیلی ادویات استعمال کرنے والے ایک نوجوان کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں مکالمے بہت کم تھے مذکورہ نوجوان کی ڈائری کے چند اوراق ایک ڈاکومنٹری فلم کے انداز میں پیش کیے گئے تھے۔ اس میں نشے کی سرور اور خمار غرضیکہ نشہ کی تمام کیفیات اور اثرات کا احاطہ بڑے حسین انداز سے کیا گیا تھا۔ اس فلم پر ۱۹۶۶ء میں وینس فلم فیسٹول کا چاندی کا میڈل بھی مل چکا تھا۔ فلم میں فلیش بیک کو بڑے سلیقے سے استعمال کیا گیا تھا۔ موسیقی پنڈت روی شنکر کی تھی اور طبلہ پر سنگت اللہ رکھا نے کی۔ موسیقی نے تو غضب کا سماں باندھا تھا۔ فلم دیکھ کر بار بار یہی احساس ہوتا رہا کہ کونارڈ روکس ہندستانی فلسفۂ حیات سے بے حد متاثر ہیں۔ سنجیدہ فلم بینوں کے لیے چپاکوا واقعی ایک قابلِ فخر فلم تھی۔

ڈریمنگ یوتھ۔ (ہنگری) ڈریمنگ یوتھ ہنگری کی فلم تھی۔ جسے مقابلہ سیکشن میں شامل کیا گیا تھا۔ اس فلم کو جیوری نے بہترین فلم قرار دیتے ہوئے طلائی مور عطا کیا تھا۔ اس فلم کے ڈائرکٹر جانوس روشا تھے۔ اس کی کہانی ہنگری کے ایک نامور ناول نگار بیلے بیرز کے ناول پر مبنی تھی۔ اس فلم کا ہیرو ایک تعلیم یافتہ نوجوان پروفیسر ہے جو ہنگری کے ایک گاؤں میں پہلی

توہم پرستی اور رجعت پسندی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ وہاں کے عوام بھوت پریت کے قائل ہیں۔ لکیر کے فقیر ہیں۔ ہیرو کا شمار علاقے کے روشن دماغ حضرات میں ہوتا ہے لیکن اس کے ترقی پسند نظریات اور عقائد کی قدم قدم پر مخالفت کی جاتی ہے۔ ہیرو رجعت پسندی کی جڑیں ہلانے اور سماج میں بیداری لانے کے لیے اپنے عزم کو عملی جامہ پہناتے ہوئے راہی ملک عدم ہو جاتا ہے اور اس کی بیوی کو اسکول میں ملازمت تک نہیں دی جاتی اور اسے وہاں سے نکلنا پڑتا ہے۔ فلم کا اختتام بڑا ہی موثر تھا۔ اور دل کو بے طرح چھوتا چلا گیا۔ فلم میں دکھائی گئیں بچوں کی شرارتیں فطری اور دل کو موہ لیتی تھیں۔ اس کے تمام کردار ہیرے پرسے تھے۔ ان میں گہرائی تھی جن سے تماشائیوں کو دعوتِ فکر ملی مجموعی طور پر یہ کوشش قابلِ تحسین تھی۔ اس فلم میں بھی پولش فلم کی طرح ہلکی سی جنسیاتی کشش موجود تھی اور یہ ثابت ہوتے دیر نہ لگی کہ کمیونسٹ ممالک بھی آہستہ آہستہ جنسیاتی کشش کے شکار ہوتے جا رہے ہیں۔

فتھ فیکیٹو۔ (آسٹریلیا) یہ آسٹریلیا کی ایک شارٹ فلم تھی۔ اس کے ڈائریکٹر ڈونلڈ کرامپ تھے۔ اس میں آسٹریلیا کی بندرگاہ سڈنی اور وہاں کے مشہور تھیٹر اوپیرا ہاؤس کی نفیس پیش کش کی گئی تھی۔ فلم میں ڈاکومنٹری انداز بلا کا تھا۔ اس میں اوپیرا ہاؤس کے فنِ تعمیر، وہاں کے ماحول، سیٹج سیٹنگ غرضکہ ہر پہلو پر بڑے بھرپور انداز سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ فوٹوگرافی خوب صورت اور رنگ دل آویز تھے۔

گریٹ نائٹ اینڈ گریٹ ڈے (چیکوسلواکیہ) گریٹ نائٹ اینڈ گریٹ ڈے چیکوسلواکیہ کی فلم تھی۔ یہ فلم مقابلے میں شامل تھی اس فلم میں دوسری عالمی جنگ کے دوران چیکوسلواکیہ میں جرمن افواج کے حملے۔ وہاں کے عوام کی طرف سے ان کا سامنا اور روسیوں کی امداد کو مرکزی موضوع بنایا گیا تھا۔ پوری فلم میں جنگ کا ماحول اور اس کی شدت کو برقرار رکھا گیا تھا۔ ڈائریکٹر نے جگہ جگہ اپنی چابک دستی کا ثبوت دیا۔ فلم بلیک اینڈ وائٹ میں تھی۔ اور جرمنوں کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھارا گیا۔ اس کی شدت

آخر تک برقرار رہی لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود یہ سوال ذہن میں بار بار کوندے کی طرح لپکتا رہا کہ آخر ایسے گھسے پٹے موضوع کو فلمانے کی ضرورت کیا تھی۔

ساناتاکرتا (ارجن ٹانا) ساناتاکیتا ارجن ٹانا کی ایک شارٹ فلم تھی۔ یہ فلم بھی مقابلے میں شامل تھی۔ فلم میں فن کا خاص طور پر ایک فوٹوگرافر کے مختلف موڈ اور ترنگ کے ساتھ فن اور زندگی کے ازلی رشتے، تہذیبی قدروں اور حسن کی نیرنگیوں کا احاطہ کیا گیا تھا۔ یہی اس فلم کا موضوع تھا فلم کی فوٹوگرافی خاص طور پر فوٹوگرافر کی جھلک لاجواب تھی۔

مائی این فوک (یو کے) مائی این فوک یو کے کی بلیک اینڈ وائٹ فلم تھی۔ اس کے ڈائریکٹر بل ڈگلس تھے۔ فلم کی کہانی نہایت ہلکی پھلکی تھی۔ یہ بن ماں کے ایک لڑکے کی کہانی تھی جسے اپنے گھر میں باپ کا پیار نہیں ملتا۔ وہ فقط پیار کا بھوکا ہے ہر طرف سے دھتکارا جاتا ہے۔ دادی کی شفقت کا تھوڑا سہارا ضرور ملتا ہے لیکن وہ بھی اسے بے سہارا چھوڑ کر مر جاتی ہے۔ فلم کا موضوع یورپی عوام کے لیے توجہ کا مرکز ضرور بنا ہوگا لیکن ہمارے یہاں یہ سکہ کب کا ٹکسال باہر ہو چکا ہے۔ فلم میں کسی اعتبار سے کوئی کشش نہ تھی۔ وقت کاٹنے کے لیے تو ہماری ہندی فلمیں اس سے بدرجہا بہتر ہوتی ہیں۔

لائر بچرا - (ارجن ٹانا) ارجن ٹانا کی یہ چھوٹی سی فلم دل و دماغ پر ایک گہرا اثر چھوڑ گئی۔ کہانی جتنی سیدھی سادھی تھی اسے پیش کرنے کا انداز اتنا ہی معصومانہ تھا۔ ایک فرم کا ادھیڑ عمر کا مینیجر دو نوجوان لڑکوں اور ایک لڑکی کا باپ ہے لڑکی کی عمر ۲۰ سال ہے اس کی بیوی کو مرے ۱۹ سال ہو چکے ہیں اور پچھلے بیس برس سے وہ ایک ہی فرم میں ملازم رہا۔ اسے اپنی زندگی میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر یہی اس کا معمول تھا۔ اچانک ایک روز ایک ۲۰ سالہ لڑکی اس کی اسسٹنٹ کے طور پر ملازم ہوئی۔ دونوں میں محبت کے عہد و پیمان ہوئے۔ مارٹی کی زندگی میں مسرت کا ایک جھونکا آیا۔ اس نے اپنے خوابوں کا تاج محل تعمیر کیا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس کی محبوبہ دو چار روز کے لیے اپنی والدہ کے یہاں چلی جاتی ہے۔ وہاں دس روز ہو گئے اچانک ایک دن دفتر میں فون آیا کہ وہ مر گئی۔ مارٹی پر گویا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بس یہی اس فلم میں نہایت خوب صورت لیکن سیدھے سادے انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ مارٹی کے رول میں ہیٹر نے لاجواب رول ادا کیا تھا۔ اس کے چہرے کا ایک ایک تاثر دیکھنے کے لائق تھا۔ کہانی کی رفتار اور اس کے کردار فلم کے موڈ کے عین مطابق تھے۔ ہدایت کار نے اسے کہیں بھی حد سے زیادہ بیز باقی ہونے نہیں دیا۔

سینرا اینڈ ریسلی۔ (فرانس) فرانس کی فلم سینرا اینڈ ریسلی ایک نیم مزاحیہ سوشل فلم تھی جس میں فرانس کے ایک کارخانہ دار سینرا اور اس کی بیوی ریسلی کی خانگی اور سماجی زندگی کا احاطہ کیا گیا تھا۔ اسے ایک آرٹسٹ سے لگاؤ ہو جاتا ہے باتوں باتوں میں سینرا آرٹسٹ کو مشورہ دیتا ہے کہ چونکہ ریسلی تمھیں چاہتی ہے لہٰذا تم اس سے شادی کر لو۔ آرٹسٹ کو یہ بات پسند آ جاتی ہے وہ ریسلی کو اپنا جیون ساتھی بنا لیتا ہے۔ آخر آرٹسٹ اور سینرا دونوں مل کر ریسلی سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ فلم کافی دلچسپ تھی۔ خاص طور پر سینرا کی اداکاری لاجواب تھی۔ اس کا ایک ایک ایکشن اور چہرے کا تاثر بلراج ساہنی کی یاد دلاتا رہا۔ اتنی ڈوب کر ایکٹنگ کی کہ کیا کہنے۔

اس پانچویں بین اقوامی فلمی میلے کا مجموعی تاثر یہی پیدا ہوتا ہے کہ ایسے میلے وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے رہنے چاہئیں۔ اس سے دنیا کے دیگر ممالک کے سیاسی، سماجی، تمدنی اور تہذیبی رجحانات سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ خوشی ہے کہ دلّی کے عوام میں اس میلے کے تئیں بے حد دلچسپی رہی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اب بھارت میں ہر دو سال بعد بین اقوامی فلمی میلہ منعقد ہوا کرے گا۔ چھٹے بین اقوامی میلے کی تیاریاں ابھی سے شروع ہو گئی ہیں۔

★

نیا دور کا خسرو نمبر

تاثرات کے آئینے میں

علامت یار جنگ (گو . ز مہاراشٹر)

نیا دور کا خسرو نمبر موصول ہوا میں اس نمبر میں شامل معیاری مضامین اور اس کے گٹ اپ کے لیے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔
(ترجمہ از انگریزی)

(ڈاکٹر) بیکو جعفری اکور (بہرائچ)

انتہائی انتظار میں نیا دور دسمبر ۷۴ء کا "امیر خسرو نمبر" دستیاب ہوا دل خوش ہو گیا ۲۴۲ صفحات پر پھیلے ہوئے مضامین جن خوش اسلوبی اور دیدہ وری سے یکجا کیے گئے ہیں یہ آپ کے ذوق سلیم اور رسالے کے اعلیٰ معیار کا پتہ دیتے ہیں۔

آپ نے حضرت امیر خسرو کی سات سو سالہ تقریبات کے موقع پر جو نیا دور کا خصوصی نمبر شائع کیا ہے اس سے امیر خسرو کی زندگی، تخلیقات، شاعری اور ظاہری و باطنی کمالات پر پوری روشنی پڑتی ہے اس کی جامعیت کو دیکھتے ہوئے اسکو خسرو نامہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔

اس کے لیے آپ اور ادارہ قابل صد ستائش و مبارک باد ہیں۔

پروفیسر سید حسن (پٹنہ)

نیا دور کا امیر خسرو نمبر وصول ہو کر باعث نواز ہوا، یہ شمارہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے جاذب توجہ اور لائق تحسین و آفرین ہے، اس کے متنوع مضامین میں، جن میں سے بیشتر معروف اصحاب قلم اور ارباب نقد و نظر کے لکھے ہوئے ہیں، حضرت امیر خسرو کی گونا گوں شخصیت اور رنگارنگ تصانیف سے متعلق مفید و ذی قیمت معلومات فراہم ہو گئے ہیں جو اس فقید المثال ہنرمند، معجز نگار شاعر اور باکمال صوفی کے احوال و آثار کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے والوں کو مدد دیں گے، آپ کی سعی و سلیقہ اور کوشش و کاوش کی داد نہ دینا ادبیات کے عالم قدر ناشناسی پر ظلم ہوگا۔

آوارہ . مارہرہ (ایٹہ)

خسرو نمبر ملا - ماشاء اللہ. تنقید یا تبصرے کی مجھ میں لیاقت کہاں. عرشی صاحب کا مضمون بہت پسند آیا۔ پٹیالی مارہرہ سے شاید دس بارہ کوس ہے. گنگا پار کر کے شکار کے سلسلے میں کئی بار جانا ہوا - فاتحہ عرض کیا گیا - مجھے فخر ہے کہ مومن پور میں حضرت امیر اور سوران میں بابا سن داس میرے ہم وطن تھے. سرکار کی تجویز سنی گئی کہ پٹیالی اب خسرو نگر ہو جائے گا۔ تلسی داس کی یادگار وطنی برادری نے منوا دی ہے۔

کوثر چاند پوری دہلی

خسرو نمبر ملا، گرا بہت ترتیب بڑے سلیقے کی گئی ہے۔ مضامین کے انتخاب میں دانشوری کار فرما ہے۔

شکیل احمد صدیقی۔ لکھنؤ

رسالہ نیا دور کا امیر خسرو نمبر موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بہت اچھا نمبر نکالا ہے. اس کے لیے دلی مبارکباد قبول کیجیے۔ امید ہے کہ آپ کا موقر رسالہ اسی طرح کے شاندار خصوصی نمبر نکالتا رہے گا۔

محمد اسمٰعیل بدایونی

نیا دور کا امیر خسرو نمبر موصول ہوا، از حد مسرت ہوئی۔

ادارۂ نیا دور کا یہ اقدام بے انتہا مستحسن اور لائق ستائش و قابل صد مبارکباد ہے۔ اس میں ہمارے ملک کے ایک عرفانی شاعر کے سوانح حیات کے متعلق چوٹی کے ادیبوں اور اہل قلم حضرات کے مضامین اور مقالے ہیں جو نہایت تجسس و تحقیق کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اس ضخیم نمبر کے بارے میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ جو مدعی زبان و ادب اس کے مطالعہ سے محروم رہے "اس سے بہتر ہے کہ وہ دنیا سے سفر کر جائے"۔

حضور مہسوانی (بدایوں)

نیا دور کا امیر خسرو نمبر نظر نواز ہوا. جو حضرت امیر خسرو کی ہمہ گیر شخصیت کے شایان شان ہے اور ان کی زندگی اور فن کے سبھی پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔ نیا دور کو اتنا اچھا نمبر نکالنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

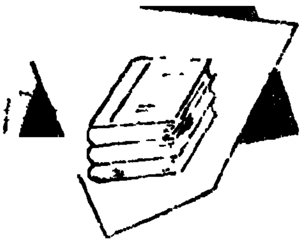
حسن الدین احمد - ٹی اہلی

رسالہ نیا دور کا امیر خسرو نمبر نظر نواز ہوا۔ رسالہ آپ نے نہایت محنت سے مرتب کیا ہے اور اس کی حیثیت ایک اہم دستاویز کی ہے. میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

ایم . اے شوق - مرزاپور

نیا دور کا امیر خسرو نمبر موصول ہوا رسالہ دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ امیر خسرو کے سلسلے میں جتنے بھی مضامین ہیں جامع ہیں۔ ساتھ ہی ساغر نظامی صاحب کی نظم "نذر امیر خسرو" بہت خوب ہے واقعی یہ نیا دور کا کمال ہے کہ ایک ایسی برگزیدہ ہستی کا نمبر نکال کر ہم جیسے بہت سے لوگوں کی معلومات میں اضافہ کیا ہے جس کے لیے میں ادارہ نیا دور کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نقد و تبصرہ



(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے
دو نسخے آنا لازمی ہیں!)

موسموں کا وطن۔ مصنف تسنیم فاروقی
قیمت۔ پانچ روپے۔ ۸۰ صفحات۔ چھپائی آفسٹ۔ مجلد مع گرد پوش۔
ملنے کا پتہ: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

کتاب موسموں کا وطن تسنیم فاروقی کی ان ۳۸ نظموں پر مشتمل ہے جن میں انھوں نے سیاسی، سماجی و ثقافتی اور اپنے عہد کے حب الوطنی کو موضوع شاعری بنایا ہے۔ ان نظموں کے مطالعے سے ہمیں ان کے احساس و عرفان کا پتا چلتا ہے کہ شاعر اپنی زندگی اور زمانے سے بے تعلق ہو کر نہیں رہ سکا بلکہ ان کی موثر اور گرد و پیش کے اثرات سے بھی انھوں نے کسب فیض کیا ہے۔ وہ اگر ایک طرف ماضی کے عظیم الشان ماضی کا احترام کرتے ہیں تو دوسری طرف معاشرے کا مبصر بھی ہو کر آتا ہے۔ ان کا ایک سماجی مصلح ہونا ہے اور اپنے منصب کی ذمہ داریوں کو اسی رفعت پورا کر سکتا ہے جب وہ ان خامیوں اور کامرانیوں کو آئینہ دکھلائے جن سے سماج کے افراد دوچار ہوا کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں انھوں نے صرف اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ اپنی سرزمین کی عظمت کے گیت گائیں بلکہ ان اکابرین کو نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے جن کی کوششوں سے ملک نے غیر ملکی سامراجی بیڑیوں سے نجات پائی۔

حب الوطنی کے موضوع پر ان کی جو نظمیں ہیں ان میں وطنیت کا محدود تصور نہیں ابھرتا بلکہ عالمگیر انسانی برادری اور ایک آفاقی نقطۂ نظر کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ رنگ و نسل اور جغرافیائی حد بندیوں کے امتیازات سے بالاتر ہو کر مسائل کا تجزیہ کرنا بدات خود ایک ایسی دولت ہے جو کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

تسنیم فاروقی نے کچھ نظمیں وقتی اور ہنگامی تقاضوں کے پیش نظر بھی اس مجموعے میں شامل کی ہیں مگر ان کے اندر فن کی وہ تازگی بھر دی ہے کہ حالات تبدیل ہونے اور وقت گزر جانے کے بعد بھی ان میں باسی پن نہیں پیدا ہوگا اور وہ تاریخی اہمیت کی بھی حامل رہیں گی۔

ہمارے ملک میں اس وقت قومی یکجہتی کا مسئلہ بہت اہم بن گیا ہے رجعت پرست طاقتیں اس یکجہتی میں حائل ہو رہی ہیں۔ تسنیم فاروقی نے ان اہم موضوعات پر بھی سماجی ترقی پسند انہ رجحانات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے روشنی ڈالی ہے۔ ان کی یہ نظمیں ان کے عقیدے کی استواری اور نظریات کی معتدل سلامت روی کے باعث ان لوگوں کو بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکیں گی جو سیاسی اعتبار سے ان کے مسلک سے اختلاف رکھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی فن کاری سے اپنے عقائد کو ایک ایسے موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ ہر شخص ان کے اخلاص کا قائل ہو جاتا ہے۔ آزادی کے بعد ہمارے شعراء نے اپنے کلام میں ان خرابیوں پر تنقید ضرور کی ہے جو ہمارے ملک میں پائی جاتی ہیں مگر کم شعراء ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے مثبت انداز میں ان برکتوں کا تذکرہ کیا ہے جو آزادی اپنے ساتھ لائی ہے۔ خار و خس کے انبار میں شگفتہ پھولوں کو تلاش کر لینا ایک اچھے گلشن پرست کا شیوہ ہوا کرتا ہے اور یہ جذبہ تسنیم فاروقی کی نظموں میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔

—— ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد

ہفتہ وار **"ہماری زبان"** دہلی۔ شمارہ بابت ۱۵ اگست ۱۹۷۴ء (جلد ۳۳ شمارہ ۲۵) ضخامت ۱۲ صفحات جسامت ۲۵×۳۸ سنٹی میٹر قیمت سالانہ ۸ روپے (فی شمارہ ۲۵ پیسے) ملنے کا پتا: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۳۶۶ کلاں محل دہلی۔

انجمن ترقی اردو ہند کا ترجمان ہفت روزہ "ہماری زبان" ۳۳ سال سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق، قاضی عبدالغفار اور پروفیسر آل احمد سرور جیسے بلند پایہ اردو ادیب اس کے مدیر رہ چکے ہیں۔ ۳۱ مارچ ۱۹۷۴ء تک یہ اخبار پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی و ادارت میں علی گڑھ سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد یہ دہلی منتقل ہو گیا اور اب اس کے مدیر ڈاکٹر خلیق انجم ہیں۔

ادارت اور مقام اشاعت کی تبدیلی کے نتیجے میں پرچے میں بعض خوش آیند صوری و معنوی تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں۔ مثلاً اخبار کی جسامت پہلے ۲۰×۳۲ سنٹی میٹر تھی جو اب بڑھا کر ۲۵×۳۸ سنٹی میٹر کر دی گئی ہے۔ مواد کی ترتیب، اخبار کی سرخیاں، کتابت اور طباعت وغیرہ میں بھی خوشگوار تبدیلیاں ہوئی ہیں جو موجودہ مدیر کی سلیقہ مندی کا ثبوت ہیں۔ معنوی اعتبار سے اخبار میں بعض نئے کالموں کا اضافہ ہوا ہے جن میں "ہماری شکایتیں"، "افکار و مسائل"، "دلی ڈائری"، "ماضی کے دریچے سے" شامل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ نئے کالم دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ افادیت کے بھی حامل ہیں۔ "ہماری زبان" میں ان تمام خوشگوار صوری اور معنوی تبدیلیوں کے لیے اس کے نئے مدیر ڈاکٹر خلیق انجم مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے "ہماری زبان" دلچسپیوں اور معلومات کا خاصا اچھا ذخیرہ فکر و نظر کی ضیافت کرتا ہے اور اکتا دینے والی یک رنگی کے بجائے ایسی بوقلمونی کا حامل ہے جس میں بیک وقت اردو کے محقق، نقاد، اساتذہ، طلبہ، مصنفین، مضمون نگار، ناشرین، کتابوں کے تاجر، ادبی انجمنیں، اخبارات و رسائل کے مدیر، اردو کی فروغ و اشاعت میں سرگرم عمل کارکن، سیاسی اور انتظامی حلقوں میں اردو کے مسائل سے دوچار رہنے والے ارباب حل و عقد سبھی دلچسپی اور کشش محسوس کریں گے۔ البتہ اخبار میں افسانے اور منظوم تخلیقات یکسر معدوم ہیں۔ "ہماری زبان" کی اس کمی کو دور کرنے کے لیے اگر ضخامت میں اضافہ بھی کرنا پڑے تو بھی اس میں پس و پیش نہ کرنا چاہیے۔

—— کاظم علی خاں

★

نیا دور

جلد ۳۱ نمبر ۲

مئی ۱۹۷۵ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: کماری سرلا ساہنی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ : پچاس پیسے
زر سالانہ : پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن (سی) ڈپارٹمنٹ۔ یو پی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

ڈاکٹر رادھا کرشنن سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی موت سے ملک ایک بلند پایہ فلسفی، مخلص محب وطن، اعلیٰ مدبر، مفکر اور خوش بیان مقرر سے محروم ہو گیا۔ ان کی موت سے علم و دانش کے میدان میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ ان کا نام رابندر ناتھ ٹیگور، سی وی رمن اور ابوالکلام آزاد جیسی شخصیتوں کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن بچپن سے ہی بڑے ذہین اور فہیم واقع ہوئے تھے اور زندگی کے ہر شعبے میں کامیابیوں نے ان کے قدم چومے۔ کلکتہ، میسور اور مدراس یونیورسٹیوں میں استاد رہنے کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی پروفیسر مقرر ہوئے اور آندھرا اور بنارس یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے کو بھی زینت بخشی۔ وہ ایسے تھے کہ جب بولتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم کے دریا بہائے جا رہے ہیں۔ ان کی تقریروں کا انداز بے حد سلجھا اور مسحور کن ہوتا تھا۔ جس طرح علم کے میدان میں انھوں نے جھنڈے گاڑ دیے تھے اسی طرح مسند سیاست پر جلوہ افروز ہوتے ہی سیاست کے میدان میں بھی اپنی قابلیت اور سوجھ بوجھ کا سکہ جما لیا تھا۔ وہ سب سے پہلے نائب صدر جمہوریہ اور اس کے بعد صدر جمہوریہ بنائے گئے۔ ان کی دلنواز شخصیت نے ان دونوں عہدوں کی عزت اور وقار بڑھایا۔ بیرونی ممالک نے بھی انھیں متعدد اعلیٰ اعزازات سے نوازا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن مذہب سے بھی کافی شغف رکھتے تھے۔ فلسفہ سے گہرا تعلق ہونے کے باعث ہندو مذہب کے عقائد اور تفکرات میں فلسفیانہ موشگافی کرتے تھے اور ان کے اس وصف نے سیاست میں روحانیت پیدا کر دی تھی۔ وہ اگرچہ ہمارے درمیان نہیں رہے ہیں لیکن ان کے تفکرات، علمی اور فلسفیانہ نظریات بنی نوع انسان کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہیں گے۔

آریہ بھٹ ہندوستان کی تاریخ میں ۱۹ اپریل ۱۹۷۵ء کا دن زرّیں حرفوں سے لکھا جائے گا۔ یہ وہ تاریخی اور یادگار دن ہے جب ہندوستان نے اپنا پہلا مصنوعی سیارہ آریہ بھٹ خلا میں بھیجا اور تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ دنیا کو حیرت اس وقت بھی ہوئی تھی جب ہندوستان نے جیسلمیر کے ریگستان میں زیر زمین ایٹمی دھماکا کیا تھا۔ اگرچہ یہ ایٹمی دھماکا ہندوستان نے صرف پرامن اور ترقیاتی مقاصد کے لیے کیا تھا لیکن بعض ممالک نے بے بنیاد اندیشوں کی بنیاد پر اس کے خلاف واویلا اور شور و غل مچانا شروع کر دیا تھا۔ بہرحال ہمارے ملک کے لیے یہ بات باعث صد فخر ہے کہ مختلف دشواریوں اور محدود مالی وسائل کے باوجود وہ خلائی دور میں داخل ہونے والے ملکوں میں شامل ہو گیا ہے۔ اور اس نے اس سلسلے میں مغربی ممالک کی اجارہ داری کو ختم کر دیا ہے۔ ہندوستان کا زیر زمین ایٹمی دھماکے کی طرح اس مصنوعی سیارے کو خلا میں چھوڑنے کا مقصد کسی ملک کو خوف زدہ یا مرعوب کرنا نہیں ہے بلکہ وہ نیوکلیائی سائنس کے ساتھ ساتھ خلائی سائنس کو بھی پرامن اور ترقیاتی اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہ مصنوعی سیارہ ایک گھنٹہ ۳۶ منٹ میں زمین کا ایک چکر لگا لیتا ہے اور اس کا وزن ۳۶۰ کیلوگرام ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اب تک کسی بھی ملک نے اتنا وزنی سیارہ خلا میں نہیں چھوڑا تھا۔ روس کے پہلے سیارے کا وزن ۸۳ کیلوگرام تھا جبکہ امریکہ کے سیارے کا وزن صرف ۱۴ کیلوگرام تھا۔ لیکن اس سلسلے میں محض وزن ہی کی بات قابل فخر نہیں ہے بلکہ آریہ بھٹ کا کامیابی کے ساتھ زمین کا چکر لگانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس سیارے کی بناوٹ اور اس کا ڈیزائن بہت ہی مناسب ڈھنگ سے تیار کیا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے راکٹوں کا تجربہ اگرچہ کیا جا چکا ہے لیکن سیارے کو خلا میں چھوڑنے کے لیے بڑے راکٹوں کی ضرورت پڑتی ہے اور ہمارے پاس اس طرح کے راکٹ موجود نہیں ہیں۔ چنانچہ بڑے راکٹوں کو تیار کرنے کے لیے ٹراونکور میں تجربات کیے جا رہے ہیں اور توقع ہے کہ ۱۹۸۰ء تک ہندوستان اس قسم کے بڑے راکٹ تیار کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس موقع پر یہ واضح کرنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ ہندوستان کی اس شاندار کامیابی میں روس کا پورا اشتراک و تعاون حاصل ہے۔ ہمارے وہ سائنس داں واقعی قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے ہندوستان کو خلائی دور میں داخل کر کے اقوام عالم میں اپنے ملک کا نام اونچا کر دیا ہے۔

شفاعت علی کو آکاشوانی ایوارڈ ہمیں یہ جان کر انتہائی مسرت ہوئی کہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے اردو پروڈیوسر شری شفاعت علی کو ان کی اعلیٰ کارکردگی اور فنی مہارت کے اعتراف کے طور پر آکاشوانی ایوارڈ ۱۹۷۴ء سے نوازا گیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے تمام اسٹیشنوں سے ۱۹۷۴ء میں نشر ہونے والے ڈراموں، فیچروں اور دوسرے پروگراموں کا ایک کل ہند مقابلہ ہوا تھا۔ اس مقابلے میں شفاعت صاحب کو جس فیچر کو خوش سلیقگی اور اعلیٰ مہارت کے ساتھ نشر کرنے پر یہ ایوارڈ دیا گیا ہے اس کا عنوان تھا "بارگاہِ رسالت میں"۔ ادارہ نیا دور شفاعت صاحب کو اس اعزاز پر اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

—— ایڈیٹر

اداریہ

ایک روشن چراغ تھا نہ رہا

ڈاکٹر رادھا کرشنن

جمہوریہ ہند کے سابق صدر ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کی موت نے نہ صرف ملک ہندوستان ہی کو، بلکہ پوری دنیا کو، ایک عظیم المرتبت فلسفی و مفکر، ممتاز ماہر تعلیم، بلند قامت مدبر اور اعلیٰ انسانی قدروں کے علمبردار سے محروم کر دیا۔ وہ دنیائے روشنی کا ایک مینارہ تھے۔ وہ جس عہدے پر سرفراز ہوئے انھوں نے اس کی شان اور عظمت کو دوبالا کر دیا۔ وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا کے الفاظ میں ڈاکٹر رادھا کرشنن گاندھی جی کی یادگار، سچائی، جمہوریت، رواداری، انسانیت اور روحانیت کے نقیب کا پیکر تھے۔ انھوں نے اپنے زور قلم اور زور خطابت سے ہندوستان کا نام دنیا میں پھر سے اونچا کر دیا تھا۔

۱۷ اپریل ۱۹۷۵ء کو مدراس میں ان کی وفات سے بھارت ایک معزز و مقتدر سپوت سے محروم ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن ۵ ستمبر ۱۸۸۸ء کو چنگل پٹ میں ترتنی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ انھوں نے ویلور اور مدراس میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۹ء میں مدراس کرسچین کالج سے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آپ نے مدراس ایجوکیشنل سروس میں لیکچرر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور ۱۹۱۷ء میں مدراس پریسیڈنسی کالج میں پروفیسر بن گئے۔ میسور یونیورسٹی میں خدمات انجام دیتے ہوئے انھوں نے پہلی دو اہم کتابیں شائع کیں جن کے نام ہیں "دی فلاسفی آف رابندر ناتھ ٹیگور" (رابندر ناتھ ٹیگور کا فلسفہ) اور "دی رین آف ریلیجن ان کنٹیمپوریری فلاسفی" (عصر حاضر کے فلسفے میں مذہب کا غلبہ)۔ اول الذکر کتاب ۱۹۱۸ء میں اور موخر الذکر کتاب ۱۹۲۰ء میں منظر عام پر آئی۔ موخر الذکر کتاب کی وجہ سے کلکتہ یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر ہو گئے جہاں انھوں نے ۱۹۲۳ء میں اپنی معظم تصنیف انڈین فلاسفی مکمل کی۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ۱۹۲۶ء میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی جب انھیں آکسفورڈ میں اپٹن لیکچر دینے کی دعوت دی گئی۔ اسی سال اگست کے مہینے میں موصوف نے شکاگو یونیورسٹی میں ہسکل لیکچر دیے۔ ۱۹۲۷ء میں انھوں نے انڈین فلاسفی نامی کتاب کی دوسری جلد مکمل کر لی۔ اس کے بعد ان کی کچھ اور کتابیں شائع ہوئیں جن کے نام ہیں دی ریلیجن وی نیڈ، [illegible] کا مستقبل، زندگی کے بارے میں ایک مثالی انداز نظر اور ایسٹ اینڈ ویسٹ ان ریلیجن۔ ان کتابوں کے سن اشاعت بالترتیب ۱۹۲۸ء، ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۳ء ہیں۔

۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر رادھا کرشنن آندھرا یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ اسی سال وہ لیگ آف نیشنز کی شعبہ ہائے علوم میں تعاون سے متعلق کمیٹی کے رکن نامزد کیے گئے۔

۱۹۳۶ء میں موصوف آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی مذاہب و اخلاقیات کے سپالڈنگ پروفیسر ہو گئے۔ وہ کلکتہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے دوبارہ پروفیسر مقرر ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں برٹش اکیڈمی نے انھیں ماسٹر مائنڈ لیکچر دینے کے لیے دعوت دی جو گوتم بدھ کے نام سے شائع ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں انھیں اکیڈمی میں فیلوشپ کے لیے چن لیا گیا۔ اسی سال ان کے اسپالڈنگ لیکچر دی ایسٹرن ریلیجن اینڈ ویسٹرن تھاٹ (مشرقی مذاہب اور مغربی انداز فکر) کے نام سے شائع ہوئے۔ اسی برس موصوف کو بنارس یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا گیا۔ مئی ۱۹۴۴ء میں انھیں چین کی سرکار نے لیکچر دینے کے لیے دعوت دی۔ ان لیکچروں کو بھارت اور چین کے نام سے شائع کیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں انھیں امریکہ کی طرف سے دانفورڈ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام چودہ یونیورسٹیوں میں لیکچر دینے کے لیے مدعو

کیا گیا۔ انھوں نے کملا لیکچر بھی دیے جو ۱۹۴۷ء میں ریلیجن اینڈ سوسائٹی (مذہب اور سماج) کے نام سے شائع ہوئے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء کے درمیان یونسکو کے لیے ہندستانی وفود کی سربراہی کا اعزاز بھی ڈاکٹر رادھا کرشنن کو ہی عطا ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں ایگزیکیٹو بورڈ کے صدر چنے گئے اور ۱۹۵۲ء میں یونیسکو کی جنرل کانفرنس کی صدارت کی۔

جنوری ۱۹۴۰ء ڈاکٹر رادھا کرشنن بنارس یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے سے سبکدوش ہو گئے تاکہ وہ یونی ورسٹی ایجوکیشن کمیشن کے صدر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھال سکیں۔ ۱۹۴۹ء - ۵۲ کے دوران ڈاکٹر رادھا کرشنن روس میں ہندستان کے سفیر رہے۔ ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر رادھا کرشنن انڈین یونین کے نائب صدر منتخب ہو گئے۔ ۱۹۵۷ء میں انھیں دوبارہ نائب صدر جمہوریہ چن لیا گیا۔ نائب صدر جمہوریہ کی حیثیت سے ڈاکٹر رادھا کرشنن نے غیر ملکوں کا دورہ کیا۔

۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کو ان کی نمایاں خدمات اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھارت رتن کا اعلیٰ ترین اعزاز عطا کیا گیا۔

۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کو صدر جمہوریہ ہند چن لیا گیا اور انھوں نے اس حیثیت سے ۱۹۶۲ء میں چینی جارحیت نیز ۱۹۶۵ء میں ہند پاک جنگ کے مشکل اور آزمائشی دور میں ملک کی خدمات انجام دیں۔ بحیثیت صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس اعلیٰ عہدے کو عزت اور وقار بخشا اور تمام قومی اور بین الاقوامی مسائل پر فلسفیانہ اور انسان دوستی کے انداز فکر سے اثر انداز ہوئے۔ انھوں نے دنیا کے بہت سے ملکوں میں خیر سگالی کے دورے کیے اور اس طرح دیگر ملکوں کے ساتھ دوستی اور ہم آہنگی کے رشتے مضبوط کیے۔

۱۹۶۴ء میں ہز ہولی نس پوپ پال ششم نے انھیں اعلیٰ ترین ملٹی گن ایوارڈ "گولڈن اسپر" عطا کیا۔ پوری دنیا کی مشہور یونی ورسٹیوں کی جانب سے انھیں اعزازی ڈگریاں عطا کر کے اسکالر سیاستداں اور مفکر کی حیثیت سے ان کی شہرت کا عالمگیر طور پر لوہا منوایا گیا ہے۔

ان کی آخری تصنیف "دی ریلیجن اِن چینجنگ ورلڈ" ان کی سبکدوشی کے فوراً بعد ۱۹۶۸ء میں شائع کی گئی۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ان ہی تحریروں اور تقریروں سے بھارتی فلسفہ اور اندازِ فکر کے پیغام کی اشاعت کی۔ وہ اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ روئے زمین پر انسانی ترقی کا راز اس کی مادی ترقی یا اس کی فتوحات نہیں بلکہ اسکی روحانی ترقی اور تلاشِ حق کی جستجو ہے۔ انھوں نے حق اور بھلائی کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔

مارچ ۱۹۷۵ء میں انھیں ٹیمپلٹن ایوارڈ عطا گیا یہ اعزاز ڈاکٹر رادھا کرشنن کو ہندو مذہب کے لیے انکی خصوصی دین اور خدا کو سمجھنے کے لیے انکی کوششوں کے صلہ میں عطا کیا گیا۔

برٹرنڈ رسل نے ان کے بارے میں کہا تھا "ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ہماری زندگی کے مسائل کے حل کے تئیں انتہائی اعلیٰ دانشوری کا ثبوت دیا ہے انکا شمار ان چند بزرگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہندستانی ثقافت کو انسان کے شاندار کارناموں کا جزو بنانے کے لیے خدمات انجام دیں۔"

ڈاکٹر کیملے نے تہذیب کے تئیں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی خدمات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ہندستان اور یورپی کلچر کو ملانے کے لیے خاص کاوشیں کی ہیں۔ انھوں نے مفاہمت کی کڑیاں ملانے کے لیے خاص کام کیا ہے اور ان کی یہ خدمات بہت زیادہ نمایاں ہیں

۵ ستمبر کو ان کے یوم پیدائش پر ملک بھر میں یوم اساتذہ منایا جاتا ہے جو کہ اس عظیم ماہر تعلیم اور اسٹیٹسمین کے شایان شان خراج عقیدت ہے۔

حکومت اور ہندستانی عوام ڈاکٹر رادھا کرشنن کو اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہیں جن کی زندگی اور کارنامے ہمیشہ مینارہ نور ثابت ہوں گے۔ ڈاکٹر اقبال نے دنیا کی ایسی ہی عظیم شخصیتوں کے لیے کہا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

★

نذیر بنارسی

غزل

زیادہ پیار سے دیکھا نہ جائے
مسافر لوٹ کر پھر آ نہ جائے

دِوانے کے تو سر پر آئے پتھر
تمہارے سر پہ الزام آ نہ جائے

نہ دو دادِ جنوں اے عقل والو
کہیں دیوانہ بھی کام آ نہ جائے

منا کر جشنِ منزل راستے میں
ہمارا راستہ روکا نہ جائے

محبت بھی اگر ہے جُرم یارو
تو میں مجرم مجھے بخشا نہ جائے

سنواری جائے زلفِ زندگانی
کسی سے بے سبب اُلجھا نہ جائے

بہت کچھ ہے نسیم صبح گاہی
اگر دل کی کلی مُرجھا نہ جائے

ہٹا لو سامنے سے مے کی بوتل
مری توبہ کہیں ٹکرا نہ جائے

جلن کچھ کم تو ہو جائے گی دل کی
وہاں تک آہ جائے یا نہ جائے

ملی قیمت سے دنیا بھی تو ایسی
جہاں سے کوئی بھی زندا نہ جائے

بچاؤ آبروئے آدمیت
محبت کو سیاست کھا نہ جائے

نذیر انسان ہی ہیں محترم بھی
انھیں بھی پارسا سمجھا نہ جائے

عتیق احمد صدیقی

سودا کے کثیر الممدوح قصائد

مرزا محمد رفیع سودا ایک بڑے شاعر اور فن کار تھے لیکن وہ ایک اچھے خاصے دنیادار آدمی بھی تھے وہ دنیا سازی کا فن خوب جانتے تھے۔ وہ مدت العمر کسی نہ کسی دربار سے وابستہ رہے اور اس وابستگی کو کامیابی سے نباہتے رہے۔ ان کی خوش باشی اس بات کی مقتضی تھی کہ وہ کسی ایسے ممدوح کا سہارا تلاش کریں جس سے وہ متمتع ہوتے رہیں۔ ان کی مصاحب پیشگی نے ان کو ممدوح کے انتخاب کا شعور بخشا تھا وہ کسی ایک بارگاہ کے منت گزار ہو کر نہ رہے بلکہ حالات کے مطابق وہ ایک سہارے کو چھوڑ کر دوسرا سہارا اختیار کرتے رہے۔ اس انتخاب میں ان کی عملی فراست ہمیشہ ان کی رہ نمائی کرتی رہی۔ مذہبی عقیدت مندی کے نتیجہ میں انھوں نے رسول اکرمؐ اور آئمۂ معصومینؑ کی شان میں قصیدے لکھے۔ ان کے علاوہ بھی ان کے ممدوحین کی جتنی بڑی تعداد ہے اتنی کسی بھی اردو شاعر کے ممدوحین کی نہیں۔ یہ بات بجائے خود بڑی اہم ہے کیونکہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اتنے ممدوحین سے اپنی شاعری کا خرچ وصول کر سکے۔ پھر ان کے ایسے قصائد کی بھی خاصی تعداد ہے جن کے ایک سے زیادہ ممدوحین کی نشاندہی ہوتی ہے۔ بعض قصائد کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ خود سودا نے ان کو مختلف شخصیتوں سے منسوب کیا یا کاتبوں کے سہو یا دانستہ ترمیم سے یہ صورت پیدا ہوئی۔ بعض قصائد سے واضح طور پر مترشح ہوتا ہے کہ سودا نے خود انھیں مختلف اشخاص کی نذر کیا ہے۔ بعض جگہ اول الذکر صورت پیدا ہونے کا ایک سبب یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان قصیدوں میں مدح اس عمومی انداز میں کی گئی ہے کہ ان کو کسی بھی شخصیت سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ یہ اردو قصائد کا عام انداز بھی رہا ہے بقول حالی:

"مدح میں اکثر ایک نام کے سوا کوئی خصوصیت ایسی مذکور نہیں ہوتی جو ممدوح کی ذات کے ساتھ مختص ہو، بلکہ ایسے حاوی الفاظ میں مدح کی جاتی ہے کہ اگر بالفرض مداح اس علت میں کہ فلاں شخص کی مدح کیوں کی عدالت میں ماخوذ ہو جائے تو قصیدہ میں کوئی لفظ ایسا نہ ملے جس سے اس کا جرم ثابت ہو سکے۔ مدح میں زیادہ تر وہی معمولی محامد بیان ہوتے ہیں جو قدیم سے شعراء باندھتے چلے آئے ہیں اور ہر ایک خوبی کے بیان میں ایسا مبالغہ کیا جاتا ہے کہ قصیدہ کا مصداق نفس الامر میں کوئی انسان قرار نہیں پا سکتا۔ ممدوح کی ذات میں جو واقعی خوبیاں ہوتی ہیں ان سے اصلاً تعرض نہیں کیا جاتا بلکہ بجائے ان کے ایسی محال باتیں کی جاتی ہیں جن کی اضداد اس کی ذات میں موجود ہیں۔"[1]

اور جب متن قصیدہ میں ممدوح کا نام بھی مذکور نہ ہو تو اس تعین میں اور بھی زیادہ دشواری ہوتی ہے کہ صرف عنوان قصیدہ میں تبدیلی ایک کے بجائے دوسرے نام سے نسبت کا سبب بن سکتی ہے۔

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری ص ۹۸

سودا کے کلام کی مقبولیت ان کی زندگی میں ہی عام ہو چکی تھی۔ ان کے کلام کے مکمل اور نامکمل بے شمار مخطوطات تیار کیے گئے ــــ ان کی زندگی میں بھی اور ان کی وفات کے بعد بھی۔ ان میں بعض نسخوں کی کتابت اور فراہمی کلام میں خاصی کاوش کی گئی۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ آج جو نسخے دستیاب ہیں ان میں سے کوئی بھی سودا کی نظر سے گزرا ہے لیکن کتابت کے اہتمام اور متن کی صحت و عدم صحت کی بنا پر ان میں سے بعض کو بہتر اور قابل ترجیح قرار دیا جاسکتا ہے اور اسی لیے قابل اعتماد اور قابل استناد بھی۔ بعض ان مخطوطات میں بھی جنھیں مستند قرار دیا جاتا ہے (اور وجہ استناد صرف یہ ہے کہ وہ سودا کی زندگی میں لکھے گئے۔ حالانکہ اس بات کا کوئی ثبوت تو کیا اشارہ بھی نہیں ملتا کہ وہ سودا کی نظر سے گزرے ہیں) ایسے تسامحات راہ پاگئے ہیں اور بعض قصائد کو مختلف نسخوں میں مختلف افراد سے منسوب کیا گیا ہے۔ دو نسخوں کے علاوہ کلام سودا کے تمام تر نسخے وہ ہیں جو ان کی وفات کے بعد لکھے گئے۔ ان دو میں سے بھی ایک نسخہ[1] جسے رچرڈ جانسن نائب ریذیڈنٹ اودھ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا، سودا کی زندگی کے آخری ایام میں مرتب ہوا۔ یہ نسخہ ۹۵-۱۱۹۳ء میں لکھا گیا اگرچہ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ سودا نے اسے خود جانسن کی خدمت میں پیش کیا لیکن کم از کم ان کے ایما سے یہ پیش کش کی گئی ہے۔ اس بات کا بھی کوئی قرینہ نہیں کہ سودا نے اس پر نظر ثانی کی یا اس کی تصحیح کی۔ بعض دیگر غلطیوں کے علاوہ اس میں املا کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ اس طرح صرف حبیب گنج کلکشن[2] کا ایک نسخہ رہ جاتا ہے جو دہلی میں ۱۱۷۴ھ میں لکھا گیا اور اس لیے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس میں دہلی کے زمانہ قیام تک کا کلام ہے لیکن بعض دیگر شواہد سے یہ بھی ثابت ہے کہ قیام دہلی کا سارا کلام اس میں موجود نہیں ہے۔ اگر ایسی شہادت دستیاب ہوتی جس سے قصائد کی تاریخی ترتیب کا تعین ہو سکتا تو ان قصائد کے ممدوحین اول کے بارے میں یقین سے کچھ کہا جا سکتا، نیز اس بات کی بھی نشاندہی ہو سکتی تھی کہ اس اختلاف میں کاتبوں کے تصرفات کا کہاں تک دخل ہے لیکن افسوس ہے کہ تعین کا یہ وسیلہ موجود نہیں ہے۔

ذیل میں ایسے قصائد کی نشاندہی کی گئی ہے جن کو مختلف نسخوں میں مختلف اشخاص سے منسوب کیا گیا ہے اور اس اختلاف کی توجیہہ نیز اس کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قصیدہ ع "ہے اشتہار تجھ سے مرا اے فلک جناب" کے ممدوح کے بارے میں مختلف نسخے مختلف اطلاع فراہم کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا نسخہ رچرڈ جانسن کو بھی محققین و ناقدین نے مستند اور صحیح قرار دیا ہے۔ اس میں یہ قصیدہ عالمگیر ثانی کے نام سے منسوب ہے۔ ایک نسخہ جو اگرچہ سودا کی زندگی میں نہیں لکھا گیا لیکن جس میں بڑے اہتمام سے سودا کا کلام جمع کیا گیا ہے، انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے میں موجود ہے اس میں سودا کے کئی غیر مطبوعہ قصائد بھی موجود ہیں۔ یہ نسخہ بالعموم اغلاط سے پاک ہے اور اس قصیدے کو "در وصف نواب آصف الدولہ بہادر" بتاتا ہے۔ نسخۂ آسی میں اسے "در ثنائے ..... عالی گوہر محمد شاہ عالم بہادر" لکھا گیا ہے۔ خود قصیدے میں کوئی نام مذکور نہیں ہے۔

تاریخ اور سودا کی سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ دور محمد شاہی تک سودا کی دربار میں رسائی نہیں ہوئی۔ بسنت خاں خواجہ سرا جسے محمد شاہی عہد میں بے پناہ اثر و اقتدار حاصل تھا، سودا کا ممدوح تھا۔ محمد شاہ کی مدح میں سودا نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔

عماد الملک بھی سودا کا ممدوح تھا، اس کی کوشش سے عالمگیر ثانی کی تخت نشینی عمل میں آئی (۱۷۵۴ء - ۱۱۶۷ھ) اور اسی کی وساطت سے سودا کی دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ شاید اسی موقع پر سودا نے عالمگیر ثانی کی شان میں قصیدہ پیش کیا ؎

رکھے ہمیشہ تری تیغ کار کفر تباہ
بحق اشہد ان لا الہ الا اللہ

بادشاہِ وقت کی خدمت میں یہ ان کا پہلا قصیدہ تھا اور ایسا معلوم ہوتا

---

[1] مملوکہ انڈیا آفس لائبریری

[2] مملوکہ مولانا آزاد لائبریری (حبیب گنج کلکشن) علی گڑھ۔

ہے کہ اس کے بعد انھیں عالمگیر ثانی کی شان میں دوسرا قصیدہ لکھنا نصیب نہیں ہوا۔ داخلی طور پر اس قصیدے کے درج ذیل اشعار بھی اس قیاس کی تکذیب کرتے ہیں کہ یہ عالمگیر ثانی کی مدح میں لکھا گیا ہوگا۔

بخشی جو تجھ کو حق نے جوانی میں سلطنت
شیب زمانہ کو یہ ہوئی خواہش شباب
نزدیک شام تجھ پہ شفق پھولتی نہیں
کرتا ہے چرخ پیر حنا باندھ کر خضاب

تخت نشینی کے وقت عالمگیر ثانی کی عمر ۵۵ سال تھی، یہ اشعار اس سے متعلق نہیں ہو سکتے۔

ایک نسخہ جو ۱۲۱۹/۱۲۲۴ھ میں بمبئی میں لکھا گیا، رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ اس میں اس قصیدے کو "در مدح شاہ عالم بادشاہ غازی" بتایا گیا ہے۔ شہزادہ عالی گوہر نے عالمگیر ثانی کے قتل کی خبر سن کر جلا وطنی کے عالم ۱۷۵۹ء/۱۱۷۳ھ میں تاج پوشی کی رسم ادا کی اور "شاہ عالم" کا لقب اختیار کیا۔ سودا کی دربار دہلی تک رسائی کے بعد عالی گوہر شہزادگی کے زمانے میں سودا سے مشورۂ سخن کر چکے تھے۔ ان کی تخت نشینی، سودا کے لیے مسرت کا باعث بھی ہوئی ہوگی اور توقع آفرینی کا بھی۔ انھیں توقعات کے پیش نظر یہ قصیدہ لکھا گیا ہوگا۔ یہ شہادت نہیں ملتی کہ سودا نے کب یہ قصیدہ لکھا اور کس مقام پر شاہ عالم کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن قصیدہ خطابیہ ہے اور مدح غائب کے بجائے مدح حاضر کی گئی ہے۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سودا نے یہ قصیدہ خود شاہ عالم کی خدمت میں پیش کیا ہوگا۔ جلا وطنی کی زندگی گزار کر ۱۷۷۱ء میں شاہ عالم دہلی واپس ہوئے تو فرخ آباد سے بھی گزرے، جہاں سودا اس وقت مقیم تھے۔ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت سودا نے یہ قصیدہ پیش کیا ہو۔

نسخۂ حبیب گنج بھی سودا کی حیات میں لکھا گیا۔ (اگرچہ یہ بھی سودا کی نظر سے نہیں گزرا) اور اس میں سودا کا کم و بیش وہ تمام کلام موجود ہے جو ان کے قیام دہلی کے زمانے میں مرتب ہو چکا تھا۔ اس نسخے میں یہ قصیدہ موجود نہیں ہے، جس سے اس امر کی توثیق ہوتی ہے کہ یہ قصیدہ قیام دہلی کے زمانے میں نہیں لکھا گیا اور اس لیے اس کا عالمگیر ثانی کی مدح میں ہونا بعید از قیاس ہو جاتا ہے۔ اگرچہ، جیسا پہلے ذکر ہوا، قیام دہلی کا سارا کلام اس نسخے میں موجود نہیں ہے لیکن یہ بات محال معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہِ وقت کی مدح میں لکھا ہوا قصیدہ اتنا غیر معروف رہتا کہ مرتب کے علم میں نہ آتا۔

شاہ کمال نے اپنا تذکرہ مجمع الانتخاب دوبارہ ۱۲۱۸ھ میں مرتب کیا۔ اس میں وہ سودا کا ذکر بڑے تپاک اور عقیدت مندی سے کرتے ہیں۔ تمہید میں لکھا ہے کہ:

"..... و معمول حضور (آصف الدولہ) ہمیشہ چنیں بود کہ دیوان کلیات مرزا صاحب مرزا رفیع سودا بر پلنگ می ماند ..."[1]

مجمع الانتخاب میں سودا کے ۱۴ قصائد بہ تمام و کمال نقل کیے گئے ہیں۔ اس میں اس قصیدے کا عنوان "در مدح محمد شاہ عالم بہادر متخلص آفتاب" درج ہے۔ یہ بات عین قرین قیاس ہے کہ شاہ کمال نے سودا کا کلام اسی نسخے سے انتخاب کیا ہوگا جو ہمیشہ آصف الدولہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اگر یہ قصیدہ آصف الدولہ کی مدح میں ہوتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ خود آصف الدولہ کے نسخے میں اسے شاہ عالم کے نام سے منسوب کیا گیا ہوتا۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ قصیدہ شاہ عالم متخلص آفتاب کی مدح میں لکھا گیا اور اس کا ممدوح نہ محمد شاہ ہے، نہ عالمگیر ثانی اور نہ آصف الدولہ۔

سودا کے دو مستند مخطوطات (نسخۂ حبیب گنج اور نسخۂ رچرڈ جانسن) میں ع کیے ہے کاتب دوراں سے منشی تقدیر، کے ممدوح کے نام بھی مختلف ہیں۔ نسخۂ رچرڈ جانسن اسے "در مدح عالمگیر ثانی" بتاتا ہے اور یہ اطلاع اس نسخے کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتی۔ دیگر تمام نسخوں میں اسے عماد الملک سے ہی منسوب کیا گیا ہے۔ داخلی طور پر بھی اس کی تصدیق قصیدے کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

سنا نہیں ہے کہ غازی دیں عماد الملک
جو میر بخشی تھا اس کا سواب ہوا ہے وزیر

---

[1] مجمع الانتخاب (قلمی) ورق ۵۸ الف مملوکہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔

نسخۂ رچرڈ جانسن میں بھی یہ شعر اسی طرح موجود ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عنوان میں عالمگیر ثانی کا نام محض سہوِ کاتب ہے۔ سلطان عزیز الدین بن معز الدین کو عالمگیر ثانی کے معزز لقب سے تخت پر بٹھانے میں عماد الملک کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس وقت (۱۷۵۴ء) بھی عماد الملک سودا کا ممدوح تھا۔ اس قصیدے کے درج ذیل اشعار اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

دہر کی تری کیا ثنا کرے کوئی — کہ جس کے حق میں یہ مطلع ہے شمل مہر
نہیں ہے معجز عیسیٰ سے کم تری تدبیر — کیا ہے زندہ سر نو سے جن نے عالمگیر

قصیدہ ع گوہر سخن کو دیا سنگ رنگ ڈھنگ، شجاع الدولہ کے نام منسوب ہے۔ دو نسخوں کے علاوہ کسی بھی مخطوطے میں اس قصیدے کا عنوان درج نہیں ہے۔ قصیدے میں موجود ایک شعر سے اس کا در مدح شجاع الدولہ ہونا معلوم ہوتا ہے ؎

مجھ کو ہنگ بحرِ معانی سے کام ہے — سمجھے سخن کا کیا کوئی خر چنگ رنگ ڈھنگ
یعنی شجاع الدولہ بہادر کہ فیض کا — پہنچا ہے جس کے لاکھوں ہی فرسنگ رنگ ڈھنگ

لیکن بعض نسخوں میں دوسرا شعر موجود نہیں ہے۔ اور اس طرح ان نسخوں سے شجاع الدولہ کے حق میں داخلی تصدیق ختم ہو جاتی ہے۔ ایک نسخہ میں اس کے برخلاف شہادت ملتی ہے۔ اس میں دوسرے شعر کا متن یوں ہے ؎

یعنی عماد ملک بہادر کہ فیض سے
پہنچا ہے جس کے لاکھوں ہی فرسنگ رنگ ڈھنگ

لطف کی بات یہ ہے کہ پورا قصیدہ نہ نسخۂ حبیب گنج میں ہے اور نہ نسخۂ رچرڈ جانسن میں کہ اس کے زمانے کا کچھ تعین کرنے میں مدد ملتی اور اس سے ممدوح کا تعین ممکن ہوتا۔ اس صورت میں یہ سوچا جا سکتا ہے کہ سودا نے اپنے قیام دہلی کے وقت یہ قصیدہ عماد الملک کی مدح میں لکھا اور پھر شجاع الدولہ کے دربار سے وابستگی کے بعد انھیں صرف اتنی ترمیم کی کہ عماد الملک کا نام نکال کر شجاع الدولہ کا نام شامل کر دیا۔ یہ بات یوں بھی بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ قصیدہ نگار شعرا کی روایت میں یہ بات معیوب نہیں رہی ہے کہ ایک قصیدہ کسی ممدوح کے لیے لکھا اور پھر کسی وقت ذرا سی ترمیم کے ساتھ یا کسی ترمیم کے بغیر ہی اسے کسی دوسرے ممدوح کی نذر کر دیا۔ سودا کے یہاں بھی اس کی کئی مثالیں ہیں، جن کے بارے میں سودا کے تمام سوانح نگار اور نقاد تو خاموش ہیں لیکن کلام سودا کے مختلف مخطوطات اس کی شہادت پیش کرتے ہیں۔

تقریباً تمام نسخوں میں سودا کا قصیدہ ؎

اشجار کا بستانِ جہاں کے ہے عجب ڈھنگ
جلتا ہے چنار اس سے رخ گل پہ جو ہو رنگ

شجاع الدولہ سے منسوب ہے۔ اس میں ۴۴ اشعار ہیں۔ ۱۲ سے ۱۷ تک اشعار صنعت توشیح میں لکھے گئے ہیں۔ ان سے شجاع الدولہ کا نام برآمد ہوتا ہے۔ اس طرح اس قصیدے کا در مدح شجاع الدولہ ہونا متعین ہو جاتا ہے۔ لیکن دو نسخے اس سے مختلف صورت پیش کرتے ہیں۔ ایک نسخہ جو ۱۲۱۲ف (مطابق ۱۲۲۳ھ) میں جون پور میں لکھا گیا، خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ اس میں یہ قصیدہ نامکمل شکل میں موجود ہے۔ ۴۴ کے بجائے صرف ابتدائی ۱۲ اشعار پر یہ قصیدہ ختم ہو گیا ہے۔ لیکن اس نسخے میں ایک اور قصیدہ ہے جس کے عنوان میں درج ہے "قصیدہ در مدح نواب معتمد الدولہ ظفر جنگ، یعقوب علی خاں" اور اس کا مطلع ذرا سی ترمیم کے ساتھ یوں ہے ؎

ساکن جو ہیں اس باغ کے ان کا ہے نئے ڈھنگ
جلتا ہے چنار اس سے روئے گل پہ جو ہو رنگ

اس قصیدے میں ۲۴ اشعار ہیں۔ اول الذکر قصیدے میں جو اشعار صنعت توشیح میں لکھے گئے ہیں وہ اور چند دیگر اشعار حذف ہو گئے ہیں۔ باقی اشعار وہی ہیں۔ البتہ اشعار کی ترتیب بدل دی گئی ہے اور دو شعروں میں ذرا سی ترمیم کر کے ظفر جنگ کا نام شامل کر دیا گیا ہے۔ شجاع الدولہ کے قصیدے کا شعر ہے ؎

دنیا میں توقع نہیں انساں کو کسو سے
چھٹ اس کے وزیراب ہے جسے ہند کا اورنگ

ترمیم شدہ شکل یہ ہو گئی ہے ؎

دنیا میں توقع نہیں انساں کو کسو سے
جز معتمد الدولہ نواب ظفر جنگ

اسی قصیدے کا ایک اور شعر ہے ؎

رستم کو خبر ہو کہ ترا اس پہ ہے آہنگ
جیوے کبھی جو یہ سن کے تو کھایا نہ لگے انگ

ترمیم کے بعد اس کی شکل درج ذیل ہو گئی ہے ؎

رستم سے اگر کہیے کہ آتا ہے ظفر جنگ
چھوٹے بھی اگر سن کے تو کھلیا نہ لگے انگ

اس نسخہ کے متن کی تائید ۱۲۶۸ھ کے اس نسخے سے ہوتی ہے جو حیدرآباد میں لکھا گیا اور اب انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ اس میں یہ قصیدہ بلا عنوان درج ہے لیکن متن اور ترتیب اشعار مذکورہ بالا نسخے کے مطابق ہے۔ متن میں شجاع الدولہ کے بجائے معتمد الدولہ نواب ظفر جنگ کا نام موجود ہے۔ شجاع الدولہ کی مدح میں قصیدہ ع

اشجار کا بستانِ جہاں کے ہے عجب ڈھنگ

اس نسخے میں موجود نہیں ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نسخے کی رو سے اس قصیدے کا ممدوح صرف ایک ہے اور وہ معتمد الدولہ ظفر جنگ ہے شجاع الدولہ نہیں لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پہلے یہ قصیدہ ظفر جنگ کی خدمت میں پیش کیا اور پھر ترمیم و اضافہ کے ساتھ شجاع الدولہ کی نذر کر دیا گیا۔

ایک تہنیتی اور مدحیہ قطعہ ع

نوید زیر فلک یوں ہوئی ہے شہرۂ عام

ہے۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ایک نسخے میں اس کا عنوان "قطعہ مبارک باد عید در مدح بادشاہ عالمگیر ثانی خلد اللہ ملکہ" درج ہے۔ اسی سے غالباً نسخہ آسی میں اخذ کیا گیا ہے اور یہی عنوان دیا گیا ہے۔ اس کی تائید میں اس قطعہ میں دو اشعار ہیں ؎

عزیز دولت و دیں بادشاہ عالمگیر   ضعیف کفر سے جس سے ہے اور قوی اسلام
زہے وہ خسروِ ہندوستاں کہ ہیں جس کے   بلند رتبہ سلاطین عصر سے خدام

اور اس سے اگلا شعر بھی اس سیاق و سباق میں اس نسبت کی تائید کرتا ہے ؎

جہاں پناہ پس از عرض تہنیت سودا
یہ چاہتا ہے دعائیہ پر ہو ختم کلام

لیکن ان دو نسخوں کے علاوہ کسی بھی نسخے میں یہ قرات نہیں ہے۔ اس کی دو مختلف قراتیں ملتی ہیں۔ مذکورہ بالا ۱۲۲۳ھ کے جون پوری نسخے میں یہ اشعار درج ذیل صورت میں ہیں ؎

عماد دولت و دیں آصفِ سلیماں جاہ   ضعیف کفر سے جس سے ہے اور قوی اسلام
زہے وزیر وہ ہندوستاں کا ہیں جن کے   بلند رتبہ سلاطین عصر سے خدام
امیدگاہا پس از عرض تہنیت سودا   یہ چاہتا ہے دعائیہ پر ہو ختم کلام

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے کتب خانہ کے ایک کرم خوردہ نسخہ میں بھی یہی قرات ملتی ہے۔ باقی نسخوں میں "عماد دولت و دیں" کے بجائے "شجاع دولت و دیں" کر دیا گیا ہے۔ باقی متن جون پوری نسخے کے مطابق ہے۔ اپنی منصبی حیثیت میں عماد الملک اور شجاع الدولہ دونوں ہمسر تھے اس لیے کسی تبدیلی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

عالمگیر ثانی کی تخت نشینی کے وقت سودا دہلی میں تھے اور انھیں عماد الملک کی وساطت سے دربار تک رسائی بھی ہوئی تھی اور انھوں نے عالمگیر ثانی کی مدح میں یہ قصیدہ بھی لکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ قطعہ عماد الملک کے لیے لکھا گیا۔ پھر دربار سے توسل کے بعد اسے عالمگیر ثانی کی نذر کر دیا گیا اور جب سودا شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہوئے تو اس میں مزید ترمیم کر کے اسے شجاع الدولہ کی نذر کر دیا۔ اگرچہ یہ قطعہ نسخہ حبیب گنج میں موجود نہیں ہے، لیکن یہاں اس کی عدم موجودگی کے باعث یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قیام دہلی کے زمانہ میں نہیں لکھا گیا ہوگا۔

ایک اور قصیدہ ع

صباح عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام

نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں بہادر کی مدح میں ہے۔ داخلی طور پر قصیدے کے دو اشعار اس کے موید ہیں ؎

اسی کے عہد مبارک کا ہے مگر یہ سبب   جس افتخار زماں کا حسن رضا خاں نام
زہے وہ خانِ رفیع المکان عالی قدر   زہے وہ خانِ فلک مرتبت ذوی الاکرام

مگر ایک نسخہ میں اس قصیدے کے سر عنوان "در مدح نواب شجاع الدولہ بہادر رستم جنگ" درج ہے اور ان دو اشعار کا متن بھی بدلا ہوا ہے ؎

اسی کے عہد مبارک کا ہے مگر یہ سبب   جس افتخار جہاں کا شجاع الدولہ نام
زہے وزیر رفیع المکان عالی قدر   زہے خدیو فلک مرتبت ذوی الاکرام

سرفراز الدولہ حسن رضا خاں اور شجاع الدولہ دونوں ہی سودا کے ممدوح ہیں۔ حسن رضا خاں کا عروج آصف الدولہ کے عہد میں ہوا۔

شجاع الدولہ کے عہد میں وہ معمولی عہدوں پر فائز رہے لیکن آصف الدولہ وزارت پر مامور ہوئے تو ان کو نائب مقرر کیا گیا۔ اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ پہلے یہ قصیدہ شجاع الدولہ کے لیے ہی کہا گیا ہو اور پھر شجاع الدولہ کے انتقال اور حسن رضا خاں کے عہدۂ نیابت پر مامور ہو جانے کے بعد اسے سرفراز الدولہ حسن رضا کی خدمت میں پیش کر دیا گیا ہو اور ضروری ترمیم بھی کر دی گئی ہو۔

رچرڈ جانسن کی مدح میں جو قصیدہ ؏

دیکھا نہ جائے اس سے روئے گل رعنا بہ رنگ

لکھا گیا، اس کے انتساب میں بھی اختلاف ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ خود وہ نسخہ جسے رچرڈ جانسن کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا، اس بارے میں خاموش ہے۔ اس نسخے میں اس قصیدہ کا کوئی عنوان درج نہیں ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ اس نسخے میں یہ قصیدہ آغاز متن سے پہلے درج ہے۔ داخلی طور پر بعض اشعار سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہ قصیدہ ممتاز الدولہ حسام جنگ، رچرڈ جانسن کی مدح میں ہی لکھا گیا ہے۔ مثلاً یہ شعر ؎

ہے اب مگر وہ ایک کہ جس کا ہے یہ خطاب
ممتاز دولہ فخر جہان و حسام جنگ

اور پھر مدح غائب سے مدح حاضر کی طرف آتے ہوئے یہ شعر ؎

تیری وہ ذات گو تو نہیں ہے سرِ فرنگ
کرسی میں تیری سایۂ اورنگ کا ہے ڈھنگ

واضح طور پر ممدوح کی ذات کا تعین کرتے ہیں لیکن ایک نسخے میں اس قصیدے کا عنوان "درمدح خلف حسن رضا خاں" درج ہوا ہے۔ اشعار میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ مذکورہ بالا اشعار کا کوئی بھی تعلق حسن رضا خاں کے بیٹے سے نہیں ہو سکتا۔ اسے بساط لکھنؤ پر کوئی اہم حیثیت بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کے متعلق صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فوج میں جرنیلی کے عہدے کے لیے نامزد کیا گیا، لیکن یہ شخص مرض صرع میں مبتلا تھا اور مجنوں صفت آزاد مشرب تھا۔ سوداؔ سے یہ توقع کم معلوم ہوتی ہے کہ ایسے شخص کے لیے اس نے قصیدہ لکھا ہو۔ ایک اور نسخے میں اس قصیدے کا عنوان "فی المدح جانشین" درج ہے۔ جس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ یہ جانشین حسن رضا خاں کا ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ تصرف کاتب سے جانسن کی شکل بدل کر جانشین ہو گئی ہو۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس قصیدے کا انتساب میں سوداؔ نے کوئی تبدیلی نہیں کی، بلکہ صرف کاتبین کے سہو سے ایسا ہوا۔

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سوداؔ نہ صرف فن قصیدہ گوئی میں مہارت تامہ رکھتے تھے، بلکہ ان کو درباروداری کا سلیقہ بھی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کب کس شخص کی مدح کی جائے اور کس طرح اپنے فن کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کی جائے۔ وہ کسی ایک دربار سے وابستہ نہ رہے۔ اس دور پر آشوب میں جب سلاطین قتل کیے جا رہے تھے، نوابین و رؤسا معاشی بدحالی میں مبتلا تھے، امرا باہمی سازشوں کا شکار ہو رہے تھے، نہ صرف یہ کہ محبت و عداوت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، بلکہ انقلاب زمانہ اور معاشی زبوں حالی سے مجبور ہو کر لوگ ان کو نبھانے کی مقدرت بھی نہیں رکھتے تھے، کسی ایک در سے وابستگی ممکن بھی نہیں تھی۔ یہ ان کی زمانہ شناسی ہی تھی کہ وہ تمام عمر آسودگی سے زندگی بسر کرتے رہے۔ ان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دستور الفصاحت کے مصنف حکیم سید احمد علی یکتا نے لکھا تھا:

"معہذا دیگر اوصاف و کمالات آں بے عدیل کہ بالنفس شریف خود جمع داشت، چہ گویم؟ از آداب صحبت ملوک و سلاطین و آگاہی علم موسیقی و طرح نہادن بر سلام و مرثیہ ہائے گفتۂ خود و تہذیب اخلاق و تالیف قلوب و علم مجلس وغیرہ چہ ہنرہا کہ در ذات کامل الصفات او نبود؟ بدام بہ صحبت امرا و وزرا گزرانیدہ، ہمیشہ بخلاع ثمین و جائزہائے سنگین از خدمت اینہا سرفراز بودہ"۔ ص۳۱

زبان و بیان پر عبور اور ان کی فنی مہارت نے ان کے "علم مجلسی اور تالیف قلوب" کی صفت کے ساتھ مل کر ان کو ایک کامیاب قصیدہ گو شاعر بنا دیا تھا۔ اس کا انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے ہم عصر امرا، وزرا اور سلاطین سے اس کا بھرپور خراج وصول کیا۔

★

ڈاکٹر ستیانیتی رنجن بھٹاچاریہ

تیتو میر — ایک مجاہد آزادی

اٹھارویں صدی کے آخری دور سے لے کر پورے انیسویں صدی میں ہندستان کے ہر حصے میں کم و بیش وہابی تحریک چلی ہے۔ اس تحریک کے سرچشمہ درحقیقت شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء تا ۱۷۶۲ء) تھے جس کی وجہ سے اسے ولی اللہی تحریک بھی کہا گیا ہے۔ ابتدائی مرحلے میں یہ صرف ہندستانی مسلمانوں میں مذہبی اصلاح کی ایک تحریک تھی اور ملک کی سیاست سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اصلاحِ قوم کی کوئی تحریک سیاست سے بالکل بے تعلق نہیں رہ سکتی اور وہابی تحریک کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔

"ہندستانی مسلمانوں" کی اپنی ایک الگ تاریخ ہے۔ ہندستان میں باہر سے آنے والے مسلمانوں نے طویل عرصے تک حکومت ضرور کی لیکن وہ یہیں رہ بس گئے۔ انھوں نے اسے اپنا وطن سمجھا اور یہاں کے باشندوں سے یہاں تک گھل مل گئے کہ ان ہندستانی مسلمانوں اور بیرونی مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں فرق پیدا ہوگیا۔ یہ نہیں کہ ہندستانی مسلمان صدقِ دل سے ایمان نہیں لے آئے تھے بلکہ ہندستانی تہذیب کی جڑیں یہاں کے باشندوں میں اتنی مضبوط پیوست تھیں کہ مذہب اسلام کو دل سے قبول کرنے کے بعد بھی تہذیبی طور پر وہ بدلے نہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کی بڑی اکثریت ان ہندوؤں پر مشتمل ہے جو نچلے طبقہ اور نچلی ذات کے ہندو تھے عموماً کسی تبلیغی مشن کا اثر عوام کے غریب اور پچھڑے ہوئے طبقے پر نیز سماجی طور پر پست طبقوں پر زیادہ ہوتا ہے اور ہندستان میں اسلامی تبلیغ کو اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس میں بھی کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ بعض موقعوں پر جبریہ تبدیلی مذہب کے کچھ واقعات بھی ہوئے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ بہرحال تاریخ میں جہاں ہمیں مذہب کی جبریہ تبدیلی کے کچھ واقعات ملتے ہیں، وہاں ایسے مسلمان حکمراں بھی ملتے ہیں جو دل و جان سے ہندو مذہب کی عزت کرتے تھے۔ ہندوؤں کے ساتھ نرمی، اخلاق، بھائی چارگی اور انصاف سے پیش آتے تھے۔ لیکن ہندستان میں (خاص کر بنگال میں) اسلام کو پھیلانے کا حقیقی سہرا مسلمان پیر، فقیر اور صوفیائے کرام کے سر ہے جو لوگ ہندو سماج سے بہت قریب تھے اور گاؤں گاؤں گھوما کرتے تھے اور جن کی وجہ سے سینکڑوں کی تعداد میں ہندو اسلام میں داخل ہوگئے۔ لیکن یہ سب ہندو تبدیلی مذہب کے باوجود اپنے ساتھ اپنے دیرینہ رسم و رواج بھی لیتے آئے اور اپنی قدیم روایات کو انھوں نے یا تو جوں کا توں برقرار رکھا یا پھر اس میں تھوڑی بہت تبدیلی کرلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسب سابق ان ہندستانی مسلمانوں میں قدیم غیر اسلامی عقائد قائم رہے۔ آج بھی صدیوں کے بعد انقلابات زمانہ کے باوجود ہندستانی مسلمانوں میں (خاص کر دیہات کے رہنے والوں میں) لاتعداد قدیم رسم و رواج اور عقائد قائم ہیں۔ زچہ گھر کی رسموں سے لے کر شادی بیاہ کی رسموں تک اور پھر مسلم سماج میں ذات پات کی جداگانہ بندشیں، ہندو دیومالا اور رزمیہ داستانوں کی طرح ان کے بھی پیر بابا، غازی بابا اور مختلف فقیروں کے قصے، کرامات اور کہانیاں ہیں یعنی ہندستانی مسلمانوں کے سماج میں مقامی رنگ آج بھی نمایاں ہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے ان ہی باتوں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے بالکل درست لکھا ہے کہ[1] "یہ مقامی اثر بنگال اور بہار میں جتنا نمایاں ہے

[1] مضمون اردو میں وہابی ادب از خواجہ احمد فاروقی

شاید اتنا کسی جگہ نہیں اور یہی وہ علاقہ ہے جہاں وہابی تحریک سب سے زیادہ مقبول اور موثر ہوئی۔

بنگال میں وہابی تحریک کے سلسلے میں ایک نام جو سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہے وہ تیتومیر کا ہے۔ تیتومیر کی کوئی سوانح حیات ایسی نہیں ہے جس سے ان کی زندگی اور کارناموں کا ہمیں تفصیلی علم ہو سکے۔ لیکن ان کے سلسلے میں کئی لوک کہانیاں، پہیلیاں اور کہاوتیں آج بھی مغربی بنگال، خاص کر بشیرہاٹ ضلع ۲۴ پرگنہ کے عوام میں مقبول ہیں۔ جناب احمد شریف نے اپنی بنگلہ تصنیف "پوتھیر پہیلے" میں اس طرح کی چند کہاوتوں، پہیلیوں اور گیتوں کو قلم بند کر کے پیش کیا ہے۔ تیتومیر کے سلسلے میں جو دیگر بنگلہ تصانیف ہیں وہ بہت بعد کی لکھی ہوئی ہیں لہذا یہ کہا نہیں جا سکتا کہ ان تصانیف میں تاریخی حقیقت کتنی ہے۔ بہرحال نامور تصانیف میں بہاری لال سرکار کی "تیتومیرا و جنگ نارکل بیڑیا"، جناب عبدالغفور کی "شہید تیتومیر" اور پروفیسر شانتی مے رائے کی تصنیف "تیتومیر" شامل ہیں۔

"گولی کھا ڈالے گا" ـــــــ کہتے ہیں کہ جب لوگ تیتومیر سے پوچھتے کہ تم انگریزوں کی گولیوں کا کیسے مقابلہ کرو گے تب وہ جواب دیتے "گولی کھا ڈالے گا"۔ تیتومیر کا کہا ہوا یہ جملہ آج بھی اس کے نام کے ساتھ چسپاں ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب انگریزوں کے خلاف زبان ہلانے کی کسی میں ہمت نہیں تھی اور جنگ آزادی کا خیال پوری طرح ابھر کر سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ ایک ایسے زمانے میں تیتومیر نے نہ صرف انگریزوں کے خلاف خود ہتھیار اٹھایا، جہاد کا اعلان کیا بلکہ عوام کو انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے تیار بھی کیا۔

سید نثار علی عرف تیتومیر کا سلسلہ نسب حضرت شاہ جلال یمنی کے شاگرد پیر حضرت گورا چاند کے بھائی سید شہادت علی سے جا ملتا ہے۔ وہ ۱۴ مارچ ۱۷۸۲ء (بعض کے مطابق ۱۷۷۲ء) کو بمقام حیدر پور، بشیرہاٹ، ضلع ۲۴ پرگنہ، مغربی بنگال کے ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بنگلہ زبان میں لفظ "تیتا" کے معنی کڑوا ہے۔ کہتے ہیں کہ بچپن میں تیتو کو اکثر بخار رہتا جس کی وجہ سے اس کو شیولی کے پتے کا رس جس کا ذائقہ نہایت کڑوا ہوتا ہے بطور دوا پلایا جاتا اور تیتومیر ایسی کڑوی دوا کو بھی بہ شوق پی لیتے۔ اسی وجہ سے گھر والے اسے "تیتا میاں" کہتے تھے اور آگے چل کر یہی "تیتا میاں" "تیتومیر" کے نام سے مشہور ہوئے۔

چونکہ وہ ایک کاشتکار کا بیٹا تھا لہذا جیسے جیسے دن گزرتے گئے اور وہ بڑا ہوتا رہا، دن بھر کھیت میں سخت محنت کا کام کرتے کرتے وہ ایک مضبوط جسم کا نوجوان بن گیا۔ اس زمانے میں ملک میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ کسانوں کو ایک طرف تو زمیندار لوگ لوٹتے تھے اور دوسری طرف ڈاکو اور لٹیرے تھے جو گاؤں کا گاؤں لوٹ کر، تباہی مچا کر چل دیتے تھے۔ زمینداروں کا ظلم اور ڈاکوؤں کی لوٹ سے گاؤں کی حفاظت کرنے کے لیے گاؤں کے نوجوان لاٹھی چلانے کی مشق کرتے تھے۔ تیتو نے لاٹھی گھمانے کے فن پر ایسی مہارت حاصل کی تھی کہ وہ ایک لاٹھی کے سہارے کئی لوگوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ اس مہارت کی وجہ سے بعد میں اسے ضلع ندیا کے زمیندار کے یہاں ملازمت ملی تھی لیکن ان ہی دنوں ایک اور زمیندار کے خلاف ہنگامہ اور فساد برپا کرنے کے جرم میں تیتو گرفتار ہوا اور اسے سزا ہو گئی۔ رہائی کے بعد تیتو کا دل اداس تھا اور وہ حج کرنے کے لیے مکہ چلا گیا۔ حج کے دوران اس کی ملاقات حضرت شاہ سید احمد بریلوی (وفات ۱۸۳۱ء) سے ہوئی جن کے زمانے میں وہابی تحریک اپنے نقطہ عروج پر تھی، اور سید احمد بریلوی سے ہی تیتو نے وہابی فلسفہ سے واقفیت حاصل کی اور حج سے واپس آنے کے بعد وہ بنگال میں وہابی تحریک کو پھیلانے میں لگ گئے۔

وہابی تحریک کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں میں جو مقامی تمدن کے اثرات تھے اور جو پرانے رسم و رواج اور عقائد تھے، ان سے ہندوستانی مسلم سماج کو پاک کرنا تھا۔ وہابی درحقیقت مذہب اور کلچر کے بنیادی فرق کو درست طور پر سمجھ نہ پائے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تمام دنیا کے لوگ اگر مذہب اسلام کو قبول کر لیں تو سب کا کلچر بھی ایک ہو جائے گا۔ انسان کے دل و دماغ پر تمدن کے جو گہرے اثرات ہیں، تمدن کی جڑیں کتنی مضبوط ہوتی ہیں، اس پر انھوں نے ہر زاویہ نگاہ سے غور نہیں کیا تھا۔ ایک مذہب کے ماننے والے تو ہر ملک میں ہو سکتے ہیں لیکن ہر ملک میں جغرافیائی، معاشرتی اور تہذیبی حالات یکساں

نہیں ہوتے جس کی وجہ سے تہذیبی قدریں بدل جاتی ہیں۔ ایک ملک کی تہذیبی ترقی میں، اس ملک کی زمین آب وہوا، پیداوار، ندی نالے، معاشرتی نظام سیاسی نظام کے علاوہ وہاں کے لوگوں کی ذہنی ترقی، ان کے احساسات، ان کے تجربے ومشاہدے، جمالیات کا ذوق، ان کے فنون لطیفہ ــــــ شاعری، مصوری، سنگ تراشی نقش، فن تعمیر اور ادب ــــــ سب کا تعلق ہوتا ہے۔ وہابی تحریک نے ان امور پر زیادہ غور وفکر نہیں کیا۔ آج بھی ہندوستانی مسلمانوں میں کئی ایسے رسم ورواج ہیں جو ایران، افغانستان یا عرب ممالک یا افریقہ کے مسلمانوں میں پائے نہیں جاتے[1] ہر زمانے میں مہذب زندگی کا تصور شرعی احکامات سے الجھتا رہا ہے اور شاعروں کا علم اور عشق، زہد اور رندی، عقل اور جنون کو مقابلے پر لانا اس کی علامت ہے کہ مختلف قسم کے ذہنی اور جمالیاتی احساسات کے درمیان پورا ربط قائم نہیں کیا جا سکا"

بہرحال وہابی تحریک کی کامیابی اور ناکامیابی سے یہاں ہمیں اتنی بحث نہیں ہے جتنا کہ تیتومیر کی زندگی سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تیتومیر ایک نہایت ہی بہادر، نڈر اور لڑاکو، انگریز دشمن اور غریبوں کا دوست وہمدرد انسان تھا۔ ظلم کے خلاف اس نے آواز اٹھائی اور ظلم کے خلاف لڑتے لڑتے ہی شہید ہو گیا۔

تیتومیر کو بعض نے (مثلاً استوش دیب کی بڑی بنگلہ لغت کے حصہ شخصیات میں) ہندوؤں کا دشمن لکھا ہے۔ یہ بات تاریخی روشنی میں سراسر غلط ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہابی تحریک ہندو دشمن تحریک نہیں تھی بلکہ مجاہدین ہندوستانی مسلمانوں میں ہندو عنصر کے شمول کے خلاف رہے ہیں اور ہندو پندو رسموں کو جو اسلام میں داخل ہو گئی تھیں نکالنا چاہتے تھے۔ ان کا براہ راست ہندوؤں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ تیتو کی تحریک بنیادی طور پر کسان تحریک تھی۔ یہ درست ہے کہ بنگال کے کسانوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن یہ صرف مسلمان کسانوں کی بات نہیں تھی۔ ظالم زمیندار یا حاکم جب ظلم ڈھاتا ہے تب ہندوؤں اور مسلمانوں کو وہ الگ الگ طور پر نہیں دیکھتا۔ زمینداروں کے ظلم سے ہندو کسان بھی بے حال تھے۔ یہ ہندو کسان عموماً نچلی ذات سے تعلق رکھتے تھے جس کی وجہ سے ان کو نہ صرف زمینداروں کا ظلم بلکہ اونچی ذات کے ہندوؤں کا ظلم بھی سہنا پڑتا تھا لہٰذا ہندو کسانوں نے بھی تیتومیر کا ساتھ دیا ہے۔

ان دنوں پورے بنگال میں کسانوں سے زبردستی نیل کی کاشت کرائی جاتی تھی۔ کیونکہ اس کاشت سے انگریزوں اور ساتھ ہی زمینداروں کو تجارتی طور پر خوب فائدہ تھا لیکن فرقہ پرستی کو ہوا دینے میں یہ کام آیا ہے کہ زیادہ تر زمیندار اونچی ذات کے ہندو تھے جن کے خلاف کسانوں کے انقلابی رہنما تیتومیر کو لڑنا پڑا تھا۔ مثلاً پوڑا کے زمیندار کرشن دیب رائے، گوبرڈنگا کے زمیندار کالی پرشنیا مکرجی اور گوبند پور کے زمیندار دیب ناتھ رائے وغیرہ۔

تیتو کا ذکر کرتے ہوئے سپرکاش رائے نے اپنی بنگلہ تصنیف "ہندوستان میں کسانوں کی بغاوت اور جمہوری جدوجہد" میں لکھا ہے ــــــ "تیتومیر دیگر مکتبۂ فکر کے مسلمانوں کے بھی خلاف تھے......" پھر اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بھوشنا کے زمیندار منوہر رائے تیتومیر کے طرف دار تھے اور اس نے تیتومیر کا طرح طرح سے ساتھ دیا تھا۔"

عبدالغفور صدیقی نے "حیات تیتو" میں لکھا ہے ــــــ "تیتومیر نے یہ کوشش کی تھی کہ اس علاقے کے ہندو مسلم کسان اور دیگر لوگ بلاتفریق مذہب زمینداروں کو لگان دینا بند کر دیں اور تیتو کے حکم سے رعیت کی اکثریت نے لگان دینا بند کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ کئی گاؤں کے ہندو مسلم کسانوں نے تیتومیر کو آزاد بادشاہ تک تسلیم کر لیا تھا ــــــ" شری بہاری لال سرکار نے صاف لکھا ہے "اس بغاوت کو فرقہ پرستی کا رنگ دینا غلط ہے۔ جو ایسا کرنا چاہتے ہیں وہ حق پرست نہیں ہے بلکہ کسی خاص سیاسی مفاد کے تحت ہی وہ ان مسلم دیش بھگتوں پر فرقہ پرستی کا فرضی رنگ چڑھاتے پھرتے ہیں۔"

انگریزی حکومت زمینداروں کی سرپرست رہی ہے چونکہ زمینداری

---

[1] تاریخ تمدن ہند۔ از محمد مجیب

نظام حکومت ان کے حق میں مفید رہی ہے۔ اس لیے زمینداروں کے حقوق کی حفاظت کرنا بھی انگریزوں کا کام تھا۔ زمین داروں کے تحفظ کے لیے انگریزوں نے جب تیتو کے خلاف فوجی کارروائی کی تب تیتو کو انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کرنا پڑا لیکن تیتو میر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ۱۸۳۱ء کی کسان بغاوت کو انگریزوں اور زمینداروں نے متحد ہو کر کچل ڈالا گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنگ نے تیتو میر کے خلاف فوج بھیج دی۔ اور فوج نے نارکیل ڈنگہ میں تیتو کے بانس کے قلعہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ آخر کار قلعہ پر حملہ ہوا اور ایک توپ کے گولے سے تیتو میر شہید ہو گئے۔

پروفیسر شانتی مے رائے نے لکھا ہے ——— "تیتو میر کو شہید ہوئے دو سو سال گزر گئے ہیں لیکن آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کھلنا ۲۴ پرگنہ اور ندیا وغیرہ کے علاقے میں آباد ہندو مسلم عوام ان کی تاریخی موت پر فخر کرتے ہیں۔ ایک زمانے میں انگریز اور ان کے طرف دار زمینداروں نے تیتو میر کے خلاف جو جھوٹی باتیں پھیلائی تھیں آج اس سب جھوٹ کا پول کھل چکا ہے اور لوگوں میں وہ جھوٹی باتیں زندہ نہیں ہیں۔"

لیکن یہ مجاہد آزادی، یہ وہابی رہنما، یہ باغی کسان رہنما بھی آج ایک پیر کی طرح پوجا جانے لگا ہے۔ اس کے ماننے والے اسے ایک صوفی کی طرح پوجتے ہیں۔ توپ کے گولے سے تیتو میر کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا تھا۔ بعد میں ہگلی کے کسانوں نے ان ٹکڑوں کو چن چن کر جمع کیا اور نارکل بیڑیا میں تیتو کا مزار قائم کیا گیا۔

تیتو میر کے بھگتوں میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی اور عام طور پر سب لوگ ہی تیتو کو ایک دیش بھگت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ بادڑیا تھانہ کے تحت سلو یا گاؤں سے ہر سال محرم میں جو تعزیہ نکلتا ہے اسے نارکل بیڑیا میں تیتو کی درگاہ پر لاتے ہوئے گھوشس پور، خیڈی پور اور بڑ دیج وغیرہ گاؤں میں روکا جاتا ہے اور ہندوؤں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے مجلس "قائم" ہوتی ہے۔ ہر سال حیدر پور میں محرم کے دنوں تقریباً ۱۰ ہزار مسلمان جمع ہوتے ہیں اور دس دن تک میلہ لگتا ہے۔ میلے کے آخری دن دھوم دھام اور چہل پہل ہوتی ہے اور اس طرح آج بھی عوام میں تیتو میر کی یاد تازہ ہے

★

وقار خلیل

فلسفی پیامبر

(آنجہانی ڈاکٹر رادھا کرشنن)

وہ فلسفی پیام بر
وہ روشنی کا سلسلہ
معلّم معاشرہ
ورق ورق کتاب دل
نئی صدی میں دھیان اور گیان کا وہ منتہی
دلوں کے دردِ مشترک کا راز داں
فلاسفر، مزاج داں
شعورِ ذات و کائنات کا وہ ایک آسماں
تمام چشم و گوش و حرف و لب متاعِ جاں
تمام شرق و غرب جس کے فکر کی تجلیاں
قلم لکھے افق افق مہ و نجوم
وہ آدمی لباسِ گل میں کہکشاں نژاد تھا
اسے جنوں سے پیار تھا کہ وہ خرد شعار تھا
وہ حق شناس مجتہد کہ مرد پاکباز تھا
وفا نہاد تھا

ایس۔ امرت سنہا

غزل

غزلخواں مست و رقصاں بیخود و سرشار آتا ہے
نہ پوچھو دل کا عالم جب پیامِ یار آتا ہے

یہی دیکھا ہے جو آیا وہ عقل و ہوش کھو بیٹھا
بظاہر بزم میں اس کی ہر اک ہشیار آتا ہے

سعادت اس کی دیوانوں کے حق میں لکھ گئی شاید
کہاں اوروں کے حصے میں فرازِ دار آتا ہے

طلب گارانِ راہِ حق سمجھ لیں سوچ لیں پہلے
کہ اس میں اک حسیں بت خانۂ پندار آتا ہے

یہ جذبِ دل کی باتیں ہیں کہ ذکرِ یار بھی ہر دم
جو آتا ہے بہ افسونِ جمالِ یار آتا ہے

زمانے بھر کی افسردہ دلی دیکھی نہیں جاتی
نظر آتا ہے جو بھی صورتِ بیمار آتا ہے

کوئی دیکھے حیا کی کارفرمائی معاذ اللہ
جب ان کے سامنے ذکرِ لب و رخسار آتا ہے

لرز جاتا ہے دل کیا کیا گماں ہوتے ہیں کیا کہیے
پئے تسکیں جو بھولے سے کوئی غمخوار آتا ہے

اسی سے زندگی کے کچھ نہ کچھ آثار ملتے ہیں
غنیمت ہے جو کوئی برسرِ پیکار آتا ہے

مئے و خورشید و انجم ہیچ ہوتے ہیں نگاہوں میں
مگر یہ عالمِ مستی بہ پیشِ یار آتا ہے

وہی سنہا جسے سب رندِ خوش اوقات کہتے تھے
وہی اب میکدے سے بھی بہ حالِ زار آتا ہے

اے۔م۔ شاہد

(ڈرامہ)

زندہ مُردہ

کردار

نرملا دیوی ـــ منوہر بابو کی بیوی
موہن ـــ منوہر بابو کا لڑکا
کملا دیوی ـــ پڑوس کی ایک عورت

منظر:-
ایک بڑا کمرہ کمرے میں دو دروازے کھلتے ہیں ایک اندر کی طرف۔ دوسرا باہر کی طرف۔ کمرے میں ایک بڑی سی میز رکھی ہے۔ میز پر الارم گھڑی اور دو تین اخبار نظر آ رہے ہیں۔ میز کے پاس دو کرسیاں پڑی ہیں۔ دیوار پر منوہر بابو کی تصویر آویزاں ہے۔ اس وقت صبح کے آٹھ بجے ہیں۔ موہن کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا ہے۔

نرملا دیوی ـــ بیٹا آج سخت سردی پڑ رہی ہے، کوٹ پہن لے۔

موہن ـــ کوٹ ... میرے پاس کوٹ کہاں ہے ماں؟

نرملا دیوی ـــ وہی اپنے پتا جی والا۔

موہن ـــ (حیرانی سے) پتا جی والا کوٹ۔ کیا تم نے دان نہیں کیا۔ میں نے کہا تھا نا کہ پتا جی کے مرنے کے بعد ان کی ہر چیز دان کر دو۔ .... مگر ......

نرملا دیوی ـــ مگر میں نے کوٹ رکھ لیا ہے۔

موہن ـــ کیوں۔؟

نرملا دیوی ـــ کوٹ تمھارے پتا جی کی یاد دلاتا رہے گا۔

موہن ـــ دھرم کے مطابق پتا جی کا سب کچھ دان کر دینا چاہیے تھا۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا ماں۔ پتا جی کی آتما کو تکلیف ہوگی۔ دیوار پر پتا جی کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ کیا یہ تصویر کافی نہیں۔ کیا اس تصویر کو دیکھ کر پتا جی یاد نہیں آئیں گے؟ بتاؤ ماں .... تم نے کوٹ کیوں رکھ لیا؟

نرملا دیوی ـــ جو بھی ہو اب تو رکھ ہی لیا ہے۔ تم اسے پہن کر آفس جایا کرو۔

موہن ـــ میں نہیں پہنوں گا۔

نرملا دیوی ـــ (سمجھاتے ہوئے) پہن لو بیٹا سخت سردی ہے اور اس گرانی کے زمانے میں ایک نیا کوٹ سلوانا بس کی بات نہیں۔ تمھاری تنخواہ ہی کتنی ہے۔ پیسہ

جمع کر کے آئندہ سال تمھارے لیے ایک نیا کوٹ
سلوا دوں گی۔ یہ سال کسی طرح اس کوٹ میں گزار دے۔

موہن ——— جیسی تمھاری مرضی۔

[موہن کوٹ پہن کر کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ موہن
کی ماں اندر والے کمرے میں جاتی ہے اور سوپ میں
چاول لے کر آتی ہے۔ اتنے میں کملا دیوی آجاتی ہے۔]

کملا دیوی — کیا کر رہی ہو بہن ؟

نرملا دیوی — ذرا چاول چن رہی ہوں۔ بیٹھو۔
(کملا دیوی فرش پر بیٹھ جاتی ہے)
ان دنوں چاول میں کنکر پتھر اس قدر آنے لگے ہیں کہ
کیا بتاؤں۔ ہر چیز میں ملاوٹ ہی ملاوٹ۔ آدمی
کھائے تو کیا کھائے۔

کملا دیوی — تم ٹھیک کہتی ہو بہن۔ کل رادھا کے پتا جی بازار
سے مٹی کا تیل لائے تو شاید اس میں کچھ ملا ہوا تھا جیسے
میں نے لالٹین جلائی کہ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ سرکار
کو چاہیے کہ ملاوٹ کرنے والوں کو پکڑ کر جیل میں بند
کر دے۔ اگر آج موہن کے پتا جی منوہر بابو زندہ ہوتے
تو وہ ملاوٹ کرنے والوں کو پکڑوا کر سرکار کی ضرور مدد
کرتے۔ بڑے دیش بھگت آدمی تھے وہ بھی۔

نرملا دیوی — بھگوان کی مرضی کے سامنے کس کی چلی ہے بہن۔ ان
کے چلے جانے سے تو میرا اس گھر میں ایک منٹ بھی
رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر موہن نہ ہوتا تو میں بھی
اپنے پتی کے ساتھ جل مرتی۔

کملا دیوی — موہن بڑا اچھا لڑکا ہے۔ بالکل اپنے باپ جیسا
سیدھا سادہ ہے۔

نرملا دیوی۔ دکھ تو یہ ہے کہ موہن کو ابھی اپنے پتا جی کی سیوا کرنے
کا موقع بھی نہیں ملا تھا کہ بھگوان نے انھیں اٹھا لیا۔
(نرملا دیوی آنچل سے آنسو پونچھتی ہے)

کملا دیوی — صبر سے کام لو بہن ... جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

کملا دیوی — دو بج گئے۔

نرملا دیوی — بڑی جلدی دو بج گئے۔ سردی کے دن چھوٹے ہوتے
ہیں۔ اب میرا موہن بھی آتا ہی ہوگا۔

[موہن کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ موہن کے بدن
پر کوٹ نہ دیکھ کر نرملا دیوی حیران رہ جاتی ہے۔
موہن پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے۔]

نرملا دیوی — موہن —؟

موہن ——— (مسکرا کر) میرے بدن پر کوٹ نہ دیکھ کر تمھیں حیرانی
ہو رہی ہے ناماں۔ میں نے کوٹ ایک غریب آدمی
کو دان کر دیا۔

نرملا دیوی — (حیرت سے) کیوں —؟

موہن ——— یہ سن کر شاید تمھیں یقین نہ آئے گا کہ کوٹ پہننے کے بعد
میں مردہ ہو گیا تھا۔

نرملا دیوی — مردہ ... کیسی باتیں کر رہا ہے تو ... پاگل تو
نہیں ہو گیا۔

موہن ——— میں سچ کہہ رہا ہوں۔ جب تک میں کوٹ پہنے
رہا لوگ مجھے منوہر بابو سمجھتے رہے اور میں خود کو مردہ
تصور کرتا رہا ... یہ اذیت، یہ دکھ ... یہ سب
کچھ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا ماں ... اور
میں نے کوٹ ایک غریب آدمی کو دان کر دیا۔ دان
کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں زندہ ہوں۔ اور
ابھی مجھے زندہ رہنا ہے ... تمھارے لیے ماں۔
تمھارے لیے ....

[منوہر اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر رونے لگتا ہے۔
نرملا دیوی کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ کملا دیوی
بھی اداس ہو جاتی ہے۔]

(پردہ گرتا ہے)

★

اختر انصاری

رباعیات

افکار کی گرمی سے پگھلے جاتے ہیں
دم سیل حقائق سے رکے جاتے ہیں
اللہ رے افزونیِ سرمایۂ ذہن
اس بوجھ سے تو شانے جھکے جاتے ہیں

ناشورۂ نیکی و بدی کی چھل بل
گندم کے خمارِ سرمدی کی چھل بل
آزردہ و دل تنگ ہیں پچھلی صدیاں
اللہ رے بیسویں صدی کی چھل بل

دیتا ہوں غمِ عشق کی باہوں کو خراج
اس زیست کی الجھی ہوئی راہوں کو خراج
مجھ سے نہ رکھے چشمِ تضرع خالق
ویرانے سے ملتا نہیں شاہوں کو خراج

دن رات کوئی زہر پیا ہے یارو!
زخموں سے جگر کو بھر لیا ہے یارو!
جلادِ فلک خونی و قاتل ہی سہی
اک قتل تو ہم نے بھی کیا ہے یارو

ہاتھوں میں مرے ساغرِ جم بھی ہوتا
میں بہرہ ورِ ذوقِ نغم بھی ہوتا
شہ رگ سے بھی جو قریب تر ہے میرے
اے کاش وہ نزدیک ستم بھی ہوتا

باوا کرشن گوپال مغموم

قاضی نذر الاسلام

نذر الاسلام! تیرے نغموں پر اہلِ بنگال رقص کرتے ہیں
لوک گیتوں پہ تیرے سر دھن کر دم تری شاعری کا بھرتے ہیں
دردمندی ہے تیرے شعروں میں کیوں نہ ہو شاعرِ عوام ہے تو
خستہ انساں کے جو پیامی تھے ان اکابر کا ہم پیام ہے تو
طبعِ طوفاں پسند نے تیری موڑ بخشا نیا صحافت کو
تیرے خامے کی ہر نگارش نے دی ہوا شعلۂ بغاوت کو
جذبۂ حریت کی گرمی سے تیری ہر نظم تھی حرارت خیز
فتنہ ساماں ہوئی حکومتِ غیر اور تھا خنجرِ تشدد تیز
تجھ پہ الزام تھا بغاوت کا تجھ کو دینا تھی اس کی قیمت بھی
تو نے کس صبر سے قناعت سے جھیل لی قید با مشقت بھی
تجھ کو کھلتے تھے آپسی جھگڑے اے علمدارِ اتحادِ قوم!
خوں رلاتی تھی تجھ کو ناچاقی اے پرستارِ اتحادِ قوم!
جنگِ آزادیِ وطن کا تو قابلِ فخر اک مجاہد ہے
اور تیغ و قلم کے میداں میں مردِ بیباک، فردِ واحد ہے
یہ تنوع ترے مضامیں کا اور یہ وسعت بساطِ سخن
سحر انگیز تری موسیقی غیر فانی ترے نقوشِ فن
قدرداں میں تھا ترے ٹیگور تیرے اسلوب کا ثنا خواں تھا
تھی پسند اس کو تیری نظم و نثر تیرے جوشِ وطن پہ نازاں تھا
مدتوں سے ہے تو خموش، مگر تیرے شعروں میں ہے صدا تیری
اور بنگال کی ہواؤں میں گونجتی ہے ابھی نوا تیری!

۱۹۴۲ء سے قاضی صاحب ایک مجذوبانہ کیفیت میں مبتلا ہو کر خاموش ہیں اور مقیم ڈھاکہ ہیں۔ (بحوالہ "ہست و بود" مصنفہ حضرت عرش ملسیانی) مغموم

ڈاکٹر فضل امام

سنسکرت ناول نگاری

تاریخی جائزہ

جہاں تک ڈرامہ نگاری کا تعلق ہے سنسکرت ادب ایک شاندار روایت رکھتا ہے لیکن ناول کے میدان میں وہ کافی کم مایہ ہے۔ درحقیقت سنسکرت میں ناول نگاری کا رجحان بنگلہ ناولوں کے ترجمہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے قبل داستان گوئی کا جو انداز تھا اس کی ترقی یافتہ شکل بان بھٹ کی تصنیف "کادمبری" میں اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ نظر آتی ہے جس کا بھرم مشہور مصنف شیو رام ترپاٹھے (۱۷۰۸-۱۷۸۸ء) کی "من دار منجری" میں ملتا ہے پھر بھی تکنیک اور ہیئت کے اعتبار سے جو داستان اور ناول میں بنیادی فرق ہوتا ہے وہ سنسکرت کے ابتدائی ناولوں میں نہیں ملتا ہے۔

سنسکرت ادب کے دورِ جدید میں ناول نگاری کا آغاز امبیکا دت بیاس کے ناول "شیو راج وجے" (۱۹۰۱ء) سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ کچھ ناقدین اس ناول کو طبع زاد اور منفرد کہتے ہیں لیکن دراصل امبیکا دت بیاس کا یہ ناول بنگالی ناول نگار رمیش چندر دت کے ناول "مہاراشٹر جیون پربھات" کا آزاد ترجمہ ہے۔ آچاریہ مہابیر پرشاد دویدی نے بیاس جی کو اس کے ترجمے کے لیے متوجہ کیا تھا۔ "مہاراشٹر جیون پربھات" ایک اچھا ناول ہے اس کا ترجمہ کرشن موہن لال جوہری نے انگریزی میں شواجی نام سے کیا ہے۔ امبیکا دت بیاس کے بعد شیل تاتاچاریہ، اَپّا شاستری، ہری چرن بھٹاچاریہ کے نام اہم ہیں انھوں نے بنگلہ کے مشہور اور اہم ناولوں کو سنسکرت میں ترجمے کے ذریعہ سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چنانچہ "کھشتریہ رمڑی" "درگیش نندنی" "دیوی کمد ھوتی" "اندرا"، "کرشن کانتیہ نروانم" سب کے سب ترجمے ہیں۔

۱۸۶۳ء کے لگ بھگ انگریزی سے ترجمے کا رجحان بھی پیدا ہوا جس کا سہرا راج رجورم کے سر باندھا جا سکتا ہے۔ موصوف نے شکسپیر کے ڈرامہ "اتھیلو" کا ترجمہ "ادال چرتم" نام سے کیا اور اس

مضمون نگار

ڈرامے کو ناول کی شکل دی ہے۔ راج رجورم نے اکثر و بیشتر انگریزی ناموں کو سنسکرت بنا دیا ہے اس لیے ان کے ترجمے اصل سے کچھ مختلف ہو جاتے ہیں لیکن پی کے کلیان رام شاستری نے شیکسپیر کے (LUCRECR) کا ترجمہ ناول کی شکل میں "لنگ لتا" (लवङ्गलता) کے نام سے کیا ہے اور اس میں کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہونے دیا ہے۔ ان کے علاوہ ترولاچاریہ نے شیکسپیر کے COMEDY OF ERRORS کا ترجمہ "بھارت ولاسم" کے نام سے اور نگاچاریہ نے VICOR OF FIELD کا ترجمہ "پریم راجیم" کے نام سے کیا ہے۔ جن میں ترجمے کا فن کافی پختہ اور جاندار ہو گیا ہے بلکہ اس چابک دستی سے کیا ہے کہ اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔

اسی عہد میں تامل کے دو مشہور ناولوں کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں اننتاچاریہ نے "سنار چرتم" اور داس دیو آتما رام لاگرنے بلدی دانم شائع کرایا تھا۔ جس میں پہلا ناول مشہور ہندی ادیب و شاعر جگن ناتھ پرشاد کے ناول کا ترجمہ ہے اور دوسری تصنیف کے خالق تر سنگھ چنتامنی کیلکر ہیں۔ ان ترجموں کے علاوہ اس دور میں ایسے سنسکرت ناول بھی عالم وجود میں آئے جن کے قصے مہابھارت، رامائن اور پرانوں پر منحصر تھے جس سے حیات و کائنات سے کوئی زیادہ

تعلق نہیں ہے اور نہ تو کوئی نتیجہ خیز کیفیت ہے بس بہیا نیہ انداز میں قصے پیش کیے گئے ہیں جن کو آگے بڑھانے کے لیے کرداروں کو تراشنا پڑا ہے۔ اس کی مثال "راما ئن سنگرہ کے بھیشم وجے" اور مہابھارت سنگرام نامی ناولوں میں مل جاتی ہے۔ اساطیری داستانوں کو بنیاد بنا کر ناول لکھنے والوں میں شنکر لال مہیشور کا نام سرفہرست آتا ہے ان کے ناولوں میں ان سویٔا بھیدوم، بھگوتی بھاگیودیہ چندر پربھا چرتیم دلکش اور پرتاثیر ناول ہیں۔ جن میں زندگی کے کچھ پیچیدہ گوشے، نفسیاتی گرہیں کھولنے اور سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ گنپت مُنی، گوپال شاستری اور شری نواس آچاریہ کے ناول روحانی روایات کے حامل ہیں۔

تاریخی واقعات اور گرد و پیش کے حالات کے تحت بھی اس دور میں سنسکرت ناولوں کے موضوعات رہے ہیں۔ چنانچہ کرشنماچاریہ کے دو تاریخی ناول — ذرو دوچہ اور چندر گپت (۱۹۰۹ء، ۱۹۰۸ء) شائع ہوئے۔ ہیتہ سنگھ چاریہ نیکر نے "سوداہنی" نامی ناول ۱۹۰۵ء میں لکھا تھا۔ جس میں مگدھ کے راجہ شورسین اور ودربھ کی راجکمار "سوداہنی" کے عشق و محبت کی کہانی دلچسپ اور دل گداز پیرایے میں لکھی گئی تھی۔ اسی عہد میں لگ بھگ چالیس چالیس عذرمانی اور سماجی انداز کے ناول سنسکرت میں لکھے گئے ہیں۔ قصہ پن، ٹکنیک، کردار نگاری، منظر کشی، کشمکش اور نقطۂ عروج وغیرہ کے اعتبار سے یہ ناول کسی حد تک مکمل کہے جا سکتے ہیں کیونکہ ابتدائی سنسکرت ناولوں میں جو سطحیت، ناپختگی، قصوں کا ڈھیلا ڈھالا پن زندگی پر فن کی گرفت کی کمی کھٹکتی ہے وہ تاریخی، سماجی اور رومانی ناولوں کے سامنے آجانے سے کچھ حد تک دور ہو جاتی ہے پھر بھی مغربی ادب کے ناولوں کے مقابلے میں رکھے جانے کے قابل نہیں۔

سماجی ناول لکھنے والوں میں اپیندر ناتھ سین رائے چیتر ڈھیر کافی مشہور و معروف ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے تین ناول —
۱۔ مکرندکا، کندمالا اور سرلا کافی اہمیت اور شہرت کے حامل ہیں۔ یہ ناول اصلاحی اور اخلاقی ہیں جن میں طبقہ نسواں کی بے بسی کا اظہار ملتا ہے لیکن سین رائے سے زیادہ شدت اظہار مجیندرت کے ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ ان کا شاہکار ناول ستی چھایا ہے جس میں اندر پریا اور اس کی لڑکی چھایا کی کہانی ہے۔ اندر پریا پر ایک راج کمار رمرطی موہن عاشق ہو جاتا ہے اور مکر و فریب سے اپنے بس میں کر لینا چاہتا ہے۔ پوشیدہ طریقے سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ اندر پریا پر رمرطی موہن کا دوست اُتل بھی عاشق ہو جاتا ہے۔ اندر پریا اپنی ماں کے دیدار کے لیے بہت بے قرار ہوتی ہے اور رمرطی موہن طفل تسلی دے کر اسے بہلائے رکھتا ہے کچھ ہی عرصہ بعد اندر پریا حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس وقت اتل کی شرارت سے رمرطی موہن کے والدین اس کی دوسری شادی کرا دیتے ہیں گو کہ اندر پریا، رمرطی موہن کو بہت سمجھاتی اور منت و سماجت کرتی ہے لیکن وہ نہیں پگھلتا ہے۔ نتیجے کے طور پر بے بس و بے کس اندر پریا دریا میں ڈوب کر خودکشی کرنا چاہتی ہے لیکن عین وقت پر اس کی ایک سہیلی نیشودا اسے آکر پکڑ لیتی ہے۔ اپنے گھر لے جا کر رکھتی ہے اور وہیں اندر پریا کے بچی بھی پیدا ہوتی ہے۔ ایک شب جب اندر پریا، مکان کی چھت پر تھی اس نے رمرطی موہن کو دولہا بنا برات کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا۔ نفسیاتی طور پر اس کا دل متاثر ہوا اور آنکھوں سے اشکوں کی ایک سیل رواں ہو گئی لیکن ضبط و قرار کو باقی رکھتی ہے۔ "اندر پریا" اپنی اس نوزائیدہ بچی کا نام "ستی چھایا" رکھتی ہے۔ اندر پریا کے بھائی اور باپ برسوں تک اسے تلاش کرنے کے بعد پاتے ہیں، لیکن وہ زندگی کے اس کرب ناک موڑ پر پہنچ چکی ہے جہاں سے اب وہ ماضی کی طرف واپس نہیں ہونا چاہتی ہے اس لیے اندر پریا خود گھر جانے کے لیے تیار نہیں ہوتی ہے اپنی بچی کو اپنے باپ کے حوالے کر دیتے ہوئے ستی چھایا اپنے ننہال پہنچ جاتی ہے جہاں اس گھر میں صرف اس کا ماموں ہی اس کی دیکھ بھال میں دلچسپی لیتا ہے بقیہ دوسرے افراد نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کی زندگی کا کارواں رفتہ رفتہ آگے بڑھ کر اس منزل پر بھی پہنچ جاتا ہے جہاں سے طفلی کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں اور حیات کسی انجانے لطف و حظ سے پرسکون

بننے کی کوشش کرتی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ بتیندر بہادر نامی ایک نوجوان سے عشق و محبت کی پینگیں استوار ہونے لگتی ہیں لیکن بتیندر بہادر کا یہ عشق صادق نہیں بلکہ بوالہوسانہ ہے کیونکہ شادی کے لیے وہ تیار نہیں ہوتا ہے۔ "ستی چھایا" کو ایک عجیب کشمکش غم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اپنی بے بسی، بے چارگی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتی ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی پوچھنے والا نہیں، وہ قطعی بے سہارا ہے لوگ اسے اپنی تفریح کا سامان سمجھتے ہیں۔

اس مقام پر ناول نگار نے بہت ہی غم انگیز انداز میں خون کے آنسو رلوائے ہیں، قصے میں ایک فطری روانی آگئی ہے جسے دت کے فن کارانہ قلم نے اور بھی موثر بنا دیا ہے۔

عہد حاضر میں کرشنما چاریہ نے تین سماجی ناول لکھے ہیں جس میں قدیم و جدید سماجی اقدار حیات کی روشنی میں کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ "پتی ودتا" ناول میں ایک عورت کی کہانی ہے۔ "پانی گرھم" میں شادی بیاہ اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ "سوشیلا" میں ایک گونگی عورت کی کہانی ہے۔ راج اما کی چندر مولی سماج پر طنز ہے۔ کپیہ سوامی کی سولوچنا نپ بیوگی کی زندگی کی داستان بیان کی گئی ہے اور چدمبر شاستری کے ناول "کملا کمادی" اور "ستی کملا" طبقۂ نسواں کی مجبوریوں اور مجبوریوں سے عبارت ہے۔ ہری داس سدھانت واگیش کا ناول "سرلا" ایک رومانی ناول ہے لیکن رومانی زندگی کے تار و پود اساطیری انداز لیے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ نگیندر ناتھ سین، کل بھوشن، بال کمن، شش شالی، منڈوبے، بھٹ بھشرا ناتھ شاستری وغیرہ اہم ناول نگار ہیں۔ ان میں آخر الذکر کا ناول "آدرش رمنی" ایک آدرش ہندوستانی عورت کی کہانی ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں سنسکرت ناول نگاری کا ایک تاریخی جائزہ لیا گیا ہے لیکن تنقیدی اعتبار اور فنی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو یہ ناول زیادہ تر مثالی عشق کی روداد پیش کرتے ہیں عاشق بے وفا، بے مروت اور بد عہد ہوتا ہے اور معشوق مظلوم، باوفا، صبر و شکیب کرنے والا، مجبور و ناچار۔ عشق ہمیشہ پہلی ہی نظر میں ہو جاتا ہے۔ پہلی نظر کا یہ عشق سنسکرت ناٹکوں کا اثر ہے۔ واقعات کو اس قدر پیچیدہ اور الجھا کر پیش کیا گیا ہے کہ طوالت پیدا ہو گئی ہے ان ناولوں میں عہد اور ماحول کے گہرے نقوش تو ملتے ہیں مگر ان نقوش کی افادیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ واقعات صرف کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے نظم ہوئے ہیں۔ حقیقت نگاری جو نئے ادب کی روح ہے اس سے چشم پوشی ملتی ہے۔ حیات اور اس کی تلخیوں کی نقاب کشائی سے احتراز کیا گیا ہے بلکہ زندگی کی کڑی دھوپ سے محفوظ رہ کر چند لمحوں کے لیے مصنوعی عشرت کدوں کا سہارا لیا گیا ہے جیسا کہ داستانوں کا انداز رہا ہے۔ پند و نصیحت کے باب میں پنچ تنترا اور مہابھارت کی حکایتوں کو مشعل راہ بنایا گیا ہے اگر گیتا کے خطوط پر اس عبارت کی بنیاد رکھی جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔ مغربی ناول نگاری کے اثرات برائے نام ہی ملتے ہیں کیونکہ آج کے دور میں بھی جو ناول سنسکرت میں لکھے جا رہے ہیں وہ قطعی طور پر قدیم ڈگر پر گامزن ہیں ان کے نام اور کردار بھی مہابھارت سے مستعار معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوصف سنسکرت ناولوں میں قدیم تہذیب و معاشرت کا احیاء زیادہ قرینے سے ہوا ہے یہی سنسکرت ناولوں کی بنیادی خصوصیت ہے۔

★

غزل

[illegible] الحق انصاری

صرف اپنی ہی نگاہوں کا ہے دھوکا صحرا
ورنہ کیا چیز ہے گلزار ہے کیسا صحرا

دل اگر بارشِ امید سے ہوتا محروم
بن چکا ہوتا یہ گلزار کبھی کا صحرا

متحد ہوں گے جو افراد تو بن جائے گی قوم
ایک ہو جائیں گے ذرّے تو بنے گا صحرا

ندیاں بہتی تھیں، بہتی ہیں، بہیں گی لیکن
تشنہ تھا، تشنہ ہے اور تشنہ رہے گا صحرا!

اس کے آغوش میں کھل پائے نہ احساں کے پھول
دُور دریائے کرم سے رہا، میرا صحرا

لعل و یاقوت سمجھتے اور اٹھا لیتے لوگ
گر کبھی دل کا لہو اپنے اگلتا صحرا

کل جو شاداب چمن تھا وہ بیاباں ہے آج
آج گلشن جو نظر آتا ہے کل تھا صحرا

دیدۂ ژرف نگہ سے جو کبھی آپ و کی
چیرتے گر دلِ ذرّہ تو نکلتا صحرا

زبان

افتخار اعظمی

زبان صداقت، اٹل حقیقت
گلوں کی خوشبو
وطن کی الفت
زبان ہی سے ہے ماں کی لوری
زباں سرگوشیٔ محبت
زبان معراجِ آدمیت
کلی کا کھلنا
ہمکتے بچے کا مسکرانا
وفا، رفاقت
کسی کی چاہت میں گیت گانا
غزل سنانا
یہ سب زبان ہی کا عطیہ
زبان اظہار افکار کا وسیلہ
زبان ٹیگور کی کہانی
زبان اقبال کا ترانہ
زبان ہندی
زبان اردو
زبان تامل زبان تلگو
یہ سب زبانیں
ہمارے گلشن کی مسکراتی لجاتی کلیاں
کہ جن کی خوشبو سے ہے معطر چمن ہمارا
زبان اتنی حسین ہے جب
زبان اتنی امین ہے جب
تو پھر بتاؤ
زبان کا نام لے کے آخر فساد کیوں ہو؟
یہ بغض اور یہ عناد کیوں ہو؟

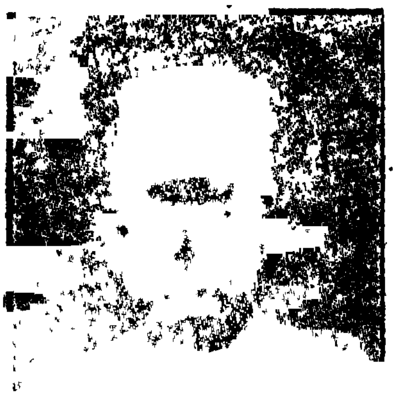
محمد اسمٰعیل بدایونی

نظامی بدایونی کی ادبی خدمات

مولانا نظامی بدایونی مرحوم بدایوں کے مشاہیر میں آخری آدمی تھے۔ مولانا فخر الدین صاحب آپ کے والد محترم ایک معزز خاندان کے فرد فرید تھے اور ملا محمد یوسف آپ کے جد امجد شہنشاہ جہانگیر کے استاد تھے جو عرصہ تک پٹنہ کے حکمراں رہے اور انہی کے ہاتھوں مشہور باغی ہاشم کا استیصال ہوا۔ بحکم شاہی یہ کالنجر کے قلعہ دار بنے۔ ان کے فرزند کرم اللہ بادشاہ کی جانب سے اوقاف کے متولی تھے۔ اس لیے یہ خاندان، خاندانِ متولیاں کہلانے لگا۔ خیر خواہی کے صلہ میں موضع کھریا رہلو پرگنہ بدایوں میں نسلاً بعد نسلاً معافی میں ملا تھا جو تنسیخ زمینداری تک ان کی اولاد کے قبضہ میں رہا۔

اسی شرف و اعزاز کے باعث بدایوں کے پرانے خیال کے شرفا اپنے بچوں کی بسم اللہ خوانی اسی خاندان کے لوگوں سے کراتے تھے۔ نظامی مرحوم اسی خاندان کے یادگار تھے اس لیے ان کے اکثر عزیز اور دوست اپنے بچوں کو ان سے بسم اللہ پڑھوانا مبارک اور نیک فال سمجھتے تھے۔ چنانچہ خان بہادر مولوی رضی الدین صاحب نے جب اپنے پوتے مولوی نہال الدین، بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی، ایم ایل۔ اے، کا مکتب کیا تو نظامی صاحب سے بہ اصرار بسم اللہ پڑھوائی۔

ملازمت سے مستعفی ہو کر آپ نے ۱۹۰۳ء میں اخبار ذوالقرنین نکالا جو منشی آغا جان لکھنوی کے وکٹوریہ پریس بدایوں میں چھپتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں خود اپنا مطبع نظامی پریس کے نام سے قائم کیا۔ ذوالقرنین اسی میں چھپنے لگا اور آغا جان کی شرکت بھی ختم ہو گئی۔ پریس کے قیام نے ان کی ادبی دلچسپیوں کو علمی جامہ پہنانے میں کافی مدد دی۔ ان کے علمی جواہر ریزے بڑی سرعت کے ساتھ پبلک کے سامنے آنے لگے۔ مطبع نظامی سے سب سے پہلی کتاب "کنز التاریخ" مصنفہ مولوی رضی الدین صاحب شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ ذوالقرنین کے ذریعہ آپ نے ملک اور قوم کی تا حدِ امکان خدمت کی اور اپنے خیالات کو عوام میں پھیلایا۔ تعلیمی اور علمی تحریکوں میں



مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی مرحوم

سرگرم حصہ لینے کی بڑی لگن تھی اور ان کی کامیابی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے۔ آپ کے دردِ ملی، شغف علمی، جوش تحقیق اور بے پناہ محنت نے آپ کو عہد حاضر کے مشاہیر کی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔

ان کی تصانیف و تالیف، اخباری مضامین نیز نظموں وغیرہ کو یکجا پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک تنہا متوسط الحال انسان کس قدر کام کر سکتا ہے۔ ملک کی مشہور علمی و ادبی انجمنوں کے کام کو تنہا نظامی صاحب کے کام کے مقابلہ میں رکھا جائے تو نظامی کا پلہ بھاری رہے گا۔ مرحوم کو نام سے زیادہ کام کا خیال تھا۔ ہر کام بڑی دلچسپی، محنت جانفشانی اور دیانت داری سے کرتے تھے۔ نام و نمود اور شہرت پسندی سے نفرت تھی۔ یوں بھی نظامی خاندان بدایوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ آپ اسی گھرانے کے ایک مشفق بزرگ، ایک بلند پایہ ادیب، میدان صحافت کے ایک معقول مدیر، قوم پرور ی کے مبلغ، خاموش سیاسی کارکن اور علمی مجالس کے سرگرم رکن کی حیثیت سے اپنی ذات سے قطع نظر تمام عمر دوسروں کی فلاح و بہبودی کے واسطے اپنی ذہنی صداقت اور ضمیر کی صفائی سے بے لوث خدمت کی۔ لیڈر قسم کے انسان نہ تھے۔ ملک اور قوم کے سچے اور بے لوث خادم تھے۔ قوم کے نام و ریاست اور سوسائٹی کے زیور تھے۔ جذبۂ حب وطن سے سرشار تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

نظامی جذبۂ حب وطن کا تیرے کیا کہنا اسی سے دل منور ہے یہی تو نور ایماں ہے



صدر جمہوریہ شری فخر الدین علی احمد ۱۷ اپریل کو راشٹرپتی بھون کے دربار ہال میں منعقدہ
ایک تقریب ایر کموڈور ڈی این کپاڈیا کو نمایاں خدمات انجام دینے کے صلے میں اتی وششٹ
سیوا میڈل دیتے ہوئے

سکم کے ایک وفد نے وزیر اعلیٰ قاضی لینڈوپ دورجی کی قیادت میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے ۱۶ اپریل کو نئی دہلی
میں ملاقات کی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۱۲ اپریل ۱۹۷۵ء کو رائے بریلی میں ہونے والی ترقیاتی نمائش کا جائزہ لیتے ہوئے



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۱۲ اپریل ۱۹۷۵ء کو نہرو یوتھ سنٹر کے زیر اہتمام منعقدہ سیمنار کے تیسرے روز شہریوں اور طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے

رائے بریلی میں

ترقیاتی نمائش سیمنار اور جلسہ

(۹ لغایۃ ۱۲ اپریل ۱۹۷۵ء)



وزیر اعلیٰ ۹ اپریل ۱۹۷۵ء کو رائے بریلی میں حکومت اترپردیش کی جانب سے لگائی جانے والی زراعتی ترقیاتی نمائش کا افتتاح کر رہے ہیں ساتھ ہی نمائش کے صدر دروازہ کی تصویر

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی رائے بریلی میں ۱۲ اپریل ۱۹۷۵ء کو سئی ندی پر تعمیر ہونے والے پل کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے



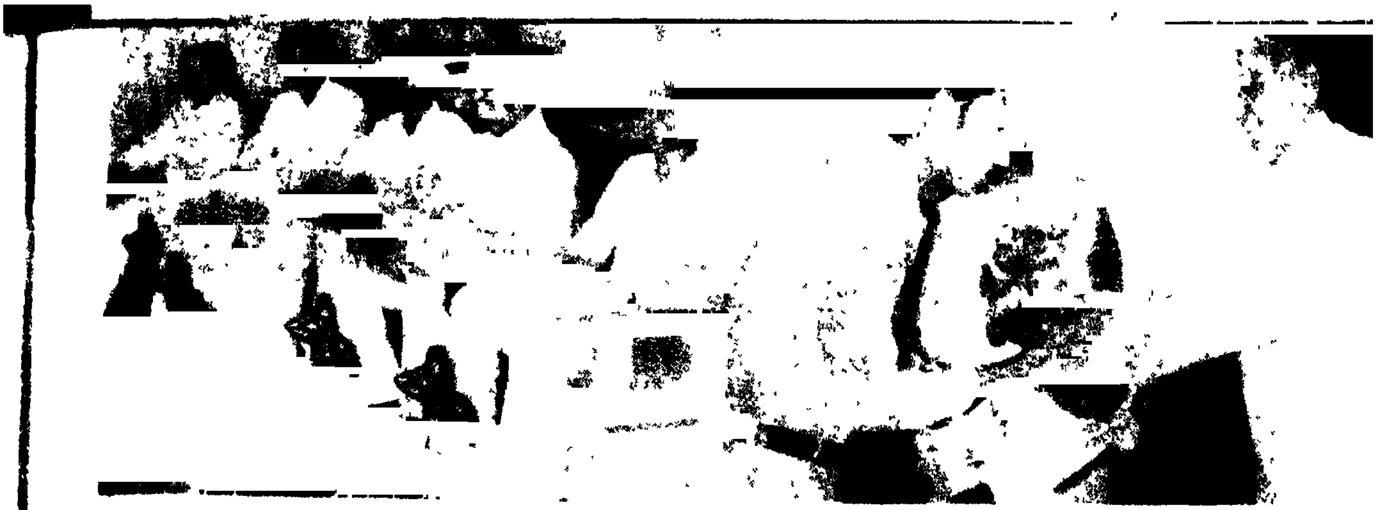
وزیر اعلیٰ ۹ اپریل ۱۹۷۵ء کو رائے بریلی میں زراعتی مسائل پر منعقدہ سیمنار سے خطاب کر رہے ہیں











گورنر ڈاکٹر ایم۔ چنا ریڈی ۲۸ اپریل ۱۹۷۵ء کو لکشمن انعام جیتنے والے کھلاڑیوں کو اسپورٹس اسٹیڈیم لکھنؤ میں انعامات تقسیم کرتے ہوئے

وزیر اعلیٰ شری بہوگنا کو ان کی ۵۵ ویں سالگرہ ۲۵ اپریل ۱۹۷۵ء کے موقع پر لوگ مبارکباد دے رہے ہیں۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کو شریمتی ودیا کماری نے ۱ اپریل کو ان کے ریلیف فنڈ کے لیے ۲۵ ہزار روپیہ کا چیک پیش کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے





لیکن پھر بھی ؎

ہم نے ٹھکرا دیا نظامی کو   لفظ دو اس کے سن لیے ہوتے

انسان دوستی اور انسان پرستی ان کا محض عقیدہ ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی کا مسئلہ تھا۔ اسی لیے تو ان کی شاعری کھری شاعری ہے جو سیاسی پہلو اس کا آئینہ دار ہے۔ آپ کا درد مند دل قوم کی زبوں حالی اور ملک کی غلامی پر ہمیشہ تڑپا کیا۔ مستقبل میں آنے والے خطرات سے پورے طور پر آگاہ تھے۔ کہتے ہیں ؎

اے نظامیؔ دورِ موجودہ کو کیا روتے ہیں آپ
آگے آگے دیکھیے کیا کچھ دکھائے آسماں

مولانا نظامی نے میدانِ سیاست میں پھولوں کا بستر چھوڑ کر خار زار کو پسند کیا۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی اور مسلم لیگ کے کٹر مخالف تھے۔ ہمیشہ وطنیت، قومیت، باہمی ہمدردی و اتفاق، اتحاد اور آزادی کے نغمے سنا سنا کر قوم کو جدوجہد اور عمل کی ترغیب دیتے تھے۔ آپ کا نظریہ تھا کہ ہم ہندوستانیوں کا مفاد مخلوط انتخاب اور ہندو مسلم ایکتا میں ہے۔ جس کی ترویج تحریک اور اشاعت آپ آخر دم تک کرتے رہے۔ کہنہ مشق اخبار نویس بہترین شاعر اور بلند پایہ نثار ہونے کی حیثیت سے آپ نے اپنے مسلک کا پرچار کیا اور مخالفین کی پروا نہ کی لیگی لیڈر سے یوں مخاطب ہیں:

کیا ڈر ہے آپ شوق سے لیڈر بنا کریں
لکچر سنائیں ملک کے ٹکڑے کیا کریں
جس طرح چاہیں ملک کو دیتے رہیں فریب
آزادی کا مگر نہ کبھی تذکرہ کریں

جداگانہ انتخاب اور تقسیم ملک کے دشمن تھے۔ اور برطانیہ کی غلامی سے سخت بیزار۔ آپ کی ایک نظم ہے "ووٹ کا فیصلہ" اس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

قائد اعظم تمہارے ہوں تو ہوں میرے نہیں
گالیاں دوں ان کو میں شیوہ نہیں ہے یہ مرا
یہ اپنی اپنی رائے ہے

میرا مقصد ہے غلامی سے ملے سب کو نجات
آپ کی مجلس غلامی کی ادا پر ہے فدا
یہ اپنی اپنی رائے ہے

تم یہ کہتے ہو جداگانہ الکشن خوب ہے
میں یہ کہتا ہوں نہیں اس میں مفاد عامہ
یہ اپنی اپنی رائے ہے

میں یہ کہتا ہوں کہ طاقت ایک جا قائم رہے
تم نے ہی تقسیم و حدت کا وظیفہ رٹ لیا
یہ اپنی اپنی رائے ہے

۱۹۳۸ء کے بعد تحریک آزادی نے پھر زور پکڑا۔ اس وقت لیگی لیڈر اپنے ہاتھوں سے مسلمانوں کی گردنوں کے لیے تلواریں ڈھال رہے تھے اور کلکتہ سے پشاور تک گونجنے والی اذان کی آواز کو ایک کوٹھری میں بند کرنا چاہتے تھے۔ اسی وقت مولانا مرحوم کی ہمدردیاں کانگریس سے منسلک ہو گئیں ۱۴ر جولائی ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے کامل آزادی ملنے کا ریزولیوشن پاس کر دیا۔ جو "ذوالقرنین" میں شائع ہوا۔ اس جرم میں حکام ضلع نے ذوالقرنین کی اشاعت کو ممنوع قرار دیدیا نظامی پریس کو بھی بند کر دیا۔ ایک ماہ بعد سرکار نے اپنے آرڈر کو واپس لے لیا اور ۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۲ء سے پریس اور اخبار آپ کے صاحبزادے مولوی احمد الدین صاحب کے نام سے پھر جاری ہو گئے اور نظامی صاحب کی ایڈیٹری ختم ہو گئی۔

بعد میں جب ملک کی فضا یک لخت بدل گئی تب اپنے نظریہ کے باعث آپ کو بڑی بڑی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مردانہ وار ان کا مقابلہ کیا۔ اکثر اہل وطن ان سے ناراض رہے، دھمکیاں دیں، اخبار کا بائیکاٹ کیا لیکن نظامی مرحوم کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی۔ حالانکہ مولانا اگر اپنے سیاسی عقائد میں ذرا سا موڑ پیدا کر دیتے تو اپنی ذات اور اپنے متعلقین کو کافی فائدہ پہنچا سکتے تھے، لیکن اپنے ذاتی مفاد کے لیے اپنے اصول کو کبھی قربان نہیں کیا۔ وہ ایک غیر معمولی سیاسی بصیرت رکھتے تھے۔ انگریز کی غلامی اور مسلمانوں کے سیاسی انتشار نے عمر بھر ستایا ؎

کہاں اب ہم میں جرأت جو مظالم ان کے دہرائیں
ہمیں کانا ہے جب سے سانپ نے رسی سے ڈرتے ہیں

اہنسا کے پجاری تھے۔ ملاحظہ ہو۔

نہ بندوق ہے اور نہ تلوار ہے فقط نفس کا اپنے ایثار ہے
اہنسا کو سمجھا کرے کوئی ہیچ مگر بیکسوں کا وہ ہتھیار ہے

مولانا ہندو مسلم ایکتا اور باہمی ہمدردی کے پرچارک تھے۔ ان کے نزدیک یہ بنیادی مسئلہ تھا ان کے جگر میں سارے جہاں کا درد تھا۔ محض اپنی قوم کی پرستش ایک لچر خیال تھا اور مذہبی فرق بے حقیقت۔ مذہب کے تنگ دائرے میں نہیں بلکہ انسانیت کے وسیع دائرے میں گم تھے۔ فرماتے ہیں ؎

بہت رسوا ہوئے لڑکر گلے سے اب تو مل جاؤ
مجھے اب میان میں رکھ لو یہ ہے آواز خنجر کی

نہ قربانی کا قصہ ہو نہ باجے کا قضیہ ہو
ہو یکساں دل میں عزت، چرچ کی مسجد کی مندر کی

بریلی اور الٰہ آباد کے فرقہ وارانہ فساد سے متاثر ہو کر حضرت نظامی نے جو نظم لکھی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کتنے صاف گو اور پاک طینت انسان تھے۔ جس وقت علی گڈھ تحریک کی بنیادیں استوار ہو رہی تھیں اور مسلم لیگ میں رجعت پسند عناصر مجتمع ہو کر اپنی وفاداری کا یقین دلا رہے تھے۔ اس وقت تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے یہ بڑا نازک دور تھا۔ مسلمان انگریز سے مشکوک تھے، نئی تہذیب سے متنفر تھے اور ان میں وہ سب برائیاں جو ہزیمت خوردہ قوموں کا مابہ الامتیاز ہوتی ہیں۔ جڑ پکڑ چکی تھیں۔ سرسید مرحوم انگریزی تہذیب اور علوم جدیدہ سے اس قدر مرعوب تھے کہ وہ یورپ کے ہر وہم کو یقین اور ہمارے ہر یقین کو وہم سمجھتے تھے یہ تھا وہ سیاسی پس منظر، جبکہ پہلی دفعہ مولانا نظامی ذوالفقار علین کے روپ میں عوام کے سامنے جلوہ گر ہوئے۔

نظامی صاحب پکے نیشنلسٹ اور کانگریسی تھے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ، اکثریت سے مرعوب تھے اور مسلمانوں کے مسائل سے غافل۔ وہ مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی سے خوب واقف تھے ہر وقت اسی فکر و تردد میں رہتے تھے کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل نکالا جائے۔ اس جدوجہد میں آپ کی زندگی بیت گئی حقیقت یہ ہے کہ آپ مطالبۂ پاکستان کے سخت مخالف تھے۔ حالانکہ نواب زادہ لیاقت علی خاں سے ذاتی تعلقات تھے۔ جو اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری تھے اور پھر پاکستان کے وزیر اعظم بنے۔ نواب زادہ نظامی صاحب کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے اور مسلمانوں کے تعلیمی مسائل میں دونوں میں برابر مشورے ہوتے رہتے تھے۔ ایجوکیشنل کانفرنس میں نواب زادہ کو نظامی صاحب نے ہی شامل کیا تھا۔ ان کی صدارت میں مرادآباد میں ایک جلسہ بھی کرایا۔ راجہ صاحب محمود آباد لیگ کے خزانچی تھے۔ اس زمانے میں عام مسلمانوں پر لیگ کا جادو چڑھا ہوا تھا۔ پاکستان کے طالب مخالف خیالات کے لوگوں سے بات چیت کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے کانگریسی مسلمانوں کو کافر کہا جاتا تھا مگر نظامی صاحب اور راجہ صاحب محمود آباد سے مخلصانہ تعلقات قائم رہے۔ مسلمانوں کے تعلیمی اور اقتصادی مسائل میں آپس میں مشورے ہوتے رہے۔ یو۔ پی میں ضلع بورڈ کے تحت اسلامیہ مکاتب چلتے ہیں، ان کے قیام و دوام کے لیے نظامی صاحب کی انتھک کوشش تھی۔ اکثر اضلاع میں آپ نے اسلامیہ اسکول قائم کروائے جو اسکول درجہ ۸ تک تھے ان کو ہائی اسکول بنوایا بعض کو انٹرمیڈیٹ۔ جہاں اسکول نہ تھے وہاں قائم کرائے۔ نظامی صاحب اپنی پوری ٹیم (مولانا طفیل احمد صاحب منگلوری۔ مولوی بشیر الدین صاحب اٹاوہ وغیرہ) کے ساتھ اس شہر میں جاتے اور مسلمانوں کی تعلیمی اور مالی مشکلات کے دور کرنے کی اسکیم مقامی حضرات سے مل کر بناتے اور اس کو عملی جامہ پہناتے۔ بیسیوں مثالیں اس قسم کی موجود ہیں۔ یو۔ پی میں اسلامیہ مکتب، اسکول اور کتب خانے قائم کرانے میں نظامی صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔

وہ کہتے تھے :

میں شمع علم دنیا میں فروزاں کر کے چھوڑوں گا
جو ہے قصر جہالت اس کو ویراں کر کے چھوڑوں گا
مری کوشش سے ہل جائیں گی بنیادیں جہالت کی
جو ہیں حیوان ان پڑھ ان کو انساں کر کے چھوڑوں گا
مٹا کر ہی رہوں گا ملک سے ظلمت جہالت کی
اندھیری رات کو گویا چراغاں کر کے چھوڑوں گا
جہالت کے سبب سے ہند دوزخ کا نمونہ ہے
خدا چاہے تو اس کو باغ رضواں کر کے چھوڑوں گا

یہ تھا آپ کا عزم بالجزم اور یقین محکم۔ سعی عمل کا یہ عالم تھا کہ تعلیمی

اور علمی تحریکوں میں حصّہ لینے کی دُھن دیوانگی کی حد تک پہونچ گئی تھی۔ میسٹن اسلامیہ ہائی اسکول بدایوں جو آج حافظ صدیق میسٹن اسلامیہ انٹر کالج ہے، آپ ہی کی تحریک اور جدوجہد سے ۱۹۱۶ء میں کھلا تھا۔ بحیثیت بانی آپ اس کے دوامی ٹرسٹی تھے۔ بوقت ضرورت آپ نے پریسیڈنٹ وائس پریسیڈنٹ اور جوائنٹ سکریٹری کے فرائض بھی انجام دیے۔ بریلی اور اٹاوہ اسلامیہ کالجوں کے بھی آپ ٹرسٹی تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام اور کانگریس گورنمنٹ کی طرف سے ایجوکیشن ریکمنڈیشن کمیٹی کے تقرر پر آپ نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپ یونیورسٹی علی گڈھ کے کورٹ کے بھی ممبر تھے۔ صوبہ کی تعلیمی مجلس کے بانی بھی آپ ہی تھے۔

اگر آپ کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ تعلیمی کام کرنے والوں میں بہت جلد گھل مل جاتے تھے اور آپ کو علمی ذوق رکھنے والوں سے کام لینے کا خوب ڈھب آتا تھا۔ خان بہادر فصیح الدین، علامہ یعقوب بخشی صاحب، راغب بدایونی، سید طفیل احمد صاحب منگلوری، مولانا بشیر الدین، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، سر راس مسعود، حسرت موہانی، خان بہادر حبیب اللہ خاں، حاجی محمد عبدالرحمٰن خاں اور پروفیسر عبدالمجید قریشی جیسے بلند پایہ حضرات آپ کے انیس و جلیس تھے۔ آپ کو ان معتدد ہستیوں کا پورا تعاون حاصل تھا۔

نظامی صاحب نے ۳ اگست ۱۹۳۷ء کے ذوالقرنین میں "سر راس مسعود کی وفات کا حادثہ" اور ۷ فروری ۱۹۴۵ء کے اسی اخبار میں "سر راس مسعود اور اردو ادب" کے عنوان سے جو دو مضمون لکھے ہیں وہ سید راس مسعود مرحوم کی ذات گرامی کو سمجھنے کے لیے بہت کافی ہیں۔ سر راس مسعود کو اردو زبان سے خاصی دلچسپی تھی۔ ہزارہا اشعار زبانی یاد تھے۔ کوئی بیاض نہ رکھتے تھے۔ دماغ ہی بیاض تھا۔ ۱۹۱۲ء کے ایک دلچسپ واقعہ نے ان کو اردو ادب کی علمی خدمت پر آمادہ کیا۔ ان کے ایک فرانسیسی دوست بغرض سیاحت ہندستان آئے ہوئے تھے۔ یہ پٹنہ سے دہلی آئے تھے۔ دہلی میں دونوں دوستوں کا ملن ہوگیا۔ باتوں باتوں میں اردو ادب کے متعلق گفتگو چھڑ گئی اور مرزا غالب کا ذکر آگیا اور دوست نے دیوان غالب کی فرمائش کی۔ فرانسیسی دوست کی گفتگو کا ان کے دل پر کیا اثر ہوا۔ اس کا اندازہ ان الفاظ سے ہوتا ہے جو آپ نے بہ حیثیت صدر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۳۰ء میں بنارس کے اجلاس میں کہے۔

"میں اپنی ایک دفعہ کی ذلت کو کبھی نہیں بھول سکتا جب میں اتفاقاً اپنے ایک فرانسیسی دوست کے ساتھ دہلی جا نکلا ان کے لیے دیوان غالب کی ایک جلد خریدنے کا ذمہ لیا اور اس غیر فانی شاعر کے کلام کی ایک ستھری جلد کی تلاش میں دلّی کی گلیوں میں مارا مارا پھرا لیکن جو بہتر سے بہتر نسخہ دستیاب ہوا۔ وہ اس سستے زرد رنگ کے کاغذ پر چھپا ہوا تھا جس سے یورپ کے لوگ اپنے بوٹ بھی نہ صاف کرنا چاہیں گے۔ جب میں نے یہ کتاب اپنے فرانسیسی دوست کے ہاتھ میں دی اس کے چہرے سے تعجب اور حیرت کے جو آثار نمودار ہوئے ان کے تصور سے میں اب تک کانپ جاتا ہوں۔ اسے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ میری مادری زبان کے سب سے بڑے شاعر کے کلام کا یہ بہترین نسخہ تھا جو خود اس شاعر کے وطن عزیز میں دستیاب ہوا۔"

راس مرحوم کو اس واقعہ سے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ اردو شعرا کے دیوان بھی انگلستان اور فرانس جیسے ترقی یافتہ ممالک کے شعرا کے مجموعہ کے مثل شان و نفاست کے ساتھ طبع ہوں۔ اس کام کے واسطے ان کی نظر منشی رحمت اللہ صاحب رعد کے نامی پریس کانپور پر پڑی۔ سید صاحب نے فرانسیسی دوست کی ملاقات کے حوالہ سے رعد صاحب کو لکھا۔ نظامی صاحب فرماتے ہیں کہ رعد صاحب ہمارے ملک کے نامور طابع اور ناشر ہی نہ تھے بلکہ وہ اردو کے ایک اچھے ادیب اور جرنلسٹ بھی تھے اور مجھے ۱۸۹۰ء میں جب اپنے زمانۂ طالب علمی میں ان کے اخبار "عالم تصویر" کی نامہ نگاری کرتا تھا، ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا تھا۔

اتفاقاً انھیں ایام میں نظامی صاحب پریس کی مشکلات کے بارے میں مشورہ لینے کانپور رعد صاحب کے پاس پہنچے۔ جو خط راس مسعود صاحب نے دیوان غالب کی طباعت کے متعلق لکھا تھا۔ رعد صاحب نے نظامی صاحب کو دیدیا اور کہا کہ "اس کے منشا کو پورا کرو۔ مسعود اردو ادب کا دلدادہ ہے اور تمہارا بھی یہی مذاق، بلکہ یہی پیشہ ہے۔" یہ واقعہ ۱۹۱۳ء کا ہے۔

بدایوں آکر نظامی صاحب نے دیوان غالب کی طباعت کے متعلق مسعود صاحب سے مراسلت شروع کردی اور ۱۹۱۵ء میں

دیوان غالبؔ کا پہلا اڈیشن نہایت صحت و نفاست کے ساتھ شائع ہوا۔ راس صاحب کو اس کی کاپی ملی۔ بہت پسند فرمائی۔ علامہ اقبالؔ نے اس سائز کو اتنا پسند فرمایا کہ اپنی تمام کتب اسی سائز پر طبع کرائیں۔ یکے بعد دیگرے دیوان غالبؔ کے سات اڈیشن نظامی پریس سے نکلے اور ساتوں ختم۔ اس دیوان کی اشاعت کے بعد نظامی پریس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور سر راس مسعود کی وساطت سے تاجدار دکن نے سو روپیہ ماہوار کی امداد مرحمت فرمائی جو تک بھگ دو برس تک جاری رہی۔

مسعود مرحوم نے اردو شعراء کے کلام کا انتخاب نظامی مرحوم کی تحریک سے مرتب کیا جو "انتخاب زریں" کے نام سے ۱۹۱۱ء میں نظامی پریس میں چھپا۔ اس انتخاب کو قبول عام کی ایسی سند حاصل ہوئی کہ اس کے کئی اڈیشن نکالنا پڑے۔ آپ کا ایک انتخاب نثر و نظم "نصاب اردو" کے نام سے ۱۹۱۶ء میں نظامی پریس سے شائع ہوا جو عرصہ تک کلکتہ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں داخل رہا۔ اس مجموعہ کا دوسرا اڈیشن (۱۹۴۲ء) مستند اردو کے نام سے اسی پریس میں چھپا۔

نواب محمد اسحاق خاں فرزند نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کو اپنے والد مرحوم کی کلیات طبع کرانے کا خیال ہوا تو آپ کی نظر بدایوں کے اسی مطبع نظامی پر پڑی اور یہ کام بھی نظامی صاحب کے سپرد ہوا۔ نظامی صاحب کے علمی و ادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے نواب صاحب نے مقدمہ لکھنے کی بھی فرمایش کی۔ چنانچہ کلام شیفتہؔ پر ایک مکمل و مفصل تبصرہ بڑے سائز کے ۸۰ صفحات پر ۲۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو لکھا اور کلیات شیفتہؔ و حسرتیؔ جس میں نواب شیفتہؔ کا کلام فارسی و اردو اور رقعات فارسی شامل ہیں۔ اور جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۱۶ء میں شائع کیا۔

نواب محمد اسحٰق خاں نے اس کتاب کی ایک جلد بگرامی خدمت علامہ اقبالؔ ارسال فرمائی۔ کلیات ملنے پر علامہ نے نواب صاحب کو خط لکھا۔ اس کی نقل دفتر ذوالقرنین سے حاصل کر کے ہدیۂ ناظرین کرام ہے۔

لاہور۔ ۱۶ ستمبر ۱۷ء

مخدوم مکرم جناب قبلہ نواب صاحب۔ السّلام علیکم۔

کلیات شیفتہؔ مرحوم و مغفور کا جو نسخہ آپ نے بکمال عنایت مرحمت فرمایا ہے اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ دہلی کے آخری دور کے اہل کمال کی تصانیف کا شائع ہونا موجودہ لٹریری تحریکوں کے لیے از بس ضروری ہے۔ افسوس کہ نظامی صاحب مقدمہ کا پورا حق ادا نہ ہو سکا تاہم جو کچھ لکھا ہے خوب ہے۔ امید کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

محمد اقبالؔ لاہور

ریختی زبان کے مشہور شاعر جان صاحب کا دیوان مع فرہنگ اعلیٰ طباعت کے ساتھ بار اوّل ۱۹۲۲ء میں اپنے پریس سے شائع کیا جس پر ایک مفصل مقدمہ ریختی زبان میں آغا حیدر مرزا دہلوی سے لکھوایا۔ دیوان رنگینؔ و انشاؔ مع فرہنگ طبع کیا۔ تصحیح کے ساتھ دیدہ زیب کتب چھاپنے کی شہرت ہوئی تو انجمن ترقی اردو ہند، جس کا صدر دفتر اس وقت اورنگ آباد میں تھا، اپنی کتب کی طباعت کے لیے نظامی پریس سے رجوع کیا اور اپنی اکثر کتابیں یہاں چھپوائیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔ "دیباچۂ صحت" مصنفہ ڈاکٹر لطافت حسین جو بڑے سائز کے ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے، ۱۹۱۹ء میں طبع ہوئی۔ نکات الشعراء میر تقی میرؔ کا مشہور تذکرہ ۱۹۲۰ء، دیوان دردؔ بار اوّل ۱۹۲۳ء، خطوط سرسید بار اوّل ۱۹۲۴ء، دیوان رنگینؔ و انشاؔ بار اوّل ۱۹۲۴ء اور بجلی کے کرشمے۔ مصنفہ سید معشوق علی۔

مہاراجہ سر کرشن پرشاد شادؔ کی مشہور کتب۔ رباعیات شادؔ ۱۹۲۶ء بیاض شادؔ ۱۹۲۶ء اور روزنامچۂ گلبرگہ ۱۹۲۴ء نظامی پریس میں طبع ہوئیں۔ مراثی انیسؔ تین جلدوں میں شائع ہوئے جن کی تصحیح پروفیسر سید علی حیدر نظم طباطبائی نے کی۔ جو اپنی صحت و طباعت کے اعتبار سے منفرد ہے۔

جسٹس سر شاہ محمد سلیمان بھی ہندی مسلمانوں میں ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ مولانا نظامیؔ نے خدا جانے ان کے کان میں کیا منتر پھونک دیا۔ قانون تو ان کا پیشہ ہی تھا ادب اور سائنس سے بھی عشق تھا۔ قصائد ذوقؔ، غزلیات ذوقؔ، اور مثنویات میرؔ مرتب کر کے مولانا کے سپرد کیں۔ ان کی اشاعت بھی مانند دیوان غالبؔ، اعلیٰ معیار پر ہوئی۔ اردو کتب کی طباعت و اشاعت کے لیے نظامیؔ صاحب نے قابل تقلید نمونہ چھوڑا ہے۔ "قاموس المشاہیر" آپ کی مشہور تصنیف ہے۔

یہ بڑے سائز کی دو جلدوں میں ہے جو آپ کی مسلسل بارہ سالہ محنت و جگر کاوی کا نتیجہ ہے۔ پہلی جلد ۱۹۲۳ء میں اور دوسری ۱۹۲۶ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ زبان اردو میں اس نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ اور مرحوم کے طرز نگارش کا حسین ترین نمونہ ہے۔

ادبی حلقوں میں علامہ اقبال اور سر راس مسعود کی دوستی مشہور تھی۔ اقبال کے ہزاروں اشعار ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔ مثنوی زہر عشق حفظ تھی۔ اسی بنیاد پر نظامی پریس سے اسے شائع کرایا۔ اس زمانے میں زہر عشق کی طباعت قانوناً جرم تھی، اس لیے نظامی صاحب نے گورنمنٹ سے اجازت لے کر اور صحیح نسخہ بہم پہنچا کر ۱۹۲۰ء میں اس کو شائع کیا۔ "حیاتِ حافظ رحمت خان" سید الطاف علی بریلوی کی بڑے معرکے کی تصنیف ہے جو ۱۹۳۴ء میں چھاپی۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" مصنفہ سید طفیل احمد صاحب منگلوری دور حاضرہ کے ہندستانی مسلمانوں کی جامع اور غیر جانبدار تاریخ سے متعلق پہلی سیاسی کتاب ہے جو مسلمانوں کے لیے ہی نہیں، ہر ہندستانی کو خضرِ راہ کا کام دیتی ہے۔ مصنف موصوف نے دیباچہ میں لکھا ہے: "یہ کتاب ہرگز پایہ تکمیل کو نہ پہنچتی اگر مولوی نظام الدین صاحب نظامی میری مدد نہ کرتے۔" اس میں ۴۲۲ صفحے ہیں۔ نظامی پریس سے ۱۹۳۷ء و ۱۹۳۹ء میں دو ایڈیشن نکلے۔

۱۹۳۰ء سے پہلے سوانح کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ عام لوگوں کا تو سوال ہی نہیں خواص کے ذہن بھی صاف نہ تھے۔ ملک کی بھاری اکثریت صدیوں سے جذباتی زندگی بسر کرتی رہی ہے۔ اس طرح کی زندگی بسر کرنے والوں کی نظامی صاحب نے کھلے عام، صاف صاف مذمت کی ہے۔ آپ کو تحریک آزادی کی ریڑھ کی ہڈی کہنا چاہیے۔

مولانا مرحوم ہندستانی قوم کی اخلاقی و ذہنی پستی گوارہ نہ کر سکتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندستانی لوگ مغربی تعلیم اور نئی تہذیب کے غلام بن کر اپنی تہذیب اپنا مذہب، اپنی قومی روایات و اصولِ معاشرت کو فراموش کر دیں۔

ادبی سرگرمیوں میں پریس کو بڑی اہمیت ہے۔ نظامی مرحوم کی بقا کے لیے خدا نے آپ کو پریس عطا کیا۔ ان سے ان کے جواہر پارے نہایت سرعت کے ساتھ منظر عام پر آنے لگے۔ ذوالقرنین کے ذریعہ تقریباً نصف صدی مسلمان قوم اور اردو زبان کی جو خدمت کی اس کو قوم کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ماہرین تعلیم میں آپ کا خاص مقام ہے۔ ترقی و توسیع تعلیم کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ تحریک آزادی کی جو کتابیں بطور سند پیش کی جاتی ہیں بھلے ہی ان میں مولانا مرحوم کا نام نہ آئے، تو ان سے ان کی خدمات ختم نہیں ہو جاتیں۔ آپ بھارت کو سالم و بے میں آزاد دیکھنا چاہتے تھے کہ ۸ رجون ۱۹۴۷ء کو آپ کا کسوتِ حیات چاک ہو گیا۔ اے بدایوں کے چمکدار ستارے "نظامی" تم تو کیا رخصت ہوا۔ تیرے ساتھ انسانیت کا عجز و انکسار، محبت کا سوز و گداز اور علم و حکمت کا نور بصیرت بھی رخصت ہو گیا۔ اے علم و ہنر کے علم بردار اور اے ہندو مسلم اتحاد کے پیام بر۔ اللہ کی رحمتوں کا نزول تیرے مزار پر ہمیشہ ہمیشہ ہوتا رہے:

ان کو تلاش ہے کہ نظامی کدھر گیا
مل جائے وہ تو اس کو اسیر بلا کریں
کہہ دے یہ ان سے کوئی وہ جی سے گزر گیا
آپ اس کی مغفرت کے لیے اب دعا کریں

★

ساغر مہدی

شوق بہرائچی

بحیثیت ایک طنز و مزاح نگار



مضمون نگار

ریاست حسین شوق بہرائچی (مرحوم)

ریاست حسین صاحب شوق مرحوم کا ذکر آتے ہی ایک انتہائی دھان پان، رعشہ دار جسم، چشمے کے پیچھے اندر کو دھنسی ہوئی بے رونق آنکھیں، چیچک رو، کشادہ پیشانی، الجھے ہوئے سفید بال، کھانسی اور دمہ کی شدت سے پھولتی ہوئی سانس، بوسیدہ شیروانی میں ملبوس انسان کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ شوق صاحب بڑے زود رنج تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر مہینوں روٹھے رہتے لیکن اگر خوش ہو جاتے تو صبح و شام کی نشستیں اور محفلیں جمائے۔ حالات، واقعات اشخاص، مشاعروں اور صافتوں پر دلچسپ تبصرہ اور ادبی رموز نکات پر پُر مغز بحیث اور گفتگو کرتے اور نئے نئے لطیفے سناتے۔ درمیان میں کھانستے بھی جاتے، سانس جب زیادہ پھولنے لگتی تو سجدے میں چلے جاتے۔ اس طرح سانس بحال کرتے۔ نمک کی کنکری پھانکتے اور مسکراتے ہوئے پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ مفلسی، تنگ دستی، ضعیفی اور ناقدریٔ زمانہ کے باوجود وہ اپنی ذہانت کے مخملی نیام میں طنز کی تیغ صیقل بے رہے۔ حالات نے کبھی انھیں طرحی غزلیں فروخت کرنے پر مجبور کیا اور کبھی جسم میں جان نہ ہونے کے باوجود مشاعروں کے دور دراز سفر اور شب بیداریوں پر آمادہ کیا، کبھی کسی ابن الوقت کی شان میں قصیدہ پیش کرنے پر اکسایا اور کبھی قرض خواہوں کی خوشنودیٔ مزاج میں ان کو گھنٹوں شعر سنانے پڑے۔ اس طرح مر مر کے زندگی بسر کرنے والا تمام عمر ہمیں قہقہے اور مسکراہٹیں بانٹتا رہا۔ کیونکہ یہ اس کا فن تھا، اس کا ہنر تھا اور اس کا مزاج تھا۔

ڈاکٹر اعجاز حسین، شوق صاحب کی مزاح نگاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"موجودہ دور کے مزاح نگاروں میں شوق بہرائچی کے کارنامے قابل قدر ہیں۔ ان کے یہاں مزاح میں سنجیدگی بھی ہے اور اندازِ بیان میں فن کاری بھی۔ وہ سپاٹ پن جو خالص ظرافت کا طرۂ امتیاز ہے ان کے یہاں پیچ و خم سے گزر کر صرف آڑے ترچھے خطوط ہی نہیں بناتا بلکہ ان کی شاعری میں ایک خاص سیاسی اور سماجی شعور اور سنجیدگی ملتی ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب زندگی اور زندگی کے مسائل کا شدید احساس شاعر کے رگِ دل پر نشتر زنی کرنے لگے۔ جب دل پر نشتر زنی ہوتی ہے تو ہنسنے میں بھی تیکھے پن کا شدید احساس ہوتا ہے۔"

ان کی زندگی[1] میں ان کی شاعری اور فن سے متعلق ڈاکٹر اعجاز حسین

---

[1] شوق صاحب کی حیات میں راقم الحروف کا ایک مضمون آثار کلکتہ مارچ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا اور نازش پرتاب گڑھی کا ایک مضمون نکہت الہ آباد میں۔

کے علاوہ شاید ہی کسی قابل ذکر نقاد نے ان کا ذکر کیا ہو جس کی ذمہ داری ناقدین کے علاوہ خود حضرت شوق پر بھی عاید ہوتی ہے۔ عام طور سے وہ چھپنے چھپانے سے زندگی بھر کتراتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ان کی تخلیقات مشاعروں میں پیش کرنے سے قبل ہی عام ہو جائیں گی اور معاشی طور پر ان کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس کے باوجود ان کی تخلیقات مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ جن میں اودھ پنچ لکھنؤ، مجلس لاہور، قومی آواز لکھنؤ، پھلجھڑی کراچی، سرفراز لکھنؤ، تعمیر سرینگر، تیج دہلی۔ فانوس مدراس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں بابو پیری پورنا نند کی کوششوں سے حکومت اتر پردیش نے ان کو ساٹھ روپے ماہوار ادبی پنشن دینا منظور کر لیا جو ان کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ عالیہ بیگم کو منتقل ہوئی اور اب تک جاری ہے۔

ریاست حسین شوق ۶؍ جون سنہ ۱۸۹۶ء کو محلہ سید واڑہ، ایودھیا (فیض آباد) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سلامت علی ایودھیا کے خوش حال لوگوں میں تھے۔ بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اردو کی ابتدائی تعلیم اپنی گرہ میں باندھے تلاش معاش میں نکل پڑے۔ اور سنہ ۱۹۱۹ء میں بہرائچ وارد ہوئے۔ مختلف قسم کی ملازمتیں کیں مگر کہیں جی نہ لگا۔ مقامی میونسپل بورڈ کے علاوہ ریاست نواب گنج علی آباد میں نواب نوازش علی خاں قزلباش مرحوم کے مختار رہے مگر وہاں بھی جی نہ لگا اور جلد ہی یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اپنے منظوم حالات زندگی[1] یوں بیان کرتے ہیں:

سنیے اے مومنین نیک صفات — مختصر سے ہیں یہ مرے حالات
ہے ریاست حسین نام مرا — اور تخلص ہے شوق احقر کا
رہنے والا ایودھیا کا ہوں — اور سلامت علی کا بیٹا ہوں
تیرہ سو تیرہ ہجری جب آیا — میں اسی سال میں ہوا پیدا
مجھ میں جب کچھ شعور آنے لگا — پڑھنے اک مدرسے میں جانے لگا
اردو تھوڑی بہت پڑھی تھی ابھی — کہ طبیعت مری اچاٹ ہوئی
ساز تحصیل علم توڑ دیا — پڑھنا اور لکھنا میں نے چھوڑ دیا
دل پہ رنج و تعب اٹھاتا رہا — ٹھوکریں در بدر میں کھاتا رہا
پھر سنہ انیسویں کے قریں — یہ دل افسردہ و ملول و حزیں
چل پڑا آیا گھر سے بہرائچ — دانا اور پانی لایا بہرائچ
ایک مولانا کی سفارش پر — ہوا میونسپلٹی میں نوکر
اس میں دیکھی جو سخت پابندی — ہو کے عاجز وہ نوکری چھوڑی
وکلا کی کلرکی کرنے لگا — کسی صورت سے پیٹ بھرنے لگا
اس کی گھس گھس سے جب ہوا عاری — کی نوازش علی کی مختاری
ختم جب ہو گئی زمینداری — اور باقی رہی نہ مختاری
مجھ میں کچھ قوت کلام آئی — شاعری میری میرے کام آئی
میری شہرت تو پہلے ہی سے تھی — جاتا تھا میں مشاعروں میں بھی
ہر جگہ کامیاب رہتا تھا — آپ اپنا جواب رہتا تھا
اب بھی ہر جا بلایا جاتا ہوں — اب بھی ہر جا نوازا جاتا ہوں
ہے گورنمنٹ کی بھی مجھ پہ نگاہ — دیتی ہے ساٹھ روپیہ ہر ماہ
یوہی ہر شام ہر سحر میری — ہو رہی ہے گزر بسر میری
میری دو بیٹیاں ہیں دو فرزند — نئی تہذیب کے ہیں جو پابند
تین کی کر چکا ہوں میں شادی — اک کی باقی ہے خانہ آبادی

خادم مصطفیٰؐ و حیدرؑ ہوں
میں بھی اس انجمن کا ممبر ہوں

شوق صاحب رعشے کے باوجود وہ ایک بہترین خوش نویس بھی تھے۔ ماموں جان (سید ہدایت حسین قمر مرحوم) کے مرثیوں کے بستوں میں آج بھی حضرت شوق کے ہاتھ کے لکھے ہوئے میر انیس، میر نفیس، پیارے صاحب رشید وغیرہ کے مراثی موجود ہیں جو خوش نویسی و خطاطی کے بہترین اور نادر نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ عام اردو شاعروں کی طرح ایک عرصہ تک روایتی غزل کہتے رہے مگر اس صنف سخن اور سنجیدگی فن میں کوئی نمایاں شان نہ پیدا کر سکے۔ ابتدائی زمانے میں مولوی سید قربان حسین مرحوم[2] سے اصلاح و مشورہ کرتے رہے۔ مولوی سید قربان حسین

---

[1] مطبوعہ گولڈن جبلی نمبر انجمن وظیفہ سادات و مومنین ۱۹۶۵ء - [2] مولوی سید قربان حسین مرحوم

مرحوم کا خاندانی سلسلہ میر انیس تک پہنچتا تھا۔ اس طرح حضرت شوق انیس اسکول سے نسبت رکھتے تھے۔ وہ میر ببر علی انیس تو نہ بن سکے مگر حالات کی ستم ظریفی، گردش زمانہ اور مزاج کی شوخی نے ان کو اپنے عہد کا ضاحک ضرور بنا دیا اور یہ سلسلہ مقامی سیاست اور چشمکوں کے حوالے سے ہجو، طنز اور مزاحیہ نظموں سے شروع ہوا جس کی نقلیں آج بھی بیشتر مقامی سخن سنجوں اور زندہ دلان شہر کی بوسیدہ اور کرم خوردہ ڈائریوں میں محفوظ و موجود ہیں۔ ان کی چند مثالیں لطف سے خالی نہ ہوں گی۔ ایک نظم "محمود و ایاز" ملاحظہ ہو:

جہاں میں بار خدایا کوئی وکیل نہ ہو وکیل ہو تو وکالت میں بے عدیل نہ ہو
جو بے عدیل بھی ہو جائے تو جمیل نہ ہو جمیل ہو تو سیاست میں کچھ دخیل نہ ہو

یہ خوبیاں جو بیک وقت کوئی پاتا ہے
دماغ اس کا یقیناً خراب جاتا ہے

ہر اک کو دیکھنے لگتا ہے وہ حقارت سے کسی سے بات بھی کرتا ہے گر تو نخوت سے
ہر اک کو کرتا ہے مرعوب اپنی فطرت سے قدم زمین پہ رکھتا نہیں رعونت سے

ضمیر قیصر و ہامان بن کے رہتا ہے
وہ اپنے عہد کا شیطان بن کے رہتا ہے

کبھی کبھی اسے ہوتا ہے اپنی ذات پہ ناز کبھی گھمنڈ لیاقت پہ اور صفات پہ ناز
کبھی نمازیوں میں صوم اور صلوٰۃ پہ ناز غرض کہ اس کو ہے اپنی ہر ایک بات پہ ناز

یہی جو حال رہا اس کی خودستائی کا
عجب نہیں کہ وہ دعوا کرے خدائی کا

اور اس کے ساتھ جو ہے اک بہت بڑا صفی منافقت ہی میں جس کی تمام عمر کٹی
بنے نمود رہی جس کو روز بھپتی کسی نے خوب کسی اس کو دیکھ کر پھبتی

خدا کا شکر کہ اک عبد حیلہ ساز ملا
خدا کا شکر کہ محمود کو ایاز ملا

ان کی ایک اور بہت ہی صاف ستھری، دلچسپ اور بلیغ ہجو "سنا ہے کہ خواجہ نکالے گئے" بہت ہی معروف و مقبول رہی ہے۔ مضمون کی طوالت کے پیش نظر یہاں اس کو نقل کرنے کی گنجائش نہیں مگر جن حضرات نے ہفتہ وار اردو بلٹز بمبئی کے گزشتہ شماروں میں نئی گلستاں کے تحت گلزار ی لعل نندہ کے سلسلے میں بلٹز کے مزاحیہ کالم نگار کے قلم سے "سنا ہے کہ نندہ نکالے گئے" پڑھی ہوگی وہ حضرت شوق کی مذکورہ ہجو کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ ہجو سو فیصدی حضرت شوق کی ہجو کا چربہ ہے۔

بروز اتوار ۱۳ جنوری سنہ ۱۹۶۴ء کی صبح چار بجے ان کا انتقال ہوا۔ اس طرح اسی سال کی عمر میں طنز و مزاح کا یہ روشن چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا اور تکیہ چھڑے شاہ متصل آزاد انٹر کالج بہرائچ آخری آرام گاہ قرار پائی۔ انھوں نے بطور یادگار خود ترتیب دیے دو دواوین "طوفان" اور "ہیجان" چھوڑے جو تمام کوششوں کے باوجود اب تک ان کے ورثا سے حاصل نہ کیے جا سکے کہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آتے اور طنز و مزاح میں شوق صاحب کے مرتبہ اور حیثیت کا تعین ہو سکتا۔ دھیرے دھیرے ان کے قدر دان ان کے فن اور زیر لب تبسم کی شناخت والے بھی اللہ کو پیارے ہوتے جا رہے ہیں۔ احتشام حسین صاحب مرحوم مرتے دم تک جب ملے شوق صاحب کے کلام کی عدم اشاعت پر کف افسوس ملتے رہے۔ آخر وہ بھی عدم آباد کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ رہے نام اللہ کا۔

حضرت شوق نے کم و بیش پچاس سال اپنی شاعری پر صرف کیے جس میں ابتدائی سولہ برس غزل اور عام روائتی شاعری اور آخری چوبیس سال طنزیہ و مزاحیہ رنگ میں گزارے۔ اس طرح ان کی مجموعی شاعری کی عمر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۳۰ء اور دوسرا دور سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۶۴ء

شوق بہرائچی کا جو کچھ اور جس قدر کلام رسائل، اخبارات، ریڈیو اور مشاعروں نیز حضرت شوق کے پرستاروں کی یادداشت اور حافظے کی بنیاد پر دستیاب ہو سکا سر دست اس کلام کی چھان پھٹک کے ذریعے ان کے معیار و مرتبہ کا تعین کرنا ہوگا۔ بقول نثار احمد فاروقی طنز و مزاح کے الفاظ عموماً ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کے مفہوم و مقصود اور اظہار و اسلوب میں گہرا فرق ہے۔ یہ قطعاً ممکن ہے کہ کسی ادب پارے میں طنز ہو اور مزاح نہ ہو۔

یا بالعکس ان دونوں صفات کا اجتماع بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے بہت سے شاعر ایسے ہیں جنھیں یا تو صرف مزاح نگار ہی کہا جا سکتا ہے یا طنز نگار۔ ایسا بہت کم ہوگا کہ ایک ہی شخصیت ان دونوں کی جامع ہو۔ پھر طنز و مزاح کی قسمیں بھی بے شمار ہیں۔ طنز، تعریض، ہجو، تنقیص، تمسخر، استہزا، پھکڑ، پھبتی، شوخی، شگفتگی، ظرافت، تضحیک، ان سب لفظوں کے علاحدہ علاحدہ معنوں میں کچھ فرق بھی ہے اور ان میں ایک طرف اعلیٰ درجہ کی ذہانت، برجستگی اور نکتہ رسی کے نظاہر ملیں گے جنھیں بہترین تہذیبی شعور سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تو دوسری طرف پست اندیشی، سستی لذت، سوقیانہ اور مبتذل فکر کے جلوے بھی نظر آئیں گے جنھیں کچھ بھی کہا جائے ادب کہنا مشکل ہوگا۔ شوق بہرائچی کی شاعری ابتذال، پھکڑپن، تمسخر، بدمذاقی وغیرہ سے قطعاً صاف اور پاک ہے۔ ان کا رنگ ظرافت مزاحیہ بھی ہے اور طنزیہ بھی۔ انھوں نے غزل کی متانت، سنجیدگی، نزاکت و شرافت کو طنز و مزاح کے لطیف سانچے میں ڈھال کر اس میں نشتریت، تلخی، سادگی و پرکاری کے ساتھ ساتھ زیر لب تبسم کی آمیزش کی ہے۔ ان کے لہجے میں شدت، سنجیدگی اور وقار کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے ہمارے مزاحیہ اور طنزیہ ادب کے معیار و مذاق کی سطح بلند کی۔ بزرگوں مزاحیہ شاعری کو نئی وسعتوں اور نئے امکانات سے ہم آہنگ کیا۔ اکبر الہ آبادی اور ظریف لکھنوی کے ورثہ میں اضافے کے ساتھ ساتھ اپنی راہ سب سے جدا اور سب سے الگ نکالی۔ دراصل طنز و مزاح کا تعلق ہماری معاشرت اور اس کے مسائل سے ہے۔ ہمیں اپنے گرد و پیش کے بے ہنگم پن پہ ہنسنے اور مذاق اڑانے کے ساتھ ساتھ خود اپنی ذات پر ہنسنا آنا چاہیے۔ اور اسی وقت ممکن ہے جب ہمیں خود اپنی ذات کا عرفان اور سماجی شعور و ادراک حاصل ہو۔ ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

زمانہ یوں مرے سائے سے دور رہتا ہے
کہ جیسے کاٹ ہی کھائے گی مفلسی میری

بعید قدیم اور پرانی نسل سے تعلق رکھنے کے باوجود نئی قدروں پہ گہری نگاہ رکھنے والا یہ انسان، طبقاتی شعور اور سیاسی و سماجی ناہمواری کا کیسا تیز اور شدید احساس رکھتا ہے چند اشعار دیکھیے ؎

مری جان میرے وظیفے کو دیکھو
جو آنکھیں ہوں منھ پہ تو ہیرے کو دیکھو

یہ واعظ، یہ قائد یہ ناقد یہ رہبر
بڑے پاجیوں کے جزیرے کو دیکھو

ارے توبہ یہ انقلاب زمانہ
کرے بادشاہی فقیرے کو دیکھو
ہر اک راہرو اب ہے رہبر سے آگے
یہ گگڑی تو گگڑی ہے کھیرے کو دیکھو

گزرتی ہے جو غم زدوں پہ نہ پوچھو
تم اپنے سرنگی مجیرے کو دیکھو

طنزیہ اور مزاحیہ لفظیات کے وہ بہترین نباض اور رازداں شناس ہیں۔ ان کے فن اور رنگ سخن کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ان کے شعر کے مصرعۂ اولیٰ سے مزاح کا گمان تک نہیں ہوتا مگر مصرعۂ ثانی میں کسی ایک لفظ کو اس خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ شعر طنز و مزاح کا بہترین نمونہ بن جاتا ہے۔ ان کی یہی خوبی ان کی انفرادیت ہے جو ان کو اپنے معاصرین میں ممتاز اور صاحب طرز بناتی ہے۔ طنز کی یہ تہذیب یہ ادا یقیناً اردو ظرافت میں آپ اپنی مثال ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عروض اور فن کی باریکیوں پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ الفاظ کے دروبست اور بیان کے اظہار پر انھیں خاصی قدرت حاصل تھی۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج ذیل ہیں:

یہ عضو متناسب نہیں ترے اے دوست
بلینک ورس میں قدرت نے شاعری کی ہے

اب کے ناکام رہا قائد ملک و ملت
اب کے بربادیِ اقوام کا ٹھیکہ نہ ملا

بزم ادب بھی آئینہ بزمِ طور ہے
لوگ آرہے ہیں ہاتھ میں جوتا لیے ہوئے

یہاں ہر اہلِ فن کی قدر بعدِ مرگ ہوتی ہے
یہاں ہر ایک دعویٰ خارج المیعاد ہوتا ہے

اللہ رکھے زاہدِ صد سالہ کو قائم
اک یہ بھی ہے منجملۂ آثارِ قدیمہ

سرور و کیف سب پیدا ہوئے ہیں دخترِ زر سے
یہ لڑکی تو کئی لڑکوں کی ماں معلوم ہوتی ہے

واعظ کو بھی اب شکوۂ بے بال و پری ہے
اڑتا نہیں ہے مرغِ مسلم کئی دن سے

اللہ ہو غنی اس دنیا میں سرمایہ پرستی کا عالم
بے زر کا کوئی بہنوئی نہیں زردار کے لاکھوں سالے ہیں

سکوں شاید ہے پیدا ہونے والا
حکومت کی توجہ حاملہ ہے

کوئی نہ ہوگا تمھارا سنبھالنے والا
تمھارے حسن کی لٹھیا اللہ ہو تو سہی

آزاد ملک کر کے فرنگی چلے گئے
گھر میں غلیظ چھوڑ کے بھنگی چلے گئے

زلفیں جو بکھریں شام کے آثار ہو گئے
روزے ہمارے دن رہے افطار ہو گئے

دوڑی ہوئی ہے آپ کے چہرے پہ سیاہی
نام آپ کا مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں

حضرت شوق نے بہت سے شعری تجربے بھی کیے اور اردو شاعری کو جدید بحریں بھی عطا کیں۔ انھوں نے اس بحر کا نام "بحرِ شیرخوار" رکھا۔ چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

خار زار ارے واہ
پُر بہار ارے واہ
وہ نگاہِ کرم
ہفتہ وار ارے واہ
بے وفا کو یہ دل
پھر ادھار ارے واہ
کرسیِ ناز پر
اک گنوار ارے واہ

اگر آپ کا دیہاتی یا قصباتی زندگی سے ذرا بھی لگاؤ ہے تو یقیناً آپ نے یہ محاورہ ضرور سنا ہوگا "نہ باسی بچے نہ کتا کھائے"۔ حضرت شوق بہرائچی نے اسی کہاوت کو بحر بنا کر ایک قطعہ میں یوں پیش کیا ہے:

نہ رکھیں کوئی جتن اب اٹھائے
وہ لوٹیں جتنا بھی لوٹا جائے
نہ چھوڑیں کسی کے پاس اک پائی
نہ باسی بچے نہ کتا کھائے

ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں ان کی غزلوں سے زیادہ ان کی نظموں کو مستقل اضافے کی حیثیت حاصل ہے۔ جن میں "پوسٹ ماسٹر جنرل"، "مجھے معلوم نہ تھا"، وغیرہ کے علاوہ "دعوت" قابلِ ذکر ہے۔ "دعوت" کے چند بند ملاحظہ ہوں:

روٹی

بعد کچھ دیر کے آئی وہ خمیری روٹی
جیل میں جیسے ملے وقتِ اسیری روٹی

بے مزہ بے نمک و بے حس و بے جاں روٹی
چاک دل چاک جگر چاک گریباں روٹی
دیر ہضم ایسی جسے کھا کے ہر اک پچھتائے
سنگدل ایسی کہ دانتوں کو پسینہ آئے
حلق میں پہنچے تو صحت کا ازالہ کر دے
حلق سے اترے تو آنتیں تہ و بالا کر دے

سالن

پہلے تو لوگوں نے کچھ روکھا ہی سوکھا کھایا
بعد ازاں چھوٹے سے ڈونگے میں وہ سالن آیا
جس میں اندازہ نہ ہو پایا تھا کتنا پانی
ہاں مگر دیکھ کے سر سے ہوا اونچا پانی
صاف و شفاف وہ موتی سا مصفا پانی
جیسے دریاؤں میں بہتا ہوا ٹھنڈا پانی
میزباں کی تھی جو توقیر وہ کھو دی اس نے
کشتیٔ ذائقہ و رنگ ڈبو دی اس نے

پلاؤ

آیا پھر قابوں میں تھوڑا سا وہ خود دار پلاؤ
جس نے گھی کا بھی گوارا نہ کیا کوئی لگاؤ
جو کبھی ذائقہ و لطف کا خواہاں نہ ہوا
لونگ الائچی کا بھی شرمندۂ احساں نہ ہوا

جس کا چاول تھا ہر اک لاغر و کمزور و نحیف
جھائیاں رخ پہ پڑیں اور تن زار و کثیف
جسم بیچاروں کے عزت سے تھے سکڑے سکڑے
دل کئے فرط غم و اندوہ سے ٹکڑے ٹکڑے
سختی کھیتوں کی جو سہتے رہے بیچارے چاول
گلے کیا رکھتے تھے پتھر کا کلیجہ چاول

شیرمال

شیرمالیں تھیں مگر اٹھ کے یہاں آ نہ سکیں
اتنی خستہ تھیں کہ وہ تاب سفر لا نہ سکیں

شوق بہرائچی نے ادبی، سماجی، سیاسی اور معاشرتی موضوعات کے علاوہ قصائد، منقبت سلام اور نعتیہ کلام میں بھی اپنا مخصوص و منفرد رنگ نہایت چابکدستی اور سلاست روی کے ساتھ برتا جو کسی طرح آگ کے کھیل سے کم نہیں۔ چند متفرق اشعار قصائد اور منقبت سے پیش کیے جاتے ہیں[1]

آمد ہے اس غضنفر آہو شکار کی
جس کے پدر نے کفر کی لٹیا اُلار کی

عباس کی حقیقت عابد سے کوئی پوچھے
معصوم تو نہیں ہیں معصوم کے چچا ہیں

خلد میں شاہ بحر و بر شوق کو دیں گے چودہ[14] گھر
دیکھی ہے میں نے یہ خبر پرچۂ سرفراز میں

★

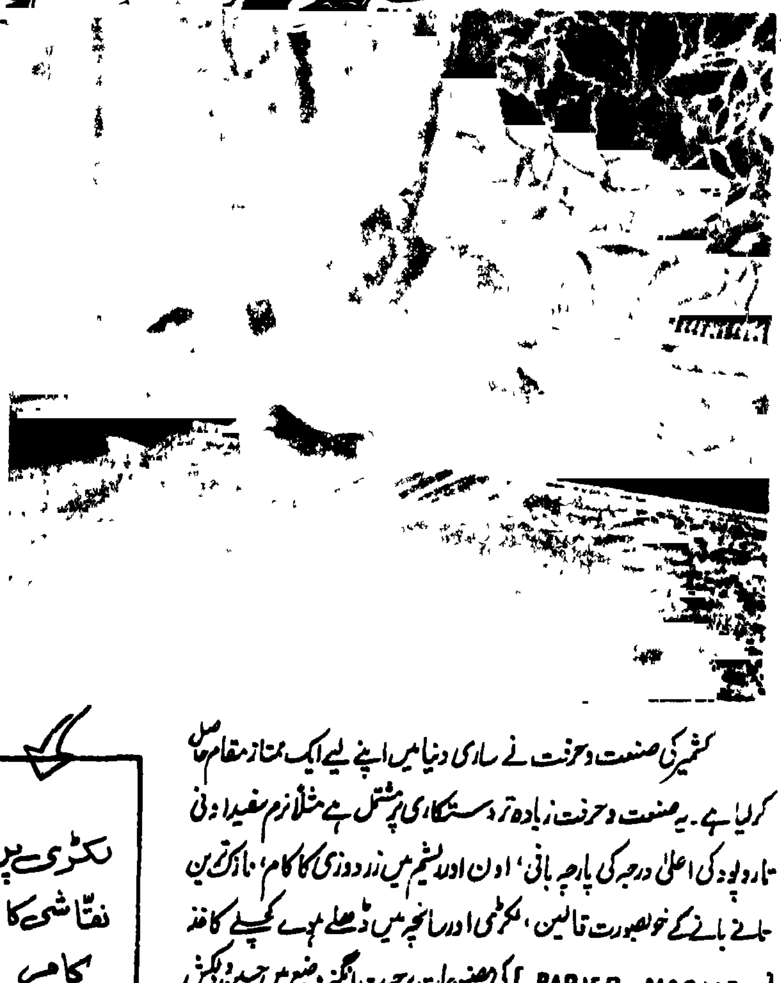
---

[1] ہفتہ وار سرفراز۔ لکھنؤ

ڈاکٹر محمد یسین



کشمیر کی صنعت و حرفت



کشمیر کی صنعت و حرفت نے ساری دنیا میں اپنے لیے ایک ممتاز مقام حاصل کرلیا ہے۔ یہ صنعت و حرفت زیادہ تر دستکاری پر مشتمل ہے مثلاً نرم سفید اونی تار و پود کی اعلیٰ درجہ کی پارچہ بافی، اون اور ریشم میں زردوزی کا کام، نازک ترین تانے بانے کے خوبصورت قالین، لکڑی اور سانچہ میں ڈھلے ہوئے کچلے کاغذ [PAPIER MACHE] کی مصنوعات پر حیرت انگیز وضع میں حسین و دلکش مصوری و نقاشی، چوبی منبت کاری میں کٹاؤ کا آرائشی کام اور نقش و نگار، بید کی بٹی ہوئی ٹہنیوں سے استادانہ بناوٹ اور خوشنما نازک دھات کا کام، وغیرہ وغیرہ۔ دیہی صنعتوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ چوبی منبت کاری ہے جو نہ صرف یہ کہ حسین و خوبصورت ہوتی ہے بلکہ بہت زیادہ کارآمد بھی ہے۔ اخروٹ کی عمدہ لکڑی کی حسین مصنوعات جیسے چقیں، کھانے اور نشست کے کمروں کے سامان، دودکشی کے خلوت خانے اور نجی استعمال کی دوسری چیزیں۔ ان سب کے لیے ساری دنیا میں روز افزوں بازار موجود ہے۔ ایک قسم کا لکڑی کا کام جو تقریباً کلیتہً مقامی صنعت ہے اور جو "خاتم بندی" کہلاتی ہے، اندرونی چھتوں کی آرائش کے کام میں آتا ہے اور یہ چوبی کام صنوبر کی لکڑی کی پٹیوں پر مختلف اقلیدسی شکلوں میں جو بذریعہ خطوط ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں، بنایا جاتا ہے۔

سرینگر کا گرد و پیش اتنا دلکش اور دلربا ہے کہ اس نے زمانہ بعید میں فنکارانہ اور استادانہ صناعی کو نشو و نما دی ہے ان کشمیری صناعوں کا مقابلہ کرنا جو اپنے قدیم وضع کے اوزار سے نہایت پر تکلف، آراستہ اور استادانہ مصنوعات تیار کرتے ہیں، ناممکن ہے۔ کشمیر کی بہترین زردوزی فرانس کی اجرت پر زردوزی کا کام کرنے والی عورتوں کی صناعی کی حریف ہے یہاں کی چاندی کی مصنوعات لندن کی سب سے زیادہ فیشن ایبل دکانوں کی مصنوعات سے کمتر نہیں ہیں۔ کشمیری پوستین اور سمور وغیرہ جو صنف نازک کے لیے نہایت پرکشش ہوتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیرس میں تیار ہوئے ہیں

لکڑی پر نقاشی کا کام

کشمیری شال (ایسی کہ ایک پوری شال خاتم شاہی سے گزر جائیگی) کی شہرت صدیوں سے دنیا کے دور دراز گوشوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ریز کی انسائیکلوپیڈیا کے مطابق "رومی کشمیری شال سے، جو شوخ اور حسین تار و پود کا کپڑا ہوتا ہے، اچھی طرح واقف تھے۔ یہ حیرت انگیز طور پر نرم اور ملائم اون سے بنی جاتی ہے اور اس کی بناوٹ اتنی نازک ہوتی ہے کہ اس کا مقابلہ یوروپین اقوام کبھی بھی نہ کرسکیں۔"

یہ شالیں تین طریقے سے بنائی جاتی ہیں ——
سادہ کپڑے کی زمین پر زر دوزی کے ذریعہ زمینی پارچہ کے ساتھ وضع بافی، وضع کا زمینی پارچہ کے ایک جز و لاینفک کی حیثیت سے بُننا اور بعد میں زر دوزی سے اس کی تزئین۔ صناعوں کا ایک خاص طبقہ "شال باف" ہوتا ایک اعلیٰ درجہ کی شال کی تیاری میں برسوں صرف کرتا تھا۔ اس کی تیاری میں لگنے والا سامان بہت قیمتی ہوتا تھا یہ مہین اور نازک پشمینہ اُون ہوتا تھا جو کشمیر میں چاندی کے ہم وزن فروخت ہوتا تھا۔

کشمیری قالین چینی، ایرانی اور ترکی قالینوں کا کامیابی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ قالین سازی کی صنعت جو ریاست کی سب سے بڑی صنعتوں میں سے ہے، اور جس کی سالانہ پیداوار کی قیمت ایک کروڑ روپیہ



قالین بافی



گبا سازی

آنکی جاتی ہے، کلیتۂ یورپ اور امریکا کے ساتھ برآمدی تجارت کے سہارے پھل پھول رہی ہے۔ قالین سازی کی صنعت کو کشمیر نے سب سے پہلے کشمیر کے فرماں روا سلطان زین العابدین بڈشاہ (۱۴۷۴-۱۴۲۳ء) نے متعارف کرایا تھا۔ اوسط درجہ کے قالین بننے کی رفتار ۴ فیٹ روزانہ سے ایک مہینہ میں ۱۲ انچ تک گھٹتی بڑھتی ہے، جس کا انحصار کام اور ڈیزائن کی پیچیدگی پر ہوتا ہے۔ اس صورت میں جو استاد صناع ہیں وہ ایک مہینہ میں صرف ایک انچ قالین بن سکتے ہیں جس میں فی مربع انچ ۴۰۰ گرہیں ہوتی ہیں اس قسم کے ایک قالین کی قیمت مکمل ہونے کے بعد جو کافی لمبا چوڑا ہوتا ہے، پانچ ہزار روپے سے زیادہ ہوتی ہے۔ سوزن کاری جس سے ایرانی قالین باف اپنی قالینوں کو گنجان بنایا کرتے تھے، کشمیر میں کامیابی کے ساتھ اختیار کرلی گئی ہے۔ ہراتی اور کرمانی قالین بھی بہت عمدہ تیار کیے گئے ہیں۔ اور یارقندی قالین کی وضع کی بھی کامیابی سے نقل کی گئی ہے۔

ایک اور اسی قسم کی صنعت ہے گبا سازی جو شاید اننت ناگ (اسلام آباد) ہی تک محدود ہے۔ یہ جگہ سرینگر سے باہر ہے۔ گبہ سازی وہ اونی کپڑے ہیں جو ٹکڑوں سے بنائے جاتے ہیں اور خوش پوش، پلنگ پوش اور میز پوش کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان اونی کپڑوں کا پس منظر مختلف رنگوں کا ہوتا ہے اور جزوی یا کلی طور پر



پیپر ماشی

بکثرت دیسی اقلیدسی یا دوسرے ڈیزائنوں سے جو زردوزی یا سوزن کاری سے بنتے ہیں مرصع ہوتے ہیں۔ یہ جمے ہوئے نمدہ زیادہ گراں اور ہاتھ سے بنے ہوئے قالین سے بہت زیادہ ارزاں ہوتے ہیں۔

قالین بافی کے علاوہ کشمیر میں ایک بہت ہی دلچسپ صنعت نمدہ ہے ۔ قدرے بنے ہوئے کپڑے کو جما کر دبیز کرنے کے بعد اس کے اوپر زردوزی سے نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ نقاشی کرتے ہیں۔ یہ نمدے جیسا کہ عام بول چال میں کہا جاتا ہے، اگر ان کو توشک کے طور پر استعمال کیا جائے، تو بہت گرم ہوتے ہیں اور بہت عمدہ غلاف اور پٹے ثابت ہوتے ہیں ان نمدوں والوں نے آج کل کے مشینی دور میں بھی اپنی پوزیشن برقرار رکھی ہے۔

زمانہ دراز تک "پیپر ماشی" کشمیر کے نام کے مترادف تھا۔ کاغذ کی لگدی اور سنہرے روغن سے مختلف چیزیں، پیالیاں، شمع دان، اور مختلف قسم کے صندوقچے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ کشمیر میں "پیپر ماشی" کی مصنوعات کی تیاری ترقی یافتہ صنعتوں میں سے ہے، جو عہد عتیق سے نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔

★

نیا دور کے قلمی معاونین سے

ازراہِ کرم اپنی تخلیقات کے شروع میں یا آخر میں اپنا مکمل پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔ نا طلبیدہ مضمون، افسانہ، غزل یا نظم کی ایک نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔ اگر واپسی کے لیے ڈاک لفافہ یا ٹکٹ ساتھ میں موصول نہ ہوں گے تو ان کی واپسی کی ذمہ داری ادارہ پر نہ ہوگی۔

لیلیٰ لکھنوی

وہ سحر نہ ہوئی

(افسانہ)

"نشیمن" اب بھی موجود ہے مگر اب اس کی اونچی اونچی قلعہ جیسی دیواروں میں بڑے بڑے شگاف پڑ گئے ہیں۔ جگہ بہ جگہ ٹوٹی پھوٹی اینٹیں صاف نظر آ رہی ہیں جو مہر بہ لب اپنی بوسیدگی اور خستگی کا ماتم کر رہی ہیں۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے یوکلپٹس کے بے شمار درخت سر جھکائے خاموش و ساکت کھڑے ہیں۔ ہر طرف در و دیوار پر خاموشی اور ویرانی چھائی ہے جیسے "نشیمن" کا کونا کونا اپنے سینے کے اندر کوئی غم چھپائے ہوئے ہے ایک ایسا غم جس کے افشا ہونے سے ساری کائنات، سارا جہان ظلمتوں کے اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔ ہر درد مند دل تڑپ اٹھے گا، ہر آنکھ اشکبار ہو جائے گی! انگور کی مرجھائی سوکھی ہوئی بیل کے قریب جا کر میرے قدم بوجھل ہو گئے، دل ڈوبنے سا لگا اور باوجود انتہائی ضبط کے میری آنکھیں چھلک اٹھیں۔ "ہائے کیسے آگے بڑھوں کس کے گلے سے لپٹ کر کہوں کہ "سیما آپا دیکھئے میں آ گئی ہوں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ جب بھی مجھے موقع ملے گا اور میرے حالات مجھے اجازت دیں گے میں آپ سے ملنے ضرور آؤں گی۔ آپ جانتی ہیں میں نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی۔ میں جہاں کہیں بھی ہوں آپکی محبت اور آپ کے حسن کی کشش مجھے کھینچ لائی۔ ہاں مجھے آنے میں دیر ضرور ہوئی ہے اتنی دیر کہ دنیا کے رسم و رواج کے مطابق بے رحم لوگ آپ جیسی نازنین پیکر کو منوں مٹی کے اندر دفن کر آئے ہیں۔ کیا آپ کا حسن، شہابی چہرہ، لمبی لمبی سیاہ پلکوں کی چلمن سے ڈھکی ہوئی غلافی آنکھیں، نازک سا جسم، باوقار شخصیت اور اعلیٰ صفات اس قدر کمسنی میں خاک میں ملا دیے جانے کے قابل تھے؟ اب میں کبھی آپ سے نہ کہہ سکوں گی کہ سیما آپا آپ کس قدر حسین ہیں خدا آپ کو نظر بد سے بچائے ــــــ" اور ایک بار پھر میرا جی چاہا کہ میں چیخ مار کر الٹے پیروں وہاں سے بھاگ جاؤں اور جیسے ہی میں جانے کے لیے مڑی اندر سے سراج چچا کی آواز سنائی دی،

"کون ہے؟"

سراج چچا ہی تو میری سیما آپا کی بربادی، تباہی اور موت کے ذمہ دار تھے۔ انھیں کے بیجا اصولوں، ضد اور ہٹ دھرمی نے سیما آپا کی زندگی، ارمانوں، حسرتوں اور جوانی کا گلا گھونٹ دیا تھا ــــــ مگر نہ تو انھیں کسی کی زندگی کے مٹنے کا کوئی احساس ہوا اور نہ ہی ان کی وضع داری میں بظاہر کوئی فرق آیا۔ ہاں اگر کبھی تنہائیوں میں انھیں کچھ احساس ہوا بھی ہوگا تو ان کے چہرے سے کبھی اس کا اظہار نہ ہوا جس طرح خاتمہ زمین داری سے قبل وہ تختوں کے چوکے پر جس پر دودھ جیسی سفید چاندنی بچھی ہوتی تھی، ایرانی قالین اور گاؤ تکیے لگے رہتے تھے، اس پر بڑے شان و شوکت سے بیٹھے حقے کے کش پر کش لگایا کرتے تھے۔ چاندی کے خاصدان سے قوام لگی پانوں کی گلوریاں کھایا کرتے تھے، اور گھر کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ فرد پر اپنا حکم اور حکومت جتاتے رہتے تھے اسی طرح زمین داری ختم ہو جانے کے بعد بھی ان کی وضع داری میں کوئی خاص فرق نہیں آیا علاوہ اس کے کہ گھر کے اندر اور باہر دونوں جگہ پر وہ جاہ و حشم اور آن بان قائم نہ رہ سکی جو پہلے تھی۔ ملازمین کی تعداد میں بھی کمی ہو گئی۔ اخراجات میں بھی کفایت برتی جانے لگی مگر ان کے دل و دماغ، ضدی مزاج اور دقیانوسی اصولوں میں ذرہ برابر تبدیلی نہ ہوئی زمانے اور وقت کے ساتھ چلنا ان کی شان کے خلاف تھا۔ جو بات منھ سے نکلتی وہ پتھر کی لکیر بن جاتی، خواہ اس کی قیمت جان سے ہی کیوں نہ چکانا پڑتی بچی ان سے بے حد ڈرتی تھیں اور گھر کے سکون، خوشی اور ظفر بھائی کی خاطر بے انتہا صبر و تحمل سے ان کے ہر جا و بیجا حکم کو بجا لاتی تھیں جیسے نہ ان کی اپنی کوئی پسند تھی، نہ شخصیت تھی اور نہ کوئی رائے بس وہ سراج چچا کے اشاروں پر چلتی تھیں اور کبھی بھی کسی قسم کی مخالفت و احتجاج بلند کرنے کی جرأت تو بڑی چیز ہے اس کا تصور تک نہ کر سکیں۔

ظفر بھائی اس زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔

ہمیشہ کے خوددار، ضدی مگر بے حد ذہین اور شاعرانہ مزاج رکھنے والے۔ سیما آپا سراج چچا کی مرحومہ بہن کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ جب بہن بسترِ مرگ پر آخری سانسیں لے رہی تھیں تو سراج چچا نے ظفر بھائی کے ساتھ سیما آپا کی منگنی کی تجویز پیش کی۔

سیما آپا کو ٹھکرانے کی کس میں ہمت تھی کون سا ایسا سنگدل تھا جو ان کے حسن، دلکشی اور شخصیت کے سحر کا اسیر نہ ہوتا؟ ان کی سادگی سے مسحور نہ ہوتا۔ ان کے حسن کا مرکز ان کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں تھیں، امنڈتی کالی گھٹاؤں کو شرما دینے والے ان کے لمبے لمبے سیاہ بال جو ان کی پشت پر لہرایا کرتے تھے۔ اگر کسی بزم یا محفل میں ظفر بھائی پہلی بار ان کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ لیتے تو ہمیشہ سیما آپا کے خواب دیکھتے۔ اور تڑپ تڑپ کر آہیں بھرتے —— وہ جب بھی علی گڑھ سے چھٹیوں میں لکھنؤ آتے تھے تو سیما آپا کے حسن کا سحر اور قربت کی کشش غیر ارادی طور پر انھیں ان کی طرف جھکا دیتی تھی ان کے قدم ٹھٹھک کر رہ جاتے تھے۔ سیما آپا کے علاوہ اگر کسی اور لڑکی کے ساتھ ظفر بھائی کی شادی کا سوال اٹھایا جاتا تو وہ ضرور دبی زبان سے سراج چچا سے کہتے ——

" ابا گستاخی معاف میں لڑکی کو بغیر دیکھے، ملے اور اس کے خیالات معلوم کیے بنا شادی نہیں کرسکتا کیونکہ یہ میری زندگی کا سوال ہے"

مگر سیما آپا کا نام سن کر ان کے لبوں پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی اور بولے " جی بھلا میں آپ کے انتخاب پر کچھ کہہ سکتا ہوں، آپ کی پسند میری پسند " اور اسی شام کو سیما آپا کے ساتھ ظفر بھائی کی منگنی کی مختصر رسم ادا کردی گئی۔ گلابی چکن کے کپڑوں میں سیما آپا بے حد دلکش لگ رہی تھیں۔ اس قدر سادگی اور میک اپ کے بغیر ان کے حسن کی تابانی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ شرم و حیا سے بوجھل جھکی ہوئی نگاہیں ماں کی علالت سے غمگین و پریشاں حال، تمتماتے ہوئے چہرے پر آنسوؤں کی نمی، جیسے گلاب کے پھولوں پر صبح شبنم کے قطرے جھلملاتے ہیں بچی سیما آپا سے بے انتہا محبت کرتی تھیں، شرمائی سکڑی سمٹی دلہن کے چہرے کی بار بار بلائیں لے رہی تھیں۔ سراج چچا نے شکرانہ ادا کیا کہ صاحبزادے کو ان کی تجویز اور خواہش پر کوئی اعتراض نہ ہوا ان کی بات بھی رہ گئی اور بہن کی نشانی گھر کی عزت بن گئی —— بسترِ مرگ پر سسکتی ہوئی ماں نے ظفر بھائی کو گلے سے لگایا، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان کی بلائیں لیں اور بس اتنا ہی کہہ سکیں کہ " سیما کو تمہارے سپرد کر رہی ہوں اب اس دنیا میں تم لوگوں کے سوا اُس کا کوئی نہیں ہے۔ اُس کا خیال رکھنا ——"

منگنی کے کچھ ہی روز بعد سیما آپا کی والدہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اور سیما آپا تڑپتی رہ گئیں ——

انھوں نے اپنے آپ کو اپنی تعلیم اور پینٹنگ میں بھلا دیا۔ منگنی کے بعد سے وہ ظفر بھائی کو اپنا مجازی خدا سمجھنے لگی تھیں۔ انھیں کا خیال و تصور اور آئندہ زندگی کے سنہرے سپنے ان کا مقصدِ حیات بن گئے تھے وہ تمام چیزیں جو ظفر بھائی کو پسند اور مرغوب تھیں انھیں سیما آپا نے اپنا لیا۔ اپنی پسند کو ظفر بھائی کی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش پر قربان کردیا۔ مثلاً ظفر بھائی کو سفید رنگ بہت ہی پسند تھا۔ سیما آپا نے جب بھی اپنے کپڑوں کا انتخاب کیا اس میں سفید رنگ کو اہمیت دی۔ موسمی پھولوں کی کیاریاں صرف سفید رنگ کے پھولوں کی ہوتی تھیں وہ کہتے تھے " سفید رنگ سے جاں نثاری اور وفا کی بو آتی ہے " انھوں نے اپنے کمرے میں سفید پردے، سفید پلنگ پوش اور گلدان میں سفید ہی رنگ کے پھول لگائے تھے جو سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے ظفر بھائی کی یاد دلاتے رہتے تھے۔ ظفر بھائی کو جو چائنیز اور کانٹی نینٹل کھانے پسند تھے اُس میں بھی انھوں نے مہارت حاصل کرلی تھی اور جب وہ علی گڑھ سے لکھنؤ آتے تھے تو سیما آپا اپنے ہاتھ سے روزانہ ان کی پسندیدہ ایک نئی ڈش تیار کرتی تھیں اور بے حد خلوص اور محبت کے ساتھ پیش کرتی تھیں۔ ظفر بھائی چپکے سے اُن سے مسکرا کر کہتے تھے " کس قدر خوش نصیب ہوں میں۔ تم نے تو میرے دل کے تاریک گوشوں اور اداس زندگی کو اپنی تابانیوں سے منور کردیا ہے۔ تمہارے بغیر میری زندگی بے کیف اور نامکمل ہے سیما " اور وہ جھینپ جاتی تھیں۔ چہرہ شرم سے گلنار ہوجاتا اور نگاہیں بے اختیار جھک جاتیں۔ وہ بس مسکرا دیتی تھیں اور ظفر بھائی ان کے چہرے کو گلابی دیکھ کر اور بھی بے چین

ہو جاتے تھے ـــــــ

سیما آپا ایک بہترین فنکار اور آرٹسٹ بھی تھیں۔ بچپن ہی سے ان کے اندر یہ جذبہ موجود تھا۔ کانونٹ کی تعلیم اور محنت سے یہ شوق اور فن مزید پروان چڑھا۔ بعد میں انھوں نے آرٹ کالج جوائن کر لیا تھا، جہاں ان کے فکر و فن کے جوہر رنگوں میں نکھر کر سامنے آ گئے۔ وہ آئیل پورٹریٹ اور لینڈ اسکیپ بنانے میں ماہر تھیں۔ ایک بار انھوں نے ظفر بھائی کی ایک تصویر کی لائف سائز پینٹنگ کی تھی۔ جب چھٹیوں میں وہ لکھنؤ آئے تو اس کو بہت ہی خوب صورت ٹشو پیپر میں لپیٹ کر سفید ربن سے باندھ کر وہ اس پینٹنگ کو ان کے کمرے کی میز پر چپکے سے رکھ آئی تھیں۔ سب سے ملنے کے بعد جب ظفر بھائی اپنے کمرے میں گئے، تو میز پر ایک تحفے کو اپنا منتظر پایا۔ بے تاب ہو کر جلدی کھولا تو اپنی پورٹریٹ نکلی اور وہ بھی اس قدر باکمال۔ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ ہونٹوں پر ایک گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔ کس قدر خلوص اور عقیدت سے لبریز تھا وہ تحفہ! کتنی گھڑیاں کتنے دن اس کے بنانے میں گزرے ہوں گے جو سیما آپا کے بے کراں خاموش ایثار و محبت کی یقین دہانی کرا رہا تھا ـــــــ وہ الٹے پاؤں کمرے سے باہر نکلے۔ نگاہیں سیما آپا کو ہر سو تلاش کرتی رہیں پھر وہ گیلری میں مل گئیں۔ ان کی جھکی جھکی نگاہیں دیکھ کر ظفر بھائی بچوں کی طرح چیخ اٹھے، "خدارا سیما ذرا ٹھہرو تو، اتنے بیش قیمت خوبصورت تحفے کا شکریہ تو ادا کر لینے دو۔ للّٰہ مجھ سے اس طرح نگاہیں نہ چراؤ، اس قدر درِ رنہ بھاگو میں بھی آخر انسان ہوں پتھر نہیں ہوں" اور وہ پتھر کے بت کی طرح خاموش و ساکت کھڑی ان کی قدموں کو تکتی رہیں، دل ہی دل میں پرستش کرتی رہیں بھلا کیسے کہتیں "یہ تو ایک حقیر سا نذرانہ ہے ابھی تو آپ پر اپنی جان نچھاور کرنا ہے"۔ بڑی مشکل سے رک رک کر بولیں "آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں" اور ظفر بھائی کا دل بے اختیار مچل اٹھا کہ وہ ان کے خوب صورت ہاتھوں کو چوم لیں، ان کو اپنی بیتاب باہوں میں بھر لیں۔

علی گڑھ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سراج چچا نے ظفر بھائی کو انجینئرنگ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے لیے جرمنی بھیج دیا۔ ان کے جانے سے قبل چچی نے دبی زبان سے سراج چچا سے سیما آپا کی رخصتی کی یاد دلائی تو وہ گرج کر بولے "جب تک ظفر انجینئرنگ کا کورس کر کے ہندوستان میں ملازم نہ ہو جائیں گے سیما کی شادی نہیں ہوگی"۔ اس نادر شاہی حکم کے بعد کس میں ہمت تھی جو مخالفت کرنے کی جرأت کرتا۔ کون تھا جو ان کے ارادے کو بدل سکتا تھا؟ چچی چپکے چپکے روئیں بھی، ظفر بھائی کے ماتھے پر شکن بھی پڑی، سیما آپا کے چہرے پر اداسی بھی چھائی مگر وہ تختوں کے چوکے پر بیٹھے حقے کے یکے بعد دیگرے کش پر کش لگاتے رہے اور دو ارمان بھرے دل چپ چاپ تڑپتے رہے ــــ

جرمنی سے ظفر بھائی کے خطوط آتے رہے۔ دو سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ سراج چچا کو نہ وقت کا احساس ہوا نہ ان کا ارادہ بدلا۔ ایک بار ظفر بھائی نے سراج چچا کو لکھا تھا کہ "آپ بذریعہ تحریر سیما کا نکاح کر کے اس کو جرمنی بھیج دیجئے"، جس کو پڑھ کر وہ اس قدر چراغ پا ہوئے اس قدر گرجے کہ سارا نشیمن ہل گیا ـــــــ خط کے جواب میں انھوں نے ظفر بھائی کو لکھا تھا کہ "جرمنی جا کر تم ہماری خاندانی روایات رسم و رواج عزت اور وقار کو بھول گئے ہو، ظفر میں تحریری نکاح کا مخالف ہوں، اس میں میری اور میرے خاندان کی رسوائی ہے جب تک تم کورس ختم کر کے یہاں برسرِ روزگار نہ ہو جاؤ گے اس وقت تک یہ شادی نہیں ہوگی سیما جرمنی نہیں آئے گی، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اب اس سلسلے میں آئندہ مجھے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے"

اس ضد اور ٹکراؤ سے سیما آپا کا دل لرز اٹھا۔ وہ تو بچپن ہی سے محرومِ تمنا رہی تھیں۔ ایک ایک کر کے سبھی چاہنے والے ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ محبت اور شفقت کے لیے وہ دوسروں کا منھ تکتی تھیں کوئی ایسا نہ تھا جس کے پاس بیٹھ کر وہ اپنے غموں کا بوجھ ہلکا کرتیں۔ وہ آنسو بہا لیتیں بس دل ہی دل میں اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھیں۔ ظفر بھائی سے وابستگی اور محبت کے جو رشتے قائم ہوئے تھے اس کے حلقۂ زنجیر کو توڑ دینا ان کے لیے موت سے بدتر تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ ظفر بھائی اب بچے نہ تھے جن کو ڈرا دھمکا کر یا رعب جتا کر کام نکالا جا سکتا ہے کہ اگر شادی ہو گی تو انجینئرنگ کا کورس ختم کرنے کے بعد ہی جب ہندوستان میں ملازمت مل جائے گی، تحریری نکاح سے

خاندان میں رسوائی ہوگی، نکاح اور رخصتی ہوگی تو باپ دادا کی چوکھٹ "نشیمن" سے جس میں سارا کنبہ، عزیز و اقارب، لکھنؤ کے رؤسا اور احباب کی شرکت لازمی ہوگی، "نشیمن" کا ایک ایک گوشہ روشنی سے جگمگائے گا، شہنائیاں بجیں گی، بڑے شان و شوکت کے ساتھ دعوتِ ولیمہ کا اہتمام ہوگا، خواہ ان اخراجات کو برداشت کرنے کے لیے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے ورنہ یہ شادی نہیں ہوگی چاہے سیما آپا زندگی بھر کنواری ہی کیوں نہ بیٹھی رہیں!

اور پھر نئی اور پرانی نسل کے خیالات سے تصادم ہوگیا۔ ظفر بھائی کا جواب کیا تھا ایک بم تھا جس نے گھر کے تمام افراد کو ہلا کر رکھ دیا ـــــ در و دیوار لرزا اٹھے اور سراج چچا غصے سے تلملا اٹھے اور چیخ کر بولے:

"صاحب زادے نئی تہذیب اور آزادی کے گل کھلا رہے ہیں، شرم و حیا، تہذیب و تمدن سے قطعی بے نیاز ہوگئے ہیں، لکھتے ہیں "میں قدیم رسم و رواج، خاندانی روایات اور پرانی فرسودہ رسموں، اور جھوٹی شان و شوکت کو قطعی نہیں مانتا ہوں۔ آپ کو اپنے اصول مبارک ہوں، اگر آپ بغیر نکاح کی رسم کے سیما کو جرمنی نہیں بھیجنا پسند کرتے ہیں تو آپ اس کی شادی کہیں اور کر دیجئے! میں انجینیئرنگ کا کورس ختم کرکے امریکہ میں سکونت اختیار کر لوں گا اور اب ہندوستان واپس نہیں آؤں گا کیونکہ نہ میرا وہاں کوئی مستقبل ہے اور اب نہ کوئی اپنا ہے۔ سیما میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ مجھ تک آسکے۔ جھوٹی اور فرسودہ رسم و رواج کو توڑ سکے۔ لہٰذا اس کو میری طرف سے اپنا مستقبل سنوارنے کی اجازت ہے۔"

ظفر بھائی کو کیا معلوم تھا کہ صرف انھیں کا خیال اور تصور سیما آپا کا ماضی و مستقبل تھا۔ انھیں کو وہ اپنا ساتھی اور ہم سفر سمجھتی آئی تھیں اور اب جبکہ یہ نقوش ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوچکے تھے، ان کی زندگی کا ایک جز بن چکے تھے، ان کو مٹا دینا کچھ آسان نہ تھا۔ وہ کس دل سے کسی اور کو اپنا ساتھی بنا سکتی تھیں، جس دل پر سوتے جاگتے ظفر بھائی حکمراں رہے ہوں، ان کی رفاقت میں...... بیتا ہوا ہر لمحہ سیما آپا کی تنہائیوں کو پیامِ مسرت سناتا رہا ہو۔ وہ دل کسی اور کا کیسے ہوسکتا تھا؟ مگر ان میں اتنی ہمت اور جرأت بھی نہ تھی کہ وہ سراج چچا سے کہتیں کہ "ماموں جان یہ میری اور ظفر کی زندگی کا سوال ہے۔ خدا کے لیے آپ اپنا نقطۂ نظر بدل دیجئے۔ مجھے ظفر کے پاس جرمنی بھیج دیجیے ورنہ میں آپ کے "نشیمن" کے زنداں میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔ ذرا سوچیے تو میرے ماموں جان ظفر کو میری ضرورت ہے ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ میں اتنے بڑے جہان میں اکیلی کہاں بھٹکتی پھروں گی، کس کے سہارے زندہ رہوں گی؟"

مگر نہ تو سیما آپا کے لرزتے ہونٹ ہی ہلے، نہ تو کوئی فریاد سنائی دی اور نہ تو ان کے ٹوٹے ہوئے دل سے کوئی آہ نکلی ـــــ بس انھیں ایک چپ سی لگ گئی تھی جیسے کسی نے جیتے جی سونپ دیا ہو کہ کچھ عرصے کے بعد انھیں دفن کر دیا جائیگا ـــــ انھوں نے سراج چچا کو کہتے سنا تھا کہ "میں ظفر کو اپنی جائداد سے محروم کر دوں گا آج سے نہ وہ میرا بیٹا ہے اور نہ میں اس کا باپ ہوں۔" اور سیما آپا کے دل میں جیسے دیمک لگ گئی۔ وہ اندر ہی اندر کھوکھلی ہوتی چلی گئیں۔ جو امیدیں، ارمان اور خواب ان کے دل میں بسے تھے وہ سب منتشر ہوگئے جو چراغ روشن ہوئے تھے وہ سب آن کی آن میں بجھ گئے ـــــ ان کا غم اور درد گہرا ہوتا چلا گیا۔ وہ زندگی کی محرومیوں اور ناامیدیوں کے دھندلکوں میں گھرتی چلی گئیں ان کی زندگی راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی کیونکہ اس کی گرمی اور چنگاریاں تو ظفر بھائی کے ساتھ چلی گئی تھیں ....

سراج چچا کی نگاہوں نے سیما آپا کے وجود کو مٹتے ہوئے بھی دیکھا۔ ان کے معصوم اداس چہرے کی بیکراں ویرانی اور عنقریب آنے والے انجام کو بھی محسوس کیا مگر ان کی ضد، ہٹ دھرمی اور اصول اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ان کی وضع داری میں کسی قسم کا فرق نہ آیا وہ ہمیشہ کی طرح اپنے کمرے میں تختوں کے چوکے پر بیٹھے حقے کے کش لگاتے رہے، پانوں کی گلوریاں چباتے رہے۔

اور ایک صبح جب خلافِ معمول سیما آپا کے کمرے اور کھڑکیوں کے پردے گرے رہے تو کمزور اور لڑکھڑاتے قدموں سے چچی ان کے کمرے میں گئیں اور ان کے منھ سے ایک دردناک چیخ نکل گئی۔۔ انھوں نے دیکھا سیما آپا اپنے بستر پر ابدی نیند سو رہی تھیں۔

کا جسم برف کی سل کی طرح سرد پڑا تھا سفید مرجھائے ہوئے چہرے پر بے پایاں درد و کرب نمایاں تھا کھلی ہوئی بے کیف نگاہیں تیوراگئی تھیں۔ جیسے ان کی روح تڑپ تڑپ کر نکلی ہو۔

شاید دمِ آخر سیما آپا نے پہلی اور آخری بار اپنے معبود سے اپنی بد قسمتی محرومیوں اور سراج چچا کی بے رحمی و بے التفاتی کا شکوہ کیا تھا۔ ظفر بھائی کو یاد کیا تھا جبھی تو ان کے مرجھائے ہوئے چہرے پر بے پناہ کرب و اندوہ نمایاں تھا جیسے ان کی کھلی ہوئی آنکھیں آخری بار ظفر بھائی کا دیدار کرنا چاہتی تھیں ــــــ شاید ان کی زندگی میں کبھی ایسے بھی لمحات آئے ہوں گے جن میں ان کی نہاری توں اور شرمیلی نگاہوں نے اس حسین سحر کا تصور بھی کیا ہوگا جب ظفر بھائی وفورِ جذبات سے بے تاب ہو کر دیوانہ وار ان کے درخشاں چہرے اور افشاں سے بکھرے ہوئے سیاہ بالوں پر سے جھلملاتے ہوئے سرخ دوپٹہ کو ہٹاتے اور وہ بارِ حیا سے اپنی غلافی آنکھوں پر اپنی سیاہ پلکوں کی چلمن گرالیتیں اور شرم و حیا سے دوہری ہوجاتیں، کسماتیں اور وہ ان کے سیمیں پیکر کو اپنی مضبوط باہوں میں سمیٹ لیتے اپنے دہکتے ہوئے لبوں کو ان کے ہونٹوں میں پیوست کر دیتے کہ سانس لینا دشوار ہوجاتا ــــــ

سیما آپا نے اپنے ہونے والے خوب صورت گھر کے بھی خواب دیکھے ہوں گے جس کے لان کی سامنے کی کیاریوں میں ظفر بھائی کے پسندیدہ گلاب کی مختلف قسمیں "کس آف فائر" "مسچیف" اور "فلیمنگ سن سٹ" کے دلکش پھول مسکراتے، کمروں اور کھڑکیوں کے دروازے سفید پھول دار نائلکس کے پردوں سے ڈھکے ہوتے جن کے پیچھے وہ اور ظفر بھائی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے مسکراتے، قہقہے لگاتے۔ ڈرائینگ روم کی دیوار پر ظفر بھائی کی لائف سائیز آئیل پینٹنگ لگی ہوتی۔ اور کمروں کے گوشے پھولوں سے بھرے ہوتے جن کی دلکش خوشبو پوری فضا کو مہکا دیتی۔ مگر وہ حسین سحر جس کا سیما آپا کی تشنہ لب زندگی کو برسوں سے انتظار تھا کبھی نہ آئی۔

★

رحمٰن حامی

غزل

سازش ہیں یوں تو دنیا ہی مصروف ہے سنا
میرے خلاف تیرا بھی ملفوف ہے سنا

چاہے تو بخش دے جو نہ چاہے تو دے سزا
یہ بات اب تو تجھ پہ ہی موقوف ہے سنا

یوں تو سبھی کے نام ہیں فہرست میں تری
بس ایک میرا نام ہی محذوف ہے سنا

میرے خلاف جس نے لگائی ہے تجھ سے وہ
اک مولوی نما کوئی موصوف ہے سنا

بھرتا رہا جو صبح و مسا دوستی کا دم
دشمن ہمارا اب وہی مالوف ہے سنا

پینے سے جس کے بڑھتا ہے خود آدمی کا ظرف
ساقی وہ تیری آنکھ کا ظروف ہے سنا

رحمٰن حامی کو میں سمجھتا تھا اجنبی
لیکن یہ تیرے شہر میں معروف ہے سنا

مالک رام

خسرو نمبر — تاثرات کے آئینے میں

C. 396 DEFENCE COLONY

NEW DELHI-24

۲ مئی ۱۹۷۵

مکرمی خورشید احمد صاحب آداب

میں بہت شرمندہ ہوں کہ آج تک نیا دور کے 'خسرو نمبر' کے لیے آپ کو مبارکباد پیش نہیں کر سکا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میں مہینوں سے بستر علالت پر دراز ہوں۔ دن بھر لیٹے لیٹے اور کچھ نہیں ہو سکتا، تو کچھ پڑھتا رہتا ہوں۔ لکھنے کی ابھی تک اجازت نہیں ملی۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ یہ خاص نمبر بہت اچھا ہے۔ مضامین کے معیار، ان کی تعداد اور رسالے کی ضخامت — ہر پہلو سے آپ اس پر فخر کر سکتے ہیں۔ زندہ باشید۔

میری تجویز یہ ہے کہ اسے کتابی شکل میں محفوظ کر دیا جائے۔ بوقت اشاعت رسائل ضائع ہو جاتے ہیں، اور بعد کو ان کی دستیابی محال ہوتی ہے۔ خدا کرے، آپ ہر طرح بخیر و عافیت ہوں۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

واصف نظامی طاہر پوری

خسرو نمبر دیکھ کر

محب گرامی! سلام و رحمت

طویل انتظار کے بعد "نیا دور" کا "خسرو نمبر" اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ لگتا ہے "نیا دور" کا ہر خاص نمبر اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ جیسے کوئی ماہر بکار بازی گر اپنے جھولے سے خلاف توقع کوئی عمدہ اور بہترین چیز پیش کر کے مجمع کو حیران و ششدر کر دیتا ہے آپ نے بھی ٹھیک اسی طرح بغیر کسی اطلاع کے یہ نہایت شاندار "خسرو نمبر" پیش فرما کر ادبی دنیا کو چونکا دیا۔ "خسرو نمبر" کو آپ نے جس سلیقے اور نفاست سے سنوارا اور سجایا ہے اس سے آپ کی عظیم فنکارانہ صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ نمبر دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا اور قلب و دماغ پر ایک عجیب سا کیف و سرور طاری ہو گیا اور اس عالم نشاط میں واردات قلب صفحۂ قرطاس پر قطعات کی صورت میں بکھر گئے جو پیش خدمت ہیں۔ —— واصف نظامی طاہر پوری

قطعات

"خسرو نمبر" کو محترم خورشید — آپ نے خوب تر سجایا ہے
اور فنکار قیصر سرمست — واہ کیا سرورق بنایا ہے

اے "نیا دور" تیری عمر دراز — علم کا تو نے در کیا ہے باز
خسروی شان تو نے دکھلائی — ہے یقیناً یہ اک ترا اعجاز

اے "نیا دور" تیری خدمت کو — بھول سکتی نہیں کبھی اردو
تجھ سے مہکا جہان علم و ادب — ہر طرف پھیلی ہے تری خوشبو

اے "نیا دور" تو نے پیش کیا — ہے خوش رنگ [illegible]
"خسرو نمبر" کی شان کیا کہیے — ہے مضامین کا اک گلدستہ

ہیں مضامین سب کے سب شستہ — جن سے کھلتے ہیں راز [illegible]
"خسرو نمبر" ہے عمدگی میں بھی — دلکش و دیدہ [illegible]

غزل

ہریش دار برشمی

سلیقہ ہے تجھے تاروں سے لَو لگانے کا
کہ میں چراغ نہیں داغ کے گھرانے کا

وہ دیکھ برف کے پھولوں میں جاگتی ہے سحر
یہی ہے کیا ترا انداز مسکرانے کا

خلوص شرط ہے پی لو گا زہر بھی اے دوست
تو پہلے سیکھ لے مجھ سے ڈھنگ آزمانے کا

لیا جو شاخِ گلِ تر کو جھک کے باہوں میں
وہ اک بہانہ تھا تجھ کو گلے لگانے کا

سرور سے تو فرشتوں کو پیش کر ساقی
میں جام ہوں تری آنکھوں کے بادہ خانے کا

چلی جو یاد تمہاری الکھ جگاتی ہوئی
بھٹک گیا کوئی جوگی کسی ٹھکانے کا

اڑوں تو چوم لوں تجھ کو کہ ایک جگنو ہوں
خواب ہے کسی پربت کے شامیانے کا

مری لگن کا سفینہ نہ ڈوب جائے کہیں
ترا وجود بھنور ہے کسی بہانے کا

ترے کلام، ترے جام، تیرے نام سے پریم
چمک رہا ہے ستارہ ترے زمانے کا

شاہد ساگری

ہم ایک رہیں گے

ہے اپنا یقیں دیش کے دیوانے سبھی ہیں
اس شمعِ ضیا بار کے پروانے سبھی ہیں
ہیں وقف یہاں اس کی محبت کے لیے ہم
مٹ جائیں گے اس دیش کی عظمت کے لیے ہم
ہم اس چمنِ خاص کے رکھوالے رہیں گے
اس میکدۂ عشق کے متوالے رہیں گے
کوئی بھی ہمیں اس سے جدا کر نہیں سکتا
ہم میں سے کوئی اس کا گلہ کر نہیں سکتا
تا زیست اسی کے لیے سرشار رہیں گے
اس مے کے ہمیشہ ہی طلبگار رہیں گے
ہر آن دل و جاں سے فدا اس پہ رہیں گے
قربان دل و جاں سے سدا اس پہ رہیں گے
عزت کو کبھی اس کی گرانے نہیں دیں گے
دشمن کو کبھی آنکھ اٹھانے نہیں دیں گے
الفت ہے تو آنکھوں کے گہر ایک ہیں اپنے
دو سمت سہی دل تو مگر ایک ہیں اپنے
زنہار نہ شاہدؔ برا آپس میں کہیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

اترپردیش سرکاری خبریں

اعظم گڈھ فساد کے مصیبت زدگان کو ایک لاکھ روپیہ کی مزید امداد ● ● ● اچھے کھلاڑیوں کی امداد کے لیے ٹرسٹ کے قیام کی تجویز ● ● ● مشترکہ پری میڈیکل ٹسٹ میں بیالوجی کے تمام طلبا کو شرکت کی اجازت ● ● ● ہریجنوں کی شکایت پر مناسب اور فوری کارروائی ● ● ● کمزور طبقے کو مالی سہولتیں ● ● ● اترپردیش لاٹری کے پہلے انعام کی تقسیم ● ● ● اسپورٹس کالج جولائی سے کھل جائے گا ● ● ●

وزیر اعلا شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے اپنے امدادی فنڈ سے ایک لاکھ روپیہ ان مصیبت زدگان کو تقسیم کرنے کے لیے منظور کیا ہے جنھیں گزشتہ ۲۶ مارچ کو اعظم گڈھ میں آتش زنی اور لوٹ مار میں نقصان پہنچا تھا۔ اس سے قبل مصیبت زدگان کو فی کس ۲۵۰۰ روپیہ دیا جا چکا ہے۔

امدادی رقم کا تعین ضلع مجسٹریٹ کی رپورٹ پر کیا گیا ہے جو انھوں نے شہر میں ہونے والے لوگوں کے نقصانات کے سلسلے میں دی تھی۔ وزیر اعلا نے ضلع مجسٹریٹ کو مصیبت زدگان کی ہر ممکن مدد و اعانت کرنے کی ہدایت کی ہے۔

⁂

وزیر اعلا شری ایچ۔ این بہوگنا نے عالمی ہاکی کپ جیتنے والی ہندستانی ٹیم کے منیجر شری بلبیر سنگھ کو جب یہ بتایا کہ ان کی حکومت قومی اور بین اقوامی شہرت رکھنے والے بوڑھے اور معذور اسپورٹس مینوں اور کھلاڑیوں کی امداد کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کرنے کی تجویز رکھتی ہے تو شری بلبیر سنگھ نے جذبات بھرے الفاظ میں کہا کہ "آپ نے اسپورٹس مین کو عمر بھر اسپورٹس مین رہنے اور بحیثیت اسپورٹس مین مرنے کے بھی لائق بنا دیا ہے۔"

شری سنگھ نے افسوس ظاہر کیا کہ جوانی میں تو ہمارا زبردست خیر مقدم کیا جاتا ہے اور انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ لیکن پیری میں ہمیں آسانی سے بھلا دیا جاتا ہے اور نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

انھوں نے وزیر اعلیٰ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اترپردیش میں ان کا جو شاندار استقبال کیا گیا اس سے کھلاڑی ایک باعزت زندگی گزارنے کی توقع کر سکتے ہیں۔

⁂

ریاستی حکومت کے ایک فیصلے کے موجب اب انٹرمیڈیٹ سائنس (بیالوجی گروپ) کے تمام طلبا ۷۶-۱۹۷۵ء کے تعلیمی سال کے دوران مشترکہ پری میڈیکل ٹیسٹ میں شرکت کے مجاز ہوں گے۔ حکومت نے اس سے قبل عائد کردہ یہ شرط ختم کر دی ہے کہ گورکھپور یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے مشترکہ پری میڈیکل ٹیسٹ میں سرکاری میڈیکل کالجوں اور کے۔ جی۔ میڈیکل کالج لکھنؤ میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کورس میں داخلے کے لیے صرف ایسے امیدوار شرکت کر سکتے ہیں جنھوں نے انٹرمیڈیٹ سائنس (بیالوجی گروپ) کا امتحان ۱۹۷۵ء، ۵۰ فیصد نمبروں کے ساتھ پاس کیا ہو۔ اس کے علاوہ اس شرط کے تحت ۴۵ فیصد نمبروں کے ساتھ کامیاب ہونے والے اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے طلبا کو بھی اس ٹیسٹ میں شرکت کی اجازت دی گئی تھی۔

⁂

بعض اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ضلع کانپور میں چھوت چھات اور ہریجنوں پر مظالم کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے اور سماجی شعور بیدار نہ ہونے کی بنا پر ہریجن اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی شکایتیں کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

ریاستی حکومت نے اس سلسلے میں جانچ کی جس سے معلوم ہوا کہ یہ الزامات بے بنیاد ہیں۔ جانچ کے دوران ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس نے سماج کے مختلف شعبوں کے لوگوں سے ملاقات کی جنھوں نے نہ تو

کا پنو. میں ہریجنوں پر بڑھتے ہوئے مظالم کی شکایت کی اور نہ چھوت چھات کی شکایت کی۔

اس کے برعکس جانچ سے یہ معلوم ہوا کہ ہریجنوں کی شکایتوں کا مناسب اندراج کیا جاتا ہے اور اولیت کی بنیاد پر اس کی جانچ کی جاتی ہے۔ ان شکایتوں کی جانچ عام طور پر گزیٹیڈ پولیس افسران کرتے ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ریاستی حکومت نے میدانی علاقوں کے دیہاتوں میں واقع اسکولوں میں درجہ ایک سے درجہ پانچ تک زیر تعلیم سماج کے کمزور طبقے کے ۶۴۰۰۰ طالب علموں کو مفت درسی کتابوں کو مہیا کرنے کی غرض سے گزشتہ مہینے ۱۹۲۰۰۰ روپیہ کی مالی امداد منظور کی ہے۔

یہ درسی کتابیں کمزور طبقے سے تعلق رکھنے والے طلباء اور طالبات کو آئندہ تعلیمی سال سے مہیا کی جائیں گی۔ کتابیں اسکول کی لائبریری میں رکھی جائیں گی اور ہر طالب علم کو آئندہ تعلیمی سال کے دوران میں کتابوں کا ایک سیٹ بطور قرض مہیا کیا جائے گا۔ طالب علموں کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ ان کتابوں کو تعلیمی سال کے ختم ہونے پر دوسرے طالب علموں کے استعمال کے لیے واپس کر دیں۔

درجہ ایک کے طالب علموں کو یہ کتابیں ان کی حاضری اور سرپرستوں کی مالی حالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے دی جائیں گی جبکہ درجہ دوم سے درجہ پانچ تک کے طالب علموں کو یہ کتابیں ان کی حاضری سالانہ رفتار ترقی اور پچھلے درجوں میں انھوں نے جو نمبر پائے ہوں ان کی بنیاد پر دی جائیں گی۔ پسماندہ ضلعوں کے طالب علم خصوصی توجہ کے مستحق ہوں گے۔

یاد ہوگا کہ اس کے علاوہ ان ہی شرائط پر میدانی علاقوں کے شہروں میں واقع جونیئر بیسک اسکولوں کے پہلے درجہ سے پانچویں درجے تک کے طالب علموں کو درسی کتابیں مہیا کرنے کی غرض سے ۸۰۰۰۰ روپیے کی الگ رقم منظور کی گئی ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

اترپردیش ریاستی لاٹری کی ۴۶ ویں قرعہ اندازی میں ایک لاکھ روپے کا پہلا انعام جیتنے والی شریمتی کستوری دیوی کو سکریٹریٹ میں گزشتہ ۹ راپریل کو اسپیشل سکریٹری مالیات مہیش پرشاد نے انعامی رقم کا بینک ڈرافٹ پیش کیا۔

یہ خوش نصیب خاتون کانپور کے محلہ کچھیانہ کی رہنے والی ہیں۔ ان کے شوہر لچھمن پرشاد دستکاری ایک غریب آدمی ہیں جن کی ماہانہ آمدنی ۱۵۰ روپیہ ہے لیکن آج کل وہ بیکار ہیں۔ ان کے چار بچے ہیں جن میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

انعامی رقم کا ایک حصہ شریمتی کستوری دیوی اپنی لڑکیوں کی شادی اور لڑکوں کی تعلیم پر صرف کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

لکھنؤ میں اسپورٹس کالج، جو ریاست میں اپنی نوعیت کا پہلا کالج ہوگا، آئندہ جولائی سے شروع ہونے والی تعلیمی سال سے کام کرنے لگے گا۔

یہ کالج لکھنؤ سے ۱۰ کلومیٹر کے فاصلے پر لکھنؤ کرسی روڈ پر واقع گاؤں "گودمبا" میں تعمیر کیا جا رہا ہے۔ تعمیراتی کام مکمل ہونے تک یہ کالج لکھنؤ شہر میں ہی کسی کرایے کی عمارت میں کھولا جائے گا۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد مختلف کھیلوں میں ہونہار طالب علموں کو ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ٹریننگ دینا ہے۔ کھیلوں کے ساتھ ساتھ اس کالج میں تعلیم کا بلند معیار قائم کرنے کے لیے پوری کوشش کی جائے گی تاکہ اچھے طلبا اس کالج میں داخلے لینے کے لیے راغب ہو سکیں۔

آرٹس گروپ کے ایسے طلباء کو جن کو فٹ بال، باسکٹ بال، ورزش اور والی بال کا شوق ہو کالج کے پہلے سال کے کورس کے تحت نویں درجے میں داخل کیا جائے گا۔ ہر طالب علم کو ۵۰۰ روپیہ سالانہ کی شرح سے فیس ادا کرنا ہوگا اور مفت قیام و طعام کے بندوبست کے ساتھ ساتھ اسے کالج کی طرف سے کتابیں، اور اسکول اور کھیل کود کی وردی بھی فراہم کی جائے گی۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

دیوانِ صد غزل

حسین علی تاسف ۔ مرتبہ:۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نونہروی۔
طبع اول: دسمبر ۱۹۸۲ء ضخامت: ۲۵۲ صفحات ۔
قیمت :۔ بارہ روپے ملنے کا پتہ : اردو پبلشرز، ۸ تلک مارگ، لکھنؤ ملا

حسین علی تاسف اردو ادب کی تاریخ کا ایک گم شدہ باب ہیں جن کے نام اور کلام دونوں ہی کے بارے میں اردو ادب کی تاریخیں عام طور پر خاموش نظر آتی ہیں شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ اس گم نام شاعر کو تذکروں میں بھی کوئی جگہ نہیں ملی۔ سعادت خاں ناصر کا تذکرہ خوش معرکۂ زیبا وہ واحد تذکرہ ہے جس میں اردو کے اس غیر معروف شاعر کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ کے اس گم شدہ باب کی بازیافت ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی کا ایک قابلِ قدر تحقیقی کارنامہ ہے۔ دیوانِ صد غزلہ حسن علی تاسف کے کلام کے اس واحد قلمی نسخے پر مبنی ہے جو ریاست محمود آباد کے نادر الوجود کتب خانے کی ملکیت ہے اور جس کے کسی اور نسخے کے وجود کا ابھی تک کہیں کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ ان امور کی روشنی میں زیرِ تبصرہ کتاب کی اہمیت اردو تحقیق کے لیے یقیناً مسلّم ہے۔

حسین علی تاسف تاریخِ ادب کے اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں جب انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کے دوران لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کی سربراہی میں چلنے والی ادبی اور لسانی اصلاح کی تحریک عمل اور ردِ عمل کی منزلوں سے گزرتی ہوئی ایک فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ چکی تھی اور اس تحریک کے تیز رو دھارے کو روکنے والی قوتیں اپنی کوششوں میں ناکام ہو چکی تھیں۔ اس اصلاحی تحریک کے خلاف ناسخ اور آتش کے علی الرغم جن قوتوں نے کھل کر رزم آرائی کی تھی ان میں انشا، اور مصحفی کے بعد تاسف کا بھی نام آتا ہے۔ دیوانِ صد غزلہ میں شامل حسین تاسف کا مفصل دیباچہ اس اصلاحی تحریک کے خلاف اس ناکام جوابی کارروائی کا آخری اقدام ہے جس کے ابتدائی نقوش انشاء کی دریائے لطافت (۱۲۲۲ ہجری) میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی نے اس لسانی رزم آرائی کا تجزیہ کتاب کے مقدمے میں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "۔۔ حسین علی تاسف اس طبقاتی کشمکش میں اسی قدامت پسند گروہ کے دارثین جو طرزِ نو در ایجاد تازہ کا سخت مخالف تھا۔

تاسف کا دیباچہ اس وقت وجود میں آیا جب ناسخ اور آتش کی سربراہی میں چلنے والی ادبی اور لسانی اصلاح کی تحریک کو کامیابی سے ہم کنار ہوئے تقریباً بیس سال بیت چکے تھے لہٰذا صورتِ حال کو تبدیل کرنے میں اس کی کامیابی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ البتہ تاسف کا یہ دیباچہ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ اس رزم آرائی میں شکست کے بعد بھی مزاحم قوتوں نے نئی روش کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا تھا۔ اس مزاحم گروہ نے تبدیل ہونے کے بجائے تحلیل ہو جانا گوارا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تاسف اور ان کے ہم خیال ادبی تاریخ کا ایک ایسا گم شدہ باب بن چکے ہیں جس کے بارے میں مورخینِ ادب کا حافظہ کسی بات کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ تاسف کا مطالعہ اس لحاظ سے ڈوبتے ہوئے تاروں، الجھتی ہوئی نبضوں، اکھڑتی ہوئی سانسوں اور گم نامی کی تاریکیوں میں تحلیل ہو جانے والی ان ادبی قوتوں کا مطالعہ ہے جو لسانی تازہ کاری کے ابھرتے ہوئے سورج کے سامنے ماند ہو کر تاریخِ ادب میں اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکیں مگر لسانی اصلاح کی تحریک کے خط و خال کو بخوبی سمجھنے میں جن کی اہمیت سے انکار کرنا دانش مندی کا ثبوت نہ ہوگا۔ لکھنؤ میں لسانی تازہ کاری کی تحریک کا کوئی بھی جائزہ اس وقت تک مکمل نہ ہوگا جب تک اس تحریک کے موافقین کے ساتھ ساتھ اس کے مخالفین کے نظریات کا بھی مطالعہ نہ کر لیا جائے۔ مگر بدقسمتی سے اس تحریک کے مخالفین کے خیالات کو ادبی تاریخوں نے نظر انداز کر دیا۔ زیرِ تبصرہ کتاب اردو کی ادبی تاریخ کے اسی رخنے کو پُر کرتی ہے۔ یہ درست ہے کہ تاسف کے کلام میں اعلیٰ تخلیقی اور فنی صلاحیتوں کے ثبوت نہیں ملتے، یہ بھی صحیح ہے کہ تاسف کے ادبی نظریات خامیوں اور کوتاہیوں سے پاک نہ تھے اور یہ بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ تاسف کا مطالعہ کسی بڑے شاعر کا مطالعہ نہیں مگر یہ ایک بڑی ادبی تحریک کو سمجھنے میں ضرور معاون ثابت ہوگا اور اس مطالعے سے تصویر کا وہ رُخ بھی سامنے آئے گا جو ابھی تک ہماری نظروں سے اوجھل رہا ہے۔

دیوانِ صد غزلہ میں تاسف کا اکیس صفحات پر مشتمل وہ مفصل دیباچہ بھی شامل ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اور جو تقریباً ۱۸۴۳ء میں لکھا گیا تھا۔ انیسویں صدی عیسوی کے پہلے ثلث کے دوران لکھنؤ میں لکھا جانے والا اولین دیباچہ اردو ہی میں لکھا گیا تھا۔ اس دور میں عام طور پر شعرا کے دیوان دیباچوں سے محروم ہوتے تھے اور اگر دیوان میں کبھی کوئی دیباچہ ہوتا بھی تھا تو وہ فارسی میں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی کے مطابق تاسف سے قبل کسی شاعر نے بھی اپنے دیوان کا اردو میں اور اتنا مفصل دیباچہ نہیں لکھا۔ اس لحاظ سے سودا کے بعد تاسف کا نام اس سلسلے میں خاصی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس کے مباحث سے ناسخ کی لسانی اصلاح کی تحریک کے مخالف نظریات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

تاسف کا یہ دیباچہ لکھنوی اردو نثر کے اسلوب اور اسلوبی رجحانات کے بارے میں کچھ نئے اور مفید انکشافات کرتا ہے۔ یہ دیباچہ سادہ نثر کا نمونہ ہے جس میں اسلوب کی سادگی آخر تک برقرار نظر آتی ہے۔ دیباچہ کا سادہ اسلوب اس نظریے کی نفی کرتا ہے جس کے تحت پُر تکلف اور رنگین اسلوب کو لکھنوی اردو نثر کا جزو لاینفک قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اس دیباچے کے پیشِ نظر لکھنوی نثر کے بارے میں مروجہ نظریات ہی نہیں بلکہ لکھنوی اردو نثر کو نقطۂ فسانۂ عجائب کے پیمانے سے ناپنے کا رواج بھی ترمیم کا محتاج ہے۔

غرض تحقیق اور ادبی تاریخ دونوں ہی اعتبار سے دیوانِ صد غزلہ کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی کے ۵۰ صفحات پر مشتمل مفصل مقدمے اور مفید حواشی سے کتاب کی افادیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مقدمے میں دیوان اور صاحبِ دیوان کے بارے میں ضروری معلومات کو پیش کرنے میں مرتب نے جس دیدہ ریزی، بالغ نظری، تحقیقی مہارت اور تنقیدی توازن کا ثبوت دیا ہے اس کے لیے موصوف یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کتاب مجلد اور دیدہ زیب ڈزائن اور گرد پوش سے مزین ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ قابلِ بخش ہے۔ البتہ اس گرانقدر تالیف کے لیے اس سے بہتر طباعت اور کتابت کی توقع تھی۔ بہرحال یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے شائع ہونے والی یہ کتاب اردو کے سنجیدہ ادبی اور علمی حلقوں میں گرم جوش خیر مقدم اور خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔

——— کاظم علی خاں

عنوانات

نیا دور

جلد ۳۱ نمبر ۳

جون ۱۹۷۵ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: کماری سرلا ساہنی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

سرورق: علی عطا صدیقی

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن (سی) ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ

ذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

اپنی بات

حال ہی میں مشرقی اتر پردیش کی زرعی و صنعتی ترقی پر ایک سیمینار غازی پور میں منعقد ہوا۔ اس موضوع پر یہ پہلا بڑا سیمینار تھا جو غازی پور ترقیاتی کارپوریشن کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا۔ واضح رہے کہ غازی پور ترقیاتی کارپوریشن ایک غیر سرکاری ادارہ ہے جو کم سے کم سرکاری اشتراک و امداد کے بغیر مختلف شعبوں میں معیشت کی ترقی کے لیے کام کر رہا ہے۔

سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے اتر پردیش کے وزیر صحت شری پربھو نرائن سنگھ نے ٹھیک ہی کہا کہ مشرقی یوپی میں جہاں کی غالب آبادی کا انحصار زراعت پر ہے، ایک زراعتی سائنس اور تحقیقی ادارے کا قیام بے حد ضروری ہے تاکہ اس علاقے کی زرعی معیشت کو بھی ریاست کے مغربی حصے کی معیشت ہی کی طرح مستحکم اور ترقی پذیر بنایا جاسکے۔ اس سلسلے میں وارانسی، گورکھپور اور فیض آباد کی یونیورسٹیاں مشرقی یوپی کے مخصوص زرعی مسائل کا مطالعہ کرکے کھیتوں پر تربیتی مظاہروں کے ذریعے کسانوں کو مستحکم بنیادوں پر کھیتی باڑی کرنے کے لیے آمادہ کرنے میں اہم رول ادا کرسکتی ہیں۔

یہ ایک خوش آئند علامت ہے کہ کم سے کم سرکاری امداد سے مختلف شعبوں خاص کر زرعی شعبے کی معیشت کو مستحکم بنانے اور اسے ترقی دینے کی ضرورت کا احساس ابھر رہا ہے۔ ایسے ادارے قائم ہو رہے ہیں جو کلیتاً سرکاری امداد پر بھروسہ کیے بغیر اس ضمن میں کام کر رہے ہیں اس سے ایک طرف سرکاری مالیات پر بار بھی کم ہو جائے گا اور عوام میں خود اعتمادی، خود کوشی اور ترقیاتی پروگراموں میں رضاکارانہ اشتراک و تعاون کا جذبہ بڑھے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکومت معاشی استحکام و ترقی کے پروگراموں سے ہاتھ کھینچ لے اور امداد دینا بند کردے یا کوئی متوازی نظام قائم کیا جائے۔ ان اداروں کا مقصد صرف یہ ہے کہ حکومت اپنے وسائل کے اندر رہ کر جو امداد و تعاون دے رہی ہے اس کے ساتھ ساتھ معیشت کے استحکام و ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے اپنے طور پر بھی پروگرام مرتب کرے اور اسے اس طرح بروئے کار لائے کہ ایک طرف وہ سرکاری پروگراموں سے متصادم نہ ہو اور دوسری طرف سرکاری امداد کی کم سے کم ضرورت پڑے۔

حکومت کا جہاں تک تعلق ہے وہ پردیش کے عوام کی بالخصوص اور پس ماندہ طبقوں، ہریجنوں اور اقلیتوں نیز پس ماندہ مشرقی اضلاع کی بالعموم حالت سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے اور ان کی فلاح و بہبود اور ترقی کی اسکیمیں اور پروگرام بروئے کار لا رہی ہے۔ اس سلسلے میں ان مختلف کارپوریشنوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو حال ہی میں یوپی حکومت نے قائم کیے ہیں یا جن کی تشکیل کا فیصلہ کیا ہے۔ نئے کارپوریشنوں میں جن کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا ہے گنے کے بیج اور گنے کی ترقی سے متعلق چار کارپوریشن، پہاڑی علاقوں کے قبائل مندرجہ فہرست کی بہبود کے دو کارپوریشن اور پس ماندہ ترین طبقوں کی سماجی، معاشی اور تعلیمی ترقی سے متعلق کارپوریشن شامل ہیں۔ گنا بیج و ترقیاتی کارپوریشن پردیش کے مشرقی، مغربی، وسطی اور روہیل کھنڈ ڈویژن میں قائم کیے جائیں گے اور ان کے صدر دفاتر بالترتیب گورکھپور، میرٹھ، لکھنؤ اور بریلی میں ہوں گے۔ ان کارپوریشنوں کی غرض و غایت پردیش میں گنے کی تیز رفتار ترقی اور پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ کارپوریشن کاشتکاروں کو قرضے اور زرعی آلات مہیا کریں گے تاکہ عمدہ قسم کے گنے کی پیداوار میں معتد بہ اضافہ ہو جس سے کاشتکاروں کو اپنے گنے کی زیادہ قیمت ملے اور ان کی مالی حالت بہتر ہو۔

پہاڑی علاقوں میں قبائل مندرجہ فہرست کی بہبود کے جو دو کارپوریشن قائم کیے جا رہے ہیں ان کا مقصد قبائل مندرجہ فہرست کی سریع ترقی ہے۔ ایک کارپوریشن "کمایوں قبائل مندرجہ فہرست ترقیاتی کارپوریشن" اور دوسرا "گڑھوال قبائل مندرجہ فہرست ترقیاتی کارپوریشن" کے نام سے موسوم ہوگا اور ان کا صدر دفتر بالترتیب پتھورا گڑھ اور ٹہری نگر میں رہے گا۔ یہ دونوں کارپوریشن مقامی طور پر دستیاب خام مال کی بنیاد پر گھریلو اور چھوٹی صنعتیں قائم کریں گے، زراعت اور باغبانی کے جدید طریقوں کو مقبول عام بنائیں گے۔ افراد اور انجمنوں کو تکنیکی امداد دیں گے، جنگلاتی، زراعتی اور صنعتی پیداوار کے لیے گودام تعمیر کرائیں گے نیز خام اور تیار مال کی تقسیم اور نکاسی کا بندوبست کریں گے۔

پس ماندہ ترین طبقوں کی ترقی کے کارپوریشن کے قیام کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ پردیش میں بعض طبقے ایسے ہیں جو سماجی اور تعلیمی اعتبار سے سب سے زیادہ پس ماندہ ہیں اور ان کی حیثیت تقریباً وہی ہے جو اقوام و قبائل مندرجہ فہرست اور ڈی نوٹیفائڈ قبیلوں کی ہے۔ پس ماندہ ترین طبقوں میں وہ طبقے رکھے جائیں گے جنھیں سماج میں ان کے پیشے کی بنیاد پر کمتر سمجھا جاتا ہے۔ دیگر امور کے علاوہ یہ کمیشن ان طبقوں کو تعلیمی، سماجی اور معاشی سہولیتیں بہم پہنچانے کے سلسلے میں مناسب اقدامات کی سفارش کرے گا تاکہ سماج میں انھیں باعزت مقام دلایا جاسکے اور ملازمتوں نیز تربیتی نصابوں میں ان کے لیے مناسب تحفظات کیے جاسکیں۔

اس طرح یہ دیکھا جائے گا کہ پردیش کی حکومت سماج کے کمزور طبقوں، غریب کاشتکاروں اور غیر ترقی یافتہ علاقوں کی ترقی کے لیے بھرپور کوششیں کر رہی ہے۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ حکومت اپنی کوششوں میں اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب اسے عوام اور رضاکار تنظیموں اور انجمنوں کا اشتراک و تعاون حاصل ہو۔ یہ ایک فال نیک ہے کہ اس کا احساس بڑھ رہا ہے اور جس کی ایک مثال غازی پور ترقیاتی کارپوریشن ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے اور بھی کارپوریشن قائم کیے جائیں جو اپنے اپنے علاقے کے لیے ترقیاتی پروگرام بنائیں اور ان پر تیزی سے عمل درآمد کی پرخلوص کوشش کریں۔

● یہ امر ادارہ نیا دور کے لیے باعث مسرت ہے کہ خسرو نمبر کی اس کی توقع سے زیادہ پذیرائی ہوئی اور ملک کے ممتاز ادیبوں، دانش وروں اور ادب دوستوں نے اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور اس معیاری نمبر کی اشاعت پر مبارک باد کے خطوط بھیجے۔ ادارہ نیا دور ان سب حضرات کا شکر گزار ہے۔ اس ضخیم نمبر کی اشاعت کے باعث نیا دور کے عام شماروں کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوتی گئی اور ابھی تک اس کی اشاعت معمول پر نہیں آسکی ہے۔ بہر حال ہماری انتھک کوشش ہے کہ آئندہ پرچہ وقت سے شائع ہو۔ تاخیر اشاعت کے باعث قارئین نیا دور کو جو زحمت ہوئی اس کے لیے ایک بار پھر ہم معذرت خواہ ہیں۔

—— ایڈیٹر

غزل

عمر انصاری

لگے ہیں مفت جو یوں ہاتھ دیدۂ تر کے
کسے خبر کہ یہ موتی ہیں کس سمندر کے

ہوے نہ کیوں وہ بشر، پتھروں کو غم ہوگا
ہمیں یہ غم ہے کہ ہم کیوں ہوے نہ پتھر کے

اب اس کا اے دلِ ناداں ملال کیا کرنا
جواب خود ہی لیے ہیں سوال کر کر کے

قریبِ منزلِ ہستی ہیں وہ سفینے بھی
جو آرہے ہیں مہم جیسے کوئی سر کر کے

جو مانگئے بھی تو اس شامِ غم سے کیا جس سے
ملے نہ اشک بھی اک شب گزارنے بھر کے

اب اتنی جلد بھی اے موسمِ بہار نہ جا
ذرا ٹھہر کے تجھے دیکھ لوں میں جی بھر کے

مہک اُٹھے ہے یوں ہی دل میں یادِ یار عمر
لنڈھائے ساغرِ مے جیسے کوئی بھر بھر کے

شعیب عظیم (بنگلا دیش)

چودھری محمد علی

بیسویں صدی کا ایک صاحبِ طرز مکتوب نگار

اردو خطوط نویسی کی بظاہر ابتدا رجب علی بیگ سرور سے ہوئی لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب نے تقریباً ۱۸۴۸ء سے اردو خطوط نویسی کا جو سلسلہ شروع کیا وہی اردو مکتوب نگاری کی تاریخ بن گئی جب بھی اردو خطوط نویسی کی تاریخ بیان کی جاتی ہے تو غالب کا نام پہلے مکتوب نگار کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔ فسانۂ عجائب کے مکتوب نگار کو تو لوگ بھول گئے! بھول کیا گئے بلکہ غالب کے نئے انداز، نئے اسلوب اور نئے لب و لہجہ کے آگے لوگوں کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اور یہ فطری بات ہے کہ انسان اچھی بات کو اپناتا ہے۔ لوگوں نے بھی غالب کے اسٹائل کو اپنایا اور یاد رکھا۔

مکاتیب غالب کے بعد ایک طویل سلسلہ مکاتیب کا ملتا ہے اور بہت سے صاحب مکاتیب اپنی اپنی جگہ منفرد اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جیسے سرسید، حالی، شبلی، اکبر، مہدی، داغ، امیر مینائی، شوق قدوائی، ریاض خیرآبادی، سید ناصر علی، شاد عظیم آبادی، ڈاکٹر اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، سجاد ظہیر، صفیہ اختر، فراق گورکھپوری، چودھری محمد علی ردولوی وغیرہم۔ لیکن اس وقت اردو کے ان مکتوب نگاروں کا تنقیدی یا تاریخی جائزہ لینا میرا مقصد نہیں۔ اس وقت میں صرف اردو کے صاحب طرز ادیب اور فطرت نگار چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط کا مجموعہ گویا دبستان کھل گیا اٹھاتا ہوں اور اس کا تفصیلی جائزہ لیتا ہوں۔

گویا دبستان کھل گیا سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو چونکانے یا اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ایسا انوکھا نام رکھا ہے لیکن مکاتیب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر شخص کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ "چونکا دینے والی بات" نہیں بلکہ اس سے واقعی اردو خطوط نگاری کا ایک "دبستان" کھل گیا۔ محمد علی کی مکتوب نگاری کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے فاصلے کو پاٹ دیا۔ تحریر اور گفتگو کے فرق کو مٹا دیا۔ اس انداز بیان کے پیش رو غالب تھے۔ محمد علی نے اس انداز بیان کو اپنایا اور وسعت دے کر دلکش اور جاذب نظر بنایا۔

غالب کے خطوں میں فطری روانی، بیان کی ندرت، اسلوب کا اچھوتا پن، تخیل کی بلندی، خلوص کی گرمی، ظرافت کی بہار سب کچھ موجود ہے لیکن ایک خاص قسم کی آزاد خیالی جو محمد علی کے خطوں کا طرۂ امتیاز ہے وہ غالب کے یہاں نہیں۔ آزاد خیالی کا اندازہ لگائیے۔ اپنی بیٹی کو خط لکھتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بیٹی کو نہیں بلکہ اپنے بے تکلف احباب سے مخاطب ہیں۔ مشرقی تہذیب میں آزاد خیالی کی اتنی جرات اور کسی مکتوب نگار میں نظر نہیں آئی۔

"نماز کے بعد بارگاہ خدا میں عرض کرتا ہوں کہ بار الہا ایمان دے۔ بقیہ میاں فرماتے ہیں ہمارا کام ہی ہے ایمان بخشنا۔ مگر تم خود اپنے دل میں ڈھونڈو یہ طلب تمہاری صادق ہے؟ میں عرض کرتا ہوں میرے مالک۔ میری تمنا، ایمان کی روشنی سے سینہ جگ مگ جگ مگ کرنے لگے جس سے معلوم ہوتی ہے۔ وہاں سے ارشاد ہوتا ہے کہ ہاں ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر ذرا غور کرو تم نے جوانی میں بہت سی عورتوں کو چاہا ہے بھلا ایمان کے لیے وہ اس بیتابی، تڑپ، شوق کا کچھ بھی شائبہ ہماری تلاش میں پاتے ہو۔ میں عرض کرتا ہوں جی نہیں اس طرح کی تڑپ بے چینی تو نہیں پاتا۔ ایک دوسری طرح کی خواہش ضرور ہے۔ وہ فرماتے ہیں ہم تمہارے دل کا حال تم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ خواہش جو تم محسوس کرتے ہو تو یہ ہماری محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ بوڑھے ہو گئے ہو۔

عورت منہ نہیں لگاتی۔ طاقت جواب دے رہی ہے۔ موت کھڑی گھور رہی ہے اس لیے اس طرح کے خیالات دل میں پاتے ہو۔"

خورشید صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"چاند کے حساب سے بہترواں سال ۳۰ رجمادی الآخر کو شروع ہو گیا پھر بھی ہنس لیتا ہوں کھیل لیتا ہوں خوبصورت عورت کو دیکھ کر کم سے کم دل میں تو گرمی پیدا ہو ہی جاتی ہے اس سن میں اتنی خیالی قابلیت بھی قابلِ رشک ہے۔

دل ابھی تک جوان ہے پیارے
ایک آفت میں جان ہے پیارے"

راقم الحروف نے نومبر ۱۹۵۸ء میں چودھری محمد علی ردولوی سے ایک تصویر مانگی تھی اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"فی الحال میرے پاس کوئی موجود نہیں ہے۔ جوانی میں عورتیں مجھ کو گھور گھور کے دیکھتی تھیں اب بڑھاپے میں یہ حال ہے کہ شکنوں نے چہرے کو بن چلا یا ہوا کھیت بنا دیا ہے۔ اب تصویر اس وجہ سے نہیں کھنچواتا کہ ان جھریوں کو کون دوام کی صورت بخشے۔"

اس سے کون واقف نہیں کہ غالب تعزیتی خطوط میں ظریفانہ رنگ اختیار کرتے ہیں اور غم و الم کو مسکرا کر گزار دینے کا سلیقہ غالب کی ظرافت عطا کرتی ہے ان خصوصیات کی بنا پر پروفیسر کلیم الدین احمد یہ مشورہ دیتے ہیں:۔

"اگر اردو انشا پرداز یہ چاہتے ہیں کہ وہ میدان ظرافت میں آگے بڑھیں، اگر ان کی خواہش ہے کہ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ہنستی بولتی تصویریں مرتب کر سکیں، اگر ان کی تمنا ہے کہ وہ ظرافت کے ایسے نمونے پیش کریں جنھیں فنا نہ ہو تو پھر وہ اپنی راتیں اور اپنے دن غالب کے مطالعے میں صرف کریں۔"

غالب اپنے ایک شاگرد کو ان کی دوسری بیوی کی وفات پر تعزیت نامہ لکھتے ہوئے یوں گل افشانی کرتے ہیں:

"اے واہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ دم ہی نکلتا ہے نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے۔"

اسی طرح محمد علی بھی نئے انداز اور خوبصورت پیرائے میں اپنے ایک تعزیتی خط میں یوں اظہار ہمدردی کرتے ہیں:

"میں ناتجربہ کاری کے زمانے میں تعزیت اور پرسے پر مہنا کرتا تھا میری ایک لڑکی جو بہت دنوں سے بیمار تھی (اس کے علاوہ چار لڑکیاں اور بھی تھیں) وہ گزر گئی۔ صبح کو ایک صاحب تعزیت کو آئے بیچارے کم سخن تھے آ کر چپ بیٹھ گئے میں نے کہا۔ ہاں تو پھر شروع کیجیے۔ بچی کیا مری تھی۔ مجھ کو اطلاع بھی نہیں ہوئی خدا آپ کو صبر دے۔ وہ بیچارے پریشان ہو گئے اس کے بعد میرا اکلوتا لڑکا گزر گیا اس واقعے کے بعد ایک دیہاتی جاہل ملاقاتی نے ہمدردی کی عجیب بھونڈے طریقے سے اس نے مجھ کو تسکین دی مگر یہ معلوم ہوا کہ جیسے زخم پر کسی نے مرہم رکھ دیا۔ اس نے کہا "وہ لڑکا تمہارا تھا ہی نہیں۔ اگر تمہارا ہوتا تو تمہارے پاس رہتا نا۔ وہ جس کا تھا اس نے لے لیا۔ تم کیوں رنج کرتے ہو؟" ہاشمی صاحب! اس وقت بھی وہ زخم ہرا ہے اور اس وقت بھی وہ مرہم اپنا کام کر رہا ہے۔ اس کے بعد سے میں ہر پہلو سے تعزیت کی قیمت سمجھنے لگا اور اسی وجہ سے یہ صفحہ سیاہ کیا کہ شاید دلی ہمدردی غم میں کچھ افاقہ کرے۔ ارحم الراحمین آپ حضرات کو صبر دے آمین!"

میں نے اوپر غالب سے جو موازنہ کیا ہے اس کی تائید مولانا صلاح الدین احمد بھی کرتے ہیں:

"جن خوبیوں اور خصوصیات نے غالب کے خطوط کو دوام بخشا وہ ایک لباس تازہ اس مجموعے کی زیب و زینت ہیں وہی سلاست، وہی بے تکلفی، وہی شگفتگی، وہی برجستگی اور سب سے بڑھ کر وہی احساس یگانگت اور وہی کیفِ مخاطبت جو اردوئے معلیٰ اور عود ہندی کے مکاتیب میں پایا جاتا ہے ایک بہت بڑی حد تک ان خطوط میں بھی اپنی پوری رعنائی سے جلوہ افروز ہے۔"

محمد علی کی ایک انفرادی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جزئیات کو اپنے خطوں میں جگہ دیتے ہیں اور یہی جزئیات نگاری ان کے یہاں ایک وصف بن جاتا ہے پڑھنے والا اس سے لطف اندوز ہوتا ہے مگر گرانی محسوس نہیں کرتا۔ دیکھیے ایک فطری بات کو کتنے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

"دلہنیا کے لڑکا ہونے والا ہے۔ دن قریب ہوں گے گو قریب تر نہیں معلوم ہوتے۔ وہ بہت خوش ہے باورچی خانے سے بڑی

آتے وقت ذرا سا سر جھکا کر کنکھیوں سے اپنا پیٹ دیکھتی چلتی ہے۔ مجھ کو نہ معلوم آپ ہی آپ کیوں خوشی ہے مجھ کو معلوم ہوتا ہے گویا میرا ہی پوتا پیدا ہونے والا ہے۔"

فطرت نے محمد علی کو شگفتہ مزاجی، شوخی اور زندہ دلی ودیعت کی تھی۔ انھوں نے جاگیردارانہ نظام میں ناز و نعمت سے پرورش پائی تھی اس کے باوجود وہ ہنسنا اور ہنسانا جانتے تھے۔

ان کے مزاح کی حس بڑی تیز تھی اپنے ایک دوست مولانا حمایت احسن کو خط کا جواب نہیں دیا۔ انھوں نے شکایت کی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں

"مائی ڈیر مولانا۔ ایک عورت تھی وہ بڑی ہنس مکھ تھی جس مرد کو دیکھتی تھی ہنس دیتی تھی اس کے شوہر کو کچھ یہ بات پسند نہ تھی۔

ع عشق است و ہزار بدگمانی !

اس نے اپنے شوہر کو اطمینان دلایا "ہنسنا میرا سبھاؤ بلم تم جنتا نہ مانیو" یہی حال میری کوتاہ قلمی کا ہے آپ اپنے خطوط محبت کا جواب دیر میں پاکر الجھا نہ کیجیے۔ اگر میں روز روز خطوط کا جواب دیا کروں تو اتنی تمہیدیں کہاں سے پاؤں اور میرے خطوط بجائے میری عقیدت کے ترجمان ہونے کے جبرات کا آموختہ ہو کر رہ جائیں۔"

ایک دوسرے دوست کو بھی اسی سلسلے میں لکھتے ہیں :

آپ کا محبت نامہ آیا تھا اور جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے جواب بھی لکھا تھا مگر قسم نہیں کھاؤں گا۔ ممکن ہے لکھنے کا ارادہ ہی کرتے کرتے رہ گیا ہوں بہرحال اگر وہ خط میں نے نہ بھی لکھا ہو تو آپ از نظر گیا نہ دور رہے ہوں مگر از دل دور کبھی نہیں رہے۔"

اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو ناشروں سے ہمیشہ شکایت رہی ہے اور آج بھی ہے ناشر اکثر و بیشتر اچھی سے اچھی کتابوں کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ کتابت کی غلطیاں اور ناقص طباعت ادیبوں اور شاعروں کا ذہنی سکون چھین لیتے ہیں۔ محمد علی کو بھی یہی شکایت ناشر سے ہے : اس شکایت میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔ علی ضامن صاحب کو اپنی تصانیف دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرا مذہب اور کشکول محمد علی شاہ فقیر حاضر ہیں یہ دونوں کتابیں اتنی غلط چھپی ہیں کہ دل سے اتر گئیں مگر پھر بھی پیاری ہیں جیسے چیچک نکلنے کے بعد اولاد ہوتی ہے منہ الٹا توا ہو گیا ایک آنکھ پھوٹ گئی چہرے پر آدھ سیر قیمہ بھر دو تو جلد برابر ہو۔ مگر دل یہی کہتا ہے کہ بچوں کی نمائش میں شاید انعام بندہ زادہ ہی پا جائے۔"

اسی سلسلے میں ایک خط مدیر ادبی دنیا لاہور کو لکھتے ہیں :۔

"کشکول محمد علی شاہ فقیر امید ہے کہ ڈھائی برس کے بعد پریس سے آجائے۔ جیسے ہی آگئی حاضر کر دوں گا مگر صلاح الدین صاحب چھاپنے والے نے کیا ظلم کیا ہے۔ چھپائی ایسی ہے جیسے یتیم بچے کا منہ ہوتا ہے غلطیاں ایسی ہیں جیسے بھرے گھر کی لونڈی ہوتی ہے۔ کتاب مسخ ہو کر رہ گئی ہے اور ہم ہیں کہ بے بس اور بے اختیار دم بخود بیٹھے ہیں۔"

جو خطوط چھپنے کی غرض سے لکھے جاتے ہیں ان میں کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اس کا اظہار اپنی بیٹی سے یوں کرتے ہیں :۔

"تم نے لکھا ہے کہ میرے خط چھپوانے کے لیے جمع کر رہی ہو۔ اب خط لکھتے وقت یاد آجایا کرے گا اور بجائے سادگی، صفائی، بے لوثی کے انانیت، اوچھا پن۔ اظہار قابلیت۔ الابلا خاک دھول خطوں میں نہ معلوم کیا کیا سما جائے گا۔ نے بھائی ہمارا کہا کبھو بھی نہ کیا کرو اب سب مٹی کر دیو۔ ایک مرتبہ یہی بات میں نے اپنے استاد مسٹر سڈنس کو لکھی تھی۔ انھوں نے جواب میں لکھا تھا کہ میرے خطوط کے چھپانے کا خیال ہرگز نہ کرنا۔ اگر میں یہ جانتا تو تجھ کو سے وہ خطوط لکھے نہ جاتے۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرے خطوط چھپیں نا۔ اگر ان سے کوئی فائدہ مقصود ہو تو ضرور چھپیں مگر اس خیال کے بعد وہ تحریر کی بے تکلفی تو گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جیل خانے میں چھپوانے کے لیے خطوط لکھے تھے : دیکھ لو ایک خط کے سوا جو انھوں نے اپنی بی بی کے مرنے پر لکھا تھا اور جتنے خطوط ہیں ان میں لڑکوں کا باپ مردہ، بی بی کا شوہر غائب اور صرف ادب کا منشی علوم کا مولوی، انگریزی پالیٹکس کا ادھ کچرا نقال "انا" کا ڈھنڈورا پیٹنے والا بڑے بڑے الفاظ اور عربی ترکیبوں کا اردو کی اونچی نیچی زمین پر TANK چلانے والا دکھائی دیتا ہے۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں: "بہت سے خطوط جو میں نے لوگوں کو لکھے تھے بعض کی نقل تمہارے حکم کی تعمیل میں رکھ لی ہے۔" اس خط سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ محمد علی کو معلوم تھا کہ یہ خطوط شائع ہوں گے جس کا اعتراف خود ایک خط میں کرتے ہیں اور یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ جو خط اشاعت کی غرض سے لکھے جاتے ہیں اس میں بے تکلفی، بے ساختگی اور خلوص نہیں ہوتا لیکن محمد علی کے خطوط کو پڑھتے ہیں تو وہی بے تکلفی اور وہی سادگی پاتے ہیں۔ ان کے خطوط میں آورد کا شائبہ تک نہیں! آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کا اظہار وہ ایک خط میں یوں کرتے ہیں:-

"جس طرح صوفیوں کے یہاں ایک زمانہ ہوتا ہے جس کو قبض کہتے ہیں اس زمانے میں ہزار عبادتیں کریں، عہد کریں، ریاضتیں کریں مگر انوار الٰہی نہیں۔ ساطع ہوتے اور ایک زمانہ بسط کا ہوتا ہے جس میں عبادتوں کا لطف آتا ہے اور انوار الٰہی کی بارش ہوتی ہے اسی طرح سے میرے خط لکھنے کا بھی حال ہے۔ کبھی ہر وقت خطوط لکھنے کا تقاضا ہوا کرتا ہے اور سب کو لکھا کرتا ہوں۔ کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ تم لوگوں کو یاد کیا کرتا ہوں مگر خط لکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ غالب کہتے ہیں ؎

چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے

بعض ایام قبض میں سب کوششیں بے کار ہیں ہاں البتہ جب اللہ میاں اپنی رحمتوں کا دروازہ کھول دیتے ہیں پھر عبادتوں کا لطف ہے آج یہ معلوم کتنے دنوں سے کسی کو خط نہیں لکھا تھا۔ اس وقت تمہارا خط پڑھ کر یکبارگی بسط شروع ہو گیا۔"

خطوط نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں مکتوب نگار کی شخصیت کا انفرادی رنگ بھی پایا جائے۔ یہ خصوصیت بھی چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے خطوں میں صاف ستھری زبان، فطری روانی، سادگی، بے تکلفی، آزاد خیالی، وسعت نظر، مذہبی رواداری، خلوص اور صاف گوئی بھی عیاں ہیں۔ ان کے خطوں سے ان کی خود نوشت سوانح عمری بھی مرتب کی جا سکتی ہے ان کی زبان دانی کا کون قائل نہیں۔

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

منور لبستوی

تصورات کے دھندلکے

وہ گومتی کا کنارہ، وہ رنگ و کیف کی شام
خدا گواہ کہ سب کچھ بھلا دیا تو نے
کیا تھا مجھ سے جو وعدہ نباہ کرنے کا
اسے بھی صفحۂ دل سے مٹا دیا تو نے
وہ تیرے گیسوئے شب گوں سے کھیلنا میرا
نئی سحر کا کوئی جیسے پیش خیمہ تھا
حیا سے وہ ترا آنچل سے منہ چھپا لینا
چھپا اندھیروں میں جیسے کوئی اجالا تھا
وہ عرض حال پہ سرخی سی بھولے چہرے پر
تبسم لب نازک کی سحر کاری تھی
مرے خیال میں ابھرا ہے آج پھر وہ مقام
تری نوازش پیہم جہاں سے جاری تھی
دماغ سے میں ترا جسم چھو رہا ہوں آج
کہ میری مٹھی میں جیسے حیات کی ہو طناب
ترے خیال کو کیسے میں بے وفا کہہ دوں
ترا خیال تو آتا ہے دل کی دنیا میں
اسی سے مجھ کو سکون حیات ملتا ہے
اسی کا دخل ہے میری ہر اک تمنا میں
مری نظر ہے تری راہ میں بھی اب تک
قدم قدم پہ تری راہ میں بلندی ہے
جو پستیوں کو سبق دے رہی ہے رفعت کا
کہ پستیوں سے اسے جیسے دردمندی ہے
مے سخن ترے غم سے کشید کرتا ہوں
کہ تیرے غم کی امانت ہے شاعری میری
خدا گواہ کہ تو نے براہِ لطف و کرم
حیات، نور کے سانچوں میں ڈھال دی میری
ترے خطوط میں تیری جھلک ہے پوشیدہ
مگر وہ تلک کو میسر ہو کر نہیں سکتی
مجھے یقین مکمل ہے زندگی میری
ترے بغیر جہاں میں گزر نہیں سکتی
تصورات کی دنیا میں گھومنے والے
وہ گومتی کا کنارہ، وہ رنگ و کیف کی شام
تری جدائی کا غم لے کے آہ مجبوراً
اداس اداس نگاہوں سے کہہ رہے ہیں سلام

نصیر پرواز

غزل

نئے لہجے نئے اسلوب لکھ دوں
غزل کے نام کچھ مکتوب لکھ دوں
پکڑ لے گی محبت میرا دامن
اگر رسم وفا معیوب لکھ دوں
انھیں لوح و قلم میں جذب کر کے
نگاہ فکر کا محبوب لکھ دوں
شب احساس کا روشن دریچہ
تمھارے نام ہے منسوب لکھ دوں
انھیں کے نام پھولوں کی جبیں پر
جو وقت نے مصلوب لکھ دوں
خریدا تو نہیں ہے تو نے مجھ کو
مگر جو ہو تجھے مرغوب لکھ دوں
مجھے سمجھا گئی گہری خموشی
محبت سے تجھے محبوب لکھ دوں
کتاب زندگی پر نام پروانہ
نہ ہو کوئی اگر مجذوب لکھ دوں

آوارہ

لہو کی ایک بُوند

ڈاکٹر (کسی کی آہٹ پر) "ہوں ؟"

آواز "جی" مادھو۔ ایک سجن آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ بیمار ہیں۔

ڈاکٹر "اتنے سویرے ؟ ابھی تو میں نے اشنان بھی نہیں کیا ہے"

مادھو "جانتا ہوں سرکار بہتیرا کہا، پر وہ نہیں مانتے۔" کہتے ہیں جیوں جیوں دیر ہوتی ہے، خطرہ بڑھتا جاتا ہے "

ڈاکٹر (ناگواری سے) "لوگ سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر آرام دینے کے لیے ہوتے۔ خود انھیں آرام کی ضرورت نہیں۔ میرا ڈریسنگ گون دو۔ اور انھیں بلا لو۔ جانتے ہو کون ہیں ؟"

مادھو "کوئی نئے صاحب ہیں۔ سرکار کے پاس آتے جاتے نہیں دیکھا۔ بات چیت اور پہراوے سے بڑے آدمی جان پڑتے ہیں۔ دو گھوڑوں کی بگھی میں آئے ہیں "

ڈاکٹر "اچھا! کوئی بھی ہوں، بیمار ہیں تو بس ہے۔ جاؤ میں تیار ہوں" (بیمار آتا ہے)

بیمار (کراہتے ہوئے) "نمشکار۔ ڈاکٹر کاشی ناتھ جی آپ ہی ہیں؟"

ڈاکٹر "جی ہاں نمشکار"

بیمار "مجھے سوریہ کانت کہتے ہیں شہر سے دور رہتا ہوں آپ کا نام ہی سُنا ہے۔ پریچت نہیں ہوں۔ اپنی اس دُردشا کو میں کیسے کہوں کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی "

ڈاکٹر "آپ کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ بیٹھ کر بات کیجیے (بیمار کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)" ہاں اب کہیے "

بیمار "ڈاکٹر میرے داہنے ہاتھ میں کچھ ہو گیا ہے۔ آج آٹھ دن سے گھڑی بھر کے لیے سو نہیں سکا ہوں۔ پتہ نہیں اڈھیٹ پھوڑا ہے یا کوئی ناسور جو بھی ہو، میں یہ ہاتھ لٹکا نہیں سکتا۔ سلنگ میں رکھے رہتا ہوں پہلے میٹھا درد ہوتا تھا، پر اب منٹ بھر کے لیے چین نہیں۔ ایسا جان پڑتا ہے کوئی لوہے کی سلاخ گرم کر کے چبھوئے جا رہا ہے۔ ڈاکٹر اب مجھ سے سہا نہیں جاتا۔ پرماتما کے لیے نشتر لیجیے اور ہاتھ کا اتنا مانس کاٹ دیجیے کچھ دیر اور یہی تکلیف رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گا "

ڈاکٹر "گھبرائیے نہیں۔ آپ کا درد جاتا رہے گا"

بیمار "دنیا بھر کا کوئی بلسٹر کوئی مرہم مجھے آرام نہیں دے سکتا میں آپ کے پاس آیا ہی اس لیے ہوں کہ ہاتھ کا اتنا ٹکڑا کاٹ کر پھینک دیا جائے "

ڈاکٹر "ہاتھ لائیے دیکھوں تو سہی کیا ہے "

بیمار (کراہتے ہوئے) "لیجیے دیکھیے۔

ڈاکٹر "آپ ذرا جی کڑا کیے رہیے۔ میں سنبھال کے پٹی کھولتا ہوں" لیجیے کھل گئی"

بیمار "ڈاکٹر صاحب۔ آپ مانس کاٹنے میں ذرا بھی آگے پیچھے نہ ہوں۔ میرا یہ روگ ایسا دچتر ہے کہ آپ بھی حیران رہ جائیں گے۔ پر آپ ذرا پرواہ نہ کریں "

ڈاکٹر "آپ گھبرائیں نہیں۔ میرے پاس بیسیوں کیس آتے رہتے ہیں۔ آپ کا ہاتھ دیکھ کر مجھے کوئی اچنبھا نہیں ہوگا۔ اب

مجھے دیکھنے دیجیے۔ (ہاتھ کو الٹ پلٹ کر) پھوڑا یا ناسور کچھ بھی نہیں، ہاتھ پر معمولی کھرونچا تک نہیں ہے۔ آپ کا ہاتھ بالکل ویسا ہی ہے جیسا میرا۔ اچھا سنبھلے رہیے گا میں ہاتھ چھوڑتا ہوں"

بیمار (زور کی چیخ نکلتی ہے) "اُف! مر گیا۔ آہ! ڈاکٹر صاحب میں آپ سے بناوٹ کرنے نہیں آیا"

ڈاکٹر "اچھا بتایئے ہاتھ میں دُکھن یا درد کس جگہ ہے؟"

بیمار "دیکھیے یہاں ہاتھ کی بیچو بیچ۔ یہ۔ یہ یہاں دو موٹی رگیں ایک دوسرے کو کاٹ رہی ہیں"

ڈاکٹر (ہاتھ چھو کر) "آپ کا مطلب ہے یہاں؟ ٹھہریے میں انگلی سے دبا کر دیکھتا ہوں"

بیمار (چیخ کر) "اف! نہیں۔ ڈاکٹر۔ درد ہیں ہے۔ آہ! بڑی جلن ہے۔ بڑی جلن ہے۔ ہاتھ پھنکا جا رہا ہے"

ڈاکٹر "میرے انگلی رکھنے سے کوئی دباؤ معلوم ہوا آپ کو؟"

بیمار (کراہ کے) "نہیں"

ڈاکٹر "عجیب بات ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو اس جگہ کچھ بھی نہیں دیکھتا"

بیمار "میں بھی یہی کہتا ہوں۔ پھر بھی اتنا درد ہے کہ من کرتا ہے دیوار سے سر ٹکرا کے مر جاؤں"

ڈاکٹر "ٹھہریے میں آئی گلاس سے دیکھتا ہوں۔ اوں ہوں! کچھ بھی نہیں۔ ہاتھ کی کھال۔ ٹھیک سے خون کا دوران برابر ہو رہا ہے۔ سوجن نہیں ہے۔ نہ کھال کے نیچے کوئی پھوڑا یا ناسور دکھائی دیتا ہے۔ کھال میں اتنی ہی جان ہے جتنی شریر کے دوسرے انگ میں"

بیمار "مگر کھال پر دیکھیے کچھ لالی ہے"

ڈاکٹر "کس جگہ؟"

بیمار "میں پنسل سے نشان بنائے دیتا ہوں۔ دیکھیے اس جگہ"

ڈاکٹر "میں سمجھتا ہوں آپ کا۔ یعنی میرا مطلب ہے ..."

بیمار "کہ میرا دماغ چل گیا ہے"

ڈاکٹر "نہیں نہیں۔ چلیے چھوڑیے اس کو کچھ دن یہاں رہیے۔ میں آپ کو ٹھیک کر دوں گا"

بیمار "نہیں ڈاکٹر میں اب گھڑی بھر نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ نہ سمجھیے کہ میں پاگل ہوں۔ یہ نشان جو میں نے پنسل سے بنایا ہے رگ کی بھانتی جل رہا ہے، میں آپ کے پاس ہاتھ کا اتنا ماس کٹوانے آیا ہوں"

ڈاکٹر "معاف کیجیے میں یہ نہیں کر سکتا"

بیمار "کیوں"؟

ڈاکٹر "یوں کہ آپ کے ہاتھ میں بیماری کا کوئی چنہ نہیں پایا جاتا۔ آپ نے جو نشان بنایا ہے، وہاں کی کھال اتنی ہی ٹھیک ہے جتنی خود میرے ہاتھ کی"

بیمار "آپ سچ مچ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔ یا آپ کا دھیان ہے کہ میں آپ سے دل لگی کرنے آیا ہوں (جیب سے نوٹ نکال کر) یہ دیکھیے ہزار روپے کے نوٹ، آپ کی فیس، دیکھ لیجیے میں آپ سے کوئی بچکانی کھیل نہیں کر رہا۔ پرماتما کے لیے میرے ہاتھ کا اتنا ماس کاٹ دیجیے۔

ڈاکٹر "اگر آپ دنیا بھر کا خزانہ مجھے دیں، تب بھی میں آپ کے اچھے بھلے ہاتھ کو نشتر سے کاٹنا تو الگ رہا بیمار بھی نہیں کہنے کا"

بیمار "کیوں نہیں کاٹنے کے؟"

ڈاکٹر "اس لیے کہ اس آپریشن کے کارن دنیا مجھے مورکھ کہے گی۔ میرے نام کو بٹہ لگ جائے گا۔ ہر کوئی یہی کہے گا کہ بیمار پاگل تھا میں نے اس کی نشا سے لابھ اٹھا کر بے ایمانی کی۔ یا مجھے کچھ آتا جاتا نہیں، روگ کی پڑتال نہ کر سکا"

بیمار "اچھی بات ہے جانے دیجیے۔ میں اپنے آپ اتنا ماس کاٹ لوں گا۔ نشتر بائیں ہاتھ سے لگانا پڑے گا کچھ پروا نہیں۔ آپ اتنا کیجیے گا کہ آپریشن کے بعد گھاؤ پر پٹی باندھ دیجیے گا"

ڈاکٹر "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

بیمار "جو کرنا چاہتا ہوں (اچانک نشتر اٹھا کر بنائے نشان میں

بھونک دیتا ہے)" دیکھیے میں نے کھال کاٹ کے گہرا گھاؤ بنا دیا۔"

ڈاکٹر (گھبرا کے) "ہے بھگوان! ٹھہریے۔ یہ آپ نے کیا کیا! کہیں ٹیڑھا بیڑھا بایاں ہاتھ کسی رگ کو نہ کاٹ دے جو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ آپ آپریشن پر تلے ہی ہوئے ہیں تو لائیے نشتر مجھے دیجیے۔ آپریشن کر دوں"

بیمار "پرماتما آپ کا بھلا کرے۔ یہ لیجیے"

ڈاکٹر "اچھا آپ منہ اُدھر پھیر لیجیے۔ بہت سے لوگ خون نہیں دیکھ سکتے۔"

بیمار "اس کی ضرورت نہیں۔ اُلٹا میں آپ کو بتاتا جاؤں گا کہ کہاں اور کتنا ماس کاٹنا ہے چلیے شروع کیجیے۔" (گھبراتے) بالکل ٹھیک کاٹ رہے ہیں آپ! دیکھا آپ نے میں نے جوں بھی کی؟ ہاتھ ذرا بھی کانپا؟ میں نے اُف بھی کی؟ — اوہ کٹ گیا! دھنیہ واد ڈاکٹر دھنیہ واد۔ کتنا سکھ ملا مجھ کو!

ڈاکٹر "اب تو جلن نہیں ہے؟"

بیمار: بالکل نہیں۔ درد جاتا رہا۔ مانو ماس کے لوتھڑے میں تھا جو آپ نے کاٹ کے پھینک دیا۔ کھال کٹنے اور ابلتے ہوئے خون کے نکلنے سے مجھے کچھ تکلیف ہے، اس کی مجھے پرواہ نہیں۔ ایسا جان پڑتا ہے کہ پہلے نرک سے لو کا جھونکا آیا تھا، پھر سورگ کی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ خون جوں جوں بہتا جاتا ہے، مجھے آرام ہوتا جاتا ہے۔ بہنے دیجیے ڈاکٹر صاحب اسے خوب بہنے دیجیے۔ (اپنے آپ سے) کتنا سکھ ملا ہے مجھ کو، کتنا خوش ہوں میں!"

ڈاکٹر: "زیادہ خون بہہ جانے سے آپ بہت کمزور ہو جائیں گے لائیے اب پٹی باندھ دوں۔ عجیب بات ہے میرے تجربے میں کبھی نہیں آئی۔ آپ کے چہرے کا رنگ نکھر گیا، گالوں پر لالی آ گئی — آنکھوں میں زندگی جھلکنے لگی۔ اور آپ تو جیسے ایک دم بدل گئے۔"

بیمار: کاشی ناتھ جی، میں سچے دل سے آپ کا دھنیہ واد کرتا ہوں۔ آپ نے مجھے بچا لیا۔ آپ نے جو سیوا کی ہے اس کے آگے یہ فیس جو میں پیش کر رہا ہوں کچھ بھی نہیں۔

ڈاکٹر: "میں اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔"

بیمار: "تو یہ رقم میں واپس بھی نہیں لے جاؤں گا۔"

ڈاکٹر: "آپ کی مرضی۔"

بیمار: "اچھا آپ فیس نہیں لیتے" نہ لیجیے۔ کم سے کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ میری طرف سے یہ رقم کسی ہسپتال کو بھینٹ کر دیں۔"

ڈاکٹر: "ہاں یہ ہو سکتا ہے۔"

بیمار: "بس تو اب میں آپ سے بدا لیتا ہوں۔"

●

اس واقعے کے کچھ دن بعد

مادھو: (آتے ہوئے) "سرکار پھر وہی بیمار۔"

ڈاکٹر: "کون سو ریہ کانت؟ اب کیا کام ہے؟ اچھے ہو گئے، اپنا کاروبار کرنے لگے، پھر...."

مادھو: "پھر یہ کر آئے ہیں، گلے میں پٹی ڈالے ہیں اور اپنا ہاتھ جیسے ہی پڑا ہے"

ڈاکٹر: "بلا لو۔ یہ کیا بھید ہے؟" (بیمار کراہتا ہوا داخل ہوتا ہے) اَرے! یہ کیا! آپ تو پہچان بھی نہیں پڑتے یہ کیا دشا ہوئی آپ کی؟"

بیمار: (کراہتے ہوئے) "مجھے بیٹھ جانے دیجیے ڈاکٹر صاحب۔۔۔ یہ۔ یہ دیکھیے پھر وہی ہاتھ!"

ڈاکٹر: "اوہ! کہیے تو ہوا کیا"؟

بیمار: (ڈوبی آواز سے) "ڈاکٹر ماس کافی نہیں کٹا۔ اب یہ اور بھی پھونکے دے رہا ہے۔ مرا جا رہا ہوں جلن کے مارے۔ پورا بازو یہاں سے وہاں تک سن پڑ گیا ہے۔ آہ! آہ! میں دوبارہ آپ کو کشٹ دینا نہیں چاہتا تھا۔ برابر جھیلے جا رہا تھا۔ سمجھا تھا کہ یہ سوجن چڑھتے چڑھتے سر تک پہنچ جائے گی، یا دل تک اتر جائے گی۔ اور میرا انت ہو جائے گا۔ پر ایسا نہیں ہوا۔ درد وہیں ہے جہاں تھا اور اتنا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ ڈاکٹر صاحب میرا چہرہ دیکھئے اور سمجھ جائیے۔"

ڈاکٹر: "وہ تو میں دیکھ رہا ہوں، منہ پر خون کی ایک چھینٹ نہیں۔

جان پڑتا ہے کہ دم کا بنا ہے روم روم سے پسینے کی دھاریں
چل رہی ہیں۔ ہاتھ لائیے پٹی کھول لے۔"

بیمار: "ہاتھ نہیں ہلا سکتا۔ آپ ہی کھولیے۔

ڈاکٹر: (پٹی کھول کر) "کچھ بھی نہیں۔ گھاؤ بالکل اچھا ہو گیا۔ نئی کھال آ گئی ہے۔ کوئی اسادھارن بات نہیں دکھائی دیتی۔ ذرا اپنی ناڑی تو دیجیے۔ ہوں۔ کتنی تیز چل رہی ہے۔ مگر شریر میں گرمی بالکل نہیں، کانپ رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسا کہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

بیمار: "ڈاکٹر یہ عجیب روگ ہے۔ اس کا کارن کھوجنے کی کوشش نہ کیجیے۔ اور پرماتما کے لیے مجھے اس سے مکت کرائیے۔ نشتر لیجیے اور اس ماس کا بڑا اور موٹا لوتھڑا کاٹ ڈالیے۔ مجھے اسی سے سکھ ملے گا۔"

ڈاکٹر: "کیا بتاؤں آپ کی بات ماننی ہی پڑے گی" (پکارتا ہے) "مادھو"

ڈاکٹر: "جی میں یہیں ہوں۔ حکم۔"

ڈاکٹر: "آپریشن کا سامان۔ جلدی کرو"

مادھو: "کلوروفارم۔

بیمار: "نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپریشن میں اپنی آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہوں"

مادھو: "پھر تو سرکار آپریشن کی میز تیار ہے۔"

ڈاکٹر: "آئیے چلیں"

بیمار: "نہیں میں نہیں اٹھ سکتا اب ایک ایک سانس مجھ پر بھاری ہے۔ ڈاکٹر آپریشن یہیں، اسی کرسی پر ہو گا"

ڈاکٹر: "کوئی ہرج نہیں مادھو۔ آپریشن کا بکس اور ایک بڑے یہیں لے آؤ" (سامان آنے پر) "سوریہ کانت جی سنبھلیے میں آپریشن شروع کرتا ہوں"

بیمار: "دیکھا ڈاکٹر خون بہنے لگا اور مجھے سکھ ملنے لگا دیکھیے نشتر گہرا لگائیے گا۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلتا کوئی پھانس چبھ رہی ہے۔ دھنیہ واد ڈاکٹر۔ خوب کاٹا"

ڈاکٹر: "ذرا لیٹ کر لوں تب کچھ کہوں۔ مادھو پٹی؟"

مادھو: "سرکار، یہ روئی اور یہ پٹیاں۔

ڈاکٹر: (پٹیاں باندھ کر) "اب کہیے"

بیمار: "کیا کہوں، درد بھرتا جا رہا۔ جلن مٹ گئی۔ مگر ٹھنڈی سانس لے کر) مہینہ بیتتے پائے گا جو آپ پھر مجھے یہیں دیکھیں گے"

ڈاکٹر: "نہیں۔ اب یہ وچار من سے نکال دیجیے۔ ایسا نہیں ہو گا"

بیمار: "تو اب مجھے بدا ہونے کی آگیا دیجیے۔ ایسا جان پڑتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں"

ڈاکٹر: "اور پھر ہو گا بھی نہیں"

بیمار: "اچھا بدا ہوتا ہوں"

ڈاکٹر کاشی ناتھ کے آرام کمرے کا دروازہ کھلا

ڈاکٹر: "کون؟ مادھو کیا ہے؟

مادھو: "سوریہ کانت جی کی چٹھی"

ڈاکٹر: "ہوں، لاؤ، پچھلی بار آئے انھیں کتنے دن ہوں گے؟"

مادھو: "جی آج مہینے کی پندرہ ہے۔ انھیں آئے پورے چھ سپتاہ ہوئے"

ڈاکٹر: "اب کے بالکل ٹھیک ہو گئے۔ وہ جو کچھ بھی تھا۔ آ خر جاتا ہی رہا، اچھا جاؤ" (اپنے آپ سے) ٹھیک ہے روگ جاتا ہی رہا۔ ورنہ ان کے اپنے ہاتھ کی چٹھی نہ آتی۔ دینے ہاتھ سے قلم ہی نہ پکڑا جاتا۔ دیکھوں کیا لکھتے ہیں (لفافہ پھاڑ کے پڑھتے ہیں)۔ "مانیہ ڈاکٹر صاحب میں اپنے وچتر روگ کے بارے میں جو جلد ہی میرا انت کر دے گا آپ کو اور چکتسا وگیان کو دبدھا یا شک میں نہیں ڈالنا چاہتا اور اس چٹھی دوارا آپ کو اپنے بھینکر روگ کا کارن بتا دینا چاہتا ہوں۔ پچھلے سپتاہ میرا روگ تیسری بار ابھرا۔ اب میں اس کا کوئی اپائے نہیں کروں گا۔ یہ چٹھی لکھتے سمے میں نے درد کی جگہ ایک دہکتا ہوا انگارہ رکھ لیا ہے، ورنہ میں قلم نہ پکڑ سکتا۔ انگارہ سلگ رہا ہے۔ درد نہیں ہوتا۔ ایسا نہ کرتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ اچھا

توسیپ: کمی سیتاہ ہوے، میں سوریہ ولا کے ایک کمرے میں
جں کے کچھ حسابات کی پڑتال کر رہا تھا جو دروازہ کھلا اور میری
پتنی موہنی اندر آئی۔"

میں: "کون موہنی۔ تم آگئیں؟ اتنی جلدی؟ سوشیلا نہیں ملی کیا؟"

موہنی: "ملی کیوں نہیں۔ پر۔ ۔ ۔"

میں: "پر کیا؟"

موہنی: "من نہیں لگا"

میں: "کیوں بھئی من کیوں نہیں لگا؟ تمہاری پرانی سہیلی ہیں۔ کتنی ہنس مکھ۔ تم سے تو بڑا پریم ہے ان کو۔ کتنی اچھی کوٹھی ہے ان کی۔ ان کا جیسا بغیچہ دور دور تک نہیں۔ دنیا بھر کی نعمت بھرا ہوا اس کی پھلواری کو جب دیکھو پھولوں سے بھری ہو۔ آرام کی ہر چیز وہاں موجود۔ پھر بھی کہتی ہو من نہیں لگا۔"

موہنی: (لجاکر) "ہاں۔ آپ جو وہاں نہیں ہوتے۔"

میں: "اب میں تمہارے ساتھ بندھا بندھا کیسے رہ سکتا ہوں۔ سو کام ہیں ان کی دیکھ بھال نہ کروں سب چوپٹ ہو جائے۔ ایسا نہیں کرتے۔ جایا کرو تو دو ایک دن وہاں ٹھہرا بھی کرو۔ منھ پر نہ کہیں، من میں ضرور برا مانتی ہوں گی۔"

موہنی: کیا کریں جب ہمارا من بھی مانے۔"

میں: ہمارے بیاہ کو پورا برس ہوا۔ میں اب نیا تو نہیں رہا۔"

موہنی: "نئے پرانے کی بات نہیں۔ میں آپ کے ہونے جتنی پرسن رہتی ہوں آپکے اوجھل ہونے ہی اس سے بڑھ کے کڑھتی ہوں۔ آپ کچھ گھنٹوں کے لیے شہر جاتے ہیں، جانتی ہوں کہ لوٹ ہی آئیں گے اتنا سمے کا سناٹا بھر ہو جاتا ہے۔ دیکھا نہیں کوٹھی کی سڑک پر آپ کی باٹ دیکھتے ملتی ہوں۔"

میں: "ہاں سب دیکھتا ہوں، اور چندا چکوری کی کہانی یاد آجاتی ہے۔ ہاں یہ تم نے کلب جانا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ مہینے کا چندہ دینے سے فائدہ؟"

موہنی: "آپ بھی تو کم ہی کم جاتے ہیں۔"

میں: "کہا نہ سو دھندے لگے ہیں میری جان کو۔"

موہنی: "بس تو جہاں آپ نہیں وہاں میں کہاں۔ پھر میں پرائے انجانے لوگوں سے گھلنا ملنا پسند بھی نہیں کرتی۔ میرے لیے تو جو کچھ ہیں وہ آپ ہیں میں تو سپنے میں بھی آپ کے سوا کسی کو دیکھنا نہیں چاہتی۔"

ڈاکٹر: یہ تھا ہم دونوں کے پریم کا ایک معمولی درشیہ۔ اب سنئے جیسے بیٹھے بیٹھے کسی پر پاگل پن کا دورہ پڑ جائے، ایک دن نجانے کون سا بھوت میرے سر پر سوار ہوا جس نے مانو میرے کان میں پھونک دیا کہ موہنی کا پیار کہیں دکھاوا اور بناوٹ تو نہیں۔ اس کے آرام کمرے میں ایک میز تھی جس کی درازیں ہمیشہ بہت دیکھ بھال کے بند کیا کرتی تھی اور کنجی کبھی ادھر ادھر نہ رکھتی۔ میں کبھی اس کمرے میں جاتا اور دراز کھلی ہوتی تو وہ گھبرا کے جھٹ سے بند کر دیتی اور مجھے ایسے دیکھتی جیسے کچھ رہی ہو کہ میں نے کچھ دیکھ تو نہیں لیا۔ یہ سوال میرے دماغ پر چھا گیا کہ دراز میں کیا ہے جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہے۔ اب مجھے اس کے سندر مکھڑے کی پوترتا اور چتون کی کوملتا پر دھیان نہیں رہا۔ ڈاکٹر۔ ایک دن اچانک سوشیلا آئی اور موہنی کو اپنے ساتھ لے گئی۔"

کاشی ناتھ: "موہنی کے جاتے ہی میرے دماغ کی جو لالکھی میں جو لاوا اب تک بھڑک رہا تھا پھوٹ پڑا۔ "اٹھو سوریہ کانت یہ دبدھا کب تک پالتے رہو گے"۔ کہہ کر میں نے اپنی چابیوں کا گچھا لیا اور ایک ایک کر کے موہنی کی میز کی دراز کھولنے لگا۔ دراز کھل گئی۔ مگر انتر آتما نے ٹوکا۔ "سوریہ کانت یہ کیا کر رہے ہو تم؟ یہ پاپ ہے۔ تمہارا پہلا پاپ! دیکھو تمہارا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ اتنے میں تم پسینے پسینے ہو گئے؟" میں نے کہا کوئی پرواہ نہیں، من کی مسوس جاتی رہے گی۔ دن رات کی الجھن سے مکت ہو جاؤں گا۔ کھولو۔ "کسی کی آہٹ پڑی۔ کون ہے؟ یہ کس کی آہٹ تھی؟ کوئی نہیں اپنے ہی پردے کی آہٹ تھی۔ جلدی کھولو۔" دراز کھینچ لی۔
"کچھ نہیں، انگوٹھی ہے۔ وہی جو میں نے پچھلے برس اس کی سالگرہ پر بھینٹ کی تھی۔ سنبھال کے رکھ دو۔ اور۔ اور یہ کیا ہے؟ بینک کی پاس بک۔ خبردار کوئی چیز اپنی جگہ سے نہ ہٹنے پائے۔ پتہ چل گیا تو۔ اب کیا رہ گیا، کچھ نہیں۔ نہیں، ہے، یہ کیا چٹھیوں کا مٹھا!؟ اسے ہاتھ لگاتے ہی دل کی دھڑکن کیوں تیز ہو گئی؟ کنٹھ سوکھ کر کانٹے کیوں آگئے ہونٹ کیوں سوکھ گئے؟ یہ ریشمی کناری کا گلابی بندھن مجھے لپٹا ہوا

سانپ ہوں محسوس ہوتا ہے۔ سوریہ کانت سنبھلو! موہنی کے نام کسی کے پریم پتر، بس کے ہیں کب لکھے گئے، سوں دیکھو، رکھو دو۔ ترکیے ہوں نے جب تم پر اور وہ تمہاری تھیں۔ ایسا بتانے سے۔ سوسی پر شک کرنا پاپ ہے۔ مگر نہیں۔ کھول کر پڑھو۔ دیکھو ان دنوں کے تو نہیں جب تمہارے سوا کسی کو ایسے پتر لکھنے کا ادھیکار نہ تھا۔ جب سماج نے قانون نے تم دونوں کو ایک کر دیا تھا۔ چٹھیاں ایک دو نہیں دس بیس۔ ڈاکٹر میں نے مٹھا کھول ڈالا ۔۔۔ اُف یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں! یہ ایک ایک شبد! ایک ایک اکشر ترشول کی بھانتی میری آنکھوں میں کیوں اترتا جا رہا ہے۔ لکھنے والا کون؟ اور کوئی نہیں تو! میرا سگا بھتیجا، سب کچھ! امتر! دغا باز! پاپی! کب لکھے گئے؟ ہماری شادی کے بعد۔ یہ پریم میں ڈوبے ہوئے شبد! یہ لگاوٹ کی باتیں! یہ مجھ سے اپنا بھید چھپانے کی گھاتیں! اُف! یہ میری رگ رگ میں وش دوڑ رہا ہے۔ تن من جلتا جا رہا ہے۔ بس، سوریہ کانت بس! ڈاکٹر میں نے مٹھا باندھ کر دراز بند کر دیا۔ ڈاکٹر میں گھائل سانپ کے سمان بل کھا رہا تھا جو کمرے کا دروازہ کھلا اور موہنی آئی۔ میں نے کہا "ارے تم آ گئیں؟ اتنی جلدی کیوں کی؟ سوشیلا نے برا مانا ہوگا۔" کہنے لگی "آپ نہ ہوں اور میرا من لگے۔ مجھے تو آپ کے بنا جینا بھی اچھا نہیں لگتا۔" "تو جاؤ ڈنر تیار ہے کھا پی کے آرام کرو۔ مجھے شاید رات گئے تک کام کرنا پڑے۔"
"جیسی آپ کی آگیا۔"

"کاشی ناتھ جی۔ آدھی رات کے سناٹے میں موہنی کے آرام کمرہ کا دروازہ میں نے جھٹکے سے کھولا، اور دبے پاؤں اندر گیا۔ وہ ہلکے خراٹے لیتی ہوئی سو رہی تھی۔ پاپ کی پتلی سو گئی۔ تیری ہر سانس اب مجھے سانپ کی پھنکار معلوم ہوتی ہے۔ آگئی نہ گھڑی جس کی باٹ میں گھنٹوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سفید ستھرے بچھونے پر سوئی ہوئی تو کبھی ایک اپسرا دکھائی دیتی تھی۔ اب وہی بچھونا ہے، وہی تیرا رنگ روپ ہے مگر تو اب میری آنکھوں میں چڑیل سے بڑھ کر ہی جان پڑتی ہے۔ تو نے میرا سکھ لوٹا! میری مریادا کی چوری کی۔ میری آستین کا سانپ بن کر مجھ کو ڈسا۔ اب اپنے کیے کو بھگت۔ اپنے پاپ کا پھل کھا! چنڈالنی دیکھ ان سوتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ جن ہاتھوں نے کبھی تجھے دھرتی سے اٹھا کر آکاش پر چڑھایا تھا، آج وہی ہاتھ تیرے منحوس گلے کا کیا حال کرتے ہیں۔ میں بڑھا اور اس کا گلا داہنے ہاتھ سے شکنجے کی طرح دبا کر گھونٹ دیا۔ موہنی کے گلے سے دو ایک بھیانک آوازیں نکلیں ساتھ ہی لہو کی ایک بوند ناک سے اچھل کر میرے ہاتھ کی پیٹھ پر گری، اور موہنی ٹھنڈی پڑ گئی۔" ڈاکٹر صاحب آپ نے میرے ہاتھ کی کہانی؟ موہنی کے آگے پیچھے کوئی نہیں جو مجھ سے پوچھ گچھ کرتا۔ چپ چپاتے داہ سنسکار کر دیا گیا۔ شمشان بھومی تک ارتھی کے ساتھ چلنے کے لیے بھی کسی کو نہیں بلایا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ اب میری انتر آتما پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ میں ہتیارا ضرور تھا مگر موہنی اس کے یوگیہ تھی۔ اس کی ہتیا کر کے شاید کوئی اتنا پرسن نہ ہوتا جتنا کہ میں۔ اس گھٹنا کے دوسرے دن سوشیلا پرسے کے لیے آئی۔ اور آنسو ڈبڈباتے ہوئے بولی "سوریہ کانت جی، موہنی چلی گئی، اور میرا بانہہ بل توڑ گئی۔ پرماتما اس کی آتما اور آپ کے ہردیہ کو شانتی دے۔" میں نے سوکھے منہ سے کہا "ہاں ہونے والی بات تھی ہو کر رہی۔ آپ کی کوٹھی سے لوٹ کر کھلی چنگی بات چیت کرتی رہی، ڈنر لیا، اور لیٹ کے سو گئی۔ سویرے دیکھا تو ٹھنڈی تھی۔ ہردیہ گتی بند ہو گئی۔" "میرا اور سب کا یہی وچار ہے" کہنے لگی۔ "آپ کو ترنت کہلوا بھیجنا تھا، میں اپنی پیاری سہیلی کے انتم درشن کر لیتی۔" میں نے کہا "اس درگھٹنا نے کچھ ایسا بوکھلا دیا کہ کسی کو نہ بلا سکا شما کیجیے۔"

"سوریہ کانت جی،" سوشیلا نے دبی زبان سے کہا "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ موہنی چلی گئی، نہیں تو یہ بات آپ تک نہ آنے پاتی۔ پہلے وچن دیجیے کہ آپ سن کر بھول جائیں گے۔" "آپ نشچنت رہیے بات مجھ ہی تک رہے گی۔" بولی "سنیے میں نے موہنی کے پاس چٹھیوں کا ایک مٹھا رکھوایا تھا۔ کرپا کر کے وہ مٹھا ڈھونڈ کر مجھے واپس کر دیجیے۔ مٹھا ریشمی کناری کے بندھن سے بندھا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "آپ بیٹھیں، ڈھونڈتا ہوں۔" میں اٹھا اور موہنی کی میز سے مٹھا نکال لایا۔ "دیکھیے یہ تو نہیں؟" سوشیلا اچھل پڑی "جی یہی ہے۔ دیکھیے میری باندھی گرہ ابھی ویسی ہی اچھوتی ہے۔ اب مجھے آگیا

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

صلاح الدین نیر

غزل

جرمِ الفت کی سزا دانستہ دے جاتے ہیں لوگ
دوستی کا نام لیتے پھر بھی گھبراتے ہیں لوگ

بزمِ عشرت میں اگر چشمِ کرم خاموش ہو
اپنے آنسو اپنا دامن ساتھ لے جاتے ہیں لوگ

دل شکستہ ہم ہیں تم کو اس کا اندازہ نہیں
لمحہ لمحہ بن کے صدیوں تک بکھر جاتے ہیں لوگ

تہمت آوارگی جب مے کدے میں عام ہو
زندگی کا زہر خاموشی سے پی جاتے ہیں لوگ

فاصلۂ قربت کا اک بدلی ہوئی سی شکل ہے
دل گرفتہ رہ کے مقتل سے کہاں جاتے ہیں لوگ

قیمت عرضِ ہنر کی بات رہنے دیجئے
کوڑیوں کے مول میں بھی آج نایاب جاتے ہیں لوگ

اس زمینِ سرخ کی مٹی اٹھا لاتے ہیں ہم
نقشِ پا اپنے جہاں میں چھوڑ کر جاتے ہیں لوگ

جانتے ہیں وہ بھی نیّر! کیا ہے تہذیبِ وفا
رکتے رکتے پاس آکر پھر بھی گھبراتے ہیں لوگ

رونق دکنی سیمابی

زعمِ انا

یوں کہا شب تاب نے اک دن پتنگے سے کہا
کود نا سیکھے کوئی تجھ سے پرائی آگ میں
آنکھ موندے بے خبر انجام سے
کب ہے جل جانا حیات جاودانی کی دلیل
ہم جیالوں سے ہے روشن آج بھی عزمِ خلیل
یہ وفا کے کب چلن ہیں
ہے وفا بدنام تجھ جیسے تہی ظرفوں سے آج
ہو پذیرائی بھی اس جانب سے تو اک بات ہے
کیسے کہیئے، اس کو خودداری، کہ ناز
بے نیازانہ سحر تک شمع جلتی ہے مدام

دیکھ مجھ کو میں بھی ہوں آتش بدوش
مجھ میں تجھ جیسی تہی ظرفی نہیں
خوب واقف ہوں مزاجِ شعلہ و شبنم سے میں
بزدلی ہے جل کے مٹ جانا وفا کے نام پر
زندہ رہ کر ہی نہ کیوں روشن کریں نام وفا
اور میں اس عزم پر ہوں کاربند
بانٹتا پھرتا ہوں شب کی تیرگی میں
روشنی ضبط و تحمل کی بہ اندازِ وفا
یہ مری وسعت نگاہی اور تو!
تنگ دل بکو تاہ بیں!!
تجھ میں سوزِ عشق کا فقدان ہے۔
میں سراپا پیکرِ سوزِ دروں

سن کے جگنو سے پتنگا جل اٹھا
سوزِ الفت کیا کہا؟ مجھ میں نہیں
تجھ میں ہے زعمِ انا مجھ میں نہیں
میں کہ ہوں آتش بجاں، اور تو کہ ہے آتش بدوش
بیخودی کے دور میں اے خود نما! کیا ذکرِ ہوش

مظہر امام

داغ کا ایک غیر معروف شاگرد ـــ سعادت پیغمبر پوری

داغ کے سیکڑوں شاگردوں میں سے شہرت کا تاج، بیخود دہلوی، آغا شاعر قزلباش، سائل دہلوی، رسا رام پوری، احسن مارہروی، سیماب اکبر آبادی اور نوح ناروی کے سروں کی زینت بنا۔ آپ چاہیں تو ان "سعادت مندوں" میں اقبال کا بھی اضافہ کرلیں جنھیں شہرت کا تاج ہی نہیں، دوام کا خلعت بھی ملا۔ داغ کے باضابطہ شاگردوں کی فہرست میں ان کا نام اجنبی سا لگتا ہے، تاہم انھوں نے دو چار غزلیں داغ کی خدمت میں تو بھیجی ہی تھیں۔ داغ کے ایک اور معتقد شاگرد تھے جنھوں نے صحیح معنوں میں داغ کی خوبصورت روایت کو آگے بڑھایا اور اپنے استاد کے علاوہ آتش اور شاد کے امتزاج سے ایک ایسا طرز سخن ایجاد کیا جو اپنے رنگ و آہنگ کے اعتبار سے انفرادیت کی شان رکھتا ہے۔ ان کا یہ شعر ؎

گھٹا اٹھی ہے کالی اور کالی ہوتی جاتی ہے
صراحی جو بھری جاتی ہے، خالی ہوتی جاتی ہے

ملک کے چپے چپے میں مشہور ہوا، لیکن وہ خود اپنے صوبہ سے باہر شاید ہی کہیں پہچانے گئے۔ یہ مبارک عظیم آبادی تھے۔ مبارک کے ساتھ پھر بھی اتنا تو ہوا کہ اپنے وطن میں ہر دلعزیزی اور پذیرائی نصیب ہوئی لیکن داغ کے شاگردوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جنھیں "نیم معروف" کہنا بھی مبالغے کو راہ دینا ہوگا۔ ان کے کمالات یا تو زمانے کی چشم تغافل شعار سے اوجھل رہے، یا وقت ان کی سمت نگاہ غلط انداز ڈال کر گذر گیا۔ داغ کے ایسے ہی غیر معروف شاگردوں میں ایک بڑا اہم نام "سعادت پیغمبر پوری" کا ہے۔

پیغمبر پور صوبہ بہار کے مشہور ضلع دربھنگا سے بارہ میل پچھم اور کمتول اسٹیشن سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے واقع ایک بستی ہے جو پہلے نواب سید سعادت علی خاں کی ریاست تھی۔ موصوف کے مورث اعلیٰ شیخ ابو سعید خاں دہلوی، شاہجہاں کے دربار میں شرف حضوری حاصل کرتے تھے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں "خاں" کا خطاب موروثی بنا دیا گیا۔ اس خاندان کو ایک بڑی جاگیر ملی۔ جس کا صدر مقام پیغمبر پور تھا لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس خاندان نے کب یہاں آکر دائمی سکونت اختیار کی، کیونکہ تاریخی شواہد ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔

ابوالخیر مظہر عالم تپیر دربھنگوی اڈیٹر "الپنچ" پٹنہ نے "دیوان سعادت" کے آغاز میں "حالات مصنف" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے، وہ بہت تشنہ ہے۔ اس تحریر سے آج ہمیں کچھ اس طرح کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں، کہ "نواب صاحب رئیس ابن رئیس، تشکیل اور وجیہہ نوجوان" تھے۔ "اردو کی شاعری کا آپ کو فطری مذاق" تھا۔ اور آپ شکار خصوصاً شیرافگنی کے بڑے شائق تھے۔ لیکن یہ تحریر اچھی بری جیسی بھی ہے، سعادت سے متعارف ہونے کے لیے اس سے مستند کوئی اور شہادت ہمارے پاس موجود نہیں۔

سعادت ۱۸۷۹ء (۱۲۹۶ھ) میں پیدا ہوئے۔ سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس لیے آٹھ سال تک انھیں کورٹ آف وارڈس کے زیر نگرانی رہنا پڑا۔ اس دوران میں ہی انھوں نے اردو فارسی کی خاصی استعداد پیدا کرلی تھی۔ کورٹ آف

وارڈس کی نگرانی کے خاتمہ کے بعد انھیں اپنے علمی اور ادبی ذوق کو مزید ترقی دینے کا موقع ملا۔ اہلِ علم و کمال کی صحبتوں نے اس ذوق کو اور بھی جلا دی۔ قدرت کی طرف سے شاعرانہ صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ داغ جیسا استاد ملا۔ یہ صلاحیت کیوں نشو و نما نہ پاتی!

سعادت کا دیوان اپریل ۱۹۰۷ء میں، یعنی داغ کے انتقال سے دو سال بعد زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ دیوان کے آخری صفحے پر مطبع کی جانب سے یہی اعلان ہوا۔ گویا اس وقت سعادت کی عمر ۲۸ سال تھی۔

"دیوانِ سعادت" کی ابتدا میں مولوی عبداللطیف شوق مدار المہام ریاست بیغیر پور کی لکھی ہوئی تاریخ "سرکار کا یہ دیوان لاکھوں میں منتخب ہے" درج ہے۔ اس سے دیوان کے سنِ اشاعت ۱۹۰۷ء کی تصدیق ہوتی ہے لیکن اس دیوان کے آخری صفحات میں داغ دہلوی، شمشاد لکھنوی، احسن مارہروی، جلیل مانک پوری، خیر دربھنگوی وغیرہ کے قطعاتِ تاریخ بھی درج ہیں۔ ان کی تاریخیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "دیوانِ سعادت" کی ترتیب کے بعد ہی مختلف شعراء سے موقع بہ موقع قطعاتِ تاریخ منگوائے گئے لیکن دیوان کی اشاعت میں تعویق ہوتی چلی گئی۔ داغ کے مصرعے "مبارک انجمن افروز دیوانِ سعادت ہے" سے دیوان کی اشاعت کا سن ۱۳۲۳ھ نکلتا ہے۔ داغ کی تاریخ وفات ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء ہے۔ ظاہر ہے کہ داغ نے یہ تاریخ اپنی وفات سے کچھ ہی عرصہ قبل لکھی ہوگی۔ اور انہیں علم ہوگا کہ دیوان مذکور کی اشاعت ۱۳۲۳ھ سے پہلے نہیں ہو سکتی۔ داغ کا انتقال ۱۳۲۲ھ کے آخری مہینے میں ہوا۔ شمشاد لکھنوی کے مصرع

"چہ گنجینۂ نظم جادو مقال"

سے تاریخ ۱۳۲۱ھ نکلتی ہے۔ احسن مارہروی کا مادۂ تاریخ ہے۔

"دیوانِ سعادت است نادر"

جس کے اعداد ۱۳۲۲ ہوتے ہیں۔ جلیل مانک پوری کا مصرع بھی یہی ہے۔ البتہ "است" کی "الف" گرا دی گئی ہے۔ اس طرح اعداد ۱۳۲۱ ہوتے ہیں: خیر دربھنگوی کے مصرع،

"چھپا بے مثل دیوانِ سعادت واہ کیا کہنا"

سے تاریخ ۱۳۲۴ھ نکلتی ہے اور یہی صحیح ہے۔

یہ دیوان نولکشور پریس لکھنؤ میں بہ اہتمام جناب مولانا مولوی سید شاہ ابوالخیر مظہر عالم صاحب خیر دربھنگوی اڈیٹر اخبار "الپنچ" بانکی پور پٹنہ شائع ہوا۔ جس زمانے میں یہ دیوان چھپا اردو میں اتنی خوبصورت طباعت اور تزئین کاری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ کتاب بڑی تقطیع کے دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ ان نقش و نگار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر صفحے پر نئے انداز سے نئے رنگ کے گل و بوٹے ہیں۔ یعنی دو سو صفحات میں دو سو طرح کے نقش و نگار، ہر صفحہ دو رنگوں میں چھپا ہے۔ آج آفسٹ، بلاک اور ٹائپ کی سہولتوں کے باعث ایک سے ایک دیدہ زیب اور "دیدہ زیب" کتابیں چھپنے لگی ہیں لیکن بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اس طرح کی اردو کتاب کا چھپنا کسی طرح معجزے سے کم نہیں۔ میں نے آج تک لیتھو میں چھپی ہوئی اردو کی کوئی اور ایسی کتاب نہیں دیکھی جسے اہتمام، آرائش، نفاست اور دلکشی کے اعتبار سے "دیوانِ سعادت" پر ترجیح دی جا سکے۔

قاضی عبدالودود نے اپنے مضمون "بہار" (مطبوعہ "اشارہ" پٹنہ نومبر ۱۹۶۰) کے فٹ نوٹ میں سعادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ داغ کے شاگرد مشہور تھے۔ خیال مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ حفیظ جونپوری ان کے یہاں نوکر تھے اور یہ دیوان بڑی حد تک انھیں کا ہے۔ کچھ غزلیں اوروں سے لے کر بھی حفیظ نے دیوانِ سعادت میں درج کر دی تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے داغ کے بعض خط موجود ہیں جن سے تلمذ ثابت ہے۔ بخوبی ممکن ہے کہ دوسروں کا کلام اصلاح کے لیے بھیجتے ہوں۔ خیال، مرحوم ان کے سسرالی رشتہ داروں میں تھے۔ ان کی شہادت آسانی سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ حفیظ کا یہ مقطع "بہار" شمارہ ۱۲ میں ہے ؎

"سعادت سے یہ کوئی پوچھے حفیظ
کہ ہے آپ پر حق استاد کچھ"

قاضی صاحب نے "خیال مرحوم" کا پورا نام نہیں لکھا لیکن شاید ان کی مراد ریاض حسن خاں خیال سے ہے، جو بقول قاضی صاحب سعادت کے سسرالی رشتہ داروں میں تھے۔ اور اس لیے "ان کی شہادت آسانی

سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی"۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف "سسرالی رشتہ دار" ہونا سعادت کی معقولیت پر دلالت نہیں کرتا۔ ممکن ہے سعادت اور خیال کے تعلقات ہموار نہ رہے ہوں۔ ریاض حسن خاں خیال، سعادت کی اہلیہ کے چچا زاد بھائی تھے۔ اس طرح کے رشتوں میں ناہمواری کا احتمال اکثر رہتا ہے۔ پھر اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ خیال اپنے علمی پس منظر کے باوجود اقتصادی اور شاید سماجی لحاظ سے بھی سعادت سے، برتر یا برابر نہیں تھے۔ ممکن ہے اسی احساس نے انھیں بھی سعادت پر اس طرح کا الزام لگانے پر مجبور کیا ہو۔

لیکن ریاض حسن خاں خیال مرحوم یا قاضی عبدالودود ہی پر کچھ منحصر نہیں، بلکہ مثنوی، گلزار نسیم کے بارے میں، بھی یہ کہا گیا تھا کہ یہ خواجہ آتش کی لکھی ہوئی ہے یا ظفر کے تمام دواوین ذوق کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں! یہ درست ہے کہ حفیظ جونپوری، سعادت علی خاں کی ریاست میں ملازم تھے اور عین ممکن ہے کہ سعادت نے داغ کے علاوہ حفیظ سے بھی مشورۂ سخن کیا ہو یا اپنا کلام داغ کو بھیجنے سے قبل ایک نظر حفیظ سے بھی دکھا لیتے ہوں۔ حفیظ سے ان کی قربت داغ کی بہ نسبت بہرحال زیادہ تھی۔ حفیظ کا جو مقطع قاضی عبدالودود نے جہاد کے حوالے سے نقل کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ حفیظ کا سعادت سے استادانہ رشتہ تھا لیکن دیوان سعادت کے کسی شعر سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ پورے دیوان میں کسی بھی حیثیت سے، بر سبیل تذکرہ ہی سہی، حفیظ کا نام کہیں نہیں آیا ہے۔ حتیٰ کہ ان کا لکھا ہوا قطعۂ تاریخ بھی شامل کتاب نہیں ہے۔ مجھے حقیقت حال کا علم نہیں۔ ہو سکتا ہے بعد میں حفیظ سے سعادت کے تعلقات خراب ہو گئے ہوں۔

نواب سعادت علی خاں کی تاریخ وفات کے بارے میں ان کے کتبۂ مزار کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے کوئی علم نہیں ہوتا۔ سعادت کا مزار شہر دربھنگا میں "مرزا خاں کا تالاب" کے مشرقی کنارے کے بلند ٹیلے پر واقع ہے۔ مزار کے اوپر سنگ مرمر پر کندہ کیا ہوا کتبہ آویزاں ہے۔ اس پر سال وفات ۱۳۴۰ھ درج ہے اور یہ بھی لکھا ہے "۴۴ سال زندہ رہے"۔ اس طرح ان کا سال پیدائش ۱۲۹۶ھ نکلتا ہے۔

سعادت سپغیر پوری تذکرہ نگاروں اور محققوں کی بے توجہی کا شکار رہے ہیں۔ عزیز الدین بلخی کی "تاریخ شعرائے بہار" تو ۱۳۱۴ھ تک کا تذکرہ ہے، لیکن معین الدین دردائی کی تالیف "بہار میں اردو شاعری" میں بھی سعادت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ سعادت، داغ کے شاگرد تھے۔ بقول قاضی عبدالودود ... "داغ کے بعض خطوط موجود ہیں جن سے تلمذ ثابت ہے"۔ دیوان سعادت کے سرورق پر مصنف کے نام کے بعد "شاگرد رشید حضرت داغ دہلوی مرحوم" درج ہے۔ مجھے ذاتی طور پر معتبر ذرائع سے واقفیت ہوئی ہے کہ مرزا داغ ریاست سپغیر پور میں نواب سعادت کے مہمان بھی ہوئے تھے اور موصوف کو داغ کی صحبت سے براہ راست فیض حاصل کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی تھی۔

داغ کے شاگرد ہونے کے باوصف، سعادت کو داغ کے حریف امیر سے بھی عقیدت تھی"۔ دیوان سعادت" کے سرورق پر ہی ان کا مقطع درج ہے:

بعد از امیر و داغ، سعادت ہے اپنا دور
مشہور ہے کلام مرا دور دور آج

ان کا ایک دوسری غزل کا مقطع ہے:

سعادت اس کو کیا کہیے ہمارا یہ عقیدہ ہے
امیر و داغ سے شاعر ہوا اچھا ہم نہ مانیں گے

اس کے علاوہ انھوں نے امیر کے جانشین جلیل مانکپوری سے قطعۂ تاریخ بھی لکھوایا ہے۔ اس سے سعادت کے قلب و نظر کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ویسے یہ کہنا مشکل ہے کہ داغ کی زندگی میں بھی وہ اوّل الذکر شعر کو اپنے دیوان کے سرورق کی زینت بناتے یا نہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سعادت کے کلام پر داغ کے رنگ سخن کی گہری چھاپ ہے۔ وہی سادگی، صفائی اور سلاست، وہی چھیلا پن، الفاظ کی نشست و برخاست کی طرف خصوصی توجہ، محاورات کا خوبصورت استعمال، داغ کے کلام کی یہ صفات سعادت کے یہاں بھی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ فکری اعتبار سے سعادت ایک خاص سطح سے کبھی اونچے نہیں اٹھتے۔ داغ کی فکری سطح بھی بہت بلند نہیں ہے لیکن

کبھی کبھی ان کے کلام میں بجلیاں بھی نظر آتی ہیں جو پشت احساس پر تازیانہ کا کام دیتی ہیں سعادت کے یہاں ایسی بجلیوں کی تلاش بے معنی ہوگی۔ وہ عموماً لمبی لمبی غزلیں لکھتے ہیں۔ عام طور پر ان کی غزلیں ۱۷، ۱۸ اشعار سے کم کی نہیں ہیں، ۳۰، ۲۵، ۳۰ اشعار کی غزلیں بھی اچھی خاصی تعداد میں مل جائیں گی۔ سات یا نو اشعار کی غزلیں بہ مشکل دو چار ہوں گی۔ اس "بسیار گوئی" کے باعث ان کے کلام میں بڑی یکسانیت اور سطحیت پیدا ہو گئی ہے۔ دیوان کو بہ اعتبار حروف تہجی، ردیف دار مرتب کرنا بھی ضروری تھا اس لیے بہت سی زمینوں میں کسی تحریک کے بغیر محض خانہ پری کے لیے غزلیں کہی گئی ہیں جن سے شاعرانہ مشق و مزاولت کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن ان غزلوں میں شاید ہی کوئی شعر ایسا ملتا ہے جہاں نظر ٹھہر سکے۔ اگر سچ پوچھئے تو سعادت کی کامیاب غزلیں صرف ردیف "یائے" میں ہیں دوسری ردیفوں میں اگر کوئی اچھی غزل مل جائے تو اسے اتفاق کہنا چاہیئے۔

سعادت کا دور وہ تھا جب ہندستان میں انڈین نیشنل کانگریس کی تاسیس تو ہو چکی تھی، لیکن آزادی کی کوئی باضابطہ تحریک شروع نہیں ہوئی تھی۔ مغل سلطنت کے خاتمے اور انگریزی استعمار کے تسلط نے قومی زندگی کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا۔ لیکن عام طور پر نوابوں رئیسوں، جاگیرداروں اور امیروں کا طبقہ اس سیاسی شکست و ریخت کے عمل سے بے نیاز سا تھا۔ بے فکری، عیش پسندی اور خود فراموشی کا غلبہ تھا۔ سعادت نواب تھے۔ ایک اچھی ریاست کے مالک تھے۔ ان کی زندگی بھی انہیں اوصاف یا عیوب سے عبارت تھی جو اس دور کے افراد کے حصے میں آئے تھے۔ داغ کی شاعری بھی اسی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔ جسے داغ نے دیکھا محسوس کیا اور برتا تھا۔ سعادت فن شعرگوئی میں ان کے شاگرد رہتے ہی، معنوی حیثیت سے بھی دونوں ایک ہی زندگی کے عکاس ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو سعادت کی شاعری داغ سے زیادہ ریاض خیرآبادی سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ وہی شوخی، کھلنڈراپن، کھلنڈول اور خود مستی جو ریاض خیرآبادی کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہمیں سعادت کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ ریاض کو "شاہد" سے واسطہ ہو یا نہ رہا ہو، لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ انھوں نے "شراب" کا ایک قطرہ بھی بھولے سے چکھا نہ تھا مگر سعادت تو والیِ ریاست تھے اور ان کے لیے شاہد و شراب لازم و ملزوم۔ سعادت کے یہاں محبوب کے ستم یا غم فراق کا ذکر بھی کہیں کہیں آ گیا ہے۔ لیکن اسے محض رسمی یا تقلیدی کہنا چاہیئے۔ ان کی شاعری میں وصال کا بہت ہی ارضی اور فطری تصور ہے جسے آپ چاہیں تو "سطحی" بھی کہہ لیں۔ کیونکہ اس کے ڈانڈے عریانی اور فحاشی سے بھی جا ملتے ہیں۔ خلوت و وصل کے واقعات کا ذکر سعادت خوب مزے لے لیکر بڑی بے تکلفی سے بیان کرتے ہیں۔ یہ تصویریں سطحی ہوں یا عریاں لیکن ان کے حقیقی ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً یہ اشعار سے

وصل کی رات بھی نکلی نہ تمنا دل کی ان کا نازک سا کلیجہ جو دہلتے دیکھا
ہائے گھبرا کے شب وصل یہ کہنا ان کا شمع بجھتی ہے نہ بجتا ہے گجر آج کی رات
چھوڑو شب وصل ہاتھا پائی دوپہری ہو جائے گی کلائی

میں نے عرض کیا کہ سعادت کی شاعری ریاض سے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔ ذرا یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔ کیا ان میں ریاض کے رنگ سخن کی جھلکیاں نمایاں نہیں ہیں:

مل گئی جس دن کہیں اچھی شراب
توبہ توڑی اور فوراً پی شراب

ابتدا اچھی رہے ہر کام کی
پہلے توبہ کر تو پیچھے پی شراب

پینے کو میکدے میں آئے نہ آئے واعظ
رندو یہ بحث چھوڑو چولھے میں جائے واعظ

تقدس کی اگر لے میکدے میں
نکالو شیخ کو داڑھی پکڑ کر

یہ دھمکیاں ہیں یوں ہی، خوب ہم سمجھتے ہیں
گلے لگا کے جو کرلیں گے پیار، کیا ہوگا؟

یہ بات کچھ حیرت کی نہیں ہے کہ سعادت نے اکثر ریاض کی زمینوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شخصیت اور عملی زندگی میں بھی شوخی اور کھلنڈراپن تھا جو ہمیں ریاض کی شاعری میں ملتا ہے۔ سنجیدگی کا عنصر ان کے یہاں خال خال نظر آتا ہے اور کبھی وہ زبردستی سنجیدہ بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو مضحکہ خیز بن جاتے ہیں۔ عیش پرستی نے انہیں سہل پسند بنا دیا

تھا اور وہ ریاض ہی کی طرح سطحی اور عامیانہ مضامین سے کبھی اوپر نہ اٹھ سکتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ سعادت کو خود بھی اس کا احساس تھا کہ وہ اپنے استاد کے رنگ سے زیادہ ریاض کی سرمستی اور خوش باشی کی نمائندگی کرتے ہیں ؎

استاد سے الگ ہے سعادت کا رنگ ڈھنگ
طوطی کو کوئی بحث نہیں عندلیب سے

اس شعر میں استاد داغ کو "عندلیب" اور خود کو "طوطی" قرار دے کر اصل سعادت نے اپنے دل کا چور ظاہر کیا ہے :

سعادت کا عام رنگ سخن وہی ہے جس کی مثالیں میں نے مندرجہ بالا اشعار کی صورت میں دی ہیں وہ ایک خاص زندگی، بلکہ اپنی زندگی کی چند خاص کیفیات و محسوسات کے عکاس ہیں۔ انھوں نے شاعری میں مصوری کی کوئی کوشش نہیں کی۔ "حالات مصنف" میں خیر در بھنگوی نے سعادت کے فوٹو گرافی کے شوق کا بھی ذکر کیا ہے۔ دراصل ان کی شاعری بھی فوٹو گرافی ہی ہے جس میں ان کی زندگی کے بعض واقعات کی ہو بہو تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فوٹو گرافی کو مصوری کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے سعادت کی شاعری کا مطالعہ بھی انھیں حدود کے اندر رہ کر کرنا چاہیے۔

سعادت کی غزلوں میں ذہنی اور فکری احساسات کو ابھارنے کی کوشش نہیں ملتی۔ مجھے لے دے کر ان کے سارے دیوان میں ایک ہی فکری شعر نظر آیا ؎

مجھ سے چھپنا ہی تھا تو روز ازل
کیوں کیا صورت آشنا تو نے

اس کے علاوہ ان کے یہاں ایسے شعر بھی مل جاتے ہیں جو متانت کے ساتھ بعض لطیف احساسات کو پیش کرتے ہیں۔ کاش اس طرح کے اشعار ان کے دیوان میں زیادہ تعداد میں ہوتے ؎

یہ مانتا ہوں سزاوار میں کرم کا نہیں
تمھیں کچھ اپنی طرف تو خیال کرنا تھا

خود پرست حسن پرستی نے کیا
اپنی نظروں میں تماشا ہوں میں

نیچی وہ نگاہیں ہیں تو ہونٹوں پہ تبسم
شوخی ہے طبیعت میں تو آنکھوں میں حیا ہے

مرے پہلو میں جب تک وہ حسیں ہے
غم کونین کا خدشہ نہیں ہے

قیامت بھی ہے اک دن آنے والی
ترے ہر عہد کا مجھ کو یقیں ہے

موسیٰ سے کب ہوا تھا راز و نیاز ایسا
سچ ہے کہ اپنا اپنا انداز گفتگو ہے

ان کو یہ ناز کہ وعدے پہ اسے ٹال دیا
مجھ کو یہ فخر کہ وہ آج مری مان گئے

★

چودھری محمد علی ردولوی — (صفحہ کا بقیہ)

ان کے خطوں کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیں۔ ترکیب اضافت کا نام و نشان تک نہیں ان کے بارے میں نیاز فتحپوری لکھتے ہیں :

"چودھری صاحب کا انداز تحریر سب سے الوکھا ہے۔ وہ لکھتے نہیں بات کرتے ہیں اور جس نے انھیں بات کرتے سنا ہے وہی سمجھ سکتا ہے کہ منھ سے پھول جھڑنا کسے کہتے ہیں۔"

صاحب طرز مکتوب نگار کے لیے جن خصوصیات اور شرائط کی ضرورت پڑتی ہیں محمد علی اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ اس بنا پر ان کو اگر بیسویں صدی کا صاحب طرز مکتوب نگار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

★

سراج مرزا پوری

غزل

موجِ شررسے برقِ شرر کھیل رہی ہے
میری نظر سے کس کی نظر کھیل رہی ہے

کیوں مسکرا رہی ہے دمِ نزع زندگی
کس کی دعا بہ لطفِ اثر کھیل رہی ہے

دنیائے غم سے یوں تو گریزاں ہے زندگی
دنیائے غم کے ساتھ مگر کھیل رہی ہے

دنیا کی یہ بلندیٔ پرواز دیکھیے
دنیا قریبِ نجم و قمر کھیل رہی ہے

بادِ سحر کے فیض سے لالہ کی گود میں
شبنم برنگِ لعل و گہر کھیل رہی ہے

دشواریوں کا ذوقِ اذیت لیے ہوئے
اہلِ سفر سے راہِ سفر کھیل رہی ہے

کون و مکاں کی گردشِ پیہم کے ساتھ ساتھ
کس کی ادائے شام و سحر کھیل رہی ہے

جس غم کی زندگی کو فرشتے نہ چھو سکے
اس غم سے کائناتِ بشر کھیل رہی ہے

پردے میں رقصِ جلوۂ بیتاب ہے سراجؔ
میری نظر میں تابِ نظر کھیل رہی ہے

حیات وارثی

غزل

سبزہ ہے گل ہے اور نہ کوئی درخت ہے
اے دوستو وفا وہ گزرگاہ سخت ہے

حالات کی تپش سے ابھی ہونٹ خشک ہیں
کیسے کہوں کہ آپ کا لہجہ کرخت ہے

اب تک نہ جس کے سائے میں کوئی پنپ سکا
انساں کی ہوس وہ گھنیرا درخت ہے

مفہوم کیسے سمجھیں اشارے کنائے سے
ہر مطلعِ نگاہ کا مصرعہ دو لخت ہے

جس شکل میں بھی زیست کو تم چاہو ڈھال لو
پھولوں کی سیج ہے یہی کانٹوں کا تخت ہے

انساں کی فکر کتنے سویرے جگا چکی
انسانیت حیاتؔ ابھی خوابیدہ بخت ہے

ڈرامہ

ڈاکٹر محمد علی زیدی

نواب کی موت

[وقت۔ شام کا
مقام۔ نواب کے محل کا ایک خوب صورت سجا ہوا کمرہ۔
کردار:
بیگم۔ عمر پچاس پچپن سال۔ سُرخ و سفید رنگ، بناؤ سنگار کیے ہوئے۔
فہیمن۔ بیگم کی خادمہ۔ عمر ۲۵، ۳۰ سال۔
نظیرن۔ بیگم کی دوسری خادمہ۔ عمر ۲۵، ۳۰ سال۔
بشیرن۔ بیگم کی تیسری خادمہ۔ عمر ۱۸، ۲۰ سال۔
چھوٹے سرکار۔ بیگم کا بیٹا عمر ۳۰ سال عادات و اطوار بچوں کے سے]

بیگم۔ اری فہیمن، نظیرن، بشیرن اری مرداروتم سب کہاں ہو۔
فہیمن۔ حاضر ہوئی بیگم صاحبہ
بیگم۔ ارے مردار جھاڑو پھری کہاں مرگئی تھی۔ مجھے اتنی دیر ہوگئی چلاتے چلاتے۔
فہیمن۔ نواب صاحب کے کمرے میں گئی تھی بیگم صاحبہ (روتی آواز میں) سرکار کے دشمنوں کی حالت خراب ہوگئی ہے۔
بیگم۔ صبح سے یہ سنتے سنتے کان پک گئے۔ آخر یہ ڈاکٹر حکیم وید کیا کر رہے ہیں۔
فہیمن۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ سرکار کے دشمنوں کی حالت بہت نازک ہے۔ میں نے ایک دوا دی ہے اگر ۱۵ منٹ کے اندر اندر اس دوا نے بھی اثر نہ کیا تو سرکار ـــــ سرکار ـــــ بیگم صاحبہ ـــــ (رونے لگتی ہے۔)
بیگم۔ اری چڑیل کچھ کہے گی بھی یا روئے ہی جائے گی۔ میں نے تو ابھی کوئی تیاری بھی نہیں کی ہے۔
فہیمن۔ حکم فرمائیے بیگم صاحبہ
بیگم۔ حکم کی بچی، درزی سے کہنا ہمارے لیے فوراً کالا ریشمین جوڑا تیار کرے ہمیں ماتمی لباس پہننا ہوگا۔
فہیمن۔ جو حکم، میں ابھی درزی کو بلواتی ہوں۔ (جاتی ہے)
بیگم۔ فہیمن
فہیمن۔ جی بیگم صاحبہ
بیگم۔ یہ تو بتا مجھ پر کالا جوڑا زیادہ کھلے گا یا سفید۔
فہیمن۔ بیگم صاحبہ۔ میں صدقے جاؤں کالا لباس تو آپ پر کھِل اٹھتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کالی کالی گھٹاؤں میں چاند چمک رہا ہے
بیگم۔ اچھا تو کالے لباس ہی کے لیے کہہ دینا۔ اور یہ بھی تاکید کر دینا

کہ بہت اچھا سی کرلائے یہ موقع بار بار نہیں آتا۔ مجھے یاد ہے نواب کلن کے انتقال پر ان کی بیگم نے کیسا خوب صورت جوڑا پہن رکھا تھا۔

فہیمن۔ وہ آپ کی جوتی کی بھی برابری نہیں کرسکتیں آپ کا جوڑا دیکھ کر سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی پھٹی رہ جائیں گی۔

نظیرن۔ (روتی آواز میں) بیگم صاحبہ میرے منھ میں خاک سرکار کی حالت بہت نازک ہے۔

بیگم۔ ہر ایک نے نازک کی رٹ لگا رکھی ہے صاف صاف بتاتی کیوں نہیں۔

نظیرن۔ بیگم صاحبہ سرکار کے دشمنوں کی حالت بہت خراب ہے انھیں ابھی تک ہوش نہیں آیا۔

بیگم۔ دشمنوں کو جہنم میں ڈال تو دو گھنٹے سے کہاں غائب تھی؟

نظیرن۔ بیگم صاحبہ ابھی دوا کی بوتل سے سر پھوڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا اسے لیے کھڑی رہو۔

بیگم۔ تو نے بوتل کی بجائے دیوار سے سر نہیں پھوڑا۔ ایک منٹ میں پھوٹ جاتا کم بخت میں سنگار کے لیے تیرا انتظار کر رہی ہوں اور تیرا کہیں پتہ نہیں۔

نظیرن۔ لائیے ابھی کیے دیتی ہوں۔

بیگم۔ نہیں تو نہیں کرسکتی۔ یہ کام تیرے بس کا نہیں ہے۔

نظیرن۔ بیگم صاحبہ آپ کا سنگار روزانہ میں ہی کرتی ہوں۔ آج کیا نئی بات ہوگئی۔

بیگم۔ آج نئی بات ہی ہے۔ آج دوسرے قسم کا سنگار کرنا پڑے گا۔ اداسی میں دلکشی ہو۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ چمک ہو۔ بکھری ہوئی زلفوں میں دل ربائی ہو۔ سوگوار حسن کی تصویر یہ کام تجھ سے نہیں ہوسکے گا۔

نظیرن۔ بندی کو یہ بھی آتا ہے کہ آپ کے بکھرے ہوئے ریشمی بال ناگن معلوم ہوں گے آپ کی بھیگی ہوئی نرگسی آنکھیں شراب کا چھلکتا جام نظر آئیں گی آپ کے سرخ رخساروں پہ پانی کی بوندیں گلاب پر شبنم کے موتی دکھائی دیں گے۔

نہیں

بیگم۔ (خوش ہوکر) بہت خوب ہماری یہی خواہش ہے۔ آج جیلہ کھائی نہیں دے رہی ہے۔ اس کام چور کو نکال باہر کردوں گی۔

نظیرن۔ بیگم صاحبہ وہ برابر رو رہی ہے آنسوؤں سے منھ دھو رہی ہے روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی ہیں سرکار کی صحت یابی کی دعائیں مانگ رہی ہے۔

بیگم۔ وہ کیوں نہیں روے گی مردار بیگم بننے کے خواب بھی تو وہی دیکھ رہی تھی۔ آج اس کے خوابوں کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔

فہیمن۔ ڈاکٹر صاحب چھوٹے سرکار کو بلوا رہے ہیں۔ (روتی آواز میں) دکھ رہے ہیں کہ بڑے سرکار اب کچھ دیر کے اور مہمان ہیں۔

بیگم۔ ایے اس بڈھے کھوسٹ ڈاکٹر کو کیا ہوگیا ہے ایسے وقت میرے بچے کو بلوا رہا ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے جیرے تیسویں سال میں قدم رکھا ہے میرے بچے کے دل پر دہشت بیٹھ گئی تو کیا ہوگا۔

فہیمن۔ کیا جواب دوں بیگم صاحبہ؟

بیگم۔ ارے جواب کیا دے گی کہہ دے وہ ابھی آرام فرما رہے ہیں۔ بھلا ایسے وقت میں بچوں کو بلایا جاتا ہے۔ سرکار خود اسے پسند نہیں فرمائیں گے۔ وہ انھیں جان سے زیادہ چاہتے ہیں۔

فہیمن۔ بیگم صاحبہ گستاخی معاف ہو۔ ایسے وقت میں چھوٹے سرکار کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے

بیگم۔ ارے کیا بھنگ پی کر آئی ہے یا تیری عقل گھاس چرنے گئی ہے نوج دو۔ بار میں اپنے بچے کو ہرگز نہیں بھیج سکتی اور دیکھ بڑے سرکار کے پاس سے تمام چابیاں مجھے لاکر دے دے۔ دوڑ کر جا۔ دیکھ کسی کو پتہ نہ ہو چپکے سے لانا (فہیمن جاتی ہے)

(چھوٹے سرکار آتے ہیں)

چھوٹے سرکار۔ امی حضور آداب بجالاتا ہوں۔

بیگم۔ جگ جگ جیو۔ پھلو پھولو۔ اری نظیرن۔ اری کم بخت یہاں کھڑی ہوئی کیا کر رہی ہے۔ جا مرزا صاحب سے جاکر کہہ کر انتظامات کریں۔

چھوٹے سرکار۔ (ٹھنک کر) اونہہ ہونہہ۔

بیگم۔ کیا ہوا چھوٹے سرکار۔ آپ کیوں ناراض ہوگئے؟

چھوٹے سرکار۔ (رونی آواز میں) امی حضور آپ ہم سے تو بات ہی نہیں کرتیں۔ معلوم نہیں آج آپ کو کیا ہو گیا ہے۔

بیگم۔ آپ ہی سے تو بات کر رہی ہوں فرمائیے۔

چھوٹے سرکار۔ امی حضور آج ہمارے رستم خاں کی سالگرہ ہے۔ آپ نے ابھی تک کچھ انتظام نہیں کیا۔ ہم اپنے مصاحبوں اور رفیقوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔

بیگم۔ نہیں بیٹے! آپ کو معلوم ہے بڑے سرکار کی کیا حالت ہے؟ لوگ کیا کہیں گے؟

چھوٹے سرکار۔ لیکن امی حضور میرے بٹیر کی سالگرہ کا ابو حضور کی بیماری سے کیا تعلق ہے؟

بیگم۔ نہیں میرے لعل! تم سے تو تعلق ہے تمھیں یہیں رہنا چاہیے۔

چھوٹے سرکار۔ لیکن امی حضور۔ جب دادا حضور دم توڑ رہے تھے اس وقت ابو حضور بھی تو بٹیروں کی کشتی کروا رہے تھے۔ اور جب دادا حضور کا جنازہ جا رہا تھا اس وقت ابو حضور اپنے دوستوں کے ساتھ دنگل جیتنے کی خوشیاں منا رہے تھے۔ ابو حضور نے کتنی دفعہ یہ واقعات مجھے سنائے ہیں۔

بیگم۔ اس وقت بڑے سرکار کی ناسمجھی کا زمانہ تھا ان کی عمر ہی کیا تھی کل بیس سال کے تو تھے ہی میرے ساتھ گڑیاں کھیلا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے کہ میری بٹیریں مرغیوں کا دودھ پیتی ہیں۔ میں نے کہا مرغی تو انڈا دیتی ہے تو قسم کھا کر کہنے لگے کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دودھ پیتے دیکھا ہے۔

چھوٹے سرکار۔ امی حضور ہمیں بھی ایسی ہی مرغیاں منگوا دیجیے۔

بیگم۔ ارے آپ بھی ناسمجھی کی باتیں کرنے لگے اب آپ کو یہ باتیں چھوڑ دینی چاہئیں۔ اب ماشاء اللہ تم نواب ہونے والے ہو۔

چھوٹے سرکار۔ لیکن وہ دن کب آئے گا۔ ابو حضور تو مرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

بیگم۔ وہ تو اب چند لمحوں کے مہمان ہیں۔

چھوٹے سرکار۔ امی حضور ہمیں ابو حضور کی خادمائیں بہت پسند ہیں ان کی ہیرے کی انگوٹھی بھی بہت اچھی ہے۔

بیگم۔ اب سب آپ کا ہی ہے۔ بہو بیگم کہاں ہیں۔ وہ دکھائی نہیں دیں۔

چھوٹے سرکار۔ وہ روٹھی ہوئی چھپر کھٹ میں پڑی ہیں۔ ضد کر رہی ہیں کہ نواب ہونے کی خوشی میں مجھے زیورات بنوا دیجیے۔

فہیمن۔ (آتے ہوئے) سرکار، بیگم صاحبہ، بیگم صاحبہ سرکار۔

بیگم۔ اری کچھ کہے گی بھی حرام خور یا یہی رٹ لگائے رہے گی۔

فہیمن۔ بیگم صاحبہ بڑے سرکار کی سانس رک رک کر آ رہی ہے (رونی آواز میں) ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ سرکار آخری جدوجہد کر رہے ہیں۔

بیگم۔ یا اللہ تو بڑے سرکار کی مشکل آسان کر۔

چھوٹے سرکار۔ امی حضور ہمارا گانا سننے کو جی چاہ رہا ہے۔

بیگم۔ نہیں چھوٹے سرکار! یہ وقت گانا سننے کا نہیں ہے آپ کی غفلت سے لوگ فائدہ اٹھا کر مال ادھر ادھر کر دیں گے آپ تمام کام سنبھال لیجیے۔

چھوٹے سرکار۔ امی حضور پہلے کچھ کھلوا دیجیے۔ بھوک لگ رہی ہے۔

بیگم۔ فہیمن چھوٹے سرکار کے لیے خوانِ نعمت لگا۔

فہیمن۔ ابھی پیش کرتی ہوں بیگم صاحبہ۔

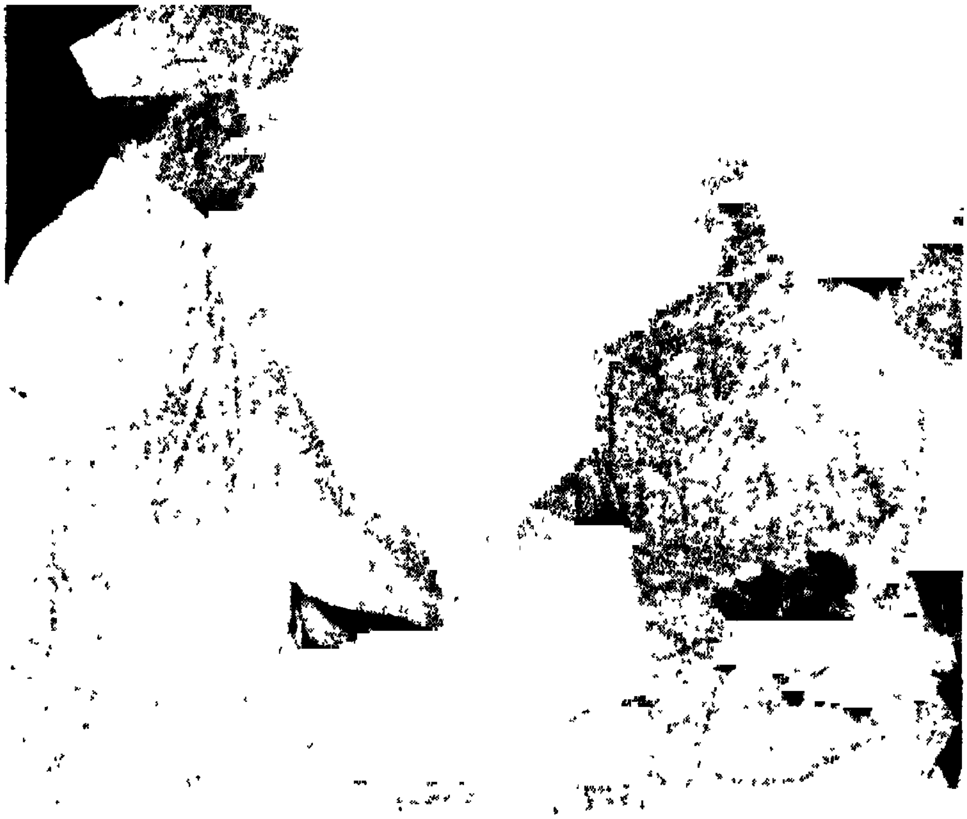
بیگم۔ چھوٹے سرکار۔ میرے لعل۔ یہ وقت غفلت کا نہیں ہے سستی نہ کرو۔ تمام سامان پر تالے لگا دو۔ بڑے سرکار کے کمرے پر پہرہ بٹھوا دو۔ اور پہرے داروں کو یہ حکم دے دو کہ کوئی شخص نہ بغیر اجازت اندر آئے نہ باہر جائے۔

چھوٹے سرکار۔ امی حضور یہ کام تو آپ بھی کر سکتی ہیں۔

بیگم۔ میں نے مرزا صاحب کو تمام ہدایات دے دی ہیں۔

چھوٹے سرکار۔ آپ نے کیا ہدایات دی ہیں؟ یہی نا کہ فلاں کمرے پر تالا لگا دو۔ فلاں تجوری پر مہر لگا دو۔ فلاں کاغذات کی الماری کو اپنی نگرانی میں رکھو۔ امی حضور میں یہ ہدایات نہیں چاہتا۔ یہ ہدایات دیجیے کہ گھی کے چراغ جلاؤ۔ چراغاں کرو۔ پورے محل کو سجا کر دلہن بنا دو۔ ناچ ہو، گانے ہوں۔ خوشی ہو مسرت ہو۔ ہر طرف شادمانی ہو ......

بیگم۔ نہیں بیٹا ابھی نہیں۔ صبر کرو اس کا بھی وقت آئے گا۔



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۴ مئی ۱۹۷۵ء کو صدر جمہوریہ شری فخرالدین علی احمد کو ان کی ۷۰ ویں سالگرہ پر مبارکباد دیں۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی ۱۹ اپریل ۱۹۷۵ء کو بنگلور میں انڈین سائنٹیفک سیٹے لائٹ (مصنوعی سیارہ) پر احکٹ کا معائنہ کرتے ہوئے







مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات شری اندر کمار گجرال ۸ مئی ۱۹۷۵ء کو نئی دلی میں وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کو اردو کمیٹی کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے

مرکزی وزیر اطلاعات و نشریا
شری شفاعت علی کو "آ کا تو
"بارگاہِ رسالت میں"، فیو کو ا

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن ب
وکاس ا

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن ب









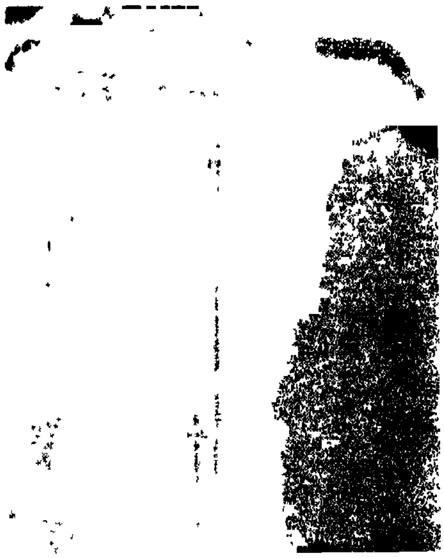
گورنر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی ۳ مئی کو رویندرالیہ لکھنؤ میں ساتویں پنچایتی راج کانفرنس کے اختتامی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے



۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے اردو پروڈیوسر
دے رہے ہیں یہ ایوارڈ ان کو
گ کے ساتھ نشر کرنے پر دیا گیا ہے

ضلع پرتیدھ کے کمپاؤنڈ میں "اندرا گاندھی
لکھتے ہوئے ◄

لستفار میں "منعقدہ مشاعرہ کا افتتاح
▼





وزیر اعلیٰ شری بیرونتی مدان بہوگنا ۲۳ مارچ کو بلند شہر سے ۲۶ کیلومیٹر دور الوپ شہر میں کسان اور باہمی سنگم کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے۔ ان کے دائیں جانب وزیر مالیات شری نرائن دت تیواری کھڑے ہیں ◀

◀ آئی اے ایس اور آئی ایف ایس امتحانات ۱۹۷۰ء میں

کماری کرن بھورا (دائیں) اور شری اے چودھری (وسط) نے بالترتیب پہلا اور دوسرا نمبر حاصل کیا۔ شری امیتاب بنرجی (دائیں جانب) آئی۔ اے ایس کے امتحان میں تیسرے نمبر اور آئی ایف۔ ایس کے امتحان میں چوتھے نمبر پر آئے





مسٹر کوستوف ترپاٹھی ۲۶ اپریل کو مشرقی بنگال ٹیم کے فٹ بال کھلاڑیوں سے مصافحہ کرتے ہوئے ◀

چھوٹے سرکار۔ نہیں نہیں اب زیادہ صبر کی ہم میں تاب نہیں ہے۔ اب صبر نہیں ہوتا۔ دل میں انار چھوٹ رہے ہیں۔ خوشیاں پھل رہی ہیں ارمان کروٹیں لے رہے ہیں۔ بھول جائیے اس نقطہ کو۔

بیگم۔ چھوٹے سرکار عقل سے کام لیجیے ابھی بڑے سرکار کی شمعِ حیات ٹمٹا رہی ہے تو مدھم پڑ گئی ہے لیکن بجھی نہیں ہے۔

چھوٹے سرکار۔ ان خوشیوں کی آندھی کا یہ مدھم ٹمٹماتی لو کب تک مقابلہ کرے گی۔ اپنے آپ بجھ جائے گی۔ خوشیاں مناؤ۔ نغمے تذریں پیش کرو، مبارک باد پیش کرو۔

نظیرن۔ (دوڑتی ہوئی آتی ہے) چھوٹے سرکار۔ تو تو۔ مبارک ہو۔ بیگم صاحبہ...... مبارک ہو ...... مبارک ہو۔

فہیمن۔ (دوڑتی ہوئی آتی ہے) مبارک ہو۔ مبارک۔ چھوٹے سرکار مبارک ہو۔

چھوٹے سرکار۔ ہم تمھاری مبارک باد قبول کرتے ہیں۔ ابھی حضور ان کے مرثیوں سے پھر دیکھئے۔ ہم بہت خوش ہوئے۔

فہیمن، نظیرن۔ (دونوں ایک ساتھ) بڑے سرکار کو ہوش ہو گیا۔ انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اللہ تیرا شکر ہے دوبارہ جان بخشی ہے۔

چھوٹے سرکار۔ کیا کہا آآ..........

بیگم۔ کیا۔ آ۔ آ۔ آ

فہیمن، نظیرن۔ ہاں سرکار ڈاکٹر کہتے ہیں اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔

چھوٹے سرکار۔ بس بس بکواس بند کرو۔

بیگم۔ (دل آواز میں) اللہ تیرا شکر ہے۔ چھوٹے سرکار آپ تو بیٹھ لڑاؤ۔

★

تعمیر گلستاں

تکمیل رضوی

مقصد کو نہ پابندِ تقدیر کرو یارو
تعمیرِ گلستاں کی تدبیر کرو یارو

کردار میں یوں پیدا تاثیر کرو یارو
ہر خاک کے ذرے کو تسخیر کرو یارو

شاید ابھی کچھ گوشے محتاجِ تعارف ہیں
قرآنِ محبت کی تفسیر کرو یارو

انساں کی بلندی ہے آپس کی محبت میں
دل دل سے ملیں ایسی تدبیر کرو یارو

تم راہ میں ہو اب تک منزل پہ نہیں پہنچے
راہوں کو نہ منزل سے تعبیر کرو یارو

ماضی کی ہر اک تلخی تم دل سے بھلا ڈالو
تاریخ نئی اپنی تحریر کرو یارو

جو کچھ رہِ الفت میں تکمیل پہ گزری ہے
افسانہ در افسانہ تحریر کرو یارو

ویریندر پرشاد سکسینہ

پنڈت اندرجیت شرما ـ حیات اور شاعری

میرٹھ ایک زمانے میں علم و ادب کے اعتبار سے سارے ہندستان میں مشہور تھا جہاں یزدانی میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، شوکت میرٹھی ندرت میرٹھی اور پنڈت اندرجیت شرما نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی اس کو اردو کا کوئی ادبی مورخ اور تذکرہ نویس فراموش نہیں کرسکتا۔ آج اس مقالہ میں پنڈت اندرجیت شرما کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے حالات زندگی اور ادبی خدمات سے ہمارے دورِ جدید کے ادبی مورخ اور تذکرہ نویس ناواقف ہوتے جا رہے ہیں۔

پنڈت اندرجیت شرما ۳ دسمبر ۱۸۹۳ء کو بمقام کھرکودہ ضلع میرٹھ میں ایک تیاگی برہمن خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم اردو ہندی اور فارسی کی میرٹھ میں حاصل کی۔ ٹریننگ اسکول اور نارمل اسکول کے امتحانات میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوکر معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۲۲ء میں میٹرک کا امتحان پرائیوٹ طور پر سیکنڈ ڈویزن میں پاس کیا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۰ء تک ماچھرہ فائنل اسکول میں انگریزی کے استاد رہے۔ پھر اسی اسکول میں ۱۹۴۰ء سے ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۶ جولائی ۱۹۴۶ء کو آپ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ شرما جی نے اردو کے اساتذہ کی آنکھیں دیکھی تھیں اور ان کی صحبتوں سے فیض بھی اٹھایا تھا۔ بڑے سلجھے ہوئے نیک اور وضعدار انسان تھے۔ ساری زندگی ایک سچے سپوت کی طرح اردو کی خدمت میں لگادی۔ خواجہ حسن نظامی کو قرآن مجید کا ہندی ترجمہ کرنے میں مدد کی۔ اس کا ذکر خواجہ حسن نظامی نے ان کے مجموعۂ کلام نیرنگِ فطرت پر تبصرہ کرتے ہوئے صفحہ ۱۴ پر ان الفاظ میں کیا ہے

"میں نے ان کی صورت نہیں دیکھی مگر انھوں نے میرے دوست چودھری تیوا رام سنگھ صاحب ساکن ماچھرہ ضلع میرٹھ کے ذریعہ مجھے قرآن مجید کا ہندی ترجمہ کرنے میں مدد دی تھی اور میں نے ان کو اپنے اردو ترجمہ کو ہندی لباس پہنانے میں بہت ہی کامیاب پایا تھا"

پنڈت اندرجیت شرما مولانا ندرت میرٹھی مرحوم کے شاگرد رشید تھے۔ پندرہ سال کی عمر سے ہی شاعری کی طرف رجحان طبع ہوگیا تھا۔ شرما کی شاعری کسی ایک ہی صنف تک محدود نہیں تھی بلکہ انھوں نے نظم، مسدس، مخمس، غزل، گیت وغیرہ میں اپنی طبع خداداد کے جوہر دکھائے ہیں۔ ہمارے بعض ادبی مورخوں نے یہ لکھ دیا ہے کہ شرما جی کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا حالانکہ شرما کے کلام کے دو مجموعے "نیرنگِ فطرت" اور "جلوۂ راز" شائع ہو چکے ہیں جن کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ "نیرنگِ فطرت" اندرجیت شرما کی ادبی، اخلاقی، قومی اور نیچرل نظموں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۳۰ء میں احسن المطابع میرٹھ سے باہتمام مولانا شعیب احمد صاحب ندرت شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ پر مولانا ندرت میرٹھی، خواجہ حسن نظامی اور مولانا عشرت لکھنوی وغیرہ جیسے ارباب شعر و ادب نے ان کے کلام کو سراہا ہے اور اس مجموعہ کو اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ بتایا ہے۔ یہ مجموعہ نصاب تعلیم میں بھی شامل تھا۔ جناب عبدالشکور صاحب اپنی کتاب "دورِ جدید کے چند منتخب ہندو شعراء" میں صفحہ ۱۲۳ پر اس مجموعہ کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں۔

"سنہ ۱۹۳۰ء میں ان کا کلام نیرنگیٔ فطرت کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ مجموعہ یو پی ٹیکسٹ بک کمیٹی نے مڈل مدارس کے نصاب کے لیے منظور کیا ہے۔ علاوہ ازیں سی پی اور بمبئی کی حکومتوں نے لائبریریوں اور انعامات کے لیے پسند کیا ہے۔ اکثر نظمیں مختلف صوبوں میں کورسوں میں منتخب کی گئی ہیں۔"

اندرجیت شرما کے کلام کا دوسرا مجموعہ جلوۂ راز جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا اور یہ مجموعہ بھی نیرنگیٔ فطرت کی طرح مقبول ہوا تھا یہ بھی احسن المطابع میرٹھ سے شائع ہوا تھا اس مجموعہ میں نظمیں، غزلیں اور گیت شامل ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے جلوۂ راز پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کو جدید اردو شاعری میں ایک مفید اضافہ بتایا ہے۔

اندرجیت شرما کا رجحان بہ نسبت غزل کے نظم کی طرف زیادہ تھا اور ان کی نظمیں کافی مقبولیت حاصل کر چکی تھیں شرما جی نے بہت سے گیت بھی لکھے تھے جو زیادہ تر ریکارڈوں میں بھرے جا چکے ہیں۔ اردو گیتوں کی تخلیق کے سلسلے میں حفیظ جالندھری، اندرجیت شرما، مقبول حسین احمد پوری، عظمت اللہ خاں، ساغر نظامی، عرش ملسیانی، عدم، شکیل بدایونی وغیرہ نے ہمارے اردو گیتوں کے ادب میں کامیاب اضافے کیے ہیں۔ اندرجیت شرما گیتوں کی تکنیک سے پوری طرح واقف تھے کیوں کہ انھوں نے سنسکرت اور ہندی کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ عرش ملسیانی کی طرح ان کے گیت مختلف موضوعات پر ہیں۔ ان کے گیتوں کی زبان سلیس اور سادہ ہے لیکن ان میں موسیقیت اور مٹھاس شامل ہے اور ان کو ساز پر بہ آسانی گایا جا سکتا ہے ان کے گیتوں میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، احساس کی شدت بھی ہے اور جذبات کا زور بھی۔ "ادبی دنیا" لاہور کے ایڈیٹر مولانا صلاح الدین احمد صفحہ ۴ پر اندرجیت شرما کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے گیتوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اس ہفتے ایڈیٹر ادبی دنیا کا بھیجا ہوا ایک ایسا پرچہ ڈاک خانے سے واپس آیا جس پر ڈاکیے نے پنسل سے لکھا تھا "مکتوب الیہ کا انتقال ہو گیا لہٰذا واپس ہے"، پرچہ پلٹ کر پتہ دیکھا تو لکھا تھا پنڈت اندرجیت شرما ——— بے اختیار ایک آہ سرد سینے سے نکلی اور نغمہ ریز ہو گئی ایک آنسو ٹپکا اور خاک میں مل گیا ——— اندرجیت شرما چل بسے اور اپنے ساتھ وہ رس وہ مٹھاس اور خوشبو بھی لے گئے جو انھوں نے اپنے سہانے گیتوں میں بسائی تھی اُردو کو ایسا گیت لکھنے والا مدت تک نہیں ملے گا اور ان لوگوں کو جو انھیں جانتے تھے ایسا سادہ، مخلص اور گرم دل دوست قیامت تک میسر نہیں آئے گا وہ ایک عرصے سے خاموش تھے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ یہ چپ ایک ابدی خاموشی کی پیشرو ہے اور اب ان کے نغمے اس دنیا کے لیے نہیں ہیں بلکہ اس سازِ سرمدی سے ہم آہنگ ہونے والے ہیں جس کا سرور کبھی کبھی انسانی روح کی گہرائیوں میں سنا جاتا ہے۔ شرما جی کہنے کو مر گئے لیکن جب تک ان کے گیت زندہ ہیں اور جب تک ہماری دیہاتی دوشیزائیں انھیں ندی کے کنارے جھرمٹوں میں گاتی اور شہری دلہنیں اپنی معطر تنہائیوں میں گنگناتی رہیں گی وہ خود زندہ رہیں گے اور ہمیں زندگی سے ہمکنار کرتے رہیں گے۔"

اندرجیت شرما کا ایک گیت "جوگن اور پپیہا" پیش کیا جاتا ہے:

سن لے میرا گیت
پپیہے سن لے میرا گیت
جوگن ہوں میں گانے والی — پریم کا راگ سنانے والی
پی پی کرنا پریم سے پیارے ہے تیری ریت — الفت کا ہے جام پپیہے سن لے میرا گیت
پپیہے سن لے میرا گیت
جوگن ہوں میں گانے والی — پریم کا راگ سنانے والی

(۲)

میرے من کی بات
پپیہے میرے من کی بات
پی پی کا تجھ کو دکھ بھاری — پریم کی میرے لگی کٹاری
غم کی سر پہ چھائی گھٹا سی برہن کالی رات — تیرے من کی بات پپیہے میرے من کی بات
پپیہے میرے من کی بات
پی پی کا تجھ کو دکھ بھاری — پریم کی میرے لگی کٹاری

(۳)

مجھے دہی بیراگ
پپیہے مجھے دہی بیراگ

جس کے سب تو پریم کا پیاسا اسی کی ہے اس دل میں لالسا
دوار جی کے لگی بدن میں ہائے یہ کیسی آگ بجھ کر جو احساس پپیہے مجھے دہی بیراگ
پپیہے مجھے دہی بیراگ
جس سے ہے تو پریم کا پیاسا اسی کی ہو اس دل میں لالسا

اندرجیت شرما کا شمار جدید اردو شاعری کے قابل ذکر شعراء میں ہوتا ہے۔ سرور جہان آبادی کی طرح آپ کی نظموں میں قدیم اور جدید رنگوں کا امتزاج تھا۔ سلاست بیان، چست بندش اور پاکیزہ تخیل آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ انداز بیان سادہ و دلکش ہونے کے علاوہ تاثیر اور اثر سے بھرپور ہے۔ ان کا کلام پڑھنے سے طبیعت کو تازگی اور نفس کو بالیدگی محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سید احمد مسعود رضوی اڈیٹر رسالہ "کامیابی" دہلی نے اپنے رسالہ ماہ جولائی ۱۹۲۰ء کے صفحہ ۳ پر شرما جی کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی تھی:

"شرما صاحب آہستہ آہستہ اپنے لیے شعرائے ملک کی صف اولین میں جگہ نکال رہے ہیں اور وہ دن بہت دور نہیں کہ عروس کامیابی آپ سے ہم کنار ہوگی۔"

بہار حسن کی تصویر دیکھ کر ایک مسدس لکھا تھا اس میں جذبات فطرت کا کس سادگی کے ساتھ اظہار کیا ہے کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔ کیا خوب کہتے ہیں ؎

ہائے یہ موسم گلوں کا ہائے یہ عہد شباب بے پیے رگ رگ میں ہے کیفیت جام شراب
مست ہو کر گا رہی ہیں کیا حیا کیسا حجاب تالیاں یہ کیا ہیں بجتا ہے ہتھیلی کا رباب
زندگی کا لطف جھولے میں ہے یا گلشن میں ہے
فصل گل میں ننھی ننھی بوندوں میں یا دن میں ہے

مفلسوں کی ہولی میں ہندستانیوں کی غریبی کی کیسی دردناک تصویر کھینچی ہے جب بھارت پر انگریزوں کا راج تھا:

سب اہل ہند مست ہیں جام خیال میں
گاتے ہیں مرد و زن سبھی ہولی کا راگ آج
ہے پیٹ کو اناج نہ کپڑا بدن کو ہے
ہر شخص کھیلتا ہے لنگوٹی میں پھاگ آج

"ہندو مسلم" ایک مسدس لکھا ہے اس میں ہندو مسلمان کے اتحاد پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

وہ طائر ہیں کہ جن کی عمر گزری اک نشیمن میں
مکیں ہیں وہ کہ ہیں رشک جناں کی ایک مسکن میں
وہ گل ہیں جن کی بو پھیلی ہوئی ہے ایک گلشن میں
وہ پتلے ہیں نہیں کچھ فرق جن کے رنگ و روغن میں
مگر افسوس ناواقف ہیں اب تک راز فطرت سے
اٹھانا فائدہ سیکھا نہیں کچھ درس عبرت سے

نظم "برسات کی فضا"، "دوشیزۂ صحرا اٹھے" اور "ہر غزال" میں جن جذبات عالیہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ حقیقت میں اندرجیت شرما کا ہی حصہ ہے۔ نظم "برسات کی فضا" کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آسماں پر چھا گئی کالی گھٹا برسات کی ٹھنڈی ٹھنڈی خلد سے آئی ہوا برسات کی
زاہدوں کے دل میں بھی پیدا ہوئی مستی کی لہر سوتے فتنوں کو جگاتی ہے ہوا برسات کی
ہر طرف کہسار پر طاؤس محو رقص ہیں باغ میں کوئل کی کوکو ہے نوا برسات کی
برق بن کر جلوۂ قدرت ہوا ہے بے حجاب پانی پانی شرم سے ہوگی گھٹا برسات کی
گل کھلے گلزار میں یا آئیں پریاں خلد سے یا قیامت ڈھا گئی کالی گھٹا برسات کی
بھول کر جنت کا طالب نام جنت کا نہ لے دیکھ لے اک بار اگر آ کر فضا برسات کی
کیوں ترو تازہ نہ ہوں برسات میں زخم کہن
کر گئی سب کو ہرا کالی گھٹا برسات کی

نظم "جگنو" جس بحر میں لکھی گئی ہے وہ بحر اردو میں کم مروج ہے البتہ عربی اور فارسی میں اس کا رواج بہ کثرت ہے۔ دو بند ملاحظہ فرمایئے:

برسات کی یہ شب ہے تاریک جہاں پر پڑتی ہیں جہاں نظریں اک ہو کا سماں ہے
کیا زیر فلک گردوں بادل کا عیاں ہے وہ بزم فلک بھی اب پردہ میں نہاں ہے
ہے دوش ہوا لیکن اک طور کا عالم
چھایا ہوا صحرا میں ہے نور کا عالم
چنگاریاں اڑتی ہیں خاموش فضا میں یا مور ہیں یہ رقصاں ظلمت کی قبا میں

باشانِ مسیحائی چمن چمن کے گھٹا میں ذروں کو اڑاتی ہے، بَر دے سے کے ہوا میں
یا چرخ پہ بادل کے چمکتے ہیں ستارے
یا برقِ تجلّی کے گرتے ہیں شرارے

نظم "گنگا" ملاحظہ فرمایئے کیا خوب فرماتے ہیں:

کوہِ ہمالیہ ہے گنگا ترا نشیمن پھیلا ہوا ہے اس کی گودی میں تیرا دامن
دنیا میں تو رواں ہے جنت میں تو رواں ہے تیرا زمیں پہ جوبن ہے آسماں پہ جوبن
قدرت نے آبِ شیریں تجھ کو عطا کیا ہے شاداب جس کے دم سے بھارت کا ہے یہ گلشن
کہتی ہے ساری دنیا کہتا ہے سارا عالم
پانی ترا نہیں ہے آبِ حیات سے کم
تقدیر سے میسر جس کو تری فضا ہے تیرا ہی دامن اس کو آغوشِ دلکشا ہے
کٹیا بنا کے جوگی بیٹھا ترے کنارے حسنِ ازل کا جلوہ موجوں میں دیکھتا ہے
آبِ رواں سے ایسی لو اس کی لگ رہی ہے گویا کہ محو ہو کر تصویر بن گیا ہے
اک جام وصل تیرا مل جائے وقتِ آخر
یہ زندگی سپھل ہو مرنے کا ہے مزا پھر

اندر جیت شرما نے غزلیں پنڈت چکبست مرحوم کی طرح بہت کم لکھی ہیں لیکن اس صنفِ سخن میں بھی جو کچھ کہتے ہیں اس میں بڑی جان ہوتی ہے۔ فنی حیثیت سے غزل کی قدیم روش کے پابند ہیں لیکن خیالات کے لحاظ سے ان کی غزل سوقیت و ابتذال سے پاک ہے۔

ہر شے میں ترا یا رب جلوہ نظر آتا ہے جس کو یہ جانا ہوں سینا نظر آتا ہے
معلوم یہ ہوتا ہے سمجھا فرقِ جز و کل میں قطرہ کی جگہ تو میں دریا نظر آتا ہے
تو آئینۂ دل کو کر صاف تکدر سے اس آئینہ میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے
ہستی کے سفینے کو ساحل سو کہاں حاصل دریائے فنا میں یہ ڈوبا نظر آتا ہے
سینے میں تڑپتا ہے ارماں ترے ملنے کا لیکن اسے کب کوئی رستہ نظر آتا ہے

اظہارِ غم کا بعد کو سودا کرے کوئی پہلے اثر کی راہ تو پیدا کرے کوئی
ذوقِ نظر کے ضبط کا ہے اقتضا یہی کچھ دل کے آئینہ ہی میں دیکھا کرے کوئی

آیا پیامِ ہوش پیامِ اجل کے ساتھ کیا خاک زندگی کی تمنا کرے کوئی
پرواز کا تو بعد میں ہوتا ہے امتحاں درِ تو قفس کا پہلے ذرا وا کرے کوئی
لو کھل گیا معمۂ حیات و ممات کا اک انقلاب زیست میں پیدا کرے کوئی

حقیقت سے یہ مانا دور ہوں میں محبت میں مگر مسرور ہوں میں
مری فطرت ہے وقفِ خاک ساری تکبّر کے سبب منصور ہوں میں
زمانہ پر حکومت چاہتا ہوں مطیعِ نفس ہوں مجبور ہوں میں
صداقت کی ضیا پاشی ہوئی جب تو دیکھا جہل میں مستور ہوں میں
مجھے بھاتا نہیں جنت میں رہنا گناہوں میں بہت مشہور ہوں میں
لگی لپٹی نہیں رکھتا کسی کی
بہت بیباک ہوں مغرور ہوں میں

چرخِ کہن کے جور سے تنگ آ گئے ہیں سب یارب کوئی اب اور نیا آسماں بنا
بوئے وفا نہیں ہے تو کس کام کا ہے پھول اچھا تو ہے وہ خار جو دامن کشاں بنا
سیراب آنسوؤں سے ہوئی کشتِ آرزو برباد ہو کے خرمنِ دل گلستاں بنا

میرے مذہب میں کہاں نقشِ دوئی کا نام ہے طالبِ گل کو چمن میں خار سے کیا کام ہے
میرا بس ہو تو مٹا دوں سارا رنگِ امتیاز فتنۂ دیر و حرم تو اک خیالِ خام ہے
کعبۂ دل کی پرستش میں ہے روحانی طرب ماسوا کہتے ہیں جس کو مجمعِ آلام ہے
ہے منور دل کا کاشانہ خدا کے نور سے صبحِ صادق سے ہے روشن تر وہ اس کی شام ہے
صاحبِ ہمت نہیں ڈرتے ہیں مرنے سے کبھی موت کیا ان کے لیے ہے زیست کا پیغام ہے

یہ آرزو ہے دل میں تری آرزو رہے اس گھر میں کوئی بھی نہ رہے تو ہی تو رہے
دل میں ہجومِ یاس کی کچھ انتہا نہیں گھر میں جگہ بھی ہو جو تری آرزو رہے
لائے گا رنگ خونِ محبت کبھی ضرور اے گل نہ تو رہے نہ تری رنگ و بو رہے
پینے کا جب مزہ ہے کہ آ جائے وہ خمار رگ رگ میں موج مے ہو نہ باقی لہو رہے

★

ہمارا وطن

ایم۔ اے شفق دھتاسی

ہمیں اپنی جاں سے یہ پیارا وطن ہے
وطن کے ہیں ہم، اور ہمارا وطن ہے

وطن کی محبت ہے مثل عبادت
ہے عزت وطن کی ہماری بھی عزت
وطن کی حفاظت ہے اپنی حفاظت

ہمیں اس لیے اتنا پیارا وطن ہے
وطن کے ہیں ہم اور ہمارا وطن ہے

وطن رقصِ طاؤس کا سا ہے منظر
وطن ہی ہے ہر حسن خوبی کا پیکر
وطن ہی ہے تابندگی مقدر

غرض زندگی کا سہارا وطن ہے
وطن کے ہیں ہم اور ہمارا وطن ہے

وطن سے ہے بہنوں کی مانگوں کا صندل
وطن ہے جوانوں کے ایثار کا پھل
وطن نونہالوں کی مشکل کا ہے حل

ضعیفوں کی آنکھوں کا تارا وطن ہے
وطن کے ہیں ہم اور ہمارا وطن ہے

یہاں ہے بیاباں بھی رشکِ گلستاں
یہاں کا ہر اک گل ہے خوشبو بداماں
یہاں ملتا ہے راحتِ دل کا ساماں

نگاہوں کو دلکش نظارا وطن ہے
وطن کے ہیں ہم اور ہمارا وطن ہے

یہاں پھوٹ کا بیج بونا نہ ہوگا
یہاں دل میں نشتر چبھونا نہ ہوگا
یہاں خوں میں دامن بھگونا نہ ہوگا

مصیبت کا واحد سہارا وطن ہے
وطن کے ہیں ہم اور ہمارا وطن ہے

سدا مخلصِ راز پائے گا ہم کو
مصیبت میں دمساز پائے گا ہم کو
جہاں دے گا آواز پائے گا ہم کو

ہم اس کے ہمارا سہارا وطن ہے
وطن کے ہیں ہم اور ہمارا وطن ہے

غزل

جے۔ ایم سنہا دھتبو

ہے فہم اس کا جو ہر انساں کے دل کی زباں سمجھے
سخن وہ ہے جسے ہر شخص اپنا ہی بیاں سمجھے

فرشتہ ہر بشر کو ہر زمیں کو آسماں سمجھے
کہ ہم تو عشق میں دنیا کو ہی جنت نشاں سمجھے

وہ میرا دل تمہارے شفق جسے تم آسماں سمجھے
وہ داغ حسرتِ دل تھے جنھیں تم کہکشاں سمجھے

میں اس کو دل کہوں ہمدم جو ہو میرا شریک غم
میرا طرز وفا دیکھے مرا دردِ نہاں سمجھے

نہ ہم نے تم سے کچھ مانگا نہ کچھ شکوہ شکایت کی
نہ تم نے ہم سے کچھ پوچھا ہمیں تم بے زباں سمجھے

محبت نامہ لکھتے ہیں انھیں ہر صبح اٹھ کر ہم
عبادت بھی اسی کو ہم تو اے جانِ جہاں سمجھے

بہت پیارا ہے دھتبو مجھ کو ذوقِ عاشقی میرا
زمانہ لاکھ اس کو ایک سعیِ رائیگاں سمجھے

آغا کامل رزمی

عبدالرحیم خان خاناں

تاریخ کے آئینے میں

عبدالرحیم خانِ خاناں کی پیدائش لاہور میں ہوئی۔ ان کے والد خانِ خاناں بیرم خاں ہمایوں بادشاہ کے سپہ سالار، شاعر، درباری اور شہزادہ اکبر کے پھوپھا و اتالیق تھے۔ والدہ جمال خاں میواتی کی دختر تھیں۔ بڑی بہن کی شادی اکبر سے ہوئی تھی (حالانکہ صاحب مآثر کو اس بات سے اختلاف ہے)۔ رحیم کی عمر بمشکل چھ سال تھی کہ بیرم خاں حج کے لیے روانہ ہوئے اثنائے راہ بمقام پٹن ایک لوہانی افغان کے ہاتھوں ان کا خاتمہ ہوگیا۔ ہونہار رحیم نے شہنشاہ اکبر کی زیر سرپرستی قلیل مدت میں ہی ترکی، فارسی، عربی نیز بھاشا و سنسکرت پر عبور حاصل کرلیا۔ ۱۵۸۲ء میں وہ شہزادہ سلیم جہانگیر کے اتالیق مقرر ہوئے اور خانِ خاناں کے آبائی خطاب سے سرفراز ہوئے۔ اگرچہ عبدالرحیم ایک بہترین سپہ سالار تھے لیکن جنگی معرکوں نیز فتح و ظفر کی بدولت ان کی شہرت اتنی نہیں تھی جتنی کہ ان کی علمی و ادبی سرپرستی اور جود و سخا کی داستانیں جو آج بھی زبان زد خلائق ہیں۔ نہ صرف ہندوستان میں آباد اہل علم و فن بلکہ ایران اور دوسرے غیر ممالک کے شعرا اور اہل قلم بھی ہمیشہ عبدالرحیم خان خاناں کے دستِ کرم سے فیضیاب ہوتے رہے۔

فارسی شعرا کی سرپرستی

ایران کے صفوی دربار کا مشہور اور جواں سال شاعر عرفی شیرازی ہندوستان آکر کچھ عرصہ فیضی کے پاس اور پھر حکیم ابوالفتح کی سرپرستی میں رہا۔ مُربّیِ علوم حکیم ابوالفتح کی وفات کے بعد عرفی نے عبدالرحیم خانِ خاناں سے رجوع کیا۔ ۵۳ اشعار کا ایک قصیدہ موزوں کرکے خدمت میں پیش کیا جس کا مطلع یہ ہے ؎

اے داشتہ در سایۂ ہم تیغ و علم را   وی ساختہ آرائش ہم فضل و کرم را

(ترجمہ: آپ نے شمشیر و پرچم کو ہم سایہ کر دیا ہے نیز فضل و کرم کو دوبالا کر دیا ہے)

خانِ خاناں نے شاعر کو مبلغ ایک لاکھ روپے انعام دیے۔ وفات سے قبل عرفی نے اپنا قلمی دیوان خان خاناں کی خدمت میں بھیجا جو ۲۶ قصائد، ۲۷۰ غزلیات اور ۷۰۰ متفرق رباعیات و ابیات پر مشتمل تھا۔ خانِ خاناں نے ایک خوش نویس مسمی محمد قاسم معروف بہ سراج کو کتابت پر مامور کیا۔ سراج نے ایک سال سے زائد عرصہ تک کام کیا اور چودہ ہزار اشعار کو انتہائی خوش سلیقگی سے ترتیب دیا۔ ماہانہ تنخواہ کے علاوہ خانِ خاناں نے اس خدمت کی انجام دہی پر مزید زرِ کثیر سراج کو انعام میں دیا۔

نظیری نیشاپوری نے خراسان و کاشان میں قسمت آزمائی کے بعد ہندوستان آکر خانِ خاناں کے دربار کا رُخ کیا۔ حالانکہ اس کو اکبری دربار میں جگہ ملی تاہم وہ مستقل طور پر خانِ خاناں کے ساتھ احمد آباد اور دوسرے مقامات پر رہا۔ نظیری کو بھی ایک لاکھ روپے انعام میں ملے۔ شاعر نے ۱۰۰۱ھ میں اپنا ارادہ حج بیت اللہ کا کیا جس کی تکمیل کے خیال سے ایک قصیدہ پیش کیا جس میں شاعر کہتا ہے ؎

ہمہ عیش ایں جہانی بہ عنایت تو دیدم   چہ عجب اگر بیابم ز تو زادِ آں جہانی

(ترجمہ: آپ کی عنایت سے میں نے اس دنیا کے تمام عیش اٹھائے ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر آپ ہی کی طرف سے آخرت کا توشہ بھی مل جائے۔)

خانِ خاناں نے رقم خطیر مرحمت کرنے کے علاوہ سفر حج کے لیے تمام سہولتیں بھی نظیری کو مہیا کیں۔

ایرانی دربار کے ایک خاص شاعر اور طبیب حکیم رکن الدین متخلص بہ مسیح (حکیم رکنائے کاشی) نے، جو تقریباً ایک لاکھ اشعار کہہ چکے تھے، ایک دن واضح طور پر شاہ عباس صفوی کی بے التفاتی کو دیکھا اور فوراً مملکت سے چلے جانے کا تہیہ کرلیا۔ شاہ عباس کو خطاب کرتے ہوئے حسب ذیل اشعار کہا ؎

گر فلک یک صبح دم با من گراں باشد سرش
شام بیروں می روم چوں آفتاب از کشورش

(ترجمہ: اگر کسی دن صبح کو میرے خلاف آسمان کو سرگرانی ہو جائے تو شام ہوتے ہی میں اس کی مملکت سے مثل آفتاب چلا جاؤں گا۔)

چنانچہ حکیم رکنائے کاشی مسیح بمعہ حکیم سدرائے شیرازی، جنھیں بعد

یں جہاں گیر نے مسیح الزماں کے لقب سے سرفراز کیا، ہندوستان چلے آئے۔ خانِ خاناں نے بڑے تپاک سے دونوں کا استقبال کیا۔ دربار شاہی میں ممتاز جگہیں دلوائیں اور ہر طرح سے نوازا۔ انھیں ایام میں ایک دوسرے سخن گو شکیبی اصفہانی نے اپنا وطن چھوڑ کر آگرہ کا رخ کیا اور حسانِ خاناں کی ملازمت میں داخل ہوا۔ خانِ خاناں نے ایک لاکھ سے زائد روپے انعام واکرام میں دیے، حتیٰ کہ "ساقی نامہ" میں شاعر کو اپنے ممدوح کی تعریف میں کہنا پڑا ؎

بیا ساقی آں آبِ حیواں بدہ   ز سرچشمۂ خانِ خاناں بدہ
سکندر طلب کرد لیکن نیافت   کہ در ہند بود و بہ ظلمت شتافت

(ترجمہ:۔ آ۔ اے ساقی آبِ حیات بخش۔ خانِ خاناں کے چشمۂ کرم سے عطا کر۔ تلاش کے باوجود سکندر نہ پا سکا کیونکہ (چشمۂ آبِ حیات) ہند میں تھا اور وہ تاریکی میں پھرتا رہا۔)

خانِ خاناں کی نیک نامی، فیاضی اور جود وسخا کے چرچے چار دانگ عالم میں پھیل چکے تھے۔ چنانچہ ایران کے شاہ عباس صفوی کے دربار کا ایک اور شاعر کوثری کھلے الفاظ میں کہتا ہے ؎

کہ نبود در سخن دانانِ دوراں   خریدارِ سخن جز حسانِ خاناں

(ترجمہ:۔ زمانہ کی سخن فہم ہستیوں میں شعر کا حقیقی قدر دان خان خاناں کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خانِ خاناں سپہ سالار افواج کی حیثیت سے دہلی سے آگرہ آرہے تھے۔ پہلی منزل پر قیام کیا۔ سہ پہر کو خانِ خاناں دھوپ میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک فقیر یہ صدا لگاتا ہوا گزرا ؎

منعم بہ کوہ ودشت وبیاباں غریب نیست   ہر جا کہ رفت، خیمہ زد و بارگاہ ساخت

(ترجمہ:۔ خداوند نعمت کہسار، جنگل اور بیابان کسی جگہ بھی اجنبی نہیں۔ جہاں تشریف فرما ہوئے، خیمہ لگا اور بارگاہ تیار ہو گئی)

اس وقت تک منعم خاں کا خطاب بھی مل چکا تھا۔ خوش ہو کر فقیر کو طلب کیا اور مبلغ ایک لاکھ روپے انعام دیے۔ یہی سب باتیں دوسری منزل پر پیش آئیں۔ خانِ خاناں نے پھر ایک لاکھ روپے انعام دیے۔ یہی تکرار پھر تیسری منزل پر ہوئی اور فقیر نے مزید ایک لاکھ روپے حاصل کئے۔ اس طرح تین لاکھ کی رقم مل جانے پر فقیر کو تردد ہوا۔ اور دل میں معاً خیال کیا کہ معطی ایک امیر الامرا اور مسلح افواج کا سپہ سالار ہے۔ کہیں ناراض ہو گیا تو جان کی خیر نہیں۔ چنانچہ وہ اگلی منزل پر نہیں آیا لیکن خان خاناں نے حسب سابق انتظار کیا۔ خدمت گاران کو تلاش کرنے بھیجا مگر بے سود۔ فقیر نہ آنا تھا نہ آیا۔ آخر رنجیدہ لہجہ میں کہا کہ فقیر کم ہمت نکلا ورنہ ہم سے اس کو ہر اگلی منزل پر بھی ایک ایک لاکھ کے حساب سے ہی روپے انعام میں ملتے۔ اس سے خانِ خاناں کی بے مثل اور عدیم النظیر فیاضی کا پتہ چلتا ہے۔

عبدالرحیم خانِ خاناں حقیقت میں جامع الکمالات اور خداداد علمیت اور صلاحیت کے حامل تھے۔ بہترین خدوخال، فیضانِ کرم اور حسنِ سلوک کے پیکر تھے۔ انھوں نے ایک اکاڈمی (بیت العلوم) کی بنیاد ڈالی اور ادبی حلقے قائم کیے جن کے اراکین کی فہرست میں فضلائے زمانہ اور سرآمد روزگار ہستیوں کے نام ملتے ہیں۔ اس زمانے کے لحاظ سے ایک اعلیٰ اور ممتاز لائبریری احمد آباد میں قائم کی جہاں مختلف زبانوں اور علوم وفنون کی ہزارہا معیاری اور عدیم النظیر کتابیں جمع کی گئی تھیں۔

بزمِ مشاعرہ کو خانِ خاناں نے ہی فروغ دیا۔ صحت مند مقابلہ کے لیے مصرعۂ طرح کا اطلاق کر دیا جاتا تھا۔ مدعو شعرا تاریخ مقررہ پر جمع ہوتے اور قواعد وضوابط کے تحت شمع کی گردش کے ساتھ اپنا تازہ کلام سنجیدگی سے پڑھتے۔ اہلِ ذوق سنتے اور مناسب داد دیتے۔ خانِ خاناں نہ صرف یہ کہ خود شریک مشاعرہ ہو کر شعرا کی عزت افزائی کرتے بلکہ انعامات سے بھی نوازتے۔

ہندی شعرا کی سرپرستی

قدیم ہندی شاعری کے بانیوں میں عبدالرحیم خانِ خاناں کا اپنا مخصوص وممتاز مقام ہے۔ آسمان شاعری کے آفتاب یا ماہتاب یعنی گوسوامی تلسی داس رحیم کے ہم عصر تھے۔ دونوں میں کافی خوشگوار تعلقات تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی مفلس برہمن کو اپنی لڑکی کا عقد درپیش تھا۔ وہ غریب مالی امداد کی غرض سے گوسوامی جی کے پاس آیا۔ انھوں نے حسبِ ذیل الفاظ کے ساتھ اس کو خانِ خاناں کی خدمت میں بھیجا۔

ع ۔ سُرتیہ۔ نرتیہ۔ ناگ تیہ یہ چاہت سب کوئے

(ترجمہ: دیویاں ہوں، عورتیں ہوں یا ناگنیں سب کو بیٹی تو اچھی ہوتی ہے)

خانِ خاناں نے برہمن پر زر و جواہر اور لعل و زمرد کی بارش کر دی۔ علاوہ ازیں گوسوامی تلسی داس نے مصرعہ پر دوسرا مصرعہ لگا کر بیت مکمل کیا۔ مصرعۂ ثانی حسبِ ذیل ہے:

ع گود لیے ہلسی پھرے تلسی سو سُت ہوے

(ترجمہ: اولاد سے خوش ہوں اور تلسی جیسا بیٹا ہو سکے)

یہاں لفظ ہُلسی کے دو معنی ہوسکتے ہیں یعنی (۱) ہُلسی یعنی خوش و خرم (۲) تلسی داس کی ماں کا نام بھی ہُلسی تھا۔ انشا پردازانہ اور شاعرانہ ذوق کے حامل حضرات نے جہاں ان پر بے حساب زر کی بارش کی وہیں ہم عصر شاعروں کے انتخابِ الفاظ اور موزونیٔ طبع کی بھی داد دیا کرتے۔

بخشش قیمتی زر و جواہرات کے ساتھ خانِ خاناں کبھی بالاتر رہا۔ گیا۔ علاوہ ازیں زر و جواہرات سے عام لوگوں میں بھی تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ شاعروں اور اہلِ قلم کی ایک بڑی تعداد کو ان کی سرکار سے باقاعدہ تنخواہ اور وظیفے ملتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی آدمی نے پانچ سیر کا آہنی وزن خانِ خاناں کی سواری میں پھینک دیا۔ برق انداز فوراً حرکت میں آئے اور مرتکب کو گرفتار کر کے حاضر کیا۔ اہلِ دربار نے مجرم کے خلاف سزائے موت تجویز کیا مگر سیکر رحم و کرم عبدالرحیم خانِ خاناں نے نہ صرف یہ کہ خطا کار کو بالکل معاف کر دیا بلکہ اس کو لوہے کے برابر پانچ سیر زرِ خالص بھی بخشش میں دیا اور کہا:

آہن کہ بہ پارس آشنا شد فی الفور بہ صورتِ طلا شد

(ترجمہ: جو لوہا پارس سے چھو جاتا ہے وہ فوراً زرِ خالص بن جاتا ہے)

غرور و تکبر خانِ خاناں کے پاس سے ہو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ سب سے زیادہ انعام ۳۶ لاکھ کی رقم ہندی کے شاعر گنگ کو عطا کی تھی۔ انعام تفویض کرتے وقت خانِ خاناں محجوبانہ انداز سے ایک طرف کو جھکے ہوئے تھے۔ گنگ نے یہ بات دیکھی اور برمحل کہا:

سیکھے کہاں نواب جو ایسی دینی دین
جیوں جیوں کر اونچے کریں تیوں تیوں نیچے نین

(ترجمہ: نواب صاحب! آپ نے ایسا طرزِ سخاوت کہاں سے سیکھا۔ ہاتھ جتنے اونچے اٹھتے ہیں، نگاہیں اتنی ہی نیچی ہوتی جاتی ہیں)

اس پر خانِ خاناں نے برجستہ جواب دیا:

دین ہار کوئی اور ہے دیت ہے دن رین
لوگ بھرم مجھ پر کریں تا سے نیچے نین

(ترجمہ: بظاہر ہم دن رات بخشش کرتے ہیں۔ مگر دینے والا اصل میں کوئی اور (خدا) ہی ہے۔ لیکن لوگوں کو بھرم مجھ پر ہے لہٰذا (شرم سے) نگاہیں نیچی ہیں)

عبدالرحیم خانِ خاناں کی ان نوازشات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خود شاہانِ مغلیہ کی فیاضیاں اور جاگیر بخشیاں کس قدر بے حساب ہوں گی جو عموماً علماء، فضلاء، نیز شعراء اور اہلِ قلم پر بلا تحقیق نذر و ملت کیا کرتے تھے۔

بحیثیت مصنّف و شاعر

خانِ خاناں ایک کامیاب مترجم، بہترین صاحبِ اسلوب نثار اور اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ شہنشاہ بابر کے شاہکار یعنی خود نوشت سوانح "تزکِ بابری" کا ترجمہ ترکی سے فارسی میں کامیابی سے مکمل کر کے شائع کیا۔ اس فارسی ایڈیشن سے بعد کو اردو، انگریزی وغیرہ دیگر زبانوں میں بھی تزکِ بابری کے بے شمار تراجم ہوئے۔ اور اصل ترکی نسخہ کو پھر غالباً مترجمین نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اگر خانِ خاناں کا یہ کارنامہ عالمِ وجود میں نہ آتا تو بابر کے عہد کے بہت سے واقعات کی تو اصلیت ہی نہ معلوم ہوتی۔

علمِ ہیئت میں بھی خانِ خاناں کو کافی دسترس تھی۔ ایک مثنوی "کھیٹ کوتک" اس سلسلہ میں یادگار ہے جس میں التزام یہ ہے کہ پہلا مصرعہ فارسی میں ہے اور دوسرا مصرعہ یا بھاشا میں ہے یا سنسکرت میں۔ لطف یہ ہے کہ اس التزام کے ساتھ خامی کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ علاوہ ازیں ترکی و فارسی میں متعدد غزلیات، رباعیات اور دیگر ابیات بھی کہی ہیں۔ فارسی کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

غزل

شمارِ شوق ندانستہ ام کہ تا چنداست
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند است
نہ دام دانم و نے دانہ ایں قدر دانم
کہ پائے تا سرم ہر چہ ہست در بند است

ادائے حق محبت عنایتے ست ز دوست
دگرنہ خاطرِ عاشق بہ ہیچ خورسند است
بَکیشِ صدق و صفا حرفِ عہد بیکار است
نگاہِ اہل محبت تمام سوگند است
ازاں خوشم بہ سخنہائے دلکش تو رحیم
کہ اندکے بہ ادا ہائے دوست مانند است

(ترجمہ : (۱) مجھے اپنے اشتیاق کا علم نہیں کہ کس قدر ہے۔ بس اتنا ہی معلوم ہے کہ میرا دل انتہائی مشتاق ہے

(۲) نہ مجھے دام کی خبر ہے نہ دانہ سے غرض مجھے تو صرف اتنا علم ہے کہ سر سے پاؤں تک میرا تمام وجود ہی قید میں ہے۔

(۳) وفائے عہد تو دوست کی عین مہربانی ہے ورنہ دل عاشق تو اس کے ذرا سے التفات سے بھی خوش ہو سکتا ہے۔

(۴) رہ صدق و صفا میں عہد و پیمان کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اہل محبت کی نظر میں تمام قسم ہے۔

(۵) اے رحیم میں تمہارے دلفریب باتوں سے اسی لیے خوش ہوں کہ یہ کسی حد تک محبوب کی اداؤں سے مشابہ ہیں)

رحیم کی شاعری میں سادگی، روانی، بلاغت و فصاحت وغیرہ صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کا کلام "از دل ریزد بر دل خیزد" کا مصداق ہے۔ قلبی واردات اور خارجی کیفیات کو شاعر نے ارمغانِ نظر سے پر کیف بنا دیا ہے۔ رحیم کا کلام صوری اور بروے نائکا بھید کے مالامال ہے۔ بھاشا میں بروے اور بروے نائکا بھید کے علاوہ دوہوں میں عبدالرحیم خانِ خاناں کا ایک ارفع اور اعلیٰ مقام ہے۔ چھند بھی رحیم نے خوب کہے ہیں۔ خود کہتے ہیں ؎

کوِت کہیو، دوہا کہیو، تلے نہ چھپیے چھند
ورچیو یہی وچار کے رحیمن بروے چھند

(ترجمہ، رحیم کہتے ہیں کہ اگرچہ میں نے کوت، دوہا اور چھپے کہے مگر چونکہ وہ نگاہ میں نہ آئے لہذا بروے چھند موزوں کیے۔)

ہندی تصانیف

عبدالرحیم خانِ خاناں کو بھاشا کے ہر دو مروجہ اسلوب یعنی برج اور اودھی پر پورا عبور حاصل تھا۔ بروے نائکا بھید اودھی میں ہے۔ حالانکہ دوسری تصانیف میں عموماً برج بھاشا کا استعمال کیا ہے۔ ہندی تصانیف حسب ذیل ہیں :

۱۔ رحیم دوہاولی ۲۔ لاناسٹک ۳۔ شرنگار سورٹھ
۴۔ رس پنچادھیائے ۵۔ بروے نائکا بھید۔

ایک صاحب مسمی مایا شنکر یاگک نے خانِ خاناں کا ہندی کلیات "رحیم رتناولی" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ اقدام قابل تعریف ہے۔

آخری ایام میں عبدالرحیم خانِ خاناں کو بھی زبردست صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ سنہ ۱۶۲۰ء کے بعد دور انحطاط جھلکنے لگتا ہے۔ بڑے صاحبزادے ایرج کا انتقال ہوا ایک ہی سال کے بعد دوسرا لڑکا داراب داغِ مفارقت دے گیا۔ خان خاناں کی نواسی شاہ نواز خاں کی بیٹی شاہزادہ خرم کے عقد میں تھیں۔ ملکۂ نورجہاں کوشش میں تھی کہ اس کے داماد یعنی شہزادہ شہریار کو ولی عہد تسلیم کر لیا جائے۔ جبکہ خانِ خاناں اور آصف خاں شہزادہ خرم کی تائید میں تھے۔ ان حالات میں پے بہ پے پریشانیاں لاحق ہونے لگیں۔ ان ہی ایام میں خانِ خاناں نے جہانگیر کو ایک خط لکھا جو سہواً شاہ جہاں کے ہاتھ پڑ گیا۔ دراندازیاں جاری تھیں۔ جہانگیر اور شاہ جہاں دونوں نے سرد مہری اختیار کی مگر خانِ خاناں کو سزا کے بجائے اس بات کا رنج تھا کہ وہ لاچاری کے باعث کسی مستحق یا کسی اہل علم کی امداد اور سرپرستی کرنے سے قاصر تھے۔ ؎

رحیمن وے نر مر چکے جو کہیں مانگن جائیں
ان تے پہلے وے موے جن مکھ نکست نائیں

(ترجمہ : رحیم کہتے ہیں کہ وہ ہستیاں ختم ہوئیں جو دستِ سوال دراز کرنے کہیں نکلیں۔ اس سے بھی پہلے ان لوگوں کو مردہ سمجھا جائے جن کے منہ سے سوال پر نفی میں جواب ملے۔)

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ ان ہی حالات میں آخرکار داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ تاریخ وفات "خان سپہ سالار کو" سے سنہ ۱۰۳۶ھ برآمد ہوتی ہے۔ آخری آرام گاہ یعنی مقبرۂ خانِ خاناں نظام الدین شرقی نئی دہلی میں واقع ہے۔ جسے دیکھ کر تاریخ ہند کا ایک درخشاں باب نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

★

رشید عبدالسمیع جلیل

برق

برق افلاک پہ صدیوں سے جو لہراتی ہے
آن واحد میں چمک جاتی ہے بجھ جاتی ہے
ذہن انساں کو عطا کرتی ہے نا دیدہ خیال
برق ہو جاتی ہے پیدا بصد انداز جلال
مثبت و منفی حرارت کا تصادم ہے جہاں
زد میں آئی ہوئی ہر شے کو جلا کر نازاں
اک علامت ہے تباہی کی جلا کرتی ہے
سینۂ دہر پہ بے باک گرا کرتی ہے
رہ گزر جس کی مگر زیر سماوات بھی ہے
آشیاں زد میں ہے جس کی تو کوئی بات بھی ہے
برق پرشور علامت ہے چمک جانے کی
خطۂ ارض پہ زینت ہے یہ ویرانے کی
روشنی لے کے یہ چلتی ہے تو ناگن کی طرح
جب اترتی ہے زمیں پر تو ابھاگن کی طرح
برق اک حادثۂ نور بھی ہے زیر فلک
چمن دہر کی دشمن ہے ازل سے بے شک
یوں تو تاریخ کے اوراق پہ بکھرے ہیں ستم
خوف کے زیر اثر ہم نے تراشے ہیں صنم
برق سنگم ہے صداؤں کا مگر نور کے ساتھ
نسبت سوز مسلسل ہے جسے طور کے ساتھ
تیز اتنی کہ جسے وقت کبھی چھو نہ سکے
کتنے شعلوں کی لپک رکھتی ہے جب رقص کرے
کرۂ ارض پہ آدم کو ہدایت تو ملے
سوچتا ہوں کہ کبھی نور بصیرت تو ملے
برق محتاج ہے یا دل کی جو ٹکرا بھی سکیں
ربط باہم سے کبھی خود کو جو گرما بھی سکیں

نصیر ناطقی

غزل

چھلکنے دے مرے دل گفتگو کے پیمانے
ابھی نہ بھرنا مری آبرو کے پیمانے

ڈھلے ہوئے مرے الفاظ پائے گی دنیا
نپے ہوئے ہیں مری گفتگو کے پیمانے

بہار ساقی تو پرشکن ہے پھولوں میں
چمن کے ہاتھ میں ہیں رنگ و بو کے پیمانے

ابھی نہ چھیڑ ابل جائے گی وفا کی شراب
دل و جگر ہیں مری آرزو کے پیمانے

جو پوچھیے تو بتائیں گے جادۂ منزل
بنے ہیں نقش قدم جستجو کے پیمانے

جناب شیخ بتائیں ہمیں ملیں گے کہاں
نماز عشق کی خاطر وضو کے پیمانے

نصیر زاویۂ دشمنی نہیں باقی
جو ہم نے بدلے نگاہ عدو کے پیمانے

ڈاکٹر آصفہ زمانی

میر کے اشعار دل اور دلی کے مرثیے ہیں

جہاں سے دیکھیے یک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

میر کا فرمانا سچ ہے۔ لیکن ان کے دیوان میں "قیامت کا سا ہنگامہ" کیسے اور کیونکر برپا ہوا؟ یہ ہے وہ بنیادی سوال جس کے جائزے اور تجزیے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ بے شک ان کی یہ تنقید اپنے بارے میں صحیح تھی۔

یوں تو کسی شاعر کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس کا کلام کسی قدر معاون ہوتا ہے۔ لیکن شاعر کے ذہن اس کی فکر اور اس کے فن و ہنر کو درجہ بہ درجہ سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہم اس کے نجی ماحول، اس کے عہد کے سیاسی اور سماجی پس منظر پر نظر ڈالتے ہوئے اس کے ذہن کے تدریجی آتار چڑھاؤ کو سمجھیں۔ تب ہی ہم کسی شاعر کی شخصیت کی صحیح عکاسی کر سکتے ہیں۔

میر تقی میر کے ابتدائی حالات پر نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ میر نے بچپن ہی سے دکھوں اور غموں کے سائے میں پرورش پائی۔ سید امان اللہ جو ان کے درویش صفت والد کے معتقد تھے، میر کو اُن سے بڑی عقیدت اور اُنسیت تھی اور سچ تو یہ ہے کہ میر کی تمام تر تربیت سید صاحب کے زیر سایہ ہوئی۔ میر ابھی دس ہی برس کے تھے کہ سید امان اللہ کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد ان کے شفیق باپ نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس تربیت سانحے نے میر کے حساس دل پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ شومئ قسمت کہ وہ اپنے سوتیلے بڑے بھائی حافظ محمد حسن کے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کی کفالت میں دیے گئے۔ بڑے بھائی کی تحریک پر خان آرزو نے میر صاحب کو اس قدر اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائیں کہ وہ مکان کے دروازے بند کیے پڑے رہتے اسی وجہ سے ان کی حالت جنون کی سی ہو گئی۔ بے یاری اور لاچاری نے کبھی سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ زندگی کا شیرازہ یوں ہی منتشر رہا۔ اس پر مستزاد یہ کہ تیغ عشق کے بھی گھائل ہو گئے۔ مولوی عبدالسلام ندوی نے "بہار بے خزاں" کی روایت پر اس بات کی تصدیق کی ہے کہ میر صاحب تیغ عشق کے زخم خوردہ تھے اور ان کے دل پر ابتدا ہی سے یہ چرکہ لگ چکا تھا جو عمر بھر ان کے دل میں نشتر کی طرح کھٹکتا رہا۔ چنانچہ بہار بے خزاں میں درج ہے:

در بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزش بود در پردہ تعشق طبع میل خاطر داشت۔ آخر عشق او خاصہ مشک پیدا کردہ خواست کہ بجنبہ بچار سوے رسوائی می کند و حسن بے پردہ بجلوہ گری در آید از ننگ افشائے راز وطن دا قربا بائے بعنی پروردۂ حسرت و حرماں و باخطر ناشاد دست و گریباں قطع رشتہ حب وطن ساختہ از اکبر آباد بعد از خسارۃ بسیار از یہا شہر لکھنؤ رسید و ہمیں جا بصد حسرت و جانکاہ جلاوطنی و حرماں نصیبی از دیدار یار و دیار جاں بجہاں آفریں داد۔ تا بقید رشتۂ حیات بود۔ طوق محبت بہ گردن و سلسلۂ دیوانگی بپا داشت۔ از کلام عاشقانہ درد انگیزش

پیدا است کہ صد آرزو دیگاک پردہ دہ۔"

میر صاحب کے اشعار بھی در پردہ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں ؎

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

اس پر والد کی درویشانہ زندگی اور تلقین نے تازیانے کا کام کیا۔ ان کی یہ تلقین کہ "اے پسر عشق بورز عشق است کہ درین کارخانہ متصرف است۔ اگر عشق نمی بود نظم کل صورت نمی بست۔ بے عشق زندگی وبال ست دل باختۂ عشق بودن کمال ست عشق بسازد عشق بسوزد۔ در عالم ہرچہ ہست ظہور عشق است ... بے عشق نباید بود۔ بے عشق نباید زیست۔"

چنانچہ میر صاحب کو چہار سو عشق ہی عشق نظر آنے لگا ؎

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے
اب عشق بھر رہا ہے زمین آسمان میں

کلام میں درد و سوز پیدا کرنے کے لیے یہی حالات کیا کم تھے کہ دلی بھی آفات کا نشانہ بن گئی۔ جس وقت میر نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا، دلی کی تاریخ ایک خاص اہمیت کی حامل تھی مغلیہ سلطنت کا اقبال جواب دے چکا تھا کبھی نادر شاہ کی یورش تھی تو کبھی احمد شاہ درانی کا یلغار، ایک طرف مرہٹوں اور جاٹوں کے حملے تھے تو دوسری طرف روہیلوں کی دست برد اور غارت گری۔ غرض ہر طرف انسانی خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی، خود غرضی کا ماحول گرم تھا۔ انسان انسان کے خون کا پیاسا تھا۔ خاندان تباہ اور برباد ہو رہے تھے۔ ان حالات کا میر نے کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ ان پر بے ثباتی دنیا کا راز فاش ہو چکا تھا ؎

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

کہا میں نے گل سے ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

ان کا دل خون کے آنسو رو پڑا۔ وہ ایک نفس سرد بلند کرنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے تھے ؎

بہت سعی کیجیے تو مر رہیے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

ہماری تو گذری اسی طور پہ
یہی نالہ کرتے یہی زاریاں

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دل

میر نے اگر خود اپنی آنکھوں سے دلی کی تباہی نہ دیکھی ہوتی تو ایسے اشعار کبھی نہیں کہہ سکتے تھے ؎

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

ان نجی اور خارجی حالات کے پیش نظر میر کا دل میر کا ذہن میر کے خیالات تصورات یہاں تک کہ میر کی ساری زندگی ایک زخم بن کر رہ گئی۔ ایسا زخم جو ناسور کی شکل اختیار کر گیا اور جو زندگی بھر اشعار کے روپ میں رستا رہا۔ ان کے ذہن کا اندازہ ایک بے کراں اور لامتناہی تا حد نظر پھیلے ہوئے سمندر سے کیجیے جو اوپر سے دیکھنے پر پرسکون اور بے شور دکھائی پڑتا ہے لیکن ذرا اس کے اندر جھانک کر دیکھیے تو نیچے ہزاروں بے چین اور مچلتی ہوئی لہریں موج زن نظر آئیں گی اور ایک تلاطم سا برپا دکھائی دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بظاہر سلیس نظر آنے والے میر کے ان اشعار کے پیچھے قیامت کا شور، غضب کا درد اور بے پناہ غم چھپا ہوتا ہے، جو ہر دردمند دل کو بے اختیار تڑپا دیتا ہے اور جو بہ قول غالب ہر پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے "کہ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔"

چونکہ میر کے رگ و ریشے میں نا امیدی اور محرومی نصیبی سمائی ہوئی
تھی لہذا مسرت بھرے اشعار وہ کہاں سے لا سکتے تھے یہی
وجہ ہے کہ میر کے اشعار ان کی آپ بیتی کا ایک مرثیہ ہیں جن
میں غم و درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ لیکن ایک خاص چیز
جو میر کے یہاں نظر آتی ہے وہ یہ کہ ان کے اشعار میں درد لاکھ
سہی لیکن ان کے غم میں یاس یا قنوطیت کی صورت نہیں یہی
وجہ ہے کہ ان کا غم ایک صحت مند غم کی صورت میں جلوہ گر
ہوتا ہے۔ میر کے یہاں یاسیت آ بھی کیسے سکتی تھی اس لیے
کہ میر نے خود غم اٹھائے تھے اور جو دکھ اٹھاتے ہیں وہ مایوس
کبھی نہیں ہوتے، مایوس تو وہ ہوتے ہیں جو مادی مال و متاع
کی ہوس رکھتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو دنیاوی
مسرتوں سے کبھی سیر نہیں ہوتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر ہر دم ایک
یاس و نا امیدی اور امید و بیم کی سی کیفیت طاری رہتی ہے،
ایک قنوطیت کا سا رنگ غالب رہتا ہے۔ لیکن میر کے اس
غم میں قنوطیت کا نام و نشان نہیں بہ الفاظ دیگر یاسیت نہیں۔
یاس تو زندگی کے لیے زہر ہلاہل ہے لیکن غم — غم زندگی کے
لیے امرت ہے۔ اس لیے کہ

موجِ غم پہ رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

وہ زندگی جو دنیا میں حسین ترین چیز ہے۔ میر نے بھی زندگی کو
سب سے بڑا حسن مانا ہے اور جس کے اشعار زندگی سے لبریز
ہوں، زندگی سے بھرپور ہوں اس کے یہاں قنوطیت کا تصور ہی
نہیں کیا جا سکتا ہے

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

یہ ہے میر کے یہاں زندگی کا جوش و خروش — جاوداں پیہم
رواں، ہر دم جوان نظر آنے والی چیز — اور زندگی متحرک کرنے
والا، اس کے حسن کو دوبالا کرنے والا، اس پہ نکھار لانے والا
بنیادی نقطہ میر کے خیال میں غم ہے — ایک بڑے نقاد کا کہنا
ہے کہ "غم انسانی زندگی کی مستقل اور ضروری چیز ہے اور مسرت
ایک سطحی چیز —" جب یہ غم عالم گیر ہو کر ایک عالم گیر احساس
کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو لوگوں پر چھا جاتا ہے —
میر کا غم بھی عالم گیر غم تھا تو پھر بھلا حساس دل کیونکر اس کی لپیٹ
میں آنے سے بچ پاتے۔ بہ قول آل احمد سرور۔

"میر نے غمِ عشق اور غمِ آفاقی پر مردانہ وار قلم اٹھایا ہے وہ
ڈوب کر بھی ابھرتا ہے اور مرنے کے بعد بھی آگے بڑھنے کا
عزم رکھتا ہے، ان کے یہاں جو غم ہے وہ لازمۂ زندگی ہے
ان کے یہاں جو سوز ہے اس کے بغیر زندگی ویران ہے۔"

ادب کا کام ہے عوام کو بیدار کرنا، ان کے نازک احساسات
کو ابھارنا اور ان باتوں کے لیے پُر اثر فن کی ضرورت ہوتی ہے
— اور غم اثر پیدا کرنے کا سب سے بڑا آلہ ہے — اگر میر
کے یہ پردرد نالے بلند نہ ہوتے تو آج انسانی ذہن کے بہت سے
احساسات سوتے پڑے رہتے۔ میر اپنے غم کے اظہار کے لیے
مجبور ہیں اس لیے کہ انھیں آنے والی نسلوں کو ایک نئی راہ
دکھانا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میر کے یہاں اس غم کا خاص سبب
کیا تھا —؟ — پہلی بات تو یہ کہ حساس شاعر ایک خاص
طرح کا نظامِ حیات دل ہی دل میں چاہتا رہا — فن کار آواز
بلند کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ تنہا تھا اور فن کار کا یہ اکیلا پن
خواہشوں کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا —

میر کو کچھ لوگوں نے "بد دماغ" اور "نازک مزاج" جیسے
خطابات سے نوازا ہے۔ اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے
تو یہ چیز بھی ان کی "تنہائی" کا نتیجہ تھی۔ ذرا انصاف کی ترازو
پر تول کر دیکھیے کہ "ایک درد مند انسان تنہا اتنے سانحات
اور واقعات دیکھنے اور برداشت کرنے کے بعد اگر بد دماغ
نہ ہو سکے تو یقیناً اس کی شخصیت میں کوئی کمی ہے۔ جب
فقر و فاقے کا سامنا ہو تو وضع داری نبھانے میں نازک مزاجی
کا پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ اگرچہ ان کی آشفتہ مزاجی سے

انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ ابال اسی جگہ آتا ہے جب ان میں احساس انفرادیت پیدا ہوتا ہے۔ ایک فن کار کے سامنے اس کی ایک تخیلی دنیا ہوتی ہے جہاں وہ انصاف چاہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اخلاقی قدریں اور اخلاقی معیار بلند ہوں لیکن جب وہ اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے تو اسے رنجیدہ خاطر ہو جاتا ہے۔ اس کو جب یہ احساس ہوتا ہے کہ "مجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے" تو بد دماغی کا عود کر آنا فطری بات ہے۔ وہ اپنی اس کمزوری سے خود بھی واقف ہیں چنانچہ اپنے بعض اشعار میں اس کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میرؔ بے دماغ
ازبس کہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

—

ہر چند میرؔ بستی کے لوگوں سے ہے نفور
پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

—

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

—

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں دم نکل گیا

—

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میرؔ جی
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں

اس بد دماغی اور نازک مزاجی کے ہوتے ہوئے وہ جتنا بھی شعلہ خو ہوتے کم تھا۔ ان کو تو بلا کا غصہ ور، تند مزاج اور ایک دم برس پڑنے والے کردار کا مالک ہونا چاہیے تھا، لیکن میرؔ کے کردار کا یہ کس قدر بلند پہلو ہے کہ اس بد دماغی اور نازک مزاجی کے سائے تلے ہمیں ان کے یہاں ایک دھیما پن نظر آتا ہے۔ یہی وہ خاص عنصر ہے جس کی بنا پر شاعری کو "جزو پیغمبری" اور شاعر کو "پیغمبر سخن" جیسے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ پیغمبروں کے لہجے میں دھیما پن اور نرمی کا عنصر ہر وقت اور ہر جگہ غالب رہتا ہے اگرچہ طبیعت میں استقامت سرد کی سی رہتی ہے۔ میرؔ کے یہاں یہ ساری خصوصیات موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں "پیغمبر سخن" جیسے خطاب سے نوازا گیا۔ آپ خود دیکھیے اور غور کیجیے، اس کا لہجہ کس قدر مظلوم ہے لیکن ثابت قدمی کس قدر زبردست ؎

مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے
کل تک تو یہی میرؔ خرابات نشیں تھا

"آ کے وہاں سے" کس قدر پیارا لہجہ ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

میرؔ کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

یہاں "کب کا" کس قدر برمحل اور مناسب ہے۔

"غم" کے عنصر کے وجود پذیر ہونے کا دوسرا سب سے بڑا سبب ہے "دردمندی"۔ میرؔ ایک دردمند دل لے کر دنیا میں آئے تھے۔ نجی حالات اور خارجی واقعات نے انھیں اور بھی تلخ کر دیا۔ میرؔ نہایت غیور اور ایک خوددار شخص تھے۔ خودداری کو برقرار رکھنے کے لیے انھیں اپنے اصول زندگی کو چھوڑنا گوارا نہ تھا۔ قناعت اور کم آمیزی ان کی شان تھی۔ بے نیازی، دردمندی اور عاشقانہ تڑپ نے مل کر ان کے "غموں" کو اور سوا جاگر کر دیا۔

میرؔ کے رازِ غم کو سمجھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ میرؔ نے شاعری میں صرف آنسو ہی نہیں بہائے ہیں بلکہ احساس بیداری پیدا کرنے اور انسان کے لیے اپنے وقار کو

قائم رکھنے کی راہیں دکھائی ہیں۔ شبلی کے یہ سطور ان کے حسب حال ہیں "حرماں نصیب لوگ غلطی سے گہوارۂ شعر میں ڈال دیے جاتے ہیں جو مصیبت تو خود جھیلتے ہیں مگر وہی مصیبت نظم میں دوسروں کو سناتے ہیں۔" اور یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے "اپنی مصیبت سنا کر" انسانی قدروں کو بلند کرنے کے راستے بتائے ہیں۔ ان کے "بہتر نشتر" نے زندگی اور اخلاقی معیار کو بلند کرنے میں ہماری رہنمائی کی ہے۔

مختصراً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ میر نے اپنی نجی محرومی کو تاریخی سانحات اور محرومیوں کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا کہ ایک عالم ان کی شخصیت میں دل جیسی لینے پر مجبور ہو گیا۔ چونکہ انھوں نے دل اور دلی کے حالات میں ایک یکسانیت سی پیدا کر دی ہے لہذا ان تصورات سے جو اشعار نکلے وہ کچھ اس طرح ظہور پذیر ہوئے ؎

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

روشن ہے اس طرح دل ویراں میں داغ ایک
اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

دل اور دلی کے حالات میں مطابقت اور دونوں کی خرابی کی وجہ سے ایک دوسرے سے یکسانیت اس شعر میں اور زیادہ صاف نظر آتی ہے ؎

دل و دلی دونوں ہیں گرچہ خراب
پہ کچھ لطف اس اجڑے نگر میں بھی ہیں

پھر بھی دل، دل ہی ہے۔ جو ایک بار اُجڑ کر بھلا کیسے آباد ہو سکتا ہے ؎

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کے

اس مختصر سے تجزیے کے بعد ہم کو ایک حد تک یہ ماننے میں دشواری نہ ہونا چاہیے کہ میر کے اشعار دل اور دلی کے مرثیے ہیں۔ اگرچہ یہ بات ان کے پورے کلام پر صادق نہیں آتی۔ کیونکہ میر ہر میدان کے شہسوار ہیں۔ ان کی آنکھوں سے جہاں لہو کی بوندیں ٹپکی ہیں وہاں ان کے منہ سے محبت کے پھول بھی برسے ہیں۔ غرض ان کا کلام رنگ برنگ کے پھولوں سے آراستہ ایک ایسا گلدستہ ہے جس کا ہر لفظ اپنی جگہ موزوں اور مناسب ہے۔

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

★

نیا دور کے قلمی معاونین سے

ازراہِ کرم اپنی تخلیقات کے شروع میں یا آخر میں اپنا مکمل پتہ ضرور تحریر فرمائیں۔ ناطلبیدہ مضمون، افسانہ، غزل یا نظم کی ایک نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔ اگر واپسی کے لیے ڈاک لفافہ یا ٹکٹ ساتھ میں موصول نہ ہوں گے تو ان کی واپسی کی ذمہ داری ادارہ پر نہ ہوگی۔

غزلیں

پیام سہالوی

مسرت آشنا ہر منزلِ آلام ہو جائے
جو تیرا اک اشارہ بھی شریکِ جام ہو جائے

بڑی امیدیں وابستہ ہیں دل کو تجھ سے اے ساقی
خدارا اک نظر ہونے دلِ ناکام ہو جائے

بہت نادان نظر آتا ہے سورج اپنی کرنوں پر
ذرا بکھرا دو اپنے گیسوؤں کو شام ہو جائے

مقدر تو بہانہ ڈھونڈتا ہے رخ بدلنے کو
اشارہ آپ کر دیں اور اپنا کام ہو جائے

وہ دیوانہ کہاں جائے بتا اے واعظِ ناداں
دوراہے پر جسے دیر و حرم کی شام ہو جائے

پیام آج ان کی مست آنکھوں کا عالم اور ہی کچھ ہے
بہت ممکن ہے توبہ آج نذرِ جام ہو جائے

شہباز انجم اٹاوی

ہوتی ہر خوشی دل کو تو مل جاتے ہیں غم بھی
دنیائے محبت میں کرم بھی ہیں ستم بھی

پیمانۂ دل سے نہیں بڑھ پائے گا ہرگز
آجائے مقابل میں اگر ساغرِ جم بھی

پی کر بھی مرے ہوش سلامت ہیں وگرنہ
کچھ لوگ تو کھو دیتے ہیں رندی کا بھرم بھی

رندوں نے ٹھہر جانا مناسب نہیں سمجھا
رستے میں نظر آئے تو نکلے دیر و حرم بھی

فکر میں ڈوبا ہوں کہاں سر کو جھکاؤں
ہے سامنے کعبہ بھی ترا نقشِ قدم بھی

ہم سے وہ بہر دست گریزاں تو ہیں لیکن
اے حضرتِ انجم بڑے خوددار ہیں ہم بھی

ھادی امان آبادی

یہ غم انگیز ہے کیفیت دردِ نہاں میری
کہ ان سے بھی سنی جاتی نہیں اب داستاں میری

بڑے جگر میں رکھتی ہے اسے آہ و فغاں میری
شکایت کرنے والا ہے زمیں سے آسماں میری

بیانِ سوزشِ پنہاں ارے توبہ ارے توبہ
زبانِ شمع ہے گویا مرے منہ میں زباں میری

چلی آتی ہیں ہمدم نزع میں کیوں ہچکیاں مجھ کو
خداوندا یہ کس کو یاد آئی ناگہاں میری

جلایا بھی اگر آہوں نے گردوں کو تو کیا حاصل
مزا جب تھا کہ گرتیں خود مجھی پہ بجلیاں میری

دکھا دوں چیر کے پہلو تو اپنے دل کے زخموں کو
مگر وہ بدگماں سمجھے گا رنگ آمیزیاں میری

زمانہ ہو گیا گزرے ہوئے صحرائے وحشت سے
مگر اب تک زبانِ خار پہ ہے داستاں میری

گلِ ویرانہ کا ہوتا ہے پرساں کون اے ہادی
تعجب کیا اگر دنیا نہیں ہے قدرداں میری

از نیّر مرادآبادی

(مزاحیہ)

کیا شادی ایک بھیانک غلطی ہے

امریکہ کے مشہور طنز نگار اور بذلہ سنج ڈان ہیرالڈ نے اپنی ازدواجی زندگی سے کچھ نتائج اخذ کرکے انکشاف کیا ہے کہ شادی نوجوانی کی ایک ایسی غلطی ہے جس کا ارتکاب ہر کسی کو کرنا چاہیے! لیکن ہم ڈان کے انکشاف کے نصف حصے کے خلاف پرزور احتجاج کرتے ہیں ـــ شادی نوجوانی کی غلطی ہے، اس میں تو شک وشبہ کی قطعی گنجائش ہی نہیں ہے۔ لیکن اس غلطی کے ارتکاب کرنے کا مشورہ مردوں کو بے وقوف اور عورتوں کو عقلمند بنانے کی کھلی سازش ہے۔ کیونکہ عصر رواں میں نئی نسل کے نوجوان لڑکوں کی بہترین ہابی بیوقوف بننا بھی ہے ـــ مثلاً، اگر کسی بدقسمت لڑکے کی نظر سرراہ چلتے چلتے ہی بھی کسی معمولی لڑکی سے بھی ٹکرا جاتی ہے تو وہ فلمی ہیرو کی طرح خواہش کرتا ہے "خدایا! اگر میری شادی ہو تو اسی لڑکی سے ہو" اور پھر شادی اتنی جلد ہو جاتی ہے جیسے بندوق سے بلا تامل اور بے سوچے سمجھے گولی چھوٹتی ہے۔ بعد میں اسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے اپنے سینہ پر بندوق کی نال جمالی ہو اور کہہ رہا ہو "ہاں، گولی چلاؤ!" اور یقیناً یہ گولی اس کے اور اس کی بیوی کے جیتے جی اس کے کلیجے پہ چلتی رہتی ہے۔ اس گولی سے شاذونادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی احمق داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دے، بلکہ وہ یکے بعد دیگرے گولیاں کھاتا رہتا ہے، تڑپتا رہتا ہے، ایڑیاں رگڑتا رہتا ہے اور سسکتا رہتا ہے۔ لیکن موت کی نظر عنایت نہیں ہوتی اس پر اسی کشمکش کے دوران میں اگر کوئی خوش نصیب بے وقوف عالم بالا کا ٹکٹ کٹا بھی لے تو معجزہ ـــ سمجھئے معبود حقیقی کا! اس کا سیدھا کریڈٹ میری عقل ناقص میں موجودہ اعلیٰ مخلوط تعلیم کو پہنچتا ہے۔

اکثر لڑکیاں (اعلیٰ تعلیم یافتہ) بیویاں بننے کے اگلے دن بعد ہی بصد خلوص اعلان فرما دیتی ہیں کہ وہ امور خانہ داری کے عملی میدان کی شہسوار ہونے کے سوا ہر میدان میں یکتا ہیں۔ اس کا عام فہم لب لباب یہی نکلتا ہے کہ میاں جی روٹی ہانڈی سے لے کر سینے پرونے کے کام تک کو اپنے دست مبارک سے انجام دیں۔ ہمارے ترقی پذیر ملک میں اب پیچیدہ مسئلہ کا حل بھی نکل آیا ہے: طعام وناشتے کے لیے ہوٹل، سلائی کڑھائی کے لیے درزی کی دکانیں سرزمین وطن کے چپے چپے پر موجود ہیں۔ لیکن اس حل کو کھنگالا جائے تو اس کی تہہ میں منہ چھپائے ایک مسئلہ لاینحل اوندھا پڑا ملے گا، وہ یہ کہ ہمارے دیس کی فی کس انکم اتنی کم ہے کہ ایک مرد عورت کی بھاری زندگی کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتا، کجا ہوٹلوں اور دکانوں کے بھاری بھرکم بلوں کی ادائیگی کا بار! ہاں امریکہ جیسے ملک کی طرز معاشرت کے لیے اس مسئلے کی کوئی اہمیت نہیں ہے ـــ ہمیں یاد ہے کہ ایک بار ہم حکومت کے خرچ پر امریکہ گئے۔ وہاں ایک غریب مزدور کے غریب خانے پر بھی جانے کی سعادت حاصل ہوئی تو اس نے ہمیں اپنا جدید طرز کا باورچی خانہ دکھایا۔ برقی چولہا، برتن صاف کرنے کی مشین اور اسی قسم کے دیگر ساز وسامان نے ہماری عقل کو زچ کر دیا۔ اس کے بعد وہ کہنے لگا: "آیئے ہوٹل میں چل کر کھانا کھائیں" جبکہ اسکی بانجھ بیوی گھر پر ہی استراحت فرما رہی تھی۔

اگر بیوی بے وقوف یا بدصورت ہو (ایسا بہت کم ہوتا ہے) تو کسی نہ کسی

طرح زندگی کی گاڑی لڑھکتی ہی رہتی ہے لیکن اگر بیوی عقلمند اور تیز طرار ہو اور شوہر معصوم یا بدھو یا گاؤدی ہو تو اس کی وقعت بیوی کی نظر میں اُرد پر سفیدی کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں ہم اپنے ایک پہلوان دوست کو بطور گواہ پیش کرتے ہیں ــــ انھوں نے ایک بار بتایا۔ "وہ میرا مقابلہ کالو پہلوان سے کیا جاتا ہے جسے میں بارہا شکست دے چکا ہوں"۔ ہم نے حیرت سے آنکھوں کو پھاڑ کر پوچھا، "کون کرتا ہے یہ مقابلہ؟" انھوں نے بڑے بھولپن سے جواب دیا۔ "میری بیوی، وہ کالو کو ترجیح دیتی ہے!" لگے ہاتھوں ایک گواہی اور بھی خدمت میں ہے ــــ

ایک دن کسی گاؤدی مرد کی تیز طرار بیوی گھر میں اکیلی تھی۔ رات کے آخری پہر میں ایک چور گھر میں گھس آیا۔ بیوی نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھایا اور بیلن سے چور کی اتنی مرمت کی کہ وہ تڑکے تک بیہوش پڑا رہا۔ علی الصبح اس کے شوہر نے آکر بہادر بیوی کو شاباشی دی تو وہ جل بھن کر بولی۔ "میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ تم اتنی رات گئے آوارہ گردی کر کے لوٹے ہو!" ــــ یا اگر ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانا مقصود ہی ہو تو شوہر کو کان دبا کر بیوی کی امیدوں پر تادم آخر پورا اترتے رہنا چاہیئے، ورنہ وہ شوہر کو اپنی نگاہ سے کم مایہ آنسو کی طرح گرا دیتی ہے ــــ ہمیں ایک بار تندرست و توانا مرد کی کالی کلوٹی بیوی نے بتایا۔ "میں نے اپنے شوہر سے طلاق صرف اس لیئے لی ہے کہ وہ ہمیشہ گھریلو کاموں کے بارے میں شکایتیں کرتا رہتا، جبکہ وہ خود ہی سارے گھریلو کام اُجڈ پن سے کیا کرتا تھا اور روٹی تو اس نے کبھی ڈھنگ کی پکائی ہی نہیں، کام چور موا تھا کمبخت!"

آج کل آرائشی لوازمات اور بیوٹی پارلروں سے متعلق نت نئی فرمائشیں بالخصوص نئی بیوی کی اور بالعموم پرانی بیوی کی اس قدر شدت اختیار کر گئی ہیں کہ بے چارہ ستم رسیدہ (شادی شدہ) مرد خود کو اقتصادی کرائسس کا شکار محسوس کرنے لگتا ہے۔ بہت سے مفلوک الحال شوہروں سے ملاقاتوں کے دوران میں علم ہوا کہ بہت سی فیشن ایبل لڑکیاں تو شادی کو بھی فیشن تصور کرتی ہیں اور وہ صرف اپنی فرمائشوں کو ہی پورا کرانے کے چکر میں شادیاں کرتی ہیں ــــ ایک صاحب کی گواہی اس سلسلے میں قلمبند کی جاتی ہے ... انھوں نے اپنی محبوبہ کے سامنے شادی کی تجویز پیش کی تو وہ کھل کر بولی، "واہ! آپ نے تو میرے دل کی بات چھین لی ــــ پھر تو مزے آجائیں گے میرے!" ان صاحب نے پوچھا، "وہ کیسے؟" اس نے پہلے سے بھی زیادہ خوش ہو کر جواب دیا، "اس طرح کہ صرافوں، بزازوں اور میک اپ کا سامان فروخت کرنے والوں کی ساری دوکانیں اور سیر و تفریح کے مقامات آپ کے دیکھے ہوئے ہیں!" ــــ جب کنواری لڑکی کی شادی سے پہلے حالت یہ ہو تو آپ ہی بتایئے، مرد کی شادی بھیانک غلطی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟

اگر شادی کا مطلب اور مقصد پیار و محبت کی دولت سمیٹنا ہے تو اس سے متعلق ہمارے ایک شادی شدہ دوست کا تجربہ بطور تبرک حاضر ہے۔ ہمارے دوست انگیجمنٹ ہونے کے بعد اپنی الاٹیڈ بیوی (ALOTTED WIFE) سے چھپ چھپ کر ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ تحائف پیش کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اس کی فرمائش پر ایک سوتی ساڑی خرید کر دی جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی اسی لیے اس نے ہمارے دوست کو ہدایت کی کہ اس کے مرنے کے بعد وہ اس کے جسم کو اسی ساڑی سے کفنائے۔ لیکن یقین کیجیے کہ وہ پیار کی نشانی (ہمارے) شادی کے بعد بچوں کی گندگی صاف کرنے کے کام آرہی تھی اور شوہر، نامدار کو صرف بچوں کو چومنے چاٹنے کی ہی کھلی آزادی تھی ــــ!

مندرجہ بالا چند حقائق کی روشنی میں اگر ہم اپنی عقل کا جائزہ لیں تو پتہ چل جائے گا کہ شادی (بالخصوص مرد کی) ایک ایسی بھیانک غلطی ہے جس کا ارتکاب بھول کر بھی کیا خواب میں بھی نہیں کرنا چاہیئے ــــ! ان کے علاوہ کچھ اور روشن حقائق بھی ہیں جو ہمارے اس سنہرے قول پر سہاگے کا کام کر سکتے ہیں لیکن مضمون کی طوالت کے باعث ہم سردست انھیں اپنے سروے کی رپورٹ میں ہی (صیغۂ راز میں) محفوظ رکھتے ہیں۔

آخر میں آپ کو یہ جان کر شاید مسرت نہ ہو کہ ہم نے مندرجہ بالا مضمون اپنی شادی سے بہت پہلے سپرد قلم کیا تھا جب ہم کانوں کے کچے اور پیٹ کے ہلکے تھے۔ اب ہم ایک عدد نیک سیرت، باصلاحیت سلیقہ شعار، پردہ دار، سعادت اثار اور وفادار بیوی کے تنہا شوہر اور

ذو بچوں کے اکلوتے باپ ہیں ہمارا ذاتی تجربہ گواہ ہے کہ ازدواجی زندگی خواہ لاکھ جہنم ہو پھر بھی اس سے ناقابل بیان فرحت بخش سکون، آسودگی اور اطمینان بھی میسر آتا ہے جو غیر شادی شدہ لوگوں کی زندگی کو شاید کبھی نصیب نہیں ہو سکتا ـــــ لیکن ان نعمتوں کے حصول کے لیے شرط یہ ہے کہ بیوی ہماری جیسی مثالی سیرت و شخصیت کی حامل ہونی چاہیئے! یوں بھی زندگی بہ مسلسل، امواجِ حوادث سے تھپیڑا گزرنے کا نام ہے سہ

گزرتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اس تمام مغز زنی اور تجربات کے پٹارے کو کھولنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح سامنے آئی کہ شادی ایک ایسا پھل ہے جسے چکھنے والا بھی پچھتاتا ہے اور نہ چکھنے والا بھی! اس قول کو تولنے کے لیے شادی کرنا بہت ضروری ہے، کیونکہ سطحِ آب پر تیرنے والی خوبصورت مچھلی کو سمندر کی گہرائی کا کیا علم!

اس لیے ہم نے بھی اب ڈان کی آواز میں آواز ملانا شروع کر دی ہے کہ شادی نوجوانی کی ایک ایسی غلطی ہے جس کا ارتکاب بہت سوچ سمجھ کر ہر کسی کو کرنا چاہیئے ـــــ اگر اب ہمارے سامنے کوئی صاحب اپنی بیگم کا دکھڑا لے کر بیٹھتے بھی ہیں تو ہم نوٹس نہیں لیتے اور یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ تالی دونوں ہی ہاتھوں سے بجتی ہے یا جب دو یا دو سے زیادہ برتن ایک جگہ اکٹھے ہوں تو وہ آپس میں ضرور ٹکراتے ہیں اور ان میں آواز بھی پیدا ہوتی ہے۔"

★

خسرو نمبر

تاثرات کے آئینے میں

نارا چرن رستوگی (رگوہانٹ آسام)

نیا دور لکھنؤ کے خصوصی نمبر بالعموم اہمیت و دلکشی کے حامل ہوتے ہیں۔ آپ نے اس روایت میں خسرو نمبر کا وقیع اضافہ کیا ہے "تلفظ ایرانی و اشعار امیر خسرو" بہت ٹھوس مضمون ہے، تحقیق قابلِ داد ہے۔ دوسرے مضامین بھی خاصے اچھے ہیں مگر نظمیں بس نظمیں ہی ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ امیر خسرو جیسے ہمہ صفات شخصیت کا احاطہ نظم میں کر لینا آسان ہے بھی نہیں۔ آپ کا نمبر بہت شاندار ہے۔ آپ کی محنت، عقیدت و قابلیت قابلِ صد ستائش ہیں۔

وقار خلیل (حیدرآباد)

"نیا دور" کا خسرو نمبر بلا شبہ خسرو صدی کی اہم ادبی دستاویز ہے۔ ہر آنکہ یہ شمارہ آپ کے حسنِ ادارت کی آبرو اور اردو ادب نیز خسرو شناسی کی جان ہے۔ دلی مبارکباد میں۔

رحمان مین پوری (کانپور)

اتنا حسین جامع و نافع نمبر شائع کرنے پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ یقیناً نیا دور آپ کے زیرِ ادارت مائل بہ ارتقا ہے۔ امیر خسرو نمبر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ نثری مواد تو بہت عمدہ ہے ہی مگر منظوم نظم بھی کم وقیع نہیں۔ یہ گرانقدر اور قابلِ فخر کارنامہ اربابِ علم و فن کی نظر میں تاریخی اہمیت کا حامل ہوگا۔ ایسا میرا یقین بلکہ یقینِ کامل ہے۔

نیلی لکھنوی (لکھنؤ)

نیا دور کا خسرو نمبر نظر نواز ہوا۔ اردو ادب کی دنیا میں اس نمبر کی اشاعت ایک ایسی بے مثل تاریخی دستاویز ہے جس سے اردو ادب کا چمن ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ اس نمبر کی اشاعت آپ کی بے پایاں محنت، خوش سلیقگی اور کاوشوں کا نتیجہ ہے میں آپ کو اور ادارہ نیا دور کو اس شاندار کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

★

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

پنچایت اداروں کو مزید اختیارات دینے پر غور و خوض • • • پینے کے پانی کے لیے ہنگامی اسکیم کا نفاذ • • • اتر پردیش کے مشترکہ زمرہ میں آٹھ کتائی ملوں کا قیام • • • مشترکہ زمرہ میں آکسیجن گیس پلانٹ کا قیام • • • عارضی پنشن کی مدت میں توسیع • • • ۵۰۰ سے زیادہ ڈاکٹروں کی جلد تقرری کا فیصلہ • • • اتر پردیش گنا بیج اور ترقیاتی کارپوریشن کا قیام • • • اقوام مندرجہ فہرست کی طلبا کی فیس معاف • • • چھوٹی صنعتوں کے لیے ۲۵ کروڑ روپیہ۔

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے کہا کہ حکومت پنچایت راج اداروں کو مزید اختیارات دینے کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے تاکہ انھیں ریاست میں تیزی سے سماجی اور معاشی انقلاب لانے کے سلسلے میں زیادہ موثر اور اہم رول ادا کرنے کے قابل بنایا جا سکے۔ وزیر اعلیٰ نے رومندرالیہ میں دوروزہ ساتویں ریاستی پنچایتی راج کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اتر پردیش کے مستقبل کا بڑی حد تک انحصار بجلی کی پیداوار، مزید وسائل کی دستیابی اور گاؤں پنچایتوں کو مزید اختیارات کی منظوری پر ہے جنھیں ہمارے جمہوری نظام میں ایک اہم مقام حاصل ہے اور جو سماجی انقلاب لانے کا موثر ذریعہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اتر پردیش پنچایتی راج ایکٹ اور چھیتر سمیتیوں اور ضلع پریشدوں سے متعلق ایک ایکٹ میں ضروری ترمیمات کی جائیں گی تاکہ گاؤں سبھاؤں، چھیتر سمیتیوں اور ضلع پریشدوں کو مزید اختیارات دیے جا سکیں۔

❖ ❖ ❖

اتر پردیش کابینہ نے جس کا جلسہ وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کی صدارت میں منعقد ہوا، ریاست کے سات اضلاع میں اس سال موسم گرما کے دوران پینے کے پانی کی سہولتیں فراہم کرنے کے سلسلے میں ایک ہنگامی اسکیم کی منظوری دے دی ہے۔

اس اسکیم کے دائرہ عمل میں وارانسی، غازی پور، مرزاپور، جونپور، الہ آباد، باندہ اور ہمیرپور اضلاع کے وہ علاقے آئیں گے جو موسم سرما میں قلیل بارش کی وجہ سے پینے کے پانی کی قلت سے دوچار ہیں۔ ان اضلاع کے لیے ۸۵ ہزار روپے منظور کیے گئے ہیں۔

پانی فراہم کرنے کا بندوبست متعلقہ کلکٹر، متعلقہ محکموں مثلاً لوکل سیلف گورنمنٹ انجینئرنگ، آب پاشی انجینئرنگ اور بجلی کے محکموں کی مدد سے کرے گا۔

❖ ❖ ❖

حکومت اتر پردیش نے ریاست کے مشترکہ زمرہ میں پچیس پچیس ہزار تکلوں پر مشتمل آٹھ کتائی ملیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہر ایک کتائی مل پر تقریباً چھ کروڑ روپیہ کا سرمایہ لگایا جائے گا۔ اس رقم میں سے دو کروڑ روپیہ مساوی حصص اور بقیہ رقم قرضہ کی شکل میں ہوگی۔ یہ فیصلہ گزشتہ ۱۷ مئی کو کابینہ کے ایک جلسے میں کیا گیا جس کی صدارت وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کر رہے تھے۔

حکومت مذکورہ حصص کی بنیاد پر ۲۶ فیصد تک رقم مالی امداد کے طور پر فراہم کرے گی اور ۲۵ فیصد تک رقم پرائیوٹ پارٹیوں کے ذریعہ مہیا کی جائے گی۔ بقیہ ۴۹ فیصد رقم عام لوگوں کے ذریعہ فراہم کی جائے گی۔ اس طرح ریاستی حکومت ہر ایک مل پر ۵۲ لاکھ روپیہ کی سرمایہ کاری کرے گی۔

❖ ❖ ❖

اتر پردیش کابینہ نے ناردرن انڈیا گیس کمپنی لمیٹیڈ، کانپور کے اشتراک و تعاون سے ریاست میں آکسیجن گیس تیار کرنے کا ایک پلانٹ لگانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ گیس کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کیا جا سکے۔ اس پلانٹ کے چالو ہو جانے پر متعدد سرکاری محکموں اور سرکاری زمرے کی صنعتوں کی ضروریات پوری ہو سکیں گی۔

چرک اور ڈلا کی دو سرکاری سیمنٹ فیکٹریوں میں ہی تقریباً

۱۵۰۰۰ مکعب میٹر سالانہ آکسیجن گیس درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ حکومت نے ریاستی سیمنٹ کارپوریشن کو اس پراجیکٹ میں ۱۵ لاکھ روپیہ کا سرمایہ حصص لگانے کی اجازت دے دی ہے

نادرن انڈیا گیس کمپنی لمیٹیڈ اناؤ میں ۷۰ء۱ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ایک گیس پلانٹ لگانے کی تجویز رکھتی ہے۔ اس پراجکٹ پر تخمینی لاگت کا کام ریاستی مالیاتی ادارہ نے مکمل کر لیا ہے مذکورہ پراجکٹ کے لیے زمین کا بھی بندوبست کیا جا چکا ہے اور توقع ہے کہ پلانٹ اور مشینیں وغیرہ آئندہ چھ ماہ میں دستیاب ہو جائیں گی۔ اس فرم کے پاس ۴۵۰۰ گیس سلنڈر برآمد کرنے کا لائسنس ہے۔

❊ ❊ ❊

ریاست کے ایسے تمام سرکاری ملازمین کو جن میں گزیٹیڈ افسران بھی شامل ہیں جو زیادہ سے زیادہ ۱۲۰۰ روپیہ کی شرح تنخواہ پا رہے ہیں انھیں سبکدوشی کی تاریخ سے ابتدائی ایک سال تک کے لیے عارضی پنشن دی جائے گی جسے متعلقہ محکمہ کا سربراہ منظوری دے گا۔ یہ فیصلہ گذشتہ ۱۰ مئی کو کابینہ کے ایک جلسہ میں کیا گیا۔

یہ فیصلہ ریاستی سرکاری ملازمین کے لیے دور رس مضمرات کا حامل ہے۔ اب تک صرف غیر گزیٹیڈ ملازمین کے لیے صرف چھ ماہ کی مدت تک پنشن کی سہولت حاصل تھی جسے بڑھا کر اب ایک سال کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اترپردیش کے اکاؤنٹنٹ جنرل کے لیے چھ ماہ کی مقررہ مدت کے اندر ملازمین کی پنشن کے کاغذات تیار کرانا ایک مشکل مسئلہ بن گیا تھا جس سے ریاستی ملازمین کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

اسی طرح محکموں کے سربراہوں کو ایسے ریاستی ملازمین اور گزیٹیڈ افسران کے تمام معاملات میں جو ۱۲۰۰ روپیہ کی زیادہ سے زیادہ شرح تنخواہ پا رہے ہیں، ۷۵ فیصد سروس گریجویٹی یا فوت ہونے نیز سبکدوشی سے متعلق گریجویٹی کی ادائیگی کے لیے مجاز کر دیا گیا ہے۔ یہ سہولت اب تک صرف غیر گزیٹیڈ ملازمین کو ہی حاصل تھی۔ چنانچہ اس سہولت میں اب توسیع کر دی گئی ہے تاکہ ملازمین کی کثیر تعداد مستفید ہو سکے۔

ریاست میں تقریباً چھ لاکھ ۲۵ ہزار سرکاری ملازمین ہیں اور مذکورہ اقدامات کے نتیجہ میں تقریباً چھ لاکھ ۱۵ ہزار ملازمین مستفید ہوں گے۔

❊ ❊ ❊

پردیش کے عوام کو علاج و معالجہ کی مزید سہولتیں مہیا کرنے کی غرض سے صحت و علاج و معالجہ کی ریاستی نظامت عنقریب ۵۰۰ سے زیادہ ڈاکٹروں کی تقرری کرے گی جن میں سے بیشتر ڈاکٹر دیہی علاقوں میں عوام کی خدمت کے لیے تعینات کیے جائیں گے۔

ریاست کے دیہی علاقوں میں واقع ابتدائی صحت مرکزوں میں سے جن کی مجموعی تعداد ۸۷۵ ہے، تقریباً ۴۳۷ مرکزوں میں کوئی دوسرا ڈاکٹر نہیں ہے جس کی تقرری ریاستی حکومت کو ملنے والی مرکزی امداد سے کی جاتی ہے ریاستی حکومت کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں ان ابتدائی صحت مرکزوں میں باقی ۴۳۷ ڈاکٹر مہیا کرنے کی منظوری اب مرکزی حکومت نے دے دی ہے۔ اس طرح اب تمام ۸۷۵ ابتدائی صحت مرکزوں میں دو ڈاکٹروں کا بندوبست ہو جانے پر ان مرکزوں سے وابستہ تقریباً ۷ ہزار ذیلی مرکزوں میں بہتر نگرانی اور زیادہ طبی سہولتیں دستیاب ہو سکیں گی۔ جس سے خاص طور پر دیہی عوام مستفید ہوں گے کیونکہ انھیں ان ابتدائی صحت مرکزوں اور ان سے وابستہ ذیلی مرکزوں سے علاج و معالجہ کی سہولتیں فراہم ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ ریاست کے دوسرے اسپتالوں میں بھی جہاں اسامیاں خالی پڑی ہوئی ہیں ۶۵ ڈاکٹروں کی تقرری کی جائے گی۔ چھٹنی کی تجویز کے پس منظر میں ریاست میں اتنی بڑی تعداد میں نئے ڈاکٹروں کی تقرری سے ڈاکٹروں کی ملازمتوں کی صورت حال میں استحکام پیدا ہوگا اور عوام کو باقاعدگی کے ساتھ زیادہ طبی سہولتیں دستیاب ہوں گی۔

❊ ❊ ❊

مالیات اور بھاری صنعتوں کے وزیر شری نارائن دت تیواری نے کل اعلان کیا کہ ریاست میں گنے کی تیز رفتار ترقی اور گنے کی پیداوار

میں کمی گنا اضافہ کرنے کی غرض سے عنقریب چار گنا بیج اور ترقیاتی کارپوریشن قائم کیے جائیں گے۔

وزیر مالیات نے بلند شہر سے تقریباً ۲۶ کیلو میٹر دور ڈونگرا ہاٹ میں، جہاں وزیر اعلیٰ نے چھ کروڑ ۴۸ لاکھ روپیہ لاگت کی ایک امداد باہمی شکر مل کا سنگ بنیاد رکھا ہے، گنا کاشت کاروں کے ایک بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ گنا بیج اور ترقیاتی کارپوریشن مشرقی، مغربی، وسطی اور روہیلکھنڈ منطقوں میں قائم کیے جائیں گے اور اس کے صدر دفاتر بالترتیب گورکھپور، میرٹھ، لکھنؤ اور بریلی میں ہوں گے۔

وزیر مالیات نے یہ اعلان بھی کیا کہ گنا خریداری ٹیکس میں عارضی اضافہ کرکے ۱۰ کروڑ روپیہ کا ایک متحرک فنڈ قائم کیا جائے گا۔ اس فنڈ سے شکر ملوں کو قرضے دیے جائیں گے تاکہ وہ کسانوں کی بقایا رقموں کی ادائگی کرنے کے ساتھ ساتھ ملوں کی جدید کاری اور گنا تحقیق کا کام بھی بخوبی انجام دے سکیں۔

ریاستی حکومت نے اقوام مندرجہ فہرست کے ایسے طالب علموں کی، جن کے سرپرستوں کی ماہانہ آمدنی ۵۰۰ روپیہ تک ہے، ۷۶-۱۹۷۵ء کے تعلیمی سال سے پری میٹرک درجات تک فیس کی معافی کے لیے چار لاکھ روپے کی رقم منظور کی ہے۔

اب تک یہ سہولت اقوام مندرجہ فہرست کے صرف ان طالب علموں کو حاصل تھی جو پری میٹرک درجات میں زیر تعلیم تھے اور جن کے سرپرستوں کی آمدنی صرف ۲۵۰ روپے ماہانہ تھی۔

ریاست کی چھوٹی صنعت اور گھریلو صنعتوں کو خصوصی سہولتیں اور مراعات دینے کی غرض سے پانچویں پنجسالہ منصوبہ کے دوران ۲۵ کروڑ روپیے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس میں سے تین کروڑ ۹۳ لاکھ روپیہ موجودہ مالیاتی سال کے لیے رکھا گیا ہے جبکہ ۷۵-۱۹۷۴ء میں تین کروڑ ۹۴ لاکھ روپے کی رقم اس سلسلے میں مہیا کی گئی تھی۔

لہو کی ایک بوند ـــــ (صفحہ ۴۱ کا بقیہ)

دیجیے؟"

ڈاکٹر: "میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اب سنئے کہ لہو کی وہ بوند جو مرنے والی کی ناک سے اچھل میرے ہاتھ کی پیٹھ پر گری تھی، صبح تک سوکھ کر جھڑ چکی تھی۔ کھال پر کوئی نشان نہیں تھا۔ مگر وہاں جلن شروع ہوئی۔ مانو کالے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ منٹ منٹ یہ جلن بڑھ رہی ہو۔ میری کہانی پر کوئی وشواس نہیں کرے گا، ہاں آپ، جنھوں نے سب کچھ دیکھا اور دو آپریشن کیے۔ گھاؤ اچھا ہوتے ہی جلن پھر بڑھ جاتی ہے۔ اب اس کا تیسرا دورہ ہے جس کو سہنے کی اب مجھ میں سکت نہیں۔ ایک گھنٹے کے بعد میرا انت ہو جائے گا۔ پر مجھے ڈھارس ہے کہ موہنی نے اسی لوک میں اپنا بدلہ چکا لیا۔ شاید پرلوک میں مجھے شما کر دے۔ لہو کی نہ وہ بوند گرتی۔ نہ میں مکت ہوتا پرماتما آپ کا بھلا کرے ڈاکٹر۔ آپ کا سیوک سوریہ کانت۔

خبر چھپی کہ شہر کے لکھ پتی مل مالک سوریہ کانت جی نے گولی مار کے آتم ہتیا کر لی۔

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

"مالویکا گن متر" مصنف: بشیشور پرشاد منور لکھنوی
ضخامت: ۱۱۰ صفحات، قیمت: ۲ روپے
شائع کردہ: انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ)

اردو شعر و ادب کی دنیا میں بشیشور پرشاد منور لکھنوی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ موصوف نے اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے قبل بھی ان کا منظوم ترجمہ "شکنتلا" انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع ہو کر اہل علم سے خراج عقیدت وصول کر چکا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب "مالویکا گن متر" بھی سنسکرت زبان کے شاعر اعظم کالی داس کا ہنگامہ خیز رومانی ڈرامہ ہے جسے انتہائی دل فریب اور دل کش انداز میں اردو نظم کے قالب میں ڈھالنے کا اہم کام منور لکھنوی نے انجام دیا ہے۔ اردو دنیا میں کالی داس کے خاص طور سے دو ہی ڈرامے مشہور ہیں ایک شکنتلا اور دوسرا میگھ دوت۔ مترجم شاعر کا اردو زبان و ادب پر احسان ہے کہ انہوں نے اپنی ذاتی تحقیق و جستجو سے کام لے کر اس ڈرامے کی منظوم شکل اردو شاعری کو بخشی ہے۔ کسی ادب پارے کو ترجمہ کرنا ایک مشکل کام ہے اور اگر نظم کا ترجمہ نظم میں کرنا پڑے تو یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ صاحب تبصرہ شاعر منور لکھنوی نے ترجمے کی نزاکتوں کے پیش نظر بڑی اچھی راہ نکالی ہے اور ان کی اس روش پر آئندہ آنے والی نسلیں بھی چلیں گی کیونکہ اردو کے شعری سرمایہ میں ان کا یہ ترجمہ ایک اضافہ ہے۔ کتابت اور طباعت بھی اچھی ہے۔

——— ڈاکٹر محمد علی زیدی

"مزاج پرسی" مصنف: نریندر لوتھر ناشر: زندہ دلان حیدرآباد
ضخامت: ۱۹۱ صفحات قیمت: ۳ روپے ۵۰ پیسے
ملنے کا پتا: ادبی ٹرسٹ بک ڈپو، کنار ہینگ، عابد روڈ، حیدرآباد نمبر ۱

نریندر لوتھر اردو کے جانے پہچانے قلم کار ہیں۔ ہندی اور انگریزی میں بھی برابر لکھتے رہتے ہیں۔ طنز و مزاح سے یک گونہ شغف ہے۔ "مزاج پرسی" ان کے پندرہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ ان کا فن ارتقا پذیر ہے۔ اس کے قبل ان کے افسانوں اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ۱۹۶۴ء میں "بدکواڑ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جو ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا اور کچھ ہی عرصے بعد اس کا دوسرا اڈیشن بھی چھپ گیا۔

زیر تبصرہ مجموعۂ مضامین (مزاج پرسی) میں لوتھر صاحب نے موضوع کی نزاکت کے پیش نظر مکمل انصاف سے کام لیا ہے۔ اس کے سبھی مضامین میں مقصدیت کی روح کارفرما ہے۔ یہ صرف ہنسنے ہنسانے یا خواہ مخواہ طنز کا نشتر چبھونے کے لیے نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ طنز کی مرچوں پر مزاح کا قوام چڑھا دیا گیا ہے۔ شروع میں مصنف کے پیش لفظ کے بعد ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کا مختصر مگر پر مغز مقدمہ ہے جس میں وہ یوں رقمطراز ہیں۔

"لوتھر صاحب نے اسی بے ستون سے جوئے شیر نکالنے کی کوشش کی ہے اور اس ضمن میں ان کا اپنا مخصوص رنگ ہے۔ ان کے مزاح میں وہی کیفیت ہے جو سنسکرت ادب کے شاہکار منظوم بدھل ستکا (SATAKAA) میں پائی جاتی ہے۔"

محترم ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے بڑی نپی تلی رائے دی ہے۔ اس مجموعہ کے مطالعے کے بعد ان کی رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

——— ڈاکٹر فضل امام

"سلگتے پھول ڈھلکتے آنسو" مجموعۂ کلام۔ سرمتی بابا کھنہ راحت بریلوی
قیمت: دس روپے، ضخامت ۱۲۸ صفحات
ناشر: راجیو پرکاشن، ۱۷۔ باری ٹولہ، بریلی۔

سرمتی بابا کھنہ راحت بریلوی ایک اچھی شاعرہ ہیں۔ "سلگتے پھول ڈھلکتے آنسو" ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو غزلیات، نظمیات، قطعات اور متفرقات پر مشتمل ہے۔ بابا کھنہ راحت بریلوی کی شاعری ایک دردمند دل کی پکار ہے جس میں شکست خوردگی کے بجائے حوصلہ مندی ہے۔ وہ جہاں دل کشی کائنات اور بے ثباتی حیات کا تذکرہ کرتی ہیں وہیں حقیقتوں کے دبیز پردے بھی فاش کر دیتی ہیں۔ وہ دام فریب مسرت میں مبتلا ہو کر اپنی داستان کو تشنۂ غم نہیں بنانا چاہتی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک حاصل محبت، سوز نہاں، برق تپاں اور حال پریشاں سے عبارت ہے۔

راحت کے کلام میں اختلاط بذیر روایتی غزل گوئی کے وہ عناصر ہیں جن کا سبب روایتی غزل گو شعرا کی تربیت اور شاگردی ہے۔ ویسے ان کے مجموعۂ کلام کے مطالعے سے میں اس منزل تک پہنچتا ہوں کہ خود ان میں شعر گوئی کی اچھی صلاحیت ہے اگر وہ داخلیت کو اپنے کلام میں جگہ دیں تو ان کے کلام میں اور بلندی آ سکتی ہے کیونکہ مفروضہ خارجی لوازمات کے بیانات، زندگی کی تلخ حقیقتوں سے چشم پوشی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کے باوصف راحت نے اپنے کلام میں صبر و ضبط، تحمل و استقلال کا پیغام دیتے ہوئے تلخ حقیقتوں کی طرف بھرپور اشارے کیے ہیں کیونکہ ان بیانات میں ان کی اپنی فطرت شامل ہے۔

مجموعۂ کلام کی ترتیب و انتخاب میں اگر کچھ اور شعور و سلیقے سے کام لیا گیا ہوتا تو بہتر تھا۔ کتابت کی خرابی کے لیے خود شاعرہ نے معذرت چاہی ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں اچھی نظر سے دیکھا جائے گا۔ ——— ڈاکٹر فضل امام

★

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

نیا دور

جلد ۳۱ نمبر ۴

جولائی ۱۹۷۵ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: کماری سرلا ساہنی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ، لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات، اتر پردیش

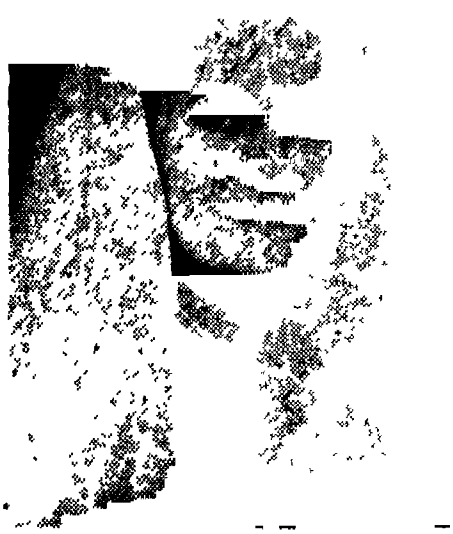
قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ انفارمیشن (سی) ڈپارٹمنٹ، یوپی، لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ، یوپی، لکھنؤ

ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کیوں؟

——— شریمتی اندرا گاندھی

پچھلے کچھ عرصے سے ملک میں ایسے حالات پیدا ہوگئے تھے جن سے جمہوریت، سیکولرزم، دستوری طریقوں اور قومی قدروں کو سخت خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ جمہوریت دشمن عناصر کی فسطائیت پسندانہ ریشہ دوانیاں ان کوششوں کو ناکام بنا دینا چاہتی تھیں جو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت و رہنمائی میں ملک کا معاشی اور سماجی ڈھانچہ بدلنے کے لیے کی جا رہی تھیں۔ جمہوریت دشمن عناصر کی کوششوں کو کامیاب ہونے دینے نیز جمہوریت اور قومی قدروں کے تحفظ کے لیے ہنگامی حالات کے اعلان کے علاوہ کوئی دوسرا دستوری طریقہ نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ صدر جمہوریہ نے ۲۶ جون ۱۹۷۵ء کو ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کیا۔ ہنگامی حالات کے اعلان پر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے قوم کے نام ایک پیغام نشر کیا جس میں انھوں نے ہنگامی حالات کے اسباب و مقاصد کی وضاحت کی۔



ذیل میں قوم کے نام وزیر اعظم کے نشری پیغام کا متن درج کیا جا رہا ہے:

راشٹرپتی نے ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا ہے۔ اس سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے مجھے یقین ہے کہ آپ سب اس بات سے آگاہ ہوں گے کہ جب سے میں نے بھارت کے عام لوگوں کے فائدے کے لیے بعض ترقی پسندانہ اقدامات کرنے شروع کیے تبھی سے ایک نہایت گہری اور وسیع پیمانے پر سازش تیار ہو رہی تھی۔ جمہوریت کے نام پر ہی جمہوریت کو ناکام بنانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ باقاعدہ چنی ہوئی حکومتوں کو اپنے فرائض ادا کرنے سے روکا گیا ہے اور بعض حالتوں میں آئینی طور پر چنی ہوئی اسمبلیوں کو توڑنے کے مقصد سے ممبروں کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔ ایجی ٹیشنوں نے فضا کو کشیدہ بنا دیا ہے جس کے نتیجے میں تشدد آمیز واقعات ہوئے ہیں۔ تمام ملک کو میری کابینہ کے رکن شری للت نرائن مشر کے وحشیانہ قتل سے نہایت دکھ پہنچا۔ ہمیں بھارت کے چیف جسٹس پر کیے گئے مکروہ حملے سے بھی انتہائی صدمہ پہنچا ہے۔

کچھ لوگ تو ہماری مسلح افواج اور پولیس کو بغاوت کرنے کے لیے اکسانے لگے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے فوجی اور ہماری پولیس حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہیں، وہ ڈسپلن کے پابند ہیں اور وہ کسی کے بہکاوے میں نہیں آئیں گے۔ لیکن اس سے اس اشتعال انگیزی کی سنگین نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تمام انتشار پسندانہ قوتیں پورے زور سے کام کر رہی ہیں اور فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکایا جا رہا ہے جس سے ہماری ایکتا کے لیے خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔

مجھ پر کئی طرح کے جھوٹے الزامات لگائے گئے ہیں۔ بھارت کے لوگ مجھے میرے بچپن سے ہی جانتے ہیں۔ میری تمام زندگی عوام کی خدمت میں ہی گزری ہے۔ یہ کوئی ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ اہمیت اس بات کی نہیں کہ میں پردھان منتری رہتی ہوں یا نہیں لیکن پردھان منتری کا عہدہ اہم ہے اور اس کے وقار کو کم کرنے کی سوچی سمجھی سیاسی کوششیں جمہوریت اور قوم کے مفاد میں نہیں ہو سکتیں۔

ہم کافی عرصے تک ان واقعات کو انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ دیکھتے رہے ہیں لیکن اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ معمول کی زندگی کو درہم برہم کرنے کے لیے ملک بھر میں امن و قانون کو چیلنج کرنے کا نیا پروگرام بنایا گیا ہے۔ کوئی بھی حکومت جو اپنے آپ کو حکومت کہلانے کی حق دار ہو، کس طرح تماشائی کی طرح ملک کے استحکام کو خطرے میں پڑتا ہوا دیکھ سکتی ہے؟ چند لوگوں کی کارروائیوں سے لوگوں کی بھاری اکثریت کے حقوق خطرے میں پڑ گئے ہیں۔ ہر ایسی صورت حال جس سے ملک کے اندر ضروری قدم اٹھانے کے سلسلے میں قومی حکومت کی قوت فیصلہ کمزور ہوتی ہو، اس سے لامحالہ بیرونی خطروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ ملک کی ایکتا اور استحکام کو برقرار رکھنا ہمارا فرض اولین ہے۔ ملک کی سالمیت سخت کارروائی کا تقاضا کرتی ہے۔

اندرونی استحکام کے لیے خطرے کا اثر معاشی ترقی کے امکانات اور پیداوار پر بھی پڑتا ہے۔ پچھلے کچھ مہینوں میں ہم نے ثابت قدمی سے کچھ قدم اٹھائے ہیں جن سے قیمتوں میں اضافے کو روکنے میں بڑی حد تک کامیابی ملی ہے۔ ملک کی معیشت کو مضبوط بنانے اور مختلف طبقوں، بالخصوص غریبوں اور سماج کے کمزور طبقوں اور ایک مقررہ آمدنی پانے والے لوگوں کو مشکلوں سے راحت دلانے کے لیے مزید اقدامات کرنے کے سوال پر ہم سرگرمی سے غور کر رہے ہیں۔ میں ان اقدامات کا اعلان جلد ہی کر دوں گی۔

گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں

میں آپ کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ ہنگامی حالات کے اس نئے اعلان سے قانون کا پابند رہنے والے شہریوں کے حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اندرونی حالات میں تیزی سے سدھار ہوگا اور ہم جلد از جلد اس ہنگامی حالت کو ختم کر سکیں گے۔

مجھے بھارت کے تمام حصوں اور لوگوں کے تمام طبقوں کی طرف سے خیر سگالی کے پیغامات ملے ہیں، جن کے لیے میں انتہائی شکر گزار ہوں۔ آنے والے دنوں میں بھی میں آپ کے سرگرم تعاون اور اعتماد کے لیے اپیل کرتی ہوں۔

اقتصادی تعمیر و ترقی کے لیے
۲۱ نکاتی پروگرام

شریمتی اندرا گاندھی

پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے یکم جولائی ۱۹۷۵ء کو رات کے ساڑھے ۸ بجے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے قوم کے نام اقتصادی تعمیر و ترقی کے لیے پروگرام کے سلسلے میں ایک پیغام نشر کیا ہے۔ پروگرام کی تفصیل درج ذیل ہے:

میں آج آپ کے سامنے کچھ اقتصادی پروگراموں کی بات کہنے جا رہی ہوں جنھیں لاگو کرنے کا سرکار کا خیال ہے۔ ان میں سے کچھ نئے ہیں، کچھ پہلے سے شروع ہو چکے ہیں، لیکن انھیں اور زیادہ زوردار طور پر اور عزم مصمم کے ساتھ چلانے کی ضرورت ہے۔ براہ کرم جادوئی حل اور ڈرامائی نتائج کی تلاش نہ کریں۔ صرف ایک ہی جادو ہے جو غریبی کو دور کر سکتا ہے اور وہ ہے واضح دور اندیشی کے ساتھ ساتھ کڑی محنت مضبوط ارادہ اور مضبوط ترین ضبط و تنظیم۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ پر صرف اپنے لیے ہی نہیں بلکہ اپنے ساتھی شہریوں کے لیے اور زیادہ کام کرنے کا عزم مصمم کرنا چاہیے۔ سرکاری املاک کا زیادہ احترام کیا جانا چاہیے۔ انھیں برباد کرنے پر تعزیری جرمانے کیے جائیں گے۔ سبھی طرح ہمیں اور زیادہ ضبط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ جو کھپت صاف طور سے کم کی جا سکتی ہے اسے کم کرنا سرکار کا فرض ہے لیکن شہریوں کی بھی ذمے داری ہے۔ قوم کی زندگی بہتر بنانے کیلیے صرف یہی راستہ ہے۔

> ہنگامی حالات سے ہمیں اقتصادی کاموں کو آگے بڑھانے کا موقع ملا ہے

قانون توڑنے، قومی سرگرمیوں کو ختم کرنے اور بے نظمی اور حکم عدولی کے لیے حفاظتی افواج کو اکسانے سے اقتصادی انارکی اور انتشار پیدا ہو سکتا تھا اور ہمارا ملک علیحدگی پسندانہ رجحانات اور بیرونی خطرے کا شکار ہو جاتا۔ نفرت کے بادل کچھ چھٹ جانے پر ہم اپنے اقتصادی مقاصد کو اور زیادہ وضاحت اور اہمیت کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ ہنگامی حالات سے ہمیں اپنے اقتصادی کاموں کو آگے بڑھانے کا ایک نیا موقع ملتا ہے۔

پہلا اور سب سے بڑا چیلنج قیمتوں سے متعلق ہے۔ پچھلے پانچ دنوں میں بہت سی چیزوں کی قیمتیں گرنے کا رجحان نظر آیا ہے اس رجحان کو قائم رکھنا ہوگا۔ اس مقصد سے پیداوار بڑھانے، وصولی کو تیز کرنے اور اشیائے ضروریہ کی تقسیم کے نظام کو موثر بنانے کے لیے سرکار بہت سے قدم اٹھائے گی۔ امتناعی حکم سے مغربی بنگال اور اڑیسہ میں دھان کی وصولی پر روک لگ گئی ہے۔

بیرونی زرمبادلہ کے وسائل کے تئیں ہمارا نقطۂ نظر مناسب طور سے اطمینان بخش ہے اس سے جہاں ضروری ہوگا درآمد کا انتظام کیا جائے گا۔ تاکہ ضروری سپلائی بنی رہے ریاستی سرکاروں سے پہلے ہی کہہ دیا گیا ہے کہ وہ قیمتوں کی فہرست ٹانگنے اور ذخیروں سے متعلق اطلاعات دینے کے لیے تاجروں کو مشورہ دیں ذخیرہ اندوزی اور ضابطہ شکنی کرنے والوں کو سنگین سزا دی جائے گی۔

افراط زر کو روکنے کی اس حکمت عملی کو جاری رکھا جانا ہے۔ قرضوں میں محتاط طور پر اور سوچ سمجھ کر ضبط و تنظیم کی جاتی ہے۔ سرکاری محکموں اور پبلک اداروں کو ضروری خرچ کم کرنے کے نئے احکام دیے گئے ہیں

ہمارے عوام میں سے زیادہ تر دیہی علاقوں میں رہتے ہیں ہم کو بالائی حدود سے متعلق قوانین کو لاگو کرنا اور بے زمین لوگوں میں فالتو زمین تقسیم کرنے کا کام دوگنے جوش سے کرنا چاہیے۔ اراضی سے متعلق کھاتوں کو مکمل کرنے میں مقامی لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے اس بات کا خاص دھیان رکھا جائے گا کہ قبائلی افراد کو ان کی زمین سے محروم نہ کیا جائے۔

دیہی اور شہری دونوں طبقوں کے لیے امداد اور راحت کے اقدامات

دیہی علاقوں میں مکانوں کے لیے جگہ کا بندوبست کرنے کے پروگرام کو بہت توسیع دی جائے گی۔ ان بے زمین مزدوروں کو ملکیت کے حقوق دینے کے لیے قانون بنائے جائیں گے جو کچھ مقررہ مدت سے زیادہ وقت تک اپنے مالکوں کی زمین پر گھر بنا کر رہ رہے ہیں انھیں نکالنے کی کارروائی کرنے والوں کے ساتھ سختی برتی جائے گی۔

بندھن میں پھنسے مزدوروں سے کام لینے کی روایت نفرت انگیز ہے اسے ختم کیا جائے گا۔ اس طرح سے کام لینے کے لیے جو اقرار نامے یا دیگر انتظامات کیے گیے ہیں انھیں غیر قانونی قرار دیا جائے گا۔

دیہی عوام کے قرضوں کو معاف کرنے کے لیے مختلف مرحلوں میں قدم اٹھانے کا ہمارا ارادہ ہے۔ ایک طرف جہاں بے زمین مزدوروں، دیہی صناعوں اور چھوٹے اور سرحدی کسانوں کو جن کے پاس دو ہیکٹر سے کم زمین ہے ادارہ جاتی قرضے دلانے کے لیے متبادل ایجنسیاں کھولنے کے لیے نئی اسکیمیں بنائی جائیں گی اور دوسری طرف ایسے طبقوں سے قرضوں کی وصولی سے متعلق مقدموں اور متعلقہ احکامات پر عملدرآمد کو ملتوی کیا جائے گا۔ کوآپریٹو سوسائیٹوں، تجارتی بینکوں اور سرکاری قرضوں کو اس اسکیم سے باہر رکھا جائے گا۔

کھیت مزدور ہمارے سماج کا وہ حصہ ہے جس کا بری طرح استحصال کیا جاتا ہے۔ کھیت مزدوروں کے لیے کم از کم اجرت سے متعلق موجودہ قانون کا بھی جائزہ لیا جائے گا اور جہاں ضروری ہوگا کم از کم اجرت کو مناسب طور پر بڑھانے کے لیے کارروائی کی جائے گی۔

پیداوار بڑھانے کی ہمیں پوری کوشش کرنی چاہیے زیادہ زرعی اور صنعتی ترقی کے لیے پانی اور بجلی کا بہت اہم رول ہے۔ کم سے کم ۵ لاکھ ایکڑ مزید اراضی کو آب پاشی کی سہولت کے تحت لانے کے لیے تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ جہاں جہاں زیر زمین آبی ذخیروں کا پتہ چلا ہے ان سے فوراً فائدہ اٹھایا جائے گا اور آب پاشی کے لیے اور پینے کے پانی کے بندوبست کے لیے خاص طور سے خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں اور زیادہ سروے کیے جائیں گے۔

بجلی کی صورت حال میں کچھ سدھار ہوا ہے۔ ۲۶۰۰ میگاواٹ مزید بجلی پیدا کرنے کے لیے کارروائی کی جا رہی ہے۔ بجلی کی فراہمی سے متعلق اسکیموں پر عملدرآمد کے لیے کافی رقم کا بندوبست کیا جا رہا ہے طویل مدتی ضرورتوں کے لیے مرکزی سرکار کے تحت بڑے حرارتی بجلی گھروں کی اسکیم بنائی جا رہی ہے، ریاستی بجلی بورڈوں کو بہتر طور پر منظم کیا جا رہا ہے۔

جہاں تک لوگوں کو روزگار دینے کا تعلق ہے زراعت کے بعد ہتھ کرگھے کی صنعت کا دوسرا مقام ہے۔ بنکروں کو مناسب دام پر ضروری چیزوں کی سپلائی کو یقینی بنایا جائے گا۔ ہتھ کرگھوں کے لیے الگ سے ایک ترقیاتی کمشنر کا تقرر کیا جا رہا ہے۔ بنکروں کو اور زیادہ حفاظتی سہولتیں دینے کے لیے ریزرویشن کی پالیسی کو مربوط بنایا جا رہا ہے۔

کارخانوں کے علاقوں میں کنٹرول کپڑا اسکیم میں سدھار کیا جا رہا ہے تاکہ دھوتیوں، ساریوں اور کپڑے کی قسم میں سدھار ہو اور یہ زیادہ سے زیادہ دکانوں کے ذریعے دیہی اور شہری علاقوں میں بیچا جا سکے۔

شہری زمین سے بہت سی دولت کمائی گئی ہے جس سے قومی مفادات کو صدمہ پہنچا ہے۔ زمین کی قیمتوں میں سودے بازی اور شہری املاک کے کچھ ہاتھوں میں مجتمع ہو جانے سے نابرابری غیر معمولی طور پر بڑھی ہے اور شہری ترقی بہت ہی غیر منظم طریقے پر ہوئی ہے۔ افتادہ زمین، فاضل زمین پر قبضہ کرنے شہری زمین میں شامل کرنے کے قابل زمین کو سماجی ملکیت میں لینے کے لیے، قانونی اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

ٹیکس چوروں کے خلاف کڑی کارروائی

ٹیکس کی چوری جرم ہے اس طرح سے چوری سے بچایا ہوا کالا

وصف عالی شان آرام دہ مکان بنانے میں کام آتا ہے۔ شہری جائیداد کی قیمت بہت ہی کم دکھائی جاتی ہے۔ جائیداد کی مالیت کی جانچ کے لیے خصوصی دستے قائم کیے جائیں گے اور خطا کاروں کو سخت سزا دی جائے گی۔ ہم مقدموں کو جلد فیصل کرنے کے بندوبست کے بارے میں غور کر رہے ہیں۔

اسمگلروں کی جائیداد ضبط کی جائے گی

اسمگلروں کے خلاف مہم میں تیزی لائی جائے گی۔ کچھ ٹیکنیکل بنیادوں پر ان کی رہائی سے اس مہم میں رکاوٹ آگئی اور کچھ معاملوں میں انھیں ضمانت پر رہا بھی کر دیا گیا۔ اسمگلروں کی جائیداد کو چاہے ان کے نام ہو یا نہ ہو ضبط کر لیا جائے گا۔

لائسنس نظام سے نئی سرمایہ کاری میں رکاوٹ آئی ہے۔ اس کو آسان بنایا جائے گا۔ جن صنعتوں کو درآمدی سامان یا سرکاری مدد کی ضرورت نہیں ہے ان کی سرمایہ کاری کی حد بڑھا دی جائے گی۔ ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی کہوں گی کہ لائسنسوں کا بیجا استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے درآمد و برآمد کے ضوابط میں ترمیم کی جا رہی ہے۔ ایسے مقدموں کا جلدی فیصلہ کیا جائے گا اور سزا کے طور پر خطا دار افراد کی جائیداد ضبط بھی کی جا سکتی ہے۔

طالب علموں کو نصابی کتابیں مناسب قیمتوں پر فراہم کرنے کا بندوبست

صنعتوں میں خاص طور پر فرونٹ کی سطح پر کارکنوں کے اشتراکِ عمل کی اور پیداواری پروگرام سے متعلق اسکیمیں شروع کی جائیں گی۔ پچھلے کچھ مہینوں میں ریلوے کے ذریعے اناج، کوئلہ، فولاد اور سیمنٹ کی نقل و حمل میں سدھار ہوا ہے۔ سڑکوں کے ذریعے مال ڈھونے میں درپیش مشکلات کو دور کیا جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہم قومی سطح کا پرمٹ سسٹم شروع کر رہے ہیں۔

گزشتہ کچھ برسوں میں مقررہ آمدنی والے لوگوں نے بہت تکلیفیں برداشت کی ہیں ان کی فوری مدد کی ضرورت ہے۔ انکم ٹیکس سے چھوٹ کی کم سے کم چھوٹ کی حد کو چھ ہزار روپئے سے بڑھا کر آٹھ ہزار روپے کر دی جائے گی۔ غریب کنبوں کے طالب علموں کو اپنے گھر سے دور رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں خاص طور سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی مدد کے لیے ہوسٹلوں میں اشیائے ضروریہ کو مقررہ قیمتوں پر فراہم کرایا جائے گا۔

تعلیمی میدان میں ایک اہم قدم یہ اٹھایا گیا ہے کہ سبھی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی کے طالب علموں کو نصابی کتابیں اور کاپیاں مناسب قیمتوں پر فراہم کرنے کا بندوبست کیا جائے گا۔ قیمتوں پر سختی سے کنٹرول رکھا جائے گا اور ذخیرہ کتب قائم کیا جائے گا۔

تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع میں اضافہ کرنے کی غرض سے اپرینٹس شپ ایکٹ میں مناسب ترمیم کی جائے گی۔ تاکہ ہماری معیشت کے منظم شعبے اپنے انتظامیہ میں بڑی تعداد میں اپرنٹسوں کو لیں۔ اپرنٹسوں کی بھرتی کرتے وقت اقوام و قبائل مندرجہ فہرست، اقلیتوں اور معذوروں کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا۔

میں نے نئے پروگراموں کے بہت سے حصوں کا خاکہ مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ یہ پروگرام اگلے کچھ ہفتوں میں بروئے کار لایا جائے گا۔ دوسرے معاملوں پر بھی غور کیا جا رہا ہے اور وقتاً فوقتاً مزید اقدامات کا اعلان کیا جائے گا۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہماری تدبیریں ملک کے اقتصادی نقطۂ نظر کو بدلنے میں معاون ہوں گی۔ سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں ملک کو بے بسی کے احساس سے چھٹکارہ دلانا ہوگا۔ گزشتہ کچھ مہینوں میں پیدا شدہ بحران کا سب سے خراب اثر یہ ہوا کہ اس سے بدظنی بڑھ گئی ہے اور اس نے قومی خود اعتمادی کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اب قوم کی مہم جوئی کے جذبہ کا احیاء کرنے کا موقع ہے۔ آئیے ہم مستعدی اور مہم جوئی کے ساتھ کام شروع کریں۔

★

فضا ابن فیضی

غزل

گرے تو ذہن پہ شیشوں کے پتھر ایسا بھی
کبھی تو طبعِ قلم ہو مکدّر ایسا بھی

تم اس کو توڑ کے دیکھو تو میں دکھائی دوں
شکستِ آئینہ رکھتا ہے منظر ایسا بھی

صبا کا لمس ہے اقدامِ قتل سے بھی سوا
کلی کے سینے پہ رکھو نہ خنجر ایسا بھی

جو چہرہ چہرہ کھلے، ہونٹ ہونٹ مسکائے
کوئی تو خواب ہو آنکھوں کے اندر ایسا بھی

پیالہ گیرِ بنتا ہوں کہ تشنگی نے مری
پلا دیا ہے مجھے اک سمندر ایسا بھی

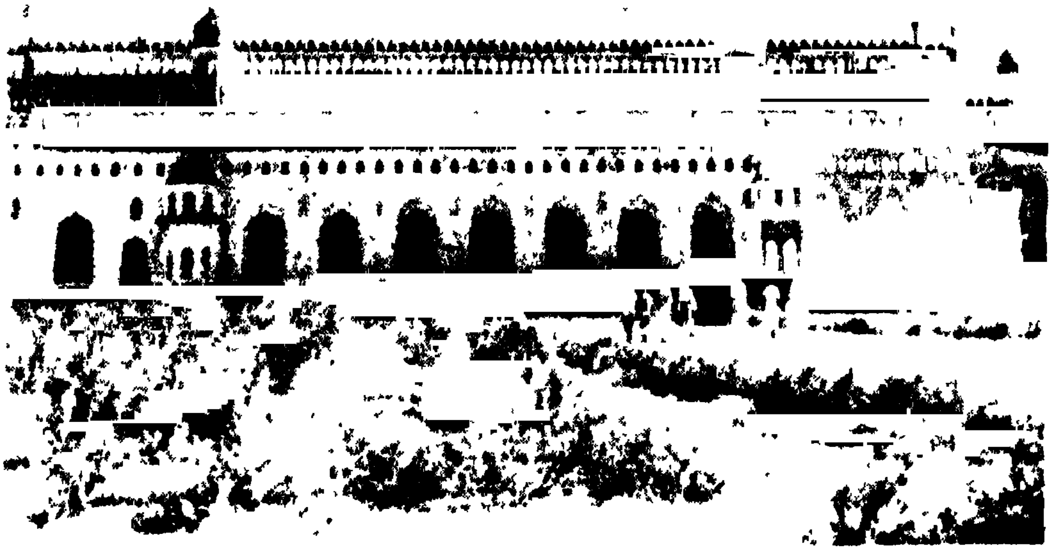
زمانہ تیرہ نصیبوں کا درد پہچانے
کبھی تو سایہ پڑے روشنی پر ایسا بھی

کتاب تجھ پہ جو اتری تو کفر اور بڑھا
ترے جہاں میں ہے خیر اک پیمبر ایسا بھی

تجھے جو لفظ بھی ڈھونڈیں تو نامراد پھریں
اُتر نہ گہرے معانی کے اندر ایسا بھی

قلم کی لَو پہ سلگتا رہا جو ساری عمر
فضا کے شہر میں ہے اک سخنور ایسا بھی

ڈاکٹر اکبر حیدری



لکھنؤ کی چند عظیم الشان اور تاریخی عمارتیں ایسی ہیں جو نوابینِ اودھ کے عہد رفتہ کی یاد دلاتی ہیں۔ ان نادر روزگار عمارتوں میں نواب آصف الدولہ کا امام باڑہ اپنی عظمت، شان و شوکت اور فن تعمیر کے اعلیٰ نمونے کے لیے دور دور تک مشہور ہے۔ لوگ اس امام باڑے کو آصفی امام باڑے یا بڑے امام باڑے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اس امام باڑے کی تعمیر کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ اودھ میں ۱۷۸۴ء میں سخت قحط پڑ گیا تھا اور رشر فائے شہر تک قحط کا شکار ہو رہے تھے۔ نواب آصف الدولہ نے رعایا کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے امام باڑہ تعمیر کرنا شروع کیا۔[1] جو ۱۷۹۰ء میں مکمل ہوا اور اسی سال اس میں تعزیے رکھے گئے۔[2] بقول نجم الغنی صاحب اس کی تعمیر کے لیے کاریگر دور دراز علاقوں سے بلائے گئے اور سب کو حکم ہوا تھا کہ اپنی اپنی رائے کے مطابق اس تعمیر کے لیے نقشے پیش کریں۔ تاکید یہ تھی کہ کسی عمارت کی نقل نہ ہو۔ اور یہ عمارت ایسی تیار ہو کہ کبھی پیشتر ایسی نہ بنی ہو اور جتنی تعمیرات مشہور ہیں سب سے زیادہ خوش قطع اور خوش اسلوب ہو۔ کفایت اللہ ایک شخص تھا جس کی تدبیر سے یہ تیار ہوا اور جیسا اب موجود ہے اسی سے ظاہر ہے کہ جو شرائط نواب کی تھیں ان میں کمی نہیں ہوئی۔[3] امام باڑے کی تعمیر کا کام دن کی طرح رات کو بھی جاری رہتا اور غریب و نادار گشت نسرفائے شہر رات کے اندھیرے میں آ کے مزدوروں میں شریک ہو جاتے اور مشعلوں کی روشنی میں کام کرتے۔ اس عمارت کو نواب نے جیسے خلوص عقیدت اور جوش دینداری سے بنوایا تھا ایسے ہی خالص اور سچے دلی جوش سے لوگوں نے بھی تعمیر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی نفیس اور شاندار عمارت بن کر تیار ہو گئی جو اپنی نوعیت میں بے مثل اور نادر روزگار ہے۔[4]

---

[1] لکھنؤ گیزٹیئر صفحہ ۲۰۲ ایچ۔ آر۔ نیول [2] تفضیح الغافلین صفحہ ۱۱۲ سال تصنیف ۱۷۹۷ء مرزا ابو طالب لندنی۔
[3] تاریخ اودھ صفحہ ۲۰۹ حصہ سوم نجم الغنی [4] گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۳۸ شرر لکھنوی

امام باڑے کی مضبوطی طول و عرض اور جلو خانوں کے بارے میں مرزا ابو طالب لندنی (متوفی سنہ ۱۸۰۵ء) اپنی کتاب (سال تصنیف سنہ ۱۷۹۶ء) میں لکھتے ہیں۔

"در سائر عمارات وزیر امام باڑہ مذکور قابل ذکر و مستحکم است۔ زیرا کہ مشتمل است بر دو دالان و یک شاہ نشین و چند صحنچی کہ طول الاانہا ۔ ۱ شصت گز و عرض سی گز است۔ و صفہ در پیش آں بسیار وسیع کہ در وسط آں حوض گلابی است بر آوردہ و اندر صحن وسیع دارد و در اطراف صحن مسجدے عالی و بیوتات لائق آں ساختہ و نیز دروازۂ عالی میل تریولیہ مقابل عمارت ترتیب دادہ اند و دو سہ ۲ جلو خانہ بہ ہمیں قسم سہ سہ ۳ دروازہ و اطراف آں بیوتات و نقار خانہ و مسافر خانہ ہا ست و بر دروازۂ جلو خانۂ آخریں کہ مشہور است بہ دروازۂ رومی ۱۰ طاقچہ تہ در تہ نقوش بر دیوار ہا آوردہ اند کہ طول آں موافق ہر سہ دروازہ سی ۳ گز و بلندی آں بقدر چہل گز خواہد بود و آں حیرت افزائے بیدگان است۔ سقف ایں دروازہ و دالا نہا کہ سی گز عرض ۱ اند و سائر بیوتات ایں عمارت از خشت و آہک است۔ کار چوب مطلقاً در آں نیست"۔[1]

ابو طالب خاں جب سنہ ۱۷۹۶ء کے واقعات قلم بند کرتے ہیں تو امام باڑے کے سامان و آرائش کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"اس کے تعمیر ہونے کے وقت سے اب تک ہر سال چار پانچ لاکھ روپیہ امام باڑے کی آرائش پر صرف ہوتا ہے سیکڑوں چھوٹے بڑے سونے اور چاندی کے تعزیے بنائے گئے اور اس قدر کانچ کے جھاڑ، فانوس اور سونے چاندی کی سادہ و رنگین قندیلیں خریدی گئیں کہ جن کا حساب شمار سے باہر ہے۔ چنانچہ اس کشادگی کے باوجود دالان چھت سے زمین تک بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح اس کی صفائی کرنے والوں کو اپنے کام میں دشواری ہوتی ہے اور تعزیہ داروں کی آمد و رفت کے لیے مشکل سے جگہ نکل پاتی ہے۔ اس کے باوجود وزیر کا دل نہیں بھرا۔ جس وقت ڈاکٹر بلین ولایت (لندن) جا رہے تھے تو نواب نے کانچ کے دو تعزیوں کی فرمائش کی جو جھاڑ، فانوس اور دیگر لوازمات کے ساتھ ایک سرخ اور ایک سبز رنگ کا ہو۔ تعزیوں کی قیمت ایک لاکھ روپے مقرر ہوئی سنہ ۱۷۹۶ء میں ایک تعزیہ موصول ہوا اور دوسرا اگلے سال آنا طے ہوا۔ اتفاق سے اگلے سال سنہ ۱۷۹۷ء میں نواب موصوف کا انتقال ہوا اور یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ دوسرا تعزیہ موصول ہوا تھا کہ نہیں"۔[2]

ایک اور ہم عصر مورخ سید عبد اللطیف خاں شوستری جنھوں نے نواب آصف الدولہ کے زمانے میں امام باڑہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اپنی کتاب سال تصنیف سنہ ۱۸۰۱ء میں "تعزیہ خانۂ آصف الدولہ" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ

"۔ ۔ ۔ ۔ از فرط ولائے آئمۂ اطہار صلوٰت اللہ علیہم و جد و جہدی کہ بمراسم تعزیہ داری سید الشہدا داشت تعزیہ خانہ و مسجدے عالی در جنب آں قریب بخانۂ خود بنا نہاد و مبالغ خطیر صرف عمارت و تزئین آں نمود' از دفتر داران آں سرکار۔ مردم ثقہ کہ در آں امر دخیل بودند' شنیدم کہ از دو کرور روپیہ زیادہ خرچ آں شدہ است۔ در تمام ایں کشور عمارتی بآں بزرگی و وسعت و روح و نفا جائے دگر نیست۔ شاہ جہاں در اکبر آباد مقبرہ دارد مسمّیٰ بتاج گنج' مردم از وضع و اساس آں حکایت عزیب کنند کہ عمارت متعددہ با توابع و لواحق و بیوتات دا ماکن عدیدہ ہمہ از سنگ مرمر و منبت بہ فیروزہ و یشم و عقیق الوان اندد گویند بوزن سنگ وکل آں طلا خرچ شدہ است۔ آں را نہ دیدہ ام ایں تعزیہ خانہ و مسجد را کہ دیدم از غرائب ابنیۂ عالم است۔ اندرون آں مشتمل است بر چہاردہ گنبد کہ در ہر گنبدے جاے یکی از ضرائح مقدسہ چہاردہ معصوم است کہ از نقرۂ خالص ہمہ را ساختہ اند۔ در ایام عاشورا کہ آں را زینت کنند' شبہا چہار صد یا نصد چہل چراغ بلورین آویزند و دو ہزار چہل چراغ مجلسی و فانوسہائے بلورین کہ در ہمہ شمعہائے کافوری نصب کردہ اند روشن شوند و ساعتہائے طلا و نقرہ از ہر قسم و دیناہائے طلا و مرصع بجہتہ زینت جا بجا نصب نمایند و در و دیوار اند و بنا ہمہ آئینہا و اسباب طلا و جواہر افتند۔ آں خانہ تمام کوہ نور و رونق شکن و وادی طور گردد و بے شائبہ تکلف و ہر گاہ ناظر از قدرے مسافت در آں تعزیہ

[1] تفضیح الغافلین صفحہ ۱۱۴، [2] تفضیح الغافلین ص ۱۱۵

خانہ جنید۔ دریائی از نور مشاہدہ شود۔ سہ لک روپیہ کہ متہ خرچ آں دو روزہ از سرکار او معین بود۔ اگرچہ بیشتر ازیں زیادہ آمدہ بود بزوار و مستعین می رسید"[1]

امام باڑے کی خوب صورتی اور دلکشی کے بارے میں ایک سیاح کے تاثرات ملاحظہ کیجیے:

"I HAVE NEVER SEEN AN ARCHETECTURAL VIEW WHICH PLEASED ME MORE FROM THE RICHNESS AND VARIETY, AS WELL PROPORTIONS AND GENERAL TASTE OF ITS PRINCIPAL FEATURES THE DETAILS A GOOD DEAL RESEMBLE THOSE OF ETON; BUT THE EXTENT IS MUCH GREATER AND THE PARTS LARGER. ON THE WHOLE IT IS PERHAPS MOST LIKE THE KREMLIN, BUT BOTH IN SPLENDOUR AND TASTE OF MY FAVOURITE FALLS VERY SHORT OF IT."[2]

امام باڑے کی مضبوطی کے بارے میں بعض اقوال درج کیے جاتے ہیں۔ آر۔ ایچ۔ نیول لکھتے ہیں:

"امام باڑے کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سو سال سے زیادہ کی مدت گزر گئی لیکن باوجودیکہ غدر کے زمانے میں یہاں بڑی بڑی توپیں دوڑتی پھرتی تھیں مجال ہے کہ اس کی ایک اینٹ ادھر سے ادھر ہٹ جاتی۔"[3]

یہ عمارت اسی قدر مضبوط ہے جس قدر خوب صورت اور خوش قطع ہے۔ بنیاد اس کی بہت عمیق ہے۔[4]

دالان کا طول ۱۶۰ گز اور عرض ۳۰ گز، بعضوں نے لکھا ہے کہ اس کی وسعت ۱۶۷ فٹ سے ۶۲ فٹ تک ہے۔ چھت ۱۲۰ فٹ چوڑی بالکل لداؤ کی بنی ہوئی بے ستون کھڑی ہے۔[5]

مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی کے قول کے مطابق اتنی بڑی لداؤ کی چھت ساری دنیا میں کہیں نہیں ہے اور اسی وجہ سے یہ بھی دنیا کی اعجوبۂ روزگار یادگاروں میں شمار کی جاتی ہے[6] لیکن بایں ہمہ پھر بھی نواب اس شاندار عمارت سے مطمئن نہیں تھے۔[7]

امام باڑے کے بارے میں ایک اور ہم عصر مورخ مرتضیٰ حسین بلگرامی لکھتے ہیں:

"ہیچ ملک را از املاک ہفت اقلیم بانی آں در رفعت و متانت و وسعت پیدا نیست"[8]

امام باڑہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں محاذ جنگ بن گیا تھا۔ مرزا محمد کاظم جو ہنگامے کے زمانے میں لکھنؤ میں موجود تھے لکھتے ہیں:

"جماعتے از گورا با نہایت چستی و چالاکی داخل امام باڑہ نواب آصف الدولہ گردیدہ۔ بقبضۂ خود گرفتند و بر جوانی امام باڑہ توپہا نصب کردہ سر کردن آغاز نہادند گولہ ہائے آں تا دور رسید سکنۂ اطراف و جوانب آں سراسیمہ شدہ، مکانہائے خود گزاشتہ فراری شدند۔ ہنگامۂ عظیم برپا شد از اول شب تا صبح توپہا بر اطراف امام باڑہ نصب نمودہ سر می کردند و بر جانب محلہ ہا می انداختند از دور معائنہ می شد کہ گویا شعلہ ہائے آتش بسرعت بہ ہوا می زدند"[9]

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

---

[1] تحفۃ العالم ص ۵۲۲-۵۲۳، سال تصنیف سنہ ۱۸۰۱ء

[2] Narrative of the Journey through Upper Provinces of India, Vol I, P.386. by W. Heber, London, 1828 A.D.

[3] لکھنؤ گزیٹیر ص ۲۰۲ [4] تواریخ نادر العصر ص ۱۵۸-۱۵۹ مطبوعہ نولکشور سنہ ۱۸۹۳ء [5] لکھنؤ گزیٹیر ص ۲۰۳

[6] گزشتہ لکھنؤ ص ۳۰ [7] تفہیم الغافلین ص ۱۱۵ [8] حدیقۃ الاقالیم ص ۱۵۵ مطبوعہ نولکشور [9] رسالہ سوانح عباسی ص ۲۰

اقبال ماہر

وادیٔ گنگ و جمن

اے وادیٔ گنگ و جمن اے جنّت ارضِ وطن معمورۂ عصرِ رواں ، افسانۂ عہدِ کہن
ایوانِ اربابِ ہنر اے درس گاہِ اہلِ فن ہر سر میں سودائے سفر ہر دل میں منزل کی لگن
پیغامِ یک جہتی لیے ہیں لب پہ شیخ و برہمن
اے وادیٔ گنگ و جمن

اے رو کشِ خلدِ بریں اے رشکِ بزمِ کہکشاں خوشحال ہیں تیرے مکیں آباد ہیں تیرے مکاں
تیرے در و دیوار پر تہذیبِ رفتہ کے نشاں صدیوں کے نقشِ کالحجر قرنوں کی روشن داستاں
گہوارۂ علم و ادب کاشانۂ تخلیق فن
اے وادیٔ گنگ و جمن

ہر پھول ہر غنچہ یہاں سرمایہ دارِ رنگ و بو ہر نخل میں نشو و نما ہر شاخ میں جوشِ نمو
فردوس ہے ہر آستاں جنت نشاں ہر کاخ و کو ہر ذرّۂ خاکِ چمن میں زندگی کی آرزو
لبریز صہبائے وفا ہیں لالہ و سرو و سمن
اے وادیٔ گنگ و جمن

یہ بزم ہے کردار کی محفل ہے یہ جذبات کی سرسبز کھیتوں کا جہاں یہ سرزمیں باغات کی
تعبیرِ خوابِ ارتقا تفسیر احساسات کی تاریخ زندہ ہے یہاں گزرے ہوئے لمحات کی
فرطِ عقیدت سے یہاں جھکتا ہے دھرتی پر گگن
اے وادیٔ گنگ و جمن

شہکار ہے ہر شے یہاں فنکار ہے ہر ذی نفس ہر صاحبِ ادراک کو تکمیلِ حکمت کی ہوس
ہر شام ہے منزل نشاں ہر صبح ہے بانگِ جرس مسجد کے وہ مینار و در مندر کے وہ اونچے کلس
گونجی مؤذّن کی اذاں گایا پجاری نے بھجن
اے وادیٔ گنگ و جمن

پروفیسر ذکی الرحمٰن خان

ڈرامہ میں تصادم کی اہمیت

یوں تو ہر صنف ادب زندگی کی کسی نہ کسی انداز میں عکاسی کرتی ہے لیکن ڈرامہ اور زندگی کا تعلق کچھ مختلف ہے۔ ڈرامہ زندگی کا زندہ REPRESENTATION ہے۔ آرٹاد (ARTAUD) اپنی کتاب THE THEATRE AND ITS DOUBLE میں رقم طراز ہے۔

"THE THEATRE SHOULD NOT REPRESENT LIFE; THE THEATRE IS LIFE."

ارسطو (ARISTOTLE) نے یہی بات یوں کہی ہے۔

"IT IS ACTED, NOT NARRATED"

اس خصوصیت کی بنا پر ڈرامہ میں زندگی کی زندہ خصوصیات کا ظہور زیادہ نمایاں طور پر ہوتا ہے۔ اور تصادم زندگی کی ایک بنیادی اور اہم خصوصیت ہے۔ ڈارون کی تھیوری STRUGGLE FOR SURVIVAL میں یہی بات کہی گئی ہے اور کسی شاعر نے اسے یوں کہا ہے ؎

زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

اور برنارڈ شا (SHAW) کے بقول زندہ انسان کا جسم ایک میدانِ کارزار ہے جہاں صحت کے جراثیم کی فوجیں بیماری کے جراثیم کی فوجوں سے ہر وقت برسرِپیکار ہیں۔ زندگی کا تصور تصادم کے بغیر ناممکن ہے اور ڈرامہ کا تصور بھی بنا تصادم کے مشکل ہے۔ قدیم یونانی ڈرامہ سے لے کر موجودہ دور تک ڈرامہ میں تصادم کسی نہ کسی شکل میں ایک جزو لاینفک رہا ہے۔

آیئے اس تصادم کی مختلف نوعیات کا ایک مختصر جائزہ لیا جائے۔ تصادم کی عام طور پر دو شکلیں ہوتی ہیں۔ دو اشخاص اور اُن کے حامیوں کے گروہوں کے درمیان یا ایک شخص کے دل و دماغ میں مختلف قوتوں کے درمیان۔ کسی بھی اچھے ڈرامہ میں دونوں ہی قسم کا تصادم پایا جاتا ہے ــــ ڈرامہ کے پلاٹ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں ایک شخص اور اس کے حامی کامیابیاں حاصل کرتے ہیں اور دوسرے حصے میں مخالف گروہ کامیابی کی منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ المیہ (TRAGEDY) میں اکثر دونوں گروہ ایک دوسرے کو ختم کر دیتے ہیں۔ ہیملٹ (HAMLET) کے دم توڑتے وقت اس کے دونوں مخالف کلاڈیئس (CLAUDIUS) اور لارٹیس (LAERTES) دم توڑ چکے ہوتے ہیں۔ یہی انجام اوتھیلو (OTHELLO) کا بھی ہے۔ ایاگو (IAGO) حالانکہ زندہ رہتا ہے لیکن وہ چپ رہنے کی قسم کھا کر اپنے کو بے اثر بنا لیتا ہے۔ یونانی المیہ نگار SAPHOCLESE کے المیہ اِی ڈی پس OEDIPUS کے المیہ کی ذمہ داری اس کے کردار یا اُس کے افعال پر نہیں ڈالی جا سکتی اس کی قسمت یا بدقسمتی کا فیصلہ اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ وہ اپنے باپ کو قتل کرتا ہے اپنی ماں سے شادی کرتا ہے اس لیے نہیں کہ وہ قاتل یا بدکردار ہے بلکہ اس لیے کہ قدرت نے یہ سب کچھ پہلے سے اس کے لیے طے کر لیا تھا۔ اس قسم کے تصادم کا منظر دل و دماغ پر بہت بوجھ ڈالتا ہے۔

سولھویں صدی کے ڈرامہ نگار مارلو (MARLOWE) کے ڈرامہ "ڈاکٹر فاسٹس" (DR. FAUSTUS) میں اسی چیز کو ذرا فرق سے پیش کیا گیا ہے۔ فاسٹس خود بھی جانتا ہے کہ وہ جس راستے پر چل رہا ہے وہ اس کو تباہی کی جانب لے جا رہا ہے مگر وہ سب کچھ بھلا کر دنیاوی مدت میں مزے اڑاتا ہے۔

شیکسپیر کے ڈراموں میں تصادم بہ ظاہر انسانی ہستیوں کے بیچ

ہوتا ہے لیکن ان کے دیدہ و نادیدہ آفاقی قوتوں کی کارفرمائی کا احساس بھی رہتا ہے۔ بہ بجائے کہ ہیملیٹ کا تصادم کلاڈیس (CLADIUS) سے، میکبتھ (MACBETH) کا ڈنکن (DUNCAN) کے حامیوں سے، اوتھیلو (OTHELLO) کا آیاگو (IAGO) سے، LEAR کا اس کی ناخلف اولاد سے ہے۔ تصادم کی ابتدا ان کے افعال سے ہوتی ہے اور اپنے افعال کے وہ خود ذمہ دار بھی ہوتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھنے پر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ سب OEDIPUS کی طرح مجبور ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ کوئی ایسی طاقت ہے جو ان کو ایسے حالات کے گرداب میں ڈال دیتی ہے جس کے باہر وہ تمام کوششوں کے باوجود نہیں نکل سکتے۔ ان کا تصادم اپنے حالات سے ہوتا ہے جو ان کے لیے ناقابل تسخیر ہے۔ ہیملیٹ (HAMLET) اگر میکبتھ (MACBETH) کی جگہ ہو تو المیہ نہ ہو۔ OTHELLO کے علاوہ کوئی بھی آیاگو (IAGO) کے شیطانی ذہن کو سمجھ سکتا ہے۔ غرض یہ کہ شیکسپیئر کی TRAGEDIES میں تصادم کی نوعیت OEDIPUS میں تصادم کی نوعیت سے تھوڑی ہی مختلف ہے۔ شیکسپیئر کے طربیہ (COMEDIES) میں بھی یہی تصادم پایا جاتا ہے لیکن یہاں پر تصادم کا نتیجہ خوشگوار نکلتا ہے۔ المیہ (TRAGEDY) میں متصادم قوتیں ایک دوسرے کو تباہ کیے بغیر دم نہیں لیتیں لیکن طربیہ (COMEDYS) میں یہ قوتیں آخر میں "جیو اور جینے دو" کے اصول پر عمل کرتی ہیں۔ شیکسپیئر کے بعد ایک طویل عرصے تک ڈرامے کے لیے ایک تاریک دور رہا۔ اس دور کے ڈراموں میں تصادم کا فقدان تو نہیں ہے لیکن متصادم ہستیوں میں وہ جوش اور ولولہ نہیں پایا جاتا اور تصادم کی بنیادیں اتنی کمزور ہیں کہ ان میں کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔ شاید اسی لیے اس دور کے ڈراموں کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو شیکسپیئر یا اس کے دور کے ڈراموں کو حاصل ہے۔ اس دور سے ڈرامہ میں تصادم کی اہمیت کافی واضح ہو جاتی ہے۔ ابسن (IBSON) اور شا (SHAW) کے ڈراموں میں متصادم ہستیاں اور تصادم کی بنیادیں سترہویں اٹھارہویں صدی کے ڈراموں سے زیادہ مختلف نہیں لیکن اس وقت زندگی میں اتنا انقلاب آچکا تھا کہ وہ قدریں جو اس وقت غیر اہم نہیں تھیں اب اہم بن گئی ہیں۔ اب تصادم ہیملیٹ (HAMLET) اور کلاڈیس (CLADIUS) کے بجائے BLUNTSCHILLI اور SERGIUS کے درمیان ہے اور تصادم کی بنیاد تخت و تاج نہیں بلکہ دو مختلف نقطۂ نظر ہیں۔

چیخوف (CHEKOV) کے ڈراموں میں زندگی کو بے معنی اور اس کی جدوجہد کو لاحاصل پیش کیا گیا ہے مگر تصادم کو ان ڈراموں میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ THE THREE SISTERS میں حال اور ماضی میں تصادم ہے۔ CHEKOV کے کردار بے جان ہوتے ہیں اور وہ ایک بے مقصد زندگی گزارتے ہیں اس لیے CONGREVE اور اس کے ساتھی ڈرامہ نگاروں کی طرح CHEKOV کے ڈراموں کے تصادم میں وہ زور نہیں پایا جاتا جو شیکسپیئر، ابسن (IBSON) اور (SHAW) کے ڈراموں میں پایا جاتا ہے۔

BRECHT کے ڈراموں میں ایسا نہیں ہے اس کے کردار جاندار ہیں اور ان کا آپس کا تصادم دلچسپ۔ THE GOOD WOMAN تصادم سے پر ہے اور تصادم انسانی زندگی کی بنیادی قدروں یعنی اچھائی اور برائی میں ہے۔ THE LIFE OF GALILEO میں گلیلیو (GALILEO) کی شخصیت بہت نمایاں اور دلچسپ ہے اس کا تصادم جن قوتوں سے ہے وہ بھی اپنی جگہ پر مضبوط ہیں اس لیے ڈرامے میں جان ہے اور وہ دیکھنے اور پڑھنے میں دلچسپ ہے۔ چیخوف (CHEKOV) اور (BRECHT) کے ڈراموں کے تقابل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بنا تصادم کے ڈرامے میں دلچسپی کا فقدان ہوتا ہے۔

امریکی ڈرامہ نگار OLNEILL یونانی ڈرامہ نگاروں سے بہت متاثر تھا اس کے بیشتر ڈرامے گریک ڈراموں کی کہانیوں کے بارے میں ہیں۔ THE LONG DAY'S JOURNEY INTO NIGHT بڑی حد تک OEDIPUS سے مشابہت رکھتا ہے۔ MOURNING BECOMES EL-ECTRA، AESCHYLUS، DESIRE UNDER THE ELMS یوریپیڈیز (EURIPEDES) کے ڈراموں سے متاثر ہیں۔ اس لیے O'NE... کے ڈراموں میں تصادم گریک ڈراموں کی نوعیت کا ہے THE LONG DAY'S JOURNEY میں ایک جگہ کہا گیا ہے:-

"NONE OF US CAN HELP THE THINGS
LIFE HAS DONE TO US!"

یعنی انسان کی سعی بے سود ہے یہی احساس ہم کو OEDIPUS پڑھنے یا دیکھنے کے بعد بھی ہوتا ہے لیکن پڑھنے یا دیکھنے کے دوران نہیں ہوتا جبکہ OINEILL کے ڈرامے میں یہ احساس خود کرداروں کو بھی ہے۔ اگر سعی کے دوران احساس

ہوجائے تو پھر وہ بے معنی ہوجاتی ہے اور تصادم کے منظر میں جان نہیں رہتی۔ BECKETT اور IONESCO کے یہاں زندگی کے بے معنی اور فضول ہونے کا احساس بہت قوی ہے۔ BECKETT کے ایک کردار کے الفاظ میں:

> "NOTHING HAPPENS, NOBODY COMES,
> NOBODY GOES,
> IT IS AWFUL."

زندگی کو پرمعنی اور بامقصد کس طرح بنایا جائے BACKETT کے کردار ایسی ہی کشمکش میں الجھے رہتے ہیں مگر یہ احساس بھی رہتا ہے کہ یہ کشمکش لاحاصل ہے اور زندگی کو بامقصد نہیں بنایا جاسکتا۔ IONESCO کے ڈرامہ RHINOCEVOS میں انسانوں کو جانوروں کی پیروی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ برطانیہ میں اس دور کے دو اہم ڈرامہ نگار FRY اور ایلیٹ (ELIOT) ہیں۔ ایلیٹ کا ڈرامہ MURDER IN THE CATHEDRAL اس کا سب سے مشہور ڈرامہ ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس میں متصادم قوتیں جاندار ہیں اور تصادم کی بنیادیں مضبوط۔ یہی بات FRY کے THE LADY IS NOT BURNING کے لیے بھی کہی جاسکتی ہے ان کے علاوہ WESKER, ARDEN, PINTER, OSBORNE وغیرہ قابل ذکر ہیں ان کے ڈراموں کو پڑھنے یا دیکھنے کے بعد اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ موجودہ دور اگرچہ کہ شدید تصادم اور کشمکش کا دور ہے لیکن فراریت اور بیزاری کا عنصر حاوی رہتا ہے۔ ایک طرف تو آج کا انسان قدرت کی ہر طاقت کو اپنی تحویل میں لینے کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسری طرف وہ ایک بے چارہ بےکس و بیزار انسان کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ کوئی MACBETH یا RICHARD جو بہادری سے مخالف حالات سے متصادم ہوسکے یا کوئی ہیملٹ (HAMLET) جو بے دریغ اپنی جان سے کھیل جائے مشکل سے نظر آتا ہے۔

ان ڈراموں میں تصادم ہے تو ضرور لیکن متصادم قوتیں اتنی بے جان اور تصادم کی بنیادیں اتنی کمزور ہوتی ہیں کہ اس میں کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہو پاتی۔ اس کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ سنیما اور ٹیلی ویژن کی بنا پر ڈرامہ اپنی قدیم اہمیت سے محروم ہوگیا۔ پہلے زندگی کو زندہ روپ میں پیش کرنے کا واحد ذریعہ ڈرامہ تھا لیکن اب ایسا نہیں۔

اس کے علاوہ زندگی کے تصادم میں انسان کی اہمیت بڑھنے کے بجائے بہت کم ہوگئی ہے۔ آج کا انسان اپنے کو کسی عظیم موہوم قوت کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں سمجھتا لیکن وہ کھلونا اب بھی ہے اور کھلونا بھی اس طاقت کا جس کو اس نے اپنے کھلونے کے طور پر ایجاد کیا تھا۔ آج کے دور میں انسان کی اہمیت اس سے کہیں کم ہے جتنی کہ GREEK TRAGEDIES کے دور میں تھی۔ اور آج کا OEDIPUS اس دور کے OEDIPUS سے زیادہ بے بس ہے۔ اس دور کا OEDIPUS بے بس تھا مگر بیزار نہیں۔ آج کا انسان بے بس بھی ہے اور بیزار بھی۔ پھر اس کے تصادم میں کیا جان اور کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔

ماحصل یہ کہ تصادم ڈرامے کا ایک ایسا عنصر ہے جس پر ڈرامے کی دلچسپی کا انحصار ہے شیکسپیر کے ڈرامے آج بھی دلچسپ ہیں کہ ان میں متصادم ہستیاں اور قوتیں جاندار ہیں۔ ان کے تصادم کی بنیادیں اس قدر مضبوط ہیں کہ زندگی کی بنیادیں ہل جاتی ہیں لیکن تصادم کی بنیادیں اپنی جگہ قائم رہتی ہیں۔ آج کے دور کے ڈرامے میں اس چیز کا فقدان ہے اور اسی لئے وہ دلچسپی سے محروم ہے۔

★

غزل

رشید کوثر فاروقی

میری آنکھوں سے لپک جاتی ہے جب پیار کی آنچ
چونک پڑتی ہے ترے شعلۂ رخسار کی آنچ

کون سمجھے گا مرا سوزِ تمنا، جو کہوں
کس نے دیکھی ہے تری نرگسِ بیمار کی آنچ

بھیگی راتوں میں مرے دل سے لپٹ جاتی ہے
میرے ہم ذوق پپیہے تری جھنکار کی آنچ

جانے گھل گھل کے ان آنکھوں سے بہی جاتی ہے
اُف مرے پردہ نشین عشق کے آزار کی آنچ

اُن کے آنے میں یہ تاخیر، الٰہی توبہ
جیسے سینے میں اترتی ہوئی تلوار کی آنچ

تیرے مکھڑے پہ سرِ شام شفق کا آنچل
جیسے جوگی کی دُلھن کے لب و رخسار کی آنچ

عکس انداز ہے یوں شمعِ شبستانِ جمال
کروٹیں لیتی ہے گیسوئے شکن دار کی آنچ

بے محابا تری دوشیزہ نظر کا اُٹھنا
جیسے لہراتی ہو خنجر پہ نئی دھار کی آنچ

روشنی گوہر و یاقوت میں مچلے جیسے
لب و دنداں پہ ترے چہرۂ گلنار کی آنچ

میری غزلوں سے ترا حسن نہ رسوا ہو جائے
شوخ ہوتی ہے بہت گرمیِ بازار کی آنچ

غزل

مجیب بستوی

نشانِ جادۂ منزل کو ڈھونڈھتے ہیں ہم
ہو درد جس میں اسی دل کو ڈھونڈھتے ہیں ہم

طلب کا عزم سلامت کہ اب سرِ طوفاں
نظر میں جلوۂ ساحل کو ڈھونڈھتے ہیں ہم

غرورِ تشنہ لبی کو سنبھال کر ساقی
کسی فقیر کی محفل کو ڈھونڈھتے ہیں ہم

خدا گواہ کہ مطلب پرست دنیا میں
وفا کے جذبۂ کامل کو ڈھونڈھتے ہیں ہم

اگر وفا ہے کوئی جرم ہم بھی مجرم ہیں
نقوشِ طوق و سلاسل کو ڈھونڈھتے ہیں ہم

جسے نہ کر سکے آسان عشق والے بھی
مجیب اس بڑی مشکل کو ڈھونڈھتے ہیں ہم

شرافت حسین

(افسانہ)

راکھ سے ڈھکا انگارہ

جانکی ادھر کئی ہفتوں سے مدن سے بے حد خوف زدہ رہنے لگی تھی۔ اگرچہ اس کے اور مدن کے درمیان خاموشی کی ایک دیوار سی کھڑی ہو گئی تھی، پھر بھی وہ خود کو محفوظ نہیں پا رہی تھی۔ کبھی اچانک جب مدن سے نگاہیں ٹکرا جاتیں تو جانکی کو ان آنکھوں کے صحرا میں ایک بوالہوس خوں خوار بھیڑیا شکار کی تلاش میں گھومتا ہوا صاف نظر آجاتا اور وہ خوف سے کانپ اٹھتی ——— ایک ہی گھر میں ساتھ رہتے ہوئے وہ کب تک اپنے کو بچائے رکھ سکتی ہے!

چند سال پہلے جب جانکی اس گھر میں دلہن بن کے آئی تھی، مدن کیسا معصوم، کم گو اور شرمیلا لڑکا تھا، اس وقت وہ سب اپنے قصبہ ہی میں رہتے تھے۔ خود جانکی اکثر مذاق مذاق میں اسے چھیڑا کرتی۔ سردیوں کی صبح جب وہ مدن کے سر سے زبردستی لحاف کھینچ کر جگانے لگتی تو وہ التجا آمیز لہجے میں کہتا

"بھابی! تم روز ہی اتنے سویرے مجھے کیوں جگاتی ہو؟ کسی دن تو جی بھر کے سو لینے دیا کرو۔"

"ارے، اتنا سارا دن چڑھ آیا اور تمھیں سویرا لگ رہا ہے ——— جانتے ہو اس وقت وہ لوگ سو کر اٹھتے ہیں جن کی سہاگ رات ہوتی ہے۔ تمھاری بھی دلہن آئے گی تو سارا دن سوتے رہنا، میں جگاؤں گی ہی نہیں!"

کچھ اسی قسم کے تیکھے جملے سن کر جب مدن لڑکیوں کی طرح شرمانے لگتا تو وہ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر خوب لطف اندوز ہوتی رہتی تھی۔

جانکی کے شوہر ہری کا تبادلہ ہو جانے پر وہ تینوں بمبئی جیسے رنگین اور پر رونق شہر میں آ گئے تھے، جہاں زندگی دن رات دوڑتی بھاگتی رہتی تھی۔ اس وقت تک مدن کے اندر کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کے بعد نہ جانے کالج کی فیشن زدہ فضاؤں کا اثر تھا یا جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہوئی عمر کا تقاضہ، جیسے جیسے دن گزرتے گئے، سیدھے سادے مدن کے دبے جذبات الفاظ کے سانچے میں ڈھلنے لگے۔ وہ ایسے بھونڈے اور عریاں انداز میں مذاق کیا کرتا کہ جانکی حیرت سے اس کا منھ دیکھتی رہ جاتی۔ کوئی جواب ہی نہ بن پڑتا۔

مدن دن پر دن شوخ اور گستاخ ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی آتے جاتے ہاتھ بڑھا کر وہ اس کا پیٹ چھو لیتا اور کہتا ——— "بھابی! آخر تمھارے کوئی بچہ کیوں نہیں ہوا اب تک؟" کبھی کہتا "بھابی! آجکل تم کچھ زیادہ تندرست ہو گئی ہو، دیکھو تو بدن کیسا کسا ہوا ہے!"

جانکی دم بخود رہ جاتی۔ کھسیانی ہنسی ہنس دیتی۔ ایسی بے ہودہ حرکت پر آنکھوں اور ہونٹوں کو سکوڑ کر خفگی کا اظہار کرتی لیکن مدن ڈھیٹ ہوتا جا رہا تھا۔ اس پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا۔ اس کی بے باک نگاہیں جانکی کے جسم کو جیسے چھیدتی چلی جاتیں!

ابھی تک جانکی مدن کی حرکتوں کو اس کی نادانی ہی سے تعبیر کرتی تھی۔ لیکن اسے یہ بھی احساس تھا کہ اگر مدن کو باز نہیں رکھا گیا تو ایک دن وہ حد سے تجاوز کر جائے گا! وہ عمر کی ان منزلوں سے گزر رہا تھا، جہاں جنسی خواہشات پوری شدت کے ساتھ بیدار ہونے لگتی ہیں۔ اور اگر ان خواہشات کو دبا کر نہ رکھا گیا تو تنہائیوں میں کسی

دوشیزہ کی جسمانی بناوٹ کا تصوّر کرکے ہی سارے بدن میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جنسی سرور و کیف سے ہمکنار ہونے کا جذبہ اکثر ذہن کے تمام دریچے بند کر دیتا ہے اور انسان ایسے غلط راستوں پر دوڑنے لگتا ہے جہاں نازک رشتوں کی پہچان بھی باقی نہیں رہ جاتی!

جانکی کبھی کبھی اسی سوچ میں ڈوب جاتی کہ وہ اپنے اور مدن کے درمیان بے تکلفی کو کس طرح ختم کرے اور دیور بھابی کے مقدس رشتے کی عظمت کو برقرار رکھے۔ اس نے نیچی تراشش کے گریبان والے بلاوز پہننے چھوڑ دیے میک اپ کے سارے سامان کو بھی مقفل کر دیا تاکہ اپنے حسن کو کسی طرح بے پردہ نہ ہونے دے لیکن اس پر بھی مدن کے رویے میں ذرا بھی تبدیلی نہ آئی۔ وہ اسی طرح بے وجہ اس کے حسن و شباب کی تعریفیں کرنے لگتا۔ ایسی للچائی نگاہوں سے گھورتا جنھیں عورت فوراً بھانپ لیتی ہے اور اس کے اندر ایک انجانے خطرے کا الارم بج اٹھتا ہے!

جانکی نے اپنے شوہر ہری سے کبھی ان سب باتوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ البتہ مدن کی بگڑتی ہوئی عادتوں کی نشاندہی ضرور کی تھی۔ مثلاً وہ بالکنی پر کھڑا اکثر نیچے گلی سے گزرنے والی جوان لڑکیوں کو زور زور سے سیٹی بجا کر مخاطب کیا کرتا ہے۔ سامنے والے فلیٹ کی روبینہ جیسال جب اسکول جانے کے لیے لباس تبدیل کرتی ہے تو وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں جھری بنا کر جھانکا کرتا ہے۔

جانکی کی بات سن کر ہری ہنس دیا کرتا تو وہ جھنجھلا اٹھتی اور کہتی "آپ جھوٹ سمجھ رہے ہیں کیا؟"

"نہیں، تم بالکل سچ کہہ رہی ہو۔ لیکن پہلے میں بھی یہی سب کیا کرتا تھا اگر آج تمہاری نظر میں ایک شریف انسان ہوں!" ہری جواب دیتا۔

چھوٹے بھائی کے اعتماد کی بنیاد اتنی مضبوط اور مستحکم تھی کہ اسے اکھاڑنا مشکل تھا۔ بہت ممکن تھا اس کوشش میں خود جانکی کے ہاتھ زخمی ہو جاتے! اس بھرپور اعتماد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مدن اب بھی ہری کا اتنا ہی ادب و احترام کیا کرتا جتنا آٹھ دس برس پہلے کرتا تھا۔

بھائی کی موجودگی میں اس کی زبان ہی نہ کھلتی۔ بہت دھیمے لہجے میں نظر جھکا کر بات کرتا۔ ہری کے سامنے سگریٹ تک پینا گناہ سمجھتا تھا لیکن اس کے باہر جاتے ہی۔۔ اپنے بناوٹی خول سے باہر نکل آتا۔

جانکی اس دن غصّے سے بھڑک اٹھی، جب مدن زبردستی اس کے رخساروں کا بوسہ لینا چاہ رہا تھا۔

"مدن! مجھے ایسے گھناونے مذاق پسند نہیں۔ آخر تم نے مجھ کو کیا سمجھ رکھا ہے؟"

مدن بے حیائی سے ہنستے ہوئے کہنے لگا ——— "خفا کیوں ہوتی ہو بھابی۔ میں نے تو دوستوں سے سن رکھا ہے بھابی آدھی بیوی کے برابر ہوتی ہے۔"

"تمھارے دوست لچے اور لفنگے ہیں۔ انھیں نہیں معلوم بھابی آدھی ماں کے برابر ہوتی ہے! آنے دو تمھارے بھیا کو۔ ان سے سب کہہ دوں گی"

مدن کا چہرہ فق ہو گیا۔ اسے جانکی سے ایسی امید ہرگز نہیں تھی۔ گھبراہٹ، غصّہ اور خوف بھرے لہجے میں بولا ———"کیا کہو گی؟"

"یہ کہوں گی" کہ تم .... کہ تم ...."

جانکی جملہ پورا ادا نہ کر سکی اور اس کا گلا رندھ گیا۔

"تم میری شکایت کرو گی؟ تو پھر یاد رکھو کہ میں بھی تمہارے خلاف زہر اگلنے لگوں گا۔ اور تم اچھی طرح جانتی ہو، بھیا پر کس کی بات کا زیادہ اثر ہوگا!"

مدن کا خیال صحیح تھا۔ وہ ہری کو بہت پیارا تھا۔ اگر کبھی اس کے سامنے یہ مسئلہ آ جاتا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اپنانا ہوگا تو یقیناً وہ مدن کو جانکی پر ترجیح دیتا!

جانکی نے ہری سے کوئی شکایت نہ کی۔ وہ تو طیش میں آ کر اتنا کچھ کہہ گئی تھی۔ لیکن مدن کے من میں شاید بہت سارا غبار دبا پڑا تھا۔ اس نے جانکی سے بولنا بند کر دیا تھا، یہ بات جانکی کے لیے قدرے سکون بخش تھی لیکن کبھی کبھی وہ بہت ڈر جاتی۔ اسے لگتا، مدن کسی انتقامی جذبے کے زیر اثر اندر ہی اندر سلگ رہا ہے۔ جب وہ ہری

کے جانے کے بعد گھر سے نکلتا تھا اور اس سے پہلے ہی واپس آ جاتا تھا۔ وہ لمحے جانکی پر بہت بھاری ہوتے جب مدن گھر میں ہوتا۔ وہ بے چینی سے ہری کا انتظار کیا کرتی۔ وہ آ جاتا تو جیسے اُسے بہت بڑی اذیت سے چھٹکارا مل جاتا!

ایک رات جانکی بستر پر جانے کے بعد ہری سے کہہ اٹھی:

"آپ ذرا مدن کا بھی خیال رکھا کیجیے کہ وہ من لگا کر پڑھ رہا ہے کہ نہیں؟ جو پیسے اسے ملتے ہیں وہ کہاں خرچ کرتا ہے؟ آپ تو بس دفتر کے کاموں میں ہی الجھے رہتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے مدن کچھ آوارہ قسم کے نوجوانوں کی سنگت میں پڑ گیا ہے۔ پڑھتا لکھتا خاک نہیں ہے۔"

ہری پہلے تو ایک ٹک جانکی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر سر جھکا کر بولا:

"تم آج کل مدن کی بہت شکایت کرنے لگی ہو؟"

ہری کا بدلا ہوا لہجہ سن کر جانکی چونکی۔ جلدی سے بولی ——

"نہیں، آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مدن بہت بدل گیا ہے۔ آپ تو کچھ بھی نہیں جانتے!"

"میں خاموش رہتا ہوں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ مجھے کسی بات کا علم نہیں۔ جانتی ہو مدن کیا کہہ رہا تھا؟"

"کیا؟" جانکی کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔

"اس کے لیے چھوٹی موٹی نوکری تلاش کر دوں، وہ اب آگے پڑھنا نہیں چاہتا، اس لیے کہ اس کے خیال میں تم اسے اپنے شوہر پر بوجھ سمجھنے لگی ہو، چنانچہ اب وہ اپنی کمائی کھانا چاہتا ہے! اُسے ضرور تمھاری کسی بات سے ٹھیس پہنچی ہے —— جانکی! میرا ایک ہی بھائی ہے، یہ کبھی نہ بھولنا۔ اور ہاں، اس کی رگوں میں میرا ہی خون دوڑ رہا ہے، وہ برا آدمی کیسے بن سکتا ہے!"

ہری کا انداز سمجھانے والا تھا لیکن جانکی کو اتنی ذہنی تکلیف پہنچی کہ وہ ساری کا آنچل منہ میں دبائے بے اختیار رونے لگی۔ مدن اس کے لیے اتنا خطرناک بن جائے گا، وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ سات آٹھ برس سے جس مدن سے وہ اپنے چھوٹے بھائی کی طرح خلوص و محبت سے پیش آ رہی تھی وہ اس پیار اور محبت کا کیسا صلہ دے رہا تھا۔

تیز موسلا دھار بارش اور طوفانی ہواؤں کا شور سن کر جانکی کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ رات بڑی بھیانک اور ڈراؤنی لگ رہی تھی۔ وہ گھر میں بالکل تنہا تھی۔ ہری شام ہی کو دفتر کے کسی ضروری کام سے دوسرے شہر چلا گیا تھا اور اس کو کل دوپہر تک واپس لوٹ کر گھر آنا تھا۔

جانکی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر ایک شیلف سے ایک کتاب نکال لی۔ ان موٹی موٹی کتابوں سے اسے ہمیشہ وحشت ہوتی تھی مگر آج وہ زبردستی پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ دفعتاً مدن زور زور سے دروازے پر دستک دینے لگا ساتھ ہی گھبرائی ہوئی آواز میں کہتا جاتا —— "بھابھی دروازہ کھولو جلدی کھولو۔ ابھی ابھی تمھارے کمرے میں ایک سانپ گیا ہے۔"

وہ مارے خوف کے بھاگتی ہوئی جیسے ہی باہر آئی مدن نے اسے اپنی باہوں میں بھر لیا اور ناپاک ارادوں میں ڈوبی آواز میں بولا۔۔

"آج کی رات میں اپنے سارے ارمان نکال لوں گا۔ تم اگر سیدھی طرح نہیں مانتی ہو تو جبراً ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"مدن ایسی بے ہودگی میں برداشت نہیں کر سکتی۔ تیری یہ جرأت لفنگا کہیں کا۔ آخر تو چاہتا کیا ہے" وہ چیخ کر بولی۔

"وہی جو ہر نوجوان مرد عورت سے چاہتا ہے۔"

مدن کی بھاری آواز جیسے ناک سے نکل رہی ہو۔ اس نے شراب بھی پی رکھی تھی۔ کئی بدبودار بھبکے جانکی کے رخساروں سے ٹکرائے وہ کسمسائی لیکن مدن کی گرفت مضبوط دیکھ کر مجبوراً التجا کرنے لگی۔

"مدن تو ہوش میں نہیں ہے۔ چھوڑ دے میرے بھیا۔ میں نے تجھے ماں کی طرح پیار دیا ہے۔ میں اس آدمی کی بیوی ہوں جو تیرا بھائی بھی ہے۔ باپ بھی!"

لیکن مدن کے کان بہرے ہو گئے تھے شیطان اس پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔

یکایک نفرت اور حقارت کے زوردار طوفان نے جانکی کے

وجود کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ بے قابو ہو کر چلائی۔
"ذلیل، کمینے تو مجھے اتنی کمزور کیوں سمجھ رہا ہے۔ میں تجھے کچا چبا جاؤں گی۔"

جانکی نے پنجے اپنے تیز ناخن مدن کے چہرے پر گاڑ دیئے اور تڑپ کر الگ ہو گئی۔ پھر بالکنی کی طرف تیزی سے لپکی کہ تیسری منزل سے نیچے کود کر اپنی جان دے دے۔ لیکن دروازے کی سٹکنی کھولنے تک مدن پھر اسے دبوچ چکا تھا۔

ہاتھا پائی کرتے کرتے اچانک مدن ہکا بکا سا کھڑا رہ گیا اس کے ہاتھ پاؤں بے جان ہو گئے۔ جیسے جسم کا سارا خون ہی منجمد ہو کر رہ گیا ہو۔

باہری دروازے سے لگا ہری کھڑا تھا۔ خاموش بے حس و حرکت جیسے وہ ہری نہ ہو، اس کا بت ہو!

جانکی دونوں ہاتھ سینے پر رکھے لمبی لمبی سانسیں لیتی دیوار سے ٹک گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہری کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ مدھم روشنی میں ہری کا چہرہ پرسکون نظر آ رہا تھا جیسے وہ سینما ہال میں کھڑا پردے پر کوئی ریپ سین دیکھ رہا ہو! غم و غصے کا شدید طوفان اس کے اندر کہیں دبا پڑا تھا بڑے اطمینان سے اس نے جیب سے سگریٹ نکالی سلگائی، اور ٹھہری ہوئی آواز میں کہنے لگا ـــــ "میں تجھے معاف نہیں کروں گا مدن۔ لیکن میں نے ماں کو مرتے وقت وچن دیا تھا کہ تیری ہر خواہش پوری کروں گا۔ اس لیے ...... تو اپنی یہ خواہش بھی پوری کر ڈال میں باہر تیرا انتظار کر رہا ہوں!"

اتنا کہہ کر وہ فوراً اندر سے نکل آیا اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ شاید ہری بھی پاگل ہو گیا تھا۔ آخر یہ کیا ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا؟ جانکی کا دل مارے دہشت اور خوف کے بیٹھا جا رہا تھا۔ اب کیا ہو گا؟ لمحے جیسے موت کی سرگوشیاں بن کر دیواروں سے ٹکرانے لگے!

ہری کے نرم، ٹھنڈے لہجے سے نکلنے والی بھڑکتے شعلوں جیسی آنچ مدن کے لیے یقیناً ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ اب تک سہما ہوا سر جھکائے اپنی جگہ دم بخود کھڑا تھا۔ اس کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ وہ یکا یک پلٹا اور یہ کہتے ہوئے "بھیا میں پاپی ہوں پاپی ہوں"، جھپٹ کر بالکنی پر چڑھ گیا۔ اس کی جگر خراش چیخ تیز بارش کے شور میں دب کر رہ گئی۔

جانکی نے اپنی انگلی دانتوں تلے کاٹ لی کہ کہیں یہ سب خواب تو نہیں ہے۔ لیکن سب کچھ حقیقت تھا۔ سو فیصد حقیقت۔

مدن واقعی بالکنی سے نیچے کود گیا تھا اور وہ ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا ہے۔

★

محبوب جامی

رباعیات

جو رسمِ محبّت سے بڑے ہیں آگاہ
کر سکتا نہیں ان کو زمانہ گمراہ
پیمانِ محبت ہے کبھی عہدِ وفا
ہر بات محبت میں ہے حسب دل خواہ

کہنے کو تو ہر شکل حسیں ہے یارو
خورشید رُخ و ماہ جبیں ہے یارو
ہر ایک حسیں دشمن جان و ایماں
نقصان رساں کون نہیں ہے یارو

اپنے لیے دنیا میں جگہ کوئی نہیں
ہو جائیں زمانے میں کہاں جا کے مکیں
کیا دیر و حرم، کیسے کلیسا و کنشت
ہوتا ہے بہر حال خرابات نشیں

تہمت سرِ میخانہ یہ اپنے سر لی
پیمانے سے پیماں شکنی بھی کر لی
لیکن، جب امنڈتے ہوئے دیکھے بادل
توبہ شکنی کرکے صراحی بھر لی

راس آئیں نہ آشفتہ سری کی باتیں
ہونے لگیں حیرت نگری کی باتیں
وہ لوگ جواب بھی ہیں نرے تنگ نظر
کرتے ہیں وسیع النظری کی باتیں

اخلاص کے آثار نہ گرنے دیں گے
احساس کی دیوار نہ گرنے دیں گے
مست مے پندار رہیں گے ہر دم
ہم عشق کا معیار نہ گرنے دیں گے

اوم پرکاش بجاج

امیدوں کا اُجالا

یاس کے مٹ گئے گھنے سائے
آرزوؤں کا نور ابھرا ہے
مسکراتی ہوئی سی کلیوں سے
صحن گلشن سجا ہے سنورا ہے
دردِ دل کی نہ کوئی بات کرو
راحتیں اَن گنت میسّر ہیں
بدنصیبی کا ذکر کیا معنی
اب تو سلجھے ہوئے مقدر ہیں
پھول کلیاں نکھر کے رقصاں ہیں
گیت چھیڑے ہیں کچھ ہواؤں نے
حسنِ محفل سنوار ڈالا ہے
وقت کی شوخ سی اداؤں نے
گوہرِ آرزو نصیب ہوا
آگیا وقت مسکرانے کا
ہمتوں کے چراغ روشن ہیں
حسن نکھرے گا اب زمانے کا
دردِ ماضی کو یاد کیا کرنا
آج کو مل کے پر بہار کرو
آرزوؤں کی روشنی لے کر
رنگ ہستی کو تابدار کرو

رحمان مین پوری

شاعرِ تصوف

بیدم شاہ وارثی کا سرمایۂ فکر

اردو شاعری کا آغاز ہی فارسی شاعری کی تقلید سے ہوا ہے۔ الفاظ بحور، قواعد عروض ہی نہیں بلکہ تخیل و تلمیحات تراکیب، اسالیب، تشبیہات و استعارات وغیرہ سب فارسی سے اخذ کیے گئے ہیں۔

تصوف شروع ہی سے اردو شاعری کا اہم ترین موضوع رہا ہے جو کہ فارسی کا اردو کو ایک خاص عطیہ ہے۔ غزل اگر اردو شاعری کی جان ہے تو تصوف غزل کی روح جس طرح غزل کے بغیر اردو شاعری کا تصور مکمل نہیں ہوتا اسی طرح تصوف کے بغیر بھی غزل کا تصور مکمل نہیں ہوتا ہے۔ تصوف کی بنیاد عشق حقیقی پر ہے۔ محبوب کو مذکور استعمال کرنے کا رواج محض تصوف کا عنصر قائم کرنے کے لیے ہے۔ اگر تصوف کے عنصر کو جدا کر دیا جائے تو اردو و فارسی دونوں زبانوں کی شاعری بے جان ہو کر رہ جائے گی۔

بیدم شاہ وارثی اٹاوی کا شمار ایسے ہی صوفی شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے گلشن ادب کو تصوف اور معرفت کے گلہائے رنگیں سے آراستہ کیا اور اپنی فنی صلاحیت و استعداد سے اردو غزل کی زلفِ پریشاں کو سنوار کر اردو شاعری میں روح پھونک دی۔

بیدم اُن خوش نصیب شاعروں میں ہیں جن کے کلام کی قدر و منزلت ان کی زندگی میں بھی ہوئی اور بعد مرگ بھی۔ دیگر صوفی شعراء کی طرح ان کی شہرت صرف عقیدت مندوں، احباب، تلامذہ، خانقاہوں یا اعراس کی محفلوں تک محدود نہیں بلکہ ان کے دل آویز نغمات کی گونج فضائے ہند میں ہر طرف سنائی دی اور مقبول خاص و عام ہوئے۔ بڑے افسوس و حسرت کی بات ہے کہ ایسے مشہور ترین و باکمال شاعر پر ناقدین سخن کی نگاہ نہیں پڑی کم از کم میری نظر سے کلام بیدم پر کوئی ایسا قابل قدر تنقیدی تبصرہ نہیں گزرا جو ان کے فنی کمالات اور محاسن کو اجاگر کرتا۔

"کوئی اچھا انسان ہی اچھا شاعر ہو سکتا ہے" شہنشاہ تغزل حضرت جگر مرادآبادی کے اس قول کی روشنی میں جب ہم بیدم صاحب کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہی جانتے ہیں کہ وہ انسان بھی عمدہ تھے اور شاعر بھی بے نظیر ہیں۔ یہاں صرف ان کی شاعرانہ صلاحیت کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ بیدم کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے سے جو بات ہمیں سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے "جاذبیت الفاظ کی برجستگی" زبان کی سادگی و سلاست بیان، تخیل کی بلندی اور پاکیزگی اور مضامین کی ندرت، تشبیہ و استعارات کا برمحل استعمال یہ سبھی محاسن ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں اگرچہ زبان اور اصول کی چند خامیاں بھی پائی جاتی ہیں مگر بہ حیثیت مجموعی انھیں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجیے کہ عیوب پر محاسن غالب ہیں۔ آپ واردات و احساسات قلبی کا اظہار بیان نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ کرتے ہیں۔

مسائل تصوف اور اسرار معرفت تو اس سادگی سے بیان کرتے ہیں کہ دل و دماغ پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ کوئی بھی شخص خواہ وہ کیسا ہی مذاق کیوں نہ رکھتا ہو وہ آپ کے کلام سے متاثر اور لطف اندوز ضرور ہوگا۔ وہ آپ بیتی کو اسی طرح کہتے ہیں کہ ہر شخص اس کو "اپنی بیتی" سمجھتا ہے:

بیدم اہل زمانہ سے کل تو ہم نے کہی اپنی بیتی
ہر اک نے سمجھا محفل میں میرا ہی وہ افسانہ تھا
سنا جس جس نے وہ اپنی ہی روداد الم سمجھا
زمانے بھر کا افسانہ تھی گویا داستاں میری

خیالات و افکار کی کامیابی ادا کرنے کے لیے مناسب بحر اور ردیف و قافیہ منتخب کرنا بھی ضروری ہے۔ اس انتخاب پر ہی شاعر کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے جس کے لیے شاعر کو عروض کی واقفیت اور شعور کا پختہ ہونا لازمی ہے۔ سلسلۂ آتش لکھنوی میں مولانا نثار اکبرآبادی اچھے شاعر ہوئے ہیں۔ بیدم صاحب کو انھیں سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ خوش قسمتی کہ استاد کے علاوہ ان کو حضرت سیدنا حاجی وارث علی شاہ صاحب قبلہ جیسے پیر و مرشد اور رہبر کامل نصیب ہوئے جن کی قربت اور فیضان توجہ سے روحانی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ موصوف کو اپنے مرشد سے بے حد عقیدت و محبت تھی جس کی جھلک ان کی شاعری میں بھی جا بجا پائی جاتی ہے بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہے دل کا دل جان کی جان وارث مری زندگانی کا ساماں وارث
سلام مرشد کونین و ہادیٔ دوراں
حضور حاجی وارث علی امام زماں
تری سرکار ہے عالی مرے وارث مرے والی
نہ رکھ جھولی مری خالی مرے وارث مرے والی

جس طرح وہ خود کو اپنے مرشد سے جدا نہیں مانتے اسی طرح وہ انسان سے خدا کو جدا نہیں سمجھتے ہیں:

ہر شئے کے پردے میں آئینہ ساز ہے ہر بندے کے لباس میں بندہ نواز ہے

ہر قطرے میں دریا کی موجیں نظر آتی ہیں
ہر بت کی صورت میں مولا نظر آتا ہے

مگر ہر آدمی کو عرفان خودی نہیں ہوتا:

اپنی ہستی کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
آدمی کثرت انوار سے حیراں ہو جائے

اسی لیے وہ انسان سے کہتے ہیں:

منکشف تجھ پہ اگر میری حقیقت ہو جائے
خود پرستی مرے مذہب میں عبادت ہو جائے

بیدم چونکہ آدمی کی حقیقت سے واقف ہیں اسی وجہ سے وہ ہر انسان کا احترام کرتے ہیں:

اب آدمی کچھ اور ہماری نظر میں ہے
جب سے سنا ہے یار لباس بشر میں ہے

ان کو یقین کامل ہے کہ خدا ہر جگہ پر ہے اور اس کا جلوہ ہر شے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ صرف چشم بینا درکار ہے:

طور پر ہی نہیں نظارۂ جاناں موقوف
دیکھنا ہے تو وہ موجود ہے ہر جا دیکھو
نہیں خالی ترے جلووں سے کوئی
کلیسا کیا؟ حرم کیا بت کدہ کیا؟
ہر شے میں دیکھتا ہوں جھلک حسن یار کی
مشتاق کو تمیز نہیں نور و نار کی
بتخانے میں کعبہ کی تنویر نظر آئی
ہر بت میں ہمیں تیری تصویر نظر آئی

چنانچہ اس کا جلوہ ہر شے میں ہے پھر بھی اس کا دیدار ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ:

ذرے ذرے میں عیاں ہونے کے بعد
آج تک راز حقیقت راز ہے
خدا جانے کہاں سے جلوۂ جاناں کہاں تک ہے
وہیں تک دیکھ سکتا ہے نظر جس کی جہاں تک ہے

دیر و حرم کو وہ خانۂ خدا نہیں بلکہ "قید تعین" سمجھتے ہیں:

سنیں، بیدم حرم کا ماجرا کیا؟
بلے قید تعین میں خدا کیا؟

واقعی قیدیٔ زنجیر مذاہب ہیں وہ لوگ
جو سمجھتے ہیں خدا سبحہ و زنار میں ہے

اصلی خانۂ خدا وہ انسان کے دل کو تصور کرتے ہیں۔ ہر انسان یہ نہیں جانتا۔ مگر بیدم صاحب یہ بھی جانتے ہیں! انسان کی غلطی کا انھیں اعتراف ہے:

بیدم یہ جستجو بھی عجب ہے عجیب تلاش
نکلے ہیں ڈھونڈھنے کو اسے ہم جو گھر میں ہے

ظاہر ہے کہ جس انسان کا نقطۂ نظر اتنا وسیع ہو وہ دیر و حرم کو اگر "نقش خیالی" تصور کرتا ہے تو کیا غلط ہے؟ ساری دنیا کو اپنا وطن اور انسانیت کو مذہب سمجھنے والے بیدم صاحب کی نظروں میں عشق و محبت کا درجہ عبادت سے کم نہیں لیکن ان کی عبادت کا طریقہ بھی جداگانہ ہے:

ادا ہو نماز اپنی یوں پنجگانہ
مرا سر ہو اور یار کا آستانہ

نہ مصحف رخ دل میں آنکھوں میں تصویر ہے
البیلی تلاوت ہے قرآن نرالا ہے

وہ جانتے ہیں کہ:

ان کے در پر مروں میں سجدے میں
عمر بھر کی قضا ادا ہو جائے

نام و نمود کی خواہش انھیں قطعی نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک چاہتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی قبر کا نشان تک باقی نہ رہ جائے:

مجھے خاک میں ملا کر مری خاک بھی اڑا دے
ترے نام پر مٹا ہوں مجھے کیا غرض نشاں سے

اتنا ہی نہیں بلکہ ان کو تو یہ بھی پسند نہیں کہ کوئی ان کی میت پہ آنسو بہائے:

بےکار یہ رونا دھونا ہے اب رونے سے کیا ہوتا ہے؟
جو ہونے کو تھا ہو ہی چکا جو ہونا ہے ہو جائے گا!

زندگی اور موت کے فلسفے کو بیان کرتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے اور انفرادیت کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ زندگی کو وہ ناپائیدار تصور کرتے ہیں:

ناپائیدار ہستی ناپائیدار ہے
ہستی ہی کیا ہے ہستئ ناپائیدار کی؟

حیات کی طرح ہی وہ موت کو بھی جاوداں نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ اصلی زندگی کی ابتدا بعد الموت ہے اور موت محض اس زندگی کے بیدار کرنے کی ایک جنبش کا نام ہے۔ ہر انسان دنیا میں مرنے کے لیے آیا ہے اور یہاں سکون اس کو قطعی حاصل نہیں ہو سکتا:

سکون کا اُن کا دلِ بقا ہے
اجل اک جنبشِ بیدارِ ہستی
میں مرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں
مرا انجام ہے آغازِ ہستی

دنیا اُن کی نظر میں خوشی کی محفل نہیں:

عدم سے آئے تھے دنیا کو سن کے بزم سرور،
مگر یہاں تو کوئی شادماں نہیں ملتا

جوانی کی یاد بڑی سہانی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

خیال و خواب ہوئے وہ مزے جوانی کے
عجیب دن تھے عجب سن عجیب زمانہ تھا

پھر بھی بڑھاپا ان کے لیے باعثِ تکلیف نہیں:

پیری میں ہے جذباتِ محبت کا مزہ خاص
رکھتی ہے اثر وقت سحر جیسے دعا خاص

محبوب کی ستم ظریفی اور ناکامیٔ قسمت کا گلہ ہر شاعر نے کیا ہے لیکن بیدم صاحب کے مذہب میں شکوہ کرنا باعثِ کفر ہے:

شکوہ اور شکوۂ محبوب، الٰہی توبہ
کفر ہے مذہب عشاق میں شکوہ کرنا

اُن کا خیال تو یہ ہے کہ

غم ناکامیٔ قسمت کی دنیا سے شکایت کیا؟ وہی بہتر ہے جو بیدم مزاج یار میں آیا

ان کا عقیدہ ہے کہ:

نہیں گو حفاظت کا سامان کوئی
تو غربت میں کیوں ہے پریشان کوئی
نہیں جس کا بیدمؔ نگہبان کوئی
تو اللہ اس کا نگہبان ہوگا
کشتیاں سب کی کنارے پہ پہنچ جاتی ہیں
ناخدا جس کا نہیں اس کا خدا ہوتا ہے

اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

بے حجابی ہے کرم و بخشش کی ساقی سے تری رحمت کا
ہے اتنی ہی دی جتنا تھا پیمانہ کسی کا

حقیقتاً بیدمؔ کا کوئی بھی شعر محتاج تشریح نہیں لیکن بقول خود بیدمؔ صاحب:

نہ جس نے درس گاہ عشق میں تعلیم پائی ہو
مری باتیں وہ کیا جانے وہ کیا میری زباں سمجھے

جس انسان کو روحانیت میں دلچسپی ہے وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ کلام بیدمؔ کا ہر لفظ اسرار و معانی کا ایک خزینہ ہے وضاحت کے ساتھ ان کے کسی شعر کی بھی تشریح کی جائے تو ایک پوری ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے مگر یہاں اختصار سے کام لینا ہے تصوف اور معرفت کی راہیں بہت دشوار طلب ہیں۔ دراصل راہ معرفت میں گم ہونے کے بعد ہی انسان کو منزل مقصود کا پتہ چلتا ہے:

پا جانا ہے کھو جانا، کھو جانا ہے پا جانا
بے ہوشی ہے ہشیاری، ہشیاری ہے بے ہوشی
گم ہونے کو پا جانا کہتے ہیں محبت میں
اور یاد کا رکھنا ہے یاں نام فراموشی
ہمارا کھونا ہی گویا تمھارا پانا ہے
کہ تم ملے تو ہمارا پتہ نہیں ملتا

صوفیائے کرام کے یہاں اس "کھو جانے" کی کئی منزلیں ہیں۔ فنا فی الشیخ، فنا فی المحبوب، فنا فی الرسول، فنا فی اللہ۔ بیدمؔ صاحب کی شاعری میں ان کا بیان خوب ملتا ہے:

اس صورت ظاہر کے نقشے کو مٹا پہلے
پھر دیکھ مجھے تجھ میں کیا کیا نظر آتا ہے
واہ ری مشق تصور کوئی گھر خالی نہیں
ایک صورت ہے ادھر دل میں ادھر آنکھوں میں ہے
دل کی دنیا کا ہر اک گوشہ منور ہو گیا
اٹھ گیا پردہ کوئی پردے سے باہر آ گیا

جسم خاکی میں رہ کر کوئی بھی بندہ خدا کا دیدار نہیں کر سکتا، بیدمؔ صاحب فرماتے ہیں:

ترا جلوہ جو ہستی ہے تو پھر قید نظر کیسی؟
مری ہستی جو پردہ ہے تو یہ بھی درمیاں کیوں ہو؟

اور جب دعا مستجاب ہوئی تو پھر:

اٹھتا ہوا ہستی کا پردہ نظر آتا ہے
اب جلوۂ حقیقت میں جلوہ نظر آتا ہے

فنا فی الذات ہی معراج ہے اسی کو فنا فی اللہ بھی کہتے ہیں:

قریب جلوہ آرائی کمال بے حجابی ہے
مری ہستی کے پردے میں ترا روپوش ہو جانا
تصور کی حدوں سے بڑھ گیا ذوق نظر اپنا
کہ دھوکا ہو گیا اکثر تری تصویر پر اپنا

اس کے بعد ہی وہ منزل ہے کہ جب بندے اور معبود میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا ہے:

مجھی کو دیکھ لیں اب تیرے دیکھنے والے
تو آئینہ ہے مرا، تیرا آئینہ ہوں میں

اس موقع پر کلام بیدمؔ سے چند متقدمین و معاصرین شعراء کے کلام سے موازنہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے:

میر تقی میرؔ کا مشہور شعر ہے:

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز		اسی خانہ خراب کی سی ہے

بیدمؔ صاحب فرماتے ہیں:

میرے نالے سن کے فرماتے ہیں وہ		یہ اسی کی دکھ بھری آواز ہے

اگرچہ بیدم صاحب کے شعر کو چربہ کہہ سکتے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ میر کے شعر سے کمتر درجہ کا نہیں۔
جوش ملیح آبادی کا شعر ہے:

تنکے کیا پوچھتے ہو آشیاں کا
وہیں ہو گا جہاں بجلی گری ہے

بیدم صاحب فرماتے ہیں:

ابھی جس کو بجلی جلا کر گئی ہے
اسی شاخ پر تھا مرا آشیانہ

فانی بدایونی (بیدم صاحب سے متعارف تھے۔ اٹاوہ کے قیام کے دوران کافی ساتھ رہا) فرماتے ہیں:

کمال ہوش ہے دل بے نیاز ہوش ہو جانا
ترے آغوش میں بیگانۂ آغوش ہو جانا

اسی مفہوم کو بیدم صاحب نے یوں نظم کیا ہے:

یہ نہیں معلوم کوئی زینت آغوش ہے
بے نیاز ہوش کتنا بے نیاز ہوش ہے

مجاز کا شعر ہے:

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

اسی خیال کو بیدم صاحب بہت پہلے اس طرح ادا کر چکے ہیں:

قسمت کے مری پیچ نکلنا محال ہیں
یہ زلف تو نہیں کہ سنوارا سنور گئی

مجروح سلطان پوری کا شعر ہے:

دور دور میں وہ پیمانہ کا عالم بدل گیا
برباد کرنے آیا تھا برباد کر گیا

بیدم وارثی کا شعر ملاحظہ ہو:

آئی ادھر بہار جوانی ادھر گئی
برباد کرنے آئی تھی برباد کر گئی

حضرت کوثر صاحب کا شعر ہے:

عشق کی سکوں طلبی دربدر لے کر لائی
سر انھیں کے قدموں پہ رکھ دیا تو نیند آئی

بیدم کا شعر ہے:

کبھی یہاں لیے ہوئے کبھی وہاں لیے ہوئے
پھری ہے تیری جستجو کہاں کہاں لیے ہوئے

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ ہر نئی چیز پرانی چیز کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ اردو شاعری میں سب سے بڑا عیب یہ تقلید ہی ہے جو کہ ترقی کی راہ میں ایک اہم روڑا ہے۔

عام طور پر شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جن پر فن پوری طرح غالب ہوتا ہے۔ دوسرے وہ کہ جو فن پر غالب ہوتے ہیں۔ بیدم صاحب نے اپنی انفرادیت کو یہاں کبھی ختم نہیں ہونے دیا ہے نہ تو پوری طرح فن ان پر غالب ہے اور نہ وہ ہی پوری طرح فن پر غالب ہیں۔ اگرچہ نئی ترکیبوں کے اختراع کی صلاحیت ان میں ضرور پائی جاتی ہے۔

اردو کے علاوہ بیدم نے فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کے نام کو زندہ جاوید بنانے کے لیے ان کی اردو شاعری ہی بہت کافی ہے۔ ذیل میں بیدم کے کلام سے چند اشعار دیے جا رہے ہیں جن سے ان کی فنی خوبیوں اور شاعرانہ کمالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

اب با آسانی نکل جائیں گی اپنی حسرتیں
یار کے تیر نظر نے دل میں روزن کر دیا

آتش رشک و حسد سے سنگ بھی خالی نہیں
دیا موسیٰ کو ہوئی اور طور جل کر رہ گیا

سینے میں دل ہے دل میں داغ داغ میں سوز و ساز عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا راز عشق

رنج و غم یاس و قلق حسرت و حرمان و الم
سب گوارا ہیں مجھے آپ کی فرقت کے سوا

پردے میں ہے جمال تو یہ شور اس قدر
اور بے نقاب ہو تو خدا جانے کیا کرے

جلوہ گاہ ناز کے پردوں کا اٹھنا یاد ہے
پھر ہوا کیا اور کیا دیکھا یہ کس کو ہوش ہے

(باقی صفحہ ۴۲ پر)



صدر جمہوریہ جناب فخرالدین علی احمد اپنے
انڈونیشیا کے دورے کے موقع پر ۲۰ جون
کو جکارتا میں ہیروز کالی بتا کی یادگار
پر پھول مالا رکھتے ہوئے ←

مشان اسماعیل دلیس کے قریب مکیرہ یہ
چوٹی سر کرنے والی ہندوستانی خواتین کو جو
ہیمالیہ کی مہم سے نئی دہلی میں ۱۱ جون کو
وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی سے ملایا جا رہا ہے۔
اس تصویر میں شریمتی گاندھی کماری ہرشا رانی
دوبے (دائیں) کماری ایم سی اوستا
اور دوسرے ممبروں کے ساتھ دیکھی
جا سکتی ہیں ↓





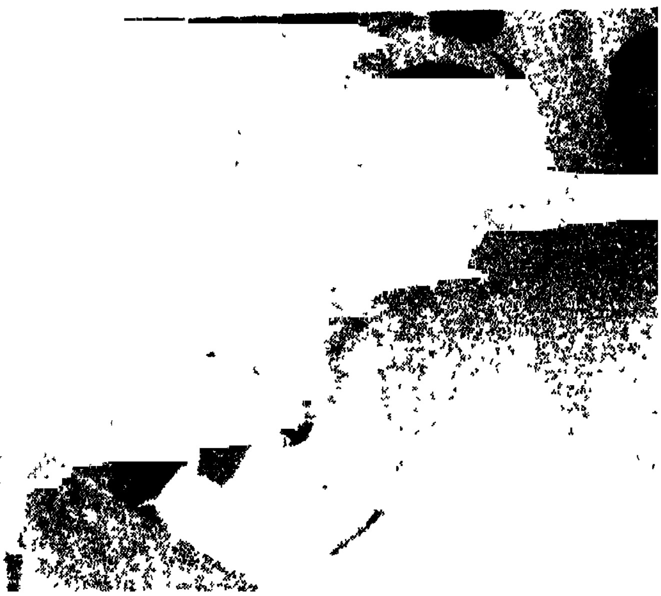
گورر ریڈ نس



سردار نگر ٹمری خاص، گورکھپور کے مہیلا منڈل کے ضلع کا بہترین مہیلا منڈل قرار پانے پر
منڈل کی صدر مسٹر شکنتلا کو وریا علاشری ہیم وتی ندن ہوگیا۔ ارسی کو ترقیاتی سمیار
کے موقع پر انعام دیتے ہوے

و علاشری ہیم وتی سہ
کر ے ں







سا دین دانی میں کمایوں یونیورسٹی کے پہلے جلسہ
ہوئے

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا ۲ جون کو پوڑی میں ریاست کے سب سے مقام
اونچا ... ہزار فٹ پر تعمیر ہونے والے رانسی سٹیڈیم کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے۔



لورمیہ کا افتتاح

ے





وزیر صحت سردار ہربھجن سنگھ ۵ جون کو رام پور اسپتال کے تحت کلاوتی دیوی امراض سینہ وارڈ کا افتتاح کرتے ہوئے

بین الاقوامی خواتین سال کے سلسلے میں شملہ اسپورٹس اسٹیڈیم میں ہونے والے خواتین کرکٹ میچ میں ۶ جون کو ہماچل کی ٹیم کی ممبر مالو والیا ہندوستان کے مانی ہوئی ٹیم کی کھلاڑی کماری سودرشن والیا کو بولڈ آؤٹ کیا



مصوعی مرکزی ۶ رکنی ہندوستانی کھلاڑیوں کی ٹیم جو ... روں کے بین الاقوامی کھیل کود مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ۸ جون کو ... ہوائی اڈے پر واپس ہوئی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے



مفتاح الرحمٰن خاں منشا

غزل

جو تغافل کو بھی ریاں بخشش ادا کہتے ہیں
نگہِ لطف کو کیا جانیے کیا کہتے ہیں

قدر اس کی کوئی نادان نہ جانے بھی تو کیا
کہنے والے تو محبّت کو خدا کہتے ہیں

یہ تو ہم اہلِ محبت کی ہے اعلیٰ ظرفی
درد جو تم نے دیا اس کو دوا کہتے ہیں

کتنے دل والے ہیں وہ، کیسے جگر دار ہیں وہ
شدتِ غم کو بھی جو روح فزا کہتے ہیں

جس میں گرمائے نہ دل کو کوئی ہنگامۂ شوق
ایسے جینے کو تو ہم جرم و خطا کہتے ہیں

ان میں کردار کی عظمت نہیں پائی جاتی
ہو کے مجبور جو بندوں کو خدا کہتے ہیں

ندرتِ فن یہ نظر ہوتی ہے جن کی منشا
شعر کو جلتے ہوئے دل کی دوا کہتے ہیں

رئیسہ شبنم

غزل

اک جانِ گلستاں ہے صحنِ چمن میں بیٹھی
پھولوں کی انجمن میں دل کی لگن میں بیٹھی

بالائے دوش گیسو بیٹھی ہے سر جھکائے
شاخوں پہ انگلی رکھے گل سے نظر ملائے

مستی بھری نگاہیں ہر گل پہ ڈالتی ہے
صحنِ چمن کو اپنی مستی میں ڈھالتی ہے

کچھ گنگنا رہی ہے اللہ رے ترنم
حسن و شبابِ گلشن نغموں میں اس کے ہیں گم

زلفیں بکھر رہی ہیں کیا مست ہے جوانی
ہے میکدہ شباب باده ہے ارغوانی

خاموش ہو گئی پھر نہ جانے سوچ کر کیا
یہ کیا بتائے کوئی کیسا خیال آیا

اٹھ کر ذرا سنبھل کر نزدِ گلاب پہنچی
نزدِ گلاب یعنی مست شباب پہنچی

توڑا گلاب کا پھول، اک ناز سے ادا سے
بولی گلاب سے پھر، اندازِ دلربا سے

گلشن میں آج آکر میں نے گلاب دیکھا
تو نے بھی اے گلاب اب میرا شباب دیکھا

بولا گلاب اس سے تو حسنِ بے بدل ہے
نغموں کی تو ہے رانی دوشیزۂ غزل ہے

دوشیزۂ غزل جب مستی میں بہہ رہی ہے
شبنم فضائے گلشن لبیک کہہ رہی ہے

مفتون کوٹوی

راج رانا راجیندر سنگھ مخمور

شخصیت اور فن

ریاست جھالاواڑ اگرچہ راجپوتانہ کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی لیکن والیان ریاست کے خصوصی کردار کی وجہ سے اس کی شہرت قرب و جوار میں خوب خوب رہی ہے۔ راج رانا یہاں کے والیان ریاست کو سلطنت انگلشیہ کا دیا ہوا خطاب تھا۔ راج رانا بھوانی سنگھ جن کا دور حکومت ۱۸۹۹ء سے ۱۹۲۹ء تک رہا ہے معمار ریاست کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں، ان کے دربار میں ہر فن کار کی قدر دانی حسب حیثیت ہوا کرتی تھی۔ علماء و فضلاء اور شعراء و ادبا، علمی و ادبی ماحول بنائے ہوئے تھے۔ درباری وید، درباری حکیم، درباری پہلوان، درباری کوی، درباری شاعر، درباری سنگیت کار سبھی کچھ اس ریاست میں موجود تھے۔ بھوانی ناٹیہ شالا آج بھی ان کے ناٹکوں کے ذوق و شوق کی یادگار موجود ہے۔ ادب پروری و سخن نوازی کے ثبوت میں ان کی توجہ و التفات سے شاعروں کے چھپے ہوئے مجموعے موجود ہیں۔ کلیات دانش کی اشاعت ۱۹۲۶ء میں ہوئی جو لالہ منشی شمبھو دیال دانش کی تخلیق ہے۔ مولوی عبدالوحید نیرنگ کا مجموعہ کلام سرمایہ افتخار نیرنگ کے نام سے شائع ہوا ہے اور اس اہتمام و اہتمام کے ساتھ کہ والیِ ریاست راج رانا بھوانی سنگھ نے ایک وقت خاص مقرر کر کے اس کی ہر غزل کو مطلع و مقطع تک سنا اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ مولوی نیرنگ مرحوم کو افتخار الشعراء کی سند عطا کی اور دیوان بغرض طباعت نیر پریس لکھنؤ میں بھیج دیا۔ لیکن وہ ابھی کتابت و طباعت کے مرحلے ہی میں تھا کہ راج رانا بھوانی سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد راج رانا راجیندر سنگھ ان کے ولی عہد مسند آرائے ریاست ہوئے اور اس مصرعے کے مصداق کہ گر پدر نتواند، پسر تمام کند، مولوی نیرنگ مرحوم کے دیوان کو ۳۰-۱۹۲۹ء میں طباعت و اشاعت کی منزلوں سے گزارا۔ انھوں نے نہ صرف اس دیوان کو چھپوایا بلکہ اپنے نام پر اس کا معنون ہو جانا بھی منظور فرمایا۔

راج رانا راجیندر سنگھ ہندی کویتائیں بھی کہتے تھے۔ ہندی میں ان کا تخلص "سدھاکر" تھا۔ اردو شاعری کی طرح ہندی کویتاؤں میں بھی ان کا صوفیانہ رنگ نمایاں تھا۔ چنانچہ سنت "سدھاکر" کے نام سے ان کی کئی کویتائیں، ہندی کے معروف مذہبی ماہنامے کلیان میں چھپی ہیں جنھیں جھالاواڑ ہی کے ایک ساہتیہ کار اور کوی پنڈت رام نواس شرما نے چھپوایا ہے، ان کی ہندی کویتاؤں کے متعلق لکھنا اسی ساہتیہ کار کا حق ہے جو انھیں عوام سے روشناس کرانا چاہتا ہو۔ ہمیں یہاں ان کی اردو شاعری کا جائزہ لینا ہے اور بہ حیثیت اردو شاعر انھیں پیش کرنا ہے۔

اردو میں وہ مخمور تخلص کرتے تھے۔ مولوی نیرنگ مرحوم کو انھوں نے اپنا استاد سخن منتخب کیا جس پر وہ اپنی شاعری میں بھی فخر کرتے ہیں۔

ہے بزم ادب میں ذکر یہی اک میں ہی نہیں کہتے ہیں سبھی
مخمور سا اب تلمیذ نہیں، نیرنگ سا اب استاد نہیں

انھوں نے "راجیندر" کے نام سے بزم مشاعرہ قائم کی جس کا دور میں مشاعروں کا سلسلہ ان کے والد راج رانا بھوانی سنگھ کے زمانے ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ انھوں نے اس سلسلے کو مزید توانا و تابدار بنا دیا خود شریک مشاعرہ ہوتے، طرحی غزلیں لکھتے اور خود غزلیں پڑھتے۔

شرکت کرنے کے ساتھ دیگر شعراء کی حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ وہ مشاعروں کے اتنے شوقین تھے کہ جب اپنی مہارانی کے علاج کے سلسلے میں لندن گئے تو وہاں سے بھی طرحی مصرعے بھیجتے رہے اور مشاعرہ جاری رکھنے کی ترغیب دیتے رہے۔ ان کے استاذ مولوی نیرنگ مرحوم کی طرح ان کی غزلوں کا بھی رنگ قدیم ہے، وہ قدیم روایات غزل کے باسدار و پرستار تھے۔ ان کی غزلوں کے چند عشقیہ اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

تصور سے رخ روشن کے دل اپنا درخشاں تھا
ہمیشہ چودھویں کا چاند میرے گھر میں مہماں تھا

حسن کی رنگینیوں پر جس کا دل مائل نہیں   وہ حقیقت میں ہمارے نزدیک اہل دل نہیں

درد دل بے تاب سے واقف ہو کہاں تم   جو مجھ پہ گزرتی ہے وہ پوچھو مرے جی سے

تصویر یار آنکھوں میں مخمورؔ کی ہے قید   تار آنسوؤں کا اس کو نہ سمجھو یہ جال ہے

مخمورؔ کو جو ڈھونڈو تو ڈھونڈو نہ گھر میں تم   ہوگا وہ راجہ اندر، پریوں کی انجمن میں

مخمورؔ کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ ایک رئیس وقت کے دل میں اس درد کا ہونا کہ ہندوستان انگریزوں کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے، اس انگریزی دور حکومت کے لحاظ سے باعث صد حیرت ہے۔ اس سلسلے میں ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

وطن کی خاک یہ کہتی ہے اجڑا ہے بھی بڑھ کر ہو   ہر اک ذرہ یہاں کا غیرت خورشید انور ہے

صیاد کا گلشن کنج قفس اک دن ہے وہاں کا ایک برس
یوں رہ کے جیئے تو خاک جیئے جب اپنا وطن آزاد نہیں

یہی ہے مخمورؔ اپنا کہنا نہ دیکھو اب تم برا نا سپنا
سنوار اس طرح ملک اپنا کہ اور جیسے سنبھل رہے ہیں

قومی ایکتا اور ملکی یکجہتی کے یہ چند مندرجہ ذیل اشعار ان کی حقیقت پسندانہ اور وطن دوستانہ ذہنیت کے مظہر ہیں ۔

کٹے مرتے ہیں ناحق ہندو مسلم یہ دو بھائی
یہ بحارت ویغض کا منظر بھی کیا دل سوز منظر ہے

ہو اگر آپس کے جھگڑوں سے یہ ہندوستان صاف
پھر ترقی کے لیے ہو جائے گا میدان صاف

دل سے ہو خلق ومحبت کا اگر پیمان صاف
دام لعنت سے نکل جائے گا ہندوستان صاف

جناب مخمورؔ دیگر راجاؤں اور رئیسوں کی طرح عیش وعیاشی کے دلدادہ نہ تھے بلکہ سادھوؤں کا سا مزاج رکھتے تھے اسی لیے ان کے کلام میں صوفیانہ، ناصحانہ اور اصلاحانہ اشعار کی بہتات ہے ۔

جام وحدت پی کے میں ایسا آزاد دیوانہ تھا   رات دن میری زباں پر تیرا ہی افسانہ تھا

یارب مجھے کچھ زعم نہیں جاہ وحشم کا   محتاج ہوں ہر وقت ترے لطف وکرم کا

خواہش دل ہے یہی دل کی تمنا ہے یہی   کبھی مخمورؔ سے چھوٹے نہ عبادت تیری

کس لیے نازاں ہے غافل ایک دم کی بات ہے   زندگی ایسی ہے جیسے بلبلا کچھ بھی نہیں

احسان کر کے خلق پہ دنیا میں نام کر   پھر لوٹ کر جہان میں آیا نہ جائے گا

جب مخمورؔ شراب پیتے تھے تو بڑی عالی ظرفی کے ساتھ، چنانچہ فرماتے ہیں ۔

وہ اور ہوں گے جو پیتے ہی ہوش اڑجائیں   یہاں تو پیتے ہی اک جام اور آیا ہوش

کچھ عرصے کے بعد اپنے صوفیانہ خیالات کے پیش نظر وہ شراب سے تائب ہو گئے تھے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو ۔

حضرت مخمورؔ میخواری سے تائب ہو گئے   آج تذکرہ خیر ان کا بزم رنداں میں نہ تھا

حیات و کائنات کے گہرے تفکر نے ان کی توجہ حقیقت کی طرف لگا دی تھی۔ جھالا واڑ سے قدرے دور شہر اور کوہ و بیابان کے درمیان پر فضا تالاب کے کنارے انھوں نے ایک خوش نما وسیع باغ اور خوش اسلوب چوبی مکان بنوایا تھا "رین بسیرا" اس کا نام رکھا تھا۔ یہ آج بھی موجود ہے۔ وہیں اپنے مالک کی بندگی اور ریاضت و عبادت کے لیے ایک چبوترہ بھی بنوایا تھا۔ یہاں جنگل کی سہانی فضا بھی تھی۔ اور پہاڑیوں کا دل ربا منظر بھی۔ اس پاکیزہ ماحول نے صلح جوئی اور صلح خوئی ان میں پیدا کر دی تھی فرماتے ہیں ؎

کسی سے کچھ عداوت ہے نہ دشمن سے شکایت ہے — خدا کو خوب روشن حال ہے مخمور کے دل کا
قدر ہر فرد بشر کی ہے نظر میں اپنی — دوست تو دوست ہے دشمن کو بھی اپنا کہا

ان کا دور حکمرانی ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۲ء تک رہا۔ کچھ ان کے نصیحت آمیز اشعار اور سن لیجیے

خاک ہو کر فلک پہ پہنچا ہوں — انکساری کا یہ کمال تو دیکھ
کان دیوار کے بھی ہوتے ہیں — رکھئے دل ہی میں آدمی دل کی

انسان وہی فخر کے قابل ہے جہاں میں — کرتے ہیں سلوک اور نہیں کہتے کسی سے

آصفی امام باڑہ ۔ (صفحہ ۹ کا بقیہ)

(صفحہ ۹ کا بقیہ)

الغرض جب مشرقی تہذیب و تمدن اور قومی یکجہتی کا عظیم الشان نمونہ ۱۲۰۵ھ ہجری مطابق ۱۷۹۰ء میں خلوص نیت سے تعمیر کیا گیا تو بہت سے شاعروں نے تاریخیں کہیں۔ چند تاریخیں یہ ہیں:

(۱) قصر شاہ کربلا آل نبی ۔ ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء)
(۲) بزم گاہ شہید راہ خدا ۔ ۱۲۰۵ھ
(۳) مقام آل پیغمبر مقام محمود است ۔ ۱۲۰۵ھ
(۴) وزیر ہند سلیمان جناب آصف جاہ — نیز برجنگ خدیو جہاں کلاہ آثار
رفیق گشت چو توفیق حق بنا گردش — امام باڑۂ گردوں اساس جنت آثار
بگوش اہل جہاں گفت عقل تاریخش — رواق عرش آئینۂ اظہار
کرد نواب آصف الدولہ — دیگچوں ساخت جائے غم حسین
داد ہاتف خبر ز تاریخش — روضۂ مجلہ امام دین

آصفی امام باڑہ نواب آصف الدولہ کے زمانے سے آج تک برابر شاندار عزاداری کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ یہاں ان کے عہد میں بڑی دھوم دھام سے مجلسیں ہوتی رہیں جن میں اس زمانے کے مشہور و معروف مرثیہ گو شاعر پڑھتے تھے۔ نواب مرحوم امام باڑے میں تین سال تک متواتر مجلسوں میں شرکت کرتے رہے۔ ہر پنجشنبہ مجلس منعقد کی جاتی تھی۔ عشرۂ محرم کو ملا محمد خطا مرثیہ پڑھتے تھے۔ یہ رونق نواب کے بعد بھی قائم رہی۔[۳]

امام باڑے کا ساز و سامان انقلاب ۱۸۵۷ء میں لوٹ لیا گیا۔ شہ نشین پر آج تک نواب مرحوم کے زمانے کا صندل کا ایک تعزیہ رکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ پیتل کے چار اور شیشے کے کچھ جھاڑ بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

نواب مرحوم امام باڑے کے بیچ میں دفن ہیں۔ ملا محمد نعیم ندیم نے تاریخ وفات کہی تھی۔ بعد میں یہ قطعۂ تاریخ لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو مرزا عشق (متوفی ۱۸۸۵ء) کے ہاتھ سے لکھوا کر قبر پر لٹکایا گیا جو اب تک موجود ہے۔

امام باڑہ بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔ ہر سال لاکھوں کی تعداد میں ملکی اور غیر ملکی سیاح اس کے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ نواب آصف الدولہ نے امام باڑے پر دو کروڑ روپیہ صرف کیا تھا۔[۴] اور بقول صاحب قیصر التواریخ یہ دس سال کی مدت میں تعمیر ہوا۔[۵]

---

[۱] مفتاح التواریخ ص ۳۶۳ تھامس ولیم بیل مطبوعہ نول کشور ۱۸۶۷ء [۲] تواریخ نادر العصر ص ۱۵۷، [۳] قیصر التواریخ ص ۱۲۲ جلد اول [۴] تحفۃ العالم ص ۵۳۲، [۵] قیصر التواریخ ص ۱۱۲ جلد اول۔



گوشۂ سلام

مچھلی شہری

سلام کی آخری غزل

بسترِ مرگ سے

اب عیادت کو مری کوئی نہیں آئے گا
پھر ہوں بیمار کسی کو نہ یقیں آئے گا

غم مسلسل ہو تو احباب بچھڑ جاتے ہیں
اب نہ کوئی دلِ تنہا کے قریں آئے گا

اپنے خوابوں کے دریچوں میں جلا لو شمعیں
اور یہ سوچ لو اک ماہ جبیں آئے گا

پھر نگارِ چمن وادیٔ فردا ہے بہار
گل بدست و مہ انجم بہ جبیں آئے گا

ذہنِ تازہ کے لیے سازِ حقیقت چھیڑو
چین اسے صرف تخیل سے کہیں آئے گا

صرف اپنے ہی عزائم پہ بھروسہ کر لے
کام کوئی بھی نہ اے قلبِ حزیں آئے گا

روز پوجا کے نئے پھول سجاتا ہے سلام
جانے کب اس کا خدا سوئے زمیں آئے گا

نذرِ سلام

ساغر مہدی

مرحوم سلام مچھلی شہری صاحب نے ۲۴ ستمبر ۱۹۷۳ء کو ولنگڈن نرسنگ ہوم دہلی میں یہ غزل اس وقت کہی تھی جب وہ کینسر جیسے ہولناک مرض کی شدت اور زندگی و موت کی کشمکش سے گزر رہے تھے۔ اس غزل میں زندگی سے مایوسی کے ساتھ ساتھ زندہ رہنے کی غیر معمولی خواہش اور زندگی کی خوبصورتی سے بے پناہ محبت کا احساس بھی کافی نمایاں ہے۔ خراجِ عقیدت کے طور پر اس یادگار غزل پر تضمین پیش کی جاتی ہے۔

ـــــــ ساغر مہدی

افق پہ صبح کا تارا دکھائی دینے لگے
زمیں سے زہر ابھرتا دکھائی دینے لگے
حسین پھولوں کی دنیا دکھائی دینے لگے
شگفتہ بچوں کا چہرا دکھائی دینے لگے
میں کیا کروں کہ اجالا دکھائی دینے لگے

بکھیرنے دے ہوا اور مہک کے دوش پر نغمات
کہ رنگ و بو کے مغنی کی ہے یہی سوغات
مرے لہو میں رواں ہے عروسِ فن کی بات
میں کامیاب جبھی ہوں گا اے نگارِ حیات
کہ بزم کو ترا نغمہ دکھائی دینے لگے

تھکے تھکے ہوئے چہرے کو مے سے دھوتے ہیں
گلاس میں لبِ تشنہ ذرا ڈبوتے ہیں
دوا کے زہر کی شدت کو خوں سے دھوتے ہیں
یہ سخت ظلم ہے مالک کہ صبح ہوتے ہی
تمام گھر میں اندھیرا دکھائی دینے لگے

نہ جانے روز مرا ذہن سوچتا کیا ہے
مرے خدا مرے گلشن کو یہ ہوا کیا ہے
سموم کی طرح چلتی ہوئی صبا کیا ہے
گلاب اگانے کی عادت سے فائدہ کیا ہے
اگر گلاب میں شعلہ دکھائی دینے لگے

شکستِ جام پہ سو قہقہے لگا کر بھی
مثالِ کاہکشاں روز جگمگا کر بھی
ہزار شمعیں سرِ انجمن جلا کر بھی
وہ صرف میں ہوں جو سو جنتیں سجا کر بھی
اداس اداس سا تنہا دکھائی دینے لگے

غموں کی بھیڑ میں ہر ایک شخص تنہا ہے
کھڑا ہوا ہے سمندر میں اور پیاسا ہے
خود اپنی ذات کا اپنے بدن پہ پہرا ہے
مرا ہی عکس سہی پھر بھی وہ فرشتہ ہے
جو غیر ہو کے بھی اپنا دکھائی دینے لگے

ازل سے شوخیِ فطرت تمہیں ملی ہے سلام
غموں کی دھوپ میں بھی اک شگفتگی ہے سلام
ہر ایک لب پہ ہے "کیا زندہ آدمی ہے سلام"
بہت علیل ہو لیکن یہ بزدلی ہے سلام
کہ تم کو موت کا سایہ دکھائی دینے لگے

ایس۔ ایم۔ عباس رضوی

سلام مچھلی شہری اور عقیدتِ وطن

ذرا آہستہ چل، آہستہ چل اے سرپھری دنیا
کہ میرے کانپتے ہاتھوں میں اب تک تیرا دامن ہے

اور اس سرپھری دنیا کو ''آہستہ آہستہ'' چلنے کا حکم دینے والے سلام نے ١٩ر نومبر ٧٣ء کو ولنگڈن ہسپتال کے ایک کمرہ میں اپنے ''کانپتے ہاتھوں'' سے اس تیز رو دنیا کا دامن یہ کہتے ہوئے چھوڑ دیا ؎

میں شاید توڑ ہی دوں خوابِ قصدٗ کے جھولوں کو
نہ رکھ پاؤں گا اب گل دان میں شاداب پھولوں کو

سلام نے اپنے بارے میں لکھا ہے:

''مچھلی شہر ضلع جون پور (اتر پردیش) کا ایک قصبہ ہے جون پور جسے ایک زمانے میں ''شیراز ہند'' کہا جاتا تھا۔ مچھلی شہر کے اردو مڈل اسکول میں جو تاریخ رجسٹر میں درج ہوگی اس اعتبار سے میں یکم جولائی ١٩٢١ء کو پیدا ہوا۔ شاید میرے گھرانے میں باقاعدہ تاریخ پیدائش رکھنے کا رواج نہیں ہے۔ والد محترم کا نام عبدالرزاق ہے (جواب خلد آشیاں ہیں) .... والدہ محترمہ کا تعلق قصبہ مئو ائمہ ضلع الہ آباد کے ایک مولوی گھرانے سے ہے ..... میری آنکھ محلہ مولویانہ کے ایک تنگ شکستہ اور مٹی کی مکان میں کھلی۔'' ١؎

مگر سلام کو اس تنگ شکستہ اور خام مکان سے بھی بے پناہ عقیدت رہی ہے، کیونکہ یہی ان کا وطن ہے، اور یہیں کی دھرتی نے انھیں جنم دیا ہے۔ اس گھر، اس سرزمین پر انھیں ہمیشہ ناز رہا ہے:

''...... اب تک نہیں سمجھ پایا ہوں کہ میرے وطن کا نام مچھلی شہر کیونکر پڑا۔ وجہ تسمیہ جو بھی ہو اس دھرتی نے مجھے پیدا کیا ہے اور مجھے اس پر ناز ہے۔ یوں بھی مچھلی ایک شاعرانہ علامت ہے۔ اتر پردیش کے سرکاری نشان میں تو مچھلی بہت نمایاں ہے''۔ ٢؎

کچھ لوگ بڑے پیدا ہوتے ہیں کچھ اپنے اوپر بڑائی لاد لیتے ہیں اور کچھ لوگ اپنی کوشش و جدوجہد، محنت اور جانفشانی سے بڑے بن جاتے ہیں۔ سلام کا شمار بھی اسی تیسرے قسم کے لوگوں میں کیا جاسکتا ہے۔ معمولی گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود انھوں نے کبھی ہمت نہ ہاری۔ انھوں نے خود اپنی راہیں نکالیں۔ منزل کا تعین کیا اور زندگی بھر انھیں راہوں کو استوار کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔

یہی نہیں، راہوں سے ہٹ کر نئی راہ، منزلوں سے نکل کر نئی 'منزل' بنانے کی عظیم تمنا سلام کے دل میں ہمیشہ تڑپتی اور مچلتی رہی شاید یہ وقت کی اسی تڑپ، اسی جستجو، اسی سرگردانی نے

١؎، ٢؎ غبارِ کارواں۔ سلام مچھلی شہری۔ آج کل مارچ ٧٢ء صفحہ ٣٧۔ ٣٨۔

اُن کے ذہن کو انقلابی روش پر ڈال دیا۔ اُن کی قوتِ عمل کو مہمیز کیا اور انھیں ایک نیا شعور عطا کیا۔ انھوں نے لکھا ہے:

"شاعری تو میں نے مڈل اسکول کی طالب علمی کے دور سے ہی شروع کر دی تھی مگر یہ دلچسپی محض مشاعروں تک محدود تھی۔ الجھن یہ تھی کہ یقین مچھلی شہری جو یادگار داغ تھے اسی رنگ کے رسیا تھے اور میں شاعری میں کوئی نئی بات چاہتا......" [۵۱]

آخر سلام اپنی کوشش میں ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ اُن کی محنت ٹھکانے لگی۔ اُن کی نظم ہو خواہ نثر دونوں میں ان کا ایک الگ لہجہ، ایک جداگانہ اسلوب اور ایک علیحدہ انداز رہا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مختصر سی عمر میں سلام ہر دل عزیز بن گئے۔ دنیا نے ان کی آواز سنی، سمجھی اور قدر کی۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

"...... سلام کو شاعری یا ادب کو نیا ذہنی اُفق دینے میں دلچسپی نہ تھی لیکن یہ ضرور ہے کہ سلام نے نظم و نثر دونوں میں اپنا لہجہ اور اسلوب اپنے آپ تلاش کرنے کی کوشش کی اور ایک انوکھا پن قائم رکھا......" [۵۲]

سلام نے اس وقت اپنا ہوش سنبھالا جب آزادی کی تحریکیں ملک میں رواں دواں تھیں۔ ہر سمت انقلاب انقلاب کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ وقت کے اہم تقاضے نے وطن کے نوجوانوں کو مخاطب کر کے انھیں "سر کٹا کر سرسامانِ وطن" ہونے کی ترغیب دی۔ سلام کا دل بھی قومی درد سے معمور تھا۔ اُن کے اندر بھی جذبۂ آزادی نے کروٹ بدلی۔ وطن کی عظمت و شان، قوم کی قدر و منزلت، قومی رہنماؤں کے لیے خلوص و محبت اور عقیدت کا بیش بہا جذبہ سلام کے دل میں رچا بسا تھا۔ وطن کی آزادی انھیں بھی جان و دل سے عزیز تھی۔ وہ انقلابی تحریک سے وابستہ ہو گئے صرف وابستہ ہی نہیں ہوئے بلکہ اسی راہ میں اپنے ہم نواؤں کے شانہ بشانہ چلے بھی۔ انھوں نے بھی انقلابی ترانے گائے اور ان ہی انقلابی نظموں نے انھیں بہت جلد مقبول بنا دیا۔ انھوں نے لکھا ہے:

"آزادی کی تحریکیں اپنے شباب پر تھیں۔ اپنی بعض انقلابی نظموں کے سبب میں تمام فیض آباد اور خاص طور پر طالب علموں میں بہت مقبول تھا۔ اُن ہی دنوں کے سیاسی جلسے میں کسی سیاسی نظم پر سروجنی نائیڈو نے مجھے شاباشی دی۔ یہ شاباشی بعد میں میرے لیے اُن کی سرپرستی میں بدل گئی۔" [۵۳]

اپنے عزیز وطن کی طرح سلام کو قومی و ملکی رہنماؤں سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ اُن کا یہ جذبہ ساری زندگی قائم رہا۔ آزادی کی عظیم تمنا اور انقلابی تحریکوں کے اثرات سے انھوں نے پولٹیکل کانفرنسوں میں بھی حصہ لیا اور پنڈت نہرو، سبھاش بابو اور اُن کے علاوہ ملک کے دیگر بڑے رہنماؤں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ اس کا تذکرہ انھوں نے یوں کیا ہے:

"ان ہی دنوں مجھے اجودھیا پولٹیکل کانفرنس میں پنڈت جواہر لعل نہرو سے اور اس کے بعد رام گڑھ کانگریس سشن میں ملک کے قریب قریب تمام بڑے رہنماؤں سے ملنے کا موقع ملا۔ رام گڑھ میں ایک بات یہ ہوئی کہ سبھاش چندر بوس نے "اینٹی کامپرومائز کانفرنس" رچائی تھی۔ نہ جانے اس میں کیا کشش تھی کہ میں معہ سامان اپنے کانگریس کے خیمے سے پہاڑی کے اس پار بوس کی کانفرنس میں چلا گیا۔ سبھاش بوس جی کا خود ملنا اور نئی نظموں کے لیے نئے نئے خیالات دینا۔ سوامی سہجانند جی

---

[۵۱] غبارِ کارواں۔ سلام مچھلی شہری۔ آج کل مارچ ۶۲ء صفحہ ۳۸۔ [۵۲] تخیل کا حصار۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ مشمولہ شاعر بمبئی نمبر ۱۲ صفحہ ۱۱۔ [۵۳] غبارِ کارواں۔ سلام مچھلی شہری۔ آج کل مارچ ۶۲ء صفحہ ۳۸۔

کا ہر مصرع کے سسشن میں مجھے پڑھوانا یہ سب مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔" [۱]

سلام نے جہاں مختلف موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے اور بہت سی قومی و ملکی نظمیں لکھی ہیں۔ وہیں وطن کے جاں نثاروں اور ملکی و سیاسی رہنماؤں کو بھی انھوں نے اپنا نذرانۂ عقیدت بڑے خلوص سے پیش کیا ہے۔ ان خوب صورت تحریروں میں جنھوں نے مجھے متاثر کیا اور جو میری فائل کی زینت ہیں ان میں "گاندھی" بھی ہے۔ یہ مختصر مگر دل کش اور پُر تاثیر نظم یقینی طور پر سلام کے فن کا بہترین نمونہ ہے "گاندھی کیا تھے؟ گاندھی نے ہمیں کیا دیا؟ ان کی ذات سے قوم و ملک پر کیا اثر پڑا؟ شاعر نے اس مقدس ہستی کو کس کس زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ گاندھی "اس سائنسی دور" میں "روحانی آواز" ہیں۔ گاندھی "ایک نئی سحر کا آغاز" ہیں۔ گاندھی "بھارت ماں کے سپنوں کا پرتیک" ہیں۔ گاندھی ایک "حقیقت" ہیں۔ گاندھی ایک "خیال" ہیں لیکن ایک ایسی "حقیقت" ایک ایسا "خیال" جس کی بدولت ہمارا "ماضی" بھی روشن ہوا اور "حال" بھی اس عظیم مقدس اور بزرگ ہستی سے شاعر کی عقیدت ملاحظہ فرمائیں:

گاندھی کیا تھے
"بھارت ماں کے" سپنوں کا کومل پرتیک
ان کی بدولت جاگی، پہنچی، منزل تک، اپنی تحریک۔
گاندھی کیا تھے
بھوکی، پیاسی دھرتی کے ذی ہوش فقیر
ان کی بدولت بے شک ٹوٹی اپنے پیروں کی زنجیر
گاندھی کیا تھے
خوابِ دلِ جمہور کا دل کش ردِّ عمل
"مادرِ ہند" کے ویراں چہرے پر ایک نورانی آنچل
گاندھی کیا ہیں
ایک حقیقت، جس کو ہم سمجھے ہیں خواب
پُر جس کی تعبیرِ حسیں کی کھوج میں دنیا ہے بے تاب
گاندھی کیا ہیں
اس سائنسی دور میں روحانی آواز
یعنی جب ہونے والا ہے ایک سحر کا پھر آغاز
گاندھی کیا تھے
ایک حقیقت
گاندھی کیا ہیں
ایک خیال

لیکن ان کی یاد سے روشن عہدِ ماضی، بزمِ حال ہے

سلام کو اپنے پیارے وطن کی ہر چیز سے پیار تھا۔ "خاکِ وطن" کا "ذرہ" بھی ان کی نگاہ میں "دیوتا" تھا۔ اس سرزمین کے ندی، نالے، جھیل و تالاب، شاداب باغ، ہرے بھرے میدان اُن کا جی لبھاتے تھے۔ مسجد و مندر، مقبرے اور امام باڑے، محرم کے جلوس، میلے اور تہواروں سے انھیں خاصی دلچسپی تھی اور ان ساری چیزوں نے ان کے کلام کو متاثر کیا۔ اپنے قیام فیض آباد کے تاثرات انھوں نے یوں ظاہر کیے ہیں:

"فیض آباد میں بہو بیگم کا مقبرہ، گلاب باڑی، امام باڑہ اور گھاگھرا سرجو ندی کی ساحلی پھلواری مجھے بے حد عزیز تھی (اس کے بعض حصے انگریز فوجوں کے لیے وقف تھے مگر میں ان کی محفلوں میں نہ جانے کیسے پہنچ جاتا تھا) فیض آباد میں بھی میری شاعری کو ایک تہذیب اور شعور حسن دینے کے لیے محرم کی مجلسوں اور راجودھیا جی کے جھولوں کے میلوں اور ان کے پس منظر کو بڑا دخل تھا۔" [۲]

سلام کے شروع کے کلام میں ان کے قصبے کی زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں، آموں کے سرسبز و شاداب باغ، کھیتوں کی ہریالی، پائلیوں کی مدھر جھنکار، مہندی لگے ہاتھ، ہار سنگار کے پھولوں سے بسا

---

[۱] غبار کارواں سلام مچھلی شہری۔ آج کل مارچ ۴۲ء صفحہ ۴۸ [۲] غبار کارواں سلام مچھلی شہری۔ آج کل مارچ ۴۲ء صفحہ ۴۸

اور سجاسے دوپٹوں وغیرہ نے نوجوان سلام کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچا:

"...... میری ابتدائی شاعری کی فضاؤں میں میرے قصبے کی عام و خاص زندگی کی جھلکیاں ہیں۔ ان میں آپ کو پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں، آموں کے باغ میں پڑے جھولے، ہرے بھرے کھیت اور کھیتوں میں چھن چھن کرتی پائلیں، اونچے گھروں کی چہار دیواری، مہندی لگے ہاتھ، ہار سنگھار کے بسائے اور سجائے دوپٹے، راتوں میں چھپ کر اُن ہاتھوں کا تھالیاں لیے ہوئے مقدس قبروں کی طرف بڑھنا اور منتوں کی مدھم آوازیں، بہشتی زیور، رامائن، میلاد اکبر اور انیس کے مراثی کی پیدا کردہ پاکیزہ فضا سے دور بہت دور، بہت ساری تمنائیں آرزوئیں کامیابیاں اور ناکامیاں یہی سب ہے۔" ۱؎

سلام کا دل وسیع، نظر بلند، ذہن پاکیزہ اور دماغ شگفتہ تھا۔ اُن کے ذہن کی نازک و پاکیزہ سطح پر کبھی نذرالاسلام کے نقوش اُبھرے جن کی پرجوش نظموں نے سلام کے ذہن کو آتشکدہ بنا دیا۔ تو کبھی شاعرِ اعظم ٹیگور کے رسیلے مدھ بھرے نغموں نے اُن کے قلب و جگر کو سکون بخشا۔ گو سلام نے انقلابی تحریک کو اپنے گلے لگایا۔ انقلابی نظموں کے ذریعہ ہی ان کی شاعری کی داغ بیل پڑی اور ان کے شروع کے کلام میں "خون خون چاہیے" کی جھنکار سنائی دی لیکن وقت کے بدلتے ہوئے دھاروں کے ساتھ آہستہ آہستہ سلام نے بھی سنجیدہ شاعری کی راہوں میں قدم بڑھایا اور آخرکار یہ ننھا ستارہ چمکا اُبھرا اور آسمانِ ادب پر چھا گیا۔ یہ تخاطب، یہ انداز، یہ سلاست و روانی، یہ شیرینی حلاوت ملاحظہ فرمائیں:

آسماں اب بھی تجھے ہم پہ یقین ہے کہ نہیں
دیکھ جنت سے بھی دل کش یہ زمیں ہے کہ نہیں

پاؤں میں راس کماری، کی سنہری پازیب
کاشمیر صرت افشاں یہ جبیں ہے کہ نہیں

حضرت کوثر چاندپوری کے لفظوں میں:

سلام کے فن میں بڑی رنگینی، رعنائی اور پختگی تھی ان میں ایک فطری شاعر کا انداز تھا۔ سلام نے فن کی عصمت کے آبگینے کو آخر تک ٹھیس نہ لگنے دی۔ اس میں شگفتگی، دلچسپی اور برجستگی کے پھول ہمیشہ ہی کھلتے اور مسکراتے رہے۔ ان کا فن طویل سفر اور مسلسل گہرے تجربات کا نچوڑ تھا"...... ۲؎

سلام "بھارت ماں" کے سچے سپوت تھے ان کا عقیدہ تھا کہ ایک ہندستانی سب سے پہلے ہندستانی ہے اس کے بعد ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی یا کچھ اور۔ وہ ایک وفا شعار اور امن پسند شہری تھے۔ اُن کے طرزِ عمل، ان کی وفا شناسی ان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور بیش بہا ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے سرکار نے بجا طور پر انھیں پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔ سلام کو اپنی آخری سانس تک اندرا جی سے، ان کے نظامِ حکومت سے اور اس ملک سے بے پناہ عقیدت رہی کاش ان ہی کا سا جذبہ آج ہمارے ہر ملکی میں پیدا ہو جائے تو ملک و قوم کی قسمت سنور جائے۔ حیات اللہ انصاری کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا:

"...... آج میں سب سے پہلے ہندستانی ہوں اور پھر مسلمان، اندرا جی کی کانگریس کا پرستار ہوں اور دعا ہے کہ میں ہمیشہ انھیں راستوں پر سوچوں ......" ۳؎

سلام ایک اچھے شاعر، ایک اعلیٰ ادیب، ایک لائق وفادار وطن پرست اور سب سے بڑھ کر ایک نیک اور شریف انسان تھے۔ وہ ایک سچے فنکار تھے۔ فنکار جو کبھی نہیں مر سکتا ہے۔ جس کی حیات کو کبھی موت چھو نہیں سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج سلام ہم میں نہیں ہیں لیکن یہ بھی کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہمیں وہ مدتوں یاد آتے رہیں گے۔

۱؎ دیوانہ مر گیا ..... کوثر چاندپوری۔ شاعر بمبئی مشمولہ نمبر ۱۲ سنہ ۷۳ء صفحہ ۹ ۲؎ سلام مچھلی شہری کا ایک خط۔ حیات اللہ انصاری کے نام۔ شاعر بمبئی مشمولہ نمبر ۱۲ سنہ ۷۳ء صفحہ ۴۱۔

★

سلام کی یاد میں

تسنیم فاروقی

خلائے فکر میں اک مسلکِ کہکشاں تھے سلام
جہانِ قدر میں احساس کی زباں تھے سلام

جہاں جہاں تھے حقائق وہاں وہاں تھے سلام
ہمیں شعور ہے اس کا کہاں کہاں تھے سلام

بسی تھی نکہتِ شیراز ان کی فطرت میں
نئے حدود میں نازِ سخن وراں تھے سلام

انھیں کے نام سے پیتے تھے میکدے والے
شراب چھوڑ کے بھی فخرِ مے کشاں تھے سلام

نہیں ملیں گے اب اس رکھ رکھاؤ کے شاعر
گلوں کے عشق میں کانٹوں کے میہماں تھے سلام

بہت قریب سے دیکھا تھا جینے والوں کو
دلوں کا عکس تھے چہروں کے ترجماں تھے سلام

گھٹن سی ہوتی ہے دہلی کی شاہراہوں پر
اجل یہ تو نے کیا کیا ابھی جواں تھے سلام

چراغ رہ تھے ترقی پسند ادب کے لیے
نثار قوم تھے ہر غم کے پاسباں تھے سلام

جو دل کے کانوں سے سنتے تو لوگ رو دیتے
غمِ حیات کی اک ایسی داستاں تھے سلام

ہو نظم و نثر کہ تمثیل کی نگارش ہو
کئی فنون میں مشاق و کامراں تھے سلام

بہ دوست داریٔ عہدِ مجاز و میراجی
خیال و فکر و قلم کے مزاج داں تھے سلام

غزل کو کچھ نئی سمتوں سے روشناس کیا
عروسِ پردۂ رنگیں کے رازداں تھے سلام

وہ خود کو کہتے تھے شہزادۂ اودھ اکثر
مگر دکن ہو کہ دلی سبھی کی جاں تھے سلام

وہ اک گروہ جو زندہ ہے فیض و ساحر سے
اسی قطار کی اک شمعِ کارواں تھے سلام

چمن نواز تھے مانندِ ابرِ آوارہ
گل آشنائے صبا زادِ دلبراں تھے سلام

لیے ہے سینۂ ہر ساز ان کے نغموں کو
وطن پرست تھے الحاق کا نشاں تھے سلام

بھلاؤں کیسے وہ یادیں وہ محفلیں تسنیم
نہیں تھے دوست تو کیا میرے مہرباں تھے سلام

عزیز تیندوری

سلام مچھلی شہری کا تنقیدی شعور

سلام مچھلی شہری کا مرتبہ اردو شاعر کی حیثیت سے انتہائی بلند اور اہم ہے۔ انھوں نے شعر گوئی اسی وقت سے شروع کر دی تھی جب کہ وہ درجۂ ہشتم کے طالب علم تھے اور عبد السلام کہلاتے تھے اس وقت کے چند اشعار انھوں نے "ادب لطیف" کے خاص نمبر کو دیکھ کر کہے تھے وہ مدیر ادب لطیف کو اس قدر پسند آئے تھے کہ انھیں ادارتی نوٹ کے ساتھ انھوں نے نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔ ان اشعار کی پختگی کو دیکھ کر اہل نظر شعور نے یقین کر لیا تھا کہ عبد السلام کا مستقبل انتہائی درخشاں اور تاباں ہے۔ اور ہوا بھی یہی۔ کلام سلام کو ابتدا ہی سے اس دور کے نمائندہ اور معیاری رسائل میں جگہ ملنے لگی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سلام نے شاعر کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کر لی۔ ان کی اس شہرت میں ان کی فطری صلاحیت، اختراعی ذہن اور جدت پسند دماغ کو بڑا دخل رہا جس نے ان کے ہم عصروں کو بڑی حد تک چونکا دیا۔ انکی وہ نظمیں جو ہیئتی تجربات کی وجہ سے اہل ادب سے خراج تحسین حاصل کر رہی تھیں۔ یقینی طور پر اس دور کا اعلیٰ شعری سرمایہ کہلانے کی مستحق تھیں۔ شاعر کی حیثیت سے سلام نے جتنی کم مدت میں شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا وہ قابل رشک ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ ان میں ناقدانہ شعور بھی ابتدا ہی سے موجود تھا۔ پتہ نہیں اس شعور کو اتنی تیزی سے انھوں نے کیوں نہیں ابھارا جس قدر تیزی سے انھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو ابھارنے کی طرف توجہ دی۔

سلام نے تقریباً ۱۹۳۵ء سے شاعری شروع کر دی تھی جبکہ ان کی عمر مشکل سے پندرہ سال ہی تھی یہی نہیں بلکہ ان کا پہلا مجموعہ "میرے نغمے" بھی لگ بھگ ۱۹۳۶ء یا اس کے فوراً بعد لکھنؤ سے چھپا تھا اور اس کے ایک حصے "انگارے" کو انگریزی سامراج کے نمائندوں کے ظلم کے باعث پریس ہی سے نکال دینا پڑا تھا۔[1]

انھوں نے نثر نگاری بھی اسی زمانے سے شروع کی، لیکن نثر نگاری کی بے پناہ قوت رکھنے کے باوجود سلام نے اس جانب بھرپور توجہ نہیں دی۔ اس کا سبب انھوں نے بیان کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"میں سب سے پہلے ایک شاعر ہوں مگر روٹی مجھے نثر نگاری دے رہی ہے۔"[2]

مگر اس کے باوجود سلام میں نثر نگاری کی بے پناہ قوت و صلاحیت تھی۔ انھوں نے افسانے ڈرامے اور تنقیدی مضامین بھی اسی زمانے میں لکھنے شروع کر دیئے تھے جبکہ وہ شاعر کی حیثیت سے شہرت کی منزل کو چھو رہے تھے۔ ان کے افسانے "خونی گھڑ ندا" (مطبوعہ ماہنامہ نگار اکتوبر ۱۹۳۹ء) "بندی" (مطبوعہ آجکل جنوری ۱۹۴۲ء) "شبنم" (مطبوعہ جام نو دھنباد جون۔ جولائی ۱۹۶۰ء) "ناگن" (مطبوعہ عصمت کراچی اپریل ۱۹۶۳) اور "کالی کرن" (مطبوعہ نیرنگ خیال اگست ۱۹۶۷ء) کے مطالعہ سے ان کی افسانہ نویسی کی بتدریج ترقی کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح ان کے ڈراموں تاج محل کی تشکیل،

---

[1] ماہنامہ انکار کراچی سنہ؟ [2] ماہنامہ انکار کراچی سنہ؟

تخیلات، اجنتا کی گونج، مصر میں، بکھرے موتی اور موت کی ہار" وغیرہ کو پڑھ کر بھی ان کی نثر نگاری کی اہمیت کا قائل ہونا پڑتا ہے، لیکن افسانہ نویسی اور ڈرامہ نگاری کے ساتھ سلام نے جو تنقیدی مضامین لکھے ان کے مطالعے سے ان کے ذہنی رجحانات اور تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ کاش! سلام نثر نگاری کو روٹی کمانے کا ذریعہ نہ سمجھ کر اس کی جانب اور بھی سنجیدگی سے توجہ دیتے تو ان کے قلم سے بے حد معیاری تنقیدی مضامین کی تخلیق کا امکان تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں بہت کم مضامین لکھے ہیں۔ پھر بھی ان مضامین کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کس قدر بے باکی سے کرتے تھے اور اپنے دل کی بات کو ظاہر کرنے کی ان میں کس قدر جرأت موجود تھی سب جانتے ہیں کہ سلام نے جس ادبی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، وہ ترقی پسند نظریات کی آڑ لے کر بعض حضرات سیاسی نعروں کو مسلط کر دینا چاہتے تھے۔ اور ان میں سے بیشتر ترقی پسند نظریات کو اختیار کرتے وقت انتہا پسند بن گئے تھے۔ سلام نے بھی سامراجیت کے خلاف آواز اٹھائی اور چاہا کہ سماج کے غیر مساوی حالات کو تبدیل کر دیا جائے لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے کبھی ان نظریات کو نہ تو خود اختیار کیا اور نہ ان کے مقلدین کی ہم نوائی ہی کی جو نہ تو معاملہ فہم ہی تھے اور نہ دانش ور۔ بلکہ ترقی پسند نظریات کو انھوں نے محض روٹی، بھوک، محنت اور مکان کے نام پر چند نعروں تک محدود کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا ہے:

"اکثر ترقی پسندوں سے میں متفق نہیں ہوں میں نہیں مانتا کہ صرف روٹی کے مسئلہ پر ادب اور فن ایک ہو جائے۔۔۔ ہمارے دونوں ملکوں (ہند پاک) کے ادیبوں کو اپنے قریبی مسائل پر لکھنا چاہیئے یہ ادیب اپنے گھر کی فضاؤں کو بھول کر روس، چین کوریا اور ملایا وغیرہ کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی نئی زندگی کی بنیاد پڑی ہے اور پاکستان میں بھی۔ کیا یہ ادیب اور شاعر رومانی ہوں یا انقلابی، اپنے گھر کی فضاؤں سے اپنی تخلیقات کے لیے مواد نہیں لے سکتے؟ میں تو نئے فنکاروں کی اس مجہولیت سے بہت چڑتا ہوں۔ کوئی کہانی پڑھیے۔ کوئی نظم دیکھیے موضوع یہی ہوگا۔

"بہار آئی ہے مگر گلشن اداس ہے"

ارے بھئی۔ یہ کیوں اداس ہے۔؟ کیسے اداس ہے؟ اچھا چلو۔ یونہی سہی اداس ہے تو پھر تمھارا فرض کیا ہے۔؟ تم تو معمار ہو، تم کرو نا یہ اداسی۔ یہ "خزاں پرستی" کہیں ہمارے پورے ادب کو نہ لے ڈوبے یہی سوچا کرتا ہوں۔" [1]

انھوں نے ادب کو محدود موضوعات میں مقید کرنے سے بھی کبھی اتفاق نہیں کیا۔ انھوں نے کبھی نہیں چاہا کہ ادب کو چند مخصوص نظریات میں سمیٹ کر زندگی کے سنجیدہ اور شگفتہ پہلوؤں کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کیا جائے اس سلسلے میں وہ اپنے خیالات کو کس قدر بے باکی اور حق گوئی کے تحت ظاہر کرتے ہیں:

"بھلا سوچئے تو سہی۔ کیا ادب کے لیے یہی گنے گنائے موضوعات ہیں۔؟ کیا موسیقی، مصوری، رقص، فلسفہ، نفسیات اور اسی طرح کے بہت سارے موضوعات کو صرف ادب اپنے سینے میں سمیٹے ہوئے ہے۔؟ تو پھر آج کے ادب کے دامن کو اتنا تنگ کیوں سمجھا جا رہا ہے اور ہمارے لکھنے والے "گہرے اور سنجیدہ موضوعات" پر کیوں نہیں لکھ رہے ہیں؟؟؟ اس سے پہلے کہ آپ مجھے "رجعت پسند" کہیں میں اپنا خیال ظاہر کر دوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے نئے ادیب پڑھے لکھے کم ہیں (بے شک ایسوں میں میں بھی شامل ہوں) اس کے علاوہ ان میں "اپنے طور پر" کچھ سوچنے کی صلاحیت بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ انگریزی تو انگریزی اگر یہ علوم مشرقیہ (اور یہ علوم مغربی سے کسی طرح کم نہیں) سے بھی واقف ہوتے اور ان کے شہ کاروں کو پڑھتے تو ان کے دل میں کچھ کام کرنے کی لگن ضرور پیدا ہوتی۔ میرے خیال میں تو یہ حساس بھی صرف دکھاوے کے طور پر ہوتے ہیں ورنہ یہ ایک بات، ایک مسئلہ،

---

[1] آئینہ کے سامنے۔ الحمرا کراچی۔ اپریل ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۷۳

ایک موضوع پر کچھ سوچتے اور اس میں ڈوب جاتے تو ضرور رہ جاتے انھیں سوچے بغیر ایک بات جلدی سے کہہ دینے کی عادت ہو گئی ہے اور یہ جلد بازی بڑی خطرناک چیز ہے۔ سنجیدہ اور گہرے موضوعات پر پڑھتے وقت اور خاص طور پر لکھتے وقت صبر و سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے خیال میں نوجوان کمیونسٹ ادیبوں میں (جو اپنے کو پڑھا لکھا کہتے ہیں۔) ایسے بہت کم ہوں گے جنھیں مارکس کیپٹل (CAPITAL) پڑھنے کی زحمت گوارا کی ہو سنجیدہ موضوعات پر "منصوبے اخبار" کالم اور سنی سنائی باتیں کافی نہیں ہیں۔ اس طرح حاصل کی ہوئی قابلیت صرف پھلجھڑی کی طرح ہوتی ہے۔ ابھی چھوٹی ابھی روشنی اور ابھی اندھیرا"۔؎۱

سلام چاہتے تھے کہ اردو کے ادیب اور شاعر زندگی، اس کے ماحول اور اس کے مسائل کو دل کی نگاہ سے بھی دیکھیں اور ایسی تخلیقات کو جنم دیں جن سے "اپنائیت" کی بو آئے اور جو زندگی کے تمام تر گداز پن کو پیش کریں۔ ان کا دل چاہتا تھا:

"میں اپنے بعض شاعروں کو ان چینی اور جاپانی شاعروں کی طرح دیکھنا چاہتا ہوں جو اپنے قریبی مناظر، اپنے کھیتوں، اپنے باغوں اور اپنے آنگنوں میں چمیلی کے پودوں سے اپنے قلموں کے لیے مواد لیتے ہیں۔ جو اپنے بچوں کی موت اور ان بچوں کی مسکراہٹوں پر غیر فانی نظمیں لکھ چکے ہیں آج کے کمیونسٹ چین کے شاعر بھی آئیں بائیں شائیں نہیں بکتے بلکہ وہ کلا کی مورتی کو کلاکار کے نازک ہاتھوں سے چھوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج کے ناقد صرف دوسروں کی کہی ہوئی باتیں نہ دہرائیں بلکہ اپنی فضا، اپنے ماحول اور اپنے فنکاروں کی زندگی میں اپنوں کی طرح نکلیں، ملیں اور پھر فنکاروں کے ساتھ ساتھ چل کر ان کی زندگی اور فن کا تجزیہ کریں"۔؎۲

سلام اپنے تنقیدی مضامین میں اس بات کا بار بار اعلان کرتے رہے کہ وہ ادب میں کسی "ازم" کے نہ تو خود قائل ہیں اور نہ کسی ادیب یا شاعر کو کسی مخصوص نظریے (ازم) کی پیروی کرتا ہوا دیکھ کر اسے سچا ادیب یا شاعر ماننے کو تیار ہیں۔ انھوں نے خود کو زندگی بھر صرف ایک کلاکار کے طور پر پیش کیا اور وہ ادب میں سیاست کے کھوکھلے نعروں کو داخل کرنے پر کبھی تیار نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی شعری تخلیقات میں اپنی فکری عظمت کی بنیاد رکھتے وقت زندگی اور اس کے مسائل کو پرکھا، دیکھا اور سمجھا، اس سلسلے میں ان کا خیال تھا:

"فکری عظمت کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ براہ راست زندگی کو بھگتنے کے بعد اسے سنوارنے اور اسے حسین دیکھنے کی تمنا سے سرشار ہوتے ہوئے اس کے ردّ عمل کے طور پر خود حسین بن جانے کی کوشش سے میسّر آتی ہے"۔؎۳

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سلام کو ترقی پسندی سے گریز تھا یا وہ ادب کے ترقی پذیر پہلوؤں سے نفرت کرتے تھے۔ وہ ترقی کے تمام تر روشن امکانات کا خیر مقدم کرنا چاہتے تھے مگر اس سلسلے میں انتہا پسندی کو وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے اسی لیے اپنے اس جذبے کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا:

"میں ترقی پسندی کے خلاف نہیں ہوں البتہ اس جماعت بندی کو ضرور برا سمجھتا ہوں۔ جہاں سیاست آرٹ پر چھانے لگتی ہے اور جہاں ایک فنکار کی تخلیقی آزادی ختم ہونے لگتی ہے۔ حیرت ہے کہ انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ میں اپنے انھیں خیالات کے باعث "اشتراکی ترقی پسندوں" میں کتنا مطعون ہوں"۔؎۴

یہی سبب ہے کہ سلام اپنے بہت سے ایسے ہم عصروں سے نباہ نہیں کر سکے۔ جن کی سرپرستی یا صحبت بقول ان کے مجموعی طور پر ضرر رساں ثابت ہوتی ہے۔

؎۱ آئینہ کے سامنے، الحمرا۔ اپریل ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۰۳، ؎۲ آئینے کے سامنے۔ الحمرا۔ اپریل ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۰۲، ؎۳ قومی زبان کراچی جنوری ۱۹۶۱ء
؎۴ مدیر الحمرا کے نام خط۔ الحمرا جون ۱۹۵۲ء صفحہ ۴۔۳

"غلط سرپرستی سے تخلیقی کام کرنے والوں کا فائدہ نہیں لیکن نقصان بہت ہوتا ہے۔ ان کی فکری پرواز رک جاتی ہے اور یہ صرف فن کاروں اور ان کے فن ہی کا نقصان نہیں ہے بلکہ بحیثیت مجموعی پوری قوم اور وطن کا نقصان ہے۔"[1]

ایسے حالات سے سلام کا نباہ بڑا مشکل تھا۔ اسی لیے بار بار ان کی انا ابھر آتی تھی اور وہ محسوس کرتے تھے کہ انھوں نے ادب کے جن مسائل پر جس طرح غور کیا ہے وہ صادق ہیں۔ اور وہ اپنی اس صداقت کو تسلیم کرانے کے لیے محدود دائروں سے باہر نکل کر کسی فضا میں سانس لینا چاہتے تھے جہاں ان کی کہی گئی باتوں پر کان دھرے جائیں اور جب وہ دیکھتے تھے کہ ان کی باتوں کو محض بعض مصلحت اندیشیوں اور نظریاتی یا سیاسی اختلافات کی بنا پر نظر انداز کیا جا رہا ہے تو وہ بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں اپنے تخلیقی عمل اور اپنی فکری عظمت پر ہمیشہ ناز اور گھمنڈ رہا۔ نیز انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے دلی جذبے کا بڑا بے باکی سے اظہار کیا۔

سلام سائنس کے ارتقا کا احترام تو کرتے تھے لیکن انھوں نے سائنسی ارتقا کے ساتھ ارضی سرزمین کے حسن کو کبھی نظر انداز کرنا نہیں چاہا۔ انھوں نے سائنس کی ترقی کو مبارک و سعید تو تسلیم ضرور کیا مگر اس ترقی کے پس پشت تخریبی عمل یا محض سیاسی نعروں سے انھیں ہمیشہ اختلاف رہا۔ انھوں نے تاج محل کو اس دھرتی کے حسن کو سنوارنے والی حسین داستان سے تعبیر کیا اور اس سائنسی نظریے کی تردید کی جس کے تحت شہنشاہیت اور مظلومیت کے جذبے کو محض اس لیے ابھارا گیا کہ شاہ جہاں نے تاج کی تعمیر محبت کے صلے کے طور پر نہیں بلکہ دولت کے سہارے کر کے لاکھوں غریبوں کی محبت کا مذاق اڑایا ہے۔ اس سلسلے میں سلام بڑی سنجیدگی سے ساتھ کہہ گئے

"تاج محل کے رہبر جس دم پچھلے قصے دہراتے ہیں
"تاراجی" کا دشمن ہوں لیکن پھر بھی آنسو آجاتے ہیں
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہو جاتا ہے

اس سلسلے میں سلام اپنے ان ہم عصروں سے الجھ جاتے تھے جو ادب کو ہر پہلو سے سائنسی ارتقا کی روشنی میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ آمید کالج بھوپال میں منعقدہ مشاعرہ کی اس "میٹنگ" کو اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس میں سلام اس مسئلہ پر اپنے دو اشتراکی ترقی پسند شاعر دوستوں سے الجھ گئے تھے۔

تاج کے حسین نقشوں کو سن کر سلام کی آنکھوں میں آنسو آجانے کو سائنسی ارتقا کے پیرو کار چاہے تسلیم نہ کریں لیکن سلام نے تاج کو ہمیشہ "دھرتی کا حسن" سمجھا اور یہ جذبہ ان کے دل میں محض ایک کلاکار ہونے کے ناتے ہی پیدا ہوا تھا۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے سائنسی ارتقا کو مبارک تسلیم کرنے کے باوجود اسے بڑی حد تک خطرناک بھی سمجھا۔ اس سلسلے میں اُن کا کہنا تھا:

"میرے خیال میں سائنسی ترقیاں بہت مبارک ہیں اگر یہ دھرتی کو سنوارنے اور انسان کے صحت مند جوہروں کو نکھارنے میں ان تمام خوبیوں کے ساتھ مصروف ہو جائیں۔ میں آپ سے بہت پر زور لفظوں میں یہ کہنے کے لیے خود بھی تیار ہو رہا تھا کہ خلا کی تسخیر کی خواہش بالکل بے معنی ہے۔ اگر دھرتی اور اس پر بسنے والے انسانوں کے مسائل الجھے ہوئے ہیں اور یقیناً میں سب سے پہلے یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر یہ واقعی پروپیگنڈہ نہیں ہے اگر یہ سب سرد جنگ کے ٹھنڈے شعلے نہیں ہیں اور اگر ابھی "تیسری جنگ" کا کوئی امکان نہیں ہے تو ہمارے سائنس دانوں کو خلائی رازوں کو بے نقاب کر کے ان پر فتح پانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ عروس گیتی کو بھی حسین تر اور حسین ترین بنانے کی سعی کرنی چاہیئے۔ اور یہ سائنسی ترقیاں تخریبی مقاصد کے لیے ہیں تو یہ بہت نامبارک خیال ہوگا خدا نہ کرے اگر تیسری جنگ ہوئی تو پھر آج کی یہ برق رفتار تاریخ پیچھے کی طرف لوٹ جائے گی۔ میں انتہائی خوش فہم اور خوابوں کی وادیوں میں رہنے والا شاعر نہیں مگر میرا خیال ہے کہ دنیا پھر تباہ نہ ہوگی۔ انسان زندہ

---

[1] مدیر الحمرا کے نام خط۔ الحمرا، جون ۵۴ء صفحہ ۳۰۔

رہے گا اس لیے کہ وہ امر ہے اور یہ جو روشنی کے ساتھ اندھیرا سا بھی نظر آجاتا ہے کس لیے؟ حیات بخش فضاؤں کے ساتھ یہ اجل ساماں حالات کیوں۔؟ کس لیے!؟ کس کے لیے؟؟؟

کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم صرف روشنی، امن، تہذیب اور انسان دوستی کی باتیں کریں۔؟ کیا ہمارے سائنسی کارنامے اس بات میں ہماری کوئی مدد کریں گے؟ ۔۔۔۔

اجنتا اور تاج محل سے کسی طرح بھی کوئی انقلابی تصور نہیں ابھرتا۔ یہ دونوں ہی صرف محبت، حسن، کلا اور روشنی کی نشانیاں ہیں۔[1]

سلام نے اپنے بیشتر تنقیدی مضامین میں اپنے نظریات اور دلی جذبات کا جس طرح اظہار کیا ممکن ہے ان کے مطالعہ کے بعد یہ رائے قائم کی جائے کہ وہ بعض صورت میں چڑ کر اپنا غصہ اتارنا چاہتے تھے یا ان کے یہ مضامین بالکل ذاتی (PERSONAL) بن کر رہ گئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے اس عمل کے پیچھے ان کے بعض ہم عصروں کا وہ سلوک کارفرما تھا جس کے تحت وہ نہ تو سلام کے ذریعے کہی گئی باتوں کو لائق توجہ سمجھتے تھے۔ اور نہ ہی ان کی شاعرانہ اور فن کارانہ اہمیت اور ان کی فکری عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کر رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ بعض حالتوں میں انھوں نے سلام کو کم پڑھا لکھا ادیب و شاعر کہہ کر انھیں اپنے "حلقۂ دانش وروں" سے نکال دینا چاہا تھا۔ نیز انھیں "احساس کمتری" میں مبتلا کر کے ان کی تمام تر شعری خوبیوں اور تنقیدی شعور سے یکسر انکار بھی کر دیا تھا۔ سلام نے ان لوگوں پر اپنا غصہ اتارا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ادب میں ڈکٹیٹر شپ کو قائم رکھنے کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کیے گئے ان کے خلاف آواز اٹھائی جائے اور ادب و شاعری کو ایک کلاکار کی حیثیت ہی سے پرکھا جائے نیز شعر و ادب میں زندگی کے ایسے شگفتہ اور سنجیدہ مسائل کو بھی شامل کیا جائے جنھیں فنکار نے خود پرکھا، دیکھا اور سمجھا ہو۔ وہ شعری و ادبی ماحول کو ایک آئینہ کی طرح سمجھتے تھے اور فن کاروں کو اس کے سامنے بٹھا کر اس کے چہرے کے نقوش کو اس میں دکھانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ فن کار جو بوڑھے ہو چکے ہیں اس آئینے کے سامنے سے ہٹیں اور نئے اور تازہ دم فنکاروں کو آئینے کے سامنے آنے دیں۔ اس سلسلے میں وہ ٹیگور کے اس قول کو دہراتے تھے۔

"میں ادب کا اسٹیج نئے اداکاروں کے لیے چھوڑتا ہوں"۔[2]

اس تنقیدی رجحان کے علاوہ جو ذرا ذاتی ہو گیا تھا سلام نے اپنے دوسرے مضامین میں اپنے تنقیدی شعور اور فکری عظمت کو قدر اطمینان بخش حالتوں میں پیش کیا۔ یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ سلام خود کو ایک کلاکار ہی تسلیم کرتے تھے اور ایک کلاکار ہونے کے ناطے وہ زندگی کے تمام تر حقیقی اور سنجیدہ پہلوؤں پر توجہ دیتے تھے۔ اسی لیے ان کا تنقیدی شعور کسی خاص نظریہ، ازم اور حدود کا پابند نہ ہو سکا جس نے انھیں انتہا پسندی سے بچا لیا اسی شعور نے انھیں دھرتی پہ بکھرے حقائق کو پرکھنے اور انھیں اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کی جانب متوجہ رکھا۔ اسی لیے وہ زندگی کو ان خلاؤں میں پرواز کرنے کی اجازت نہیں دے سکے جہاں پہونچ کر انسان کے قدم دھرتی کو چھونے سے محروم ہو جائیں۔ وہ اس دھرتی اور اس کے مسائل کو حسین ترین بنانے کے خواہش مند رہے ان کی اس خواہش نے ان کے تنقیدی شعور کو معتدل بنائے رکھا یہی سبب ہے کہ وہ ان ادبی میلانات کی طرف راغب رہے جو دھرتی پر بکھرے انتشار، کرب، بدنظمی کو حسن، سکون اور اطمینان میں تبدیل کر سکیں اسی لیے انھوں نے فطری تقاضوں کو ہمیشہ مکمل کرنا چاہا۔ چاہے وہ رومانی ہوں یا انقلابی۔

سلام کے اس سنبھلے ہوئے انداز نے انھیں بہ یک وقت رومانی اور انقلابی رجحانات کا قائل بنا دیا تھا لیکن ان کا رومان نہ تو انھیں اتنی دیر تک کہکشاں پر نگاہیں گاڑنے کی اجازت دیتا تھا کہ دھرتی پر بکھرے حقائق سے وہ غافل ہو جائیں اور نہ ان کا انقلابی تصور پیمانہ کو توڑ پھوڑ لینے کے تصوّں، قصر شاہی کو زمین سے ملا دینے اور نعرۂ انقلاب لگانے تک ہی محدود تھا۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے ان فنکاروں

---

[1] قومی زبان، جنوری، مارچ ۶۲ء صفحہ ۶۵، ۶۴؛ [2] آئینے کے سامنے الحمرا اپریل ۷۵ء صفحہ ۱۷۲

کو نگاہِ قدر سے دیکھا جن کی تخلیقات میں اسی معتدل رجحان کی ملاپنیں موجود تھیں۔ مثلاً انھوں نے سروجنی نائیڈو کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے جذبے کا اظہار یوں کیا :

" یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ نائیڈو کی شخصیت سامراجی دور میں جاگیردارانہ نظام کی پیداوار تھی لیکن شروع ہی سے ان کے اندر کی شاعرہ بھی جاگ رہی تھی ان کی آواز اور شاعرانہ نظریہ ان نقرئی فضاؤں سے جن میں وہ خود گھری ہوئی تھیں نامعلوم انداز سے بغاوت بھی کرتی رہتی تھی اور یہی دھرے کرائی زندگی کی دوسری منزلوں میں وہ ملک کے کاروانِ آزادی میں ایک رہنما کی حیثیت سے آئیں۔ یہیں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ سیاست کے میدان میں بھی شاعری کی گل بار راہوں سے آئی تھیں۔" [1]

یا پھر انھوں نے نذرالاسلام جیسے باغی اور انقلابی شاعر کو نگاہ قدر سے اس لیے دیکھا کہ اس کی تخلیقات میں بغاوت کی بو اور انقلاب کی شعلہ فشانی کے ساتھ زندگی کی دھڑکن اور ذہن کی نغمگی بھی موجود تھی۔ سلام تدرل کے اس قول کے قائل تھے۔

" میرے ایک ہاتھ میں ٹیڑھے بانس کی بانسری ہے دوسرے ہاتھ میں طبل جنگ "۔

رابیندر ناتھ ان کی نظر میں TORU DUT سے بڑے شاعر تھے اس لیے کہ دت کے مقابلہ میں ٹیگور کی شاعری میں اپنائیت (ہندستانیت) کے بڑے گہرے نقوش ابھرتے تھے۔ نیز جن میں روحانی بلندیوں کے بھی ایسے گہرے نقوش ابھرے تھے جو ذہن کو انقلابی بنانے کے ساتھ سکون و اطمینان سے بھی قریب کر رہی تھی۔ جبکہ ترو دت ایسی شاعرہ تھی جس کی نظموں میں مخصوص ہندستانی رنگ نہیں ابھر پایا تھا۔ اسی لیے سلام نے ٹیگور کے نظریات پر ماہ نامہ " آندھرا پردیش " میں کافی تفصیل سے اظہار خیال کیا۔

سلام نے مولانا ابوالکلام آزاد کو اس لیے عظیم سمجھا کہ موصوف عقائد روایات کے بھی دائروں سے سنبھلے ہوئے انداز میں نکلنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور اوہام و خام خیالی کی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ کی موجودگی پر یقین رکھتے تھے۔ سلام مزاجی اعتبار سے مولانا کے مذکورہ عقیدہ کے قائل تھے وہ خود بھی حالات کی تبدیلی کو انتہائی سلجھے ہوئے انداز میں قبول کرنے کے خواہش مند تھے جس نے ان کے مزاج میں بھی مولانا موصوف کی طرح اعتدال اور یک سوئی پیدا کر دی تھی۔ وہ مولانا کے اس قول کو تسلیم کرتے تھے :

" ہماری زندگی ایک آئینہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے اگر ایک چہرے پر بھی غبار آجائے گا تو سینکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے" [2]

مولانا آزاد نے زندگی کو قدرت کا حسین ترین عطیہ سمجھا اور سلام نے ان کی مکمل تقلید کرتے ہوئے زندگی اور اس کے مسائل کو حسین تر بنانے کی ہمیشہ کوششیں کیں۔

سلام نے اپنے ان خیالات کا اظہار بار بار کیا ہے کہ وہ سیاسی آدمی نہیں بلکہ ایک کلاکار ہیں اور کلاکار کے تعلق سے وہ اپنے فن کو سیاسی یا ادبی نظریات سے بچائے رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے اس عقیدے کو مولانا کی روش ہی سے روشنی ملی تھی جس کا اظہار سلام نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کیا :

" مولانا کی سیاسی زندگی کے طوفانی حوادث انکی تمام دوسری حیثیتوں پر چھا گئے ہیں لیکن خود مولانا نے اپنی سیاسی زندگی کو اپنے علمی اور ادبی علائق سے ہمیشہ الگ رکھا ہے۔ جن راستوں سے ان کا علاقہ محض علم و ادب کے ذوق کا علاقہ ہے وہ ان کے علائق کو سیاسی زندگی سے ہمیشہ الگ رکھتے ہیں اور اس طرح الگ رکھتے ہیں کہ سیاسی زندگی کی پرچھائیں بھی اس پر نہیں پڑ سکتی " [3]

سلام کو مولانا کی شخصیت میں ان اخلاقی، تہذیبی اور روحانی اقدار کے تمام تر نشانات دکھائی دیئے جن کے باعث زندگی اپنی

---

[1] میرا خیال ہے۔ الحمرا دسمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۔ [2] مولانا آزاد غبار خاطر کی روشنی میں 'پاسبان' اگست ۶۳ء صفحہ ۱۷، [3] 'پاسبان' اگست ۶۳ء صفحہ ۷۔

شگفتگی اور سنجیدگی کو قائم رکھ سکتی ہے۔ اسی لیے سلام مولانا آزاد کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے اور ان سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے اس لیے کہ سلام کو سائنس کی تخریبی ترقی سے جو بیزاری تھی اس کا حل ان کے نزدیک ماضی کی وہ شاندار اقدار تھیں جن کی بنیادیں اخلاق، تہذیب، حمیت اور انسان دوستی پر تھیں۔ اسی لیے سلام نے مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

"غرض مولانا ایک روشنی تھے اور روشنی امر ہوتی ہے۔ آج مولانا کا جسم خاکی سرزمیں ہی مگر ان کی روشنی زندہ و پائندہ ہے ہمارا دیش روشنیوں اور چراغوں کا ایک جگمگاتا دیس ہے۔ ہر دور میں یہ چراغ ہماری بزم میں پرنور رہے ہیں اور رہیں گے۔ ہم اس سائنسی دور میں سائنس کی اہمیت کو مانتے ہوئے بھی ان اخلاقی، علمی اور روحانی اقدار کے قائل ہیں جو عہد قدیم سے اب تک ہمارے فلسفۂ حیات کی روح رہی ہیں"۔ [۱]

سلام اس ڈکٹیٹرشپ، اور شہنشاہیت کے ہمیشہ دشمن رہے اور ان سے پیدا ہونے والے حالات کی ہمیشہ مخالفت کی جس کے باعث انسان کشی کے دل سوز نظارے دیکھنے کو ملے۔ انھوں نے فرانس کے تشدد پسند شاہ لوئی کو بدترین اور قابلِ نفرت شخصیت سمجھا نیز اس کے تشدد آمیز رویے کی مخالفت کرنے والے عظیم ادیب والٹیر کو خراجِ عقیدت پیش کیا جس نے انسان دوستی کے تحت لوئی کے ظالمانہ سلوک سے زندگی بھر نبرد آزمائی کی۔ ان حالات کا موازنہ کرتے ہوئے سلام نے شاد عارفی کو والٹیر کی طرح عظیم شاعر تسلیم کیا۔ اور شاد عارفی کے ذریعہ درباری امرا کی زوال آمادہ زندگی پر لگائی گئی ضربوں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ انھیں شاد کی شاعری میں موجود طنز میں اسی انقلاب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جو والٹیر کی تخلیقات میں انسان دوستی کے تحت ابھری تھیں۔ اور جو اصلاحی ہونے کے بجائے انقلابی تھیں لیکن شاد کے انقلابی تصور میں نعرے بازی کی نہ تو بوکھلاہٹ ہی ملتی ہے اور نہ اس میں سیاسی مصلحت اندیشیاں یا محدود نظریے ہی موجود ہیں بلکہ اس کا یہ تصور بقول سلام

"نئے نظام کے مزاج کی نقش گری کرتا ہے"۔ [۲]

— جس میں سنجیدگی بھی ہے اور شگفتگی بھی، اعتدال بھی ہے اور نغمگی بھی۔ اور جو گھن گرج سے ملوث انقلابیت سے مبرا ہے۔

سلام نے شاد عارفی کو اردو کا والٹیر کہا ہے۔ چونکا دینے والی بات ضرور ہے لیکن وہ لوگ جو رام پور کے سیاسی اور تہذیبی پس منظر میں شاد کی شاعری کا موازنہ فرانس کے سیاسی اور تہذیبی حالات میں ابھری ہوئی والٹیر کی تخلیقات سے کر سکتے ہیں وہ سلام کی کہی ہوئی بات کی تردید ہرگز نہیں کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں سلام نے شاد کا موازنہ والٹیر سے کرتے ہوئے کس قدر سچی بات کہی ہے:

"مجھے والٹیر اور شاد کی زندگی میں حیرت انگیز حد تک مشابہت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے اس کا تو علم نہیں کہ انھیں جیل بھیجا گیا یا نہیں یا ان کی پٹائی بھی ہوئی یا نہیں (والٹیر کو فرانس کے نگران حکومت نے جیل بھیج دیا تھا اور وہاں چند غنڈوں سے اس کی پٹائی بھی کرائی تھی۔ ظ۔ ۹) لیکن وہ جس انداز سے رام پور کے درباری امرا سے الجھتے رہے اس کا انجام یہی کچھ ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ شاد صاحب نے ان کی زوال آمادہ زندگی پر بڑی کاری ضربیں لگائی تھیں والٹیر کی طرح ان کا حربہ طنز تھا۔ اور انھوں نے والٹیر ہی کی طرح بے باکی سے ریاستی زندگی کی بے اصولیوں کو بے نقاب کیا۔" [۳]

سلام کا تنقیدی شعور اس وقت اور ابھر کر سامنے آتا ہے جب وہ — شاعری کے ساتھ دوسرے آرٹ پر بھی اظہارِ خیال کرتے ہیں مثلاً وہ مصوری کے آرٹ میں پیدا ہونے والی ایسی جدت طرازی کو گوارا نہیں کرتے جو عوام کے داخلی اور خارجی تجربات سے دور رہ کر مخصوص

---

۱ مولانا ابوالکلام آزاد "غبارِ خاطر کی روشنی میں"۔ پاسبان، اگست ۱۹۶۳ء صفحہ ۲۰۔

۲ "ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں"۔ آندھرا پردیش فروری ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۰۔

۳ ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ آندھرا پردیش فروری ۱۹۶۷ء صفحہ ۹ اور ۱۰۔

اور محدود ہو جائے بلکہ وہ آرٹ میں ایسی قوت کے قائل تھے جو انسانوں کے ذہن کے قریبی پردوں ہی کو نہیں بلکہ روح کی گہرائیوں کو بھی چھوتی ہے۔ اسی لیے وہ آرٹ کو قدیم یا جدید شکلوں میں دیکھنے کے بجائے محض اسے آرٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ ایک شاعر کو سیاسی مصلحتوں اور ادبی نظریات سے بلند تر سمجھ کر صرف فنکار کی شکل میں دیکھنا پسند کرتے تھے اس سلسلے میں ان کا کہنا تھا:

"میں تو سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں ابھی کسی اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے۔ آرٹ سب سے پہلے آرٹ ہے پھر وہ ماڈرن یا قدیم آرٹ میں تبدیلی کسی سیاسی نعرے یا سائنسی ایجادات کے باعث نہیں ہوگی۔ بلکہ اسے بھی انسان کا ذہنی شعور بدلے گا جو ہر وقت "روشنی" کی تلاش میں رہتا ہے"[1]

غرض سلام مچھلی شہری کی فنکارانہ عظمت جہاں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے بلند تھی وہیں ان کی فکری عظمت کے روشن نشانات ان کی نثری تخلیقات میں بھی نظر آتے ہیں۔ خاص طور سے ان کے تنقیدی شعور کی عظمت اور بھی بلند ہوتی اگر حالات ان کا ساتھ دیتے اور انھیں "ذاتی تنقید" کی طرف متوجہ ہونے کی سہولت بھی ترا کیب سے بچا لیا جاتا اور وہ خود بھی اس احساس کو اپنے سینے سے نکال دیتے کہ ان کی فکری عظمت کی ناقدری کرنے والے انھیں احساس کمتری میں مبتلا کرنے پر آمادہ ہیں۔

★

نسیم اجملی



سلام کی یاد میں

مثال موجِ صبا جو آیا بہ رنگِ بادِ سحر گیا وہ
نسیم صحنِ چمن سے پوچھو کہاں پہ گر کے بکھر گیا وہ

وہ تلخیاں جو دکھوں کی اس کی رگوں میں پیوست ہو چکی تھیں
انھیں سے لڑتا رہا وہ ہر دم، انھیں سے ٹکرا کے مر گیا وہ

تمام دشتِ حیات اس کو خلا کی مانند گھورتا تھا
کہاں تلک روکتا قدم کو خلا کے اندر اتر گیا وہ

عجیب تھا اس کا دردِ پیہم، صدائیں لاکھوں تھیں جس میں غم کی
ہوئیں نہ آنکھیں وہ پھر بھی پُرنم، بکھر بکھر کے سنور گیا وہ

وہ شوخ اندازِ مے گساراں، وہ خوش خیالِ بتِ غزالاں
سجائی اس نے بساطِ یاراں، ہر ایک دل میں اتر گیا وہ

متاعِ راہِ وفا شعاراں، وہ رشکِ بزمِ جگر فگاراں
فلک پہ تھا غم کا ابرِ باراں، برس برس کے گزر گیا وہ

عجیب تھا سانحہ سفر کا، وہ دکھ سے مل کے دکھوں سے چھوٹا
یہ اس کو رستے میں کس نے لوٹا، یہ ہم سے مل کر کدھر گیا وہ

حصارِ فکر و نظر میں اس نے حدیثِ زخمِ جگر چھپا دی
سلام تھا ایک نام اجمل یہ ہم پہ احسان کر گیا وہ

---

[1] میرا خیال ہے۔ قومی زبان جنوری ۱۹۶۱ء صفحہ ۷۔

دورافسونیدی

سلام مچھلی شہری

ادبی تذکرہ

ایک عرصۂ دراز سے، ایک اوسط درجے کا مسلم خاندان، قصبہ مچھلی شہر ضلع جون پور میں رہتا بستا چلا آ رہا ہے۔ اس میں مشہور محدث محمد اسمٰعیل جون پوری گزرے ہیں۔ ان کے صاحب زادے عبدالرزاق صاحب تھے۔ عبدالرزاق صاحب کے گھر میں یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو، (مچھلی شہر) میں، سلام صاحب کی ولادت ہوئی۔ یہ تاریخ پیدائش اردو مڈل اسکول مچھلی شہر میں درج ہے۔

سلام صاحب نے اردو مڈل اسکول مچھلی شہر سے، مڈل پاس کیا۔ پھر فاربس ہائی اسکول (FORBES HIGH SCHOOL) فیض آباد میں داخلہ لیا۔ آٹھواں، نواں درجہ پاس کیا لیکن میٹرک میں فیل ہو گئے البتہ ان ہی دنوں، انھوں نے اردو کی "اعلیٰ قابلیت" کا ایک امتحان پاس کر لیا تھا۔ پھر بعد ازاں پرائیوٹ طور پر میٹرک پاس کیا

سلام صاحب نے طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ متین مچھلی شہری کے شاگرد تھے۔ اس وقت تک وہ مشاعروں اور رسایل کے ذریعے شاعر کی حیثیت سے عوام میں روشناس ہو چکے تھے۔ یہ شاعری (زیادہ تر) انقلابی افکار کی تھی اور ان دنوں ملک میں تحریک آزادی کے عروج کا زمانہ تھا۔ اکثر سیاسی جلسوں میں، سلام صاحب نظمیں پڑھتے تھے، اور داد پاتے تھے۔ اس طرح وہ ہندستانی عوام و خواص میں، دن دونی ترقی کے ساتھ، ہر دل عزیز ہوتے گئے۔

سلام صاحب نے میٹرک میں فیل ہونے کے بعد، باقاعدہ تعلیم ترک کر دی تھی۔ ان ہی دنوں فیض آباد سے، ایک رسالہ "نغمہ" جاری ہوا۔ اس میں ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔

چند دنوں بعد، ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ "میرے نغمے" کے نام سے پریس کو طباعت کے لیے دیا گیا۔ اس مجموعے کے دو حصے تھے۔ پہلے میں کچھ ہلکی پھلکی رومانٹک طرز کی نظمیں تھیں، دوسرا حصہ "انگارے" کے عنوان سے، انقلابی نظموں پر مشتمل تھا۔ برٹش حکومت کے فرماں رواؤں نے اس دوسرے حصے کو پریس سے کالعدم کرا دیا۔ اس طرح "میرے نغمے" ادھوری شکل میں شائع ہوا۔

اس ستم ظریفی سے پہلے سلام صاحب کو انقلابی نظم پڑھنے کی پاداش میں گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ ان کا فیض آباد کا تعلیمی زمانہ تھا۔ اس وقت فاربس ہائی اسکول کے پرنسپل، ان کے آڑے آئے تھے اور اُن کو گرفتار ہونے سے بچا لیا تھا۔

اس قومی خدمت اور جذبے کے رشتے سے اکثر سلام صاحب اپنے وقت کے رہنماؤں (گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ) کے قریب دیکھے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں ان کے سبھاش چندر بوس سے، ذاتی مراسم بھی قائم ہو چکے تھے۔

سلام صاحب نے کچھ عرصہ ایڈیٹرشپ کے فرائض انجام دیئے۔ پھر ڈاکٹر امرناتھ جھا (وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد) نے، لائبریری الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد کے شعبۂ مشرق میں ملازمت دے دی۔ یہاں پروفیسر اعجاز حسین، فراق گورکھپوری اور دوسرے اہم دانشوروں کے درمیان، ان کی ذہنی استقامت کے آئینے کو اور زیادہ صیقل ہونے کے مواقع ملے۔ پھر کچھ دنوں بعد، جھا صاحب کی سفارش کے ذریعے، آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ان کا ایک اسکرپٹ رائٹر (SCRIPT WRITER)

کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔

لکھنؤ کی رنگین فضا میں، سلام صاحب نے زندگی کے لاتعداد شب و روز، اور کئی ایک ماہ و سال، رومانٹک فضا میں گزارے ہیں۔ دل کو ٹھیس لگی ہے اور دل بستگی بھی ہوئی ہے۔ بہر نوع یہ سارے عشق غیر مستقل تھے اور غیر مستقل ثابت ہوئے۔

سلام صاحب کو یہاں کی ادبی زندگی میں، مجاز اور کچھ دوسرے ترقی پسند، اور کچھ دوسرے ترقی پسند دوستوں کا حلقہ ملا۔ بہت سے لوگ، انھیں ترقی پسند شاعر سمجھتے ہیں۔ یہ یقین کے ساتھ کہنا بہت مشکل ہے۔

میرا خیال ہے ہندوستانی قومی شاعری سے اور ترقی پسند شاعری سے، جدید شاعری کی منزل تک پہنچنے کے لیے، سلام مچھلی شہری کی شاعری، ایک پل کا کام دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں رومانی اقدار کی جگہ جگہ چھاپ ہے۔ لفظوں میں رومانیت، یعنی میں رومانیت، مصرعوں اور شعروں اور نظموں کے بندوں میں رومانیت کی فراوانی، ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

ان کی ذاتی شاعری میں (قومی شاعری کے سوا) کوئی شدید دکھ نہیں ہے؛ نہ سکھ ہے۔ بلکہ ایک دکھ سکھ کا، ہلکا پھلکا سا جوار بھاٹا ہے۔ اس کے علاوہ سلام صاحب کی شاعری میں افکار کی کثرت ہے۔ اس کے اظہار کے لیے، وہ ہر بار ایک نیا تخلیقی تجربہ کرتے ہیں؛ اور کچھ دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے اس وقت موضوعی ہیئت اور تجرباتی شاعری میں (جوش، فراق کے بعد)، سلام اردو کا تیسرا بڑا شاعر ہے۔

"وسعتیں" ان کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں رومانٹک نظمیں ہیں کچھ پر رومانٹک لہجے میں ہیئتی اور تجرباتی فضا ہے یا کچھ میں قومی جذبے کی سرشاری ہے۔ تیسرا مجموعہ "پائل" ہے۔ یہ گیتوں پر مشتمل ہے۔ یہ گیت آل انڈیا ریڈیو سے، گائے جانے کے لیے لکھے گئے تھے ان کے کلام کا ایک انتخاب "سلام مچھلی شہری" کے عنوان سے چھپا ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے شائع کیا تھا۔ "بازو بند کھل کھل جائے" سلام صاحب کا ایک ناول ہے۔ اس کی اشاعت پر ان کی نثری حیثیت کو فروغ ہوا تھا۔ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کے لیے لاتعداد ریڈیائی تقریریں یا فیچرز بھی لکھے۔

سلام صاحب شاعر تھے، اسکرپٹ رائٹر تھے؛ ناول نگار تھے اور افسانہ نگار بھی۔ مدتوں ان کی کہانیاں رسالہ "بیسویں صدی" دہلی میں شائع ہوتی رہیں، اور کچھ دوسرے رسائل میں بھی۔ مچھلی شہر سے فیض آباد تک، فیض آباد سے الہ آباد تک اور الہ آباد سے لکھنؤ تک، ثقافتی اور معاشرتی صورت میں، سلام صاحب نے بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ حاصل کیا اور اس دنیا کو بہت کچھ واپس کر دیا۔

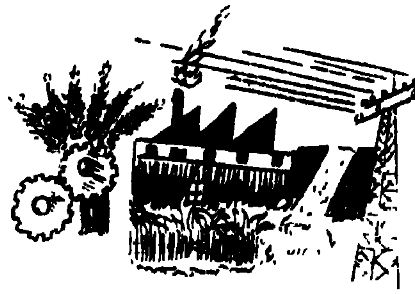
۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء تک، سلام صاحب لکھنؤ میں رہے ۱۹۵۱ء میں سری نگر تبادلہ ہو گیا۔ کشمیر میں کچھ دنوں رہے، پھر لکھنؤ تبادلہ کرایا پھر اچانک دہلی تبادلہ ہو گیا۔ یہاں زندگی کی آخری سانس تک رہے ایک اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے، پروڈیوسر اردو سروس اسٹیشن تک، اس ملازمت میں ترقی کی۔

انھوں نے اپنی ابتدائی شاعری سے، بستر مرگ تک بہت کچھ کہا ہے؛ اور اچھا کہا ہے۔ بہت کم شاعر ہوتے ہیں جو بہت کہیں اور اچھا (کلام) کہیں۔ اس ادبی خدمت کے اعتراف میں، سلام صاحب کو حکومت ہند کی طرف سے، ۱۹۷۰ء کی ابتدا میں "پدم شری" کا خطاب ملا۔

سانولی سی رنگت، کھلا کھلا سا ناک نقشہ، قدرے بھاری بھرکم جثہ، ہر وقت (موسم کے لحاظ سے) مغربی لباس میں مزین رہتا تھا۔ تین بیٹیاں، دو بیٹے، (ایک بیوی) اور ایک وہ خود، ان کا خاندان تھا۔ وہ ایک رومانٹک مزاج شاعر اور آدمی تھے۔ اچھے لہجے میں گفتگو کرتے تھے کبھی کبھار کچھ (دانستہ) تلخی بھی پیدا کرتے تھے۔ یہ تلخی نہایت مختصر اور ہلکی پھلکی ہوتی تھی۔ کوئی ضرب کاری نہیں۔

انتقال سے دو ماہ پہلے، سلام صاحب بیمار ہوئے۔ اسپتال میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا: "یرقان ہے اور کثرت شراب نوشی سے جگر خراب ہو گیا ہے۔" کچھ دنوں زیر علاج رہے۔ بعد میں گھر آ گئے پھر یکایک طبیعت خراب ہو گئی اور ولنگڈن نرسنگ ہوم دہلی میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ اس بار ڈاکٹروں نے کینسر تجویز کیا۔ آپریشن ہوا۔ آپریشن کے بعد چند روز زندہ رہے۔ آخر ۱۹ نومبر ۱۹۷۳ء کو ۱۱ بجے دن کو مذکورہ ہاسپٹل میں انتقال ہو گیا اور قبرستان بہادر شاہ ظفر مارگ دہلی میں سپرد خاک کیا گیا۔

★



اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

نظم و نسق کو زیادہ بہتر بنانے کے لیے مناسب پالیسی وضع کرنے کی ہدایات • • • ۹ لاکھ سے زیادہ بے زمین خاندانوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمین کی فراہمی • • • غیر معمولی پنشن سے متعلق قواعد کو مزید نرم کر دیا گیا • • • ریاست کے تمام کسانوں کو عمدہ قسم کے بیجوں کی فراہمی • • • فاضل مہنگائی بھتہ کی بقایا رقم کی ادائیگی • • • اقوام مندرجہ فہرست کے پوسٹ میٹرک طالب علموں کو مالی امداد • • • نظامت صحت میں کنٹرول روم کا قیام • • • اتر پردیش میں ہوٹلوں کے لیے مالی امداد • • • اتر پردیش کے مقامات سیاحت تک جانے والی سڑکوں کا نقشہ

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے ریاست کے نظم و نسق سے متعلق سینیر افسروں سے پرزور الفاظ میں کہا کہ وہ عملے سے متعلق مناسب پالیسی وضع کریں اور مالیاتی ضبط و نظم کو سختی کے ساتھ بروے کار لائیں تاکہ ریاست کے نظم و نسق کو اور زیادہ بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ اس کو سماجی اور معاشی تبدیلی لانے کا موثر ذریعہ بنایا جا سکے۔

شری بہوگنا نے محکمہ جاتی سکریٹریوں کے ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ بجٹ میں شامل مدوں کے لیے مہیا کردہ رقومات کی منظوری دیں۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملے میں کوئی کوتاہی نہ برتنا چاہیے۔

وزیر اعلیٰ نے سکریٹریوں اور محکموں کے سربراہوں کو یہ ہدایت بھی کی کہ وہ ایسی اسکیمیں یا کام نہ شروع کریں جن کے لیے بجٹ میں رقم کا بندوبست نہیں کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں گذشتہ طریقہ کار لازمی طور پر ترک کر دیا جانا چاہیے۔

وزیر اعلیٰ شری بہوگنا نے سرکاری ملازمین کو ضبط و نظم اور وقت کا پابند بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔

وزیر اعلیٰ نے حکومت کے اس فیصلے کا اعادہ کیا کہ تین سال سے زیادہ مدت کی تمام اسامیوں کو مستقل کر دیا جانا چاہیے۔ اسامیوں کو مستقل کرنے کے فوراً بعد ان اسامیوں پر کام کرنے والے ملازمین کو مستقل کرنے کی کارروائی تیزی سے شروع کرنا چاہیے۔

انھوں نے کہا کہ حکومت گذشتہ چار برسوں میں عارضی اسامیوں کو مستقل اسامیوں میں تبدیل کرنے اور ان پر کام کرنے والے ملازمین کو مستقل کرنے کے سلسلے میں جو کوششیں کی ہیں ان کا ایک خاکہ تیار کیا جانا چاہیے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس سلسلے میں حکومت کی پالیسی پر کس حد تک عمل درآمد ہوا ہے۔

❖ ❖ ❖

اتر پردیش کے دیہی علاقوں میں ۱۱ لاکھ سے زیادہ بے زمین خاندانوں میں سے ۹ لاکھ سے زیادہ خاندانوں کو مکانات تعمیر کرنے کے لیے زمین الاٹ کی جا چکی ہے۔ اس سلسلے میں مجموعی طور پر ۱۳۴۰۰۰ ہیکٹر زمین الاٹ ہو چکی ہے۔

یہ اطلاع ریاستی حکومت کے افسران کی ایک کانفرنس میں دی گئی ہے جس میں اتر پردیش کے تعمیرات عامہ، مال، اجتماعی ترقی، لوکل سلف گورنمنٹ، شہری اور دیہی منصوبہ بندی کے محکموں نیز اتر پردیش ہاؤسنگ بورڈ کے نمایندوں اور حکومت ہند کی وزارت تعمیرات کے انڈر سکریٹری شری ایل ایم سکھوانی نے شرکت کی۔

اس کانفرنس میں دیگر باتوں کے علاوہ جن امور پر تبادلہ خیالات کیا گیا ان میں بے زمین افراد کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمین فراہم کرنے اور گندی بستیوں کا سدھار کرنے کی غرض سے بروے کار لائی جانے والی سماجی تعمیر مکانات اسکیم اور کم سے کم ضروریات سے متعلق پروگرام کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا گیا اور اس پر تبادلہ خیالات کیا گیا۔

اتر پردیش پولیس کے سب ہی غیر گزیٹیڈ اور گزیٹیڈ افسران خواہ وہ مستقل ہوں یا غیر مستقل، اب اتر پردیش پولیس (غیر معمولی پنشن) قواعد ۱۹۶۱ سے مستفید ہوں گے جنھیں اور زیادہ نرم کر دیا گیا ہے۔

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کی صدارت میں منعقدہ اتر پردیش کابینہ کے جلسے میں کیے گئے اس فیصلے کے مطابق پولیس فورس کے کسی بھی مستقل یا عارضی غیر گزیٹیڈ یا گزیٹیڈ افسر کے پس ماندگان کو، ایسی صورت میں جب مذکورہ پولیس افسر ڈاکوؤں یا مسلح بدمعاشوں سے مڈبھیڑ میں یا غیر ملکی دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے یا اپنے دیگر فرائض انجام دیتے ہوئے فوت ہو جائے، متوفی افسر کی موت کی تاریخ کو واجب الادا مشاہرہ کے برابر پنشن نیز اس کے آٹھ ماہ کے مشاہرے کے برابر گریجوٹی کی یک مشت رقم دی جائے گی۔ اس سلسلے میں غیر گزیٹیڈ ملازمین پر نافذ ہونے والے دیگر قواعد کا اطلاق پولیس فورس کے گزیٹیڈ افسران پر بھی کیا جائے گا۔

اگرچہ ان قواعد کا اطلاق ہندستانی پولیس سروس کے افسروں پر ازخود نہ ہوگا تاہم اگر وہ اپنے لیے ان قواعد کا انتخاب کرتے ہیں تو وہ بھی ان سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

اتر پردیش کے محکمۂ امداد باہمی نے کسانوں کو عمدہ قسم کے بیج فراہم کرنے کی غرض سے ایک جامع پروگرام وضع کیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت پانچویں پنج سالہ منصوبے کے آخر تک تمام کسانوں کو عمدہ قسم کے بیج فراہم کرنے کی سہولت مہیا کر دی جائے گی۔

ابتداً اس اسکیم پر چھ اضلاع یعنی متھرا، علی گڑھ، بلند شہر، میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور میں عمل درآمد ہوگا۔

محکمۂ امداد باہمی اس سلسلے میں ترائی ترقیاتی کارپوریشن، پنت نگر یونی ورسٹی فارم، قومی بیج کارپوریشن اور ریاستی محکمۂ زراعت سے عمدہ قسم کے بیج حاصل کرے گا۔

⁂ ⁂ ⁂

ریاستی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ایسے ملازمین کو جن کا کوئی جنرل پراویڈنٹ فنڈ اکاؤنٹ نہیں ہے انھیں یکم اپریل ۱۹۷۴ء سے ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۴ء کے درمیان منظور شدہ فاضل مہنگائی بھتہ کی ۵۰ فی صد بقایا رقم کی ادائیگی قومی بچت سرٹی فکٹوں کی شکل میں کر دی جائے۔

حکومت نے اس امر کے احکام جاری کیے تھے کہ مذکورہ مدت کے دوران فاضل مہنگائی بھتہ کی ۵۰ فی صد رقم ملازمین کے جی۔ پی۔ فنڈ میں اور بقیہ رقم لازمی ڈپازٹ اسکیم کے تحت جمع کر دی جائے لیکن اس وقت سے اب تک ایسے ملازمین کے مہنگائی بھتہ کی ۵۰ فی صد رقم نہیں حاصل کی جا سکی تھی جن کا جنرل پراویڈنٹ فنڈ اکاؤنٹ نہیں تھا۔ اب ایسے ملازمین کو مذکورہ رقم کی ادائیگی قومی بچت سرٹی فکیٹ کی شکل میں کی جائے گی۔

چھوٹی رقومات جن پر سرٹی فکیٹ نہیں جاری کیے جا سکتے، ملازمین کو نقد ادا کر دی جائیں گی۔

⁂ ⁂ ⁂

ریاستی حکومت نے مالیاتی سال رواں کے دوران پوسٹ میٹرک درجات میں زیر تعلیم اقوام مندرجہ فہرست کے طالب علموں کو وظائف اور غیر مکرر مالی امداد دینے کی غرض سے متعلقوں کو ۳۱۴۵۵۶۰۰ روپیہ کی رقم الاٹ کی ہے۔ اس میں سے ۳۰۹۰۷۱۰۰ روپیہ میدانی علاقوں کے طالب علموں اور ۵۴۸۵۰۰ روپیہ پہاڑی علاقوں کے طلبا پر صرف کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ مہانگر (لکھنؤ) میں واقع لڑکیوں کے آشرم طرز کے سرکاری اسکول میں ایک ٹیوب ویل لگانے کی غرض سے ۲۲۰۰۰ روپیہ کی رقم بھی منظور کی گئی ہے تاکہ اسکول کے مکینوں اور اس سے متعلق دوسرے لوگوں کی پینے کے پانی کی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔

وزیر سماجی بہبود کے اختیاری فنڈ سے بھی ۸۵ افراد کو گذشتہ ۵ جون کو ختم ہونے والے ہفتہ کے دوران ۱۵۷۰۵ روپیہ کی رقم منظور کی گئی ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

ریاست میں وبائی صورت حال کی تازہ ترین اطلاع دینے کے لیے نظامت علاج و صحت میں ایک کنٹرول روم قائم کر دیا

گیا ہے۔ اس سلسلے میں کنٹرول روم سے ٹیلیفون نمبر ۲۲۸۱۹ پر روزانہ صبح ۸ بجے سے ۱۰ بجے رات تک معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس طرح کی اطلاعات کے لیے ڈپٹی ڈائرکٹر (متعدی امراض) سے بھی ان کے ٹیلیفون نمبر ۲۷۴۵۸ پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

ریاستی محکمہ سیاحت نے اتر پردیش میں ہوٹل قائم کرنے کے خواہش مند افراد کو مالی امداد مہیا کرنے کی غرض سے انھیں اتر پردیش ریاستی مالیاتی کارپوریشن سے قرضے دلانے کا بندوبست کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں ۱۹۷۳-۷۴ء کے دوران ۱۷ ہوٹلوں کے قیام کے لیے مجموعی طور پر ۵ لاکھ ۶۶ ہزار روپے کے قرضے دیے گئے۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۴-۷۵ء میں دسمبر ۱۹۷۴ء تک ۴۱ لاکھ ۲۷ ہزار روپے کے قرضے دیے جا چکے ہیں۔ مجوزہ سال کے دوران "ہڈکو" نے بھی ۲۰ لاکھ روپے منظور کیے ہیں۔ ریاستی حکومت نے ایسے ہوٹلوں کو مالی امداد دینے کے لیے بھی احکامات جاری کر دیے ہیں جو خود اپنے جنریٹر لگانا چاہتے ہیں۔

∴ ∴ ∴

اتر پردیش ریاستی سیاحت ترقیاتی کارپوریشن نے ریاست کے مقامات سیاحت تک جانے والی سڑکوں کا ایک نقشہ جاری کیا ہے۔ یہ نقشہ سروے آف انڈیا پریس نے طبع کیا ہے۔

اس نقشہ میں مقامات سیاحت کی سڑکوں کے علاوہ دستیاب رہائشی سہولتوں اور سیاحت دفتروں کے بارے میں تفصیلی معلومات درج ہیں۔ اس نقشہ کو اتر پردیش ریاستی سیاحت ترقیاتی کارپوریشن کے دفتر واقع ۶- سپرو مارگ، لکھنؤ سے تین روپیہ فی نقشہ کی شرح سے نقد قیمت ادا کرکے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

★

شاعرِ تصوف بیدم شاہ وارثی کا سرمایۂ فکر

صفحہ ۲۴ کا بقیہ

مرے دل میں جو آ بیٹھی تو پھر آ کر نہیں نکلی
کسی پردہ نشیں کی یاد بھی پردہ نشیں نکلی

بیدل کا غم نہ بیدم اپنے مرنے کا خیال
دل تھا آنے کے لیے اور جان جانے کے لیے

کیسے کہہ دوں کہ غیر سے ملیے
ان کہی تو کہی نہیں جاتی

اگرچہ بیدم صاحب آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر جب تک اردو زبان زندہ ہے ان کا نام اور کلام بھی زندہ رہے گا۔

قطعہ

زمانہ آج بھی لیتا ہے نام بیدم کا
کبھی بھلا نہ سکے گا کلام بیدم کا
یہ مانا اور بھی شاعر تمام گزرے ہیں
کسی سے کم تو نہیں ہے مقام بیدم کا

★

نیا دور

جلد ۳۱ نمبر ۵

اگست ۱۹۷۵ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: کماری سرلا ساہنی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ۔ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ، یوپی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

اس سال ہم یوم آزادی کی ۲۸ ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ یوم آزادی یعنی پندرہ اگست ہمارے ملک کی تاریخ میں انتہائی اہم اور یادگار دن ہے۔ آج ہی کا وہ مبارک دن ہے جب ہم کو ۲۸ سال قبل برسہا برس کی غیر ملکی غلامی سے نجات ملی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ آزادی ہم کو بڑی دقتوں، مصیبتوں اور قربانیوں سے نصیب ہوئی ہے۔ اس کے حاصل کرنے کے لیے ہم کو کتنی پرخطر راہوں سے گزرنا پڑا ہے اور ملک کے کتنے جوانوں، بوڑھوں، اور بچوں کو اس کے لیے بیش قیمتی جانیں قربان کرنا پڑی ہیں۔ اتنی جانفشانیوں اور قربانیوں سے حاصل کی ہوئی اس آزادی کو برقرار رکھنا اور اس کو مستحکم بنانا ہر محب وطن کا اولین فریضہ ہے۔ لیکن اب یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے رجعت پسند اور قوم دشمن عناصر نے ملک کی آزادی کے لیے زبردست خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ گزشتہ جون میں تو ان شیطانی طاقتوں اور تخریب پسند عناصر کی ریشہ دوانیاں نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ تحریر و تقریر کی آزادی کا کھلے عام مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ جمہوری اقدار کا بر سر عام گلا گھونٹا جا رہا تھا۔ ملک میں انتشار اور نراج کی سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ ملک کو ایک ایسے بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جو ہماری نوزائیدہ جمہوریہ کو اس سے قبل کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ ہمارے ملک کے لیے سخت امتحان کی گھڑی تھی۔ اگر ۲۶ جون کو صدر جمہوریہ نے ہنگامی حالات کا بروقت اعلان نہ کر دیا ہوتا تو ہماری آزادی کو ہی زبردست خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہنگامی حالات کے بروقت اعلان نے ملک کو نراج اور انتشار سے بچا لیا ہے اور اس خطرے پر قابو پا لیا ہے جس سے ہمارا ملک دوچار ہو گیا تھا۔ یہ اقدام صرف آزادی کے استحکام، جمہوریت اور سیکولرزم کی بقا اور عوام کی خود اعتمادی اور حوصلوں کو بلند کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کوئی غیر آئینی قدم نہیں ہے۔ ہمارے ملک کے آئین میں اس قسم کی سنگین صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے ضروری گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس ہنگامی صورت حال کی پارلیمنٹ سے بھی منظوری حاصل کر لی گئی ہے۔ عوام نے ہنگامی حالات کے اعلان کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے دن بدن ان کو راحت مل رہی ہے اور اس اعلان کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے۔ اس کے سبب ملک میں ضبط و نظم کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے۔ ضروری اشیا کی قیمتوں کا بڑھنا نہ صرف رک گیا ہے بلکہ ان میں نمایاں کمی آ رہی ہے۔ منافع خوروں، اسمگلروں، کالا دھن جمع کرنے والوں، اور رشوت خوروں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ شروع کر دی گئی ہے۔ ہماری محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ملک کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے تیز معاشی نابرابری کو دور کرنے کے لیے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کا اعلان کیا ہے۔ اس معاشی پروگرام میں جو خاص اہم باتیں ہیں وہ یہ ہیں —— ضروری اشیا کی قیمتیں کم کرانا، غذائی پیداوار میں اضافہ کرنا، غلہ وصولی اور ضروری اشیا کے تقسیم کے طریقۂ کار کو بہتر بنانا، سرکاری اخراجات میں سختی کے ساتھ کفایت شعاری کرنا، جوت کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرنا، فاضل زمین کی تقسیم اور کاغذات درست کرنے کے کام میں تیز رفتاری لانا، بے زمین اور غریب طبقوں کے لیے مکانات تعمیر کرنے کے لیے زمین کا جلد سے جلد بندوبست کرنا، دیہی علاقوں میں کمزور طبقوں کو قرض سے نجات دلانا، بجلی کی پیداوار میں اضافہ کرنا، ہینڈلوم صنعت کے فروغ کے لیے نئی اسکیمیں بروئے کار لانا، ٹیکسوں کی چوری کو روکنا، معاشی جرائم کے مرتکب مجرموں کو سخت سے سخت سزائیں دینا، اسمگلروں کی جائداد ضبط کرنے کے لیے خصوصی قانون، صنعتوں میں مزدوروں کو حصہ دار بنانے کے لیے نئی اسکیمیں وضع کرنا، روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ہر ایک محب وطن کا فرض ہے کہ وہ ملک کی ترقی کے لیے، ملک کی آزادی اور جمہوریت کو مستحکم بنانے کے لیے اور ملک میں خوش حالی لانے کے لیے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے معاشی پروگرام کی اہمیت کو محسوس کرے اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے اپنا ہر ممکن تعاون پیش کرے۔ اسی میں ہماری، آپ کی اور پورے ملک کی بھلائی ہے۔ اگر ہم ضبط و نظم اور خلوص کے ساتھ اس معاشی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو گئے تو وہ دن دور نہیں جب اپنی آزادی اور جمہوریت کو اس قابل بنا دیں گے کہ وہ ہر خطرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گی۔ آئیے یوم آزادی کے اس مبارک موقع پر ہم از سر نو عہد کریں کہ ملک کی آزادی اور جمہوریت کے تحفظ اور استحکام کے لیے اپنی ذمہ داریوں کو پورے خلوص اور ایمان داری کے ساتھ نبھائیں گے اور اس سلسلے میں کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

—— ایڈیٹر

آزادی کی قیمت مسلسل چوکسی اور مستعدی ہے

گورنر اترپردیش شری ایم چنا ریڈی کا یومِ آزادی کے موقع پر پیغام

ہر قوم کی زندگی میں اکثر واقع ایسے آتے ہیں جب وہ خود کو ایک دوراہے پر کھڑی ہوئی پاتی ہے اور اس کو تاریخ ساز اور مشکل فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ گزشتہ سال ہمارے ملک میں بھی ایسی ہی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ عرصے سے تشدد اور عوام کی بے راہ روی کے رجحانات ابھرنا شروع ہونے لگے تھے جس سے نہ صرف یہ کہ عوامی شخصیتوں کی زندگیوں کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا بلکہ ہمارے طرزِ زندگی اور ان قدروں کو بھی جو ہمیں انتہائی عزیز ہیں ٹھیس پہنچ رہی تھی اور آہستہ آہستہ عوامی زندگی میں ضبط و نظم کا فقدان ہونے لگا تھا۔

کچھ شخصیتیں جو حالات کو جوں کا توں رکھنے کے حق میں تھیں اور جو کوئی بھی معاشی تغیر و تبدل سے ہم آہنگ نہیں کر پا رہی تھیں وہ مستقل طور پر ملک کی ترقی کی راہ میں اور ان کوششوں میں روڑے اٹکا رہی تھیں جو معاشی برابری، سماجی انصاف اور سماج کے کمزور طبقوں کی نجات کے لیے کی جا رہی تھیں۔ چنانچہ ایک وقت ایسا آیا کہ اگر قومی لیڈر تشدد کی اس لہر کو ختم کرنے کی کوشش نہ کرتے تو تاریخ انھیں معاف نہیں کر سکتی تھی اور وہ ملک کے عوام کے سامنے جواب دہ ہوتے۔ یہی وہ حالات تھے کہ ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کرنا پڑا اور ایسے اقدامات کرنا پڑے جن کے ذریعہ قوم کو تباہی سے بچایا جا سکے۔

ہنگامی حالات کا تقاضا ہے کہ ترقی پسندانہ اور موثر اقدامات کیے جائیں کیونکہ جس غیر معمولی صورت حال میں ہنگامی حالات کا اعلان کیا گیا ہے اس پر قابو پانا اسی طرح کے ٹھوس اقدام سے ممکن ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہنگامی حالات کے اعلان سے قبل ہمارے ملک میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے، اسی طرح کے حالات کے پیدا ہو جانے پر کچھ لوگوں کی آزادی کو محدود کر کے عوام الناس کی آزادی کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ جمہوری نظام خواہ کتنا ہی مثالی کیوں نہ ہو لیکن اس میں بھی کسی شہری کو اپنی آزادی کو اس طرح استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اس سے دوسرے شہریوں کی آزادی میں کوئی خلل پڑے۔ اس پس منظر میں ہمیں پچھلے تقریباً دو مہینوں کے حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔

مجھے اپنے عوام کی سوجھ بوجھ پر کامل اعتماد ہے۔ مجھے بھروسہ ہے اپنے ملک کے کسانوں پر، مزدوروں پر اور ہر کس و ناکس پر جو راستے کی رکاوٹوں اور ٹھوکروں کو ہٹا کر ترقی کی راہیں پیدا کرنے میں حکومت کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ ہنگامی حالات کے اعلان نے ان کے اس اعتماد کو بحال کر دیا ہے کہ وہ سیاسی اور اقتصادی برائیوں کو، جو ہماری عوامی زندگی کو گھن کی طرح کھائے جا رہی تھیں، اصلاح کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ امن و قانون کی صورت حال میں ہمہ جہت اصلاح ہوئی ہے۔ ایک امن پسند شہری چند ماہ قبل کے مقابلے میں آج خود کو اپنے گھر میں یا باہر سڑک پر زیادہ محفوظ محسوس کرتا ہے۔ روزمرہ ضرورت کی چیزوں کے نرخ میں نہ صرف ٹھہراؤ پیدا ہوا ہے بلکہ بہت سی چیزوں کی قیمتوں میں کمی بھی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ضروری اشیا کی بحیثیت مجموعی فراہمی میں بھی سدھار ہوا ہے۔ ہمارے تاجروں اور مزدوروں نے صنعتی امن قائم رکھ کر اور کارکردگی بڑھا کر پیداوار میں اضافہ کرنے کا عہد کیا ہے۔ ان حالات میں ہم ملک اور ریاست کے لیے روشن مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں۔

ہمارے پاس اگرچہ رجائیت پسندی کا معقول جواز موجود ہے لیکن سہل پسندی اور کاہلی ہماری ترقی کی رفتار میں سستی پیدا کر سکتی ہے اور ہم کو ہماری منزل مقصود سے دور لے جا سکتی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری جمہوریت اور آزادی کی قیمت مسلسل چوکسی ہے۔ ہماری آزادی اس وقت تک محفوظ نہیں رہ سکتی جب تک ہم بیرونی خطرات اور اندرونی عدم استحکام کی جانب سے مستقل طور پر ہوشیار اور چوکس نہ رہیں اور نہ اس وقت تک محفوظ ہو سکتی جب تک کہ ہم اپنے ملک سے غریبی، بھوک، بیماری اور جہالت کا پوری طرح ہمیشہ کے لیے خاتمہ نہ کر دیں۔

وہ آزادی جو مجاہدینِ آزادی نے قوم کے باپو کی رہنمائی میں زبردست قربانیوں اور جاں فشانیوں سے حاصل کی اس کی ۲۸ ویں سالگرہ کے موقع پر میں اپنی جانب سے اور حکومت اترپردیش کی جانب سے تمام لوگوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اپیل کرتا ہوں کہ وہ ملک کو طاقتور، خوشحال اور پرامن بنانے کے لیے خود کو از سر نو وقف کر دیں اور رام راجیہ کے اس خواب کو پورا کریں جس کے لیے قوم کے باپو مہاتما گاندھی زندہ رہے اور جس کی خاطر انھوں نے جان بھی دے دی۔

آزادی کو ہر قسم کے خطروں سے محفوظ رکھیے

یوم آزادی کے موقع پر وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری ہیم وتی نندن بہوگنا کا پیغام

۲۸ ویں سالگرہ آج ہم مخصوص حالات میں منا رہے ہیں۔ ویسے تو پچھلے
۲۷ برس سے آج کے دن آزادی کا تہوار مناتے آرہے ہیں لیکن ۱۵ اگست
۱۹۷۵ کا یہ تہوار ہماری آزادی کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل
کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔ اس کے باوجود کہ آزادی کی یہ سالگرہ
ہنگامی ایمرجنسی میں منائی جارہی ہے ہم اپنے دلوں میں ایک نئی
امنگ اور جوش محسوس کر رہے ہیں۔
ہند ... م ... سرت و ... شادمانی کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ ادھر
کچھ دنوں سے ... یشتر ... بازو کے رجعت پسند اور بائیں بازو کے
انتہا پسند عناصر آپس ... باز ... کے آئین میں دیے گئے بنیادی
حقوق کا غلط استعمال کر رہے تھے جس سے ہماری آزادی اور جمہوریت
کے لیے ایک زبردست خطرہ پیدا ہوگیا تھا اس خطرہ پر قابو پانا مشکل
ہوگیا ہوتا اگر ... پردھان منتری نے عین موقع پر ان قوم دشمن
طاقتوں پر ... کر کے ملک کی آزادی اور جمہوریت کو اس سنگین صورت حال
سے بچا ... لیا ہوتا۔ ساتھ ہی انھوں نے دیش کے لیے ۲۱ نکاتی پروگرام کا
بھی اعلان کیا جس پر عمل درآمد پورے دیش میں بجلی کی رفتار سے کیا
جارہا ہے اور اس کے باعث دیش میں ایک سرے سے دوسرے سرے
تک ... داری اور مستعدی کی ایک تیز لہر دوڑنے لگی ہے۔ آنجہانی نہرو جی
کے الفاظ میں "آج سارا بھارت ایک بڑا ورک شاپ بن گیا ہے"۔

ضرورت اس بات کی ہے اور سچ پوچھا جائے تو آزادی اور نیشنلزم کا
تقاضا بھی یہی ہے کہ موجودہ قومی جوش و خروش کو نہ صرف ہم قائم
رکھیں بلکہ اس سے تحریک حاصل کرکے لگاتار آگے بڑھتے رہیں۔ مجھے اس
میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر ہم سب لوگوں نے ضبط و نظم کے ساتھ
۲۱ نکاتی معاشی پروگرام کو مکمل طور پر عملی جامہ پہنانے کی کوشش جاری
رکھی تو مستقبل قریب میں ہم اپنے ملک اور اس کی آزادی کو اس
قابل بنا دیں گے کہ وہ ہر قسم کی مشکلات اور خطروں سے محفوظ رہے۔

آج کے اس متبرک تہوار کے موقع پر میں پردیش کی جنتا کو مبارکباد
دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اچاریہ ونوبا بھاوے نے جسے "ضبط و نظم
کے دور" سے تعبیر کیا ہے اس کو ہم سب اپنے لیے مشعل راہ
بنائیں گے اور اپنے اندر ضبط و نظم پیدا کرکے ملک کے تئیں
اپنی ذمہ داریاں ایمانداری اور پورے خلوص کے ساتھ نبھائیں گے۔
ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسلسل چوکسی ہی آزادی کی قیمت ہے۔

نازشؔ پرتابگڈھی

شہیدانِ وطن کو سلام

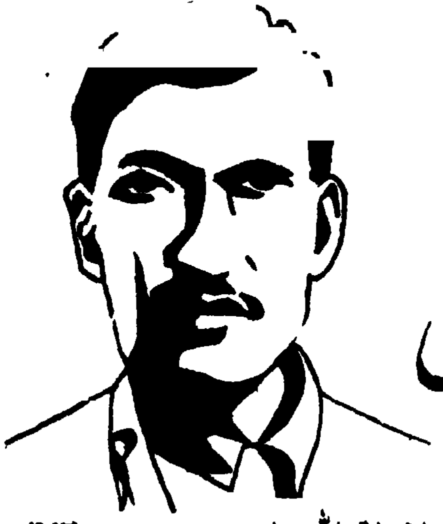
تاریکیوں کو مطلعِ انوار کہہ گئے
ظلم و ستم کو طالعِ بیدار کہہ گئے
تا عمر یوں تو مہر بہ لب ہی رہے مگر
افسانۂ بلندیٔ [illegible] کہہ گئے
آئی کوئی بلا تو گلے سے لگا لیا
ٹوٹا کوئی ستم تو [illegible] ہتھیار کہہ گئے
کڑکی کماں تو سمجھا اسے نغمۂ حیات
خنجر کبھی چبھا تو اُسے ہمار [illegible] گئے
باندھے گئے تو اور بڑھی قوتِ عمل
زخمی ہوئے تو جسم کو گلنار کہہ گئے
طوق و رسن کو نام دیا زلفِ دوست کا
زنداں کو سایۂ مژۂ یار کہہ گئے
حُسنِ حیات کے وہ ادا آشنا کہ جو
ہر قتل گہہ کو مصر کا بازار کہہ گئے
کس آن بان کے وہ شہیدانِ ہند تھے
جو تیغ کو بھی ابروئے خمدار کہہ گئے
یادش بخیر خاکِ وطن! تیری گود میں
کیا لوگ تھے جو دار کو دلدار کہہ گئے

احمد ابراہیم علوی

کاکوری کیس



رام پرشاد بسمل



اشفاق اللہ خاں

ہماری ہندستانی تاریخ حب الوطنی، جاں فروشی، بہادری اور دلیری کی عدیم المثال داستانوں سے معمور ہے۔ اس کے بہادر سپوتوں نے ہمیشہ ملک کے لیے اپنے کو سینہ سپر رکھا اور ہمیشہ ہنستے مسکراتے اس کی حفاظت اور اس کو قائم رکھنے کے لیے بصد شوق جام شہادت نوش کیا۔

سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں بہادری کے کارناموں میں کاکوری کیس بھی ایک دلیرانہ کاوش کے طور پر ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کے حوصلوں کو فروغ دینے کے لیے ایک ادنیٰ مثال ہے۔

لکھنؤ سے آٹھ میل دور ہردوئی روڈ پر کاکوری نام کا ایک قصبہ ہے جو ہمیشہ سے اپنے نامور فرزندوں کی بدولت عزت و احترام کا مستحق رہا ہے۔ یہ اپنی تہذیب، اپنے اشراف اور اپنے مخصوص مزاج کیلئے ہمیشہ سے مشہور رہا ہے یہاں مذہب اور ادب نے اس طرح فروغ پایا ہے کہ سیکڑوں اور ہزاروں دماغوں کو آج بھی یہیں سے جلا مل رہی ہے۔ حضرت شاہ تراب علی قلندر، حضرت شاہ محمد کاظم قلندر، حضرت شاہ حبیب حیدر قلندر، تصوف و معرفت الٰہی کی ایسی بے مثال شمعیں فروزاں کر گئے ہیں کہ آج بھی لوگ انکے نام کا فیض حاصل کر کے شہرت و احترام پاتے ہیں، محسن کاکوری، نورالحسن نیر، امیر احمد علوی، ناظر کاکوری ادب کے وہ شہ پارے چھوڑ گئے، جو ہمارے ادب کا سرمایۂ لازوال ہے ــــ لیکن اس سے بہت پہلے یہ اپنے ڈھاک کے جنگلوں اور ان میں آئے دن پڑنے والے ڈاکوں کے لیے مشہور رہا ہے۔ ــ ڈھاک کا جنگل تو وہاں آج بھی ہے مگر اب وہاں ڈاکے نہیں پڑتے۔ بلکہ اب وہ ایک خوبصورت تفریح گاہ بن گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کاکوری کی اسی دیرینہ شہرت کے پیش نظر ہی" ہندستانی" سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن" نے اس جگہ کا انتخاب اس دلیرانہ کارنامہ کو سرانجام دینے کے لیے کیا ہو جس کو دنیا "کاکوری سازش کیس" یا "کاکوری ڈکیتی کیس" کے نام سے جانتی ہے۔

یہ ۱۹۲۵ء کا زمانہ تھا اور ہندوستان کے نوجوان، باشعور اور ذی علم و حساس افراد کے لیے اس لیے بڑا تاریخی اور اہم دور تھا کہ وہ ہندستان کو غیر ملکی ظلم و استبداد کے خلاف بھڑکا کر ایک شعلۂ جوالہ بنا چکا تھا اور یہاں کا ہر ذرہ بھی آفتاب تھا ہر بچہ شیر تھا، دلوں میں آزادی وطن کا جذبہ موجزن تھا اور ہونٹوں پر انقلاب کی بات تھی۔

ہندستانی سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن ملک میں ایک سوشلسٹ

نوٹ: اس مضمون کے سلسلے میں تمام معلومات جناب رام کرشن کھتری سے حاصل کی گئی ہیں جو ایک مجاہد آزادی اور " ہندستانی سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن" کے ایک سرگرم رکن رہے ہیں اور جو اس تاریخی واقعے کی یادگار قائم کرنے کے لیے اس کی گولڈن جبلی منانے والی کمیٹی کے روح رواں بھی ہیں۔

حکومت قائم کرنے کے لیے ہر ناممکن کو ممکن بنا ڈالنے کا عہد کیے ہوئے تھی. اس کے نمائندے دنیا بھر سے اسلحہ جمع کر رہے اور قدم قدم پر انگریزوں سے مورچہ لینے کے لیے مستعد تھے ایک نمائندہ جرمنی گیا تھا. جس نے وہاں سے ایسوسی ایشن کو مطلع کیا تھا کہ اسلحہ حاصل کرنے کے لیے روپے کی شدید ضرورت ہے اور ایسوسی ایشن کے پاس محض سرفروشانہ جذبے کے اور کچھ نہ تھا اس کے ممبر نوجوان، تعلیم یافتہ اور نہایت منظم تھے. طے یہ پایا کہ سہارنپور لکھنؤ پسنجر کو لوٹ کر اس میں سے سرکاری خزانہ حاصل کر کے ملک میں انقلاب لانے کی جدوجہد کو تیز تر کیا جائے سہارنپور لکھنؤ پسنجر ٹرین جو کہ کاکوری سے گزرتی تھی اس پر گارڈ کے ڈبے میں وہ رقم رکھ کر لے جائی جاتی تھی جو کہ دن بھر میں ریلوے ٹکٹوں کی فروخت سے حاصل ہوتی تھی اور یہ کافی معقول رقم ہوتی تھی ایسوسی ایشن میں جس وقت سہارنپور لکھنؤ پسنجر کو کاکوری میں لوٹنے کے بارے میں مشورہ ہوا تو اشفاق اللہ خاں وارثی نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ ٹرین کے لوٹنے سے انگریز حکومت چوکنا ہو جائے گی اور اتنا بھرپور وار کرے گی کہ ایسوسی ایشن اس کی متحمل نہ ہو سکے گی. مگر سرفروشوں نے ان کی اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی بلکہ اپنے ارادے کو اٹل فیصلہ میں تبدیل کر دیا. تب اشفاق اللہ خاں بھی ان کے پورے طور سے ہمنوا بن گئے کیونکہ ان کا خاص مقصد صرف سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کے لیے لوگوں کو متوجہ کرنا تھا.

اس مہم کو سر کرنے کے لیے رام پرشاد بسمل کپتان اور اشفاق اللہ خاں وارثی کو وائس کپتان مقرر کیا گیا. ان کے علاوہ جیتندر ناتھ بخشی، راجیندر ناتھ لہری، من متھ ناتھ گپت، مکندی لعل، چندر شیکھر آزاد، بنواری لال، کیشو چکرورتی اور روشن سنگھ ان کے ہمرکاب ہوئے. اس طرح دس سرفروشوں نے اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر ملک کی آزادی کے لیے سب کچھ کر گزرنے کا عہد کیا.

۹ اگست ۱۹۲۵ کی شام کو تقریباً پانچ چھ بجے کے درمیان جب ۸ ڈاؤن سہارنپور لکھنؤ پسنجر ٹرین کاکوری اسٹیشن پر پہنچی تو منصوبہ کے مطابق اس کو آؤٹر سگنل پر روک لیا گیا اور یہ دلیرانہ کام سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں سفر کرنے والے اشفاق اللہ خاں وارثی، جیتندر بخشی اور راجیندر ناتھ لہری میں سے اشفاق اللہ خاں نے خطرے کی زنجیر کھینچ کر انجام دیا. گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور گارڈ لپک کر ڈبے کے پاس آیا. اس نے انگریزی رعب اور دبدبے کے تحت گرج کر انگریزی میں پوچھا. گاڑی کس نے روکی ہے اور کیوں روکی ہے. اشفاق اللہ خاں نے جواب دیا "میں نے روکی ہے اور میری بیوی کے زیورات کا بکس پچھلے اسٹیشن پر رہ گیا ہے جو بہت قیمتی ہے لہٰذا گاڑی فوراً لوٹائی جائے." گارڈ نے کہا گاڑی واپس نہیں جا سکتی. آگے عالم باغ اسٹیشن پر جب گاڑی رکے گی تب اس کی رپورٹ کرنا. پھر تحقیقات ہوگی. اشفاق اللہ خاں نے کہا نہیں. گاڑی کو لوٹایا جانا بہت ضروری ہے. اسی اثنا میں تیسرے ڈبے میں بیٹھے ہوئے سرفروشوں نے منصوبے کے تحت اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی تھی اشفاق اللہ خاں کی بحث اور تکرار نے گارڈ کو اتنی دیر روکے رکھا کہ اس کے ڈبے سے خزانے کا بکس نکال کر لے آیا جائے. مشکل سے دس پندرہ منٹ میں دوسرے باغی سرفروش خزانے کا بکس لے کر آ گئے. تب اشفاق اللہ خاں نے گارڈ سے ڈانٹ کر کہا کہ اگر کوئی حرکت کی تو بندوق سے بھون کر رکھ دیا جائے گا. گارڈ بے بس ہو گیا اور سرفروش آہنی تجوری کو توڑنے میں مصروف ہو گئے. مگر وہ اتنی مضبوط تھی کہ توڑے نہیں ٹوٹ رہی تھی. ان سب سرفروشوں میں اشفاق اللہ خاں سب سے مضبوط اور لمبے تڑنگے تھے. انھوں نے اپنا پستول من متھ ناتھ کو دیا اور ہتھوڑا لے کر آہنی تجوری کو توڑنے میں لگ گئے. ان کی محنت رنگ لائی اور تجوری ٹوٹ گئی. اسی وقت سرفروشوں نے فضا میں فائر کیے اور انگریزی نیز ہندوستانی زبان میں مسافروں کو آگاہ کیا اور ان سے کہا کہ وہ اپنے اپنے ڈبے میں واپس چلے جائیں. کھڑکیاں بند کریں. مسافروں سے اس کا کوئی واسطہ نہیں. ہم ملک کے سرفروش ہیں. اور اپنی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے سرکاری خزانہ لوٹ رہے ہیں. ہمارا مقصد مسافروں کو پریشان کرنا بالکل نہیں، ٹرین کی دونوں جانب سے مسلسل فضائی فائرنگ ہوتی رہی اور سرفروش خزانہ لے کر شام کے دھندلکے میں جنگلوں میں غائب ہو گئے. اسی درمیان ادھر سے دہرہ ایکسپریس آتی دکھائی دی تو دوسرے سرفروشوں نے دائیں بائیں جانب پستول کر کے

گارڈ کو حکم دیا کہ تم ہری جھنڈی دکھاؤ اور بیگل ایک مسکرا کر دو تاکہ اس گاڑی کے گارڈ کو کوئی شبہ نہ ہو اور وہ گزر جائے۔ گارڈ مجبور تھا۔ اس نے حکم مانا اور دہرہ بخیریت گزر گیا۔ تب گارڈ کی اس شرط پر رہائی بخشی ہوئی کہ وہ اس سلسلے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا اور گاڑی کو جانے کی اجازت دیدی گئی۔ گاڑی گزرتی رہی اور اس کے دونوں جانب سے سرفروشوں کی ہوائی فائرنگ آدھے گھنٹے تک جاری رہی۔

اس فائرنگ میں صرف ایک انسانی جان ضائع ہوئی اور وہ بھی مرنے والے کی بیوقوفی سے کہ اس نے منع کرنے کے باوجود باہر نکلنے کی کوشش کی۔ لوگوں کا بیان تھا کہ اس کی بیوی زنانے ڈبے میں تھی اور وہ اس کی خیریت لینے کے لیے بیتاب تھا یہی بیتابی اس کی موت کا باعث بنی ـــ ہندستانی سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن کو دوسرے دن اخباروں سے اس موت کی اطلاع ہوئی جبکہ اخباروں میں شائع ہوا کہ جائے وقوعہ پر ایک لاش بھی پائی گئی۔

اس ٹرین ڈکیتی کے واقعہ کے بعد ہی انگریزی حکومت کا عتاب ہندستانی سرفروشوں پر بھرپور طور سے نازل ہوا اور اشفاق اللہ خاں وارثی کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ ایسوسی ایشن اس کی متحمل نہ ہو سکی۔ ایک ایک فرد پکڑ پکڑ کر ظلم کا نشانہ بنایا گیا اور ان پر مقدمہ قائم ہوا۔ جوں جوں مقدمہ کی کارروائی آگے بڑھتی گئی اہل وطن کی ہمدردیاں سرفروشوں کے ساتھ بڑھتی گئیں، مقدمے کے لیے چندے ہوے، ہمدردی میں جگہ جگہ جلسے جلوس اور مظاہرے ہوئے پنڈت موتی لعل نہرو نے ریلیف کمیٹی قائم کی اور ملک کے قابل ترین بیرسٹر اور وکیل اپنے سرفروشوں کی پیروی کے لیے تیار ہوگئے ان میں بیرسٹر بی کے چودھری، گووند ولبھ پنت، سی۔ بی گپتا، موہن لال سکسینہ اور ہجیلا قابل ذکر ہیں۔

اس تاریخی اور عدیم المثال دلیرانہ کاوش کا انجام ۱۶ر اپریل ۱۹۲۷ء کو ہوا جبکہ مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا اور پنڈت رام پرشاد بسمل راجیندر ناتھ لہری، اشفاق اللہ خاں اور روشن سنگھ کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ پنڈت رام پرشاد جی بسمل کو ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو گورکھپور ضلع جیل میں پھانسی دی گئی۔ راجیندر ناتھ لہری کو ۱۷ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو گونڈہ میں پھانسی دی گئی۔ اشفاق اللہ خاں وارثی کو ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو فیض آباد جیل میں پھانسی دی گئی اور روشن سنگھ کو ملاکا پریاگ میں (الٰہ آباد) ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو پھانسی دی گئی اور اس طرح یہ سب ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ کے سنہرے ابواب میں شامل ہوگئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہوگئے۔

یہاں قابل ذکر امر یہ ہے کہ یہ تمام سرفروش اور محبان وطن جنھوں نے ڈکیتی کی وہ نہ تو عادی مجرم تھے اور نہ ان کا کوئی تعلق جرائم پیشہ لوگوں سے تھا۔ ہماری ہندستانی کا یہ نمایاں وصف ہے اور جس پر ہم کو نازاں بھی ہونا چاہیے کہ جتنے بھی سرفروش بڑھ چڑھ کر آزادی کی جدوجہد میں آگے آئے انھوں نے بغیر کسی نام و نمود کی خواہش کے اپنی عزیز جانوں کی قربانیاں دیں۔ ان میں بیشتر ایسے تھے جو اگر اس جدوجہد آزادی میں نہ شریک ہوے ہوتے تو بڑے اطمینان اور سکون کی زندگی گزارتے بلکہ ایسے عیش کرتے جو قابل رشک ہوتے۔

جن جن لوگوں نے ہمارے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا وہ سب دل میں صرف ایک ہی تمنا اور آرزو رکھتے تھے۔ اور وہ تھی ملک کی آزادی کی تمنا اس کے علاوہ انھوں نے اور کچھ نہ جانا بلکہ اپنے پاس جو کچھ تھا وہ بھی ملک اور قوم پر نچھاور کر دیا اور یہ سرفروش پھانسی کے پھندوں پر بھی ہنستے مسکراتے ملک کی آزادی کے ہی طالب رہے۔ اگر رام پرشاد بسمل کی زندگی پر نظر دوڑائیے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک کٹر آریہ سماجی تھے اور اردو و ہندی کے ممتاز قلم کاروں میں شامل کیے جانے کے مستحق تھے۔ لیکن کسی قسم کا مذہبی تعصب یا تنگ نظری ان کے پاس سے بھی ہو کر نہیں گزری تھی جس کا بین ثبوت اشفاق اللہ خاں وارثی سے ان کی بے پناہ محبت ہے جو نہ صرف ہم نوالہ ہم پیالہ تھے بلکہ آزادی کی جنگ میں ہمیشہ ان کے شانہ بشانہ رہے اور دونوں ہی نے جام شہادت ایک ہی واقعہ کے سلسلے میں نوش کیا۔

اشفاق اللہ خان وارثی کی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک ذہین طالب علم تھے اور ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس میں اس وقت کرنل اور جنرل پیدا ہوتے تھے

اگر وہ چاہتے تو فوج کے بڑے سے بڑے عہدہ پر باسانی فائز ہو سکتے تھے اور ایسی ٹھاٹ کی زندگی بسر کرتے کہ ان کی سات پشتیں ان کو یاد کرتیں مگر یہ آزادی کا ایک ایسا مجنونانہ جذبہ تھا جس نے سب کچھ قربان کروا دیا اور وہ دولت و ثروت کے ساتھ ساتھ عیش و آرام سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور فیض آباد کی کال کوٹھری میں پھانسی سے قبل آٹھ مہینے تک انھوں نے ایسی تکلیفیں برداشت کیں کہ جن کو یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رام پرشاد بسمل سے ان کی عقیدت اس حد تک تھی کہ لوگ کہنے لگے تھے کہ انھوں نے شدھی کرالی ہے مگر وہ جب پھانسی کے تختے پر آئے تو اس شان سے کہ ان کے ہاتھوں میں قرآن شریف تھا اور ہونٹوں پر اس کی مقدس آیات کا ورد ــــ ایسی موت پر ہزار زندگیاں بھی قربان ہوں تو کم ہے۔

راجیندر ناتھ لہری بنگال کے ایک بڑے جاگیردار کے بیٹے تھے اور انتہائی خوش مزاج اور ہنس مکھ ہونے کے علاوہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے۔ اور جس طرح چاہتے عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے مگر انھوں نے تمام آسائشوں کو بالائے طاق رکھ کر ملک کی آزادی کی خاطر جانِ عزیز کو اس پر نچھاور کر دیا۔ پھانسی سے تین دن قبل انھوں نے جو خط لکھا تھا وہ زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے جو یہ ہے :

"کل میں نے سنا ہے کہ پریوی کونسل نے میری اپیل رد کر دی ہے آپ لوگوں نے ہم لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا کوئی کسر نہ باقی رکھی مگر ایسا لگتا ہے کہ وطن کو ہمارے خون کی ضرورت ہے۔"

موت کیا ہے؟ زندگی کی دوسری سمت کے علاوہ کچھ نہیں اس لیے آدمی موت سے خوف یا رنج کیوں کرے ــــ یہ تو کل کا سحر"

واضح رہے اشفاق اللہ خاں وارثی نے بھی پھانسی پر چڑھتے ہوئے ایسی ہی سچی بات کہی تھی ــــ

"میرے ہاتھ انسانی خون سے کبھی نہیں رنگے گئے مجھ پر جو الزام لگایا گیا ہے وہ غلط ہے۔ خدا کے یہاں میرا انصاف ہوگا۔"

کاکوری کیس میں پھانسی دیے جانے والے چوتھے رکن روشن سنگھ سیاسی تحریک آزادی میں شریک ہونے سے قبل شاید غیر سیاسی لوگوں کے ساتھی تھے مگر ان کے کردار میں کوئی خامی نہ تھی اور وہ جرائم پسند نہ تھے۔ اس کے برعکس ایک اچھے پہلوان تھے انتہائی شریف اور منکسر المزاج بھی تھے اگر وہ چاہتے تو پہلوانی میں نام پیدا کر سکتے تھے اور سکون کی زندگی تو بہر حال گزار ہی سکتے تھے لیکن ملک کی آزادی کی کچھ ایسی تڑپ ان میں پیدا ہوئی کہ سب کچھ تیاگ دیا اور بالآخر ملک پر اپنی جان بھی نثار کر دی۔

رام پرشاد بسمل، اشفاق اللہ خاں وارثی، راجیندر ناتھ لہری، اور ٹھاکر روشن سنگھ، کاکوری کیس کے چار اہم رکن ہیں جنھوں نے اپنی اطمینان اور سکون کی زندگی کو تج کر وطن کی خاطر سخت سے سخت آزمائشوں پر بھی اپنے پائے استقامت میں جنبش نہ آنے دی اور بالآخر پھانسی چڑھ کر ہمارے ملک کی تاریخ کے ابواب میں سنہرے حروف سے اپنے نام لکھ گئے۔ در اصل یہ ایسے چار ستون ہیں جن پر آج کا ہندوستان مضبوطی سے کھڑا ہے۔ آپ محنت اور سخت کوشش، مروت، اور ہمدردی، قومی یکجہتی اور بھائی چارگی کی اعلیٰ ترین نظیر ہیں ان کے افکار و افعال سے اخذ کر سکتے ہیں۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، بنگالی بھی اور یو۔ پی والے بھی۔ مگر یہ سب بہترین انسان اور قابلِ صد ستائش محبِ وطن تھے۔ ان پر ہندوستان جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

نشور واحدی

غزل

بے مایہ سی ہے اب نسل آدم — انساں زیادہ انسانیت کم
اک وحشت دل اک حیرت غم — کیا ہو گیا ہے واللہ اعلم
تقدیر انساں عریاں ہے یعنی — آدم سے لغزش، لغزش سے آدم
گلزار رخ پر یہ نم نگاہی — آنسو کے آنسو شبنم کی شبنم
پیچیدہ گیسو ان کا سراپا — شام مقید صبح مجسم
وہ دیکھتے ہیں کس کس ادا سے — آئینہ رکھ کر اپنا ہی عالم
رحمت سے اُن کی نزدیک ہو جا — دامن بھگو لے اے چشم پُرنم
آہٹ سی ہے کچھ اُن کے قدم کی — اے غم ذرا رک اے دل ذرا تھم

فرصت ہے کس کو جو سننے آئے
شعر نشور اور افسانۂ غم

آوارہ

ٹھالی سے بیگار بھلی

"مئی کا سورج دن بھر آگ برسا کے تھکا ہارا ڈھلا تھا، پہلی شام تھی۔ میں آبادی سے دور گھومنے پھرنے نکلا تھا، اور ننگے کھیتوں کی مینڈھ پر ٹہلتا ہوا لوٹ رہا تھا جو بوز کی ایک ہری بھری باڑی پر گزر رہا تھا۔ اچانک دیکھا کہ سینچی ہوئی بیلوں میں کوئی دو سوا دو گز لمبا کالا سانپ پڑا ہے۔ بغل میں بندوق تھی، چھپتا ہی کہ ایک کارتوس خدمت میں عرض کروں اور صاحب کے پرخچے اڑا دوں، لبلبی دبانے کو تھا جو دور سے باڑی کے رکھوالے ایک لنگوٹی بند چھوکرے نے چلا کر کڑے تیوروں سے کہا: "ہاں دھامن ہے، ماریو مت!" ہات رکا اور سانپ سے کتراتا ہوا چھوکرا میرے پاس آگیا۔ جانا پہچانا تھا۔ بولا "میاں، تمھاری بگیا میں کالا اژدہا رہتا ہے نا، یہ دھامن با کی گھر والی ہے، مردے سے کچھ ٹنٹا جھگڑا ہو گیا، تا تیسے اسے چھوڑ جہاں آن پڑی ہے۔ وہ جو کچی گبر ہے نا، تا میں رہتی ہے، سنجھا ہوتے ٹھنڈی لین کو باڑی میں آن پڑتی ہے۔ پھر رات کی بریا جنگل کے چوہا مڑکی، کھیرہا کے بچہ پکڑے گی، اور سموچے ای لیل جائے گی اور بھور بھرا ہوتی گبر ماں گھس پڑے گی۔ میں سسری کو بھگائے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر چھوکرے نے پیر پٹ پٹائے، دو ایک ڈھیلے مارے، پر اس کی چل پکار اور شاید میری مانس گن سے چونک کر دھامن اپنی جگہ سے سرکی، اور بل کھاتی لہریا بناتی ہمارے پاس سے گزری، اور دیکھتے ہی دیکھتے قبر کی ایک پھٹی دراڑ میں سما گئی۔ میں گھر آگیا۔"

گرمی کی شدت، لو کی لپٹ، نیند نصیب دشمن، رات کروٹوں میں کٹ رہی تھی اور شام کی واردات دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اسی میں یاد آیا، کسی امریکی رسالے میں دنیا کے زہریلے سانپوں پر ایک محقق کا مضمون پڑھا تھا، اور انگلینڈ کے افعی (VIPER)، امریکا کے ناگ چکی (RATTLE SNAKE) اور بنگال کے ناگ سانپ کی کافی معلومات ہوئی تھی۔ بھارت کے گرم علاقوں میں قسم قسم کے اور بھی سانپ پائے جاتے ہیں اور ان کی پرورش اور نمائش کے ذریعہ پیٹ پالنے والے بھی ملتے ہیں اور سپیرے کہلاتے ہیں۔ اس موضوع پر سوچتے سوچتے نئی سوجھی، یعنی ٹھالی سے بیگار بھلی، نکلئے اور کسی کھوسٹ سپیرے سے ملیے، دیکھیے اپنے پیشے کی معلومات سے کیسے ڈھکے چھپے بھید اگلتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بھارت کے منیات میں سانپ کی اہمیت کتنی اور اس کا رتبہ کیا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ریشنلزم کے اس دور میں ایک نیم صحرائی ان پڑھ سپیرے کی بات سائنٹیفک اصول پر نہیں پرکھی جا سکتی پھر بھی

ع "گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است"

مجھے اپنا شوق پورا کرنا تھا۔ رات بھر آنکھ نہیں لگی، صبح ہو گئی اور تلاش ہوئی کسی رہنما کی۔ ڈھونڈھے سے خدا ملتا ہے، یہ تھا ایک مہار۔ پتہ چلا کہ متھرا کے گرد نواح میں سپیروں کے کئی ٹھکانے ہیں۔ گھر سے چھوٹی لین پر چلوں، رایا اسٹیشن پر اتروں، اور آبادی میں پتہ چلاؤں۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ صبح کا پسنجر پکڑا نو بجے رایا آگیا۔ اب جس سے سپیروں کو پوچھتا ہوں، شتبہ نگاہوں سے میرا سراپا دیکھتا ہے اور "آگے جاؤ" کا کھرا جواب دے کر ٹال جاتا ہے۔ بازار میں گنی چنی دکانیں ہیں، ہر سوال کا ایک ہی جواب "آگے جاؤ" اور بازار ختم۔ البتہ ایک راہگیر نے کہا۔ بس میں ماٹھ جاؤ، چلا تو سپیروں کا پتہ وہیں چلے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بس آئی اور ماٹھ میں اتار دیا۔ اب دوپہر کا عمل تھا۔ ایک سبزی فروش

سے پوچھا، جواب ملا: "آگے جاؤ۔" تحصیلدار کی کچہری ہے۔ سپیروں کا پتہ وہیں چلے گا۔ چلا اور کوئی پون میل بڑھ کے تحصیل کی کچہری دکھائی دی۔ بالکل سنسان۔ کنوئیں پر کوئی دھوتی چھانٹ رہا تھا۔ میرے سوال کا جواب ملا: "کیا کام ہے سپیرے کیسے؟ یہاں تحصیلدار رہتے ہیں، منتر اگتے ہیں۔ عرضی سوال دینا ہو کل آنا۔ آگے جاؤ۔" میں نے جیسے آگے بڑھنے کی قسم کھائی ہو۔ چل دیا۔

"مئی کی چلچلاتی دوپہر، تارکول کا بستر سا پگھلا گیا تھا، دور کا گھلتا ہوا نظارہ، ہوا ان نہیں، لو کے تھپیڑوں کا چلتا سناٹا، تپتی ریت کے بگولوں کا لگاتار رقص، پت جھڑ کے مارے بھاگتے لٹے درختوں کی سائیں سائیں اور اداس اداس ماحول میں اپنی انجانی منزل کی تلاش، دور دور تک آدمی نہ آدم زاد۔ پسینے میں شرابور فقط میری ذات! آنکھوں کی جوت ماند پڑ چلی تھی، پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے، جو اچانک آم کی کچی کیری نمک کی کنکری سے کھاتا ہوا، ایک دہقان بچہ نہ جانے کدھر سے آیا اور میرا سراپا دیکھ کر گاؤں کے اکھڑ لہجے میں پوچھا: "جان جوں۔ ٹھہرے ہو؟" "ادھر کہیں سپیرے رہتے ہیں، ان سے ملنے آئے ہیں۔" یہ سن نے کہا: "تم بی سپیرا ہو؟ تمھارے کپڑا تو بابو لوگن کے ہیں۔" "ہاں ایک بابو نے دیئے ہیں۔" "اچھا تم پہ کچھو پیسہ ہیں؟ دس پیسہ لگو، سپیرن کا ٹھکانو بتلائے دنگو۔" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ جیب ٹٹولی اور دس کا ایک سکہ نکالا۔ کتنا کائیاں تھا، بولا: "پھینک دیو، ہم اٹھا لینگے۔" میں نے سکہ اچھال دیا۔ جھجکتا جھجکتا بڑھا، جھکا، سکہ اٹھایا، پرکھا اور انٹی میں گھرس لیا اور ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا: "دیکھو، وہ سامنے سڑک جہاں مڑ کے لیکھ بیٹھی ہے، تاپے پر لیٹو، چلو اور چلے جاؤ چلے جاؤ، آگے جہاں لیکھ مڑ ک جائے ایک ٹیلا آئے گو، سپیرا مل جانگے۔ دو ٹکا چلے ہیں، ٹیکے رہیو نا ئیں تو چار ٹکا کھا لیں گے، جاؤ۔" مژدۂ از غیب بروں آید و کارے بکنند۔ زندے کے بھیس میں حافظ شیرازی تھے۔ چلنے میں سنا دہقان زادہ کہہ رہا تھا: "اپنے کو سپیرا بابو لوگن کے تنا پھرے لاگے۔"

لیکھ آگئی۔ لیکھ کیا تھی، جلتی ریت کی چوڑی پگڈنڈی پٹی تھی، جس میں پیر جوتوں سمیت دھنسے جا رہے تھے، گویا آگ کی بھٹی میں دے دیئے۔ جلن تلوؤں سے لگتی اور سر میں کچھ کوئی پندرہ منٹ بعد اس آتش کدہ نے موڑ لیا اور بائیں ہاتھ پر پیلی مٹی کا وہ ٹیلا دکھائی دیا جو آس پاس کی سطح سے پچاس ساٹھ گز اونچا تھا۔ سپیرے کہاں تھے نظر نہیں آئے۔ البتہ آبادی کے نام سے ایک کوا ضرور تھا جو ٹیلے کے ایک کنگرے پر چونچ کی قاشیں کھولے العطش العطش پکار رہا تھا۔

چکر لگانے پر ایک جگہ ٹیلے کا دامن کاٹ کر بے ڈھب کی سیڑھیاں بنی تھیں۔ اپنی خستگی کے باوجود ایک ایک سیڑھی چڑھا، ایک طرفہ ماجرا نظر آیا، یعنی ٹیلے کی چوٹی کاٹ کر زمین کا ایک چوڑس قطعہ نکالا تھا جس کے اطراف کیکر کے کٹیلے جھانکڑوں کی اونچی باڑھ سے گھری ہوئی کچی دیواروں پر پھونس کے چھپر چھائی چھوٹی بڑی تین چار جھونپڑیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے سرے پر باڑھ کاٹ کر اندر جانے کا رستہ تھا جیسے آنگن کہیے اس میں ایک جھلنگی کھٹیا۔ المونیم کے دو کٹورے اوندھے پڑے دھوپ کھا رہے تھے، اور مزید زیبائش کے لیے پرانی گدڑیوں کا ڈھیر لگا تھا۔

میں چپ چاپ اس منظر کا جائزہ لے رہا تھا جو اجنبی کی بو پا کے دو جھبڑے کتے پیشوائی کے لیے بھونکتے ہوئے ایک جھونپڑی سے نکلے اور قریب تھا کہ میرے ان کے لیا دگی کی ٹھہرے، جو پاس کی دو جھونپڑی سے ٹیلے رنگ کی اوڑھنی سے ڈھکا ہوا ایک زنانہ سر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی گھونگھٹ کاڑھتا ہوا غائب ہو گیا۔ لمحے بھر بعد دوسرا سر نکلا۔ اس بار ایک چھ سوا چھ فٹا تاڑ کا جھاڑ مرد پورے قد کی لمبائی سے میرے سامنے کھڑا تھا میں اپنے نظری پیمانے سے اس کی انگلیٹ ناپ رہا تھا جو اس نے کڑے تیوروں سے مخاطب کیا: "پرانا تیور یا گیا جو تم آئے ہو، تو سنو۔ ربی کٹی پڑی ہے، دائیں چل رہی ہے، دانہ گھر میں آئے گا تب لگان ملے گا۔ جاؤ ابھی ایک پیسہ نہیں۔" میں نے کہا: "پٹواری کیا، میں گانوں گانوں تمھارا پتہ اٹھاتا یہاں آیا ہوں، بیٹھو تو بات کروں۔" گرم تیور ٹھنڈے پڑ گئے۔ "آؤ سامنے کی جھونپڑیا میں کھٹیا ڈالے دیتا ہوں، بیٹھو، کچی کنیاں کا جل پیو گے؟" میرے انکار پر لم ٹنگے میزبان نے سامنے کی جھونپڑی میں دھکا سے چبتی کھٹیا ڈال دی۔ یہ ٹیلے کا گویا ڈرائنگ روم تھا جس کی سجاوٹ میں دو تین میلے گھڑے، ایک کرم سینک پرانا حقہ، نلے اوپر جڑاول کے کئی اوڑھنے بچھونے، گیروے رنگ کے کھدر کی تنگائی کی ہوئی کانور کی دو عدد جھولیاں، اور اسی کا ہم رنگ غلاف چڑھا کانور کا بانس، اور کھٹیا

تلے ٹیلے سے پرے، دونوں کتے جبڑے پھاڑے ہانپ رہے تھے۔ بن بلائے مہمان کو کھٹیا پر بٹھا کر، میزبان خود کچی، کونی کھائی دیوار کے سہارے اکڑوں بیٹھ گیا۔ لمبی ٹانگیں تہہ ہو کر کانوں سے کئی انچ اوپر نکل گئیں۔

زحمت نہ ہو تو ذرا اس عجائب المخلوقات کا سراپا بھی پیش کرتا ہوں۔ تپا ہوا تانبا چہرہ، بے پیمانے پر ہونٹ، بن سنوارا کا تھا بیچ سر کے بال جٹا کی جانب کھینچ کر ماتھے سے کچھ اوپر جوڑا سا جوڑا بندھا تھا۔ پیشانی کی کھال ڈھیلی ہو کر کئی چینوں میں بٹ گئی تھی۔ البتہ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کبھی کبھی جوانی کی جوت چمک جاتی تھی۔ جبڑا، برسوں بین بجاتے بجاتے دو کلّے بن گئے ہوں جو اب جھول کھا کے کلے سے چپک گئے تھے۔ دانتوں کی بتیسی مسوڑوں کا ساتھ چھوڑ چکی تھی، ان کی یادگار ہلدی کی گرہ جیسے زرد دانت دو ایک بھی الگ الگ رہ گئے تھے۔ اوپر کے ہونٹ پر کھچڑی مونچھیں، جیسے روئے کی جاوریں؟ داڑھی کے چھدرے، بالوں کی جھالر، کچھ ٹھوڑی پر کچھ کلوں پر۔ چہرے کی رنگت سے میل کھاتے ہوئے بال، خون کی زبان پوچھیے تو میلی چکٹ دھوتی سے کمر اور رانوں کا بالائی حصّہ ڈھکا ہوا۔ باقی خیر صلا۔

اپنے مطلب کی بات چیت میری جانب سے ہوئی۔ نام پوچھا۔ جواب ملا: "سچا نام خدا کا۔ ویسے مجھے بدیا ناتھ جی کہتے ہیں"۔ "عمر کیا ہوگی؟" کچھ سوچ کر جواب دیا: "دس کم سو"۔ بدیا ناتھ کے لب و لہجے میں شائستگی پائی گئی۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا: "سنو بدیا ناتھ جی برس کے برس ایک موسم ایسا بھی آتا ہے، جب رنگ رنگ کے تماشے والے روزی کمانے کے لیے شہر کے شہر گھومنے نکلتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بندر، دراینٹھا سنگھ کا تماشا دکھاتا ہے، تو کوئی ڈنڈے، ڈگڈگی کے بل بھالو نچاتا ہے۔ کٹھ پتلی والوں کا الگ رنگ ہے، نٹوں کے کرتب کا نرالا ڈھنگ ہے۔ مداری ڈھٹ بندی کرتا، آنکھیاروں کو اندھا بناتا ہے، بازی گر اپنی ہت پھیری کا سکّہ جماتا ہے۔ ان ہی تماشے والوں میں سپیرے بھی ہیں۔ دوسروں سے مطلب نہیں، تم لوگوں کے رہن سہن کھان پان، شادی بیاہ، موت مٹی اور سب سے بڑی بات سانپوں کا پالن پوسن جاننے کا شوق مجھے یہاں کھینچ لایا۔ کہاں کہاں گیا کس کس سے ملا۔ یہ رام کہانی کیوں دہراؤں۔ آج تم مل گئے، یوں ان دیری میں جیسے کی چیل انڈا چھوڑے تمھارے گھر میں ہوں۔"

بدیا ناتھ چپ چاپ سنتا رہا، پھر بڑی متانت سے بولا: "بابوجی تم کیوں آئے، ہمیں لکھ دیتے، میں آ جاتا، نہیں تو اپنے بڑے لڑکا امرت ناتھ کو بھیج دیتا"۔ بدیا ناتھ کی بول چال، لب و لہجہ راجستھانی، ہندوستانی اور برج کا ملا جلا ملغوبہ تھا۔ میری مہر سکوت اس نے توڑ دی: "سنو بابوجی کوئی کچھ بھی سمجھے ہم چوہان راجپوت ہیں۔ ہمارے پرکھا راجستھان سے نکلے، اور بھاگ کا لکھا ڈانواڈول گھومتے بھٹکتے چرکھی دادری پہنچے۔ یہ دس پانچ برس کی نہیں کئی سو برس پہلے کی بات ہے۔ جانتے ہو بابوجی یہ بستی کہاں ہے۔ بڑھ ضلع میں دلّی جاتے ہوئے چرکھی دادری کا اسٹیشن پڑتا ہے، وہاں ہمارے گرو گورکھ ناتھ جی کا بہت بھاری گردوارہ ہے اور گرو جی کی مورتی رکھی ہے۔ ان ہی مہاتمانے ہمارے نو سے پُرکھوں کو اپنا چیلہ بنایا اور سب کو الگ الگ کام سنبھالنے کا حکم دیا۔ سب کو دوا کی شکشا دی، بین بنانا اور بجانا سکھایا، بدا کیا، اور کہا جاؤ سانپ پکڑو، پالو، اور کھاؤ کماؤ۔ تب سے آج تک ہم لوگ سری گورکھ ناتھ جی کو اپنا ست گرو مانتے ہیں۔ برس کے برس ساون بھادوں ماس میں گردوارے کے درشن کرنے جاتے ہیں۔ تپسیا اور منتروں کا جاپ کرتے ہیں۔ بابوجی تم جانو منتر پڑھنے سے تو ایشور بھگوان ملتے ہیں نا۔ اب تھرائی کے آس پاس ہماری جاتی کے سو دو سو گھر ہیں۔ یہاں لوگ ہمیں سپیرے کہتے ہیں۔ پھر علی گڈھ، ایٹہ، مین پوری سے لے کے قنوج کے پاس کالی ندی تک ہم بھہودے کہلاتے ہیں۔ مدھیہ پردیس میں کن پھٹا اور راجستھان میں جے پور، جودھ پور کے آس پاس ہم لوگ جوگی ہیں۔ اور یہ سچ بھی ہے، ہمیں اپنے گرو سے جوگ ہی تو ملا تھا۔ آپ ہمارے کانوں میں چندن کی لکڑی کے جو بڑے بڑے کنڈل دیکھ رہے ہیں گردوارے سے ملتے ہیں۔ برس پیچھے پرانے کنڈل گرو جی کے چرنوں پہ چڑھا دیتے ہیں۔ مندر کا بڑا پجاری نئے کنڈل ڈال دیتا ہے۔ ان کے بوجھ سے کانوں کے بیچ پھٹ جاتے ہیں، یوں لوگ ہمیں کن پھٹا کہتے ہیں۔ رہی کھان پان کی بات، سو یہ ہے کہ ہم لوگ سبزی ترکاری اور موٹا اناج کھاتے ہیں، بکرے ہرن اور کھرگوش کا گوشت کبھی مل جاتا ہے۔ تیج تیوہار کو کبھی دو کبھی دارو مل گئی۔ بیڑی، گانجا اور سلفہ بھی چلتا ہے۔ ہاں بوٹی پینے سے بچتے ہیں۔ اس سے آنکھ کی جوت گھٹ جاتی ہے، ہاتھی کا مچھر دکھائی دیتا ہے، سانپ

پکڑنے میں ہاتھ کی صفائی اور آنکھ میں تیزی نہ ہو تو کیڑے سے بچنا بہت مشکل ہے۔ اور بابو جی آپ نے بیاہ شادی کی پوچھی، سو یہ ہے کہ ہم گوت بچا کے لڑکی لیتے دیتے ہیں۔ بیاہ میں بھیڑ بھڑ کا نہیں ہوتا۔ لکڑی کا کھم گاڑ کے کیلے کے پتے چھا دیتے ہیں۔ پنڈت آ نا ہے، بھانوریں پڑتی ہیں پھیرے دلوا دیتا ہے۔ بیاہ کے کپڑوں میں لال تول کا لہنگا، چنری کی اوڑھنی ہوتی ہے۔ سیندور سے مانگ بھر دیتے ہیں۔ ملتے پر بندیا مل گئی تو ہاتھوں میں مہندی لگا دیتے ہیں۔ گھر کے بال بچے ڈھولک پر سہاگ گاتے بجاتے ہیں۔ بس بیاہ ہو گیا۔ اب بتاؤں موت مٹی کی بات، سو یہ ہے کہ ہم مردے کو جلاتے نہیں۔ ہتھیلی پر انگارہ رکھ کے داغ دیتے ہیں اور شریر کپڑے میں لپیٹ کے گنگا جی کی دھارا میں بہا دیتے ہیں۔ گنگا جی تک پہونچ نہ ہوئی تو مردے کی لمبائی برابر گڑھا کھود کے اس میں لاش کھڑی کر دیتے ہیں اور اوپر سے مٹی بھر کے توپ دیتے ہیں، مل جائے تو پتھر کی سل اوپر رکھ دیتے ہیں، اسے سمادھی بٹھانا کہتے ہیں۔ مردہ بیاہی کا ہوا تو اسے سہاگ کا جوڑا پہنا دیتے ہیں، مرد کو معمولی دھوتی کرتہ۔"

بابو جی تھک گئے ہو گے، اب تو ٹھنڈا جل پی لو۔ گر اوئی تمھارے سامنے مانجتا ہوں، اوک سے پانی پی لینا۔ ہم تو بڑے بڑے تلک دھاری پنڈتوں کو ایسے ہی پلاتے ہیں۔ اپنا لب کسی کو نہیں دیتے نہ دوسرے کا لب لیتے ہیں۔ آپ نہیں سمجھے، مطلب یہ کہ اپنا جھوٹا کسی کو نہیں دیتے، نہ کسی کا جھوٹا آپ لیتے۔" بابو جی آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم لوگ شہروں سے الگ تھلگ دور کیوں بستے ہیں۔ تو بابو برا نہ ماننا شہر کے لوگ ہم سے ہمارے دھندے سے گھناتے ہیں۔ پھر یہ کہ ہمارے پاس ایسے جیون کے لیے پیسہ نہیں ہوتا اور بڑی بات یہ کہ ہم جوگی ہیں، شہر کے لوگ سانپ کا تماشا دیکھیں گے، آنہ دو آنہ پھینک چلتے بنیں گے۔ جوگی ہان ٹھاکر کی عزت کرنا نہیں جانتے۔ جنگل کی ہوا ہمیں راس آتی ہے۔ موسم آنے پر دیمک کی بانبیاں ڈھونڈھنا نہیں پڑتی۔ بے روک ٹوک کھودتے اور سانپ نکالتے ہیں۔ ہے نہ ٹھیک؟ گرو نے ہمیں جوگی کا بانا دیا ہے، بھکاری کا نہیں۔ ہم اس کی لاج رکھتے ہیں جو ہاتھ بھکشا کے لیے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔" بدیا ناتھ کا چہرہ خودداری کے جذبے سے چمک اٹھا تھا۔ میں نے کہا "بدیا ناتھ جی تم نے بہت کچھ بتا دیا۔ دو چار باتیں رہ گئیں، پوچھنا یہ ہے کہ تم لوگ سانپ کو مارتے کیوں نہیں؟" رام رام بابو جی! جس باسن میں کھائیں اسی میں چھید کریں؟ سرپ تو دیوتا ہیں، بشن بھگوان کے رچھک۔ مہادیو جی گلے میں سرپ مالائیں ڈالے رہتے ہیں۔ مارنا کیسا، ہم منتر پڑھ کے پکڑتے ہیں تو سرپ دیوتا کو وچن دیتے ہیں کہ رُت بدلتے ہی انھیں چھوڑ دیں گے۔ سانپ جتنے دن بھی ہماری کانور میں رہتے ہیں، ہم ان کی سیوا کرتے ہیں۔ انھیں دودھ پلاتے ہیں، ماس کھلاتے ہیں، ناگ پنچمی کے میلہ میں جا کے دیکھو بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار ہمیں بلاتے ہیں۔ سانپوں کو دودھ پلواتے ہیں اور ہمیں مٹھی بھر بھر روپے دیتے ہیں۔" میں نے کہا "بدیا ناتھ جی! جنگل میں سانپ کو گوشت اور دودھ کہاں سے ملتا ہو گا؟" کہا "بابن کی مٹی چاٹتا ہے، اور رات کو مینڈکی یا جنگلی چوہا پکڑ لیتا ہے۔" اب مجھے بین کی بات یاد آئی۔ بدیا ناتھ نے کہا "بابو جی ہم بال پن ہی سے اپنے بچوں کو بین بجانا، اور سانس کی روک تھام کرنا سکھلاتے ہیں۔ بارہ تیرہ برس کی اوستھا میں وہ بچے ہو جاتے ہیں، اور ہر اجا کرنا کو کھلانے لگتے ہیں، اور یہ ہوتا ہے کہ باجن لاگی تو مرلی نکسن لاگے ناگ۔ بالپن ہی میں سانپ پکڑنے کے گر سکھلاتے ہیں، اس کے لیے ہاتھ کی صفائی اور آنکھ کی تیزی سے کام لینا پڑتا ہے۔" اس پر میں نے کہا "سانپ کے کان نہیں ہوتے، بین کا سُر کیسے سنتا ہو گا؟" کہا "ناک کے رستے سُر سر میں گھستا ہے۔" اب میں نے سب سے اہم سوال کیا۔ "بدیا ناتھ آپ نے اب تک کتنے سانپ پکڑے، پالے اور برتے ہیں؟" "بابو جی بڑوں سے سنا ہے کہ سرپ کی سو ہر یا اٹھارہ سو جاتیاں ہمارے دیس میں پائی جاتی ہیں۔ میں نے اب تک ساٹھ سے اوپر کل جاتی کے، اور کوئی نو جاتی کے پھن والے سانپ پکڑے پالے ہیں۔ ان میں سے شیش ناگ کا ڈسا دس منٹ بھی نہیں جیتا۔ بھینسا ڈوم کے جوڑا چکلا پھن ہوتا ہے، اس پہ گھونگھر بنے ہوتے ہیں۔ جسے کاٹے، اس کی کھوپڑی چٹک جائے، بھیجا نکل پڑے۔ پھول پنکھا، کاگا دھنی ناموڑہ، پوپیا، پدم ناگ، سنگ چوڑ کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔ اپنے بجر گوں سے من دھاری کا نام سنا پر دیکھا نہیں۔ اندھیاری رات میں نکلتا اور من اگلتا ہے۔ اس کی چاندنی میں اوس چاٹ کے پیٹ

ہوتا ہے۔ اور ایک سانپ ہے ہرا بھانگر۔ جسے ڈسے، پیٹ ہرا کر دے۔ پکھال جیسا پھولے، پیٹ پھٹے اور مر جائے۔ اور ایک ہوتا ہے لگ نام۔ بانس کے گھنے جنگل کا باسی، چٹک گراڑتا ہے اور راستے پر کاٹتا ہے اور ہے لال پیلے رنگ کا۔ رکت دشمنی۔ کاٹتا کم ہے پھنکارے جیسے لہار کی دھونکنی۔ اور لوہا۔ نیا پھن کا کالا سانپ ہے اس کا ڈسا دس پانچ منٹ میں پران تیاگ دیتا ہے۔ بنگالے میں اسے ناگ کہتے ہیں اس کی مادہ دھامن کہلاتی ہے۔"

اس پر میں نے بات کاٹی "بدیا ناتھ جی سنتے ہیں یہ دھامن گائے کے تھن کا دودھ پی لیتی ہے۔" بڈھے سپیرے نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اور بولا "بابو یہ ہم سپیروں کی چال ہے، اگو سانپ لے کر وا یپ کرنے کا لاتیں تمارے دھامن کو بیکنٹھ نہ پہنچا دے گا؟" اور سنو پرکھوں کی بات ہے، سانپوں کا راجہ کل ناگ۔ سونے کے پتر جیسا رنگ، بلا ہاتھ کا آکار، سر پہ سنہرے بالوں کا مکٹ، جسے ڈسے، دم سے مارے اور جس پرانی میں اس کا رکت ہو وہ بھی اب بانو کر نہ مانو۔" اب مجھے یاد آیا اور پوچھا۔ بدیا ناتھ جی دو ایک باتیں رہ گئیں، سانپ ڈسنے کی بات کہو بولا، بابو جی سرپ دبا ڈرے پر ہی کاٹتا ہے سنو اس کے جبڑوں کی بتیسی مینڈک چوہے پکڑنے کے لیے ہوتی ہے۔ جبڑوں کے بھیتر کنٹھ کے پاس دو ٹیڑھے جو کے دانے سے چھوٹے، سوئی جیسی پینی نوک کے دانت ہوتے ہیں، ان کے نوکوں کے ٹھیک نیچے مٹر برابر دو پھپھولوں میں بس بھرا ہوتا ہے، سانپ بھر کے منہ مارے اور الٹ پڑے، پر پھپھولے چھید جاتے ہیں اور ان کا بس شریر میں اتر جاتا ہے۔ برس لیتے پلٹتے نئے پھپھولے بن جاتے ہیں۔ آئی سمجھ میں؟"

اپنے سوالوں کی بوچھار سے اب میں تھک چلا تھا۔ پھر بھی پوچھا ہی پوچھا۔ "مہاراج سانپ کے کاٹے کا منتر بھی ہوتا ہے؟" کیوں نہیں۔ بیدھ ہو جائے۔ منتر نہیں تو ڈھکوسلہ" اور اس کے کاٹے کی دوائیں؟" ہوتی ہیں۔ جڑی بوٹی جیسے سرپ بسی اور ردم ریکھ۔ پر ملیں کیسے۔ ہمالیہ کے بنوں گھومو پھرو تو تب کی بات، نینی تال کی پہاڑیوں میں ایک بیل ہوتی ہے، روپے برابر بیج کی پھلی نکلتی ہے۔ ایک بیج پانی میں گھسو اور گھاؤ پر لگا دو، چپک جائے گا۔ بس ہو چس کر گر پڑے گا اور تباول بٹنے کا چلن جب سے سگریٹ نکلی اٹھ گیا ہے، نہیں تو اس کی نلیوں میں پانی بھر کے لوہے کی سلائی سے رگڑو۔ تماکو کے دھوئیں کا چکٹا کالا میل نکلے گا۔ پلاؤ۔ الٹی ہوگی۔ نیلا پانی نکلے گا۔ پلاتے جاؤ بس نکل جائے گا۔" تماکو کے کھیت میں سانپ نہیں گھستا۔" میں نے کہا "بدیا ناتھ دو باتیں اور ہیں، پوچھ کر تم سے بدا ہو جاؤں گا پہلی یہ کہ سانپ کے انڈے ہوتے ہیں یا بچے؟" بدیا ناتھ پھر خوب ہنسا اور کہنے لگا۔ بابو جی تمھاری بات پر بالک بھی ہنسیں گے۔ بچے نہیں۔ جس پشو پنکشی کے کھلے کان نہیں ہوتے وہ سب انڈے دیتے ہیں۔ سانپن کسی پرانی بانبی یا باگ بگیچے کے دوڑے کے سہارے ایک سو تک انڈے اسی بیا کھ جیٹھ ماس میں دیتی ہے۔ اور آپ کنڈل مارے ان کی رکشا کرتی ہے، کوئی سوا مہینے میں سپنولے نکلتے ہیں، جو رینگ کر نکل گیا سرپ ہو گیا نہیں تو دھامن انڈے کھا جاتی ہے۔ اتنے سب سپنولے ہو جائیں تو آپ سمجھو دھرتی پہ ہمارے آپ کے لیے ٹھکانا نہ بچے۔ ہاں یہ بتانا رہ گیا کہ سانپ بہت پرانا ہو جائے تو اس کی کینچلی پر مخملی جیسے سینگ نکل آتے ہیں۔ اور یہ بھی سنو کہ سرپ کے انڈوں کی یہ وچتر بات ہے کہ دھرتی پر ٹپکو، ربڑ کی گیند کی بھانتی گدا کھا کے اچھلتے ہیں، ٹوٹتے نہیں۔"

اب میں گرمی کے مارے بالکل پست ہو چکا تھا۔ بدیا ناتھ کے اصرار پر اس کی گڑ کی اور کچی کنوئیاں کا پانی پیا۔ اور دعا سلام کر کے پھر کبھی آنے کا قول دے کر اٹھا اور پانچ روپے کا ہرا پتا بدیا ناتھ کی بھینٹ چڑھا کر ماٹھ کا رستہ لیا۔ اور مٹی کے اس گھروندے سے بدا ہوتے ہی مرزا غالب کی ارواح سے معافی مانگتا۔ مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہ تھی۔ ایک چکر تھا میرے پانوں میں زنجیر نہ تھی، ورد کرتا بخیریت گھر آ گیا۔

★

سناؤ یارو وطن کے نغمے

نذیر بنارسی

گھٹا ہے گھنگھور رات کالی فضا میں بجلی چمک رہی ہے　　ملن کا سینہ اُبھار پر ہے برہ کی چھاتی دھڑک رہی ہے
ہوا جو مستی میں چور ہو کر قدم قدم پہ بہک رہی ہے　　کمر ہے ہر شاخِ گل کی کومل ٹھہر ٹھہر کر لچک رہی ہے

ہوا پہ چلتا ہے حکم ان کا گھٹائیں بھرتی ہیں ان کا پانی　　انھیں سے سُرخی بہار کی ہے انھیں سے برسات کی کہانی
انھیں سے چشمے انھیں سے جھرنے انھیں سے جھرنوں کی نغمہ خوانی　　انھیں سے پربت انھیں سے دریا انھیں سے دریاؤں کی روانی

فریب دے کر چلی نہ جائیں بڑی دھواں دھار ہیں گھٹائیں　　جب آ گئی ہیں تو جم کے برسیں بغیر برسے چلی نہ جائیں
ملے نیا سب کو ایک جیون چمن کھلیں کھیت لہلہائیں　　ہوا محبت کا راگ الاپے کسان دھرتی کے گیت گائیں

کیا ہے جس جس نے دور اندھیرا اُسے اُسے روشنی میں لاؤ　　جہاں جہاں دن ہے اُجالا وہاں وہاں پر دیئے جلاؤ
قسم ہے آزادیِ وطن کی عداوت آپس کی بھول جاؤ　　کیا ہو جس نے گلہ تمھارا اُسے بھی بڑھ کر گلے لگاؤ

قدم جو آگے بڑھا سکے زباں سے دہرا دو وہ کہانی　　نذیر پندرہ اگست سے لو نئے ارادے نئی جوانی
اگر جلائے وہ چار دن تو جلانے والے کی مہربانی　　جو کام آ جائے دیش کے تو بہت ہے دو دن کی زندگانی
ہوا سے کہہ دو کہ ساز چھیڑے امر شہیدوں کے بانکپن کا
سُنا دو یارو وطن کے نغمے یہ دن ہے آزادیِ وطن کا

کوثر چاندپوری

شیدائے غزل حسرت موہانی

حسرت موہانی اس اعتبار سے اردو شاعروں میں مخصوص امتیاز کے مالک ہیں کہ انھوں نے اصناف شاعری میں صرف غزل کو اپنا موضوع بنایا، قصیدہ مثنوی اور مرثیہ وغیرہ کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ اسی خصوصیت نے انھیں غزل گو شعرا کی طویل فہرست میں بلند مقام دیا۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ حسرت دل و جان سے غزل کی جانب متوجہ نہ ہوتے تو یہ صنف سخن بے آبرو ہوگئی ہوتی۔ حسرت ہی نے غزل کی فنی عصمت کو تباہ ہونے سے بچایا۔ اگر وہ سہارا نہ دیتے تو غزل ایسی قدیم روایت اپنے تمام حسن و جمال کے ساتھ ختم ہو جاتی۔ حسرت نے غزل میں نفسیاتی اندار کی تبدیلیاں کیں جن سے اس کی زندگی طویل ہوگئی اور انسان کی تون پسند طبیعت نے اسے اپنا مرکز التفات بنائے رکھا۔ حسرت نے غزل کے معیار کو بدلا اور بلند کیا۔ غزل پر ان کے اتنے احسانات ہیں کہ ان سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔ غزل کو حیات تازہ دے کر اس کی مقبولیت کو برقرار رکھنا حسرت کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے جہاں عشق و محبت کے گہرے رنگوں سے پردے اٹھا کر انسانی فطرت سے قریب کیا وہاں ہوسناکی اور پست عشقیہ جذبات سے محفوظ رکھنے کی کوشش بھی کی۔ ان کے لہجہ میں انفرادیت، رنگینی، مٹھاس اور سادگی ہے۔ حسرت نے جنسی تصورات کو شجر ممنوعہ نہیں سمجھا بلکہ خلوص کے ساتھ ان کی پردہ کشائی کی۔ اسی خلوص نے ان کے کلام کو ہوس کے پست جذبات سے بچایا ہے۔ وہ ہر عالم میں عشق اور غزل کے پرستار رہے۔ جیل کے مصائب میں بھی زلف یار کے پیچ و خم کی رعنائی کو فراموش نہیں کر سکے یہی ان کی شخصیت اور کردار کا بانکپن ہے۔ انھیں بڑا شاعر تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے مگر ایسا عاشق مزاج شاعر ضرور کہا جائے گا جس کا عشق روایتی نہیں حقیقی اور عملی ہے۔ ان کے عشقیہ تجربات میں بڑی صداقت اور واقعیت ہے۔ حسرت کے یہاں محبوب کا تصور ماورائی نہیں، وہ اسی دنیائے آب و گل کا باشندہ ہے۔ اردو شاعری کی روایت کے خلاف صنف لطیف سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا ماحول وہی ہے جو اس زمانہ کے مسلمانوں کے درمیانی طبقہ کا تھا۔ اس کے لیے پردے کی پابندی تھی رسوائی کا ڈر تھا نگاہوں پر بھی قدغن تھی۔ حسرت کا گھریلو محبوب یہ گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اسے بار بار شوق کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔ حسرت اس معاملہ میں خود بھی محتاط نظر آتے ہیں۔ انھیں اپنے مرکز التفات کے عزت و ناموس کا بہت زیادہ لحاظ ہے۔ وہ اس راز سے واقف ہیں کہ ایسا کرنے سے بینائی دل کا راز فاش ہو جاتا ہے چنانچہ خود اپنی ذات کو مخاطب کرتے ہیں:

حال کھل جائے گا بینائی دل کا حسرت
بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

لیکن ان سب باتوں کے باوجود جذبات کی کارفرمائی سے محبوب بھی مجبور ہے اور کبھی کبھی جلوۂ لب بام دکھا ہی دیتا ہے:

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا
اب تو اظہار محبت برملا ہونے لگا

حسرت کا عشق بازاری نہیں تھا بلکہ گھر کی قسم کا تھا۔ ان کی عشقیہ شاعری میں مسلم گھرانوں کی روایات کا عکس ملتا ہے۔ چلمن کی اوٹ اور پردے کی جھلک بھی موجود ہے۔ کہیں کہیں نامہ و پیام تک نوبت پہونچ جاتی ہے:

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے
مشتاق دید اور بھی للچا کے رہ گئے

نہاں ہے دل پذیری جس کے ہر ہر لفظ تحریر میں
یہ کس جانِ وفا کے ہاتھ کی رنگیں نگارش ہے

حسرت کے یہاں نظر بازی کا ذکر ہے لیکن ہوسناکی نہیں ہے ایک طرح کی طہارت ہے۔ حسرت کی عشقیہ شاعری میں نفسیاتی اور عملی صداقت ہے وہ حسن و عشق کے کاروبار سے واقف ہیں، اور ایک خاص تہذیب کے عکاس ہیں۔ گھر کی پاکیزہ فضا پیش کرتے ہیں تصنع سے کام نہیں لیتے جذبات انسانی کی تصویر کشی بڑی سادگی اور پرکاری سے کرتے ہیں:

آہ کہنا وہ ترا پاس کے مجھے گرم نظر
ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں

لوگ سب جان گئے چھپتی کہیں شوق کی بات
میں گلی سے جو تری ہو کے مکرر گزرا

آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

یہ خصوصیات سچی عشق کی گرمی سے پیدا ہوئی ہیں جو خیالی نہیں حقیقی ہے۔ جس سماجی پس منظر میں اس جذبے کی نشو و نما ہوتی ہے وہ بھی مصنوعی نہیں۔
حسرت کی غزل میں سلاست، سادگی اور صفائی کا خاص اہتمام ملتا ہے۔ اور طرزِ ادا میں بڑی ندرت اور جدت پائی جاتی ہے۔ انھیں چیزوں میں ان کا شاعرانہ کردار جھلکتا ہے۔ وہ فطرت کی زبان میں نغمہ سرائی کرتے ہیں لب و لہجہ بہت سادہ اور رواں دواں ہے:

بیتابیوں سے چھپ نہ سکا ماجرائے دل
آخر حضورِ یار بھی مذکور کر دیا

بیتابیاں ہیں عام کہ اس حسنِ شوق نے
دنیا سے محو صبر کا مضمون کر دیا

حسرتیں دل کی ہوئی جاتی ہیں پامالِ نشاط
ہے جو وہ جانِ تمنا رونقِ کاشانہ آج

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

خود ہے اقرار انھیں اپنی ستم گاری کا
پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ میں ایسا نہ کہوں

شوق کو مجبور ہو کر چھوڑ دینا ہی پڑی
جب کلائی نازکی سے تھرتھرائی آپ کی

میاک نھا زبس کہ مرا اضطرابِ شوق
شرما کے وہ کبھی کبھی جھنجلا کے رہ گئے

حسرت کی ذات میں شروع ہی سے غزل کا وہ خمیر پیدا ہو رہا تھا جس میں عشق و محبت کی نفسیات کو سمجھنے کا شعور تھا۔ اس کے ساتھ سوز و گداز کی کیفیت بھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے داغ کی شہرت اور مقبولیت پر توجہ نہیں کی اور منشی امیر اللہ تسلیم کی شاگردی قبول کر لی حالانکہ داغ کی آواز فضا میں اس شدت سے گونج رہی تھی کہ دوسرے شاعروں کی آوازیں دب گئی تھیں۔ عام طور پر شعرا نواب داغ ہی کے دامن کا سہارا لے رہے تھے۔ یہ محض حسرت کے ذوقِ سلیم کی رہنمائی کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے امیر اللہ تسلیم کو اپنا رہبر بنایا۔
حسرت کی شخصیت کے دو نمایاں پہلو ہیں، ایک میں نرمی، رعنائی اور نزاکت ہے۔ یہ پہلو شاعری کے لیے مخصوص ہے، اس میں عشق و محبت کی نکہت بھری ہوئی ہے محبوب کی زلف و رخسار کا حسن ہے دوسرا پہلو وہ ہے جس میں سیاست کی دی ہوئی آہنی صلابت ہے عزم کی گرمی ہے جس سے عمر بھر انھوں نے جیل کی مشقتوں کا مقابلہ کیا۔ غنیمت ہے کہ حسرت نے عاشقانہ شخصیت پر سیاسی شخصیت کو غالب نہیں ہونے دیا بلکہ سیاست

اس جذبہ سے مغلوب رہی۔ ان کی سیاسی غزلوں میں بھی عشق و محبت کے
کے اشعار مل جاتے ہیں، پھر بھی حسرت نے انھیں ایک دوسرے سے
ٹکرانے نہیں دیا۔ یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا جس سے وہ آسانی کے ساتھ گزر گئے
اس سلسلہ میں وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

درکف جام شریعت درکف سندان عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

حسرت کی سے میں انفرادیت ضرور ہے لیکن انھوں نے بہت سے شاعروں
کا اثر شعوری طور پر قبول کیا ہے ان کا امتیاز یہ ہے کہ اپنی انفرادی
آواز کو دبنے نہیں دیا۔ میر، قائم، مومن، غالب، امیر اللہ تسلیم،
اور نسیم سے اکتساب فیض کا اعتراف انھوں نے صاف الفاظ میں کیا
ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت لکھنوی رنگ کے مقابلے میں دہلی
کے انداز غزل سرائی کو پسند کرتے تھے لیکن یہ دونوں رنگ ان کی غزل
میں موجود ہیں۔ یوں ان کے یہاں لکھنوی اسلوب سے بیزاری کا اظہار
بھی ملتا ہے ایک جگہ کہتے ہیں :

حسرت مجھے پسند نہیں طرز لکھنؤ ۔۔۔ پیرو ہوں شاعری میں جناب نسیم کا

حسرت میں دقت پیروی مومن و نسیم ۔۔۔ کیوں سلسلہ ملائیں کسی لکھنوی سے ہم

مومن کی تقلید حسرت نے کامیابی سے کی ہے اس پر انھیں فخر
بھی ہے۔

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں ۔۔۔ مومن کو اپنے رنگ سے تو نے ملا دیا

طرز مومن میں مرحبا حسرت ۔۔۔ تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

رسمی شعرا کا حسرت نے گہرا مطالعہ کیا تھا اس کے نقوش ان کے
غالبیہ اشعار میں ملتے ہیں۔ وہ اپنی غزل کو سعدی و جامی کا عکس خیال
کرتے ہیں :

حسرت اردو میں غزل ہے تیری
پرتو نقش سعدی و جامی

تعجب ہے کہ وہ مشہور صوفی اور جلال الدین رومی کے پیر شمس تبریز
سے روحانی تلمذ کا ذکر بھی کرتے ہیں ایک جگہ کہتے ہیں،

ب جاتے ہیں
بڑے لکھے **باغباں اپنا**
ان سے منسو
شمس تبریز تھا
یاں اپنا
رو رہی سے
اور شدت **ستاں اپنا**
میر، مومن **آشیاں اپنا**
کا ظلم زمیں
عیاں اپنا
بہت کم ہیں
یہ وراثت **کرن پھوٹی**
موضوع عوام **اپنا**
شعر زیر سے میں **زندگانی کی**
شاعر در
آتا ہے جو زمانے کا **اپنا**
کا سرمایۂ غزل بھی **ماتم**
اسے سراہا ۔۔۔ ہے **نا**
تعریف کا مستحق ہے :

یارب زمانہ مجھ
لوح جہاں پہ حر

مگر اس کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ حسرت
سے کہے ہیں :

غزل گوئی رہی یکتا بیان عاشقاں میں
کہاں سے پھر کوئی لاتا بیاں میرا زباں میری

پسند آیا طریق شاعری تیرا ہمیں حسرت
کہ جب کہنا کبھی کچھ نغز کہنا بے بدل کہنا

عیاں ہے دل پذیری جس کے ہر ہر لفظ شیریں
یہ کس جانِ وفا کے ہاتھ کی رنگیں نگارش . ،

حسرت کے یہاں نظر بازی کا ذکر ہے لیکن ہوسناکی نہیں
کی طہارت ہے . حسرت کی عشقیہ شاعری میں نفسیاتی او ۱
ہے وہ حسن و عشق کے کاروبار سے واقف ہیں ، اور ایک
کے عکاس ہیں . گھر کی پاکیزہ فضا پیش کرتے ہیں تصنع سے
جذبات انسانی کی تصویر کشی بڑی سادگی اور پرکاری سے کر

آہ کہنا وہ ترا پاکے مجھے گرم نظر
ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں

لوگ سب جان گئے چھپ نہ سکی شوق کی بات
میں گلی سے جو تری ہو کے مکرر گزرا

آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

یہ خصوصیات اسی عشق کی گرمی سے پیدا ہوئی ہیں
جس سماجی پس منظر میں اس جذبے کی نشو و نما
حسرت کی غزل میں سلاست ، ر ا
ملتا ہے . اور طرز ادا میں بڑی ندرت
چیزوں میں ان کا شاعرانہ کردا
نغمہ سرائی کرتے ہیں لب و لہجہ
بیتا .

شیرینیِ نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

ایک جگہ انھوں نے غالب کو بھی اپنے مقابلہ میں پست کر دیا ہے حالانکہ وہ غالب کے کلام کی شرح کر چکے تھے ،

ہو کے بے خود کلام حسرت سے آج غالب غزل سرا نہ ہوا

حسرت نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جن میں بہت زیادہ گہرائی نہیں ہے . حیرت ہے کہ وہ ذوق کو غالب کے مقابلہ میں بڑا شاعر سمجھتے ہیں . جہاں تک نقائص اور عیوب کلام کا تعلق ہے وہ سب ہی کے یہاں مل جاتے ہیں . حسرت بھی مستثنیٰ نہیں ہے مگر غزل میں انھوں نے اپنا جو مقام بنایا ہے وہ کافی بلند ہے . حسرت کو تاریخ ادب کبھی بھلا نہیں سکے گی .

★



عزیز بارہ بنکوی

غم کی روداد مختصر نہ ہوئی — شمع روتی رہی سحر نہ ہوئی
وہ ستمگر ہوا کرم گستر — بدگمانی بھی معتبر نہ ہوئی
ہر نفس حادثاتِ نو گزرے — زندگی پھر بھی مختصر نہ ہوئی
قیدِ ہستی بھی توڑ دی ہم نے — ہم سے توہینِ بال و پر نہ ہوئی
عشق کی ابتدا تو کی ہم نے — انتہا کی ہمیں خبر نہ ہوئی
کچھ نہ آیا جوابِ نامۂ شوق — کارگر سعیِ نامہ بر نہ ہوئی
مرگِ عاشق بھی ہو گئی لیکن — بے نگہِ لطفِ چارہ گر نہ ہوئی
بجھ گئی شمعِ انتظار عزیز
شامِ امید کی سحر نہ ہوئی .

اسلم لکھنوی

چمن اپنا چمن کے پھول اپنے باغباں اپنا

حدیثِ وصفِ گل اپنی زباں اپنی بیاں اپنا
گلستاں کی ہے رونق جیسے حسنِ داستاں اپنا
ہمیں حق ہے جہاں چاہیں بنالیں آشیاں اپنا
چمن اپنا، چمن کے پھول اپنے، باغباں اپنا
قفس کی تیلیاں ٹوٹیں امیدوں کی کرن پھوٹی
ہمارے کام آخر آگیا عزمِ جواں اپنا
ہنسی کلیوں کی منزل بن گئی ہے زندگانی کی
رواں دوشِ نسیمِ صبح پر ہے کارواں اپنا
گیا وہ دور جب تھی زندگی گہوارۂ ماتم
مکمل شادماں ہے اب دلِ ناشادماں اپنا
تخیل کی رسائی بھی جہاں اب تک تھی ناممکن
وہاں تک رفتہ رفتہ لے گیا عزمِ جواں اپنا
برستے ہیں نہ انگارے نہ دل پر برق گرتی ہے
زمیں سے بھی بڑھ کر دوست ہے اب آسماں اپنا
نئی دنیا نئے ماحول کی جانب بلاتی ہے
ضرورت ہے کہ ہم لے کر بڑھیں قومی نشاں اپنا
یہ آزادی کی دولت ہے حفاظت فرض ہے اس کی
ہے سب کے نام یہ اسلم پیامِ جاوداں اپنا

غیاث احمد گدی

(افسانہ)

گھر

یہ گھر میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں اس کے کونے کونے سے واقف تھی، کوئی جاننا چاہے تو میں یہاں تک کہہ سکتی ہوں کہ میں اس گھر کی آتما تک کو پہچانتی ہوں۔

اس لیے جب میں نے اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو ٹھٹھک گئی ایک لمحہ کے لیے بھول گئی کہ چھ برس پہلے کی سنیتا کوئی اور تھی اور آج کی سنیتا کوئی اور ہے۔ ان دونوں کے درمیان چھ سال کی موٹی مضبوط اور ناقابل مسمار دیوار حائل ہے۔ ایسی کہ کوئی ایک طرف سے چیخ کر آواز دے جب بھی دوسری جانب کوئی فرق نہیں پڑتا، وقت خاموشی سے دونوں کے بیچ رواں ہے۔

اتنے میں وہ نوخیز لڑکی سامنے آکھڑی ہوئی۔ سانولی سی، بے حد سبک سی، ایک لمحہ کے لیے مجھے اس کے وجود سے جلن ہوئی میرا سارا کا سارا جسم بکھرنے کو ہوا، تبھی میں نے ہاتھ بڑھا کر اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کی، میں وہ نہیں ہوں۔ میں ..... سنیتا نہیں ہوں۔ وہ کوئی اور تھی، جو وقت کی دھول میں مل کر دھول بن گئی، شاید شاید اس لیے مرے اپنے آپ میں کبھی کبھی کوئی موجود بھی رہتا ہے۔ جب وہ ہوتا ہے تو باہر کی سنگدل دنیا میرا کچھ نہیں بگاڑتی اور کبھی کبھی جب وہ ساتھ چھوڑ دیتا ہے تب ......؟

"آپ کس سے ملنا چاہتی ہیں ——؟" وہ لڑکی خوش دلی سے بولی —— "کون ہیں آپ"؟؟

"سنیتا" بے اختیار مری زبان سے نکل گیا۔ پھر ثانیہ گزرتے ہی میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ "میں سنیتا سے ملنے آئی ہوں۔" وہ مری بچپن کی ....

"اوہ . . . ." لڑکی نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور افسردہ ہو گئی جیسے کچھ ہاتھ میں آتے آتے رہ گیا ہو —— "آپ کھڑی کیوں ہیں؟ بیٹھیے نا" وہ میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی، اس نے ایک گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ میری ہستی کے سارے اسرار و رموز کو پڑھنا چاہا . . . . اور پھر اداس ہو گئی "آپ بیٹھیے نا، کیا کھڑی کھڑی چلی جائیے گا؟"

"سنیتا میری سہیلی . . . . . ." میں صوفے پر بیٹھ گئی —— "کیا وہ اب یہاں نہیں رہتی، یہ گھر ......" میں نے چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے کہا —— کیا یہ گھر اس کا نہیں ہے؟ . نہ میرا آنا [illegible] اس جوں کا توں تھا۔

"گھر تو انھیں کا ہے ...... لیکن وہ ان دنوں یہاں نہیں ہیں۔" لڑکی ابھی تک میرے چہرے پر کچھ ڈھونڈھ رہی تھی۔

"گھر انھیں کا ہے . . . لیکن وہ یہاں"۔ میں چونک گئی کیا یہ گھر آج بھی سنیتا کا ہی ہے، یہ صوفے، کرسی، برتن، باسن المارے کپڑے لتے، برتن چوکا، کیا آج بھی ان پر میرا ادھیکار ہے . . . ؟

میرے آس پاس دھند سی پھیلنے لگی جس میں میں دھیرے دھیرے ڈوبنے لگی ..... ایک خواب ناک اندھیرا میرے چاروں اور چھانے لگا، تبھی باہر سڑک پر گزرتی ہوئی کوئی تیز رفتار کار کو بریک لگا، جس کی آواز گونجی، میں ایک جھٹکے سے اس دھندلکے سے باہر آگئی۔

"اور آپ کون ہیں؟" پوچھنے کو تو میں نے پوچھ لیا لیکن کوئی میرے اپنے آپ سے سوال کر بیٹھے کہ جس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں سامنے بیٹھی ہوئی لاتعلق سی لڑکی کون ہے؟ تو شاید میں اپنے آپ کو سنبھال نہیں پاؤں، بکھر جاؤں، پھوٹ پڑوں کسی جذباتی بچی کی

سسک سسک کر رونے لگوں، لیکن سچائی میرے سامنے ہوتے ہوئے بھی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی ... !

"میں ... ، وہ لڑکی ذرا رکی۔ میری طرف دیکھا پھر مسکرا دی، میں ان کی چھوٹی بہن ہوں، سنیتا دیدی کئی برس سے باہر ہیں نا، ان کی عدم موجودگی میں ان کے گھر سنسار کی دیکھ ریکھ میں ہی کر رہی ہوں۔

پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی ... "میں آپ کے لیے چائے بنا لاؤں ... "

میرے روکتے روکتے وہ اندر کمرے میں چلی گئی۔

یہ جھوٹ تھا، ایک دم سے سفید جھوٹ۔ اتنا نیک جھوٹ تھا کہ سننا مجھے اچھا لگا۔ کبھی کبھی کوئی جھوٹ اتنا پیارا کیوں لگتا ہے کہ اس پر سے کئی سچ کو وار دینے کو جی چاہتا ہے ..... اب جھوٹ .... اتنا پیارا، جیسے کوئی سپنا ہو، میں نے دھیرے سے آنکھیں بند کر لیں، سنیتا کئی سال سے باہر گئی ہے۔ اور اپنا گھر سنسار اس لڑکی کے حوالے کر گئی ہے اپنا پتی بھی، جس کو پانے کے لیے اس نے کبھی سارے شہر کی بدنامیاں سہیں، گھر والوں کی نفرت کی شکار ہوئی۔ اپنے بیگانے ہو گئے رشتوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ دیواریں پتھر دل ہو گئیں۔

اس پتی کو بھی اس لڑکی کے حوالے کر دیا ہے

اس سب کچھ سے معصوم سی لڑکی کو اگر معلوم ہو جائے، وہ سنیتا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی اس کے سامنے بیٹھی ہے اور یہ سارا کا سارا جھوٹ ہے جو مجھ سے کہہ رہی ہے تو کیا ہو ؟

لیکن نہیں، وہ ایسا نہیں کرے گی۔ یہ بات وہ اس لڑکی پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دے گی کہ میں وہی ہوں۔ وہی جس کی دنیا پر تم نے قبضہ جما رکھا ہے۔ پل کی پل میں سارا سنسار دھڑام سے خوابوں کے محل کی طرح نیچے آ رہے گا۔

چائے بسکٹ دال موٹ، کاجو، اتنی ساری چیزیں لا کر اس نے میز پر رکھ دیں۔ بالوں کی الجھی ہوئی شریر لٹ کو سر کے اوپر جھٹک کر میری طرف دیکھا اور دھیرے سے مسکرانے لگی۔

"آپ ..... سنیتا دیدی کے پتی سے کبھی ملی ہیں؟" چائے بناتے بناتے اس نے ہاتھ روک کر اور آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ... "میرا مطلب ہے وہ ابھی اچانک آ جائیں تو کیا آپ انھیں پہچان لیں گی ___ ؟"

"کیا ___" میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی "کیا وہ باہر پر نہیں گئے ہیں"؟

"گئے تو ہیں۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی .... "

"اوہ ..... " ایک لمبی سانس لے کر میں صوفے پر آرام سے بیٹھ گئی "میں سمجھی ... " میں بہت دیر تک رکی رہی تو اس نے آگے بڑھ کر سرگوشی کے انداز میں دھیرے سے پوچھا ___ "آپ کیا سمجھیں"؟

"کچھ نہیں ... " میں نے اپنی دھڑکنوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا۔ "میں نے انھیں کبھی دیکھا نہیں ہے ... "!

"آپ کتنے دنوں سے سنیتا دیدی سے نہیں ملی ہیں ___"؟

وہ لڑکی میری سانسوں میں الجھن ڈالتی جا رہی تھی۔ اور میرا باہر جانے کیوں طوفان کی نظر میں تھرتھراتے ہوئے دیے کی طرح لگ رہا تھا۔

"کوئی چھ برس ہوں ... " میں نے اپنے آپ کو چائے کی پیالی میں غرق کر دینا چاہا۔ لیکن دور سے کوئی مجھے آواز دے رہا تھا ... جھوٹ ..... یہ سب جھوٹ ہے ......

"سچ کیا ہے ... ؟ وہ جو بیت گیا، میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ میں سناٹے میں کھڑی رہی۔ مجھے کوئی جواب نہیں ملا کسی دشا سے نہیں۔

چھ برس تو بہت ہوتے ہیں ...... وہ لڑکی کھڑکی سے باہر نیلے آسمان کو تکنے لگی، جس کو آدمی چاہتا ہے، جس سے پیار کرتا ہے ...... چھ برس تک اسے ایک نظر دیکھے بھی نہیں ...... پھر وہ آسمان کی نیلاہٹوں سے لوٹ آئی۔

اس نے کاجو کی طشتری بڑھاتے ہوئے کہا ___ "لیجیے، لیجیے کھائیے نا، آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں ...... اس گھر .... اس گھر کو غیر سمجھتی ہیں نا ؟"

"کھا تو رہی ہوں" ... میں اتنا ہی بول پائی اس کے آگے میری زبان نے، میرے حلق نے ساتھ نہیں دیا، الفاظ میری گرفت میں

ہی نہیں آسنے . . ."ہاتھ بڑھا کر میں نے کاجو کے دو دانے اٹھا لیے۔ زندگی یوں رواں ہے۔ میں کیوں یہاں چلی آئی۔ اس گھر سے رشتہ ٹوٹے ہوئے چھ سال ہو گئے ہیں، اب یہاں کیا رکھا ہے کہ جنید گھنٹوں کے لیے اگلی ٹرین لیٹ تھی تو میں بے اختیار سی ہو کر یہاں چلی آئی جس پتی نے چاہنے والے شوہر نے ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا۔ اس سے کیا واسطہ۔ زندگی قدم قدم پر کانٹے۔ بچھانے پر کیوں تلی ہے اور یہ دل کیوں کبھی کبھی ایسا نادان ہو جاتا ہے کہ کانٹوں کی باڑھ میں چھلانگ لگانے کو دوڑ پڑتا ہے۔

بوکھلائی بوکھلائی سی میں اس نازک سی خوش اخلاق لڑکی کو دیکھ رہی تھی

یہاں اس گھر میں آئے کئی گھنٹے بیت گئے۔ آندھیاں اٹھیں اور اسے کھسوٹتے ہوئے چلی بھی گئیں، ویران راستے میں کیسے بگولے اٹھے اور پھر بیٹھ بھی گئے۔

اس لڑکی نے مجھے سب کچھ دکھایا "یہ کمرہ جوں کا توں ہے۔ اس پلنگ پر پڑی ہوئی چادر بھی وہی ہے۔ ویسی ہی گلابی۔ تکیے پردیکھیے اور دیواروں کا رنگ ویسا ہی ہلکا گلابی ہے۔ اور . . . اور یہ . . . سنگھار میز دیکھا آپ نے؟ . . . . . . یہ دیکھیے، اس آئینے پر چپکی ہوئی یہ چھوٹی سی سرخ رنگ کی بندیا، یہ شاید سنیتا دیدی کی ہے

میں ٹھہر کر دیکھنے لگی۔ سرخ رنگ کی وہ بندیا، جسے شادی کی پہلی یعنی سہاگ رات کو میں نے نیل پالش کی مدد سے چپکا دیا تھا . . . . . . میرے دل کی دھڑکنیں بڑھنے لگیں، آنکھوں تلے دھندلکا پھیلنے لگا۔ جی چاہا، ہاتھ بڑھا کر بندیا کو چرا لوں . . . . . .

اور یہ آنگن میں دیکھیے، گملے وہی ہیں۔ سنیتا دیدی کو جوہی کے پھول پسند تھے نا، میں ان پودوں میں ہر روز پانی دے دیتی ہوں۔ صبح و شام دونوں وقت دیکھیے کیسے لہلہا رہے ہیں، ان کے بیچ میں چھوٹے چھوٹے سفید سفید پھول کھلتے ہیں تو سارے گھر آنگن میں سنیتا دیدی کی من پسند خوشبو پھیل جاتی ہے۔

"آپ کو . . . . . . " وہ لڑکی رک گئی پھر میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔" آپ کو جوہی کے پھول اچھے لگتے ہیں نا۔؟"

"کیا ـــــ؟" میں چونک گئی . . . . میں نے کٹھور لہجے میں جواب دیا ـــــ "نہیں، بالکل نہیں . . . . . ."

"کیوں"؟ وہ لڑکی اچانک عجیب سوال کر گئی۔

کیوں؟ یہ کیا سوال ہے ـــ ایسا بھونڈا بے تکا! . . . . بے ہودہ سوال ہے۔ کیا اسے اس کا جواب دینا ہوگا۔

"چلو . . . . . . " میری گاڑی کا وقت ہو گیا ہے . . . . "

میں چلنے کو آمادہ ہو گئی۔

میں ڈرائنگ روم میں آگئی۔ میز سے پرس اٹھایا۔ جلدی جلدی اپنے آپ کو سمیٹا۔ وہ لڑکی خاموشی سے میرے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں آ کر میرے سامنے کھڑی تھی، ذرا دیر تک میرے چہرے کی اور دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔

"دیدی . . . . "۔ اس کی آواز بھرا گئی "بچی نہیں ہوں، ان پانچ برسوں میں ایک دن بھی مجھے اپنی زندگی جینا نصیب نہیں ہوا ہے۔ سایہ بن گئی ہوں . . . . . ."

"کسی کی پرچھائیں بن کر جینا کتنی بڑی سزا ہے۔ میں سنیتا دیدی کی پرچھائیں بن کر رہ گئی ہوں . . . . ایک دن کے لیے بھی وہ نہیں بھول سکے ہیں . . . . . ."

میں کھٹک گئی . . . . . . یہ کیا ہو رہا ہے . . . . . . یہ دیواریں کیوں گرنے لگی ہیں . . . . میں کیوں یہاں آئی؟ کس لیے؟"

بڑی مشکل سے الگ ہوتے ہوئے میں اٹھ کھڑی ہوئی . . . ."

تو . . . . تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں کوئی وہ نہیں . . . . . "

"میں کوئی سنیتا تو نہیں؟؟"

باہر شام کا افسردہ سایہ آہستہ آہستہ برس رہا ہے۔

حفنور سہوانی

(سانیٹ)

عروسِ ہند

عروس ہند کو رشکِ بتاں بنائیں گے
جڑیں گے مانگ میں تارے لگائیں گے مہندی
بھریں گے نین میں کاجل پنھائیں گے چوڑی
ہر ایک دشت کو ہم گلستاں بنائیں گے

نگاہ بھر کے جو دیکھے گا ایک بار اسے
ہمیشہ حسن کے نغمے اسی کے گائے گا
خیال اسی کا رہے گا جہاں بھی جائے گا
کوئی بھلا نہیں سکتا، بھائے گا یہ جسے

نہ ہو سکے گی زمانے سے ہمسری اس کی
یہ خوب تو ہے مگر خوب تر بنانا ہے
اسی کے حسن کا سکہ ہمیں چلانا ہے
ہر اک نگاہ میں بھر دیں گے دلبری اس کی

بہشت سے کہیں بڑھ کر اسے سجائیں گے
قسم خدا کی بڑا دل نشیں بنائیں گے

غزل

داصف نظامی، ظاہر پوری

وہ چن لیا جسے رشک قمر کہا جائے
اس انتخاب کو حسن نظر کہا جائے
رہے جو ساتھ اسے ہمسفر کہا جائے
تمہارے غم کو غم معتبر کہا جائے
وہ جس نے چھوڑ دیا ہم کو راہ میں تنہا
تمہیں کہو کہ اسے راہ بر کہا جائے؟
نہ جس کے دل میں ہو کچھ قدر آدمیت کی
بتائیے اسے کیوں کر بشر کہا جائے
فلک پہ جس کو سمجھتے ہو کہکشاں یارو!
کسی حسیں کی اسے رہ گزر کہا جائے
کچھ امتیاز نہ اچھے برے کا ہو جس کو
پھر ایسے شخص کو کیوں دیدہ ور کہا جائے
وہی جو ہمت پرواز سے رہے محروم
اسی کو طائر بے بال و پر کہا جائے
زمانہ عشق کی منزل کو لاکھ سہل کہے
مرے خیال میں دشوار تر کہا جائے

رضوان احمد خان

راجہ مہدی علی خاں کی مزاحیہ شاعری

اُردو کی مزاحیہ شاعری کے افق پر چاند تاروں کی کمی نہ تھی۔ میرؔ، سوداؔ اور جرأتؔ کی ہجویات، حسرتؔ کے لطائف، اکبرؔ کا طنز و مزاح، احمقؔ کی حماقتیں، ظریفؔ کی ظرافت، فرقتؔ کا مزاح اور واہیؔ کی 'واہیات' سے گلستانِ اردو زعفران زار تھا۔ پھر بھی، اسی افق سے ایک نیا ستارہ طلوع ہوا اور سب سے الگ تھلگ ایک خاص سمت میں بلند ہوتا گیا۔ اس نے اپنے لیے ایک ایسا مقام منتخب کیا جہاں سے وہ سب کو دیکھے اور سب اس کو دیکھیں۔ جہاں اس کی انفرادیت پر کوئی آنچ نہ آئے اور جہاں ہزاروں گردشِ فلک کے بعد بھی کسی چاند کا گزر ممکن نہ ہو کہ اس کی روشنی میں اپنی آب و تاب ماند پڑ جائے۔ اس نئے ستارے کو دنیا راجہ مہدی علی خاں کے نام سے جانتی ہے۔

راجہ مہدی علی خاں نے اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں نئے گل بوٹے کھلائے —— اکبرؔ نے اپنی ظرافت نگاری کی توجیہہ اس طرح کی تھی ؎

سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برف بار
شاہدِ معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

سرد موسم کی برف بار ہواؤں سے بچاؤ کے لیے اکبرؔ کو لحافِ ظرافت کا سہارا لینا پڑا کیونکہ کوئی بھی صاحبِ عقل و نظر دیدہ و دانستہ غلط باتوں سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ وہ حق بینی و حق گوئی سے کبھی نہیں چوکتا اور سچی بات چونکہ ہمیشہ تلخ ہوتی ہے اس لیے وہ اسے شیریں و دل نشیں بنا کر پیش کرتا ہے تاکہ وہ تلخی کام و دہن کو بلکہ کان و ذہن کو گوارا ہو سکے۔ اکبرؔ کے یہاں شیرینی کی یہ تہہ قدرے ہلکی ہے جس سے تھوڑا ہی سہی، تلخی کا احساس ہوتا ہے۔ اگرچہ اس دور میں بھی نزاکت کا یہ عالم تھا کہ ع

کان ان کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی!

پھر بھی، غالباً قوتِ برداشت اتنی باقی تھی کہ تھوڑی تلخی کا گوارا کر لینا ممکن تھا —— اکبرؔ کو گزرے ہوئے نصف صدی سے زائد ہوئے اور اب انسان کا ذہن اس درجہ تلخی کا متحمل ہونے کا بھی اہل نہ رہا۔ راجہ مہدی علی خاں کو اس بات کا احساس تھا چنانچہ انھوں نے شیرینی کی اس تہہ کو قدرے دبیز کر دیا اور گویا طنز کی نشتریت ANAESTHESIA کے زیر اثر ہو گئی۔ یہ بات الگ ہے کہ شیرینی کی یہ تہہ زود تحلیل پذیر اور ANAESTHESIA کا یہ اثر جلد زائل ہو جانے والا ہوتا ہے جس کے بعد انسان بہ آسانی یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ شے جو ابھی شیریں تھی، دراصل کتنی تلخ، اور وہ عمل جسے اس نے ہنستے ہنستے گوارا کر لیا تھا درحقیقت کیسا جانگسل تھا ——

اور یہی دراصل ان کی کامیابی ہے۔ وہ ہنسی ہنسی میں مطلب کی بات کچھ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ قاری کو سوچنا پڑتا ہے کہ بظاہر معمولی سا زخم دراصل کتنا گہرا ناسور ہے۔ ان کی نظم "ضرورتِ رشتہ اور تصویریں" سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں: ؎

پولس کپتان کی بیٹی ہے یہ اس سے نہیں ممی!
جہاں ڈانٹا پولس آ جائے گی فوراً، وہیں ممی!
ذرا "فوں فوں" کیا تو اپنے ڈیڈی کو بتا دے گی
یہ خود باہر رہے گی اور مجھے اندر کرائے گی
نہیں ممی! نہیں ممی!!

ممی کیا یہ وہی ہے جس کی تم ہو عاشق شیدا؟
یہ ہندی ہو کے کیوں انگلینڈ میں جا کر ہوئی پیدا؟

سونسبز پلیٹ میں ہے باپ، امریکہ میں ماں رکی | چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں اس کی

نہیں امی! نہیں امی!!

سنا ہے فلم میں بھی یہ حسینہ کام کرتی ہے | نہ جانے ایک دن میں کتنے دل نیلام کرتی ہے
جو ہیرو مل گیا کوئی، مجھے ولین بنا دے گی | یہ دو ہی چار سینوں میں مجھے گھر سے بھگا دے گی

نہیں امی! نہیں امی!!

دکن کی جادوگرنی آئی دام زلف کو کھولے | کہے قینچی کو "کینچی" اور قسم کو "خسم" بولے
قسم کھانے کے دھوکے میں "خسم" شاید یہ کھا جائے | مری امی! جوانی میں نہ مجھ کو موت آ جائے

نہیں امی! نہیں امی!!

غزالی آنکھ، چہرہ پھول، تتر ملی نواس کی | حسیں گالوں پہ دو دو تل ہیں اور نچلی کمر کی
ممی یہ سرو قد لڑکی نہیں میرے نصیبوں میں | یہ بٹ جائے گی فوراً شاعروں میں اور ادیبوں میں

نہیں امی! نہیں امی!!

کھڑی ہے ریگ ساحل پر امیر البحر کی پوتی | صراحی دار گردن میں ہیں کچھ مرجان کچھ موتی
مرے دل کے سفینے کو چٹانوں سے نہ ٹکرا دے | کسی ملاح سے مجھ کو سمندر میں نہ پھنکوا دے

نہیں امی! نہیں امی!!

ممی اب تو سمندر ہی میں پھینک آؤ یہ تصویریں | نہیں ڈالو مرے قدموں میں تم شادی کی زنجیریں
جو سچ پوچھو! یہ سب شادی نہ کرنے کے بہانے ہیں | مچلتا تیر ہوں سب لڑکیاں میرے نشانے ہیں
مجھے دنیا کی ہر لڑکی حسیں معلوم ہوتی ہے | ہر اک صورت مجھے سحر آفریں معلوم ہوتی ہے
اگر ان لڑکیوں میں سے ایک سے شادی کروں گا میں | یقیں ہے مجھ کو باقی کے لیے آہیں بھروں گا میں
کہو اب تم ہی امی! میں کروں گا کس طرح شادی | میں ڈیڈی کی طرح ہرگز "قناعت" کا نہیں عادی

ارے لڑکے! ارے لڑکے!!

آج کے معاشرے کا تقریباً ہر نوجوان ذہنی و نفسی طور پر بے صبری، بوالہوسی اور جنسی نا آسودگی کی جس منزل پہ ہے اس کی اتنی کامیاب ترجمانی، وہ بھی ایسے پرلطف انداز میں راجہ مہدی علی خاں ہی کا کام تھا۔ ایک معمولی سے فقرے "قناعت کا نہیں عادی" کے موزوں اور برمحل استعمال میں آج کے ہوس پیشہ اور نا آسودہ ذہن کا مکمل عکس موجود ہے اس کا دوسرا رخ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں:

یہ اچکن پہنے بیٹھے ہیں، غلط بولیں گے انگریزی | ہلاکو جیسی آنکھیں ہیں، نگاہیں ان کی چنگیزی
میں کوئی ملک ہوں جو مجھ پہ حملہ کرنے آئے ہو | میاں جاؤ! میں کل تلوار ہوں کیوں مرنے آئے ہو؟

نہیں چچیتے! نہیں چچیتے

وٹامن بی کی کچھ اس میں کمی معلوم ہوتی ہے | ارے اللہ نبض اس کی تھمی معلوم ہوتی ہے
میں بیٹ کرتی ہوں امی! ہو گا یہ بیمار برسوں سے | بچارہ مطمئن ہو گا کم از کم چار برسوں سے

نہیں امی! نہیں امی!!

نگاہیں نیچی نیچی، نام ہے اس کا لطیف احمد | خدایا توبہ تو یہ جسم ہے کتنا نحیف اس کا
مری نظروں کا پہلا تیر بھی یہ سہہ نہیں سکتا | یہ مر جائے گا بیچارہ، یہ زندہ رہ نہیں سکتا

چلو آگے! چلو آگے!!

یہ ایل ایل بی ہے پر اللہ بچائے ان وکیلوں سے | یہ ہر اک بات منوا لے گا قانونی دلیلوں سے
مجھے ڈائی ورس یہ بائی فورس دے سکتا ہے حیلوں سے | مرا گھر لوٹ لے گا قرقیوں سے اور اپیلوں سے

نہیں دیکھو! پرے پھینکو!!

یہ شاعر ہے، یہ ہر لڑکی کو آہیں بھر کے تکتا ہے | جب اکتا جائے گا، کہہ دے گا میرا ہم قدم میں سکتا ہے[1]
کرے گا شاعری دن بھر نہیں پیسہ کمائے گا | یہ بیکارہ کے راتوں کو گرہ مجھ پر لگائے گا

نہیں امی! نہیں امی!!

ارے یہ ڈاکٹر نبضیں حسینوں کی ٹٹولے گا | لگے گا دھڑکنیں دل کی، گریبانوں کو کھولے گا
شریک زندگی بن کر میں جینے کو ترس لوں گی | جو اس پر شک ہوا، میں ٹنکچر آیوڈین پی لوں گی

نہیں بابا! نہیں بابا!!

ممی اب بس کرو، بس بس! غلط ہیں سب یہ تدبیریں | محبت میں نہ کام آتی ہیں تصویریں نہ تقریریں
جو سچ پوچھو شراب عشق سب پ کرتی رہی ہوں میں | وہی اچھا ہے جس سے کورٹ شپ کرتی رہی ہوں میں

بہت اچھا! بہت اچھا!!

ہمارے سماج کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو کتب و رسائل پر پیسہ خرچ کرنا صرف بیجا سمجھتا ہے لیکن کتب بینی کو ضروری بھی اسی درجہ سمجھتا ہے۔ ایسے اشخاص مانگ کر کتابیں پڑھتے ہیں۔ ان میں بھی دو گروہ ہیں۔ ایک تو وہ جنہیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے اور دینے والے کو کتابیں کم از کم صحیح و سالم حالت میں واپس مل جاتی ہیں۔ مگر بڑا تکلیف دہ گروہ وہ ہے جو احساس ذمہ داری کو تکلف اور غیر ذمہ دارانہ انداز کو عین بے تکلفی سمجھتے ہوئے کچھ اس انداز میں سامنے آتا ہے:

یہ کلام حسانی؟ پہ گھی کی تھالی رکھی رہی تھی معاف کیجیے۔

---

[1] سکتہ

پھر اس پہ اک دن وہ ہنڈیا میری الٹ گئی تھی، معاف کیجیے!
"کلامِ داغ" آہ کتنے چوہے کے پیارے داغوں سے بھر گیا؟
اور اس میں سے اک حسین غزل میں نے پھاڑ لی تھی معاف کیجیے!
"کلامِ غالب" پہ غالب آئی تھی میرے بچوں کی بدتمیزی
ورق ورق ہو کے ہر غزل ان میں بٹ گئی تھی معاف کیجیے!
"کلامِ آزاد" جلد سے بھی آج آزاد ہو گیا ہے
کہ اس پہ سندوں میں چھینا جھپٹی سی ہو گئی تھی، معاف کیجیے!
"کلامِ آتش" باورچی خانے میں لے گئی تھی مری پڑوسن
ہر ورق پر حساب بنیے کا لکھ گئی تھی، معاف کیجیے!
"فسانۂ عبرت" پہ ذرا کھیر گر گئی تھی نہ آہیں بھریے
وہ کھیر جھٹ میں نے اپنے دامن سے پونچھ دی تھی معاف کیجیے!
"وہ بالِ جبریل" کھو گئی، لے گئے ہیں شاید اسے فرشتے
سنبھال کر در نہ طاقِ نسیاں پہ وہ رکھی تھی، معاف کیجیے!
"کلامِ اکبر" کو میرے اصغر نے چار آنے میں بیچ ڈالا
زیادہ پیسے نہیں ملے چونکہ پھٹ گئی تھی، معاف کیجیے!
"وہ شعلہ و شبنم" ایک مزدور مجھ سے یہ کہہ کے لے گیا تھا
کہ جوش نے یہ کتاب میرے لیے لکھی تھی، معاف کیجیے!

بہت حفاظت سے لائی ہوں یہ کتابیں اپنی سنبھال لیجیے
میں پڑھ چکی "نظم"، "نثر"، الماریوں سے مجھ کو نکال دیجیے

مزاح کا دار و مدار ناہمواریوں یا غیر معمولی پن پر ہے۔ یہی ناہمواریاں مزاحیہ شاعری کی جان ہوتی ہے۔ الفاظ کا الٹ پھیر، مشہور فقروں اور مصرعوں میں تھوڑی سی تحریف کے ساتھ ان کا اچانک اور غیر متوقع استعمال، مشہور اور سنجیدہ زمینوں میں غیر سنجیدہ بات کہہ جانا ہی راجہ صاحب کی نظموں کی وہ خصوصیات ہیں جن کے ذریعہ انہوں نے اپنی شاعری میں قہقہوں کے پھول بکھیرے ہیں۔ ان کی نظم "دستکِ نیم شب" ان ناہمواریوں کی اچھی مثال پیش کرتی ہے۔ ابتدا کے دو بند ملاحظہ ہوں:

کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول
اے مری روٹھی ہوئی بیوی ذرا منہ سے بول

رات کو دیر سے آنا مری عادت ہی سہی
مرا ہر عیب چھپانا تری فطرت ہی سہی
مری راحت کے لیے تھوڑی سی زحمت ہی سہی
حرفِ الفت نہ سہی حرفِ ملامت ہی سہی
شیریں آواز کا کانوں میں مرے اب رس گھول
کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

شک نہ کر مجھ پہ مری جان سے پیاری ممتاز
پڑھ رہا تھا کسی مسجد میں تہجد کی نماز
ایک ہی صف میں کھڑے تھے وہاں محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ وہاں تھا نہ کوئی بندہ نواز
میرے ہی گھر سے نہ کر ہائے مرا بستر گول
کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

غالب کا "مرثیۂ عارف" تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کا پہلا شعر یوں ہے ؎

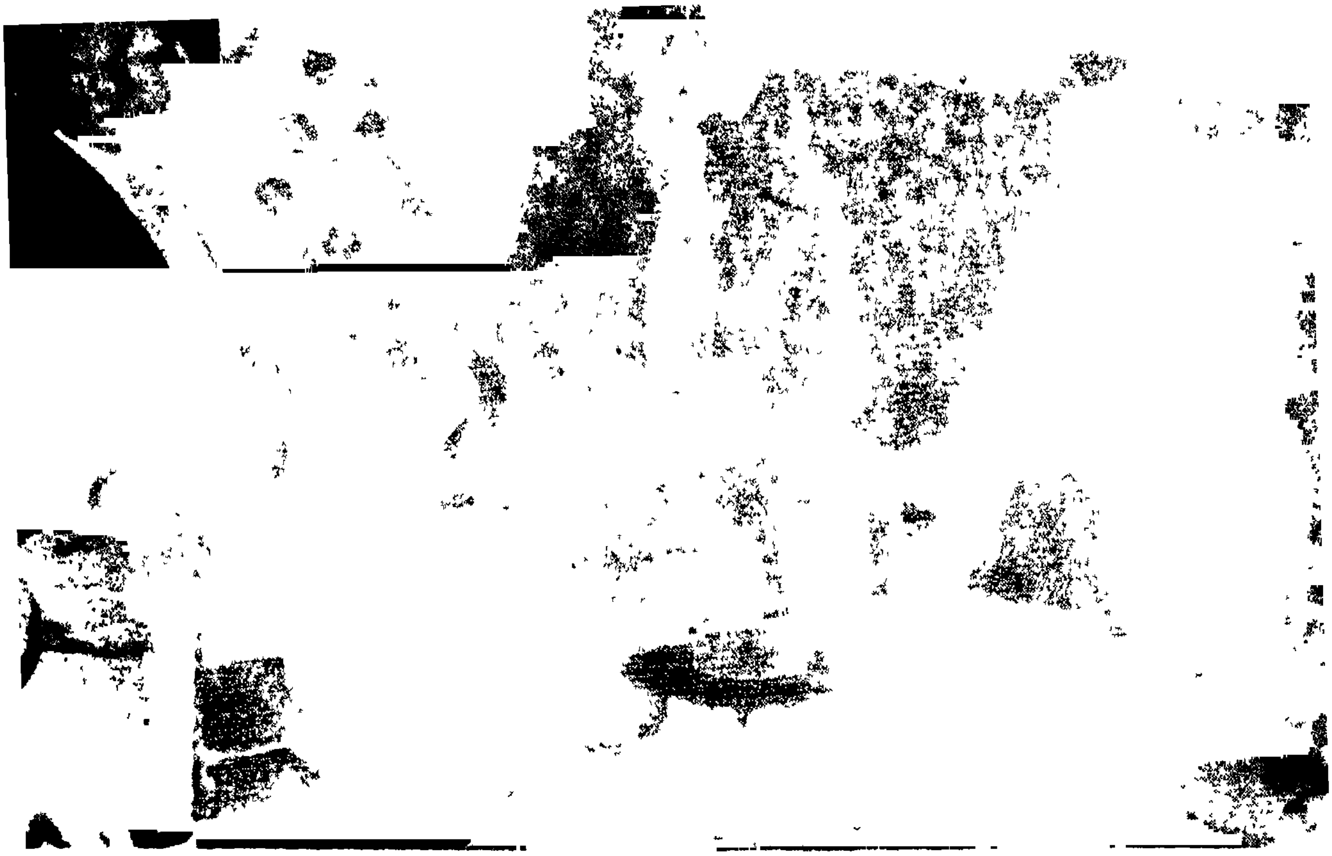
لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
کیوں اب گئے تنہا، رہو تنہا کوئی دن اور

راجہ صاحب کے سدا بہار ذہن نے اس کو یہ شکل دی ہے:-

"حکیم اسد اللہ خاں غالب اپنے مطب میں"

لازم تھا کہ پی لو مرا نسخہ کوئی دن اور — گھبرا گئے؟ پڑے رہو کھٹیا کوئی دن اور
سرمہ یہ میرے کاسہ ہوتا نہیں تیار — مر جاؤں گا پیسوں گا جو سرمہ کوئی دن اور

راجہ مہدی علی خاں کی شاعری طنزیہ کم، مزاحیہ زیادہ ہے۔ انھیں الفاظ کے استعمال پر پوری قدرت تھی۔ ساتھ ہی انھیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ہنسی کا خزانہ کہاں پوشیدہ ہے اور اس کی کلید کیونکر ہاتھ آسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ہنسی پیدا کرنے کی کوشش کہیں نہیں ملتی بلکہ ان کا قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ شاعر اسے عمداً و ارادتاً ہنسنے کی ترغیب نہیں دے رہا ہے بلکہ وہ تو ایک بات کہہ رہا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ قاری خود گدگدی محسوس کرے اور ہنسنے پر مجبور ہو۔ اور مزاحیہ شاعری کی معراج در اصل یہی ہے۔

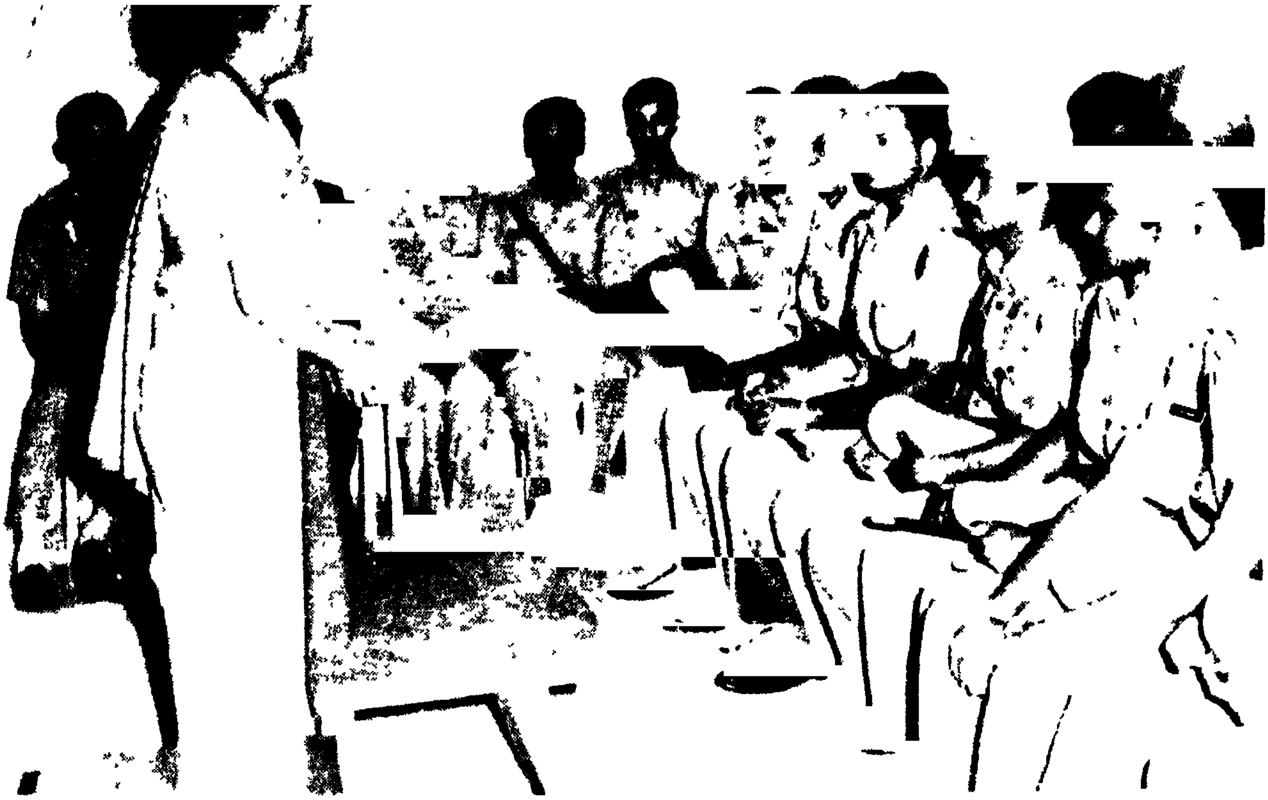


صدر جمہوریہ شری فخرالدین علی احمد اپنے حالیہ دورہ جکارتہ کے دوران استانا مرڈیکا میں انڈونیشیا کے
صدر جنرل سہارتو سے محو گفتگو

بیگم عابدہ احمد نے نئی دہلی میں ۲۰ جون ۱۹۷۵ء کو ینگ ومن کرسچین ایسوسی ایشن کی صد سالہ سالگرہ
تقریبات کے موقع پر محکمہ ڈاک وتار کے جاری کردہ ایک یادگاری ڈاک ٹکٹ کا اجرا کیا یہ تصویر اسی
موقع کی ہے



تصویر میں گلوریا بنرجی، ڈائرکٹر پوسٹل سروسز بیگم عابدہ احمد کو ڈاک ٹکٹوں کا ایک البم پیش کر رہی ہیں



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی ۲۱ جولائی ۱۹۷۵ء کو نئی دہلی میں اپنی جائے رہائش پر آئی۔ پی۔ ایس۔ پروبیشنرس کو خطاب کرتے ہوئے

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی ۹ جولائی ۱۹۷۵ء کو نئی دہلی میں اپنی جائے رہائش پر اخبار کے کچھ ایڈیٹروں سے محو گفتگو ہیں

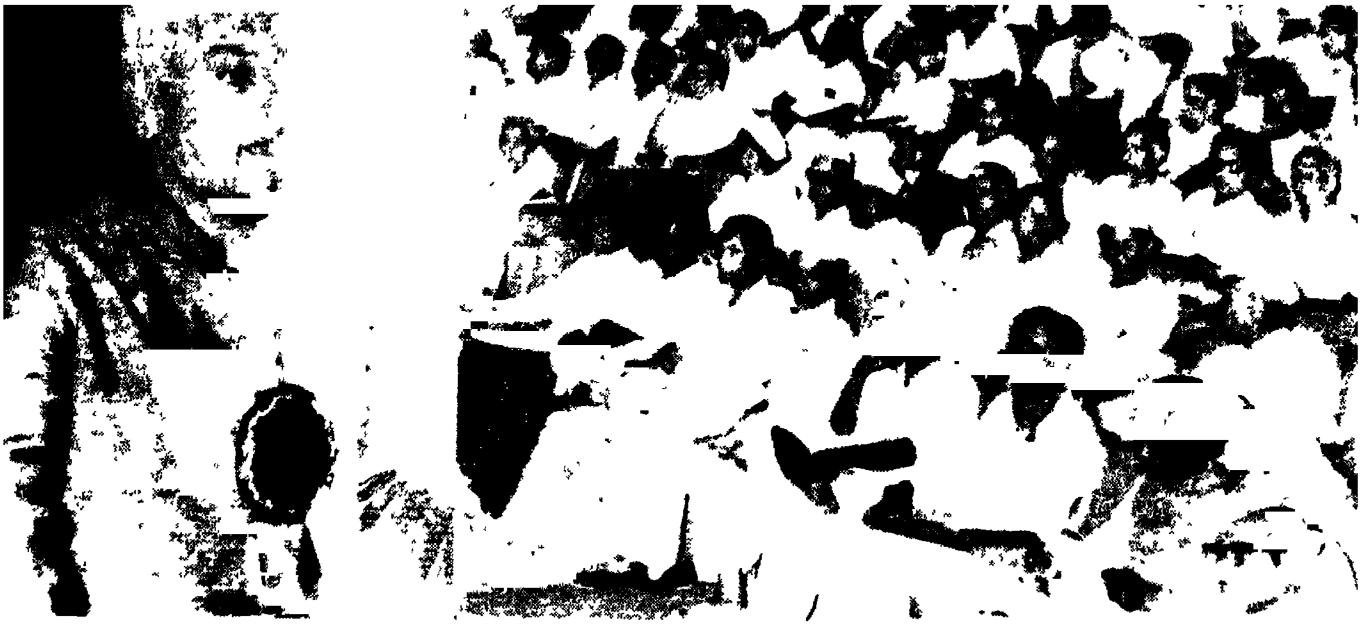








بیہ ، وزیر اعلا شری ہیم وتی نندن بہوگنا ۴ر جون ۱۹۷۵ء کو لیس ڈاؤن
ضلع پوڑی میں لوسا کے زیر اہتمام ایک عام جلسے کو خطاب کر رہے ہیں
سطامیں) وزیر اعلا شری ہیم وتی نندن بہوگنا ۲۹ر جون ۱۹۷۵ء کو تلک بال لکھنؤ
میں کابینہ کے ممبران اور اعلیٰ افسروں کو خطاب کرتے ہوے
نیچے) وزیر اعلا شری ہیم وتی نندن بہوگنا ۲۱ر مئی ۱۹۷۵ء کو لال بارہ دری
لکھنؤ میں للت کلا اکاڈمی کے شائع کردہ سہ ماہی رسالہ کی رسم اجرا
ادا کر رہے ہیں



وزیر مالیات شری نارائن دت تیواری ۲؍جولائی کو روبند رالیہ لکھنؤ میں اتر پردیش امداد باہمی کانفرنس کے اختتامی جلسہ میں تقریر کر رہے ہیں

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے دفتر واقع نئی دہلی سے ۱؍جولائی کو پولیس نے بعض مہلک ہتھیار اور فوجی وردیاں برآمد کیں جو تصویر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔



مہندر پرتاب گڈھو

کارِ آئینہ سازی

اٹھائیں جام اٹھائیں! بنامِ آزادی
کہ اپنے ہاتھوں میں ہے اب نظامِ آزادی
یہ صبح آئی ہے سو جنتیں سجائے ہوئے
بڑھیں خلوص کا ہم بھی علم اٹھائے ہوئے
ہر ایک گام پہ تعمیر کا کریں در باز
کہ اور دانش ذہنِ بشر ہو سر افراز
نکھاریں صنعتی منصوبہ بندیوں کا نظام
دلوں سے دور کریں شورشِ غم و اوہام
ہمیشہ ہاتھوں میں ہو علم و ہوش کا دامن
حیات اپنی ہو امن و سکون کی ضامن
کسی بھی ذہن میں پلنے نہ دیں ریاکاری
رہے نہ ملک میں باقی کسادِ بازاری
نہ ہو ثقافتی آئینہ سازیوں کا ظہور
ہر ایک ذہن ہو تخریب کے فریب سے دور
حیات جھومتی، گاتی ہو، مسکراتی ہو
ہر ایک گام پہ تعمیر گنگناتی ہو
عبور کرتے چلیں کلفتوں کا ہر دریا
قدم نہ روک سکے کوئی درد کا صحرا
سیاہ راتوں کے کوہِ گراں گراتے جائیں
ہم اپنے خونِ جگر سے دیے جلاتے جائیں

ہے ایک بارِ امانت یہ صبحِ آزادی
سنبھالنا ہے اسے کارِ آئینہ سازی

مفتوں کوٹوی

نذرِ آزادی

درخشاں ہے زمانے میں ہمیں سے شانِ آزادی
شہیدوں کے لہو سے سرخ ہے عنوانِ آزادی
گلستانِ وطن میں رنگِ لالہ کیف افزا ہے
جواہرات و موتی سے ہے پُر دامانِ آزادی
ہوئے ہیں اور بھی آزاد، راہِ ہند پر چل کر
کئی ملکوں کے سر پر ہے ہند کا احسانِ آزادی
ہے دل میں شوقِ تعمیرِ وطن، وہ ماند کیونکر ہو
کہ ہم سب جانتے ہیں بس یہی ہے جانِ آزادی
ہمارا ملک ہے اب گامزن راہِ ترقی پر
خدا کا شکر ہے پورا ہوا ارمانِ آزادی
ہوئے ہیں جوش افزا شاعرانِ ملک کے نعرے
انھیں نعروں سے پیدا ہو گیا عرفانِ آزادی
بلندی وہ ملے اے کاش احساسِ ترقی کو
کرے بھارت کا ذرّہ ذرّہ خود اعلانِ آزادی
سنور جائے ہماری یک دلی سے زندگی ساری
نکھر جائے محبت سے ہماری شانِ آزادی
ہماری صنعت و حرفت نے کیا ارتقا پایا
حقیقت میں یہی ہے ملک کا عرفانِ آزادی
اڑان ایسی بھری اونچی، خلا میں ہم بھی جا پہنچے
بلندی نظر اپنی ہے یہ، شایانِ آزادی
مرے اشعار یہ مفتوںؔ، خلوصِ دل سے نکلے ہیں
مری یہ نذر ہے پیشِ شہنشاہانِ آزادی

اخلاق اثر

احتشام حسین اور مدھیہ پردیش

پیغامات اور تاثرات

[آپ حضرات جو حلقۂ ارباب ادب کا سالانہ اجلاس کر رہے ہیں وہ اس بات کا جواب ہے کہ ادب موجود ہے ہر عہد کے ادب میں جمود ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ اگر ادیب زندگی کے مسائل سے دست و گریباں ہیں تو جمود نہیں رہ سکتا پہلے زمانے میں یہ کام انفرادی بنیاد پر مقابلہ اور مسابقت کی وجہ سے ہوتا تھا، آج تنظیم کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ہم ادب میں ترقی پسندی کے نقطۂ نظر کو صحیح سمجھتے ہیں تو ہمیں منظم ہوئے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی مجھے خوشی ہے کہ آپ حضرات ایسے حلقہ کی سالانہ مجلس کر رہے ہیں تاکہ ایک بار پھر وسیع ترین ادبی اور سماجی بنیادوں پر انسانوں کی ادبی خدمت کرنے کا عہد کریں۔ میں آپ کی کامیابی کا دل سے خواہش مند ہوں ——— احتشام حسین] ۔

ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر ذاکر حسین کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ "اردو والوں کا کوئی کام سرور اور احتشام کے بغیر نہیں چل پاتا"[1] اور لکھا ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں اصحاب کے بغیر اردو کا کوئی ادارہ اور کوئی کمیٹی مکمل نہیں ہوتی۔ وہ گجرال کمیٹی کے مختلف شہروں کے دوروں کے وقت احتشام حسین کو شدت سے یاد کرتے ہیں۔ احتشام حسین سے محبت کرنے والوں اور عقیدت رکھنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے اور ان کی تحریروں میں یہ محبت اور عقیدت مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ حال ہی میں قاضی عبدالستار کی تحریروں نے احتشام حسین کی یاد تازہ کر دی۔ وہ سجاد ظہیر کو دیکھ کر لکھتے ہیں "کتنے ہی بوڑھے حسین آدمیوں کا خیال آ گیا۔ لیکن ان کا ذکر نہیں کر سکتا کہ ان میں سرفہرست تو احتشام صاحب ہیں اور احتشام صاحب کے نام کے ساتھ صیغۂ ماضی کا استعمال کرتے ہوئے ہاتھ کانپنے لگتا ہے۔ ہڈیاں سرد ہونے لگتی ہیں ——— اور آنسو! . . . . آنسو کیسی تو قلم چلے"[2] اور اورنگ آباد سمینار میں ان کے "سایہ" عاطفت کی محرومی سے خود کو "غیر محفوظ" سمجھتے ہیں۔

"اورنگ آباد سمینار کا تیسرا اور آخری اجلاس تھا۔ لسانی غیرت اور اپنے نصب العین کی حمیت کی سرشاری نے کبھی اس طرح بے قرار نہیں کیا تھا جس طرح میں اس سمینار میں بے قرار ہوا۔ اس سے قبل کسی ایسے سمینار میں شریک نہ ہوا جس میں دوسری زبانوں کے ماننے ہوئے اہل قلم موجود ہوں۔ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کے اجلاس میں صرف ہندی کے ادیبوں کا ہجوم تھا۔ لیکن وہاں لسانی کمتری کا گزر ممکن نہ تھا کہ احتشام صاحب کی موجودگی کا سایہ ہمارے سروں پر قائم تھا۔ ان کے علم کا

---

[1] احتشام حسین کچھ بھولی بسری یادیں۔ ڈاکٹر گیان چند۔ فروغ اردو (احتشام حسین نمبر) ص ۴۰

[2] سفر ہے شرط . دنین سمینار، ایک رپورتاژ) قاضی عبدالستار۔ کتاب اگست ستمبر ۱۹۷۴ء ص ۳۶

منارۂ نور روشن تھا۔ اُن کی زبان کی تلوار بے نیام اور بے امان تھی اور ہم صرف موجود اور محظوظ ہونے پر اکتفا کرتے تھے لیکن اورنگ آباد میں کون تھا؟[1] احتشام حسین یاد ہیں اور یاد رہیں گے۔ وہ ان خوش نصیبوں میں سے ایک تھے جن کی اپنی زندگی میں بہت قدر و منزلت ہوئی اور ان سے فیض حاصل کرنے والوں نے ادب میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ برصغیر میں ادب کی بڑی اور چھوٹی، اہم اور غیر اہم ادبی سرگرمیوں میں احتشام حسین سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ ان کے مشوروں پر عمل کیا جاتا تھا۔ ان کے پیغامات بالکل رسمی اور سرسری نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ ان کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ زندہ قومیں اپنے مشاہیر کے ایک ایک حرف اور ایک ایک لمحہ کو محفوظ کرتی ہیں۔ اس پس منظر میں پروفیسر آفاق احمد کے مشورے کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"بھوپال کے ادبی حلقوں کو احتشام صاحب سے اتنی ارادت و عقیدت تھی کہ وہ اپنے سالانہ اجلاس، افتتاح یا کسی رسالے کے اجراء کے موقع پر ان سے نیک تمنائیں اور دعائیں بھیجنے کی ضرور درخواست کرتے تھے۔ اور اہم بات یہ ہے کہ احتشام صاحب نے انھیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ اپنی مصروفیات کے لمحوں میں سے کافی وقت دیتے اور محض رسمی پیغامات پر اکتفا نہ کرتے بلکہ اس میں بڑے حتمی مشورے دیتے اور کام کی باتیں بتاتے۔ کاش یہ ممکن ہو سکے کہ ہندوستان بھر میں مختلف اداروں اور رسائل و جرائد کو بھیجے ہوئے ان کے پیغامات اور مختلف جلسوں میں کی ہوئی تقاریر کو یکجا کر کے شائع کیا جا سکے۔"[2]

حمیدیہ کالج، بھوپال کی "بزم ادب" کے لیے احتشام حسین کا پیغام حاصل کیا گیا تھا۔ احتشام حسین نے یہ پیغام ۲۰ راگست ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ سے تحریر فرمایا جو "بزم ادب" کے جلسہ میں پڑھا گیا اور یکم جنوری ۱۹۵۲ء کو گورنمنٹ حمیدیہ کالج میگزین کے "اردو سیکشن" میں شائع ہوا۔ اس وقت میگزین کی مدیر[3] صفیہ اختر تھیں۔ احتشام حسین نے تحریر فرمایا تھا:

"مجھے بے حد مسرت ہے کہ حمیدیہ کالج بھوپال کی "بزم ادب" اپنے سالانہ ادبی سفر پر رواں ہو رہی ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ جو سفر پہلے خوش گوار ہوا کرتا تھا اب مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ راہ کی دشواریوں کے ساتھ ساتھ ہمسفروں کی بے دلی بھی اس کا سبب بن گئی ہے لیکن علمی اور ادبی کام کرنے والوں کے جوش اور ذوق کو دیکھ کر یہ خیال مایوسی کی شکل اختیار نہیں کرنے پاتا بلکہ یقین ہوتا ہے کہ اگر کچھ لوگ بھی ہمت سے کام لیتے رہیں تو راہ کی دشواریوں پر قابو پانا مشکل نہ ہوگا۔ اگر آپ میں زبان و ادب کی خدمت کا سچا اور صحت مند جذبہ موجود ہے تو آپ یقیناً منزل تک پہنچیں گے۔

طلباء کی ادبی انجمنوں کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر ہمیں اپنے مطالعہ کی سمت نہ معلوم ہو تو محض جوش اور ولولہ ناکافی ہوتا ہے۔ اس وقت جذبات کو غلط راہوں پر ڈالنے والے بہت سے عناصر کام کر رہے ہیں۔ مذہبی تنگ نظری اور فرقہ وارانہ تعصب ہے۔ ایک دوسرے سے لاعلمی ہے، تہذیب کے متعلق غلط نظریات ہیں، زبانوں کے سلسلہ میں غلط فہمیاں ہیں۔ ادب اور زندگی کے تعلق کے بارے میں واضح اور متوازن نقطۂ نظر کا فقدان ہے۔ یہ ساری باتیں نوجوان طلباء کے رائے قائم کرنے کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ ایسی حالت میں محض جوش سے کام نہیں چل سکتا۔ غور و فکر اور سنجیدہ مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اور اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اپنی تنقید سختی سے اور دوسروں کی تنقید ہمدردی سے کی جائے۔ جو طلباء اس کو اپنا مطمح نظر بنائیں گے وہی سچا ادبی کام کر سکیں گے۔ یہی میرا پیغام ہے[4]۔"

جب یہی بزم اپنی زندگی کی دسویں سال میں داخل ہوئی تو اس

---

[1] سفر ہے شرط ..... (تین سیمینار ایک رپورتاژ) قاضی عبدالستار کتاب اگست ۷۴ء ص ۵۲ [2] رسمی گفتگو۔ پروفیسر آفاق احمد شاہکار (احتشام حسین نمبر) نومبر دسمبر ۷۳ء ص ۱۹۴ [3] میگزین میں نگراں کی جگہ مدیر لکھا گیا ہے۔ اور طالب علم کو نائب مدیر کی حیثیت دی گئی ہے۔ [4] گورنمنٹ حمیدیہ کالج میگزین یکم جنوری ۱۹۵۲ء ص ۴ عنایت کردہ پروفیسر آفاق احمد۔

موقع کے لیے پیغام میں احتشام حسین نے تحریر فرمایا:

"اگر بزم ادب طلبا میں مطالعہ کا ذوق پیدا کر سکے تو میں اس کو اس کی سب سے بڑی کامیابی قرار دوں گا۔ کیونکہ طالب علم کی زندگی کا بنیادی پتھر یہی ہے۔ اس کے بغیر اس کے مضامین، بحث مباحثوں میں تقریری مقابلے، شعر و شاعری ہر ایک میں کھوکھلا پن نظر آئے گا۔ پھر ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ مطالعہ محض نشہ بن جائے بلکہ تحقیقی و تنقیدی ہو کہ جو کچھ پڑھا جائے وہ زندگی کا جزا بن جائے[1]۔"

"حلقۂ ارباب ادب" شہر بھوپال بلکہ مدھیہ پردیش کی ایک اہم اور متقتدر ادبی انجمن ہے۔ پروفیسر حسن مسعود اور آفاق احمد نے ۱۹۵۴ء میں اس انجمن کی چوتھی سالانہ کانفرنس کی۔ ظ۔ انصاری کی صدارت میں اس کانفرنس کا افتتاح ہوا اور اس کے فوراً بعد احتشام حسین کا ۲۰ اگست کا لکھا پیغام پڑھا گیا۔ انھوں نے تحریر فرمایا تھا:

"آپ حضرات جو حلقۂ ارباب ادب کا سالانہ اجلاس کر رہے ہیں وہ اس بات کا جواب ہے کہ ادب میں جمود ہے۔ ہر عہد کے ادب میں جمود ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ اگر ادیب زندگی کے مسائل سے دست و گریباں ہے تو جمود نہیں رہ سکتا۔ پہلے زمانے میں یہ کام انفرادی بنیاد پر مقابلہ اور مسابقت کی وجہ سے ہوتا تھا، آج تنظیم کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ہم ادب میں ترقی پسندی کے نقطۂ نظر کو صحیح سمجھتے ہیں تو ہمیں منظم ہوئے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ حضرات اپنے حلقہ کی سالانہ مجلس کر رہے ہیں تاکہ ایک بار پھر وسیع ترین ادبی اور سماجی بنیادوں پر انسانوں کی ادبی خدمت کرنے کا عہد کریں۔ میں آپ کی کامیابی کا دل سے خواہش مند ہوں[2]۔"

گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال کی "بزم ادب" اور بھوپال کے "حلقۂ ارباب ادب" کے علاوہ انھوں نے کالج کے مجلّوں کے لیے بھی پیغامات تحریر فرمائے۔ سیفیہ کالج بھوپال کے میگزین کے لیے احتشام حسین کا پیغام مندرجہ ذیل تھا:

"آپ اس کی فکر کیجیے کہ زیادہ تر مضامین اور نظمیں طلبا ہی کی ہوں ادھر ادھر سے مانگ کر چیزیں جمع کرنا تجارتی رسائل کے لیے چھوڑ دیجیے۔ اگر ایسا ہی ہو تو زیادہ تر بھوپال کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شامل کیجیے تاکہ آپ کے رسالے کی علاقائی خصوصیت بھی نمایاں رہے[3]۔"

مُلّا فخر الدین، سکریٹری سیفیہ کالج ایجوکیشن سوسائٹی بھوپال کی عنایت اور دل چسپی کی وجہ سے اردو کا میگزین "مجلہ سیفیہ" کے نام سے ۶۱-۱۹۶۲ء میں علیحدہ شائع ہوا۔ اس کے لیے احتشام حسین نے الہ آباد سے پیغام روانہ فرمایا جس میں تحریر تھا:

"یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ سیفیہ ڈگری کالج میں اردو کا رسالہ "مجلہ سیفیہ" الگ شائع ہو رہا ہے۔ اردو کی انفرادیت کا تقاضہ بھی یہی تھا اور سچ پوچھیے تو موجودہ سیاست کے اس طوفان میں جب کبھی اردو کو ہندی کا ایک روپ یا شیلی کہہ کر، کبھی اس کا رسم خط مٹا کر، کبھی اس پر قوم دشمن ہونے کا الزام لگا کر جو حملے کیے جا رہے ہیں ان سب کا مقصد یہی ہے کہ اسے ایک غیر اہم زبان ثابت کیا جائے اور اس طرح اس کی انفرادیت کو ختم کر دیا جائے اس وقت ہمارا ـــــ اور ہم اردو کے نام لینے والوں کا یہ فرض ہے کہ اس کی ان خصوصیات کو نمایاں کریں جو قومی زندگی میں اس کی جگہ بناتی ہیں۔ ان عناصر کو ابھاریں جو اتحاد و اتفاق کی بنیادوں کو استوار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارا قدیم ادب بھی غالباً دوسری زبانوں کے ادب سے پیچھے نہیں تھا۔ موجودہ ادب تو اس کا ایک زندہ نشان ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ کا مجلّہ بھی اس کی آئینہ داری کرے اور ایسی تخلیقی اور تنقیدی چیزیں پیش کرے جو ہر طرح کی تنگ نظری سے پاک ہوں۔ میں رسالے کی کامیابی کا دل سے خواہش مند ہوں[4]۔"

---

[1] احتشام صاحب۔ آفاق احمد۔ مہارانی لکشمی بائی گرلس کالج میگزین، بھوپال [2] مکتوب احتشام حسین بنام پروفیسر آفاق احمد، صدر شعبہ اردو مہارانی لکشمی بائی گرلس کالج بھوپال [3] روشنی گھٹ گئی ـــــ پروفیسر آفاق احمد۔ شاہکار (احتشام حسین نمبر) نومبر-دسمبر ۱۹۷۲ء ص ۱۹۵

[4] مجلہ سیفیہ۔ جلد اول۔ (۶۱-۱۹۶۲ء) ص ۱۲

مجلّہ سیفیہ" میں ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر ابو محمد سحر اور پروفیسر آفاق احمد جیسے نامور محققین اور ناقدین کی تحریریں شائع ہوئیں اور انھوں نے "مجلّہ سیفیہ" کو "علاقائی کردار" عطا کیا۔

"اردو کو بھوپال کی علاقائی زبان کی حیثیت دلانے کے لیے ۸ راگست ۱۹۵۴ء کو بھوپال اسٹیٹ اردو کنونشن منعقد ہوا تھا اس موقع کے لیے بھی احتشام حسین سے پیغام کی درخواست کی گئی تھی اور انھوں نے تحریر فرمایا تھا:

" اس وقت جو صورتِ حال ہے اس میں اردو کے لیے ہر جدوجہد کا خیر مقدم کرنا فرض سمجھتا ہوں اور اس کا ہر کارکن عزیز ہے۔ بھوپال میں تو ایک طویل زمانہ سے اردو کی ایک روایت ــــــ زندہ روایت رہ چکی ہے جو فرقہ پرستی، تنگ نظری اور دل آزاری سے ہمیشہ دور رہی اگر اردو سے محبت کرنے والوں نے انھیں خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر اردو کو مادری زبان ماننے والوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کی تو مجھے یقین ہے کہ کامیابی ہوگی۔ میں اپنی بہترین تمناؤں کے ساتھ مبارک باد کا پیغام بھیجتا ہوں[1]"

احتشام حسین ادبی حلقوں میں اپنی تحریروں اور تقریروں کی وجہ سے بہت مقبول تھے۔ انھیں بار بار زحمت سفر دی جاتی اور وہ بھی مصروفیات سے وقت نکال کر مختلف علاقوں کا سفر کرتے۔ ۲۳ نومبر ۱۹۶۴ء کو اردو لٹریری سوسائٹی، سیواسدن کالج، برہان پور کے زیر اہتمام دو ادبی نشستیں ہوئی تھیں[2]۔ پہلی ادبی نشست میں انھوں اردو زبان و ادب پر تقریر فرمائی تھی اور دوسری ادبی نشست میں مشاعرہ کی صدارت بھی فرمائی تھی اور اپنا کلام بھی سنایا تھا[3]
انھوں نے پہلے ادبی جلسہ کے بارے میں تاثرات قلم بند کیے۔ تحریر فرمایا:

" اردو لٹریری سوسائٹی سیواسدن کالج برہان پور کے کارکنوں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ارباب کالج، اساتذہ اور شہر کے سربرآوردہ حضرات کے تعاون سے ۲۳ نومبر کو ایک کامیاب جلسہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مختلف سیاسی اور مذہبی خیالات رکھنے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے سب نے مل کر اس جلسہ کو کامیاب کیا۔ اس میں جہاں اردو زبان کی ہر دلعزیزی کو دخل ہے وہیں کارکنوں کی انتھک کوششوں کا ہاتھ بھی ہے۔
مجھے سوسائٹی کے کارکنوں سے صرف یہ کہنا ہے کہ اگر ہم دوسری زبانیں بولنے والوں کو اردو کی مٹھاس، ترقی پسندی اور اتحاد و دوستی کا یقین دلا سکیں تو ہمیں اس سے زیادہ کامیابی ہوگی جتنی اردو کے لیے نالہ و فریاد کرنے سے ہو سکتی ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں اردو کو زندہ رکھنے کا طریق کار بھی بدل جانا چاہیئے آپ کو اپنے گرد و پیش کی مختلف زبانوں سے دل چسپی لینا چاہیے تاکہ دوسرے آپ کی زبان سے دل چسپی لیں[4]۔"

برہان پور میں قیام کے دوران احتشام حسین صاحب جنتا لائبریری بھی تشریف لے گئے اور اپنے تاثرات قلم بند کیے تھے:

" مجھے آج جنتا لائبریری برہانپور کے دیکھنے کا موقع ملا مسرت بھی ہوئی اور حیرت بھی کہ کسی سرمایہ دار کی سرپرستی اور حکومت کی قابل ذکر امداد کے بغیر یہ لائبریری یہاں کے ہندی اور اردو پڑھنے والوں کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کر رہی ہے اور بڑی خوش سلیقگی سے شائقین علم کی پیاس بجھا رہی ہے۔ میری تمنا ہے کہ یہ لائبریری اور ترقی کرے اور نہ صرف برہان پور کی قدیم علمی روایات کو تازہ کرے بلکہ موجودہ ضروریات کو پورا کرنے کی اہل بھی بن سکے[5]"

بھوپال میں قیام کے دوران احتشام حسین ۳ راکتوبر ۱۹۵۷ء کو اقبال لائبریری تشریف لے گئے تھے اور دل کو چھونے والے تاثرات تحریر فرمائے تھے:

---

[1] رپورٹ بھوپال اسٹیٹ اردو کنونشن منعقدہ ۸ راگست ۱۹۵۴ء ص ۳۳ عنایت کردہ پروفیسر اطہر راہی صدر شعبہ اردو، وکرم یونیورسٹی، اجین [2] سرجن سواسدن کالج برہان پور کا سالانہ ۶۵-۱۹۶۴ء ص ۲۳: عنایت کردہ مولوی معین الدین صاحب برہانپور [3] بیان جناب اقبال نصیب صاحب (برہانپور) [4] سرجن سواسدن کالج برہانپور کا سالانہ رسالہ ۶۵-۱۹۶۴ء ص ۵ [5] عنایت کردہ حاجی صلاح الدین صاحب برہان پور۔

"مجھے مسرت ہے کہ اقبال لائبریری کے دیکھنے اور اس کے عملہ سے ملنے کا موقع ملا۔ ایسی لائبریریاں میرے لیے ایک تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتی ہیں جن سے قوم کے شعور کا افق روشن ہوتا ہے، اور مطالعہ کا شوق زندگی کے نہاں خانے میں جھانکنے کا موقع دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتب خانہ زیادہ سے زیادہ عوام کی خدمت کرے گا اور ایسی ترقی کرے گا کہ بھوپال کا دل بن جائے۔
دستخط [illegible] [1]

احتشام حسین 'اقبال لائبریری' بھوپال دیکھنے کے تقریباً دس سال بعد 'نیشنل اردو پرائمری اسکول، چھاؤنی، منگلوارہ، بھوپال' تشریف لے گئے تھے۔ انھوں نے یکم اکتوبر ۱۹۶۷ء کو تحریر فرمایا:

"مجھے آج نیشنل اردو پرائمری اسکول آکر بے حد مسرت ہوئی۔ کہنے کے لیے یہ مختصر سا اسکول ہے لیکن کام کی ابتدا ہمیشہ اسی طرح ہوتی ہے۔ جذبہ، لگن، اور کام کرنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے، یہ چیزیں مجھے یہاں نظر آئیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب میں دوبارہ آؤں گا تو اس اسکول کے درجات میں ترقی ہو چکی ہوگی اور یہ مرکز بن کر دوسرے علاقوں کے لیے شمع ہدایت بنے گا۔" [2]

احتشام حسین کے پیغامات اور تاثرات بڑی اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے۔ بقول پروفیسر آفاق احمد ان میں "مخلصانہ مشورے" اور "کام کی باتیں" ہوا کرتی تھیں۔ ہم ادب کو شخصیت کا اظہار کہیں یا ہم ادب میں شخصیت سے فرار کے نظریہ کو اپنائیں اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ادب میں شخصیت کے اظہار اور شخصیت سے فرار کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ جہاں تک احتشام حسین کے پیغامات اور تاثرات کا تعلق ہے ان میں احتشام حسین کی شخصیت اور ان کے تصورات کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ اور ان کی شخصیت اور تصورات کے سمجھنے میں یہ پیغامات اور تاثرات بہت مدد کرتے ہیں۔

۲۰ اگست ۱۹۵۱ء کو احتشام حسین اردو کے ناسازگار ماحول سے متفکر تھے۔ ان کے نزدیک اس زمانے میں ادبی سفر، جو پہلے "خوشگوار" تھا۔ اس وقت "مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ "راہ کی دشواریاں" اور اردو دوستوں کی "بے دلی تھی"۔ ۲۰ اگست ۱۹۵۴ء کو وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ "ادب میں جمود ہے" اور "اگر ادیب زندگی کے مسائل سے دست و گریباں ہیں تو جمود نہیں رہ سکتا"۔ ان کے نزدیک یہ کام پہلے "انفرادی بنیاد" پر ہوتا تھا اور "آج تنظیم" کی بنیاد پر۔ وہ انسانوں کی ادبی خدمت "وسیع ترین ادبی اور سماجی بنیادوں" پر چاہتے تھے۔ احتشام حسین اردو کی قومی زندگی میں اہمیت اور قومی یکجہتی کی خصوصیات کو نمایاں کرنا اپنے اور دوسروں کے لیے "فرض" سمجھتے تھے اور ہر قسم کی تنگ نظری سے دوری پسند کرتے تھے۔ ۲۲ نومبر ۱۹۶۴ء کو احتشام حسین اردو کے ناسازگار ماحول سے بے خبر نہیں تھے۔ انھیں سیوا سدن کالج برہانپور کے طلبا، اساتذہ اور اردو دوستوں کا طریقہ کار پسند آیا۔ انھیں خوشی ہوئی کہ "مختلف سیاسی اور مذہبی خیالات رکھنے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے سب نے مل کر اس جلسہ کو کامیاب کیا۔" وہ اس کامیابی کو اردو کی "ہر دلعزیزی" اور "کارکنوں کی انتھک محنت" کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس موقع پر اردو سوسائٹی کے کارکنوں کو مشورہ دیا کہ وہ دوسری زبانوں کے بولنے والوں کو "اردو کی مٹھاس، ترقی پسندی اور اتحاد و دوستی کا یقین" دلائیں۔ ان کے نزدیک "نالہ و فریاد" کرنے سے زیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ اردو دوستوں کو مشورہ دے رہے تھے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسری زبان بولنے والے اردو میں دلچسپی لیں تو آپ کو مختلف زبانوں سے دلچسپی لینا چاہیے۔ وہ "بدلے ہوئے حالات میں" بدلے ہوئے طریقہ کار کا مشورہ بھی دے رہے تھے۔

احتشام حسین یکم اکتوبر ۱۹۶۷ء کو نیشنل اردو پرائمری اسکول تشریف لے گئے تو اس "مختصر اسکول" کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ کام کی ابتدا ہمیشہ اسی طرح ہوتی ہے جس میں کام کرنے

---

[1] عنایت کردہ جناب محمد عمر انصاری صاحب، بھوپال

[2] رہنمائی پروفیسر قاسم نیازی، صدر شعبہ فارسی، حمیدیہ کالج، بھوپال

والوں کے جذبہ اور لگن سے ترقی ہوتی ہے اور بعد میں یہ کوششیں دوسرے علاقوں کے لیے شمع ہدایت" بنتی ہیں "اردو کنونشن" اور دوسری قسم کی جدوجہد میں کامیابی کے لیے وہ فرقہ پرستی، تنگ نظری اور ملّا زادی سے دور رہنا ضروری سمجھتے تھے۔ پبلک لائبریری کی اہمیت سے احتشام حسین واقف تھے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو اقبال لائبریری بھوپال کو دیکھ کر انھوں نے لکھا کہ "ایسی لائبریریاں میرے لیے ایک تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتی ہیں جن سے قوم کے تصور کا افق روشن ہوتا ہے اور مطالعہ کا شوق زندگی کے نہاں خانوں میں جھانکنے کا موقع دیتا ہے۔" ۲۳ نومبر ۱۹۶۴ء کو انھوں نے برہانپور کی جنتا لائبریری دیکھی جہاں اردو ہندی کی کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ انھیں خوشی تھی کہ وہ لائبریری "ہندی اردو پڑھنے والوں کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کر رہی" تھی۔ احتشام حسین چاہتے تھے کہ کتب خانہ عوام کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے۔ اقبال لائبریری بھوپال دیکھ کر انھوں نے یقین کا اظہار کیا تھا کہ کتب خانہ عوام کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے گا اور "بھوپال کا" دل بن جائے گا ——"دھڑکتا ہوا دل"۔

کالجوں کی بزم ادب یا ادبی انجمنوں کے بارے میں بھی احتشام حسین نے اظہار خیال فرمایا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ طلبا میں "جوش ولولہ" کے علاوہ "مطالعہ کی سمت" کا تصور بھی ہونا چاہیے۔ "غلط راہوں" پر چلنے سے گریز کرنا چاہیے۔ "مذہبی تنگ نظری"، "فرقہ وارانہ تعصب" "تہذیب کے متعلق غلط نظریات" اور "زبان" کے متعلق غلط فہمیوں" سے دور رہنا چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ "متوازن نقطۂ نظر" کی کمی ہے۔ اس لیے احتشام حسین نے طلبا کو مشورہ دیا کہ انھیں اپنے مطالعہ کی ان "رکاوٹوں" کو دور کرنا چاہیے۔ وہ ادبی انجمن کے ممبران میں ادبی سرگرمیوں کے لیے "محض جوشش" کو ناکافی اور "غور و فکر اور سنجیدہ مطالعہ" کو ضروری سمجھتے تھے۔ ادبی انجمنوں میں تنقید کے معیار اور ماحول کے بارہ میں ان کا خیال تھا کہ "اپنی تنقید کچی سے اور دوسروں کی تنقید ہمدردی سے کی جائے۔" "ادبی کام" کے لیے یہی ان کا مشورہ تھا۔

احتشام حسین کا خیال تھا کہ بزم ادب کا سب سے بڑا کام طلبا میں "مطالعہ کا ذوق" پیدا کرنا تھا۔ کیونکہ وہ اسے طلبا کی زندگی کا بنیادی تجربہ سمجھتے تھے جس کے بغیر مضامین، بحث مباحثوں میں تقریری مقابلے، شعر و شاعری ہر ایک میں کھوکھلا پن "نظر آتا ہے۔ وہ مطالعہ کو "محض نشہ" بنا دینا کافی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک مطالعہ "تحقیقی، تنقیدی ہو کہ جو کچھ پڑھا جائے وہ زندگی کا جز بنے۔"

کالجوں کے مجلّوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان میں طلبا کی تخلیقات ہی شائع ہونا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ مقامی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سے رسالوں کی "علاقائی خصوصیت" نمایاں کرنا انھیں گوارہ تھا۔ مگر دوسری جگہوں سے حاصل کی ہوئی تخلیقات کو کالجوں کے مجلّوں کے لیے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ کالجوں سے شائع ہونے والے اردو کے علیحدہ مجلّوں کو بھی پسند کرتے تھے اور اسے "اردو کی انفرادیت کا تقاضہ" سمجھتے تھے۔

احتشام حسین نے مدھیہ پردیش کے مختلف علاقوں میں بہت سے پیغامات ارسال فرمائے تھے۔ ان میں سے کچھ حاصل ہو سکے ہیں اور باقی کی تلاش جاری ہے۔ ان کے مطالعہ سے احتشام حسین کے اردو میڈیم اسکولوں، پبلک لائبریروں، کالجوں کی ادبی انجمنوں اور دوسری ادبی انجمنوں، کالجوں کے مجلّوں اور "اردو کنونشن" کے بارے میں ان کے تصورات ملتے ہیں۔ کالجوں اور اسکولوں کے طلبا، اساتذہ اور اردو دوستوں کے لیے ان کے پیغامات اور تاثرات میں بڑی بصیرت ہے۔ ان کے مطالعے سے احتشام حسین کے علمی اور ادبی تصورات پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی روشنی میں ادبی سفر کامیابی سے طے کیا جا سکتا ہے۔

★

اختر بستوی

جشنِ یومِ آزادی

یوم آزادی کا یہ جشنِ مسرت دوستو
دے رہا ہے جھومنے گانے کی دعوت دوستو
ذہن و دل سے دور کر کے ساری کلفت دوستو
آؤ ہاتھوں میں اٹھا لیں سازِ عشرت دوستو
آج کے دن ہم نے پائی تھی غلامی سے نجات
آج کے دن غاصبانِ ملک نے کھائی تھی مات
آج کے دن خوں کی سرخی لائی تھی رنگِ حیات
آج کے دن ہند میں آئی تھی خوشیوں کی برات
آج کا دن ہر برس لاتا ہے پیغامِ سرور
آج لازم ہے کہ ہر جانب ہو جشنِ رنگ و نور
آج احساسِ الم کیونکر رہے ہم سے نہ دور
آج سینوں میں ہمارے ہے مسرت کا وفور
آؤ یارو گائیں ناچیں مست ہوں دھومیں مچائیں
انبساط و لطف کا ہر سمت اک طوفاں اٹھائیں
محفلیں عیش و طرب کی گوشے گوشے میں سجائیں
آج یوم جشن ہے، جی کھول کر خوشیاں منائیں

ہاں مگر اے دوستو اس کا بھی رکھنا ہے خیال
ہم کو جس نعمت نے بخشا ہے یہ خوشیوں کا ابال
یعنی آزادی کی وہ دولت، نہیں جس کی مثال
ہو نہ ہم لوگوں کی غفلت کے سبب سے پائمال
یوں تو اس دولت کے ڈاکو سیکڑوں باہر بھی ہیں
کچھ لٹیرے اس کے لیکن ملک کے اندر بھی ہیں
جو بظاہر بے ضرر ہیں، امن کے پیکر بھی ہیں
دامنوں میں جن کے، پوشیدہ مگر خنجر بھی ہیں
اپنی اس دولت کو ان سب سے بچانا ہے ہمیں
داؤں پر اس کے لیے سب کچھ لگانا ہے ہمیں
اس کو جو خطرہ بھی لاحق ہو، مٹانا ہے ہمیں
ثابت و سالم اسے رکھ کر دکھانا ہے ہمیں
تا کہ آنے والی نسلیں بھی یہ دولت پا سکیں
دہر میں "آزاد" کہلانے کی عزت پا سکیں
جشنِ آزادی منانے کی سعادت پا سکیں
یہ خوشی، یہ شادمانی، یہ مسرت پا سکیں

عبد المتین نیاز

اے ماں

(اے ماں)
اَے دھرتی اے ماں
تیری مٹی سے سنورے ہیں ہم سارے انساں
ذرہ ذرہ سونا تیر اندیاں ساگر چاندی
تیری ممتا نے بخشی ہے کھیتوں کو ہریالی
تیرے تن سے لوگ بچھڑیں دنیا کی ہر مستی
تونے سب کے دکھ پر وارے اپنے سکھ ارماں
اے دھرتی اے ماں
تیرا سینہ چیر کے پائے ہم نے ہیرے موتی
تونے ہمیں پہچان بنایا اس آدھونک یگ کی
تو ہے کرم شکتی ماتا تو شکتی کی جیوتی

تیرے آگے شیش نوائیں محنت کش انساں
اے دھرتی اے ماں
ہم تیرے ہونٹوں کو ہمیشہ امن ترانے دیں گے
دشمن کو پل بھر بھی نہ کوئی گھات لگانے دیں گے
تیرا دودھ رہے جب تک تن میں آنچ نہ آنے دیں گے۔
ہم تجھ پہ واریں گے خود کو ہم ہوں گے قرباں
اے دھرتی اے ماں

ڈاکٹر سخاوت شمیم

ھم

زمانے بھر کی نگاہوں میں سرفراز ہیں ہم
سبھی یہ کہتے ہیں مخلص ہیں، غم نواز ہیں ہم
ہمیں نے آدمیت کے اصول اپنائے
ہمیں نے درد کے رشتوں کا احترام کیا
زمانے بھر کو اخوت کا اک سبق دے کر
ہمیں نے امن کو ہر دور میں سلام کیا
ہمیں نے جادۂ الفت پہ گامزن ہو کر
خلوص و مہر و محبت کو تازگی بخشی
ہر ایک لمحہ گواہی یہ آج دیتا ہے
ہمیں نے وقت کی قدروں کو زندگی بخشی
زمانے بھر میں سیاست کی دھوم ہے ایسی
ہر ایک لب پہ ہمارا ہی نام ہوتا ہے
ہماری سمت عقیدت سے آنکھ اٹھتی ہے
ہمارا ذکر بصد احترام ہوتا ہے
اگر روایت دوراں کو برقرار رکھا
تو ہم پہ کوئی بھی انگلی اٹھا نہیں سکتا
اسی روش پہ جو چلتے رہے زمانے میں
ہمیں نظر سے کوئی بھی گرا نہیں سکتا

وجاہت علی سندیلوی

(افسانہ)

غیر ضروری آدمی

ٹرین میں غیر معمولی بھیڑ تھی۔ لطیف احمد نے رات کا بیشتر حصہ کھڑے کھڑے یا اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ٹرنکوں یا بستر بندوں پر بیٹھ کر گذارا تھا۔ ہردوئی اسٹیشن پر کچھ مسافروں کے اتر جانے سے اسے ایک برتھ پر ذرا سی جگہ مل گئی تھی اور وہ بیٹھا اونگھنے لگا تھا لیکن جب چارباغ اسٹیشن پہونچنے سے قبل ٹرین پٹریاں بدلنے لگی تو اس کے ہچکولوں سے وہ پوری طرح جاگ اٹھا اور جلدی سے اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھا کر کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں پلیٹ فارم پر موجود ہجوم میں اپنے لڑکے شریف احمد اور حنیف احمد کو تلاش کرنے لگیں لیکن ان میں سے اسے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ ٹرین رک گئی اور وہ چند لمحے اور کمپارٹمنٹ کے دروازے پر سے اپنی متلاشی نظریں اِدھر اُدھر دوڑاتا جاتا تھا لیکن پھر پیچھے سے مسافروں کے ریلے نے اُسے نیچے اتر آنے کے لیے مجبور کر دیا۔ وہ جلدی سے اس بھیڑ کے درمیان سے نکل گیا جو ٹرین کے پاس جمع ہو گئی تھی اور ذرا سی کھلی جگہ میں کھڑا ہو کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اس جگہ پر کھڑے ہونے سے اگر وہ لڑکوں کو نہ بھی دیکھ پایا تو وہ خود ہی اسے دیکھ کر اس کے پاس آ جائیں گے۔ لیکن وہاں تو اس کے استقبال کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔ سیکڑوں آدمیوں کی موجودگی میں اسے پلیٹ فارم کسی ریگستان کی طرح سنسان معلوم ہوتا تھا۔

دفعتاً رات بھر جاگنے اور بڑی تکلیف سے کھڑے یا بیٹھے رہنے سے اسے جو تھکاوٹ ہوئی تھی وہ ایک دم سے اس پر طاری ہو گئی جیسے کسی بلی نے کوئی غافل چڑیا دبوچ لی ہو۔ وہ دماغ میں سنسناہٹ، آنکھوں میں جلن اور ہاتھ پیروں میں کربناک اینٹھن محسوس کرنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں اس کے چہرے پر اپنے لڑکوں سے اسٹیشن پر ملنے کی امید میں جو بشاشت تھی وہ ختم ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بجھ سی گئیں اور ان کے گرد سیاہ حلقے کچھ زیادہ سیاہ اور گہرے نظر آنے لگے۔ اس پر تھکن اور مایوسی کی ایک گھٹا سی چھا گئی۔ یوں تو وہ شہر جا کر تھوڑی ہی دیر میں اپنے لڑکوں، لڑکی، بہوؤں، داماد اور ان کے بچوں سے جا کر مل جائے گا لیکن وہ اس احساس اور کوفت کے بوجھ کے نیچے دبا جا رہا تھا کہ وہ لوگ اُسے اب ایک غیر ضروری آدمی تصور کرتے ہیں اور اس کو لینے کے لیے اسٹیشن پر آنا ایک بیکار کی تکلیف سمجھتے ہیں۔ اُسے یاد آیا کہ جب اس کے لڑکے باہر سے گھر آتے تو وہ ان کو خوش آمدید کہنے ٹرین کے وقت سے پہلے ہی اسٹیشن پہونچ جایا کرتا اور ایک دفعہ جب حنیف الہ آباد سے کسی مقابلے کے امتحان میں شریک ہو کر واپس آ رہا تھا اور گاڑی چھ گھنٹے لیٹ ہو گئی تھی تو اس نے قریب قریب ساری رات اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹہل کر کاٹ دی تھی۔ اس نے سوچا غالباً یہ نئی پود کے بچے نہیں جانتے کہ تھوڑا سا رکھ رکھاؤ، اخلاص اور ذاتی دلچسپی کا اظہار انسانوں کے درمیان کتنا بڑا سہارا اور بھروسہ پیدا کر کے ان کے تعلقات کو کس قدر محبت آمیز اور خوشگوار بنا دیتے ہیں، اور ان کو کتنی تلخیوں اور کدورتوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

وہ سر جھکائے بوجھل قدموں سے ویٹنگ روم کی طرف بڑھا۔ درمیان میں اس نے ایک چائے والے سے ایک کلہڑ میں چائے خریدی اور اسے پھونک پھونک کر پینے لگا۔ پھر ایک دم سے اسے خیال آیا کہ کہیں اس وقت اس کے لڑکے اور داماد جنھیں کچھ دیر ہو گئی ہو، نہ آ جائیں

اور اسے اس طرح چائے پیتے دیکھ کر اپنی سبکی محسوس کرنے لگیں لہٰذا اس نے چائے کا آخری گرم گھونٹ فوراً ہی اپنے حلق میں انڈیل لیا اور جلدی سے خالی کلہڑ کو ریل کی پٹریوں پر پھینک کر ویٹنگ روم میں چلا گیا۔ غسل خانے سے نئے صاف کپڑے پہن کر وہ باہر نکلا تو اس نے حجام سے داڑھی بنوائی۔ پالش والے سے اپنے جوتوں پر پالش کرائی۔ آئینے میں اس نے اپنی صورت دیکھی تو اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ساٹھ سال کی عمر میں اور اتنی پریشانیاں اور مصیبتیں جھیلنے کے بعد بھی وہ کافی وجیہہ اور جوان دکھتا اور اسے کسی طرح بھی اپنے بڑھاپے یا کسی قسم کی ذہنی یا جسمانی کمزوری کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن پھر ایک دم سے جیسے آئینے میں سے اس کے عکس نے چیخ کر کہہ دیا ہو "غیر ضروری آدمی" اور وہ تلملاتا ہوا بجھ کر رہ گیا۔ وہ آئینے کے پاس سے ہٹ آیا اور اپنا سوٹ کیس اٹھا کر ایک کونے میں پڑی آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

آج اس کے بڑے لڑکے ڈاکٹر شریف احمد کے گھر پر اس کی تیرہ سالہ پوتی تنویر کی امتحان میں کامیابی کے سلسلے میں کافی دھوم دھام اور چہل پہل ہوگی۔ اسی میں شرکت کے لیے اس کا چھوٹا لڑکا حنیف احمد مع بیوی کے چھٹی لے کر آیا ہوا ہے۔ اس کی لڑکی یاسمین اور شوہر کلیم الدین اور اس کے بچے بھی پہلے سے پہنچ گئے ہیں۔ لیکن اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی ہے۔ وہ آیا ہی کیوں؟ وہ تو ایک غیر ضروری آدمی ہے جیسے ڈرائنگ روم سے باہر رہ گزر کی دیوار پر ٹنگی ہوئی کوئی پرانی تصویر جسے دیکھتے ہی دیکھتے سب تھک چکے ہوں اور جس کے در و دیوار پر ٹنگے رہنے دیئے جانے کا صرف یہ سبب ہو کہ اسے اتار کر رکھنے کے لیے کوئی دوسری جگہ سمجھ میں نہ آتی ہو۔

اس نے اپنی جیب سے اپنی عینک اور ایک پوسٹ کارڈ نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔ ایک بار، دو بار، کئی بار۔

لکھنؤ ۱۸ جون۔ پیارے ابا جان۔ آداب، امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ تنویر سلمہا ہائی اسکول کے امتحان میں میرٹ لسٹ میں آئی ہے۔ اس خوشی میں ایک پارٹی ۲۳ جون کو ہوگی۔ میں، فردوس، یاسمین آپا اور کلیم بھائی پہونچ چکے ہیں — آپ ۲۲ کی شام کی ٹرین سے روانہ ہو کر یہاں ۲۳ کو سویرے پہنچ سکتے ہیں۔ اور اس طرح اس خوشی کے موقعے پر ہم سب اکٹھا ہو جائیں گے۔ بھائی صاحب بہت مصروف ہیں اور اسی لیے وہ آپ کو خود نہیں لکھ سکے۔ آپ کو اسنوفیلیا کی جو شکایت ہو گئی تھی وہ غالباً اب بالکل دور ہو چکی ہوگی۔ یہاں سب لوگ آپ کو سلام کہتے ہیں۔

آپ کا بیٹا

حنیف

اس نے خط کو پلٹ کر دیکھا۔ ڈاکخانے کی مہریں بہت صاف لگی ہوئی تھیں۔ لکھنؤ ۲۰ جون۔ مراد آباد ۲۲ جون۔ اس نے پوسٹ کارڈ کو توڑ مروڑ کر اس کی ایک گولی بنائی اور پاس کی خالی آتش دان میں پھینک دی۔ کرسی پر ایک تھکے ہوئے انسان کی طرح لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی ٹانگیں اس کے بازوؤں پر پھیلا دیں۔ دیکھنے میں وہ آرام کر رہا تھا لیکن واقعتاً وہ بڑے انہماک سے سوچ رہا تھا۔

آج اس کی اولاد بھی اس کو ایک غیر ضروری آدمی سمجھتی ہے۔ اس آدمی کو جس نے دوسروں کی خدمت میں اپنی خود کی زندگی بسر ہی نہیں کی۔ بچپن پریشانیوں میں گزرا۔ باپ چھوٹے زمیندار تھے۔ لیکن وہ موروثی قرضوں اور مقدمہ بازیوں میں ساری جائداد تلف کر بیٹھے تھے۔ وہ ابھی تعلیم بھی مکمل نہیں کر پایا تھا کہ اسے اپنی بیمار ماں اور مفلوج باپ کے علاج کے لیے اور اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے ٹیوشن کرنا پڑے۔ دق کی مریض ماں کا علاج محلے کے ایک نیم حکیم ہی تک محدود رہا اور وہ بیچاری ختم ہو گئی۔ کچھ سال بعد باپ مرے تو دو جوان بیٹیاں شادی کرنے کے لیے چھوڑ گئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ خود اس کی شادی کر کے ایک تند خو بیوی کا طوق اس کی گردن میں ڈال گئے۔ بڑی کوشش اور محنت کے بعد اسے ایک معقول ملازمت مل گئی۔ بیوی اور بہنوں میں آئے دن خانہ جنگی رہتی اور نشانۂ ملامت وہ بنتا۔ بالآخر بیوی کے ہاتھ پیر جوڑ کر کچھ اس کا زیور اور سامان اور کچھ قرض ادھار لے کر اس نے یکے بعد دیگرے اپنی دونوں بہنوں کی شادیاں کر دیں۔ اس نے حتی الوسع اپنی یتیم بہنوں کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی

لیکن انھیں یہی خیال رہا کہ وہ زن مرید ہے۔ لہٰذا اپنی شادیوں کے بعد وہ اسے ایک غیر ضروری آدمی سمجھنے لگیں اور اس کی محبت اور ہمدردی کا جواب ہمیشہ بے رخی اور بے تعلقی سے دیا۔

شریف کو فرصت نہیں تھی کہ وہ باپ کو خط لکھ سکے۔ اُس باپ کو جس نے میڈیکل کالج میں اس کے داخلے کے لیے اپنا گھر دس فی صدی سود پر رہن رکھ دیا تھا اور پھر جتنے دنوں میں وہ ڈاکٹر بنا تھا گھر میں شاید ہی کوئی اچھی چیز پکی ہو یا کوئی نیا کپڑا بنا ہو۔ اور ابھی شریف کی تعلیم جاری ہی تھی کہ حنیف بی۔اے اور یاسمین ایم۔اے میں آگئی تھی۔ دونوں علی گڑھ میں ہوسٹل میں تھے اور ان کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اسے نہ صرف اپنا آدھا گھر کرایہ پر اٹھانا پڑا تھا بلکہ دن بھر دفتر میں سر مغزی کرنے کے بعد رات کو تین گھنٹے کے لیے ایک سیٹھ جی کے یہاں ان کے حسابات لکھنے کے لیے نوکری بھی کرنا پڑی تھی۔

اس کی اس جان لیوا جد و جہد کے درمیان اسے اپنی بیوی سے کبھی کوئی داد یا ہمت افزائی نہیں ملی تھی۔ وہ اس کے پلّے پڑ جانے پر ہمیشہ اپنے نصیبوں کو روتی رہی اور اس سے اپنے ان زیورو‌ں اور سامان کا تقاضہ کرتی رہی جو اس نے اپنی بہنوں کو دیدیے تھے۔ وہ اپنے اخراجات میں کبھی کوئی کمی نہ کرتی اور ساری نفس کشی اور پتّہ ماری صرف اس کے لیے چھوڑ دی تھی لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود اس نے اپنے بچّوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے اور ان کا رہن سہن اس طرح قائم رکھنے میں کہ وہ اپنے ہم چشموں میں ذلیل نہ ہوں کبھی دریغ نہیں کیا تھا۔ اس کا کوئی بھی بچہ ماہ بماہ مصارف کے علاوہ کسی غیر معمولی ضرورت کے لیے اگر روپے کی فرمائش کر بیٹھتا تو وہ خواہ گھر کی کوئی چیز بیچتا خواہ اپنے شناساؤں سے دس دس بیس بیس روپے قرض لیتا وہ اس کو پورا ضرور کر دیتا۔

اور پھر جب دونوں لڑکے تعلیم ختم کرکے برسرِ روزگار ہو گئے اور اس نے بڑی جفاکشی اور توہین آمیز پریشانیاں اٹھانے کے بعد قرض ادا کرکے اپنا مکان واگزار کرا لیا تو پھر یاسمین کی شادی کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی بیوی نے اس سے کہا بھی کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے بیٹوں سے مدد مانگے لیکن اُس کی غیرت نے اُسے گوارا نہ کیا۔ اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی ان کو اپنے اپنے کاموں سے لگے دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو ان کے پاس کچھ ہو۔ اس نے ان کو بتائے بغیر اپنے مکان کو دوبارہ رہن رکھ دیا اور اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے بھی کچھ روپیہ نکال لیا اور اپنے ارمان اور حوصلے کے لیے نہیں بلکہ محض اس خیال سے کہ سسرال میں وہ ہلکی نہ سمجھی جائے اس نے اپنی اوقات اور حیثیت سے زیادہ جہیز دے کر اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ اور پھر جلد ہی اس نے اپنے لڑکوں کی انھیں کی پسندیدہ لڑکیوں کے ساتھ شادی کر دی تھی اور اس سلسلے میں ساری زیر باری کو نفسی خوشی برداشت کر لیا تھا اور غیر شعوری طور سے اسے یہ ایک امید موہوم پیدا ہو چلی تھی کہ شاید اب وہ پریشانیوں کے جنگل سے نکل آیا ہے۔ جوانی بیت گئی تو کیا ہوا اس کا بڑھاپا تو اس کی بیوی بچوں کی عقیدت اور محبت کی چھاؤں میں اطمینان سے گزرے گا۔ لیکن یہ چھاؤں تو افلاس اور مشقت کی تپتی ہوئی دھوپ سے بھی زیادہ اذیت ناک ثابت ہو رہی تھی۔

تنویر کی کامیابی کی اسے اطلاع دینے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ حنیف اور یاسمین کو پہلے سے اطلاع دے دی گئی لیکن اس کو عین وقت پر ۱۸ کو خط لکھا گیا اور وہ بھی چونکہ ایک غیر ضروری آدمی کے نام تھا لہٰذا ۲۰ تک اس کو ڈاک میں ڈالنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ وہ تو کہیے کہ ڈاکخانے والوں کی مہربانی تھی جو اسے ۲۲ کی سہ پہر میں یہ خط بھی مل گیا تھا۔ اور پھر اسے بلایا کہاں گیا تھا۔ اسے تو صرف آنے کی اجازت دی گئی تھی "آپ ۲۲ کی شام کی ٹرین سے روانہ ہو کر یہاں ۲۳ کو سویرے پہونچ سکتے ہیں" وہ ایک غیر ضروری آدمی ہے نا۔

یاسمین اور لڑکوں کی شادی کے بعد وہ پھر قرضہ ادا کرنے کی چکّی پیسنے پر مجبور ہو گیا تھا اور جب وہ خدا خدا کرکے قرض ادا کرکے اپنا مکان پھر واگذار کرا پایا تھا تو اس کا ریٹائرمنٹ ہو گیا۔ اس کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے چند ہی ماہ بعد اس کی بیوی بھی چل بسی تھی۔ غالباً اسکے بچوں کی تعلیم اور تربیت پوری کر دینے اور ان کو زندگی میں جگہ دلوا دینے اور پھر خود کمانے کے قابل نہ رہ جانے کے بعد وہ اپنی بیوی کے لیے بھی جو اب تک گھر کی ہر پریشانی کا ذمے دار اُسی کو سمجھتی ایک غیر ضروری آدمی ہو گیا تھا اور وہ اسے اس وقت جبکہ اُسے کسی کی رفاقت کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، اکیلا اور تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

اس کی بند آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک کر اس کے گالوں پر آگئے۔ اس نے رومال نکال کر انھیں پونچھا اور پھر فوراً کھڑے ہو کر اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور ویٹنگ روم سے انکوائری آفس یہ پوچھنے کے لیے چل پڑا کہ مرادآباد واپس جانے کے لیے اسے سب سے پہلی ٹرین کون سی مل سکتی ہے۔ لیکن انکوائری آفس کے قریب ہی اسے پلیٹ فارم سے باہر جانے کا دروازہ نظر آیا۔ اس نے سوچا "میں بھاگوں کیوں؟ میں اپنے لڑکوں کا کوئی دست نگر نہیں ہوں۔ مجھے پنشن کے ڈیڑھ سو اور اپنے مکان کے کرایے کے دو سو روپے ملتے ہیں جو میری اکیلی جان کے لیے کافی ہیں۔ میں آج انھیں کچھ کھری کھری باتیں سناؤں گا تاکہ ان کی بھی آنکھیں کھل جائیں کہ آج کا غیر ضروری آدمی ان کے لیے کبھی کتنا ضروری تھا۔ میں نے آج تک اپنی بساط بھر اپنے بچوں کی ہر خواہش پوری کی ہے تو پھر اس وقت ان کی کسی لعن طعن پر ان تمام قربانیوں پر جو میں نے اب تک ان کے لیے کی ہیں ٹھوکر مار کر چلا جاؤں؟ میں جانتا ہوں کہ شریف کو مجھ سے شکایت ہے کہ جب اسے یونیورسٹی سے ولایت جانے کے لیے وظیفہ ملا تھا تو میں باقی روپے کا انتظام نہیں کر سکا اور اس کا یہ ارمان پورا نہیں ہو سکا تھا۔ حنیف اور یاسمین مجھے کنجوس اور تنگ نظر سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اور ادنیٰ ترین زندگی بسر کر کے پیسہ جمع کر رہا ہوں۔ لیکن میرا ضمیر صاف ہے۔ میرے پاس انکی نادانی کا کوئی علاج نہیں۔ بہرکیف میں اپنی طرف سے انھیں یہ کہنے کا موقع کیوں دوں کہ میں ان کی کسی خوشی میں شریک نہیں ہوا۔"

وہ پلیٹ فارم سے باہر نکل آیا۔ رفیوجی مارکیٹ سے اس نے بچوں کے لیے کچھ پھل، بسکٹ اور ٹافی خریدی۔ قریب ہی اسے اپنا جانا پہچانا ایک ریسٹوراں نظر آیا۔ اسے بھوک بھی لگی تھی اس نے کھانا کھایا اور رکشے پر بیٹھ کر ڈاکٹر شریف احمد کی کوٹھی کے لیے روانہ ہو گیا۔

کوٹھی پر پہنچا تو گیارہ بج رہے تھے۔ یہ کوٹھی شریف کے مرحوم خسر ڈاکٹر عبدالجبار اپنی پریکٹس کے ساتھ اپنی اکلوتی بیٹی زیبا کو جو خود بھی ڈاکٹر اور شریف کی شریک زندگی بننے سے پہلے اس کی ہم جماعت بھی رہ چکی تھی دے گئے تھے۔ کوٹھی پر نئی پالش، صاف ستھرا لان پھولوں کی خوبصورت کیاریاں اور پودوں کے گملے آگے نو وارد اس کی زینت کو دوبالا کر رہے تھے۔ لان کے ایک طرف کچھ بچے کرکٹ اور بڑے لوگ ٹینس کھیل رہے تھے۔ کوٹھی والے جگہ جگہ ٹیوب لائٹ، بلب اور رنگین قمقموں کی جھالر لگا رہے تھے۔ وہ پھاٹک تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ کسی کھڑکی سے حنیف نے اسے دیکھ لیا اور وہ "ابا جان" چیخ کر دوڑ پڑا اور پھر ساری کوٹھی میں شور مچ گیا "ابا جان آگئے" "ابا جان آگئے"۔

بیٹوں، بیٹی اور داماد کو اس نے گلے لگایا، بہوؤں کے سر پر ہاتھ رکھا اور ان کے بچے دوڑ کر لپٹ گئے۔ پھلوں وغیرہ کی ٹوکری اس نے تنویر کو دی اور کہا "انھیں پہلے ٹسٹ میں آنے کا انعام بعد میں ملے گا پہلے تم سب بچوں میں تقسیم کر دو۔" وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہی تھا کہ ملازم کافی کی ٹرے لے کر آگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے مسکراتی ہوئی ڈاکٹر عبدالجبار کی بیوہ زاہدہ خاتون تھیں۔ پچپن سال کے لگ بھگ عمر تھی لیکن ان کے چہرے کی نازکی، خوبصورت آنکھوں اور متناسب جسم کی وجہ سے دیدہ زیب اور پرکشش کہا جا سکتا تھا۔ لطیف احمد نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ دعا سلام کے بعد رسمی گفتگو ہونے لگی لیکن لطیف احمد نے اس میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا صرف کسی بات کے پوچھے جانے پر مختصر سا جواب دے دیا۔ اسے احساس بری طرح تھا کہ وہ ایک غیر ضروری آدمی ہے اور یہ لوگ محض انسانی ہمدردی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ جب شریف احمد نے کہا "میرا ارادہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے میں ابھی سے تنویر کو انگلینڈ بھیج دوں" تو اس نے بے رخی سے جواب دیا "اس معاملے میں تم لوگ جانو۔ اب تو میں ایک غیر ضروری آدمی ہوں۔" اس پر زاہدہ خاتون نے اپنے چہرے پر ہمدردانہ مسکراہٹ لا کر کہا "واہ لطیف احمد صاحب آپ غیر ضروری آدمی کیسے ہو سکتے ہیں۔ آپ کی ضرورت اگر کوئی نہیں سمجھتا تو یہ اس کی نادانی ہے۔" لطیف احمد کے چہرے پر پہلی مرتبہ ہنسی کے آثار نمودار ہوئے۔ "محترمہ آپ نے ضرورت کے لفظ کو جس طور سے استعمال کیا ہے اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو میری اپنی ضرورت اور دوسرے کسی اور کے لیے میری ضرورت۔ جہاں تک پہلی ضرورت کا تعلق ہے مجھے اپنی زندگی سے

لیے بسر کرنے کا اب تک موقع ہی نہیں ملا لہٰذا اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جہاں تک کسی اور کے لیے میری ضرورت کا سوال ہے تو میری زندگی اپنے امکان بھر اپنے ماں، باپ، بہنوں، بیوی اور بچوں کی خدمت کرنے میں گزر چکی۔ اب کسی کو بھی میری ضرورت نہیں۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اب کسی دوسری زندگی بسر کرنے کا نہ حوصلہ ہے اور نہ ہمت۔ میری مثال درخت سے گرے ہوئے ایک ایسے پتے کی ہے جو حوادث کی آندھی میں ادھر ادھر اڑتا پھر رہا ہو اور جس کی نہ کوئی مرضی ہو اور نہ منزل"

زاہدہ خاتون کچھ جواب دینا ہی چاہتی تھیں کہ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ کھانا میز پر لگا دیا گیا ہے۔ لطیف احمد نے کہہ دیا کہ اسے بھوک نہیں تھی لہٰذا وہ اسٹیشن ہی سے کھانا کھا آیا ہے۔ اور چونکہ رات کے سفر سے بہت تھک چکا ہے لہٰذا آرام کرنا چاہتا ہے۔

اس سلسلے میں زیبا اور شریف احمد کے درمیان چپکے چپکے گفتگو ہوئی۔ غالباً ٹھہرنے کے سبھی کمروں میں مہمان پہلے ہی سے آکر ڈیرا جما چکے تھے صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے زاہدہ خاتون بول اٹھیں "آپ میرے کمرے میں آرام فرما سکتے ہیں۔ فی الحال میں تو یہیں نیچے انتظامات میں رہوں گی۔ آپ کو زحمت صرف یہ ہوگی کہ وہ دوسری منزل پر ہے"

"آپ کو بڑی تکلیف ہو جائے گی۔ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ میں یہیں کوچ پر بیٹھا رہوں گا" لطیف احمد نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ مجھے کوئی بھی تکلیف نہ ہوگی" اور پھر ہنستے ہوئے "اور تکلیف ہو بھی گئی تو کیا۔ آپ غیر ضروری آدمی تو نہیں رہیں گے۔ غیر ضروری آدمی کب کسی کو تکلیف پہنچاتے ہیں" زاہدہ خاتون نے جواب دیا۔

تھوڑی سی رد و قدح کے بعد یاسمین اور تنویر اور ساتھ ہی ساتھ زاہدہ خاتون، اسے دوسری منزل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا آئیں جس میں صرف ایک الماری، مسہری، کرسی اور میز تھی۔ غالباً یہ زاہدہ خاتون کا مستقل کمرہ نہیں تھا۔ بلکہ مہمانوں کے لیے سمٹ کر انھیں عارضی طور سے اس میں ایک دو روز کے لیے آنا پڑا تھا۔

لطیف احمد لیٹا تو ایسا غافل سویا کہ اس کی آنکھ ساڑھے چار بجے کھلی۔ تھوڑی ہی دیر میں یاسمین چائے لے کر آگئی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہ بولی "ابا جان اس وقت آپ نے بھیا کی ساس، بھابی

اور دوسروں کے سامنے اتنی اکھڑی اکھڑی اور مایوسی کی باتیں کیوں کیں؟ وہ کیا سوچتی ہوں گی۔" لطیف احمد نے مسکرا کر جواب دیا "یہی سوچتی ہوں کہ میں ایک سیدھا سادھا بے وقوف اور غیر ضروری آدمی ہوں" اتنے میں زاہدہ خاتون آگئیں۔ یاسمین چائے کے برتن ہٹا کر خود میز پر بیٹھ گئی اور ان کے لیے کرسی خالی کر دی۔ "آپ تو ایسے سوئے جیسے گھوڑے بیچ کر سوئے ہوں" زاہدہ خاتون بولیں۔

"واقعی میں گھوڑے ہی بیچ کر سویا تھا۔ میرے گھوڑے بک چلے"

"زندگی کو آپ نے بہت کچھ دیا لیکن زندگی بنی ہی ہے۔ دینے کے لیے۔ پوچھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ زندگی نے آپ کو کیا دیا بلکہ صرف یہ کہ آپ نے زندگی کو کیا دیا؟ قربانی اور ایثار کرنے کے بعد اس پر خوش ہونا چاہیے۔ اس کے موقعے تو صرف خوش قسمت انسانوں ہی کو ملتے ہیں۔

بالکل صحیح خیال ہے آپ کا۔ میں نے جس طرح زندگی بسر کی اس پر میں ہرگز متاسف نہیں۔ زندگی کے مجاہد کے لیے اس کے زخم ہی اس کی کامیابی کے تمغے ہوتے ہیں"

قریب قریب ہر انسان اپنی زندگی بسر نہیں کرتا بلکہ اس کو دوسروں ہی کے لیے زندگی بسر کرنا پڑتی ہے۔ وراثت، ماحول، واقعات — حادثات ہم کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ہمارے اختیار میں صرف ایک ہی بات ہے اور وہ یہ کہ ہر حال میں خوش رہنا اور ہر مصیبت کا پامردی سے مقابلہ کرنا"

"کاش کہ خوش رہنا اپنے اختیار میں ہوتا"

"ہے اور بالکل ہے۔ خوش رہنے کی ترکیب بہت آسان ہے لیکن افسوس کہ لوگ اس پر عمل نہیں کرتے"

"کیا ترکیب ہے وہ؟" لطیف احمد نے تعجب سے پوچھا۔

"یہی کہ بس خوش رہیے"

لطیف احمد نے قہقہہ لگایا "بہت خوب۔ یہ ترکیب تو ایسی ہی ہے جیسے کہا جائے کہ دولت مند بننے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ دولت حاصل کیجیے"

"جی نہیں۔ دولت حاصل کرنے کے لیے تو آپ کو وہ لوگ بھی چاہئیں جن سے کہ آپ دولت حاصل کیجیے لیکن خوش رہنا تو آپ کا

خود اختیاری فعل ہے۔ آپ تہیہ کر لیجیے کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے کیسی ہی ناگہانی مصیبت پھٹ پڑے، کیسے ہی صبر آزما حالات سے مقابلہ کرنا پڑ جائے، آپ خوش رہیں گے۔"

"میں سمجھتا ہوں ذہنی کیفیات خارجی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

"آپ کا خیال بہت حد تک صحیح ہے لیکن اس کے باوجود خوش رہنا نہ صرف ایک انداز فکر بلکہ ایک مجاہدانہ عزم ہے اور اگر اس میں خلوص اور توانائی ہے تو خارجی حالات سے متاثر ہونے کے بجائے، خود خارجی حالات کو متاثر کر سکتا ہے۔"

لطیف احمد اس کا جواب نہیں دے سکے۔ زاہدہ خاتون نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "اب مجھ کو ہی دیکھیے، بچپن میں ماں کے مرجانے سے مجھے ماں کا پیار نصیب نہیں ہوا۔ باپ نے دوسری شادی کر لی۔ اس سے جو اولادیں ہوئیں ان کی دیکھ ریکھ میں وہ بیچارے ایسا منہمک ہوئے کہ میں باپ کے پیار سے بھی محروم رہی۔ وہ بیچارے غریب آدمی تھے اور ڈاکٹر عبدالجبار کے کمپاؤنڈر۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب ابا کی بیماری میں ہمارے گھر آئے اور مجھے دیکھ لیا۔ اس وقت ان کی پہلی بیوی مر چکی تھیں اور زیبا دو سال کی بچی تھی اور پھر انھوں نے ابا پر ایسا دباؤ ڈالا کہ وہ مجھ اٹھارہ سال کی لڑکی کی بیتالیس سال کے ڈاکٹر کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور پھر میں نے تیس سال ڈاکٹر کے ساتھ بسر کیے۔ بیوہ ہوئے مجھے سات سال ہو چلے ہیں لیکن درحقیقت میں اپنی شادی کے چار پانچ مہینے بعد ہی سے بیوہ ہو گئی تھی کیونکہ میرے شوہر کے عجیب عجیب شوق تھے جن میں میں ان کا تعاون نہیں کر سکتی تھی۔ انھیں اپنے زیر علاج عورتوں سے عشق کرنے کا خبط تھا۔ اس سلسلے میں کئی اسکینڈل بہت مشہور ہوئے اور مجھے اپنے ہم چشموں میں بڑی شرمندگیاں اٹھانا پڑیں۔ ڈاکٹر صاحب مجھے زیبا کی نگرانی اور اپنے ڈرائنگ روم کے ایک گلدستے سے زیادہ اہمیت نہ دیتے بلکہ اکثر اپنے شکار کے لیے مجھے ٹٹی کے طور پر بھی استعمال کرتے۔ لیکن میں خوش رہی اور زندگی سے کبھی کوئی شکایت نہیں کی اور نہ اس وقت کر رہی ہوں۔"

اب نیچے پارٹی کے مہمانوں کی غالباً آمد شروع ہو گئی تھی کیونکہ جلدی جلدی موٹروں کے آنے اور استقبال کی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یاسمین چائے کے برتن لے کر چلی گئی۔

لطیف احمد بولا "آپ نے مجھے اب ایک بالکل دوسرے نہج سے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں جو دوسروں کے لیے اپنی زندگی بسر کرتا رہا تو دراصل مجھے ان سے شکرگزاری کی توقع نہیں بلکہ خود ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ انھوں نے میری بے مقصد زندگی کو ایک مقصد دیا۔ انھوں نے مجھے ایک غیر ضروری آدمی سے ضروری آدمی بنا دیا۔ میں خود اپنے لیے زندہ رہتا تو کیا کرتا؟ کچھ اچھا کھا لیتا، پہن لیتا، دوستوں میں بیٹھ کر گپ شپ کر لیتا۔ کچھ فلمیں دیکھ لیتا کچھ عشق کر لیتا۔ اس سے زیادہ اور کیا کر لیتا۔ یہ کتنی ادھوری اور سطحی باتیں ہوتیں اور جو لوگ یہ سب کر لیتے ہیں کیا وہ مجھ سے زیادہ خوش اور مطمئن ہیں؟"

"بڑی گہری بات کہہ دی آپ نے۔ مقصد بڑا ہو یا چھوٹا۔ وہ پوری انسانیت کی بہبودی یا ملک و قوم کی فلاح کے لیے ہو یا محض اپنے متعلقین کی پرورش کے لیے ہو۔ اس کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اور چونکہ مقصدوں کی اس دنیا میں کمی نہیں ہے لہٰذا کوئی آدمی غیر ضروری ہو ہی نہیں سکتا"

لطیف احمد نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا "آپ خوش رہتی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں کسی دوسرے شخص کی بنجر زندگی پر خوشی کے پھول کھلا دینا اس سے کہیں بہتر مقصد ہوگا۔ ایک کے بجائے دو خوشی کے پیاسے انسان ہم سفر ہو کر چلیں تو خوشی کا چشمہ خود آگے بڑھ کر ان کے قدم چوم لے گا۔"

زاہدہ خاتون کا شہابی رنگ سرخ ہو گیا۔ ان کی گہری آنکھیں اور بھی گہری ہو کر جھک گئیں۔ وہ جلدی سے اپنی ساری کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے اٹھیں "اب پارٹی شروع ہو رہی ہوگی۔ میں چلتی ہوں۔ آپ بھی جلدی آجائیے گا۔"

"اور میری درخواست؟"

"وہ زیر غور ہے۔ اس پر پھر تبادلہ خیال ہوگا۔"

رنگ میں بڑی چہل پہل اور جوش و خروش تھا۔ قریب ساٹھ ستر مہمان تھے جن میں آدھے کے قریب تنویر کے ہم عمر لڑکے اور لڑکیاں تھے۔ ناشتے کے بعد دو لڑکے لان کے دوسرے کنارے پر کودنے پھاندنے اور قہقہے لگانے لگے۔ باقی مہمان فوارے کے گرد صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھ کر حالاتِ حاضرہ پر نیم سنجیدہ باتیں کرنے لگے۔ شریف احمد نے مہمانوں سے لطیف احمد کا تعارف کرایا۔ لطیف احمد نے بھی اپنے گرد و پیش کی گفتگو میں گرمجوشی سے حصہ لیا۔ زاہدہ خاتون عورتوں کے جھرمٹ میں میٹھے لطیفے سنا رہی تھیں اور ان کے ہر لطیفے کے خاتمے پر قہقہوں کی بارش ہو جاتی۔ ڈاکٹر پانڈے نے ان کی طرف مخاطب ہو کر پکارا "یہ سب لڈّو اُدھر ہی بٹیں گے یا کچھ ہم لوگوں کے حصے میں بھی آئیں گے!"

زاہدہ خاتون بولیں "آئیے آپ بھی بٹور لے"

خورشید حسن ڈپٹی کلکٹر بولے "آپ نے اوستھی جی کے یہاں غالب کی ایک غزل سنائی تھی آج ایک اور غزل عنایت ہو۔ واقعی اس روز سے میری نظر میں غالب کی وقعت بڑھ گئی۔" اس پر کچھ لوگ زیرِ لب مسکرائے۔

"میں ایسے ناقدر دانوں کو غالب کا کلام نہیں سناتی جو غالب سے بڑا اس کی ڈومنی کو سمجھیں" اس پر سب ہنسنے لگے اور کئی قہقہے گونجے۔

تھوڑے سے اصرار کے بعد زاہدہ خاتون نے اپنی مترنم آواز سے غالب کی غزل ع مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے۔ سنانا شروع کردی۔ غزل سناتے وقت زاہدہ خاتون کی نظریں اٹھ کر جب لطیف احمد کی نظروں سے ٹکرا جاتیں تو وہ محسوس کرتے کہ براہ راست مجھ کو ہی مخاطب کیا جا رہا ہے۔ زاہدہ خاتون کی آواز میں کچھ ایسا درد انگیز ترنم اور کیف تھا کہ معلوم ہوتا کہ نہ صرف حاضرین بلکہ ساری فضا مسحور ہو کر رہ گئی ہے۔

دوسرے روز دوپہر کے کھانے کے دوران جب مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد گھر کے ہی سب افراد موجود تھے لطیف احمد نے کہا "بچو، میں تمھیں ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔ میں نے اور زاہدہ خاتون نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنی ادھوری زندگیوں کو جوڑ کر ایک پوری زندگی بنا لیں۔ اور پھر ہم لوگ مل کر اپنے گھر میں غیر ضروری آدمیوں کو ضروری بنانے کے لیے ایک ادارہ قائم کریں گے۔"

ایک لمحے کے سکوت کے بعد پہلے حنیف اور پھر شریف اور پھر کلیم دوڑ کر تعجب اور خوشی سے لطیف احمد سے لپٹ گئے۔ انھیں زندگی میں پہلی دفعہ یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس بڈھے کی اپنی بھی کوئی شخصیت اور زندگی ہے اور وہ صرف دوسروں کی خدمت گزاری کرنے کی ایک مشین نہیں ہے۔ یاسمین، زیبا اور فردوس اظہارِ مسرت میں چیخ اٹھیں اور جھپٹ کر زاہدہ خاتون سے چمٹ گئیں۔ زاہدہ خاتون سر جھکائے خاموش بیٹھی مسکراتی رہیں۔ انھوں نے شرمائی ہوئی نیچی نظروں سے لطیف احمد کے شگفتہ چہرے اور مارے خوشی کے آنسوؤں سے چھلکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا تو انھیں معاً خیال آیا "زندگی کبھی ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ ہمیشہ شروع ہوتی ہے" لطیف احمد بڑی خود اعتمادی سے سوچ رہے تھے "کل کا غیر ضروری آج کتنا ضروری آدمی بن گیا ہے؟"

★

ارشاد للیانوی

پندرہ اگست

کیونکر نہ ہو ہجوم غم و یاس کو شکست
لایا ہے انبساط و طرب پندرہ اگست
بھارت میں کوئی بھی نہ رہے گا ذلیل و پست
پیغام لے کے آیا ہے یہ پندرہ اگست
ہوگا ہر اک کی روٹی کا کپڑے کا بندوبست
اعلان عام کرتا ہے یہ پندرہ اگست
ہرگز کوئی رہے گا، کسی کا نہ زیردست
ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے یوں پندرہ اگست
انساں بنائے جائیں گے یہ سارے خود پرست
لایا ہے وہ نظام نیا پندرہ اگست
ارشاد اگر ہو دیس کی خدمت میں جہد چست
کچھ اور ہی بنائے صدا پندرہ اگست

ہمدرد سب کا فیض رساں پندرہ اگست
پیغام عیش و امن و اماں پندرہ اگست
کرتا ہے دور درد نہاں پندرہ اگست
مرہم دلوں کا روح رواں پندرہ اگست
جو حق پہ مر کے زندۂ جاوید ہو گئے
قربانیوں کا ان کی نشاں پندرہ اگست
اس سے لگے ہیں دیس کی عظمت میں چار چاند
کیسے نہ ہو عزیز دلاں پندرہ اگست
بھارت کے سبزہ زاروں سے ہوتا ہے آشکار
چمکا رہا ہے رنگ جہاں پندرہ اگست
ارشاد اس کے جشن سے ہوتا ہے یہ عیاں
اس وقت کا ہے شاہ جہاں پندرہ اگست

آغا کامل رزمی

جشن آزادی

سرزمین ہند اب اے آسماں آزاد ہے
لالہ و گل شاد، سرو گلستاں آزاد ہے

بلبل رنگیں نوا نغمات آزادی سنا
آشیاں کیا، گلستاں کا گلستاں آزاد ہے

رنگ لایا دیکھیے خون شہیدان وطن
آج اپنا ملک یہ ہندوستاں آزاد ہے

گاندھی و آزاد و نہرو کا ہے یہ فیض کرم
اب غلامی سے ہر اک پیر و جواں آزاد ہے

ہر مخالف کے مقابل متحد ہیں آج ہم
عزم و ہمت سے یہ اب ہندوستاں آزاد ہے

کام آئیں گی مخالف کی نہ کچھ چالاکیاں
قوم اب بیدار ہے، عزم جواں آزاد ہے

دشمنان ملک کو آگاہ کامل کیجیے
ان کی سرکوبی کو ہر گرز گراں آزاد ہے

محمد رضی اللہ تمیزی معظمی

اردو ادب میں عورت کا تصوّر

یہ امر مسلمہ ہے کہ انسان کے اندر حسن پرستی ایک فطری جذبہ ہے۔ وہ فطرتاً حسن کی جانب مائل اور اس کی پرستش پر مجبور ہے۔ اور چونکہ "ادب" دلی جذبات و احساسات کی تصویر کا نام ہے لہٰذا ادب میں "حسن کا تصور" اور جنسی اثر کا پایا جانا ضروری ہے۔

یہ بات غیر فطری ہے کہ ایک مرد کا تخیل عورت کے خیال سے اور ایک عورت کا تخیل مرد کے خیال سے آزاد ہو۔ زندگی کو حسین بنانے میں ایک دوسرے کا بہت دخل ہے۔ مرد کی زندگی کی تمام رعنائیاں محض عورت کی ناز آفرینیوں سے ہیں۔ اور اس طرح مرد عورت کی زندگی کے لیے سامانِ راحت اور سرمایۂ عیش و طرب ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کلیوں کا تبسم، پھولوں کی مہک، چشمِ نرگس اور سروِ قامتی اور روئے گل بغیر جنسی تصور کے حسین اور دلکش نظر آئیں۔ مولانا حالی نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

اے ماؤ بہنو! بیٹیو!! دنیا کی زینت تم سے ہے

ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزت تم سے ہے

آج آپ سارے عالم کے کسی ملک کا ادب یا آرٹ کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ کریں تو اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ کوئی ادب یا آرٹ جنسی موضوع سے خالی نہیں بعض ماہرین و محققین جنسیات کا خیال ہے کہ "جنسیات کے مختلف نظریات کی تعریف اور اس کے دھارے کے اتار چڑھاؤ کو جس دور میں دیکھنا ہو اسی دور کے ادب اور آرٹ کا مطالعہ اس کا سب سے بہتر اور موثر طریقہ ہے"۔ اگر آپ کا مطالعہ وسیع ہو تو ملاحظہ فرمائیں گے کہ عہدِ عتیق کے ادبی شاہکار بھی جنسیات سے خالی نظر نہیں آتے۔ ہم ان سب میں "عورت" کو سب سے نمایاں پاتے ہیں۔ اور قدرت نے کیف و سرور کی حسین وسعتوں کو عورت کی ہستی میں سمو دیا ہے اس کا احاطۂ بیان میں لانا ممکن نہیں۔ کالیداس، والمیکی، ہومر، تی پولی سے لے کر گوئٹے، شکسپیر اور شیلے اور زمانہ موجودہ تک ہر ایک کے ہاں جنسیات کا بیان ملے گا، عورت کا تصور ہوگا۔ عریانیت ہوگی، علانیہ یا کھلم کھلا ہو یا تشبیہ استعاروں میں یا کتابوں میں۔ دنیا کا کوئی ادب کسی زمانہ میں بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہا۔

لیکن آج اکثر و بیشتر محققین و ماہرین تنہا اردو ادب پر ہی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

معزز قارئین کرام! آج عورت کا تصور عالمگیر ہے۔ اس کا طرۂ امتیاز صرف سرزمین ہند ہی کے پیشانی پر آویزاں نہیں ہوتا بلکہ یہ بتلائیے کہ عورت، کس ملک، کس قوم اور کس زمانہ میں مرد پر مسلط نہ تھی؟

موہن جوڈارو اور ہڑپہ کی کھدائیوں سے جو نشانیاں برآمد ہوئیں ان کے ظروف اور دوسری اشیاء پر عورت کی تصاویر کندہ تھیں۔ اجنتا اور ایلورا میں، یونان و مصر کے اصنام میں جلوہ گر ہے۔ تو پھر عورت بقول ایک تنقید نگار کے "شاعر کے کلام میں عورت، مغنی کے لیے عورت، ادیب کے قلم میں عورت، مصور کے رنگ میں عورت، بت تراش کے سنگ میں عورت، دنیا کی کشمکش میں عورت، مریض کے سرہانے عورت، زخمی کے قریب عورت، آنکھیں کھلیں تو عورت، آنکھیں مندیں تو عورت۔ غرض یہ تہمت کہ "ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس" ہی پر عائد نہیں ہوتی کہ "آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار" بلکہ ہر ملک اور ہر قوم کے ہر شخص کے اعصاب اور دماغ

دماغ پر عورت ہی نظر آتی ہے۔

آئیے اب اردو ادب کی جانب رُخ کریں۔ عموماً اردو ادب کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک تو شاعری اور دوسرا نثر نگاری۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شاعری و نثر نگاری پر کس طرح سے جنسی اثر پایا جاتا ہے۔

اردو شاعری میں عورت کا تصوّر

سرزمین دکن ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ عہد قطب شاہی میں دکنی زبان کے ممتاز شعرا جن میں وجہیؔ، احمدؔ، غنیؔ، نصرتیؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یاد رہے کہ ان کی شاعری کا موضوع عورت ہے انھوں نے عورت کی تعریف میں ہزارہا صفحات پُر کیے ہیں

دکنی زبان کی شاعری کے دور کے بعد اردو شاعری مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات کے مطابق پانچ ادوار میں تقسیم ہوتی ہے۔

ولیؔ پہلے دور کے ممتاز شاعر ہیں لیکن روایت پرستی سے وہ بھی نہ بچ سکے۔ اور فارسی کی تقلید میں روایتی امرد پرستی اختیار کی۔ لیکن یہ بھی ایک ادبی روایت کی مجبوری تھی۔ یادگار ولیؔ میں پروفیسر عبدالواحد رقم طراز ہیں "ولیؔ کے مشرب حسن پرستی سے کہیں زیادہ اہم ان کا خالص ہندی تخیل ہے جس نے ان کے الہامات شاعری میں ایک خاص قسم کی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے"۔ لیکن ولیؔ کی حسن پرستی نے ان سے اورنگ آباد چھڑایا اور گجرات میں سکونت اختیار کی شاہدان سیم تن کے تصور میں انھوں نے اورنگ آباد چھوڑا اور گجراتی حسن کی جانب یوں ملتفت ہوئے۔

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یوں آگ بجھاتی جا
اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں توں سوں
ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا

مقطع میں ولیؔ اورنگ آبادی اپنے شوق کا اظہار کرتے ہیں ؎

تجھ گھر کی طرف سندر جاتا ہے ولیؔ دائم
مشتاق ہے درشن کا ٹک درشن دکھاتی جا

ولیؔ کی شاعری کا اگر بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ماحصل عورت ہے جس کے تصور میں انھوں نے اپنی شاعری کو رنگین بنایا۔

مولانا محمد حسین آزاد کے تیسرے دور میں میر تقی میرؔ اور مرزا محمد رفیع سوداؔ دو ہی ممتاز شعرا نظر آتے ہیں بلکہ عنوان کے تحت صرف میرؔ ہی باقی رہ جاتے ہیں کیوں کہ سوداؔ نے اپنا سارا زور قلم قصیدے اور ہجو لکھنے میں صرف کر دیا اس طرح میرؔ کی شاعری کو سوز و گداز بخشنے والی ایک عورت ہی رہتی ہے جس کا ذکر اپنی مثنوی "خواب و خیال" میں دبے دبے کہتے ہیں۔ ہر شاعر کے کلام سے جنسی پہلو ضرور نکلتا ہے۔ چاہے علانیہ یا کھلم کھلا یا مستور و پنہاں کیونکہ جنسیات کے بغیر ادب ادب نہیں رہتا بلکہ فلسفہ بن جاتا ہے۔

میرؔ کی شاعری میں جنسیات کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن عریانیت نہیں پائی جاتی ؎

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

اپنے محبوب کی آنکھوں کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

چوتھے اور پانچویں دور کے شعرا نسبتاً تیسرے دور کے ظاہری حسن اور خارجی کیفیات اور عریانیت کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں ان میں "لکھنؤ اسکول" کے شعرا شامل ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ لکھنؤ میں سلطنت اودھ اپنے عالم شباب پر تھی چاروں سو رنگینیوں کا دور دورہ تھا۔ عورت کا تصور عزت و عفت مآبی اور پردہ نشینی سے اوپری رنگ و روغن اور ظاہری حسن پرستی شاہداں بازی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ چنانچہ شعرا کرام نے بھی اسی تہذیب کی بھرپور عکاسی کی اور نازاری معشوق کی تعریف میں اپنا پورا زورِ قلم دکھایا اس دور کے ممتاز شعرا میں انشاؔ، اشرف خاں آتشؔ، جرأتؔ اور رنگینؔ شامل ہیں۔

میر تقی میرؔ جرأتؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں "تم شعر تو نہیں کہنا جانتے، جانتے ہو اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو"۔ محمد حسین آزاد بھی اس کی تائید میں فرماتے ہیں "عاشق و معشوق کے راز و نیاز اور حسن و عشق کے معاملات کو جس شوخی سے اور چونچلے پن سے جرأتؔ نے برتا ہے۔ وہ انھیں کا حصہ ہے" یہ سب باتیں اس امر کی توضیح کرتی ہیں کہ جرأتؔ نہ صرف عورت کے حسن کے پجاری ہیں بلکہ ان کے کلام میں جنسی احساس کے مختلف پہلو بھی ہر جگہ دکھائی پڑتے ہیں۔

رنگینؔ نے ریختہ کی طرز پر ریختی کو ایجاد کیا جس کے بارے میں انشاؔ

فرماتے ہیں" برائی بیٹیوں کو اپنا معشوق بنانے میں میاں رنگین نے ریختی کی اختراع کی" رنگین کی اس ریختی کو عہد واجد علی شاہ میں خوب فروغ ہوا۔ اس عہد کے ممتاز ریختی گو شعرا میں جان صاحب چرکین اور جعفر زٹلی قابل ذکر ہیں انھوں نے اس فن میں وہ کمال پیدا کیا جو یقیناً اردو شاعری میں ایک بدنما داغ بن سکتا ہے۔ انشا اور جرأت کے بعد مولانا آزاد کا پانچواں دور شروع ہوتا ہے جس میں آتش، ناسخ، مومن، ذوق، غالب ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آتش و ناسخ کا دور شاہانِ اودھ کا زمانہ تھا یعنی اسے عموماً بیہودہ تہذیب کے زمانہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ (شاہانِ اودھ کے دور میں بیہودگیاں ضرور ہوئیں لیکن وہ زمانہ سراسر بیہودگیوں سے عبارت نہ تھا) جس کے باعث آتش و ناسخ جیسے ممتاز و معظم شعرا بھی اس سے اپنا دامن نہ بچا سکے اور ان کے زورِ قلم سے بعض اوقات ایسے اشعار بھی نکل پڑے جن سے طبیعت منغص ہو جاتی ہے۔ مومن کا بھی مرکزِ نظر عورت ہے جس کا کھلا ثبوت انکی مثنوی اور نوحہ ہے جو اپنی محبوبہ کی وفات پر اظہار کیے ہیں۔ غالب بھی غزل کے استاد مانے جاتے ہیں لیکن ان کے ذہن میں بھی عورت کا تصور موجود ہے جس کا ثبوت اس شعر میں ملاحظہ کیجیے ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

غالب ایک سنجیدہ اور عالی دماغ انسان تھے وہ اپنے جنسی احساس یا اظہار عشق کا تذکرہ عام طور پر نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے اظہار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نسائی محبوب ان کی زندگی میں شامل ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی۔ دردِ بے دوا پایا

مومن و غالب کے بعد نظیر، داغ اور امیر مینائی کا زمانہ آتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی اپنی شاعری میں عام زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کھینچتے ہیں ان کی شاعری کا انداز عامیانہ ہے جس کے باعث جنسی تذکرے بھی اسی انداز میں کرتے ہیں۔ آپ کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت حقیقت نگاری ہے۔ آپ کی شاعری کے کردار جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ شاہدانِ بازاری کے تذکرے بیباکی سے کرتے ہیں۔ آپ کی شاعری میں ہندستانیوں میں فضول اور عامیانہ رسم و رواج اور خاص و عام پر جنسی اثرات کا تذکرہ نہایت مفصل ملتا ہے۔ ع

اوروں نے کھیلی ہولی' یاروں نے کھیلا ہولا

"ہولا" ہجڑوں سے چھیڑ چھاڑ اور ان پر رنگ اندازی و طنز کو کہا جاتا ہے اسی طرح نظیر کی شاعری بھی عامیانہ زندگی کا آئینہ ہے ؎

اس گورے بدن کا کوئی کیا وصف کہے آہ
ختم اس کے اوپر گل رعنی وسیم تنی ہے
وہ عارض یا جبین تاباں کہ ہو دیکھ اسکو شرمندہ
قمر خورشید زہرہ شمع و شعلہ مشتری مشعل

نظیر اردو ادب کے وہ سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عورت کو عورت کے روپ میں پیش کیا۔ کسی دیوی کا روپ نہیں دیا۔ یا استعاروں میں اسے جگہ نہیں دی جیسا کہ عہد عتیق کے شعرا کا شعار رہا ہے بلکہ عورت کو صحیح مقام و افضلیت حاصل ہے۔

داغ اپنے عصر کے بہترین غزل گو شاعر ہیں ان کے کلام سے معاملات حسن کی بیباکی ظاہر ہوتی ہے۔ داغ کے یہاں جنسی کیفیات کا ذکر بہت زیادہ ملتا ہے آپ نے ان تمام حقیقتوں کو بیان کیا ہے جو ہر انسان کی زندگی سے وابستہ رہتی ہیں۔

اب محوِ حیرت بات یہ ہے کہ امیر مینائی جیسے خداترس شاعر نے بھی بعض مقامات پر ایسی باتیں کہی ہیں جو داغ جیسی رنگیلی طبیعت والے شاعر کو بھی مات کر دیتی ہیں۔ داغ و امیر مینائی کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد و مولانا حالی نظر آتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ سرزمین ہند اپنا چولا بدل رہی تھی قدیم طرز کی غزل گوئی اور حسن و عشق کی باتوں سے عام بیزاری پائی جا رہی تھی ایسی حالت میں کوئی ایسی بات پیش نہیں کی جا سکتی تھی جو جنسیات سے تعلق رکھے۔ یا اس میں عریانیت کو دخل ہو۔ چنانچہ مولانا حالی نے بھی زمانہ کا ساتھ دیا آپ کی شاعری میں حسن و عشق کا ذکر ملتا ہے لیکن لطیف انداز میں ایک سلجھی ہوئی کیفیت کے ساتھ انھوں نے عریانیت کو معیوب سمجھا۔ بقول مولانا عبادت بریلوی کے "ان کے یہاں مولوی اور شاعر کی شخصیات یکجا ملتی ہیں"۔

میری اس بحث کے مطابق علامہ اقبال کی شاعری پر تذکرہ کرنا ممکن نہیں کیونکہ علامہ اقبال کی شاعری سوائے تفکر اور کچھ نہیں۔ آپ کا فلسفہ ہی مختلف ہے جیسا کہ یہ شعر ملاحظہ کیجیے ؎

عشق بتاں سے ہاتھ اٹھا، اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف

علامہ اقبال کے بعد جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، عظمت اللہ خاں، ن۔ م۔ راشد، میراجی اس قسم کی شاعری میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی رومان کی رنگین شاہراہوں پر چلتے نظر آتے ہیں لیکن باوجود رومانی عنصر غالب رہنے کے انھوں نے حقیقت کو نہ جانے دیا ؎

جوش یہ کافر مناظر ہوش میں رکھتے نہیں
آہ ان فصلوں میں اکثر اپنی رسوائی ہوئی

آپ کی نظموں میں زیادہ تر عورت ہی عورت نظر آتی ہے۔ اور ہر جگہ اور ہر مقام پر جنسی پہلو پیدا کر دیتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی کے بعد ن۔ م۔ راشد نے عورت کو عورت سمجھا اور اس صنف نازک سے مکمل استفادہ کرنے کی تلقین کی۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کی نقاب کشائی کرنے سے نہیں گھبراے اور زندگی کی ساری لذتوں سے لطف حاصل کرنے کے متمنی رہتے ہیں۔ اور روح کی تکمیل ان کی آرزو ہیں ہیں۔ نمونہ ملاحظہ فرمایئے ؎

دیکھ اس جذبات کے نشہ کو دیکھ
تیرے سینے میں بھی اک لرزش سی پیدا ہو چلی
زندگی کی لذتوں سے منھ بھر لینے بھی دے
مجھ کو اپنی روح کی تکمیل کر لینے بھی دے

راشد کی شاعری میں تقدس کا پہلو بالکل مفقود ہے اور علانیہ جنسیت نمایاں رہتی ہے ؎

میں جو سرمست نہنگوں کی طرح
اپنے جذبات کی شوریدہ سری سے مجبور ۔ مضطرب رہتا ہوں مدہوشیٔ عشرت کیلیے
اور تری سادہ پرستش کے بجاے ۔ تڑپتا ہوں تری ہم آغوشی کے لیے

راشد کی زندہ شاعری کے برخلاف میراجی کی شاعری سے نامرادی و قنوطیت ٹپکتی ہے۔ اپنی شاعری کو عریانیت کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہ کسی بات کو کہنے سے کبھی نہیں جھجکتے۔ ان کی شاعری میں از اول تا آخر جنسیات کی عکاسی ملتی ہے ؎

فسردہ شام کو تنہائی پھیلتی ہی گئی ۔ بڑھا بڑھا کے بڑھاتی ہوئی سکون کے ہاتھ
میں اس کے پاس کھڑا تھا مگر وہ تنہا تھی ۔ پرے کھجور کے اوپر خموش گول سا چاند

ابھر رہا تھا، ابھرتا رہا، ابھرتا رہا

عظمت اللہ خاں کی شاعری میں محبت کے شدید، گہرے اور پرخلوص احساسات جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے آپ کی شاعری میں عورت کے حسن کا گہرا احساس ابھرتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے ؎

سندر عورت سندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی
فطرت نے ہو جس رنگ میں ڈھالا
آنکھ ادھر دیس کی سندرتا، کالی کوئل کالی
بال بھی کالے گھنگھور گھٹا

اختر شیرانی کی شاعری میں رومانی محبت ملتی ہے وہ اپنی فرضی محبوبہ میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور محبوبہ کی محرومی و دوری ان کی شاعری کو سطحی بنا دیتی ہے یہ مومن کی طرح اپنی محبوبہ کو پردہ نشین باعصمت عورت کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

دورِ حاضر کے شعرا میں بھی عورت کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن کمیونزم اور عوامی تحریک کے باعث اس کے رنگ میں خاصی تبدیلی آئی ہے۔ یہ جب کبھی بھی شاہد بازاری کو دیکھیں گے تو بجائے اس کے ظاہری حسن و نمائش کی تعریف کرنے کے اس کی بداخلاقی و زبوں حالی کا ماتم کرتے ہوے پاے جاتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی مشہور نظم "چکلے" اس کی بہترین مثال ہے ؎

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے ۔ یہ لٹتے ہوے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے ۔ ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی ۔ یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت زلیخا کی بیٹی ۔ ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

یا پھر یہ بند ملاحظہ کیجیے :۔

بلاؤ خدایانِ دیں کو بلاؤ
یہ کوچے یہ گلیاں یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

آج تقریباً تمام ترقی پسند شعرا کے ہاں عورت کہیں شاہد بازاری کی شکل میں تو کہیں مزدور کی صورت میں، کہیں کسان یا فقیر تو کہیں فاقہ زدہ عورت کے روپ

ہیں، کہیں مظلوم و بے بس امداد کی طالب تو کہیں سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کھلونا نظر آئے گی

اردو نثر نگاری میں عورت کا تصور

جس طرح اردو شاعری کا دامن عورت کے تصور سے بھرا پڑا ہے اسی طرح اردو نثر نگاری بھی عورت کے تصور سے خالی نہیں البتہ اس سلسلے میں اردو نثر نگاری کا دامن اردو شاعری کے نسبتاً کم ہے۔

تاریخ اردو نثر میں اولیں دور مثالی دور کہلایا جاسکتا ہے جس کا شاہکار ملا وجہی کی "سب رس" ہے اس تصنیف میں حسن و عشق کی داستانیں عجیب و غریب انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ دوسرا دور طلسماتی داستانوں کا دور کہلاتا ہے جس کی ابتدا رجب علی سرور کی فسانۂ عجائب سے ہوتی ہے۔ ایک طلسمی کارخانہ کے مانند ہے جس کا ہیرو جان عالم محبوبہ کی خاطر ہزارہا پریشانیوں کو جھیلتا ہے۔ ہر ہر قدم پر طلسم میں گرفتار ہوتا ہے لیکن محض محبوبہ کے تصور سے اس کی قوت میں پھر تازگی پیدا ہو جاتی ہے اور آفات سے بچ نکلتا ہے اس تصنیف کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف نے قصہ سے زیادہ زبان کو اہمیت دی ہے اس میں ہر جگہ ہر مصیبت کا پیش خیمہ اور ہر راحت کا حاصل عورت بتلائی جاتی ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ اس دور کی دوسری مایہ ناز تصنیف امیر حمزہ ہے گو کہ اس میں طلسم کی پیچیدگیاں نہیں لیکن پھر بھی معاشقوں اور لڑائیوں کی یکسانیت کے باعث دلچسپی کم ہو جاتی ہے۔ اس کے ہیرو حضرت امیر حمزہ ہیں۔ لیکن تمام کارنامے کسی نہ کسی عورت سے ہی وابستہ ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کی فسانہ آزاد کا ماحصل بھی عورت ہے۔ اس کے ہیرو آزاد ایک دل پھینک انسان ہیں جو ہر حسین و جمیل عورت پر فریفتہ ہو جاتے ہیں بالآخر حسن آرا سے شادی کا وعدہ کر کے سفر روم اختیار کرتے ہیں۔ اور کئی کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں۔ اگر فسانۂ آزاد کی زبان میں کوئی خاص خوبی نہ ہوتی اور عورت کا تصور نمایاں نہ ہوتا تو یہ کتاب درحقیقت قارئین سے بالکلیہ دور رہ جاتی۔

مولوی عبدالحلیم شرر نے اردو نثر نگاری کی تاریخ میں پہلی بار ناول کی بنا ڈالی۔ آپ نے بے شمار تاریخی ناول لکھے ان کی نثری خصوصیت یہ تھی کہ وہ تاریخی داستانیں محبت کی چاشنی سے پرلطف بن جاتی ہیں۔ اکثر تصانیف میں جہاں حسن و عشق اور عورت کا خواہ مخواہ ذکر لا کر داستان کو عدم دلچسپی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے وہاں عبدالحلیم صاحب شرر اپنے ناولوں میں حسن و عشق کی باتوں کو اس خوبی سے پیش کرتے ہیں کہ وہ قاری کے لیے پوری دلچسپی کا باعث بن جاتے ہیں اور یہی دراصل کامیابی کا راز ہے۔

اردو نثر نگاری میں ایک دور ایسا بھی آتا ہے جس میں بازار حسن کی زندگی سے متعلق لکھے گئے ناول بہت زیادہ مقبول ہوئے ہیں۔ اس دور کی سب سے پہلی تصنیف مثنوی ہے جسے منشی سجاد حسین نے فارسی سے ترجمہ کیا تھا یہ تصنیف دراصل ڈیرہ دار طوائف کی زندگی کا آئینہ ہے مصنف نے نفسیات عشق اور والہانہ جذبات کے اظہار سے بیان کو خوب دلچسپ بنایا ہے۔ دوسری تصنیف مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا ہے یہ دراصل سرگزشت ہے جس میں طوائف کی زندگی کا از اول تا آخر نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ ناول اس دور کی زندگی کی صحیح تصویر کھینچتی ہے۔ قاضی عبدالغفار کی کتاب لیلیٰ کے خطوط اس دور کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب کو عموماً ناول نہیں کہتے۔ جیسا کہ قاضی صاحب خود دیباچہ میں لکھتے ہیں "یہ ایک ناول نہیں بلکہ احتجاج ہے: اس فرسودہ تہذیب پر جس نے حسن فروشی اور اسی قسم کی دوسری باتوں کو روا رکھا"

مولوی نذیر احمد بالکل پہلی بار عورت کو ایک گھریلو اور شریف عورت کے بھیس میں پیش کرتے ہیں۔ آپ نے خانہ داری، عورت کی طرز معاشرت، پردہ نشین خواتین کی مظلومیت پر ناول لکھے۔

افسانہ نویسی سے اردو نثر نگاری میں ایک نئے دور کی ابتدا ہوتی ہے۔ ادب کی یہ صنف آج روز بروز ترقی پر ہے اس میں جنسیات کے ذمہ دار سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی نظر آتے ہیں۔ اردو میں دراصل جنس پرستی انگریزی اثر کا نتیجہ ہے۔ ان مصنفین کا مقصد اس سے ہرگز نہیں کہ جنسی اصلاح کی کوشش کی جائے جیسا کہ کرشن چندر عصمت چغتائی کے متعلق اپنی ایک تنقید میں کہتے ہیں۔ "عصمت رات کے اندھیرے میں ٹارچ لیے گھومتی رہتی ہے اور اسے جہاں سماج کی برائی یا خامی نظر آتی ہے ٹارچ اس کو منظر عام پر لے آتی ہے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے کیا حاصل۔ کیونکہ جب سماجی زخم مرہم ہی نہیں تو ناسوروں کو دکھانے سے کیا فائدہ۔ اور سب سے مضر اثر انسی جنس کی تفصیلی حقیقت نگاری پر یہ پڑتا ہے کہ نوعمر و ناتجربہ کار لڑکے و لڑکیوں کی سمجھ میں اس کا اصل مدعا تو نہیں آتا بلکہ وہ ان کے شہوانی اور جذباتی

ناسور پر براہ راست فوری اثر پڑ جاتا ہے یہی عالم آج کل کے سنیاؤں، درجہ سوم طرز کے ڈائیلاگ گیت اور گانوں وغیرہ کا ہے جو اس کی صحیح عکاسی کرتے ہیں عصمت چغتائی کا "لحاف" یا "بھول بھلیاں" جس میں جنسیات عریانیت کی حد تک پہونچ چکی ہے۔ سعادت حسن منٹو کے یہاں بھی ایسی ہی علانیہ عریانیت اور جنسی بھوک پائی جاتی ہے۔ اس کے لیے ان کے افسانے دھواں اور بلاؤز قابل ذکر ہیں۔

برخلاف عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کے احمد علی اور اوپندر ناتھ اشک کے یہاں بھی جنسیات ملتی ہے لیکن دبی ہوئی صورت میں وہ ہندستانی معاشرہ کی جنسی بھوک کی تصویر کو بے پناہ طنز کے ساتھ کھینچتے ہیں۔ اوپندر ناتھ اشک کے افسانے اُبال اور ناسُور سے یہ بھی اظہر من الشمس ہوتا ہے کہ وہ طبقاتی تفاوت کا جنسی پہلو بڑی خوش اسلوبی اور فنی خوبی کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن اس میں جنسی پہلو کے طنز دلنشتر پوشیدہ رہتے ہیں۔

اردو افسانہ نگاری میں کرشن چندر کا نام سب سے نمایاں ہے۔ آپ نے اپنے افسانوں کی بنیاد ایک طرح کی رومانیت اور فطرت پرستی پر رکھی ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے نہ صرف مزدور اور غریب عورتوں ہی پر جو سرمایہ داروں کی جنسی بھوک کی شکار ہیں افسانے لکھے بلکہ سرزمین ہند کی تمام مظلوم خواتین کی حقیقی تصویر کھینچنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

آخر میں اردو افسانہ نگاری کے باوا آدم منشی پریم چند کی نثر نگاری میں عورت کا تصور پیش کرتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں پریم چند کے افسانوں میں عورت ایک گرہستن اور صحیح معنی میں "ہندستانی خاتون"، جس پر ساری دنیا کو ناز ہے نظر آتی ہے۔ انھوں نے گھریلو زندگی کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ وہ نہ صرف عورت کو گھریلو اصلاح بلکہ سماجی اصلاح میں بھی نمایاں مقام عطا کرتے ہیں اسی لیے پریم چند کے افسانوں میں گھریلو اصلاح کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاح کا پہلو بھی نمایاں رہتا ہے۔

★

خضر برنی

یومِ آزادی

دوا ہے دل بڑی مشکل سے سازگار ہوئی
ہماری بات زمانے میں باوقار ہوئی
کچھ اپنی خفتہ مزاجی جو ہوشیار ہوئی
بہار آئی چمن میں خزاں فرار ہوئی
ہماری اپنی حکومت ہمارا ہے دستور
کہ آج ہم سے غلامی ہے دور کوسوں دور

ہوئی چمن میں عجب طور سے یہ گل کاری
ہزار رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے پھلواری
ہر ایک گام پہ چشمے سے ہو گئے جاری
زمینِ ہند پہ فطرت کی ہے ضیا باری
کسان جھوم اٹھے کھیت لہلہانے لگے
ہر ایک شاخ پہ جلوے سے مسکرانے لگے

نشاطِ روح کے آثار ہو گئے پیدا
ترنگے جھنڈے کا عنوان اس طرح چمکا
نمودِ صبح نے اندازِ تیرگی بدلا
چمن میں نور کی کرنوں کا ہو گیا ڈیرا
زباں پہ سعیِ مسلسل کی بات آئی ہے
نگاہِ شوق نے منزل کی راہ پائی ہے

قدم قدم پہ نئے دیپ جگمگائیں گے
وطن کی شان پہ انداز نو بڑھائیں گے
ترانہ عزم و عمل کا خوشی سے گائیں گے
زباں پہ اپنے شہیدوں کا نام لائیں گے
یہی ہے اپنی حکایات دواردات کا دن
ہے دورِ غلامی سے اک نجات کا دن

ڈاکٹر انوار الحسن

اردو کے بے لوث خادم

منشی نول کشور

منشی نول کشور اردو زبان کے محسن ہی نہیں محسنِ اعظم کہلانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ انھوں نے اس زبان کی جتنی خدمت کی وہ کوئی بڑے سے بڑا ادارہ بھی اب تک نہ کر سکا۔ انھوں نے اردو زبان وادب کے علمی سرمایے کو زمانے کی دستبرد سے بچایا اور اپنے مشہور "نول کشور پریس" کے ذریعے ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

" نول کشور پریس ہمارے ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر نول کشور پریس نہ ہوتا تو اردو ادب کی روایات نہ ہوتیں اور غالباً ہماری زبان ایک ایسی زبان نہ ہوتی جو اپنا ماضی رکھتی۔ نول کشور پریس نے اردو ادب کو اس کا ماضی دیا اور اس کی روایات کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ کر کے ہمیشہ کے لیے اردو ادب کے نئے رجحانات کی پشت پناہی کے لیے راستہ استوار کر دیا۔"

۳ جنوری ۱۸۳۶ء کو متھرا کے ایک گاؤں "ریڑھا" میں اردو زبان کے اس محسنِ اعظم کی ولادت ہوئی اور ۵۹ سال کی عمر میں ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء کو بمقام لکھنؤ وفات ہوئی۔ ان کے والد منشی جمنا پرشاد ضلع علی گڑھ کے زمینداروں میں سے تھے اور دادا منشی بالمکند شاہ عالم کے عہد میں آگرہ کے افسر خزانہ تھے۔ متھرا، آگرہ اور علی گڑھ کے اضلاع میں ان کی کافی جائداد تھی، اسی لیے منشی نول کشور کی ابتدائی زندگی انھیں اضلاع میں گزری۔ وہ چھ سال کی عمر میں آبائی وطن ساسنی ضلع علی گڑھ کے ایک مکتب میں داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ثانوی تعلیم آگرہ میں حاصل کی۔

منشی نول کشور کو کم عمری ہی سے مضمون نگاری کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور انھوں نے اس کی مشق جاری رکھی۔ رفتہ رفتہ صحافت کی طرف رجحان بڑھتا گیا اور عرصے بعد لاہور کے مشہور اخبار "کوہ نور" کے عملۂ ادارت میں شامل ہو گئے۔ لاہور میں چار سال وہ کر منشی ہرسکھ رائے کی زیرِ نگرانی اردو صحافت، طباعت اور اشاعت کا عملی تجربہ حاصل کرنے کے بعد ۱۸۵۴ء کے آخر میں وہ آگرہ واپس آئے اور وہاں سے تھوڑا سا سرمایہ لے کر ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ آ گئے اور نول کشور پریس کی بنیاد ڈالی۔ لکڑی کے ہینڈ پریس اور چند پتھروں پر مشتمل "نول کشور پریس" ابتدا میں محلہ آغا میر کی سرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں قائم ہوا، پھر وہاں سے گولہ گنج میں منتقل کیا گیا۔ کچھ عرصہ رکاب گنج میں اور پھر بالآخر حضرت گنج کی ایک وسیع کوٹھی میں پریس اور بک ڈپو کے دفاتر اور گودام بنائے گئے۔ پریس کی جدید و قدیم مشینوں اور متعلقہ صنعتوں کا کاروبار حضرت گنج ہی کے ایک دوسرے قطعۂ آراضی پر قائم کیا گیا جو آج نول کشور روڈ کے نام سے موسوم ہے اور جہاں سے کبھی ایشیا کا سب سے بڑا پریس علوم و فنون کی روشنی پھیلا رہا تھا۔ نول کشور پریس کے قیام کے کچھ ہی ماہ بعد منشی نول کشور نے "اودھ اخبار" کے نام سے اردو کا ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا جو بعد میں ہفتے میں دو بار اور پھر روزنامہ کی حیثیت سے ۱۹۵۰ء تک اردو زبان و ادب کی خدمت کرتا رہا۔ "اودھ اخبار" کا پہلا شمارہ ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو شائع ہوا تھا جو فل اسکیپ سائز سے کچھ بڑے چار صفحات پر مشتمل تھا۔ بعد میں بڑے

سائز کے ۴۴ صفحات پر نکلنے لگا۔

اردو صحافت کی تاریخ میں "اودھ اخبار" کی خدمات زرّیں حروف سے لکھی جانے کے قابل ہیں۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی:

"منشی نول کشور کا روزنامہ "اودھ اخبار" اردو صحافت کی تاریخ میں بڑا ممتاز مرتبہ رکھتا ہے۔ اس اخبار کے ذریعہ اردو زبان و ادب کو بعض بلند پایہ اہلِ قلم مل گئے جن میں عبدالحلیم شررؔ، رتن ناتھ سرشارؔ، منشی امیر اللہ تسلیمؔ، سید امجد علی اشہریؔ، نسیمؔ دہلوی، مرزا حیرتؔ دہلوی، سید جالبؔ دہلوی، نوبت رائے نظرؔ، دوارکا پرشاد افقؔ، پیارے لال شاکرؔ میرٹھی، منشی پریم چند اور شوکت تھانوی جیسے ادیب و انشا پرداز شامل ہیں۔"

منشی نول کشور نے اپنے "اودھ اخبار" میں شائع ہونے والے مضامین کے لیے مضمون نگاروں کو معاوضہ دینے کا آغاز کیا۔ اودھ اخبار میں اردو کے بلند مرتبہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں جن میں مرزا غالبؔ، سر سید احمد خاں، مولانا حالیؔ اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کے نام بھی ملتے ہیں۔ اردو نظم کا عظیم ترین شاہکار "فسانۂ آزاد" اودھ اخبار کے کالموں میں قسط وار شائع ہوتا تھا اور بعد میں کتابی صورت میں نول کشور پریس ہی سے شائع ہوا۔

منشی نول کشور اردو زبان کے سب سے بڑے پبلشر تھے اور دنیا کا کوئی کتب خانہ شاید ہی ایسا ہو جہاں ان کے پریس کی شائع کردہ کتابیں موجود نہ ہوں۔ منشی جی کا اشاعتی منصوبہ بہت منظم اور بڑے سلیقے پر مبنی تھا کیونکہ خود ان میں اتر پردیش کی ذہانت اور پنجاب کی جرأت کا حسین امتزاج تھا۔ انھوں نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے بموجب ہر قسم کی چھوٹی بڑی کتاب شائع کی اور اس کی قیمت بہت کم رکھی تاکہ زیادہ سے زیادہ فروخت ہو سکے۔ اسی لیے مرزا غالب لکھتے ہیں:

"اس چھاپے خانے نے جس کا بھی دیوان چھاپا اس کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔"

ممتاز ادیب اور نقاد پروفیسر احتشام حسین رقمطراز ہیں:

"منشی نول کشور نے اپنے اخبار اور پریس کے ذریعہ علم و ادب کو زندگی بخشی اور ملک کی ذہنی بیداری میں جو حصہ لیا اسے نظر انداز کر کے ہندستان کی مکمل تہذیبی تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔ نشرواشاعت کے جدید ذرائع اختیار کر کے اپنی صلاحیت، سوجھ بوجھ، محنت اور ذوق سے منشی جی نے ان ادبی خزانوں کو برباد ہونے سے بچا لیا جو محض قلمی بیاضوں، سفینوں اور کتابوں میں لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ اور دسترس سے دور پڑے ہوئے تھے۔ اس احسان کو تسلیم کرنا مشرقی ادبیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر دانشور کا فرض ہے۔ میں اسے احسان ہی نہیں قرض تصور کرتا ہوں جسے ہمیں ادا کرنا ہے۔"

منشی نول کشور نے اپنے پریس کے لیے بلند مرتبہ ادیبوں اور عالموں پر مشتمل ایک دار الترجمہ قائم کیا تھا جس کے ذریعے عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، انگریزی، بنگالی، گورمکھی اور مراٹھی زبانوں کی بکثرت کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے گئے اور انھیں بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا۔

نول کشور پریس کے ذریعے اردو کی نثری داستانوں کا ایک طویل سلسلہ شائع ہوا۔ یہ بڑے حوصلے اور ہمت کی بات تھی کہ اس پریس نے دنیا کی سب سے زیادہ ضخیم کتاب "طلسم ہوش ربا" طبع کرائی۔ داستانِ امیر حمزہ، آفتاب شجاعت، لعل نامہ، طلسم نوخیز جمشیدی، طلسم فتنۂ نور افشاں وغیرہ ہزاروں صفحات پر مشتمل نثری داستانوں کی اشاعت کا سہرا بھی اسی پریس کے سر ہے۔ داستانوں کے اس طویل سلسلے نے اردو ادب کے خزانے کو مالا مال کر دیا۔

منشی نول کشور کو اردو زبان میں قرآن مجید کی سب سے بڑی تفسیر "مواہب الرحمٰن" کے شائع کرانے کا بھی فخر حاصل ہے۔ یہ تفسیر تیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور مولانا امیر علی ملیح آبادی کی کاوشِ علمی کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح فقہ اسلامی پر "فتاویٰ عالمگیری" کا اردو ترجمہ بھی دس ضخیم جلدوں میں اسی پریس کے ذریعہ منظرِ عام پر آیا۔

منشی جی نے اپنی زندگی میں چار ہزار کتابیں شائع کی تھیں جو گوناگوں عنوانات اور مختلف موضوعات پر مشتمل تھیں۔ تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، مذہبیات، نجوم، رمل، موسیقی، حساب، طب، زراعت، سائنس، قانون، علم الحیوانات، فلسفہ، منطق، تصوف، ویدانت

ادبیات، عمرانیات، معاشیات، خوش نویسی، طلسمات اور دیگر غرض کہ ہر موضوع پر نول کشور پریس کی مطبوعات موجود ہیں۔ اس طرح انھوں نے اردو ادب کے دامن کو انمول جواہرات سے بھر دیا اور اسے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مصنف "تاریخ ادب اردو" لکھتے ہیں:۔

"مطبع نول کشور نے زبان اردو کی بڑی خدمت کی اور اسکی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ نادر کتابوں کی اشاعت، مشہور کتب فارسی و عربی کے تراجم، جدید کتابوں کی پبلک مذاق کے موافق تیاری، نیز اسکولی کتابوں کی تیاری سے ادب اردو پر بہت بڑا احسان کیا۔ منشی نول کشور کی قابلیت، دیانتداری اور پابندی اصول سے یہ مطبع تھوڑے ہی عرصے میں ہندستان کیا بلکہ ایشیا کے سب سے بڑے مطابع میں شمار کیا جانے لگا۔ اس مطبع سے ہزارہا عربی، فارسی، سنسکرت، اردو اور ہندی کتابیں بڑے صرف اور بڑے تکلف سے چھپ کر شائع ہوئیں"

منشی نول کشور کی گوناگوں صفات نے انھیں حکومت اور عوام و خواص میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ بقول مرزا غالب: "خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے، گویا بجائے خود قرآن السعدین ہیں"

ان کا دل تعصب سے پاک، نیت صالح اور حوصلے بلند تھے۔ انھوں نے ہندستان کی قومی یکجہتی کے لیے اپنے پریس کے ذریعے لافانی کارنامے انجام دیے۔ ان کی وسیع القلبی کا یہ حال تھا کہ ایک طرف ہندو مذہب کی کتابیں شائع کرتے اور دوسری طرف اسلامی کتابوں اور دوسرے مذاہب کی کتابوں کی اشاعت میں بیش از بیش حصہ لیتے۔ انھوں نے ایک مذہب کے لوگوں کو دوسرے مذہب کے لوگوں سے قریب لانے اور قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کو ہندی میں اور سکھوں اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کو اردو میں بھی شائع کر کے ملک و قوم کی عظیم خدمت انجام دی اور قومی اتحاد و یگانگت کی داغ بیل ڈالی، جس کی اہمیت سے آج کے جمہوری دور میں انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ان اعلیٰ صفات اور جذبات کی بنا پر اس وقت کی برطانوی حکومت نے منشی جی کی عظیم خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اعلیٰ خطابات سے نوازا۔ ایران اور افغانستان کے بادشاہوں نے عزت و احترام کے ساتھ اپنے برابر جگہ دی۔ اور آزادی کے بعد ۱۹ فروری ۱۹۷۰ء کو حکومت ہند نے محکمۂ ڈاک کی طرف سے ان کی پچھترویں برسی کے موقع پر خصوصی ڈاک ٹکٹ جاری کیے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک اردو زبان زندہ ہے، منشی نولکشور اور ان کے عظیم کارناموں کی یاد اردو بولنے والوں کے دلوں سے نہ مٹ سکے گی۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

جشنِ آزادی

ودود قمر

ہر ایک سمت اُجالا دکھائی دیتا ہے
وطن میں نور کا تڑکا دکھائی دیتا ہے
ہر ایک ذرہ سنہرا دکھائی دیتا ہے
فلک پہ جیسے ستارا دکھائی دیتا ہے
ہر ایک سمت مسرت بھری فضائیں ہیں
زمیں پہ خلد کا نقشا دکھائی دیتا ہے
ہر ایک چہرہ ہے تازہ گلاب کی صورت
ہر ایک فرد سجیلا دکھائی دیتا ہے
نویدِ صبحِ مسرت ملی ہے بھارت کو
شگفتہ زیست کا چہرا دکھائی دیتا ہے
نہ ہو زمین پہ کیوں رنگ و نور کی بارش
فلک پہ آج ترنگا دکھائی دیتا ہے
ہماری جہدِ مسلسل کا یہ نتیجہ ہے
کہ آج قطرہ بھی دریا دکھائی دیتا ہے
قمرؔ عدو کے لیے دن یہ باعثِ غم ہو
مجھے تو عیشِ سراپا دکھائی دیتا ہے

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

کتاب - وہ صورتیں الٰہی - مصنف : مالک رام
صفحات : ۲۵۶ قیمت : ۱۰ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شخصیت کیا ہے اس کا مکمل جواب دینا تو مشکل ہے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی ایسی صفت کا کرشمہ یا چند ایسی صفات کا مجموعہ ہے جو ایک شخص کو دوسرے شخص سے ممتاز کرتا ہے۔ اگر یہ شخص ایک ادیب یا فن کار ہو تو اس کی شخصیت میں ایک بانکپن پیدا ہو جاتا ہے اس بانکپن کی بدولت اسے دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔

مالک رام صاحب کی نئی کتاب وہ صورتیں الٰہی چند ایسے ہی مشاہیر کے نقوش کا مرقع ہے۔ اس میں آٹھ ایسے معاصر ادیب ہیں جن سے مصنف کو ملاقات اور استفادے کے مواقع میسر آئے اور نویں حضرت غالب ہیں جنھیں مالک رام نے چشم تصور سے اتنا ہی قریب سے دیکھا ہے جتنا کتاب کے باقی بزرگوں کو۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ دوسروں کی موت کے بعد تو ان سے ملاقات کا سلسلہ ٹوٹ گیا لیکن غالب سے برابر جاری رہا۔ غالب پر اپنے مضمون میں جو کتاب میں بجا طور پر سر فہرست ہے نہایت دل چسپ انداز میں لکھتے ہیں "اور حق تو یہ ہے کہ مالک رام ہی ایسا لکھ سکتے ہیں کہ" ان سے ہمارے خاندان کے پرانے تعلقات تھے۔ بلکہ دور نزدیک سے کچھ عزیز داری بھی۔ میرے والد ان کے ہم عمر اور ہم جولی تھے۔ غالب انھیں بھائی کہتے تھے۔" اپنے والد ہی کے کہنے پر مالک رام عنفوان شباب میں غالب کے ہاں سلام شوق کے لیے حاضر ہوئے۔ اس وقت غالب کا سن ۵۰ سے اوپر تھا اور وہ میاں کالے کی حویلی میں رہتے تھے ان کے ہاں اس کے بعد وہ بار بار جاتے رہے بلکہ بار بار یاد بھی کیے گئے۔ غالب کی نجی زندگی اور رہن سہن کے دل چسپ پہلو۔ ان کی بیماریاں، مشکلات، زندہ دلی، بچوں سے محبت، بیگم، عزیزوں اور یہاں تک کہ ملازموں سے شفقت، مہمان نوازی، دوست پسندی۔ وضع خاص نفاست متانت، زیرک نگاہی سبھی کا حسین و جمیل عکس اس مضمون میں اُتر آیا ہے۔ ہم عصر شعرا کا ان کے ہاں آنا اور گل چینی کرنا مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے ہاں شعرا کی خاص محفل میں غالب کا اپنے مخصوص انداز میں اور ہلکے ترنم میں فارسی غزل سنانا اور پھر نور گڑھ کے پاس جمنا کی ریتی میں اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر کے جوان دنوں ان سے اصلاح بھی لیتے تھے اصرار پر ادب و احترام سے پتنگ کے قلابے سے مثنوی کے طور پر لکھے ہوئے اپنے ابتدائی زمانے کے اشعار سنانا، مصنف کی خیالی ملاقاتوں کے کچھ ایسے تاثرات ہیں جو حقیقت سے زیادہ حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ غالب کے بڑھاپے کی قلمی تصویر کمر بند کی گرہیں کھولتے ہوئے رات کو فکر کیے ہوئے شعر کہتے جانا اور پھر ۱۸۵۷ء کے رستخیز ہنگامے کے بعد ان کی اداسی غرض کہ غالب کے آخری تیس سال کے تخیلاتی مشاہدے کو ان کی باقی زندگی کے پس منظر میں ایسی مہارت اور عمدگی سے پیش کیا گیا

کہ مصنف اور فن کار کے ناقابل عبور زمانی فصلے پر یقین ہی نہیں آتا۔

غالب مالک رام کے معبود اور محبوب رہے ہیں۔ اس سے یہ خدشہ ہوتا ہے کہ وہ غالب کو جو توجہ دے سکتے ہیں وہ کسی اور شاعر یا ادیب کو نہیں دے سکتے لیکن اس کتاب سے اس واہمے کی بھرپور نفی ہوتی ہے۔ چنانچہ نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی۔ نواب صدر یار جنگ۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی۔ مرزا یاس عظیم آبادی ثم یگانہ چنگیزی۔ جگر مرادآبادی۔ میاں محمد خاں، نیاز فتح پوری اور غلام رسول مہر پر بھی ان کے مضامین جامع اور وقیع ہیں۔ اپنے مخصوص اسلوب کے مطابق انھوں نے ہر ادیب کا پورا شجرہ نسب، موروثی خصوصیات، اور زندگی کے ابتدائی زمانے کے اثرات بیان کیے ہیں۔ سماجی اثرات اور شعور و لاشعور کی کش مکش میں ان کی شخصیت کردار اور فن کا قلب در دمند اور نگاہ تحسین سے جائزہ لیا ہے۔ مصنف کی سخن فہمی کا اندازہ کہا اس سے لگایا ہے کہ انھیں یگانہ کی غالب دشمنی پسند نہ تھی لیکن جب انھوں نے ۱۹۲۱ء میں لاہور میں پہلی بار انھیں ایک مشاعرے میں سُنا تو وہ ان کی غزل سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کے کلام کی بلندی دیکھ کر مالک رام کی پوشیدہ اور غیر شعوری مخالفت ہوا ہو گئی اور اس کی جگہ ہم دردی نے لے لی۔ لکھنؤ والوں نے ۵۰ سال تک یگانہ کی جو مخالفت کی اور بعد میں ان کے ایک نجی خط کی بنا پر ان کی جو گت بنائی اس کی خبر پا کر مالک رام صاحب کو جو ان دنوں اسکندریہ (مصر) میں تھے۔ دلی افسوس اور رنج ہوا۔ اس جان لیوا حادثے پر خود یگانہ کے ردعمل سے مالک رام بہت مرعوب ہوئے۔ انھوں نے مالک رام کو اپنے خط میں کوئی نا روا کلمہ نہیں لکھا بلکہ بڑے ضبط اور تحمل کا ثبوت دیا۔ اس سے یگانہ کے کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھیں اپنے کلام پر ناز تو تھا لیکن اپنے نقادوں اور مخالفوں سے کوئی کینہ یا عناد نہیں تھا۔

ہم عصر ادیبوں سے تعلقات استوار کرنے کے لیے جہاں ایک طرف مالک رام خواہش مند رہے ہیں وہاں دوسری طرف اکثر ادیب بھی ان کی دوستی کے لیے کوشاں رہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کا واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کیفی صاحب جن کا انتقال ۸۹ سال کی عمر میں ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ ۱۹۵۱ء تک مالک رام صاحب سے کبھی نہیں ملے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں انھوں نے ایک نیاز مند کی حیثیت سے مالک رام کو جو ان دنوں بسلسلہ کار منصبی بغداد میں تھے ایک خط لکھا اور کہا کہ میں اپنی تمام ادبی جائداد آپ کے حق میں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اجازت تحریر فرمائیں اور جب ہندوستان واپس آئیں تو مجھ سے ضرور ملیں یہ ان کے تعارف کی ابتدا تھی۔ مالک رام نے کیفی کو بنفس نفیس جنوری ۱۹۵۲ء میں دیکھا یعنی ان کی وفات سے قریباً تین سال پہلے اور پھر ان کے ساتھ ایسے گہرے تعلقات ہو گئے جو بے مثل تھے۔

اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے کیفی کی لگن اتنی گہری تھی کہ انھوں نے ساری زندگی اس کے لیے وقف کر دی۔ اس صدی کے پہلے نصف میں اردو کی ایسی کوئی قابل ذکر تحریک نہیں تھی جس میں انھوں نے دامے درمے قدمے اور سخنے حصہ نہ لیا ہو۔

کیفی کے ہم عصر سائل دہلوی کی جو تصویر مالک رام نے پیش کی ہے وہ بہت دل نشین ہے۔ خوش خوراک۔ خوش عقیدہ۔ خوش ترنم حقیقی بزرگی اور علم کے

قدر شناس۔ بناوٹ اور تملق کے سخت دشمن اپنے خیالات کے اظہار میں بیباک اور لُبیلے مزاج کے خاندانی نواب تھے۔ جنھوں نے اردوئے معلیٰ کا عمدہ نمونہ پیش کیا۔ ان کا سرمایہ بلا مبالغہ ایک لاکھ شعر سے کم نہیں لیکن ان کا بہت بڑا کارنامہ ان کی مثنوی "نور علیٰ نور" ہے جس میں نورالدین جہانگیر بادشاہ اور ملکہ نورجہاں بیگم کی حیات معاشقہ کا بیان ہے۔ افسوس کہ وہ نامکمل رہ گئی ورنہ خاصے کی چیز ہوتی۔

مالک رام عمر بھر کتابوں کے رسیا رہے چنانچہ نواب صدر یار جنگ سے راہ و رسم بڑی آسانی سے پیدا ہو گئی کیونکہ نواب موصوف بھی کتابوں کے عاشق تھے۔ جہاں کہیں اچھی کتابیں اور عالموں کی صحبت مل جاتی ان کا بیرونی پردہ اٹھ جاتا اور وہ اپنے اصلی روپ یعنی پرستار علم کی صورت میں نمایاں ہو جاتے۔ وہ رئیس بن رئیس تھے لیکن انھوں نے اپنی عمر رئیسوں کی لغویات میں ضائع نہ کی۔ حبیب گنج میں ان کا بھرپور کتب خانہ عالموں اور طالبان علم کے لیے جنت نگاہ تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی سے مصنف کا تعارف مولانا کی تصنیف "عرب و ہند کے تعلقات" سے ہوا جس کا نسخہ انھوں نے بازار سے خریدا اور ازراہ شوق اس کا مطالعہ کیا۔ اسے ختم کرنے کے بعد یہ حسرت رہی کہ کاش یہ کتاب ابھی کچھ اور لمبی ہوتی۔ ان پر مولانا کے وسیع اور گہرے مطالعے کا بہت اثر ہوا اور انھیں عربی ماخذوں کو اردو میں منتقل کرنے کا خیال ہوا۔ چنانچہ انھوں نے مولانا کو خط لکھا کہ اس کام میں وہ ان کی رہنمائی کریں۔ یہ ان کے تعلقات کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد موضوعات اور مشاغل کا اشتراک انھیں بہت قریب لے آیا۔ مولانا سلیمان ندوی اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی کے شاگردوں میں رئیس الطائفہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ بنیادی طور پر ان کی تعلیم سراسر مذہبی تھی لیکن انھوں نے اپنے مطالعے کو مذہب تک محدود نہیں رکھا اور انھوں نے اردو زبان کو گوناگوں تصنیفات سے مالا مال کیا۔

نیاز فتح پوری سے مصنف کا تعارف رسالہ نگار کے ایک شمارے کے مطالعے سے ہوا۔ انھیں لکھنے کی طرف توجہ بھی نگار اور نیاز صاحب کی تحریروں کے مطالعے سے ہوئی۔ خیال و فکر کی دنیا میں نیاز ایک ہیرو کی طرح داخل ہوئے اور چالیس سال تک اپنے جریدہ کے ذریعے اس دنیا کو مسحور اور متحیر کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جرأت خیال سے بہت سے ادبی سماجی اور مذہبی بت توڑے۔ کافر انھیں مومن اور مومن انھیں کافر سمجھتے رہے۔ حالانکہ وہ صرف انسان تھے۔

ادیبوں کے کردار میں ان کا مذہب بھی خوب نشیب و فراز دیکھتا ہے۔ جگر مرادآبادی مزاجاً دین پسند تھے لیکن عملاً بلا کے شراب نوش تھے۔ تاہم انھوں نے فسق و فجور میں کبھی لذت محسوس نہیں کی۔ جو کچھ سرزد ہوا اضطراری طور پر ہے۔ ہوش کی حالت میں وہ ہمیشہ پشیمان ہوتے اور اس سے باز رہنے کے منصوبے باندھتے۔

یہ توقع کرنا کہ پھر کوئی جگر سا غزل گو اور ترنم میں پڑھنے والا شاعر پیدا ہوگا امید موہوم سے زیادہ نہیں۔

کتاب کا آخری مضمون غلام رسول مہر پر ہے لیکن یہ زیادہ تر ان کی صحافت کے زرین دور کا تذکرہ ہو گیا ہے۔ اس میں مہر کی نصف سے بھی کم حاضری کا خود مصنف نے بھی اعتراف کیا ہے اور ان پر پھر کبھی ایک مستقل مضمون لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

کتاب میں ہر ادیب اور شاعر کا حلیہ نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان مشاہیر کے بارے میں یہ حصے اگر الگ سے جمع کر لیے جائیں تو ان ادیبوں کی قلمی تحریروں کا ایک اچھا البم تیار ہو سکتا ہے۔

یہ کتاب ایسے بزرگان تہذیب و تمدن کا مرقع ہے جو اپنی ذات سے انجمن تھے۔ اعلیٰ اور ارفع قدروں کے امین تھے۔ ایک دور کی روح اور اساس تھے۔ ان کا وجود سرتاسر خیر اور صدقہ جاریہ تھا۔ اب وہ علم و فضل وہ انکسار و تواضع وہ محبت و نوازش خواب و خیال ہوتے جا رہے ہیں۔

——— محمد حنیف چندن

نامے جو میرے نام آئے

مرتبہ: ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ

ضخامت: ۸۸ صفحات

طابع: روشن پریس، ۱۲ سری ناتھ بابو لین کلکتہ ۱۲۔ قیمت: تین روپے

ملنے کا پتا: ۱۰/۲ ای۔ اشوک نگر، ریجنٹ پارک، کلکتہ ۴۰

'نامے جو میرے نام آئے' ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مرتب کے پاس وقتاً فوقتاً مشاہیر نے بھیجے تھے۔ اس انتخاب میں خاص طور سے مرحومین اور تارکین وطن کے خطوط کو شامل کیا گیا ہے جن کی مجموعی تعداد ۵۶ ہے۔ ان خطوط کی وضاحت کے لیے حواشی بھی مرتب کیے گئے ہیں۔

مکاتیب نگاری کی اختراع انسانی زندگی کے ہمہ گیر تقاضوں کے پیش نظر عالم وجود میں آئی ہے۔ ابتدا میں یہ روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرتی تھی لیکن رفتہ رفتہ اب یہ ترقی کر کے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر چکی ہے یہاں عملی انداز میں خطوط نگاری پر بحث کرنا مقصود نہیں صرف اس بات کی وضاحت کر دینا ہے کہ خطوط کی مختلف قسمیں ہیں جن میں سیاسی، دفتری، تجارتی، علمی، شخصی اور جذباتی وغیرہ زیادہ مستعمل ہیں لیکن موٹے طور پر اس کی دو قسمیں ہیں ایک نجی اور دوسرے عوامی۔ زیر تبصرہ مجموعۂ مکاتیب کی حیثیت بالکل نجی ہے۔ اس سے انشائے عام سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ہاں کسی حد تک ان خطوط پر "المکتوب نصف الملاقات" کا مقولہ صادق آتا ہے۔ پھر بھی ان خطوط کے مفید اور معلوماتی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

——— ڈاکٹر فضل امام

جلد ۳۱ نمبر ۶

ستمبر ۱۹۷۵ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

عنوانات

پبلشر: کماری سرلا ساہنی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر: اشوک دوہ
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ مرکزی گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ ۔ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ ۔ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

اپنی بات

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کے اعلان کے ساتھ ساتھ پردیش میں ہریجنوں، پس ماندہ اقوام و قبائل اور کمزور طبقوں کی ترقی اور انھیں سماج میں برابری کا درجہ دلانے نیز صدیوں سے ان پر روا رکھے جانے والے مظالم اور چیرہ دستیوں کا سدباب کرنے کے اقدامات کی رفتار تیز تر کردی گئی ہے۔ یوں تو ان پس ماندہ اور کمزور طبقوں کی فلاح و ترقی کی جانب ریاستی حکومت پہلے ہی سے متوجہ تھی اور اس سلسلے میں مختلف اسکیموں اور پروگراموں کے علاوہ کئی قوانین بھی وضع کیے گئے۔ چنانچہ ۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو ایک آرڈی ننس جاری کرکے بے زمین اور ایک ایکڑ تک کے کھاتے دار ہریجنوں اور اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے ان لوگوں کو جو کئی پشتوں سے مہاجنوں کے قرض دار چلے آ رہے تھے ان قرضوں سے نجات دلا دی گئی۔ اس آرڈی ننس کے اجرا کے لیے ۲ اکتوبر کو جو مہاتما گاندھی کا یوم پیدائش ہے، اس لیے منتخب کیا گیا کہ گاندھی جی ہی کی وہ ذات تھی جنھوں نے عمر بھر ہریجنوں اور پس ماندہ طبقوں کے اٹھانے کے لیے جنگ کی اور بالآخر اس کے لیے جان بھی دے دی۔ اس طرح یہ آرڈی ننس جو محسن قوم گاندھی جی کے تئیں ایک چھوٹا سا نذرانۂ عقیدت تھا، ایک اہم انقلاب کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا قدم تھا جس میں پہل بھی اتر پردیش ہی نے کی۔ بعد میں اس آرڈی ننس کو قانونی شکل دے دی گئی۔ اب حال ہی میں اس میں ترمیم کرکے اسے زیادہ وسیع بنا دیا گیا ہے۔ اور اس کی رو سے تمام بے زمین افراد اور ایک ایکڑ تک جوت رکھنے والے بھی کسان، خواہ وہ کسی طبقے اور قوم و قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں، مہاجنوں کے قرضوں سے چھٹکارہ پا گئے ہیں۔ کمزور طبقوں کی بہبود کے لیے ایک اور اہم قدم پابند مزدوروں کے رواج کو ختم کرنے کے لیے بھی اٹھایا گیا ہے۔ چنانچہ کسی معاہدے، اقرارنامے یا رواج کے مطابق مزدوروں، ان کے خاندان والوں یا آئندہ نسلوں کو دھمکی یا لالچ کے ذریعے زمین مالکوں کے یہاں کام کرنے کے لیے پابند بنانے کا طریقہ قانوناً ختم کردیا گیا ہے۔ پابند مزدوروں کے رواج کے خاتمہ سے پردیش میں بلاشبہ ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ اس سلسلے میں جوت حد بندی قانون کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ جوت حد بندی قانون اگرچہ کچھ عرصہ قبل وضع کیا گیا لیکن بعض اسباب کی بنا پر وہ مقصد پورا نہیں ہو رہا تھا جس کے لیے یہ قانون بنا تھا۔ اس لیے اس قانون میں بعض ضروری ترمیمیں کرکے نہ صرف جوت کی حد کم کردی گئی ہے بلکہ اس پر عمل درآمد کے لیے زیادہ موثر قواعد و ضوابط وضع کیے گئے ہیں۔ وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی پروگرام کے ذیل میں جوت حد بندی قانون کے تحت فاضل قرار دی جانے والی آراضیات کی بے زمین کھیت مزدوروں اور دیہی دستکار خاندانوں میں سریع تقسیم اور اس بات کی دیکھ بھال کے لیے کہ آراضی کی تقسیم میں کوئی بے قاعدگی اور ناانصافی نہ ہو، پردیش کا ایک ایک ضلع ریاستی وزیروں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ حکومت کے اس اقدام سے نہ صرف تقسیم کے کام کی رفتار بڑھ گئی ہے بلکہ آراضیات کی منصفانہ تقسیم بھی ہو رہی ہے اور شکایتوں اور بے قاعدگیوں کا موقع ہی پر ازالہ بھی ہو جاتا ہے۔ موجودہ پروگرام کے مطابق فاضل آراضیات کی تقسیم کا کام ۲۹ فروری ۱۹۷۶ء تک مکمل ہو جائے گا۔

معاشی ترقی سے متعلق ۲۰ نکاتی پروگرام کے ذیل میں جو دیگر اقدامات کیے گئے ہیں ان میں کمزور طبقوں کو مفت قانونی سہولتوں کی فراہمی، غیر قانونی قبضوں کو ختم کرنے کے لیے قانونی بندوبست، بے زمین کھیت مزدوروں اور دیہی دستکار خاندانوں کو مکان بنانے کے لیے زمین کا الاٹمنٹ، قیمتوں پر کنٹرول اور ضروری اشیا کی مناسب تقسیم، جنتا دکانوں کی نئی اسکیم، اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور ٹیکسوں کی چوری روکنے کے لیے سخت کارروائی، مختلف کارخانوں میں اپرنٹسوں کے لیے جگہیں محفوظ کرنے، کمزور طبقوں کے درجہ ا سے درجہ ۵ تک کے طالب علموں کو مفت نصابی کتابیں فراہم کرنے، صنعتوں میں مزدوروں کی ساجھے داری کو یقینی بنانے کے اقدامات کے علاوہ ۱۹۷۵-۷۶ء میں حکومت کے پلان اخراجات میں ۱۱ کروڑ ۶۰ لاکھ اور نان پلان اخراجات میں ۴ کروڑ روپے کی بچت کا نشانہ، ۱۹۷۵-۷۶ء ہی میں ۱ لاکھ ۵۳ ہزار مزید ہیکٹے کی سینچائی کے بندوبست کا نشانہ اور بنکروں کو مزید مالی امداد دینے اور سوت کی فراہمی کے لیے ۲ کتائی ملوں کے قیام کا نشانہ شامل ہے۔ جہاں تک ان اقدامات میں کامیابی کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مکان کی تعمیر کے لیے اب تک ۲۵۳۴۱۱ بے کھیت مزدوروں اور ۹۹،۰۰۹ دیہی دستکار خاندانوں کو زمین دی جا چکی ہے، کھیت مزدوروں کی کم سے کم اجرت معین کردی گئی ہے، اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور ٹیکس ماری کے خلاف سخت کارروائی کے نتیجے میں گرفتاریوں کے علاوہ ڈیڑھ کروڑ روپے کا سامان ضبط کیا جا چکا ہے اور مختلف کارخانوں میں ۲۵۰۰ جگہیں اپرنٹسوں کے لیے محفوظ اور ۲۵۹۴ اپرنٹسوں کی تقرریاں کی جا چکی ہیں۔

بہر حال ہنگامی حالات کے اعلان نے استحصال سے آزاد سماج کی تشکیل، ڈسپلن اور مستعدی سے کام لینے، کھیتوں، کارخانوں اور دیہی اور گھریلو صنعتوں میں پیداوار بڑھانے اور اس طرح ملک کو خوش حال بنانے، باتیں کم اور کام زیادہ کرنے اور اپنی آزادی، جمہوریت اور سالمیت کو بچانے اور اسے برقرار رکھنے کا ایک موقع ملا ہے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا انقلابی پروگرام انھیں مقاصد کی تکمیل کے لیے ہے۔ یہ موقع ہم نے کھو دیا تو آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہ کریں گی۔ اس لیے آیئے وزیر اعظم کے پروگرام کو کامیاب بنائیں اور ہنگامی حالات نے ہم پر جو ذمے داریاں عائد کردی ہیں ان سے عہدہ برآ ہوں۔

—— ایڈیٹر

غزل

خمار بارہ بنکوی

عشق خدا کی دین ہے عشق سے منھ نہ موڑیے
چھوڑیے زندگی کا ساتھ دل کا نہ ساتھ چھوڑیے

اپنے کہاں کے غیر کیا اب یہ جنون چھوڑیے
درد سبھی کا درد ہے درد سے رشتہ جوڑیے

مجھ کو یہ سوچنا پڑے آپ مرے ہیں یا نہیں
خوفِ جہاں بجا مگر ایسے تو منھ نہ موڑیے

سجدے کا حق جو ہو ادا ایک ہی سجدہ دے مزا
ویسے خوشی ہے آپ کی سر ہمہ عمر پھوڑیے

خانہ خرابِ آرزو دعوتِ خودکشی بھی دے
ضد بھی کرے ستم ظریف ساتھ مرا نہ چھوڑیے

سایۂ التفات میں عشق کی آنکھ لگ نہ جائے
لطف و کرم کے ساتھ ساتھ آپ ستم بھی توڑیے

میں ہوں بُرا مجھے قبول پھر بھی جنابِ محتسب
میرے معاملات کو میرے خدا پہ چھوڑیے

عشق ہے کتنا جاں فزا بعد میں ہوگا فیصلہ
پہلے تو حضرتِ خمارؔ دامنِ تر نچوڑیے

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی رستوگی

غالب بچشم اقبال

غالب کی یہ خوداعتمادی کہ ع

شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

قابل صد ستائش ہے۔ ان کے شعر و فکر کے مداحوں میں علامہ اقبال کی شمولیت غالب کی شہرت و مقبولیت کو بقائے دوام کی سطح پر لے آئی ہے۔ اقبال نے غالب کے فکر و فن پر جو وقتاً فوقتاً اظہارِ خیال کیا ہے اس کو تنقیدی نظر سے دیکھنے پر غالبیات کو قابلِ قدر رسمت و جہت سے روشناس کرا تا ہے علاوہ بریں غالب سے متعلق اقبال کے خیالات کو بھی روشنی میں لاتا ہے۔ پہلے اقبال کے خیالات متعلقہ غالب کے ماخذ ملاحظہ ہوں :

۱۔ سر کرشن پرشاد (؟) کی صدارت میں ۱۵ فروری ۱۹۳۶ کو غالب ڈے (GHALIB DAY) وسیع پیمانہ پر منایا گیا اور اس کی تقریبات کو دہلی براڈکاسٹنگ اسٹیشن نے اپنے خصوصی پروگرام میں پیش کیا۔ غالب ڈے پر اقبال نے جو پیغام بھیجا اور مسز سروجنی نائیڈو نے جو انگریزی میں تقریر کی، ان دونوں میں پیش کیے گئے نکات خاصے وقیع ہیں۔ اقبال نے اپنے پیغام میں کہا:

"جناب خواجہ صاحب!

دو سال سے علیل ہوں :

سخن اے ہم نشیں از من چہ خواہی
کہ با من خویش دارم گفتگوئے

...... پیغام کے لیے مراقبہ کیا تو مرزا ہرگوپال تفتہ مرحوم کی روح سامنے آئی اور...... یہ دو شعر نازل کر کے غائب ہو گئی :

دریں محفل کہ افسونِ فرنگ از خود ربود او را
نگاہے پردہ سوز آور، دلے دانا سے راز آور
مئے ایں ساقیان لالہ رو ذوقے نمی بخشد
ز فیضِ حضرت غالب ہماں پیمانہ باز آور

...... زیادہ کیا عرض کروں، سوائے اس کے کہ دعا کا محتاج ہوں......"

(مکتوب بنام خواجہ حسن نظامی، منادی دہلی بابت ۲۱-۲۸ فروری ۱۹۳۶ء)

۲۔ اقبال کبھی کبھی اپنے تاثرات کو ڈائری میں نوٹ کیا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ ڈائری STRAY REFLECTIONS کے نام سے ۱۹۶۱ میں لاہور سے شائع ہوئی۔ غالب سے متعلق اس ڈائری میں جو اندراجات ملتے ہیں ان کے اردو ترجمے یہاں پیش کیے جاتے ہیں :

"جہاں تک میری نظر جاتی ہے مرزا غالب، شاعر فارسی ہی ہم ہندستانی مسلمانوں کی دائمی دین (PERMANENT CONTRIBUTION) ہے جو ہم نے اسلامی ادبیات کے لیے پیش کی ہے۔ فی الواقعی وہ ان شاعروں میں سے ایک ہے جو اپنے تخیل، ہوش و خرد کی بنا پر فرقہ واریت اور قومیت کی حد بندیوں سے بالاتر رہتے ہیں۔ اس کو بھرپور مقبولیت ابھی ملنا باقی ہے (STRAY REFLECTIONS ص ۲۳)

مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، مرزا عبدالقادر بیدل اور ورڈس ورتھ سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔

پہلے دو شخصوں نے اشیاء کی درونیت (INSIDE) تک میری رہنمائی کی۔ تیسرے اور چوتھے یعنی غالبؔ اور بیدلؔ نے مجھے یہ سکھایا کہ شاعری کے بیرونی آدرشوں کو سمو کر کس طرح روح و ترسیل میں مشرقیت کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ موخرالذکر نے دورانِ طالب علمی مجھے لادینی (ATHEISM) سے بچایا۔

(STRAY REFLECTIONS ص ٣٩)

٣۔ بانگِ درا میں شامل غالبؔ پر نظم جو پہلی مرتبہ مخزن بابت ستمبر ١٩٠١ میں شائع ہوئی تھی غالبؔ شناسی کی بہترین مثال کہی جا سکتی ہے۔ درج ذیل بند ملاحظہ ہوں:

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ گفتار پر ۔۔۔ محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر ۔۔۔ خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر
آہ تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ۔۔۔ ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سر زمیں ۔۔۔ آہ اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں
گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دلسوزیِ پروانہ ہے

٤۔ اس نظم کے پانچ سال بعد ستمبر ١٩٠٥ میں غالبؔ کے مزار پر حاضر ہو کر اپنے تاثرات و جذبات کا اظہار اپنے ایک مکتوب بنام مولوی محمد انشاء اللہ خاں میں کیا ہے:

".......شام کے قریب ہم اس قبرستان (جہاں حضرت محبوبِ الٰہی کا مزار ہے) سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب (خواجہ حسن نظامی) سے کہا کہ ذرا غالبؔ مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنجِ معانی مدفون ہے جس پہ دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت ایک نہایت خوش آواز لڑکا...... تھا۔ اس ظالم نے مزار کے قریب بیٹھ کر

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

کچھ ایسی خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہو گئیں۔ بالخصوص اس نے جب یہ شعر پڑھا:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھیں پر نم ہو گئیں اور بے اختیار لوحِ مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ سے رخصت ہوا۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے تو دل کو تڑپا جاتا ہے۔ ...."

(از اخبار وطن لاہور بابت ١٦۔ اکتوبر ١٩٠٥)

٥۔ اقبالؔ نے اپنی تصنیف جاوید نامہ (مطبوعہ ١٩٣٢) میں غالبؔ، حلاجؔ، و طاہرہ کو فلکِ مشتری پر دکھایا ہے۔ بطور سرخی یہ لکھا گیا ہے:

"ارواحِ جلیلۂ حلاجؔ و غالبؔ و قرۃ العین طاہرہ کہ بہ نشیمنِ بہشتی نگرویدند و بگردشِ جاوداں گرائیدند۔"

(یعنی حلاجؔ، غالبؔ، طاہرہ کی ارواحِ جلیلہ جنھوں نے دائمی گردش کو بہشت پر ترجیح دی)

تینوں کی عظمت درج ذیل اشعار میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے:

پیشِ خود دیدم سہ روحِ پاک باز
آتش اندر سینہ شاں گیتی گداز
در برِ شاں حلہ ہائے لالہ گوں
چہرہ ہا رخشندہ از سوزِ دروں
در تب و تابے ز ہنگامِ الست
از شرابِ نغمہ ہائے خویش مست

غالبؔ و حلاجؔ و خاتونِ عجم
شورہا افگندہ در جانِ حرم
ایں نواہا روح را بخشد ثبات
گرمیِ او از درونِ کائنات

(یعنی اپنے سامنے میں نے تین پاک روحوں کو دیکھا، ایسی

روحیں جن کے سینوں میں گیتی گداز آتشِ عشق فروزاں تھی۔ لالہ گوں حلے اوڑھے ہوئے ان تینوں کے چہرے سوزِ باطنی سے دمک رہے تھے۔ یہ روحیں ان کی تھیں جو ہنگامِ الست سے اپنے ہی کیفِ آور نغموں میں کھو کر رہ گئے تھے۔

غالب و حلاج، خاتون عجم یعنی قرۃ العین طاہرہ نے جہانِ حرم میں حرکت و شور پیدا کر دیا جس کے سبب ایسے نغمے معرض وجود میں آئے جو روح کو ثبات بخشتے ہیں کیونکہ ان کی نغمگی میں جو گرمی ہے وہ درونِ کائنات سے عبارت ہے۔)

آگے چل کر اقبال نے زندہ رود کی زبانی غالب سے اس کے ایک شعر کے معنی و مطلب دریافت کیے:

اے ترا دادند دردِ جستجو
معنیٔ یک شعر خود با من بگوے
"قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ چیست"

(یعنی تو جو یاے حقیقت ہے، قدرت نے تجھے دردِ جستجو عطا کیا ہے۔ تو اپنے اس شعر کی تشریح کر کہ قمری تو نالہ کرنے پر اس کی آگ میں جل کر خاک ہو جاتی ہے مگر بلبل ہزار جان سے گلہاے رنگا رنگ پر قربان ہونے کے باوجود "قفسِ رنگ" ہو جاتی ہے۔ اے نالہ، جگرِ سوختہ کی نشانی کہاں ڈھونڈھی جائے۔)

یہ بات غالباً دلچسپی کا باعث ہوگی کہ اقبال نے غالب کی ایک اردو غزل سے ایک شعر قدرے تصرف کے ساتھ فارسی طبوس میں پیش کیا ہے ؎

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

"قفسِ رنگ" نے ہفت خوان پیش کر دیے ہیں جگر سوختہ ہونے سے کیا نشانیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اقبال نے غالب سے یہ اشعار کہلوائے ہیں:

نالہ کو خیزد از سوزِ جگر　　ہر کجا تاثیر او دیدم دگر
قمری از تاثیر او وا سوختہ　　بلبل از وے رنگہا اندوختہ
اندر و مرگے باغوشِ حیات　　یک نفس اینجا حیات اندر ممات
آں چناں رنگے کہ ارژنگی ازوست　　آں چناں رنگے کہ بے رنگی ازوست
تو ندانی ایں مقام رنگ و بوست　　قسمتِ ہر دل بقدرِ ہاے و ہوست
یا برنگ آیا بہ بے رنگی گذر　　تا نشانے گیری از سوزِ جگر

(یعنی نالہ ہے تو سوزِ جگر سے عبارت مگر ہر جگہ اس کی تاثیر جداگانہ رہتی ہے۔ قمری اس کی اثر سے خاک کا ڈھیر بن جاتی ہے مگر بلبل زندہ رہتی ہے اور جہانِ رنگ و بو کو اندوختہ کرنے لگتی ہے اس کی موت میں حیات مضمر ہوتی ہے۔ نفسِ عشق ایک ہونے کے باوجود کہیں پیامِ مرگ اور کہیں پیامِ حیات ہو کر ظاہر ہوتا ہے، کہیں وہ جلوۂ ہزار رنگ ہوتا ہے تو کہیں مظہرِ بے رنگی۔ اس جہانِ رنگ و بو میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ بقدرِ شدتِ نالہ، بقدرِ ہائے و ہو ہوتا ہے۔ سوزِ جگر ہی نالہ کی حقیقت آشکار کر سکتا ہے۔ بے رنگ اور بہ رنگ دونوں منازل ہیں، کسی سے ہو کر گذر تاکہ تو سوزِ جگر سے نشانی تک رسائی حاصل کر سکے۔)

اس کے بعد زندہ رود اور غالب کے مابین گفتگو شروع ہوتی ہے:

زندہ رود : صد جہاں پیدا دریں نیلی فضاست
ہر جہاں را اولیا و انبیاست

غالب : نیک بنگر اندریں بود و نبود
پے بہ پے آید جہاں ہا در وجود
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینے ہم بود

زندہ رود : فاش تر گو زانکہ فہمم نارساست

غالب : ایں سخن را فاش تر گفتن خطاست

زندہ رود : گفتگوے اہلِ دل بے حاصل است

غالب : نکتہ را برلب رسیدن مشکل است

زندہ رود : تو سراپا آتش از سوزِ طلب
بر سخن غالب نیائی اے عجب

غالب : خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است
رحمۃٌ للعالمینے انتہا ست

زندہ رود : من ندیدم چہرۂ معنی ہنوز
آتش داری اگر مارا بسوز

غالب : اے چو من بینندۂ اسرار شعر
ایں سخن افزوں تر است از تار شعر
شاعراں بزم سخن آراستند
ایں کلیماں بے ید بیضا ستند
آنچہ تو از من بخواہی کافری است
کافری کو ماورائے شاعری است

درج بالا مکالمے کا لب لباب یہ ہے کہ آفرینش کا کاروبار بدستور چل رہا ہے جس سے نت نئے جہاں پیدا ہو رہے ہیں۔ جہاں کوئی عالم ہوگا وہاں ایک رحمۃٌ للعالمین بھی ہوگا۔ اس نکتہ کی مزید وضاحت کرنا خطرہ مول لینا بھی ہے اور مشکل بھی ہے۔ ابتدا ہوتی ہے تخلیق، تقدیر اور ہدایت سے اور انتہا ہوتی ہے رحمۃٌ للعالمین کی ذات پاک پر۔ یہ موضوع دراصل شاعری کی حدود سے بالاتر ہے۔ لفظ و شعور سے ماورا ہے یہ کافری جس کو اسے زندہ رود تو موضوع سخن بنانا چاہتا ہے۔

الغرض، یہی وہ شعری و نثری نگارشات ہیں جن کو بطور ماخذ استعمال کرتے ہوئے غالب کے بارے میں اقبال کے خیالات و تصورات کا خاکہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کی غالب پسندی کسی ایک دور تک محدود نہیں رہی بلکہ دم آخر اقبال کے دامن دل کو کھینچتی رہی۔ ۱۹۰۱ء میں غالب پر کہی ہوئی نظم ۱۹۰۵ء میں غالب کے مزار کی زیارت، ۱۹۳۲ میں جاوید نامہ میں غالب کی روح سے فلک مشتری پر ملاقات، اور ۱۹۳۶ء میں پہلے 'غالب ڈے کے لیے پیغام' اس محبت عقیدت مندی کا بین ثبوت بہم پہنچاتے ہیں جو اقبال کو غالب سے عمر بھر رہی۔

غالب پسندی اقبال کے یہاں جذباتیت پر مبنی نہیں ہے،

تخیل و فکر کامل کے متناسب استعمال اور ابلاغ و ترسیل کے سر و علوں کی بھرپور واقفیت کے بغیر شاعری بے ذرح بھی رہتی ہے اور زبان و اہل زبان کی خدمت سے عاری بھی رہتی ہے۔ غالب کا علو ئے تخیل کا ہم نشیں چونکہ فکر کامل ہے لہذا اس کی شاعری میں ہم سری کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے ؎

لطف گویائی میں تیری ہم سری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں

غالب ڈے کے لیے کہے ہوئے فارسی کے دو شعر جو سرود رفتہ اور باقیات اقبال میں بھی نہیں ملتے اقبال کے محور خیال کی پوری طرح عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اشعار غالب کی نگاہ کو نگاہ پردہ سوز، دل کو دانائے راز بتاتے ہیں۔ غالب کا کلام ایسا کلام نہیں ہے جو ہمیں حال کی زبوں حالی سے بے خبر کر دے۔ شعر غالب ہندستانی محفل پر جاری و ساری افسون فرنگ کو پردہ در بھی کرتا ہے اور ہمیں پست ہمتی سے بھی باز رکھتا ہے۔ پیغام میں دیے ہوئے دو شعروں پر دوبارہ توجہ مبذول فرمایئے اور اپنے لطف کو دو آتشہ کیجیے۔

ڈائری کے محولہ بالا اندراجات میں غالب کو فرقہ و قوم کی حدود سے بالاتر بتایا گیا ہے اور اس کو ہیگل، گوئٹے، ورڈس ورتھ کے ساتھ بریکیٹ کیا جانا محض اتفاقی یا وقتی بات نہیں ہے۔ ہیگل کے نظام فلسفہ کا اقبال نے غائر مطالعہ کیا تھا اور اس کو اپنی ڈائری میں "EPIC POEM IN PROSE" نثر میں ایک عظیم رزمیہ نظم" (ص ۵۸ STRAY REFLECTIONS) قرار دیا ہے۔ گوئٹے کے MEPHISTOPHELES کی طرح اقبال کا ابلیس بھی ابدی توانائی کا جذبہ ہے اور شر کا متمنی ہوتے ہوئے بھی خیر کے لیے کوشاں نظر آتا ہے۔ فعالیت کی اس روح کے بغیر دنیا مرگ جہلیت کا شکار ہو گئی ہوتی

M.T. STEPANYANTS: PAKISTAN PHILOSOPHY & SOCIOLOGY, MOSCOW ص ص: ۵۰-۵۱

ہیگل اور گوئٹے کے ساتھ بہ یک نفس غالب کا ذکر کرتا بتاتا ہے کہ

اقبال کی نظر میں فکرِ غالب بھی اہمیت کی حامل تھی۔ مسائل تصوف اور ان کو خوبصورت لفظی پیکروں میں پیش کرتے ہیں غالب کو ید طولیٰ حاصل تھا جیسا خود غالب نے ایک شعر میں کہا ہے۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

بادہ خواری کے کفر کے باوجود غالب خود شناس، مصلحت اندیش مزاج و ماحول کی آگہی رکھنے والے شخص تھے۔ بہشت کے تصور کا سلبی پہلو ان کے مزاج سے کوئی مطابقت نہ رکھتا تھا، عزم و حوصلہ کلام غالب کا پرکشش آہنگ ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

کفر ہے غیر از وفورِ شوق رہبر خواستن
راہِ صحرائے حرم میں ہے جرس ناقوس بس

اے بالِ اضطراب کہاں تک فسردگی
یک پر زدن تپش میں ہے کارِ قفس تمام

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

از وہم قطرگیست کہ در خود گمیم ما
اما چو وا رسیم ہماں قلزمیم ما

جز سخن کفری و ایمانی کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می رود

خواجہ فردوس بمیراث تمنا دارد
وائے گر در روش نسل بہ آدم نرسد

پیمانہ بر آں رند حرام است کہ غالب
در بےخودی اندازۂ گفتار ندانند

غالب کے یہ اشعار کسی دیوان کی طرف رجوع کیے بغیر، صرف حافظے پر اکتفا کرتے ہوئے بطور مثال پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں معمولی استعارات نہیں ہیں بلکہ ایسے استعارات ہیں جو نفسی علامتیں ہیں۔ سماجی اور سیاسی زبوں حالی، مزاج و ماحول میں تغیر، بدلتے دور میں راہبر ناشناسی، تقلیدی و بے جان رسوم وغیرہ ٹھوس حقیقتوں پر محیط علائم غالب سے پہلے چراغ لے کر بھی ڈھونڈنے پر نہیں مل سکتے۔ اقبال نے شعری ابلاغ و ترسیل کا یہ گر غالب کی شاعری ہی سے حاصل کیا اور وہ اپنے دل کے مطلب کو استعاروں میں چھپانے لگے ع

چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعاروں میں

غالب کے اظہار کے پرجلال و جمال پیرایے میں نشید زندگی اور ولولۂ نشاط دونوں کے آہنگ صاف سنائی دیتے ہیں۔ غالب اور اقبال کی غزلیات کے تقابلی مطالعے سے دونوں شاعروں کے مزاج کا داخلی اتحاد و اشتراک کہیں کہیں بہت صاف نظر آتا ہے مثال کے طور پر ایک ہی بحر اور ایک ہی زمین میں دونوں کی غزلوں سے چیدہ چیدہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ اقبال کی غزل کی ردیف "دہیم" کی بجائے "دہم" ہے۔ غالب

غالب
سوخت جگر تا کجا رنج چکیدن دہیم — رنگ شو اے خون گرم تا بہ پریدن دہیم

اقبال
مثل شرر ذرہ را تن بہ تپیدن دہم — تن بہ تپیدن دہم بال پریدن دہم

غالب

عرصۂ شوق ترا مشتِ غباریم ما　　تو چو ریزی ز ہم بہ تپیدن دہیم

اقبال

سوز نوائیم نگر ریزۂ الماس را　　قطرۂ شبنم کنم خوے چکیدن دہم

غالب

جلوہ غلط کردہ اند رخ بکشا تا ز ہم　　ذرہ و پروانہ را فرصتِ دیدن دہیم

اقبال

چوں ز مقامِ نمود نغمۂ شیریں دہم　　نیم شباں صبح را میلِ دمیدن دہم

غالب

بر اثر کوہکن نالہ فرستادہ ایم　　تا جگرِ سنگ را ذوقِ دریدن دہیم

اقبال

یوسفِ گم گشتہ را باز کشودم نقاب　　تا بہ تنک مایگاں ذوقِ خریدن دہم

غالب

شیوۂ تسلیم ما بودہ تواضع طلب　　در خمِ محراب تیغ تن بہ خمیدن دہیم

اقبال

عشق شکیب آزما خاکِ ز خود رفتہ　　چشم ترے داد و من لذتِ دیدن دہم

دونوں کے مزاج کا داخلی اشتراک و اتحاد صاف ظاہر ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ اقبال کے یہاں فلسفے کی ایک مربوط تنظیم ملتی ہے مگر غالب کے یہاں صرف فلسفیانہ خیالات ہی ملتے ہیں۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ غالب کے انداز بیان سے شیفتگی، دل بستگی کی ضو اقبال کے متعدد اشعار میں صاف نظر آتی ہے، ملاحظہ ہوں یہ مزید مثالیں:

غالب

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا　　درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا

اقبال

ایں حرف نشاط آور می گویم و می رقصم　　از عشق دل آساید با ایں ہمہ بے تابی

غالب

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب　　یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

اقبال

آہ! شبِ دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ　　صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

غالب

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا　　بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

اقبال

اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے　　چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

غالب

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز　　پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اقبال

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید　　کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

غالب

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے　　انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

اقبال

عشق از فریادِ ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد　　ورنہ ایں بزمِ خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

غالب

سخنِ ما ز لطافت نپذیرد تحریر　　نشود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما

اقبال

ہر معنیٔ پیچیدہ در حرف نمی گنجد　　یک لحظہ بہ دل در شو، شاید کہ تو دریابی

غالب

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ　　رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

اقبال

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں　　کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

غالب

آتش افروزیِ یک شعلۂ ایماں تجھ سے　　چشمک آرائیِ صد شہر چراغاں تجھ سے

اقبال

نشۂ نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم　　لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

غالب

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اقبالؔ

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائیست حدیث خلوتیان جز بہ رمز و ایما نیست

غالبؔ

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

اقبالؔ

تیشہ اگر بہ سنگ زد ایں چہ مقام گفتگو است عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را

جیسا ڈائری کے ایک محولہ اندراج سے ظاہر ہوتا ہے، اقبالؔ نے غالبؔ کے اظہار بیان، ابلاغ و ترسیل وغیرہ سے بھرپور استفادہ کیا ہے اس کا بھرپور معاصرانہ مطالعہ غالب کو نئی تفہیم و توضیح اور فوکس دے کر ادا کیا ہے۔ ایک نابغۂ عصر کا یہی تو خصوصی کردار ہوتا ہے جس کی دل کش تفصیل ٹی۔ ایس ایلیٹ کے تنقیدی مقالوں سے اُبھرتی ہے۔

اقبالؔ نے بہ تمام و کمال فنتریت مطالعۂ غالبؔ کو ایک نئی روشنی پیغام کے طور اپنے دو شعروں میں پیش کی ہے۔

دریں محفل کہ افسون فرنگ از خود ربود او را
نگاہے پردہ سوز آورد و لے دانائے راز آورد
سے ایں ساقیان لالہ رد، ذوق نمی بخشد
ز فیض حضرت غالبؔ ہمان پیمانہ باز آور

اس کے ساتھ اقبالؔ کے ایک خط سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

"عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کی داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہے تو جس کو داد دینا مقصود ہو، اس کے رنگ میں شعر لکھے یا بالفاظ دیگر اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔" (اقبال نامہ حصہ دوم ص ۔ ۴۰ ۔ ۴۱)

بات صاف و واضح ہے۔ اقبالؔ اور غالبؔ کے آہنگ میں یگانگت اور غالبؔ کے رنگ و آہنگ میں اقبالؔ کی سخن گوئی کا مطالعہ اقبالیات اور غالبیات دونوں کے لیے سودمند بھی معلوم ہوتا ہے اور ناگزیر بھی۔

★

وسیم بریلوی

غزل

شام تک صبح کی نظروں سے اتر جاتے ہیں
اتنے سمجھوتوں پہ جیتے ہیں کہ مر جاتے ہیں

پھر وہی تلخیِ حالات مقدر ٹھہری
نشے کیسے بھی ہوں کچھ دن میں اتر جاتے ہیں

اک جدائی کا وہ لمحہ کہ جو مرتا ہی نہیں
لوگ کہتے تھے کہ سب وقت گزر جاتے ہیں

گھر کی گرتی ہوئی دیواریں ہی مجھ سے اچھی
راستہ چلتے ہوئے لوگ ٹھہر جاتے ہیں

ڈھونڈنے نکلے تھے جس کے لیے گھر سے پانی
پھر اسی آگ میں جلتے ہوئے گھر جاتے ہیں

ہم تو بے نام ارادوں کے مسافر ہیں وسیمؔ
کچھ پتہ ہو تو بتائیں کہ کدھر جاتے ہیں

ایس. این. سنہا

غزل

فروغِ مے سے اُجالا ہے گھر میں شام کے بعد
فضا سے نور برستا ہے دورِ جام کے بعد

نماز و فکرِ معاش و حصولِ جام کے بعد
زباں پہ نام ہے تیرا ہر ایک کام کے بعد

جہاں میں گزرے ہیں ایسے بھی چند دیوانے
جبینیں جھکتی ہیں سجدے میں جن کے نام کے بعد

نگاہِ ناز نے چپکے سے کچھ کہا تھا کبھی
فسانے بن گئے اک حرف نا تمام کے بعد

ہمارے لب پہ تو اک بت کا نام آتا ہے
خدا کے نام سے پہلے خدا کے نام کے بعد

جو رند واقفِ آدابِ مے پرستی ہیں
وہ روز پیتے ہیں لیکن نمازِ شام کے بعد

ذرا سی بات میں سب رازِ عشق فاش ہوا
ہوئے جو سرخ وہ عارض ہمارے نام کے بعد

نہ پوچھیے مری دنیائے آرزو کیا ہے
نگاہ ناز کے مبہم سے اک پیام کے بعد

شباب تھا کوئی مہماں کہ آیا اور گیا
بہت ہی مختصر و دلنشیں قیام کے بعد

حدیثِ شوق ہے در پردہ ہم سمجھتے ہیں
سکوت اک لبِ شیریں سخن کا شام کے بعد

ضرور کوئی خطا تو نے کی ہے اے سنہا
وہ مسکراتے نہیں اب ترے سلام کے بعد

مناظر عاشق ہرگانوی

مولانا عبدالحلیم شرر کی ڈرامہ نگاری

ڈرامہ ایک ایسی صنف ہے جو تمام اصناف پر محیط ہے۔ نیچر کی صحیح عکاسی اور تصویر کشی صرف اسی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ایک قادر انشا پرداز و ماہر فنکار اپنے دماغی و ذہنی کاوشوں کے کمالات صرف ڈرامہ میں ہی پیش کرسکتا ہے اور زندگی کی بوالعجبی، گرما گرمی، تیزی، شدت اور حرکت و عمل کو ڈرامہ کے ذریعہ ہی اچھی طرح قاری تک پہنچا سکتا ہے اور جب اس کا احساس قاری کو ہو جائے تو یہی ڈرامہ کی بنیادی خصوصیات اور ضروریات ہیں۔

اردو ڈرامہ نگاری کی باضابطہ ابتدا، آغا حشر کشمیری سے ہوتی ہے۔ حشر ایک نیّر تاباں کی طرح آسمان ڈرامہ نگاری پر چمکتے نظر آتے ہیں۔ پہلے پہل جب وہ بمبئی کی تھیٹریکل کمپنیوں میں آئے تو وہاں جو کھیل اسٹیج ہوا کرتے تھے، ان پر مغربی ڈراموں کا اثر بہت زیادہ تھا۔ لیکن اس وقت تک کوئی کمپنی کامیاب اور شاندار ڈرامہ اسٹیج نہ کرسکی تھی کیونکہ وہاں انگریزی ڈراموں کے چربے اتارے جاتے تھے اور گویا ان کی نقل پیش کی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بمبئی کی رونق میں کمی آ گئی اور تھیٹریکل کمپنیاں ٹوٹتی گئیں۔ لیکن دوسری طرف کلکتہ کی رونق میں اضافہ ہوتا گیا اور وہاں تھیٹریکل کمپنیاں کھلتی گئیں۔ حشر بھی بمبئی سے کلکتہ چلے گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ انگریزی ڈراموں کی گرم بازاری تھی۔

لیکن حشر کے بعد اردو ڈرامہ نگاری پر ایک قسم کا زوال طاری ہوتا نظر آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب ڈرامہ نے ترقی کرنا شروع کی تو پھر ان کمپنیوں کا بازار اتنا گرم ہوا کہ تھیٹریکل کمپنیاں ٹوٹنے لگیں اور تماشہ اسٹیج کے بجائے رفتہ رفتہ سینما گھروں میں دکھلایا جانے لگا۔

ہم جانتے ہیں کہ ڈرامہ کا فن بہت حد تک اسٹیج سے وابستہ ہے اور جو ڈرامے اسٹیج سے علیحدہ ہو کر لکھے جاتے ہیں ان کے اندر عملی نقائص ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ اردو ڈرامہ کا بھی کثیر سرمایہ اسٹیج ہی کا ہے (۱۸۵۳ء سے بیسویں صدی کے اوائل تک) اور یہ اسٹیج کے سہارے ہی پروان چڑھتا رہتا ہے۔

ڈرامہ کے اسٹیج سے علیحدہ ہونے کے بعد کاروباری حیثیت سے تھیٹریکل کمپنیاں بند ہوگئیں اور پردۂ اسکرین کی وجہ سے یہ اعلیٰ فن زنگ آلود ہوگیا لیکن بعض تعلیمی اور علمی اداروں میں شوقیہ طور سے تمثیلیں اسٹیج کی جاتی رہیں۔ اور اس طرح اب ڈرامے کی حیثیت خالص ادبی ہو کر رہ گئی۔ یعنی اسٹیج کا کام پڑھنے والوں کا دماغ کرنے لگا، جس کے نتیجے میں تاریخی، رومانی، اصلاحی، واقعاتی، سماجی اور مقصدی ہر قسم کے ڈرامے پیش کئے گئے۔ ادبی ڈرامے کا یہ دور جن چند اہم شخصیتوں اور ڈراموں کو پیش کرتا ہے۔ ان میں عبدالحلیم شرر کی شخصیت اور ان کے چند ڈرامے قابل ذکر ہیں۔

عبدالحلیم شرر تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ انھیں بحیثیت شاعر یا بحیثیت ڈرامہ نگار شاذ ہی لوگ جانتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ لکھتے وقت رام بابو سکسینہ، مرزا عسکری اور اعجاز حسین وغیرہ نے شرر کی تصانیف کی صرف نامکمل فہرست دی ہے۔ شرر کی نظم و ڈرامہ سے متعلق "شہیدِ وفا" "شب غم" اور "شب وصل" کا نام ملتا ہے۔ یہ تفصیل نہیں ملتی کہ ان تینوں تصانیف میں نظم کون سی ہے اور ڈرامہ کون سا ہے۔ اور ان کے

موضوعات کیا ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ "شب وصل اور شب غم" نظمیں ہیں۔ جہاں تک ڈرامہ کا سوال ہے عبدالحلیم شرر نے چھ ڈرامے لکھے ہیں۔ تین ڈرامے نظم معریٰ میں ہیں اور تین نثر میں۔

نثر میں "میوۂ تلخ"، "شہیدِ وفا" اور "شکنتلا" ہیں۔ "میوۂ تلخ" کو میں نے مرتب کرکے کتابی شکل میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع کرایا ہے۔ ضخامت ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک اخلاقی، اصلاحی، واقعاتی، معاشرتی اور مقصدی ڈرامہ ہے جس کے ذریعہ عورتوں میں تعلیم کی اہمیت اور ضرورتوں کو بھرپور طور پر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پردہ کی سختی سے مخالفت کی گئی ہے، نکاح ثانی پر زور دیا گیا ہے اور اس کی اہمیت پیش کی گئی ہے اور سماج اور معاشرے میں رائج اندھی رسم کی تقلید کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔ یہ ڈرامہ اس وقت لکھا گیا تھا جب عورتوں میں نکاح ثانی کو عیب سمجھا جاتا تھا۔ پردہ کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اور عورتوں میں تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا "میوۂ تلخ" دو ایکٹ کا ڈرامہ ہے۔ دونوں ایکٹ میں نو نو سین ہیں۔

شہیدِ وفا:۔ یہ ڈرامہ تین ایکٹ اور بائیس سین پر مشتمل ہے۔ یہ اسپین کے زمانۂ زوال کی ایک سچی داستان سے ماخوذ ہے۔ پلاٹ یہ ہے کہ قاضی ابو یحییٰ کی لڑکی صفیہ پر یوسف عاشق ہو جاتا ہے۔ لیکن ابو یحییٰ کی شرط ہے کہ وہی لڑکا صفیہ سے بیاہا جائے گا جو اپنے ملک کی لڑائی میں شامل ہو کر نام پیدا کرے۔ یوسف، امیر عبداللہ کی فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے اور عیسائی فوجوں سے زبردست مقابلہ کرکے افسرانِ اعلیٰ کی خوشنودی، حکومت سے انعامات اور خلیفہ سے تلوار حاصل کرتا ہے۔ قاضی ابو یحییٰ کو خوشی ہوتی ہے اور وہ شادی کے لیے راضی ہو جاتا ہے مگر یوسف کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ وہ روپیہ کی تلاش میں نکلتا ہے، راستہ میں عیسائی دستہ کے ہاتھوں میں پڑ جاتا ہے اور اسے پھانسی ہو جاتی ہے۔ صفیہ کو جب یہ خبر ملتی ہے تو وہ خودکشی کرکے اپنی محبت کو غیر فانی بنا دیتی ہے۔

شکنتلا:۔ یہ کالیداس کے مشہور ڈرامے کا اردو ترجمہ ہے۔ بڑی تقطیع پر ایک سو ستر صفحات پر مشتمل ہے۔ ترجمہ پڑھ کر شائبہ تک نہیں ہوتا کہ یہ ڈرامہ ترجمہ ہے۔

نظم معریٰ یا غیر مقفیٰ کے سلسلے میں پہلا ڈرامہ "فلورنڈا" ہے۔ شرر کا کہنا ہے کہ "جو حضرات ڈرامے کی حقیقت و حالت سے واقف نہیں وہ بے تکلف کہہ دیں گے کہ کوئی خیال اور کوئی واقعہ ایسا نہیں جسے ہم اپنی موجودہ شاعری کے ذریعہ نہ ادا کر سکتے ہوں۔ مگر جو لوگ جانتے ہیں کہ ڈرامہ کیا چیز ہے وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ نظم معریٰ کے اختیار کیے بغیر اردو میں ڈرامے لکھے ہی نہیں جا سکتے۔"

اسی سلسلے میں شرر لکھتے ہیں کہ "انگریزی میں خاص ڈرامہ کے لیے یہ نظم غیر مقفیٰ ایجاد کی گئی جو یہ شان دکھاتی ہے کہ ایک طرف تو کلام برابر موزوں ہوتا چلا جاتا ہے اور دوسری طرف سلسلۂ کلام یوں جاری رہتا ہے کہ اگر مصرع مصرع جدا کرکے دیکھیں تو معلوم ہو کہ گویا بے تکلفی سے نثر میں گفتگو ہو رہی ہے۔ صرف یہی چیز ہے اور یہی نظم ہے جس نے شیکسپیر اور دیگر شعرائے یورپ کو شہرت کے دربار میں سب سے معزز جگہ دی ہے۔۔۔ بعض انگریزی داں نوجوانوں نے کئی مرتبہ اردو میں نظم غیر مقفیٰ کے کہنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اور ناکامی کی وجہ یہ ہوئی کہ سوا قافیہ کی قید چھوڑ دینے کے انھوں نے اس نظم کی دوسری خوبیاں اور اصل ضرورت دکھانے کی طرف توجہ نہیں کی۔ شاید اگر وہ کسی ڈرامہ یا گفتگو کو نظم کرنے اور کلام کی بے تکلفی و روانی کے قائم رکھنے کی کوشش کرتے تو ممکن نہ تھا کہ اہل سخن پسند نہ کرتے۔۔۔ لہٰذا ہم اب اس جانب توجہ کرتے ہیں اور بالکل اسی انگریزی شان سے ایک موزوں ڈرامہ لکھنے کی بنیاد ڈالتے ہیں۔"

یہ ڈرامہ فتح اندلس کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ اس میں چھ سین ہیں اور یہ ڈرامہ نامکمل ہے۔ نظم غیر مقفیٰ کے فارم میں تجربہ کے سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"چوتھے سین میں ہیرو عیسیٰ اپنے برج سے نکل کر قلعہ کے اوپر دریا کے کنارے ٹہل رہا ہے اور غروب آفتاب کا تماشہ دیکھتے ہوئے اپنی محبوبہ فلورنڈا کا خیال کرکے خود بخود بڑبڑاتا ہے: "جس کو دیکھو خوش ہے لیکن آہ۔ اک میں ہوں کہ دل کو قرار آتا نہیں۔ الجھن ہے بیتابی ہے اور ہر گھڑی اک درد ہے۔ پیاری فلورنڈا تجھے اک نظر دیکھوں تو

چین آئے کہاں ایسے نصیب ۔ !"

اب اسے تقطیع کر کے دیکھئے!

جس کو دیکھو خوش ہے لیکن آہ اک میں ہوں کہ دل
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
کو قرار آتا نہیں، الجھن ہے، بیتابی ہے اور
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
ہر گھڑی اک درد ہے ۔ پیاری فلورنڈا ! تجھے
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
اک نظر دیکھوں تو چین آئے کہاں ایسے نصیب
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

نظم معریٰ میں دوسرا ڈرامہ "مظلوم ورجینا" ہے یہ بھی تاریخی ڈرامہ ہے اور دو سین پر مشتمل ہے۔ یہ ڈرامہ روۃ الکبریٰ کی تاریخ قدیم سے ماخوذ ہے۔ روم میں دو گروہ تھے۔ ایک امراء و معززین اور دوسرے عوام الناس ان دونوں گروہوں میں اپنے اپنے حقوق کے لیے اکثر نزاع رہا کرتی تھی۔ چنانچہ انھیں جھگڑوں کو رفع کرنے کے لیے ۴۵۲ ق م میں وہاں یہ نیا طریقۂ حکمرانی جاری کیا گیا تھا کہ دس مجسٹریٹ منتخب کیے گئے اور حکومت کے سارے اقتدارات ان کے ہاتھ میں دے دیئے گئے۔ یہ مجسٹریٹ وہاں "ڈیسم ویر" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ دو ہی برس یہ نظام رہنے پایا تھا کہ آپیوس قلادیوس نام کے ایک شریر النفس ڈیسم ویر کی بدمعاشی سے ایک ایسا شرمناک واقعہ پیش آیا جس سے ہنگامہ ہو گیا اور سلطنت کو ۴۴۷ ق م میں ڈیسم ویروں کے تقرر کو منسوخ کر کے پھر اپنا پرانا انتظام جاری کر دینا پڑا اسی واقعہ کو اس ڈرامہ میں نہایت کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔

چھٹا ڈرامہ "اسیری بابل" ہے بخت نصر سارے بنی اسرائیل کو اسیر کر کے بابل پکڑ لے گیا تھا۔ ان کے بادشاہ صدقیا کو زنجیروں سے جکڑ دیا گیا۔ اس کے بیٹوں کو اسی کے سامنے قتل کیا گیا، لوہے کی گرم سلاخوں سے اس کی آنکھیں پھوڑ دی گئیں اور اسے بابل کے تیرہ و تار قید خانہ میں ڈال دیا گیا۔ اہل بابل یعنی کلدانی بت پرست، بنی اسرائیل سے غلاموں کی طرح محنت و مشقت کے ذلیل ترین کام لیتے رہے۔ عرصہ تک یہی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اسرائیل کا بادشاہ صدقیا قید میں مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد فارس کے تاجدار سائرس نے حملہ کر کے کلدانیوں کو تباہ اور بابل کو ویران کر دیا اور بنی اسرائیل کو اپنے وطن ارض یہودہ میں واپس جانے کی اجازت دی ۔ یہ واقعہ دنیا کے اہم ترین تاریخی واقعات میں سے ہے۔ اسی واقعہ کو انگریزی کے جادو بیان شاعر گولڈ اسمتھ نے ایک مختصر منظوم ڈرامہ کی شکل میں قلم بند کیا تھا۔ عبدالحلیم شرر نے اسی ڈرامہ کا ترجمہ اردو نظم میں کیا ہے۔ یہ ڈرامہ مورخانہ وقار، مذہبی استقلال، موحدانہ جذبات اور ادیبانہ کمالات کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

عبدالحلیم شرر نے صرف چھ ڈرامے لکھے ہیں لیکن اردو ڈراما میں انھوں نے نئے تجربے کیے ہیں۔ اسے نیا طرز، نئی ڈگر بخشی ہے اور اس کے کینوس کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔

★

یادیں

احتشام الاسلام

کھلتا ہے دریچہ یادوں کا
ماضی کی ہوا در آتی ہے
تو پاس کھڑی مسکاتی ہے
لہراتا ہے آنچل بھی ۔ تیرا

ماحول بسا ہے خوشبو میں
پھیلا ہے اجالا ہر جانب
میں تیری نگاہوں کا طالب
کھویا ہوں نظر کے جادو میں

خود تو نے خموشی توڑی ہو
لب پر ہے ترے پیمان وفا
تجھے ساتھ رہیں گے ساتھ سدا
دونوں نے قسم یہ کھائی ہے

یادوں کا دریچہ بند ہوا
پھر کمرے میں ہوں میں ہی تنہا

صلاح الدین نیّر

غزل

لبوں پہ زخم ہیں نشتر مری تلاش میں ہے
ہے اتنی پیاس، سمندر مری تلاش میں ہے

بس اتنی بات تھی، آئینے دل کے جوڑے تھے
ترے خلوص کا پتھر مری تلاش میں ہے

اُجالے ڈھونڈنے جس گھر سے بھاگ نکلا تھا
سُنا ہے آج بھی وہ گھر مری تلاش میں ہے

نہ جانے کب ترے کوچے سے ہو کے گزرا تھا
وہ پہلی پہلی سی ٹھوکر مری تلاش میں ہے

میں اپنے دور کا سقراط تو نہیں لیکن
نہ جانے کیوں کوئی ساغر مری تلاش میں ہے

مزارِ زندہ ہوں، جسموں کی قید سے آزاد
ابھی سے پھولوں کی چادر مری تلاش میں ہے

سحر فریب ہیں، یہ مہر و ماہ جھوٹے ہیں
شکستِ شام کا منظر مری تلاش میں ہے

سمٹ کے رہ گئے لب روشنی کی باہوں میں
سنا ہے جب سے کہ نیّر مری تلاش میں ہے

محمد مرسلین شیدا

میرا وطن پیارا وطن

جس جگہ شام اودھ صبحِ بنارس ضوفگن
ناز سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی گنگ و جمن
جس کے گہوارے میں ملتی ہے متاعِ علم و فن
جس کے قدموں میں ہے تہذیب و تمدن کا چلن
ہے وہی ہندوستاں میرا وطن پیارا وطن

ہے جہاں میں وادیِ کشمیر بحرِ اولیں
شاہکارِ حسنِ فطرت، پرتوِ خلدِ بریں
آسماں جس کی قدم بوسی کرے وہ سرزمیں
دیکھ کر گرویدہ اک عالم ہے جس کا بانکپن
ہے وہی ہندوستاں میرا وطن پیارا وطن

امنِ عالم کے لیے جو پاسباں بن کر رہا
حلقۂ دشمن میں، تیغ بے اماں بن کر رہا
جو حقیقت بن گئی وہ داستاں بن کر رہا
جس کا اک اک فرد ہے آئینۂ خیبر شکن
ہے وہی ہندوستاں میرا وطن پیارا وطن

چاند بی بی لکشمی بائی کی ہمت ہے عیاں
خون سے اشفاق و بسمل کے ہے رنگیں داستاں
جراتِ ٹیپو بھگت کی دیدِ تا شامل جہاں
ہو گئے قربان جس پر نونہالانِ چمن
ہے وہی ہندوستاں میرا وطن پیارا وطن

ملک کے دشمن اگر تہ مقابل آ گئے
ہے زمانہ جس کا شاہد، اپنے منہ کی کھا گئے
ضربِ کاری کچھ پڑی ایسی کہ بس گھبرا گئے
ہر محافظ ہے جواں باندھے ہوئے سر سے کفن
ہے وہی ہندوستاں میرا وطن پیارا وطن

جو ارادہ کر چکا، اس کو بدل سکتا نہیں
جان جائے عزم مستحکم ہے ٹل سکتا نہیں
رزم کا دم ضعف کے سانچے میں ڈھل سکتا نہیں
قول کا پابند ہے، جو دشمنِ پیماں شکن
ہے وہی ہندوستاں میرا وطن پیارا وطن

معین الدین حسنی کاکوروی



صدیق صاحب

اردو کا ایک مخلص خادم

بزرگوں کے مقولے بھی بڑے جچے تلے اور سچے ہوا کرتے ہیں۔ کسی دانائے راز نے کیا خوب کہا ہے کہ نیک اور اچھے لوگوں کا نام زندہ رکھنا چاہیے تاکہ تمہارا نام بھی زندہ رہے۔ دنیا میں ہر ذات مظہر صفات متضادی ہے۔ انسان خیر و شر کا ایک طرفہ مجموعہ ہے۔ "جلال" و "جمال" دونوں اس کی ذات میں پنہاں ہیں۔ اس کے نفس کے خاکدان میں محبت کے شرر بھی رقصاں رہتے ہیں اور یہی روح کی روشنی کسی میں مدھم لَو دیتی نظر آتی ہے اور کسی میں شعلہ جوالہ بن کر خود اس کی ہستی کو خاکستر کر دیتی ہے لیکن ہزاروں تاریک دل اس کی جوت سے جگمگا اٹھتے ہیں۔ اس کی گرمیٔ نفس اس کے ماحول میں تب و تاب اور اس کے ہم نفسوں کے دلوں کو شعلہ بداماں کر دیتی ہے۔ ہر انسان اپنی جگہ محشر خیال اور خیالستان ہے اور خود اپنی ذات میں ایک انجمن، جو حیات گزراں میں محو انجمن آرائی رہتا ہے، ہزاروں خوش نصیب تھے کہ ان کی ذات کی خوبیاں اجاگر کرنے کے لیے نغز گو شعراء کی تخئیل میسر ہو سکی کہ جن کے اشعار کی رنگینی اور دلکشی سے ان کے کردار کی خوبیاں نمایاں ہوئیں اور پردۂ عام پر بعد آب و تاب ابھریں جس سے ہزاروں عبرت بیں نگاہوں کو درس بصیرت مل سکا۔ کچھ کو کہنہ مشق ادیبوں کا قلم میسر ہوا جس نے ان ہستیوں کو زندہ جاوید بنا دیا۔ کچھ گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے اور ان کے کردار کی تب و تاب محروم نظر و نظارہ رہی۔

ان کے گلہائے اخلاق کی مہک پھیلی تو لیکن ویرانے میں، جہاں کسی کے مشام جاں اس سے تازہ نہ ہوئے۔ نہ کوئی غواص اُن کو ملا جو ان کے زندگی کے آبدار موتیوں کو گمنامی کے سمندر سے نکال کر ان کو زیب و زیبائی کا پیکر تابندہ بنا دیتا۔ وہ چمکے، دمکے، چہکے اور لہکے لیکن ان کی قسمت میں وہ بادِ نسیم نہیں تھی جو ان کی شہرت کی خوشبو کو لے اُڑتی اور اس کی عنبر آفریں شمیم سے دماغوں کو مہکا دیتی۔ صدیق صاحب مالک صدیق بک ڈپو بھی بڑے کمالات اور صفات کے مالک تھے۔ وہ تمام عمر بے نیاز رنگ محفل رہے۔ نہ ان کو کبھی مدح و ستائش کی تمنا رہی اور نہ کبھی عزت و شہرت کی فکر دامن گیر۔ وہ بظاہر کتابوں کے تاجر تھے لیکن ان کی دلچسپیاں لکھنؤ کی تمدنی، ثقافتی اور علمی، زندگی سے وابستہ رہیں۔ وہ بقول شوکت تھانوی اپنی "درۂ خیبر" نما دکان پر بیٹھ کر تمام مسائل حیات پر اظہار خیال فرماتے، نایاب کتابوں کے ذخیرے سے استفادہ کر کے ان کے ذہن کی ایسی جلا ہو گئی تھی کہ جس کی صیقل بعض اوقات سامعین کو چونکا دیتی۔ ان کا دماغ تابندہ اور دل تا زندگی تازہ اور زندہ رہا۔ ان کی باتوں میں دل لگتا تھا، وہ نہ صرف زیب انجمن ہوتے بلکہ خود اپنی جگہ ایک انجمن تھے۔

یادش بخیر کوئی پچاس برس ادھر کی بات ہے میری بڑی پھوپھی صاحبہ جنھوں نے مجھے بڑے لاڈ و پیار سے پالا تھا اور داغ یتیمی اور یسیری کو یک قلم اپنی بے پناہ محبت سے

مٹا دیا تھا کتابوں کی رسیا تھیں اور کیوں نہ ہوتیں! منشی سجاد حسین صاحب مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ ان کے حقیقی پھوپھا تھے، مرحومہ پھوپھی صاحبہ منشی احمد علی صاحب مرحوم کاکوروی، مصنف شباب لکھنؤ اور مترجم تاریخ تمدن (بکلز) کی شریک حیات تھیں۔ وہ نایاب اور نادر کتابوں کی ہر وقت جویا رہتی تھیں۔ اسی لیے وہ صدیق صاحب کے بک ڈپو میں مجھے بھیجا کرتیں ——— روز ایک نئے نام کے ساتھ۔ چنانچہ دس پندرہ برس کے سن ہی سے نہ صرف کلاسیکی اردو ادب سے کچھ واقفیت ہو گئی بلکہ وہ سب کتابیں جو صدیق صاحب مرحوم بڑی کاوش اور کوشش سے فراہم کرتے تھے میں نے چاٹ ڈالیں۔ اس احسان کا اعتراف کرنا میرا خوشگوار فریضہ ہے کہ اردو ادب سے محبت نہیں بلکہ عشق پیدا کرنے کے سلسلے میں بس دو نام حافظے کے پردہ سیمیں پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ بڑی پھوپھی صاحبہ مرحومہ اور دوسرے صدیق صاحب مرحوم۔

اس زمانے میں صدیق صاحب کی عمر تقریباً پچاس یا پچپن کی ہوگی۔ تندرست۔ چوڑی چکلی ہاڑ، سرخ و سپید رنگ۔ تازہ ولایت معلوم ہوتے تھے۔ گول چہرہ، ڈاڑھی تقریباً سفید ہو رہی تھی یا ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک جس میں شوخی طبع بھی جھلکتی تھی۔ گاہکوں سے بھی چھیڑ چھاڑ چلا کرتی تھی۔ کوئی کتاب لینے آیا تو کبھی کبھی دکان داری کے تمام مراسم بالائے طاق رکھ کے کتاب کی افادیت کے سلسلے میں اسے لغو اور مہمل کہہ دیتے۔ بے چارہ گاہک عجیب مخمصے میں پھنس جاتا۔ ایک واقعہ اسی ضمن کا یاد آرہا ہے۔ میں حسب معمول ایک کتاب کے سلسلے میں صدیق صاحب کی دکان کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مولویانہ وضع قطع، کچھ گھبرائے کچھ سٹپٹائے ہوئے میرے پاس آئے۔ کہنے لگے "بھیا یہ پرچہ لو اور صدیق صاحب سے یہ کتاب خرید لاؤ میں یہیں کھڑا ہوں۔ میں نے پوچھا دکان تو قریب ہے آپ خود ہی زحمت فرمائیں۔ کہنے لگے بھیا بات ہی کچھ ایسی ہے تمھیں لے آؤ۔ کتاب کے دام مجھے ٹکا دیے۔ میں واقعے کے سیاق و سباق سے محض ناواقف تھا۔ دکان پر گیا۔ پرچہ دکھا کر کتاب مانگی۔ عام طور پر یہ کتاب ان موضوعات سے بالکل ہٹ کر تھی جو عموماً ہمارے یہاں منگوائی جاتی تھیں۔ صدیق صاحب مرحوم نے پرچہ دیکھا اور میری طرف اپنی چمکتی آنکھوں سے جن میں شوخی کا رنگ جھلک رہا تھا، کہا یہ پرچہ تم کو کس نے دیا۔ میں نے معصومانہ انداز میں واقعہ بتایا۔ کہنے لگے انھیں بھیج دو اور پھر اپنے مناظرہ کا واقعہ جو ان مولوی صاحب کے ساتھ پیش آیا ہنس ہنس کر بیان کرتے رہے۔ پھر نہ مولوی صاحب ان کے پاس گئے اور نہ کتاب کی خریداری ہو پائی۔ بیچارے عرفی کے اس مصرعہ کے مصداق ہو گئے۔ ع

ہمہ شوق آمدہ بودم، ہمہ حرماں رفتم

نہ معلوم کتنے ایسے واقعات ان کی دکان پر آئے دن پیش آیا کرتے تھے۔ وہ صرف کتب فروش نہیں تھے بلکہ علم دوست، ادب نواز اور ادب سنج بھی تھے۔ اس زمانہ کے ادیبوں سے ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ نیاز فتح پوری مرحوم تو اپنی کتابوں کا پورا ذخیرہ صدیق صاحب ہی کو دے گئے، جو انھیں کی دکان جواہر نگار سے مہیا ہو سکتا ہے۔

صدیق صاحب ہمیشہ قوم پرور خادم کی حیثیت سے سماجی کاموں میں پیش پیش رہے۔ میں نے ان کو ہمیشہ کھدر پوش ہی دیکھا۔ بڑے عرض کا پاجامہ، لمبا کرتا اس پر جواہر کٹ واسکٹ پہنے نظر آتے۔ میں نے بڑی سے بڑی تقریب میں بھی ان کو شیروانی میں ملبوس نہیں دیکھا، تاجر وہ ضرور تھے لیکن تاجرانہ ذہنیت انھیں چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ ایک بزرگ جو فارغ التحصیل، عبرانی اور عربی کے مستند عالم ہیں بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے بڑی عسرت کے عالم میں تعلیم حاصل کی۔ کتابوں کے مطالعہ کا شوق بے حد تھا مگر اتنے دام نہیں جو قیمتی کتابیں خرید سکتے۔

کہیں خوبی قسمت سے صدیق صاحب سے ملاقات ہو گئی، یہ تو ایسے تشنگان علم و ادب کو سیراب کرنے کے لیے ہر وقت اور ہمہ تن تیار رہتے۔ یہ کم عمر طالب علم جمعہ کے دن آکر دکان صاف کرتے، جھاڑو دیتے، کتابیں سلیقے سے رکھتے اور اس کے صلہ میں ایک کتاب صدیق صاحب مرحمت فرماتے۔ یہ جذبہ ہمدردی اب کہاں، نہ معلوم کتنے طلبا کو اپنے بک ڈپو کی نایاب کتابوں سے استفادہ کا موقعہ دیا اور علم کو عام کر کے اور ذوق مطالعہ کی ہمت افزائی کر کے گردِ سرِ راہ کو نازش کارواں بنا دیا۔

ایک اور واقعہ ان کی زر و سیم کی طرف سے بے نیازی کا معلوم ہوا۔ سنا ہے کہ کسی ریاست کے سربراہ نے ان کے بک ڈپو کی ساری کتابیں خریدنے کا ارادہ کیا۔ ظاہر ہے کہ پورا ذخیرہ ایک لاکھ دو لاکھ سے کیا کم ہوگا۔ صدیق صاحب نے بہ کمال لاپرواہی اس معاملت سے صاف انکار کر دیا۔ جب ان کے چھوٹے صاحب زادے نے کہا کہ آپ نے یہ سب کتابیں بیچ ڈالی ہوتیں۔ صدیق صاحب نے جواب دیا "وہ تو لاکھ دو لاکھ دے کر کتابیں لے جاتے لیکن تم کہاں رہتے ساری دکان ویران ہو جاتی"۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دکان پر نادر الوجود کتابوں کا ذخیرہ محفوظ ہے اور طالبان علم کو سیراب کر رہا ہے۔ چوٹی کے علمی جرائد کے خاص نمبر جو آج نایاب ہیں، ان کے بک ڈپو میں محفوظ ہیں۔

صدیق صاحب میں جرأت اخلاقی بھی بدرجۂ اتم تھی۔ وہ جو نظریہ اختیار کرتے اس پر خلوص دل سے عمل پیرا ہوتے۔ ان کے خیال و عمل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ وہ پکے قوم پرور اور محب وطن تھے۔ لیکن بنیادی مسائل میں وہ اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے اور انھوں نے اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، وہ دل کے کھرے، بات کے کھرے اور زبان کے بھی کھرے تھے۔ وہ ہر معاملے میں دو ٹوک بات کہتے تھے اور نام و نمود سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ گرچہ بڑے بڑے اکابر قوم سے ان کے ذاتی مراسم تھے لیکن چونکہ بہت ہی خوددار آدمی تھے اس لیے کسی کے در کی جبہ سائی کرنا تو درکنار کبھی اس کے پاس، اپنی غرض لے کر بھی نہ جاتے تھے۔

صدیق صاحب سماجی کاموں میں پیش پیش رہے انھوں نے انسداد گداگری پر ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے ٹھوس عملی تجاویز پیش کیں، جس سے پیشہ ور بھیک مانگنے والے دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں اور ان کے کام کے لیے دست کاری یا اور کسی پیشہ اور ہنر کے سکھانے کا انتظام کیا جائے جس سے وہ سماج پر بار (PARASITE) ہو کر سوسائٹی کے لیے وبال نہ بنیں بلکہ ایک کار آمد اور کام کرنے والے اچھے شہری کی حیثیت سے باعزت زندگی بسر کریں کیونکہ گداگری عزت نفس کی موت ہوتی ہے — ان خیالات کو انھوں نے نہایت سلجھے انداز میں بیان کیا ہے۔ اور یہ کتاب آج بھی سماجی کارکنوں کے لیے ایک مشعل ہدایت ہے جس کی روشنی میں وہ کام کر کے سماج کو ایک ناکارہ طبقے سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں اور ان کو معاشرہ کے لیے کار آمد بنا سکتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کے مضامین بھی محفوظ ہیں جن میں خاص طور پر چند قابل ذکر ہیں۔ "شاہان لب بام" کے پیشے کی روک تھام کے لیے انھوں نے ایک کتاب لکھی تاکہ معاشرہ صاف اور ستھرا بن سکے اور یہ گروہ باعزت اور پاک دامنی کے ساتھ ایک اخلاقی زندگی اختیار کرے۔ ایک شریف انسان کی حیثیت سے ان کو جنسی بے راہ روی ناگوار تھی اور اسی لیے انھوں نے سماجی زندگی کے تاریک پہلوؤں پر قلم اٹھایا اور ان کی اصلاح کے کار خیر میں مشغول رہے۔ ان کے صدہا مضامین مختلف النوع موضوعات پر شائع ہو چکے ہیں۔

صدیق صاحب کا سب سے معرکۃ الآرا کارنامہ کتابوں

کی ڈائرکٹری کی تدوین ہے۔ انھوں نے نایاب اور نادر کتابوں کی ایک نہیں متعدد فہرستیں مرتب کیں اور تمام ہندستان کے مطابع میں چھپنے والی کتابوں کی فہرست تیار کی جس سے ہزارہا تحقیقی مقالہ نگاروں کو مدد ملی، اور وہ آسانی سے اپنی تحقیقات مکمل کر سکے۔ اس کا اعتراف ان کے انتقال پر نظامی پریس کے مالک حال نے ایک تعزیتی مکتوب میں کیا ہے۔ یہ کام بڑی عرق ریزی سے کیا اور اس کی افادیت سے کس ہوش مند انسان کو انکار ہو سکتا ہے۔

صدیق صاحب نے خلافت اور ترک موالات کی تحریک میں پُر جوش حصہ لیا۔ جنگ آزادی کی تحریک میں جوش پیدا کرنے اور حب الوطنی کے جذبہ کو ابھارنے کے سلسلے میں انھوں نے قومی نظموں کے متعدد مجموعے شائع کیے۔ آزادی حاصل ہونے سے قبل اور ۱۹۵۱ء تک وہ کانگرس پارٹی کی جانب سے شائع ہونے والے رسالے ترقی کو ایڈٹ کرتے رہے جس میں وہ ملک کے معاشی اور سیاسی مسائل پر بے باکانہ تبصرہ کرتے اور تعمیری تجاویز اور ملک کی فلاح و بہبودی کے عملی اقدامات پیش کرتے رہے اور ہمیشہ برٹش گورنمنٹ کی آنکھوں میں کھٹکتے رہے۔ ان کی تنقید سیاسی ہو یا علمی بے لاگ اور اصلاحی ہوا کرتی جس میں فلاح قوم اور فلاح ملت کا جذبہ کارفرما رہتا۔ وہ خلوص اور صداقت کے پیکر تھے۔

صدیق صاحب مرحوم نے نہایت مفید اور علمی کتابیں شائع کیں جن میں چند نہایت مشہور اور ممتاز ہیں مثلاً احمد علی شوق مرحوم کی مثنوی عالم خیال، عبد الباری آسی مرحوم کی شرح دیوان غالب، عزیز لکھنوی مرحوم کا دیوان موسوم بہ گلکدہ، شوکت تھانوی مرحوم کے مزاحیہ مضامین کے متعدد مجموعے نہایت اہتمام سے شائع کیے۔

انھوں نے سماج سیوا کی دھن میں قرض حسنہ کی ایک مفید اور جامع اسکیم مرتب کی تاکہ حاجت مند لوگ مہاجنوں کے چنگل سے بچ سکیں اور اپنی ضرورت کے لیے بلاسود کا قرض لے سکیں۔ الغرض خدمت خلق برائے خدمت خلق ان کا نصب العین رہا۔ وہ مختلف فرقوں اور جماعتوں کے اتحاد باہمی کے زبردست حامی تھے ان کا نظریہ تھا کہ اقلیتوں کو اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مل جل کر اور ان کے دکھ درد میں شریک رہ کر خدمت وطن میں تن من دھن سے لگ جانا چاہیئے۔ وہ اپنے اصولوں میں اتنے سخت تھے کہ ان پر قائم رہنے کے باعث بڑے سے بڑا مالی نقصان برداشت کیا اور اف تک نہ کی۔ انھوں نے جو سماج کی خدمت کا خاکہ مرتب کیا وہ آج بھی سماجی کارکنوں کے لیے مشعل ہدایت ہے جس کی روشنی میں وہ سماج کی سطح بلند کر سکتے ہیں۔ یہ تھیں ان کی طویل زندگی کی خدمات جو ان کے مقالوں متعدد رسالوں اور تقریروں سے نمایاں ہیں۔ اور یہ خدمات ایسی ہیں کہ ملک و قوم ان کو آسانی سے بھلا نہیں سکتی صدیق صاحب ہی کے ایسے دردمند، مخلص اور دھن کے پکے خادم قوم کے لیے میر کہہ گئے ہیں ؎

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

★

فضل نقوی

محافظ جمہوریت

اندرا گاندھی

شانتی کی روح اہنسا کی نگاہوں کا وقار — جان آزادی گلستاں کے لیے ابر بہار
گاندھی اور نہرو کے اقوال عمل کی یادگار — اکبر و پرتاپ کے ہندوستاں کی تاجدار
لکشمی بائی کی ضو دیتی ہوئی تنویر ہیں
ملکۂ حضرت محل کے خواب کی تعبیر ہیں

جوش قومی نے رکھی ہے ملک و ملت کی لاج — ان کی نظروں کی تجلی دیکھ کر نکھرا سماج
گنگا اور جمنا کی لہریں کیوں نہ دیں جھک کر خراج — نور کے چہرے پہ ضو دیتا ہے آزادی کا تاج
ان کی کوشش سے ہر اک قسمت بھلی ہوتی گئی
مندر و مسجد میں یکساں روشنی ہوتی گئی

عظمت انسانیت تھی کارواں در کارواں — لب کی جنبش نے مکمل کی وفا کی داستاں
دیکھ کے ہر راہ میں گاندھی کے قدموں کے نشاں — کردیا ثابت عمل کے ساتھ رہتی ہے زباں
قومیا کر بینک سارا ملک روشن کردیا
جھونپڑی کو قصر ویرانے کو گلشن کردیا

کس نے کس نے انکے نازک دل کو تڑپایا نہیں — ہاں مگر ہمت کا پرچم تھا جو جھک پایا نہیں
کون سے طوفان کا بادل تھا جو چھایا نہیں — زلف کی نکھری شکن تیور پہ بل آیا نہیں
دیپ ہر غربت کدے کے پاس روشن ہوگئے
ہند کے دشمن ادھر کوتاہ دامن ہوگئے

ہر ستارہ زندگی کی داستاں بنتا گیا — ہر عمل تاریخ میں عظمت نشاں بنتا گیا
راہ کی دشواریوں میں کارواں بنتا گیا — جو قدم رکھا زمیں پر آسماں بنتا گیا
جس چمن میں خود چلی تھیں وہ چمن تک دیدیا
قومیت کے نام پر اپنا بھون تک دیدیا

ایسی ہمت دل دے کر کردیا ملت کو شاد — مستقل تھا راستہ مٹتے گئے خود ابر و باد
دل کو تڑپانے لگی جب گاندھی نہرو کی یاد — ملک کو بیدار کرکے وقف کردی جائداد
دولتوں کا ہر پجاری درس حق حاصل کرے
ان کا ہر ایثار دیکھے اور سبق حاصل کرے

قاعدہ ہے قافلے کے ساتھ کچھ اٹھتی ہے دھول — پھر بھی دامن کو بچا لیتے ہیں آزادی کے پھول
ایک جا کیونکر نہ ہوتے ملک کے سب غرض مند — بن گئے فولاد کی دیوار اندرا کے اصول
حرص کی سب آرزوئیں خاک ہو کر رہ گئیں
زر پرستی کی قبائیں چاک ہو کر رہ گئیں

قومیت میں بڑھ گیا انسانیت کا اعتبار — کشمکش میں پڑ گئے کچھ اور جبر و اختیار
چشم کی جنبش میں ٹھہری گردش لیل و نہار — نارمل ہونے لگا سرمایہ داری کا بخار
خود غرض مطلب پرستی کے لیے روتا گیا
قوم کے دامن سے ہر کانٹا الگ ہوتا گیا

کھل گیا جیسے پھول نکھرے گلستاں آگے بڑھا — زندگی کے راستے پر کارواں آگے بڑھا
اندرا جی کے روش پر قومی نشاں آگے بڑھا — جب قدم آگے بڑھے ہندوستاں آگے بڑھا
حرص اور لالچ کے دامن چاک ہو کر رہ گئے
وہ ترقی کی کہ دشمن خاک ہو کر رہ گئے

جگمگایا ہند کی تاریخ کا زریں لباس — بن گیا شمع حقیقت تیر غالب کا قیاس
روشنی میں آگیا حسن خیالی سور داس — جاوداں گلشن بنا روح ظفر کے آس پاس
خود محبت تھا تو انجام محبت بن گیا
ہند کی آغوش میں کشمیر جنت بن گیا

قلعے کی رونق بڑھی اور تاج کے گنبد کا نور — دیکھ کر ہندوستاں کو مسکرائی شمع طور
خاک ہو کر رہ گیا ہر دشمنی حق کا غرور — کیوں نہ بڑھتا اے اجنتا تیرا الکھوں کا غرور
اندرا جی نے صداقت چھیڑ دی ہر ساز پر
ملک سارا جاگ اٹھا ایک ہی آواز پر

قیمتیں گرنے لگیں اور جرم کم ہونے لگے — قوم کو راحت ملی دشمن کو غم ہونے لگے
فضل کالے دھن کے جو دامن تھے نم ہونے لگے — ساغر حسن و محبت جام جم ہونے لگے
اندرا جی نے بلندی دی ہر اک پیغام کو
اور اونچا کردیا جمہوریت کے نام کو

اخلاق حسین عارف

افسانہ

پھندا

اس نے جھولی کاندھے پر لٹکائی، ایک ہاتھ سے لاٹھی تھامی دوسرے میں ڈگڈگی اور بندر بندریا کی رسی تھامے اللہ کا نام لے کر کھڑا ہو گیا۔

وہ سڑک پر چلتا رہا اور اس کے پیچھے پیچھے کھلنڈرے بچے بھی چلتے رہے۔ ان میں سے کوئی بندر بندریا کو چھیڑتا، کوئی شرارت کا مظاہرہ کرتا تو کچھ تالیاں بجاتے مگر مداری ان سب سے بے نیاز اپنی راہ پر گامزن رہا۔ وہ ان سب سے بے پرواہ ڈگڈگی بجاتا سڑک پر بڑھتا ہی رہا۔ اس کی لنگی ہوا کے تیز جھونکوں سے کبھی ادھر کبھی ادھر اڑتی رہی جس میں سے اس کی آبنوسی رنگ کی پنڈلیوں کی ابھری نسیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کی داڑھی اور سر کے بال کثیف اور الجھے سے تھے۔ پگڑی جو کبھی رنگین رہی ہوگی، امتداد زمانہ کے ہاتھوں اس درجہ بدرنگ ہو گئی تھی کہ موجودہ صورت میں اس کے رنگ کا امتیاز محال ہو گیا تھا۔ اس کے کرتے کی آستینیں بھی یقیناً لانبی ہوں گی کیونکہ انھیں اس نے کہنیوں تک موڑ رکھا تھا ـــــ اترن کے کپڑوں میں ٹھیک ناپ کے ہونے کا امکان بھی کہاں!

اور ان باتوں کے متعلق اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اور یہ باتیں اس کے سوچنے کی تھیں بھی نہیں ـــــ کیونکہ وہ پشتینی مداری تھا ـــــ! اترن، جھوٹن اور گنے چنے ٹکے ہی تو اس کا مقدر بن چکے تھے۔

لیکن جس قدر پچھلے چند دنوں میں وہ پریشان اور سراسیمہ رہا، اتنا ہی آج وہ مسرور و مطمئن تھا۔ پچھلے دنوں تو اس کے جوڑ جوڑ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، جماہیاں آ رہی تھیں، طبیعت از حد نڈھال رہی تھی۔ سارا جسم بھٹی کی مانند پھنک رہا تھا مگر اب اُن دنوں کے مقابلہ میں اپنے کو بہتر محسوس کر رہا تھا کیونکہ آج کئی روز کے بعد اس نے پیٹ بھر کر خود بھی کھایا تھا اور بندروں کو بھی کھلایا تھا۔ پچھلے دو دن تو اسے سینہ کے درد اور کھانسی نے اٹھنے ہی نہیں دیا تھا۔ وہ دن رات اپنی جھونپڑی میں پڑا کراہتا رہتا اور بندر بندریا کھونٹوں سے بندھے گول دائرے میں گھومتے اور چیختے رہتے۔ کل کے دن وہ ہمت کرکے تھوڑی دیر کے لیے پھیری پر نکلا بھی تو ایک لمبا چکر لگانے کے باوجود کسی نے آواز تک نہ دی ـــــ شاید مہنگائی سے متاثر ہو کر تماشائی بھی کفایت شعاری پر اتر آئے تھے ـــــ وہ تو خدا بھلا کرے ان میم صاحبہ کا جو شاید کہیں باہر سے آئی ہوئی معلوم دے رہی تھیں تبھی تو تماشہ دیکھنے کے بعد اپنی بچی کے ہاتھوں سے دو روپے کا کرارا نوٹ دلوایا تھا اور ساتھ ہی بہت سی روٹیاں اور سبزی بھی جو اس نے پیٹ بھر کر کھائیں اور بندر بندریا کو بھی کھلائیں۔ بنگلے کے احاطہ میں مکینوں کے علاوہ پاس پڑوس کے بچے بھی تماشا دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ اور مداری اس سجی گڑیا کو تو کبھی اس کی مخیر ماں کو تشکرانہ نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

کھا پی کر بنگلہ کے احاطہ سے نکلنے سے پیشتر اس نے بندر کی رسی ڈھیلی کر دی اور بچی اور میم صاحب کے پیروں کو چھو کر انھیں سلام کرنے کا اشارہ کیا۔ اور اس کام سے فارغ ہو کر خود بھی دعائیں دیتا ہوا باہر کی طرف چل پڑا۔ جن کے پاس کچھ دینے کو نہیں ہوتا۔
وہ دعائیں ہی تو دیتے ہیں ـــــ!

یہ کرشمہ دن میں کئی کئی بار ہوتا۔ لیکن پھر بھی دو دو چار چار آنے کر کے بمشکل روپیہ پورا ہونے کی نوبت آتی۔ مہنگائی کی وجہ سے سوکھا اناج ملنا یکسر موقوف ہو گیا تھا کیونکہ

گرانی نے عوام کو حد درجہ محتاط بنا دیا تھا۔

مگر آج سب دنوں سے معاملہ مختلف تھا ـــــــ پیٹ بھرنے کے بعد اس کے پاس دو روپے کا کرارا نوٹ بھی تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کی ڈگڈگی کی آواز از خود تیز ہوگئی۔ اور وہ ریلوے بینک کالونی سے ملنے والی بڑی سڑک کی جانب تیزی سے بڑھنے لگا۔ بچوں کی بھیڑ بھی آہستہ آہستہ اس کا ساتھ چھوڑنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تنہا رہ گیا صرف اس کے ساتھ چلنے والے رسی سے بندھے ہوئے بندر اور بندریا رہ گئے جن کے پیروں سے بندھے ہوئے گھنگھروؤں کے تال اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کا ساتھ دے رہے تھے اور وہ کالونی سے دور ہوتا جا رہا تھا تھوڑی مسافت کے بعد جب اس نے پل کو پار کیا تو اس نے ڈگڈگی کو جھولی میں رکھ کر بیڑی سلگائی۔ اب وہ ریلوے کراسنگ سے ملی ہوئی سڑک پر جامن کے پیڑ کے نیچے پان بیڑی سگریٹ کی ایک چھوٹی سی دوکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنی تہبند کی پھینٹ میں گھرسے ہوئے نوٹ کو نکالا اور دکان دار کی طرف بڑھاتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا ـــــــ دکان دار نے اسے دو سگریٹ، ایک پڑیا اور بقیہ پیسے تھما دیے اور بدستور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اس وقفہ میں بندر اور بندریا اپنے گلوں میں بندھی ہوئی رسی کو تھامے اس کے قدموں میں بیٹھے ادھر ادھر تکتے رہے۔

مداری نے پڑیا اور سگریٹوں کو بڑی احتیاط سے جیب میں رکھتے ہوئے دکان دار سے تھوڑا پانی مانگا۔ پانی پی کر اس نے بھیگا ہوا ہاتھ غبار آلود چہرے اور بلگی داڑھی پر پھیر لیا اور اپنے راستہ پر ہولیا۔

سورج آہستہ آہستہ بالکل سر پر آچکا تھا۔ ڈامر کی سڑک تپنے لگی تھی۔ ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے پہنچ کر وہ رکا، اپنی جھولی کو کاندھے سے اتار کر درخت کی جڑ سے لٹکا دیا اور بندر اور بندریا کی رسیوں کو زمین سے ابھری ہوئی جڑ سے الجھا کر وہ خود بھی درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد سڑک بیوہ کی مانگ کی طرح سونی ہوگئی اور دور تک کوئی آتا جاتا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے اپنی جیب سے سگریٹ اور پڑیا نکالی ایک سگریٹ کی تمباکو نکال کر کھوکھلے کاغذ کو جھولی پر رکھ دیا اور پڑیا کھول کر اس نے ہتھیلی پر الٹ لی، اسے انگوٹھے سے مسلا اور سگریٹ والے خول میں بھر کر ہاتھ جھاڑ لیے۔

بندریا بے تعلق سی بیٹھی کبھی پیڑ پر آتی جاتی چڑیوں کو دیکھتی کبھی اپنی پھول دار گھنگھریا کے اوپر سے اپنے کولھے کھجانے لگتی مگر بندر مداری کے قریب کھسک کر جمائیاں لینے لگا تھا۔

مداری نے سگریٹ سلگا کر پہلے چھوٹے چھوٹے کش لیے پھر جو لمبا کش کھینچا تو سگریٹ سلگ کر آدھا ہوگیا، اس کے ساتھ ہی مداری پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ اس کی آنکھیں لال بھبوکا ہوگئیں چہرے کی رگیں تن گئیں۔ وہ بندر کی جانب منہ کیے کھانس رہا تھا اور بندر اس کے منہ سے نکلنے والے دھوئیں کو پی جانے میں مصروف تھا۔ مداری کھانستے کھانستے اپنا سینہ پکڑے درد اور تکلیف سے مضطرب جب بندر کی طرف سے اپنا منہ ہٹا لیتا تو بندر کھسیا کر چیخنے لگتا مجبوراً مداری پھر اپنا منہ اس کی جانب کرکے کھانسنے لگتا۔ لیکن اچانک اس کے منہ سے سگرٹ کے دھوئیں کے بجائے بدبو کا ایک بھبکا نکل رہا تھا۔ اس موقع پر بندر نے اپنا منہ ہٹا لیا۔

تھوڑے وقفہ کے بعد مداری نے بقیہ سگرٹ کا کش اس زور سے کھینچا کہ وہ جلتے جلتے اس کی انگلیوں کی پوروں تک پہنچ گیا اس کے ساتھ ہی اس پر پھر وہی کھانسی کا دورہ شروع ہوا۔ بندر دوبارہ دھوئیں کو سانس کے ذریعہ اپنے پیٹ میں اتارنے لگا کیونکہ مداری کے کھانسنے کے عمل کے دوران اس کے منہ سے نکلا ہوا دھواں بندر کے منہ اور ناک کے ذریعہ اس کے پیٹ میں جا رہا تھا جس کا وہ بھی عادی ہوچکا تھا۔ اس کا بھی چہرہ مداری کی طرح پہلے سرخ پھر پیلا ہونے لگا۔

کھانستے کھانستے مداری نڈھال ہوکر زمین پر چاروں خانے چت پڑ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پسلیوں پر تیزی سے چل رہے تھے اور وہ مسلسل کھانسے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا سر جھٹکے سے ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ ذرا دیر بعد اس کے منہ سے خون کا ایک فوارہ سا چھوٹا اور اس کی ہچکیاں بتدریج چڑھنے لگیں۔ کچھ دیر نہ بیتی تھی کہ اس کا سارا جسم ڈھیلا ہوکر زمین پر پھیل گیا۔ اب اس کی سانس کی دھونکنی بھی سستی آ چلی تھی اور آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

بندر نے بغور اس کا جائزہ لیا اس کے بعد وہ جا کر بندریا کے پاس بیٹھ گیا اس کے چہرہ پر اطمینان کے آثار دکھائی دے رہے تھے اور بندریا خاموش تماشائی بنی بہت کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔

بندر کو اپنا سر اور جسم بھاری سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی کرنجی آنکھیں بھی سرخی مائل ہو گئی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر متاقت بنا من کی طرح مداری کے چہرے پر نگاہ ڈالی جس کے منہ اور ناک پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

بندر کی آنکھوں میں ایک چمک سی نمودار ہوئی اس نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ ادھر رسی میں قدرے تناؤ پیدا ہوا پھر اس نے مسلسل جھٹکے دیتے ہوئے اچھل پھاند کرنا شروع کر دی تاکہ اس پھندے سے اپنے کو جلد از جلد نجات دلائے اب وہ آزاد ہونا چاہتا تھا۔ وہ اپنی فہم کے مطابق یہ جان چکا تھا کہ مداری ختم ہو چکا ہے جس کے اشاروں پر وہ ایک مدت سے ناچتا اور کرتب دکھاتا رہا ہے —— لیکن اب وہ اس دھندے سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔

بندریا اپنی گنگھریا سنبھالے ذرا اس سے کھسک کر بیٹھ گئی۔ وہ کبھی مداری کو دیکھتی اور کبھی اچھل پھاند کرتے ہوئے بپھرے بندر کو۔ بندر اپنی تمام طاقت اور زور کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے رسی کے پھندے کو گلے سے نکالنے کی کوشش میں مصروف تھا حالانکہ اس تگ و دو میں اس کی گردن کے کچھ بال بھی نچ گئے تھے۔

پھندا جیسے ہی بندر کی گردن سے نکلا وہ بغیر ادھر ادھر دیکھے سیدھا سڑک پار کرتا ہوا کھیتوں کی جانب اچکتا پھاندتا یہ جا وہ جا۔ بہت دور جا کر وہ ایک پیڑ پر چڑھ کر دم لینے لگا۔

اس کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اب وہ بالکل آزاد تھا۔ ذرا دیر بعد پیڑ کی شاخوں پر ادھر ادھر اچھل کود کر اسے ایک عجیب سی فرحت محسوس ہوئی۔ اب اس کے گلے میں کوئی پھندا نہیں تھا۔ اب اسے کسی مداری کے اشارہ پر ناچنا اور کرتب دکھانا نہیں تھا۔ اس احساس سے رہ رہ کر اس کے جسم میں ایک برقی رو دوڑ جاتی جس کی وجہ سے وہ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر چھلانگ لگاتا کبھی کسی شاخ پر لٹکتا کبھی ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر چھلانگ لگا دیتا۔

اسی ہنگامے میں دن ڈھل گیا اور شام ہو گئی تب اس نے صبح کا بچایا ہوا ذخیرہ گلپھڑہ سے برآمد کر کے بھوک کی آگ کو تسکین دی اور کسی شاخ سے لگ کر شب باش ہو گیا۔

دوسری صبح اس نے بستی کا رخ کیا بستی کے باہر ایک باغ میں بہت سے بندروں کی موجودگی کو دیکھ کر اس میں ایک نیا جوش، ایک نیا ولولہ پیدا ہوا۔ وہ قلانچیں مارتا ہوا ان میں شامل ہونے کے لیے سرعت سے آگے بڑھتا گیا جہاں اس کے ہم جنس بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سوچتا جا رہا تھا کہ ایک مدت کے بعد وہ اپنی برادری والوں سے ملے گا۔ ان کے غول میں شامل ہوکر وہ بھی آزادانہ طور پر باغ میں اچکتا پھاندتا پھرے گا اس سرخوشی سے سرشار وہ چھلانگ لگاتا پھاندتا چلا جا رہا تھا۔

ان بندروں نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور وہ ایک تنومند خرانٹ بندر کی سرداری میں قریب تر ہونے لگے تھے اور وہ سردار بندر اسے وحشی اور خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا، باقی غول کے بندر سمٹ کر اس کے پاس کھڑے ہوکر خوں خوں کرنے لگے تھے۔

مداری والے بندر کے بڑھتے قدم رک گئے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماجرا کیا ہے —— یہ تو خیر مقدم کے بجائے شاید حملہ کی تیاریاں تھیں۔ ابھی وہ کسی فیصلہ تک پہنچی نہ

پہنچنے پایا تھا کہ ان بندروں نے اپنے سردار کی سرکردگی میں ایک ساتھ حملہ کا بگل بجا دیا۔

مداری والے بندر نے الٹے پیروں بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی لیکن کچھ ہی دیر بعد تمام بندروں نے اسے آ دبوچا اور بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ بھلا ہو چند آوارہ کتوں کا جنھوں نے بروقت دخل درمعقولات کا عمل کیا جس سے اس کی جان بچی اور موقع پاکر وہ سر پر پیر رکھ کر بے تحاشا بھاگتا ہوا بہت دور جاکر ایک پیڑ پر چڑھ گیا۔ بندروں کا غول بھی منتشر ہوگیا اور جسے جو پیڑ ملا اس پر چڑھ گیا۔

اس طرح بچ نکلنے کے بعد وہ سارا دن سہما ہوا اسی پیڑ کی ایک شاخ پہ بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ شام ہوگئی مگر اب اس پر بھوک اور پیاس کا غلبہ ہوا مجبوراً وہ رات اس نے خراشوں کی تکلیف اور بھوک پیاس سے بے چین رہ کر کاٹی۔ صبح اس نے سہمی سہمی نظروں سے پیڑ کے نیچے اور دائیں بائیں دیکھا کسانوں کی اکادکا آوازیں آنے لگیں تھیں اسے بھوک شدت سے لگی تھی۔ مگر نیچے اترنے کی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں تھوڑا وقت اور بیتا آخرش دوپہر سر پر آگئی تب اس نے کمر ہمت کس کر پیڑ سے نیچے اترنے کی ٹھانی کیونکہ بھوک اور پیاس کی شدت سے وہ بے چین ہو رہا تھا۔

دوپہر کے سناٹے میں وہ سہما ٹھٹکتا نیچے اترا اور چھپتا چھپاتا ایک نالے پر جاکر پانی پینے لگا پانی پی کر اس نے کان پھٹ پھٹائے، سر کو جنبش دی اسی کے ساتھ اسے کئی بار جمائیاں آئیں، تب اس کو یاد آیا کہ دن کے اسی حصہ میں اس کا مداری بنی ہوئی سگریٹ کا کش گھسیٹ کر اس کے منہ پر دھواں چھوڑتا تھا جس کے کیف سے اس کے جوڑ جوڑ میں توانائی سی دوڑ جاتی تھی اور ایک لطیف تازگی محسوس ہوتی تھی۔ اس احساس کو دماغ سے محو کرنے کے لیے اس نے سر کو کئی جھٹکے دیئے۔ اور پھر کچھ کھانے کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ جنگلوں میں رہنے والے بندر کن کن اشیاء سے اپنا گزارا کر لیتے ہیں ——— اگر کوئی چیز اس کے ہاتھ لگتی تو پہلے وہ اسے سونگھتا پھر پھینک دیتا ——— روٹی یہاں کہیں میسر نہیں ——— : اس نے سوچا۔

ایک ایک کر کے دن گزرتے رہے۔ بھوک، تنہائی اور نشی دھوئیں کی مار سے وہ نحیف ولاغر ہو چلا تھا۔

ایک دن وہ تہیہ کر کے باغ کی جانب چلا کہ وہ کسی نہ کسی طرح بندروں کے غول میں شامل ہوگا تا کہ اسے عافیت ملے اور تنہائی دور ہو۔ وہ بستی کے قریب ایک پیڑ پر چڑھ کر بیٹھ گیا مگر تھوڑی دیر بعد جوں ہی اس نے پیڑ کے نیچے دیکھا تو اسے نظر آیا کہ پیڑ کی جڑ سے ملا ایک چھوٹا سا گڑھا ہے جس میں پیلے پیلے چنے بھرے ہیں اور گڑھے کے منہ پر ویسا ہی رسی کا پھندا ہے جیسا کہ مداری اس کے گلے میں ڈالے رہتا تھا۔ اسے بہت دنوں کی بات یاد آئی جب وہ چھوٹا سا تھا تو ایک ایسے ہی پھندے میں مداری نے اس کے گلے کو پھنسا کر پکڑا تھا ——— اور پھر چھڑی کے اشاروں اور روٹی کی لالچ کے ذریعہ مداری نے اسے ناچنا اور کرتب دکھانا سکھایا تھا اور گلی گلی تماشا دکھا کر وہ اپنی روزی روٹی کماتا تھا اور نشہ پانی کرتا تھا۔

ان خیالات کے آتے ہی نہ جانے کیوں اس کا مداری اسے یاد آنے لگا جس کے منہ سے اگلے ہوئے دھوئیں کو وہ ایک مدت سے ترس گیا تھا جو اس کے جسم میں ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔

اب وہ سنبھل سنبھل کر بڑے عزم کے ساتھ نیچے اترنے لگا۔ پیڑ سے اتر کر اس نے بڑے اطمینان سے گڑھے پر پہنچ کر چنوں پر اپنا منہ ڈال دیا۔ ابھی وہ چند ہی لقمے کھا پایا تھا کہ پھندا کس گیا جس کا سرا کہیں دور تک نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں اور بے بس ہوگیا۔

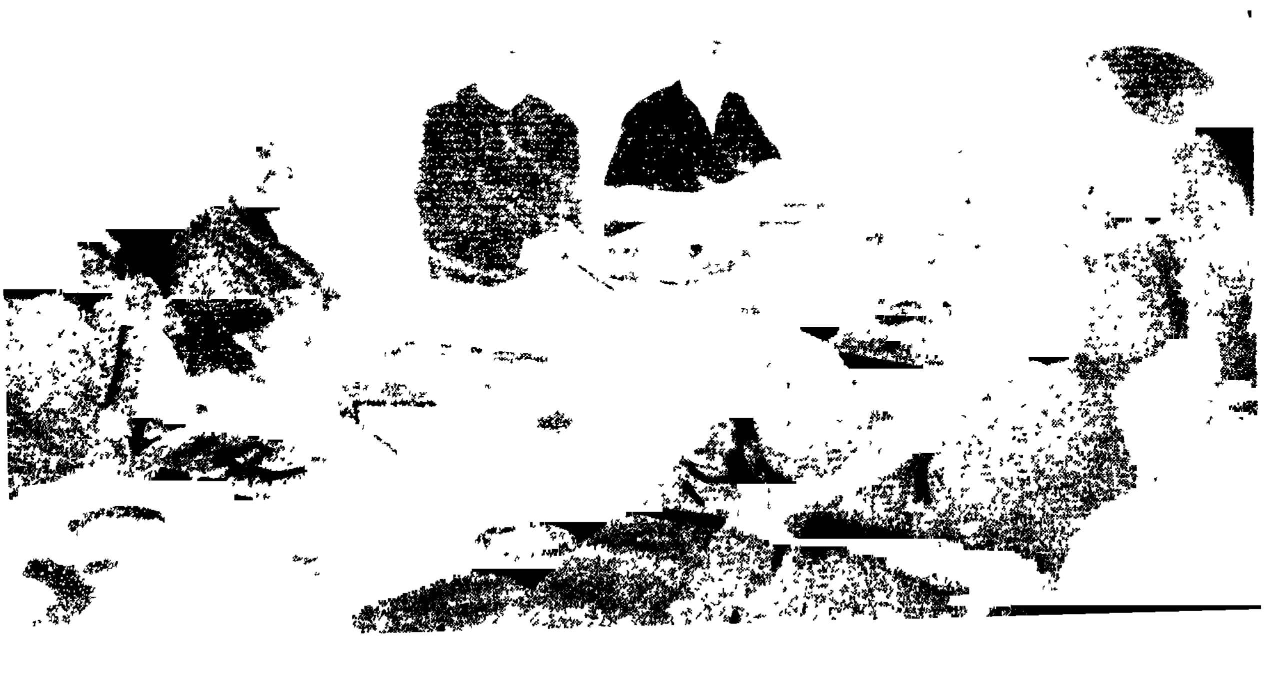
اس کے دوسرے دن اس نے حسب سابق بڑی مشاقی سے اپنے نئے مداری کے اشاروں پہ ناچنا اور کرتب دکھانا شروع کر دیا۔ مگر اس کا یہ نوجوان مداری پہلے والے سے قدرے مختلف تھا۔

★



نیپال کے وزیر خارجہ مسٹر کرشنا راج اریل نے ۱۶ر اگست ۱۹۷۵ء کو نئی دہلی میں صدر جمہوریہ شری فخرالدین علی احمد
سے راشٹرپتی بھون میں ملاقات کی

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۶ر اگست کو نئی دہلی میں غالب انسٹی ٹیوٹ بورڈ آف ٹرسٹیز کے سالانہ جلسہ کو خطاب کیا
وزیر اعظم کے دائیں جانب بیگم عابدہ احمد بھی تشریف فرما ہیں





یوم آزادی کے موقع پر گورنر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی
راج بھون میں تقریر کرتے ہوئے



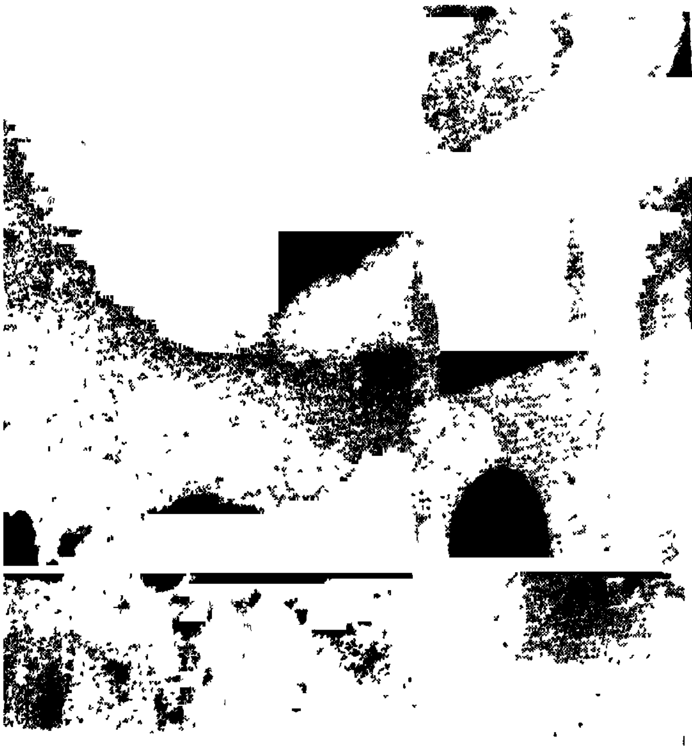
گورنر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی ۴ اگست کو ڈپٹی ڈائرکٹر
محکمہ اطلاعات، شری ٹھاکر پرشاد سنگھ کو ریاستی
ادبی ایوارڈ دے رہے ہیں

ستنٹرل ہوائی فوج کے کمانڈر کی اہلیہ شمیم
لطیف نے سیلاب سے متاثرہ افراد کی امداد
کے لیے گورنر اترپردیش کو ۳ ٹن اناج پیش کیے





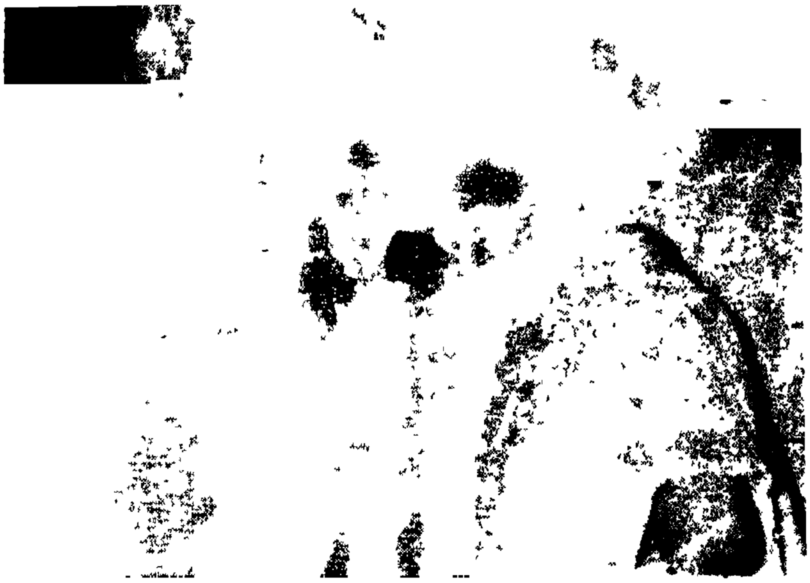
وزیر اعلا شری ہیم وتی نندن بہوگنا ۵ راگست کو ہندستان میں مقیم
آسٹریلیا کے ہائی کمشنر شری بروس گرانٹ اور ان کی اہلیہ کے اعزاز
میں دیے گئے ایک عشائیہ کے موقعہ پر ان کا استقبال کرتے ہوئے



وزیر اعلا شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے ۱۵ راگست کو شہید پارک
کا افتتاح کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے



وزیر اعلیٰ ۱۵ راگست کو اپنی رہائش گاہ پر مداشہ
سے محو گفتگو ہیں



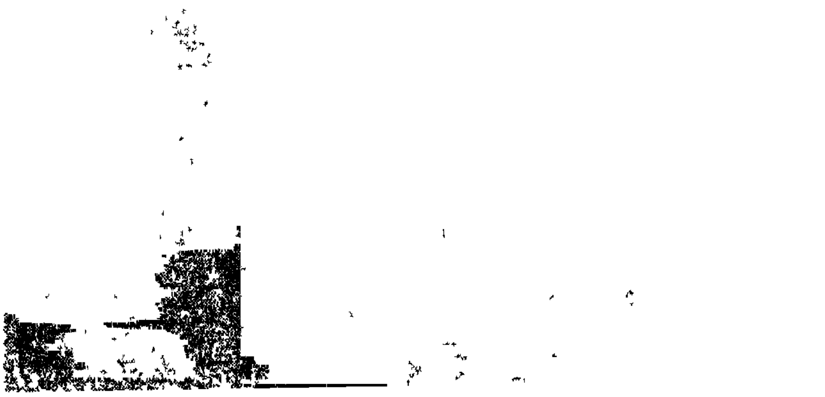
گورنر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی اور شریمتی ریڈی ۹ راگست کو چار مینار
ریلوے اسٹیشن پر بیگم عابدہ احمد کا استقبال کرتے ہوئے



بیگم عابدہ احمد ۹ اگست کو ردیف رالیہ میں
مولانا عبدالماجد دریا آبادی

اور

علی سردار جعفری کو نہرو کلچرل ایسوسی ایشن
کی جانب سے اردو ادب ایوارڈ پیش
کر رہی ہیں



حکیم جوہر شاہ وارثی

وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کا نوجوانانِ وطن سے خطاب

روند کے گردشوں کو دیکھ زلزلوں کو کچل کے دیکھ
دھڑکنیں دل کی روک کر تیوریوں کو بدل کے دیکھ

منزلِ مقصدِ حیات موت کی وادیوں میں ڈھونڈھ
گم ہے تلاشِ زندگی راہِ عمل پہ چل کے دیکھ

فکر و نظر بلند کر شارعِ عام چھوڑ دے
دور ہوں منزلیں اگر راستے کو بدل کے دیکھ

فکر و نظر کو چاہیے ہر گھڑی اک انقلاب
حسن کو بھی بدل کے دیکھ عشق کو بھی بدل کے دیکھ

صبر کسی کا یاد کر خلق کسی کا یاد کر
آج کی کج روی نہ دیکھ حسنِ عمل کو کل کے دیکھ

پیش روؤں سے لے سبق پیروی خواص کر
ان کی روش پہ چل کے دیکھ ان کی روش میں ڈھل کے دیکھ

میکدۂ منافرت اصل میں قصرِ مرگ ہے
زہر بھرے سبو توڑ دے یا بدل کے دیکھ

لاکھ حسیں سہی مگر پستیاں پھر ہیں پستیاں
سامنے ہیں بلندیاں دو قدم اور چل کے دیکھ

نفرت و بغض و انتشار ہیچ کنی و خلفشار
کتنے عمیق غار ہیں اب ان سے تو نکل کے دیکھ

ملک کی آبرو و حیا قوم کی دیکھ بھال کر
راہِ وفا کر اختیار طرزِ عمل بدل کے دیکھ

آبروئے وطن بھی تو قوم کی روح تن بھی تو
ان کے مفاد کے لیے اپنے کو تو بدل کے دیکھ

تیرا بھلا اسی میں ہے لطفِ حیات اسی میں ہے
محفلِ خار سے نکل پھول ہیں پھول پھل کے دیکھ

دہر کا انقلاب اگر امن میں تیرے دخل دے
دہر کے انقلاب کو ٹھوکروں سے کچل کے دیکھ

قاضی سید عرشی کاظمی

بانگِ رحیل

مصورو، شاعرو، ادیبو! کوئی نیا فکر و فن تراشو
کہ زلف و رخ کی نمائشوں سے طبیعتیں چور ہو چکی ہیں
کہ زندگی کی پرانی شمعیں جھلک کے بے نور ہو چکی ہیں

ادائے سرو و سمن کو بدلو۔ مزاجِ حسنِ چمن تراشو
تمھاری کاوش سے پھوٹ نکلیں حیاتِ تازہ کی آبشاریں

تم اپنے قول و عمل کا پرتو خرد کے ظلمت کدوں میں بھر دو
جنوں کی شعلہ مزاجیوں کو شعور دو علم دو ہنر دو

اٹھو دو عالم کا حسن بھر دو ہر ایک تصویرِ زندگی میں
تمھیں خبر ہے نئے تجسس نئی امیدوں کی آہٹ لے کر

سکونِ قلب و نظر کی خاطر خلا میں انساں بھٹک رہا ہے
زمین پر ہے تو جیسے کانٹا چبھا ہوا ہے کھٹک رہا ہے
ہزار ہا سال سے رواں ہے زمانہ دکھ کے پہاڑ لے کر

مصورو، شاعرو، ادیبو! زمین کو آسماں بنا دو
جہاں جہاں ہو وہیں وہیں پر محبتوں کے جہاں بسا دو

بدیع الزمان اعظمی



کاغذ کی ایجاد اور اہمیت

ماہنامہ کا یہ شمارہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے کاغذ کے چند اوراق پر ہی تو مشتمل ہے۔ ان اوراق کو قدر کی نگاہ سے دیکھیے۔ یہ سونے اور جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ تہذیب و تمدن کے موجودہ قصر کو منہدم ہونے میں دیر نہ لگے گی اگر کاغذ صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے۔ کاغذ ہی در اصل جہالت اور اکتساب علم کے درمیان، نظم و نسق اور لاقانونیت کے درمیان، غلامی اور آزادی کے درمیان، قدیم تاریکی اور نئی روشنی کے درمیان ایک پل کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے بغیر ہم ان تحریری الہامات سے بھی تہی دامن ہو جائیں گے جو ہمارے دلوں کو گرماتے اور ہمیں کار عظیم کرنے کے لیے اکساتے رہتے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ کاغذ کی اہمیت کیا ہے۔

اگر آپ دنیا کے کسی بڑے کتب خانے میں جائیں جہاں عظیم المرتبت کتب الہٰیہ کے علاوہ بڑے بڑے فلسفیوں، بڑے بڑے ادیبوں، بڑے بڑے دانشوروں، بڑے بڑے شاعروں، بڑے بڑے سائنس دانوں، بڑے بڑے ہیئت دانوں اور بڑے بڑے سیاست دانوں کی لکھی ہوئی کتابیں محفوظ ہیں تو آپ کو تعجب نہ ہوگا کہ مرے ہوئے ہزاروں لاکھوں انسان اب بھی آپ سے باتیں کر رہے ہیں اور اپنی تحریروں سے آپ پر مختلف انداز سے اثر انداز ہو رہے ہیں۔ وہ آپ کو اپنی تحریر کردہ کتابوں کے مطالعہ سے ہنسنے یا رونے پر مجبور بھی کر رہے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کتب خانوں کی الماریوں میں قرینے سے سجی ہوئی کتابوں میں سقراط، افلاطون، ارسطو، کنفوشس، قیصر، کارل مارکس وغیرہ کی کتابوں کے پہلو بہ پہلو ہومر، ملٹن، ورڈس ورتھ، شیکسپیر، گوئٹے، بالزیک، شوپنہار، رومی، سنائی، خیام، حافظ، فردوسی، کالی داس، میر، غالب، ٹیگور، اقبال وغیرہم کے شہ پارے بھی موجود ہیں۔ ان میں سے بیشتر بزرگ ایسے ہیں جو سیکڑوں اور ہزاروں سال قبل دنیا سے جا چکے ہیں لیکن اب بھی وہ ان الماریوں میں بند ہیں اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ اس وقت ہمارے خیالات کیا تھے اور ہمارے سوچنے کا انداز کیا تھا جب ہم بھی آپ کی طرح گوشت و پوست میں ملبوس تھے اور چلتے پھرتے انسان تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ابن آدم اپنے ابتدائی دور میں اپنے خیالات کی ترجمانی چند اشاروں، علامتوں یا تصویروں کے ذریعہ کیا کرتا تھا۔ جن کے نمونے آج بھی ہڈیوں، لکڑی کی تختیوں، غاروں کی دیواروں اور پتھر کی سلوں پر کندہ کی ہوئی تصاویر کی شکل میں ہمیں جابجا ملتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مٹی کی بنی ہوئی تختیوں پر نقش بنا کر یا معبد خانوں کی دیواروں پر خط تصویری میں اپنے خیالات کو ثبت کرنے لگا۔ بعدہٗ اس نے جانوروں کی جھلیوں یا ابتدائی کاغذ کے پارچوں پر لکھنا شروع کیا۔

اہل مصر کاغذ سازی کے باوا آدم کہے جا سکتے ہیں۔ لفظ پیپرس (PAPYRUS) خود غماز ہے کہ مصریوں نے دریائے نیل کے ڈیلٹائی علاقہ میں اگنے والے پیپرس پودے

سے کاغذ بنایا ہوگا۔ اسی پیپیرس سے ہی وہ ٹوکری تیار کی گئی تھی جس کے اندر شیر خوار حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رکھ کر ان کی والدہ ماجدہ نے فرعون وقت کے تانا شاہی حکم کے خوف سے اپنے نور نظر کو نیل کی موجوں کے سپرد کر دیا تھا۔

پیپیرس بر وقت اگرچہ نیل کے ڈیلٹائی علاقہ سے ناپید ہو چکا ہے مگر اب بھی نیل کی بالائی وادی اور حبشہ میں پایا جاتا ہے پیپیرس کے بارے میں مشہور مورخ (THEOPHRASTUS) رقمطراز ہے کہ یہ پودا تین فٹ گہرے پانی میں نشو ونما پاتا ہے۔ اس کی جڑ ۵ فٹ لمبی ہوتی ہے اور دبازت میں انسان کی کلائی کے برابر ہوتی ہے۔ یہ جڑ کیچڑ میں زمین کی سطح کے متوازی پھیلی ہوتی ہے۔ جڑ سے ننھی ننھی جڑیں زمین کے اندر جاتی ہیں اور کئی ایک تنے اوپر کی سمت نکل آتے ہیں۔ یہ تنے چھ فٹ اونچے ہوتے ہیں جو نیچے سے اوپر کی جانب پتلے ہوتے جاتے ہیں۔ ان کے سروں پر پتیوں کے خوب صورت گچھے ہوتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں ان گچھوں سے ہار بنا کر دیوتاؤں کے مجسموں کو پہنائے جاتے تھے۔ جڑ ایندھن کے کام آتی تھی اور تنے کے گودے سے چٹائیاں، ٹوکریاں، رسیاں کپڑے اور کاغذ بنائے جاتے تھے۔

پیپیرس کا کاغذ ابتدائی کاغذ تھا جس پر آج کل کے کاغذ کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ پیپیرس کا سفید گودا لمبے لمبے ٹکڑوں میں کاٹ لیا جاتا تھا۔ انھیں ایک قطار میں رکھ کر ان کے اوپر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آڑے پھیلا دیے جاتے تھے۔ اس کے بعد جملہ ٹکڑوں کو نیل کے کیچڑ سے یا کسی چپکنے والے مادے سے جوڑ دیا جاتا تھا پھر انھیں اچھی طرح دبا کر اور بیل کر کاغذ کی شکل دے دی جاتی تھی۔ یہ کاغذ بھی کچھ کم اہمیت کا نہ تھا۔ مصر میں کھدائی کے بعد اس قسم کی تحریر کردہ کاغذ کے رول پر آج سے ساڑھے پانچ ہزار برس قبل شہنشاہ آسا (EMPEROR ASSA) کے عہد حکومت (سنہ ۳۵۸۰ ق م سے سنہ ۳۵۴۹ ق م) کے حالات درج ہیں۔ کاغذ کا ایک ایسا ہی رول پیرس کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے جو مصر کے پانچویں خاندان کے بادشاہ کے زمانے میں ۲۵۰۰ سال قبل مسیح رکھا گیا تھا۔ ایسے ہی رولوں پر افلاطون، ارسطو وغیرہ کی لکھی تحریریں دستیاب ہوتی ہیں۔ بھارت کا بھوج پتر کچھ اسی قسم کا تھا۔

موجودہ دور کے کاغذ کے سلسلے میں ہم اہل چین کے مرہون منت ہیں۔ چینی لوگ بانس کے بنے ہوئے کاغذ پر یا ریشمی پارچوں پر لکھا کرتے تھے لیکن سنہ عیسوی کی پہلی صدی میں یا اس سے کچھ قبل ایک چینی نے شہتوت کے درختوں کی چھال، چیتھڑے اور مچھلی پکڑنے والے بوسیدہ جالوں سے کاغذ بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ باوثوق ذرائع سے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اصل کاغذ کب بنایا گیا۔ لیکن یہ بات قرین قیاس ہے کہ کاغذ آج سے دو ہزار برس قبل کی ایجاد ہوگی۔ اس امر کا سراغ ہمیں برطانوی سیاح جناب سر آرل اسٹین (SIR AUREL STEINS) کی تحقیقات سے ملتا ہے۔ موصوف برٹش میوزیم کے لیے صحرائے گوبی کے مدفون شہروں کی کھوج میں ایک تحقیقاتی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ اس ریگستانی علاقہ میں قدیم دیوار چین پر بنی ہوئی حفاظتی چوکیوں کے جابجا کھنڈرات بھی تھے۔ انھیں کھنڈروں میں سے ایک کھنڈر کے ملبہ میں کھدائی کے بعد مسٹر اسٹین اور ان کے ساتھیوں کو لکڑی کی چند تختیاں ملیں جن پر چینی زبان میں کچھ عبارت کندہ تھی۔ ان کے علاوہ تحریر کردہ ریشمی پارچے اور درختوں کی چھال اور چیتھڑوں کے بنے ہوئے کاغذ پر لکھے ہوئے خطوط کا ایک بنڈل بھی دستیاب ہوا۔ اگرچہ یہ تحریریں ایسی زبان میں تھیں جس سے مسٹر اسٹین ناواقف تھے مگر بعد میں جب ان کے ترجمے کرائے گئے تو نفس مطلب کا اندازہ ہوا۔ ان خطوط میں سے ایک پر تاریخ بھی تحریر تھی جس سے یہ معلوم ہوا کہ سنہ عیسوی کا ابتدائی زمانہ تھا۔

اہل چین اس زمانے میں جو کاغذ بناتے تھے وہ زیادہ تر شہتوت کی چھال کا بنتا تھا۔ اس درخت کی پتیوں پر ریشم کے کیڑے بھی پالے جاتے ہیں جو ریشم پیدا کرتے ہیں۔ اسی لیے

اس درخت پر ریشم اور کاغذ دونوں کا انحصار تھا چینیوں کی اس ایجاد کی بھنک دنیا کے کسی اور خطّے کو تقریباً سات سو برس تک نہ ہو پائی ۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ کاغذ کی ایجاد کا علم عربوں کو ایک جنگی مڈبھیڑ کے سلسلے میں ہوا ۔ سنہ ۷۵۱ء میں چینیوں نے وسط ایشیا کی نئی اسلامی مملکت کی راجدھانی سمرقند پر فوج کشی کر دی ۔ سمرقند کے عرب گورنر نے اس جھڑپ میں چینیوں کو پسپا کر کے اُن کے بہت سارے فوجی قید کر لیے ۔ اِن قیدیوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو کاغذ سازی کے فن سے واقف تھے ۔ ان لوگوں نے کاغذ سازی کی صنعت کے گُر سے نہ صرف عربوں کو روشناس کیا بلکہ انھیں کاغذ بنانے کی تربیت بھی دی ۔ اس طور پر کاغذ سازی کی صنعت کی شروعات عرب ممالک میں بھی ہو گئی اور دیکھتے دیکھتے اسے کافی فروغ بھی ملا ۔ سب سے پہلے سمرقند ہی میں خراسان کے علاقہ میں کاشت کی جانے والی السی کے ریشوں سے کاغذ بنایا گیا ۔ اسی کاغذ پر عربی قواعد کی مشہور کتاب دیوان الادب سمرقند ہی میں سنہ ۹۷۴ء میں لکھی گئی ۔ جب عربوں نے اپنی فتوحات کے سلسلے میں یورپ کے کئی ممالک زیرِ نگیں کر لیے تو ان کے ساتھ کاغذ بنانے کی صنعت بھی یورپ پہنچی ۔

اگرچہ دنیا کی تاریخ بڑی بڑی جنگوں اور بڑی بڑی فتوحات کے ذکر سے بھری پڑی ہے مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی تاریخ عالم پر وہ انقلاب انگیز اثر نہیں چھوڑا جو ایک معمولی جھڑپ میں مٹھی بھر چینیوں کو قیدی بنا کر لیا گیا ۔

اہلِ چین کاغذ بنانے کے لیے شہتوت کی چھال کو اتنا کوٹتے تھے کہ ان کے ریشے الگ الگ ہو جاتے تھے ۔ یہ ننھے ننھے ریشے پانی میں حل کر کے بڑے بڑے چھلنے میں ڈال دیے جاتے تھے ۔ پانی ٹپک جانے کے بعد فضلہ نمدہ کی شکل اختیار کر لیتا تھا جسے آج ہم لُبدی کہتے ہیں ۔ اس نمدہ کو بیلنوں سے دبا دبا کر بیلنے کے بعد پتلے کاغذ کی شکل دے دی جاتی تھی ۔ اس طریق کار میں اگرچہ ہر صدی میں سدھار ہوتا گیا مگر اصل اصول اپنی جگہ پر قائم رہا ہے ۔ آج بھی کاغذ ایسے ہی ریشوں سے بنی ہوئی لُبدی سے بنایا جاتا ہے ۔ لُبدی نرم لکڑی ہی سے نہیں بلکہ ہر قسم کی گھاس پات سے بنائی جاتی ہے اس ضمن میں نرم لکڑی، کپاس، سن، پوال، الفا فا یا اسپارٹو گھاس یا بھارت کے ترائی علاقہ کی سبائی اور بھابھر گھاس خاص ہیں ۔

نباتاتی ریشوں میں ایک قسم کا مادہ پایا جاتا ہے جسے ہم سلولوز (CELLULOSE) کہتے ہیں ۔ کاغذ بنانے میں اس کی ایک خاص اہمیت ہے ۔ سلولوز پودوں اور پیڑوں کی ہری پتیوں میں سورج کی شعاعوں کی بدولت پیدا ہوتا ہے ۔ دراصل یہ کاربو ہائیڈریٹ (CARBO HYDRATE) ہے جو بے رنگ آکسیجن، ہائیڈروجن اور سیاہ کاربن سے مرکب ہوتا ہے ۔ اگر ہری پتیوں کا وجود نہ ہوتا تو سفید کاغذ کا تختہ بھی وجود میں نہ آتا ۔ سورج کی شعاعیں اور ہری پتیاں نشاستہ تیار کرتی رہتی ہیں ۔ یہ نشاستہ شکر میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر شکر سلولوز میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ یہی تین اشیاء یعنی نشاستہ، شکر اور سلولوز غیر معمولی اہمیت رکھنے والے مادّے ہیں ۔ جس طرح نشاستہ اور شکر ہماری بقا اور جسمانی حرارت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہیں اسی طرح سلولوز کاغذ کی شکل میں سیاہی کی چند بوندوں کی مدد سے ہمارے ذہنی ارتقا کا ایک واحد ذریعہ ہے ۔

جیسا کہ سطور بالا میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ جس طرح کاغذ سازی کی صنعت کا راز چین سے سمرقند عربوں کی نوک خنجر پر لایا گیا اسی طرح تلوار کی دھار پر یورپ تک پہنچا ۔ یورپ میں کاغذ عرب ممالک سے سب سے پہلے یونان لایا گیا جہاں گیارہویں صدی میں ملکہ آئرین (EMPRESS IRENE) کے دورِ حکومت میں کاغذ کے استعمال کا سراغ ملتا ہے ۔ ملک اسپین کا شہر طالیدو (TOLEDO) یورپ کا وہ پہلا مقام ہے جہاں مُور کاریگروں کی مدد سے کاغذ بنانے کا سب سے پہلا کارخانہ کھولا گیا ۔ بعدہٗ وہاں کے دوسرے شہروں میں بھی کارخانے کھولے گئے ۔ فرانس میں سنہ ۱۱۸۹ء میں ایک کارخانہ کھولا گیا جس کے لیے وہ اسپین ہی کا مرہونِ منت تھا ۔ عربوں کا تسلط

جب جزیرہ سسلی پر ہو گیا تو وہاں بھی شہر فابریانو (FABRIANO)
اس صنعت کا مرکز بنا۔ وہاں کے ڈیوک ریمنڈ کا تحریر کردہ ایک
خط آج بھی انگلستان کے پبلک ریکارڈ آفس میں محفوظ ہے
جسے موصوف نے انگلستان کے شہنشاہ ہنری سوم کے نام
لکھا تھا۔ بعد میں جزیرہ نما اٹلی کے بڑے بڑے شہر جیسے فلورنس،
روم، میلان، وینس وغیرہ کاغذ سازی کے مرکز بن گئے۔ ان
کارخانوں میں تیار شدہ کاغذ سے جنوبی جرمنی کی کاغذ کی مانگ
چودھویں صدی تک پوری کی جاتی رہی۔ بالآخر جرمنی میں بھی
اطالوی کاریگروں کی مدد سے کارخانے قائم کیے گئے۔ سب سے
پہلے ۱۳۲۰ء میں شہر مینز (MAINZE) میں اور ۱۳۳۶ء
میں شہر نورمبرگ میں کارخانے کھولے گئے۔ انگلستان میں پہلا
کارخانہ سولہویں صدی کے اوائل میں مسٹر جان ٹیٹ نے
ہارٹ فورڈ (HART FORD) میں کھولا اور ملکہ الزبتھ کے
جوہری مسمی سر جان اسپل مین (SIR JOHN SPILMAN) نے
ایک کارخانہ ڈارٹ فورڈ (DART FORD) میں کھولا لیکن اٹھارہویں
صدی میں ہی انگلستان میں کاغذ ایک معتد بہ مقدار میں اور فنی
خصوصیات لیے ہوئے تیار کیا گیا۔ امریکہ میں تو پہلے یورپ ہی
سے کاغذ درآمد کیا جاتا تھا۔ مگر وہاں پہلی پیپر مل کا افتتاح جرمن
ٹاؤن (GERMAN TOWN) میں ۱۶۹۰ء میں ہوا۔
اس کے بعد وہاں ہر سال کارخانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔
۱۸۱۰ء تک تقریباً دو سو کارخانے چالو ہو گئے۔ جن میں ملین
لاکھ ڈالر کے کاغذ تیار ہونے لگے۔ فرانس کی
(ESSONNE PAPER MILL) کے ایک کلرک مسمی لوئس
رابرٹ (LOUIS ROBERT) نے ۱۷۹۸ء میں کاغذ
بنانے کی مشین ایجاد کر لی۔ اس ایجاد کی وجہ سے کاغذ سازی کی
صنعت کو چار چاند لگ گئے۔

ابتدا میں یورپ کے جن جن ملکوں میں کاغذ تیار کیا جاتا
تھا اس کے لیے چیتھڑے استعمال کیے جاتے تھے۔ اب بھی اس کا
استعمال جاری ہے مگر اب اس صنعت کے لیے خام مال میں
مخروطی جنگلات کی نرم لکڑی کو خصوصی درجہ حاصل ہے۔

جنگلات کی لکڑی سے کاغذ بنانے کا فن کاغذ کی ایجاد سے
ہزاروں سال قبل کیڑے مکوڑوں نے معلوم کر لیا تھا۔ شہد کی
مکھیاں اور بھڑیں اپنے اپنے چھتے درختوں کی سڑی ہوئی بے جان
لکڑی سے بناتی ہیں۔ بھڑ کا چھتہ دراصل لکڑی کا کاغذ ہی ہے۔
اسی چھتہ نے ہی لکڑی کی لُبدی سے کاغذ بنانے کا راز بتایا۔
جب حضرت سلیمانؑ نے آرام طلب اور کاہل انسانوں کو نصیحت
کی کہ وہ چیونٹیوں کے پاس جائیں اور اُن سے جفاکشی
کا سبق لیں تو غالباً انھوں نے کاغذ بنانے والوں کو بھی یہ مشورہ
دیا ہوگا کہ وہ بھڑوں کے پاس جائیں۔ لیکن کسی کو بھی بھڑوں سے
سبق لینے کی توفیق نہ ہوئی۔ یہ تو ۱۷۶۵ء کی بات ہے کہ
ایک پادری مسمی شیفر نے بھڑوں کے چھتوں اور لکڑی کے برادہ
سے اچھے قسم کا کاغذ بنانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس
تجربہ کو ایک ڈچ مسمی کوپس (KOOPS.) اور سیکسنی کے
مسمی کیلر (KELLER) نے آزما کر ۱۸۴۴ء میں لکڑی کی
لُبدی سے کافی مقدار میں کاغذ بنایا۔ پھر تو لُبدی سے کاغذ
تیار کیا جانے لگا۔ چنانچہ ۱۸۷۳ء میں بارہ ہزار ٹن لکڑی کاغذ
بنانے میں استعمال کی گئی۔ ۱۹۰۰ء میں اس کی مقدار بڑھ کر
دس لاکھ ٹن ہو گئی۔ بر وقت ساری دنیا میں مخروطی جنگلات کی
لگ بھگ پانچ کروڑ ٹن سے بھی زائد لکڑی ہر سال استعمال
کی جاتی ہے جس سے دو کروڑ ٹن لُبدی حاصل ہوتی ہے جس سے
طرح طرح کے کاغذ تیار کیے جاتے ہیں۔

مخروطی جنگلات کے ہزاروں میل لمبے اور سیکڑوں میل
چوڑے قطعے شمالی یورپ، سائبیریا اور شمالی کینیڈا میں پھیلے
ہوئے ہیں۔ چیڑ اور صنوبر کے درخت کاٹ کر ندیوں کے بہاؤ کے
ذریعہ اُن جگہوں پر لائے جاتے ہیں جہاں آبشار پائے جاتے ہیں۔
آبشاروں کے قریب لُبدی بنانے کے کارخانے قائم کیے
گئے ہیں جو انھیں آبشاروں سے حاصل کردہ آبی بجلی کی مدد سے
چلائے جاتے ہیں۔ ان کارخانوں میں بڑی بڑی مشینیں لکڑی

کے کندوں کو پیس کر برادہ کی شکل میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ پھر اس برادہ سے کاغذ بنانے کی لُبدی تیار کر لی جاتی ہے۔ اُن کارخانوں سے لُبدی دنیا کے صنعتی علاقوں میں کاغذ بنانے کے لیے بھیج دی جاتی ہے۔ کاغذ بنانے والے کارخانوں میں لُبدی پانی سے بھرے ہوئے بڑے بڑے حوض میں ڈال دی جاتی ہے اور مختلف کیمیاوی اجزا کی آمیزش سے خوب متھی جاتی ہے۔ جب لُبدی اچھی طرح صاف ہو کر دودھ کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو اُسے آہنی چادروں پر بہایا جاتا ہے جو کئی ایک بھاری بھرکم بیلنوں کے نیچے سے گذر کر بالآخر کاغذ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ تیار شدہ کاغذ ایک دوسرے بیلن پر لپیٹا جاتا ہے۔ اس بیلن پر لپٹنے والے کاغذ کی لمبائی جب ایک میل کے قریب ہو جاتی ہے تو اُسے ہٹا کر ضرورت اور مانگ کے مطابق مختلف سائزوں میں کاٹ کر پیک کر لیا جاتا ہے۔ کارخانوں سے کاغذ کے بنڈل نکل کر مارکیٹ میں آجاتے ہیں جہاں سے چھاپے خانے اور عوام الناس کاغذ حاصل کر کے اپنی ضرورتیں پوری کرتے رہتے ہیں یہ کاغذ مختلف قسم کے ہوتے ہیں جیسے اخباری کاغذ، کتابوں اور میگزین کے لیے کاغذ، کھردرے اور چکنے کاغذ، آرٹ پیپر، فلٹر پیپر، سگریٹ پیپر، ٹیشو پیپر، بلاٹنگ پیپر، مومی کاغذ، پیکنگ کا غذ وغیرہ وغیرہ۔ اب تو پلاسٹک کے کاغذ بننے لگے ہیں، کاغذ کے علاوہ پلاسٹک کی بنی ہوئی اشیاء کے بڑھتے ہوئے رواج کے پیشِ نظر گمان غالب ہے کہ اگلی صدی پلاسٹک کی صدی کہلائے گی۔

دنیا بھر کی کاغذ کی مانگ پورا کرنے کے لیے مخروطی جنگلات کے ایک ارب ایکڑ رقبہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان سے تیار کیے جانے والے کاغذ کی مقدار کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ ایک ٹن لُبدی سے تیار ہونے والا کاغذ اگر پھیلایا جائے تو تین ایکڑ زمین کو ڈھک لے گا۔ ۱۸۰ ٹن لُبدی سے تیار کیا گیا کاغذ ایک مربع میل کے رقبہ پر پھیلایا جا سکتا ہے۔ بروقت تیار کی جانے والی دو کروڑ ٹن لُبدی سے بنا ہوا کاغذ ایک لاکھ مربع میل کے قطعہ کو ڈھکنے کے لیے کافی ہے۔ اسے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک سال میں تیار ہونے والے کاغذ کی نصف مقدار سے دنیا کے چاروں طرف کاغذ کی ایک میل چوڑی سڑک بنائی جا سکتی ہے۔ اگر ہم سال بھر میں تیار ہونے والے سارے کاغذ کی ایک انچ چوڑی پٹیاں کاٹ کر ایک دوسرے سے جوڑ دیں تو یہ پٹی زمین سے سورج تک کا فاصلہ تین بار طے کر لے گی۔

کسی ملک یا کسی قوم کے ذہنی ارتقا کا اندازہ وہاں استعمال ہونے والے کاغذ کی مقدار سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ اگر نشاستہ کی کمی سے ہماری جسمانی صحت بگڑ سکتی ہے تو کاغذ کی قلت ہمارے ذہنی افلاس کا سبب بن سکتی ہے۔

★

نصر قریشی

نیا دور

وادیٔ ظلمت میں ہر سو روشنی ہی روشنی ہے
شادمانی سے عبادت آج اپنی زندگی ہے
بزم خوابیدہ میں بیداری کی دلکش چاندنی ہے
آج ہر پیر و جواں میں حوصلوں کی تازگی ہے
رات کی تاریکیوں سے صبح کا سورج اگا ہے
نغمۂ جمہور سے ارض و سما گونجا ہوا ہے

میٹھے میٹھے خوابوں کے کچھ پھول کھلتے جا رہے ہیں
تیرہ ذہنوں کے لیے روشن زمانے آ رہے ہیں
نفرت و بغض و عداوت خود سے ہی شرما رہے ہیں
بیکس و بے بس بھی آزادی کے نغمے گا رہے ہیں
وقت خوشبو کے خزانے آج لے کر آ گیا ہے
اپنی منزل کے قریں اب زندگی کا قافلہ ہے

شعبۂ ہستی میں نظم و ضبط کا اک سلسلہ ہے
آج وہ بے سمتی کا ماحول رخصت ہو رہا ہے
آسماں چھوتی گرانی کا کہاں کوئی پتا ہے
زندگی کے شہر میں اب زندگی جلوہ نما ہے
موسم گل نکہتوں کا کارواں لے کر بڑھا ہے
چاند کے نورانی رتھ میں وقت چلتا جا رہا ہے

مفسدانہ ذہنیت کا زور کچھ چلتا نہیں ہے
حادثوں کی آگ سے اب گھر کوئی جلتا نہیں ہے
ذہن میں تخریب کا جذبہ کوئی پلتا نہیں ہے
شعبدہ بازوں کا نغمہ ساز میں ڈھلتا نہیں ہے
ظلم و استبداد کے ہر دور کا اب خاتمہ ہے
آج گھر، آنگن سلامت، پرسکوں ساری فضا ہے

بے اماں کے واسطے اک سایۂ ابر رواں ہے
بیکس و بے بس کا حامی، بے زبانوں کی زباں ہے
اعلیٰ قدروں کا محافظ، زندگی کا پاسباں ہے
جذبۂ تعمیر لے کر ساتھ میر کارواں ہے
اک صدا میں آج شامل دیکھیے ساری صدا ہے
حال کے آگے ہی مستقبل کا روشن راستہ ہے

ایس۔ ایم عباس رضوی

اختر شیرانی

رومان اور زندگی کا سنگم

اختر شیرانی کے بارے میں نسیم قریشی اپنی کتاب اشہاد ادب کی تاریخ میں یوں رقم طراز ہیں " دد۔ جدید کی رومانی شاعری میں اختر شیرانی کے دل آویز نغمے موج لطافت بن کر اُبھرے اور کیف و سرشاری کی فضا پیدا کر گئے۔ جواناں مرگ اختر نے خیال کی ایک جنت آباد کی تھی جہاں دوشیزگی کا نکھار جادو جگاتا تھا اور مست و سرشار محبت کے رنگین و کیف بار نغمے الاپتا تھا۔ شیرانی کا فن دل کی موج سے اُبھرتا ہے اور سرشاری کی سپردگی پر اس کی تان ٹوٹتی ہے "۔ انھوں نے آگے لکھا ہے۔

—— " شیرانی نے جس موضوع کو بھی لیا ہے حسین تخیل اور لطیف غنائی پیکر میں منتقل کر دیا ہے "

یہ صحیح ہے کہ اختر شروع سے ہی وارفتہ مزاج تھے۔ بچپن سے ہی ان کی طبیعت میں شوخی و رنگینی تھی۔ انھیں قدرت کے حسین و رنگین مناظر سے گہرا لگاؤ تھا۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ اختر جذباتی شاعر ہیں۔ ان کے یہاں عشق و محبت کے جذبات کی سرشاری ہے۔ کیف و ترنم انھیں ہمیشہ بھاتا رہا ہے۔ درد و اثر، سوز و گداز، مستی و سرشاری ہمیشہ اختر کے نزدیک ہیں لیکن اس کے باوجود بھی غم ہائے زمانہ کے لیے اختر نے اپنی آنکھیں کبھی بند نہیں کیں۔ انھیں ہمیشہ یہ احساس رہا ہے کہ کیف و سرور، مستی و سرشاری عارضی ہے۔ "صحن گلشن میں" ہر سمت جلوے ہی جلوے" تو ہیں لیکن انھیں دیکھنے کی فرصت" بہت کم ہے۔ بہار کے بعد خزاں کا بھی آنا لازمی ہے۔ خوشیوں کی اہمیت تو ضرور ہے لیکن غم کی اہمیت اس سے کہیں بلند تر ہے غنچوں کی شادابی کلیوں کے ناز و ادا اور پھولوں کی مسکراہٹ کو خزاں خبردار کر رہی ہے —

گلزار جہاں میں گل کی طرح، گو شاد ہیں ہم شاداب ہیں ہم
کہتی ہے یہ ہنس کر صبح خزاں سب ناز عبث اک خواب ہیں ہم

شاعر کے نازک اور معصوم دل کو غم ہائے روزگار پریشان کرتے ہیں۔ وہ حالات کی کشاکش سے تنگ ہے۔ مکر و دغا کی یہ دنیا، ظلم کی یہ بستی، جبر و استبداد، مصائب و آلام کے بوجھ تلے دبا ہوا یہ سماج۔ شاعر دیکھتا ہے اور اس کا شگفتہ چہرہ غمگین ہو جاتا ہے۔ پھر بھی ماحول کے بیجا ہنگاموں سے گھبرا کر وہ "میں بہت دور بہت دور چلا جاؤں گا" کا نعرہ نہیں لگاتا بلکہ وہ آپس میں دست و گریباں دنیا سے ایک ایسی بستی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو محبت کی دنیا ہے، جو امن و سکون کی سرزمین ہے جہاں اخلاق و محبت کی فضا ہے۔ جہاں اخوت و ہمدردی کے چشمے رواں ہیں، جہاں کوئی ہنگامہ نہیں، جہاں کوئی مکر و فریب نہیں، جہاں تعصب و نفرت نہیں:

ہنگامۂ عالم سے دور، آفت گہہ ہستی سے دور
اس مکر کی دنیا سے دور، اس ظلم کی بستی سے دور
اس رات اس دن سے الگ، اس اوج اس پستی سے دور

دور از زمین و آسماں
اک سرزمین عشق ہے

اختر کو خود نمائی "نفس پرستی" اور "نفس پرست" سماج سے سخت نفرت ہے۔ وہ معاشرہ کو ایک اعلیٰ تہذیب یافتہ معاشرہ دیکھنا چاہتا ہے۔ امیری غریبی، اونچ و نیچ، رنگ و نسل، مذہب و فرقہ کے امتیازات اختر کو پسند نہیں۔ وہ ان باتوں کو انسانیت کی شرافت

جیین کا بہت بڑا کلنک سمجھتا ہے۔ انسان کے لیے اخلاقی جرم ہی نہیں بلکہ پاپ بھی سمجھتا ہے۔ وہ سماج سے گوناگوں حیاسوز برائیوں کو دور کرکے انسان کی اعلیٰ تعمیروں کو استوار کرنا چاہتا ہے۔ وہ معاشرہ میں ان انسانی رابطوں کو مستحکم بنانا چاہتا ہے جس پر چل کر یہ معاشرہ انسانی معاشرہ بن سکے۔ جب شاعر انسانی قدروں کی پامالی دیکھتا ہے، جب اسے یہ معاشرہ پراگندہ حال دکھائی پڑتا ہے تو وہ بیحد مایوس ہو جاتا ہے اس کا دل اس "نفرت گہہ عالم" "لعنت گہہ ہستی" سے کہیں دور چلے جانے کو چاہتا ہے، کہاں؟ شاعر ایسی جگہ جانے کا خواہش مند ہے جہاں نفرت و تعصب کی لعنت نہ ہو، جہاں بغض و حسد کا طوفان نہ ہو، جہاں نیچ و اونچ کا بھید بھاؤ نہ ہو ؎

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہہ عالم سے، لعنت گہہ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے، اس نفس پرستی سے
دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اختر کا دل جذبات سے معمور ہے۔ اس کا ہاتھ خاموشی سے سماج کی نبض پر رہتا ہے۔ وہ سماج کے دل کی دھڑکنوں کو سنتا ہے اس کے کرب و اضطراب کو محسوس کرتا ہے۔ شاعر اپنے اوپر غیر کا تسلط دوسرے کی حکومت نہیں پسند کرتا۔ وہ خود بھی آزادی پسند ہے اور اپنی قوم و ملک کو بھی دوسرے کے تسلط سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ جب غیر کی حکومت، دوسرے کا ظلم و جور اور مظلوموں پر ظالموں کی کھلی ہوئی دست درازیاں دیکھتا ہے تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ چیخ چیخ کر خواب غفلت میں مدہوش سماج کو جھنجھوڑ ڈالنا چاہتا ہے لیکن اس کی غیرت مندانہ چیخ حلق سے باہر نہیں نکلتی بلکہ آہ بن کر اس کے ہونٹوں تک آجاتی ہے۔ اس کے دل میں اٹھا ہوا درد قطرات بن کر اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے ؎

ہم میں کچھ جرأتِ گویائی بھی ہوگی کہ نہیں؟
ہمت ناصیہ فرسائی بھی ہوگی کہ نہیں؟
شرم سے دور شکیبائی بھی ہوگی کہ نہیں؟
یوسفِ دل سے زلیخائی بھی ہوگی کہ نہیں؟
آج کی رات، اُف! او میرے خدا آج کی رات!

ڈاکٹر اختر اورینوی کے لفظوں میں:

"آج کی رات، اُف! او میرے خدا آج کی رات! میں جذبات کا سیلاب بند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کی شدت سے تھک کر شاعر آخری یادرِ اظہار جذبات کرکے دل تھام کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ ایک اعلیٰ جذباتی نظم کا نہایت ہی فطری اختتام ہے"[1]

یہ بجا ہے کہ اختر کی شاعری عشقیہ بہاریہ اور منظریہ ہے لیکن یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ وہ حسن و عشق، شراب و شباب کی سرمستی و سرشاری میں بھی دنیا مافیہا کو فراموش نہیں کر دیتا ہے۔ گو اختر خیالات کی جنت بساتا ہے جس میں ہر سمت رنگ ہی رنگ، نور ہی نور ہے۔ اس کی اس جنت میں اس کی نجمہ و ریحانہ رقص کرتی ہیں، مے ناب لٹاتی ہیں، کیف و مستی کے نغمے چھیڑتی ہیں لیکن شاعر اپنی اس جنت میں گم نہیں ہو جاتا۔ اس کے دل میں جمہور کا درد ہے۔ اسے اپنی قوم اپنے وطن کے غم و الم کا احساس ہے۔ وہ غربت و خستہ حالی، مفلسی اور کسان کو دیکھتا اور اس کا جذبہ آزادی اور حریت پسندی کروٹ بدلنے لگتا ہے۔ وہ بیدار ہو کر ایک انگڑائی لیتا ہے اور اس کی غیرت و خودداری کو ٹھیس لگ جاتی ہے۔ وہ جام و سبو کی بزم سے اٹھ کر شجاعت و بہادری، حمیت و غیرت، ہمت و استقلال کا نقیب بن جاتا ہے۔ ایک نئے عزم ایک نئی زندگی کی بات کرتا ہے ؎

سن وقت کی آواز آتی ہے وہ دورِ غفلت ختم ہوا
ساغر کو الٹ، بربط کو اٹھا ہنگامۂ عشرت ختم ہوا
جانبازی کی نوبت آ پہونچی رویائے محبت ختم ہوا

شاعر اپنے ساقی کو بھی للکارتا ہے اور اسے بھی تلوار اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے ؎

ہیں جام و سبو بے کار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

---

[1] اختر شیرانی کی شاعری۔ اشرف صدیقی۔ شاعر ص۱۵ جولائی ۱۹۶۵ء

شمالہ ندیم بدایونی

برس رہی ہے روشنی

بڑا سکون و امن ہے آج کل فضاؤں میں
بڑا سرور و کیف ہے سانولی گھٹاؤں میں
خطر کی پاسبانیاں، نہ دھوپ میں نہ چھاؤں میں
اماں ہر ایک شہر میں، خوشی ہر ایک گاؤں میں
تمام نغمے آ گئے ہیں اپنی آب و تاب پر
یہ کس کی انگلیاں ہیں آج سازِ انقلاب پر

تمام ہاتھ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے
تمام پاؤں محنتوں کی ریت میں اٹے ہوئے
تمام جسم کاوشوں کی دھول میں اٹے ہوئے
تمام لوگ ملک کی فلاح میں ڈٹے ہوئے
بدل گیا ہے آج کل ہر ایک فرد کا مزاج
مرے وطن میں لے رہا ہے جنم اک نیا سماج

دیے خوشی کے جل رہے ہیں آج ہر مکان میں
ملاوٹوں کا نام اب کہاں کسی دکان میں
برس رہی ہے روشنی ہر ایک سائبان میں
ہزار چاند لگ گئے وطن کی آن بان میں
ابھر رہا ہے آفتاب ہاتھ میں کرن لیے
مہک رہا ہے گلستاں جبیں پہ یاسمن لیے

شکایتوں کے تذکرے اٹھے ہر اک زبان سے
ہر ایک زندگی گزر رہی ہے آج شان سے
ہر ایک ذہن دور ہے فکر کی تکان سے
ہر ایک شخص چین سے، ہر ایک مرد امان سے
ہر ایک کھیت میں نشاط و تازگی کی دھوپ ہے
ہر ایک صحن میں نئی خوشی کا رنگ و روپ ہے

جوہر ہاشمی

غزل

دیکھنے میں وہ جو دیوانہ سا تھا
وضع میں سب سے جداگانہ سا تھا
مے سے تھا لبریز یا زہر آب سے
دستِ ساقی میں تو پیمانہ سا تھا
ہر طرف تھا اس کا ہی عکسِ جمیل
یہ جہاں ایک آئنہ خانہ سا تھا
ذکر اب عہدِ گزشتہ کا نہ کر
خواب ہو کر بھی وہ افسانہ سا تھا
فصلِ گل سے پہلے یہ گلزار بھی
سچ تو یہ ہے ایک ویرانہ سا تھا
سازشوں میں تھے ملوث دوست بھی
گو بظاہر مجھ سے یارانہ سا تھا
وہ شباب کیف سامانِ حیات
چلتا پھرتا ایک مے خانہ سا تھا
ہر ادا اس کی ادائے دل نواز
ہر عمل اس کا شریفانہ سا تھا
کفر توڑا وضع داری نے مری
کل مزاجِ یار شاہانہ سا تھا
کھا گیا دھوکا جہانِ سطح بیں
مسلکِ جوہر فقیرانہ سا تھا

شکور ارمان سنبھلی (افسانہ)

عورت

میں نے اس کو پہلی بار مندر کے دروازہ پر دیکھا تھا جب وہ اپنی چند سہیلیوں اور خاندان کی دوسری عورتوں کے ساتھ پوجا کرنے کے بعد مندر سے نکل رہی تھی، اس وقت وہ مجھے بہت حسین لگی تھی۔ بڑی بڑی پلکوں کی اوٹ میں جھکی جھکی نگاہیں، سر پر باریک اور حسین آنچل، سرخ رخساروں پر حیا کی سرخی، دل کش چال، دیویوں کی طرح پرنور چہرہ! وہ جا رہی تھی اور میں بھی کچھ فاصلے پر اس کے ساتھ چل رہا تھا وہ کبھی کبھی کنکھیوں سے مجھے دیکھ لیتی تھی اور جب اسے یہ محسوس ہوتا کہ میں بھی اسے دیکھ رہا ہوں تو شرم و حجاب سے اس کی نگاہیں جھک جاتیں اور پسینے کے قطرے اس کی خوبصورت پیشانی پر موتی کی طرح چمکنے لگتے۔ چہرے اور گردن پر حیا کی سرخی دوڑ جاتی — وہ چلتی رہی — میں بھی چلتا رہا — میرا دل دھڑکتا رہا اور وہ شرماتی رہی — جھجکتی رہی۔ زمین پر نظریں مرکوز کیے ہوے چلتی رہی اور — اور پھر ایک موڑ پر جا کر غائب ہو گئی۔ مجھے دن گذرتے گئے۔ مہینے اور سال گذر گئے۔ لیکن وہ نہ ملی۔ میں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا۔ مگر وہ پھر کبھی نہ ملی — زمانہ آگے بڑھتا رہا، یادیں پیچھے کھسکتی رہیں اور پھر ایک دن یادیں بھی ایک موڑ پر جا کر غائب ہو گئیں اور میں اسے بھول گیا۔

یوں ہی زمانہ گذر گیا اور میں اسے بھولا ہی رہا — لیکن! لیکن ایک دن پھر وہ مجھے ایک ڈانس کلب میں مل گئی۔ یہ میری اس سے دوسری ملاقات تھی — وہ نیم عریاں لباس پہنے ڈانس کر رہی تھی۔ ڈانس کرنے کے بعد وہ میرے پاس آ گئی۔ سیکڑوں دل فریب مسکراہٹیں اس کے سرخ لبوں پر رقص کر رہی تھیں۔ تمام جسم عریاں لباس میں سے جھلک رہا تھا ہر عضو گناہ کی دعوت دے رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ اس نے اپنی لانبی لانبی ناگن جیسی زلفوں کو قاتلانہ انداز سے جھٹکا اور میرے گلے میں اپنی باہیں حمائل کر دیں۔ اس کے منھ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا اور گھبراہٹ سے میرا تمام جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ میں نے خود کو اس سے چھڑانے کی سعی کی۔

"تم بھی کتنے بھولے ہو۔ مجھ سے دور بھاگتے ہو؟ اب تو میں تمھارے ہی جیسے لوگوں کے لیے ہوں پھر بھی مجھ سے دور بھاگ رہے ہو؟ پہلی بار جب تم نے مجھے دیکھا تھا تو میں کچھ اور ہی تھی تب تو میں ایک عورت، شرم و حیا کی ایک دیوی تھی۔ اور اب — اب تو میں ایک نمائش ہوں، مجسم نمائش! تم یہی تو چاہتے تھے نا۔ پھر کیوں مجھ سے دور بھاگ رہے ہو؟ آؤ — میرے گلے لگ جاؤ اور اپنی پیاس بجھاؤ — آؤ نا۔" کہتے ہوے وہ ایک بار پھر میرے گلے میں جھول گئی اور میں گرتے گرتے سنبھل گیا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو جھٹکا دے کر اسے علاحدہ کر دیا — وہ مسکرانے لگی اور میرے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئی میں نے اس کو بغور دیکھا اس کے اندر کی عورت مجھ پر قہقہے مار کر ہنس رہی تھی۔ میں سہم کر رہ گیا وہ میرے اور قریب آ گئی۔ پھر اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوے کہا — "دیکھو! وہ تین آدمی جو ایک میز پر بیٹھے ہوے ہیں جانتے ہو وہ کون ہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"ان میں سے ایک میرا باپ ہے — دوسرا میرا بھائی اور تیسرا — تیسرا میرا شوہر ہے!" پھر وہ مسکرانے لگی اور ایک دم اٹھ کر کاؤنٹر پر چلی گئی۔ اس نے ایک جام اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور لڑکھڑاتی ہوئی نیلے رنگ کے پردہ کے پیچھے ڈالے

کمرہ میں داخل ہو گئی جہاں کوئی پہلے سے ہی اس کا انتظار کر رہا تھا — میں گم صم سا بیٹھا رہا — نہ جانے کب تک اس کے بارے میں سوچتا رہا اس کے باپ اور بھائی کے بارے میں سوچتا رہا — شوہر کے بارے میں سوچتا رہا — ...

پھر ایک دم کسی نے میرے دماغ پر ہتھوڑے کی کاری ضرب لگائی — !

"یہ عورت نہیں ہے یہ وہ تہذیب ہے جو سر عام عریاں رقص کر رہی ہے — یہ عورت نہیں ہے یہ حیا ہے جو خود کو بھرے بازار میں نیلام کر رہی ہے —"

اور پھر — میں وہاں سے بھاگ نکلا — بھاگتا رہا نہ معلوم کب تک بھاگتا رہا — بھاگتا چلا گیا دور —— بہت دور تک —— !

لیکن —— !

لیکن ایک دن وہ پھر مجھے مل گئی — اس روز مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ اُس کے بارے میں پیدا ہونے والے سارے شکوک اسے ایک نظر دیکھتے ہی دور ہو گئے —

میں نہ معلوم کن خیالات میں غرق چلا جا رہا تھا کہ اچانک مجھے دبی دبی سسکیوں کی آوازیں سنائی دیں میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ سڑک سے کچھ فاصلے پر وہ ایک شمشان میں بیٹھی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں گڑھے پڑ چکے تھے وہ راکھ کے ایک ڈھیر کو کرید رہی تھی۔

میں اُس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ میری آہٹ پر وہ چونک پڑی۔

"تم ؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں ! لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو ؟" میں نے سوال کیا۔

وہ مسکرانے لگی — مجھے اس کی مسکراہٹ بڑی پھیکی لگی۔

"میں اس راکھ کے ڈھیر میں خود کو تلاش کر رہی ہوں۔"

"خود کو ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"لیکن یہ تو راکھ کا ایک ڈھیر ہے ؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"ہاں ! یہ سماج کے گھناؤنے ماحول کی چتا کی راکھ ہے۔ اس کے نیچے میرے اندر کی عورت چھپی ہوئی ہے — تہذیب و تمدن چھپے ہوئے ہیں۔ میں اس میں اپنے مستقبل کو تلاش کر رہی ہوں —"

میں خاموش اس کی باتیں سنتا رہا اُس نے پھر کہا —

"میں نے دنیا دیکھی ہے اور اب مجھے اس دنیا اور اس سماج سے نفرت ہو گئی ہے دنیا اور سماج سے ہی کیا خود سے بھی نفرت ہو چکی ہے —"

"لیکن کیوں ؟" میں نے سوال کیا۔

اُس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی اس نے زہر آلود نگاہوں سے مجھے دیکھا میں کانپ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"یہ سوال تم نے اگر خود سے کیا ہوتا تو کتنا اچھا تھا — تمھیں خود ہی جواب مل جاتا !"

اس نے کہا اور میں گہرے خیال میں ڈوب گیا۔

"اس کے ذمہ دار تم خود ہو — میں تو ایک عورت ہوں۔ مجبور اور لاچار —" اس نے کہا اور اُٹھ کر تیز قدم بڑھاتی ہوئی ایک سمت کو چل دی اور میں گم صم کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا

پھر میں اچانک اس طرح چونکا جیسے خواب سے بیدار ہوا ہوں۔ شام کے سائے دن کے اُجالے کو اپنی آغوش میں سمیٹنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ میں نے بھی آہستہ آہستہ اپنے قدم بڑھائے اور سڑک پر آ گیا — میں چلا جا رہا تھا اور میرے دماغ پر کوئی ہتھوڑے مار رہا تھا۔

"آج کی عورت کے ذمہ دار تم ہو — اس کی نمائش کے ذمہ دار بھی تم مرد ہو — وہ تو ایک کمزور عورت ہے — مجبور اور لاچار — بے سہارا اور بے بس ! ! — تم ... تم ..."

اور میرا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا —

مہدی رضا ماہلی

غزل

مری انا کا نشہ یوں اتارتا کوئی
کہ مجھ سے جیت کے جی بھر کے ہارتا کوئی

وہ ایک چہرہ جواب تک اسیرِ ذات نہ ہو
وہ خدو خال وہ پیکر نکھارتا کوئی

یونہی جو گزری تو آخر بکھل ہی جائیں گے
ہماری سمت لگے نے نہارتا کوئی

اٹھے تو تیر گئے نیلگوں فضاؤں میں
زمیں پہ رہ گیا بازو پسارتا کوئی

غضب کی بھیڑ میں اک اجنبی اکیلا ہے
عقب سے بڑھ کے اسے بھی پکارتا کوئی

خود اپنے وزن سے اب ٹوٹنے ہی والا ہوں
حسیں وجود پہ بوجھا سہارتا کوئی

نکہت خاں

غزل

جو مجھے بدل رہے تھے مرے ساتھ ساتھ چل کے
وہی خود بدل گئے ہیں مری زندگی بدل کے

جہاں ضبطِ غم کی حد سے غمِ زندگی بڑھے ہیں
مری آنکھ میں کچھ آنسو وہیں رہ گئے مچل کے

یہ جنونِ دل کی راہیں بڑی پرخطر ہیں واعظ
یہاں وہ بھی لٹ گئے ہیں جو چلے سنبھل سنبھل کے

مجھے کیا جو رشکِ جنت بنے تمہارے گھر کا آنگن
مجھے عمر کاٹنی ہے انھیں پتھروں پہ چل کے

مری شاعری سے پہلے مجھے کون جانتا تھا
کیا تیرے غم نے رسوا مری شاعری میں ڈھل کے

مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ میں جن کی ہمسفر ہوں
مرا ساتھ چھوڑ دیں گے مرے راستے بدل کے

ابھی چند روز پہلے وہ مجھے ملے تھے نکہت
وہی بیقرار آنکھیں وہی بانکپن غزل کے

غلام محمد نظام الدین مغربی

آج کا ترکی سماج

ترک ایک نفاست پسند قوم ہے۔ ان لوگوں کے رہن سہن رسم و رواج اور لباس سے ان کا جمالیاتی ذوق جھلکتا نظر آتا ہے۔ دلی اور لکھنؤ کے شاہی آداب سے زیادہ سخت آداب آج کے جمہوری ترکی میں نظر آئیں گے۔ کسی ترک کے مکان پر جائیے تو صاحب خانہ دروازے پر "خوش گلد نسز" (خوش آمدید) اور "مرحبا" کے الفاظ کے ساتھ استقبال کرتا ہے۔ اور آنے والے کو جواب میں "خوش بلدک" (حقیقت میں ہم نے آپ کو خوش پایا) کہنا ہوتا ہے۔ صاحب خانہ اگر مہمان سے زیادہ معمر ہوگا تو وہ آگے بڑھ کر مہمان کے دونوں گالوں کا بوسہ دے گا اور اگر چھوٹا ہوا تو اپنے گال اُس کی طرف بڑھا دے گا۔ پھر اس کے بعد اس وقت کے سلام کی باری آئے گی یعنی گنئ دن (صبح کا سلام) "ای اکشام لر" (شام کا سلام) وغیرہ۔

مکان کے بیرونی دروازے پر ہی سلیپروں کی ایک قطار رہتی ہے۔ مہمان کو اپنے جوتے اتار کر سلیپر پہننی ہوتی ہے اس کے بعد وہ گھر میں داخل ہوتا ہے۔ جب میزبان مہمان کو گھر کے اندر ملاقات کے کمرے میں لائے گا تو وہاں عورتیں استقبال کے لیے موجود ہوں گی جو "مرحبا" کے الفاظ اور مصافحہ کے ساتھ استقبال کریں گی۔ آنے والوں میں کوئی خاتون ہوئی تو اُس کا بوسہ لیں گی۔ اس کے بعد خیریت کی دریافت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ نصل سنز (آپ کیسے ہیں) ای می سنز (کیا آپ اچھے ہیں) چوجک لری نسر نصل (آپ کے بچے کیسے ہیں) وغیرہ۔ کئی منٹ تک رشتہ داروں اور دوستوں کی خیریت دریافت کرنے کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ مہمان پر عطر چھڑکنے کے بعد چائے یا قہوہ کا دور چل پڑتا ہے

کم تعلیم یافتہ دیہاتی یا شہر کی مذہب پسند خواتین اپنے شوہر کے مرد دوستوں کے سامنے نہیں آتیں حالانکہ وہ سڑکوں پر برقعہ پوش یا بلا برقعہ خوب گھومتی ہیں۔ استنبول جیسے یورپ زدہ شہر میں برقعہ پوش خواتین کی کمی نہیں۔ علی گڑھ ٹائپ برقعہ ترکی میں بے حد مقبول ہے۔ البتہ چہرے پر نقاب ڈالنے کا رواج نہیں۔ سرد علاقوں میں باہر نکلتے وقت خواتین کمبل اوڑھ کر نکلتی ہیں۔ مولانا رومؒ کے شہر قونیہ میں کمبل اوڑھے ہوئے خواتین ایک آنکھ کے سوا باقی چہرہ چھپا کر سڑکوں سے گزرتی ہیں۔ دیہاتی عورتیں ڈھیلی ڈھالی شلوار اور کرتہ اس طرح پہنتی ہیں جس طرح مرد قمیص اور پتلون پہنتے ہیں۔ ہندستانی عورتوں کی طرح دوپٹہ اور اوڑھنی کا رواج نہیں بلکہ بے حد بدنما طریقہ پر ایک لانبہ کپڑا سینے پر لپیٹ لیا جاتا ہے۔

تعلیم یافتہ اور فیشن زدہ خواتین اب منی اسکرٹ شرٹ یا بیل باٹم پینٹ استعمال کرتی ہیں۔ کالج کی طالبات اپنے بھائیوں کے پتلون پہن کر باہر نکلنے میں عار نہیں محسوس کرتیں۔ مذہب پسند خواتین شہر کے ماحول سے متاثر ہو کر اسکرٹ پہن لیتی ہیں لیکن لانبا کوٹ طویل جراب، دستانے اور سر پر ایک مربع میٹر کا خوشنما رومال باندھ کر مکمل ستر پوشی کرتی ہیں۔ مسجدوں اور درگاہوں میں عورتوں کی کثرت ہوتی ہے۔ خاص کر جمعہ عیدین اور شب ہائے متبرک میں عورتوں اور بچوں کا ہجوم رہتا ہے۔ قدیم زمانے سے مساجد میں عورتوں کے لیے علیحدہ گیلریاں بنی ہیں۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے روضہ (استنبول) اور مولانا رومؒ کے روضہ (قونیہ) میں خواتین زائرین کی کثرت ہوتی ہے۔

ترکی میں شادی بیاہ کے طریقے بھی دل چسپ ہیں۔ دیہاتوں میں خاندان کے بزرگوں کے ذریعے یا مشاطاؤں کے ذریعہ شادیاں طے ہوتی ہیں۔ چچا کی لڑکی پر بھتیجے کا حق سمجھا جاتا ہے۔ شہر کی لڑکیاں اپنے

شوہروں کا انتخاب خود کرتی ہیں جس کا قانونی حق ہر ترک لڑکی کو حاصل ہے اور اس حق میں رکاوٹ ڈالنے والے والدین کو سزا ہو جاتی ہے۔ ابتداً ہوٹلوں، پارکوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکیاں لڑکوں سے دوستی پیدا کرتی ہیں۔ جب دونوں کے درمیان عہد و پیمان قائم ہو چکتے ہیں تو خاندان کے بزرگوں کی موجودگی میں منگنی کی رسم انجام پاتی ہے جس کو "نشان" کہا جاتا ہے۔ اس وقت انگوٹھیوں کا تبادلہ عمل میں آتا ہے۔ کسی بھی مرد یا عورت کے ہاتھ میں انگوٹھی نظر آنے کے بعد اس کو اپنی طرف مائل کرنا معیوب خیال کرتے ہیں۔ ایسے لڑکے لڑکیاں جن کی منگنی ہو چکی ہو "نشانلی" کہلاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں اگر کسی لڑکی کے ساتھ کوئی لڑکا دلچسپی کا اظہار کرے تو وہ فوراً چیخ کر کہتی ہے "بن نشانلی ایم" (میں منگنی شدہ ہوں) منگنیاں ٹوٹتی بھی ہیں جو لڑکیوں کے لیے بہر حال معیوب سمجھا جاتا ہے۔

منگنی کے بعد چند ماہ تک لڑکا لڑکی دوستانہ طریقے پر پورے آداب کے ساتھ سیر و تفریح کے ذریعے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے بعد پھر بزرگوں کی موجودگی میں شادی کی تقریب منعقد ہوتی ہے مہر قانونی طور پر ممنوع ہونے کے باوجود بڑی سختی کے ساتھ نقد وصول کیا جاتا ہے طلاق کے لیے کافی قانونی دقتیں پیش آتی ہیں۔ لڑکی خود اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کرنا چاہے تو عدالت اپنی صوابدید اور لڑکی کی حیثیت کے موافق رقم شوہر کو دلواتی ہے اور شوہر طلاق دینا چاہے تو اس کو نصف آمدنی تاحیات دینی پڑتی ہے۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا سخت سزا کا موجب ہے۔ ترک عورتیں بالعموم شوہر کی غیر معمولی خدمت گزار ہوتی ہیں لیکن مرد کسی قدر ترش رو ہوتے ہیں۔

شادی کے دن دولہا میاں خوب صورت یورپین سوٹ زیب تن کیے اپنی بہنوں کے ساتھ دلہن کے گھر جاتے ہیں۔ دلہن سفید یورپین لباس میں ملبوس اپنی بہنوں کے ساتھ دولہا کی موٹر میں سوار ہو جاتی ہے اس موٹر کو خوب صورت رنگین فیتوں سے سجایا جاتا ہے اور سامنے کے حصہ پر ایک گڑیا بٹھا دی جاتی ہے۔ بارات زیادہ سے زیادہ دو تین موٹروں سے زیادہ پر مشتمل نہیں ہوتی اور یہ دلہن کے گھر سے رجسٹرار کے دفتر روانہ ہوتی ہے۔ رجسٹرار لڑکی سے دریافت کرتا ہے کہ تمہارا اس مرد سے نکاح کیا جاتا ہے بخوشی قبول ہے؟ اور اثباتی جواب کے بعد رجسٹر پر دونوں کے دستخط لیتا ہے کچھ گواہوں کے بھی دستخط ہوتے ہیں۔ لفظ نکاح عربی لفظ ہے مگر رجسٹرار خصوصیت کے ساتھ اس لفظ کو بولتا ہے۔

پھر وہاں سے بارات دولہا کے گھر روانہ ہوتی ہے۔ خانگی طور پر بھی بعض لوگ گھر پر دوبارہ مذہبی طریقے کے مطابق نکاح کی رسم انجام دے لیتے ہیں جس کے بعد بہت مختصر دعوت طعام ہوتی ہے جس میں لڑکا اور لڑکی کے انتہائی قریبی رشتہ دار شریک رہتے ہیں۔ دوسرے دن دعوت ولیمہ دھوم دھام سے ہوتی ہے اس غرض سے شہر کے مختلف حصوں میں مخصوص ہال موجود ہیں جنھیں "دعوت سالونو" کہا جاتا ہے۔ شہروں میں دعوت ولیمہ مشروبات اور مٹھائیوں تک محدود ہوتی ہے۔ دیہاتوں میں باقاعدہ پکوان کے ساتھ ہندستانی طور پر دعوت طعام دی جاتی ہے۔ دولہا دلہن کی گلپوشی نہیں ہوتی صرف خوش نما پھولوں کے گلدستے تحفۂ مہمان پیش کرتے ہیں۔ ہندستان کی طرح لڑکیوں کے لیے قیمتی جہیز دینے کا رواج نہیں البتہ دلہن کا خوشنما زردوزی لحاف اور تکیوں والا بستر اور کپڑے ضرور دیے جاتے ہیں۔ ہندستانی عورتوں کی طرح ترک خواتین تمام اقسام کا زیور استعمال نہیں کرتیں صرف گلے میں سونے کا ہار، ہاتھ میں سونے کی چوڑیاں اور کان کے پھول پہنتی ہیں۔ اسی قدر زیور دلہن کو بھی دیا جاتا ہے۔ بچّہ کی پیدائش پر عقیقہ وغیرہ جیسی چند تقریبات بھی دھوم سے منائی جاتی ہیں۔ ترکی زبان میں دولہا کو "داماد" دلہن کو گیلن (آنے والی)، اور شادی کو "ایولنک" (گھر بسائی) کہتے ہیں ایک دوسرا لفظ "دغون" بھی ہے۔ بیوی کو "کاری" شوہر کو "کوجا" لڑکی کو "کِیز" لڑکے کو "ایرکک" بھائی کو "ایرکک کاردیش" بہن کو "کِز کاردیش" کہتے ہیں۔ ترکوں کی یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ جس کسی سے بات کرے رشتہ لگا کر بات کرتا ہے چاہے مخاطب ایک فقیر ہی کیوں نہ ہو۔ عام طور پر "اعابے" "بھائی جان" "عابلہ جی" "آپا جان" سے مخاطب کرتے ہیں۔ معمر لوگوں کو "عامجہ" "چچا" "طائی زے" "خالہ" سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ دوست کہنا ہو تو "آرکاداش" کہتے ہیں۔ کاروباری افراد کو "جی" لگا کر پکارتے

ہیں۔ "قہوہ جی" (چائے فروش)، "عربہ جی" (گاڑی والے) "ساقی جی" (بیچنے والے) "کاپی جی" (دربان) وغیرہ بات بات پر "تشکر ادیدم" (شکریہ ادا کرتا ہوں) اور اس کے جواب میں "برشی دعیل" (کوئی بات نہیں) کہا جاتا ہے۔ اگر شخص کھانا کھا چکے تو گھر کے افراد ہوں یا میزبان یا ہوٹل کا بیرا "راحت لراولسون" (یعنی غذا راحت کا باعث ہو) اور کوئی شخص گھر میں یا پبلک حمام میں نہا کر نکلے تو "صاحب لراولسون" (نہانا صحت کا باعث ہو) کہتے ہیں۔ بیمار سے ملاقات ہو تو "گیچ مش اولسون" (بیماری گزر جائے) کہہ کر تسلی دیتے ہیں۔ ان تکلفاتی جملوں کی ترکوں کے پاس غیر معمولی اہمیت ہے اور ایسا نہ کہنے والے کو غیر شائستہ یا غیر مہذب سمجھا جاتا ہے۔ جب دو آدمی ایک دوسرے سے جدا ہوں تو جانے والا ٹھہرنے والے کو "اللہ عا اسمار لدک" (ہم نے آپ کو خدا کے حوالے کیا) کہتا ہے اور ٹھہرنے والا جانے والے کو "گُلے گُلے" (ہنستے ہنستے جاؤ) کہے گا۔

ترکی کے پکوان بھی ہندستانی پکوان سے کافی مشابہت رکھتے ہیں۔ اور نام بھی تقریباً وہی ہیں مثلاً پلاؤ۔ کباب۔ کوفتے۔ دولمہ۔ تاس کباب۔ قیمہ وغیرہ۔ دالیں بھی بکثرت پکتی ہیں "مسور کی دال" مرجمک چوربا" چاول کی کڑی "پرنج چوربا"۔ چنے کی دال "نخود چوربا" کہلاتی ہے۔ بیگن کے لیے ترکی لفظ بے حد دلچسپ ہے یعنی "پتلی جان" کہلاتا ہے۔ ترکاریوں اور سبزیوں میں سب ہی دستیاب ہوتی ہیں۔ خرفہ۔ پالک۔ بھنڈی۔ ٹماٹر۔ آلو۔ شلغم۔ کدو۔ مولی۔ گاجر افراط سے ملتی ہیں۔ مرغ کو "خروس" اور مرغی کو "تاووک" کہتے ہیں۔ مچھلی کو "بالک" گوشت کو "ایت" روٹی کو "پدے" اور نان پاؤ کو "اکمک" سیویوں کو "کادایف" کہتے ہیں۔ گوبھی کا پتہ "پیاز" اور پیاز "سوغان" کہلاتی ہے۔

ترکی زبان میں دکنی الفاظ بھی بکثرت ہیں مثلاً بوتل "شیشہ" کیلا "موز" شیشہ "آئینہ"، چینی "شکر" وغیرہ۔ ناریل ترکوں کو بے حد مرغوب ہے جسے "ہندستان جوزی" کہتے ہیں۔ زیتون کا پھل اور زیتون کا روغن دونوں خوب استعمال ہوتے ہیں سورج مکھی اور مونگ پھلی کے تیل بھی مستعمل ہیں۔ ہندستان کی سگریٹ کی دکانات کی طرح سڑکوں کے کنارے ایسی دکانیں ہوتی ہیں جہاں سگریٹ کے ساتھ مختلف پھلوں کا رس فروخت ہوتا ہے۔ اناناس سیب سنگترہ اور انگور کا شربت بے حد استعمال جاتا ہے۔ برف باری کا موسم نہ ہو تو اعلیٰ درجے کے پھل ارزاں فروخت ہوتے ہیں ترکی کا انگور اور سیب بے حد ذائقہ دار اور شیریں ہوتا ہے۔

ترکی کے بارے میں ہندستان میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ وہاں کے لوگ بالکل مذہب سے بیزار ہیں حالانکہ استنبول شہر کی چھ سو مسجدیں نمازیوں سے بھری رہتی ہیں۔ ان چھ سو میں سے تقریباً چھ مسجدیں دہلی کی جامع مسجد سے بڑی ہیں۔ سلطان احمد جامع، سلیمانیہ جامع بایزید جامع، ینی جامع، ایوب سلطان جامع اور نور عثمانیہ جامع کی بہار جمعہ اور عیدین کے موقع پر دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ سارا رمضان اور دیگر شب ہائے متبرکہ کے موقع پر تمام مسجدیں برقی قمقموں سے روشن کی جاتی ہیں۔ ۱۲ ربیع الاول کی شب کو قمقموں کی روشنی میں سجاوٹ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ترکی میں "فاتحہ"، "سلام" اور "مولود" (میلاد شریف) کا عام رواج ہے۔ بات بات پر لوگ الفاتحہ پکارتے اور مشترکہ فاتحہ پڑھنے لگتے ہیں۔ رمضان میں تراویح اور افطار بھی بے حد پرشکوہ ہوتے ہیں۔ عید رمضان کو "شکر بیرام" اور بقرعید کو "کھربان بیرام" کہتے ہیں۔ شب معراج اور شب برات وغیرہ کو عرف عام میں "قندیل بیرام" (چراغوں کو عید کہا) جاتا ہے۔ عید کی مبارک باد کے لیے "ای بیرام لر" "بیرامنز کتلو اولسون" کہتے ہیں۔ سال نو کی شب بھی ہنگامہ خیز ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر "ینی ییل کتلو اولسون" کہہ کر مبارکباد دیتے ہیں۔ روزہ کو "عروج" کہا جاتا ہے لفظ نماز جوں کا توں ترکی زبان میں مستعمل ہے عیدین کے موقع پر قومی پرچم سربلند کیے جاتے ہیں اور چار دن کی عام تعطیل دی جاتی ہے۔ ترکی میں غیر مسلموں کی تعداد تین فیصد سے زائد نہیں لیکن کرسمس کو بھی رمضان کی عید کے برابر قومی تہوار قرار دیا گیا ہے۔ یوم آزادی، یوم جمہوریہ، یوم قیام پارلیمنٹ اور یوم فتح قسطنطنیہ کی دھوم تو ناقابل بیان دلچسپیاں رکھتی ہیں۔

ترکی میں سینما بینی کا شوق بھی بے حد ہے۔ جنسی ہیجان کے مناظر

اس طرح دکھائے جاتے ہیں کہ انسان پاگل ہو جائے۔ ہندوستانی فلم بے حد مقبول ہیں۔ فلم کو ترکی زبان میں ڈب کیا جاتا ہے البتہ ہندی گیت جوں کے توں رہتے ہیں اسی لیے ترک نوجوانوں کو ہندوستانی گانے بکثرت یاد ہیں۔ ترک اداکاروں میں "جنید آرکن" "ایذر ہوان" "ایلماز گسی" اور اداکاراؤں میں "ترکان شورائے" "دسعت ہنیز" "ناطمہ گرک" "عائشہ گل" قابل ذکر اور بے حد مقبول ہیں۔ پلے بیک گانے والیوں میں "اژدا ایکان" نہ صرف ترکی بلکہ فرانسیسی اور جرمنی گانے بھی گاتی ہے اور بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے تاریخی اور مذہبی فلم بھی عام ہیں۔

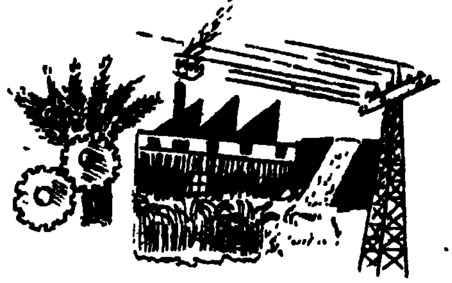
ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی بے حد دلچسپی پائی جاتی ہے — ہندوستان کی خبریں اور ہماری وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کا نام روزانہ ریڈیو پر سنائی دیتا ہے۔ بڑے بڑے چوراہوں پر ٹیلی ویژن سٹ نصب رہتے ہیں۔ ترکی میں ہر بڑی سڑک کو جادہ کہا جاتا ہے۔ استنبول یونی ورسٹی جس روڈ پر واقع ہے اس کا نام "اردو جادہ سی" ہے اسی طرح اس شہر کی دیگر سڑکیں "استقلال جادہ سی" "جمہوریت جادہ سی" اپنی رونق اور چہل پہل کے سبب دنیا کی مشہور ترین سڑکیں سمجھی جاتی ہیں۔

ترکی عوام میں اخبار بینی کا بے حد شوق ہے۔ سرکاری اعداد وشمار کے لحاظ سے انقرہ سے چالیس اور استنبول سے ستائیس روزنامے شائع ہوتے ہیں۔ استنبول کے مشہور و مقبول اخبارات میں "حریت" "ملیتیے" اور "جمہوریت" قابل ذکر ہیں جن کی روزانہ اشاعت بیس بیس لاکھ ہے۔ پیشۂ صحافت بے حد منافع بخش ہے۔ اخبارات کے ہفتہ وار ایڈیشن خوب شائع ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک حیرت کی بات ہے کہ غیر اہم خبروں کو یہ اخبار بے حد اہمیت دیتے ہیں۔ شہر میں ایک قتل ہو جائے تو بڑی بڑی سرخیاں ہر اخبار میں اسی سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور بین الاقوامی اہمیت کی خبریں معمولی سرخیوں کے ساتھ کسی کونے میں چھاپی جاتی ہیں۔ عریاں تصاویر کا مرض بے حد شدید ہے۔

آج کی ترکی کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ انقرہ کے ہندوستانی سفارت خانہ کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ یہ سفارت خانہ شہر انقرہ کے انتہائی خوبصورت علاقہ "چنکایا" میں قبرص سوکاک پر واقع ہے۔ سفارت خانہ کی جانب سے انگریزی اور ترکی میں ہفتہ وار "INDIAN NEWS" شائع کیا جاتا ہے اور "(HINDISTAN)" نامی ایک ماہنامہ بھی نکالا گیا تھا جو اب بند ہے۔ سفارت خانہ کی کوشش سے ہندوستان کی تاریخ اور فلسفہ پر ترک اخبارات میں مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یونیورسٹیوں کے طلبا کے لیے ہندوستان سے تعلق رکھنے والے عنوانات پر تحریری مقابلوں کا انعقاد ہوتا ہے۔ چنانچہ اب "ہندی۔ ترکی" "ترکی سنسکرت" تقابلی مطالعہ کا ذوق بھی بڑھ رہا ہے! انقرہ یونی ورسٹی میں "انڈولوجی" کا شعبہ بھی قائم ہو چکا ہے۔

تعلیم کا رواج بھی خوب ہے۔ ابتدائی تعلیم لازمی اور مفت ہے اسی لیے ہر شخص خواندہ نظر آتا ہے۔ پرائمری اسکول کو "الک اکول" اور مڈل اسکول کو "اورطا اکول" اور ہائی اسکول کو "لیسے" کہتے ہیں۔ کالج اس ملک میں نہیں ہیں۔ ہائی اسکول کے بعد براہ راست یونی ورسٹی میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ استنبول میں تین، انقرہ میں تین، ازمیر اور ارض روم میں ایک ایک یونی ورسٹی ہے۔ سابق میں رابرٹ کالج کے نام سے ایک امریکن کالج تھا جسے قومیا لیا گیا ہے اب وہ باسفورس یونی ورسٹی کہلاتی ہے۔ تعلیم کا معیار بہت بلند ہے صرف ترکی زبان کے ذریعے تعلیم ہوتی ہے اور ہر کورس کی کتابیں سرکاری طور پر ترکی زبان میں تیار کی گئی ہیں۔ عام طور پر ہر مضمون کی اصطلاحات یورپی زبانوں سے جوں کی توں لے لی گئی ہیں۔ دینی تعلیم کے سرکاری ہائی اسکول "امام خطیب اکول" کہلاتے ہیں۔

★



اتّر پردیش شاہراہِ ترقی پر

اتر پردیش میں نظم و نسق کو چاق و چوبند بنانے کے اقدامات ••• سرکاری نظم و نسق کو چاق و چوبند بنانے کے لیے کابینہ کے اقدامات ••• ترقی کے لیے محض سینیرٹی کو معیار تصور نہیں کیا جائے گا ••• یونیورسٹیوں میں صرف لیاقت کی بنیاد پر داخلہ کرنے کے اقدامات ••• بے سہارا بیواؤں کے لیے مالی امداد منظور کرنے کا ضلع مجسٹریٹ کو اختیار ••• جونیر بیسک اسکول کے طالب علموں کو درسی کتابوں کی مفت فراہمی ••• صحافیوں کے لیے علی گنج میں پلاٹوں کی فراہمی ••• خواتین کو بہبود نسواں کے کاموں میں شریک کرنے کا پروگرام۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے سرکاری محکموں کی کارکردگی کو بہتر بنانے اور بدعنوانی کو ختم کرنے کی غرض سے جو ہدایات دی تھیں ان کے مطابق حکومت اتر پردیش نے سکریٹریٹ اور ماتحت دفتروں میں کارکردگی بڑھانے اور دفتری کام کے طریقے کو بہتر بنانے کے لیے متعدد اقدامات کئے ہیں۔

ریاست میں سرکاری ملازمین کی کارکردگی ڈھرے کے مطابق نوا علم کی پابندی کے بجائے اب ان کی بہتر کارگزاری کی بنیاد پر آنکی جائے گی۔ ریکارڈ اور کارکردگی کی وقفے وقفے سے جانچ کے وقت ملازمین اور افسروں کی کارگزاری اور دیانت داری کے اصولوں کی سختی سے پابندی کی جائے گی تاکہ بدعنوان اور نا اہل ملازمین اور افسروں کو نکالا جا سکے۔

نظم و نسق کو زیادہ مستعد اور چاق و چوبند بنانے کے لیے سرکاری ملازمین میں وقت کی پابندی کا احساس اور نظم و ضبط پیدا کرنے کی غرض سے ایک ریاست گیر مہم شروع کی گئی ہے۔ ملازمین کی حاضری کے سلسلے میں اچانک کی جانے والی جانچوں کے نتیجہ میں سکریٹریٹ اور دوسرے دفتروں میں دیر سے دفتر آنے والوں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔ اعلیٰ افسران کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ سکریٹریٹ کے مختلف شعبوں اور دوسرے دفتروں میں کام کے اوقات میں غیر حاضر رہنے والے ملازمین پر نظر رکھیں۔

ریاست بھر میں ۱۶۔ اگست سے سرکاری محکموں میں پچھڑے ہوئے دفتری کاموں کو نپٹانے اور انھیں معمول پر لانے کی غرض سے "پچھڑا کام نپٹاؤ" "ہفتہ" منایا جائے گا۔

زیرِ غور معاملات کو جلد نپٹانے کے لیے نیچے کی جن سطحوں پر فیصلے ہوتے ہیں ان کی تعداد کم سے کم کرنے کی ہدایات جاری کی گئی ہیں۔ سکریٹریٹ کے افسروں کو برابر معائنہ کرتے رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ تاکہ مشورہ طلب معاملے بغیر کارروائی پڑے نہ رہیں۔ اس غرض سے کہ محکموں کے سربراہ ہوں یا منطقائی، علاقائی دفتروں کی سطح پر فوری کارروائی کی جا سکے۔ یہ ہدایات بھی جاری کی گئی ہیں کہ پچھلے دو برسوں میں نیچے کی سطح کو مالیاتی اختیارات تفویض کرنے کے بارے میں جو فیصلے ہو چکے ہیں ان پر عملدرآمد کیا جائے۔

نظم و نسق میں بدعنوانی اور نا اہل ملازمین اور افسروں کو چھانٹ دینے کے لیے ریاست میں شروع کی گئی زبردست مہم کے سلسلے میں حکومت نے ۱۹۔ اعلیٰ افسران کو، جن میں تین آئی۔ اے۔ ایس، ۹۔ اسٹیٹ سول سروس اور ۷۔ اسٹیٹ پولیس سروس کے افسران شامل ہیں، جبری طور پر ریٹائر کر دیا گیا ہے۔ بدعنوان ملازمین اور افسران کے خلاف سخت کارروائی کرنے کے لیے حکومت نے ضلع مجسٹریٹوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس ملازم کی نقدی اور جائیداد قرق کرنے کے لیے قانون فوجداری آرڈی نینس،

۱۹۴۴ء کی دفعات کا استعمال کریں جس نے رشوت اور خیانت مجرمانہ کر کے یہ نقدی اور جائیداد حاصل کی ہو اور جس کے خلاف قانونی چارہ جوئی ہو رہی ہو۔ متعلقہ سرکاری ملازم کے سزا پا جانے پر حکومت قرق کی گئی یہ جائداد ضبط کرے گی۔

ملازمت سے متعلق معاملات مثلاً پنشن کے معاملات، ایفی شنسی بار پار کرنے اور اسی طرح کے دوسرے معاملات، خاص طور سے وہ معاملات جن پر پچھلے کئی مہینوں سے توجہ نہیں دی جا سکی ہے، ان کو جلد سے جلد نپٹا کر ملازمین کی شکایتوں کو دور کرنے کے اقدامات کیے گئے ہیں۔

* * *

اتر پردیش کابینہ نے سرکاری کاموں کی انجام دہی کے سلسلے میں کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے متعدد اقدامات بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان اقدامات کا مقصد یہ ہے کہ سرکاری ملازمین کام کو تیز رفتاری سے نپٹائیں تاکہ عوام حکومت کی کارگزاری، دیانت داری اور خیر سگالی کے بارے میں زیادہ پر اعتماد ہو سکیں۔

سرکاری محکموں کے سکریٹریوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے زیر نگرانی شعبوں میں ایک ماہ سے زیادہ مدت تک غیر فیصل رہنے والے معاملات کی تاخیر کے اسباب کی جانچ کریں۔ ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ان معاملات کو تیز رفتاری سے نپٹانے کے لیے اقدامات کا مشورہ بھی دیں۔

عرضداشتوں اور پنشن کے معاملوں اور گورنر کے مقرر کردہ افسروں کے دیگر معاملات میں تیز رفتاری سے فیصلے کرنے کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کابینہ نے محکمہ جاتی سکریٹریوں کو ہدایت کی ہے کہ جن معاملات کو تیزی سے نپٹانے میں ان کے ماتحت عملہ کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان پر وہ خود اپنے پندرہ روزہ جلسوں میں غور و خوض کریں اور ان دشواریوں کو دور کرنے کے لیے ضروری اقدامات کا مشورہ بھی دیں۔ اسی طرح محکموں کے سربراہ بھی پندرہ روزہ جلسے طلب کر کے اپنے مقرر کردہ افسروں یا ان کے ماتحت افسروں کے معاملات پر غور و خوض کریں گے۔

ایسے معاملات میں جن میں بین محکمہ جاتی صلاح و مشورہ کی ضرورت ہے، متعلقہ سکریٹری کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ متعلقہ محکموں کے افسران کے جلسے یا تو خود اپنی صدارت میں یا اپنے ماتحت کسی سینئر افسر کی صدارت میں طلب کریں جن میں حتی الامکان جلد سے جلد فیصلہ کیا جائے۔

کابینہ نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ محکمہ جاتی مینول یا قواعد ملازمت کو مکمل رکھا جانا چاہیے اور ان میں تازہ ترین اندراجات کیے جانا چاہئیں اگر کہیں محکمہ جاتی مینول یا قواعد ملازمت نہیں ہیں تو وہاں ان کی فوری تیاری کے لیے ضروری کارروائی کی جانی چاہیے۔ جہاں تک محکمہ جاتی مینول کا تعلق ہے ہر محکمہ کے سربراہ کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے صدر مقام پر ایک شعبہ قائم کرے اور اس میں تازہ ترین اندراجات کی غرض سے ایک ایسا پروگرام وضع کرے جو مقررہ مدت کے اندر لازمی طور پر مکمل ہو جائے۔

اس کے علاوہ ہر سطح پر فائلوں میں غیر ضروری اور غیر متعلق نوٹ لکھنے سے احتراز کرنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔ فائلوں میں خصوصی تجاویز، یا سفارشات کے سلسلے میں نوٹ تحریر کیے جانا چاہیے۔

* * *

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے کہا کہ اعلیٰ تر آسامیوں پر ترقی کے لیے محض سینیرٹی کو واحد معیار تصور نہیں کیا جائے گا۔ افسروں اور دیگر ملازمین کی پوری کارگزاری کا بھرپور جائزہ لیا جائے گا اور صرف ایسے افراد ترقی کے مستحق ہوں گے جن کی سروس کا ریکارڈ صاف ستھرا ہو اور جو اہل، دیانتدار اور جفاکش ہوں اور پہل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جو ریاست کی معاشی پسماندگی کے داغ کو مٹا دینے کا جذبہ بھی رکھتے ہوں۔ بدعنوان اور ناکارہ افراد کے لیے نظم و نسق میں کوئی مقام نہیں ہے۔"

شری بہوگنا نے محکمہ آبپاشی کے اعلیٰ سطح کے انجینئروں کو خطاب کرتے ہوئے ان سے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ انھیں آئندہ دو یا تین ماہ کے اندر زبردست دھکا پہنچے جو یہ سمجھتے ہیں کہ محض سینئر ہونے کی حیثیت سے ان کی ترقی ہو جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ یہ سب کے لیے ایک چیلنج اور انتباہ ہے۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ موجودہ ہنگامی حالات صرف باہر کے لوگوں کے لیے ہی نہیں ہیں۔ بلکہ حکومت کے اندر رہ کر کام کرنے والوں کے لیے

بھی ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

حکومت اتر پردیش نے ریاست میں اعلیٰ تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کی غرض سے متعدد اقدامات کیے ہیں۔ ان اقدامات کا مقصد یونیورسٹیوں، اور ڈگری کالجوں نیز ان کے ہاسٹلوں میں داخلہ کے طریقۂ کار کو ضابطہ میں لانا، امتحانات میں ناجائز طریقوں کے استعمال کو روکنا اور امتحان کے نظام کو بہتر بنانا ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا پورا پورا بندوبست کیا جائے گا کہ تعلیمی سال یونیورسٹی کلنڈر کے مطابق ہو۔ طالب علموں کے ہاتھوں طلبا کی گھسائی کو ممنوع قرار دینے والے سرکاری احکامات پر عمل درآمد کیا جائے اور داخلہ کے لیے غیر قانونی زائد فیس نہ وصول کی جائے۔

حکومت نے یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں پر، جن میں وہ یونیورسٹیاں اور ڈگری کالج شامل ہیں جہاں ابھی تک سالانہ امتحانات نہیں ہوئے ہیں، زور دیا گیا ہے کہ اب جبکہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے نتائج کا اعلان ہو چکا ہے۔ مناسب ہے کہ تیسرے سال میں داخلے اور ان درجات میں پڑھائی کا کام شروع کر دیا جائے۔ ان سب سے کہا گیا ہے کہ ۷۶-۱۹۷۵ء ہی سے تعلیمی سال یونیورسٹی کلنڈر کے بموجب ہونا چاہیے خواہ اس کے لیے انھیں دسہرہ اور دیوالی کی تعطیل میں کمی کیوں نہ کرنا پڑے۔ امتحان کے لیے جن تاریخوں کا اعلان ایک بار کر دیا جائے ان میں کسی بھی صورت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جانا چاہیے۔

حکومت نے اپنے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ وہ امتحان ہال میں ہر صورت ناجائز طریقوں کے استعمال کا خاتمہ کر دے گی۔ کیونکہ اس طرح سارا نظام امتحان ہی نہیں بلکہ متعلقہ افراد اور تعلیمی ادارے بھی بدنام ہوتے ہیں۔ حکومت نے امتحانات کے جائز اور آزادانہ انعقاد کے سلسلے میں امتحانات کے نگران اور یونیورسٹیوں کی حفاظت کے لیے ہر ممکن بندوبست کا یقین دلایا ہے۔

حکومت نے تعلیمی اداروں میں سینئر طلبا کے ہاتھوں طالب علموں کی گھسائی کی شکایت پر سخت کارروائی کرنے پر بھی زور دیا ہے۔ کیونکہ حکومت ہند نے ملک بھر میں گھسائی کو ممنوع قرار دیدیا ہے۔ ان تعلیمی اداروں کے خلاف بھی سخت کارروائی کی جائے گی جہاں سے گھسائی کی شکایتیں موصول ہوں گی۔

اعلیٰ تعلیمی درجات میں داخلے کو باضابطہ بنانے کی غرض سے حکومت نے یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ طالب علموں کا داخلہ سختی کے ساتھ لیاقت کی بنیاد پر یعنی پچھلے امتحان میں انھوں نے جتنے نمبر حاصل کیے ہوں اس کے اعتبار سے کیا جائے۔ نیز اساتذہ کے تناسب اور ہر سیکچر کے لکچروں کی تعداد کے بارے میں یونیورسٹیوں نے جو معیار مقرر کیا ہو اس کے مطابق ہی داخل کیے جانے والے طلبا کی تعداد مقرر کی جائے۔ طالب علموں کو داخل کرتے وقت یونیورسٹی اور ڈگری کالجوں کو اس کا پورا اطمینان کر لینا چاہیے کہ کھیل کود اور اپنے ادارہ کی دوسری سرگرمیوں میں حصہ لینے والے طلباء کا مناسب لحاظ رکھا جاتا ہے۔

ان یونیورسٹیوں کو جو ایسے طالب علموں کو جو مسلسل دو سال تک فیل ہوتے رہے ہیں تیسرے سال میں داخل نہ کرنے کا قاعدہ برت رہے ہیں، ان سے کہا گیا ہے کہ وہ اس قاعدہ کو سختی سے ساتھ نافذ کریں۔

حکومت نے یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ داخلہ کے سلسلے میں طلباء سے امدادی فیس وصول کرنے سے احتراز کریں۔ اس طرح کی فیس وصول کرنا ناجائز اور یو۔ پی یونیورسٹیز ایکٹ کی دفعہ ۴۹ کے تحت جرم ہے۔

ہوسٹلوں میں بھی داخلے پچھلے امتحان میں حاصل کیے گئے نمبروں اور کھیل کود نیز اس طرح کی دوسری سرگرمیوں میں عملی حصے لینے کی بنیاد پر کیے جانا چاہئیں، یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کے ذمہ داروں پر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ وہ اس بات کا پورا لحاظ رکھیں کہ جن طلباء کا چال چلن مشتبہ ہو یا جن کے خلاف عدالتوں میں مقدمات زیر سماعت ہیں انھیں داخل نہ کیا جائے اور فیل ہونے والے طلباء کو بھی زیادہ داخلہ نہ دیا جائے۔

⁂ ⁂ ⁂

ریاستی حکومت نے مالیاتی سال رواں کے دوران بے سہارا بیواؤں کو گزر بسر کے لیے مالی امداد دینے کی اسکیم کے تحت رقم کی منظوری کے اختیار کو لامرکزی بنا دیا ہے۔ اب یہ اختیار ضلع حکام کو دیدیا گیا ہے اور

اس مقصد کے لیے ۲۰ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کردی گئی ہے۔

یہ مالی امداد ان بے سہارا بیواؤں کو دی جائے گی جن کی آمدنی ماہانہ ۱۰۰ روپیہ سے زیادہ نہ ہو۔ بیواؤں کو درخواست کے مقررہ فارم کی مکمل خانہ پری کرکے اسے تحصیلدار کے آمدنی سرٹیفکیٹ کے ساتھ متعلقہ ضلع کے ہریجن و سماجی بہبود افسر کو پیش کرنا ہوگا۔ افسر مذکور ضروری جانچ کے بعد اپنی رپورٹ حکام کو قطعی فیصلے کے لیے پیش کریں گے۔

* * *

ریاستی حکومت نے میدانی اضلاع کے شہری علاقوں میں جونیئر بیسک اسکولوں میں زیر تعلیم سماج کے کمزور طبقوں کے طلبا اور طالبات کو موجودہ تعلیمی سال سے مفت درسی کتابیں فراہم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حکومت نے اوّل درجہ سے پانچویں درجہ تک کے ۱۰۰۰۰ ہزار طلباء کو مفت درسی کتابیں فراہم کرنے کے لیے ۳ روپیہ فی طالب علم کی شرح سے ۳۰۰۰۰ روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔ یہ کتابیں درسی کتب افسر کے علاقہ کے مشورہ سے خریدی جائیں گی اور ان اسکولوں کی لائبریریوں میں رکھی جائیں گی۔ ہر طالب علم کو تعلیمی سال کے لیے کتابوں کا ایک سیٹ عارضیتاً دیا جائے گا۔ معاشی طور پر کمزور طبقے کے طلباء کو یہ کتابیں مفت دی جائیں گی اور ان طالب علموں کو برائے نام فیس پر یہ کتابیں فراہم کی جائیں گی جو ادائیگی کرسکتے ہیں۔

اس اسکیم کے تحت درجہ اوّل میں زیر تعلیم ایسی طالبات اور سماج کے کمزور طبقوں کے طلباء کو مفت کتابیں فراہم کی جائیں گی جو اپنے درجہ میں برابر حاضر رہیں اور جن کے والدین کی آمدنی بھی کم ہو۔ اس سلسلے میں درجہ ۲، ۳، ۴ اور ۵ کے طلباء کو یہ کتابیں ان کی درجہ میں باقاعدہ اور مسلسل حاضری ان کی سالانہ ترقی اور سابقہ درجہ میں ان کے نتیجہ کی بنیاد پر دی جائیں گی۔

* * *

اتر پردیش کابینہ نے اپنے ایک حالیہ جلسے میں علی گنج ترقیاتی اسکیم میں لکھنؤ کے صحافیوں کے لیے پچاس پلاٹ مخصوص کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان میں سے ۲۵ پلاٹ ۲۴۰۰ مربع فٹ کے اور بقیہ ۱۸۰۰ مربع فٹ کے ہوں گے۔

تمام پلاٹ پٹہ پر دیئے جائیں گے اور پریمیم کی شرح ۳۲ روپیہ فی مربع فٹ مقرر کی گئی ہے۔ پلاٹوں کی کل قیمت دو قسطوں میں ادا کی جاسکتی ہے۔

ان پلاٹوں کو رعایتی شرحوں پر دینے سے نگر مہا پالیکا کو جو نقصان پہنچے گا اس کی تلافی کرنے کے لیے حکومت نگر مہا پالیکا کو ۲۱۲۰۰۰ روپیہ کی مالی امداد دے گی۔

اس سلسلہ میں یہ شرائط عائد کی گئی ہیں کہ صحافیوں کی یا تو لکھنؤ میں تعیناتی ہونا چاہیے یا بعض اس شہر کا باشندہ ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ ریاست میں کسی بھی جگہ پر ان کا ذاتی مکان نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ الاٹمنٹ حکم کی تاریخ سے پانچ سال کے اندر مکان تعمیر کرالیں۔

* * *

ریاست میں سرگرم عمل کل ہند اور ریاستی سطح کی رضا کار خواتین ایسوسی ایشنوں کی نمائندوں کی ایک کانفرنس الٰہ آباد میں آئندہ ۲۶ر اکتوبر کو ہوگی جس میں ان ایسوسی ایشنوں کے زیر اہتمام چلنے والے مختلف پروگراموں پر تبادلہ خیال کیا جائے گا اور اس پر غور کیا جائے گا کہ انکے مناسب عمل درآمد کے لیے کیا طریقے ہوسکتے ہیں۔

یہ فیصلہ عالمی خواتین سال کی تقریبات کے انعقاد کے سلسلے میں ریاستی کمیٹی کی مجلس عاملہ نے کیا جس کا جلسہ یہاں شریمتی کملا بہوگنا کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔

خواتین صارفین امداد باہمی انجمن پر دو روزہ سیمینار ۹ر اگست کے بجائے جیسا پہلے اعلان کیا گیا تھا اب ۲۳ اگست کو لکھنؤ میں ہوگا۔ اس سیمینار میں شرکت کے لیے ہر ضلع سے تین یا چار خواتین منتخب کی جائیں گی اور صارفین اسٹور چلانے کی تربیت دی جائے گی۔

دیہی خواتین کو بہبود نسواں کے کاموں میں شریک کرنے اور ان میں منظم سماجی کاموں سے دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے رائے بریلی میں ایک پنچایت سمیلن نومبر میں منعقد کرنے کی تجویز ہے۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

دانش و بینش مصنف :- کوثر چاندپوری ۔ صفحات :- ۲۴۰ قیمت :- سولہ روپے ۔ ملنے کا پتہ :- حلقۂ فکر و نظر بلیماران ۔ دہلی۔

کوثر چاندپوری کی شخصیت اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک بلند پایہ اور کہنہ مشق افسانہ نگار ہی نہیں ہیں بلکہ انھوں نے تنقید و سوانح، تاریخ، سائنس اور طب کے موضوعات پر بھی اپنا قلم اٹھایا ہے اور اپنی علمی زندگی کی طرح "ذہنی تشخص" کا ثبوت دیا ہے۔ زیرِ نظر تصنیف میں سولہ ابواب ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :-

۱۔ خواجہ نصیر الدین طوسی ۲۔ بیرم خاں کی شاعرانہ شخصیت ۳۔ راجہ نول رائے وفا ۴۔ بشیشور پرشاد منور لکھنوی ۵۔ پروفیسر احتشام حسین ۶۔ غالب کے خطوط ۷۔ پریم چند اور ہندوستانی تہذیب ۸۔ بچوں کا شاعر شفیع الدین نیر ۹۔ ایک عہد آفریں شخصیت ۱۰۔ نیر واسطی ۱۱۔ جے کرشن چودھری ۱۲۔ ل۔ احمد کا افسانوی آرٹ ۱۳۔ کرشن چندر بحیثیت افسانہ نگار ۱۴۔ غبارِ کارواں ۱۵۔ فکر تونسوی کی طنز نگاری۔

ان سوانحی خاکوں میں کوثر صاحب نے ہر شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر متناسب اور متوازن انداز سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن بعض خاکوں میں ان کی عقیدت کھل کر سامنے آگئی ہے۔ ایک عہد آفریں شخصیت کے ذیل میں انھوں نے حکیم عبد الحمید دہلوی کو ایک فرشتہ کی شکل میں پیش کیا ہے: "وہ ایسے جینیس (GENIUS) ہیں جن کی فہم و فراست پر فلسفیانہ غور و فکر اور تلاش و جستجو سبقت لے جاتی رہتی ہے......"

خواجہ نصیر الدین طوسی، ایک اہم اور دلچسپ خاکہ ہے۔ اس میں اگر سن ہجری کے ساتھ ساتھ اس کے متبادل سن عیسوی کا حوالہ بھی دے دیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ خواجہ نصیر الدین جہاں فلسفہ، حکمت، ریاضی، ہیئت، طب اور دوسرے علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، وہاں سیاسی سوجھ بوجھ کے اعتبار سے بھی قابلِ رشک اہلیت کے حامل تھے۔ خواجہ نے ہلاکو خاں کے وزیر کی حیثیت میں اپنے فرائضِ منصبی اس انداز سے ادا کیے کہ وہ ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کوثر صاحب نے اپنی شگفتہ اور سحر آفریں زبان میں طوسی کی زندگی کے حالات کو بڑی تفصیل اور حوالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔

بیرم خاں کو ہمایوں کے عہد اور اکبر کے ابتدائی دورِ حکومت میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اسی کے مشورے اور اصابتِ رائے کا نتیجہ تھا کہ ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھانے کے بعد شاہ طہماسپ فرمانروائے ایران کی فوجی امداد حاصل کر سکا اور اسے دوبارہ ہندوستان پر حکومت کرنے کا موقع ملا۔ بیرم خاں کی سیاسی زندگی تاریخ کا اہم جزو ہے لیکن کوثر صاحب نے اس کی شاعرانہ حیثیت کو اجاگر کر کے ادبی حلقوں میں اولیت حاصل کی ہے۔

بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے متعلق کوثر صاحب کا خاکہ بھرپور اور معلومات افزا ہے۔ منور صاحب کی شخصیت کے اعلیٰ پہلوؤں اور نظریات کو ان کے کلام کی مثالیں ★ دے کر بڑے خوبصورت ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ ان کے بارے میں اظہار ہے:

" انسانیت کے ساتھ یہ خلوص ہی ان کی شاعرانہ عظمت کا ضامن ہے۔ عملی حیثیت سے وہ بالکل مذہبی تھے مگر جن عناصر سے ان کا سیولر تعمیر ہوا تھا اس میں خلوص اور محبت کا حصہ زیادہ تھا۔"

پروفیسر احتشام حسین سے مصنف کو جو قربت حاصل تھی اس کے ثبوت میں انھوں نے واقعات کے ساتھ ساتھ خطوط کو بھی پیش کر دیا ہے۔ 'غالب کے خطوط' میں انھوں نے غالب کی مراسلہ نگاری کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے خطوط کی روشنی میں غالب کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر اظہارِ خیال بھی کیا ہے۔ شفیع الدین نیر کے بارے میں ان کا سوانحی خاکہ بے ضرورت غیر ضروری حد تک طویل ہو گیا ہے۔

'غبارِ کارواں' خود کوثر صاحب کا سوانحی خاکہ ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے حالاتِ زندگی کے علاوہ ان عوامل کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے ان کی زندگی کے نشو و نما میں گہرا اثر ڈالا ہے۔

فکر تونسوی کی طنز نگاری کے متعلق ان کا مضمون حقیقت پسندی اور تنقید نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ انھوں نے فکر کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس پر اپنے نئے اور منفرد زاویہ نگاہ سے قلم اٹھایا ہے۔

کتابت اور طباعت اعلیٰ درجے کی ہے۔

—— سید نظر ترابی

تنقیدی انشائیے :- مرلقا اعجاز۔ پبلشر۔ فضل طلعت۔ پبلی کیشن۔ ہمایوں باغ چمن گنج کانپور ضخامت۔ ۱۴۰ صفحات۔ قیمت : تین روپے

تنقیدی انشائیے مرلقا اعجاز کے دس تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کے بیشتر مضامین اردو ادب کے طلبہ کی نصابی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں کتاب میں ڈاکٹر شمیم انہونوی، ریڈر صدر شعبہ اردو حلیم مسلم کالج کانپور کا ایک مختصر پیش لفظ بھی شامل ہے جس میں ایک استاد کی حیثیت سے اپنی ایک ہونہار شاگردہ کی ہمت افزائی کی گئی ہے کتاب میں شامل مضامین میں سے بعض غیر مطبوعہ ہیں اور چند قومی آواز لکھنؤ وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

دو مضامین نثر نگاروں سے متعلق ہیں جن کے تحت ابو الکلام آزاد اور پریم چند کی نثری نگارشات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ سات مضامین میں اقبال، میر، حسرت موہانی، فیض، اصغر گونڈوی، فانی اور نشور واحدی کی شعری تخلیقات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ دسواں اور آخری مضمون جدید شاعری سے متعلق ہے۔

جدید شاعری فیض، اصغر اور نشور واحدی سے متعلق مضامین کو مجموعہ کے کامیاب مضامین کو مجموعہ کے کامیاب مضامین کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے اقبال، میر، ابو الکلام آزاد پر لکھے جانے والے مضامین میں کافی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ان موضوعات پر متعدد اہم کتابوں میں کافی مواد موجود تھا جس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کتاب بی۔ اے کے طلبہ کے لیے مفید معلوم ہوتی ہے۔

کاظم علی خاں

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

جلد ۳۱ نمبر ۷

اکتوبر ۱۹۷۵ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: کماری سرلا ساہنی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن ببھاگ ۔ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ ۔ لکھنؤ
ذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

اپنی بات

باباے قوم مہاتما گاندھی ایک ایسا ہندستان تعمیر کرنا چاہتے تھے جس میں غریب سے غریب بھی یہ محسوس کر سکے کہ یہ اس کا اپنا ملک ہے جس کی تعمیر میں اس کی آواز کو ایک خاص وزن حاصل ہے۔ ایک ایسا ہندستان جس کے باشندوں میں نہ اعلا طبقہ ہوگا اور نہ ادنا۔ ایک ایسا ہندستان جس میں تمام فرقے مکمل یگانگت اور اتحاد کی زندگی بسر کریں گے۔ اس ہندستان میں چھوت چھات یا منشیات کی لعنت نہ پائی جائے گی۔ عورتوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مردوں کو ہیں۔ چنانچہ آزادی کے بعد گاندھی جی کے خوابوں کے اسی ہندستان کو نصب العین بنا کر مرکزی اور صوبائی حکومتیں اس کی تعمیر میں کوشاں رہیں۔ لیکن بعض مفاد پرست، رجعت پسند اور سیکولرزم دشمن عناصر اگر ایک طرف حکومت کی ان کوششوں کو تارپیڈو کر کے گاندھی جی کے ان خوابوں کو چکنا چور کر دینے کے درپے رہے تو دوسری طرف سیاسی اسٹیج پر نت نئی بازی گری دکھا کر اپنے مفاد و مقاصد کے حصول کی سعی میں مصروف رہے۔ ان جمہوریت دشمن عناصر کی فسطائیت پسندانہ ریشہ دوانیاں ان ترقی پسندانہ اقدامات کے خلاف ایک گہری سازش کی شکل میں شروع کی گئیں جو شریمتی اندرا گاندھی نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالتے ہی عام لوگوں بالخصوص غریبوں اور سماج کے کمزور طبقوں اور ایک مقررہ آمدنی رکھنے والوں کو مشکلات سے نجات دلانے اور انھیں راحت پہنچانے کے لیے شروع کیے۔ اندرا جی کی فعال اور حوصلہ مندانہ قیادت میں حکومت انتشار پسندوں کی سرگرمیوں کو صبر و ضبط سے دیکھتی رہی۔ لیکن اسے بزعم خود حکومت کی کمزوری سے تعبیر کیا جانے لگا۔ حد یہ ہو گئی کہ جمہوریت کے نام پر جمہوریت کو ختم کر دینے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ باقاعدہ اور آئینی طریقے پر منتخب حکومتوں کو اپنے فرائض کی ادائیگی سے باز رہنے پر مجبور اور مسلح افواج اور پولیس کو بغاوت پر اکسایا جانے لگا۔ صورت حال اس قدر سنگین ہو گئی تھی کہ چند لوگوں کی کارروائیوں سے ملک کی بھاری اکثریت کے حقوق، ہماری ایکتا، استحکام اور سالمیت حتی کہ ہماری جمہوریت ہی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ یہ حالات سخت کارروائی کے متقاضی تھے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بروقت اور برمحل فیصلہ پر ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر کے جمہوریت، سیکولرزم، دستوری طریقوں اور قومی قدروں کو درپیش سخت خطرے سے بچا لیا گیا۔ اس کے بعد وزیر اعظم نے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کا اعلان کیا۔

ہنگامی حالات کے اعلان سے ۲۰ نکاتی پروگرام پر عمل کرنے اور دیگر اقتصادی اسکیموں کو آگے بڑھانے کا ہمیں ایک نیا موقع ملا۔ چنانچہ صوبائی حکومتوں نے پورے خلوص اور عزم کے ساتھ اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ اتر پردیش نے جو عوامی فلاح و بہبود کے کاموں خاص طور سے ہریجنوں، پس ماندہ اور کمزور طبقوں کی ترقی و بہبود کے لیے اقدامات کرنے میں اکثر پہل کی ہے اس بار بھی وہ پیچھے نہیں رہی۔ ان طبقوں کے لوگوں کو ساہوکاروں کے قرضوں سے نجات دلانے کے لیے پہلے ہی قدم اٹھایا جا چکا تھا۔ اب اس قانون میں مزید ترمیم کر کے اسے اور وسیع بنا دیا گیا ہے۔ جوت حدبندی قانون کے تحت فاضل اراضیات کی بے زمینوں میں تقسیم کا کام پورے شد و مد سے جاری ہے۔ کسی معاہدے، رواج یا روایت کے تحت مزدوروں کو پابند بنا کر ان سے کام لینے کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ بے زمین مزدوروں، دیہی دستکاروں اور چھوٹے سرحدی کسانوں کو ادارہ جاتی قرضے دلانے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ کھیت مزدوروں کے لیے کم سے کم اجرت مقرر کر دی گئی ہے۔ دیہی علاقوں میں ہریجنوں اور کمزور طبقے کے لوگوں کو مکان بنانے کے لیے زمینیں الاٹ کی جا رہی ہیں۔ بنکروں کو مناسب قیمت پر ضروری چیزوں کی سپلائی اور ان کو مزید حفاظتی سہولتیں دینے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ ہریجنوں، پس ماندہ طبقوں اور اقلیتوں کے جان و مال کی حفاظت اور انھیں ظلم و تشدد سے بچانے کے لیے سخت اقدامات کیے گئے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کے لیے نشستیں محفوظ کرنے اور اس کی پابندی کے لیے سخت احکامات کے ساتھ ساتھ دیگر سہولتیں بھی مہیا کی جا رہی ہیں۔ اس طرح ان کمزور اور صدیوں سے دبے کچلے لوگوں میں ایک اعتماد پیدا ہو گیا ہے اور عام طور سے یہ محسوس کیا جانے لگا ہے کہ اب گاندھی جی کے خوابوں کے ہندستان کی تعمیر تیزی سے عمل میں آ رہی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس ہندستان کی تعمیر میں ہم بھرپور حصہ لیں اور وقت نے ہم پر جو ذمے داریاں عائد کی ہیں ان سے عہدہ برآ ہوں۔ یہی گاندھی کے تئیں ہمارا حقیقی نذرانۂ عقیدت ہے۔

آہ! ڈاکٹر رغیب حسین

آخری کاپی مشین پر جا رہی تھی کہ لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر سید رغیب حسین کے انتقال کی اندوہناک خبر آئی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم یونی ورسٹی میں امتحانات کمیٹی کے جلسے میں شریک تھے کہ ان پر شدید قلبی دورہ پڑا اور قبل اس کے کہ انھیں اسپتال پہنچایا جا سکے وہ انتقال کر گئے۔ رغیب صاحب زبردست قوت برداشت اور قوت ارادی کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شدید علالت کی کسی کو خبر بھی نہ ہو سکی اور اچانک انتقال کی خبر ملی تو سب کے سب مبہوت رہ گئے۔ بلا تفریق مذہب و ملت طلبہ کی خواہ وہ ان کے شعبے سے تعلق رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں مدد کرنا اور ان کے کاز کو تقویت پہنچانے کے لیے ہر امکانی کوشش کرنا انھوں نے اپنا نصب العین اور اپنی زندگی کا اصول بنا لیا تھا جس نے انھیں ہر مکتب خیال کے طلبہ میں ہر دل عزیز اور قابل احترام بنا دیا تھا۔ ان کی انسان دوستی، منکسر المزاجی اور دردمندی نے انھیں سماجی زندگی میں خاصا مقبول بنا دیا تھا۔ قدیم اور جدید فارسی پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ اردو کی ترقی سے بھی ڈاکٹر رغیب کو شغف اور گہری دلچسپی تھی۔ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا انتہائی مشکل ہے۔ اس سانحہ میں ادارہ نیا دور مرحوم کے پس ماندگان سے دلی تعزیت کرتا ہے۔

——— ایڈیٹر

رشید الدین

اردو شاعری کا لکھنؤ اسکول

اردو کے مشہور ادیب مولانا عبدالحلیم شرر لکھنؤ سے متعلق اپنی کتاب "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" میں یوں رقمطراز ہیں:

"جب دلّی کی بساط الٹ چکی تو یہ لکھنؤ میں بچھی۔ اودھ کا دربار تو ایک چھوٹا سا دربار تھا لیکن یہاں اہل علم و ادب کی جو سرپرستی ہوئی اور یہاں اس دور میں جو ادب پروان چڑھا وہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے دربار میں بھی نظر نہیں آتا۔"

مولانا شرر کی یہ رائے حرف بہ حرف صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہندستان میں یوں تو کئی خاندانوں نے حکومتیں کیں اور کئی سلطنتیں اس ملک کے سیاسی نقشہ پر ابھریں اور ختم ہوئیں لیکن اودھ کی سلطنت نے دنیائے ادب میں اپنا جو نام ثبت کیا وہ قیامت تک باقی رہے گا۔ اس دور میں اردو شاعری کا ایک مکمل اسکول یا دبستان وجود میں آیا جو دبستان لکھنؤ یا لکھنؤ اسکول کے نام سے مشہور ہے۔

جب مغلیہ سلطنت کمزور ہونے لگی تو اس کے اکثر صوبے خود مختار ہوتے گئے۔ چنانچہ جہاں نظام الملک نے دکن میں اپنی خود مختاری کا اعلان کرکے آصف جاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی وہیں اودھ میں برہان الملک نے اپنی حکومت قائم کی۔ انھوں نے اپنا ایک نیا پایہ تخت بنایا جو بعد کو فیض آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ ان کے جانشین شجاع الدولہ نے وہاں سے اپنا پایہ تخت لکھنؤ منتقل کیا اور تب سے لکھنؤ نے دن دونی رات چوگنی ترقی کرنی شروع کی۔

نواب سعادت علی خان برہان الملک سے لے کر نواب واجد علی شاہ اختر تک اس خاندان کے جملہ گیارہ بادشاہ گزرے ہیں اور ان کا دور حکومت ۱۷۲۰ء سے لے کر ۱۸۵۶ء تک یعنی پورے ۱۳۶ سالوں پر مشتمل ہے۔ ان گیارہ بادشاہوں میں سے برہان الملک کو چھوڑ کر کہ وہ سپاہی آدمی تھے باقی دس بادشاہ یا تو خود شاعر تھے یا پھر شاعری کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ آصف الدولہ (تیسرے بادشاہ) وزیر علی (چوتھے بادشاہ) غازی الدین حیدر (ساتویں بادشاہ) اور واجد علی شاہ اختر (گیارہویں بادشاہ) خود شاعر تھے۔ جب کہ شجاع الدولہ (دوسرے بادشاہ) اور سعادت علی خاں (چھٹے بادشاہ) شاعر نہیں تھے۔ مگر بڑے علم دوست تھے اور انھوں نے شاعری کی بڑی سرپرستی کی۔

لکھنؤ کو عروج اس وقت حاصل ہوا جب کہ شجاع الدولہ نے فیض آباد چھوڑ کر اسے سلطنتِ اودھ کا پایۂ تخت بنایا۔ اس وقت تک لکھنؤ صرف ایک قصبہ تھا۔ تاہم اس کا نام پرانی کتابوں میں موجود تھا اور اس کے ذکر سے اہل علم کے کان نا آشنا نہ تھے۔ چنانچہ ہندو ادب کی قدیم ترین اور مقدس ترین کتاب "رامائن" میں لکھنؤ کا ذکر ملتا ہے۔ جیسے بن باس کے بعد رامچندر جی نے اپنے چھوٹے بھائی لکشمن جی کو جاگیر میں دیدیا تھا۔ لکھنؤ میں لچھمن ٹیلہ ابھی تک موجود ہے۔ لکشمن سے لچھمن اور لچھمن سے بگڑ کر یہ نام لکھنؤ ہو گیا اور آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔ آج کے جمہوری دور میں بھی لکھنؤ وفاقی ہندستان کی ایک ریاست اتر پردیش کا پایہ تخت ہے۔

لکھنؤ نے زمانے کے سرد و گرم بہت دیکھے لیکن اس کے دبستانِ شاعری پر امتدادِ زمانہ کا کچھ اثر نہ پڑا۔ لکھنؤ نے شاہانِ اودھ کا زوال بھی دیکھا اور غدر کا ہنگامہ بھی، محبانِ وطن کی حکومت کے نظارے بھی۔ اور پھر انگریزوں کا تسلط بھی برداشت کیا لیکن اس کے زبانِ

...دلی میں بلند ہی کے تھے اور دلی کے اجڑنے کے بعد انھوں نے اس دربار میں پناہ لی تھی۔ ان شاعروں میں سراج الدین علی خاں آرزو (میر کے ماموں) مرزا محمد رفیع سودا، میر حسن دہلوی، میر مستحسن خلیق، میر قمر الدین منت، مرزا جعفر علی حسرت، شیخ میر محمد سوز، میر حیدر علی حیران، میر تقی میر، قلندر بخش جرات، انشاء اللہ خاں انشاء، غلام ہمدانی مصحفی، سعادت یار خاں رنگین اور نسیم دہلوی شامل ہیں۔

لکھنؤ اسکول کا اصل سلسلہ ناسخ سے شروع ہوتا ہے جنھیں ہم اس اسکول کا بانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ناسخ کے بعد ہی سے اس شاعری کا مخصوص رنگ شروع ہوتا ہے جو اسے ایک دبستان کی شکل عطا کرتا ہے۔ ناسخ نے زبان کی اصلاح بھی کی اور خیال کو نیا رنگ بھی دیا۔ تشبیہات، استعارے، کنائے، مضمون آفرینی اور طرز بیان کی نزاکت لکھنؤ کی شاعری کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ابتذال، رکاکت اور معاملہ بندی اس شاعری کے کمزور پہلو رہے ہیں اور یہ خامیاں اور خوبیاں دونوں ہمیں ناسخ کی شاعری میں ملتی ہیں۔

ناسخ کے بعد اس سلسلے میں یوں تو ہمیں اور بہت سے نام ملتے ہیں۔ لیکن ان میں قابل ذکر امانت لکھنوی، محسن کاکوروی، آتش لکھنوی، دیا شنکر نسیم، مرزا شوق، ریاض خیرآبادی، امیر مینائی، جلیل مانکپوری، صفی لکھنوی، حسرت موہانی، آرزو لکھنوی، یگانہ چنگیزی اور آثر لکھنوی ہیں۔ غزلوں اور مثنویوں کے علاوہ اس زمانے میں لکھنؤ میں مرثیے بھی بہت زیادہ لکھے گئے اور اس اسکول نے اس صنف سخن میں سارے اردو ادب میں ایک امتیاز پیدا کیا اور اعلیٰ معیار قائم کیا۔ اس زمانے میں یوں تو لکھنؤ میں کئی مرثیہ گو شاعر پیدا ہوئے اور اپنے زمانے میں انھوں نے خاصی شہرت بھی پائی لیکن ان میں دو نام ایسے بھی ہیں جنھیں دبستان لکھنؤ کا مورخ تو کیا اردو ادب کا کوئی بھی طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ نام انیس اور دبیر کے ہیں۔ یہ دونوں شاعر نہ صرف ہم عصر ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ہم پلہ بھی۔ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ خود ادارے تھے اور ان کے معتقدین انیسیئے اور دبیریئے

اس طرح ناسخ سے لے کر آثر لکھنوی تک دبستان لکھنؤ کا یہ دور دو سو سال سے بھی زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ اس شاعری کی اپنی چند خصوصیات ہیں جنھیں الگ کر کے نہ اس شاعری کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس کے صحیح مطالعے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ اردو ادب میں عام طور پر یہ روایت پڑ چکی ہے کہ لکھنؤ کے دبستان شاعری کی خوبیاں بیان کر کے یا تو زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں یا پھر اس کی طرح طرح کی خامیاں نکال کر اسے ایک غیر معیاری و غیر اخلاقی شاعری ثابت کیا جاتا ہے۔ حالانکہ میرے خیال میں یہ دونوں ہی باتیں انتہا پسندی پر مبنی ہیں اور ایک ادب کے طالب علم کو انھیں نظر انداز کر کے اس اسکول کی اچھائیوں اور برائیوں دونوں ہی پر نظر ڈالنی چاہیے۔

جہاں تک دبستان لکھنؤ کی اچھائیوں کا تعلق ہے اس میں زبان و بیان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دلی کی زبان بس غدر تک مستند سمجھی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد یہ شرف لکھنؤ کے حصہ میں آیا۔ اور بات یہاں تک پہنچی کہ کسی لکھنوی نے طوطی بولتا ہے کہہ دیا تو یہ سارے ہندستان میں اسی طرح بولا جانے لگا۔ اور آج تک بولا جاتا ہے۔ حالانکہ طوطی کسی طرح مذکر نہیں ہو سکتی۔ زبان کی نزاکت غزل کی جان ہوتی ہے اس لیے یہ ظاہر ہے کہ اس دور میں اردو غزل نے اپنے مخصوص رنگ میں کافی ترقی کی۔ مضمون کی بلندی خیال کی نزاکت اور زبان کی صحت لکھنؤ کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں اور ان کا بھرپور احساس ہمیں اس زمانے کی غزلوں میں ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ناسخ اور آتش دو نام ایسے ہیں جنھیں اردو شاعری کے کسی بھی انتخاب میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

دبستان لکھنؤ میں ہمیں صرف غزل ہی کا ارتقا نظر نہیں آتا بلکہ نعت، منقبت، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ کا بھی عروج ملتا ہے۔ محسن کاکوروی دبستان لکھنؤ کے مشہور نعت گو اور منقبت گو ہیں۔ قصائد تقریباً ان تمام شعرا نے کہے ہیں جو دربار اودھ سے وابستہ رہے۔ مثنوی میں دو نام پنڈت دیا شنکر نسیم (مصنف مثنوی گلزار نسیم) اور مرزا شوق (مصنف مثنوی زہر عشق) ایسے ہیں جن کی ٹکر کے مثنوی گو

شعرا پوری اردو شاعری میں کوئی اور نہیں ملتے۔

دبستان لکھنؤ میں مرثیہ کو بھی بے حد عروج حاصل ہوا۔ خلیق، انیس، مونس، منیر، دلگیر، اور فصیح اپنے زمانے کے مشہور مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں۔ لیکن دبستان لکھنؤ کے مرثیہ گو شعرا کی جو جوڑی سارے اردو ادب کی ناک سمجھی جاتی ہے وہ انیس اور دبیر کی ہے۔ یہ شاعر ایسے تھے جو اپنی جگہ ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں کون برتر ہے اور کون کمتر۔ اس کا فیصلہ آج تک نہ ہو سکا اور شبلی نعمانی جیسے جید عالم کے "موازنہ انیس و دبیر" لکھنے کے باوجود یہ بحث آج بھی تشنہ ہے۔

اب تک جن اصناف شاعری کا ذکر ہوا وہ لکھنؤ کے علاوہ ہندوستان کے دیگر مقامات پر بھی پروان چڑھی ہیں۔ اور اس میدان میں اور بھی بہت سے باکمال ملتے ہیں لیکن اردو شاعری کی ایک صنف ایسی بھی ہے جو خاص لکھنؤ سے نسبت رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ختم بھی ہو گئی یہ رہس اور اندر سبھا ہے رہس واجد علی شاہ کے تخیل کا نتیجہ ہے جبکہ اندر سبھا امانت کے ذہن کی پیداوار، بعد میں پارسی تھیٹریکل کمپنیوں نے جو ڈرامے لکھوائے اور اسٹیج کئے وہ اس کی ارتقائی صورت ہیں۔

دبستان لکھنؤ کی ان خوبیوں کے علاوہ اس کی چند خامیاں بھی ہیں جن پر یہاں روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ لکھنؤ کے پورے دور میں غزل کی حد تک صرف تقلیدی شاعری ہوئی ہے۔ اجتہاد اور اختراع کا کہیں بھی نشان نہیں ملتا۔ لکھنؤ کے تمام غزل گو شعرا نے داخلیت کو ترک کر کے صرف خارجیت کا سہارا لیا۔ لکھنؤ میں حقیقی شاعری کے زوال کے بہت سے اسباب ہیں۔ جن میں غزل کا طویل ہونا بھی ایک عنصر ہے۔ طویل غزلوں میں اکثر ایسے قافیے نظم کرنے پڑے جنکی وجہ سے مضمون خواہ مخواہ رکیک اور مبتذل ہو گیا۔ یہ اس زمانے کے لکھنؤ کا عام مزاج تھا جس سے ناسخ جیسا شاعر بھی اپنا دامن نہیں بچا سکا۔ لکھنؤ کے اس زمانے کے اکثر شعرا کے پاس بھرتی کے اشعار بہت زیادہ ملتے ہیں اور اس کی وجہ محض بیجا قافیہ پیمائی ہے۔ اس سے زبان پر شاعر کی دسترس اور ندرت کا پتہ چلتا ہو تو چلتا ہو، مگر اس کی شاعرانہ عظمت بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔

ابتذال اور رکاکت لکھنؤ کی شاعری کی ایک اور خامی رہی ہے۔ اس زمانے کے اکثر شعرا کے دامن اس سے داغدار نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ ناسخ جیسے شاعر تک کا ابتدائی دور کا کلام اس کا عبرتناک نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس زمانے کے شاعروں (اور وہ بھی اچھے شاعروں) کے دواوین میں بیسیوں ایسے اشعار ملیں گے جنھیں آج کا ادب کا کوئی طالب علم دہرانے یا ان کی مثالیں پیش کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔ تاہم اس میں ان شاعروں کا کوئی قصور نہیں۔ دراصل اس زمانہ کا معاشرہ ہی ایسا تھا اور زوال پذیر معاشرہ میں ایسی مثالیں ضرور ملتی ہیں۔ بقول حالی "شاعری سوسائٹی کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتی جتنا نقصان سوسائٹی شاعری کو پہنچاتی ہے۔" یہاں حالی کی مراد سوسائٹی سے یہی زوال پذیر اور خراب معاشرہ ہے۔

لکھنویت کا ایک اہم عنصر صنعت گیری ہے جس کے شوق میں لکھنؤ والوں نے رعایت لفظی اور ضلع جگت میں کمال پیدا کیا۔ لکھنؤ کے بعض اچھے شاعروں کو اس شوق نے بدنام کیا۔ امانت لکھنوی جن کی قادرالکلامی میں کلام نہیں اور انشا جن کے کمالات مسلم ہیں اسی بھنور میں پھنسے نظر آتے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس زمانے کے لکھنؤ کی معاشرت کا وہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کا نقشہ مولانا شرر نے اپنی کتاب "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" میں پیش کیا ہے۔ دبستان لکھنؤ کا صرف اردو شاعری (خصوصاً مثنوی، مرثیہ، منظوم ڈرامہ) پر ہی احسان نہیں ہے۔ بلکہ مسلم معاشرت پر بھی احسان ہے اور اس زمانے میں جو آداب لکھنؤ میں تھے اس کا جواب آج تک ہندوستان کا کوئی اور مقام پیش نہ کر سکا۔

★

غزلیں

نہال رضوی

جس کو غمِ انساں سے سروکار نہیں ہے
وہ کیا ہے اگر شیشے کی دیوار نہیں ہے

اس شخص کی ہے بات جو خود دار نہیں ہے
زنجیر ہے زنجیر میں جھنکار نہیں ہے

کیا اپنے کو پہچان گئے اہلِ محبت
کیوں بھیڑ قریبِ رسن و دار نہیں ہے

پتھر کی طرح ٹھوکروں میں عمر کٹے گی
اس شخص کی جو صاحبِ کردار نہیں ہے

"عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد"
اس شہر میں کیا کوئی قلم کار نہیں ہے

توہینِ شراب اس لیے فرماتے ہیں زاہد
تقلید میں ان کی کوئی مے خوار نہیں ہے

دنیا کا گلہ کیا ہو کہ عالم ہے یہ دل کا
میرا ہے مگر میرا طرف دار نہیں ہے

ملتی ہیں ہمیں کیف و اثر سے وہی محروم
جن غزلوں میں ذکرِ لب و رخسار نہیں ہے

ماحول بدلنا کوئی مشکل نہیں لیکن
مائل بہ توجہ نگہِ یار نہیں ہے

تعریف نہال آج کے انساں کی کروں کیا
سب کچھ ہے مگر صاحبِ کردار نہیں ہے

شاداب لکھنوی

شرط ہے سننے کی ہر دردِ نہاں دہرائے گا
ایک آنسو عمر بھر کی داستاں دہرائے گا

اے مرے بربادِ دل۔ آ۔ مجھ کو حالِ غم سُنا
ایسی باتیں جا کے دیوانے کہاں دہرائے گا

چل رہی ہے سانس ابھی تک آئیے سن لیجیے
کس کو فرصت ہے جو میری داستاں دہرائے گا

اک سہارا ہے کہ محشر میں کہیں گے دردِ دل
جو وہاں دہرا نہ پایا وہ کہاں دہرائے گا

صاحبِ دل جو نہ ہو کیوں اس سے حالِ دل کہوں
جو نہ خود سمجھے گا وہ کیا داستاں دہرائے گا

چاہے جس رفتار سے چلیے مگر یہ سوچ کر
کارواں کا حال نقشِ کارواں دہرائے گا

روشنیٔ شمع، پروانے کا جلنا بزم میں
ایک ان کی ایک میری داستاں دہرائے گا

آدمی کیا ہے فرشتے سے نہ رازِ دل کہو
جو یہاں سن لے گا یہ سب کچھ وہاں دہرائے گا

ہم بھی کھو جائیں گے اک دن اہلِ ماضی کی طرح
اک زمانہ کس کی کس کی داستاں دہرائے گا

ان کو کیا معلوم اے شاداب کہ جو سیراب ہیں
تشنگی کا حال اک تشنہ دہاں دہرائے گا

ساحل احمد

اردو شاعری میں گاندھیائی تحریک

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد ہندستان میں ایک غیر ملکی حکومت پوری طرح مسلط ہو گئی۔ ہندستانیوں کا نہ صرف شیرازہ منتشر ہو گیا بلکہ آزادی کے حصول کے لیے جد و جہد کرنے والی وہ تمام قوتیں بے بس ہو گئیں جن کو منظم کرنے کے لیے کافی وقت اور جاں فشانی کی ضرورت تھی۔ سیاسی دقتوں اور سماجی پیچیدگیوں نے ہر خاص و عام میں احساس کمتری یاسیت اور جذبۂ محرومی پیدا کر دیا تھا۔ لیکن ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے قائم ہوتے ہی ہندستانیوں میں اپنے حقوق کے لیے جد و جہد کرنے کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔

گاندھی جی نے اپنی سیاسی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۸۹۳ء میں جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خلاف شروع کیا۔ ۱۸۹۴ء میں نٹال انڈین کانگریس کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۹۶ء میں ہندستان واپس ہونے کے بعد ۱۹۰۳ء میں انڈین اوپینین جاری کیا۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کی مخالفت اور بدیسی مال کے بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ لیا۔ اور یہ تحریک ۱۹۰۶ء میں "سلف گورنمنٹ" کے مطالبہ کے ساتھ پروان چڑھتی گئی۔ اور پھر انھوں نے ۱۲ مئی ۱۹۰۶ء میں "ہوم رول" کا بگل بجا دیا۔ اس تحریک نے اردو شاعری کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ گاندھی جی کی اس تحریک کو آگے بڑھانے میں نمایاں رول ادا کیا۔ اس ضمن میں چکبست لکھنوی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جنھوں نے "ہوم رول" کی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ:

یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا
دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

---

۱۰ جون ۱۹۰۸ء میں "ستیہ گرہ" کی اصطلاح رائج ہوئی اور گاندھی جی ٹرانسوال نہ چھوڑنے کے جرم میں دو ماہ کے لیے قید کر دیے گئے۔ رہائی کے بعد ہی دوبارہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو گرفتار کر لیے گئے۔ لیکن ان تمام پیش بندیوں کے باوجود تحریک دن بہ دن زور پکڑتی گئی۔ ہوم رول کی تحریک نے جو صور پھونکا تھا وہ کارگر ہو رہا تھا۔ ظفر علی خاں، اکبر الہ آبادی اور دوسرے شعراء نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے لوح و قلم کا سہارا لیا۔ اس ضمن میں اکبر کا "گاندھی نامہ" خصوصیت سے قابل ذکر ہے:

انقلاب آیا نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے
شاہ نامہ ہو چکا اب دور گاندھی نامہ ہے

"ہوم رول" کی تحریک نے ستیہ گرہ کی افادیت کو بڑھا دیا

تھا چنانچہ ۲۰ مئی ۱۹۱۵ء کو احمد آباد میں ستیہ گرہ آشرم قائم ہوا جو بعد میں سابرمتی کے نام سے مشہور رہوا۔ گاندھی جی نے اپنی اخلاقی قوت، سادگی اور رواداری سے ہندستانیوں میں اتحاد و اتفاق کا بیج بویا۔ اردو شعراء نے گاندھی جی کے اس جذبۂ صداقت، روحانی قوت کا اعتراف کیا ہے اور ان کی "تعلیم" کو فروغ دینے کے لئے بڑی موثر نظمیں کہی ہیں سلام مچھلی شہری کی نظم خصوصیت سے قابل ذکر ہے!

گاندھی کیا تھے۔

"بھارت ماں کے" سپنوں کا کومل پرتیک
ان کی بدولت جاگی۔ پہنچی منزل تک اپنی تحریک
گاندھی کیا تھے۔
بھوکی پیاسی دھرتی کے ذی ہوش فقیر
ان کی بدولت بے شک ٹوٹی اپنے پیروں کی زنجیر
گاندھی کیا تھے۔
خواب دلِ جمہور کا دل کش ردِّ عمل
"مادرِ ہند" کے ویران چہرے پر اک نورانی آنچل

سلام مچھلی شہری

گاندھی جی کی شخصیت میں فرشتے جیسی معصومیت اور دیوتا جیسی دیا برا جمان تھی۔ وہ سرتاپا حلم اور بامروت انسان تھے۔ انھوں نے اپنی شخصیت کو پریم، اہنسا اور عدم تشدد سے بنایا اور سنوارا تھا۔ آنند نرائن ملاؔ، رودشؔ صدیقی، ساغرؔ نظامی اور نثارؔ اٹاوی نے گاندھی جی کی شخصیت اور ان کے کردار و عمل کو اپنی نظموں میں انتہائی خلوص کے جذبہ کے ساتھ نظم کیا ہے:

تو معنئ انساں ہے تمثیل کی ہے تصویر
تو شرحِ محبت کی اخوت کی ہے تصویر
تو قوم کی تدبیر ہے تو ملک کی تقدیر
امید وطن کی تری ہمت پہ ہے تعمیر

آنند نرائن ملاؔ

حرفِ محبت جادو تیرا، تیری شکتی پیت کی ریت
تو نے بسائی پیار کی بستی نفرت کے ویرانوں میں
عشق و وفا کی آگ میں جل کر تو نے پایا حسن کا بھید
شمعِ ازل کا پروانہ، خود شمع بنا پروانوں میں

رودشؔ صدیقی

جو بے زباں ہے انھیں جذبۂ کلام دیا
جو تشنہ لب تھے انھیں سرخوشی کا جام دیا
خود آگہی و خودی کا نیا پیام دیا
دلِ خواص کو تو نے غمِ عوام دیا

ساغرؔ نظامی

اک کھادی کی ردائے صاف میں لپٹی ہوئی
سکراتی مصلحانہ عزم سے پیغمبری
اک صداقت کی سپر، تیغِ سیاست کا جواب
اک محبت کی ادا، رشکِ نظامِ عسکری
"واردھا" کی سمت سے آئی صدائے انقلاب
کھل گئی انسان پر افرنگ کی بازی گری

نثارؔ اٹاوی

گاندھی جی کے عزم و ایثار اور ان کی شخصیت کی پاکیزگی کو نمایاں کر کے اور وطن پرستی اور قومی جذبہ کو فروغ دینے میں اردو شاعری نے نمایاں حصہ لیا ہے۔

جنگِ آزادی کے خاتمے اور روس کے سرخ انقلاب نے ہندستان کی تحریک آزادی پر زبردست اثر ڈالا۔ ہندستانی مزدور بیدار ہو چکا تھا۔ سارے ملک میں بے چینی پھیل رہی تھی۔ انگریزوں نے ہندستانیوں سے کیے تمام وعدے فراموش کر دیے تھے۔ سیاسی جد و جہد پر امن اور آئینی طریقہ پر روز افزوں آگے بڑھ رہی تھی۔ ملک بھر میں جبریہ فوجی بھرتی کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ گاندھی جی نے ان کے مسائل سلجھانے اور ان کے کاز کو آگے بڑھانے میں حصہ لیا اور ان مقاصد کی حصول یابی

کے لیے برت رکھا۔ احمد آباد کے ٹیکسٹائل مزدوروں کے مسئلے میں، صوبہ بمبئی کے کیرا ضلع کے قحط کے معاملے میں اور کاشتکاروں کے لگان کو معاف کرانے میں جو کوششیں کیں وہ نہ صرف مزدوروں، کسانوں اور کاشتکاروں تک محدود رہیں بلکہ سماج کے دوسرے کچلے ہوئے طبقوں کے لیے بھی مفید ثابت ہوئیں۔

اسی زمانے میں "رولٹ بل" شائع ہوا۔ جس کے رو سے حکومت کو مقدمہ چلانے اور گرفتاریاں کرنے کا اختیار دیا گیا تھا اور قانونی ضابطے کی بری طرح دھجیاں اڑائی گئی تھیں۔ گاندھی جی نے ہندوستانیوں کو ۲۸ فروری ۱۹۱۹ء میں "رولٹ بل" کے خلاف منظم کیا۔ اس بل کے خلاف اعتدال پسند جماعتیں بھی شریک ہو گئیں۔ اس طرح ملک کے گوشے گوشے میں اس بل کی مخالفت کی گئی اور گاندھی جی نے ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو آل انڈیا ستیہ گرہ تحریک کا افتتاح کیا۔ ابھی تحریک جاری ہی تھی کہ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ کے سانحہ سے تمام قوم جنرل ڈائر کی گولیوں کا جواب دینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گاندھی جی کی پرعزم قیادت نے ہندوستانیوں کو زندہ رہنے کا سلیقہ اور ایک ساتھ مل کر رہنے کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا احساس دلا دیا تھا۔ اعظم حسین اور زیب بریلوی کی نظمیں جذبۂ وطن پرستی، رواداری اور ایثار کا درس دیتی ہیں۔

جمہور نے سیکھی خودداری، ذلت کا وطیرہ چھوڑ دیا
آزادیٔ انساں کی جانب احساس کا دھارا موڑ دیا

اعظم حسین

جذبۂ ایثار نے وہ حسنِ ظن پیدا کیے
فطرتِ خوددار نے دار و رسن پیدا کیے
تم نے وہ وہ مردِ میدانِ وطن پیدا کیے
جن کی قربانی نے جنگل میں چمن پیدا کیے

تم نے ہر ایثار سے ایثار سکھلایا ہمیں
شانتی کے منتر کا شہ کار دکھلایا ہمیں

زیب بریلوی

عوام کی بے چینی اور سیاسی تحریک میں روز ایک نہ ایک ابال آرہا تھا یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۲۰ء میں منعقدہ ناگپور کانگریس کے اجلاس میں مکمل آزادی کا اعلان کیا گیا۔ اس اعلان کے بعد ترک موالات کی تحریک شروع کی گئی جس نے حکومت کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ عدالتوں اور کونسلوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ خطابات اور اعزازات واپس کیے گئے۔ لوگوں میں جذبۂ خودداری، قوم پرستی، ایثار، صبر و ضبط اور جد و جہد کی امنگیں پیدا ہوئیں۔ تمام قوم ایک ساتھ ہو کر گاندھی جی کے چلائے مشن کو آگے بڑھانے میں مدد دے رہی تھی۔ اس طرح گاندھی جی کی قیادت میں ہندوستان کے چپے چپے پر سیاسی بیداری پھیل چکی تھی۔ مزدوروں کی اجرت کا مسئلہ، قحط سالی، بیماری، حکومت کا جبر و تشدد، مزدوروں اور سرمایہ داروں کی کشمکش وغیرہ جیسے مسئلوں نے پورے ملک کو اخوت کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔ اردو شاعری آزادی کی تحریک، ہندو مسلم اتحاد، اخوت، ہمدردی اور وطن پرستی کے جذبات کو مہمیز کرنے میں نمایاں رول ادا کر رہی تھی۔ چنانچہ ظفر علی خاں کے کلام میں گاندھی جی کی تمام تحریکوں کی روشنی بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔

گاندھی جی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا
باطل سے حق کو دست و گریبان کر دیا
ہندوستان میں ایک نئی روح پھونک کر
آزادیٔ حیات کا سامان کر دیا
دشمن اور دوست میں ہونے لگی تمیز
کتنا بڑا یہ ملک پہ احسان کر دیا
دے کر وطن کو ترک موالات کا سبق
ملت کی مشکلات کو آسان کر دیا

گاندھی جی کی اخلاقی سماجی، اور سیاسی تحریک نے ملک میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ ہر شخص کے دل میں جذبۂ وطن پرستی کی خوشبو رچ بس گئی تھی۔ ہمت و جرأت ولولہ اور عزم و ارادے سے ساری قوم مسلح ہو رہی تھی۔

پھیلتی جاتی ہے گاندھی کی لگائی ہوئی آگ
کوئی اردن سے یہ کہہ دو کہ نہ اس آگ سے کھیل

ظفر علی خاں

اگست سنہ ۱۹۲۱ء میں بدیشی کپڑوں کے مکمل بائی کاٹ کی مہم کی قیادت کی اور اس کا آغاز عظیم تر ممبئی سے ہوا پھر تو ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی بدیسی کپڑوں کے جلانے کا سلسلہ چل پڑا۔ اکبر الٰہ آبادی نے تحریک سودیشی کے سلسلے میں کہا کہ

داخل مری دانست میں یہ کام ہے پُن میں
پہنچائے گا قوت شجر ملک کی بن میں
تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر
کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کی دُھن میں

فروری سنہ ۱۹۲۲ء میں باردولی (گجرات) میں ستیہ گرہ کی مہم شروع کرنے کے لیے انتہائی جرأت و ہمت کا مظاہرہ کیا۔ گاندھی جی دنیا کے وہ پہلے انقلابی تھے جنھوں نے سچائی، اہنسا اور انسانیت کو انقلابی نشان بنا کر جنگ آزادی کے لیے ایک نیا زاویۂ فکر اور نیا دستور العمل تیار کیا۔ وہ ستیہ گرہ کے قائل تھے۔ بقول کشن پرشاد کول "انھوں نے ستیہ گرہ کو ایک بہت بڑی روحانی طاقت کے ذریعہ پرورش کر کے مضبوط ہاتھوں کا آلۂ کار بنایا۔"

گاندھی جی نے اپنے اس آزمودہ ہتھیار کو جنوبی افریقہ میں اور ہندستان کے چمپارن، کیرا، باردولی وغیرہ میں آزمانے کے بعد ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی تحریک کو اسی ہتھیار کے توسط سے تقویت بخشی۔ اس طرح اس کا سلسلہ سنہ ۱۹۳۰ء کے ڈانڈی مارچ سے جا ملتا ہے جو ملک کی دوسری بڑی سول نافرمانی تحریک تھی۔ اُن کے اس انوکھے ہتھیار اور اس ستیہ گرہ کے اصولوں اور نظریات کی گونج اردو شاعری میں جا بجا سنائی دیتی ہے۔

لشکر گاندھی کو ہتھیاروں کی کچھ حاجت نہیں
ہاں مگر بے انتہا صبر و قناعت چاہیے

اکبر الٰہ آبادی

عدم تشدد کے ذریعہ اپنی تحریک کو روز افزوں ترقی دیتے رہے۔ عدم تشدد کا فلسفہ گاندھی جی کا سب سے موثر ہتھیار تھا۔ انھوں نے ہندستانیوں کو اس کے فلسفہ اور اس کی قوتوں سے آگاہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں انھیں وہ مثالی کامیابی حاصل ہوئی جو اب تک دنیا نے نہیں سنی تھی۔ ہندستانی قوم اس کی قوت اور صلاحیتوں کو پرکھنے کے بعد اتنی زیادہ نڈر اور بے باک ہو گئی تھی کہ برطانوی ڈپلومیسی کو شکست کھانی پڑی۔ انھوں نے دنیا پر اپنے اصولوں سے واضح کر دیا تھا کہ "انسانیت ایک ایسی قوت ہے جسے ڈپلومیسی سے اور ظلم سے کچلا نہیں جا سکتا۔ انھوں نے بارہا عدم تشدد کے فلسفہ کو اس طرح واضح کیا ہے کہ وہی شخص "تشدد" کو ملک قوم اور انسانیت کے لیے مذموم فعل قرار دے سکتا ہے جو "خدا" پرست ہے اور خدا پر کامل یقین رکھتا ہے اور یہ کہنا کہ "اہنسا" بزدلی کے مترادف ہے صحیح نہیں بلکہ خطرات میں کود پڑنے کا نام ہی اہنسا ہے۔"

اردو شاعری میں "عدم تشدد" کے اس فلسفہ کو اردو شعراء نے نہ صرف رائج کیا ہے بلکہ قوم کو اس کی اہمیت اور افادیت سے واقف کرایا ہے۔ آنند نرائن ملاؔ، جمیلؔ مظہری سیمابؔ اکبر آبادی، جاں نثار اخترؔ، وامقؔ جونپوری، شمیمؔ کرہانی وغیرہ نے عدم تشدد کے فلسفہ اور اس کے نظریات کو بڑے موثر پیرائے میں نظم کیا ہے۔

ہنسا کو اہنسا کا اپنا پیغام سنانے آیا تھا
نفرت کی عادی دنیا میں ایک پریم سندیسہ لایا تھا

——— آنند نرائن ملا

سنا کے جس نے اہنسا کو جنگ کا آلا
ملوکیت کا مزاج کہن بدل ڈالا

——— جمیل مظہری

گاندھی جی کی شخصیت ہی عدم تشدد، اخلاق و مروت، سچائی، دوستی، رواداری اور بھائی چارگی سے تعمیر ہوئی تھی۔ انھیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی بے پناہ خواہش تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان کی انسان دوستی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اردو شاعری میں ان کی تعلیمات اور پاکیزہ شخصیت کا نور داخل کرنے والوں میں اکبر، جوش، چکبست، سیماب، سراج، مخدوم، سرور، مجاز اور ملا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شیخ اور برہمن میں بڑھایا وہ اتحاد
گویا انھیں دو قالب و یک جان کر دیا

——— ظفر علی خاں

کائنات حسن صورت تیری سیرت پر نثار
جان و دل، تیری اخوت اور صداقت پر نثار
آب گنگا کا تقدس، پاک طینت پر نثار
ہے ہمالہ کی بلندی، تیری عظمت پر نثار
ایک لنگی زیب جسم اور ایک چپل پاؤں میں
دھوپ میں بھی یوں ہی دیکھا تجھ کو جیوں ہی چھاؤں میں

——— سراج لکھنوی

ہمالہ کی پری اور طور کا اک جلوۂ رعنا
جو اس کی اک نظر زمزم تو اس کی اک نظر گنگا

——— سیماب اکبر آبادی

تو امین رحمت آئینہ ایثار تھا
صحت افکار انساں کے لیے بیمار تھا
برہمن کا چارہ فرما شیخ کا غم خوار تھا
تو رواداری کا دیوتا، امن کا اوتار تھا

اَلسّلام اے کعبۂ کاشی کے درباں اَلسّلام
اَلسّلام اے ہند کے شاہ شہیداں اَلسّلام

——— جوش ملیح آبادی

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

——— مجاز

ساتھیو ہند کا راہبر اٹھ گیا
آدمیت کا پیغام بر اٹھ گیا

——— جاں نثار اختر

گاندھی جی کو ۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو سابرمتی سے گرفتار کر کے چھ برس کی سزا دی گئی تو عوام غصہ سے پاگل ہو اٹھے جس کے نتیجہ میں جگہ جگہ احتجاجی جلسے منعقد کیے گئے اور ملک میں عام ہڑتال ہوئی۔ اس رہبر انسانیت کے خلاف انگریزوں کی بزدلانہ حرکت پر عوام میں ایک اضطراب پیدا کر دیا۔ بے چینی کو دیکھتے ہوئے حکومت نے دو سال بعد ہی انھیں رہا ۱۹۱۹ سے ۱۹۲۲ تک کا یہ چار سال کا وقفہ بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ ہندو مسلم اتحاد، چرخہ، اہنسا، سودیشی، گرام سدھار، اور ہریجنوں کی فلاح کے تعمیری پروگرام تھے جس کے لیے انھیں بڑے صبر آزما حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ مختلف شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات نے انھیں مضمحل کر دیا تھا۔ جس کو فرو کرنے کے لیے ۱۷ اگست ۱۹۲۴ء کو دلی پہنچ کر امن و امان قائم کرنے کی کوششیں کیں۔ آخر میں انھوں نے ۱۷ ستمبر ۱۹۲۴ء سے ۲۱ دن کا برت شروع کیا جس کا خاطر خواہ اثر پڑا۔ "انجمن اتحاد" کی بنیاد ڈالی گئی۔ ان تمام واقعات سے انھیں گہرا صدمہ پہنچا تھا لیکن اپنی عمر کے آخری لمحے تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق قائم کرنے کی پُرخلوص کوشش کرتے رہے۔ اس کے علاوہ

انھوں نے مذہب اور سیاست کو ایک سطح پر رکھتے ہوئے فرقہ بندی اور تعصب کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ "اگر ہر آدمی اپنے اپنے مذہب کے اصولوں پہ صدق نیت اور خلوص قلب سے عمل کرے تو مجھے وشواس ہے کہ دنیا میں بھی اختلافات ختم ہو جائیں گے اور نہ تو مذہبی، سیاسی لڑائیاں ہی ہوں گی۔ جھگڑے اور باہمی تفرقہ و فساد محض اس لیے ہے کہ مذاہب کو ماننے والے ان کی بنیادی سچائیوں پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔"

مہاتما گاندھی کی ان تعلیمات اور تصورات کو عام کرنے میں اردو شاعری پیش پیش رہی ہے۔ چنانچہ سلام مچھلی شہری اور ضیاء فتح آبادی نغمہ طراز ہیں:

آپ نے ہم کو بتایا تھا کہ یہ مسجد ہند
نور و نکہت کی علامت ہے، سجاؤ اس کو
آپ نے ہم سے کہا تھا کہ وطن کا ہر پھول
روح گیتا ہے کلیجے سے لگاؤ اس کو

——— سلام مچھلی شہری

میں ہندو ہوں
تم ہو مسلماں
میں گجراتی
تم مدراسی
یہ باتیں ساری بے معنی
خوش فہمی، کوتہ نظری کی
آؤ بھلا دیں ان باتوں کو
آؤ مٹا دیں
میں اور میرا کا احساس
ابھریں تو مل کر ابھریں ہم
ڈوبیں تو مل کر ڈوبیں ہم

——— ضیاء فتح آبادی

گاندھی جی نے عدم تشدد اور انسانیت کے لیے جو دستور العمل تیار کیا تھا وہ نہ صرف ہندستانیوں کے لیے بلکہ اقوام عالم کے لیے مژدۂ حیات تھا۔ ساتھ ہی انھوں نے "ہریجنوں" کی فلاح و بہبود کے لیے بھی بہت کام کیے۔ وہ چھوت چھات کے زبردست دشمن تھے اور اپنے اس نظریات کی اشاعت کے لیے ۱۱ فروری ۱۹۳۳ء کو ہفتہ وار اخبار ہریجن جاری کیا۔ اردو شاعری نے گاندھی جی کے ان اعلےٰ تصورات و نظریات کو بھی پھیلایا۔ اس سلسلے میں تلوک چند محروم کی نظم "چھوت چھات" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ محروم کے علاوہ رفعت سروش نے بھی ان کے مسلک و نظریات کو بڑے موثر انداز میں نظم کیا ہے:

یہ چھوت چھات کیسی تو نے روا رکھی ہے
ناراض تجھ سے تیرا خلاق زندگی ہے
پاکیزگی پہ اپنی نازاں جو ابلہی ہے
جو پاک ذات تجھ میں ہے ان میں بھی وہی ہے
ہرگز تجھے نہ یوں تو عزت نصیب ہوگی

——— تلوک چند محروم

ذات پات کے جھگڑے قصے
آزادی کے دشمن ہیں
اور اونچ نیچ پھیلانے والے
آزادی کے دشمن ہیں

——— رفعت سروش

اسی طرح گاندھی جی ۲۵ دسمبر ۱۹۴۷ء تک اپنے اس مشن کو کامیاب بنانے میں تن من سے جٹے رہے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۸ء تک کے وقفہ میں آتما کی شدھی کے لیے برت رکھا، واردھا تعلیمی کانفرنس کا انعقاد کیا، برطانوی حکومت سے بھارت چھوڑو کا نعرہ دیا، چھوت چھات کے خلاف جنوبی بھارت کا دورہ کیا۔ سانحہ بنگال کے خلاف حکومت کو وارننگ دی، بہار کے فسادات کی مذمت کی۔ فرقہ وارانہ میل ملاپ کے لیے جناح کے ساتھ مشترکہ اپیل جاری کی، جد و جہد کی،

قربانیاں دیں، جیل کی سختیاں جھیلیں وہ سب اُن کے اعلیٰ کردار اور ذہنی پختگی کا ثبوت مہیا کرتی ہیں۔

انھیں اپنے آخری وقت میں ہندوستان کی تقسیم کا صدمہ بھی اٹھانا پڑا۔ اس تقسیم کے بعد فسادات، لوٹ مار، غارت گری، تباہی و بربادی کے وہ دل خراش منظر سامنے آتے ہیں جو ہمیشہ خون کے آنسو رلاتے رہیں گے۔ گاندھی جی نے تقسیم کے بعد دلی میں مسلمانوں کی زندگی بچانے اور انھیں عزت کا مقام دلانے کے لیے بڑی کوششیں کیں اور ماحول کے اس تناؤ کو دور کرنے کے لیے برت رکھا وہ ان کی انسانیت اور انسان دوستی، محبت، سچائی اور اہنسا کی جیتی جاگتی داستان ہے۔

گاندھی جی کی ابتدائی زندگی سے لے کر شہادت تک جو صدہا واقعات و سانحات ہیں، وہ ان کی جد و جہد، عمل، دوستی، بھائی چارگی اور شرافت کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

نرم گفتار سے فولاد کے دل موم کیے
کھینچ لی ابرِ سیہ سے کرن آزادی کی
چھین لی مشعلِ رنگین سحر ظلمت سے
خواب کی مانگ میں تعبیر کی افشاں بھر دی

شمیم کرہانی

تیرا لوہا سب نے مانا اُٹھ گئی قیدِ گراں
اب تو زنجیرِ غلامی اُڑ گئی بن کر دھواں
گود میں تیری پلی آزادیٔ ہندوستاں
رفتہ رفتہ اک حقیقت بن گئی یہ داستاں

تیری ہی ٹکر سے تو زنداں میں در پیدا ہوا
مسکراہٹ سے تری نورِ سحر پیدا ہوا

سراج لکھنوی

گاندھی جی ایسے فرشتہ صفت انسان کی شہادت نے پوری قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا کہ آسانی سے بھلا دیا جاتا بلکہ اس واقعہ نے پوری قوم کو اقوامِ عالم کی نظروں میں ذلیل و رسوا کر دیا تھا۔ اس دردناک سانحہ کو اردو شاعروں نے بڑے بھرپور اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ گاندھی جی کی شہادت پر اردو میں جتنی نظمیں کہی گئی ہیں شاید وہ کسی اور زبان میں نہ کہی گئی ہوں گی۔ اس سلسلے کی نظموں میں پنڈت بال مکند عرش ملسیانی صاحب کی نظم "شہیدِ اعظم" خاص طور سے قابلِ ذکر ہے:

بپا ہند میں تھرائی مچا کہرام عالم میں
کہا جس دم جواہر لال نے باپو نہیں ہم میں
فلک کا نپا ستاروں کی ضیاء میں بھی کمی آئی
زمانہ رو اٹھا دنیا کی آنکھوں میں نمی آئی
کمر ٹوٹی وطن والوں کی اہلِ دل کے دل ٹوٹے
ہوئے افسردہ باغِ نیکی و خوبی کے گُل بوٹے
ہمیں کیا ہو گیا تھا ہائے یہ کیا ٹھان لی ہم نے
خلوص و آشتی کے دیوتا کی جان لی ہم نے
یہ اچھی قوم ہے جو قوم کے سردار کو مارے
یہ اچھا دھرم ہے جو دھرم کے اوتار کو مارے
نگاہِ اہلِ عالم میں ملامت کا ہدف ہم ہیں
ہمیں نے قتل باپو کو کیا ہے ناخلف ہم ہیں
ہمیں ہیں مسلکِ محسن شناسی چھوڑنے والے
کنارے پر پہنچتے ہی سفینہ توڑنے والے
امیدِ قوم کی بنیاد تھی جس ایک بندے پر
غضب ہے گولیاں برسائیں ہم اس نیک بندے پر
اکیلی جان اس کی بوجھ دنیا بھر کا سہتی تھی
مگر جو بات کہتا تھا وہ آخر ہو کے رہتی تھی
ہزاروں رحمتیں راہِ خدا میں مرنے والے پر
حسین ابنِ علی کی یاد تازہ کرنے والے پر

عرش ملسیانی

آخر میں آنند نرائن ملا کی وہ نظم بھی ملاحظہ فرمائیں جب میں انھوں نے گاندھی جی کے چلا سے ہوئے مشن کو آگے

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

اخگر مشتاق رحیم آبادی

فکر و فن

سرورِ غم ہی سے ہم گرم رکھتے ہیں لہو اپنا
جدا ہے سب سے معیارِ مذاقِ آرزو اپنا

ملامت ہائے یارانِ ستم پیشہ کا کیا شکوہ
کہ ان کے ظرف سے اونچا ہے ظرفِ آبرو اپنا

مرے ساقی کا یہ بھی کوئی حُسنِ دلبری ہوگا
جو اک مدت سے زیبِ طاقِ نسیاں ہے سبُو اپنا

نہ وہ ہم ہیں، نہ وہ دل ہے نہ وہ دل کی تمنائیں
تو پھر کیوں کر کہیں حالِ دلِ بے آرزو اپنا

نہ پوچھو جب سے دستورِ دیارِ شوق دیکھا ہے
بھری محفل ہے خاموشی ہی طرزِ گفتگو اپنا

ابھی تک تو بڑے دعوے ہیں ضبطِ شوق کے، لیکن
خدا معلوم کیا عالم ہو ان کے روبرو اپنا

بس اب رہنے بھی دے، اے آہِ درد آلود رہنے دے
کہ اب خود لائقِ چارہ گری ہے چارہ جو اپنا

اگر اخگر یہی ہے احتیاطِ شورشِ پنہاں
تو پھر معلوم حشرِ شوقِ عرضِ آرزو اپنا

محمد اسحاق صدیقی

آگ کا جانور

سمندر

جاری تھی اسد داغِ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ جاگیرِ "سمندر" نہ ہوا تھا

(غالبؔ)

اس شعر میں جاگیرِ سمندر، سے مراد قدیم آتشکدہ ہے[1]۔ تلمیحاتِ غالبؔ مولفہ محمود نیازی میں سمندر کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے!

"سمندر لفظ سام بمعنی آگ و اندر کلمۂ ظرف سے مرکب ہے۔ سمندر آگ کا ایک جانور ہے جو قد میں چوہے کے برابر اور صورت میں گرگٹ کی مانند ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ جہاں ایک ہزار سال تک متواتر آگ جلتی رہے تو اس میں سمندر پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ آگ میں ہی رہتے ہیں۔ آگ سے باہر آ کر مر جاتے ہیں...... ایران کے آتشکدوں میں اسلام سے قبل یہ جانور موجود تھے۔ لوگ اس کی کھال کی ٹوپی بناتے تھے۔ جب وہ میلی ہو جاتی تھی تو آگ میں اسے ڈال کر صاف کر لیتے تھے کیونکہ اس کی کھال پر آگ کا اثر نہیں ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ عنقا کی مانند سمندر بھی محض افسانوی جانور ہے[1]۔"

محمود نیازی صاحب کا یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا ہے کہ "ایران کے آتشکدوں میں اسلام سے قبل یہ جانور موجود تھے"۔ اس سے تو یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ فتوحاتِ اسلام کے بعد جب ایرانی آتشکدے ٹھنڈے پڑ گئے تو ان کے ساتھ قدرت کی یہ نادر مخلوق بھی



سمندر ــــ خیالی

ناپید ہو گئی حالانکہ ان حیوانات کا ذہنِ انسانی کے باہر کہیں وجود نہ تھا۔ بہرحال ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ مؤلف کے بیان کا اصل ماخذ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو لغات ہی ہو سکتا ہے۔ اپنے خیال کی تائید میں چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

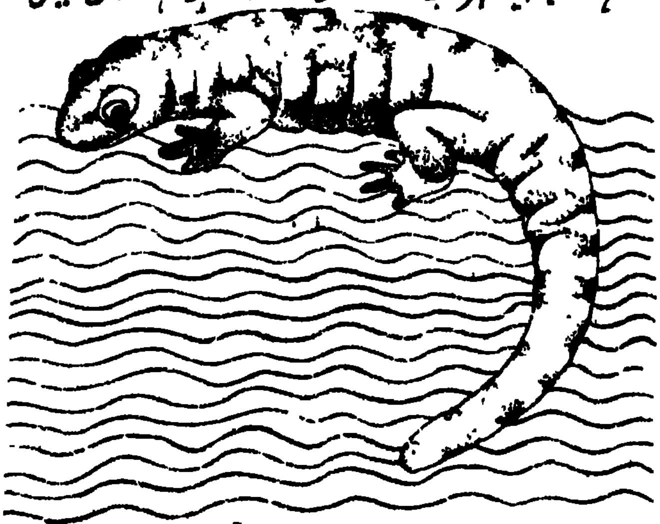
"سمندر.... ایک آتشی چوہے کا نام جو آگ کے اندر پیدا ہوتا اور امیر لوگ اُس کی کھال کی ٹوپیاں بناتے ہیں...... جب اس کی ٹوپی میلی ہو جاتی ہے تو آگ میں ڈالنے سے اُس کا تمام میل کچیل جل کر صاف نکل آتی ہے اور آگ اس میں مطلق اثر نہیں کرتی۔ اِس کی صورت گرگٹ سے بہت مشابہ ہے۔ آگ کے باہر جی نہیں سکتا.... یہ لفظ سام بمعنی آتش و اندر کلمۂ ظرف سے مرکب ہے۔" (فرہنگِ آصفیہ[2] جلد سوم صفحہ ۹۸)

دوسری لغات میں بھی کم و بیش یہی باتیں درج ہیں۔ تہذیب اللغات میں یہ اضافہ ہے:

---

[1] "تلمیحاتِ غالبؔ" (غالب اکیڈمی، نظام الدین، نئی دہلی) جون ۱۹۷۲ء صفحہ ۹۶
یعنقا افسانوی جانور نہ تھا اس کی حقیقت میں کسی دوسرے مضمون میں بیان کروں گا۔ [2] مؤلفہ مولوی سید احمد دہلوی رفاہِ عام پریس، لاہور، مئی ۱۹۰۸ء

"سمندر بر وزن قلندر، قاموس میں سمندر کو عربی قرار دے کے یہ معنی حیوان لکھا ہے، جس کو آگ نہیں جلاتی ...... عام طور سے یہ بھی مشہور ہے کہ جب ایک ہزار برس تک مسلسل آگ روشن رہتی ہے تو اس میں



سمندر ـــــ واقعی

گھوڑے کی شکل کا ایک جانور پیدا ہوتا ہے، جس کو سمندر کہتے ہیں"

(مہذب اللغات[1] جلد ششم صفحات ٢٦٦-٦٧)

• غالب کے علاوہ دوسرے شاعروں نے بھی اپنے اشعار میں سمندر کا ذکر کیا ہے مثلاً ؎

رزق دونوں کو پہنچاتا ہے وہ روزی رساں
آب میں رہتی ہے ماہی اور سمندر آگ میں

(نصیر)

چلا بے خوف یوں پانی میں بندر
چلے جس طرح آتش میں سمندر

(خوشتر)

سمندر کا تصور کتنا پرانا ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ یونانی فلسفی ارسطو (٣٢٢-٣٨٤ قبل مسیح) نے لکھا ہے کہ "سمندر نہ صرف آگ میں چلتا ہے بلکہ اس کے چلنے سے آگ بجھ جاتی ہے"

حکیم جالینوس (١٣٠-٢٠٠ عیسوی) نے اس خیال کی تردید کی ہے تاہم صدیوں تک یہ خیال برقرار رہا۔ نہ صرف مشرقی ممالک کے بلکہ یورپ کے لوگ بھی اس کے وجود پر یقین رکھتے تھے چنانچہ [illegible] میں ایک انگریز بشپ نے لکھا تھا کہ سمندر آگ میں رہتا ہے، جس پر بعد کے لوگوں نے اتنا اور اضافہ کر دیا کہ وہ آگ کھاتا بھی ہے۔

دراصل جس جانور کو فارسی میں سمندر کہتے ہیں اسے انگریزی میں سلامینڈر (SALAMANDER) کہا جاتا ہے، چنانچہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کی انگلش اردو ڈکشنری میں اس لفظ کے یہ معنی درج ہیں (١) سمندر (آگ کا کیڑا) (٢) بڑا بہادر سپاہی (جو گولہ باری کی پروا نہ کرے) (٣) آگ کا بھوت۔ اس انگریزی لفظ کی اصل یونانی سلامینڈر (SALAMANDER) ہے جسے بعض لغت نویسوں نے مشرقی الاصل لکھا ہے[2]۔ یہ خیال کہ سمندر آگ میں رہتا ہے، قرون وسطیٰ کی یادگار ہے اور سراسر غلط ہے۔ دراصل سمندر یا سلامینڈر چھپکلی سے مشابہ ایک بے ضرر جل بھومی جانور (AMPHIBIAN) ہے یعنی خشکی اور پانی دونوں میں رہتا ہے۔ اس کی ٢٥ قسمیں ہوتی ہیں جو زیادہ تر کرۂ زمین کے شمالی نصف حصے میں پائی جاتی ہیں۔ یورپ اور شمالی افریقہ میں عام طور پر یہ پایا جاتا ہے۔ البتہ ایشیائے کوچک، ہندستان، ملایا، آسٹریلیا اور بحر پیسفک کے جزیروں میں یہ نہیں ہوتا۔ دوسرے جل بھومی جانوروں کی طرح سمندر کو بھی کافی نمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ گرمی بالکل ہی نہیں برداشت کر سکتا عموماً دن میں زمین کے اندر چھپا رہتا ہے اور رات کو نکلتا ہے۔

یہ خیال کہ "سمندر" آگ میں رہتا ہے کسی عجائب پرست انسان کے دماغ کی اپج تھی یا کسی احمق بنانے والے تاجر کی، جس کی بنا پر بعض لوگوں نے خوب دولت کمائی۔ ظاہر ہے کہ ہزار سال پھرائے آتش کدے سے سمندر حاصل کرنا کتنا مشکل کام تھا۔

بقیہ صفحہ ٢٢ پر

---

[1] مؤلفہ حضرت مہذب لکھنوی د سرفراز قومی پریس، لکھنؤ ١٩٦٩ء

[2] CHAMBERS TWENTIH CENTUARY DICTIONARY

مومن خاں شوق

مہاتما گاندھی

وہ ایسا ابر تھا

صحرا میں کُنج کُنج گلاب

وہ ایسا ذہن کہ

دانش بھی سرنگوں ٹھہرے

اُصول ایسے کہ

دنیا مثال دیتی ہے

شبِ الم میں

ستاروں کی جگمگاتی برات

فنا کے دشت میں، نفرت کے خارزاروں میں

سحر کی چاپ، محبت کی روشنی کا نزول

وہ کون تھا؛

وہ فرشتہ خصال انساں تھا۔

وفا کرتپوری

میرا وطن

جس کی خاطر سر کٹا دیتا ہے ہر پیر و جواں
ذی نظر کہتے ہیں جس کو آج بھی فخرِ زماں
نانک و چشتی نے سمجھا جس کو رشکِ گلستاں
خطۂ فردوس کہتا ہے جسے سارا جہاں
گفتگو جس کی ہمالہ سے کرے ہے آسماں
ہے وہی اے دوستو میرا وطن ہندوستاں

جس کو ہر اک دور میں حاصل رہیں سرمستیاں
لہلہائیں جس کی دھرتی پر سنہری کھیتیاں
مختلف دھرموں سے ہیں آباد جس کی بستیاں
پائی ہے جس کے سپوتوں نے حیاتِ جاوداں
بغض و نفرت کا نہیں جس میں کہیں نام و نشاں
ہے وہی اے دوستو میرا وطن ہندوستاں

غنچہ و گل کو دیا جس نے شعورِ بانکپن
دور ہے جس کی حدوں سے سایۂ رنج و محن
جس نے دنیا کو سکھایا ہے محبت کا چلن
بہہ رہی ہیں جس کی ارضِ پاک پر گنگ و جمن
جس کی شادابی پہ حیراں ہے نگاہِ کہکشاں
ہے وہی اے دوستو میرا وطن ہندوستاں

اہلِ دل کرتے ہیں جس کو آج بھی جھک کر سلام
جوہر و آزاد تھے جس کی سیاست کے امام
جس کے گاندھی کا کرے ہے ساری دنیا احترام
آج بھی تاریخ لیتی ہے ادب سے جس کا نام
ہے ازل سے جس کا نعرہ نعرۂ امن و اماں
ہے وہی اے دوستو میرا وطن ہندوستاں

جس کے ہر گوشہ کو غالبؔ نے کہا صد آفریں
مومنؔ و اقبالؔ نے سمجھا جسے زہرہ جبیں
اصغرؔ و سیمابؔ کہتے تھے جسے صنفِ حسیں
اور وفاؔ کہتا ہے جس کو خطۂ خلدِ بریں
ذرہ ذرہ پر ہے جس کے چاند تاروں کا گماں
ہے وہی اے دوستو میرا وطن ہندوستاں

ناظمِ انصاری

مرزا غالبؔ کی شخصیت
ان کے خطوط کے آئینے میں

غالبؔ کے خطوط کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس میں لب کشائی کی گنجائش مشکل ہی سے نکل سکتی ہے تاہم ان کے خطوط میں جو حیات بخش تازگی اور ندرت ہے، بات کہنے کا جو اچھوتا اور انوکھا انداز ہے وہ ہر مرتبہ ایک نئے عالم کی سیر کراتا ہے۔

نیا ہے لیجئے جب نام اس کا بڑی وسعت ہے میری داستاں میں

خطوط میں غالبؔ کی رنگا رنگ اور تہہ دار شخصیت کا اظہار جتنے مختلف زاویوں سے ہوا ہے وہ ان کی شاعری سے بھی نہیں ہوا۔ شاعری پر یوں بھی "تو حنا بندی ومن معنی رنگیں بستم" کا غبار چھایا رہتا ہے۔ شاعر کی حیثیت سے غالبؔ اپنے کو سعدیؔ و حافظؔ اور نظیریؔ و صائبؔ سے کمتر نہ سمجھتے تھے اسی لیے اشعار میں وہ خودداری پندار اور بلند حوصلگی کی رفعتوں کو چھوتے نظر آتے ہیں ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزباں سخن نہ کنیم
دگر خلیل شود میہماں بگردانیم

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یہ آواز شاعر غالبؔ کی ہے مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی نہیں کیونکہ ان کو ستائش کی تمنا بھی تھی اور صلے کی پروا بھی۔ میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے ہیں۔ "مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غم زدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک دستنبو نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی آج پانچواں دن ہے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بہ سبیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات۔ کبھی خدا تم کو یہاں لائے گا تو اس کی "زیارت" کرنا۔ یہ بھی توقع پڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آجائے"۔

نصیر الدین حیدر فرمانروائے اودھ کی خدمت میں منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے توسط سے قصیدہ پیش کرتے ہیں۔ وہاں سے پانچ ہزار روپیہ بہ طریق صلہ ملنے کا حکم ہوتا ہے جس میں تین ہزار روشن الدولہ ہضم کر جاتے ہیں بقیہ دو ہزار منشی محمد حسن صاف کر دیتے ہیں۔ غالبؔ یہ خبر سن کر کس کس طرح پیچ و تاب کھاتے ہیں دیکھنے کی چیز ہے۔ ہرگوپال تفتہؔ کو کل کیفیت بتانے کے بعد لکھتے ہیں "ناسخؔ نے اب مجھے لکھا کہ تم مجھے خط لکھو اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور مجھ کو یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا مگر میں نے یہ نہ جانا کہ

اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ تاریخ ہوں اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکلوا کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا تیسرے دن شہر میں یہ خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر مر گیا اب کہو میں کیا کروں اور تاریخ کیا کرے" پانچ ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہ تھی اور متوسطین کی لے ماری پر غالب کا پیچ و تاب کھانا بجا تھا مگر حیرت وہاں ہوتی ہے جہاں مفتی صدر الدین آزردہ کی تجہیز و تکفین کے لیے ان کی بیوہ کو پانچ سو روپئے نواب رام پور کی جانب سے عطا ہونے پر غالب رشک سے مضطرب ہو جاتے ہیں اور مفتی کی بیوہ کو کہنی مار کر خود اپنا دامن التماس آگے بڑھا دیتے ہیں۔ وہ فتوحات حاصل کرنے کے لیے صاحب ثروت اشخاص کی کیسی کیسی خوشامدیں کرتے ہیں۔ نواب رام پور کی خفگی دور کرنے کے لیے کس کس طرح گڑگڑاتے ہیں۔ انگریز حکام کی رضامندی اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کون کون سے جتن کرتے ہیں۔ یہ ایک صحیفۂ عبرت ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔ "یہ تمہارا دُعاگو اگرچہ اور امور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے یعنی بہت محتاج ہوں۔ سَو دو سَو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔"

اس زمانے کو دیکھتے ہوئے غالب کی یافت کچھ ایسی قلیل بھی نہ تھی مگر ان کا رہن سہن طبقۂ امرا کی طرح تھا۔ خود اپنے کو نواب کہتے اور دوسروں سے کہلواتے تھے۔ اپنی کوئی اولاد نہ ہوتے ہوئے بھی متعلقین اور متوسلین کا اچھا خاصہ حلقہ ان کے زیر کفالت تھا۔ ان کثیر اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ان کی ماہانہ پنشن اور دیگر فتوحات ناکافی تھیں اور نیت و اخراجات کے مابین جو خلیج باقی رہ جاتی تھی اس کو پُر کرنے کے لیے وہ اپنی خودداری اور پندار کے باوجود اہلِ ثروت کے سامنے دامن پسارنے اور ان کے روغن قاز ملنے پر مجبور تھے۔ یہ غالب کی شخصیت کا بہت بڑا المیہ تھا جس میں وہ زندگی بھر پستے رہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ غالب کی شخصیت ایک مجروح شخصیت تھی یہ تو تصویر کا ایک رخ تھا تصویر کا دوسرا رُخ ان کی جارحانہ کارفرمائیوں سے بھرا پڑا ہے۔ علمی اور ادبی مباحث میں اختلاف رائے برداشت کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ مزید برآں اگر کسی نے ان کی شخصیت یا عادات و اطوار کے بارے میں کوئی سخن گسترانہ بات کہہ دی تو غالب اس غریب پر اپنے ترکش کے سارے تیر آزما لینے سے باز نہ رہ سکتے تھے۔ علاء الدین احمد خاں علائی کے خط میں حمزہ خاں کو بعد سلام کے انھوں نے جو مغلظات سنائی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ قاطع برہان کا قصہ سب کو معلوم ہے۔ بیچارے مرزا محمد حسن قتیل کی مرنے کے بعد بھی ایسی بخیہ ادھیڑی ہے کہ توبہ بھلی۔ جن لوگوں نے قتیل کے حق میں کوئی کلمۂ خیر بھی کہہ دیا غالب نے اس کی سات پشتوں کو تو م ڈالا۔ زیادہ جوش آیا تو مغلظات پر اتر آئے یہاں تک کہ ان کے شاگردوں اور دوستوں نے اگر خط میں کوئی ایسا فقرہ لکھ دیا یا ایسی رائے ظاہر کر دی جس سے قتیل کے مستند و محترم ہونے کا جواز نکلتا ہو تو غالب اس پر بھی برس پڑے اور کبھی علی الاعلان اور کبھی اشارے و کنائے میں قتیل کے بارے میں گفتنی و ناگفتنی سب کچھ کہہ گئے۔ مارہرہ کے صاحب عالم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

" اصل فارسی کو اس کھتری بچہ قتیل علیہ ماعلیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رامپوری نے کھو دیا۔ ان کی سی سمت کہاں سے لاؤں۔ جو صاحب عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں۔ خالصاً للہ غور کرو کہ وہ جو ان نا شخص کیا کہتے ہیں اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں۔ واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے . . . عربی کا حرف اور ہے اور فارسی کا قاعدہ اور ہے سمجھو یا نہ سمجھو تم کو اختیار ہے عقل کو کام فرماؤ غور کر دیکھو۔ عبد الواسع پیغمبر نہ تھا۔ قتیل برہانہ تھا۔ واقف غوث الاعظم نہ تھا۔ میں یزید نہیں شمر نہیں۔ مانتے ہو مانو نہ مانو تم جانو۔"

طنز و تعریض، شگفتگی و انشراح، بذلہ سنجی و ظرافت، خودداری و خود شناسی، کبھی کبھی سلجوقی و افراسیابی اکھڑ پن غالب کے مزاج کے ترکیبی عناصر تھے جن کا پرتو ان کے مکتوبات میں جھلک اٹھتا ہے۔ حالی نے ان کو حیوان ظریف کہا ہے بیشک حیوان ظریف تھے مگر ان کی رگوں میں سلجوقی و افراسیابی خون بھی دوڑ رہا تھا وہ زبان قلم سے سیف و خنجر کا کام لینا بھی جانتے تھے۔ اس سے فتنے بھی کھڑے ہوئے "غالب چونکہ کبھی لڑتے اور جب ضرورت بردے کار آئی تو از راہ مصلحت صلح جوئی کے لیے سفید جھنڈا بھی بلند کر دیا مگر حقیقتاً انھوں نے مرزا قتیل اور ان کے حامیوں کو بھی معاف نہیں کیا۔ غالب کے طنز و تعریض کا

شکار کبھی کبھی ان کے دوست اور شاگرد بھی ہو جاتے تھے۔ مرزا تفتہ غالب کی جسمانی تکالیف کا لحاظ نہیں کرتے اور دفتر کے دفتر اصلاح کے لیے بھیجتے رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کلام بعد اصلاح کے جلد سے جلد ان کو واپس مل جائے اس پر غالب کی برہمی ملاحظہ ہو:

"میں نے جو لکھا کہ میں اچھا ہوں اس کو آپ سچ سمجھ کر خدا کا شکر بجا لائے۔ وہ جو میں نے لکھا تھا کہ شدت مرض کا بیان مبالغہ شاعرانہ ہے اس کو بھی آپ نے سچ جانا ہوگا حالانکہ یہ دونوں کلمے ازراہ طنز تھے میں جھوٹ سے بیزار ہوں۔ جب تم نے کسی طرح بیان واقعی کو باور نہ کیا تو میں نے لکھ بھیجا کہ میں اچھا ہوں اور یہ کلمہ میں نے تمھیں جب لکھا ہے کہ عہد کر لیا ہے کہ جب تک دم میں دم ہے اور ہاتھ میں جنبش قلم ہے جب تک موقع اصلاح خیال میں آ سکتا ہے آج جو تمھارا دفتر پہونچے اس کو کل (بعد اصلاح کے) روانہ کر دیا کروں گا۔ مجملاً حال میرا یہ ہے کہ قریب المرگ ہوں۔ دونوں ہاتھوں میں پھوڑے پاؤں میں ورم نہ وہ اچھے ہوتے ہیں نہ یہ رفع ہوتا ہے۔ بیٹھ نہیں سکتا لیٹے لیٹے لکھتا ہوں کل تمھارا دوسرا رقعہ آیا۔ آج صبح کو لیٹے لیٹے اسے دیکھ کر تمھیں بھجوا دیا۔ زنہار تم مجھے تندرست سمجھے جاؤ اور دفتر کے دفتر بھیجتے رہو۔ ایک دن سے زیادہ توقف (اصلاح دینے میں) نہ کروں گا۔ قریب مرگ ہوں تو بلا سے۔"

یہاں غالب کی جھلاہٹ فطری ہے۔ وہ احباب کی خاطر اپنی بساط سے زیادہ مشقت کرتے تھے مگر اصلاحی کاموں کا منشا اتنا زیادہ تھا کہ وہ غالب کے بس سے باہر ہو جاتا تھا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ عوارض جسمانی سے وہ پریشان تھے۔ غالب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسروں ہی پر نہیں خود اپنے پر بھی طنز کے تیر چلا سکتے ہیں زہرخند کر سکتے ہیں اور خود کو غیر فرض کر کے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ سکتے ہیں حالات کی ناساعدت کا مقابلہ جواں مردی سے کر سکتے ہیں۔ تنگدستی کے باوجود احباب اور شاگردوں کی خدمت بجا لانے سے دریغ نہیں کر سکتے۔ ہمدردی مروت اور سیر چشمی میں غالب کا حوصلہ بلند مگر وسائل سے مجبور اور عوارض جسمانی سے معذور۔ غالب کے اردو خطوط ان کی آخری عمر کے ہیں جبکہ ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے تھے اور وہ اکثر و بیشتر بیماری و ناخوشی کا شکار رہتے تھے مگر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ تادم مرگ ان کے دل آتش کدہ سرد نہیں ہونے پایا۔ ان کی بذلہ سنجی خوش طبعی اور گل افشانی گفتار اس وقت بھی نہ گئی جب ان کے حواس معطل اور سامعہ و باصرہ مجروح ہو چکے تھے۔ بدن میں پھوڑے نکل آتے ہیں تو اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پھوڑوں کی کثرت سے سارا بدن سرو چراغاں ہو گیا ہو۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "اب اگرچہ تندرست ہوں لیکن ناتواں دہشت ہوں۔ حواس کھو بیٹھا حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں جتنی دیر میں ایک قد آدم دیوار اٹھ جائے"۔ اگر خدا نخواستہ غالب کے یہ خطوط شائع نہ ہوتے تو گل افشانی گفتار کے یہ نمونے کہاں دیکھنے کو ملتے۔ ایک جگہ اور رقمطراز ہیں: "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ دو ایک دن میں ہمسایوں سے پوچھنا"۔ غرضکہ غالب کے اندر کا جیوا ظریف دم واپسیں تک زندہ و توانا رہا اور وہ رنج گراں نشیں کی حکایتیں اور صبر گریز پا کی شکایتیں لکھتے رہے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ جسمانی عوارض اور ذاتی پریشانیوں کے چکر میں پڑ کر اچھے اچھوں کی بذلہ سنجی ہوا ہو جاتی ہے مگر غالب کی شخصیت اتنی مستحکم اور جاندار تھی اور شدائد اور ہجوم رنج و بلا کی آگ میں تپ کر اتنی نکھر چکی تھی کہ بڑے سے بڑا طوفان بھی ان کو نہ ہلا سکا۔ بظاہر بعض وقت وہ مایوسی کی باتیں بھی کرتے ہیں مگر ان کی سپر اندازی میں بھی ایک بانکپن اور ایک طرحداری ہوتی ہے۔ ان کے شیوۂ تسلیم و رضا میں بھی ان کی انانیت کا جھنڈا اونچا ہی رہتا ہے۔ زمانے نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ انھوں نے مع سود در سود کے زمانے کو لوٹا دیا۔ وہ زندگی بھر طوفان کے جھکولوں میں ڈولتے رہے مگر طوفان ان پر قابو کبھی نہ پا سکا۔ غالب ایک پیچیدہ متنوع اور تہ دار شخصیت کے مالک تھے وہ طبقۂ اشراف کے ایک ایسے فرد تھے جس کے وسائل محدود اور امیدیں اور حسرتیں غیر محدود تھیں نسلی برتری اور اپنے کمال فکر و فن پر ان کو ناز تھا ان کو زمانہ بھی وہ ملا جس میں کفر و ایمان کی کشمکش نے طبقۂ دانشوراں کا احاطہ کر رکھا تھا غرضکہ نفسیاتی پیچیدگی کے وہ تمام عوامل ان کی شخصیت میں کام کر رہے تھے جن سے آدمی کی زندگی خانہ در خانہ تقسیم ہو جاتی ہے مگر چونکہ وہ نابغۂ عصر تھے اس لیے نفسیاتی پیچیدگی کے ان عوامل نے ان کی شخصیت کو

ہفت پیکر اور رنگا رنگ بنا دیا۔

غالب نے خطوط میں نہ صرف اپنی شخصیت کا بھرپور اظہار کیا ہے بلکہ انیسویں صدی کے سماج کا ایک جیتا جاگتا مرقع بھی پیش کر دیا ہے۔ غالب کی پرجوش انانیت ان کے مکتوبات کے ہر لفظ میں انفرادیت کی ایک برقی رَو بن کر دوڑ رہی ہے۔ یہ انانیت یا انفرادیت اضافی نہیں معلوم ہوتی بلکہ ایک مطلق حیثیت رکھتی ہے اور اسی لیے اس میں ایک لطیف جاذبیت اور دل کشی پیدا ہو گئی ہے۔ اس انانیت کا اظہار اگر کسی مجہول شخصیت کے ذریعے ہو تو سراسر تصنع معلوم ہوتا ہے مگر غالب کی شخصیت پر انانیت کا یہ لباس نہ صرف یہ کہ زیب دیتا ہے بلکہ ان کی شخصیت کو محبوب اور مقبول بھی بنا دیتا ہے۔ کہیں وہ وبائے عام میں مرنا اپنے لیے کسرِ شان سمجھتے ہیں، کہیں وہ ہندستان کے فارسی دانوں میں امیر خسرو کے علاوہ سب کو بے وقعت سمجھنے پر مصر ہیں۔ حتیٰ کہ لباس اور وضع قطع میں بھی رواجِ عام کی پیروی کرنا ننگ سمجھتے ہیں۔ جس دن انھوں نے داڑھی چھوڑی اسی دن سر کے بال ترشوا دے کہ سر پر بال اور منھ پر داڑھی دلی کے ہر کہہ ومہ کی عام وضع تھی۔ میر مہدی مجروح کو تحریر فرماتے ہیں۔ "وہ جو تم نے لکھا تھا کہ تیرا خط میرے نام کا میرے ہمنام کے ہاتھ جا پڑا۔ صاحب قصور تمھارا ہے کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو۔ مجھ کو دیکھو کہ کب سے دلی میں رہتا ہوں نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا۔ نہ اپنا ہم تخلص بہم پہنچایا۔" منشی ہرگوپال تفتہ کو خط نہ لکھنے کی شکایت کرتے ہیں مگر کس انوکھے انداز سے "کیوں صاحب کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا تاکہ نہ ہمارا کوئی خط سکندر آباد کو یہاں سے نہ جائے۔" غرض ان کی رفتار و گفتار، تقریر و تحریر، فکر و نظر، وضع قطع ہر شے میں ان کی انفرادیت نہ صرف نمایاں رہتی ہے بلکہ چیخ چیخ کر اپنی موجودگی کا اعلان بھی کرتی رہتی ہے۔

غالب کی وسیع المشربی، انسانیت دوستی، ہمدردی و غمگساری بھی اہلِ نظر کی توجہ کی مستحق ہے۔ ان کے ملنے والوں دوستوں اور شاگردوں میں ہر مشرب اور ہر ملت کے لوگ تھے اور غالب سب کو اپنا عزیز اور دوست جانتے تھے اور سب کے ساتھ یگانگی اور سیرچشمی کا سلوک کرتے تھے۔ چاہے وہ منشی ہرگوپال تفتہ ہوں یا منشی شیو نرائن اور منشی نول کشور، صاحبِ عالم ہوں یا مولوی عبدالغفور نساخ اور میر مہدی مجروح، انگریز بڑے بڑے ہوں یا میجر جان جاکوب، سب غالب کے پیارے تھے اور وہ سب سے لطف و محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ دوسروں سے اپنا کام نکالتے تھے تو دوسروں کے کام آنے میں بھی مقدرت بھر دریغ نہ کرتے تھے۔

غالب خود کو مصنوعی غلافوں میں لپیٹ کر پیش کرنے کے عادی نہ تھے۔ انھوں نے جہاں اپنے کمالاتِ فکر و فن پر فخر و مباہات کا اظہار کیا ہے وہاں اپنی بشری کمزوریوں اور خامیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش بھی کبھی نہیں کی ہے۔ وہ لاموجود الا اللہ کا ورد بھی کرتے تھے اور شراب نوشی کے بغیر بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ رمضان میں مولوی جعفر علی سے بلا التزام قرآن بھی سنتے تھے اور روزہ خوری کا ارتکاب بھی علی الاعلان کرتے تھے۔ وہ صوفی صافی ہونے کا دعویٰ بھی کرتے تھے اور اپنی رندمشربی سے بھی شرمندہ نہ تھے۔ انھوں نے اپنی خامیوں اور کمزوریوں کی غیر ضروری تاویلات سے کبھی سروکار نہیں رکھا وہ جیسے تھے دنیا کے سامنے خود کو ویسا ہی ظاہر کیا اور اسی لیے ان کی شخصیت نے ہزاروں لاکھوں لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ عکسِ غالب کے دیباچے میں آل احمد سرور نے ٹھیک ہی لکھا ہے:

"انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ ملکوتی صفات یا فکر کی عظمت سے کتنا متاثر کیوں نہ ہو قربت اسی سے محسوس کرتا ہے جو اسی کی طرح کا آدمی ہو جس میں کمزوریاں بھی ہوں جو اس کی طرح آرزوؤں اور حسرتوں کی لاشیں بھی لیے پھرتا ہو اور جس نے اس کی طرح ستاروں کے خواب بھی دیکھے ہوں۔ غالب کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ اس میں غالب ہمیں اپنے روز مرہ کے ماحول میں ہنستے، کڑھتے، پنشن کی تلاش میں سرگرداں، فتوح کی فکر میں غلطاں و پیچاں، دوستوں شاگردوں سے بے تکلف گفتگو میں مصروف کبھی بادہ و ساغر سے دل بہلاتے، کبھی فکرِ سخن میں غرق، کبھی معترضوں پر برہم اور کبھی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بساط کو ویران دیکھ کر افسردہ نظر آتے ہیں۔"

غالب کے خطوط اگر نہ ہوتے اور شائع نہ ہو جاتے تو غالب کی رنگا رنگ اور باغ و بہار شخصیت بھی پردۂ اخفا میں رہ جاتی کیونکہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دینے والا شخص پھر کبھی پیدا ہونے والا نہ تھا۔

★

خسرو متین نصیروی

گھٹائے گا رنگ

دیوانے لوگ ہم ہیں مستانے لوگ ہم ہیں
دنیا ودیں سے بالکل بیگانے لوگ ہم ہیں

رخ سے نقاب اُٹھاؤ جلوہ ہمیں دکھاؤ
سوئے ہوئے ہیں فتنے اِن کو ذرا جگاؤ

خاموش کس لیے ہو کچھ تو زباں سے بولو
دو دن کی زندگی ہے ہنس بول لو کہ رو لو

کالی گھٹا ہے چھائی رندوں کی عید آئی
آ شیخ تو بھی پی لے پینے میں کیا بُرائی

جنگل کو چھوڑ کر گو بستی میں آ بسا ہے
لیکن ابھی تک انساں وحشی بنا ہوا ہے

صابر نیازی

پیغامِ عید

صورت رنگ اب کے جگی نت نئے عنواں لیکر
وقت خود آگیا پیغام بہاراں لیکر

ساز موسم جو چھیڑا، پھول امنگوں کے کھلے
زندگی ناچ اٹھی، ارض و سما ناچ اٹھے
دل نے خوش ہو کے کہا، درد سے فرصت پا لی
میکدے کھلنے لگے، رند اٹھے، جام چلے

ساری دنیا میں چلی جشنِ ملاقات کی بات
پیار کی بات، محبت کی، مساوات کی بات
موجِ اخلاص بہا لے گئی نفرت ساری
مل کے بچھڑے ہوئے کرتے ہیں ملاقات کی بات

یوں گلے ملتے ہیں جیسے کوئی رنجش ہی نہ تھی
جز محبت کے دلوں میں کوئی خواہش ہی نہ تھی
فاصلے بڑھ گئے یوں ہی دل و جاں میں ورنہ
اصل میں تو کسی جانب سے یہ کوشش ہی نہ تھی

اب ملے ہیں تو نئے عہد کی بنیاد رکھیں
رات کو ختم کریں صبح کی تنویر بنیں
عید آئی ہے یہ پیغام تغیّر لے کر
دوستی کی نئی اقدار کی تشکیل کریں

رحمتیں عید کی ہر سال ہی ہم پر برسیں
دوستوں سے گلے ملنے کو نہ دم بھر ترسیں

عشرت امیر

سستی کا کمرہ

(افسانہ)

تیجا سنگھ ان دنوں نائٹ ڈیوٹی پر ہے۔

جب جب اس کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی ہے وہ صبح دیر تک سوتا رہتا ہے، نو، دس اور کبھی کبھی گیارہ بجے تک، تب تک جب تک سورج کی تیکھی کرنیں اوڑھی ہوئی چادر پار کر کے اس کے جسم میں چبھنے نہیں لگتیں، یا اس کی بیٹی کلونت اسے جگا نہیں دیتی۔

آج موسم بہت نم تھا۔ بادلوں نے آسمان ڈھک رکھا تھا، جیسے ایک چھتری کھول کر الٹی ٹانگ دی گئی ہو اور تمام ماحول میں میٹھے گیت کی طرح شرمیلی ہوا گھلی ہوئی تھی۔ اس لیے تیجا سنگھ میٹھی نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔

کلونت نے اسے جب جگایا تو وہ کچھ چونکتا اور جھلاتا ہوا جاگا۔ اسے پلکیں کھولنے میں کچھ پریشانی ہوئی۔ آنکھوں کی کوروں پر کیچڑ سوکھ گیا تھا۔ تیجا سنگھ نے اسے انگلیوں سے کرید کرید کر نکالا، اور جب پلکیں اٹھا کر سامنے کھڑی ہوئی کلونت کو دیکھا تو کچھ جھینپ سا گیا۔ بچوں کی طرح کتنا سوتا رہتا ہے وہ؟۔ ایک وقت تھا جب کلونت چھوٹی تھی اور وہ اسے جگایا کرتا تھا اور اب . . . . .

"کتنا وقت ہو گیا ہوگا ؟" ——— اس نے زبردستی ایک سوال کیا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وقت کافی ہو چکا ہے۔

"دس بج چکے ہیں ——— !"

بادلوں کی وجہ سے وقت کا پتہ ہی نہیں لگتا، اس نے خفت مٹاتے ہوئے کہا ——— کلونت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تو تیجا سنگھ بھی خاموش رہا۔ اس نے انگڑائی لی اور سستی دور کر لی، کلونت اندر چلی گئی تھی۔

تیجا سنگھ نے ایک اور جماہی لی، اور بادلوں کی طرف سر اٹھا کر دیکھا، اس کی داڑھی کے کچھ بال ہونٹوں کے نزدیک آ گئے تھے، اس نے انھیں ٹھیک کیا۔

اندر سے کلونت کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی ——— وہ کوئی فلمی گانا گنگنا رہی تھی ——— تیجا سنگھ نے اس کے کمرے کی طرف دیکھا، کچھ اس طرح، جیسے کسی ایسی چیز کو دیکھ رہا ہو جسے دیکھ کر نفرت پیدا ہوتی ہے، پھر اچانک اسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ چارپائی کے نیچے کی طرف جھکا، باسی پانی سے بھرا ایک لوٹا رکھا ہوا تھا، تیجا سنگھ نے اسے نکالا اور جلدی سے ایک گھونٹ بھر کر کلی کر دی، پلنگ کے برابر ہی ———

"پاپا یہ بہت بری عادت ہے تمھاری! ——— کلونت اپنے کمرے سے نکل آئی تھی ——— وہ بات بھی پوری نہ کر پائی تھی تب تک تیجا سنگھ دوسری کلی کر چکا تھا ———

"تم نالی پر نہیں جا سکتے، یہیں آنگن میں . . چھی چھی . . . . .

کلونت نے منہ سکوڑا ——— "سارے گھر کو کوڑے دان بنا رکھا ہے!"

تیجا سنگھ چاہتا تھا اسے ڈانٹ دے، لیکن نہ جانے کون سی چیز تھی جس نے اسے روک دیا ——— وہ ہکا بکا کچھ اس طرح جیسے پرائمری اسکول کا لڑکا ماسٹر کی طرف دیکھتا ہے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"بہت گندے ہیں ہم لوگ! ــــــ ہمیں بالکل تمیز نہیں،" کلونت اب بھی بڑبڑا رہی تھی۔

تیجا سنگھ چپ رہا۔ پڑھی لکھی لڑکی ہے اس نے سوچا ــــ بس میں بھول تو اسی سے ہوئی ہے، آنگن میں نہیں تھوکنا چاہیے تھا۔۔۔

تیجا سنگھ نے حلق کا تھوک نگل لیا۔ اس نے گردن دائیں بائیں گھما کر دیکھا اس طرح جیسے چوری کر رہا ہو اور جب اس نے دیکھا کہ کسی نے اسے کلونت سے ڈانٹ کھاتے نہیں دیکھا ہے تو خوش ہو گیا۔ جیسے بھیڑ میں سے جیب کاٹ کر بچ نکلا ہو۔

کلونت کے گنگنانے کی آواز پھر اس کے کانوں میں پڑی ــــ اس کا دل چاہا کہ وہ جائے اور کلونت کے گال پر دو طمانچے جڑ دے بے شرم اس طرح کے گانے گھٹیا گنگنائے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ گھر ہے۔۔۔۔ یا۔۔۔۔ لیکن تیجا سنگھ نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔ کلونت کتنی بڑی ہو گئی ہے؟ ــــ بالکل اپنی ماں پربھجوت کور کی طرح ــــ اس سے کیا کہہ سکے گا، کیسے روکے گا ــــ پھر اب تو اس نے گنگنانا بھی بند کر دیا ہے، ــــ تیجا سنگھ کو تسلی ہوئی۔

کلونت اس درمیان اپنے کمرے میں ادھر ادھر کئی چکر کاٹ چکی تھی ــــ شاید وہ آفس کی تیاری کر رہی تھی، تیجا سنگھ نے لوٹا ہونٹوں سے لگایا اور گلے کے نیچے انڈیل لیا۔ وقت بے وقت کی ڈیوٹی نے اس کا ہاضمہ خراب کر رکھا تھا، حکیم نے کہا تھا کہ صبح نہار منہ ایک لوٹا پانی پینے سے اسے حاجت آسانی سے رفع ہوا کرے گی۔

برسوں ہو گئے ہیں ــــ تیجا سنگھ روزانہ صبح ایسا ہی کرتا چلا آ رہا ہے۔

تیجا سنگھ چپ چاپ چارپائی پر بیٹھا رہا۔ اس کی سستی پوری طرح دور نہیں ہوئی تھی وہ یوں ہی بے مقصد ادھر ادھر دیکھتا رہا ــــ آنگن میں پھیلا سامان ــــ کچھ مٹکے جن میں پینے کا پانی بھرا ہوا تھا اور جن پر کائی کی تہہ جم گئی تھی، ایک طرف رکھے ہوئے تھے کچھ بغیر منجھے ہوئے برتن نل کے پاس پڑے ہوئے تھے، ان پر مکھیاں بھنک رہی تھیں کل کی بارش میں بھیگے اس کے جوتے اب تک نہیں سوکھ پائے تھے اور ان پر پڑا تاپ اور بڑھ گیا تھا۔ ایک طرف دو چارپائیاں پڑی تھیں جن پر بستر اب تک پڑے ہوئے تھے۔ اور مسلی ہوئی چادریں بچھی ہوئی تھیں، تیجا سنگھ کو کچھ بھی عجیب نہیں لگا۔ وہ روز صبح اٹھ کر یہ سب دیکھنے کا عادی تھا، اصل میں اس کی بیوی اور کلونت کی ماں کو وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ گھر کو سنوار دیا کریں؟ اور یہی سوچ کر تیجا سنگھ کا دل اپنی بیوی کی ہمدردی سے بھر گیا۔

پربھجوت کور اس کی بیوی ــــ کلونت کی ماں ــــ وہ بچاری صرف اس کو اور اپنی بیٹی کو وقت پر کھانا دینے کے علاوہ کچھ نہیں کر پاتی، نہ گھر صاف کر پاتی ہے اور نہ کوئی اور کام ــــ خود کھانا بھی وقت سے نہیں کھا پاتی ہے۔

تیجا سنگھ کو یاد آیا اس دن پربھجوت کور کی ایک جاننے والی آئی تھی ــــ موتی نگر سے ــــ ہر دن کی طرح یہ گھر اس دن بھی بکھرا ہوا تھا، اس نے کافی حیرت سے گھر کی یہ حالت دیکھی تھی اس کی آنکھوں میں کچھ نفرت اور کچھ حیرت تھی۔ جیسے کسی چڑیا گھر میں آ گئی ہو۔

تیجا سنگھ ڈیوٹی پر جانے کے لیے کپڑے بدل رہا تھا۔ اس نے صاف صاف سنا تھا ــــ وہ کہہ رہی تھی ــــ "پربھجوت اب تو تیری لڑکی جوان ہو گئی ہے پھر بھی گھر کی یہ حالت ــــ !"

کلونت کی ماں ہنسی تھی ــــ "ہاں بڑی ہو گئی ہے۔"

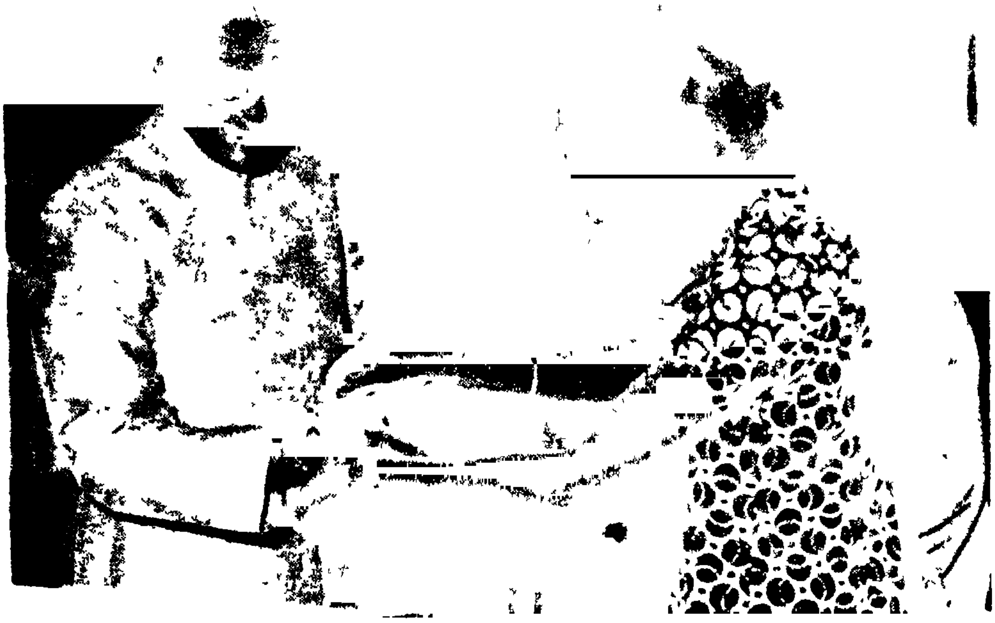
"کیا گھر کے کام میں تیرا ہاتھ نہیں بٹاتی؟"

"بٹاتی تو ہے ــــ" کلونت کی ماں نے بہت مختصر جواب دیا تھا۔

"کیا سہارا دیتی ہے؟ خاک! جھلا کر اس کی سہیلی نے کہا تھا ــــ "اگر سہارا دیتی ہے تو گھر کی یہ حالت کیوں بنی ہوئی ہے؟"

کلونت کی ماں دوبارہ ہنسی تھی ــــ کتنی کھوکھلی تھی وہ ہنسی! ــــ اس نے کہا تھا ــــ "سارا دن تو وہ دفتر میں رہتی ہے ــــ تین سو روپیہ ماہوار پر ملازم ہے ــــ کچھ بھی کرا لو، چاہے گھر میں کام کرا لو یا روپیہ۔۔۔۔۔۔"

تیجا سنگھ کو دیر ہو رہی تھی اس سے آگے کی بات نہیں سن سکا تھا، سارے راستے وہ۔۔۔۔۔۔ پربھجوت کے بارے میں سوچتا



"آندھرا کنیا ودیالیہ" کی طالبات صدر جمہوریہ شری فخرالدین علی احمد سے ملاقات کے لیے ۲۱ اگست ۱۹۷۵ء کو راشٹرپتی بھون نئی دہلی گئیں۔ تصویر میں ایک طالبہ شری احمد کی کلائی پر راکھی باندھتے ہوئے دکھائی دے رہی ہے

ہندوستان میں زیر تعلیم ماریشس کے طالب علموں نے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے ان کی جائے رہائش پر ۲۲ اگست ۱۹۷۵ء کو ملاقات کی۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے









زیراعلاشری ہیم وتی نندن بہوگنا الہ آباد کے بمرولی ہوائی اڈے پر ۲۰ راگست ۱۹۷۵ء کو
پودا نصب کرتے ہوئے



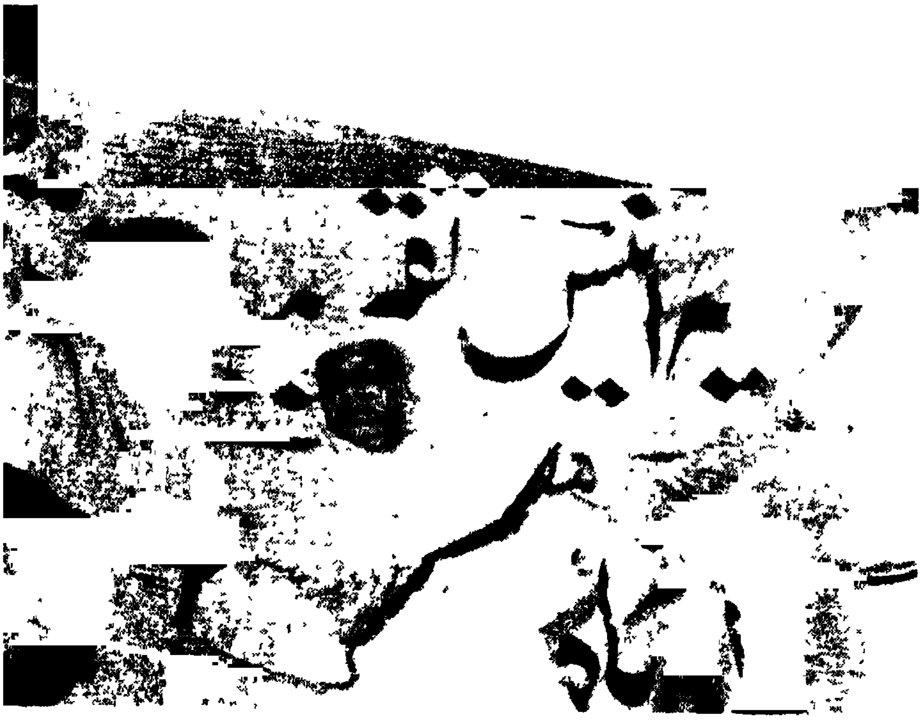
ر یاعلا شری ہیم وتی نندن بہوگنا ۲۰ اگست ۱۹۷۵ء کو یو۔پی الکٹرانکس کارپوریشن لمیٹڈ ٹی۔ آر۔ کرائمس فیکٹری کا افتتاح کر رہے ہیں

سید بارہ دری لکھنؤ میں منعقدہ سیب نمائش کے اختتام پر وزیر اعلا اتر پردیش ۳۱ اگست ۱۹۷۵ء کو انعامی شیلڈ دے رہے ہیں

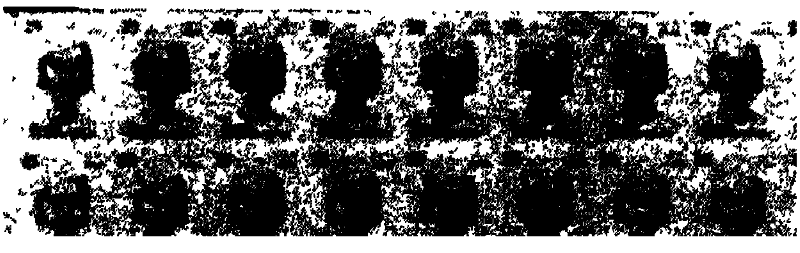




وزیراعلا شری ہیم وتی نندن بہوگنا یکم ستمبر ۱۹۷۵ء کو محلہ صحتیا باغ لکھنؤ میں پردیش کی پہلی جنتا دکان کا افتتاح کرتے ہوئے۔
دائیں جانب "جنتا دکان" کا ایک منظر



شری نرائن دت تیواری چوہداری محلہ چوک لکھنؤ میں ۲۸ ستمبر
کو مزار انیس پر منعقدہ ایک تقریب میں
انیس یادگاری ٹکٹ
کا اجرا کر رہے ہیں



محکمہ ڈاک وتار کے ذریعہ
جاری کیا گیا
انیس یادگاری ٹکٹ

رہا تھا ـــــ بالکل مشین ہو گئی ہے ـــ مگر پھر بھی گھر سنوار نہیں پاتی ـــ جب کلونت چھوٹی تھی تو اسے سنبھالنے سے اسے فرصت نہیں ملتی تھی اور اب جب وہ بڑی ہو گئی ہے ملازم ہو گئی ہے تو اسے اس کی نوکری کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

تیجا سنگھ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا ـــــ آنگن کے کونے میں لگے ہوئے نل کے پاس آکر وہ دانت مانجھنے لگا۔ کلونت اس درمیان میں نل پر آئی، وہ تولیہ کا ایک حصّہ گیلا کر کے وہیں تیجا سنگھ کے ٹھیک سامنے پیر کی انگلیوں کے ناخون رگڑنے لگی۔

جب جب کلونت اس طرح کے کام کرتی ہے، تیجا سنگھ پریشانی محسوس کرتا ہے ـــــ کبھی کبھی وہ کلونت سے ڈرنے بھی لگتا ہے ـــــ وہ بڑی ہو گئی ہے۔ جب کوئی لڑکی... اپنے چہرے مہرے اور فیشن کی طرف سے خبردار رہنے لگے، تو سمجھنا چاہیے کہ وہ جوان ہو گئی ہے۔ اور کھلی ہوئی جوانی خطرے کی چیز ہوتی ہے۔

کلونت کی جوانی کھلی ہوئی ہے۔ وہ اب تک کنواری تھی۔ درمیان میں اس کی ماں نے تیجا سنگھ کا دھیان اس طرف دلایا بھی تھا۔ لیکن تیجا سنگھ ٹال گیا تھا ـــــ اس نے سوچا تھا، اس کی عمر ابھی بیس کی ہی تو ہے، جلدی کیا ہے! ـــ میرے مالک کی بیٹی ہے، پچیس سال کی ہونے کو آئی، ابھی تک کنواری ہے ـــــ کلونت بھی ماں باپ کا ہاتھ بٹا رہی تھی ـــــ لیکن تیجا سنگھ اس طرف سے لاپرواہ نظر آتا تھا۔

کلی کرتے وقت اس کا دھیان اچانک کلونت کی طرف چلا گیا، تو اس نے جھینپ محسوس کی، کلونت جھکی ہوئی تھی، اور ناخون رگڑ رہی تھی ـــــ

اس کا سینہ ایک چیلنج کی طرح اس کی آنکھوں میں گڑ گیا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ بالکل..... پربھجوت... شادی کے کم از کم پانچ سال بعد تک کلونت کی.... ماں کی جوانی اور جسم اس طرح گدرایا رہا تھا۔

تیجا سنگھ کو نہ صرف یاد ہے ـــــ اسے اب تک اس وقت کا پربھجوت کا جسم یاد ہے ـــــ اس نے بالکل ایسا ہی..... تر و تازہ..... جسم اپنی باہنوں میں کس کر دیکھا ہے اور وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ عمر یوں ہی آزاد اور کھلا چھوڑ دینے کی نہیں ہے، بالکل نہیں ہے ـــــ تیجا سنگھ نے سوچا کہ اب اس بارے میں اسے جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔

کلونت سیدھی کھڑی ہو گئی ـــــ تیجا سنگھ منہ دھو چکا تھا اب وہ آدھے گھنٹے کو حاجت کے لیے جائے گا۔ لوٹ کر نہائے گا پھر اسے کھانا چاہیے۔

کلونت سینڈل پہن رہی تھی ـــــ تیجا سنگھ کا دل چاہا پوچھے، کہاں جا رہی ہے؟؟ ـــــ "آج تو اتوار ہے ـــــ لیکن اس نے نہیں پوچھا ـــ" اسے یاد ہے، ایک بار وہ پوچھ بیٹھا تھا ـــــ اور کلونت جھلا اٹھی تھی "میں کہیں جا رہی ہوں تم ٹوکا مت کرو، یہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے ـــــ"

بہت غصّہ آیا تھا تیجا سنگھ کو۔ اس نے یوں ہی روا روی میں پوچھ لیا تھا اور کلونت ہمیشہ کی طرح اس سے بدتمیزی سے بولی تھی۔ وہ ہمیشہ اس سے یا اپنی ماں سے اسی طرح بولتی تھی اور دونوں برداشت کر جاتے تھے۔

کلونت نے سینڈل پہن لیے تھے، تیجا سنگھ اس کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے نیا نیا نوکری پر آیا ہو۔ ایک امید تھی اس طرح دیکھنے پر، جیسے ابھی کلونت کوئی حکم دینے والی ہے اور تیجا سنگھ کو بجا لانا ہے۔

کلونت باہر گیلری میں گئی، تو تیجا سنگھ کا دل چاہا اسے روک لے، جانے کیوں کلونت جب کہیں باہر جانے لگتی ہے تو تیجا سنگھ کو لگتا ہے، اسے روک لینا چاہیئے۔

وہ گیلری سے چکر کاٹ کر واپس کمرے میں لوٹ آئی، اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور کچھ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا۔ بیچ میں وہ دوبارہ گیلری میں گئی تھی ـــــ شاید اسے کسی کا انتظار تھا۔ تیجا سنگھ نے سمجھ لیا۔ ہر اتوار کو وہ کسی کو وقت دے دیتی ہے ـــــ اور اس کے اور اپنی ماں کے سامنے ہی بن ٹھن

کر وہ اپنے دوست کے ساتھ نہ جانے کہاں گھومنے چل دیتی ہے۔

تیجا سنگھ چارپائی پر آ بیٹھا، اسے خیال آیا، جب جب کلونت اس طرح گھر سے جاتی ہے تو پاس پڑوس کے ہر گھر کی عورتوں کے چہرے دروازوں سے سڑک کی طرف جھانکنے لگتے ہیں، اب تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ کلونت کا آفس جانا...... وہاں سے لوٹنا یا گھر سے باہر جانا، سرگوشیوں کو جنم دیتا ہے۔

اور تو اور تیجا سنگھ اور اس کی بیوی کو بھی لوگ دیکھ کر مسکرانے لگتے ہیں ـــــ انھوں نے کلونت کو پیدا کیا ہے اور چونکہ انھوں نے اسے پیدا کیا ہے اس لیے کچھ انوکھا کام کیا ہے ـــــ ایسا، جسے دیکھا جانا چاہیے۔

جب جب ایسا ہوتا ہے کہ تیجا سنگھ کو کوئی دیکھ کر ہنستا مسکراتا یا پاس والے سے کوئی بات کرتا ہے تو تیجا سنگھ کو لگتا ہے کہ وہ اسی کے بارے میں ہو رہی ہے اسی پر ہنسا جا رہا ہے۔ ایسے ہر موقعہ پر تیجا سنگھ کو بے حد غصہ آتا ہے، سارا خون کھول اٹھتا ہے۔ اور دل چاہتا ہے، کچھ کر ڈالے، کلونت کا...... قتل..... یا اس کی شادی...... کلونت اب بھی بار بار گیلری کی طرف دیکھ رہی ہے ـــــ اور بے صبری سے ٹہل رہی تھی ـــــ ضرور کسی کو وقت دے رکھا ہے اس نے، تیجا سنگھ کو ہمیشہ کی طرح پھر غصہ آیا ـــــ اس نے لوٹا اٹھایا اور سنڈاس چلا گیا - وہ ایسے موقع پر کترا جانا اچھا سمجھتا ہے ـــــ کیا فائدہ..... کسی دن برداشت نہ کر سکے۔

تیجا سنگھ لوٹا تب بھی کلونت اسی طرح انتظار کر رہی تھی، کافی گھبراہٹ میں اس نے ہاتھ منھ دھوئے، بیچ بیچ میں وہ کلونت کی بے صبری دیکھتا رہا ـــــ اور ہر لمحہ مشتعل ہوتا رہا۔ حد درجہ کی بے شرمی ہے، کلونت پڑوس والے گھر میں پیدا ہوئی ہوتی تو تیجا سنگھ اور پربھ جوت بھی اس گھر کی طرف اسی طرح دیکھتے جھانکتے، جیسے لوگ اس کے گھر کی طرف جھانکتے ہیں۔

تیجا سنگھ اٹھ کر چارپائی پر آ بیٹھا، بستر اب بھی بچھے ہوئے تھے اور آنگن کے آدھے سے زیادہ حصہ کو سورج کی تیکھی کرنوں نے لپیٹ میں لے لیا تھا ـــــ اس دوران کلونت کی ماں ایک بار کسی کام سے آنگن میں آئی تھی، تیجا سنگھ نے دیکھا اس کے چہرے پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں، تیجا سنگھ کا دل پھر کسی انجانے خوف سے بھر آیا۔

کلونت اب پھر گیلری میں جاکر کھڑی ہوگئی تھی ـــــ اور جب وہ واپس آئی تو اس نے دیکھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی شاید وہ آگیا تھا جس کا اسے انتظار تھا!

گیلری میں ایک نوجوان چہرہ ظاہر ہوا۔ شاندار کپڑوں میں ملبوس، تازہ تازہ شیو اور شرارتی آنکھیں ـــــ کلونت اس کو اپنے کمرے میں لے آئی، کمرے میں جاتے وقت اس نے تیجا سنگھ کو دیکھا تھا اور وہ کچھ گھبرا گیا تھا۔

تیجا سنگھ کمرے کی طرف گیا تو اس نے دیکھا کلونت اور وہ نوجوان ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ تیجا سنگھ کو دیکھ کر وہ نوجوان سٹ پٹا گیا، کلونت پر کوئی اثر نہیں ہوا، اس نے ایک لمحہ کے لیے اس کی طرف دیکھا، جیسے پوچھ رہی ہو، ـــــ "کیا بات ہے؟" تیجا سنگھ کو خود وہاں جانا عجیب سا لگا وہ واپس آنگن میں آگیا، اس کے جسم میں ایک عجیب سی جھرجھری تھی، وہ کیوں گیا تھا وہاں؟ اُسے نہیں جانا چاہیئے تھا۔ وہ پھر چارپائی پر آ بیٹھا، کلونت کمرے سے اپنی ماں کو پکار رہی تھی پربھ جوت اس کے کمرے میں گئی۔

تیجا سنگھ نے دیکھا ـــــ پربھ جوت وہاں جاکر اس طرح کھڑی تھی، جیسے مالکن نے بلایا ہو۔ پربھ جوت واپس آگئی۔ تیجا سنگھ نے سوچا ـــــ ضرور چائے کے لیے کہا ہوگا۔ کتنی بری بات ہے کہ کلونت اپنے دوستوں کو بلائے اور ماں چائے بنا بنا کر پلائے ـــــ تیجا سنگھ کو یہ سب ناپسند تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ پربھ جوت کو ڈانٹ دے، کوئی ضرورت نہیں ہے، چائے وغیرہ بنانے کی، کمرے سے دوبارہ قہقہے بلند ہو رہے تھے، اور تیجا سنگھ کو لگا جیسے اس کے سینے پر کچھ انگارے رکھے ہوئے ہیں اور ان کی قیمت تین سو روپیہ ہے

تیجا سنگھ نے محسوس کیا ـــــ سامنے والا کمرہ کا رنگ کاہی اور شیشے کی ان دیواروں سے وہ اندر کا سارا منظر دیکھ رہا ہے ـــــ اندر.....

تیجا سنگھ اٹھا، اس نے سوچا اب زیادہ برداشت نہیں کرے گا۔ وہ سینے پر رکھے ہوئے انگارے بجھا دے گا، وہ کلونت کو ڈانٹ دے گا اور اس لڑکے کو باہر نکال دے گا ——— تیجا سنگھ کے ہاتھوں میں سنسنی پھیل رہی تھی اور چہرے پر پسینہ آگیا تھا۔

یہ شیشے کا گھر توڑ ڈالے گا وہ ——— بھوکا رہ سکتا ہے لیکن اب اس کانچ کے گھر میں رہنا اس کے لیے ناممکن ہے ——— وہ پھرتی سے کمرے کی طرف بڑھا...... لیکن اچانک گیلری میں کسی کو آتے دیکھ کر وہ پلٹ آیا ——— اس آدمی کو اس نے چارپائی پر بٹھایا پھر کلونت کی ماں کو آواز دے کر دو چائے بنانے کو کہا ——— بولا "میں تمہاری طرف آنے والا تھا، لیکن کلونت کی تنخواہ کل ملے گی، آج اتوار پڑ گیا نا!" ——— "کوئی بات نہیں" ——— اس آدمی نے کہا۔

تیجا سنگھ کا دھیان پھر کمرے کی طرف چلا گیا۔ قہقہے اب بھی گونج رہے تھے۔ لیکن اس کو یہ سوچ کر تسلی ہوئی کہ اچھا ہوا وہ پلٹ آیا اور اس نے کلونت سے کچھ نہیں کہا۔ ایسے موقعوں پر سمجھداری سے کام لینا چاہیئے،

کلونت کی تنخواہ سے ہی تو وہ اس آدمی کا قرضہ نپٹاتا ہے.... اپنی تنخواہ تو گھر میں ہی ختم ہو جاتی ہے۔

اور اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کمرے کی دیواریں سچ ہیں اور ان میں سے کچھ نہیں دکھائی دے رہا ہے۔

★

آگ کا سمندر صفحہ ۱۶ کا بقیہ

ایسی ٹوپیاں جو آگ میں ڈالنے پر نہیں جلتی تھیں دراصل (ASBESTOS) سے بنائی جاتی تھیں۔ یہ ریشم کی طرح نرم ریشے دار دھات ہوتی ہے جس سے نہ جلنے والا کپڑا بنا جا سکتا ہے۔ آگ میں نہ جلنے کی وجہ سے اس مشینی دور میں اس دھات کی بڑی اہمیت ہے۔ پرانے زمانے میں بہت کم لوگوں کو اس کا علم تھا اسی لاعلمی کا فائدہ اٹھا کر اُسے سمندر کی کھال مشہور کر دیا گیا۔

OXFORD JUNIOR ENCYCLOPEDIA (LONDON: OXFORD UNIVERSITY PRESS, 1952) کے VOL. I, P. 168 "CREATURES,"

★

مخطوطات کی فہرست سازی کے آداب

مخطوطات کی ترتیب وتدوین کے سلسلے میں ماضی کی کوششوں کا مطالعہ کرنے کے بعد موجودہ دور کے محققین نے ایک خاص قسم کا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ اس طریق کار میں مخطوطات کی خدمت کے دو مرحلے ہیں۔ ایک مرحلہ فہرست سازی کا ہے اور دوسرا ان کی ترتیب واشاعت کا۔ ان دونوں مرحلوں میں ہمارے اہل تحقیق نے ایسا طریقہ کار متعین کر دیا ہے جو ہمارے لیے یقیناً قابل تقلید ہے اس طریقہ کار کو سامنے رکھ کر ہم اپنی خدمات کو زیادہ اہم اور وسیع بنا سکتے ہیں۔ ذیل کی سطروں میں پہلی قسم کے طریق کار یعنی فہرست سازی کی تشریح کرنا مقصود ہے۔

مخطوطات کی فہرست سازی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اہل علم ان نوادر کی ضروری تفصیلات سے آگاہ ہو جائیں اور انھیں ان کے متعلق بنیادی معلومات فراہم ہو سکیں۔ موجودہ دور میں ایک محقق کو قلمی کتابوں کے بارے میں جو مختصر، ضروری اور جامع معلومات درکار ہوتی ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) مصنف کا نام اپنی اسی شکل میں جس طرح مخطوطہ پر لکھا گیا ہو۔

(۲) مصنف کا اصل تحقیقی نام۔ جو فہرست ساز کی تحقیق کے مطابق زیادہ صحیح ہو۔

(۳) کتاب کا پورا نام جو مخطوطہ پر ثبت ہو۔

(۴) کتاب کا وہ مشہور نام جس سے عام طور پر یہ کتاب علمی حلقوں میں جانی جاتی ہو۔

(۵) مخطوطہ کا افتتاحیہ

(۶) مخطوطہ کا خاتمہ اور ترقیمہ

(۷) مخطوطہ کے اوراق اور سطور کی تفصیل، صفحات کا سائز بہ اعتبار انچ یا سینٹی میٹر۔

(۸) خط کی قسم اور روشنائی کے رنگ و روغن کے متعلق تفصیل،

(۹) کاتب کا نام اور تاریخ کتابت

(۱۰) جلد

(۱۱) مخطوطہ کا ذریعہ درآمد۔

(۱۲) عمومی تعارف

(۱۳) کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں مصادر ومراجع کی تفصیل۔

اوپر دی ہوئی اجمالی فہرست کی تفصیل آئندہ سطروں میں پیش ہے۔

مصنّف کا نام

(۱) مصنف کا نام اسی شکل کے ساتھ لکھنا ضروری ہے جیسا کہ مخطوطہ پر ثبت ہو اس پر کوئی اضافہ کرنا فہرست ساز کے لیے غیر مناسب تصور کیا گیا ہے۔ بعض فہرست ساز مولف کی کنیت اور اس سے متعلق کچھ دوسری صفات کا ذکر کر دیتے ہیں۔ ان متعلقات کو مصنف کے نام کے ساتھ غیر ضروری سمجھا گیا ہے۔ بسا اوقات خود کتاب میں مصنف کے نام کے ساتھ اس کے القاب وآداب لکھے ہوتے ہیں۔ فہرست ساز کو چاہیے کہ ان غیر ضروری چیزوں کو بھی حذف کر دے اور صرف نام کا ذکر کرے اور افتتاحیہ میں وہ عبارت نقل کر دے جس میں یہ القاب آگئے ہوں۔ متقدمین مصنفین کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنا پورا نام مقدمہ کتاب میں ذکر کر دیتے تھے مثلاً خطبۂ حمد وثنا کے بعد:

"بندہ ضعیف وگنہگار سید محمد نثار ولد احمد مختار ساکن شہر فرخ آباد کہتا ہے...... کہ اس عبارت کا ذکر کر دینا بھی مناسب سمجھا گیا ہے لیکن مصنف کے نام کے ساتھ نہیں۔

مضمون میں بیان کردہ بنیادی تجربات مشہور عربی محقق ڈاکٹر صلاح الدین المنجد کے ایک رسالے سے ماخوذ ہیں

(ب) بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کاتب کی غلطی کی وجہ سے کسی معروف مصنف کا نام غلط لکھا ہوتا ہے یا اتنا مختصر ہوتا ہے کہ اس سے اشتباہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں کتاب پر لکھے ہوئے نام کے ساتھ مصنف کا اصل نام جو مشہور ہو یا فہرست ساز کا نتیجۂ تحقیق ہو ذکر کرنا مناسب ہے مگر اس کو اس فرق و امتیاز کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے کہ دیکھنے والا اس فرق کو ایک نظر میں پہچان سکے۔ اس تمیز کے لیے دو مختلف خطوں یا کسی علامت مثلاً قوسین وغیرہ کا استعمال کرنا چاہیے۔

مصنف کے نام کے ساتھ ایک ضروری اور اہم کام یہ ہونا چاہیے کہ حتی الامکان تلاش و جستجو کے بعد مصنف کا سنہ وفات کا ذکر کیا جائے اور یہ بھی اہتمام رکھا جائے کہ سنہ بہ اعتبار عیسوی بھی ہو اور بہ اعتبار ہجری بھی۔ اس سے مصنف کے عہد پر بھی روشنی پڑتی ہے اور باہم مشترک اسماء میں التباس و اشتباہ کا اندیشہ بھی دور ہو جاتا ہے۔

کتاب کا نام۔

(ل) فہرست ساز کے لیے ضروری ہے کہ وہ کتاب کے صفحۂ اول پر لکھے ہوئے نام کو جوں کا توں نقل کر دے۔ کتاب کے نام کے سلسلہ میں کتاب کے مقدمہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کتاب پر لکھا ہوا نام غلط ہوتا ہے اور اصل نام مصنف کے قلم سے مقدمہ میں بھی موجود ہوتا ہے۔ اس لیے مقدمہ کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ کبھی کتاب کا پورا نام کتاب کے آخر میں درج ہوتا ہے مثلاً۔ بندہ ..... کتاب کتاب مسمی ...... بتاریخ ...... لکھ کر فراغت ہوئی

(ب) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کتاب کا نام کچھ اور درج ہوتا ہے اور کتاب کسی دوسرے نام سے متعارف ہوتی ہے اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مشہور و معروف نام بھی اس فرق و امتیاز کے ساتھ لکھ دیا جائے کہ پڑھنے والا ان دونوں میں تمیز کر سکے

مصنفین کے حالات اور کتابوں کے تعارف کے سلسلہ میں عربی میں خاص طور سے اور فارسی میں نسبتاً کم لیکن پھر بھی خاصا ذخیرہ موجود ہے جس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ابھی اردو میں ایسی کتب حوالہ کمیاب ہیں پھر بھی دوسرے مراجع و مصادر سے کتاب کا نام اور مصنف کے نام کی تصحیح کر لینا چاہیے۔

افتتاحیہ۔ چونکہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک ہی نام کے کئی مخطوطے ہوں اور ہر ایک کا موضوع علیحدہ ہو اس لیے مقدمہ کتاب کا ذکر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مقدمہ کتاب کو نقل کرنے میں دو چیزیں بالخصوص قابل لحاظ رہنا چاہییں ایک تو یہ کہ مقدمہ کی وہ سطریں نقل کی جائیں جن سے کتاب کی ابتدا کے بارے میں معلوم ہو سکے کہ مصنف نے کن الفاظ سے کتاب شروع کی ہے دوسرے یہ کہ اگر اس افتتاحیہ کی بنیاد پر دو مخطوطوں کا یا اسی کتاب کے دوسرے مخطوطہ کو آپس میں تقابل کرنا چاہیے تو اسے فیصلہ کرنے میں زیادہ دشواری نہ ہو اس لیے حمد و ثنا کے کلام پر اکتفا کرنا درست نہیں ہے۔ قدما کا طریقہ تھا کہ وہ سرنامہ حمد و ثنا کے کلمات سے کرتے تھے مثلاً۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للہ رب العالمین ..... الخ یا اپنی زبان میں ایسے الفاظ و کلمات کا استعمال کرتے تھے جو اسی مضمون حمد و ثنا پر مشتمل ہوتے تھے۔ مثلاً۔ حمد و ثنا اس خدا کو سزاوار ہے جس نے زمین و آسمان کو وجود بخشا۔ الخ۔ فہرست ساز کو چاہیے کہ ان کلمات ... حمد والے حصہ کو بھی نقل کرے جس سے کتاب اور صاحب کتاب کے تعارف میں مدد مل سکے۔ اس لیے کہ بسا اوقات حمد و ثنا کے الفاظ کاتب اپنی طرف سے لکھ دیتے تھے۔ افتتاحیہ سے بڑی حد تک صحت متن، اسم کتاب، موضوع، سبب تصنیف، اور فرمائش کے بارے میں معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔

خاتمہ۔ مخطوطہ کے اختتام یا ترقیمہ سے کاتب کا نام اور تاریخ کتابت کا پتہ چلتا ہے اس لیے ترقیمہ کی پوری عبارت نقل کرنا چاہیے۔ اکثر مصنفین کا قاعدہ ہے کہ خاتمہ کلمات شکر و ثنا پر کرتے تھے۔ اکثر فہرست ساز انھیں کلمات کو نقل کر دیتے ہیں۔

ترقیمہ کو نقل کرنے میں اس احتیاط کا لحاظ ضروری ہے کہ کاتب، تاریخ کتابت، مقام کتابت، کے بارے میں ممکن معلومات ہو سکیں۔ مثلاً۔ تم الکتاب۔ فرغ من تصنیفہ ببلدۃ فرخ آباد سنۃ ستۃ تسعین و احد عشر سنۃ من الہجرۃ النبویۃ۔ وکتبہ عبد العزیز بن احمد علی خان من سکان بلدۃ لکھنؤ وقت العصر من یوم الاثنین الثالث والعشرین من شوال ـــــ الخ والحمد للہ علی ذالک۔ اہل تحقیق

نے صحیح طریقہ یہی قرار دیا ہے کہ ترجمہ کو مصنف کے الفاظ و کلمات ہی میں نقل کیا جائے۔ اس مضمون کو اپنے الفاظ میں بیان کرنا یا اس عبارت کا خلاصہ لکھ دینا نامناسب سمجھا گیا ہے۔

اوراق ۔ ضروری ہے کہ فہرست ساز مخطوطہ کے اوراق کی تعداد کا بھی ذکر کرے اور اگر اوراق پر اعداد موجود ہوں تو کوئی دشواری نہیں ہوتی اور یہ ان کا شمار بھی فہرست ساز کے فرائض میں شامل ہے۔ اگر کتاب اس قدر ضخیم ہو کہ اس کے اوراق کا شمار مشکل ہو تو مفہرس کو اپنے اندازہ پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی ضخامت کا ذکر کرنا چاہیے ساتھ ہی ایک صفحہ کی سطروں کا شمار اور ان کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے جن چیزوں کا تذکرہ مزید فائدہ بخش ہوتا ہے وہ یہ ہیں:

(الف) صفحات کا اندازہ۔

(ب) سطر کا طول اور حاشیہ کا عرض۔

(ج) اگر مفہرس کو کاغذ کی شناخت کا درک ہو تو اس کا تذکرہ۔

لیکن اس طرح کے قیاسی جملے مثلاً کاغذ باریک ہے یا موٹا ہے غیر مفید اور غیر ضروری ہیں۔

اقسام خط ۔ اردو کو چھوڑ کر عربی اور پھر فارسی میں رسم خط کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ فہرست ساز کو کم از کم سرسری طور پر ان رسوم خط سے واقف ہونا چاہیے۔ مثلاً خط کوفی۔ خط نسخ۔ خط اندلسی خط مسیحی وغیرہ۔ اردو میں اگر صرف نسخ و نستعلیق کا فرق بیان کر دیا جائے تو بھی کافی ہو سکتا ہے۔ فہرست سازوں کا یہ طریقہ غیر مقبول ہے کہ وہ خط کی تعریف اس طرح کرتے ہیں (خط عمدہ، معمولی، یا بہترین) ہے اگر نسخہ بخط مصنف ہے تو اس کی طرف اشارہ کرنا از حد ضروری ہے۔ اس سے مخطوطہ کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ اگر عبارت بے نقطہ ہو تو اس کی توضیح بھی کر دینا چاہیے۔ اگر کتاب میں مختلف قسم کی روشنائی استعمال کی گئی ہے تو اس کا تذکرہ بھی کر دینا چاہیے اور یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ متن اور عنوان میں کون سی روشنائی استعمال کی گئی ہے۔

کاتب اور تاریخ کی کتابت ۔ فہرست ساز کو ایسی عبارت نقل کر دینا چاہیے جس سے کاتب اور تاریخ کتابت کا پتہ چل سکے۔ اگرچہ محض کاتب کا نام اور تاریخ کتابت لکھ دینا بھی کافی ہے لیکن بسا اوقات ایسی عبارت نقل کر دینے سے محقق کو مزید فائدہ پہنچ جاتا ہے اس لیے کہ عبارت میں کبھی کبھی ان معلومات کے سوا ضمنی طور پر دوسری چیزیں بھی علم میں آجاتی ہیں مثلاً مخطوطہ پر اس طرح کی عبارت لکھی ہو۔

کتبہ محمد بن ولی الشہیر بقاضی زادہ حین کان قاما عسکریا بمدینۃ ---- سنۃ خمس وخمسین والف من الہجرۃ۔

اس عبارت سے مزید معلوم ہو جاتا ہے کہ کتابت کرنے والا کوئی معمولی شخص نہیں تھا بلکہ قاضی کے عہدہ پر فائز تھا۔ ان مزید معلومات کی بنا پر اس کی کتابت زیادہ قابل اعتماد ہو جاتی ہے۔

جلد ۔ مخطوطہ کی جلد کو بھی مرتبین کے نزدیک اہمیت حاصل ہے۔

(۱) جلد سے مخطوطہ کی عمر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۲) صنعت تجلید کے عہد بعہد ارتقاء پر روشنی پڑتی ہے۔

مسلمانوں نے خاص طور پر تجلید میں مہارت اور اس میں تنوع پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ اور بعض ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جو اپنی صنعت میں یکتا ہیں۔

چنانچہ جلدوں پر سونے کا استعمال، نقش و نگار، رنگوں کا استعمال نفیس کا طریقہ رہا ہے اور اب اس دور میں فن تجلید مسلمانوں کی تاریخ تمدن کا ایک جزو بن گیا ہے۔ فہرست ساز کو چاہیے کہ وہ اپنے امکان بھر اس جلد کے متعلق تفصیلات بہم پہنچا دے اور اگر ممکن ہو تو اس کی قسم اور مخصوص مکتب فن کی طرف بھی اشارہ کر دے۔ اگر کاتب کا سنہ وفات بھی ہماری دسترس میں ہو تو اس کا نقل کرنا بے حد ضروری ہے یہ بات اس وقت اور زیادہ ضروری ہو جاتی ہے جب کاتب اپنے فن میں کمال شہرت رکھتا ہو یا اس کا شمار اپنے عہد کے اعیان و علماء میں ہوتا ہو۔ ضروری نہیں کہ مخطوطہ پر کتابت کی تاریخ درج بھی ہو۔ بسا اوقات وہ صفحہ ضائع ہو جاتا ہے اور بسا اوقات کاتب تاریخ کا ذکر نہیں کرتا۔

ایسی صورت میں مفہرس کو کتابت کی عمر کا اندازہ قرائن سے لگانا پڑتا ہے۔ مثلاً وہ کاغذ کی قدامت، طرز کتابت، اور صفحہ اول پر ثبت شدہ مہروں اور ناموں سے ایک نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کاغذ کی قدامت کا اندازہ

اور طرز کتابت کی شناخت اسی وقت ممکن ہے جب فہرست ساز کو اس میں مہارت حاصل ہو عربی فارسی اور خاص طور پر انگریزی میں ایسی کتابیں شائع ہو گئی ہیں جو عہد بہ عہد ارتقائے خط کو پہچاننے میں مدد دے سکتی ہیں۔

ذریعہ درآمد:۔ مفہرس اگر ذریعۂ آمد کا تذکرہ بھی کر دے تو فائدے سے خالی نہیں مثلاً

خرید از
یا
عطیہ از
یا
وقف برائے کتابخانہ منجانب یا
منتقل کتب خانہ
وغیرہ

تعارفی نوٹ:۔ فہرست مخطوطات میں یہ عنوان لازمی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ اس عنوان کے تحت بسا اوقات بہت سی ایسی ضروری معلومات جمع ہو جاتی ہیں جو مخطوطہ کے بارے میں صحیح شناخت میں مددگار ہوتی ہیں بسا اوقات مخطوطہ میں کوئی ایسی بات آ جاتی ہے جو مذکورہ عنوان سے الگ ہوتی ہے لیکن اپنی اہمیت میں کم نہیں ہوتی۔ اس عنوان کے تحت مندرجہ ذیل امور کا تذکرہ مناسب ہے:

(۱) مخطوطہ کی عمومی حالت، یعنی مخطوطہ قابل استعمال ہے یا نہیں ہے۔ کرم خوردہ ہے، یا سیلاب زدہ ہے، اوراق باریک ہیں یا بوسیدہ ہیں۔ وغیرہ۔

(۲) نسخہ کامل ہے یا ناقص ہے۔ اگر کرم خوردہ ہے تو کس حد تک؟

(۳) اگر نسخہ مصحح ہے اور اس کا مقابلہ کسی نے دوسرے نسخہ سے کیا ہے تو مصحح کا نام یا نسخہ اگر مصنف کے سامنے پڑھا گیا ہے تو اس کا حوالہ۔

(۴) اگر کتاب پر کوئی اجازت نامہ، یا شاگردوں کے لیے ہدایت ہو تو اس کا تذکرہ۔

(۵) ملکیت کو ظاہر کرنے والے نام، دستخط، یا مہریں، اور اگر کتاب کسی مشہور شخص کی ملکیت میں رہی ہو تو اس کا نام و تعارف۔

(۶) اگر کتاب کسی بادشاہ یا اعیان مملکت میں سے کسی کے ذاتی کتب خانہ سے آئی ہو تو اس کا تذکرہ

(۷) اگر فہرست ساز کے علم میں ہو کہ کتاب شائع ہو چکی ہے لیکن قلمی نسخہ مطبوعہ سے زیادہ صحیح ہے تو اس خیال کا اظہار بھی۔

(۸) کتاب اگر شائع ہو چکی ہے تو حتی الامکان یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ کہاں اور کب شائع ہوئی۔

مصنف کے بارے میں مراجع:۔ مفہرس کے لیے ضروری ہے کہ ان کتب حوالہ کا بھی ذکر کر دے جن سے مصنف کتاب کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہوں یا مصنف کے نام یا اس کی تاریخ وفات کی تحقیق ہوتی ہو۔ ایسی کتابوں کا حوالہ بھی مفید ہوگا جن میں مصنف کے بارے میں کسی بھی قسم کی معلومات موجود ہوں۔

سوانح مصنفین:۔ تاریخ علوم و فنون اور دائرۃ المعارف کے فن میں عربی اور فارسی نیز انگریزی میں ایسی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو اس سلسلہ میں معین و مددگار ہو سکتی ہیں۔

مجموعے:۔ مخطوطات میں بعض ایسی کتابیں ملتی ہیں جو کئی موضوعات یا رسائل یا کتابوں کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں اس کے ہر جز کو ایک مخطوطہ سمجھنا چاہیے اور اس کی فہرست اسی اعتبار سے تیار کرنا چاہیے البتہ کتاب کے نمبر کا حوالہ ایک ہی دیا جا سکتا ہے —— یہ بھی ضروری ہے کہ ان رسائل کو نمبر کے اعتبار سے ترتیب دیا جائے یعنی یہ اشارہ کر دیا جائے کہ رسالہ مجموعہ نمبر.... کا دوسرا یا تیسرا رسالہ ہے۔

مجہول الاسم:۔ اکثر کتب خانوں میں ایسے مخطوطات بھی پائے جاتے ہیں جن کا پہلا ورق ضائع ہو جانے کی وجہ سے کتاب اور مصنف کے نام کا پتہ، نشان، نہیں چلتا۔ ایسی صورت میں اس کی تلاش و جستجو میں پوری کوشش صرف کرنا چاہیے۔ اگر کتاب کا مقدمہ موجود ہو تو اس میں یہ تلاش زیادہ تر مفید ثابت ہوتی ہے —— اگر مقدمہ نہ ہو تو مخطوطہ کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا چاہیے اور ایسی عبارات و اشارات کو نقل کرنا چاہیے جن سے مصنف یا کتاب پر روشنی پڑتی ہو۔

کتاب میں دوسری کتابوں کے متن بھی نقل کیے جاتے ہیں جن سے بہر حال کتاب کے زمانۂ تصنیف کا پتہ چل جاتا ہے اور اس کے بعد اس تحقیق میں بھی زیادہ دشواری پیش نہیں آتی کہ اس موضوع پر کن کن

مصنفین نے اس زمانہ میں قلم اٹھایا ہے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود اگر کوئی ایسا اشارہ نہ مل سکے تو چاہیے کہ مخطوطہ کے عنوانات، ابواب، موضوعات، اور مضمون نقل کر دیے جائیں تاکہ دوسرے لوگ اس تحقیق میں مدد دے سکیں۔

ترتیبِ فہرست:- فہرست کی ترتیب میں درج ذیل طریقوں میں سے کوئی بھی طریقہ جس کی ضرورت متقاضی ہو اپنایا جا سکتا ہے اس کا تعلق ذخیرہ کی کمی، بیشی پر ہے:

ا- فہرست کو مختلف فنون پر تقسیم کر دیا جائے۔ جیسے ادب، تاریخ تذکرہ، ادب منظوم وغیرہ۔

ب- فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے اسماء کتب پر مرتب کی جائے۔

ج- فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے اسمائے مصنفین پر مرتب کی جائے۔

اگر مفہرس کے لیے ان موضوعات کی تقسیم مشکل ہو تو مسلسل نمبر کے تحت بھی ان کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ البتہ تعارفی نوٹ میں اس کتاب کا فن اور موضوع مقرر کر دینا ضروری ہے۔

مخطوطات بہ اعتبار مراحل تاریخی:- مخطوطات کی ایک قسم ایسی ہے جسے ہم تاریخی مراحل کے اعتبار سے تقسیم کرتے ہیں اس کا مطلب یہ کہ ایسا اوقات ایک مصنف ایک کتاب اپنے قلم سے تصنیف کرتا ہے پھر کچھ وقت کے بعد وہ اس کتاب کا دوسرا نسخہ تیار کرتا ہے اور اس میں ترمیم و تبدیل کر دیتا ہے اس طرح ایک کتاب کے کئی نسخے ہو سکتے ہیں جو تصرفات کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایسے مخطوطات میں تاریخی مراحل کا لحاظ کیا جاتا ہے فہرست ساز کو چاہیے کہ اگر یہ فرق اس کی دسترس میں ہو تو اس کی وضاحت کر دے کہ اس کے پیش نظر نسخہ تاریخی اعتبار سے کس مرحلہ کا ہے:

حصص:- بہت سی کتابوں کے مختلف حصّے ہوتے ہیں۔ فہرست ساز کو چاہیئے کہ ہر حصّے کے بارے میں الگ معلومات فراہم کرے اور ہر حصّہ جس فصل یا جس عنوان سے شروع ہوتا ہے اور جس پر ختم ہوتا ہو اس کا ذکر کر دے۔

مصوّر مخطوطات:- مخطوطات کا قیمتی ذخیرہ ایسا بھی ہے جو مصوّر ہے، فہرست ساز کو چاہیے کہ وہ اس کی طرف اشارہ کرے اور تصویروں کی تعداد بھی لکھی جانا چاہیے۔

ان اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اہل تحقیق کو زیادہ سے زیادہ سہولت بہم پہنچا سکتے ہیں۔

★

اردو شاعری میں گاندھیائی تحریک

(صفحہ ۳۱ کا بقیہ)

بڑھاتے رہنے کی تلقین کی ہے:

ابھی ابھی تو تم کھڑے ہوئے ہو اپنے پیر پہ
ابھی تو راہ سخت ہے ابھی ہے دور کا سفر
نگاہِ پاک بیں و ہمت جواں رہی اگر
تمھیں بنو گے میر کاروانِ ایشیا مگر
ابھی تو گردِ کارواں ہے گماں بڑھے چلو
علم لیے شہید قوم کا نشاں بڑھے چلو

اس طرح اردو شاعری نے گاندھی جی کی تعلیمات اور ان کے تصورات کو عام کرنے میں جو رول ادا کیا ہے وہ ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

★

غزلیں

شارق میرٹھی

بخشی ہم کو چشمِ بصیرت
ان کی نوازش ان کی عنایت

آخر ہم بھی غیر نہیں ہیں
کچھ تو کیجیے پاسِ مروت

سچی بات سے اُن کو چڑ ہے
سچ کہنا ہے اپنی عادت

نفرت کے پھیلانے والو!
مذہب تو یکسر ہے محبت

ملتے ہی پیغامِ سحر کے
چھٹ جائے گی شب کی ظلمت

درد کسی کا جانے کوئی
آج کسے ہے اتنی فرصت

دل میں نفرت کی چنگاری
لیکن لب پر حرفِ محبت

سچی بات جو کہہ دی ہم نے
برسے ہم پر سنگِ ملامت

وزن کہیں رکھتے ہیں شارق
چھوٹے سکّے، کھوٹی دولت

چندر پرکاش جوہر بجنوری

نہ اِس جہاں کے لیے ہوں نہ اُس جہاں کے لیے
ازل سے گرمِ سفر ہوں میں لامکاں کے لیے

مری جبینِ عقیدت میں ہیں ابھی محفوظ
وہ سجدے وقف ہیں جو تیرے آستاں کے لیے

مرا فسانۂ ہستی تمام ہو نہ سکا
ملا نہ غم کوئی تکمیلِ داستاں کے لیے

رہِ وفا میں کچھ ایسے بھی نقش ملتے ہیں
چراغِ راہ ہیں جو اہلِ کارواں کے لیے

کہاں میں اور کہاں سرزمینِ کوئے حبیب
ہر امتحاں سے میں گزرا اس امتحاں کے لیے

وفا پرست ہے کتنا وہ طائرِ بےباک
جلائے اپنا نشیمن جو گلستاں کے لیے

بغور دیکھ لیں اہلِ نظر مجھے جوہر
میں انقلاب کی تصویر ہوں جہاں کے لیے

سید نظر برنی

حسرت موہانی
اور
عملی سیاست

ہے مشقِ سخن جاری، چکّی کی مشقّت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرتؔ موہانی، جن کی زندگی ایثار وخلوص سے عبارت ہے اپنے اس شعر کے مصداق نہ صرف ایک شاعر دردمند تھے بلکہ اپنے وطن عزیز کو آزاد کرانے کی تحریک میں دل وجان سے شریک بھی رہے اور اس راہ پُرخطر سے دیوانہ وار گزر گئے۔ بیباکی اور جرات رندانہ حسرتؔ کے کردار کی نمایاں خصوصیت تھی۔ وہ ساری زندگی قوم کے لئے لڑتے رہے اور لڑتے ہی لڑتے جان دی۔ ان کی زندگی میں اخلاصِ پیہم کا ایک نقشِ جاوید پایا جاتا ہے۔

حسرتؔ موہانی کی طبیعت میں ولولہ ہی ولولہ تھا۔ وہ رزم اور بزم دونوں میں یکساں طور پر اقبالؔ کے شاہین کی طرح متحرک رہے۔ تنگیٔ معاش بھی ان کے عزم وحوصلے کے آگے دیوار نہ بن سکی۔ حسرتؔ اس کے باوجود حق پرستی اور حق گوئی کی راہ پر گامزن رہے۔ سودیشی تحریک میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے سودیشی کپڑوں کی دوکانیں قائم کیں۔ اس کام میں نواب وقارالملک اور علامہ شبلیؔ نے بھی حسرتؔ کا ہاتھ بٹایا۔ علامہ شبلی نے حسرت کی "تجارتی سرگرمیوں" کو دیکھ کر کہا تھا:

"تم آدمی ہو یا جن، پہلے شاعر تھے، پھر پالیٹیشن بنے اور اب بنیے ہوگئے۔"

حسرت موہانی کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۰۳ء سے ہوتا ہے۔ جب انھوں نے مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد علی گڑھ شہر میں سکونت اختیار کرلی اور "اردوئے معلی" کا ڈکلریشن داخل کردیا۔ جس زمانے میں علی برادران کا طوطی بولتا تھا حسرت نے جو ذہنی طور پر نیشنلسٹ تھے علی برادران کی مخالفت کرنے سے گریز نہیں کیا۔ انھوں نے سنہ ۱۹۰۴ء میں کانگریس کے بمبئی اجلاس میں بحیثیت مندوب شرکت کی اور سورت کانگریس کے اجلاس تک اس پارٹی سے وابستہ رہے لیکن اس اجلاس میں بال گنگا دھر تلک نے جو آزادی کامل کے زبردست حامی تھے، کانگریس سے علاحدگی اختیار کرلی۔ حسرتؔ ذہنی طور سے تلک کے زیادہ قریب تھے اس لیے وہ بھی اس جماعت سے الگ ہوگئے۔

حسرتؔ موہانی بال گنگا دھر تلک کے فدائیوں میں سب سے نمایاں تھے۔ وہ تلک کے نظریات سے بے حد متاثر تھے اور ان کا نام بڑے احترام سے لیا کرتے تھے۔ حسرتؔ نے اپنے بعض اشعار میں تلک کا ذکر کیا ہے۔ تلک کی وفات پر انھوں نے ایک طویل نظم کہی تھی۔ جس کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

ماتم نہ ہو کیوں بھارت میں بپا، دنیا سے سدھارا آج تلک
بلونت تلک، مہراج تلک، آزادوں کے سرتاج تلک
جب تک وہ رہے دنیا میں رہا ہم سب کے دلوں پر زوران کا
اب رہ کے بہشت میں نزدِ خدا روحوں پہ کریں گے راج تلک

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ آزادی کامل کی حمایت میں حسرتؔ موہانی نے کانگریس پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ حسرت کی تلوّن مزاج طبیعت نے میدان سیاست میں بھی اپنا رنگ دکھایا اور وہ

کمیونسٹ ہو گئے۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں پہلے نیشنلسٹ تھا لیکن ۱۹۲۵ء سے میں نے نیشنلزم کو خیرباد کہا اور کمیونزم کو اپنا مسلک قرار دیا۔ ۱۹۲۵ء میں کانپور میں جو آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس ہوئی تھی اس کے روح رواں حسرت موہانی ہی تھے۔ حسرت کے خیالات شروع ہی سے اشتراکیت پسند تھے۔ لیکن ملک کی آزادی کے لیے جو تحریک زوروں پر تھی اس کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو کھلم کھلا اشتراکیت کے اثرات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے مولانا نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ وہ بھی عام دھارے کے ساتھ ہو جائیں۔ مگر حسرت کے مزاج میں بغاوت کا عنصر بھی شامل تھا۔ اسی جذبے کے تحت وہ زیادہ دنوں تک کانگریس میں نہ رہ سکے اور انھوں نے ایک پارٹی کے بعد دوسری پارٹی اور دوسری پارٹی کے بعد تیسری پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔

حسرت کے باغیانہ اور اشتراکی خیالات کے ثبوت میں مندرجہ ذیل اشعار قابل ذکر ہیں:

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی
نہ حکام کا جور بے جا رہے گا
زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں
کسی کا نہ محنت پہ دعویٰ رہے گا

حسرت موہانی اردو کے پہلے غنائی شاعر ہیں جنھوں نے اپنے اشتراکی ہونے کا بانگ دہل اس طرح اعتراف کیا ہے: ؎

صوفی مومن ہوں، اشتراکی مسلم!

حسرت کی شاعری ایک طرف جہاں عاشقانہ مضامین سے آراستہ و پیراستہ ہے وہاں دوسری طرف ان کے کلام میں جا بجا قومی اور ملکی مسائل کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں "غم جاناں" بھی ہے اور "غم دوراں" بھی۔ وہ مسلمانان عالم کے خلاف مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا ذکر کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر
اٹھے ہیں یہ حق پیشگان مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو
کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر

حسرت موہانی خود ایک سیاسی مکتب خیال سے وابستہ تھے۔ اور عملی سیاست میں بھی سرگرم حصہ لیتے تھے۔ اس لیے ان کے کلام میں سیاسی بصیرت کا ہونا لازمی امر ہے۔ جذبۂ حب الوطنی کی شدت، قوم کی بے جا بزدلی، یورپ کی تسلطائیت اور حکومت کے جبر و استبداد کے خلاف صدائے احتجاج کی گونج حسرت کی شاعری میں بھی منعکس ہے۔ غزل کے جملہ لوازمات اور قوافی و ردیفوں کی پابندی کے ساتھ ساتھ عصری مسائل پر تبصرہ کرنا ہر چند دقت طلب اور مشکل نظر آتا ہے تاہم حسرت کی خلاقانہ طبیعت نے اس راہ پرخار کو بھی گلزار بنا دیا۔ فرماتے ہیں:

رسم جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حب وطن مست خواب دیکھئے کب تک رہے
دولت ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے حد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

آخر میں اردو کے اس قلندر شاعر حسرت موہانی کی بیگم کا ذکر بھی ضروری ہے جو شوہر کی سیاسی، علمی اور ادبی زندگی میں حقیقی معنوں میں شریک حیات رہیں۔ مرحومہ زیور تعلیم سے آراستہ تھیں اور بعض اہم مسائل میں اپنے شوہر کو مفید مشورے دیتی تھیں۔ حسرت کے ساتھ آپ علی گڑھ مقیم رہیں اور بعدہٗ کانپور میں مستقل سکونت اختیار کی۔ وہ آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ممبر تھیں اور سیاسی جلسوں میں ہمیشہ حسرت کے ساتھ شرکت کرتی تھیں۔

بیگم حسرت کے ساتھ حسرت موہانی کو دلی لگاؤ رہا اس کا اظہار اس مرثیہ سے ہوتا ہے جو انھوں نے بیگم حسرت کے انتقال پر کہا تھا۔

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر — آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر
کاروبار شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں — دل پہ ذوق شاعری اک بار ہے تیرے بغیر
جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لیے
اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر

قاسم صہبا جبلی

غزل

طلوعِ صبحِ محبّت کی روشنی گم ہے
کرن کا ساز شکستہ ہے نغمگی گم ہے

یہ کارگاہِ تمدّن بھی ہے عجب بستی
ہے دوستوں کا ہجوم اور دوستی گم ہے

ہم اس قدر نہیں اندھے کہ اس کو موت کہیں
یہ زندگی ہے مگر روحِ زندگی گم ہے

جہاں میں دیر و کلیسا سے تا کنشت و حرم
ہر ایک گھر میں خدا ہے مگر خودی گم ہے

یہ مدرسہ ہے معلّم بھی ہے کتاب بھی ہے
کتاب خواں بھی ہیں صرف اک آگہی گم ہے

بیلانا پرشاد استھانا زیب بریلوی

غزل

مذاقِ جستجو قائم تمہاری جستجو تک ہے
محبّت کی حدِ آخر تمہاری آرزو تک ہے

تری آنکھوں کے ساغر میں مرے دل کا لہو تک ہے
شرابِ کیف میں شامل شرابِ آرزو تک ہے

کہاں تک رنگ لاتی چاک دامانی محبت کی
خزاں کی پردہ داری تو کلی کی آبرو تک ہے

محبت کا فسانہ در فسانہ ختم کیوں کر ہو
ہماری گفتگو آخر تمہاری گفتگو تک ہے

مئے عرفانِ ہستی روح تک سرشار کرتی ہے
شرابِ زندگی ساقی غمِ جام و سبو تک ہے

نمازِ بے نیازی تیرے دیوانے ہی پڑھتے ہیں
نمازِ ہوشمندی آج بھی رسمِ وضو تک ہے

محبت پردہ در ہو کر ہی پردہ دار ہوتی ہے
جنوں کی چاک دامانی گریباں کے رفو تک ہے

میں کیا اے دوست کہہ پاؤنگا آگے ساری دنیا کے
مری عرضِ تمنا صرف تیرے روبرو تک ہے

نیازِ زندگی سے بے نیازِ آرزو ہو جا
فریبِ زندگی شاید فریبِ آرزو تک ہے

میں ہر منزل پہ پہنچوں گا میں ہر منزل سے لوٹونگا
تعین میری منزل کا تمہاری جستجو تک ہے

سحر کی تازگی اے زیبؔ کب تک رنگ لائے گی
بہارِ شامِ گلشن میں قیامِ رنگ و بو تک ہے

عبدالرحیم قدوائی

مہاتما گاندھی ــــ اقوال و افکار کے آئینے میں

اہنسا اور سچائی اہنسا اور سچ دونوں ایک سکّے کے دو رخ ہیں اہنسا ہماری منزل ہونا چاہیے اور سچ اس منزل تک پہنچنے کا راستہ۔ اہنسا پر عمل کرنا ہماری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیے۔ اگر ہم نے ایمانداری سے ان دونوں اصولوں پر عمل کیا تو ہماری فتح ہے یہ صحیح ہے کہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے ہم کو پریشانیاں برداشت کرنا پڑیں گی لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے بعد نہ صرف ہم کو فتح حاصل ہوگی بلکہ ہم خدا کے قریب بھی ہو جائیں گے اہنسا اور سچائی ہم کو خدا کے قرب تک لاتے ہیں۔[۱]

عدم تشدّد عدم تشدّد کوئی مشینی کام نہیں ہے بلکہ یہ بڑا لطیف جذبہ ہے اور انتھک کوششوں اور صبر و ضبط کے بعد حاصل ہوتا ہے عدم تشدّد کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بہت سخت تربیت کی ضرورت ہے اگر کوئی شخص اس طریقۂ کار کو اپنانا چاہتا ہے تو اُسے ایک سپاہی کی طرح ڈسپلن کی زندگی گزارنا پڑے گی۔[۲]

عدم تشدد وحشی طاقت سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔ جو کوئی عدم تشدد پر یقین رکھتا ہے وہ خدا پر یقین رکھتا ہے۔ عدم تشدد ایک ایسی طاقت ہے جو بوڑھا، بچہ، جوان ہر ایک استعمال کر سکتا ہے اور یہ اُس کے لیے فائدہ مند ہوگا۔[۳]

جمہوریت جو حکومت تشدّد کے ذریعہ سے قائم ہوگی وہ حکومت ہمیشہ تشدد پر عمل کرے گی اور یہ اس ملک کے عوام ہی کے لیے نہیں ساری دنیا کے لیے مضر ہے۔ اس کے مقابلہ میں پُر امن جمہوری نظام کہیں بہتر ہے۔[۴]

میں سمجھتا ہوں کہ جمہوریت کہیں بھی مسلط نہیں کی جا سکتی ہے جمہوریت اسی وقت کامیاب ہوگی جب عوام دل سے جمہوریت پر ایمان لے آئیں اور ہر شعبۂ زندگی میں جمہوری طرز فکر اختیار کر لیں۔[۵]

میں نے کار لائل کی ہسٹری آف دی فرنچ ریوولیوشن (HISTORY OF THE FRENCH REVOLUTION) پڑھی ہے اور جواہر لال نہرو سے روس کے انقلاب کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ حکومت جو پر تشدد ذرائع سے قائم ہوئی ہو کبھی بھی جمہوریت کے اصول پر عمل پیرا نہیں ہو سکتی میں جس جمہوریت پر یقین رکھتا ہوں وہ پُر امن ذرائع سے قائم ہونی چاہیے میرے خیال میں جمہوریت میں ہر شخص کو برابر کے حقوق حاصل ہونا چاہییں اور ہر شخص خود ذمہ دار ہونا چاہیے۔[۶]

---

[۱] یرودا مندر۔ از مہاتما گاندھی صفحہ ۱۳ [۲] ینگ انڈیا۔ ۱۶ مارچ ۱۹۳۱ء۔ [۳] ہریجن ۵ ستمبر ۱۹۳۶ء [۴] ینگ انڈیا۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۲۴ء۔ [۵] ہسٹری آف دی کانگریس از پٹا بھائی سیتا رمیہ صفحہ ۹۸۲ [۶] GANDHIJI'S CORRESPONDENCE WITH THE GOVERNMENT صفحہ ۱۷۳ ۱۹۴۵ء

اقتصادی مساوات

اقتصادی مساوات میری زندگی کا آئیڈیل ہے مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑی حد تک ناقابلِ عمل ہے اس لیے کم سے کم میں یہی چاہتا ہوں کہ اشیاء مساوی طور پر سب میں تقسیم کی جائیں۔[1]

اقتصادی مساوات پُرامن آزادی کے لیے بہت ضروری ہے میں اقتصادی مساوات کو اس معنی میں لیتا ہوں کہ سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان خلیج دور ہونا چاہیے چند سرمایہ دار جن کی مٹھی میں سارے ملک کی معیشت ہے ان کو ختم ہونا چاہیے اور بھوکے ننگے لاکھوں عوام کی حالت بہتر ہونا چاہیے ایک پُرامن حکومت اس وقت تک ناممکن ہے جب تک سرمایہ دار اور غریب کے درمیان یہ خلیج قائم رہے گی میرے آزاد ہندوستان میں نئی دہلی کی عالی شان عمارات اور گاؤں کے بوسیدہ جھونپڑے دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ غریبوں کو بھی امیروں کے برابر حقوق حاصل ہونا چاہییں جب تک غریبی اور امیری کا یہ امتیاز قائم رہے گا تشدد کا خطرہ ہر وقت منڈلاتا رہے گا ایسی پُرامن حکومت کا قیام مشکل ہے لیکن بہرحال ہم کو جدوجہد کرنا چاہیے۔[2]

اقلیتوں کے حقوق

اکثریتی حکومت کا دائرہ کار محدود ہے جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جس میں عوام بھیڑ بکریوں کی طرح نہ ہوں۔ جمہوریت میں اکثریتی فیصلے کے علاوہ شخصی آزادی کی بھی اہمیت اور قدر ہونا چاہیے۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ اقلیت کو اکثریت سے اختلاف رکھنے کا پورا حق ہے۔ ایسے معاملات جس میں ضمیر کی آزادی کا تعلق ہو اکثریتی فیصلہ کا کوئی مقام نہیں ہے۔[3]

مذہب

سچائی سے بہتر کوئی مذہب نہیں ہے۔[4]

سچا مذہب ہمیشہ بہتر اخلاق سے منسلک ہوتا ہے مذہب میں اخلاقیات کی اتنی ضرورت ہے جتنی ایک بیج کو پھلنے پھولنے کے لیے پانی کی ضرورت۔[5]

سوراج سے مراد "رام راجیہ" کا قیام ہے رام راجیہ یعنی سچائی کی حکومت۔[6]

میں سمجھتا ہوں کہ سیاست کو مذہب سے نہیں الگ رکھا جاسکتا ہے۔ مذہب ہمارے ہر کام میں دخل رکھتا ہے یہاں مذہب سے مراد تنگ نظر فرقہ پرستی نہیں ہے میری مراد مذہب سے ایک منظم اخلاقی زندگی ہے اور یہ چیز ہندو مذہب، اسلام اور عیسائیت سب میں پائی جاتی ہے۔[7]

چھوت چھات

ہندو مذہب میں سب سے بڑی خرابی چھوت چھات ہے حد یہ کہ اس کا اثر اب مسلمانوں تک میں آگیا ہے اس چیز نے ہم کو ساری دنیا کے سامنے ذلیل کر رکھا ہے۔[8]

چھوت چھات ہندو مذہب کا ایک اہم حصہ بن گیا ہے میرے نزدیک یہ چیز ہندو مذہب کے لیے پلیگ کی طرح ہے۔ ہر ہندو کا فرض ہے کہ وہ اس کو ختم کرے اس ذلیل رسم نے کروڑوں انسانوں کو جائز حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم چھوت چھات کو ختم کریں۔[9]

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

---

[1] ینگ انڈیا۔ ۱۷ مارچ ۱۹۲۷ء [2] CONSTRUCTIVE PROGRAMME BY M.K. GANDHI صفحہ ۱۸ ۱۹۴۴ء۔ [3] ینگ انڈیا مورخہ ۲ مارچ ۱۹۲۲ء اور ۴ اگست ۱۹۲۰ء۔
[4] ETHICAL RELIGION BY M.K. GANDHI صفحہ ۴۹ ۱۹۳۰ء۔ [5] ایضاً صفحہ ۵۰ ۱۹۳۰ء۔ [6] ینگ انڈیا ۴ مئی ۱۹۲۱ء۔ [7] ہریجن ۱۰ فروری ۱۹۴۰ء۔ [8] ینگ انڈیا ۲۷ اپریل ۱۹۲۱ء۔
[9] FROM YERWADA MANDIR BY M.K. GANDHI ۱۹۳۵ء

حمیدہ راحت

معاوضہ

(افسانہ)

شام کا وقت تھا۔ آفتاب کی سنہری کرنیں کمرے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اور رفتہ رفتہ افق میں ڈوبتی ہی تھیں میں سوچنے لگی ... کاش میری زندگی کی کرنیں بھی اسی طرح ڈوب کر موت کی تاریکی میں غائب ہو جاتیں۔ مگر میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کے پاس آئی۔ مکان سے متصل تالاب میں ایک مچھلی کودی۔ جس سے پانی کی سطح پر ایک حلقہ بن گیا۔ اور حلقہ کی لکیریں آہستہ آہستہ پانی میں مل گئیں۔ اس طرح کہ کچھ پتہ نہ چلا کہ کیسے! کاش میری زندگی کے حلقہ کی لکیریں بھی زمانہ میں اس طرح مل جائیں کہ کسی کو کچھ پتہ نہ چلے۔ ...... میرا دل غمناک ہو رہا تھا۔ بہت بے چین اور بہت مضطرب! میری نظریں اوپر اٹھیں تو میں نے دیکھا کہ ایک پرندہ ہوا میں اڑتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کاش میں بھی امی جان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو ان کو میری شادی کی فکر تو نہ ہوتی۔ ایسی فکر جو میری ۲۷ سالہ زندگی تک دور نہ ہو سکی۔ اب تو انھیں میری صورت سے بھی نفرت ہے لیکن میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔ مجھے تو بس اپنی آنکھوں پر اختیار ہے۔ اور ان سے آنسو رواں ہیں۔ گنگا جمنا کی طرح۔ معلوم نہیں یہ آنسو کب تک بہتے رہے۔ اور پھر جب سر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ رمضان کا چاند نظروں کے سامنے ہے۔ اور کل سے روزہ ہے۔

دسواں روزہ تھا سحری کو میں معمول سے قبل اٹھ گئی کیونکہ طرح طرح کی آوازیں گلی سے آ رہی تھیں۔ یہ سب روزہ داروں کو سحری میں جگانے والوں کی آوازیں تھیں۔ اچانک ایک درد بھری آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ آواز تھی:

پھول مہکے بلبل چہکے آیا رمضاں پیارا
روزہ داروں کی قسمت کا چمکا ستارا

میں اس آواز کو برداشت نہ کر سکی۔ کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ ایک لاغر جسم جس کا سر آگے اور کمر پیچھے کی طرف جھکی ہوئی تھی، اوپر سے نیچے تک ایک گدڑی میں لپٹا، ایک ہاتھ میں ایک لالٹین اور دوسرے میں ایک ڈنڈا لیے گلی میں رینگ رہا تھا اور یہ صدا لگا رہا تھا۔

"روزہ داروں کی قسمت کا چمکا ستارا"

میں نے آواز سے یہ اندازہ لگایا کہ یہ کوئی ضعیف عورت ہے۔ میں دیکھتی رہی اور جسم سرکتا رہا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی مگر تصور میں وہی جسم رینگتا رہا۔ اس سال کی قیامت خیز سردی ناقابل برداشت تھی۔ سحری کے وقت لحاف سے باہر نکلنا بھی جبر معلوم ہوتا تھا۔

دوسرے دن مجھ سے کوئی کام نہ ہو سکا۔ جب بھی کوئی کام کرنے لگتی تو اس بوڑھی عورت کا جسم ذہن پر سوار ہو جاتا۔ کتنی ضعیف اور لاغر تھی وہ اور پھر سردی سے کس قدر کانپ رہی تھی۔ آخر وہ کون سی مجبوری تھی جس کے باعث وہ رات کو اس قدر سردی کے باوجود روزہ داروں کو جگانے نکلتی تھی۔

دوسری رات سحری کے وقت پھر وہی آواز سنائی دی!

پھول مہکے بلبل چہکے آیا رمضان پیارا
روزہ داروں کی قسمت کا چمکا ستارا

میں اٹھ کر بیٹھ گئی میں نے صدر دروازہ کھول دیا اور اس بوڑھی عورت کو آواز دی۔

بڑی بی۔ ذرا سنیئے تو۔

پھر ڈنڈے کی ٹک ٹک کی آواز قریب ہوتی گئی

میں نے کہا۔ بڑی بی بیٹھ جائیے۔

چولھے میں جلتی ہوئی لکڑیوں کو دیکھ کر وہ خود ہی نزدیک سرک آئی

بڑی بی کیا آپ کی طبیعت خراب ہے ؟

ہاں بیٹی ضعیفی اور پھر اس کڑاکے کی سردی نے تو کمر ہی توڑ دی ہے ۔

جب طبیعت خراب رہتی ہے تو اتنی سردی میں آپ آتی ہی کیوں ہیں میرے لہجے میں شکوہ تھا۔

وہ جلدی سے بولی کیا کروں بیٹی میری ایک کنواری بیٹی ہے رضیہ ۔ شادی جو کرنا ہے اس کی ۔ عید کی چار تاریخ کو اس کی بارات آئے گی بیٹی۔

اور یہ سن کر جیسے کہ مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ میں مضطرب سی ہوئی اور مجھ میں بیکلی پیدا ہو گئی ۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے چہرے پر کچھ ہے دیکھا تو آنسو کا ایک قطرہ ڈھلک گیا تھا۔

ارے تم تو رونے لگیں ۔ اچھا بیٹی میں چلتی ہوں ۔ یہ بیٹھنے کا وقت نہیں بیٹی وقت تنگ ہے ۔

اچھا بڑی اماں ۔ ایک بات تو بتاتی جایئے ۔ میں نے چائے کا پیالہ اور دو گرم روٹیاں اس کی جانب بڑھا دیں اور پوچھا عید کے دن آپ کو کتنا معاوضہ مل جائے گا ۔ تین سو روپے تو ضرور ہی ملیں گے بیٹی ۔ اس سے زیادہ بھی مل سکتے ہیں ۔ تین سو گھر تو اسی محلے میں بندھے ہیں

شادی کے لیے یہ روپے کافی ہیں ؟ میں نے پھر سوال کیا۔

بیٹی کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہے اچھا چلتی ہوں ۔ یہ کہہ کر وہ لاٹھی ٹیکتی چل دی۔

آخر کار عید کا دن بھی آ گیا ۔ اور گھر میں گہما گہمی شروع ہو گئی ۔ گھر کے سبھی مرد عید کی نماز پڑھ کر واپس آ چکے تھے ۔ بڑی چہل پہل تھی ۔ پھر سحری میں اٹھانے والوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ سبھی اپنی مخصوص صدائیں لگا رہے تھے ۔ تاکہ انھیں پہچان کر ان کا ؛ ا جب حق ان کو دے دیا جائے ۔ لیکن میں تو صرف یہ صدا سننا چاہتی تھی ۔

" روزہ داروں کی قسمت کا چمکا ستارا "

مجھے بڑی بی کا شدت سے انتظار تھا ۔ لیکن شام ہو گئی پھر بھی میں یہ صدا نہ سن سکی ۔ اب محلے کی عورتوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا ۔ آخر تھک ہار کر اپنی پھوپھی سے جو اسی محلے میں مسجد کے پاس رہتی تھیں اور اس وقت ہمارے گھر آئی ہوئی تھیں ' میں نے پوچھ ہی لیا --

پھوپھی جی ۔ وہ بڑی بی رضیہ کی اماں کہاں ہیں ۔ ابھی تک نہیں آئی ہیں . . . . . کون بڑی بڑھیا ۔ اس کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہی ہو تم ؟ اچھا وہی نا ؟

" پھول مہکے بلبل چہکے . . . . "

ہاں ! ہاں ! پھوپھی جی اسی کے بارے میں تو پوچھ رہی ہوں

ارے تمھیں نہیں معلوم ! ۲۷ ویں روزے کو تو مسجد سے نکلتے ہوئے نمازیوں نے اس کو مردہ پایا ۔ انتہائی ٹھنڈک کی وجہ سے اس کا جسم اکڑ گیا تھا ۔

لیکن رضیہ . . . . میں آگے کچھ نہ کہہ سکی میری آنکھوں کے سامنے وہ بارات گھوم گئی جو میری طرح رضیہ کے گھر آنے والی بھی تھی یا نہیں ۔

★

مہاتما گاندھی ۔ افکار و اقوال کے آئینے میں

(صفحہ ۳۸ کا بقیہ)

عورتیں اور ہندستان کا مستقبل

میں سمجھتا ہوں کہ ہندستان کی فلاح و بہبود عورتوں کی فلاح و بہبود اور جد و جہد پر منحصر ہے ۵۲

میری خواہش ہے کہ عورتوں کو آزادی ملنی چاہیے انھیں ووٹ دینے کا حق ہونا چاہیے ۔ انھیں ہر میدان میں برابر کے حقوق حاصل ہونا چاہییں ۔ وہ دن ملک کے لیے بہترین دن ہو گا جب عورتیں ملک کی سیاست پر اثر انداز ہونے لگیں گی ۵۳

---

۵۲ ہریجن ۲۷ جون ۱۹۳۹ء ۵۳ ینگ انڈیا ۔ ۲۱ جولائی ۱۹۲۱ء ۔

★

نصیر ناطقی

گاندھی جینتی

جہاں میں آج گاندھی جینتی کا دن جو آیا ہے
خوشی کی لہر دوڑی ہے زمانہ مسکرایا ہے
اُمانت ہے خوشی کی روشنی اہلِ وطن سُن لو
بنامِ ہند، دلِ جمہور کا پیغام لایا ہے
عجب قائد ملا ہم کو، عجب دنیا ملی ہم کو
جہاں ہم ہیں، وہاں انسانیت بھی زیرِ سایا ہے
نگاہیں رشک سے پڑتی ہیں تجھ پر اہلِ دنیا کی
زمینِ ہند، تیرے دل نے ایسا نقش پایا ہے
ہر اہلِ انجمن کے دل میں ہے تصویر گاندھی کی
خوشی ہے آج پیدائش کا دن عالم میں آیا ہے
نظر آیا ہے یوں بھی التفاتِ خاص کا عالم
نظر جس ذرّے پر ڈالی اُسے سورج بنایا ہے
چراغِ منزلِ جمہور، ان کی ذات سے روشن
جہاں کو متحد ہونے کا اک رستہ بتایا ہے
جو لکھی جائے گی تاریخ اب عبارت میں دیروں کی
تو سنئے گا انھیں کے نام کو عنواں بنایا ہے
وہ پہلا نام ہے گاندھی، جواہر لال بعد ان کے
گلستاں کی روش کو جن بہاروں نے سجایا ہے
نصیرؔ انسانیت کے ماسوا، ہر نقش باطل ہو
نگاہِ شوق میں ایسا تصور بھی اک آیا ہے

اشفاق مرزا

معذرت

اب نہ اظہارِ محبت کی جسارت ہوگی
جانِ من اب تمھیں مجھ سے شکایت ہوگی

اپنے اظہارِ محبت پہ میں شرمندہ ہوں
میرے اظہارِ محبت نے تمھیں رنج دیا
تم کو اک فکر ہوئی اور یہ سوچا تم نے
میرا اظہارِ وفا تم کو نہ بدنام کرے
میں کہا کرتا تھا تم سے کہ پریشان نہ ہو
الفتیں بھی کہیں بدنام ہوا کرتی ہیں
حسرتیں بھی کہیں ناکام رہا کرتی ہیں
آرزوئیں بھی کہیں خاک ہوا کرتی ہیں
اور اگر ڈر ہے تو اس راز کو تم راز رکھو
میں نہ اظہار کروں، تم بھی نہ اظہار کرو
میرے نزدیک تم آجاؤ تو مل جائے سکوں
تم سے خاموش محبت کی کہانی کہہ دوں
ڈر کے مارے وہ کہانی بھی نہیں تم نے سنی
عالمِ خوف میں اک رحم کی درخواست بھی کی
ظلم سے رحم کی درخواستیں کی جاتی ہیں
میں کوئی غیر نہیں اور نہ کوئی ظالم ہوں
اسی دنیا کا اک انسان ہوں ہی مگر ہے مرا
دل میں نفرت کا گذر ہی نہیں الفت کے سوا
وہ جو اظہارِ محبت تھا وہ مجبوری تھی
معذرت چاہتا ہوں تم سے مجھے کردو معاف
یہ نہ سوچو کہ کوئی راہ میں کانٹا ہوگا
میں سکوں چھینوں کسی کا یہ نہ ہوگا مجھ سے
اب کبھی تم کو پریشان کروں میں توبہ
اب نہ اظہارِ محبت کی جسارت ہوگی
جانِ من اب تمھیں مجھ سے شکایت ہوگی

سید صفدر حسین عابدی

قصائدِ اثر — ایک مطالعہ

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اردو زبان و ادب کا کوئی بھی طالب علم اس نام سے ناواقف نہ ہوگا۔ سوسائٹی میں ان کی جو حیثیت تھی اس سے بحث نہیں، ادب میں ان کی حیثیت بہ ہمہ وجوہ مسلّم تھی۔ وہ بہ یک وقت شاعر، نقاد، مترجم، محقق اور ایک مستند اہلِ زبان سبھی کچھ تھے۔ ان کے صاف ستھرے مذاقِ شعری اور ادب و زبان پر بےپناہ قدرت نے اصلاحِ زبان و ادب کی جو شمع فروزاں کی، اس سے ان گنت افراد نے روشنی حاصل کی۔ ملازمت کی زبردست بندشوں اور بےپناہ مصروفیتوں کے باوجود اثر نے جس انہماک و شغف کے ساتھ ادبی خدمت انجام دی اور جس قدر ضخیم ادبی سرمایہ چھوڑا اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

شاعری میں ان کا رجحان زیادہ تر غزل کی طرف رہا مگر اس کے باوجود انھوں نے دیگر اصنافِ سخن کی جانب توجہ دی۔ چنانچہ اثرستان، بہاراں، نو بہاراں اور سحرستان (غیر مطبوعہ) جیسے مجموعہ ہائے غزلیات کے علاوہ طبع زاد اور مترجم نظموں کے چار مجموعے رنگِ بسنت، عروسِ فطرت (مطبوعہ) نغماتِ بےصدا، دورِ تسلسل۔ (غیر مطبوعہ) نیز رباعیات و مثنوی کے ایک ایک مجموعے لالۂ و گل و نغمہ۔ باد میں ان کے یادگار ہیں۔ انھوں نے قاضی نذر الاسلام کی بیشتر نظموں کے ترجمے بھی کیے تھے جو اب تک شائع نہ ہو سکے اور ان کے غیر مطبوعہ مجموعۂ نظم نغماتِ بےصدا میں شامل ہیں۔

لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہوں گے کہ اثر نے اکثر و بیشتر مختلف ذہنی کیفیتوں کے زیرِ اثر قصائد بھی نظم کیے تھے۔ جیسا کہ محترم علی ارشاد نقوی، خویش اثر ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

"مرحوم سرکار ناصر الملۃ اعلی اللہ مقامہ کے یہاں قصیدہ خوانی کی محفلوں میں شریک ہوتے اور قصیدے پڑھتے۔"[1]

اثر کے قصائد جن کی کل تعداد سترہ ہے سب کے سب غیر شائع شدہ ہیں۔

اثر کے قصائد اُن کے نہاں خانۂ دل میں جھانکنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ان اشعار کی روشنی میں ان کی شخصیت، کردار اور مزاج کے بیشتر پہلو کھل کر سامنے آتے ہیں۔ آئیے سب سے پہلے ہم اسی نقطۂ نگاہ سے ان اشعار کا مطالعہ کریں۔

یہ سارے کے سارے قصائد آئمہ طاہرین کی مدح میں کہے گئے ہیں کسی دنیوی شخصیت کی شان میں نہیں۔ اثر کی حیات اور اس کے مختلف گوشوں سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان کی پرورش اور تربیت جاگیردارانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ ماحول جس میں ایک دوسرے کی خوشامد کرنا قطعاً معیوب

۱؎ اثر نمبر نیا دور لکھنؤ۔ صفحہ ۳۳۔

نہ تھا۔ یہ برسہا برس کے شخصی دورِ حکومت اور زوال پذیر سماج کی دین تھی۔ آثر کے مزاج پر اس ماحول کی چھاپ پڑنا ضروری تھی۔ ان باتوں کے علاوہ وہ سرکارِ انگلشیہ کے نمک خوار اور ایک بڑے عہدے پر فائز بھی تھے اس طرح انھیں "انگریز بہادر" کی بزمِ ناز میں حضوری کا شرف بھی حاصل تھا۔ کشمیر جیسی مطلق العنان ریاست میں قریب سات برس تک وزیرِ داخلہ، وزیرِ تعلیم اور وزیرِ اعظم کے سے جلیل القدر عہدوں پر فائز ہونے کی بناء پر انھیں مہاراجہ ہری سنگھ کے دربار میں شرفِ قبولیت بھی حاصل تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے آثر پر ہمیشہ الطاف و اکرام اور خلوص و محبت کی بارش ہی کی تھی۔ ایسے ہی لوگوں میں سر تیج بہادر سپرو کا نام لیا جا سکتا ہے۔ آثر مرحوم مسٹر سپرو سے بے حد متاثر اور اُن کے بے پایاں خلوص کے معترف تھے۔ چنانچہ عروسِ فطرت میں شامل نظم "چمک" کے آخری شعر میں سر تیج بہادر کو "عزیز" کہہ کر مخاطب کیا ہے اور اس کے نیچے لکھے ہوئے نوٹ میں "محسن و قدرشناس" کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔

لیکن ان تمام حقائق کے باوجود آثر کی خودداری و خودپسندی اور حد سے بڑھی ہوئی شخصیت پرستی تھی کہ ایک قادرالکلام اور زودگو شاعر ہوتے ہوئے بھی انھوں نے کسی دنیوی شخصیت کی تعریف میں کبھی کوئی شعر نہیں کہا۔ آثر کے کردار کی یہ وہ خوبی ہے جو دوسرے شعراء میں کم نظر آتی ہے۔

آثر مرحوم اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ ان کی یہ دردمندی کچھ تو انسانیت کے تئیں بے پناہ عقیدت و احترام کے باعث تھی اور کچھ طبعی محرومی و غم انگیزی کی بناء پر تھی۔ وہ فطرتاً غمگین و غم انگیز طبیعت رکھتے تھے۔ ان کے دواوین سے ایسے سیکڑوں اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جن سے مزاج کے اس پہلو پر گہری روشنی پڑتی ہے لیکن زیرِ نظر قصائد میں بھی جگہ جگہ ان کے مزاج کی اس کیفیت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ قریب قریب سبھی قصائد ایسے ہیں جن میں کسی نہ کسی موقع پر اور کسی نہ کسی شکل میں ان کی غمگینی ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ اکثر قصائد کی پوری تشبیب، حزنیہ کیفیت کی آئینہ دار ہے لیکن جہاں کہیں تشبیب کے اشعار طرب انگیز ہیں یا فلسفۂ تصوف سے متعلق ہیں وہاں بھی کسی نہ کسی پہلو سے غمگینی و غم انگیزی کا اظہار ہو ہی جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ قصیدہ ہے جو حضرت علی علیہ السلام کی مدح میں تصنیف کیا گیا ہے اس کے ابتدائی اشعار طرب انگیز ہیں۔ بہ ظاہر حزنیہ کلام کا کوئی موقع نہیں مگر ان کا دکھا ہوا دل موقع فراہم ہی کر لیتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

مری قسمت نے پایا سمِ قاتل آبِ حیواں کو
مرے طالع نے اکثر خار ہی کھینچا ہے جو ہر سے
سجے تھے دستہ دستہ جو کبھی بزمِ تمنا میں
کھٹکتے ہیں وہی ارمان اب پہلو میں نشتر سے

ایک شعر میں تو ان احساساتِ غم کو کھل کر ظاہر کر دیا ہے فرماتے ہیں:

آثر کے دل کا جو عالم ہے آہ کیا کہیے
تمام سوز و تب و تاب التہابِ جحیم

لیکن جس قصیدہ میں اس کی فضا غمگینی و غم انگیزی کا ساتھ دیتی نظر آتی ہے وہاں احساسِ غم نے کچھ اور شدت اختیار کر لی ہے۔ مثلاً امام حسین علیہ السلام کی شان میں نظم کیے گئے ایک قصیدہ میں مطلع کے فوراً بعد جو اشعار کہے گئے وہ اس دعوے کی صداقت کے لیے کافی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

کہاں تک آہ کوئی سیلِ اشکِ خوں روکے
کہ دل ہے تا بہ جگر ایک زخمِ دامن دار
یونہی فراق میں آنکھیں لہو جو روئیں گی
خزاں سے ہوں گے نمایاں بہار کے آثار
ہر ایک داغ پہ قربان لعل و گوہر سے
کہاں سے لاؤں وہ الفت کی گرمیٔ بازار

نہ اب وہ عہدِ تمنا کی شورشیں باقی
نہ اب وہ دیدۂ بینا نہ وہ دلِ ہشیار

یہاں اس بات کا موقع نہیں کہ اثر کی غم گینی و غم انگیزی کے اسباب و علل پر بحث کی جائے لیکن جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ جن کے گھر میں دولت کی ریل پیل ہو، جن کا لڑکپن پتنگ بازیوں، میلوں ٹھیلوں، سیر سپاٹوں اور اپنے ہمجولیوں اور دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں بیت بازیوں میں گزرا ہو، جو اپنے دورِ شباب میں ہر بے راہ روی سے بچتے ہوئے بھی اس کی رنگینیوں اور سرمستیوں سے کھل کر لطف اندوز ہوا ہو، جس نے پوری حیات عیش و آرام، امارت و کامرانی، جاہ و حشم اور اقتدار و حکومت کے زیرِ سایہ بڑی کامیابی و کامرانی کے ساتھ بسر کی ہو، اس کا دل :-

"تمام سوز و تب و تاب و التہابِ جحیم"

کا مصداق ہو! حیرت و سخت حیرت کا باعث ہے۔

موضوع کی تنگ دامانی کے باوجود یہ کہنا از بسکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اکثر حقائق کا تجزیہ کرنے سے محسوس ہوا کہ اثر کی زوجہ کے انتقال کے بعد ان کے دل و دماغ پر رنج و الم کے گہرے بادل چھا گئے تھے۔ مرزا جعفر حسین کے یہ کلمات کہ

"جب[1] ان کی شریکِ حیات نے داغِ مفارقت دیا تو اثر مرحوم کا دل بجھ گیا اور حوصلے سرد پڑ گئے۔"

صداقت آفریں ہیں۔ چنانچہ ان کی زندگی بے کیف تھی۔ ان کی دل بستگی کا اگر کوئی سامان تھا تو فقط شعری و ادبی مشغولیات ورنہ زندگی کی رونق ڈوبتے ہوئے سورج کی مانند گہرے اندھیاروں تلے کب کی ڈوب چکی تھی۔

غزل اور نظم میں تو ایسے کتنے ہی مواقع آئے ہیں کہ جب اثر کی محزونی طبع نے اک "آئینہ پیکر" کے لیے بزمِ تمنا سجا کر ذہنی سکون کا سامان فراہم کیا ہے لیکن قصیدہ میں بھی اکثر مقامات ایسے نظر آتے ہیں جہاں انھوں نے اپنے ممدوح کے پیکر میں اپنے محبوب کا جلوہ دیکھا ہے۔ ؎

کچھ ایسا شوق نے جادو کیا حسنِ تخیل پہ
کہ صورت پھر گئی آنکھوں میں اک آئینہ پیکر کی
تجلی پوش بام و در تھے اس کے پرتوِ رخ سے
سمجھ کر یہ کہ منزل ہے مرے نادیدہ دلبر کی

"نادیدہ" جیسے الفاظ سے دھوکا کھانے کی ضرورت نہیں۔ دراصل شاعر نے قصیدہ کی روایت اور اس کی فضا سے مجبور ہو کر نادیدہ جیسے الفاظ و تراکیب استعمال کر کے گویا ممدوح کی تعریف کا پہلو پیدا کر دیا ہے لیکن درحقیقت وہ تحت الشعور کی باریک تہوں میں چھپے اپنے محبوب کا جلوہ دیکھ رہا ہے۔

ان قصائد کے مطالعہ سے مزاجِ اثر کے بعض دلچسپ گوشے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنے شاندار ماضی کا ذکر کسی نہ کسی پہلو سے ضرور کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے دل و دماغ پر ان بیتے ہوئے دنوں کا گہرا اثر ہے۔ ایسے موقعوں پر زبان و بیان پر بے پناہ قدرت کام آتی ہے۔ چنانچہ ربط و تسلسل میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے اور جس پس منظر میں جو بات کہی گئی ہے اس کے متعلق پہلو پیدا کر کے ماضی کا ہلکا پھلکا ذکر کر دیا گیا ہے۔ یہ ذکر اتنا مختصر ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن پر گراں نہیں ہوتا بلکہ اکثر و بیشتر معنویت میں اضافہ کا موجب ہوتا ہے یا شاعر کے متعلق ہمدردی کا ایک ہلکا سا تاثر پیدا کر دیتا ہے۔ اکثر مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ شاعر اپنے ماضی کا ذکر کر رہا ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ کے یہ اشعار :

عزائم تیرے نامحکم، تری ہمت شکستہ پا
یہ حالت اور دم بھرتا ہے عشقِ مرتضائی کا
نہ کیوں کانپ کانپ اٹھے مصائب کے تصور سے
اشارہ جس کو تڑپائے سرِ انگشتِ حنائی کا

---

[1] اثر نمبر صفحہ ۲۸ (رسالہ نیا دور۔ لکھنؤ)

یہاں تک تو ملت بیضا کی موجودہ روش پر تنقید و تبصرہ تھا مگر آگے کا شعر بالخصوص اس کا پہلا مصرعہ اثر کے مزاج کے اس پہلو کی سچی تصویر پیش کر رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

نہ ہمت ہے نہ جرات ہے نہ شوکت ہے نہ ثروت ہے
مگر پھر بھی خروش و جوش بے جا خودستائی کا

اسی طرح ایک اور قصیدہ میں یہ شعر:

وہ دن بھی عجب دن تھے ہر وقت رہا کرتا
اک شکر کا عالم سا بے بادہ و پیمانہ

اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔

زیر بحث قصائد کے مطالعہ سے جس اثر کی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے وہ اس اثر سے قطعاً مختلف نہیں جو گوشت پوست کا اثر تھا۔ مثلاً وہ زندگی میں کبھی کسی شخصیت سے مرعوب نہ ہوئے کبھی جاہ و حشم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھا، اپنے عمل سے ہمیشہ قناعت پسندی اور صبر و شکر کا مظاہرہ کیا، دولت و حشمت کا ان کے مزاج پر غلط اثر نہ پڑا، خلوص محبت اور انسانیت کو ہمیشہ گلے سے لگائے رکھا، بلکہ اس کو نوع انسان کے پھلنے پھولنے کا ذریعہ اور تکوین کائنات کا باعث جانا۔ چنانچہ اثر کا بڑا کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے کردار و مزاج کے ان بنیادی عناصر کو اپنے فن کے اندر پوشیدہ کر دیا ہے اثر کے قصائد ان خصوصیات سے مالامال ہیں۔

ان آنکھوں میں زمانے کا تحشم آ نہیں سکتا
ان آنکھوں سے زیارت کی ہے میں نے قبر اطہر کی

دولت فقر مل گئی، دل ہے غنی، نگاہ سیر
صولت سد سکندری عشق برہنہ سر میں ہے

بہ فیض پیر میخانہ کہ جس سے مجھ کو بیعت ہے
محبت میرا مشرب ہے، محبت زندگی بھر کی

اثر نے قصیدہ کی عام روایت سے انحراف کرتے ہوئے اس کی اساس صحیح اسلامی جذبہ اور ٹھوس تاریخی حقائق پر رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد بے جا مبالغہ آرائی سے یکسر پاک ہیں۔ لب و لہجہ میں اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ اس میں بلا کا سوز اور میٹھا میٹھا درد پایا جاتا ہے۔ افکار و خیالات میں گہرائی اور گیرائی اور انداز بیان میں گرمی و شدت کا احساس ہوتا ہے انھوں نے ان قصائد کو محض تو انا، رسمایا ڈرامیا نہیں کہا، بلکہ ان کے وہ جذبات خیالات اور آن کا وہ درد قومی، جو اُن کے اندر ہیجان و اضطراب کا باعث تھا ان قصائد کی تخلیق کا سبب بنا۔ گویا اثر نے قصیدہ جیسی نیم مردہ صنفِ سخن کو جسے شعرائے کرام نے مالی منفعت کے پیش نظر امیروں، رئیسوں اور شاہانِ وقت کی بے جا تعریف، مبالغہ، خوشامد اور تعلّی سے بے اثر کر دیا تھا۔ اس صنفِ سخن میں تعمیری نقطۂ نظر اپنا کر اس کے تن مردہ میں گویا جان ڈال دی۔

اثر نہ سیاست داں تھے نہ مبلغ اسلام۔ چنانچہ ان کے کلام میں ملکی سیاست سے ایک طرح کی بے تعلقی نظر آتی ہے، اسی طرح مذہبی تبلیغ ان کا شیوہ نہ تھا۔ پھر بھی وہ جس ملک کے باشندے اور جس مذہب کے پیرو تھے اس سے انھیں بے پناہ عقیدت و بے پایاں خلوص تھا۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا سیاست کی عینک اتار کر انسانیت کی نظروں سے دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا دل کی بے پناہ گہرائیوں کے ساتھ محسوس کیا۔ ان میں انسانیت کا درد بھی تھا اور ایک دھڑکتے ہوئے دل کی حقیقی لرزش بھی۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے جو کچھ بھی محسوس کیا اس کا اظہار بھی برملا کر دیا۔

اثر کے قصائد کا سب سے جاندار پہلو مذہب اسلام سے ان کا شغف اور مسلمانوں کی اخلاقی پستی، نکبت و افلاس پر روشنی ڈالنا ہے۔ ان کی نظر مسلمانوں کے عروج و زوال کے سیکڑوں برس کی کہانی کا احاطہ کر رہی تھی۔

اثر نے تباہ حال مسلمانوں کے زوال کے اسباب کا بغور جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ ان کی تباہی خود ان کے ہاتھوں آئی ہے۔ اس لیے کہ اب ان کی نگاہوں میں وہ سحر نہ رہا جو دلوں کو سحر کر لے، ان کے بازوؤں میں وہ قوت نہ رہی جو ایک جھٹکے کے ساتھ درِ خیبر اکھاڑ کر در مقصود حاصل کر لے۔ انھیں اپنے حالات سے جنگ کرنے کے بجائے آپسی جنگ و جدال ہی سے فرصت نہیں۔ ان کے اندر نہ عمل کا جوش رہا نہ ایثار و سرفروشی کے جذبات۔ جہالت توہم پرستی، گمراہی اور غفلت شعاریوں کا دور دورہ ہے، ان کے دل سیاہ ہو چکے ہیں۔ بغض و عناد

اور مطلب پرستیوں نے انھیں پارہ پارہ کر دیا ہے۔ جہالت نے آنکھوں پہ ایسا گہرا پردہ ڈال رکھا ہے کہ انھیں وہ تلخ حقائق نظر ہی نہیں آتے جو ان کی تباہی کا باعث ہیں۔ ہاں اگر کوئی نظر آتا ہے تو وہ ہوا و ہوس کے رنگین مناظر ہیں جن کے جلوؤں سے آنکھیں سینکنے کو دل بیچین رہتے ہیں۔

درد قومی کے کھلے اظہار اور ملت بیضا پر اس کی کوتاہیوں اور بداعمالیوں کے لیے سخت تنقید و تبصرہ کے بعد شاعر خدائے بزرگ و برتر کے حضور میں دست دعا دراز کرتے ہوئے بڑی عاجزی کے ساتھ کہتا ہے:

ترے حبیب کی امت ہیں، رحم کر یارب
غنی ہے ذات تیری اور تیرا لطف عمیم
رگوں میں غیرت اسلام کا لہو بھر دے
ترے کرم سے نہیں دور یا غفور و رحیم

اثر کے قصائد اپنے دامن میں اخلاقیات کا ایک جہان رکھتے ہیں اولاً جن پاک نفوس کی مدح میں ان اشعار کو نظم کیا گیا ہے ان کی سیرت و شخصیت بذات خود اخلاق و تہذیب کا سرچشمہ ہے لیکن شاعر نے جس خلوص اور حسن فنی چابکدستی کے ساتھ ان منارہ علم و نور کی سیرت و کردار کو ان کے افعال و اقوال کی روشنی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے وہ ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اکثر قصائد میں معصومین علیہم السلام کے اقوال کو نظم کر کے اخلاقیات کا درس دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان اشعار کی روشنی میں زور بیان و قدرت کلام کے ساتھ ساتھ آثر کی علمیت اور ژرف نگاہی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ شاعر نے اپنی تخیل پہ بھروسہ کر کے فکر کے جوہر دکھانے کے بجائے ٹھوس تاریخی حقائق کی روشنی میں اسلامی تاریخ کی ان عظیم ہستیوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جنھوں نے اپنے خون سے اسلام کی آبیاری کی تھی۔

اثر اگرچہ عربی زبان سے بخوبی واقف نہ تھے۔ پھر بھی یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے قصائد میں جگہ جگہ عربی زبان کے اقوال، احادیث رسولؐ اور آیات قرآنی کے حوالے نظر آتے ہیں۔ اکثر مقامات پر آیات و احادیث کے ٹکڑے کے ٹکڑے نظم کیے گئے ہیں جس سے اثر کی علمیت اور وسعت مطالعہ کا ایمان لانے کو جی چاہتا ہے:

"واللیل والنہار" کی تفسیر دل پذیر
مہر مبین علیؑ ہیں اور ہیں فاطمہؑ
وارث تاج "صل آتی"، شمع حریم "انما"
مظہر شان کبریا اے زہے عز و برتری

بقول "محک لحمی" یہ سوچتا ہوں میں
حسینؑ کی تھی شہادت کہ نذر پیغمبرؐ

بعض قصائد میں مکالماتی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے ان اشعار کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاعر کو زبان اور اندازِ بیاں پر اس حد تک قدرت و تصرف حاصل ہے کہ وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے جس پیکر اور جس روپ کو چاہتا ہے اپنا لیتا ہے۔ اس قسم کے اشعار میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہو جانے سے جہاں ایک طرف اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے وہاں دوسری طرف شاعر کے مافی الضمیر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

آثر کی قادر الکلامی اور زبان و بیان پہ قدرت و اختیار نے اکثر و بیشتر ایسے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں جنھیں دیکھ کر بے ساختہ زبان پر کلمہ تحسین جاری ہو جاتا ہے۔ اکثر مقامات پر تکرار لفظی کی بنا پر حسن صوت کا بہترین نمونہ نظر آتا ہے۔ اثر جس نے اپنی لطف بیانی اور کمال فن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کبھی کہا تھا۔ سہ

زباں خود رقص کرتی تھی وہ تھا لطف بیاں اپنا
بیاں کو وجد آتا تھا وہ دلکش تھا بیاں اپنا

یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے ہی قائم کیے ہوئے معیار کو برقرار نہ رکھتے چنانچہ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان جب اعجاز بیانی کے جوہر دکھاتی ہے تو وہ بذات خود کمال فن کا جیتا جاگتا نمونہ بن جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر الفاظ کی در و بست، برجستگی و بے ساختگی کے ساتھ ساتھ مصرعوں کی روانی اور تسلسل نے ایک سماں باندھ دیا ہے۔ شعلہ بیانی اور اعجاز کلام کا ایک عمدہ نمونہ پیش خدمت ہے:

کیسی بہار آئی ہے کہ غنچے ہیں تشنہ کام
گل ہائے نو رسیدہ خونیں کفن تمام

ماتم کدے کا صحن چمن پر ہے اشتباہ
بدلی ہوئی ہوائیں ہیں بگڑا ہوا انتظام
شادابیوں پہ چھائی ہوئی ہیں اداسیاں
نسرین و نسترن کے شکستہ پڑے ہیں جام
سنبل کی زلف شانے سے بیگانہ ہو گئی
سبزے پہ اوس پڑ گئی بھولی صبا خرام
نرگس کو یاد آنکھ جھپکنا نہیں رہا
سوسن میں جیسے سکت ہی نہیں طاقت کلام
شبنم ہے آبدیدہ تو گریاں ہے جوئبار
بجھتا ہوا چراغِ سحر ہے کہ بزم شام

—— ؎ ——

اثر نے اپنے قصائد میں پورے طور پر فنی لوازم کی پابندی نہیں کی ہے۔ ائمۂ فن نے اس صنف سخن کو جن اجزائے ترکیبی سے ترتیب دے کر دیگر اصناف کے ہم دوش لا کھڑا کیا تھا۔ اثر نے ان اصولوں سے اگرچہ مکمل انحراف تو نہیں کیا ہے مگر ان کی مکمل پیروی بھی نہیں کی ہے اس لیے فن کے نقطۂ نظر سے ان قصائد کا جائزہ لینے والوں کو تھوڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایسا نہیں تھا کہ شاعر ان اصولوں سے ناواقف یا لاعلم تھا بلکہ اس کے دل و دماغ پر کچھ ایسے خیالات چھائے ہوئے تھے۔ جو اسے اس فنی التزام سے بغاوت کے لیے اکسا رہے تھے۔ دراصل شاعر کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اتنی بے چینی تھی اور اس کے خیالات اظہار کا قالب اختیار کرنے کے لیے اس درجہ مضطرب تھے کہ شاعر نے ان اصولوں سے انحراف کرنا ہی مناسب خیال کیا۔

چنانچہ زیر بحث قصائد میں اکثر و بیشتر تشبیب کے فوراً بعد یعنی گریز کی منزل تک پہونچے بغیر مدح کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعض قصائد میں تشبیب سے لے کر مدح تک تمام اجزائے ترکیبی کا التزام تو کیا گیا ہے مگر تشبیب اور مدح کے درمیان کی کڑی "گریز" کے لیے جس فنی چابکدستی اور جس نفسیاتی انداز بیان کی ضرورت ہوتی ہے شاعر اس سے کما حقہٗ عہدہ برآ نہیں ہو سکا۔ اس طرح اصول فن کے اعتبار سے ان قصائد میں تسلسل کا فقدان نظر آتا ہے گویا قصیدہ کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے مربوط و منسلک نہیں ہیں۔

الغرض قصائد اثر جہاں زبان کی فصاحت، الفاظ کے حسن استعمال، محاورہ کی دل آویزی و برجستگی، تشبیہ و استعارہ کی ندرت و تازگی، انداز بیان کی دلکشی و تیکھے پن اور جذبہ کی صداقت و اثر آفرینی کے لیے قابل قدر ہیں وہاں ان کی قدر و قیمت اس بات میں بھی ہے کہ ان کے ذریعہ ایک ایسی قوم جو جہد عمل سے کوسوں دور رہی، اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے کی بھی تبلیغ کی گئی ہے۔ اثر کی یہ کوشش قابل صد ستائش ہے۔ ہمیں ان کے شاعرانہ مرتبہ کا تعین کرتے وقت ان باتوں کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا۔

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

یہ ہے میرا ہندوستان مجموعہ کلام خضر برنی۔ قیمت: دس روپیہ۔ صفحات ۱۷۶ ملنے کا پتہ۔ ادبی سنگم جامعہ نگر۔ نئی دہلی

ادب برائے ادب یا ادب برائے عوام متنازعہ مسئلہ بن گیا ہے۔ عام و خواص کے درمیان یہ خلیج پر کرنے کے لیے چند ادیبوں اور شاعروں نے میانہ روی کو ترجیح دی ہے زبان کے ساتھ ہمدردی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ دقیق الفاظ کی بھرمار یا عامیانہ انداز دونوں ہی معاشرہ کے لیے مفید اور کارآمد نہیں، حالات اور رجحانات کے تقاضوں کے پیش نظر عوام الناس کی ترجمانی اور ذہنی اصلاح کا انداز مفکرین فن کے لیے نہایت ضروری ہے۔ آج کے دور میں ادب کو ایک اصلاحی ہتھیار کے طور پر اختیار کرنا اس لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ دیگر زبانوں کے ادب کے دائرے وسیع تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے پھیلاؤ اور بناؤ سنگھار کو دیکھ کر اندیشہ لاحق ہے کہ آنے والی نسلوں میں قدیم ادب کا فقدان ہو جائے۔ یہ ٹھیک ہی ہے کہ ہمیں نئی قدروں کے دوش بہ دوش پرانی قدروں کے سائے میں ہر گام پر نیا نشیمن تعمیر کرنا ہے نئے اسلوب کو اپنانا ہے جدید استعارے و محاورے اس میں سمونے ہیں لیکن پرانی قدروں سے محروم ہونا زبان و ادب سے دوستی نہیں محض بنے بندھے اصولوں اور ضابطوں کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھنا ہے، اردو زبان میں بنیادی طور پر اس کی گنجائش موجود ہے۔ یہ لشکری زبان اپنے قلب میں بے پناہ وسعت رکھتی ہے دنیا کی کسی بھی زبان کا لفظ اس کے اندر پڑنے کے بعد نامانوس نہیں رہتا۔ سنسکرت، فارسی، عربی کے علاوہ بھی ہزارہا الفاظ اردو زبان کے زیور بن چکے ہیں اور یہی اس کی ہمہ گیریت اور شہرت کا سبب ہیں۔ زیر نظر مجموعہ کلام یہ ہے میرا ہندوستان میں خضر برنی نے انداز و اسلوب میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے۔ نئی نسل کی ترجمانی اور قدیم ادب کا امتزاج اس کتاب کا عنوان ہیں۔ خضر برنی ایک درجن کتابوں کے مصنف اور مشہور شاعر و ادیب ہیں۔ ایک پرانے صحافی اور خوش فکر شاعر سے تعارف رسمی نہیں، میں اپنے دل کی گہرائی کے ساتھ ان کے کلام کا مداح ہوں اور یقین ہے آپ بھی کلام سننے کے بعد جھوم اٹھیں گے:

جب بھی کسی نے حق کی صدائیں بلند کیں
دیکھا گیا ہے وقت کے تیور بدل گئے

تشنہ لبی کا شور مچاتا رہا غریب — نادان اس کو پھر بھی سمندر کہے گئے
اپنی ہستی کی حقیقت پہ جو کرلے کچھ غور — پھر کسی بات پہ انسان کو دعویٰ نہ رہے
جسم سے جان نکل جائے اگر بے خودی — زخم قاتل نہ رہے، نازِ مسیحا نہ رہے
پیار سے دامن پکڑنے کا سلیقہ ہے انہیں — نرم ہے غنچوں سے کانٹوں کا مزاج
کرتے ہیں رشک ہم سے فرشتے خدا گواہ — کچھ بے خودی میں ایسے ہی سجدے ادا ہوئے

یہ چند اشعار بطور نمونہ لکھ دیے ہیں، میری اپنی نظر میں تمام دیوان ہر لحاظ سے خوب صورت ہے۔ عمدہ گرد پوش کتابت و طباعت اچھی ہے۔

———— عشرت صدیقی

جدید ادبی جائزے (حصہ نظم) تالیف: ڈاکٹر آصفہ زمانی ایم۔اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی صفحات ۲۰۰، سائز $\frac{20\times30}{16}$۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت: آٹھ روپے سنہ اشاعت۔ ۱۹۷۵ء۔ پبلشرز: یونائیٹڈ پبلشرز، ویسٹ نیا گاؤں لکھنؤ۔ ملنے کا پتہ: دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

پیش نظر کتاب جدید ادبی جائزے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ڈاکٹر آصفہ زمانی کے ادبی مقالات کا مجموعہ ہے جسے انھوں نے اردو ادبیات نظم میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے اس طرح مرتب کیا ہے کہ وہ ان کے امتحان میں معاون ہو۔ ادب کا مطالعہ کرنے کے لیے جس شعور اور فکر و نظر کی ضرورت ہوتی ہے اس سے یہ کتاب کما حقہ مزین ہے۔ آصفہ صاحبہ کے نقد و تبصرہ میں مشرقی روایات کے احترام کے ساتھ ساتھ فکر مغرب سے استفادہ کے نمونے بھی جابجا نظر آتے ہیں اور یہ کوئی بری بات نہیں، جہاں سے جو اچھی چیز ملے اسے قبول کرنا ہی چاہیے۔ رنگین شیشوں سے کسی چیز کو دیکھا جائے تو وہ شیشوں ہی کی ہم رنگ نظر آئے گی اسی لیے آصفہ صاحبہ نے اس سے گریز کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مواد کی فراہمی حوالوں کے ذکر اور طرز نگارش کے لحاظ سے بھی کتاب کی اہمیت مسلم ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب نہ صرف طلبہ بلکہ ادب اردو کے عام قارئین کے لیے بھی مفید ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر انوار الحسن

نیا دور
جلد ۳۱ نمبر ۸
نومبر ۱۹۷۵ء

ایڈیٹر: خورشید احمد
جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: کماری سرلا ساہنی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے
ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن بِبھاگ۔ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ، یوپی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ، یوپی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

نومبر کے مہینے کو ایک خصوصی امتیاز یہ حاصل ہے کہ اس میں عہد جدید کے ہندوستان کی دو عظیم المرتبت ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ایک کا یوم ولادت ۱۴ نومبر اور دوسری کا ۱۹ نومبر ہے۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی کے دستِ راست بن کر ہندوستان کو آزاد کرانے کے بعد اسے اقوامِ عالم کی برادری میں ایک ممتاز جگہ دلانے، اس کی آواز کو باوقار اور پُر وزن بنانے، اندرون ملک سماج وادی نظام کی بنیاد پر قومی معیشت کو مستحکم کرنے اور دنیا کو بقائے باہم، امن و سلامتی اور ناوابستگی کا پیغام دینے والے جس عظیم رہنما، مدبر، سیاست داں، مفکر، ادیب اور دانشور کی ولادت ۱۴ نومبر کو ہوئی اس کا نام نامی اور اسم گرامی جواہر لال نہرو ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آزادی کے بعد جواہر لال جی ہندوستان کے وزیر اعظم منتخب ہوئے اور اپنی زندگی تک وزیر اعظم رہے۔ لیکن ان کی شہرت و عظمت وزیر اعظم ہونے کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ان کی حق گوئی، امن پسندی، کمزور ملکوں کی انصاف پسندانہ حمایت اور ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے خلاف احتجاج نیز جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم کی علمبرداری کے باعث نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے ممتاز ترین رہنماؤں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ یہ ایک عجیب اور خوش آیند اتفاق ہے کہ دوسری عظیم ہستی کی ولادت بھی ممتازِ نہرو خاندان اور اسی نومبر کے مہینے میں ۱۹ تاریخ کو ہوئی۔ عظیم جواہر لال کی عظیم بیٹی شریمتی اندرا گاندھی نے انتہائی مشکل حالات، زبردست بحران اور سخت چیلنجوں کے ماحول میں جس طرح ملک کی کشتی کی ناخدائی کی ہے اس سے ان کی نکتہ رسی، دقیقہ سنجی، اعلا درجہ کی معاملہ فہمی، حسن تدبر اور ہمت شکن حالات میں غیر معمولی عزم و استقلال سے کام لینے کے جوہر ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ ان کی فعال شخصیت اور مسائل و مشکلات کو حل کرنے کے لیے بروقت دلیرانہ فیصلہ کرنے کی زبردست صلاحیت کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

وہ فسطائیت نواز طاقتیں اور انتشار پسند عناصر جو جواہر لال جی کی قد آور اور بلند و بالا شخصیت کے سامنے سر نہیں اٹھا سکی تھیں اندرا جی کے خلاف صف آرا ہو گئیں اور وزیر اعظم ہونے کے بعد جیسے ہی انھوں نے بعض ترقی پسندانہ اقدامات عوام کی بہبود و ترقی کے لیے کرنا شروع کیے ان کے خلاف ایک گہری سازش شروع کر دی گئی۔ ان سازشوں کا مقصد ملک میں انتشار اور بدامنی کی فضا پیدا کر کے اور فرقہ وارانہ جذبات ابھار کر ہماری بنیادی پالیسیوں، ہمارے بنیادی نصب العینوں اور ہماری تہذیبی قدروں کو پامال کرنا اور اس طرح جمہوریت کی جڑ ہی کو منقطع کر دینا تھا۔ کوئی بھی ذمے دار حکومت ملک کی ایکتا، سالمیت اور استحکام کو خاموش تماشائی کی طرح خطرے میں پڑتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ صورت حال سخت کارروائی کی متقاضی تھی۔ چنانچہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ایک نہایت دلیرانہ فیصلہ کیا اور صدر جمہوریہ نے ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا جس کا پر جوش خیر مقدم ملک کے تمام حصوں اور تمام لوگوں کی جانب سے کیا گیا۔ ایمرجنسی یا ہنگامی حالات کے اعلان نے جمہوریت اور ملک کو طوائف الملوکی سے تو بچا لیا لیکن کام یہیں ختم نہیں ہو گیا۔ اصل کام تھا ان ترقی پسندانہ اقدامات کو مستحکم بنانا جو عوام کے فائدے کے لیے پہلے کیے جا چکے ہیں نیز ملک کی معیشت کو مستحکم بنانے اور مختلف طبقوں خاص طور سے غریبوں اور سماج کے کمزور طبقوں اور بندھی آمدنی والوں کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے مزید اقدامات کرنا تاکہ انھیں ترقی کے نئے مواقع، ہموار اور وسیع راستہ مل سکے۔ ایمرجنسی نے اس کے لیے ایک نادر موقع فراہم کر دیا ہے۔ چنانچہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا دوسرا اہم قدم ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کا اعلان تھا۔ جس کا وعدہ انھوں نے ہنگامی حالات کے اعلان پر قوم کے نام اپنے نشری پیغام میں کیا تھا۔ اس پروگرام میں خاص طور سے ملک کے غریب اور دبے کچلے عوام کو محرومیوں اور ناکامیوں سے نجات دلانے کے اقدامات شامل ہیں۔ ملک میں اسی پروگرام پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اتر پردیش وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی پروگرام کو تیزی سے عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری سرگرمی کے ساتھ اقدامات کر رہا ہے۔ خاص طور سے ہریجنوں، سماج کے کمزور طبقوں اور بے زمین کھیت مزدوروں کو اس معاملے میں اولین ترجیح دی جا رہی ہے۔ ان کی راحت رسانی کے لیے ادھر حال میں جو دور رس اقدامات کیے گئے ہیں ان کا مختصر تذکرہ ہم اپنی سابقہ اشاعتوں میں ان سطور میں کر چکے ہیں۔ اس وقت جوت حد بندی قانون کے تحت فاضل قرار پانے والی آراضیات کی تقسیم پردیش کے مختلف ضلعوں میں تیزی سے کی جا رہی ہے تاکہ اس کام کو ۲۹ فروری ۱۹۷۶ء تک مکمل کر لینے کا جو نشانہ مقرر کیا گیا ہے وہ پورا ہو جائے۔ اسی کے ساتھ مکانوں کی تعمیر کے لیے زمینوں کا الاٹمنٹ بھی کیا جاتا ہے، کھیت مزدوروں کے لیے کم سے کم اجرت مقرر کر دی گئی ہے۔ بنکروں کو سوت کی باقاعدہ سپلائی کے لیے ۱۲ کتائی ملیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ امداد باہمی زمرے میں نئی شکر ملوں کے قیام کا بھی تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ ان میں سے چند ملیں اس سال پیرائی شروع کر دیں گی۔ ان ملوں میں ہزاروں مقامی باشندوں کو روزگار فراہم ہوگا۔ غریبوں، ہریجنوں، پچھڑی ہوئی جاتیوں اور مندرج فہرست اقوام و قبائل کو مفت قانونی امداد دینے کے لیے بھی ریاستی حکومت قدم اٹھا چکی ہے اور اس سلسلے میں جو کمیٹی بنائی ہے اس نے اپنا کام شروع بھی کر دیا ہے۔ الغرض یہ اور اس طرح کے دیگر اقدامات حکومت اتر پردیش کی ان پُرخلوص کوششوں کو ظاہر کرتے ہیں جو وہ ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں سرگرمی کے ساتھ کر رہی ہے۔ لیکن اس کام میں کامیابی کے لیے عوام کا اشتراک و تعاون سب سے پہلی شرط ہے اور امید ہے کہ وہ اپنے فرائض دیانت داری اور مستعدی کے ساتھ انجام دینے کے ساتھ ساتھ ۲۰ نکاتی پروگرام کو اور تیزی سے عملی جامہ پہنانے میں بھرپور اشتراک و تعاون دیں گے۔

—— ایڈیٹر

آوارہ

فرقت بنام آوارہ

عنوان کسی عدالتی سمن کا نہیں، میرے نام فرقت کے چند خطوں کا ہے۔ ان کا اسلوب تحریر، طنز و مزاح کا ذوق شہرت کا محتاج نہیں۔ اردو ہندستان ان کی ادبی کاوشوں سے واقف ہے۔ ان خطوں میں آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے بکھرے بکھرے چھوٹے چھوٹے فقروں میں مجھ پر کیسے کیسے تیر برسائے ہیں۔ ایسے تیر، جن کے لیے اب ترستا ہوں۔

فرقت سے غالباً سنہ ۵۰ء میں شناسائی کی بسم اللہ دہلی کالج ہوسٹل میں ہوئی، اور ہمارے مزاج کی طبعی یک رنگی سے یگانگت تک پہنچ گئی تھی۔ میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اور یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ایک المیہ تھی، اور اس المیہ کا نقطۂ عروج ان کی بڑی بے کسی کی موت!! اللھم اغفر۔ میں نے یہ خطوط سن وار ترتیب دیئے ہیں۔ پہلا جولائی سنہ ۵۳ء کا ہے۔ ملاحظہ ہو ترکش کا پہلا تیر:۔ "دانش محل لکھنؤ۔ حضور والا۔ آداب نہ تسلیمات، گڈ گیا تو لکھتا ہوں، قصور معاف، میں آج تک اس راز کی تہہ تک نہ پہنچ سکا کہ یہ آپ نے خراسان کے نقاب پوش پیغمبر المقنع کا بہروپ کیوں رچا رکھا ہے، اور اپنی شخصیت پر آوارگی کا ملمع کیوں چڑھا رکھا ہے؟ آج دانش محل میں آل انڈیا ریڈیو دلی کے اردو نشریات کا تازہ رسالہ "آواز" دیکھ کر سر پیٹ لینے کو تو اٹھتے اٹھتے رہ گئے۔ غضب ہے کہ نہیں، مولانا عبدالماجد دریاباد

گھر بیٹھے آپ کا نشریہ "بانکے" سنتے ہیں، اور آواز کے ایڈیٹر کو لکھتے ہیں۔ پڑھیے، نقل کرتا ہوں: "صدق" ڈاک خانہ دریاباد بارہ بنکی مورخہ ۳ جون سنہ ۱۹۵۳ء۔ جناب من تسلیم۔ آواز کا تازہ پرچہ ابھی پہنچا، اور ایک نظر آپ کے آوارہ کے "بانکے"[1] پر اسی وقت کر گیا۔ شروع کی چند سطریں پڑھ کر چھوڑنے کو دل ہی نہ چاہا اور ختم کر کے ہی دم لیا۔ اور اب ختم کر کے آپ کو مبارک باد کا خط لکھتا ہوں۔ اتنی صاف ستھری پاکیزہ، شستہ، شیریں اردو بولنے اور لکھنے والے اب ہیں کہاں۔ اب مجھے افسوس اس پر ہو رہا ہے کہ اس نشریہ کو اپنے سیٹ پر سنا کیوں نہ تھا۔ پڑھ لینے میں وہ لطف کہاں، اپنے کانوں سے سننے کی بات ہی کچھ اور ہوتی۔ بہرحال دل سے نکلی ہوئی داد و مبارک باد آپ خود قبول کیجیے اور آوارہ صاحب کو (وہ جو کوئی بھی ہوں) بھی سنا دیجیے۔ میرا بس چلتا تو اس کا ریکارڈ تیار کرا لیتا، اور بار بار نشر کرتا رہتا۔ دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ اب ایسی زبان جاننے والے عنقا ہو گئے ہیں، آنکھیں ان کی صورت کو اور کان ان کی آواز کو ترستے ہیں۔ داد صرف زبان کی نہیں دے رہا ہوں، جو باتیں بیان کیں اور جو خیالات ظاہر کیے سب قابل داد ہیں۔"

دیکھیے حضور والا اپنے کرتوت! خیریت اور اس خط کے جواب کا منتظر رہوں گا۔"

میں دلی کو اللہ کے سپرد کر کے وطن آ گیا۔ اور فرقت کو اس حالت میں

[1] "بانکے" اور اس کے ہم وزن ۲۵ خاکوں کا مجموعہ "اپنی موج میں" فرقت کے ایما ہی سے ۷۵ء میں چھپا اور شائع ہو چکا ہے۔ لطف یہ کہ اس کا پیش لفظ مولانا عبدالماجد ہی نے لکھا، اور یہ راز افشا کر دیا کہ نشریہ کس کا تھا۔

چھوڑا کہ اب دم ان کا ہم دم تھا۔ اگر چھٹے چھ ماہے کھڑی سواری دلی جانا ہوتا، ان سے ملاقات کا موقع نہ ملتا۔ سنہ کے ایک خط میں لکھتے ہیں "حضور والا۔ اب ہمارے آپ کے تعلقات اس منزل میں آپہنچے ہیں کہ آپ دور سے کترا کے نکل جاتے ہیں، اور دوسروں کی زبانی آپ کی آمد و رفت کی اطلاع ہوتی ہے ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

فاروق کے خط سے دو شکاریوں کی ملاقات کا حال معلوم ہوا۔ اگر سنا ہے کہ شکارگاہ سے واپسی پر دونوں ایک دوسرے پر تالیاں ٹھونکتے اپنے اپنے ٹھکانے پر واپس آئے۔ کل شب میں الیا دورہ پڑا کہ گھر بھر میں چند گھنٹوں کے لیے اچھی خاصی چہل پہل رہی۔ اور صبح جب بجائے میت کے مردے کو زینہ سے نکلتے دیکھا گیا تو محلہ قبرستان والوں نے خوب خوب تالیاں ٹھونکیں۔ اس ڈالڈا کے دور میں ساٹھ کی منزل تک پہنچنا کوئی مذاق تھوڑے ہے۔ خالص گھی کھانے والے اگر سو برس سے پہلے مرتے ہیں تو ان کی اس حرکت کو ہرگز معاف نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ڈالڈا والے اگر ساٹھ تک پہنچ جائیں تو سمجھ لیجیے کہ ان کے خون میں چمر گدھ کا میل ہے۔ ایک دن محلہ رودگران جاکر معلوم ہوا کہ وہ گھونسیں اور چھپکلیاں جن کو جناب نے خون پلا پلا کر جوان کیا تھا، ان میں سے بیشتر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اور جو باقی سے اوپر ہیں انھوں نے چوڑیاں توڑ کر رانڈوں کا لباس پہن لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب گھر والا نہیں تو کیسا سہاگ اور کیسی چوڑیاں! ہے ہے آپ کے جانے کے بعد کیسی کیسی ڈال کی ٹوٹی جوان جہان گھونسیں رانڈ ہوئی ہیں۔ دلی کب تک آنے کا ارادہ ہے بچے بہت یاد کرتے ہیں؟"

کہاں تو روز چہرے پر صیقل ہوتی تھی، اور طرح طرح کی پالشوں سے دونوں رخسار اتنے چکائے جاتے کہ آئینے کا دھوکا ہو، اور آپ کو اپنا عکس دکھائی دینے لگے، کہاں گھر آتے ہی میں نے دلی کی کیچلی اتاری، اور اپنے سراپا میں ایک نئی مد بڑھائی، یعنی داڑھی رکھ لی۔ اور شامت جو آئے فرقت کو اس کا یا پلٹ کی اطلاع دے دی۔ یہ دم تقسہ ایک سانحہ تھا جس کا ردعمل اُن کے قلم سے سنیے۔

"بہاڑی بھوجلہ، دلی ۱۱ فروری ۱۹۷۱ء۔ بات بھی کچھ کوئی العجب کرکے۔ حضور والا۔ ایک مولانا ملیح آبادی گزرے ہیں، ان کے پاس بھی آپ جیسی ایک داڑھی اسی وضع قطع کی تھی جسے ہر چند کہیں کہ تھی، نہیں تھی۔ وہ گوہ کی طرح ان کی ٹھوڑی پر چپکی رہتی تھی، چہرے کے بقیہ علاقے سے اُس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر نہ جانے اُس سے کون سی گستاخی سرزد ہوئی کہ مولانا نے اسے مونڈ کر اُس کی ممی رکھ لی، چنانچہ ہر آنے جانے والے کو وہ اس کی ممی ضرور دکھاتے تھے۔ مجھے جب آپ کا خیال آتا ہے تو نہ جانے کیوں مولانا مرحوم کی داڑھی یاد آجاتی ہے چونکہ مولانا عبدالماجد صاحب کے مضمون کے سلسلے میں آپ نے وعدہ کیا تھا کہ عنقریب بھیج دوں گا، مضمون ابھی تک نہیں پہنچا، اس لیے مجھے اندیشہ ہے کہ آپ نے کہیں وہ باسی داڑھی تو نہیں رکھ لی ہے، جسے مونڈ کر آپ نے بھی رکھ لیا ہے۔ میں آپ کو آپ کی موجودہ داڑھی کا واسطہ دیتا ہوں کہ اپنا مضمون بھجوا دیجیے۔ خدا جانتا ہے آج کل نہ جانے کیوں آپ اس قدر یاد آتے ہیں، بچے آداب گزار ہیں؟"

اللہ جانے میری داڑھی سے ایسا کیا بیر تھا جو ۱۷ اپریل کے خط میں لکھتے ہیں "مسودہ مل گیا۔ میں نے دو روز میں پورا مجموعہ پڑھ ڈالا، پہلے کانوں سے سنا تھا، اس مرتبہ آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اب توکلہ پر جو نور آیا تھا، امید ہے کہ اس میں کیری آگئی ہوگی۔ خدا جانتا ہے جب آپ کا چہرہ یاد آتا ہے تو بے اختیار اسے داڑھی زدہ دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ کاش اس پر خضاب کی مالش نہ ہو۔ ٹھوڑی پر اچھی بھلی سفید بیل لگی معلوم ہوگی۔ بچے آپ کو بے حد یاد کرتے ہیں۔ دیکھیے ادھر سے ارنی اور اُدھر سے لن ترانی کا سلسلہ کب تک رہے۔"

مئی کا مہینہ دیکھیے، اور شکار کے پیچھے میرے جنگل جنگل گھومنے کی داد دیجیے۔ لو لگ گئی۔ لوٹ پیٹ کے اچھا ہوا تو اتنا کمزور تھا کہ چھڑی کے بل چلتا۔ فرقت نے مزاج پرسی کا خط لکھا مگر اپنی چوٹ سے نہ چوکے۔ لکھتے ہیں "آپ کا خط مل گیا۔ یہ خوب کہی کہ جب جوان ہونے

آسے تو چھڑی کا سہارا ڈھونڈھا۔ میں نے آپ کا خط پڑھ کے چاک کر دیا تاکہ کسی لڑکی کے نظر نہ پڑ جائے جو ادھر لینے کے دینے پڑ جائیں۔ یہاں بہت سی لڑکیاں آپ کے انتظار میں اپنی جوانی کے جل ساز لیے بیٹھی ہیں۔ اب اگر آپ نے مزید انتظار کرایا تو سب کی سب چوڑیاں پہن کے پی لیں گی۔ اور اگر خدا نخواستہ یہ صورت ہوئی تو ان کی پھکوائی کون دے گا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد آپ کی کتاب شائع ہو جائے اور آپ اس کی مطبوعہ کاپی دلہن کو پہلی شب میں یہ کہہ کر منہ دکھائی میں نذر کر دیں ع

برگِ سبز است تحفۂ درویش

اس سے زیادہ کی سکت تو آپ میں نظر نہیں آتی۔ اپریل گزرا، مئی کا پہلا ہفتہ ختم پر آیا، مگر آپ لاپتہ ہیں، اور ادھر لڑکیاں رات دن بابل گا رہی ہیں۔ کیا آپ واقعی نہیں آئیں گے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی غیبت میں ان نامراد لڑکیوں کا کیا حشر ہوگا۔ اور یہ لن ترانی کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ خدا کرے اس درمیان میں آپ نے گھر بیٹھے ایک آدھ شیر، دس پانچ ہرن، اور پندرہ بیس نیل گھوڑے مار لیے ہوں۔ نیچے آداب گزار ہیں اور مایوسی کی حد تک منتظر۔ کل ایک لڑکا ایک سو ساٹھ روپے اور ایک عدد بالٹی لے کر رفو چکر ہو گیا۔ جتنا اوپر سے معصوم نظر آتا تھا اتنا ہی اندر سے بالی نکلا۔

فرقت سبزی خور تھے، میں برسوں ان کا ہم طعام رہا ہوں۔ ارہر کی دال خشکہ، موسم کی ترکاری، نیبو کے عرق میں ہری مرچیں اور پیاز کے لچھے ان کی من بھاتی غذا تھی۔ میں انھیں چھیڑنے کے لیے اپنے شکار اور اسلحہ کا ذکر کرتا، اور وہ بہ ہمہ سنجیدگی مجھ پر فقرے کستے۔ ۲۲ جولائی ۱۹۷۱ء کا خط ہے، لکھتے ہیں: "حضور والا خدا کی قسم جس وقت آپ کو خط لکھنے بیٹھتا ہوں، دل چاہتا ہے کہ لکھتا ہی رہوں۔ معلوم نہیں کس کا کاندھا فالتو مل گیا ہے، جو اس طرح اپنا کاندھا سمجھ کر استعمال کر رہے ہیں۔ اُف ری جوانی، ہائے رے زمانے۔ مجھے حیرت ہے کہ عام طور پر لوگ اس عمر میں حقہ پینے لگتے ہیں، مگر آپ ہیں کہ بندوق پر بندوقیں چھڑائے چلے جا رہے ہیں، اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ آپ دلی نہیں آئیں گے، اور اسی طرح وعدوں پر ترساتے رہیں گے، دیکھیے اکتوبر بھی دور نہیں، آپ آتے ہیں کہ نہیں۔"

فیض آباد سے کسی نادیدہ مہربان کا خط آیا، فرماتے ہیں "مکرمی خیال ہوتا ہے شاید کبھی کسی نے آپ کے متعلق کہا تھا کہ پہلے کسی وقت آپ بھی پولیس سے متعلق تھے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ آپ کا اس محکمے سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ خیر۔ اب اپنے حافظے اور معلومات پر زور ڈال کر بتائیے کہ آپ کے علم میں کوئی ایسے پولیس "افسران" رہے ہیں جن کی شعری اور ادبی خدمات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔" جواباً میں نے لکھا "شاعر اور پولیس کے متعلق مجھے اتنا ہی علم ہے کہ دونوں حیوانِ ناطق ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں میں کوئی قدر مشترک ہے تو میرے فہم سے بالاتر۔ آگے آیت والسلام"۔ میرے اس کورے جواب سے یقیناً صاحب موصوف کی تشفی نہیں ہوئی اور بقول سودا ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

فرقت سے بھی یہی سوال کیا گیا۔ جس کے بالواسطہ جواب کے لیے ۱۴ جون ۱۹۷۲ء کو دانش محل لکھنؤ سے مجھے لکھا گیا "ایک ضروری بات دریافت طلب ہے۔ وہ یہ کہ اردو کے وہ کون ادیب اور شاعر ہوئے ہیں جو پولیس میں ملازم رہے ہوں۔ ریاض خیر آبادی، نیاز فتحپوری، فیض جھنجھانوی کے بارے میں تو مجھے علم ہے، ان کے علاوہ اگر کوئی دوسرے صاحبان ہوں، ان کے بارے میں لکھیے۔ کہیں اپنے بارے میں نہ لکھ دیجیے گا کہ میں بھی پولیس میں رہا ہوں، ورنہ پولیس کے محکمے سے بھی نفرت ہو جائے گی۔ منع کرتے تھے کہ اتنا شکار نہ کیجیے مگر نہ ماننا تھا نہ مانے، نتیجہ یہ ہوا کہ آپریشن کراتے ہی بن پڑا۔ اب تو آپ دلی آتے ہیں تو ادھر ہی ادھر نکل جاتے ہیں۔ میرے لیے یہ مر جانے کا مقام ہے۔ مجھے خورشید کی زبانی معلوم ہوا کہ ادھر نصیب اعدا آپ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اور اس سلسلے میں خاصی تکلیف رہی۔ خورشید نے یہ بھی بتایا کہ آپ بے حد کمزور ہو گئے ہیں۔ بچے آداب گزار ہیں۔"

---

۱۶ جولائی ۱۹۷۲ء۔ محترمی سلام مسنون۔ میں لکھنؤ سے ۱۳ کی

شب میں روانہ ہوکر دوسرے دن سویرے دلّی آگیا۔ آپ نے دانش محل کے ذریعہ جو خط لکھا تھا اس سے آپ کی تندرستی کا حال جان کر بے حد تکلیف ہوئی۔ اس وقت میری عمر باسٹھ کی لپیٹ میں ہے اور اسی کے ساتھ دمہ کے دوروں کا سلسلہ بھی پابندی سے جاری ہے۔ دمہ کا ہر دورہ موت کا مترادف ہوتا ہے۔ ایک دن لکھنؤ میں ایسا دورہ پڑا تھا یقین کامل تھا کہ اس روز روز کی مصیبتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی، مگر بے غیرتی کا بھلا ہو کہ اس وقت بیٹھا آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ خدا کرے آپ سے دو ایک مرتبہ زندگی میں اور ملاقات ہو جائے اس کے بعد نہ جانے آپ دلّی آئیں تو معلوم ہو کر مجھے مرے سال بھر ہو چکا ہے۔ بہرصورت میں نے تقریباً زندگی میں کسی ذمہ داری سے روگردانی اختیار نہیں کی۔ اب تو ہر وقت سفر کی تیاری ہے۔

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

وہاں ایک مشاعرہ تو کیا ہوتا جو آپ لوگوں سے ملاقات کا وسیلہ بنتا۔ تاج، طیب اور صبوحی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ رعنا نے بھی امسال سیکنڈ ڈویژن میں ایم اے کر لیا۔" میں نے ان دوروں کی شدت کا یہ عالم بھی دیکھا، اور اس یقین کے ساتھ ان کے گھر سے نکلا ہوں کہ اب وہ چند گھڑی کے مہمان ہیں

"۲۹ر جولائی سنہ ۷۲ء۔ محترمی آداب عرض۔ آپ کا خط مل گیا آج کل شدید دورے پڑ رہے ہیں۔ ہر دورہ پیغام اجل سے کم نہیں ہوتا تین دورے تابڑ توڑ پڑ چکے ہیں۔ کل شب میں جو دورہ پڑا وہ موت سے کم اذیت رساں نہ تھا۔ اس وقت خط لکھ رہا ہوں مگر ہاتھ کانپ رہا ہے۔ دیکھیے کب تک اس زندگی کے بار کو لادے پھرنا پڑتا ہے۔ خدا کرے اب کے جب آپ دلّی آئیں تو آپ کو معلوم ہو کر وہ تو آپ کا انتظار کرتے کرتے مرحوم ہو گئے!۔"

اس خط کی شان تحریر ان کی سقیم حالت کا سچا عکس ہے۔ قلم میں لرزش الفاظ مٹے مٹے، سطریں کہیں پوری کہیں ادھوری' خدا خیر کرے۔

"۱۵ر اگست سنہ ۷۲ء۔ پہاڑی بھوجلہ دلی۔ حضور والا۔ سلام مسنون۔ آپ کے تمام خطوط مجھے مل گئے! آج کل دمہ کے شدید دورے پڑ رہے ہیں۔ ۶۲ سال کی منزل میں ہوں۔ میں والدا کا اور آپ خالص گھی کے بنے ہوئے ہیں۔ اگر میں بھی ایسے مال مسالے کا بنا ہوا ہوتا تو اب تک آپ سے میلوں بلکہ برسوں آگے ہوتا۔ صدق جدید میں آپ کا استفسار پڑھا' اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی کا نوٹ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ مولانا آپ کی قابلیت اور طرز تحریر سے کس درجہ متاثر ہیں۔ آج ہی نیا دور کے سلور جوبلی نمبر میں آپ کا مضمون پڑھ کر اس کمزوری میں بھی آپ کی جوانی جگہ جگہ' ادھر ادھر مسمریزم کی مشق کرتی اور رشکار کھیلتی نظر آئی۔ خدا کرے اس مضمون کو جوان لڑکیوں نے نہ پڑھ لیا ہو ورنہ پیاموں کی بھرمار شروع ہو جائے گا۔ کس درجہ پاکیزہ زبان ہے۔ عبدالماجد صاحب اسی وجہ سے اس عمر میں آپ کے عاشقوں میں معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے اپنے عاشقوں میں واعظ اور محتسب کو بھی نہیں چھوڑا۔ پرسوں بہت ہی سخت دورہ پڑا تھا' نہ جانے کیسے بچ گیا۔ اب میں بالکل پا بہ رکاب ہوں۔ بچے آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ آپ کے محکمہ والوں کو خدا غارت کرے جنھوں نے ہم لوگوں سے آپ کو چھڑا لیا۔"

ضروری کام تھا، دلّی جانا پڑا۔ دن لیے فرقت سے ملنے گیا گھر میں اکیلے تھے' ادھر طرفہ ماجرا یہ کہ ایک اصیل مرغ کو کھڑے تلا ہوا انڈا کھلا رہے تھے۔ بہ ہمہ شوخی و شگفتگی بولے "آگے نہ بڑھیے گا' بھوکا شریف' پیٹ بھرا گنوار دونوں خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ مادر زاد اصیل ہے' نصیب دشمناں چوٹ کر بیٹھا تو میں کیا کر لوں گا۔ میرا شوق نہیں' آپ کے بھتیجے روفی کا ہے۔ پال کے مجھ پہ ڈال گیا" مرغ سے نمٹ کر اسے کمرے میں بند کیا۔ غازی آباد کے مشاعرے میں جا رہے تھے۔ باتیں اور شکوے شکایتیں کرتے ہم دونوں نکلے۔ جامع مسجد تک ساتھ رہا۔ وہ کشمیری دروازے بس کے اڈے کو' اور میں دلّی جنکشن۔ یہ میری ان کی آخری ملاقات تھی!"

"۱۴ر جنوری سنہ ۷۳ء۔ جاڑوں کی صبح تھی میں ابھی بیدار نہیں ہوا تھا جو گئی پیروں کی چاپ نے ہشیار کر دیا' اتنا میں کسی نے کہا "اٹھیے' وہ آپ کے فرقت صاحب چل بسے" میری آواز گلے میں اٹک کے رہ گئی۔ دل نے کہا فرقت نہیں ایک زمانہ گزر گیا۔"

★

نذیر بنارسی

قطعات

وہ دِن گئے کہ ستم ڈھا رہا تھا چرخِ کہن بلا ہے آج کا انسان آسماں کے لیے
وہ ساتھ چھوڑ کے بیٹھیں جو ساتھ چل نہ سکیں بلا سے جاں نہ بنیں پورے کارواں کے لیے

نسیمِ فصلِ گل سے کم نہیں رفتار مالن کی قدم کے ساتھ شادابی بڑھی جاتی ہے گلشن کی
جو ہوتی دیر ہر گل پیرہن جلتا نظر آتا گریباں تک چلی آئی تھی بڑھ کر آگ دامن کی

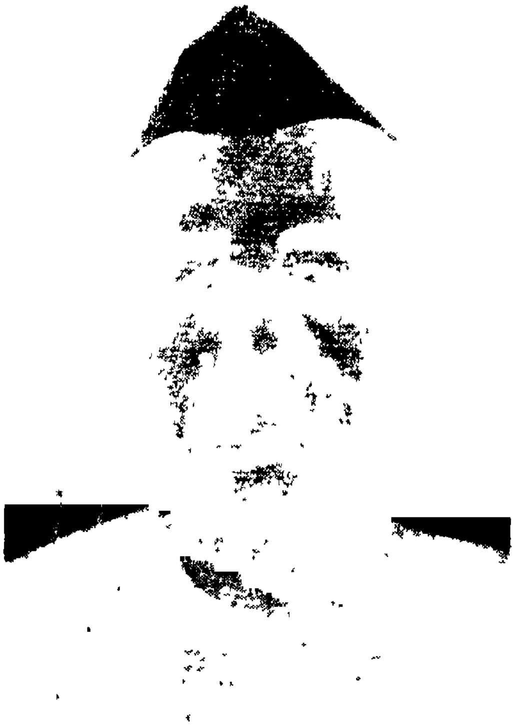
نہ زندگی ہی میں طے ہو تو مرحلہ کیا جو سانس توڑ کے نکلے وہ حوصلہ کیا
جسے سلام نہ منزل کرے وہ رہرو کیا جو زندگی نہ بڑھائے وہ ولولہ کیا

کس کی کوشش نے بچائی کشتیٔ امن و اماں پوچھیے اور ایک اک موج بلا سے پوچھیے
ان کو کیا طوفاں اٹھا کر جو کنارے ہو گئے ناخدا کی مشکلیں تو ناخدا سے پوچھیے

آنکھ اوروں کی تباہی پہ بھی بھر آتی ہے کوئی گھر اجڑے اداسی مرے گھر آتی ہے
میری مشکل ہو کہ ہو سارے جہاں کی مشکل سب کا حل صرف محبت ہی نظر آتی ہے

ادارہ

گووند بلبھ پنت



اتر پردیش کے عظیم سپوتوں کے مرقع میں پنڈت گووند بلبھ پنت کا نام سنہرے حرفوں میں ہمیشہ درخشندہ رہے گا۔ وہ ایک بے مثال خطیب، پارلیمانی امور کے زبردست ماہر اور ایک عظیم سیاست داں ہی نہ تھے بلکہ اس ریاست کے وزیر اعلیٰ اور حکومت ہند کے وزیر داخلہ کی حیثیت سے انھوں نے جو روایات قائم کیں وہ آج بھی ہمارے لیے منارۂ روشنی بنی ہوئی ہیں۔ صبر و تحمل، عزم و استقلال اور آہنی ارادے نے ہندستان کے اس عظیم فرزند کا سچ پوچھیے تو پیکر اختیار کرلیا تھا۔ سخت سے سخت بحرانوں میں بھی ان کے پائے استقلال میں جنبش پیدا ہوئی اور نہ سوجھ بوجھ میں کوئی فرق پیدا ہوا۔ اہم ذمے داریوں کے نبھانے میں انھیں کبھی بھی اضمحلال یا سستی کا احساس نہیں ہوا۔ ان کی عظمت کا راز درحقیقت ان ہی اوصاف میں پوشیدہ ہے۔

اتر پردیش کو آج ہم جس منزل ترقی میں دیکھ رہے ہیں اس کا سہرا بہت کچھ پنڈت پنت کے سر ہے۔ انھیں کی ذات تھی جس نے منصوبہ بندی کے ذریعے اس ریاست کے فلاحی ڈھانچے کی بنیاد رکھی۔ اس ریاست کے پہلے وزیر اعظم اور بعد میں بہ حیثیت وزیر اعلا انھوں نے بہت سے جرأت مندانہ فیصلے کیے۔ ان کی دانش مندانہ قیادت میں زمین داری نظام ختم ہوا۔ گاؤں پنچایتوں کا قیام عمل میں آیا، چھوت چھات غیر قانونی قرار پائی، منصوبہ بند ترقی کی سمت میں پیش قدمی کی گئی اور بہت سے دوسرے فلاحی اقدامات کیے گئے۔

اس عظیم ہستی کا جنم ضلع الموڑہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ۱۰ ستمبر ۱۸۸۷ء کو ہوا۔ ان کی ابتدائی تعلیم الموڑہ میں ہوئی۔ انھوں نے بی۔ اے۔ اور قانون کی ڈگریاں الٰہ آباد سے لیں۔ ابتدا سے ہی پنڈت پنت کی عادت ہر معاملے کی تہہ تک پہنچنے اور اس کو سمجھنے کی تھی۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھے۔ اور اس کے ساتھ ڈسپلن کے پابند اور تعلیم میں گہری دل چسپی لیتے تھے۔

الٰہ آباد اس وقت سیاسی سرگرمیوں کا ایک مرکز تھا۔ وہیں کے دوران قیام میں پنڈت پنت کو کئی عظیم شخصیتوں سے ملنے اور ان کے قریب آنے کا موقع ملا۔ انھیں رابطوں کے نتیجے میں طالب علم پنت کے دل میں حب الوطنی نے گھر کرلیا۔ اور یہیں پنڈت پنت کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ انھوں نے اعلا سرکاری افسر کی عیش پسندانہ زندگی کی کشش کو ٹھکرا دیا اور مادر ہند کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردینے کا عہد کیا۔

اپنی تعلیم مکمل کرلینے کے بعد پنڈت پنت نے قانون کے پیشے میں قدم رکھا اور نینی تال میں وکالت شروع کی۔ یہیں سے ان کی ساری زندگی کے اپنے ملک کی خدمت کے لیے وقف ہوجانے کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے انھوں نے ۱۹۱۶ء میں کمایوں پریشد قائم کی جس کا مقصد آس پاس کے علاقوں کے عوام میں سیاسی

بیداری پیدا کرنا تھا۔

اسی سال وہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں سوراجیہ پارٹی کے ٹکٹ پر پنت جی ریاستی لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور اس میں حزبِ مخالف کے لیڈر رہے۔ پنڈت پنت نے اپنی ذمہ داریاں اپنے مخصوص انداز میں خوش اسلوبی کے ساتھ نبھائیں اور حکومتِ وقت کو اپنے ناقابلِ تردید دلائل اور منطق سے مبہوت کرتے رہے۔ پنت جی نو برس تک صوبائی کونسل میں سوراجیہ پارٹی کے لیڈر رہے۔

اس وقت پنت جی نے ملک کی سیاسی زندگی میں اپنے لیے ایک خاص جگہ بنالی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں صوبائی کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے لکھنؤ میں سائمن کمیشن کی آمد پر پنڈت نہرو اور پنڈت پنت کی قیادت میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔ جب جلوس پر بہیمانہ لاٹھی چارج ہوا تو پنڈت پنت نے پنڈت نہرو کو بچانے کے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی اور بے مثال جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اس لاٹھی چارج میں انھیں جو چوٹ لگی تھی اس کا اثر زندگی بھر ان پر باقی رہا۔

پنڈت پنت نے سول نافرمانی تحریک میں نہایت سرگرم حصہ لیا۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء اور ۳۲-۱۹۳۲ء کی تحریکوں میں وکالت کا پیشہ ترک کر دیا۔ مجاہدِ آزادی کی حیثیت سے انھوں نے تقریباً سات سال کی قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ ۱۹۳۴ء میں پنت جی مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر کی حیثیت سے انھوں نے قابلِ تعریف کام کیے۔ ۱۹۳۱ء میں وہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر چنے گئے اور مختلف حیثیتوں میں زندگی بھر اس کمیٹی کی خدمت کرتے رہے۔

یوپی کانگریس کمیٹی نے پنت جی کو زرعی اصلاحات کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا۔ انھوں نے ۱۹۳۱ء میں کمیٹی کی رپورٹ پیش کی یہ رپورٹ پنت کمیٹی رپورٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اسی کمیٹی کی سفارشات اس ریاست میں اصلاحاتِ اراضی کی بنیاد بنی۔

ریاستی لجسلیچر کے ۳۷-۱۹۳۶ء کے انتخاب میں کانگریس پارٹی کو زبردست اکثریت حاصل ہوئی جس کے نتیجے میں اس ریاست میں کانگریس حکومت بنی اور پنت جی نے وزیرِ اعظم کی حیثیت سے حلف لیا۔ خود ذمہ داران حکومت بھی نظم و نسق کے معاملے میں پنڈت پنت کی اہلیت، دور اندیشی اور صلاحیتوں کو دیکھ کر متحیر رہ گئے۔ دوسری عالمی جنگ کے چھڑ جانے پر کانگریسی وزارتوں نے برطانی حکومت سے اختلافات کی وجہ سے استعفے دے دیے۔ پنت جی نے انفرادی ستیہ گرہ میں حصہ لیا اور ۱۹۴۰ء میں انھیں ایک سال قید کی سزا ہوگئی۔ پھر ۱۹۴۲ء میں وہ احمد نگر قلعے میں دوسرے قومی لیڈروں کے ساتھ نظر بند کیے گئے مارچ ۱۹۴۵ء میں رہائی کے بعد پنت جی نے ان تمام سیاسی مذاکرات میں حصہ لیا جو انگریزی حکومت سے ہوئے ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں کانگریس پارٹی پھر کامیاب ہوئی اور بہ حیثیت وزیرِ اعلیٰ پنت جی کی قیادت میں دوبارہ کانگریس وزارت قائم ہوئی۔ اسی سال وہ دستور ساز اسمبلی کے لیے منتخب کیے گئے اور ہندستان کے موجودہ سماج وادی آئین کو مرتب کرنے میں انھوں نے نمایاں رول ادا کیا۔

نئے آئین کے قبول کیے جانے کے بعد ہمارے ملک میں عام انتخاب ۱۹۵۲ء میں منعقد ہوئے اور یوپی میں کانگریس زبردست اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ پنت جی ۱۹۵۴ء تک ریاست کے وزیرِ اعلیٰ رہے پھر پنڈت نہرو کی خواہش پر مرکزی کابینہ میں شامل ہوگئے اور آخر دم تک وزیرِ داخلہ کی حیثیت سے مرکزی کابینہ کے ممبر رہے۔

سردار پٹیل جب تک زندہ رہے نہرو جی کے ساتھ مرکزی کابینہ میں رہے نہرو جی نے ملک کی سب سے بڑی ریاست کی قیادت کے لیے پنڈت پنت کو اتر پردیش ہی میں رہنے دیا۔ لیکن سردار پٹیل کی وفات کے بعد نہرو جی کو اپنی کابینہ میں ایک دور اندیش اور باصلاحیت ساتھی کی ضرورت محسوس ہونے لگی انھوں نے متعدد بار دہلی بلایا بھی لیکن یہ مسئلہ ٹلتا رہا حتیٰ کہ رفیع صاحب کا انتقال ہوگیا اور دہلی میں پنت جی کی موجودگی ناگزیر ہوگئی۔ کیونکہ ملک کو پنڈت پنت جیسے رہنما کی خدمات کی ضرورت تھی۔

پنت جی کے وزیرِ داخلہ ہو جانے کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

صلاح الدین نیر

اندرا گاندھی

صداقتوں کے جو قاتل تھے منہ چھپائے ہوئے
بھٹک رہے ہیں فضاؤں میں گمرہی کی طرح
شکست و ریخت کے اس دور تشنگی میں بھی
کسی کی چشم مروت کی منتظر تھی نگاہ
ہر ایک گوشۂ ہندوستاں میں برسوں سے
اندھیرے پھیل رہے تھے بنامِ نورِ سحر
یہاں تلک ان اندھیروں کا زہر پھیلا تھا
معاشرے کی رگیں اور کٹنے والی تھیں
اسی معاشرے میں مگر
روشنی کی تیز کرن
بنامِ حق و صداقت
سیاہ راتوں کے سینے کو چیر کر نکلی
ردائے نور میں لپٹی ہوئی سی تیز کرن
چمک رہی ہے اب ہندوستاں کے ماتھے پر

بشیر فاروقی

شہ سرو قداں

(اندرا گاندھی کے نام)

اے شہ سرو قداں! روحِ وطن جانِ وطن
تو نے سینچا ہے لہو سے کے گلستانِ وطن
تو نے ہر طرح بڑھائی ہے وطن کی توقیر
تجھ سے تابندہ ہوئی شمع شبستانِ وطن

نغمۂ امن ہے تو سارے زمانے کے لیے
اپنی آواز میں کچھ اتنا اثر تجھ کو ملا
تو نے ذہنوں میں جگایا ہے شعورِ قومی
دل جواہر کا تو گاندھی کا جگر تجھ کو ملا

حریت کی نئی مہک ہے ترے پیراہن میں
جس سے ہر لمحہ معطر ہے زمانے کا مشام
تیرا مشرب ہے محبت، ترا مذہب ہے خلوص
تجھ سے چلتا ہے مساوات و اخوت کا پیام

رانی جھانسی ہو کہ رضیہ ہو کہ زینت سب ہیں
تو اک اندازِ دلیرانہ جدا رکھتی ہے
تیرے فرمان پہ جیتے ہیں فدایانِ وطن
تو بھی اک صورتِ جانانہ جدا رکھتی ہے

اے شہ سروِ قداں، تیرا وقار اور بڑھے
نازشِ اہلِ جہاں تیرا وقار اور بڑھے

(افسانہ)

آرام حرام ہے

ملک راج گوسوامی

ہر روز کی طرح اس دن بھی صبح چار بجے یوگیش بابو کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن بستر چھوڑنے کو جی نہ چاہا۔ سردی قدرے زیادہ تھی اس لیے لحاف کو اور اچھی طرح اندر کی طرف موڑ کر پڑے رہے۔ لیکن پاس ہی میز پر پڑا فائلوں کا پلندہ انھیں اپنی طرف دعوت عمل دے رہا تھا۔ کل شام ہی کو تو ڈپٹی ڈائرکٹر نے انھیں اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ ڈپٹی ڈائرکٹر کے الفاظ اب بھی ان کے کانوں میں گونج رہے تھے ـــــ "یوگیش بابو یہ اسٹیٹمنٹ تم ہی ٹھیک طرح سے بنا سکو گے۔ اور لوگ تو تم جانتے ہی ہو، سب چلتو کام کرتے ہیں یہ ذرا ہے بھی ٹکنیکی ٹائپ کا، مجھے یقین ہے کہ ایک دو دن میں تم اسے تیار کر لوگے۔" یوگیش بابو بستر میں پڑے پڑے سوچ رہے تھے یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ صبح سے رات تک کولھو کے بیل کی طرح جتے رہنا۔ گذشتہ پینتیس برسوں میں کچھ بھی تو تبدیلی نہیں آئی۔ ان کی زندگی میں وہی دھول کا جامہ اوڑھے فائلوں کے انبار کے انبار، گھسے پٹے خطوط، مسودے اور افسروں کی گھڑکیاں۔ لیکن وہ ان سب کو سہنے کے لیے تیار تھا۔ مگر اسے ریٹائرمنٹ کے خیال سے کچھ سکون محسوس ہوا۔ دل ہی دل میں کہنے لگے کہ خیر اب تو صرف ایک ہی ماہ کی دیر ہے۔ اس گھسی پٹی زندگی سے چھٹکارہ پانے میں۔ تب نہ اتنے سویرے اٹھنے کی جلدی ہوگی نہ جلدی جلدی نہانے دھونے اور کھانا نگلنے کا بھوت سوار ہوگا۔ اتنے لمبے انتظار کے بعد اب دل و دماغ کو راحت نصیب ہوگی۔

اور پھر وہ موقع بھی آگیا جس کا انتظار وہ بہت بے چینی سے کر رہے تھے دفتر کے سامنے مان یران کے 'فیرویل' کا انتظام کیا گیا تھا۔ گلے میں کئی پھول مالائیں پہنے ہوئے وہ ڈپٹی ڈائرکٹر کے بغل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسیوں پر بیٹھے دفتر کے ان کے ساتھی اور رفیق کار یوگیش بابو کے اچھے برتاؤ، قابلیت اور ادائیگی فرض کی تعریف کر رہے تھے۔ ناشتے کے بعد دو چار شاعروں نے اپنی اپنی نظمیں پڑھ کر ان کے اوصاف کا ذکر کیا اور جب ڈپٹی ڈائرکٹر نے خود ان کی تعریف میں ایڈریس پڑھا تو وہ پھولے نہ سمائے۔ اپنی محنت اور اعلیٰ اخلاق کی تعریف سن کر وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ لیکن شام ڈھلے جب گھر لوٹے تو کچھ گم صم لگ رہے تھے۔ نہ معلوم کیسی گھٹن انھیں محسوس ہو رہی تھی۔ بیوی نے کھانا سامنے رکھا تو دو چار لقمے کھا کر اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ اتنے برسوں تک ساتھ ساتھ کام کرنے والے ساتھیوں اور دوستوں سے جدا ہونے کی وجہ سے آج کچھ من بھاری تھا۔ وہ دیر تک بستر پر لیٹے کروٹیں بدلتے رہے۔ کبھی فریم میں لگے ایڈریس کی ایک دو سطریں پڑھتے اور کبھی مستقبل کے پروگرام کا خاکہ بنانے لگتے۔ خیالات کی اسی ادھیڑ بن میں بہت رات گئے کہیں ان کی آنکھ لگی۔

عادتاً صبح چار بجے وہ پھر جاگ گئے۔ میز پر پڑے ٹیبل لیمپ کو آن کیا۔ خالی میز دیکھ کر چونکتے ہوئے بیوی سے بولے "ارے بھئی یہاں پر رکھی فائلیں کیا ہوئیں . . ." تبھی انھیں یاد آیا کہ آج فائلیں کہاں، کل شام کو ہی تو ان سے چھٹکارہ پایا ہے اور لائیٹ آف کر کے پھر بستر میں دبک گئے۔ سوچنے لگے اب جلدی کیوں اٹھا جائے کہیں جانا تو ہے نہیں۔ سات آٹھ بجے تک آرام سے سوئیں گے۔ لیکن نیند کہاں۔ جوں جوں سونے کی کوشش کرتے نیند ان سے اور دور بھاگتی۔ کتنی عجیب بات ہے ابھی کل تک ہی نیند ان پر اپنا غلبہ جمائے رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ سوچا کرتے تھے کہ وہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں جو بے فکر اور دنیا سے بے خبر نیند کی گود میں پڑے پڑے نئے نئے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ لیکن آج جبکہ وہ خود نیند

کو دعوت دے رہے ہیں، وہ ان سے کوسوں دور بھاگ رہی ہے۔ کسی طرح سات بجے تک بستر میں کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد وہ اس وقت اٹھے جب ان کی بیوی ان کے لیے بیڈ ٹی لے کر آئی۔ چائے کی پیالی دیکھ کر انھیں کچھ راحت محسوس ہوئی۔ اس سے پیشتر ہر روز صبح چار بجے اسٹوو جلا کر وہ خود اپنے لیے چائے بناتے تھے۔ اسی صبح بیوی کی نیند میں خلل ڈالنا انھیں اچھا نہ لگتا تھا۔

چائے پینے کے بعد وہ پاخانہ چلے گئے۔ جہاں کل تک وہ ایک دو منٹ بیٹھا کرتے تھے آج دس منٹ تک بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ ہاتھ دھو کر شیو کا ڈبہ لیے آئینے کے سامنے آئے۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خیال آیا کہ آج تو کہیں جانا ہے نہیں۔ اب کیا ضرورت ہے ہر روز داڑھی بنانے کی۔ ہٹاؤ، رہنے دو کل دیکھا جائے گا۔ اخبار اٹھایا، ایک دو سرخیاں دیکھ کر پرے رکھ دیا، کیا جلدی ہے۔ دوپہر کو آرام سے پڑھیں گے۔ پھر نہا دھو کر تھوڑا ناشتہ کر کے بالکنی پر آ گئے۔ نیچے بازار کی طرف نظر گئی۔ لوگ پیدل، سائیکلوں اور اسکوٹروں پر اپنے اپنے دفتروں کو جا رہے تھے۔ ان کے اپنے سیکشن کے گپتا بابو اور ورما جی نے ان کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلا کر چلے گئے۔ انھیں لگا کہ جیسے وہ اس شہر میں تنہا رہ گئے ہوں۔ ان کے دوستوں اور خیر خواہوں نے ان سے منھ موڑ لیا ہو۔ ان میں دلچسپی لینے والا کوئی نہ رہا ہو۔

کسی طرح پانچ سات دن بیت گئے لیکن دماغی سکون کے بجائے یوگیش بابو کو ہر وقت کچھ بے چینی سی محسوس ہوتی رہتی۔ کچھ اچھا نہ لگتا۔ نہ کپڑے بدلنے کی خواہش ہوتی نہ کہیں باہر جانے کی۔ طبیعت بہلانے کے لیے اگر کبھی ریڈیو لگاتے تو ایک دو منٹ ہی اس کو بند کر دیتے۔ کسی اخبار یا رسالے کے اوراق پلٹتے لیکن پڑھنے میں جی نہ لگتا۔ اب کیا کیا جائے کیسے وقت کاٹا جائے یہی سوال بار بار ان کے دماغ کو کونچتا۔ پھر دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے آپ ہی سے کہتے کہ اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ بھگوان کا شکر ادا کرو کہ اس دفتری ماحول سے نجات تو ملی۔ اب تم پوری طرح آزاد ہو جہاں چاہو آؤ

جاؤ کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس کولھو کے بیل کی زندگی سے چھٹکارہ تو ملا۔ اب کسی سے نہ حیل حجت اور نہ افسروں کی ڈانٹ پھٹکار، نہ بیکار کی خوشامد، نہ بوسیدہ رجسٹروں اور فائلوں کی گندی دھول۔ لگاتار پینتیس برس تک کیا میں نے کم کام کیا ہو؟ کتنے ہی لوگ مجھ سے کام سیکھ کر اعلیٰ افسر بن گئے۔ کتنوں نے مجھ سے لگن اور محنت سے کام کرنے کے لیے رغبت حاصل کی۔ دوسروں کی طرح میں نے کبھی جی نہیں چرایا۔ سیٹ پر کام زیادہ ہے ایسی کوئی شکایت کبھی میں نے اپنے افسروں سے نہیں کی بلکہ دوسروں کے مقابلے میں ہمیشہ محنت، لگن اور خوش اسلوبی سے اپنے فرائض کو انجام دے کر افسران کو خوش رکھا۔

پھر وہ سوچنے لگے کہ اب ان پر کوئی خانگی ذمہ داری بھی تو نہیں۔ لڑکوں کو اچھی طرح پڑھا لکھا دیا ہے۔ لڑکی اپنی سسرال میں آرام سے ہے۔ دونوں لڑکے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ایک ڈگری کالج میں پروفیسر ہے اور دوسرا سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر۔ اپنی محدود آمدنی ہوتے ہوئے بھی کیا میں نے یہ کم کیا ہے۔ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پنشن ملا کرے گی، بارہ تیرہ ہزار روپے پراویڈنٹ فنڈ اور گریچویٹی کے مل جائیں گے۔ بڑھاپا آرام سے کٹ جائے گا۔ دور دراز شہروں میں رہنے والے دوستوں اور رشتے داروں نے کئی بار بلایا لیکن میں ہمیشہ انھیں ٹالتا رہا، کبھی دفتر میں کام کی زیادتی اور کبھی چھٹی نہ ملنے کا بہانہ کیا۔ اب ان کی شکایتوں کو دور کرنے کے لیے بھی وقت نکال سکوں گا۔

خیالات کے اسی ادھیڑبن میں آٹھ دس دن اور گزر گئے۔ لیکن یوگیش بابو کچھ کر نہ پائے۔ دراصل اس نئے ماحول میں کچھ کام کرنے کا ان کا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ اکثر وہ چارپائی پر پڑے رہتے لیکن نیند نہ آتی۔ کھانا سامنے آتا تو دو چار لقمے کھا کر تھال پرے ہٹا دیتے۔ انھیں لگتا جیسے دن پر دن ان کی بھوک مرتی جا رہی ہو۔ آئینہ دیکھتے تو معلوم ہوتا جیسے چہرے کی رہی سہی سرخی اور رونق بھی آہستہ آہستہ غائب ہوتی جا رہی ہو۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ایک عجیب قسم کی ذہنی پریشانی وہ محسوس کرتے رہتے۔ رہ رہ کر دفتر کا پورا نقشہ

ان کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا۔ سوچتے دفتر کا کام ویسے ہی چل رہا ہوگا، سیکشن میں ٹیلی فون کی گھنٹی ویسے ہی بج رہی ہوگی۔ چپراسی ادھر ادھر دوڑ دھوپ کر رہے ہوں گے، سپرنٹنڈنٹ پرانے لیٹروں کے ڈسپوزل کے لیے چلّا رہا ہوگا، کلرک روم میں ویسی ہی چہل پہل ہوتی ہوگی، معلوم نہیں میری سیٹ پر اب کون کام کر رہا ہوگا، سریش بابو ڈیپوٹیشن پر جانے والے تھے شاید چلے گئے ہوں گے۔ چھ ماہ پرانے میرے میڈیکل بل کی ادائیگی کے لیے ڈائرکٹر نے آرڈر دے دیا ہوگا یا نہیں۔ پھر اچانک دفتر کے کمروں میں لگے چارٹوں کے الفاظ "کام ہی زندگی ہے" "آرام حرام ہے" "حرام خوری موت کا دوسرا نام ہے" ان کے دماغ کو نوچنے لگتے۔ وہ بہت متفکر ہو جاتے اور چھڑی اٹھا کر تھوڑی دیر کے لیے باہر نکل جاتے۔

اس دن بھی وہ چارپائی پر پڑے پڑے بور ہو رہے تھے کہ یکایک ذہن میں خیال آیا کہ تھوڑی کے لیے دفتر جا کر اپنے دوستوں کی خیریت ہی کیوں نہ معلوم کر آئیں۔ شیو کر کے کپڑے بدلے اور عادتاً اپنے ہاتھ میں چھڑی لے کر چل پڑے۔ جب راستے پر کبھی ان کے قدم بہت تیزی سے بڑھتے تھے آج وہی قدم من من بھر کے بھاری ہو رہے تھے۔ آخرکار خیالات میں غرق وہ دفتر کے پھاٹک کے سامنے پہنچ گئے۔ پھاٹک پر تعینات ان کے جانے پہچانے چوکیدار نے انھیں نمسکار کیا۔ ایک دو منٹ اس سے بات چیت کرنے کے بعد وہ پھر واپس لوٹ پڑے۔ دل میں کہنے لگے اندر جا کر کیا کریں گے، بیکار میں دوسروں کا وقت ضائع ہوگا۔

وہ بوجھل قدموں سے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے کہ اچانک "آدرش مہلا ودیالیہ" کے دفتر کی کھڑکی کے پاس رک گئے۔ کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا لیکن اندر سے کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔

— "بڑے بابو! اب تم آرام سے گھر پر بیٹھو، اب تم سے کام کرتے نہیں بنتا۔ پوری کیش بک چوپٹ کر کے رکھ دی، جگہ جگہ کٹنگ اور اوور رائٹنگ.....

— "معاف کیجیے میں اسے ٹھیک کیے...

— "تم اسے کبھی ٹھیک نہ کر پاؤ گے، موتیابند کی وجہ سے اب تمھاری نظر کافی کمزور ہوگئی ہے، اب تم سے لکھنے پڑھنے کا کام نہیں ہو سکتا۔ میں آج ہی ہیڈ آفس کو کوئی دوسرا کلرک بھیجنے کے لیے لکھ رہی ہوں ....

— "میڈم! براے مہربانی ایسا نہ کیجیے گا۔ آپ تو میری حالت جانتی ہیں۔ ابھی تین لڑکیوں کے ہاتھ مجھے پیلے کرنے ہیں۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے علاج کے لیے ہر ماہ پچاس ساٹھ روپے بھوالی سینی ٹوریم بھیجنا پڑتے ہیں" بڑے بابو نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

یوگیش بابو یہ سن کر فوراً پرنسپل کے کمرے کے اندر داخل ہو گئے اور پوچھا "میڈم آپ کے یہاں کیا کوئی کلرک کی جگہ خالی ہے، میں نے پینتیس برس تک ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کے دفتر میں اکاؤنٹنٹ کا کام کیا ہے۔"

— "ہاں ہاں بیٹھیے۔ جگہ تو خالی ہے لیکن ہم آپ کو ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ نہیں دے سکتے ... اور اسکول کے بڑے بابو کو ایسا لگا جیسے اس کے بجلی کا کرنٹ لگ گیا یا دل پر کسی نے زور سے گھونسہ مار دیا ہو۔ اسے اپنی ملازمت جاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

— "لیکن میڈم میری ایک گزارش ہے مجھے روپیوں کی ضرورت نہیں۔ بھگوان کی کرپا سے گھر میں ضرورت کی ہر چیز مہیا ہے۔ میں بغیر تنخواہ کے کام کرنا چاہتا ہوں۔ تنخواہ آپ ہر ماہ بڑے بابو ہی کو دیں گی۔ میں روزانہ دو چار گھنٹے یہاں آکر ان کی مدد کر دیا کروں گا۔ میڈم دراصل بات یہ ہے کہ ریٹائر ہونے کے بعد میں دن بھر گھر میں پڑے پڑے انتہائی بور ہوتا رہتا ہوں اگر کچھ دن اور یہی حالت رہی تو میں بیمار پڑ جاؤں گا یا پھر پاگل ہو جاؤں گا۔ میں کام کرنا چاہتا ہوں خواہ وہ کسی بھی طرح کا کیوں نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گی۔"

بڑا بابو حیرت بھری لیکن کمزور آنکھوں سے اپنے اس خیرخواہ کو پہچاننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور پرنسپل صاحبہ انھیں ٹک ٹک دیکھتی ہوئی سوچ رہی تھیں کہ اب کیا جواب دیا جائے۔

★

کملاپت سہائے ماہر بلگرامی

علمبردارِ امن – پنڈت جواہر لعل نہرو

ساعت پیدائشِ نہرو ہے نغمہ بارِ امن
ہے نومبر چودہ رسم نیک کارِ بارِ امن
آج ہی پیدا ہوا تھا وہ علمبردارِ امن
تھا لڑائی کا مخالف جو سپہ سالارِ امن
صرف بھارت کا نہیں تھا اک جہاں کا دستگیر
بن گئی ہر بات اس کی ایک پتھر کی لکیر

تھا پیام ایزدی اس کا پیام آشتی
جگمگایا بن کے وہ ماہ تمامِ آشتی
تلخ نوشوں کو پلایا اس نے جام آشتی
کر دیا دنیا کی دنیا کو غلام آشتی
پیکر ایثار۔ تصویر محبت جانفروش
اس کا ہر دانشورِ دوراں تھا بس حلقہ بگوش

وہ وفا کا دیوتا وہ امن کا پیغامبر
اشرف المخلوق انساں نازشِ نوعِ بشر
آئی جس گوشے سے بھی دنیا کے اس کو بوئے شر
وہ وہیں پہنچا برائے صلح بے خوف و خطر
جنگ کوشی کے تعفن کا اثر جاتا رہا
لخلخہ ایسا سنگھایا دردِ سر جاتا رہا

روح پرور بن کے آئی ہر شعاعِ آفتاب
آگیا پھر دور میں پیمانۂ صہبائے ناب
پھر ہوا شرمندۂ تعبیر ارمانوں کا خواب
پھر مہک اٹھا کسی کی شیروانی کا گلاب
ہو گئے پژمردہ بوئے خوش سے سب نفرت کے پھول
آج تختہ گل وہاں ہے کل جہاں اڑتی تھی دھول

خواب رنگیں کی حسیں تاویل ہو کر رہ گئی
حسب خواہش ملک کی تشکیل ہو کر رہ گئی
روحِ نہرو قوم میں تحلیل ہو کر رہ گئی
اس کی ہر تحریک سنگ میل ہو کر رہ گئی
رہتی دنیا تک ہے نام علمبردار امن
بخشش نہرو ہے ماہر دولتِ کردارِ امن

قاضی سید عرشی کاظمی

اندرا گاندھی

قوم کی آس ہے تو ملک کی تقدیر ہے تو
عقل و علم ہے تو دانش و تدبیر ہے تو
آئینے جس سے مجلیٰ ہیں وہ تصویر ہے تو
خوابِ دیرینہ کی تعبیر ہے پیدا تجھ سے
ہالۂ نور ہے ہر نقش سویدا تجھ سے
تو وہ انسان کہ گیتا تری قرآں تیرا
تو وہ شخصیتِ عالی کہ ہر انساں تیرا
سکھ و عیسائی و ہندو و مسلماں تیرا
کوئی سازش کوئی فتنہ نہ رچانے دیں گے
ہم ترے سائے کو بھی آنچ نہ آنے دیں گے
وحدتِ قوم کا آہنگ دیا ہے تو نے
ربطِ باہم کو نیا رنگ دیا ہے تو نے
نغمہ و رقص و نے و چنگ دیا ہے تو نے
خاک ریزوں کو ملا اوجِ ہمالہ تجھ سے
دشت و در بن گئے بزمِ گل و لالہ تجھ سے
زندگی جلوہ و آرائش و آئینہ بنی
شانِ آئندہ بنی عظمتِ پارینہ بنی
وسعتِ نہ فلک و شوکتِ شاہینہ بنی
تجھ سے تاریخِ وطن زندہ و پائندہ ہوئی
یہ زمیں تیرے قدم چوم کے تابندہ ہوئی

سید محمد امین علیگ

برج کے صوفی شاعر شاہ برکت اللہ پیمی اور "پیم پرکاش"

مستقبل قریب میں برج علاقے کے قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ کے عظیم شاعر حضرت امیر خسرو کی سات سو سالہ برسی منائی جائے گی۔ زیر نظر مضمون میں برج علاقے کے ایک اور عظیم شاعر برکت اللہ پیمی اور ان کے دیوان "پیم پرکاش" کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

ان کا پورا نام شاہ سید برکت اللہ تھا۔ ان کی ولادت قصبہ بلگرام ضلع ہردوئی (اترپردیش) میں سنہ ۱۰۷۰ھ مطابق سنہ ۱۶۶۰ء میں ہوئی۔ اپنی تاریخ ولادت شاہ صاحب موصوف نے اپنے فارسی دیوان میں خود کہی ہے ؎

سال تولدم ہمہ تقویم دانِ شہر
روئے حساب شایقِ خوباں نوشتہ اند
۱۰۷۰ھ

برکت اللہ پیمی آغاز سن کہولت تک بلگرام میں ہی رہے۔ بلگرام سے انھیں والہانہ عشق تھا جس کا اظہار انھوں نے اپنے مندرجہ ذیل دوہوں میں کیا ہے:

ہم باسی سری نگر کے آئے بسے سب چھوڑ
مارہرہ سے نگر موں جہاں ساہ نہیں، چور

ہم پورب کے پوربیا جات نہ پوچھے کوے
جات پانت سوں پوچھیے جو دھر پور کا ہوے

واضح رہے کہ قصبہ بلگرام کا پرانا نام "سری نگر" ہے۔
بلگرام میں شاہ برکت اللہ پیمی نے شاہ لطف اللہ عرف لدّھا بلگرامی، سید مربی ابن سید عبدالنبی اور سید غلام مصطفیٰ ابن سید فیروز سے اخذ فیض کیا۔ آپ کو سلسلہ چشتیہ سہروردیہ وغیرہ کی اجازت اپنے والد میر اویس ابن میر عبدالواحد بلگرامی صاحب "سبع سنابل" سے تھی مگر طبیعت سلسلہ قادریہ کی طرف مائل تھی اس لیے قصبہ کالپی ضلع جالون (اترپردیش) کے مشہور، قادریہ سلسلے کے بزرگ، شاہ فضل اللہ کالپوی سے قادریہ سلسلے میں اجازت و خلافت حاصل کی۔ پیمی کو اپنے بزرگان سلسلہ سے والہانہ عقیدت تھی جس کا ذکر انھوں نے کئی جگہ کیا ہے ؎

پورو سورو پیم تگ تا گرو کے ہم داس
نگر کالپی ٹھانو ہے پجوت من کی آس

پیمی اپنے والد میر اویس کے وصال کے بعد بلگرام سے مارہرہ آئے اور سنہ ۱۱۱۷ھ میں قصبہ مارہرہ سے باہر جدید آبادی کی بنیاد ڈالی اور "پیم نگر برکات نگری" نام رکھا۔

شاہ برکت اللہ کا وصال شب عاشورہ ۱۰ محرم الحرام سنہ ۱۱۴۲ھ مطابق ۱۷۲۹ء کو مارہرہ میں ہوا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں تاریخ وفات لکھی ہے ؎

تاریخ وصال او، خرد کرد رقم
صاحب برکات واصل منزل قدس
۱۱۴۲ھ

دوسری تاریخ وفات علامہ آزاد بلگرامی نے اس مصرع سے نکالی:

فنا فی اللہ شد آں پیر محرم
۱۱۴۲ھ

اس وقت ہمارے سامنے شاہ برکت اللہ کی کئی تصانیف ہیں جن میں رسالہ چہار انواع، رسالہ سوال وجواب، رسالہ عوارف ہندی، دیوان عشقی، ترجیع بند، مثنوی ریاض العاشقین، بیاض ظاہر، بیاض باطن، پیم پرکاش، وصیت نامہ، وغیرہ وغیرہ شامل ہیں مگر اس مضمون میں ہمارا موضوع پیمی اور پیم پرکاش ہے۔

اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ شاہ برکت اللہ صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ مذکورہ بالا تصانیف سوائے پیم پرکاش کے سب فارسی میں ہیں، پیم پرکاش واحد دیوان ہے جو برج بھاشا میں لکھا گیا ہے۔

شاہ برکت اللہ زبردست صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی اور ہندی کے عظیم شاعر بھی تھے۔ فارسی میں عشقی اور ہندی میں پیمی تخلص فرماتے تھے۔ ویسے تو یہ بات قرین قیاس ہے کہ ان کی مادری زبان اودھی رہی ہوگی کیوں کہ وہ کافی عرصے تک بلگرام (اودھ) میں قیام پذیر رہے اور مارہرہ میں ان کی آمد ۱۰۹۸ھ یا ۱۰۹۹ھ میں ہوئی۔

پیم پرکاش کا جو قلمی نسخہ ہمارے سامنے ہے وہ ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے اس کا سائز "۸ × "½ ۵ ہے اور نہایت پاکیزہ خط میں لکھا ہوا ہے آخر میں "روز پنجشنبہ ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ" لکھا ہوا ہے یہ نسخہ شاہ برکت اللہ کے قلم کا لکھا ہوا نہیں ہے کیونکہ ان کا وصال تو ۱۱۴۲ھ میں ہو چکا تھا مگر یقین ہے کہ شاہ صاحب موصوف کے صاحبزدگان یا خلفاء میں سے کسی نے نقل کیا ہے۔ بہر حال خارجی اور داخلی شہادتوں کی بنا پر اس نسخہ کے معتبر ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا

پیم پرکاش کی تصنیف ۱۶۹۸ء میں مارہرہ میں ہوئی۔ ہجری سن ۱۱۰۹ھ تھا۔

اس طرح شاہ برکت اللہ پیمی نے پانچ بادشاہوں کی حکومتیں دیکھیں جن میں اورنگ زیب، بہادر شاہ اول، جہاں دار شاہ، فرخ سیر اور محمد شاہ رنگیلے شامل ہیں۔

ویسے تو پیم پرکاش کو ۱۹۲۳ء میں پنڈت لچھمی دھر شاستری نے مرتب کرنے کے بعد دہلی سے شائع کیا تھا مگر اب وہ مطبوعہ پیم پرکاش نایاب ہے، کئی سال پہلے ایک صاحب کے پاس مطبوعہ پیم پرکاش دیکھی تھی۔ قلمی نسخہ سے مطابقت کرنے پر علم ہوا کہ مطبوعہ پیم پرکاش میں کافی غلطیاں ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے قلمی پیم پرکاش ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

پیم پرکاش کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے حصے میں دوہے جن کی تعداد دو سو دو ہے دوسرے حصے میں کبت (कबित्त) جن کی تعداد ایک سو تیرہ ہے۔ تیسرے حصے میں ۵ ریختے ہیں اور ۱۰ دوہے سوال وجواب کی صورت میں ہیں آخری کبت شیخ محمد شریف کمبوہ لٹھا گیانی کا ہے جس میں انھوں نے اپنے مرشد شاہ برکت اللہ کی تعریف کی ہے۔

اب ہم اس بات پر غور کریں گے کہ پیمی اپنے شاعرانہ اسلوب میں ہندی کے کس شاعر سے زیادہ قریب ہیں۔

پیمی انداز بیان میں ملک محمد جائسی اور زبان میں سورداس سے قریب ہیں۔ اسلوب میں جائسی اور سور سے اتنا قریب ہونے کے باوجود پیمی ان دونوں کے پیرو نہیں ہیں۔ انھوں نے بلا ارادہ یا شعوری طور پر جائسی اور سور کا اثر قبول نہیں کیا۔ ان کا اسلوب ان دونوں سے قطعاً مختلف ہے۔

یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ پیمی نے برج بھاشا میں شاعری کیوں کی؟ میرے خیال میں اس لسانیاتی انقلاب کا اثر پیمی نے بھی قبول کیا جو ان کے اودھی بھاشا کے علاقے سے برج بھاشا کے علاقے میں آنے کی وجہ سے ہوا تھا۔

شاہ برکت اللہ پیمی بنیادی طور سے صوفی تھے اور ان کا مقصد رشد و ہدایت و تبلیغ تھا۔ بلگرام سے مارہرہ آ کر انھوں نے اندازہ کیا کہ ایسی زبان میں تبلیغ کرنا چاہیے جس سے عوام مانوس ہوں، اور اس ماحول میں برج بھاشا واحد ایسی زبان تھی جو عوام میں یکساں مقبول تھی۔

پیمی ہندستانی تہذیب و معاشرت میں گھل مل گئے اور

بالمخصوص برج کے علاقے کے ماحول اور یہاں کی تہذیب کا اثر ان کی طبیعت نے قبول کیا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جگہ جگہ موہن، نندلال، تروینی، نرنجن لال، گنگا وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

بھلے بھلے جو موہناں ایسی کیجت بچار
بھیجو یہ ہا کٹھن اری ہم کو جالن ہار (موہناں)

بوجھ سو بھوگیان سوں سنگ ڈورت نندلال
جیسے ین تیو تھون رہو تہاں اللوں لال (نندلال)

تربینی کے پاٹ موں بیٹھو من چت لاے
دھوے جائیں گے پاپ سب پرسون لالن پائے (تربینی)

گیارہ بارہ چھوڑ کے بارہ مانس بجھان
بھجن نرنجن لال کو بیمی کر کر دھیان (نرنجن لال)

توہیں توہیں تب کہے ہو نہیں ہو نہیں جائے
جل گنگا میں مل گیو، سرگی گیو بلاے (گنگا)

"پیم پرکاش" کی ابتدا مثنوی کے طرز پر کی گئی ہے جس میں شروع میں حمد و نعت ہے پھر اہل بیتؓ اور صحابۂ کرام کی تعریف اور اس کے بعد شاہ عبدالقادر جیلانی کی شان میں منقبت ہے۔ اس کے بعد اورنگ زیب کی تعریف ہے اور بیمی نے پیم پرکاش لکھنے کی وجہ بتائی ہے۔ بیمی کا کہنا ہے کہ ؎

اورنگ حبیب کے راج میں بھئی گرنتھ کی آس
بیمی ناتو بچار کے دھرا پیم پرکاس

دوسرا حصہ گیت سے متعلق ہے جس میں بیمی نے اپنے ذاتی عارفانہ اور متصوفانہ خیالات کا اظہار کیا ہے جو وقتاً فوقتاً ان کے ذہن میں پیدا ہوے۔ ان کبتوں (कबित्त) کا مرکزی خیال عشق حقیقی ہے اس عشق حقیقی کو انھوں نے گوپی اور کرشن کو علامت بنا کر پیش کیا ہے۔

صوفیا کا عشق بہر حال عشق حقیقی ہوتا ہے۔ ان کے عشق مجازی کا آخری سرا عشق حقیقی سے جڑا ہوتا ہے عشق مجازی کو صوفیا نے عشق حقیقی تک پہنچنے کا وسیلہ مانا ہے بیمی بھی ان تمام باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور ان کے کلام میں جگہ جگہ اس کا ذکر ملتا ہے

بیمی صوفی شعرا کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو وحدت الوجود کا قائل ہے۔ اس گروہ کا خیال ہے کہ خدا ہر چیز میں جلوہ فگن ہے۔ بیمی کے وحدت الوجود کے قائل تھے جس کا ثبوت ان کے مندرجہ ذیل دوہوں سے ملتا ہے:

ہم تباب تم سرسدتم۔ ہم جھکئی تم ڈور
جت جت کھینچو تت پھرون جو بولو سوئی کھور

ان اللہ بکل شیئی ایسیں بھیو محیط
اونی تار جیوں چیر موں تیوں جگ میں جگت

ان اللہ بکل شیئی ایسیں بھیو محیط
جیسے سورج کرانت سوں جگمگ ہوت بسیط

پیم پرکاش میں بیمی نے صوفیا کا بنیادی عقیدہ توحید مانا ہے۔ وہ کرشن اور گوپیوں کو علامت بنا کر، خالق اور مخلوق یا بالفاظ دیگر عاشق و معشوق کے رشتے کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان رشتوں کی تشریح کرتے ہوے وہ لکھتے ہیں ؎

اُدھو تم یہ مرم نہ جانوں
ہم میں سیام سیام مدھ ہم ہیں۔ تم جن انت بکھانوں
تس میں انک انک مس تہنیاں ڈبرھا کیہ بیانوں
جل میں لہر جل ماہنیں۔ کہنہ بدھ برہا ٹھانوں
بکھیو جاے جوگ کبجا کہنہ۔ جاپ تاپ اوڈھیانوں
ہم سنگ جوگ بھوگ کچھو ناہیں۔ بوند سمند سمانوں
جامن سادھ سمادھ سیام کی۔ سوئی ٹیڑھ دبیا نوں
کرے نہ بیت میت کی بیمی۔ من مورکھ پچھتانوں

بیمی رہسیہ واد (रहस्यवाद) کے شاعر تھے۔ رہسیہ واد صوفیا کے یہاں اہم درجہ رکھتا ہے۔ صوفیا، عشق حقیقی، عاشق و معشوق کے تعلقات کو رازدارانہ طریقوں سے بیان کرتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں عشق کا تصور پاکیزگی کے لیے ہوتا ہے۔ روح اور خدا کا رشتہ صوفیا کے یہاں عظمت دیرینہ کا حامل ہوتا ہے، روح کو، صوفیا عورت سے تشبیہ دیتے ہیں، جو اپنے محبوب و مطلوب یعنی خدا سے

واصل ہونے کے لیے تڑپتی ہے لیکن اس کی یہ تڑپ راز و نیاز کے پردوں میں مخفی رہتی ہے۔ ہیمی کے خیالات اس بارے میں یوں ہیں ؎

برہا درجی ہیر میں ٹوک ٹوک کیو پھار
ہیم بیت کے تارسوں۔ جو زد نیک مراد

یا ایک گیت ([illegible]) میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

لیھت رہوں نس دن بھولی نہیں ایک چھن
جوں جوں سدھ آوے سکھی پیتم کے جان کی
پادس رُت آئی۔ لاگیو برہ لسائی
موہ نت دکھ دائی۔ ناہیں سدھ گات کی
چاتک پپیہا مور۔ کریں ات جہا سور
جیون نہ بنے ہیمی۔ تالت نہ بات کی
جیون کو پھل یہی۔ دیکھوں مکھ پیتم کو
ایک ایک رات جات۔ لاکھ لاکھ رات کی

ہیمی نے روح کی پاکیزگی پر بھی بہت زور دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ باطن کی کثافت کو دور کرنا ضروری ہے۔ صوفیا کو اسی وجہ سے علماء باطن بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ باطن کی صفائی پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ صوفیا کے نزدیک، روح کی پاکیزگی کے بغیر معشوق حقیقی (اللہ تعالیٰ) سے واصل ہونا ناممکن ہے۔ ظاہری شکل و صورت اگر صوفیا کی طرح بنا بھی لی جائے تب بھی ہر شخص صوفی نہیں بن سکتا۔ ہیمی اس بارے میں کہتے ہیں ؎

جٹا رکھائی بیس بر۔ الٹی کینی باںہہ
تشنا ناکری اونٹی۔ کیسے بنہیں ناںہہ

ایک دوسری جگہ یہ مفہوم اس طرح ادا کیا ہے ؎

موہ کوہ من نوں بھرے۔ ہیم پنتھ کوں جائے
چلی بلائی جج کوں۔ تو سے کچھ سے کھائے

صوفیا کے مذہب میں بندے اور خدا کا اتصال صوفیا کی معراج ہے۔ صوفیا بندے کو قطرے اور روح مقید سے تشبیہ دیتے ہیں جب تک بندہ، خدا کی محبت میں فنا نہ ہو جائے اسے قربت الٰہی حاصل نہیں ہو سکتی۔ قطرہ جب سمندر سے الگ رہتا ہے تب تک صرف قطرہ رہتا ہے اور جب قطرہ سمندر سے مل جاتا ہے اور اپنے وجود کو فنا کر دیتا ہے تب وہ سمندر بن جاتا ہے اب یہ بھی نا ممکن نہیں کہ قطرہ کہاں گیا۔ اب تو قطرہ سمندر میں مل کر سمندر کا حصہ بن گیا۔ صوفیا وصال کی پاکیزگی کی بنیاد پر روح مقید اور روح مطلق کے اتصال میں بھی یقین رکھتے ہیں۔ ہیمی کا اس بارے میں نظریہ ہے:

سُندری نوین جا کے نیش ہیں جگلا رے
سوہت سنگار آچھے گر ڈوان مال کنٹھ سوں
بینی مول گیت کر کنگن سو ڈھار راکھے نوپرا
چیرن راجہین ریسم کے کنٹھ سوں
شیام کے سہت گھن دامنی نینات جیسیں
بیٹھی، گوری آتر۔ نران اُت کنٹھ سوں
بادر کی کاری اٹھی گھن گھور تا میں
دامنی سی کوند کے۔ سو لاگی پیہ کنٹھ سوں

انھیں خیالات کو ایک ریختے میں جس میں ہندی اور فارسی کا نہایت خوب صورت امتزاج ہے، ہیمی نے اس طرح ادا کیا ہے:

گھر تج کے جا جنگل میں پڑی تب سمجھ پڑی
تن من موں پیتم کی آگ بری تب سمجھ پڑی
موجوں کے پھیر کوں جو دل غیر بوجھتا
جب سندھ کے بھنور میں پڑی تب سمجھ پڑی
تکیہ جو مخملی و دگر سیج چھوڑ کے
جب انیٹ زیر سیس دھری تب سمجھ پڑی
جیت ہت پھرے سے من کوں تسلی نہ کچھ بھئی
جب دل کی کیل مانجھ ادی تب سمجھ پڑی
گنج خفی میں وصل ہوئی فکر و غم نہ تھا
جب ہجر نین لگائی چھری تب سمجھ پڑی

پُوچھا نہ عشقیاں نے خِرد راہ پیم کا
جب عشق شُدھ بُدھ ہری تب سمجھ پری

شاہ برکت اللہ پیمی نے صوفیا کے مسلک کے مطابق ہندو مسلم اتحاد کا پیغام جس کی ہر دور میں زبردست اہمیت ہوتی ہے۔ پیمی کا قومی اتحاد کا درس وقتی نہیں' دائمی ہے۔ اپنے اِن خیالات کا اظہار پیمی نے اس دوہے میں کیا ہے ؎

پیمی ہندو ترک موں ہر رنگ رہو سمائے
دیول اور مسیت موں دیپ ایک ہی بھائے

پیمی نے پیم پرکاش میں کئی جگہ بین الاقوامی اخوت کا درس دیا۔ وہ آپسی بھائی چارے اور میل محبت میں یقین رکھتے تھے۔

پیمی نے اپنے ہم عصر شعرا کی طرح "بارہ ماسا" بھی لکھا ہے۔ اُن کا بارہ ماسا انفرادی حیثیت کا حامل ہے مختلف مہینوں کی موسمی کیفیات کا ذکر انھوں نے بڑے خوب صورت انداز میں کیا ہے۔

پیمی کے بارہ ماسا میں عورت "عاشق" اور مرد کو "محبوب" بنا کر پیش کیا ہے اور یہ ہندی شاعری کی روایت رہی ہے۔

اس بارہ ماسا میں پیمی نے عاشق کی اُن کیفیات کا ذکر کیا ہے جو ہجر محبوب سے پیدا ہوئی ہیں۔ ذیل میں چند مہینوں کا حال دیکھنے سے اندازہ ہو جائے گا کہ واقعی پیمی کا بارہ ماسا انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ ساون کا مہینہ تمام مہینوں میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عاشق کی اس مہینہ میں ہجر محبوب سے بُری حالت ہو جاتی ہے۔ پیمی اس حالت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

اُت ساون اِت نین ہیں' اُت گرجن اِت آہ
اُت کوک اِت ہوک ہے' سکو تو لیہو نباہ

کنوار کی دھوپ بڑی تیز ہوتی ہے۔ دھوپ کی سختی کا ذکر پیمی نے اس دوہے میں کیا ہے:

چٹکی دھوپ کوار کی' کارے ہوت کُرنگ
ایسے سمے بدیس کوں' چلو نہ تجا ٹرو سنگ

پوس کے مہینہ کی موسمی حالت کو پیمی یوں بیان کرتے ہیں:

آیو پوس بھاؤ نوں' اوس پرے سب رین
ردس رہے من موہناں' موس لیو سب چین

چیت کے مہینہ میں سردی رخصت ہو جاتی ہے اور گرمی کی آمد آمد ہوتی ہے۔ اس مہینہ میں ہر چیز پر ایک نیا رنگ آتا ہے۔ اس حالت کو پیمی اس طرح بتاتے ہیں ؎

آیو چیت سُہاونوں' تن کو چھوٹت تیل
من کو تیل نہ اے سکھی' بچھڑت موہن چھیل

جیٹھ کے مہینہ میں سخت گرمی ہوتی ہے۔ گرمی کی اس سختی سے مخلوق سخت پریشان رہتی ہے۔ پیمی جیٹھ کے مہینہ پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

بھون تپے آنگن تپے' برہ رہو سرسانڈھ
دیکھو جیٹھ نلج کوں' پردیسے نہ تو دئے بانڈھ

سردی' گرمی اور برسات کے موسم گزر جانے کے بعد بھی محبوب نہیں آتا۔ عاشق' جو فراق محبوب میں تڑپ رہا ہے' اپنی حالت اس طرح بیان کرتا ہے:

تن بسنت گرکھم بھیو' جرکال بھیو ہیہ
پاؤس نین سدا چوئیں' ابھوں نہ آئے پیہ
بارہ ماسا کیا کہوں' موہے نہ آوت سانس
بیتت برہا کٹھن تیں' پل پل بارہ ماس

ہولی کا تیوہار ہندوستانی تہذیب میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔ برج کے علاقوں میں ہولی کھیلنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے اور اس سلسلے میں برج اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ پیم پرکاش میں پیمی نے ہولی کے اوپر کئی گیت (कबित्त) لکھے ہیں اور اپنے مخصوص صوفیانہ انداز بیان میں ہولی کا ذکر کیا ہے ؎

سادھو بھائی ہوئی کھیلت' آ کچھو رنگ بنایو

دھیان راگ مدھر لے تان سُر، ہر سُر گن گایو
پانچ بھوت آتا پیا، بِرہ رنگ میں تایو
اُس شُلیت کے داری پیمی، ہر کو پھگوا پایو

ہولی کے موقعہ پر ساس، نند اور بہو کے ہولی کھیلنے کا ذکر پیمی اس طرح کرتے ہیں: ؎

ہوری کھیلت سیام منوہر، آر دکھین بچیئے
موئے رنگ رنگو سب کا من، جا موں لال رچیئے
ساس نند کو کچھوُ دہست ہو، چپی بات بچیئے
ہولی ہوئے سکھی ری چلو۔ گن گیئے گن سیتے

پیمی نے اپنے ریختوں میں فارسی اور ہندی کا خوب صورت امتزاج پیش کیا۔ اُن کے ریختوں کے مطالعے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اُردو کی ابتدائی شکل کیسی تھی۔ ذیل میں اُن کے ریختوں سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

سلونے روپ کی جگ میں سدا حرنت دحکایت ہے
کہاں لاگ حُسن کو برنوں، سوا کیو بیڈ نہ غایت ہے
ہمہ عالم درس کارن پھرے، چوں شمع دیپ دا آ
کوئی مجھ درد سوں واقف نہیں، وہ پی درایت ہے
کٹیلے نین ات ترل، سو تجھ دکھت نہیں مجھ تن
بہ ایں تقریب میخواہی، کہ یا یار نہ تم سو زنا ہم
بتھامن کی اَدِھک ددبھر، نہ بھاکھا جات ہے باتیں
نہ تاب گفتنش دارم، نہ یارائی شنیدن ہم

دیگر فنون لطیفہ کے علاوہ پیمی فن موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ پیم پرکاش میں پیمی نے بہت سے راگ اور راگنیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کبت (कबित्त) وغیرہ لکھے ہیں جن سے ان کی مہارت فنِ موسیقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان راگ راگنیوں میں راگ سارنگ، اساوری، ملہار، اڈانہ، رام کلی، دیو گندھار، بلاول، ڈھرپد، کانٹرا، امن، دھنا سری، للت، دیو کلی، بیلے بجے وبتی وغیرہ کافی اہم ہیں۔

برکت اللہ پیمی نے شاعری پر تنقید بھی کی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ شاعری ایک تخلیقی صنعت ہے ایک استعادہ ہے جو اپنی تخلیلی اثر سے اندرونی حقیقت کو آشکار کرتی ہے۔ یہ اندرونی حقیقت عوام کی نظر سے پوشیدہ ہوتی ہے مگر شاعر اس کو اپنی باطنی نگاہوں سے دیکھ لیتا ہے۔ پیامی شاعری کو انھوں نے اعلےٰ درجے کی شاعری مانا ہے۔

پیمی نے شاعر کے لیے چند چیزوں کو بہت ضروری مانا ہے۔ ان کے مطابق شاعر کو صناع ہونا چاہیے جو تخلیق کرتا ہے، ایک رشی ہونا چاہیے جو دیکھتا ہے، ایک صوفی ہونا چاہیے جو حقیقت کو جانتا ہے۔

ان کے شاعرانہ تنقید سے متعلق اصولوں کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک پیامی شاعر تھے۔ ان کی شاعرانہ کاوش کا مقصد حقیقت کی جستجو تھا۔ ان کا یہ مقصد بھی تھا کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ عوام کو خدا تک پہونچنے کا راست سلسلہ جیتا جاگتا حقیقی راستہ بتا دیں لیکن اس سلسلے میں انھوں نے پہلے معرفت ذات کو سمجھا۔ اُن کو آزادیٔ خیال، خلوص جذبات اور بلند اخلاق نے ایک مقناطیسی شخصیت عطا کی۔ ان کی شاعری بنی نوع انسان کے لیے روشنی اور اُمید کا پیغام لاتی ہے جو تاریکی میں بھٹک رہا تھا۔

علامہ آزاد بلگرامی کے مطابق شاہ برکت اللہ پیمی نے اپنے زمانۂ حیات میں ہی ایک بلند مرتبہ اور پیامی شاعر ہونے کی عالم گیر شہرت حاصل کر لی تھی۔

پیم پرکاش میں پیمی نے بتایا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد عشق حقیقی سے رشتے کو استوار کرنا ہے جس کو انسان بھلا چکا ہے۔ عشق حقیقی کی دریافت تو سے ہی اذیت کو مسرت اور موت کو بحال شدہ زندگی میں بدلا جا سکتا ہے۔ عشق ہمیشہ انسان کی تلاش میں رہتا ہے جس طرح کرشن گوپیوں کی تلاش میں ہوں۔ انسان کو صرف عشق کی آواز پر لبیک کہنا چاہیے اور اپنے اندر عشق کی تلاش کر کے اُسے بیلے لوٹ

بنادینا چاہیے۔ فنا انسان کو بقا کی طرف لے جاتی ہے فقر اپنی ذات کی تردید کے ذریعہ ہی انسان ترقی کرکے بلند مرتبہ حاصل کرسکتا ہے اور اسے وہ مقدس درجہ حاصل ہو جاتا ہے جو درحقیقت اس کی منزل ہے۔ یوگ (योग) کی ذہنی اور اخلاقی تنظیم، جو انسان کی روزمرہ زندگی سے وابستہ ہے، انسان کو عرفان ذات کرا سکتی ہے۔

صوفیا کے عالمانہ اور فلسفیانہ خیالات کو برج کے اس عظیم شاعر نے اپنی شاعری کی بنیاد بنایا ہے۔ اپنے صوفیانہ خیالات کے اظہار کو نیمی نے اپنی شاعری کا مقصد بنایا ہے۔

اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بحیثیت ایک صوفی شاعر شاہ برکت اللہ پیمی برج کے شاعروں میں سب سے الگ ہیں اور اُن کا ایک منفرد مقام ہے۔

★

گووند ولبھ پنت ——— صفحہ ۹ کا بقیہ)

کو امور داخلہ اور اندرونی مسائل کے حل کی جانب سے اطمینان ہوگیا اس طرح نہرو جی کو ہمارے ملک اور باہر کے دوسرے ملکوں کے درمیان بین الاقوامی رشتوں کو مستحکم بنانے کے لیے زیادہ وقت ملا۔

وزیر داخلہ کی حیثیت سے پنت جی کے کارنامے انتہائی قابل تعریف ہیں۔ دنیا کے آزمودہ کار سیاست دانوں نے بھی ان کے تدبر اور سیاست دانی کو تسلیم کیا۔ مرکزی کابینہ میں پنت جی کی شمولیت کے وقت ملک کے مشرقی خطوں منی پور اور ناگالینڈ میں زبردست ہنگامے ہو رہے تھے لیکن پنت جی کے وزیر داخلہ کا عہدہ سنبھالتے ہوئے ہنگامے فرو ہوگئے۔

ایک دور اندیش وزیر داخلہ کی حیثیت سے پنت جی نے یہ محسوس کیا کہ جب تک کشمیر کے مسئلے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوتا، پانچویں کالم کی سرگرمیوں پر قابو پانا مشکل ہے۔ اس لیے انھوں نے غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ کشمیر کے عوام آزاد بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہندستان میں ضم ہونے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور ہندستان کے عوام نے کشمیر کے عوام کے اس فیصلے کو قطعی ناقابل تنسیخ فیصلے کی حیثیت سے تسلیم کرلیا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس فیصلے کو تبدیل کرانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتی۔ پنت جی کی اس واضح اعلان سے اس مسئلے کا ابہام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ پاکستان نے یہ محسوس کرلیا کہ اس کا کیس بہت کمزور ہے۔

جب کبھی کانگریس کو کوئی اہم فیصلہ کرنا پڑا یا ملک کو کسی بحران سے دوچار ہونا پڑا تو اس کو حل کرنے کی ذمہ داری پنت جی کو سونپی گئی اور اس طرح کے تمام معاملوں کو انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے حل کیا۔ ان کے اوصاف کے اعتراف میں انھیں بھارت رتن کے اعزاز سے نوازا گیا جو ملک کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ ★

ایک ہی جادو

سخت محنت • دوراندیشی • پکا ارادہ • ڈسپلن

——— اندرا گاندھی

غزل

تسنیم فاروقی

وہ ہم کو اپنی یادیں ایسا ڈبو گئے
چاہا تھا ان کو پائیں تو ہم خود ہی کھو گئے

ہر لفظ جن کا پھول تھا ہر جملہ شاخ گل
وہ بھی جدا ہوئے ہیں تو کانٹے چبھو گئے

آئے تھے زندگی کا پتہ پوچھتے ہوئے
اک مقبرے کی بھول بھلیوں میں کھو گئے

پچھلے پہر کا چاند بھی کتنا حسین تھا
جھونکے کسی کی یاد کے دامن بھگو گئے

سونے کا دل ملے گا اسی انتظار میں
سنتے ہیں اس کے بال بھی چاندی کے ہو گئے

انسانیت کے نام پہ گزرے تھے قافلے
ہر راستے میں زہر کے کچھ بیج بو گئے

پھولوں کو تو سجا ہے شبنم کی کہکشاں
کانٹوں میں کون لوگ ستارے پرو گئے

پتھر کسی کے ہاتھ میں اب کیا دکھائی دے
بستی کے سارے جسم تو شیشے کے ہو گئے

تسنیمؔ اب کسی کو سویرے کا غم نہیں
سورج کا ڈوبنا تھا کہ سب لوگ سو گئے

غزل

ثروت نواز

چمن میں رہ کے دل پھولوں سے بہلانا نہیں آتا
ذرا سی زندگی پر مجھ کو اترانا نہیں آتا

جہاں تک ہو سکے ہم پر ستم ڈھاتے چلے جاؤ
سمندر ہیں ہمیں طوفاں سے گھبرانا نہیں آتا

میں اس پر ناز کرتا ہوں کہ تم پر جان دیتا ہوں
تمہیں تو حسن پر بھی اپنے مرجانا نہیں آتا

محبت مانگنے نکلے ہیں ہم جب گھر سے ظاہر ہے
مگر دنیا کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں آتا

ہمیں تو زندگی کی سخت راہوں سے گزرنا ہے
ہمارے راستے میں کوئی میخانا نہیں آتا

اسی ڈر سے تو ہم اس بے وفا کو دل نہیں دیتے
کہ شیشے کو ہمیں پتھر سے ٹکرانا نہیں آتا

کوئی چہرہ ہماری راہ کیا روکے گا اے ثروتؔ
ہمیں دل کو تمناؤں میں الجھانا نہیں آتا



کاظم علی خاں

غالب کی اردو مکتوب نگاری

آغاز و محرکات

غالب اپنی عمر کی ایک طویل مدت تک خط و کتابت فارسی میں کرتے رہے۔ اسے فارسی سے اُن کے فطری ذوق کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے مگر اس امر میں عہدِ غالب کے عام مزاج و مذاق کی بھی کارفرمائی شامل نظر آتی ہے۔ اُس زمانے میں خطوط اردو کے بجائے عام طور پر فارسی میں ہی لکھے جاتے تھے۔ لیکن عمر کے آخری دور میں غالب مکتوب نگاری کے لیے اُردو کی جانب متوجہ ہوئے۔ غالب کی اردو مکتوب نگاری کی ابتدا مولانا حالی نے ۱۸۵۰ء کے بعد بتائی ہے۔[1] مولانا حالی کے اس نظریے کو متعدد صاحبانِ قلم نے قبول فرمایا ہے جن میں مولانا حامد حسن قادری،[2] ڈاکٹر مسیح الزماں،[3] ڈاکٹر سلام سندیلوی،[4] شیخ محمد اکرام،[5] اویس احمد ادیب،[6] رام بابو سکسینہ،[7] رضا ہمدانی گیاوی[8] اور ڈاکٹر محمد حسن[9] وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ غالب کی اردو مکتوب نگاری کی ابتدا ۱۸۴۹ء کے آس پاس متعین کرتے ہیں[10] لیکن آفاق حسین آفاق کی تحقیقی کاوشوں کے نتیجے میں غالب کے ۱۸۴۸ء کے دو ایسے اردو خط روشنی میں آچکے ہیں،[11] جو ان تمام قیاس آرائیوں کا سدِباب کردیتے ہیں کہ غالب کی اردو مکتوب نگاری کی ابتدا ۱۸۴۹ء میں یا ۱۸۵۰ء کے بعد ہوئی تھی۔ غالب کے ان دو اردو خطوط میں سے پہلے مکتوب کی تاریخِ تحریر ۹ مارچ ۱۸۴۸ء ہے، اور دوسرا ۴ جون ۱۸۴۸ء کو لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں خطوط منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھے گئے ہیں۔ نادراتِ غالب کے علاوہ یہ دونوں خط بعد میں خطوطِ غالب میں بھی شامل کرلیے گئے ہیں۔[12] اب تک ہمارے سامنے غالب کے جو مطبوعہ اردو خطوط موجود ہیں اُن میں قدیم ترین خط ۹ مارچ ۱۸۴۸ء ہی کا ہے اور اس خط سے قدیم تر غالب کا کوئی اردو غیر مطبوعہ

---

[1] حالی، خواجہ الطاف حسین: یادگارِ غالب۔ رام دیال اگروال، الٰہ آباد ۱۹۵۸ء۔ ص ۱۶۶۔ [2] قادری، حامد حسن: داستانِ تاریخِ اُردو۔ لکشمی نرائن اگروال، آگرہ ۱۹۶۶ء۔ ص ۲۱۷۔ [3] ڈاکٹر مسیح الزماں: معیار و میزان۔ رام نرائن لال پبلشرز، الٰہ آباد ۱۹۶۸ء۔ ص ۲۵۷۔ [4] ڈاکٹر سلام سندیلوی: مطالعہ و مشاہدہ۔ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، جون ۱۹۷۵ء۔ ص ۳۲۹۔ [5] شیخ محمد اکرام: غالب نامہ۔ احسان بک ڈپو، لکھنؤ، مطبوعہ سمتا پرنٹنگ پریس، لکھنؤ، ص ص ۲۳۳/۲۳۲۔ [6] اویس احمد ادیب: تنقیدیں۔ اردو پبلشنگ ہاؤس، الٰہ آباد ۱۹۴۴ء۔ ص ۱۰۱۔ [7] رام بابو سکسینہ: تاریخِ ادبِ اردو۔ بحوالہ عبدالقوی دسنوی: نذرِ سجاد بھوپال ۱۹۷۴ء۔ ص ۳۳۴۔ [8] محمد اسمٰعیل رضا ہمدانی گیاوی (مرتب): نادر خطوطِ غالب۔ کاشانۂ ادب، لکھنؤ ۱۹۳۹ء۔ ص ۱۳۔ [9] ڈاکٹر محمد حسن: مضمون غالب کا نثری اسلوب۔ مطبوعہ ماہنامہ آجکل (اردو) دہلی فروری ۱۹۷۴ء۔ ص ۹۔ [10] ڈاکٹر سید عبداللہ: میرامن سے عبدالحق تک۔ چمن بک ڈپو، دہلی۔ مطبوعہ سود پریس دہلی ص ۳۷۳۔ [11] آفاق، سید آفاق حسین: نادراتِ غالب۔ ادارۂ نادرات کراچی ۱۹۴۹ء۔ [12] خطوطِ غالب (جلد ۱): مرتبہ مالک رام انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۶۲ء۔ ص ص ۱۰۱ لغایت ۱۰۳۔

اُردو خط سرِ دست دستیاب نہیں ہوا ہے مگر قرائن و قیاس کی روشنی میں اِس بات کا ابھی پورا امکان ہے کہ غالبؔ نے اِس تاریخ سے قبل بھی اردو میں خطوط لکھے ہوں گے جو اپنی بازیافت کے لیے کسی محقق کے تیشۂ تحقیق کے منتظر ہیں۔ عجیب نہیں کہ دنیائے تحقیق کا کوئی کولمبس اِس عالمِ گم گشتہ کو مستقبل میں دریافت کرلے۔

غالبؔ کی اردو مکتوب نگاری کے عوامل و محرکات کا جائزہ لینے پر ہمارے سامنے مختلف صاحبانِ قلم کی نگارشات آتی ہیں۔ مولانا حالیؔ کا خیال ہے :

"معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے، مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے" اور ہمہ تن مہرِ نیم روز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے، اس وقت بہ ضرورت اُن کو اُردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثر علی الخصوص اکثر فارسی خطوط، جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے، نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب اُن کی ہمت مہرِ نیم روز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی ضرور ہے کہ اُس وقت اُن کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں شاق معلوم ہوتی ہوگی۔ اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ اُنھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں"۔[1]

غالبؔ کی اردو مکتوب نگاری کا سبب مولانا حالیؔ نے مہرِ نیم روز کی تالیف کے سلسلے میں غالبؔ کی مصروفیت کو قرار دیا ہے۔ دوسرے متعدد صاحبانِ قلم نے مولانا حالیؔ کے اس نظریے کو قبول کیا ہے جن میں شیخ محمد اکرام[2]، ڈاکٹر مسیح الزماں[3]، اویس احمد ادیب[4]، مولانا حامد حسن قادری[5]، ڈاکٹر سلام سندیلوی[6] وغیرہ شامل ہیں۔ گویا حالیؔ سے حال تک مختلف ناقدین نے غالبؔ کی اردو مکتوب نگاری کو غالبؔ کی مہرِ نیم روز کی تالیف میں مصروفیت کا نتیجہ قرار دیا ہے لیکن مولانا غلام رسول مہرؔ نے مولانا حالیؔ کے اس نظریے کی تردید فرماتے ہوئے تحریر کیا ہے :

"مجھے (مولانا حالیؔ کی) اِس رائے سے اتفاق نہیں۔ اِس لیے کہ اوّل مہرِ نیم روز کوئی بڑی کتاب (نہیں) جس کی ترتیب میں غالبؔ کے اوقات کا بیش تر حصہ صرف ہوتا ہو گا۔ یہ کتاب انھوں نے کم و بیش پانچ برس میں مرتب کی۔ موجودہ مطبوعہ صورت میں اس کے ۱۱۸ صفحے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ بہ اعتبار اوسط وہ سال بھر میں زیادہ سے زیادہ پچیس صفحات لکھتے رہے اور یہ غالبؔ جیسے قادر الکلام اور مشاق نثر نگار کے لیے کوئی بہت بڑا کام نہیں ہے جس کی تکمیل کی خاطر انھیں فارسی خط و کتابت ترک کرنی پڑی ہو۔"[7]

مولانا مہرؔ اپنے متذکرۂ بالا بیان میں مولانا حالیؔ کے علی الرغم جس نتیجے تک پہنچے ہیں راقم الحروف کو بنیادی اعتبار سے تو اس سے انکار نہیں مگر مولانا مہرؔ کی بعض باتیں جزوی طور پر محلِ نظر ضرور محسوس ہوتی ہیں۔ اوّل تو مہرِ نیم روز کی ضخامت "موجودہ مطبوعہ صورت میں" جو بھی ہو اُس سے بحث نہیں؛ لیکن کتاب کی طبعِ اوّل کی ضخامت ۱۱۸ صفحات کے بجائے ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے[8] دوسرے مولانا غلام رسول مہرؔ کا یہ قول بھی نظرِ ثانی کا محتاج ہے کہ یہ کتاب "کم و بیش پانچ برس" میں لکھی گئی۔ خود غالبؔ کی نگارشات سے یہ بات اب پوری طرح پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ مہرِ نیم روز کی آغاز سے تکمیل تک کی مجموعی مدتِ تالیف جولائی ۱۸۵۰ء سے اگست ۱۸۵۴ء یعنی چار سال ایک ماہ ہے جسے "کم و بیش پانچ برس" کے بجائے "کم و بیش چار برس" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

---

[1] حالیؔ، مولانا الطاف حسین: یادگارِ غالبؔ۔ ص ص ۱۶۶/۱۶۵۔ [2] شیخ محمد اکرام: غالبؔ نامہ۔ ص ص ۲۳۳/۲۳۲۔ [3] ڈاکٹر مسیح الزماں: معیار و میزان۔ ص ۲۵۸۔ [4] اویس احمد ادیب: تنقیدیں۔ ص ۱۰۲۔ [5] قادری مولانا حامد حسن: داستانِ تاریخِ اُردو۔ ص ۲۱۷۔ [6] ڈاکٹر سلام سندیلوی: مطالعہ و مشاہدہ۔ ص ۳۲۹۔ [7] مہرؔ، مولانا غلام رسول: غالبؔ۔ تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ طبع اوّل مطبوعہ لاہور پریس دہلی۔ ص ص ۱۴۱/۱۴۵۔ [8] بہ حوالہ مالک رام ذکرِ غالبؔ مکتبۂ جامعہ دہلی ۱۹۶۴ء۔ ص ۱۸۶۔



بھوٹان کے فرمانروا جگمے سنگیے وانگ چک نے صدر جمہوریہ سری فخرالدین علی احمد سے
۱۵ ستمبر کو راشٹرپتی بھون نئی دہلی میں ملاقات کی یہ تصویر اسی موقع کی ہے

یعنی، اندرا گاندھی کے ہنگامی اقدامات کی حمایت میں اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے پر برٹش پریس
اور بی بی سی کے خلاف لندن میں مقیم ہندستانیوں کے زبردست مظاہرہ میں حصہ لینے والے کچھ
ہندستانی جنہوں نے نئی دہلی میں وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی سے ۱۵ ستمبر کو ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی





آنجہانی نہرو کے ایک قد آدم مجسمہ کونسل ہاؤس لکھنؤ کے سامنے نصب کیا گیا ہے مرکزی وزیر زراعت شری جگ جیون رام نے
اس مجسمہ کی نقاب کشائی کی تصویر میں دائیں سے بائیں آنجہانی پنڈت نہرو کے صاحب زادے اور مرکزی وزیر ریاست شری کے سی پنت شری
جگ جیون رام ڈاکٹر چنا ریڈی، شری ہیم وتی نندن بہوگنا اور مسز وجے لکشمی پنڈت

اسکول جاتے ہوئے۔ اب ریاست کے دور دراز علاقوں میں بھی
میں تعلیم کا بندوبست ہے





میڈم نصرت ق



کرتن روڈ لکھنؤ پر واقع موضع بسہا میں باہر بچوں کے لیے تعمیر کیے گئے کچھ مکانات

ای، سی، سی نے لڑکوں اور لڑکیوں میں مہم جوئی کا شوق اور ڈسپلن پیدا کرنے کا ایک تربیتی پروگرام شروع کیا ہے جس کے تحت متعدد تربیتی کیمپ ملک کے مختلف حصوں میں منعقد کیے جاتے ہیں۔ تصویر میں ممانی کی کھڑی پہاڑیوں پر کوہ پیمائی کی تربیت حاصل کرتے ہوئے این سی سی کا ایک کیڈٹ



ممانی کا ایک منظر





تحصیل سگڑی ضلع اعظم گڑھ میں ہریجنوں اور بے زمین افراد کو زمین کا الاٹمنٹ

باندہ میں پینے کے پانی کی پائپ لائن اسکیم



مہر نیم روز کی ترتیب و تکمیل کی مدت چار سال ایک ماہ خود غالب کی تحریروں سے ثابت ہوتی ہے۔ غالب کے کلیات نثر فارسی کی ایک تحریری شہادت کے حوالے سے مالک رام نے تحریر فرمایا ہے کہ غالب "...... ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو خاندان تیموری کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے تھے۔"[۵۱] عیارِ غالب میں "توقیتِ غالب" کے تحت بھی مالک رام نے "تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر غالب کی تقرری کی تاریخ" ۴ جولائی ۱۸۵۰ء درج کی ہے۔[۵۲] ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی غالب کی تاریخ تقرری ۴ جولائی ۱۸۵۰ء بتائی ہے[۵۳] جو جدید تحقیق کے مطابق درست نہیں ثابت ہوتی۔ نثار احمد فاروقی کی تلاش و تحقیق کے نتیجے میں مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام غالب کا ایک ایسا نیا فارسی خط روشنی میں آچکا ہے جس کی تاریخ تحریر ۴ جولائی ۱۸۵۰ء ہے اور جس میں غالب نے بازنوشت کے طور پر خود تحریر کیا ہے کہ "نہاں ممانا د۔ کہ تاریخ نوکری من در سرکار شاہ بعہدۂ "تاریخ نویسی اسلاف" ایں خاندان بمشاہرۂ پنجاہ روپیہ یکم ہمیں ماہ است..."[۵۴] غالب کی اس فارسی عبارت کا اردو مفہوم نثار احمد فاروقی کے الفاظ میں یہ ہے: "پوشیدہ نہ رہے کہ سرکار شاہ میں میرا تقرر اسی مہینے (جولائی ۱۸۵۰ء) کی پہلی تاریخ سے اس خاندان کے اسلاف کی تاریخ لکھنے پر ہوا ہے۔ پچاس روپے تنخواہ ہوگی۔"[۵۵] غالب کی اس واضح تحریر سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ مہر نیم روز لکھنے پر غالب کی تقرری کی صحیح تاریخ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کے بجائے یکم جولائی ۱۸۵۰ء ہے۔

مہر نیم روز کے زمانۂ تکمیل کا تعین کرنے میں منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کا ایک اردو خط معاون ثابت ہوتا ہے۔ غالب نے اپنے مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۸۵۴ء کے اس مکتوب میں حقیر کو مطلع کیا ہے کہ ۱۸۵۴ء میں عید قرباں کے موقعے پر غالب نے قصیدے کی جگہ مہر نیم روز کی تکمیل شدہ جلد بادشاہ کی خدمت میں بطور نذر پیش کی۔[۵۶] مالک رام کی تحقیق کے مطابق ۱۸۵۴ء میں عید قرباں ستمبر میں ہوئی تھی اور مہر نیم روز کی تکمیل اگست ۱۸۵۴ء میں ہوئی تھی۔[۵۷]

سطورِ گذشتہ سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مہر نیم روز کی ترتیب و تکمیل جولائی ۱۸۵۰ء سے اگست ۱۸۵۴ء تک یعنی کم و بیش چار سال ایک ماہ کی مدت میں ہوئی تھی اور مولانا غلام رسول مہر کا یہ قول قابلِ قبول قرار نہیں دیا جاسکتا کہ یہ کتاب کم و بیش پانچ برس میں تحریر کی گئی۔ بہرحال غالب جیسے مشاق فارسی نثر لکھنے والے کے لیے تقریباً چار برس کی طویل مدت میں ۱۱۶ صفحے کی مہر نیم روز جیسی مختصر سی کتاب لکھنا کچھ ایسا دشوار گذار کام نہ تھا کہ جس کی وجہ سے وہ فارسی میں مکتوب نگاری ترک کرکے اردو میں مکتوب نگاری اختیار کرنے پر مجبور ہوتے۔ حالی اور ان کی پیروی میں بعض اور صاحبانِ قلم کے نزدیک مہر نیم روز لکھنے میں غالب اتنے مصروف تھے کہ فارسی میں مراسلت کے لیے ان کو مہلت نہ مل پاتی تھی مگر یہ محض قیاس آرائی ہے اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ منشی نبی بخش حقیر وغیرہ کے نام غالب کے خطوط خود بتاتے ہیں کہ مہر نیم روز کافی اطمینان سے رُک رُک کر لکھی جاتی رہی ہے[۵۸] اور کتاب کے لیے حصولِ مواد میں خود غالب کی تلاش و تحقیق سے زیادہ دوسروں کی مدد شامل رہی ہے جیسا کہ منشی نبی بخش حقیر کے نام مورخہ ۱۹ نومبر ۱۸۵۲ء کے اپنے ایک اردو مکتوب میں غالب نے خود اس امر کا اعتراف مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"...... میں جو تواریخ تیموریہ لکھتا ہوں، تو صرف حالات و واقعات لکھتا ہوں ...... فنِ تاریخ و مساحت و سیاق سے اتنا

---

[۵۱] ماسبق ص ۱۸۲ و حاشیہ نمبر ا ص ۱۱۵۔ [۵۲] مالک رام: عیارِ غالب۔ علمی مجلس، دلی۔ فروری ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۱۔ [۵۳] ڈاکٹر خلیق انجم: غالب اور شاہانِ تیموریہ۔ مکتبۂ جامعہ دہلی دسمبر ۱۹۷۴ء۔ ص ۳۷۔ [۵۴] بہ حوالہ نثار احمد فاروقی: تلاشِ غالب۔ مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی۔ مئی ۱۹۶۹ء۔ ص ۸۹۔ [۵۵] ماسبق۔ ص ۹۸۔ [۵۶] خطوط غالب (جلد ۱) مرتبہ مالک رام۔ ص ۱۴۶۔ [۵۷] مالک رام: ذکر غالب ص ۱۸۴۔ [۵۸] متعلقہ خطوط کے لیے ملاحظہ ہو خطوط غالب (جلد ۱) مرتبہ مالک رام ص ص ۱۰۷، ۱۱۳، ۱۱۳، ۱۲۴، ۱۲۵ (کاظم علی خاں)

بے گانہ ہوں کہ ان فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ کارپردازانِ دفترِ شاہی خلاصۂ حالات از روے کتب اردو (میں) لکھ کر میرے پاس بھیج دیتے ہیں۔ میں اس کو فارسی کر کر حوالے کرتا ہوں ...... میں اسی قدر ہوں کہ نظم و نثر بقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں۔ مورخ نہیں ہوں ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس" [1]

اسی سلسلے میں ۱۰ اپریل ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں غالبؔ نے حقیر کو مہرِ نیم روز کی تالیف کے بارے میں لکھا ہے:

"کیسی تاریخ اور کیسی نقل؟ کیا فرماتے ہو؟ پہلے مجھ سے حقیقت تو پوچھ لیا کرو ...... اب سنیے، ماجرا کیا ہے۔ جب ہمایوں کے حال تک پہنچا، تو میں نے ازراہِ عذر و حیلہ بلکہ بسبیلِ اظہارِ حقیقت واقعی حکیم صاحب (یعنی حکیم احسن اللہ خاں) کا ذکر ما سے کہا کہ مجھ سے انتخاب حالات ممکن نہیں۔ آپ مدعا کتبِ سیر سے نکال کر زبانِ اردو میں ایک مسودہ اس کا لکھوا کر میرے پاس بھیج دیا کیجیے۔ میں اس کو فارسی کر کر تم کو دے دیا کروں گا۔ انھوں نے اس کو قبول کر کر ابتداے آفرینشِ عالم آدم سے میرے پاس مسودہ اردو بھیجا ...... آدم سے لے کر چنگیز خاں تک انھوں نے میرے پاس مسودہ بھیجا۔ میں نے اپنے طور پر لکھا اور مسودہ حوالے کیا۔ رمضان کے مہینے سے، کہ آج اس کو دس مہینے ہوے، وہ مسودہ آنا موقوف ہو گیا۔ بہمہ جہت چار جزو ہوں گے۔ دو چار بار میں نے ان سے تقاضا کیا۔ یہی جواب سنا، کہ اب رمضان ہے۔ پھر کہا کہ عید کا ہنگامہ ہے۔ میں نے سوچا، مجھ کو کیا۔ میں کیوں طالبِ مشقت ہوں؟ تقاضا موقوف کیا۔ وہ چار جزو میرے لکھے ہوے حکیم صاحب کے پاس ہوں گے۔ اب کہاں ان سے مانگوں اور کیوں مانگوں؟ جانے دو، دور کرو۔ جو بنا اٹھی ہی نہیں، اس سے غرض کیا۔" [2]

سطورِ گذشتہ میں خطوطِ غالبؔ سے پیش کیے جانے والے تراشوں سے یہ امر بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ مہرِ نیم روز غالبؔ نے آرام سے رک رک کر لکھی اور لکھنے کے دوران بیچ بیچ میں انھیں کافی طویل عرصے تک فرصت بھی رہی اس کے علاوہ کتاب کا مواد حاصل کرنے کے لیے بھی غالبؔ کو وقت نہ صرف کرنا پڑا۔ مواد دوسرے اصحاب اردو میں غالبؔ کو مہیا کرتے رہے غالبؔ ان اردو مسودوں کا فارسی ترجمہ کرتے رہے۔ ان واضح شواہد کی موجودگی میں غالبؔ کی اردو مکتوب نگاری کو مہرِ نیم روز کی تالیف میں ان کی مصروفیت کا نتیجہ قرار دینا حقائق سے بے خبری کا ثبوت دینا ہے۔ اس کے علاوہ غالبؔ کی اردو مکتوب نگاری کو مہرِ نیم روز کی تالیف میں ان کی مصروفیت کا نتیجہ اس اعتبار سے بھی قرار نہیں دیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کے زمانۂ تالیف سے قبل اور بعد کے زمانوں کے اردو خطوط اس نظریے کی نفی کرتے ہیں۔ جولائی ۱۸۵۰ء سے قبل کے متعدد مکاتیب اور اگست ۱۸۵۴ء کے بعد کے غالبؔ کے سیکڑوں اردو خطوط کی موجودگی اس نظریے کو رد کر رہی ہے کہ غالبؔ کی اردو مکتوب نگاری مہرِ نیم روز میں ان کی مصروفیت کا نتیجہ تھی۔

غالبؔ کی اردو مکتوب نگاری کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوے اسلوب احمد انصاری رقم طراز ہیں: "غالبؔ کی زندگی کی شام میں فارسی مکتوب نگاری کا چلن قریب قریب ختم ہو گیا تھا اور یہ بے وقت کی راگنی معلوم ہونے لگی تھی ......" [3] اسلوب احمد انصاری کا یہ نظریہ حقائق پر مبنی نہیں۔ غالبؔ کی زندگی کی شام میں فارسی مکتوب نگاری کا چلن "قریب قریب ختم" نہ ہوا تھا بلکہ برابر جاری نظر آتا ہے۔ اگر غالبؔ کی "زندگی کی شام" سے غالبؔ کی ضعیفی کا وہ زمانہ مراد لیا جائے جب ان کا سن پچاس برس سے متجاوز ہو چکا ہو تو غالبؔ (ولادت $\frac{۱۲۱۲ھ}{۱۷۹۷ء}$۔ وفات $\frac{۱۲۸۵ھ}{۱۸۶۹ء}$ [4]) کی زندگی کی شام کی مدت کم و بیش $\frac{۱۲۶۳ھ}{۱۸۴۷ء}$ سے $\frac{۱۲۸۵ھ}{۱۸۶۹ء}$ تک متعین ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں حقائق کا ایک سرسری جائزہ

---

[1] خطوطِ غالبؔ (جلد ۱) ، مرتبہ مالک رام ص ۱۲۰۔ [2] خطوطِ غالبؔ (جلد ۱) ، مرتبہ مالک رام ص ص ۱۲۵/۱۲۴۔ [3] اسلوب احمد انصاری: نقشِ غالبؔ۔ غالب اکیڈمی، نئی دہلی۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۱۲۸۔ [4] بحوالہ مالک رام: ذکرِ غالب دہلی ۱۹۶۴ء۔ ص ص ۲۵ و ۱۶۶۔

بتاتا ہے کہ مدت مذکورہ میں نہ صرف فارسی زبان رائج رہی ہے بلکہ فارسی مکتوب نگاری کی مقبولیت بھی برقرار رہی ہے اور فارسی مکتوب نگاری کی یہ مقبولیت غالب کی زندگی ہی تک نہیں بلکہ غالب کی وفات (۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء) کے بعد بھی کافی عرصے تک قائم رہی ہے۔ غالب کے ایک شاگرد ولایت علی المتخلص بہ ولایت و عزیز صفی پوری عہد واجد علی شاہ کے عینی شاہد کا بیان ہے: "واجد علی شاہ کے عہد تک دفتر زبان فارسی میں تھا۔ اس وجہ سے ہر شخص فارسی کا شائق تھا اور سب لوگ اپنی اولاد کو فارسی پڑھواتے تھے ....."[1] اودھ میں واجد علی شاہ کی حکومت کا عہد ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء سے ۲ فروری ۱۸۵۶ء تک کی مدت پر محیط ہے۔[2] ملحوظ رہے کہ یہ بھی غالب کی ضعیفی کا زمانہ تھا اور اس عہد میں فارسی کافی مقبول تھی۔ عزیز صفی پوری کے بیان کی تائید مولانا عبدالحلیم شرر کے ایک بیان سے ہو جاتی ہے جس میں شرر مرحوم نے عینی شاہد کی حیثیت سے بتایا ہے کہ اودھ اور لکھنؤ میں عہد واجد علی شاہ میں اور اس کے بعد تک فارسی مقبول رہی ہے۔ شرر مرحوم نے لکھا ہے: "لکھنؤ میں اُن دنوں فارسی کے صدہا نثار اور شاعر موجود تھے ..... فارسی شرفا ہی نہیں عوام الناس تک کا شعار و وقار بن گئی تھی اور اب باوجودے کہ فارسی درباری زبان نہیں باقی رہی ..... مگر مہذب سوسائٹی پر آج تک فارسی کا سکہ جما ہوا ہے اور عام خیال یہی ہے کہ فارسی مدارس و مکاتب سے نکل گئی اور تحصیل معاش کے لیے اس کی ضرورت نہیں باقی رہی مگر انسان بغیر فارسی پڑھے مہذب سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہو سکتا اور نہ صحیح معنوں میں انسان کامل بن سکتا ہے ....."[3] تخت حکومت سے معزولی کے بعد واجد علی شاہ اپنی وفات (۳ محرم ۱۳۰۵ھ / ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء)[4] تک کلکتے میں مقیم رہے۔ مولانا شرر نے کلکتے میں بزمِ واجدی کا بہ ذات خود مشاہدہ کیا تھا اور عینی شاہد کی حیثیت سے شرر مرحوم کا یہ بیان بھی اہم ہے: "مٹیا برج (کلکتہ) میں آخری محروم القسمت تاجدار اودھ کے ساتھ جو چند لوگ وہاں کے سکونت پذیر ہو گئے تھے اُن میں کوئی پڑھا لکھا (ایسا) نہ تھا جو فارسی نہ جانتا ہو۔ دفتر کی زبان فارسی تھی اور ہندو مسلمانوں میں صدہا فارسی گو شاعر تھے[5] ....." ملحوظ رہے کہ یہ غالب کی وفات کے بعد کا زمانہ تھا اور کم از کم واجد علی شاہ کی وفات (۱۸۸۷ء) تک کلکتے میں بھی فارسی کی مقبولیت شرر کے بیان سے بخوبی ثابت ہوتی ہے۔ شرر کے اس بیان کے علاوہ ۱۸۸۷ء تک فارسی کی مقبولیت کا ایک اور ثبوت بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے مولوی سید مظہر علی سندیلوی کا ایک[6] روزنامچہ شائع کرایا ہے۔ یہ روزنامچہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۷ء سے ۲۴ دسمبر ۱۹۱۱ء تک کی مدت پر محیط ہے۔ اس روزنامچے کی زبان کے بارے میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے تحریر فرمایا ہے: "روزنامچہ دراصل مولوی صاحب نے ۱۸۶۷ء میں پہلے فارسی میں شروع کیا تھا لیکن ۱۸۸۷ء میں اُنھوں نے محسوس کیا کہ فارسی کی وقعت اب کم ہوتی جاتی ہے اور اُردو کا دور دورہ ہو چلا ہے اس لیے اس وقت تک جو کچھ لکھا تھا اُس کو اردو میں ترجمہ کر ڈالا اور اُس کے بعد سے پھر برابر اُردو میں لکھتے رہے۔"[7] اس بیان سے بھی پتا چلتا ہے کہ غالب کی وفات کے بعد ۱۸۸۷ء تک فارسی نویسی کو مقبولیت حاصل رہی ہے۔ جس فارسی کی مقبولیت اور رواج کا غالب کی وفات کے بعد تک یہ عالم ہو اُسے غالب کی حیات

---

۱ بہ حوالہ ادیب، سید مسعود حسن رضوی: مضمون "خطوط مشاہیر بنام ولایت و عزیز صفی پوری شاگرد غالب" مشمولہ عیار غالب مرتبہ مالک رام دلی ۱۹۶۹ء - ص ۱۱۵ - ۲ بہ حوالہ ادیب، سید مسعود حسن رضوی، لکھنؤ کا شاہی اسٹیج - کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۶۸ء - ص ص ۱۶/۱۲ - ۳ شرر لکھنوی، مولانا عبدالحلیم: گذشتہ لکھنؤ - نسیم بک ڈپو، لکھنؤ - جولائی ۱۹۶۵ء - ص ص ۱۳۱/۱۳۰ - ۴ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ص ۱۷ - ۵ شرر مولانا عبدالحلیم: گذشتہ لکھنؤ - ص ۱۳۲ - ۶ ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی (مرتب): ایک نادر روزنامچہ - ادارہ فروغ اردو لکھنؤ - طبع اول - ص ۹ -

میں بے وقت کی راگنی" کہنا حقائق سے بے خبری کا ثبوت دینا ہے۔

غالب کی وفات کے بعد تک فارسی کی عام مقبولیت کے ثبوت سطور گذشتہ میں پیش کرنے کے بعد اب فارسی مکتوب نگاری کے رواج کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔ محض مطبوعہ فارسی خطوط کا ایک سرسری جائزہ اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ "غالب کی زندگی کی شام" (۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء تا ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء) کے دوران فارسی مکتوب نگاری کا چلن "قریب قریب ختم" نہ ہوا تھا بلکہ برابر جاری تھا اور فارسی مکتوب نگاری نہ صرف غالب کی حیات بلکہ وفات کے بعد تک جاری رہی ہے۔ اس سلسلے میں اختصار کے ساتھ چند ثبوت پیش کیے جاتے ہیں۔ غالب کی زندگی کی شام میں ہی ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء – ۱۸۵۵ء میں غالب کے ہم عصر حکیم مومن خاں مومن کی ایک کتاب انشائے مومن دہلی میں شائع ہوئی[1] جس میں مومن کے فارسی خطوط تو موجود ہیں، اردو کا کوئی خط نہیں ملتا۔ تلاش کے باوجود مومن کا کوئی اردو خط نہیں دستیاب ہوتا۔ اگر مومن نے اردو خطوط لکھے تھے تو اُس زمانے میں انھیں فارسی خطوط کی سی مقبولیت نہ ملی اور وہ محفوظ نہ رکھے گئے اس کے برخلاف مومن کے فارسی خطوط انشائے مومن کی شکل میں محفوظ رکھے گئے۔ ان امور سے ۱۸۵۵ء میں فارسی مکتوب نگاری کی مقبولیت کا ثبوت ضرور مل جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے وقت بہادر شاہ ظفر کی حکومت کے آخری دور میں فوج کے رسالداروں کے نام بادشاہ کے متعدد خطوط فارسی میں ملتے ہیں۔ بہادر شاہ کے علاوہ سپہ سالار افواج محمد بخت خاں کی جانب سے بادشاہ کو جو خطوط بھیجے گئے ہیں اُن میں بھی بیش تر فارسی میں لکھے گئے ہیں[2] مئی ۱۸۵۷ء سے اگست ۱۸۵۷ء تک لکھے جانے والے یہ فارسی خطوط غالب کی زندگی کی شام میں فارسی مکتوب نگاری کے چلن کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے دوران باغیوں نے واجد علی شاہ کے کم سن فرزند برجیس قدر کو واجد علی شاہ کی تخت حکومت سے معزولی کے بعد لکھنؤ میں اودھ کا حکمران بنایا۔ اس زمانے سے متعلق برجیس قدر کے بھی بعض فارسی خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔[3] جو ۱۸۵۷ء میں فارسی مکتوب نگاری کے چلن کا ثبوت ہیں اور یہ غالب کی زندگی کی شام ہی کا دور تھا۔ انشائے سرور میں بھی مرزا رجب علی بیگ سرور کے چند فارسی خطوط موجود ہیں اور یہ کتاب سرور کی وفات (۱۸۶۹ء) کے بعد شائع ہوئی ہے جیسا کہ اس کے سبب تالیف کی ایک داخلی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں سرور کو "مرزائے مرحوم" تحریر کیا گیا ہے۔[4] راقم الحروف کی نظر سے کتب خانہ ندوہ لکھنؤ میں انشائے سرور کا ایک ایسا ایڈیشن گزرا ہے جو ۱۸۷۹ء میں طبع ہوا تھا۔[5] انشائے سرور وفات غالب کے بعد فارسی خطوط کی طباعت بھی اس زمانے میں فارسی مکتوب نگاری کے رواج کی نشان دہی کرتی ہے۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے مکاتیب کے مجموعے انشائے داغ میں بھی داغ کے بعض ایسے فارسی خطوط موجود ہیں جو ۱۸۶۰ء، ۱۸۶۶ء، ۱۸۷۰ء، ۱۸۷۹ء، ۱۸۸۱ء، ۱۸۸۲ء، ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۷ء میں تحریر کیے گئے تھے۔[6] داغ کے فارسی خطوط کے بارے میں احسن مارہروی تحریر کرتے ہیں: "اُس زمانے میں اردو شاعری اگرچہ پورے فروغ

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر عبادت بریلوی: مومن اور مطالعۂ مومن۔ اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ مئی ۱۹۷۵ء۔ ص ۴۷۳۔ [2] بحوالہ اٹھارہ سو ستاون۔ اخبار اور دستاویزیں: مرتبہ عتیق صدیقی۔ مکتبۂ شاہراہ دہلی۔ مئی ۱۹۶۶ء۔ ص ص ۲۹۳ تا ۲۹۷، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۲۱۔ [3] بحوالہ اٹھارہ سو ستاون۔ اخبار اور دستاویزیں۔ ۳۴۵۔ [4] بحوالہ ڈاکٹر سید نیر مسعود رضوی: رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے۔ ناشر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونی ورسٹی الٰہ آباد ۱۹۶۷ء۔ ص ۲۱۰۔ [5] انشائے سرور مطبع [illegible] ۱۸۷۹ء ص ۸۸۔ [6] داغ دہلوی کے ان تمام فارسی خطوط کے لیے ملاحظہ ہو: انشائے داغ: مرتبہ سید علی احسن احسن مارہروی۔ انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی ۱۹۴۱ء۔ ص ص ۳، ۷، ۱۱ تا ۱۴۔ ۲۳۔ ۲۴، ۲۸ تا ۳۰، ۳۳۔ ۳۴۔ (کاظم علی خاں)

تھی مگر خط و کتابت عموماً فارسی میں ہوتی تھی، اسی رواج کے مطابق بعض خطوط مرزا داغ کے فارسی زبان میں بھی ملتے ہیں۔[1] ان شواہد کی مدد سے بھی نہ صرف "غالب کی زندگی کی شام" کے دوران بلکہ وفات غالب کے بعد بھی فارسی مکتوب نگاری کی مقبولیت اور چلن کا ثبوت ملتا ہے۔ غالب کے نام مفتی محمد عباس مرحوم کے بھی کئی فارسی خطوط ملتے ہیں جو ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء میں تحریر کیے گئے تھے۔[2] ان خطوط سے بھی غالب کی ضعیفی کے زمانے میں فارسی مکتوب نگاری کے رواج کا پتا چلتا ہے۔ اس امر کے بھی ثبوت موجود ہیں کہ نواب یوسف علی خاں آف رام پور اور مولانا فضل حق خیرآبادی کے مابین بھی ۱۸۵۷ء میں مراسلت فارسی میں ہوتی تھی۔[3] خود غالب اور نواب یوسف علی خاں آف رام پور کے درمیان بھی ۱۸۵۷ء، ۱۸۵۸ء اور ۱۸۶۵ء کے دوران فارسی میں خط و کتابت ہونے کے ثبوت موجود ہیں۔[4] مزید برآں نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کے ۱۸۶۵ء میں غالب سے فارسی میں مکاتبت کرنے کے شواہد بھی ملتے ہیں۔[5] یہ تمام شواہد بھی غالب کی زندگی کے آخری زمانے میں فارسی مکتوب نگاری کے چلن کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان شہادتوں کے علاوہ مزید ثبوت کے لیے سرسید احمد خاں کا وہ فارسی خط بھی پیش کیا جا سکتا ہے جو ۲۱ جون ۱۸۶۴ء کو مولانا محمد حسین آزاد کے نام تحریر کیا گیا ہے۔[6] آزاد ہی کے نام سرسید کے اور بھی بہت سے فارسی خطوط کے ثبوت ملتے ہیں[7] یا سرسید احمد خاں کا وہ خط بھی اسی سلسلے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جو جولائی ۱۸۷۲ء میں لکھا گیا تھا اور جس کے مکتوب الیہ مولوی فریدالدین احمد تھے۔[8]

"غالب کی زندگی کی شام" کے دوران فارسی مکتوب نگاری کے رواج کے اور بھی شواہد موجود ہیں۔ مشہور مرثیہ گو مرزا سلامت علی دبیر کا کوئی اردو خط تلاش کے باوجود ہنوز دستیاب نہیں ہوا ہے۔ البتہ اس بات کا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ دبیر فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔[9] اس سلسلے میں شاد عظیم آبادی کے نام مرزا دبیر کا وہ فارسی مکتوب دیکھا جا سکتا ہے جس کی تاریخ تحریر ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۸۶ھ (مطابق ۱۲ فروری ۱۸۷۰ء) ہے۔[10] دبیر کے علاوہ میر انیس کا بھی ایک خط سید مسعود حسن رضوی ادیب کی تحقیقی کوششوں کے نتیجے میں دستیاب ہوا ہے۔ انیس نے یہ خط اپریل ۱۸۷۱ء کو اپنے قیام حیدرآباد (دکن) کے دوران اپنے بھائی میر مونس کو لکھا تھا۔ اس خط کا اردو ترجمہ مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنے ایک مضمون میں پیش کیا ہے۔[11] میر انیس کا یہ خط بظاہر فارسی زبان ہی میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ میر انیس کے سفر حیدرآباد کے سلسلے میں ارسطو جاہ مولوی رجب علی کے فرزند شریف العلماء مولوی شریف حسین کے بھی متعدد فارسی خطوط کا بھی پتا چلا ہے۔ یہ خطوط ۱۲۸۷-۸۸ھ (مطابق ۱۸۷۰-۷۱ء) کے دوران لکھے گئے ہیں اور یہ شریف العلما مولوی شریف حسین نے اپنے بڑے بھائی کے نام لکھے ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے ان فارسی خطوط کے ضروری اقتباسات کا اردو ترجمہ اپنے محولۂ بالا مضمون میں پیش کیا ہے۔[12] شریف العلماء کے والد ارسطو جاہ مولوی سید رجب علی کا بھی ایک طویل فارسی خط قاطع برہان کی حمایت

---

[1] ماسبق۔ ص ۴۔ [2] تجلیات: مولفہ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی۔ نظامی پریس، لکھنؤ ۱۳۴۴ھ۔ ص ص ۱۹۴ تا ۲۰۰۔ [3] بحوالہ عرشی، مولانا امتیاز علی خاں: مکاتیب غالب۔ رام پور، ۱۹۴۶ء۔ دیباچہ ص ص ۷۵/۷۴۔ [4] مکاتیب غالب۔ دیباچہ ص ۴۷۔ متن ص ص ۲ تا ۶۔ نیز ص ص ۸ تا ۱۰ و ۱۳ تا ۳۳۔ [5] ماسبق دیباچہ ص ۱۱۱۔ [6] خطوط سرسید: مرتبہ سید راس مسعود۔ نظامی پریس، بدایوں۔ ۱۹۳۱ء۔ ص ۲۱۔ [7] مکتوبات آزاد۔ بحوالہ جہاں بانو بیگم نقوی: محمد حسین آزاد۔ ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد (دکن)، ۱۹۴۰ء۔ ص ۱۴۲۔ [8] بحوالہ انگریزی کتاب "سیلکٹیڈ ڈاکیومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز": مرتبہ یوسف حسین، مطبوعہ علی گڑھ، ایشیا پبلشنگ ہاؤس، بمبئی۔ طبع اول ص ص ۱۶۵/۱۶۴۔ [9] حیات دبیر: مولفہ سید افضل حسین ثابت لکھنوی۔ مطبوعہ سیوک سٹیم پریس لاہور ۱۹۱۳ء۔ [10] بحوالہ ذکر بلیغ: مرتبہ نقی احمد ارشاد۔ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ۔ اگست ۱۹۷۴ء۔ ص ص ۲۱۸/۲۱۷۔ [11] بحوالہ سید مسعود حسن رضوی ادیب: مضمون "میر انیس کے سفر حیدرآباد کا روزنامچہ" مطبوعہ نیا دور، لکھنؤ ستمبر ۱۹۷۱ء۔ ص ص ۶/۷۔ [12] ماسبق ص ص ۳ تا ۶۔

میں لکھنؤ کے ایک مشہور اخبار میں مورخہ ۲ مئی ۱۸۶۵ء کو شائع ہوا ہے۔[51] اس امر کے ثبوت بھی موجود ہیں کہ سید احمد حسن فرقانی مصنف انشائے فرقانی ساکن میرٹھ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں مرزا دبیر سے فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ مرزا دبیر کے نام فرقانی صاحب کا ایک فارسی خط راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے۔[52] اودھ اخبار لکھنؤ کے ۳۰ دسمبر ۱۸۶۳ء کے شمارے میں کرنل دورونیڈی چیف سکریٹری گورنمنٹ کا ایک فارسی خط (بنام مرزا غالب) شائع ہوا ہے جس کی تاریخ تحریر ۳۰ جولائی ۱۸۶۳ء ہے۔[53] اس فارسی خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریز حکام نے بھی فارسی میں خط و کتابت بند نہ کی تھی اور انگریزی حکومت کے دفاتر میں سرکاری طور پر فارسی کا خاتمہ ہوجانے کے باوجود کافی عرصے تک فارسی کے قدم پوری طرح نہ اکھڑ سکے تھے۔ غالب ہی کے نام منشی یحییٰ علی خاں کے دو فارسی خطوط بھی روشنی میں آچکے ہیں جو اس زمانے میں فارسی مکتوب نگاری کے چلن پر روشنی ڈالتے ہیں۔[54] مزید برآں مولانا حالی کے بھی بعض فارسی خطوط اس امر کے ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں کہ فارسی مکتوب نگاری کا رواج غالب کے آخری زمانے اور اُن کی وفات کے بعد تک جاری رہا ہے۔[55] اسی ضمن میں سرسید احمد خاں کے نام سید عبدالفتاح کا ایک فارسی خط مورخہ ۱۵ جولائی ۱۸۷۲ء بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔[56] یا سرسید ہی کے نام محمد عظیم کا وہ فارسی خط بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جس کی تاریخ تحریر ۸ اگست ۱۸۷۲ء ہے۔[57]

سطور گزشتہ میں پیش کیے جانے والے شواہد و ثبوت کے طویل سلسلے کی بنیاد پر ہم بہ آسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ نہ صرف غالب کی زندگی کے آخری دور میں بلکہ اُن کی وفات کے ایک عرصے بعد تک فارسی مکتوب نگاری "قریب قریب ختم" نہ ہوئی تھی بلکہ برابر جاری تھی۔ اس زمانے میں فارسی مکتوب نگاری جن مشہور و معروف صاحبانِ علم و ادب کا شعار تھی اُن میں خود غالب کے علاوہ مومن خاں مومن، بہادر شاہ ظفر، رجب علی بیگ سرور، نواب مرزا خاں داغ، تتر احمد خاں، مرزا سلامت علی دبیر، میر ببر علی انیس، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا مفتی محمد عباس، مولانا فضل الحق خیرآبادی، نواب یوسف علی خاں ناظم آف رام پور، نواب کلب علی خاں آف رام پور، شریف العلماء مولوی شریف حسین، ارسطو جاہ مولوی رجب علی، منشی یحییٰ علی خاں، سید احمد حسن فرقانی کے نام شامل ہیں۔ مشاہیر علم و ادب کے علاوہ کرنل دورونیڈی جیسے انگریز حکام بھی فارسی میں خطوط لکھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ عبدالفتاح اور محمد عظیم وغیرہ جیسے غیر معروف لوگ بھی فارسی میں مکتوب نگاری کر رہے تھے۔ ان تمام واضح حقائق و شواہد سے یہ بات پوری طرح پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ "غالب کی زندگی کی شام میں فارسی مکتوب نگاری کا چلن قریب قریب ختم" نہ ہوا تھا بلکہ برابر قائم و برقرار تھا اور اسلوب احمد انصاری کا یہ بیان نظر ثانی کا محتاج ہے کہ "غالب کی زندگی کی شام میں فارسی مکتوب نگاری کا چلن قریب قریب ختم ہوگیا تھا اور یہ بے وقت کی راگنی معلوم ہونے لگی تھی۔" اس دور میں فارسی مکتوب نگاری پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے مندرجہ ذیل بیان کے مطابق بھی بے وقت کی شہنائی نہیں ثابت ہوتی۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا خیال ہے کہ:

"غالب نے اردو میں خط نگاری اس وقت شروع کی جب ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کو فروغ حاصل تھا۔

---

[51] اودھ اخبار لکھنؤ، مورخہ ۲ مئی ۱۸۶۵ء۔ ص ۲۹۸، بہ حوالہ ڈاکٹر اکبر حیدری: تحقیقی نوادر۔ اردو پبلشرز، لکھنؤ۔ ستمبر ۱۹۷۴ء۔ ص ۲۴۸
[52] بہ حوالہ تحقیقی نوادر۔ ص ص ۳۵۴/۳۵۳۔ [53] بہ حوالہ ماسبق ص ص ۳۶۷ تا ۳۶۹۔ [54] سید مسعود حسن رضوی ادیب: مضمون "غالب کا ایک خط اور غالب کے نام دو خط" مطبوعہ نیا دور، لکھنؤ، ۲۶ جنوری ۱۹۷۴ء ص ص ۴ تا ۶۔ [55] مکاتیب حالی: مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ اردو مرکز، لکھنؤ، ص ص ۱۱۵ تا ۱۳۰۔ [56] بہ حوالہ انگریزی کتاب "سیلکٹیڈ ڈاکیومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز" ص ص ۱۵۹ تا ۱۶۱۔ [57] ماسبق، ص ۱۷۵۔

یہ زبان دربار شاہی میں اور امراء و رؤسا کی محفلوں میں داخل تھی اور اسی کا سکہ ہر جگہ چل رہا تھا۔ اس کے بغیر ان جگہوں میں کسی کی رسائی ممکن نہ تھی۔ عام طور سے اس زبان کو عالموں کی زبان تصور کیا جاتا تھا۔ اسی لیے خط وکتابت کی زبان فارسی ہی تھی۔" [۱]

غالب کی اردو مکتوب نگاری کو نہ تو بہ قول مولانا حالی "دو بہ نیم روز" میں غالب کی مصروفیت کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا، اور نہ ہی اسے بہ قول اسلوب احمد انصاری فارسی مکتوب نگاری کے چلن کے مفروضہ تعاقب کا نتیجہ مانا جا سکتا ہے۔ غالب کی اردو مکتوب نگاری جن عوامل و محرکات کا نتیجہ محسوس ہوتی ہے ان کے سرے ہمیں کہیں اور تلاش کرنا ہوں گے۔ غالب کی حیات و شخصیت اور اُن کے مزاج و مذاق کا ایک سرسری جائزہ اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ فارسی زبان کا قدر زیادہ رکھتے تھے۔ غالب نے نہ صرف جگہ جگہ اپنی فارسی دانی پر فخر و مباہات سے کام لیا ہے بلکہ ہندوستانی فارسی نویسوں کی تحقیر و توہین کا بھی ارتکاب کیا ہے۔ اس سلسلے میں خطوط غالب سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ مولوی عبدالغفور خاں نساخ کے نام اپنے ایک مکتوب میں غالب نے لکھا ہے:

"...... نظم و نثر فارسی کا عاشق و مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں......" [۲]

۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غالب نے چودھری عبدالغفور سرور کو تحریر کیا ہے:

"...... فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں اور یہ بھی یاد رہے کہ فارسی کی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کے پرداز میں میرا قول اکثر خلاف جمہور پائیے گا اور حق بہ جانب میرے ہوگا......" [۳]

مرزا رحیم بیگ مصنف ساطع برہان کے نام اپنے طویل ترین اور تاریخی اردو خط میں غالب نے ہندوستانی فارسی فرہنگ نویسوں پر نظر حقارت ڈال کر اپنی فارسی دانی کا دعویٰ کیا ہے۔ غالب فرماتے ہیں:

"...... یہ عقیدہ میرا ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے گزرے ہیں سب ہندی نژاد ہیں...... (آگے لکھتے ہیں)... اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد و فارسی زبان ہے...... زبان دانی فارسی میری ازلی دست گاہ اور یہ عطیۂ خاص من جانب اللہ ہے۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے۔ مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے......" [۴]

مفتی محمد عباس کے نام غالب اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں:

"...... مبداء فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح طبع میری سلیم ہے فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی سرمدی لایا ہوں......" [۵]

خطوط کے علاوہ شعری تخلیقات میں بھی غالب نے اپنے اردو کلام کے مقابلے میں اپنی فارسی شاعری کی برتری و فوقیت جتائی ہے

---

[۱] پروفیسر عبدالقوی دسنوی: مضمون "خطوط غالب" مشمولہ نذر سجاد۔ شائع کردہ سیفیہ کالج، بھوپال ۱۹۷۴ء۔ ص ۳۳۔ [۲] غالب، مرزا اسداللہ خاں: اردوئے معلیٰ۔ شائع کردہ رام نرائن لال الہ آباد، مطبوعہ نیشنل پریس الہ آباد۔ ص ۱۹۸۔ [۳] غالب، مرزا اسداللہ خاں: خطوط غالب حصہ دوم، مرتبہ غلام رسول مہر۔ کتاب منزل لاہور، بار اوّل مطبوعہ پاکستان ٹائمز پریس لاہور۔ ص ۲۰۱۔ [۴] غالب، مرزا اسداللہ خاں: عود ہندی مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حسنین۔ شائع کردہ رام نرائن لال الہ آباد۔ ۱۹۶۹ء۔ ص ص ۲۳۳ تا ۲۳۵۔ [۵] بہ حوالہ تجلیات: مولفہ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی۔ مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ ۱۳۴۴ھ ص ۱۹۵۔ مفتی محمد عباس صاحب مرحوم کے نام غالب کا محولہ بالا مکتوب۔ خطوط غالب (حصہ دوم۔ مرتبہ غلام رسول مہر۔ کتاب منزل لاہور طبع اول) اور دوسری کتابوں میں بھی نہ صرف تاریخ بلکہ تعین زمانۂ تحریر سے بھی محروم نظر آتا ہے۔ مگر راقم الحروف بعض قوی قرائن و شواہد کے پیش نظر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ غالب کا یہ خط ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا اور اس خط کی تاریخ تحریر قطعی طور پر ۴ اگست ۱۸۶۲ء کے بعد کی کوئی قریبی تاریخ ہے۔ اس خط کے زمانۂ تحریر کے تعین کی تفصیل راقم الحروف کے زیر تسوید تحقیقی مقالے میں پیش کی گئی ہے۔ (کاظم علی خاں ۵ اگست ۱۹۷۵ء)

اپنی فارسی دانی اور فارسی شاعری پر فخر کیا ہے ۔

فارسی بیں، تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ منست

فارسی سے اس غیر معمولی شغف اور اپنی فارسی دانی پر فخر کے باوجود غالب کا مکتوب نگاری کے لیے فارسی کی جگہ اردو کا سہارا لینا توجیہہ طلب مسئلہ محسوس ہوتا ہے۔ غالب کے معلوم و موجود فارسی اور اردو خطوط کا مطالعہ اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ عمر کی ایک خاصی طویل مدت تک وہ خطوط فارسی ہی میں لکھتے رہے پھر ایک خاص زمانے میں وہ مکتوب نگاری کے لیے اردو کی جانب متوجہ ہوئے اور فارسی سے اپنے غیر معمولی شغف کے باوجود مکتوب نگاری کے لیے اردو کے مقابلے میں فارسی سے گریز کرنے لگے۔ غالب کا یہ ذہنی انقلاب جن اسباب کا رہین منت ہے ان کا سراغ ہمیں غالب کے عصری ماحول اور نجی کوائف میں تلاش کرنا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی اردو مکتوب نگاری جن عوامل و محرکات کا نتیجہ ہے ان کے سرے تلاش کرنے کے لیے ہمیں غالب کے عصری حالات اور سوانح حیات کا جائزہ لینا ہوگا۔

غالب کے معلوم و موجود مطبوعہ اردو خطوط کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی اردو مکتوب نگاری کا آغاز ۱۸۴۸ء کے آس پاس ہوا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو نثر اپنے ارتقائی سفر میں حوصلہ شکن حالات اور راہ ترقی کی رکاوٹوں سے گزرتی ہوئی اس منزل مراد تک پہنچ چکی تھی جب اس کے سامنے توسیع و ترویج کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور ترقی کا ایک سازگار سنہری دور اردو نثر کا شان دار استقبال اور گرم جوشی خیر مقدم کرتا نظر آ رہا تھا۔ سیاسی تعلیمی اور سماجی زندگی ایسی کروٹیں بدل رہی تھی جن کے نتیجے میں ایسے عہد ساز اور دور آفریں حالات ظہور میں آ رہے تھے جو اردو نثر کے لیے دور رس نتائج کے حامل اور ایک شان دار مستقبل کا اشاریہ کہے جانے کے مستحق تھے۔ ۱۸۴۸ء تک جب غالب کی اردو مکتوب نگاری کی ابتدا ہوئی اردو نثر اپنے ارتقائی سفر کی بعض اہم منزلوں سے گزر کر اپنے روشن مستقبل کی جانب تیزی سے گام زن تھی۔ ۱۸۴۸ء تک اردو نثر کے اس ارتقائی سفر کی کہانی نشیب و فراز سے پُر ہے۔ تفصیلات میں اُلجھے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام تک عام طور پر اردو نثر ایک ایسا نوخیز شجر نظر آ رہی تھی جو فارسی کے قد آور اور گھنے درخت کے زیر سایہ پوری طرح پنپنے کے مواقع سے محروم رہا ہو۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قیام سے قبل اردو نثر کس مپرسی کے دور سے دوچار تھی۔ فورٹ ولیم کالج نے اسے نکھار کر ایک نیا معیار، ایک نیا اعتبار، ایک نیا وقار عطا کر کے ایک خوش گوار مستقبل سے ہم کنار کر دیا۔ فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کی ترویج و ترقی کو پہلی بار اجتماعی اور شعوری جدوجہد سے ہم کنار کر کے اُسے ایک نئی سمت و رفتار عطا کی۔ بشیر علی افسوس کی باغ و بہار اردو (۱۸۰۲ء) اسی کالج کا ثمر ہے جو اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب قرار دی جاتی ہے۔[51] مرزا علی لطف کا تذکرہ گلشن ہند (تالیف ۱۸۰۱ء) بھی فورٹ ولیم کالج کے باغ کا پھل ہے۔ جو اسے موجود معلومات کے مطابق اردو میں شعرا کا پہلا تذکرہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔[52] فورٹ ولیم کالج کلکتہ نے اردو نثر کو طباعت کے زیور سے آراستہ کیا اور اُسے خواص کے نہاں خانوں اور گوشۂ گمنامی سے نکال کر عوام کے سامنے مطبوعہ شکل میں پیش کیا اردو نثر کے اسلوب کو سلیس نگاری کی شاہ راہ پر صحیح سمت بڑھانے کی کوشش کی۔ فورٹ ولیم کالج نے اپنی پچپن سالہ زندگی میں[53] اردو نثر کے تہی دامن کو

[51] بہ حوالۂ محمد عتیق صدیقی: ہندستانی اخبار نویسی۔ کمپنی کے عہد میں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۵۷ء۔ ص ۴۷۔ [52] بہ حوالۂ خلیق انجم: غالب اور شاہان تیموریہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی دسمبر ۱۹۷۴ء۔ ص ۱۱۷۔ [53] بہ حوالۂ محمد عتیق صدیقی: گلکرسٹ اور اُس کا عہد۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۶۰ء۔ ص ۱۸۔

درجنوں کتابوں سے مالا مال کر دیا۔ مگر فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے تحت اردو نثر زیادہ تر داستانوں اور قصوں تک محدود رہی۔

اردو نثر کو داستانوں کے تخیلی اور طلسمی رنگ محل سے نکال کر علوم و فنون کی حقیقی فضا سے روشناس کرانے میں دہلی کالج نے جو گراں قدر کارنامہ سر انجام دیا وہ اردو نثر کی تاریخ کا درخشاں باب قرار دیا جائے گا۔ دہلی کالج کا قیام ۱۸۲۵ء میں عمل میں آیا۔[1] دہلی کالج کے قیام (۱۸۲۵ء) سے قبل اردو نثر یا تو داستانوں کی طلسمی دنیا میں یا فارسی کے شکنجے میں اس حد تک مقید تھی کہ عام کاروبار یا اخبار کے لیے اُس پر انحصار کرنا مشکل تھا چنانچہ ۱۸۲۲ء میں اردو کا پہلا اخبار جامِ جہاں نما فارسی کی سرپرستی کے ہاتھوں جامِ جہاں نما فارسی میں مدغم کر دیا گیا۔[2] مگر ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج کے قیام کے بعد اردو نثر رفتہ رفتہ اس قابل ہوتی گئی کہ آسان زبان میں کاروبار اور اخبار کا وسیلہ بن سکی۔ دہلی کالج کے بارے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کا خیال ہے:

"...... دہلی کالج ...... بہت تھوڑے عرصے میں ایک علمی اور تعلیمی ادارے سے زیادہ ایک تہذیبی اور ثقافتی مرکز بن گیا...... دہلی کالج کا سب سے اہم تہذیبی اور ثقافتی کارنامہ (یہ) ہے کہ اس نے اردو زبان کی ترقی میں نمایاں حصّہ لیا...... اس کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی اور اسی میں اِس کی کامیابی کا راز تھا کہ ذریعۂ تعلیم اردو تھا؛ عربی، فارسی، سنسکرت کی تعلیم تو...... اردو میں ہوتی ہی تھی، لیکن دوسرے علوم جو داخلِ نصاب تھے اُن کی تعلیم کا ذریعہ بھی اردو تھا۔ سائنس کی تعلیم تک اردو میں ہوتی تھی...... ادب کی طرف بھی اِس کالج نے خاص توجہ دی۔ مختلف موضوعات پر کتابوں کے ترجمے بھی یہاں خاصی تعداد میں ہوئے۔ یہاں مشاعرے بھی ہوتے تھے، ادبی محفلیں بھی ہوتی تھیں، تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری تھا اور اِن سب باتوں نے مل کر اِس کالج کو ثقافتی مرکز کی حیثیت دے دی تھی۔"[3]

دہلی کالج کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی رقمطراز ہیں:

"انیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کو جغرافیائی اعتبار سے ملک کہہ لیجیے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُس کی تاب و توانائی ختم ہو رہی تھی...... ہندوستانی ذہن کے آگے نہ کوئی منزل تھی نہ کوئی محمل۔ گرد و پیش کے اندھیرے سے بچ کر اُس نے اپنی ساری توجہ خارج کے بجائے باطن پر مرکوز کر دی تھی اور وہ بہت سی پرانی اور فرسودہ اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ قدیم و جدید کی اس آویزش میں دلّی کالج ایک ستارہ ہے جو اِس شامِ غم میں بھی صبحِ نو کی خبر دیتا رہا۔ اُس نے ہمیں رواجی تصورات سے نجات دلا کر ایک نئی آب و ہوا پیدا کی جس میں ماضی کا تنقیدی شعور، حال کا نیا احساس اور مستقبل کی پذیرائی ممکن تھی...... حقیقت یہ ہے کہ دہلی کی تاریخِ تعلیم، تاریخِ معاشرت اور تاریخِ ادب میں جہاں کہیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے پہلے کسی صحیح حرکت کی رو دکھائی دیتی ہے، اُس کا سلسلہ دہلی کالج ہی سے ملتا ہے۔"[4]

اپنے قیام کے بعد ۱۸۴۸ء تک دہلی کالج کئی بار نشیب و فراز سے دوچار ہوا۔ ۲ر مارچ ۱۸۳۵ء کی لارڈ میکالے کی تاریخی یادداشت، لارڈ ولیم بینٹنگ کی ۷ر مارچ ۱۸۳۵ء کی قرارداد، گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ کی ۱۸۳۹ء کی نئی وضاحتی قرارداد ـــ نشیب و فراز کی وہ منزلیں ہیں جن سے دہلی کالج گزرتا رہا۔[5] مشرقی علوم کے حامیوں (ORIENTALISTS) اور اُن کے مخالفین میں رسہ کشی ہوتی رہی۔ فارسی پر رفتہ رفتہ انگریزی زبان کی فوقیت اور برتری

---

[1] بہ حوالۂ مالک رام: قدیم دلّی کالج۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔ فروری ۱۹۷۵ء۔ ص ۲۴۔ [2] بہ حوالۂ محمد عتیق صدیقی: ہندستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں۔ ص ۱۶۱ ۔ [3] ڈاکٹر عبادت بریلوی: غالب اور مطالعۂ غالب۔ مکتبۂ پبلشنگ ہاؤس دلّی۔ جون ۱۹۷۰ء (ڈی لکس اڈیشن) ص ص ۱۵۳/۱۵۴ ۔ [4] ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی: ذوق و جستجو۔ ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ۔ فروری ۱۹۶۷ء ص ص ۲۶۱/۲۶۳ ۔ [5] بہ حوالۂ مالک رام: قدیم دلّی کالج۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، دہلی فروری ۱۹۷۵۔ ص ص ۳۳ لغایت ۴۱

کا سکہ جمتا رہا۔ فارسی اور انگریزی کی اس کشمکش میں انگریزی کے ساتھ اردو کو بھی فائدے ہوئے۔ سرکاری دفتروں اور عدالتوں سے فارسی کا اخراج کس تاریخ کو یا کس سال ہوا اس بات کا تعین کرنا خاصا دشوار گزار کام ہے۔ اس سلسلے میں مختلف و متضاد بیانات ملتے ہیں۔ حامد حسن قادری کے مطابق ۱۸۳۲ء سے اردو کو فارسی کی جگہ سرکاری زبان قرار دیا گیا۔[51] رام بابو سکسینہ کا بیان ہے: "۱۸۳۲ء میں عدالتوں میں فارسی کی جگہ پر ہندستانی زبانوں کو رائج کر دیا گیا۔[52]" مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: "۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال بعد کل دفتروں میں اردو زبان ہو گئی۔ ......غرض اپنی آسانی کے وصف سے اور اس لحاظ سے کہ ملکی زبان یہی ہے دفتری زبان بھی یہی ٹھہری۔ اردو نے آہستہ آہستہ فارسی کو پیچھے ہٹانا اور اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔[53]" احسن مارہروی تحریر فرماتے ہیں: "...... ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء اردو ملکی اور دیسی زبان تسلیم ہو کر فارسی کی جگہ سرکاری دفاتر میں تھوڑی بہت لکھی جانے لگی۔[54]" ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں:

"IN 1835 A.D. THE COURTS ABOLISHED PERSIAN AND OPENED A HIGHROAD OF PROGRESS FOR VERNACULARS." [55]

یعنی ۱۸۳۵ء میں عدالتوں نے فارسی کا خاتمہ کر دیا اور دیسی زبانوں کے لیے ترقی کی شاہ راہ کھول دی۔ طفیل احمد منگلوری کے بقول ۱۸۳۷ء میں مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں کو فارسی کی جگہ اپنے اپنے صوبے کی زبان جاری کرنے کی اجازت دے دی۔[56] لیکن ڈاکٹر خلیق انجم کے مطابق سرکاری امور کے لیے فارسی کا استعمال اس کے بعد بھی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸۴۴ء میں سرکاری اور انتظامی امور کے لیے دیسی زبانوں نے فارسی کی جگہ پوری طرح حاصل کر لی۔[57] ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے محولہ بالا قول کے برخلاف ایک جگہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ ۱۸۲۹ء میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ فارسی کی جگہ انگریزی کو دفتری زبان قرار دیا جائے اور عدالتوں میں اسی کو رائج کیا جائے لیکن اس پر جلد عمل نہ ہو سکا تا آنکہ ۱۸۴۴ء میں فارسی اس حیثیت سے محروم کر دی گئی۔[58] ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے اس سلسلے میں غالباً متضاد بیانات کے باعث ہی کوئی سنہ نہ دے کر محض اسی بیان پر اکتفا کی ہے: "اردو نثر کا احاطہ وسیع ہونے لگا۔ قرآن مجید، انجیل کے ترجمے، تفاسیر، عدالتی کارروائیوں کی خاص عبارت بھی اس کے دائرے میں آ گئیں۔[59]" سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو کے رواج اور فارسی کے اخراج کے سلسلے میں ان مختلف و متضاد بیانات کی روشنی میں کسی قطعی تاریخ یا کسی مخصوص سال کا تعین کرنا آسان نہیں۔ ڈاکٹر حکم چند نیّر اس مسئلے کے تمام اہم پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں: "بنگال اور شمال مغربی صوبے کی سرکاری عدالتوں اور دفتروں سے فارسی کے اخراج کے سلسلے میں کسی مخصوص تاریخ یا سال کا تعین کرنا دشوار بلکہ ناممکن کام ہے۔ دستیاب مواد کے

---

[51] حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو۔ لکشمی نرائن اگروال پبلشرز آگرہ ۱۹۶۶ء۔ ص ۲۴۷۔ [52] رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو (انگریزی) ص ۲۶۸ بحوالہ ڈاکٹر حکم چند نیّر بمضمون "عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے فارسی کا اخراج" مطبوعہ نیا دور لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۷۲ء فٹ نوٹ نمبر ۲ (ب) ص ۱۶۔ [53] آزاد، مولانا محمد حسین: آب حیات۔ رام نرائن لال پبلشرز، الہ آباد ۱۹۶۲ء۔ ص ۲۶۔ [54] احسن مارہروی: تاریخ نثر اردو۔ ص ۲۶۔ بحوالہ ڈاکٹر حکم چند نیّر مضمون محولہ بالا مطبوعہ نیا دور، لکھنؤ دسمبر ۱۹۷۲ء۔ ص ۱۶۔ [55] ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ عبداللہ انگریزی کتاب "اردو پروز اِن دی اِن فلوئنس آف سر سید احمد خاں"۔ لاہور، طبع اول مارچ ۱۹۴۰ء۔ ص ۵۔ [56] طفیل احمد منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ کتب خانہ عزیزیہ دہلی ۱۹۴۵ء۔ ص ۱۵۱۔ [57] ڈاکٹر خلیق انجم: غالب اور شاہان تیموریہ۔ دہلی ۱۹۷۴ء۔ ص ۱۲۴۔ [58] ڈاکٹر سید عبداللہ: ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ۔ ص ۱۹۲ بحوالہ نیا دور، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۷۲ء۔ ص ۱۶۔ [59] سید اعجاز حسین: نئے ادبی رجحانات۔ الہ آباد ۱۹۴۲ء۔ ص ۲۶۴۔

مطالعے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ نہ تو کسی فردِ واحد نے کیا تھا اور نہ کسی ایک ہی نشست میں ہوا تھا، بلکہ متعدد حکام اور اہم سرکاری اداروں کی ایک دہے (مابین ۱۸۴۰ - ۱۸۳۰ء) کی باہم گفت و شنید، صلاح و مشورت اور خط و کتابت کو بنیاد بنا کر یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔" ۵۱

متضاد اور مختلف بیانات میں اُلجھنے کے بجائے یہ بہر حال یہ بات تو قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ غالب کی اردو مکتوب نگاری کی ابتدا سے قبل اردو سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں فارسی کی جگہ رائج ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ ۱۸۳۵ء سے اخبارات کو آزادی بھی مل گئی۔ ۵۲ ۱۸۳۷ء میں ہندستان میں پہلا لیتھو پریس بھی قائم ہو گیا۔ ۵۳ جس کی وجہ سے اردو کتابوں کی اشاعت میں اضافہ ہوا۔ ۱۸۴۳ء میں دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ۵۴ کچھ عرصے بعد یہ سوسائٹی دہلی کالج سے متعلق ہو گئی۔ سوسائٹی کے تحت مغربی علوم و فنون کی کتابوں کے اردو ترجموں کی ایک خاصی بڑی تعداد نے اردو نثر کو مالا مال کر دیا۔ دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے زیرِ انتظام ادب، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، قانون، سائنس، طب، منطق اور دیگر موضوعات پر درجنوں کتابیں اردو میں ترجمہ ہو کر اس وقت تک شائع ہو چکی تھیں۔ جب ۱۸۴۸ء کے آس پاس غالب کی اردو مکتوب نگاری کی ابتدا ہوئی۔ ۵۵ یہ تمام کتابیں چوں کہ دہلی میں شائع ہوئی تھیں، لہذا دہلی کے علمی اور ادبی حلقوں کا ان سے مستفید و باخبر ہونا بعید از قیاس نہیں۔ ان اردو کتابوں نے بھی دہلی میں ۱۸۴۸ء تک اردو نثر کی ترویج و اشاعت اور مقبولیت میں قابلِ لحاظ اضافہ کیا۔ اردو نثر کے لیے ان سازگار حالات میں ۱۸۴۸ء کے آس پاس غالب کا مکتوب نگاری کے لیے اردو کی جانب متوجہ ہونا کوئی غیر فطری امر نہیں محسوس ہوتا۔ دہلی کی علمی، ثقافتی اور ادبی فضا میں ان تمام تبدیلیوں کے اثرات سے غالب کا محفوظ رہنا ممکن نہ تھا۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"اس تبدیلی کا اثر دور تک پہنچ گیا تھا۔ غالب کے یہاں جو مغرب کی خیر و برکت کا احساس اور انگریزوں کے علم و آئین کی تعریف ملتی ہے وہ بھی دراصل ...... کلکتے سے زیادہ دہلی کی فضا کی پروردہ ہے ...... دہلی میں جو تبدیلیاں دبے پاؤں آ رہی تھیں اور جو اخبارات رسائل شائع ہو رہے تھے، اُن کا چرچا (دہلی) کالج کی حدود سے نکل کر علم دوست گھرانوں تک پہنچ گیا تھا ...... غالب نے البتہ دہلی کالج کی ملازمت قبول نہیں کی ...... لیکن اُن کا انتخابی ذہن 'قدیم علوم کی نارسائیوں سے واقف ہو چلا تھا۔ کالج کے حلقے سے اُن کے اچھے مراسم تھے اور وہ انگریزوں کی داد و دہش کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ غالب کے یہاں جو چیز ایک "مبہم احساس" کی صورت میں تھی، وہ سرسید کے یہاں ایک واضح اصلاحی پروگرام بن گئی"۔ ۵۶

۱۸۴۸ء کے آس پاس جب غالب نے مکتوب نگاری کے لیے اردو کی جانب توجہ کی، تو اردو نثر کے لیے نہایت حوصلہ افزا حالات ظہور میں آ چکے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ، دہلی کالج اور دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے زیرِ انتظام اردو کی درجنوں کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ فارسی کی جگہ اردو کو انگریزی حکومت سرکاری زبان مان چکی تھی۔ اخبارات کو آزادی مل چکی تھی۔ ہندستان میں لیتھو پریس کا قیام بھی عمل میں آ چکا تھا۔

---

۵۱ ڈاکٹر حکم چند نیّر: مضمون "عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے فارسی کا اخراج"۔ مطبوعہ نیا دور، لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۷۲ء ص ص ۱۶/۱۷۔ ۵۲ بہ حوالہ آزاد، مولانا محمد حسین: آبِ حیات۔ ص ۲۶۔ نیز مولانا حامد حسن قادری: داستانِ تاریخ اردو۔ ص ۲۴۷۔ ۵۳ بہ حوالہ ڈاکٹر خلیق انجم: غالب اور شاہانِ تیموریہ۔ ص ۱۴۴۔ ۵۴ بہ حوالہ مالک رام: قدیم دلی کالج۔ ص ۴۳۔ ۵۵ دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے تحت شائع ہونے والی جن ۱۳۱ اردو کتابوں کی فہرست مالک رام نے پیش کی ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۸ء تک مختلف علوم و فنون پر اردو کتابوں کی خاصی بڑی تعداد دہلی میں منصۂ شہود پر آ چکی تھی۔ ملاحظہ ہو قدیم دلی کالج ضمیمہ ص ص ۹۴ تا ۱۰۷۔ (کاظم علی خاں)۔ ۵۶ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی: ذوقِ جستجو۔ ص ص ۲۶۳/۲۶۲۔

ان تمام سازگار حالات نے اردو نثر کی دنیا بدل دی۔ اردو کے لیے ان بدلتے ہوئے حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد سر سید احمد خاں نے عینی شاہد کی حیثیت سے لکھا ہے

"بڑے بڑے کالج جو شہروں میں مقرر تھے اوّل اوّل ان ..... میں ..... ہر قسم کے علوم فارسی اور عربی اور سنسکرت اور انگریزی میں پڑھائے جاتے تھے ..... مگر آخر کو یہ بات نہ رہی۔ قدر عربی کی بہت کم ہو گئی اور ..... فارسی بھی چنداں قابل لحاظ نہ رہی۔ تعلیم کی صورت اور کتابوں کے رواج نے بالکلیہ تغیر پکڑا۔ اردو اور انگریزی کا رواج بہت ہوا ....." [۱]

اردو اس زمانے میں تیزی کے ساتھ جن تبدیلیوں سے گزر رہی تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی عینی شاہد کی حیثیت سے انھیں محسوس کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"اردو اس قدر جلد جلد رنگ بدل رہی ہے کہ ایک مصنف اگر خود اپنی ایک سنہ کی تصنیف کو دوسرے سنہ کی تصنیف سے مقابلہ کرے تو زبان میں فرق پائے گا۔" [۲]

فکری، تعلیمی، ادبی، صحافتی، صنعتی اور سیاسی میدانوں میں زندگی اس زمانے میں جو نئی کروٹیں بدل رہی تھی ان کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے سید احتشام حسین مرحوم رقم طراز ہیں:

"....... ادب کو جس حد تک بھی داخلی کیفیات اور تجربات کا نتیجہ قرار دیا جائے یہ حقیقت نمایاں رہتی ہے کہ وہ خارجی اثرات اور محرکات سے بھی اپنا دامن نہیں بچا سکتا ..... ساری دنیا میں ادبی ارتقا کا دامن بھی مختلف علاقوں کی صنعتی اور سائنسی ترقی سے بندھا ہوتا ہے۔ نئے حالات نے پریس قائم کرنے اخبارات اور رسائل شائع کرنے اور کتابوں کی خرید و فروخت کو ایک تجارتی شکل دینے کی طرف متوجہ کیا۔ اس طرح ادیبوں اور ان کے پڑھنے والوں کے درمیان وہ رشتہ قائم ہوا جس کا تصور اس سے پہلے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب تک شعر و ادب کی سرپرستی کرنے والے بادشاہ اور اُن کے امراء تھے، کتابوں کی خریدار مخصوص طبقوں تک محدود تھی، تصانیف کی نقل اور فراہمی کا مسئلہ بھی پیچیدہ تھا لیکن جب کتابیں آسانی سے چھپنے اور بازار میں فروخت ہونے لگیں تو عام پڑھنے والے ادیبوں اور شاعروں کے سرپرست بن گئے۔ یہ ایک طویل بحث ہے کہ ان باتوں کا ادبی ذوق پر کیا اثر پڑا اور صنعتی دور نے ادبی ارتقا کی رفتار کو کس طرح دوسری طرف موڑ دیا۔ یہاں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ .... اب یہ صورت ہو گئی کہ جس کے پاس تھوڑا بہت ادبی ذوق ہو اور کچھ پیسے وہ بڑی آسانی سے اپنی پیاس بجھا سکتا تھا۔ ایسی حالت میں یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ ..... لکھنے والوں کو اس بات کا خیال رکھنا ضروری تھا کہ وہ کیوں اور کس کے لیے لکھ رہے ہیں ...... اس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ مروجہ اصناف کے علاوہ نئے اصناف پیدا ہوں ...... (ان حالات میں) ...... اصناف شاعری اور روح شاعری میں زیادہ تبدیلی کا امکان نہ تھا، لیکن نثر کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ چناں چہ دور جدید میں نثر نے جس حد تک خارجی حالات کا اثر قبول کیا، نظم میں اُن کی کھپت اس حد تک نہ ہو سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دور جدید کے آغاز سے پہلے ہی شاعری نے عروج کی کئی منزلیں طے کر لی تھیں اور مختلف اصناف کے اعلیٰ نمونے پیش کر دیے تھے لیکن نثر اُس کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ گئی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا جذباتی زندگی کے باہر وہ خارجی اور مادّی حالات میں تبدیلیوں کا انتظار کر رہی تھی اور جیسے ہی یہ حالات بدلے نثر نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔" [۳]

ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی اردو کے لیے ان حوصلہ افزا حالات کے نتائج کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"......... ۱۸۴۴ء میں اردو نثر کو وہ مقام حاصل ہو گیا جو

---

[۱] سید احمد خاں: اسباب بغاوت ہند۔ مرتبہ فوق کریمی۔ یونی ورسٹی پبلشرز مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔ ۱۹۵۸ء۔ ص ص ۴۷/۴۸۔ [۲] آزاد، مولانا محمد حسین: آبِ حیات۔ ص ۲۷۔ [۳] پروفیسر سید احتشام حسین: عکس اور آئینے۔ ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ص ۷۳ تا ۷۶۔

صدیوں سے فارسی کی قسمت میں تھا۔ ۱۸۴۴ء اردو نثر کی تاریخ میں اہم ترین سال ہے ...... ۱۸۴۴ء میں جب فارسی کا استعمال قطعی بند ہو گیا اور صرف انگریزی اور دیسی زبانیں (شمالی ہند میں اردو) باقی رہ گئیں تو مجبوراً اردو کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ اردو کے عدالتی اور سرکاری زبان ہونے سے کیا اثر پڑا، اس کا اندازہ ان حقائق سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۰۱ء سے ۱۸۴۴ء تک اردو میں صرف پانچ اخباروں کا اجرا ہوا اور تقریباً اکیس چھاپے خانے وجود میں آئے۔ جب کہ صرف ۱۸۴۵ء میں پانچ اخبار جاری ہوئے اور گیارہ چھاپے خانے وجود میں آئے۔ ۱۸۴۸ء میں یہ تعداد بہت بڑھ گئی۔ اس سال سولہ اخباروں کا اجرا ہوا۔ ۔ ۔ ۱۸۴۴ء سے قبل صرف دو تذکرے اردو زبان میں لکھے گئے، باقی سب فارسی میں تھے۔ جب کہ ۱۸۴۴ء اور اس کے بعد فارسی میں لکھے جانے والے تذکروں کی تعداد تین چار سے زیادہ نہیں۔ باقی سب اردو میں لکھے گئے۔" [1]

اِن حالات کے زیرِ اثر غالب کا ۱۸۴۸ء کے آس پاس مکتوب نگاری کے لیے فارسی سے اپنے غیر معمولی شغف کے باوجود، اردو کی جانب متوجہ ہونا کوئی ایسی انہونی بات نہیں رہ جاتی۔ عجیب نہیں کہ غالب کی اردو مکتوب نگاری میں دوسرے اسباب کے دوش بدوش ان حالات و محرکات کی بھی کارفرمائی شامل رہی ہو۔ اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو غالب کی اردو مکتوب نگاری کا سبب قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی لکھتے ہیں:

"غالب کی اردو خطوط نویسی کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں اردو کی قدر میں ...... اضافہ ہو رہا تھا اور اردو سرکاری زبان کے طور پر بیش تر جگہوں پر تسلیم کی جا چکی تھی۔" [2]

غلام رسول مہر کا بھی یہی خیال ہے:

"...... جب تک اردو کا رواج کم تھا میرزا زیادہ تر فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے پھر جیسے جیسے اردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا تداول کم ہوتا گیا انھوں نے بھی اردو کو ذریعہ مخابرت بنا لیا۔" [3]

انجم عرفانی نے بھی غالب کی اردو مکتوب نگاری کو اردو کی "خاطر خواہ ترقی" کا مرہونِ منت محسوس کیا ہے۔ [4]

پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے مختلف صاحبانِ قلم کی نگارشات کی بنیاد پر غالب کی اردو مکتوب نگاری کے اسباب کا اختصار سے جائزہ لے کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "اردو کی مقبولیت" بھی غالب کی اردو خطوط نویسی کا ایک اہم سبب ہے۔ [5]

[مقالے کی پہلی قسط پریس کو جا چکی تھی کہ روزنامہ قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء (ص ۱) میں غالب کے بعض غیر مطبوعہ نایاب خطوط کی دستیابی کی خبر شائع ہوئی۔ غالب کے نو دریافت خطوط کی تعداد ۲۱ بتائی گئی ہے جن میں سے ۱۸۴۶ء کے سات خط اردو میں ہیں اور غیر مطبوعہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ غیر مطبوعہ خطوط مقالے کی تسوید کے وقت راقم الحروف کے پیشِ نظر نہیں رہے ہیں۔ نئے خطوط کی دریافت سے روشن امکانات کی جانب مقالے کی پیشِ نظر قسط اوّل میں اشارہ بھی کیا گیا ہے اور نئے خطوط کی دریافت سے راقم الحروف کی پیشین گوئی درست ثابت ہوتی ہے۔ کاظم علی خاں مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۵ء]

(باقی آئندہ)

★

[1] ڈاکٹر خلیق انجم: غالب اور شاہانِ تیموریہ۔ ص ص ۱۲۵/۱۲۴۔ [2] اشفاق احمد اعظمی: مضمون "غالب کے اردو خطوط" مشمولہ افکارِ نو۔ خاص نمبر ۶۹-۱۹۶۸ء۔ مرتبہ افتخار اللہ خاں۔ شائع کردہ شعبۂ اردو، گورکھ پور یونی ورسٹی گورکھ پور۔ ص ص ۶۰/۵۹۔ [3] مہر، مولانا غلام رسول: خطوطِ غالب (کامل) مطبوعہ ۱۹۶۲ء (مقدمہ) ص ۲۲۔ بہ حوالہ اشفاق احمد اعظمی۔ افکارِ نو۔ ص ۶۰۔ [4] انجم عرفانی: مضمون "اردو نثر پر خطوطِ غالب کے اثرات"۔ مشمولہ افکارِ نو (محولہ بالا) ص ص ۸۷/۸۶۔ [5] پروفیسر عبدالقوی دسنوی: مضمون "خطوطِ غالب" مشمولہ نذرِ سجاد۔ شائع کردہ سیفیہ کالج، بھوپال ۱۹۷۴ء۔ ص ۳۳۶۔

نصر قریشی

دیپاولی

عظیم قدروں کا نور لے کر، چراغ مہر و وفا جلائے
جبینِ تابندہ پہ شعاعیں، رخِ حسیں پہ چمکتے تارے
حسین و پرنور چاند کے رتھ میں بیٹھ کر آگئی ہے دولھن
ہر ایک ذرّہ چمک اٹھا ہے، خزاں زدہ پھول مسکرائے

اندھیری راہوں، سیاہ چہروں کو روشنی کی کرن ملی ہے
شکست ظلمت کی ہو رہی ہے، اندھیرا کرنوں سے ٹوٹ جائے
سلگتی دھرتی پہ پیار شبنم کا رنگ بن کر برس رہا ہے
خلوص کی چاندنی سے برگ تپاں بھی ہر لمحہ جگمگائے
فسردہ ذہنوں کی تیرگی میں ستارے ہر سو چمک اٹھے ہیں
جلوسِ انوار، ظلمتوں کا جنازہ لے کر قدم بڑھائے
دلوں کے تاریک گوشوں میں بھی چراغ امید جل اٹھے ہیں
شکست خوردہ، جگر فگاروں کی زندگی سے اندھیرا جائے
ردائے نورانی بام و در پہ سحاب صورت اڑے ہے ہر سو
کدورتوں اور عداوتوں کا مہیب آسیب بھاگ جائے
سیاہ جور و جفا کا پرچم بھی سرنگوں ہے شکست کھا کر
خوشی کے بجتے ہیں شادیانے، اجالا فاتح کی صورت آئے

یہ رات، دیپوں کی مالا لے کر، زمیں کی آرتی اتارے
یہ رات، گیتوں کا تھال لے کر، حسین فردا کے گیت گائے
یہ رات ہے زندگی کا پرتو، یہ رات ہے روشنی کا پیکر
یہ رات، ہر سال ایک بار آئے، مگر ہمیشہ ہمیں جگائے
یہ رات، قدروں کا نور، مہر و وفا کا پیکر بنی رہے گی،
یہ رات ہے اسمِ بامسمیٰ، چراغ فکر و نظر جلائے
یہ رات، دیپاولی کا پاکیزہ نام پانے کی مستحق ہے
شکست خوردوں کی زندگی کو عمل کا پیغام دیتی جائے

یہ رات، ہر پل عظیم تر ہے
یہ رات، پیچ کی طرح امر ہے

نرینیدر سکسینہ

امیر خسرو کی ایک اسُتت (स्तुति)

[امیر خسرو سے منسوب یہ استُت (در توصیف کرشن جی) ہمیں جناب نرینیدر سکسینہ صاحب ایڈوکیٹ قائم گنج ضلع فرخ آباد نے عنایت کی ہے، اس کی سند کے بارے میں مضمون نگار کا فٹ نوٹ ملاحظہ ہو۔ خسرویات کے سلسلے میں یہ ایک یا گوشہ ہے جو ماہرین خسرویات اور خسرو پر کام کرنے والوں کو دعوت تحقیق دیتا ہے۔ (ایڈیٹر)]

صورت چھبیلی من بسی سندر سلونی سانوری
نوجن بشال اور بن کی مال اور بھال ات سر بھری
ماتھے مکٹ کاندھے لکٹ بجنائے تٹ مکھ بانسری

نو کھنڈ ساتوں دیپ میں بھرمت بھرا لے جنم
کھوجا ادوسے است لوں ہر جگٹ میں کرادم کرم
ترچھے کنور بانکے پیک دیکھے سہس دس کم سے کم

اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتان آذری
ہر چند وصفت می کنم در حسن تو زیبا تری

آفاق ہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوبان دیدہ ام اماں تو چیزے دیگری

ہونٹوں پہ لالی ات ادھک کیسر کا ماتھے پر تلک
کانوں میں کنڈل کی دمک ہنسنے میں دانتوں کی چمک
صورت سلونی سانوری بکھرے کپولن پر الک

چنچل چپل بھرکٹی کٹیل کیونکر نہ جی کو بھائے تو
چنچل چتر پتلی کمر کیونکر نہ من بس جائے تو
انجر گئے گھیرے رہے گاری سبے ددھ کھائے تو

تا نقش می بندد فلک کس را نہ دیدہ ایں نمک
حور نہ دانم یا ملک فرزند آدم یا پری

عالم ہمہ یغمائے تو خلق جہاں شیدائے تو
ایں نرگس رعنائے تو آموخت رسم دلبری

بالک بنی دیکھے اور ترن ادھل برن چنچل چتر
موہن منوہر من ہرن من موہ متوالے کنور
دیکھے انوکھے ہر اشر دھر دھر کرت سر دھیان پر

صورت وہ تیری دھیان میں ہو جس کے من میں گدگدی
جس دم سے گھٹ گھٹ میں بسی ہرنے میں تیری کھڈی
رہتا ہے نس دن حیت چڑھی ہوتی نہیں پل چین جُدی

ہرگز نہ آید در نظر صورت زرہ دیت خوب تر
شمسی نہ دانم یا قمر یا زہرۂ یا مشتری

من تو شدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی
تاکس نگوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

میٹھے بچن ڈھیلے چلن کومل چرن بن بن پھرے
ناک میں لٹکن ہیں نگ نگنگ سے چھل برج استری
باتوں پہ چھل بھوؤں میں بل جتون چپل چھب نٹوری

ہے کرشن ہے جیو داندن ہے نند نندت اب کر دیا
جب لول ہے یہ دم میں دم تیر نوں سے اپنے مت ہٹا
ہوں ایک تو برسانے میں بے صبر اور میں دوسرا

نوازپری چابک تری از برگ گل نازک تری
وز ہر چہ گویم برتری حقا عجائب دلبری

خسروؔ غریب از تو گدا افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہر وفا سوئے غریباں بنگری

لہ یہ استُت میرے والد جو ایک فارسی داں بزرگ تھے سنایا کرتے تھے۔ اس کی امیر خسرو کی ہونے کی سند صرف یہی ہے کہ آخری بند میں تخلص کی جگہ خسرو درج ہے اگر کوئی دوسرا لکھتا تو اپنا تخلص نظم کرتا۔ نرینیدر سکسینہ

★

عطیہ پروین

(افسانہ)

وہ شاخ ہی نہ رہی

صبح اٹھتے کے ساتھ انوار بھائی کی ہوائیاں اُڑتی صورت دیکھی تو دل دھک سے ہو گیا۔

"خدا خیر کرے!" میں نے کہا۔ "انوار بھائی ابھی تو آٹھ بجے ہیں آپ کے منھ پہ یہ بارہ کیسے بج رہے ہیں؟"

انوار بھائی کرسی پہ بیٹھے نہیں گویا گر سے پڑے اور ایک زبردست ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولے:

"حیدر میاں تمھاری بھابی نے ساتویں لڑکی کو جنم دی ہے۔"

"خدا مبارک کرے!" میں نے ان کو جلانے کے لیے بے تحاشہ خوش ہو کر کہا۔

وہ قریب قریب رو کر بولے:

"اماں پُرسہ دو پُرسہ۔ مبارکباد کیسی ..... معاذ اللہ یہ ساتویں قرقی ......" وہ سر تھام کر بیٹھ گئے۔

میرا جی چاہا خوب قہقہے لگاؤں، ان کو ستاؤں ان پہ فقرے چست کروں مگر ان کی حالت دیکھ کر ترس آگیا دوسری کرسی پہ ٹک کر پوچھا۔

"بھابی ٹھیک ہیں نا؟"

"کمزور بہت ہو گئی ہیں۔ رات تو گلوکوز کی کئی بوتلیں چڑھائی گئیں۔ بچی بھی بس سمجھو روئی کے گالوں پہ اٹھائی جا رہی ہے ...... اُف میرے اللہ......" اور اب مجھے بڑے خلوص کے ساتھ ان پہ غصہ آنے لگا۔

ہمارے یہ انوار بھائی یوں تو بڑے عقلمند، روشن خیال اور تعلیم یافتہ انسان ہیں لیکن کنبہ بڑھانے کے معاملے میں قطعی پرانے خیال رکھتے ہیں۔ پہلی لڑکی، دوسری لڑکی، تیسری لڑکی اور جب چوتھی کی آمد آمد ہوئی تو میں نے ان کو مشورہ دیا۔

"خدا کے لیے انوار بھائی اب فیملی پلاننگ سنٹر پہ جائیے۔ اپنی آمدنی کا خیال نہ کیجیے تو کم از کم بھابی پہ ہی رحم کیجیے!"

انوار بھائی زور سے ہنسے اور بولے:

"اولاد خدا کی دین ہوتی ہے، میاں اس دین کو روکنا کفر ہے اور بھئی مجھے ہی نہیں تمھاری بھابی کو بھی بیٹے کی بڑی تمنا ہے اس بار بیٹا ہو گیا تو پھر سوچیں گے......"

"اور اگر پھر لڑکی ہوئی؟" میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"اب یہ خدا کی مرضی، ہم صابر و شاکر رہ کر پانچویں بار انتظار کریں گے۔"

"کیا؟" میں حیرت سے اچھل پڑا۔ "اور پانچویں بار بھی لڑکی ہوئی تو؟ تو کیا لڑکیوں کی فوج تیار کرنے کا ارادہ ہے؟"

انوار بھائی نے کوئی جواب نہیں دیا بس ہنستے رہے۔ میں وقتاً فوقتاً ان کو فیملی پلاننگ کے فوائد سمجھاتا رہتا لیکن وہ مثل "بھینس کے آگے بین بجاؤ ......" انوار بھائی پہ پوری اترتی رہی۔ بھابی نے پانچویں بار لڑکی پیدا کی اب ان دونوں کو چھٹویں خوش خبری کا انتظار تھا ان کو یقین تھا

اس بار لڑکا ہی ہوگا۔ سال بھر کے بعد ہی انوار بھائی چھٹے بچے کے باپ بن گئے...... بچّہ کے نہیں بچّی کے!!!

"اب ساتویں کا انتظار کیجیئے......"

"یار اب تو سچ مچ صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا ہے۔" انوار بھائی ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

"بس ابھی سے......" میں نے ان کو جلانے کے لیے قہقہہ لگایا۔

"مذاق نہ اڑاؤ یار...... واقعی حالت بڑی پتلی ہوتی جا رہی ہے۔" وہ رو دے رہے تھے۔

"میری صلاح مانتے تو جناب یہ نوبت کیوں آتی......؟"

"بس صرف ایک لڑکا ہو جاتا......" وہ بڑی حسرت سے بولے۔ میں بے وقوفوں کی طرح ان کا منھ تکنے لگا——!

"یعنی اب بھی!!!"

اور جب چھ ماہ بعد ہی بھابھی کے پاؤں بھاری ہونے کی خبر مجھے معلوم ہوئی تو میں غصّے کے مارے ناچ ہی گیا۔

"اسی کو کہتے ہیں پڑھا لکھا جاہل......" انوار بھائی ملے تو میں نے کہا "مبارک ہو، ساتویں خوش خبری پھر سنائی آپ نے!"

"خدا کرے اس بار لڑکا ہو جائے!" وہ سب سے چھوٹی بچی کو کندھے سے لگائے تھے۔ اس سے بڑی کی انگلی تھامے تھے اور کہیں جانے کو تیار تھے۔ گھر کے اندر سے بچوں کی آوازیں اور بھابھی کی ڈانٹیں سنائی دے رہی تھیں۔

"اللہ موت دے تم لوگوں کو، کل کی مرتی ہو آج ہی مر جاؤ مردار، ناک میں دم کر رکھا ہے۔ مار ڈالا ان جونکوں نے مجھے......"

میں نے انوار بھائی کو دیکھا وہ بے چارے جھینپ کر بولے۔

"لڑکیاں بہت تنگ کرتی ہیں بے چاری کو، ایک اکیلی کس کس کو سنبھالے۔ پھر سارے گھر کا کام الگ......"

"یہ ظلم ہے انوار بھائی سراسر ظلم...... آپ جا کہاں رہے ہیں؟"

"ذرا ڈاکٹر آشا کے یہاں جا رہا ہوں تمھاری بھابھی کو دکھانا ہے۔ ساتھ چلے چلتے یار، وہ کمبخت بہت ڈانٹتی ہے!"

"واہ رے میرے مٹی کے شیر۔" میں ہنس دیا۔ "کیوں ڈانٹتی ہے؟"

"یہی...... یہی......" اور وہ بات ٹال کر دروازے کے پردے سے جھانک کر پکارے۔ "ارے بھئی اب تو چلو آفس کا وقت آ رہا ہے!"

"یہ تمھاری نوج تو راستہ دے......" اندر سے بھابھی کڑکیں۔

اللہ اللہ کر کے وہ اندر سے نکلیں۔!

بہت دن کے بعد میں نے بھابھی کو دیکھا تھا! دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ حیرت، افسوس اور غصّے کے ملے جلے تاثرات نے مجھے گم صم سا کر دیا لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا۔!

کیا یہ وہی بھابھی ہیں؟ وہی، جو آج سات برس قبل پھولوں سے سجی کار سے پھول کی طرح مہکتی اتری تھیں اور مجھے انوار بھائی کی قسمت پر رشک پیدا ہو گیا تھا!

اوسط قد کی بھرے بھرے گداز اور بڑی حد تک سیکسی جسم رکھنے والی گورے رنگ کی خوبصورت بھابھی! جن کی آنکھوں میں زندگی کی بھرپور چمک تھی۔ سرخ لبوں پر دل نشیں مسکراہٹ تھی۔ رخساروں پر گلاب کھلے تھے اور آواز میں ایک موہ لینے والی کھنک تھی۔ سات برس کے اندر انھوں نے چھ بچے پیدا کر دیے تھے اور ساتویں کو کوکھ میں دبا کھڑی تھیں!!!

گورا رنگ جھلس کر رہ گیا تھا۔ زندگی کی چمک سے بھرپور آنکھیں حلقوں کے اندر کچھ پیلی تھیں۔ گالوں کے گلاب مرجھا چکے تھے۔ گردن کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور وہ سیکسی جسم، بے ڈول گوشت اور ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ سا بن کر رہ گیا تھا۔!

مجھ کو اپنی طرف غور سے دیکھتے پا کر وہ کچھ شرمائیں کچھ کھسیائیں۔ جوڑی کر اور تھل تھل کرتے کولھوں پر ساڑی درست کر کے

مسکرا کر بولیں:

"حیدر بھائی آپ کب آئے؟"

ان کی وہ مسکراہٹ جو کبھی دل میں گدگدی پیدا کر دیتی تھی اب بالکل بے رس تھی۔ ان کے چہرے پر بیزاری اور جھنجھلاہٹ کے نقوش ایسے ابھر چکے تھے کہ یہ بناوٹی مسکراہٹ بھی ان کو دور نہ کر سکی۔

"آداب بھابھی! کہیئے مزاج بخیر......؟" میں نے پوچھا۔

"ارے بس جی رہی ہوں...... وہ جیسے ایل سی ٹی ہیں۔ دن پر دن صحت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ حیدر بھائی میں تو بہت ہی عاجز ہوں!"

میں نے ملامت بھری نظروں سے انوار بھائی کو دیکھا اور بولا:

"آپ نے تو اپنے ہاتھوں صحت برباد کر رکھی ہے بھابھی بس اور کیا کہوں!"

بھابھی کے بے رس ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن کہہ نہ سکیں تھکے تھکے انداز میں بولیں:

"رکشہ بلائیے جلدی مجھ سے دیر تک کھڑا نہیں ہوا جاتا ہے صبح سے چکروں کے مارے بُرا حال ہے!"

"اور سب بچے؟" میں نے پوچھا۔

"پڑوس کی بڑی بی بیٹھی ہیں، پھر اور کیا کروں!" وہ کڑوے کڑوے لہجے میں بول رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا یہ وہی بھابھی ہیں جن کے بولنے میں کبھی منھ سے پھول جھڑتے تھے۔

انوار بھائی کے اصرار پر مجھے بھی ساتھ جانا پڑا۔ وہ دونوں اور دو بچیاں رکشے پر تھیں اور میں سائیکل پر۔ ڈاکٹر آشا کے صاف ستھرے کلینک کے سامنے ہم سب اتر پڑے۔ چھوٹی بچی رونے لگی تھی، انوار بھائی جھنجھلاتے ہوئے اس کو ٹہلا رہے تھے۔ دوسری بچی جو ماں کی طرح پیاری سی تھی منھ بسورے ایک طرف کو کھڑی تھی۔ اس نے کئی بار اپنی ممّی کا آنچل تھام کر آئس کریم کی فرمائش کی تھی اور ممّی نے بری طرح جھڑک دیا تھا۔ ماں کی ممتا بے شمار خانوں میں بٹ کر چوندھیا سی گئی تھی۔ میں نے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔ پاس کھڑے کوالٹی آئس کریم والے سے ایک آئس کریم دلائی اور ایک دکان سے کچھ سنترے۔ بچی کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ وہ کبھی آئس کریم چوستی کبھی سنترے دیکھتی اور کھلکھلا اٹھتی۔

"بڑی زحمت کی یار تم نے....." انوار بھائی بولے۔

"زحمت کیسی..... لاؤ بیٹی میں سنترہ چھیل دوں!" میں نے بچی کے ہاتھ سے ایک سنترہ لیا اور چھیلنے لگا۔ بھابھی کلینک کے اندر چلی گئی تھیں ذرا ہی دیر بعد ایک گداز بدن اور شگفتہ چہرے والی نرس نے دروازے سے جھانک کر پکارا:

"انوار صاحب ڈاکٹر صاحب بلا رہی ہیں۔"

"لو یار آئی مصیبت، اب وہ کمبخت نچھیے ادھیڑے گی......." پھر انھوں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "یار ذرا اس مصیبت کو سنبھال لو کمبخت تالو زبان نہیں لگا رہی ہے....."

میں نے ہنس کر کہا۔ "دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو......" اور بڑی بچی کے ہاتھوں میں سنترے کی پھانکیں تھما کر چھوٹی کو گود میں لے لیا اور کندھے سے لگا کر ٹہلانے لگا۔ خدا معلوم کیوں وہ میرے پاس آتے ہی چپ ہو گئی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور کلینک کے دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ چق کے پیچھے سے ڈاکٹر کی تیز غصیلی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں نے آپ کو وارننگ دی تھی مسٹر انوار کہ ساتواں بچہ آپ کی وائف کو بھی ساتھ لے جائے گا۔ بچہ بھی کمزور ہے اور زچہ بھی......... ایک بوند خون نہیں ہے اس کے اندر، ذرا اس کی حالت تو دیکھئے! ہے بھگوان آپ لوگ لکھ پڑھ کر جہالت کرتے ہیں۔ آج کل تو جاہل اور اَن پڑھ آدمی فیملی پلاننگ کے لیے دوڑے آتے ہیں اور آپ ساتویں بچے کے لیے بھاگ کر میرے پاس آئے ہیں۔ بھئی میں یہ کیس نہیں کر سکتی۔ زچہ کی حالت ایسی ہے کہ یہ بچہ پیدا بھی نہیں کر پائے گی......"

انوار بھائی گڑگڑانے لگے۔ قسمیں کھا رہے تھے کہ اب آٹھواں بچہ پیدا کرنے کا کبھی نام بھی نہ لیں گے چاہے لڑکا ہو نہ ہو! بس اس بار ان کی بیوی کو کسی طرح بچا لیا جائے ......!

بڑی مشکل سے ڈاکٹر راضی ہوئی۔ دواؤں اور ٹانکوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست دی اور چلتے چلتے بھی کئی کڑوی کسیلی باتیں سنا دیں ——!

انوار بھائی کا چہرہ فق تھا، ہوائیاں بھی اڑ رہی تھیں کھسیاہٹ بھی نمایاں تھا اور بھابھی بے چاری بس رو دے رہی تھیں۔ میں نے ان لوگوں کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا سوتی ہوئی بچی کو انوار بھائی کے سپرد کرکے اپنی سائیکل تھام لی۔ رکشے پر راستے بھر وہ دونوں لڑتے رہے اور میں وہ زمانہ یاد کرتا رہا جب یہ دونوں ہر وقت ایک دوسرے سے چہلیں کیا کرتے تھے، ہر وقت ایک دوسرے سے محبت کا والہانہ اظہار کرتے رہتے تھے بھابھی ایک ہفتے کے لیے بھی میکے جاتیں تو انوار بھائی کا مفارقت میں برا حال ہو جاتا۔ آٹھویں روز سسرال ضرور جا دھمکتے اور اپنی "بیوی محبوبہ" کو لے کر ہی واپس دم لیتے ——! اور اب: اب یہ عالم تھا بھابھی میکے جاتیں تو انوار بھائی سکھ کی سانس لیتے اور کوشش یہ کرتے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دن اپنے میکے میں ہی گذار دیں۔ لمبے چوڑے محبت نامے اب ہدایت نامے بن گئے تھے!

گھر پہنچ کر بھابی نے بہت زور دیا کہ

"ایک پیالی چائے ہی پی لیجیے!"

مجبوراً مجھے گھر کے اندر جانا پڑا ——!

اُف: گھر تھا یا کباڑ خانہ! کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں تھی، بستر اب تک دھوپ میں پڑے جل رہے تھے۔ مچھر دانیاں ٹیڑھی میڑھی ہو کر ہوا میں جھول رہی تھیں، میلے کپڑوں کا انبار جگہ جگہ لگا ہوا تھا —— میں حیران رہ گیا: یہ وہی گھر تھا —— خوشیوں اور سکون کا گہوارہ۔ صاف ستھرا سجا سنورا ہوا۔ بھابی جیسے خود دلھن بنی رہتیں ویسے گھر کو بھی عروس بنائے رکھتیں!

پر اب نہ وہ دلھن بنی رہتی تھیں نہ گھر سنورا رہتا تھا، کیا انقلاب آ گیا تھا ——! تلے اوپر کی بچیاں، بھڑوں کی طرح ماں سے چمٹ گئیں۔ کوئی بھوکی تھی تو کوئی دوسرے کی شکایت کر رہی تھی ایک ایڈین کے دروازے پر کھڑی فراک کو پیٹ پر گٹھر کی طرح پکڑے اونچے سروں میں بین کر رہی تھی۔ ایک دالان میں پڑے کھٹرے تخت پر سو گئی تھی ہزاروں مکھیاں اس کی ننھی سی ناک اور چہرے پر بھنبھنا رہی تھیں۔ بھابی کی بے بسی دیکھ کر مجھے ان پر ترس آ رہا تھا۔

"بھابی مجھے جلدی آفس جانا ہے ویسے ہی دیر ہو گئی ہے پھر کبھی آپ کے ہاتھ کی چائے پی لوں گا"

وہ دونوں چپ رہے اور میں موقعہ غنیمت سمجھ کر بھاگ نکلا! اور انوار بھائی ساتویں بچی کی آمد کی خبر سنا کر یوں بے دم ہو گئے جیسے ان پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔

کئی روز کے بعد ان کے گھر گیا۔

بھابی سامنے ہی پلنگ پر بیٹھی تھیں!

میرے خدا! بالکل سفید! آنکھیں اور بھی گہرے گڈھوں میں اتری ویران جیسے بجھتے ہوئے چراغ، جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ! بچی کو دیکھا تو ایسا لگا بس آخری سانسیں لے رہی ہو۔

"بھابھی"! میں نے بڑے دکھ سے کہا "کیا آپ لوگ اب بھی میرا مشورہ نہیں مانیں گے!"

بھابی ایک کھوکھلی ہنسی ہنس دیں۔

"آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے ...."

"یعنی؟"

"کچھ نہیں ...." وہ سنجیدہ ہو گئیں اور روتی ہوئی بچی کو زانو پر رکھ کر دھیرے دھیرے ہلانے لگیں! کچھ دیر بعد میں چلا آیا۔ ان کے یہاں جانے سے مجھے اب خدا جانے کیوں وحشت ہونے لگی تھی، ایک عرصے تک نہیں گیا۔ انوار بھائی سے بھی ملاقات نہیں ہوئی غم دوراں میں اس طرح گرفتار ہوئے تھے کہ کسی سے ملنے کی فرصت ہی نہیں رہ گئی تھی ان کے پاس۔ پھر سرکاری کام سے میں گورکھپور چلا گیا۔ کوئی تین چار مہینے بعد واپس آیا۔ کام سے کچھ فرصت ملی تو

انوار بھائی یاد آئے۔ سوچا ان کی خبر لوں کہ کس حال میں ہیں ـــــ! شام کو چائے سے فارغ ہو کر اور نوکر کو کھانے کے لیے ہدایت دے کر انوار بھائی کے گھر چل دیا!!

ان کے گھر پر عجیب سا سناٹا اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ یہ سماں دیکھ کر میرا دل خود بخود بیٹھا جا رہا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ ایک، دو، تین بار ـــ! تب کہیں دروازہ کھلا! انوار بھائی تھے! میلا سا لباس، بڑھا ہوا شیو، اُلجھے ہوئے بال، اُترا ہوا چہرہ بے خواب سی سوجی آنکھیں!

"تم حیدر میاں۔ ......"

"آداب عرض .... یہ کیا حال بنا رکھا ہے انوار بھائی؟" میں نے پوچھا تو وہ عجیب سی ہنسی ہنسے۔

"بس جی رہا ہوں حیدر پیارے .... آؤ اندر آؤ"

گھر کے اندر داخل ہو کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا! بچیاں آنگن ہی میں بڑے کھٹولے پر پڑی ہوئی سو رہی تھی!

"بھابھی کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

انوار بھائی اچانک رو پڑے! جیسے ندی کا لیا ندھ ٹوٹ گیا ہو۔ آنسوؤں کا سیلاب اور ہچکیوں کا طوفان ذرا تھما تو انھوں نے بتایا۔

"وہ ساتواں زچہ خانہ سنبھال نہ سکیں حیدر.... ڈاکٹر نے پہلے ہی جواب دے دیا تھا اور .... وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا ...."

"نہیں ...." میں چیخ سا اٹھا۔

"ہاں حیدر .... وہ ان سب بچوں کو میرے لیے چھوڑ کر چلی گئیں ایسی جگہ جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا!"

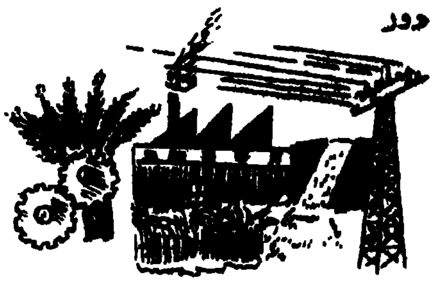
اور اسی وقت ننھی بچی سوتے سے چونک کر رونے لگی یوں جیسے اپنی کھوئی ہوئی ماں کو پکار رہی ہو ـــــ!

★

غزل

عفت بانو نیبا

رفعتِ بارگہہ ناز پہ رونا آیا اپنی ہی جرأتِ پرواز پہ رونا آیا
جانے انجامِ وفا ہم کو کہاں لے جائے اتنا سوچا تھا کہ آغاز پہ رونا آیا
میری خاطر تری مژگاں پہ ستارے چمکے! گردشِ وقت کے اعجاز پہ رونا آیا
اپنی بربادی کا احساس سوا ہونے لگا اس نگاہِ غلط انداز پہ رونا آیا
کتنی مانوس ہے ویرانیٔ غم سے فطرت آج خود اپنی ہی آواز پہ رونا آیا
میری خودداریٔ غم آج بھی مائل بہ کرم مجھ کو پھر پرسشِ دمساز پہ رونا آیا
جس پہ رقصاں ہے ہر اک تارِ نفس تک نیبا
دلِ بیتاب کے اس راز پہ رونا آیا



اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

بنکروں، دستکاروں اور رکشہ چلانے والوں کو ادارہ جاتی امداد ••• بہترین گاؤں سبھا کو انعامات ••• کتاب ضبط ••• اتر پردیش میں زمین کا نیا بندوبست ••• فاضل آراضی کی تقسیم ••• سرکاری زمرے کے اداروں میں کھلاڑیوں کو خوراک بھتہ ••• انجمن ترقی اردو کو امداد ••• ۴۴ مجاہدین آزادی کو سیاسی پنشن ••• بینکوں کے ذریعہ بنکروں کو مالی امداد ••• ایٹہ میں بے زمینوں کو ۴۳۵۰ ہیکٹر آراضی ••• اتر پردیش میں بناسپتی تیل کا نیا کارخانہ ••• نینی تال میں عوامی جشن

معاشی اعتبار سے کمزور طبقوں کو ادارہ جاتی امداد فراہم کرنے کی غرض سے ریاستی حکومت نے اتر پردیش عوامی محاصل (واجبات کی وصولی) قانون کے تحت ۹ نئی اسکیمیں شروع کی ہیں۔

ریاستی حکومت اتر پردیش کے تمام کاروباری بینکوں کی اس غرض سے ہمت افزائی کر رہی ہے کہ وہ عوام کو درمیانی اشخاص اور مہاجنوں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی پروگرام کو بروئے کار لانے میں معاشی اعتبار سے کمزور طبقے کی مدد کریں۔

ان نئی اسکیموں کے مطابق الٰہ آباد بینک بہرائچ میں ۲۰۰ رکشے چلانے والوں کو خود اپنے رکشے خریدنے کے لیے مالی امداد دے گا۔ ہر رکشے والے کو ۹۰۰ روپیے کا قرضہ دیا جائے گا۔ بینک قصبہ لہرپور (ضلع سیتاپور) کے ۵۰۰ بنکروں کو بھی مالی امداد مہیا کرے گا۔ حالانکہ یہ رقم فی بنکر ۳۰۰۰ روپیے سے زیادہ نہ ہوگی۔

بینک آف بڑودہ کانپور میں چمڑے کے سوٹ کیس بنانے والے ۸۰۰ دستکاروں کو مالی امداد دے گا۔ یہ رقم فی دستکار ۷۰۰۰ روپے تک ہوگی۔

اسی طرح اسٹیٹ بینک آف انڈیا بلند شہر، سہارنپور، اترکاشی، بجنور، میرٹھ اور مظفر نگر اضلاع میں ۴۲۵۰ بنکروں کو مالی امداد دے گا۔ ہینڈ لوم بنکر کو تقریباً ۱۵۰۰ روپیہ فی لوم اور پاور لوم بنکر کو ۳۶۰۰ فی پاور لوم کے حساب سے مالی امداد دی جائے گی۔ یہ بینک میرٹھ، آگرہ، متھرا، بلند شہر اور علی گڑھ اضلاع میں جوتے بنانے والے ۴۵۵۰ کاریگروں کو اور وارانسی، مرزا پور اور جونپور کے ۷۹۰ قالین ساز بنکروں کو بھی مالی امداد مہیا کرے گا۔

سنٹرل بینک آف انڈیا ایٹہ میں ۲۰۰ رکشے والوں کو اور ضلع ایٹہ میں ڈبیاپور اور جسونت نگر کے ۱۰۰ بنکروں کو مالی امداد دے گا۔ یہ بینک ہر رکشے والے کو ۸۰۰ روپیہ کی مالی امداد دے گا۔ تاکہ وہ خود اپنا رکشہ خرید سکیں۔ اسی طرح ہینڈ لوم کے ہر بنکر کو ۱۵۰۰ روپیہ کی مالی امداد فراہم کی جائے گی۔

اس کے علاوہ ریاستی حکومت آٹھ اسکیمیں پہلے ہی شروع کر چکی ہے جن میں تین کنارا بینک، چار پنجاب نیشنل بینک اور ایک یونین بینک کی اسکیم شامل ہے۔ یہ اسکیمیں ان بنکروں اور کاریگروں کے لیے وضع کی گئی ہیں جو جوتا سازی اور چمڑے کا سامان تیار کرنے کے کام میں مصروف ہیں۔

❋ ❋ ❋

حکومت اتر پردیش نے دیہی علاقوں کی تیز رفتار ترقیاتی سرگرمیوں کی ہمت افزائی کی غرض سے مالیاتی سال رواں کے دوران ریاست کی بہترین گاؤں سبھاؤں کو انعامات دینے کے لیے ۵۳.۲۰ لاکھ روپے

کی رقم منظور کی ہے۔

ریاست کے ہر ضلع میں جو گرام سبھائیں اپنی سالانہ آمدنی میں اضافہ کرنے اور اپنے گاؤں کی ہمہ گیر ترقی کے لیے اسکیمیں شروع کرنے کے معاملے میں اول، دوم اور سوم قرار دی جائیں گی انھیں بالترتیب ۳۰۰۰ روپے ۱۰۰۰ روپے اور ۴۰۰ روپے کے انعامات دیے جائیں گے۔ یہ اسکیم ریاست کے میدانی اور پہاڑی علاقوں میں شروع کی جائے گی۔

❖ ❖ ❖

اترپردیش حکومت نے شری شمبھو شاستری کی تصنیف "سماجی اور نمازی" کو ضبط کر لیا ہے۔ اس کتابچے کے پبلیشر شری سریندر کمار ترپاٹھی شاستری (ایم۔پی جبل پور) ہیں جو کہ وارانسی کے اکھل بھارتیہ سنسکرت چھاتر سنگھ کے صدر بھی ہیں۔

اس کتابچے میں مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان مذہبی عقائد کی بنیاد پر نفرت اور بدگمانی پھیلانے، دشمنی کا جذبہ پیدا کرنے یا پیدا کرانے میں مدد دینے والا مواد موجود ہے جس کا شائع کرنا تعزیرات ہند کے تحت مستوجب سزا ہے۔

حکومت نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ہندی میں لکھی گئی اس کتاب کی سب کاپیاں اور دیگر مطبوعات میں اس کی شمولیت دوبارہ اشاعت اور ترجمے یا اس کتابچے سے لیے گئے اقتباسات سب بحق سرکار ضبط کر لیے گئے ہیں۔

❖ ❖ ❖

محکمۂ چک بندی اترپردیش میں زمین کے ایک نئے بندوبست کو بروئے کار لائے گا۔

مذکورہ محکمہ بندوبست اسکیم پہلے ہی پیش کر چکا ہے جس پر ریاستی حکومت ابھی غور کر رہی ہے۔ وزیر مال شری سوامی پرشاد سنگھ کے مطابق اس سلسلے میں جلد ہی قطعی فیصلہ کیا جائے گا۔ اس اسکیم سے اخراجات میں کمی اور عمل درآمد کی رفتار تیز تر ہو گی۔

❖ ❖ ❖

ریاستی حکومت نے تمام ضلع مجسٹریٹوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ ریاستی انتظام آراضی کمیٹی کے وضع کردہ نظام کے بموجب فوری طور پر زمین الاٹ کرنے کا کام شروع کر دیں۔

ضلع مجسٹریٹوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ۲۹ فروری ۱۹۷۶ء تک اپنے ضلع میں دستیاب فاضل زمین کے الاٹمنٹ کا کام مکمل کر لیں۔

حکومت نے اس سے قبل گاؤں سبھا کی زمین اور دیگر فاضل زمین کے الاٹمنٹ کے سلسلے میں ۲۰ فروری ۱۹۷۵ء کو ایک حکم کے ذریعہ جو پابندی عائد کی تھی اسے فوری طور پر ختم کر دیا ہے۔

❖ ❖ ❖

اترپردیش کے سرکاری زمرہ کے اداروں میں کام کرنے والے کھلاڑیوں کو جو قومی ٹورنامنٹ میں ریاست کی نمائندگی کرتے ہیں انھیں تنخواہ اور دوسرے بھتوں کے علاوہ ۱۵۰ روپیہ خوراک بھتہ کے طور پر دیا جائے گا۔ وہ کھلاڑی جو بین اقوامی ٹورنامنٹ میں ہندستان کی نمائندگی کرتے ہیں انھیں ۲۵۰ روپیہ ماہوار خوراک بھتہ کے طور پر ملے گا۔

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کے ایک فیصلہ کے مطابق ماہانہ خوراک بھتہ ریاست کے سرکاری زمرہ کے اداروں میں کام کرنے والے کھلاڑیوں کو اس وقت تک ملتا رہے گا جب تک وہ قومی اور بین اقوامی کھیل کود ٹورنامنٹوں میں ریاست یا ملک کی نمائندگی کرتے رہیں گے۔

❖ ❖ ❖

ریاستی حکومت نے مالیاتی سال رواں کے دوران انجمن ترقی اردو، اترپردیش کو اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ۸۰۰۰ روپے بطور مالی امداد منظور کیے ہیں۔

اس مالی امداد میں سے اردو مڈل اسکول کو ۴۰۰۰ روپے، اردو لائبریری کے لیے ۲۰۰۰ روپے، دفتر کے فرنیچر اور دیگر ساز و سامان مہیا کرنے کے لیے ۵۰۰۰ روپے، اسٹیشنری، سفر بھتہ اور اتفاقی مصارف کے لیے ۲۰۰۰ روپے اور ادارہ کے اخراجات کے لیے ۱۲۰۰۰ روپے کی رقم منظور کی ہے۔

❖ ❖ ❖

الٰہ آباد، وارانسی، ہمیرپور، جھانسی، للت پور، فرخ آباد، فتح پور اور جون پور اضلاع کے مزید ۳۴۳ - افراد کو ۶۰ روپے سے ۱۰۰ روپے کی سیاسی پنشن گزشتہ اگست میں منظور کی گئی ہے۔

سیاسی پنشن پانے والے نئے لوگوں میں ۱۴ مجاہدین آزادی کی بیوائیں بھی ہیں۔

ریاست کے بنکروں کو یونین بینک اور کنارا بینک سے مالی امداد دلانے کی غرض سے دو اسکیمیں وضع کی گئی ہیں۔

یہ دونوں اسکیمیں اتر پردیش سرکاری محاصل (واجبات کی وصولی) ایکٹ کے تحت ریاستی حکومت کی جانب سے تیار کی گئی ہیں۔

پہلی اسکیم کے تحت یونین بینک اپنی موجودہ شاخوں کے ذریعہ اعظم گڑھ، غازی پور اور وارانسی کے اضلاع میں ۱۰۰۰ سے ۱۵۰۰ تک بنکروں کو نئے لوم خریدنے، پرانے لوموں کی جدید کاری اور کاروباری پونجی کے لیے سرمایہ مہیا کرے گا۔

کنارا بینک کی وضع کردہ دوسری اسکیم کے تحت آگرہ، علی گڑھ اور ایٹہ کے اضلاع کے ۴۵۰ بنکروں کو بینک کی بیلن گنج (آگرہ)، اعتقاد پور، آگرہ - فیروز آباد (آگرہ)، علی گڑھ، ہاتھرس (علی گڑھ) اور مارہرا (ایٹہ) کی شاخوں کے ذریعہ مالی امداد دی جائے گی۔

ان اسکیموں کے تحت ایک بنکر کو زیادہ سے زیادہ ۵۰۰۰ روپے دیے جائیں گے۔

حکومت اتر پردیش سماج کے کمزور طبقوں کے دستکاروں اور بنکروں کو درمیانی آدمیوں اور ساہوکاروں کے چنگل سے آزاد کرانے کی غرض سے مالی امداد دینے کے واسطے اسکیمیں وضع کرنے کے لیے ریاست کے تمام درج فہرست کمرشیل بنکوں کی ہمت افزائی کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں بنکوں کا ردعمل کافی حوصلہ افزا رہا ہے کیونکہ کافی تعداد میں بینک حکومت سے یہ خواہش کر رہے ہیں کہ ان کی اسکیمیں سرکاری اسکیموں کی حیثیت سے مشتہر کی جائیں۔

اتر پردیش کے ضلع ایٹہ میں چھوت حد بندی اور گاؤں سماج کے تحت فاضل قرار دی جانے والی تقریباً ۴۳۵۰ ہیکٹر اراضی ۴۷۵۲ بے زمین مزدوروں اور دیہی علاقوں کے دوسرے غریب طبقوں میں تقسیم کی گئی۔ اس میں سے تقریباً ۱۳۵۰ ہیکٹر زمین وہ ہے جو سابق زمینداروں اور بڑے کسانوں نے ہڑپ کر رکھی تھی۔

وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا نے کل شام سرد سے آشرم ایٹہ میں منعقدہ ایک تقریب میں ۳۰۰ سے زائد بے زمین زرعی مزدوروں کو پٹے تقسیم کیے۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کنارا بینک کی خدمات کی تعریف کی جو زراعت اور نگہداشت مویشیان کی ترقی کے لیے چھوٹے کسانوں اور گنج ددھوارہ میونسپل بورڈ کے مہتروں کو بڑی تعداد میں قرضوں کی سہولت مہیا کر رہا ہے۔

قومی امداد باہمی ترقیاتی کارپوریشن ریاست میں بناسپتی تیل کا ایک کارخانہ قائم کرنے کی منظوری دینے پر رضامند ہو گیا ہے۔ ایک امداد باہمی انجمن جو ہردوئی اور اناؤ اضلاع میں مونگ پھلی کے کاشتکاروں کو ممبر بنا کر قائم کی گئی ہے۔ اس پراجکٹ پر اسی سال سے عمل درآمد شروع کر دے گی۔

یہ پراجکٹ تین مرحلوں میں مکمل ہوگا اور پہلے مرحلے کے تحت ایک تیل مل قائم کی جائے گی۔ دوسرے مرحلہ میں پیرائی مشینیں لگائی جائیں گی اور آخری مرحلہ میں ہائیڈروجینیشن پلانٹ چالو ہو جائے گا۔

اس پراجکٹ پر ۱۱۰ لاکھ روپے کی لاگت آئے گی جس میں سے ۷۰ فی صد رقم قومی امداد باہمی کارپوریشن اور بقیہ رقم ریاستی حکومت اور امداد باہمی انجمن برداشت کرے گی۔

اس سال موسم سرما کے آغاز میں نینی تال کی سیر کرنے والوں کی تفریح طبع کے لیے دلچسپ ثقافتی پروگرام کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

جھیل کی تفریح گاہ میں گاندھی جینتی یعنی ۲ اکتوبر سے ایک پندرہ روزہ عوامی جشن کا انعقاد کیا جائے گا۔

حکومت ہند کا گیت اور ڈرامہ ڈویژن ملک کے مختلف حصوں سے ممتاز عوامی فنکاروں کی پارٹیاں اس جشن میں شرکت کے لیے لانے کا انتظام کر رہا ہے۔

اسی طرح کے عوامی جشن کمایوں پہاڑی منطقے کے دو مشہور مقامات رانی کھیت اور الموڑہ میں بھی منعقد کرنے کی تجویز ہے۔

★

قدر و نظر

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

سفینۂ زرِ گل مجموعۂ کلام ۔ فضا ابن فیضی ۔
پبلشر: دانش کدہ پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، اعظم گڑھ (یوپی)
اشاعت اول: ۱۹۷۳ء ۔
قیمت: بارہ روپے، ضخامت: ۲۷۱ صفحات ۔

کبھی تو صاحبِ فن اپنا ماجرا بھی کہے
یہ کیا، وہی کہو تم بھی جو دوسرا بھی کہے
فضا ابن فیضی

اردو شعر و ادب کی طویل روایت میں ایسے بہت کم شاعر ملتے ہیں جن کا اپنا منفرد لب و لہجہ اور اسلوب رہا ہو۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ صاحب فکر و فن ہر دور میں مشت نمونہ از خروارے رہے ہیں ۔ فضا کا مندرج بالا شعر جسے میں نے پیش نظر مجموعہ کلام کے تبصرے کے لیے سُرخی قرار دیا ہے بڑی حد تک ان کے مزاج اور نظریۂ شعری کی نمائندگی کرتا ہے ۔ فضا ابن فیضی ہمارے ان شاعروں میں ہیں جن سے اردو شاعری کا بھرم قائم ہے ۔ وہ فکر و فن کے اتصال سے شعری اور ادبی بصیرتوں کا احاطہ کرتے ہیں ۔ چبائے نوالے اور گلے ہوئے لقمے، ان کے نزدیک نقالی ہے شاعری نہیں ۔ لفظوں کی الٹ پھیر، محاوروں کی ہیرا پھیری، خیالات کی بازآفرینی کبھی بھی انفرادیت کی مظہر نہیں بن سکتی ہے بلکہ اس سے ذہنی دیوالیہ پن اور فکری بے بضاعتی کا اظہار ہوتا ہے جو اردو کے نام نہاد شعراء، ادبا اور ناقدین کا طرۂ امتیاز رہا ہے لیکن فضا جھلملاتے سرابوں میں لفظ و معنی سے بے نیاز ہو کر احساسِ جنوں اور آگہی سے دورِ جدید میں گردشِ حیات کے رازدار بن جاتے ہیں جس سے لفظ و معنی خود ان کے دست نگر ہو کر فنِ شاعری کی آبرو رکھ لیتے ہیں ۔

فضا کے قلم میں شفق کا لہو رنگ بھی ہے اور جراحتوں کی نقرئی روشنی بھی ۔ وہ بنام آگہی زہرِ ہلاہل نوش کر کے غرورِ شش جہات توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ وہ شعور کی ان گہرائیوں کے شناور ہیں جہاں کتاب دل کے حوالے سیکھے بھالے ہوئے ہیں اس لیے فضا کی زبان سے جو بھی نکلتا ہے وہ مستند ٹھہرتا ہے ۔

درحقیقت فضا کی شاعری ارباب قلم کی رہین منت نہیں بلکہ ارباب قلم فضا کی شاعری کے احسان مند رہیں گے ۔ وہ مملکتِ فن شعر کا ایک ایسا شہریار ہے جہاں دقائق فن قدم قدم "پر نکتہ سنجوں" کا امتحان لیتا ہوا نظر آتا ہے ۔

موجودہ اردو شعر و ادب کی متوازن اور سنجیدہ سمت و رفتار سمجھنے کے لیے سفینہ زرِ گل ایک انتہائی اہم کڑی ہے ۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش خدمت ہیں : ۔

میں کس افق سے اب آواز دوں اجالوں کو
جو آفتاب تھے تو تیرگی میں ڈوب گئے

فروغ دانشِ حاضر بھی کم نہیں سفاک
جو تیرگی سے بچے روشنی میں ڈوب گئے

اپنی ذات میں ہی کائنات ہوں گویا
ایک سینے میں کتنے دل دھڑکتے ہیں

آگ سینے میں لگی ہو جیسے
سانس لی جب تو دھواں سا ابھرا

یہ زندگی ہے دکھوں کا گھنا گھنا سایہ
یہاں نہ ٹھہرو تو آخر کہاں قیام کرو

میں راستہ ہوں مرا کام ہے سفر کرنا
یہ کیا سمجھ کے مجھے منزلوں نے گھیرا ہے

میں اپنے آپ کو آخر سمیٹتا کیسے
میرے وجود کے اندر بکھر گیا ہے کوئی

زمین چیخ رہی ہے کہ آسمان گرا
یہ کیسا بوجھ ہمارے بدن پہ آن گرا

اداس اداس ملے گیسوؤں کے سائے بھی
کچھ ایسی دھوپ رہی دل جلوں کی بستی میں

پرسکوں اپنے کو رکھتا ہوں سمندر کی طرح
ورنہ طوفاں تو گزر کے مرے سر سے بھی گیا

لفظ جسم رکھتے ہیں ان کو اپنے جذبوں کے لمس جواں رکھو
سطح ہے معانی کی لاکھ برف آلودہ ذہن کو تپاں رکھو

کہاں وہ لوگ جو قدر خلوص پہچانیں
دلوں کا پیار تو بس کاروبار جیسا تھا

عہد حاضر میں حیاتِ انسانی کا انتشار اور اس کے وجود کا کرب جو کسی بھی لمحہ سکون نہیں پا رہا ہے ۔ ہر شخص اپنے وجود کے خول میں گم ہے ۔ وجودیت اسے مختلف انداز سے کھنگال رہی ہے ۔ انسان کا وجود بکھرا ہوا ہے ۔ مستقبل کی تاریکیوں کا شدید احساس اس کے روح کو متلاطم کیے ہوئے ہے یہ سب موضوعات جدید شعراء کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہیں جسے فضا نے قلم، جدید اور ترقی پسندی کے مثلث میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔ ایک عظیم فن کار کی یہ بنیادی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے دور کا نقیب ہوتے ہوئے بھی ماضی کی روایتوں کا احترام بھی کرتا ہے اور مستقبل کی بشارت بھی دیتا ہے، ایسی بشارت جس میں حوصلہ مندی بھی رہتی ہے اور تاریکیوں کے گھنے سائے کا احساس بھی، لیکن ایسا احساس نہیں جس میں انسان اپنے آپ کو تلاش نہ کر سکے گوشۂ تاریکی میں سمٹ جائے بلکہ وہ ہر تاریک دور سے نبرد آزما ہونے کے لیے "غنچۂ قلم" کو تاریکی حیات و کائنات کو سپیدیِ سحر میں تبدیل کر دیتا ہے ۔ جہاں "مصلحت گزیدگی" اس کے "شوخ جذبات" پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے فضا اسی نہاد فکر کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں : ۔

مصلحت گزیدوں کو میرے شوخ جلوں پر احتجاج کرنے دو
تلخیوں کی یورش سے ڈر کے بند کیوں آخر شہد کی دکاں رکھو

ڈاکٹر فضل امام

جلد ۳۱ نمبر ۹

دسمبر سنہ ۱۹۷۵ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: کماری سرلا ساہنی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن ربھاگ۔ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی،

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

ذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

اپنی بات

اتر پردیش میں انسدادِ بدعنوانی مہم کے سلسلے میں ریاستی ویجی لنس اسٹیبلشمنٹ (نگراں ادارہ) نے جسے ریاستی حکومت نے ریاستی ملازمین کے خلاف کثیر تعداد میں شکایات کی جانچ کا کام سپرد کیا تھا گزشتہ ۲۴ مہینوں میں انسدادِ بدعنوانی مہم کے تحت بھی کامیابی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ زیرِ نظر مدت میں اس شعبے نے ۲۴ افسروں اور ملازمین کو رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا اور آٹھ افسروں کے گھروں کی تلاشی لی جس میں بڑی مقدار میں ایسے زیورات اور نقد رقمیں برآمد ہوئیں جن کا کوئی حساب موجود نہیں تھا۔ نگراں شعبے کی تحقیقات اور رپورٹ پر ۵۹ ملازمین بشمول ۱۰ کے خلاف مقدمات قائم کیے گئے۔ نگراں شعبے کی سفارشات کی بنیاد پر حکومت نے ۱۶۲ ملازمین کے خلاف کارروائی کی۔ ریاستی حکومت نے ویجی لنس اسٹیبلشمنٹ کو ۷۵-۱۹۷۴ء میں تحقیقات کے لیے ۵۲۶ معاملات اور اس کے بعد سال رواں میں ۵ نومبر ۱۹۷۶ء تک ۲۷۹ معاملات سپرد کیے تھے۔ اس قسم کے معاملات کی تعداد ۷۳-۱۹۷۲ء میں صرف ۸۰ ؛ اور ۷۴-۱۹۷۳ء میں ۳۱۲ تھی۔

رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے ملازمین یہ تھے۔ سرو شری جے این دیکشت، بی ڈی او، بیج ناتھ، تحصیلدار، شیو کمار شرما، ایگزیکٹیو افسر، رام ساگر شرما، ایس ڈی او، آر کے اگروال، سرجن، امر دو سنگھ، اسٹیشن افسر (پولیس)، بی ایم سنگھ سری واستو، لفٹیننٹ، میڈیکل افسر، سلطان حسین، قائم مقام تحصیلدار، مہر چند جیتا، اسسٹنٹ محکمۂ تعلیم، ڈی ڈی دیکشت، اسٹیشن افسر، سریش کمار، غذائی انسپکٹر، جے پی سنگھ سینگر، میڈیکل افسر، نول کشور سنگھ، جونیئر انجینئر، ایس ڈی گوئل، لیکچرار، جسٹ عطاء اللہ خاں، ریونیو انسپکٹر، رام دت شرما، پیشکار، کے کے بھٹناگر، اسسٹنٹ انجینئر، برج راج سنگھ یادو، نائب تحصیلدار، بی کے جین، ایگزیکٹیو انجینئر، تیج بہادر شکلا، کلرک، امر سنگھ، کلرک، ونیے کمار، بی این سری واستو، ایڈیشنل چک بندی افسر، شیو دیال پانڈے، ریونیو انسپکٹر، کرشن پرشاد کھنہ، آفیسر انچارج، نگر مہاپالیکا، محمود حسین، چپراسی، تیج بہادر، کیش قلی، مہندر سنگھ، لیکھ پال، پرم شنکر پاٹھک، سپلائی انسپکٹر، جیہ لال، وارڈ بوائے، کرشن کمار مسرا، جونیئر انجینئر، ارون کمار پنت، ایگزیکٹیو انجینئر، کرشن مشرا، اسٹینو کلرک، ایم پی سنگھ، اسسٹنٹ انجینئر، ہرپال سنگھ، ضلع زراعت افسر، بابا گووند، اسسٹنٹ رجسٹرار قانون گو، رام بخش سنگھ، اسسٹنٹ رجسٹرار قانون گو، کرشن نرائن سرن، سینئر گلاس کلرک، رمیش کمار ترپاٹھی، ٹیکس سپرنٹنڈنٹ شامل ہیں۔

زیرِ نظر مدت میں ویجی لنس اسٹیبلشمنٹ کے افسروں نے جن لوگوں کے گھروں کی تلاشی لی ان کے نام یہ ہیں ۔۔۔ سرو شری ایم کے اگروال، سینئر افسر، تیش چندر پرساد، ایگزیکٹیو انجینئر، او پی فنک، انجینئر، ایگزیکٹیو انجینئر، سیتا رام، سپروائزر (ٹیوب ویلس)، ایس پی مصرا، ایڈیشنل ٹرانسپورٹ افسر، کنور پال سنگھ، اسسٹنٹ چک بندی افسر، نہال سنگھ چودھری، اسسٹنٹ انجینئر اور کرشن پرشاد کھنہ، افسر انچارج، نگر مہاپالیکا۔ اس شعبے کی رپورٹ پر معطل کیے جانے والوں میں ایک ڈپٹی انسپکٹر پولیس جنرل، ایک سول جج، ایک سیشن جج، تین ڈپٹی کلکٹر، ایک ڈپٹی کمانڈنٹ، دو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس، ایک جوڈیشیل افسر، ایک اسسٹنٹ کنٹرولر ناپ تول، آئی ٹی آئی کے ایک پرنسپل، ایک اسسٹنٹ آبکاری کمشنر، ایک پرسنل اسسٹنٹ سکریٹری، ایک ایگزیکٹیو انجینئر، پی ڈبلیو ڈی، ایک ایگزیکٹیو انجینئر ایل ایس جی، ایک ایگزیکٹیو انجینئر ریاستی بجلی بورڈ، دو اسسٹنٹ انجینئر پی ڈبلیو ڈی، پانچ اسسٹنٹ انجینئر آبپاشی، ایک ایگزیکٹیو انجینئر آبپاشی، ایک اسسٹنٹ انجینئر چھوٹی آبپاشی، دو میڈیکل افسر، اسپتال کے ایک سپرنٹنڈنٹ، ایک میڈیکو لیگل ایڈوائزر، ایک سرجن، سول اسپتال، ایک ایگزیکٹیو افسر نگر پالیکا، ایک بی ڈی او، ایک ریجنل ٹرانسپورٹ افسر، تین سیلز ٹیکس افسر، ایک تحصیلدار، ایک نائب تحصیلدار (لیوی)، تین جونیئر انجینئر، ایک آرکیٹکٹ پلانر، ایک انسپکٹر، آئی ٹی آئی، ایک ہریجن و سماجی بہبود افسر، ایک سکریٹری، ریاستی شوگر بورڈ، ایک امدادِ باہمی انسپکٹر، تین سپروائزر، محکمہ ہریجن و سماجی بہبود، ایک ضلع سپلائی افسر، ایک اسسٹنٹ ڈائرکٹر (صنعت)، ایک ایڈیشنل چک بندی افسر، ایک جیلر، ایک کلرک، محکمہ ہریجن سماجی بہبود، ایک ریونیو انسپکٹر، ایک غذائی انسپکٹر، اور ایک لیکھ پال شامل ہے۔ ویجی لنس شعبے کی تحقیقات کی بنیاد پر حکومت نے دو افسروں کو برطرف، چوبیس افسروں کو جبری طور پر ریٹائر، چار افسروں کو ملازمت سے الگ کر دیا اور پانچ افسروں کی ملازمتیں ختم کر دیں۔ تین افسروں کی تنزلی کی گئی، دو افسروں کی پنشن کی رقم اور ایک افسر کی شرح تنخواہ کم کر دی۔ اس کے علاوہ ۴۷ ملازمین کو معمولی سزائیں دی گئیں جن میں تنخواہ کے سالانہ اضافے کو روک دینا اور اعمال ناموں میں ناموافق اندراجات کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ڈپٹی ٹرانسپورٹ کمشنر، دو ڈپٹی کلکٹروں، دو ریجنل ٹرانسپورٹ افسروں، تین ایگزیکٹیو انجینئروں، ایک اسسٹنٹ انجینئر، ایک ڈپٹی رجسٹرار، فارسٹ، ایل بی۔ اے (سکریٹریٹ)، ایک ڈویژنل فارسٹ افسر، وزن اور پیمائش کے ایک اسسٹنٹ کنٹرولر، ایک چک بندی افسر، ایک ریجنل انسپکٹر (ٹرانسپورٹ)، ایک سپروائزر قانون گو، ایک کوآپریٹیو انسپکٹر، اور ایک بلاک ڈولپمنٹ افسر کے خلاف مقدمات قائم کیے گئے۔ اس طرح یہ دیکھا جائے گا کہ ریاست میں بدعنوانی اور رشوت ستانی کے انسداد کے لیے مؤثر اقدامات کیے جا رہے ہیں اور خطاکار ملازموں کو کسی قیمت پر بخشا نہیں جا رہا ہے۔ ایمرجنسی کے دوران اس جانب خصوصی توجہ کر کے ان انسدادی کارروائیوں کو تیز تر کر دیا گیا ہے۔

آہ ہزار لکھنوی

قارئین نیا دور کے لیے یہ المناک خبر یقیناً دلی رنج و غم کا باعث ہوگی کہ ہزار لکھنوی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم کسی نجی ضرورت سے کانپور گئے ہوئے تھے اور وہیں ۲ نومبر کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ادھر پچھلے چند مہینوں میں اردو دنیا ایسے ممتاز ادیبوں اور شاعروں سے محروم ہو گئی ہے کہ ان کی جگہ پر ہونا محال نہیں تو مشکل ضرور نظر آتی ہے۔ ہزار صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ وہ لکھنؤ کے مشہور استاد بہار لکھنوی کے صاحبزادے تھے اور خود بھی کہنہ مشق اور نامور شاعر تھے۔ مرحوم بہت ہی خلیق، منکسر المزاج اور وضعدار تھے اسی لیے ان کے دوستوں اور مداحوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ راقم الحروف سے بھی ان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ انتقال سے تین ہی چار دن قبل دفتر تشریف لائے تھے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ کیا خبر تھی کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔ ادارہ نیا دور مرحوم کے پسماندگان سے دلی تعزیت پیش کرتا ہے۔

ایک اور سانحہ

یہ افسوسناک خبر بھی سننے کو ملی کہ اردو کے بزرگ اور ممتاز صحافی جناب انیس احمد عباسی کا گزشتہ ۱۴ نومبر کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم ایک ماہ قبل اپنے عزیزوں سے ملاقات کی غرض سے کراچی تشریف لے گئے تھے۔ ان کی عمر تقریباً ۸۳ سال کی تھی۔ عباسی صاحب ضلع لکھنؤ کے مردم خیز قصبہ کاکوری سے تعلق رکھتے تھے اور مشہور مزاح نگار فرقت کاکوروی مرحوم کے خسر تھے۔ لکھنؤ کے ایک مشہور روزنامہ حقیقت کے ایڈیٹر تھے جس کو وہ ایک عرصے تک نامساعد حالات میں بھی ہمت و استقلال کے ساتھ نکالتے رہے۔ ابتدا میں وہ سید جالب مرحوم کے مشہور اخبار ہمدم لکھنؤ سے وابستہ تھے۔ عباسی صاحب ایک ممتاز صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست قوم پرور بھی تھے اور اس اصول پر وہ مرتے دم تک ڈٹے رہے۔ زندگی کے بڑے سے بڑے طوفان میں بھی ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ ملک کے متعدد اکابرینِ قوم سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ ان کے انتقال سے نہ صرف لکھنؤ کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہی اٹھ گئی بلکہ اردو صحافت کے ایک دور کا خاتمہ ہو گیا۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کے پسماندگان اور اعزا کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

—— ایڈیٹر

غزل

حقیقت میں بابِ محبت نہیں
وہ دل جو خرابِ محبّت نہیں

نہیں ہر بشر لذّتِ غم کا اہل
کہ ہر دل کو تابِ محبّت نہیں

یہ شہر نگاراں ہے اے دل یہاں
محبّت جواب محبّت نہیں

ہماری نگاہوں میں کافر ہے وہ
جو اہلِ کتابِ محبّت نہیں

گراں ہے ہمیں مفت بھی وہ کتاب
کہیں جس میں بابِ محبّت نہیں

تغافل بھی ہے حُسن کی اک ادا
تغافل حجابِ محبّت نہیں

قبول اے خضر ہم کو آبِ حیات
بجائے شرابِ محبّت نہیں

یہ عذرِ ستم اور جو کچھ بھی ہو
مگر انقلابِ محبّت نہیں

تو سرخوش ہے اے دل جس امید میں
وہ تعبیر خوابِ محبّت نہیں

ہے درماں پذیر اے وفاؔ ہر عذاب
مگر ہاں عذابِ محبّت نہیں

میلارام وفاؔ

ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن



عورت چند اردو نظم نگاروں کی نظر میں

عورت دنیا بھر کی شاعری کا ایک اہم اور محبوب موضوع رہا ہے۔ شیکسپیر نے عورت کو خوشبو، رقص، نغمہ اور روشنی کا مجموعہ کہا ہے اور گوئٹے نے اسے انسان کے لیے خدا کی سب سے قیمتی بخشش بتایا ہے۔

اردو کی غزلیہ شاعری میں عام طور پر عورت کے ساتھ محبوبہ کا تصوّر وابستہ رہا ہے۔ چند نظم گو شعراء نے ہی اسے ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مہر و وفا اور ایثار کے جذبہ پر عموماً غزل گو شعراء کی نظر نہیں گئی ہے۔ غزلوں میں عورت کا تذکرہ محض جنسی تسکین کی خاطر کیا گیا ہے۔ اسی لیے اقبالؔ کو ان غزل گو شعراء سے یہ شکایت تھی کہ ان کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اقبالؔ پہلے اردو شاعر ہیں جنھوں نے عورت کی صحیح اور سچی تصویر کشی کی ہے، اس کے جائز مقام کے تعین کی کوشش کی ہے اور عورت کو اس کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک تصویرِ کائنات میں رنگ اور زندگی کے سوز دروں کا ساز عورت ہی کے دم سے قائم ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُرِ مکنوں

اقبالؔ کے خیال میں عورت میں اتنی صلاحیت نہیں کہ مکالمات

افلاطون لکھ سکے۔ لیکن اقبالؔ کے خیال میں مکالمات افلاطون لکھنے سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ عورت ہی کی ذات وہ ہے جس نے دنیا کو افلاطون کے افیونی نظریے سے نجات دلائی ہے۔

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

اقبالؔ کو اس بات کا افسوس ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کی تاریکی کے شکار آزادیٔ نسواں کے نام پہ بے پردگی کی تعلیم دے کر عورت کا استحصال کر رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ؎

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

مرد ہی دراصل نسوانیت کی نگہبانی کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی زندہ حقیقت ہے جیسے زندہ قوم کے افراد پر آشکار ہونا چاہیے ورنہ ؎

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

اقبالؔ کے خیال میں عورت کی تعلیم و تربیت ایسی ہونی چاہیے جو اس کی نسوانیت بچائے رکھنے میں معاون ہو۔ ایسے علم کا اثر ہے زن نازن، اہلِ نظر کی نظروں میں

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

اقبالؔ کے خیال میں عورت کا صحیح تصور

لیکن یہ طبقۂ نسواں کی بدنصیبی ہے کہ مغربی تقلید نے لوگوں کے ذہنی دریچے بند کر رکھے ہیں عقل و شعور پر پردہ پڑ گیا ہے۔ خوب و ناخوب کی تمیز باقی نہیں رہی اور مختلف قسم کے دلفریب اور خوش کن نعروں کے ذریعہ اس مظلوم طبقہ کی لوٹ کھسوٹ جاری ہے یہ دیکھ کر دکھ تو ہوتا ہے لیکن اس عقدۂ مشکل کی کشود ممکن نہیں معلوم ہوتی! اقبال کے خیال میں عورت کی تحقیقی تصویر یہ ہے:

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر — غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود
راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق — آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود

یہی عورت حبیب عظیم آبادی کی دنیا سے مشاہدہ میں داخل ہوتی ہے تو اس کے اتنے روپ سامنے آتے ہیں کہ شاعر بے چارہ سمجھ نہ پاتا ہے کہ اسے کیا کہئے۔ عظیم عورت کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ اے عورت تیرے بارے میں اس قدر مختلف خیالات پیش کیے گئے ہیں کہ میں ان آراء کے دام میں خود کو پھنسا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تجھے کیا کہوں:

کوئی کہتا ہے علاجِ مرضِ تنہائی — کوئی کہتا ہے دلیلِ رہِ عفت تجھ کو
تیرے جورِ ستم و نازِ تلوّن کے طفیل — کانپ کر کہتے ہیں نیرنگیٔ قسمت تجھ کو
حسنِ سیرت پہ نظر جن کی گئی کہتے ہیں — کبھی عصمت کی کبھی شرم کی مورت تجھ کو
اے دو رنگیٔ زمانہ کی مجسم تصویر — عرفا کہتے ہیں آئینۂ عبرت تجھ کو
دیکھتا ہوں تری صورت کو بچشمِ حیرت — کچھ بتا تو ہی کہ میں کیا کہوں عورت تجھ کو

"دو رنگیٔ زمانہ کی مجسم تصویر" کہہ کر عظیم نے عورت کی تمام خوبیوں اور خامیوں کو بے نقاب کر دیا۔ تسلیم عظیم آبادی نے بھی اپنی ایک نظم میں عورت پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس نظم میں فکر و تاثر دونوں موجود ہیں۔ تسلیم عظیم آبادی نے عورت کی فطرت پر مختصر مگر جامع طور پر روشنی ڈالی ہے انھوں نے اس پہلو کو بھی مدِنظر رکھا ہے کہ عورت کو چھیڑا نہ جائے۔ یہی بہتر ہے۔ یہ ایک ایسا راگ ہے جو ساز کی طرح آواز دیتا ہے صرف اک ذرا چھیڑیئے اور دیکھیے مختلف صدائیں خود بخود فردوسِ گوش ہونے لگیں گی۔

جنت سے آئی ہمراہِ آدم — بن کر بہارِ گلزارِ عالم
ل کی زلیخا عصمت میں مریم — گل کا تبسم اشکِ شبنم
مجھ سے ہے جنت مجھ سے ہے تبسم — فصلِ خزاں میں بھی گل کا موسم
میں عشق میں غم مجھ کو نہ چھیڑو

ہنسنے میں گل ریز رونے میں باراں — گرنے میں بجلی اٹھنے میں طوفاں
میں نورِ یزداں - میں نارِ سوزاں — عشق اپنا مذہب رشک اپنا ایماں
لونڈی وفا کی پیار پہ قرباں — الفت کی مجرم عفت ہی پنہاں
کینہ نہیں عریاں مجھ کو نہ چھیڑو

فریاد میں صور نغمہ میں ارگن — نرمی میں ریشم سختی میں آہن
ملنے میں دلبر لڑنے میں دشمن — بجھنے میں پانی جلنے میں روغن
شوخی میں ہرنی غصہ میں ایندھن — کھیلوں تو بلبل بگڑی تو توسن
اینٹھوں تو ناگن مجھ کو نہ چھیڑو

ہوں موردِ صد دشنام و لعنت — میں نے چھڑائی آدم سے جنت
دنیا میں لائی رنج و مصیبت — عشوہ ادا، ناز غمزہ شرارت
ایمان ناقص، پیچیدہ فطرت — اے وائے تقدیر اے وائے قسمت
عورت ہوں عورت مجھ کو نہ چھیڑو

چشمِ حیا خود اپنی زباں ہے — گرم اشک سرد آہ اپنا بیاں ہے
جو چپ ہے یہ میری اک داستاں ہے — دل آہن سر سنگِ گراں ہے
تہمت ہے مجھ پر باطل گماں ہے — صبر و سکوں گو رخ سے عیاں ہے
شعلہ نہاں ہے مجھ کو نہ چھیڑو

حرفِ مسرت پیغام میرا — مہر و محبت ہے جام میرا
ہر جورِ محبوب آرام میرا — جلنا تپِ عشق میں کام میرا
انجامِ پروانہ انجام میرا
زن نام میرا مجھ کو نہ چھیڑو

ہمدم کی دمساز غم خوار ہوں میں — دلداریوں میں ممتاز ہوں میں
خود ناز بردار خود ناز ہوں میں — نغمے سے مسحور اک ساز ہوں میں
تاروں میں مستور آواز ہوں میں — عاجز ہوں پھر بھی اعجاز ہوں میں
اک راز ہوں میں مجھ کو نہ چھیڑو

تمام رازہائے سربستہ کے انکشاف کے باوجود عورت راز ہی رہتی ہے۔

اک راز ہوں میں مجھ کو نہ چھیڑو

اختر شیرانی کے خیال میں عورت مہر و وفا کی دیوی ہے۔

شباب و حسن، ناز و ادا کی جان ہے۔ عصمت و شرم کی کان ہے۔ اتنا ہی نہیں عورت ہر مرد کا ایمان ہے۔ عورت اگر شمشیر ہے تو فطرت معصوم کی تصویر بھی ہے۔ معصوم طفلی ہو یا بے خود جوانی یا مجبور پیری سب کو عورت کی آغوش میں ہی آرام ملتا ہے۔ عورت کبریا نہیں لیکن شان کبریائی کی حامل ہے۔ یہی نہیں ان کے خیال میں دنیا کے غنچہ زاروں میں اسی کی بو ہے گلشن کی مہکتی تو بہاروں میں اسی کا رنگ ہے۔

حیات و حرمت مہر و وفا کی شان ہے عورت — شباب و حسن و ناز و ادا کی جان ہے عورت
حجاب عصمت و شرم و حیا کی کان ہے عورت — جو دیکھو غور سے ہر مرد کا ایمان ہے عورت
اگر عورت نہ آتی محل یہاں ماتم کدہ ہوتا — اگر عورت نہ ہوتی ہر جہاں اک غم کدہ ہوتا
جہاں میں اک سچے مرد کی تقدیر ہے عورت — طلسم عالم بالا کی اک تفسیر ہے عورت
ید قدرت میں اک چلتی ہوئی شمشیر ہے عورت — زمیں پر فطرت معصوم کی تصویر ہے عورت
جہاں میں کرتی ہے شاہی مگر نشو نہیں رکھتی — دلوں کو کرتی ہے زخمی مگر خنجر نہیں رکھتی
کہیں مجبور پیری اس کے ہاتھوں سے سنبھلتی ہے — کہیں آرام سے جاں اس کے قدموں پہ نکلتی ہے
نہیں ہے کبریا لیکن وہ شان کبریائی ہے — ہماری ایک پیاری عمر بھر اس کی خدائی ہے
اسی کی بو ہے دنیا کے مہکتے غنچہ زاروں میں — اسی کا رنگ گلشن کی مہکتی تو بہاروں میں
اسی کے نغمے جنت کے مچلتے آبشاروں میں — اسی کا نور قدرت کی بہاروں جلوہ زاروں میں
بہار آفرینش ہے شباب زندگانی ہے — جوان فطرت کا ایک کھویا ہوا خواب جوانی ہے
وہ روتی ہے تو ساری کائنات آنسو بہاتی ہے — وہ ہنستی ہے تو فطرت بے خودی سے مسکراتی ہے
وہ سوتی ہے تو سارے سماں کو نیند آتی ہے — وہ اٹھتی ہے تو کل خوابیدہ دنیا کو اٹھاتی ہے
وہی ارمان ہستی ہے وہی ایمان ہستی ہے — یہ کہیے اگر ہستی کو تو وہ جان ہستی ہے
وہ چاہے تو الٹ دے پردۂ دنیائے فانی کو — وہ چاہے تو مٹا دے جوش بحر زندگانی کو
وہ چاہے تو جلا دے نخل زار حکمرانی کو — وہ چاہے تو بدل دے رنگ بزم آسمانی کو
وہ کہہ دے تو بہار جلوہ مٹ جائے نظاروں سے — وہ کہہ دے تو لباس نور چھن جائے ستاروں سے

جمیل مظہری کا تصور زن رومان پرور اور معصومانہ ہے۔ ان کے خیال میں عورت کے جلوۂ رنگین سے دنیا میں اجالا ہے اور شاعر کی خیالی دنیا پر اسی کا تصرف ہے۔ عورت نغمۂ روح عمل اور بوئے گلستان حیات ہی نہیں گرمی بزم جہاں اور شمع شبستان حیات بھی ہے۔ عورت اگر خلش میں زخم ہے تو لذت میں مرہم بھی ہے۔ اس کے شوق میں سادگی اور افکار میں معصومیت ہے۔ عورت در اصل کی ساری ادائیں، یہاں تک خطائیں بھی معصومیت کی حامل ہوتی ہیں۔ جمیل کے خیال میں عورت کی تخلیق میں ماہ کامل کی تڑپ۔ برق کی غیرت سینۂ مہر کی حرارت، پھولوں کی خوشبو اور شاعر کے آنسو شامل ہیں۔ عورت مقصد تخلیق کی حامل ہے۔ انسان اسی کی گود سے پروان چڑھتا ہے اور عورت جس پھول کو سینچتی ہے وہ گلستان بکنار ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں عورت کی تعریف بس یہی ہو سکتی ہے کہ وہ عورت ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کا ہر حرف عورت کی مخصوص جبلت کا حامل ہے۔ یعنی "ع" سے عفت و عصمت "و" سے وفا شعاری، "ر" سے رومان انگیزی اور "ت" سے تخلیقی صلاحیت کی تکمیل — ملاحظہ ہو:

اے ترے جلوۂ رنگیں سے اجالی دنیا
تجھ سے آباد ہے شاعر کی خیالی دنیا
اے کہ گلزار ہے صحرائے تخیل تجھ سے
نالہ کش گلشن ہستی میں ہے بلبل تجھ سے
سینۂ نے میں ہے تو نور ترنم ہو کر
لب فطرت پہ نمایاں ہے تبسم ہو کر
نغمۂ روح عمل بوئے گلستان حیات
گرمی بزم جہاں شمع شبستان حیات
خلش زخم ہے تو لذت مرہم ہے تو
غنچۂ دل کے لیے قطرۂ شبنم ہے تو
عشق خوابیدہ ترے جذبۂ بیدار میں ہے
سادگی شوق میں معصومیت افکار میں ہے
تو ہے معصوم تری ساری ادائیں معصوم
انتہا یہ ہے کہ ہوتی ہیں خطائیں معصوم
تجھ سے جمعیت خاطر ہے پریشانی میں
لاکھ سامان ہیں تو بے سر و سامانی میں
اپنے ہاتھوں سے خدا نے ہے بنایا تجھ کو
ہم کہیں گے دل فطرت کی تمنا تجھ کو
ماہ کامل سے تڑپ برق سے غیرت مانگی — سینۂ مہر سے تھوڑی سی حرارت مانگی

روح پھولوں کی بنی جس سے وہ خوشبو لے کر
دلِ شاعر کی امانت ہیں جو آنسو لے کر
گوندھا قدرت نے تری شوخ طبیعت کا خمیر
اور تیری خاک کے ذروں سے محبت کا خمیر
دہر میں مقصدِ تخلیق کی حاصل ہے تو
جس کی آغوش میں قلزم ہے وہ ساحل ہے تو
چھو کے پیراں تری گود سے افسانہ نکلا
تو نے جس پھول کو سینچا وہ گلستاں نکلا
معنیِ لفظِ سکوں رازِ محبت ہے تو
ہے یہ مجمل تری تعریف کہ عورت ہے تو

ساحر لدھیانوی کے خیال میں عورت لائق صد احترام اور قابل پرستش ہے۔ کیونکہ یہ صرف عام مردوں کو ہی جنم نہیں دیتی بلکہ اس نے ان لوگوں کو بھی جنم دیا ہے جنھیں اوتار و پیمبر کہا جاتا ہے۔ لیکن دکھ کا مقام یہ ہے کہ یہ دنیا مادی دنیا عورت کی قدر نہیں کرتی اور یہ مرد ــــ؟ انھیں تو عورت کی محافظت سونپی گئی تھی مگر عورت کی نگہبانی کے بجائے انھوں نے اسے کوٹھے اور بازار کی زینت بنا دیا ہے۔ جب تک جی چاہتا ہے اس سے کھیلتے ہیں اور جب طبیعت سیر ہو جاتی ہے اسے دھتکار دیتے ہیں:

عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا جب جی چاہا دھتکار دیا

حسرت جے پوری کے خیال میں عورت شرم و حیا سے عبارت ہے۔ یہ ماں بھی ہے بہن بھی ہے اور بیوی بھی، عورت کا جو رنگ بھی ہے وہ غم خواری اور ایثار سے پُر ہے۔ اوتار پیمبر کو جننے والی ہے۔ دستِ قدرت کا شہکار ہے۔ اگر عورت کا وجود نہ ہوتا تو دنیا میں رنگینی و رعنائی بھی نہ ہوتی۔ اس کے بغیر گھر جہنم کا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ عورت خوشیوں سے بھرے پیار کا سنسار ہے:

حوا کی قسم زینت گھر بار ہے عورت
زہرا بھی ہے ہیر بھی ہے وہ پیار ہے عورت
ماتا بھی ہے بہنا بھی ہے بیوی بھی ہے دیکھو
ہر رنگ میں ہر روپ میں غم خوار ہے عورت

امید کے دامن کو وہ بھرتی ہے گلوں سے
مردوں کے لیے پیار کا گلزار ہے عورت
اوتار پیمبر کو جنم جس نے دیا ہے
اللہ کی رحمت کا وہ شہکار ہے عورت
یہ شرم و حیا کیا ایسے زیور نہیں اس کے
شوہر سے محبت کی طلب گار ہے عورت
عورت نہیں ہوتی تو یہاں کچھ نہیں ہوتا
دل جس پہ نچھاور ہے وہ دلدار ہے عورت
عورت کے مراتب بھی کوئی کم تو نہیں ہیں
دنیائے محبت کی علم دار ہے عورت
عورت کے بنا گھر ہے جہنم کا نمونہ
خوشیوں سے بھرا پیار کا سنسار ہے عورت

حفیظ جاذب غازی پوری کی نظروں میں عورت کی حقیقت ملاحظہ ہو:

عورت نے زندگی کو سنوارا کبھی کبھی
عورت نے زندگی کو ابھارا کبھی کبھی
عورت بنی ہے آنکھ کا تارا کبھی کبھی
دشمن بھی کہہ کے اس کو پکارا کبھی کبھی
بھر دیتی ہے خمارِ محبت میں سوز و ساز
کرتی ہے جب نظر کا اشارہ کبھی کبھی
کہتے ہیں لوگ مرہم زخم جگر مگر
لگتی ہے آگ کا بھی شرارہ کبھی کبھی
دریا ہے عشق کا تو سمندر ہے پیار کا
طوفاں بدوش اس کا ہے دھارا کبھی کبھی
نفرت کہیں ہے اور کہیں ہر دل عزیز ہے
بن کر بہن بھی اس نے پکارا کبھی کبھی
ہو جاتا ہے غرور اسے اپنے آپ پر
کہہ دے جو وہ کسی کو ہمارا کبھی کبھی
دل بستگی کا بن گئی ساماں کہیں کہیں
پھر بھی نظر سے اس کو اتارا کبھی کبھی

گرگر کے ہر اک نگاہ سے رہتی ہے بام پر
ہوتا ہے وقت بھی اسے پیارا کبھی کبھی

تخلیق کائنات کا عنواں بنی کبھی — !
ماں کہہ کے سب نے اس کو پکارا کبھی کبھی

لمحات ناگوار میں خدمت گذار ہے
اپنا لیا ہے درد ہمارا کبھی کبھی

انسانیت، خلوص، محبت کے جوش میں
ممتا کے روگ نے اسے مارا کبھی کبھی

ہنس ہنس کے خوش گوار زمانہ کے ساتھ ساتھ
رو رو کے الجھنوں میں گذارا کبھی کبھی

بگڑا اگر نصیب کسی بد نصیب کا!
ہوتی ہے زندگی میں سہارا کبھی کبھی

اکثر خزاں نے رونق گلشن اجاڑ دی
رنگ وفا سے اس نے سنوارا کبھی کبھی

مایوس زندگی کو بھی بخشا ہے حوصلہ
تقدیر کا جو ڈوبا ستارا کبھی کبھی

عورت ہے جاذب ایک تلاطم نما حیات
بن جاتی ہے بھنور میں کنارا کبھی کبھی

ہے ہستی معصوم گنہگاروں کی ہمدم
وابستہ تیری ذات سے ہے عظمت آدم

آئینۂ تقدیس ہے تیرا رخ تاباں
اللہ نے بخشی ہے تجھے فطرت مریم

سرچشمۂ الفت ہے تری ہستی ناچیز
دنیا کے لیے مہر و محبت کا ہے سنگم

یہ سوچ میں ڈوبی ہوئی خاموش نگاہیں
زخم دل مجبور پہ رکھ دیتی ہیں مرہم

دکھ درد کے ماروں کے لیے باعث راحت
روشن ہے ترے حسن سے یہ محفل عالم

حوا کی امانت ترے کردار کی عظمت
پاکیزگی حور ترا حسن مجسم

ہونٹوں کے تبسم میں چھپا لیتی ہے دکھ سکھ
آنکھوں میں ٹپکتی ہے سدا پیار کی شبنم

دکھ درد کی ساتھی ہے مسرت کی امیں ہے
مقصد ہے تری زیست کا بس خدمت آدم

تو شرم و حیا حسن کرم مہر و فا ہے
تو فطرت آفاق کی معصوم "انا" ہے

سیف سہسرامی کے خیال میں عورت ایک ہستی معصوم ہے جو گنہگاروں کی ہمدم ہے۔ اس کی ذات سے عظمت آدم وابستہ ہے عورت کا رخ تاباں آئینۂ تقدیس ہے۔ عورت سرچشمۂ الفت ہے اور مہر و محبت کا سنگم بھی، زخم دل مجبور پر مرہم لگانا فطرت عورت ہے محفل عالم بھی اس کے دم سے روشن ہے۔ عورت دکھ درد کی ساتھی ہے اور مسرت کی امیں ہے۔ عورت کی زیست کا مقصد صرف اور صرف خدمت آدم ہے۔

یہ تھی اردو نظموں میں پیش کی گئی عورت کی تصویر۔ یہ تصویر اردو کی غزلیہ شاعری کی اس عورت سے بہت مختلف ہے جسے محض محبوبہ کے روپ میں دیکھا گیا ہے (اور وہ بھی دیکھنے والی نظریں ہمیں الجھی ہیں کہ ان کی نگاہ زلف، چوٹی، انگیا اور محرم سے آگے نہیں بڑھی ہے)۔ ان نظموں میں عورت کی ایک پاکیزہ صاف ستھری اور خوبصورت لیکن حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی نظمیہ شاعری (مثنوی اور نظم) میں پیش کردہ عورت کے تصور کو منظر عام پر لایا جائے۔

★

قطب سرشار

اندرا گاندھی شعاعِ امید

پھر افق چمکے دل و جاں میں اجالا ہو گیا
پھر سنہری دھوپ چمکی پھر اندھیرا کھو گیا
پھر تعفن پر صبا کو فتح حاصل ہو گئی
یعنی ہر اک موجِ طوفاں موجِ ساحل ہو گئی
گھنٹیاں نورانی امن و آشتی کی گونج اٹھیں
پھر بسنتی پھول مہکے سبز کلیاں کھل گئیں
زندگی کا زرد چہرہ پھر گلابی ہو گیا
انجمادِ موت قلبِ اضطرابی ہو گیا
رفتہ رفتہ زہر آلودہ فضا چھٹنے لگی
قطرہ قطرہ اوس پھر انفاس میں گھلنے لگی
دیش کی ناموس کے تھے گندے سوداگر کئی
بے وفا، فرقہ پرست و شر پسند و مطلبی
دیش کے، جنتا کے دشمن، خود غرض ننگِ وطن
تھے ہوس کے جو پجاری یعنی گلچینِ چمن
منبعِ اشرار تھے جو تیرگی کے دا کشس
دیکھتے ہی دیکھتے سب ہو گئے بندِ قفس
اک ہوا ایسی چلی اندرا لہر کے نام سے
اونچے اونچے ریکھے تو دے گئے سب کام سے
اندرا گاندھی وفاؤں کی علامت بن گئیں
فتح کی روشن صداؤں کی علامت بن گئیں
اندر بھارت کا مستقبل ہے آشا کی کرن
اندرا غنچوں کی نکہت، اندرا حسنِ چمن
اندرا گاندھی نئی صبحوں کی اک سوغات ہے
اندرا حرفِ محبت جذب کی آیات ہے
اندرا گاندھی شعاعِ مہرِ ہندستان ہے
اندرا گاندھی وطن کی آبرو ہے جان ہے

ساحل سلطانپوری

غزل

دلوں میں گرمیِ سوز و گداز رہنے دے
یہ سلسلے ہیں جنوں کے دراز رہنے دے

سفر کا لطف انھیں راستوں پہ ملتا ہے
قدم قدم پہ نشیب و فراز رہنے دے

میں جل رہا ہوں کسی پیاس کے جہنم میں
لبوں پہ یہ لبِ شبنم نواز رہنے دے

ہر آئینے کو نہ دے داغ نامرادی کے
ہمارے بیچ کوئی امتیاز رہنے دے

ہجومِ چشمِ تماشا میں یوں نہ عریاں کر
مرے وجود کو اک حرفِ راز رہنے دے

بہار ہو کہ خزاں کا زمانہ ہو ساحلؔ
چمن چمن مجھے نغمہ طراز رہنے دے

مرزا جعفر حسین

پرنس افسر الملوک بہادر

شاہانِ اودھ کی آخری یادگار

ننہال اور دادھیال دونوں طرف سے شاہان اودھ سے منسلک ہونے کا شرف راقم الحروف کے خاندانوں کو حاصل تھا میرے معرض وجود میں آنے کے قبل ہی انتزاع سلطنت ہو چکا تھا اس لیے ان جلیل المراتب اور گرانقدر بادشاہوں کی زیارت کا شرف مجھے حاصل نہیں ہوا۔ البتہ بادشاہ اودھ کی آخری یادگار کی بارگاہ میں شرف حضوری کا موقع میری زندگی کا بہترین وقفہ تھا جس کی یاد ہمیشہ برقرار رہے گی۔ میری مراد پرنس افسر الملوک مرزا محمد اکرم حسین بہادر سے ہے جو جان عالم واجد علی شاہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے اور صورت و سیرت میں ان کے مشابہ تھے۔ مجھے خوش بختی سے ۱۹۳۶ء میں شرف زیارت و قدمبوسی کا سب سے پہلا موقع ملا تھا اور اس کے بعد ان کی وفات یعنی ۱۹۴۰ء تک تقریباً ہر سال کلکتہ جا کر ان کی ملاقات کی سعادت حاصل کیا کرتا تھا۔

آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے لکھنؤ میں مجوزہ اجلاس عام کا صدر تلاش کرنا مجلس استقبالیہ کے جنرل سکریٹری کے ہمراہ فریضہ تھا۔ میں نے لوہاٹ بغلہ پرالہ آباد دلی، پٹنہ اور مظفر پور کا مسلسل سفر کیا لیکن ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ ہماری کانفرنس نے ملک کی بنیاد وطن پرور رجحانات اور انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت پر استوار تھی، وہ جداگانہ انتخابات کا زمانہ تھا اور عام انتخابات قریب تھے اس لیے ہمارے سیاسی رجحانات کے حامل حضرات ہم سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔ بالآخر میں کلکتہ گیا اور ایک معتقد بیرسٹر صاحب سے صدارت قبول کرنے کی استدعا کی جو انھوں نے بھی مسترد کر دی۔ میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی میں کلکتہ میں بمقام ٹیلیگرلین محب محترم نواب مرزا عابد حسین خان کے یہاں فروکش تھا۔ انھیں کے ہمراہ میرے ایک دوسرے دوست نواب مرزا قاسم علی خاں المعروف بہ نواب اچھن صاحب مرحوم بھی رہا کرتے تھے۔ نواب اچھن صاحب مرحوم نے مشورہ دیا کہ کلکتہ میں پرنس موصوف کی خدمت میں شرف باریابی حاصل کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ لکھنؤ کی مناسبت اور کوئی صدر ان سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ تجویز بہت اچھی تھی مگر میں اپنی ہمت کھو چکا تھا۔ بالآخر انھیں دونوں دوستوں کے اصرار پر میں نے فون پر وقت مانگا اور مجھے ان کے سکریٹری کیقباد مرزا نے فوراً طلب کیا۔

میں ہمت ہارے ہوئے تھا اور ہمارے قیام سے بالی گنج سرکلر روڈ کا جہاں پرنس موصوف کی کوٹھی تھی کافی فاصلہ تھا اس لیے میں نے اپنی رہنمائی کے لیے مرزا عابد حسین صاحب کو اپنا سہارا بنا لیا۔ مرزا صاحب ماشاء اللہ خوش گفتار اور سنجیدہ بزرگ ہیں اس لیے ان کی معیت سود مند بھی ثابت ہوئی چنانچہ ہم دونوں راستہ بھر یہی سوچتے اور غور کرتے رہے کہ عرض مدعا کس طرح کیا جائے مگر وہاں پہنچ کر ہم اپنے سارے منصوبے بھول گئے۔ ان کے سکریٹری نے بالاخانہ پر لے جا کر ان کے حضور میں ہم کو پیش کیا اور ہم دونوں ان کا رعب اور زہرہ دیکھتے ہی مسحور ہو گئے۔ وہ ایک لانبے مگر کم چوڑے تخت پر جس پر بہترین ایرانی قالین اور نفیس گاؤ لگا تھا، رونق افروز تھے۔ دونوں طرف مخملی صوفے اور ہم رنگ و ہم وضع کرسیاں تھیں۔ انھوں نے رسمی صاحب سلامت کے بعد مجھ سے دریافت کیا کہ "فرمائیے کیسے زحمت کی؟" میں نے برجستہ جواب دیا کہ "سرکار میرے آباؤ اجداد کی آپ کے بزرگوں نے عزت افزائی

فرمائی تھی، میرا گوشت پوست اور ساری حیثیت و نمود سب کچھ آپ کے اسلاف کا مرحمت کردہ ہے، اب میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اسی طرح میری عزت افزائی فرمائیں۔" انھوں نے اتنا ہی سن کر کلمہ کی انگلی دانتوں میں رکھ کر فرمایا "ہا! آپ کیا فرما رہے ہیں مجھے شرمندہ نہ کیجیے! کہیے تو آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں کس قابل ہوں پھر بھی میرے امکان میں ہوگا تو آپ کی بات رائیگاں نہ کروں گا۔" میں نے عرض کیا کہ میں آل انڈیا شیعہ پولٹیکل کانفرنس کا جنرل سکریٹری ہوں، آئندہ ماہ میں اس کا اجلاس عام بمقام لکھنؤ منعقد ہو رہا ہے اور ہماری ملت کے معتقد حضرات میں کوئی بزرگ صدارت پر آمادہ نہیں ہوتے۔ انھوں نے پوچھا "کیوں؟" "آخر کیوں انکار ہے؟" میں نے جواب دیا کہ انتخابات سر پر ہیں، ہمارا پلیٹ فارم کامیابی کے مواقع فراہم نہیں کرتا، ذاتی اغراض و مفاد ان حضرات کو صدارت منظور کرنے میں مانع ہیں۔ انھوں نے فرمایا "یہ سچ ہے مجھے نہ الیکشن لڑنا ہے نہ میرے کچھ سیاسی اغراض ہیں لیکن میں جاہل تو نہیں اجہل ہوں۔ آپ کسی اور کو جو مجھ سے بہتر ہو ایک بار اور تلاش کر لیجیے۔ کوئی نہ ملے تو میں حاضر ہوں۔" اس آخری فقرہ نے میرے دل میں ایک چمک پیدا کر دی اور میں نے بیتابانہ دست بستہ عرض کیا کہ "اب میں کہیں اور نہ جاؤں گا۔ سرکار ہی رضامندی مرحمت فرما دیں۔" پرنس موصوف نے ہنس کر فرمایا "میری رضامندی آپ کے پاس ہے، اس کا مانگنا بیکار ہے۔" اس گفتگو کے تخمیناً دو گھنٹہ بعد تک ہمارا قیام ان کے حضور رہا۔ انھوں نے شہر لکھنؤ کے ایک ایک محلہ اور ایک ایک خاندان کا حال تفصیل کے ساتھ دریافت کیا۔ ان کی گفتگو سے پتہ چلتا تھا کہ ان کو لکھنؤ سے عشق ہے اور گو کہ ان کا اس شہر میں داخلہ ممنوع تھا اور اس ممانعت کے ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ کبھی یہاں نہیں آئے تھے مگر یہاں کی جغرافیائی اور سماجی حالات کی ہو بہو تصویر ان کے پیش نظر تھی۔ رخصت ہونے کے قبل میں نے تحریری رضامندی کی درخواست کی جو انھوں نے فی الفور منظور فرمائی۔ میں نے جائے قیام پر آکر تحریری درخواست ارسال خدمت کی اور اسی آدمی کی معرفت میرے حسب خواہش تحریری جواب آگیا۔

آل انڈیا شیعہ پولٹیکل کانفرنس ایک بے بضاعت ادارہ تھا جس کے کارکن اس کو جان پر کھیل کر چلا رہے تھے۔ پرنس موصوف کو صدارت کے لیے آمادہ کر لیا تھا لیکن ان کے شایان شان استقبال اور ان کی تواضع کے مراحل بہت سخت تھے۔ مرحوم راجہ محمد امیر احمد خاں نے ان کی مہمانداری کی ذمہ داری از خود قبول فرمائی تھی۔ اور مٹیا برج میں مناسب انتظامات شروع کرا دیے تھے۔ پھر بھی استقبال اور دوسرے لوازمات فراہم کرنے کی ذمہ داری میرے لیے بہت سخت تھی بالخصوص ایسی حالت میں کہ ان کی تشریف آوری میں دس یا بارہ روز باقی تھے۔

اس پریشان کن موقع پر میرے مرحوم دوست خواجہ اسد نے مشورہ دیا کہ بڑے بڑے پوسٹر کثیر تعداد میں چھپوا کر ہر ہر گلی، کوچہ اور سڑک پر لگوا دو، لکھنؤ والے سلطان عالم واجد علی شاہ کی آخری یادگار کے استقبال کا انتظام خود ہی کر لیں گے۔ میں نے اس مشورہ پر عمل کیا اور دو روز میں شہر بھر کے اندر یہ پوسٹر چسپاں ہو گئے۔ ہر پوسٹر کو پڑھنے کے لیے جگہ جگہ بلا تفریق مذہب و ملت لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ہمارے شہریوں کو ان پوسٹروں سے بھی اتنا قلبی لگاؤ تھا کہ ایک مدت تک ان کو کسی نے اپنے مقام سے جدا نہیں کیا۔ چند دن گزرے جیسے جیسے وقت قریب آتا جاتا تھا یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کی ہر دیوار اور یہاں کا ہر در ان کو آغوش میں لے لینے کے لیے آمادہ ہے۔

پنجاب میل گیارہ بج کر کچھ منٹ کے بعد لکھنؤ پہونچا تھا۔ میں نے اینگلو انڈین اسٹیشن ماسٹر سے اپنے والنیٹروں کے بلا ٹکٹ داخلہ کی اجازت مانگی، پرنس موصوف کا ذکر کیا لیکن سیاسی کانفرنس کے ساتھ رعایت نہیں کی جا سکتی تھی اور صرف ایک درجن والنیٹروں کو داخلہ کی اجازت ملی۔ اسی اثنا میں مجمع بڑھنے لگا اور پلیٹ فارم ٹکٹ فروخت ہونے لگے اور سارا اسٹاک ختم ہو گیا، پھر یہ ٹکٹ ہاتھ سے لکھے جانے لگے، تھوڑی دیر بعد یہ بھی ناممکن ہو گیا۔ رفتہ رفتہ پلیٹ فارم نمبر ایک اور بیرونی وسیع ہال استقبال کرنے والوں سے مملو ہو گیا۔ پھر پلیٹ فارم نمبر ایک سے دوسری طرف جانے والی سیڑھیاں بھی اسی مجمع سے لبریز ہو گئیں۔ اس ہجوم کو دیکھ کر ریلوے افسران کو مجبوراً تمام پھاٹک کھول دینے پڑے۔ عوام اور خواص جوق در جوق آ رہے تھے۔ بعض اعلا سرکاری افسران نے بھی اپنی کرسیاں خالی کر دی تھیں۔ انھیں معتقد لوگوں میں چیف کورٹ کے بعض جج بھی شامل تھے۔ میل کے آنے تک زعمائے شہر اور معتقد ترین افراد سے

بھی تعارف کرانا محال ہوگیا تھا۔ وہ تشریف لائے تو سب سے پہلے مرحوم راجہ صاحب محمود آباد نے نصف قدے جھک کر سات تسلیمیں کیں اور ہار پہنایا۔ چیف جج سر وزیر حسن، راجہ صاحب محمود آباد اور دوسرے گرامی قدر اور عالی مرتبت حضرات نے بڑی مشکل سے گھیرا ڈال کر ان کو موٹر پر سوار کیا لیکن موٹر کا بڑھنا دشوار تھا اس لیے کہ آدمیوں کا ایک سمندر ہر طرف لہریں مار رہا تھا۔ ہمارا کوئی ارادہ جلوس نکالنے کا نہ تھا مگر یہ جلوس نکل کر رہا۔ موٹر آہستہ آہستہ چلتی رہی اور محترم ترین ہستیاں خاموشی کے ساتھ اِردگرد چلتی رہیں۔ اتنا بڑا مجمع اور ایسا استقبال شہر لکھنؤ میں کبھی کسی کا نہیں ہوا۔ تعداد کے اعتبار سے عظیم الشان مجمع ضرور دیکھا گیا مگر شہر کے چوٹی کے باوقار اور جلیل القدر اصحاب بلا تفریق مذہب و ملت اتنی کثرت سے کبھی نہیں دیکھے گئے۔ وہ مجمع نہ تھا بلکہ محبت کا ایک پرجوش دریا تھا جو سیلاب پر آگیا تھا۔

پرنس موصوف کی روانگی کے بعد میں پلیٹ فارم پر پھر گیا تاکہ ان کے سکریٹری، ملازمین اور سامان کی روانگی کا انتظام کردوں۔ وہاں کوئی قلی نہیں ملا۔ ہم لوگ خود سامان لے کر باہر آئے تو کسی شکرم گاڑی، کسی تانگہ یہاں تک کسی یکہ تک پر کوئی چلانے والا نہیں تھا۔ سارے مسافر پریشان کھڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ سب آدمی جلوس میں چلے گئے۔ بالآخر محمود آباد ہاؤس قیصر باغ فون کرکے گاڑی منگوائی اور سب کو ساتھ لے کر لاٹوش روڈ کی طرف سے جاتے ہوئے دیکھا کہ وہ جلوس ہیوٹ روڈ کی طرف سے آرہا ہے۔ میں نے وہ موٹر مع ان کے ملازمین اور سامان کے ٹیلر پلیس روانہ کردی اور خود جلوس میں شامل ہوگیا۔ یہ مجمع امین آباد پہنچا تو دوکانداروں نے دوکانیں چھوڑ کر جلوس میں شرکت کی۔ نظیر آباد سے قیصر باغ نظر آیا تو ایک کہرام مچ گیا۔ زار و قطار لوگ رو رہے تھے اور ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ راجہ صاحب محمود آباد نے نہایت ہوشمندی کے ساتھ موٹر بڑھوائی اور قیصر باغ میں ان کو اتار کر جلوس ختم کر دیا۔ مگر مجمع قابو میں نہ تھا۔ دوڑتے ہوئے ہزاروں آدمی پہنچ گئے۔ پرنس بالاخانہ پر تھے اور نیچے سے آوازیں بلند ہو رہی تھیں "ہمارا راج ایک مرتبہ اور درشن کرا دو"۔ وہ بالکنی پر آئے اور خالص لکھنؤی زبان، لہجہ اور طرز میں فرمایا: "آپ کو بڑی زحمت ہو رہی ہے، اب آپ صاحبان زیادہ تکلیف نہ اٹھائیں۔" یہ کہہ کر بالاخانہ کمرہ میں واپس چلے گئے۔

پرنس موصوف نے کمرہ میں داخل ہوتے ہی مجھے یاد کیا اور راجہ صاحب نے فرمایا کہ مرزا جعفر حسین کہاں ہیں، ان کو بلوائیے۔" کمرے سے مجھے پکارا گیا اور میں بیتابانہ پہنچا تو دیکھا کہ وہ خود ایک کرسی پر رونق افروز ہیں اور تمام رؤسا و عمائدین شہر فرش زمین پر بیٹھے ہیں۔ یہ شہر لکھنؤ کی وہ تہذیب تھی جس پر آج بھی ہم کو ناز ہے۔ بادشاہ ہو یا شہزادہ اس کے برابر کوئی رئیس یا عمائدین میں کوئی بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ یہ فخر اور سعادت بخشی جاتی تھی جو کسی کو بھی حاصل نہیں تھی۔ برابر بیٹھنا تو درکنار، راجہ صاحب نے ان کی طرف کبھی پیٹھ نہیں کی۔ ان کے دوران قیام میں وہ جب بھی تشریف لائے تو فرش ہی پر بیٹھے اور الٹے پاؤں واپس ہوئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ مرحوم مہاراجہ صاحب بھی کلکتہ جاتے تو پرنس موصوف کی خدمت میں ضرور حاضری دیتے اور بعینہٖ یہی آداب ملحوظ رکھتے تھے۔ اس وقت وہ سب کی نظر میں آخری تاجدار اودھ کے نمائندے تھے۔ میں نے جن الفاظ میں عزت افزائی کی خواستگاری کی تھی وہ ان کو برابر یاد رہے اور ہر ہر موقع پر وہ میری دلجوئی فرماتے رہے۔ چنانچہ میرے پہنچتے ہی انھوں نے ہاتھ پکڑ کے مجھے پہلو والی کرسی پر بٹھا لیا اور فرمایا: "مجھے آپ نے دل کھول کر پریشان کر لیا، اب تو آپ خوش ہو گئے۔ جہاں مجھے ٹھہرانا ہو وہاں پہنچا دیجیے۔" راجہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم سب نے انھیں ٹیلر پلیس کے لیے رخصت کیا۔ جتنے لوگ حاضر تھے زار و قطار رو رہے تھے۔ سب کو مخاطب کرکے فرمایا: "آپ لوگ میری طرف دیکھیے میں کتنا خوش ہوں، آپ کیوں رو رہے ہیں، سلطنت کبھی ایک خاندان میں نہیں رہتی۔ کل ہمارے پاس تھی۔ آج دوسروں کے پاس ہے اور کل پھر کسی اور کے پاس چلی جائے گی۔" انھوں نے یہ فرمایا تو مگر ان کا سرخ و سفید چہرہ زرد تھا۔

ٹیلر پلیس پہنچ کر وہ فوراً آرام کے لیے لیٹ رہے۔ شام کو سبجیکٹس کمیٹی کی میٹنگ تھی، میں ان کو لینے گیا تو پتہ چلا کہ اس وقت سے برابر منھ ڈھانکے آرام فرما رہے ہیں۔ نہ لنچ کھایا نہ شام کی چائے اور نہ غسل کسی ضرورت کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ ملازمین اور سکریٹری بے حد پریشان تھے لیکن سوء ادب مانع تھا، کوئی جگانے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں خود کمرہ میں داخل ہوا اور لحاف کے اوپر سے آہستہ آہستہ

ان کے پیر دبانے لگا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمایا کہ "آپ کیا کر رہے ہیں، اس طرح مجھے کانٹوں پر نہ گھسیٹئے" میری استدعا پر انھوں نے بستر چھوڑا اور اپنے روزمرہ کے ضروریات کی طرف متوجہ ہوئے۔ ججلکس کمیٹی کی صدارت کے لیے ان کو زحمت دینا ان حالات میں مناسب نہ معلوم ہوا۔ اس لیے دوسرے روز علی الصباح حاضر ہونے کی اجازت لے کر میں رخصت ہو لیا۔

پرنس افسرالملوک نے تشریف آوری کے دوسرے اور تیسرے روز کانفرنس کے اجلاس ہائے عام کی پورے شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ صدارت فرمائی تھی۔ رفاہ عام ہال میں اجلاس ہوتا اور دونوں جانب دالانوں اور کھلے ہوئے میدانوں میں شہریوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ پہلے اجلاس کی صدارت کی تحریک کرتے ہوئے مرحوم مولانا سید احمد صاحب، المعروف بہ علامہ ہندی نے فرمایا تھا کہ میرے مورث اعلا بادشاہان اودھ کو تخت نشینی کے موقع پر تاج پہنایا کرتے تھے، اب ہم فقیر ہیں ہمارے پاس کچھ باقی نہیں رہا، یہی ایک کرسیِ صدارت ہے جو ہم آپ کو پیش کرتے ہیں۔ ان کا اشارہ اس رواج کی طرف تھا کہ شاہانِ اودھ کو تخت نشینی کے وقت خاندانِ اجتہاد کے جلیل القدر مجتہد ہی تاج پہناتے تھے۔ علامہ ہندی بھی اسی خاندان کی ایک فرد تھے۔ اس تقریر نے حاضرین کو بہت متاثر کیا تھا۔ پرنس موصوف نے تمام صدارتی فرائض پوری سنجیدگی کے ساتھ انجام دیے اور ان کی موجودگی کے سبب سے اختلافی مسائل میں بھی متانت و تہذیب کا دامن کسی کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔

جناب موصوف کا شہر لکھنؤ میں پانچ روز تک قیام رہا اور یہ پانچوں دن مصروفیت میں گزرے۔ اسی زمانے میں ایک عظیم الشان نمائش سرکاری اہتمام سے ہو رہی تھی۔ پرنس موصوف کو مدعو کیا گیا، سر جے۔ پی سریواستو حکومت وقت کے رکن رکین تھے۔ وہ خود بہ نفس نفیس تشریف لائے اور پورے عزت و احترام سے پرنس کو نمائش دکھانے کے لیے لے گئے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ جو صنعت و حرفت کے ایک کیمپ میں جہاں مجسمے نصب تھے، رونما ہوا۔ بہت نصیحت آموز تھا۔ پرنس کو صنعت و حرفت سے ذوق اور مجسموں سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے لارڈ ولنگٹن کے مجسمہ کو غور سے ملاحظہ کیا اور وہاں کے ذمہ دار افسر سے کچھ گفتگو فرمائی جو صنعت کی باریکیوں سے متعلق تھی۔ وہاں دو نوجوان بھی موجود تھے۔ انھوں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کچھ رائے زنی کر دی۔ پرنس نے ان کی طرف دیکھا اور صرف "ماشاء اللہ" کہہ کر خاموش ہو گئے۔ پرانے لکھنؤ کی تہذیب میں نوجوان بالخصوص اجنبی نوجوانوں کا بزرگوں کی بات کاٹنا بالخصوص بات کاٹ کر اختلاف کرنا ایک گناہ عظیم تھا۔ اس گناہ کی سرزنش میں پرنس نے "ماشاء اللہ" فرمایا۔ یہ کلمہ اپنی جگہ پر طنز، سرزنش اور تہدید سب ہی کچھ تھا مگر دائرۂ تہذیب کے اندر۔ لیکن زمانہ اتنا بدل چکا تھا کہ اس جامعیت کلام کو کوئی سمجھ نہیں سکا۔

شہر لکھنؤ نے ان کے اکرام اور مرتبہ شناسی میں کوئی کمی نہیں کی۔ میونسپل بورڈ نے ایڈریس پیش کیا، انجمن وثیقہ داران نے استقبال کیا، شہزادگان اور خاندان شاہی کے ارکان نے سپاسنامہ حاضر کیا، حسین آباد مبارک کی جانب سے شاہی جلوس نکالا گیا۔ آگے آگے ماہی مراتب اس کے بعد عصا بردار چاندی کے طویل القامت عصا لیے ہوئے، پیچھے حسین آباد کے تینوں متولی اور شاہی ادارات کے تمام اہلکار اور ایک چتر زر کے سایہ میں وہ خود رونق افروز تھے۔ جلوس بچھرگیلری میں ختم ہوا اور ان کو زرنگار کرسی پر صدر محفل کی منزلت حاصل ہوئی۔ رسمی کارروائی عمل میں آئی لیکن ہر موقع پر خلوص و مہر و وفا کے جذبات کارفرما رہے۔ لیکن جذبات راقم الحروف کبھی فراموش نہیں کر سکتا وہ ان کی میرے حال پر ذرہ نوازی تھی کسی مقام پر مجھ کو اپنے سے دور رہنے کی اجازت نہیں دی۔ یہ پاس داری یہ لحاظ اور یہ رکھ رکھاؤ ہمارے شہر لکھنؤ کے رؤسا و عمائدین بالخصوص شاہانِ اودھ کے اعلا کردار اور بلند اخلاق کی ایک گرانقدر عملی مثال تھی۔

ان تقریبوں اور اجتماعی نشستوں کے علاوہ ان کے کچھ ایسے پروگرام بھی رہے جن میں مجھے شرکت کا کبھی موقع نہیں ملا۔ رات کو کھانا نوش کرنے کے بعد مجھ سے بعض محلوں کا پتہ دریافت کر کے صرف اپنے سکریٹری کے ہمراہ موٹر پر دو دو گھنٹے باہر رہتے تھے۔ اتنا پتہ چل سکا کہ وہ ان محلوں میں ٹہل کر لوگوں سے گفتگو کرتے۔ یہ وہ محلے تھے جو شاہی دور میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ دو مرتبہ دوپہر کو ان سے کچھ صاحبان ملنے بھی آئے اور انھوں نے تخلیہ میں ملاقاتیں کیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شرفائے لکھنؤ پر پوری طرح فلاکت آچکی تھی اس لیے اس نتیجہ تک پہنچنا سہل ہے کہ وہ رات کو حالات دریافت فرماتے اور دوسرے دن

لوگوں کی حاجت روائی کرتے تھے۔ ان کے طور طریقے میں جو صورت حال بالکل واضح تھی وہ ان کا رکھ رکھاؤ اور پاس و لحاظ تھا جو خصوصیت کے ساتھ انھوں نے حسب نسب، شرافت و نجابت اور کبر سنی کے ساتھ برتا تھا۔ انھیں آنے والوں میں ایک سید النسب معمر بزرگ تھے جن کو انھوں نے دیر تک بٹھایا اور کرسی سے کھڑے ہو کر رخصت کیا تھا۔ ان غریب شرفا کے محلوں کے علاوہ وہ ہر روز کسی نہ کسی طرح وقت نکال کے خواہ وہ چند منٹ ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ ماسٹر محمد احمد صاحب مرحوم کے یہاں ضرور جاتے تھے۔ ان بزرگ سے میری بھی دوستی تھی اور پرنس موصوف کے اس شہر میں واحد دوست تھے۔ محمد احمد صاحب میونسپلٹی کے وکیل تھے اور بے مثال خوبیوں کے حامل تھے۔ ہر سال سیر و تفریح کے لیے کلکتہ جاتے تھے۔ وہیں کی ملاقات اور پرنس سے بے تکلفانہ دوستی تھی۔ شہر لکھنؤ سے روانگی کے وقت انھوں نے سختی کے ساتھ حکم دے دیا تھا کہ اسٹیشن پر رخصت کرنے کوئی نہ جائے۔ چنانچہ صرف ہم تین آدمیوں نے ان کو رخصت کیا تھا میرے علاوہ ماسٹر محمد احمد مرحوم اور نواب زادہ ہمایوں جاہ تھے جن سے ان کے عزیزدارانہ تعلقات اور خوردی و بزرگی کا رشتہ تھا۔

یادش بخیر اس زمانہ میں ہر سال اور کبھی کبھی دو بار یا اس سے بھی زیادہ کلکتہ جانا ہوتا تھا۔ دل جمعی اور تفریح مشاغل کے لیے وہی شہر میرا مرکز تھا۔ اس کے علاوہ اسی سرزمین پر مولانا آزاد مرحوم سے بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں جن کی ذات گرامی سے ہر شعبہ حیات میں مجھے رشد و ہدایت حاصل کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ۱۹۷۳ء میں یعنی متذکرہ بالا اجلاس کانفرنس کے بعد انتہائی عجلت میں صرف دو روز کے لیے کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا۔ اولاً مولانائے محترم کی خدمت میں حاضری دی اور اس کے فوراً بعد پرنس موصوف کے یہاں ہمہ تن اشتیاق بنا ہوا پہنچا۔ ان دونوں بزرگوں کی کوٹھیاں ایک دوسرے سے بہت قریب تھیں۔ پرنس موصوف اس وقت کہیں تشریف لے جانے کے لیے بالکل تیار تھے مگر مجھے اذن حضوری ملا۔ چند منٹ کی گفتگو کے بعد دوسرے روز شام کو کھانے پر مدعو کیا۔ میں نے معذرت پیش کی اس لیے کہ اسی رات کو مجھے لکھنؤ واپس ہونا تھا۔ مگر میری معذرت قبول نہ ہوئی۔ انھوں نے سر شام ہی حاضر ہونے کا حکم دیا اور یہ وعدہ فرمایا کہ وہ اپنے یہاں سے براہ راست اسٹیشن بھیجنے کا میرے لئے انتظام فرما دیں گے۔ تعمیل ارشاد میرا فریضہ تھا۔ چنانچہ دوسرے روز میں پہنچا تو وہ خود میرا انتظار فرما رہے تھے۔ اس ملاقات میں انھوں نے اپنے قریبی اعزا، بالخصوص اپنے بھتیجوں کے حالات بڑے دکھ بھرے لہجے میں سنائے اور مجھ سے لکھنؤ والوں کے معاملات بالخصوص ہماری تباہی و بربادی کے واقعات سنے اور محزون و مغموم ہو گئے۔ بالآخر کھانے کا وقت آ گیا۔

پرنس کے کھانا کھانے کا کمرہ بہت وسیع تھا اور نہ کوئی خاص سامان آرائش و زیبائش کا تھا، صرف سادگی اور صفائی تھی۔ بہت اونچے اونچے اگالدان شائستہ طرز سے لکڑیوں میں نصب تھے اور ہاتھ دھونے کے لیے سلفچیاں بھی تھیں لیکن پرانے طرز کے دسترخوان اور زمین پر فرش کے بجائے کرسیاں اور میز کا انتظام تھا زیادہ سے زیادہ بارہ کرسیاں تھیں اور اس وقت صرف تین آدمی شریک طعام تھے تیسرے صاحب انھیں کے سکریٹری کیقباد مرزا تھے۔ کمرہ میں داخل ہونے کے قبل ہی پوری میز انواع و اقسام کے کھانوں سے چن دی گئی تھی کئی قسم کا پلاؤ، کئی طرح کے میٹھے چاول، دو یا تین طرح کا قورمہ، چار اقسام کا قیمہ جن میں ایک قیمہ نخود اور دوسرے میں انگور یا سیب شامل تھے۔ کباب متعدد اقسام کے خشک اور شوربے دار تھے۔ پوریاں، پراٹھے اور لکھنؤ طرز کی چند چپاتیاں بھی موجود تھیں۔ جن برتنوں میں کھانا لگایا، جن برتنوں میں ہم نے کھایا وہ سب نفیس چینی کے قیمتی مگر سادہ اور خوش رنگ تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی اندر سے مخصوص چیزوں کا آنا شروع ہوا۔ ایک بڑی قاب میں شیرمالیں اور ایک بڑی پلیٹ میں کباب تھے۔ پرنس نے فرمایا کہ "یہ شیرمالیں اور کباب آپ کے لکھنؤ کے کھانے ہیں۔ والد مرحوم کے ہمراہ جو باورچی آئے تھے ان کی اولاد اب بھی موجود ہے اور انھوں نے مٹیا برج میں دو کانیں کھول لی ہیں۔ یہ چیزیں وہیں سے بکوائی ہیں"۔ حقیقتاً دونوں چیزیں بے حد لذیذ اور نفیس تھیں اور ویسی شیرمالیں اور کباب اس وقت تک ہمارے شہر معدوم ہو چکے تھے۔ اسی اثنا میں دوسرا آدمی ایک ڈش میں مرغ کا قورمہ لایا جس کی دور ہی سے خوشبو فرح بخش تھی۔ رنگ روغن، ذائقہ اور مسحور کر لینے

والی نفاست ہو بہ ہو وہی تھی جو لکھنؤ کے مشہور قورمہ کا طرۂ امتیاز تھا۔ انھیں غذاؤں سے سیری ہو چکی تھی لیکن آداب دسترخوان ملحوظ رکھتے ہوئے ادھر ادھر کی چیزوں سے دو دو لقمے کھانے پڑے۔ بالآخر وہ میٹھی چیزیں لائی گئیں جس کا مثل و نظیر نہیں تھا یعنی اناس کا مزعفر اور بالائی۔ ویسی بالائی ہمارے شہر سے رخصت ہو چکی تھی اور مزعفر ایسا تھا کہ میں اپنے خاندان کا مشہور و معروف مزعفر بھول گیا۔ اس کے بعد چاندی کے خاصدان میں نہایت خوشنما گلوریاں اور ایک چاندی کی ڈبیہ میں خانہ ساز قوام کا تمباکو پیش کیا گیا۔ ہر چیز شاہی تزک و اہتمام سے تیار ہوئی تھی اور پیش کی گئی تھی لہذا تعریف و توصیف عبث ہے۔ کھانے سے فراغت کر کے رخصت چاہی تو انھوں نے سکریٹری کی طرف اشارہ کیا۔ ایک چاندی کی ڈھکی ہوئی کشتی آئی ان میں سے ایک کارچوبی امام ضامن نکال کر میرے داہنے بازو پر انھوں نے خود باندھا جس کے معنی تھے کہ میرے بخیریت گھر پہنچ جانے کے لیے حسب دستور قدیم یہ رسم ادا کی گئی تھی۔ شہر لکھنؤ میں غرباء کے یہاں امام ضامن میں ایک پیسہ اور رؤساء کے یہاں عموماً ایک روپیہ اور ایک پیسہ ہوا کرتا تھا۔ یہ رقم سفر ختم ہونے پر خیرات کر دی جاتی تھی۔ پرنس نے جو امام ضامن باندھا تھا اس پر کارچوبی حروف میں فی امان اللہ لکھا تھا اور اس کے اندر ایک روپیہ اور ایک گنی تھی۔

دوسرے برس یعنی ۱۹۳۸ء میں پھر کلکتہ جانا ہوا تو پرنس موصوف کی خدمت میں با ہزاراں اشتیاق حاضری دی۔ اس مرتبہ میرے بہت پرانے دوست اور عربی اسکول کے ہم درس ڈاکٹر سید اعجاز حسین جعفری مظفر پوری ہمراہ تھے ان کو بھی پرنس موصوف کی خدمت میں شرف باریابی کی بڑی تمنا تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنے سیاسی مسلک میں میرے ہی ہم عقیدہ تھے اور ان کو بات کرنے کا بھی بڑا ملکہ تھا۔ پرنس ان سے بحد اخلاق سے ملے اور دونوں میں اچھی گفتگو ہوئی۔ لیکن سیاسیات کے موضوع پر پرنس کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بالآخر ان دونو کے درمیان ادبیات زیر بحث آئے اور امراء القیس اور متنبی پر تبادلہ خیالات ہونے لگا۔ اس وقت مجھے یہ محسوس ہوا کہ پرنس کی عربی دانی بھی بڑے پایہ کی ہے۔ انگریزی بولنے اور لکھنے میں وہ کامل مہارت رکھتے تھے۔ لیکن فارسی اور عربی ادب میں بھی پوری دستگاہ حاصل تھی۔ تخمیناً دو گھنٹے کے بعد ہم لوگوں نے رخصت چاہی تو انھوں نے دوسرے روز صبح کو ناشتہ پر مدعو کر لیا۔ مجھ سے خصوصیت کے ساتھ یہ فرمایا کہ کل صبح کو میں آپ کو اپنے ایک دوست مسٹر سی۔ اے۔ محمد سے ملاؤں گا۔ یہ صاحب عربی النسل ہیں مگر لکھنؤ کے دسترخوان کے گرویدہ ہیں، میں ان کو کبھی کبھی کچھ کھلا دیا کرتا ہوں۔ یہ کہا اور مسکرائے۔ ہم لوگ رخصت ہوئے۔ دوسرے روز وقت مقررہ پر ہم لوگ پہونچے تو مسٹر محمد وہاں موجود تھے۔ پرنس نے ہمارا ان سے تعارف کرایا۔ یہ بزرگ ایک بڑے تاجر اور صاحب حیثیت اور نقد بزرگ تھے۔ بے حد کم گو تھے۔ اب ناشتہ کا وقت آچکا تھا۔ اس وقت کھانے کی میز پر شیرمال، خمیری روٹی، پسندے کے سیخ کباب اور شب دیگ ہمیں پیش کی گئی۔ یہ شب دیگ طیور کے گوشت میں تیار ہوئی تھی جس میں تیتر اور بٹیر کا گوشت یقیناً تھا۔ اس کے علاوہ تیسرا گوشت کس طائر کا تھا اس کا پتہ ہم لوگ نہیں چلا سکے اور نہ دریافت کرنے کی جسارت ہوئی۔ شیرینی میں امرتیاں اور بالائی تھی۔ امرتیاں اتنی بڑی تھیں کہ پوری پلیٹ کی جسامت ایک ایک امرتی کے برابر تھی۔ دوران طعام میں گوشت کے کھانوں کا تذکرہ آیا۔ تو مسٹر محمد نے ہم دونوں دوستوں کو "لحم ولبن" پر مدعو کر لیا۔ اس غذا کا ہم نے نام بھی نہیں سنا تھا اور اس کے کھانے کا بے حد اشتیاق تھا مگر اسی روز دوپہر کو مظفر پور میں ڈاکٹر جعفری کی اہلیہ کا دفعتاً انتقال ہو گیا۔ خبر ملتے ہی وہ بہار چلے گئے اور یہ دعوت رہ گئی۔

ڈاکٹر جعفری سے میرے گہرے روابط تھے اور برابر خط وکتابت رہتی تھی۔ ان سے سال بھر تک پرنس کی شب دیگ اور مسٹر محمد کی موعود "لحم ولبن" والی دعوت پر مراسلت ہوتی رہی اور یہ طے ہوا کہ نومبر ۱۹۳۹ء میں "لحم ولبن" کھایا جائے گا اور پرنس سے دوبارہ شب دیگ کھلانے کی فرمائش کی جائے گی لیکن یہ سارے منصوبے ناکام ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب بعض الجھنوں میں پھنس کر کلکتہ نہیں جا سکے۔ مجھے ان کی معذوریوں کا علم وہاں پہونچ کر ہوا۔ پرنس کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن ان کو دیکھ کر دل بجھ گیا۔ وہ علیل تھے لیکن اخلاقاً مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ اس مرتبہ میں بھی ان کا موضوع سخن لکھنؤ اور اہالیان

(باقی ص۳۲ پر)

ڈاکٹر نجم الدین نقوی

غزل در مدحِ عشق

ہم نہ کہتے تھے تم سے کہ اے جانِ جاں
رنگ لائیں گی اک دن یہ دلداریاں

اب بہاتے ہو آنسو کہ رسوا ہوے
پہلے سوچا نہ کیوں ؟ ہوں گی رُسوائیاں

عشق آسان بھی ہے اور دشوار بھی
عشق پر تو ! تو جھیلو یہ دشواریاں

سارے عالم میں ہے عشق چھایا ہوا
عشق سے بچ کے نکلیں تو جائیں کہاں

عشق ثابت بھی ہے اور سیّار بھی
عشق جولانگہِ جملہ سیّارگاں

عشق ہی نے عطا کی ہیں سب برکتیں
عشق ہی ہم میں تم میں ہے عنبر فشاں

حاصلِ عشق بس عشق ہی عشق ہے
عشق میں ہے عبث فکرِ سود و زیاں

عشق سے نارِ نمرود گلزار ہو
عشق سے کربلا ہوے باغِ جناں

عشق اول بھی ہے عشق آخر بھی ہے
اور کوئی نہیں فاصلہ درمیاں

عشق مارے بھی ہے اور جلائے بھی ہے
عشق خاکستر اور عشق چنگاریاں

عشق سے ولولے عشق سے زلزلے
عشق سے آبِ حیوان و آتش فشاں

عشق واجب بھی ہے اور ممکن بھی ہے
عشق امکان و واجب کے بھی درمیاں

عشق حاکم بھی ہے اور محکوم بھی
اور طرفہ ستم ہے حکم بھی میاں

عشق بندہ بھی ہے اور خداوند بھی
عشق مومن بھی اور رہبرِ مومناں

عشق کافر بھی ہے اور مسلمان بھی
عشق زندیق و سردارِ زندیقیاں

عشق پیتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے
عشق رندِ بلا نوش و پیرِ مغاں

کوئی معشوق ہے اور نہ عاشق کوئی
عشق ہی ہر طرف ہے جو دیکھو میاں

عشق کے مرتبے اس نے واضح کیے
پھر بھی نقوی سے ملنے میں رسوائیاں

جرمن افسانہ

فرانز کافکا
مترجم: نیر مسعود

ایک قدیم مخطوطہ

ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ملک کے دفاعی نظام میں بہت سی کوتاہیاں روا رکھی گئی ہیں۔ اب تک ہم نے اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا اور اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگے رہتے تھے لیکن حال میں جو باتیں ہونے لگی ہیں انھوں نے ہمیں تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔

شاہی محل کے سامنے والے چوک میں میری جوتے بنانے کی دکان ہے۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ جوں ہی میں دکان کھولتا ہوں مجھے چوک کو آنے والی ہر سڑک کے دہانے پر مسلح سپاہی تعینات نظر آتے ہیں لیکن یہ ہمارے سپاہی نہیں ہیں۔ بظاہر یہ شمال کے صحرانشین ہیں۔ کسی ایسے طریقے سے جو میری سمجھ سے باہر ہے یہ صحرانشین دارالسلطنت کے اندر گھس آئے ہیں حالانکہ دارالسلطنت سرحد سے بہت فاصلے پر ہے۔ کچھ بھی ہو، یہ سپاہی یہاں موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر صبح ان کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

جیسی کہ ان کی سرشت ہے، یہ کھلے آسمان کے نیچے پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ اس لیے کہ انھیں مکانوں سے نفرت ہے۔ یہ صحرائی سپاہی تلواروں پر دھار رکھنے، تیروں کی نوکیں بنانے اور گھڑسواری کی مشقوں میں لگے رہتے ہیں۔ یہ پرامن چوک جس کی صفائی ستھرائی کا ہمیشہ خاص خیال رکھا جاتا تھا اس کو ان صحرائیوں نے اچھا خاصا اصطبل بنا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ کچھ وقفے کے بعد ہم لوگ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی دکانوں سے جھپٹ کر نکلیں اور کم از کم بدترین ہی غلاظتوں کو ہٹا دیں لیکن ایسا بھی کم ہو پاتا ہے کیونکہ ہماری محنت کا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور اس کے علاوہ اس کوشش میں یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ کہیں ہم گھوڑوں کی ٹاپوں تلے نہ آ جائیں یا کوڑوں کی مار سے اپاہج نہ ہو جائیں۔

ان صحرائیوں سے گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ ہماری زبان نہیں جانتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی اپنی زبان بھی برائے نام ہی ہے ان کا آپس میں بولنے کا انداز بہت کچھ کوّوں سے ملتا ہے۔ کوّوں کی تیز کریہہ چیخ کی سی کوئی نہ کوئی آواز برابر ہمارے کانوں میں آتی رہتی ہے۔ ہمارا رہن سہن اور ہمارے رسم و رواج ان کی سمجھ میں نہیں آتے اور ان کو انھیں سمجھنے کی فکر بھی نہیں ہے۔ اسی لیے اگر ہم ان سے اشاروں میں بات کرتے ہیں تو وہ اسے بھی سمجھنے پر تیار نہیں ہوتے۔ آپ ان کے سامنے اشارے کرتے رہیے۔ یہاں تک کہ آپ کے جبڑے اور کلائیوں کی ہڈیاں اتر جائیں، پھر بھی وہ آپ کی بات نہیں سمجھیں گے، کبھی نہیں سمجھیں گے۔ اکثر وہ طرح طرح کے منہ بنانے لگتے ہیں۔ اس وقت ان کی پتلیاں پھر جاتی ہیں اور ان کے ہونٹوں پر جھاگ آ جاتا ہے لیکن اس سے ان کی مراد کچھ نہیں ہوتی۔ دھمکی بھی نہیں۔ وہ ایسا بس اس لیے کرتے ہیں کہ یہی ان کی فطرت ہے۔ ان کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، لے لیتے ہیں آپ اس کو استحصال بالجبر بھی نہیں کہہ سکتے۔ بس وہ کسی چیز پہ ہاتھ رکھ دیتے ہیں اور آپ چپ چاپ وہ چیز ان کے لیے چھوڑ کر الگ ہٹ جاتے ہیں۔

میرے مال سے بھی وہ بہت سی بڑھیا چیزیں لے چکے ہیں لیکن

میں اس کی شکایت بھی نہیں کر سکتا اس لیے کہ میں دیکھتا ہوں کہ مثلاً قصاب ہی بے چارے پر کیا گزرتی ہے۔ جیسے ہی وہ گوشت لیکر آتا ہے وحشی سارے کا سارا گوشت اس سے لپک کر لیتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ان کے گھوڑے بھی خوب گوشت کھاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گھوڑا اور سوار دونوں برابر برابر لیٹے ہیں اور گوشت کا ایک ہی پارچہ، ایک اس سرے سے ایک اُس سرے سے، بھنبھوڑ رہے ہیں قصاب حواس باختہ ہے لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں کہ گوشت لانا بند کر دے۔ ہم لوگ بہرحال اس کی مشکل کو سمجھتے ہیں اور اس کے لیے کام چلانے بھر روپے کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ اگر ان وحشیوں کو گوشت نہ ملے تو نہ جانے وہ کیا سوچیں۔ یوں بھی جب کہ ان کو روزانہ گوشت مل رہا ہے معلوم نہیں وہ کیا سوچتے ہوں۔

ابھی کچھ دن ہوئے قصاب کو خیال آیا کہ اور کچھ نہیں تو جانور کاٹنے ہی کے جھنجھٹ سے چھٹکارا پا لیا جائے۔ لہٰذا ایک صبح وہ ایک زندہ بیل لے آیا لیکن ایسا کرنے کی جرأت وہ پھر نہ کرے گا۔ میں اپنے سارے کپڑوں، کمبلوں، گدّوں میں سر دیے دکان کے اندر فرش پر پورے ایک گھنٹے مسلسل پڑا رہا تھا محض اس لیے کہ مجھے مرتے ہوئے بیل کا ڈکرانا نہ سنائی دے۔ جس پر وحشی ہر طرف سے ٹوٹے پڑ رہے تھے اور اس کا جیتا گوشت دانتوں سے اُدھیڑ اُدھیڑ کر کھا رہے تھے۔ خاموشی ہو جانے کے بہت دیر بعد میں باہر آنے کی ہمت نہ کر سکا۔ وہ سب کے سب تھک کر بیل کے ڈھانچے کے اردگرد پڑے ہوئے تھے جیسے شراب کے مٹکے کے گرد شرابی۔

یہی وہ موقع تھا جب مجھے خیال سا ہوا کہ میں نے حقیقتاً بادشاہ سلامت کو محل کے ایک دریچے میں کھڑے دیکھا ہے۔ عام طور پر وہ محل کے ان باہری حصّوں میں قدم نہیں رکھتے بلکہ اپنا تمام وقت محل کے سب سے اندر والے باغ میں گزارتے ہیں۔ لیکن اس موقعے پر وہ ایک دریچے میں کھڑے ہوئے تھے — یا کم از کم مجھے ایسا ہی لگا۔ اور سر جھکائے دیکھ رہے تھے کہ ان کے محل کے سامنے کیا ہو رہا ہے۔

"آخر ہونا کیا ہے؟" ہم سب خود سے پوچھتے ہیں، "ہم کب تک یہ بوجھ اور اذیّت اٹھا سکتے ہیں۔ شہنشاہ کے محل نے ان وحشیوں کو یہاں کھینچ بلایا ہے لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ان کو واپس کیونکر بھگایا جائے۔ پھاٹک بند پڑا ہے۔ فوجی محافظ جو ہمیشہ سج بن کر باہر نکلا کرتے تھے۔ اب سلاخوں دار کھڑکیوں کے پیچھے رہتے ہیں۔ ملک کی حفاظت ہم کاریگروں اور بیوپاریوں پر چھوڑ دی گئی ہے۔ لیکن یہ کام ہمارے بس کا نہیں ہے، نہ کبھی ہم نے اس کی اہلیت کا دعویٰ کیا ہے۔ کوئی نہ کوئی غلط فہمی ہے۔ اور یہی ہم کو تباہ کرکے رہے گی۔"

★

تمکین الرحمٰن

غزل

دل وہ پیاسا ہے کہ جب جانب دریا دیکھے
وہی تپتا ہوا، جھلسا ہوا صحرا دیکھے

میں تو ہر حال میں ہوں کرب کے عالم کا امیں
جس نے دنیا نہیں دیکھی مرا چہرا دیکھے

اب تری یاد بھی آتی ہے تو یوں آتی ہے
ٹوٹتی نیند میں جیسے کوئی سپنا دیکھے

رنگ کی آنچ، کہ جلتا ہوا خوشبو کا بدن
آنکھ اک پھول کی تصویر میں کیا کیا دیکھے

دھند میں درد کے پیکر کے سوا کیا ہوگا
کیا اٹھا کر کوئی احساس کا پردہ دیکھے

ظہیر غازیپوری

آئینہ دارِ خسرو

یہی علامت عز و وقارِ خسرو ہے
کہ ہر نگارشِ فن شاہکارِ خسرو ہے

غزل بھی نعت بھی، دوہا بھی گیت بھی اب تک
دیارِ ہند میں آئینہ دارِ خسرو ہے

وسیلۂ نگہ و فکر ہے زمانے میں
ادب کدے میں جو نقش و نگارِ خسرو ہے

صدا و صوت کا کوچہ رباب چنگ کا گھر
طلسم زار، بہ شوق و شعارِ خسرو ہے

خلیج صدیوں کی حائل ہے درمیاں لیکن مگر
دلوں میں اب بھی وہی افتخارِ خسرو ہے

ہر ایک لفظ میں پیغامِ حق ہے پوشیدہ
نیاز مندِ خرد، کاروبارِ خسرو ہے

جہاں چھلک پڑا عرفان و آگہی کا جام
وہ بتکدہ حرمِ اعتبارِ خسرو ہے

وطن کے عشق سے عرفانِ ذات تک دیکھا
بہت بسیط حدِ اختیارِ خسرو ہے

خدا رسیدہ بزرگوں کی بات جب آئے
تو فرد فرد یہاں اشک بارِ خسرو ہے

تھی دل کشی خاکِ زمیں سے کچھ ایسی شیفتگی
کہ ذرہ ذرہ مریدِ شعارِ خسرو ہے

زبان و فکر و نظریات ہیں الگ تو کیا
ہر ایک شخص یہاں جاں نثارِ خسرو ہے

نظامِ جبر سے جمہوریت کی قدروں تک
ادا شناسِ زمانہ، دیارِ خسرو ہے

ہزار قتل و ادب کی بڑھی ہو ناقدری
جو اہلِ فکر و نظر ہے وہ یارِ خسرو ہے

اجڑ اجڑ کے بسی ہے جو بارہا دلی
وہیں امانتِ مٹی غبارِ خسرو ہے

گناہ گارِ ادب لوگ جس کو کہتے ہیں
وہی ظہیرِ حزیں رازدارِ خسرو ہے

غزل

ساغر مہدی

کچھ ان کی حقیقت کا انھیں بھی تو پتا دیں
آئینہ گروں کو چلو آئینہ دکھا دیں

ہونٹوں پہ وہی نغمۂ جاں سوز سجا دیں
پھر تیز ہواؤں میں کوئی شمع جلا دیں

الفاظ کے پتھر ہیں نہ معنی کی چٹانیں
احساس کا قصہ ہے سنو تم تو سنا دیں

ٹکرا کے ہر آواز ہوئی جاتی ہے زخمی
کس آس پہ ہم گنبدِ بے در میں صدا دیں

آوارہ نصیبوں کا نہ مسکن نہ ٹھکانہ
آ، اے شبِ ہجراں تجھے باہوں میں سلا دیں

بچھڑے ہیں جو تجھ سے تو یہ معمول ہوا اپنا
بیٹھے ہوئے دیکھیں تو پرندوں کو اڑا دیں

ہم شکلِ گل و لالہ ابھرتے رہے ساغرؔ
چاہا تو یہ دنیا نے کہ مٹی میں ملا دیں

لکھنؤ میں ٹیلی ویژن

ڈاکٹر مرزا رفیع الدین احمد

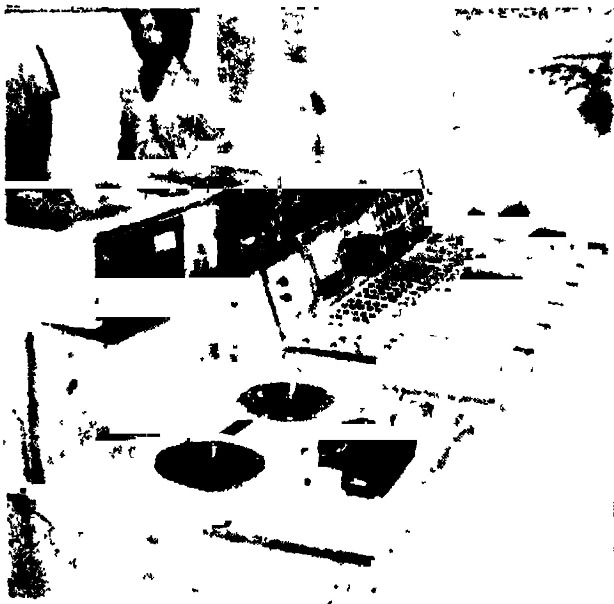


ٹرانسمیٹر ٹاور

دہلی، امرتسر، بمبئی، پونا اور سری نگر میں تو ٹیلی ویژن کافی عرصے سے آچکا تھا، حال ہی میں نا دیاڈ، مدراس اور کلکتے میں بھی ٹیلی ویژن آگیا ہے اور اب تو اکتوبر کے ماہ سے ہی لکھنؤ میں بھی ٹیلی ویژن کی شروعات ہوئی ہے۔ اس طرح ہندستان میں اب سائٹ پروگرام کے علاوہ نو جگہوں پر ٹیلی ویژن چل رہا ہے۔ یہ ہمارے ملک کی ترقی کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

ٹیلی ویژن عوامی ترسیل کا ایک نہایت ہی عمدہ ذریعہ ہے۔ خاص طور سے ایک ایسے ملک کے لیے یہ بڑی اہمیت رکھتا ہے جہاں تعلیم یافتہ اشخاص کا فی صد کم ہو۔ ٹیلی ویژن تعلیم کا بھی ایک اچھا ذریعہ ہے۔ لکھنؤ کے ٹیلی ویژن پروگرام کا آغاز ہو چکا ہے۔ پہلے تو کچھ پرانی ہندی فلمیں دکھائی گئیں۔ پھر ۶ اکتوبر کو انجنا بنرجی کا ایک گانا ٹیلی ویژن پر سنایا گیا جس میں آل انڈیا ریڈیو کے موسیقار شامل تھے اس گانے کا ڈائرکشن مسٹر آر سی۔ پوری اسسٹنٹ ڈائرکٹر ٹیلی ویژن نے کیا تھا۔ یہ پروگرام کافی کامیاب رہا۔ ٹیلی ویژن پروڈیوسروں کی ٹیم شہر کے مخصوص مناظر کی تصویریں لے رہی ہے تاکہ انھیں ٹیلی ویژن پر دکھایا جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ فیچر فلمیں بھی بنائی جا رہی ہیں۔ علاوہ ازیں ضلع کے مختلف پروجکٹس کو بھی فلمایا جا رہا ہے اور گاؤں پر بھی فیچر فلمیں بن رہی ہیں جو ٹیلی ویژن پر دکھائی جائیں گی۔

فی الحال شام کو دو گھنٹے کا پروگرام ہوا کرے گا۔ لیکن دو ماہ بعد صبح کے وقت اسکول کے بچوں کے لیے بھی پروگرام شروع ہو جائے گا۔ شام کے پروگرام مختلف قسم کے ہوں گے۔ دیہات کے لیے پروگرام ہوں گے۔ اس کے علاوہ تعلیم بالغان کے پروگرام اور سائنس کی عوامی معلومات کے پروگرام ہوا کریں گے ڈرامے اور گانے اور رقص و سرود کے پروگرام بھی ہوں گے۔ شہر کے مخصوص تو اریخی مقامات دکھائے جائیں گے اور نوجوانوں کے لیے بھی پروگرام کا بندوبست ہوگا۔ غرضیکہ



کنٹرول روم



ٹی وی ژن ٹیپ ریکارڈر

ٹیلی ویژن کے لکھنؤ آجانے سے یہاں کی سماجی زندگی میں کافی رنگینی اور زندگی آئے گی اور ساتھ ہی تعلیم کو بھی فروغ ہوگا۔ اس وقت تقریباً ایک سو تیس اشخاص ٹیلی ویژن میں کام کر رہے ہیں۔ ان میں پروڈیوسر، پروگرام اگزیکیٹوز، پروڈکشن اسسٹنٹ، ڈیزائنر، فلم ایڈیٹر، صدا بندی کے ماہر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر شامل ہیں۔ امید ہے کہ اس سنٹر میں تقریباً پانچ سو اشخاص کام پر رکھے جائیں گے۔ فی الحال ٹیلی ویژن کے مینار کی بلندی سو فٹ ہے اور یہ اپنا کام بخوبی انجام دے رہا ہے۔ اس کا دائرہ کار ابھی چالیس کلومیٹر کے ریڈیس (دائرے) میں ہے۔ دھیرے دھیرے یہ دائرہ بڑھایا جائے گا۔ اس کے انجینئر انچارج کا کہنا ہے کہ کانپور کے ٹیلی ویژن سٹ پر لکھنؤ کے پروگرام صاف دیکھے جاسکیں گے اور اس کے لیے بوسٹرس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

ٹیلی ویژن کے شہر میں آجانے سے شہر کی ثقافتی زندگی میں مزید دلچسپی پیدا ہوجائے گی اور آرٹ کی بھی ترقی ہوگی۔

ٹیلی ویژن سے متعلق کچھ ہدایات

۱۔ اسکرین کا سائز۔ اسکرین کا سائز آڑا ناپا جاتا ہے اور تیس سنٹی میٹر سے لے کر اکسٹھ سنٹی میٹر تک ہوتا ہے۔ جس کمرے میں ٹیلی ویژن رکھنا ہو اسی کے مطابق ٹیلی ویژن اسکرین کا سائز ہونا چاہیے۔

مندرجہ ذیل نقشہ دھیان میں رکھنا چاہیے۔

اسکرین کا سائز انچ میں	اونچائی انچ میں	چوڑائی انچ میں	کم از کم فاصلہ فٹ میں جہاں سے دیکھا جائے	زیادہ سے زیادہ فاصلہ فٹ میں جہاں سے دیکھا جائے
۱۲	۷	۱۰	۶	۱۵
۱۴	۸	۱۱	۷	۱۷
۲۰	۱۲	۱۶	۱۰	۲۵
۲۴	۱۴	۱۹	۱۲	۳۰

۲۔ لکھنؤ میں چینل ۴ پر پروگرام نشر ہوں گے۔ یہی چینل بمبئی دہلی وغیرہ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پونا امرتسر، سری نگر وغیرہ دیگر چینل استعمال کرتے ہیں۔ اگر کسی کو ٹیلی ویژن سٹ لکھنؤ سے باہر خریدنا ہو تو دیکھ لینا چاہیئے کہ وہ چینل ۴ کا ہو۔ ویسے چینل بدلا بھی جاسکتا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی ایسی جگہ تبادلہ ہو کر جائے جہاں چینل ۴ کی جگہ کوئی اور چینل استعمال ہوتا ہے تو چینل کی تبدیلی بآسانی اور کم خرچ میں ہوجاتی ہے۔

۳۔ ٹیلی ویژن سٹ کے خریدنے سے قبل یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ پورے اسکرین پر افقی متوازی لائنیں متوازی ہونی چاہئیں۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو تصویریں صاف نہ آئیں گی۔

۴۔ ٹیلی ویژن کے لیے بھی وولٹیج ریگولیٹر لگانا ضروری ہے تاکہ اگر بجلی کا وولٹیج کم ہو تو اسے پورا کرسکے۔ جیسا ریگولیٹر ریفریجریٹر میں لگتا ہے ویسا ہی اس کے لیے بھی کام دے سکتا ہے۔

۵۔ اگر ٹیلی ویژن سٹ ٹیلی ویژن اسٹیشن سے تین کلومیٹر کے اندر ہے تو ایریل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے معمولی کمرے کے اندر کا ایریل یا تار کا ایک ٹکڑا کافی ہوگا۔ ہاں اگر فاصلہ زیادہ ہے تو باہر کے ایریل کی ضرورت پڑے گی۔ باہر کے ایریل کا رُخ ٹرانسمیٹر کی طرف ہونا چاہیئے۔

۶۔ ٹیلی ویژن سٹ پر استعمال کے بعد غلاف چڑھا دینا چاہیے اگر اسکرین پر گرد دکھائی پڑے تو اسے کپڑے سے صاف کرنے کے بجائے محض پھونک کر صاف کرنا چاہیئے ورنہ خراش پڑ کر اسکرین خراب ہوجانے کا ڈر ہے۔ [illegible] والے ٹیلی ویژن سٹ بھی ملتے ہیں۔

۷۔ ٹیلی ویژن سٹ میں روشنی کو کنٹرول کرنے کا سوئچ ہوتا ہے۔ سٹ کو کم از کم ۶ فٹ کے فاصلے پر ہونا چاہیئے اور اس کی روشنی کو اپنی نظر کے حساب سے کنٹرول کرنا چاہیئے۔

۸۔ جب ٹیلی ویژن سٹ پر پروگرام آرہے ہوں تو اس کے پیچھے کا ڈھکن نہیں کھولنا چاہیے کیونکہ سٹ کا تعلق مینس سے ہوتا ہے سٹ کا سوئچ بند کردینے کے بعد بھی کبھی کبھی پندرہ منٹ تک ہائی وولٹیج کپیسیٹر میں کرنٹ رہتا ہے۔ اگر اسے چھوا جائے تو سخت جھٹکا لگے گا۔ اس سے آدمی جل بھی سکتا ہے۔ لہٰذا احتیاط ضروری ہے۔

۹۔ ٹیلی ویژن کا اینٹینا ٹرانسمیٹر کی طرف ۳۶۰ ڈگری پر لگانا چاہیئے۔ اینٹینا کے اور ٹرانسمیٹر کے بیچ کوئی درخت یا مکان وغیرہ نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ صاف تصویر نہیں آئے گی۔ حالانکہ انڈور انٹینا بھی ہوتے ہیں لیکن ان میں لوگوں کے کمرے میں چلنے پھرنے سے یا لوہے کے دروازے بند ہونے یا کھلنے سے تصویر میں خلل پڑتا ہے۔

۱۰۔ کبھی کبھی جب فضا میں نمی زیادہ ہوتی ہے تو اسکرین پر سیلن سی آجاتی ہے۔ اس کی وجہ سے اندرونی روغن میں چنگاری پیدا ہوتی ہے اور سٹ میں گھڑگھڑاہٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ اس سیلن کو دور کرنے کے لیے اسکرین کو کسی چیز سے ملنا نہیں چاہیئے بلکہ پھونک کر ہی صاف کرنا چاہیئے۔ اسکرین کو ٹھوکر یا چوٹ سے محفوظ رکھنا چاہیئے کیونکہ اس میں بہت زیادہ خلا ہوتا ہے۔ اور وہ چوٹ لگنے سے پھٹ سکتا ہے۔ اس خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے بچوں کو اسکرین سے دور رکھنا چاہیئے۔

ٹیلی ویژن ابھی اتنا سستا نہیں ہے کہ عوام اسے خرید سکیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کچھ کمیونٹی سٹ مختلف عوامی جگہوں پر لگائے جائیں جہاں وہ لوگ بھی اسے دیکھ سکیں جو اسے خرید نہیں سکتے۔ پتہ چلا ہے کہ دہلی اور بمبئی کی طرح لکھنؤ میں بھی کچھ کمیونٹی سٹ عوام کے لیے لگائے جائیں گے۔ علاوہ ازیں تعلیمی اداروں کو چاہیئے کہ وہ طلبا کے لیے اپنے اداروں میں ٹیلی ویژن سٹ لگائیں تاکہ جب اسکولوں کے لیے صبح کے پروگرام کیے جائیں تو بچے ان سے مستفید ہوسکیں۔ بڑے بڑے اسکول اور کالج بآسانی ٹیلی ویژن سٹ لگا سکتے ہیں اس سے تعلیمی پروگراموں کو بڑھاوا ملے گا اور ایک ہی استاد ایک ہی وقت میں ہزاروں بچوں کو مخاطب کرسکے گا۔ ٹیلی ویژن کے لکھنؤ میں آجانے سے لکھنؤ کی سماجی اور ثقافتی زندگی اور بھی دلچسپ ہوجائے گی۔

پیام سہالوی

اعلانِ مسرت

اے گلِ باغ جواہر اے وطن کی تاجدار
ہند کے گلشن میں پھر آئی ہے اک تازہ بہار
تا ابد قائم رہے تیرا بھرم تیرا وقار
مال و زر کیا چیز ہے یہ جان بھی تجھ پر نثار
آج دنیا نے خبر ایں تیرے اعلان کے
اب یقیناً دن سنور جائیں گے ہندستان کے

ہو مبارک یہ قدم اے ملکۂ انسانیت
ہند کا ہر بینک اب ہے ایک قومی ملکیت
اب یہاں کچھ بھی نہیں اہمگروں کی اہمیت
آرہے ہیں ہر گوشے گوشے سے پیامِ تہنیت
مل نہیں سکتا ہے تیرے نیک ارادوں کا جواب
کر دیے ہیں تو نے غداروں کے چہرے بے نقاب

آب پاشی کے لیے ہیں چار سو نہریں رواں
ہر طرح کے کارخانے کھل چکے ہیں اب یہاں
اب نہیں پہلا سا وہ بچھڑا ہوا ہندوستان
اب بہت آگے نکل آیا ہے اپنا کارواں
ہر قدم تیرا ہے گویا اک حقیقت کا پیام
خدمتِ ملک و وطن میں تو لگی ہے صبح و شام

اے پرستارِ وطن اے رونق ہندوستاں
آج دنیا کے لبوں پر ہے تری ہی داستاں
جو تھے مردہ دل انھیں بخشی حیاتِ جاوداں
ساتھ تیرے کیوں نہ ہو اب ہند کا ہر نوجواں
تیرے کردار و عمل کا سب کے دل پر راج ہے
تیرے سر پہ اصل میں انسانیت کا تاج ہے

آج آئینہ ہے سب پر تیرا کردارِ حسیں
کم سے کم ہندوستاں میں تو ترا ثانی نہیں
جھک گئی آخر ترے قدموں پہ ظلم کی آخر جبیں
مسکرا اٹھی خوشی سے ہند کی ساری زمیں
تو وہ دیوی ہے کہ جو سب اندر لکھا دیتی
ملک نے پایا ہے تجھ کو رہنما کے روپ میں

مظفر النساء ناز

غزل

عمر گزری تھی ہماری کبھی گلستانوں میں
خود بھی شامل ہوئے ہم چاک گریبانوں میں

مجھ کو ڈر ہے وہ کہیں میرا گلستاں تو نہیں
جس کو تم ڈھونڈتے پھرتے ہو بیابانوں میں

وقت کی طرح سے اپنوں سے گریزاں ہے حیات
اس قدر پیار ملا ہم کو بھی بیگانوں میں

دوستو! رات کی زلفوں سے نکل کر دیکھو
کتنے دل جلتے ہیں خاموش شبستانوں میں

صرف اشکوں کی نمی ہی نہیں ان میں شامل
دل کے ٹکڑے بھی ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں میں

نازؔ تو دوست کے بہکے ہوئے لہجے پہ نہ جا
ہوش کی بات کہاں ملتی ہے دیوانوں میں

ڈاکٹر ثمینہ شوکت

رابندر ناتھ ٹیگور

رابندر ناتھ ٹیگور ۷ مئی ۱۸۶۱ء کو کلکتہ کے ایک مشہور ٹھاکر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مہارشی دیبندر ناتھ ٹیگور اپنے زمانے کے روشن خیال عالم اور بہت بڑے مفکر سمجھے جاتے تھے۔ ان کا خاندان برہمنوں کا خاندان تھا لیکن یہ لوگ "پیرالی" کہلاتے تھے۔ پیرالی دراصل بنگال کے ان روشن خیال برہمنوں کا لقب تھا جو اسلامی نظریہ الٰہیت اور وحدت الوجود کے قائل اور بت پرستی اور اوہام پرستی کے منکر تھے۔ برھمو سماج کے بانی اور مذہبی اصلاح اور اوہام شکنی کے علم بردار راجہ رام موہن رائے ٹیگور کے جدامجد دوارکا ناتھ کے گہرے دوست اور رفیق کار رہے تھے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد جب ہندستانی زندگی نے اپنے پورے ڈھانچے کے ساتھ کروٹ بدلی تو جن لوگوں نے نئے تصورات اور نئی تحریکات کو کھلے ذہن کے ساتھ لبیک کہا اُن میں ٹیگور کے خاندان کو اولین اہمیت حاصل تھی۔ مشرقی تہذیب و تمدن اور علم و فن کی صالح اقدار ان کی گھٹی میں پڑی تھیں۔ مشرق اور مغرب کے اسی بہترین امتزاج نے اس گھرانے کو ایک خصوصیت بخشی تھی۔ رابندر ناتھ نے جس زمانے میں آنکھ کھولی ان کا گھریلو ماحول علم و ادب شعر و سخن، فلسفہ اور مذہب کے رنگین ترانوں سے گونج رہا تھا مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی معاملات میں اس گھرانے کے لوگ روایتی اعتقادات سے پاک و صاف ایک آزاد رائے اور صاف ذہن رکھتے تھے۔ اپنی تصانیف "میری یادیں" اور "میرا لڑکپن" میں رابندر ناتھ ٹیگور نے گھر کے اس ادبی اور تہذیبی ماحول کا ذکر خاص احساس فخر کے ساتھ کیا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور دیبندر ناتھ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ بڑے بھائیوں کو اسکول جاتے دیکھ کر انھوں نے بھی اسکول جانے کے لیے ضد شروع کر دی۔ کلکتہ کے مشہور اسکول اورینٹل سیمنری میں ان کا داخلہ کرایا گیا۔ جو استاد گھر پر انھیں پڑھانے کے لیے مامور تھے وہ رابندر ناتھ کی ضد دیکھ کر کہنے لگے "آج تم مدرسہ جانے کے لیے چلّا رہے ہو ایک دن ایسا بھی آئے گا جب تم اسی اسکول کو چھوڑنے کے لیے اس سے زیادہ شور مچاؤ گے۔" ٹیگور لکھتے ہیں "اس سے زیادہ صحیح پیشین گوئی میں نے عمر بھر نہیں سنی"۔ اورینٹل سیمنری کا نامانوس ماحول تدریس و تادیب کی بے جا سختیاں تھوڑے ہی دنوں میں ننھے ٹیگور کی آزادہ روی کے حق میں عذاب جان ہوگئیں۔ استاد کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اورینٹل سیمنری سے نکال کر مختلف اسکولوں میں داخل کرایا گیا۔ کہیں بھی طبیعت نہ جمی، حصول تعلیم کی طرف سے بے توجہی اور بے دلی بڑھتی ہی گئی۔ رابندر ناتھ کی شخصیت دراصل تعلیم سے نہیں، تدریس کے اس طریق کار کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی جس میں شفقت اور محبت کی بجائے بے جا سختیاں اور بے جا قید و بند کی اہمیت تھی۔

ٹیگور کی عمر ابھی تیرہ ۱۳ برس کی تھی کہ ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ رابندر ناتھ تنہا دریچہ میں بیٹھے باہر کی دنیا کا نظارہ کرتے۔ قدرت انھیں ماں کی طرح مہربان اور قلبی دوست کی طرح رفیق معلوم ہوتی۔ ٹیگور لکھتے ہیں ــــــ "آہ میں خوشی سے دیوانہ ہو جاتا تھا جب دیکھتا کہ آسمان پر بادل ایک کے بعد ایک گزرتے جاتے ہیں۔ بچپن کے

اس ابتدائی دور میں میں محسوس کرتا تھا کہ میں ایک گہرے اور جانی دوست کی رفاقت میں ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کو کس نام سے پکاروں۔"

مزاج کی افتاد میں یہ فطرت پرست بچہ بنیادی اعتبار سے ایک تصویر ساز و نغمہ کار شاعر بننے والا تھا۔ بڑے بھائی جتیندر ناتھ نے ایک دن ٹیگور سے کہا "رابی تم شعر کیوں نہیں کہتے"، رابندر ناتھ حیران کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جتیندر ناتھ نے ہمت دلائی ٹیگور نے کنول پر نظم لکھی۔ نظم پڑھ کر بڑے بھائی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ رابندر ناتھ کی شخصیت کا یہ پہلو بھی منکشف ہو گیا۔ حوصلہ افزائی معصوم ٹیگور کے سمند ناز پر تازیانہ بنی۔ اب وہ ہر تہوار پر نظمیں اور مناجاتیں لکھنے لگے۔ ان کی مناجات کا ایک شعر سن کر ان کے والد مہارشی دیبندر ناتھ متوالے ہو اٹھے بیٹے کو گلے سے لگایا اور کہا "اس ملک کا بادشاہ اس شاعر کی زبان اور ادب کو سمجھتا تو ضرور انعام دیتا۔ چونکہ ایسا نہیں ہے اس لیے یہ خدمت میں انجام دوں گا۔" ایک چیک انھیں عطا کیا۔ مشفق باپ کا یہ عطیہ ناقابل فراموش یاد بن کر زندہ رہی بعد میں جب انھیں "گیتانجلی" پر نوبل پرائز ملا یہ عطیہ اس سے کہیں زیادہ گراں بہا تھا۔ پھر جب مہارشی ہمالہ یاترا کے لیے چلنے لگے تو ٹیگور کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس سفر میں ٹیگور نے مہارشی سے علم ہیئت و نجوم کی تحصیل کی چاندنی راتوں میں جب ہمالہ کی برف پوش چوٹیاں جگمگاتی ہوتیں، مہارشی ٹیگور کو گانے کا حکم دیتے۔ ٹیگور کا ماحول اور ان کی افتاد طبع موسیقی کے عین مناسب تھی۔ ٹیگور گانے دونوں سنگیت کے متوالے معرفت کے گیتوں میں ڈوب جاتے اور پہروں ڈوبے رہتے موسیقی ٹیگور کی شخصیت کا ایک منفرد پہلو تھا۔ بعد میں مغربی اور مشرقی دھنوں کو ملا کر ایک نیا سنگیت بھی انھوں نے ایجاد کیا جو رابندر سنگیت کہلایا۔ موسیقی بھی ان کے ہاں انسان اور انسانیت سے محبت اور بلند مقاصد کے حصول کے ذریعہ تھا۔

یاترا سے واپسی کے بعد سینٹ زیویر اسکول میں داخل کرانے گئے۔ اس زمانے میں میکبتھ (Macbeth) ڈرامہ کا بنگالی میں ترجمہ کیا لیکن پڑھائی میں دل کسی طرح لگتا نہ تھا۔ ۱۸۷۷ء میں انگلستان بھیجے گئے۔ مغرب کی پُرفریب زرپرستی، عیش پرستی، مذہب و ملت کی تفریق، جغرافیائی حدبندیاں، اور نسلی تعصبات سے متنفر، دل لے کر ایک سال بعد بغیر کوئی ڈگری حاصل کیے ہندستان واپس آگئے۔ جس سے باپ اور خاندان کے تمام افراد ناراض ہو گئے۔ مہارشی نے سزا دینے کی غرض سے انھیں خاندانی جاگیر کے انتظام کے لیے گاؤں بھیج دیا۔ وہاں ٹیگور کو غریب کاشت کاروں کی دکھی زندگیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ٹیگور جیسے پیدائشی فنکار کے لیے یہ سزا بھی جزا بن گئی۔ یہاں پہونچ کر ٹیگور نے بہت سے ڈرامے لکھے "سندھیا سنگیتے"، "پربھاتے سنگیتے" کے نام سے نظموں کے مجموعے مرتب کیے جس سے ان کی ادبی شہرت مسلم ہو گئی گاؤں سے واپسی کے بعد دسمبر ۱۸۸۳ء میں مرنیلنی دیوی کے ساتھ ان کی شادی ہو گئی کئی لڑکے اور کئی لڑکیاں پیدا ہوئیں جب بچوں کی تعلیم کا مرحلہ درپیش ہوا تو اپنی تعلیم کے تلخ تجربوں سے انھیں بچانے کی فکر ہوئی۔ تعلیم کے میدان میں انھوں نے ایک نیا تجربہ کیا۔ مہارشی کی اجازت سے شانتی نکیتن میں ایک برہم چاری آسرم قائم کیا جو بعد کو "وشوابھارتی" یونی ورسٹی بن گیا۔ ٹیگور ہندستان میں مروجہ انگریزی طرز کے نصاب تعلیم کے خلاف تھے وہ تعلیم اور تعلیمی سرگرمیوں کو ہندستان میں روحانی بیداری کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ قدیم ہندستان جہاں نالندہ یونی ورسٹی نے علم و دانش کے چراغ روشن کیے اور عظیم انسان پیدا کیے تھے ٹیگور اسی کا تجربہ کرنا چاہتے تھے۔ شانتی نکیتن کے قیام اور پھر وشوابھارتی کی تشکیل کے سلسلے میں مالی اور اخلاقی تعاون اور چندے کی فراہمی کے لیے انھوں نے ہندستان کے علاوہ مشرق اور مغرب کے مختلف ممالک کی سیاحت کی۔ حیدرآباد کے نظام، بڑودہ کے گیکواڑ، چین، ایران، یورپ اور امریکہ نے مالی اعانت کی۔ گاندھی جی کے ایما پر قرض کی ادائیگی کے لیے ایک گمنام شخص نے ۶۰ ہزار کا گراں قدر عطیہ دیا ٹرانسوال سے واپسی پر گاندھی جی نے پہلی بار ٹیگور سے ان کے

تعلیمی ادارے شانتی نکیتن میں ملاقات کی۔ گرودیو ٹیگور نے انھیں مہاتما کا خطاب عطا کیا اس سے دو سال پہلے سنہ ۱۹۱۲ء میں گیتانجلی کی تصنیف پر سویڈن کی نوبل پرائز اکیڈیمی نے انھیں نوبل پرائز عطا کیا اور برطانوی حکومت نے 'سر' کا خطاب دیا۔

گاندھی جی کے اثر سے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں عظیم انقلابات رونما ہو رہے تھے ٹیگور شانتی نکیتن کو سیاست کے گرد آلود بگولوں سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ تاہم مغربی قومیت اور ہندوستان پر انگریزی سامراج کے تسلط کے زبردست مخالف تھے۔ امرت سر میں جلیاں والا باغ میں جنرل ڈائر نے بے گناہ عوام کو جب گولیوں کا نشانہ بنایا تو انسانیت کی یہ پامالی ٹیگور سے دیکھی نہ گئی۔ انھوں نے احتجاج کرتے ہوئے وائسرائے ہند کو ایک نہایت سخت خط لکھا اور "سر" کا خطاب واپس کر دیا۔ برطانوی حکومت کے لیے ایک ہندوستانی کا ایسا رویہ حد درجہ توہین کا باعث تھا۔

ٹیگور کو قدرتی مناظر اور انسان سے والہانہ محبت تھی۔ ان کی شاعری، فن کاری، موسیقی اور مصوری میں انسان اور اس کے پاکیزہ جذبوں کی عکاسی ملتی ہے۔ اپنے افکار اور اعمال میں وہ پورے رشی تھے۔ انسانیت ان کی منزل اوّلیں اور الٰہیت منزل آخر تھی۔ انسانیت کے خون خرابہ، تقسیم و تفریق اور تعصب، جنگ جوئی اور خوں ریزی سے سخت نفرت تھی۔ انسان اور اس کے ثقافتی ورثے سے محبت ہی ان کی زندگی تھی۔ لیکن چونکہ اسلام اخوت اور مساوات اور بھائی چارگی کا پیغام لے کے آیا تھا۔ اسی لیے ٹیگور نے برادران اسلام سے خطاب کر کے کہا تھا:

"اے برادران اسلام میں آپ کو اللہ کے ہر مقدس نام کی قسم دیتا ہوں، آپ کے عظیم الشان دین کی قسم دیتا ہوں کہ اٹھیے اور انسانیت اور اخوت کو عالمگیر کر دیجیے۔"

ٹیگور کی یہی انسان دوستی اور بنی نوع انسان سے محبت انھیں اپنے دور کا سب سے بڑا امن کا پجاری بناتی ہے۔ نغموں کی زبان ہو یا شعر کی داستان، افسانوں کا فسوں ہو یا ان کی مصوری کا جادو، سب امن کا پیغام دیتے ہیں۔ سویڈن یونیورسٹی میں آرک بشپ نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا تھا:

"ادب کے نوبل پرائز کا مستحق وہی شخص ہو سکتا ہے جو بیک وقت فن کار بھی ہو اور پیغامبر بھی اور رابندرناتھ ٹیگور سے پہلے آج تک اس بات کو کسی نے پورا نہیں کیا۔"

۶۰ برس کی عمر میں ٹیگور نے مصوری سیکھی نیچر سے ان کا والہانہ عشق اور ان کے درد مند دل نے انھیں ایک کامیاب مصور بنا دیا۔ پیرس میں ان کی پینٹنگس (PAINTINGS) کی نمائش دیکھ کر فرانس کے مشہور مصور نے کہا تھا "ٹیگور آج کی دنیا کا بہت بڑا مصور ہے۔"

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کے فرزند مصوری سیکھنے کے لیے شانتی نکیتن آئے تو ٹیگور نے ایک روز انھیں دیکھ کر کہا تھا:

"خان ذرا دیکھوں تمہارا ہاتھ۔"

بہت دیر تک ہاتھوں کی لکیریں دیکھتے رہے پھر کہنے لگے:

"یہ ہاتھ برش پکڑنے کے لیے تو نہیں بنے ہیں۔"

خان صاحب زادے نے کہا: "جناب ایسی تصویر بناؤں گا جسے دیکھ کر ہر پٹھان بچہ بندوق سنبھال لے گا۔"

برجستہ جواب سن کر ٹیگور نے نوجوان کو سینے سے لگا لیا

"فن عبادت ہے اگر روح کا آئینہ ہے"

★

سالک رحمانی

غزل

جس سے دل و نگاہ میں تابندگی رہی
شائستۂ حیات وہی آگہی رہی

شاید نیا ستم کوئی ایجاد ہو گیا
ہونٹوں پہ ان کے آج ہنسی کھیلتی رہی

ہم نے ہزاروں زخم بھی کھائے تو ہنس دیے
لیکن وہ ایک بات جو دل میں چھپی رہی

کتنے چراغ دیر و حرم میں جلا دیے
اک شمع آرزو جو بجھی تھی بجھی رہی

کیا کیا تمھارے نام سے دشنام مل گئے
پھر بھی تمھارے نام سے آسودگی رہی

اٹھی وہ اک نگاہ کہ افسوں کہیں جسے
پھر ساری کائنات پہ اک بیخودی رہی

کیا بات تھی کہ رات تھا دل پر غبار سا
کہنے کو یوں تو چاروں طرف چاندنی رہی

تابِ جمالِ حسن کوئی بھی نہ لا سکا
حائل نشاطِ وصل میں یہ زندگی رہی

سالکؔ سراغ منزلِ جاناں نہ مل سکا
ہر ہر قدم پہ عقل کی جب رہبری رہی

اشتیاق احمد لاری

سحر البیان کے کردار

کردار نگاری ایک مشکل فن ہے۔ کسی بھی کہانی کا مقام متعین کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کے کرداروں پر نظر پڑتی ہے۔ جن کی **حرکت** عمل، جذبات، احساسات اور مکالموں کی چستی یا ڈھیلے پن سے کہانی کے کامیاب یا ناکامیاب ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سحر البیان کی تصنیف کے وقت میر حسن کے سامنے کردار نگاری کا کوئی اعلیٰ نمونہ موجود نہیں تھا، ان کی مثنوی کے کردار جس درجہ کے بھی ہیں، وہ انھیں کی ذہنی کاوش، قوت فکر اور فنی پختگی کا نتیجہ ہیں۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اگر سحر البیان کے کرداروں کا مطالعہ کیا جائے تو زیادہ مایوسی نہ ہوگی بلکہ اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ میر حسن کردار نگاری کا شعور ضرور رکھتے ہیں۔

سحر البیان کے کرداروں کا مطالعہ کرتے وقت اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اس وقت داستانوں میں کرداروں پر زیادہ توجہ صرف کرنے کا خیال داستان گویوں کو نہیں ہوتا تھا۔ ان کا مقصد تو بس جوں توں قصہ بیان کرنا ہوتا تھا۔ ان کی زیادہ توجہ انداز نگارش اور واقعات کے بیان پر صرف ہوتی تھی۔

جب افسانہ نگاری کو فنی حیثیت حاصل ہوئی تو پلاٹ اور کردار نگاری کے اصول بھی مرتب ہوئے۔ اسی وجہ سے آج کے افسانوں اور ناولوں کا سا بلند معیار قدیم داستانوں میں نظر نہیں آتا۔ داستانوں کا مطالعہ کرتے وقت اگر ہم ان امور کو پیش نظر رکھیں تو ان پر رائے زنی یا محاکمہ آسان ہو جائے گا۔ اس طرح ہم نہ صرف داستانوں کے ساتھ انصاف کر سکیں گے بلکہ ان کے مصنفین کے ساتھ بھی۔

کردار

سحر البیان کی کہانی چند نمایاں کرداروں کے گرد گھومتی ہے، انسانی کرداروں میں بے نظیر، بدر منیر اور نجم النسا اہم کردار ہیں۔ یوں تو بدر منیر اور بے نظیر کے والدین کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان کی حیثیت مرکزی نہیں ہے۔

غیر انسانی کرداروں میں ماہ رخ اور فیروز شاہ بے حد اہم ہیں۔ اور داستان کی ارتقا میں معاون اور مددگار ہوتے ہیں۔ کہانی کا بہاؤ جہاں رک جاتا ہے میر حسن انھیں کرداروں کے ذریعہ اسے آگے بڑھاتے ہیں۔ اس طرح کہانی میں کہیں جمود نہیں پیدا ہوتا بلکہ انھیں غیر انسانی کرداروں کے ذریعہ اس میں ڈرامائی عنصر شامل ہو جاتے ہیں۔

بے نظیر کا کردار عام شہزادوں کا سا ہے۔ اس کے عمل سے کسی مخصوص جذبہ اور احساس کا پتہ نہیں چلتا اور کہانی کا ہیرو ہونے کے باوجود اس کے کردار میں کوئی کشمکش اور عملی پہلو نظر نہیں آتا۔ میر حسن نے اسے بہادر، عالم اور دانا بتایا ہے مگر ان اوصاف کا اظہار کہانی میں کسی موقع پر بھی نہیں ہوتا۔

کہانی کے عام ہیروؤں یا شاہزادوں کی طرح وہ بے حد خوبصورت، بہادر، دانا اور زیور علم سے آراستہ ہے۔ بارہ سال تک وہ محل میں عام شہزادوں کی سی زندگی بسر کرتا ہے۔ محل کے محدود

ماحول میں اس کی سیرت و کردار کا کوئی نمایاں پہلو ہمارے سامنے نہیں آتا۔ بارھویں سال میں جب پری ماہ رخ اسے اٹھا لے جاتی ہے تو یہی موقع ہے جب اس کی سیرت کے نمایاں پہلو ہمارے سامنے آسکتے تھے۔ مگر بارہ سال کی عمر ہی کیا اور اس پر غیر انسانی مخلوق کا قبضہ جو انسانوں کے مقابلہ میں بہرحال قوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے نظیر ہمیں بے دست و پا نظر آتا ہے۔ وہ ماہ رخ کے چنگل سے نکلنے کی کوشش نہیں۔ حقیقتاً وہ اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ مجبور اور پریوں کے مقابلہ میں انسان کی حقیقت ہی کیا۔ پھر بارہ سال کی عمر، اس کی ناز و نعم کی زندگی اور معصومیت۔ وہ حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔ ماہ رخ اس سے اظہار محبت کرتی ہے۔ اسے بہلانے کی کوشش کرتی ہے۔ پرستان کی سیر کراتی ہے۔ مگر بے نظیر اپنے کو اجنبی ماحول میں دیکھ کر گھبراتا ہے۔ پری کا حسن اور اظہار محبت اس کی اس بے چینی کو دور نہیں کرسکا۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنی کمزوری اور گھبراہٹ کو چھپاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ماہ رخ پر اس کی بے چینی ظاہر ہو۔ بظاہر اس نئے ماحول سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے:

غرض دل کو جوں توں لگایا وہاں ؛ کہا اس نے جو کچھ کہا اس کو ہاں

لیکن وہ کسی آن بھی اپنے ماں باپ اور محل کی زندگی کو نہیں بھولتا جب بھی اسے موقع ملتا ہے، اپنی آزادی کے دنوں کو تنہائی میں یاد کرکے آنسو بہا لیتا ہے۔

وہ محلوں کی چہلیں وہ گھر کا سماں ؛ رہے روز و شب دھیان میں ہر زماں
وہ شفقت جو ماں باپ کی یاد آئے ؛ تو راتوں کو رو رو کے دریا بہائے
کرے یاد جب اپنے ناز و نعم ؛ فغاں زیر لب وہ کرے دم بدم

بے نظیر کی زندگی میں تین اہم موڑ آتے ہیں۔ ایک وہ موقع ہے جب وہ بدر منیر پر عاشق ہوتا ہے مگر اس سے اظہار عشق کرتا ہوا جھجکتا ہے اور شراب کے دو جام پی لینے کے بعد اپنا دل بدر منیر کے قدموں میں ڈال دیتا ہے۔ وہ بدر منیر پر پہلی ہی ملاقات میں اعتماد بھی کرلیتا ہے اور اپنی ساری داستان اسے سنا دیتا ہے۔ غیر جنس ہونے کی وجہ سے وہ ماہ رخ سے عشق نہیں کرسکتا تھا مگر بدر منیر سے ملنے کے لیے ہر شام کو بے چینی سے انتظار کرتا ہے۔ وہ ماہ رخ سے ڈرتا بھی ہے، جب ماہ رخ اپنے باپ کے پاس چلی جاتی ہے تو شام کو چوری چھپے بدر منیر سے ملنے کے لیے وہ پرستان چلا جاتا ہے اور ماہ رخ کی واپسی سے قبل ہی لوٹ بھی آتا ہے۔

اس عشق کا راز جب فاش ہوتا ہے تو بے نظیر کی سیرت کی ایک اور خصوصیت سامنے آتی ہے۔ یہ اس کی زندگی اور محبت کا ایک اور امتحان ہے۔ جب ماہ رخ اس کی قید کا فیصلہ سناتی ہے تو عام عاشقوں کی طرح وہ اس فیصلے کو خاموشی سے سن لیتا ہے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کرتا۔ حالانکہ اب وہ بارہ سال کا معصوم شاہزادہ نہیں ہے بلکہ جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھ چکا ہے۔ عشق کی لذت سے بھی آشنا ہے، مگر وہ ہر قدم پر ماہ رخ سے شکست کھا جاتا ہے اور اس سے مقابلہ کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔ شاہزادہ عام عشقیہ روایتوں کی طرح عشق کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ اپنے اندر رکھتا ہے اور اسے اپنی محبت کی آزمائش اور معراج تصور کرتا ہے۔

کہا، دل پہ رتبہ جو کچھ آتی ہے ؛ یہی عشق کی جان معراج ہے

اور جب وہ قید سے رہائی پاتا ہے تو انسانی ہمدردی سے مجبور ہو کر نجم النساء سے لپٹ جاتا ہے اور خوب خوب روتا ہے۔

بے نظیر بدر منیر کی محبت میں اپنے والدین کو بھی بھول جاتا ہے۔ قید سے رہائی اور بدر منیر سے ملاقات کے بعد وہ سب سے پہلے مسعود شاہ کے پاس شادی کا پیغام بھیجتا ہے کہ اگر پیغام نامنظور ہوا تو ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ ناگزیر ہے۔ بس اس کے کردار میں یہیں پر ذرا شدت اور حرکت نیز اس کے شاہانہ مزاج کا عکس نظر آتا ہے۔ ورنہ وہ ہر جگہ اور ہر موڑ پر حالات کے رحم و کرم پر ہے۔

بدر منیر کا کردار بھی عام روایتی شہزادیوں سے مختلف نہیں ہے اس کے اندر وہ تمام صفات موجود ہیں جو عموماً افسانوی شہزادیوں کے لیے ضرور سمجھی جاتی ہیں حسن میں یکتائے زمانہ ہے، بے حد پڑھی لکھی ہے اور علم کی دلدادہ ہے۔

سرہانے مجلد دھری اک کتاب ؛ ظہوری نظیری کا کل انتخاب

دھری اک بیاض اور نرگس چمن   پر از شعر سودا و میر و حسن

ماحول کی آزادی اور بے فکری کی وجہ سے وہ شوخ طبع ہے۔ اس کی سیرت و کردار سے اس کی نسوانی فطرت کا اندازہ ہوتا ہے جب بے نظیر اس سے پری کا ذکر کرتا ہے تو اس کے اندر نسائیت پوری طرح بیدار ہو جاتی۔ عام عورتوں کی طرح وہ بھی پسند نہیں کرتی کہ اس کے محبوب سے کوئی دوسری عورت دل لگائے۔ وہ ڈاہ سے جل جاتی ہے۔ وہی بدر منیر جو بے نظیر سے پیار و اختلاط کی باتیں کر رہی تھی، پری کا ذکر سن کر پیچ و تاب کھانے لگتی ہے اور بڑی بے رخی سے کہتی ہے ؎

مرو تم پری پر وہ تم پر مرے   بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے
میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں   یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں

جب بے نظیر اس کے قدموں پر سر رکھ دیتا ہے تب بھی اس کے دل میں لگی حسد کی آگ نہیں بجھتی وہ کہتی ہے ؎

کہا چل سر اپنا قدم پر نہ دھر   کسی کے مجھے جی کی کیا ہے خبر

میر حسن نے یہاں نسوانی فطرت کا بہت صحیح نقشہ پیش کیا ہے۔

بدر منیر بے نظیر پر دل و جان سے فدا ہے۔ مگر عورت کی فطرت ہر موقع پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ وہ بے نظیر سے بے رخی، بے مروتی اور سنگ دلی کا اظہار کرتی ہے مگر جب بے نظیر اس کے باغ سے چلا جاتا ہے تو بدر منیر کی زندگی بے لطف اور بے کیف ہو جاتی ہے۔ وہ اس کے لیے راتوں کو جاگتی اور ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے۔

وہ شب اس کو اندوہ و غم میں کٹی   گھڑی جو کٹی سو الم میں کٹی

بدر منیر کے اندر عورت کا فطری حجاب بھی موجود ہے۔ اس کے اندر اس جرأت و ہمت کی کمی ہے جو اظہار عشق کے لیے ضروری ہوا کرتی ہے۔ نجم النساء زبردستی اسے بے نظیر کے پاس لا بٹھاتی ہے مگر ؎

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے   بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منھ آنچل سے اپنا چھپاتے ہوئے   لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
پسینہ پسینہ ہوا سب بدن   کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن

جب بے نظیر تاریک کنوئیں میں ڈال دیا جاتا ہے تو بدر منیر کو ایک خواب کے ذریعے اس کی مصیبت اور قید و بند کا علم ہوتا ہے وہ اپنا اندیشہ نجم النساء پر ظاہر کرتی ہے۔ مگر جب نجم النساء اسے سمجھاتی، چھیڑتی اور طنز کرتی ہے تو بدر منیر عام عورتوں کی طرح اس کا جواب دیتی ہے۔ وہ اپنے محبوب پر کوئی اتہام یا الزام نہیں برداشت کرتی۔ چنانچہ نجم النساء کو جواب دیتے ہوئے کہتی ہے۔

کسی کی بدی تو نہ کر عیب ہے   کہ اس کا خدا عالم الغیب ہے
وہ اپنے دلوں سے تو ہے نیک ذات   ہوئی اس پہ کیا جانے کیا واردات

بدر منیر کا دل انسانی ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہے۔ وہ مطلب پرست اور خود غرض نہیں، بلکہ انسان دوست اور دوست نواز ہے۔ نجم النساء شاہزادے کی تلاش میں جانا چاہتی ہے لیکن بدر منیر اسے روکتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ نجم النساء پری کا مقابلہ کس طرح کر سکتی ہے، اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ میں کہیں شاہزادے کے ساتھ نجم النساء کو بھی نہ کھو دوں

بھلی چنگی اپنی نہ کھو جان تو   کہ ہے وہ پری اور انسان تو
رسائی تری ہوگی کیوں کر وہاں   مجھے بھی نہ دے ہاتھ سے مری جاں

بے نظیر کے مقابلے میں بدر منیر کے اندر کچھ حرکت اور شدت پائی جاتی ہے۔ عورت کی فطرت کا مطالعہ میر حسن نے خوب کیا ہے اور اسے سچائی سے پیش بھی کر دیا ہے۔ بدر منیر کے کردار کی جو خوبیاں اوپر بیان ہوئیں وہ ضمنی ہیں ورنہ مجموعی حیثیت سے اس کردار کے مطالعہ سے ایک عمومی اور سطحی شخصیت کا کردار ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ کیسی شہزادی ہے جس کا کردار شاہانہ وقار اور پندار سے خالی ہے، جو شراب بھی پی سکتی ہے، جو اتنی آزاد اور بیباک ہے کہ شادی سے قبل ہی اپنے محبوب سے جنسی تعلقات قائم کر لیتی ہے۔ ان دونوں کرداروں سے زیادہ بہتر زیادہ موثر اور زیادہ جان دار اور متحرک کردار نجم النساء کا ہے۔ کہانی کے ارتقا میں نجم النساء کے کردار نے میر حسن کا ہر نازک موڑ پر ساتھ دیا ہے۔ نجم النساء کی تخلیق میر حسن کی زبردست تخلیقی صلاحیت کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے کردار میں زندگی کی حقیقت پائی

جاتی ہے۔ اس کے وجود میں بجلی بھری ہے۔ وہ بیحد تیز طرار اور ذہین ہے۔ اس کا ہر کام موقع و محل کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ وزیر کی بیٹی ہونے کی وجہ سے وہ شاہزادی سے بیحد قریب ہے اور اس کے رازوں میں شریک ہے۔ شروع شروع میں میرحسن اس کا تعارف دو اشعار میں اس طرح کرا دیتے ہیں کہ نجم النسا اپنے تمام اوصاف سے متصف ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے

تھی ہمراہ اک اس کے دخت وزیر　　نہایت حسین اور قیامت شریر
زبس تھی ستارہ میں وہ دلربا　　اسے لوگ کہتے تھے نجم النسا

جب بے نظیر اور بدر منیر ایک دوسرے کو دیکھ کر ہوش کھو دیتے ہیں تو نجم النسا ہی انھیں ہوش میں لانے کی تدبیریں کرتی ہے

شتابی سے لا اس نے چھڑکا گلاب　　تب آئی تنوں میں فرزان کے تاب

نجم النسا ہی بدر منیر اور بے نظیر کی ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ مگر تکلف اور حجاب کی وجہ سے دونوں کے منھ پر تالے لگ گئے ہیں۔ نجم النسا ایسے موقع پر شراب کا انتظام کر کے ان کی شرم اور جھجک دور کرتی ہے۔ وہ بدر منیر سے بے تکلف ہے، اس سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہے اس پر طنز کرتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بدر منیر سے کس قدر قریب ہے اور اس کی زندگی میں کس قدر دخیل ہے مثلاً۔

مجھے چونچلے تو خوش آتے نہیں　　ترے ناز بے جا یہ بھاتے نہیں
میری طرف ٹک دیکھ تو ٹلنے ہلے　　مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے
ٹک اک حظ اٹھا زندگانی کا تو　　مزا دیکھ اپنی جوانی کا تو

اور

تو وہ ہے کہ سمجھے تئیں بے وقوف　　کدھر دل گیا ہے ترا اے وقوف
سنو جانی جو کوئی خود بیں مرے　　تو دل پہلے اپنا بھی صدقہ کرے
وہ خوش ہوگا اپنی پری کو لیے　　عبث اس پہ بیٹھی ہو تم جی دیے

نجم النسا کی یہ طنزیہ باتیں، چھیڑ چھاڑ اور بدر منیر کو سمجھانا دونوں کی محبت کا پتہ دیتا ہے۔ بدر منیر سے نجم النسا کی محبت ہی تھی جس نے اس کو بادیہ پیمائی پر مجبور کیا۔ نجم النسا کا یہ خطرناک مگر جرأتمندانہ قدم تھا۔ وہ اپنے دل میں شاہزادی کے لیے بے انتہا محبت اور خلوص رکھتی ہے۔ اس کی خوشی کے لیے اپنا آرام تج دیتی ہے اور ایک موہوم سی امید پر بحر طلسمات میں بے خطر کود پڑتی ہے۔ یہ اس کے ارادے کی مضبوطی اور عزم و ہمت کی بلندی کا نتیجہ ہے۔ اس سے نجم النسا کے جذبہ ایثار و قربانی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنے فیصلے میں اٹل ہے، اس نے جس انداز سے بدر منیر کو اپنے ارادے کی خبر دی ہے اس سے اس کے جذبہ ایثار اور بے پناہ انسانی ہمدردی کا پتہ چلتا ہے۔

لگی کہنے وہ یوں نہ آنسو بہا　　ترے واسطے میں نے اب کو سہا
بس اب سر بہ صحرا نکلتی ہوں میں　　اسے ڈھونڈ لانے کو چلتی ہوں میں
جو باقی رہا کچھ مرے دم میں دم　　تو پھر آگئے یہ دیکھتی ہوں قدم
وگرنہ اگر مر گئی، مر گئی　　تو یوں جانیو مجھ پہ صدقہ گئی

نجم النسا بڑی فطرت شناس اور مزاج داں ہے۔ وہ ہر کام موقع و محل دیکھ کر نہایت ہوشیاری اور کمال دانشمندی سے کرتی ہے۔ وہ جوگن بن کر نکلتی تو شاہزادہ بے نظیر کی تلاش میں ہے مگر راہ میں بالکل اتفاقیہ اسے فیروز شاہ مل جاتا ہے اور نجم النسا کو اپنے گھر لے جاتا ہے۔ وہ نجم النسا کی محبت میں گرفتار ہے، نجم النسا بھی اس سے محبت کرنے لگی ہے۔ مگر وہ اپنی محبت پر قابو رکھتی ہے۔ وہ کسی لمحہ بھی اپنے مقصد کو فراموش نہیں کرتی ہے جس کے لیے اس نے جوگ بھرا تھا اور جب فیروز شاہ اس سے اظہار عشق کرتا ہے تو نجم النسا پہلے تو تغافل سے کام لیتی ہے مگر جب وہ اپنا دل نجم النسا کے قدموں میں ڈال دیتا ہے تو وہ کہتی ہے۔

مطالب اگر میرے برلائے تو　　تو شاید مراد اپنی بھی پائے تو

فیروز شاہ کی درخواست پر نجم النسا سارا ماجرا بیان کرنے کے بعد کہتی ہے۔

پری زاد آپس میں تم ایک ہو　　اگر تم ذرا کھوج اس کا کرو
تو شاید مدد سے تمھاری ملے　　تو پھر آرزو بھی تمھاری ملے
دل آباد ہو جی کو آرام ہو　　تمھارا بھی اس کام میں کام ہو

تو پھر آرزو بھی تمھاری ملے" یہ جملہ نجم النسا کی طرف سے کہا گیا ہے

بدر منیر شاہ تو اس کا عاشق صادق تھا، اس کا تذکرہ کیونکر نہ ہوتا۔ فیروز شاہ کی مدد سے شاہزادہ قید سے رہائی پاتا ہے۔ اس کے طلسمی تخت پہ بٹھا کر نجم النساء اسے بدر منیر کے پاس لے آتی ہے۔ دونوں مل کر خوب روتے ہیں۔

ع لگا رونے آنکھوں پہ رکھ کر رومال

ع لگی کرنے تر دامن و آستیں

نجم النساء شاید ایک ماہر نفسیات بھی ہے۔ اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں خوشی کی زیادتی کی وجہ سے دونوں کی طبیعتوں پر کوئی ناگوار اثر نہ پیدا ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ نجم النساء میر حسن کی تخلیقی صلاحیت کا بہترین مظہر ہے۔ اس کے کردار میں محل کی شوخ اور عقلمند کنیز (جو عموماً تخت و زیر ہی کو پیدا کرتی تھیں) کا کردار پوری طرح جلوہ گر ہے۔ کہانی کے ارتقا میں نجم النساء کے کردار نے بہت مدد دی ہے اور اسی کی کوشش سے کہانی کا اختتام طربیہ ہوتا ہے۔ اس کے کردار کی سب سے بڑی خوبی اس کی انسانی ہمدردی اور جذبۂ ایثار و عمل ہے۔ اس کے کردار کا یہی پہلو ہمیں متاثر بھی کرتا ہے۔

کہانی کے غیر انسانی اور ما فوق الفطرت کردار بھی اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ میر حسن نے کہانی کو آگے بڑھانے میں ان سے بھی بہت مدد لی ہے اور جہاں کہیں قصہ رکتا ہوا محسوس ہوتا ہے یہ کردار آگے اسے بڑھانے کے لیے آموجود ہوتے ہیں۔ ان کرداروں کی حرکت و عمل ضرور انسانوں سے مختلف ہے لیکن ان کے جذبات و احساسات بالکل انسانوں کے سے ہیں۔ انسانوں کی طرح یہ بھی عاشق ہو سکتے ہیں۔ حسد، جلن، خود غرضی، جنسی جنون، ایثار، قربانی، ہمدردی اور مروت کے جذبات اس غیر فطری مخلوق کے اندر بھی اسی طرح پائے جاتے ہیں جیسے انسانوں میں۔

ماہ رخ پری کا کردار اس ما فوق الفطرت مخلوق کا نسوانی کردار ہے۔ نسوانی فطرت کی وہ تمام صفات جو عام عورتوں میں پائی جاتی ہیں، ماہ رخ کی فطرت میں بھی موجود ہیں۔ وہ ایک ہی نظر میں بے نظیر کو دل دے بیٹھتی ہے۔ بدر منیر بھی بے نظیر کی صرف ایک جھلک دیکھ کر اپنا ہوش کھو بیٹھی تھی۔ ماہ رخ بے ہوش تو نہیں ہوتی مگر بے نظیر کا حسن اسے دیوانہ بنا دیتا ہے اور وہ بے اختیار ہو کر اس کے رخسار پر پیار سا رکھ دیتی ہے۔ "دیا گال سے گال اپنا ملا" اس سے اس کی آتش ہوس اور تیز ہو جاتی ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پری زادی کے اندر بھی عورت کی فطری حیا موجود ہے چنانچہ وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھتی ہے اور اسے اڑا کر پرستان لے آتی ہے۔ شاہزادہ جب نیند سے بیدار ہو کر اپنے آپ کو نئی جگہ دیکھ کر متعجب ہوتا ہے تو ماہ رخ اس کی حیرت دور کرنے کے لیے بڑی صفائی سے اپنے جرم کا اقرار کر لیتی ہے مگر اس سے پہلے ہی اپنے عشق کا اظہار کر دینا بھی ضروری سمجھتی ہے۔

ترے عشق نے مجھ کو شیدا کیا ترا غم مرے دل میں پیدا کیا

پھر اکر ترا تجھ سے شہر و دیار یہ بندی ہی لائی ہے تقصیر وار

پری ہوں میں اور یہ پرستان ہے یہاں سب یہ قوم جن جان ہے

اس طرح پہلی ملاقات میں وہ بے نظیر سے اپنا مکمل تعارف کر لیتی ہے اور پھر اس کی دل جمعی اور دل بستگی کے لیے اسے پرستان کی سیر کراتی ہے اس کے باوجود بھی جب اسے اداس دیکھتی ہے تو سیر و تفریح کے لیے کل کا گھوڑا لا دیتی ہے۔

عورتوں کا مزاج بھی اور شکی ہوتا ہے۔ ان کے اندر جلن اور رقابت کا مادہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ایک طرف تو ماہ رخ یہ چاہتی ہے کہ بے نظیر اداس نہ رہنے پائے مگر کل کا گھوڑا دیتے وقت اس کے دل میں ایک شبہ ایک وہم سر اٹھاتا ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد بے نظیر کسی کی محبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ یہ اس کی طبیعت کا بالکل فطری تقاضا ہے۔ اگر انسانی مخلوق ہوتی تو وہ بھی یہی سوچتی۔ اس کا اندیشہ ٹھیک ہی نکلا۔ بے نظیر بدر منیر کی محبت میں گرفتار ہوا اور ایک شام جب وہ بدر منیر کے باغ میں اس کے ساتھ مصروف راز و نیاز تھا، ایک دیو نے اسے دیکھ لیا اور ماہ رخ کو خبر دے دی۔ یہاں ماہ رخ کا عورت پن ایک

جاگ پڑتا ہے۔ رقابت کی آگ میں وہ جلنے لگتی ہے۔ اس کے جذبات میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے اور وہ بے نظیر کی جان کی دشمن ہو جاتی ہے۔

قسم مجھ کو حضرت سلیمان کی   ہوئی دشمن اب اس کی میں جان کی

اس کے اندر سویا اژدہا پیدا ہو جاتا ہے۔ بدر منیر تو اس کے پاس موجود نہیں مگر وہ تصور میں اس سے خوب لڑتی ہے اور جلی کٹی سناتی ہے کیا فطری جذبہ ہے۔

یہ اڑتی سی اس کو خبر سن پڑی   کہا پیچھے پاؤں اس کو ذری
تو کھا جاؤں کچا اسے موت ہو   لگی ہے مری اب تو وہ سوت ہو

ماہ رخ انتقامی کارروائی کے لیے بے چین ہو جاتی ہے اور بے اضطراب کے عالم میں بے نظیر کی واپسی کا انتظار کرتی ہے جب وہ واپس آتا ہے تو غیض و غضب کی آگ اور بھڑک اٹھتی ہے وہی ماہ رخ جو بے نظیر کی ناز برداریاں کیا کرتی تھی، اس سے اس طرح مخاطب ہے:

تجھے سیر کرنے کو گھوڑا دیا   کہ اس مال زادی کو جوڑا دیا
الگ ہم سے یوں رہنا اور چھوٹنا   یہ اور ہی اور پر مزے لوٹنا
جھلکا دیا تھا نہ تو نے سہی   بھلا اس کا بدلہ نہ دوں تو سہی
کہ چاہ الم میں پھنساؤں تجھے   ہنسا ہے تو جتنا رلاؤں تجھے

چنانچہ ماہ رخ بے نظیر کو ایک دیو کے ذریعے کنوئیں میں ڈلوا دیتی ہے وہ اسے سخت سے سخت اذیت دینا چاہتی ہے، وہ بے نظیر کی جان کی خواہاں نہیں، وہ سمجھتی ہے کہ موت سے تو اس کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا، اس لیے وہ اسے زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ ماہ رخ کا یہ کردار اس کی طبیعت کی تیزی، سنگ دلی، اذیت پرستی اور نسوانی فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی لیے اس کا کردار بھی داغ دار نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے نظیر سے وہ سچی محبت نہیں کرتی ہے۔ اس کے اندر بوالہوسی اور جنسی بھوک پائی جاتی ہے۔ وہ بے نظیر کو حاصل نہ کر سکی اور بدر منیر کی محبت میں اس کو گرفتار دیکھ کر جل اٹھی۔ اس کی نگاہوں میں بے نظیر کے ساتھ بدر منیر بھی مجرم ہے۔ اگر ماہ رخ کی محبت سچی ہوتی تو اس کے انتقامی جذبہ کا شکار بے نظیر کے بجائے بدر منیر کو ہونا چاہئے تھا، کیونکہ در حقیقت وہی اس کی رقیب ہے۔ معشوق کو کوئی سزا نہیں دیتا۔

ماہ رخ کی فطرت کا دوسرا رخ اس وقت سامنے آتا ہے۔ جب اس کے پاس فیروز شاہ کا تہدیدی پیغام پہنچتا ہے اور وہ بے نظیر کی رہائی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس پیغام سے ماہ رخ کا جذبہ انتقام سرد پڑ جاتا ہے۔ اسے اپنی بدنامی کا خوف گھیر لیتا ہے اور وہ بہ خوشی بے نظیر سے دست بردار ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی میر حسن نے ماہ رخ کی نسائی فطرت کا عمیق رخ پیش کیا ہے، وہ نہیں چاہتی کہ اس واقعہ کا چرچا پرستان میں ہو۔ کوئی عورت اپنے دامن پر بدنامی کا داغ کسی قیمت پر پسند نہیں کرتی۔ میر حسن نے اگر ایک طرف اس کی گرم مزاجی اور طبیعت کی تیزی دکھائی ہے تو دوسری طرف اسے ذلیل و رسوا بھی کیا ہے۔ وہ ایک عاجزانہ جواب فیروز شاہ کے تہدیدی پیغام کے جواب میں بھیجتی ہے۔

کہا مجھ سے تقصیر اب تو ہوئی   کہو اس کو لے جائے یاں سے کوئی
اگر اب میں لاگوں ہوا اس کی کبھی   تو پھر پھونک دیجیو مجھے تم تبھی
پڑا اتنا یہ احسان مجھ پر کرو   کہ اس کا پرستاں میں چرچا نہ ہو
مرے باپ کو پھر نہ ہووے خبر   کہ پھر میں ادھر کی ہوں نہ ادھر

ماہ رخ کے کردار میں ارتقائی مراحل ہیں جو بڑی تیزی سے طے ہو جاتے ہیں۔ اس کے کردار میں کہیں سستی نہیں، وہ بڑی عجلت پسند ہے، بے نظیر کو کسی تامل کے بغیر اڑا لاتی ہے۔ وہ سخت گیر بھی ہے مگر اپنے سے بڑی طاقت کے سامنے بھی جھک جاتی ہے۔ بدنامی کے خوف اور فیروز شاہ کی طاقت سے سہم کر وہ بے نظیر سے دستبردار ہو جاتی ہے۔ ماہ رخ کا کردار مافوق الفطرت ہونے کے باوجود جنی نہیں۔ وہی انسانوں کی سی باتیں، انسانوں کے سے جذبات و احساسات ان کا غیر فطری عمل ہواؤں میں اڑنا، آن کی آن میں کہیں سے کہیں پہنچ جانا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی اڑا لے جانا، پرستان کی طلسمی دنیا، انھیں وجوہات سے ماہ رخ انسانی فطرت و جذبات رکھنے کے باوجود انسانوں سے الگ ہو گئی ہے اور مافوق الفطرت

کہلاتی ہے، یہی بات فیروزشاہ کے متعلق بھی کہی جائے گی۔

فیروزشاہ کا کردار ماہ رخ کے برعکس ہے۔ اس کے اندر مردانہ وقار، شرافت، وفاداری اور سچی محبت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس کے اندر صبر و ضبط کا مادہ بھی بہت زیادہ ہے، اسے اپنے جذبات پر قابو حاصل ہے۔

عام کرداروں کی طرح فیروزشاہ بھی نجم النسا کو محض ایک نظر دیکھ کر عاشق ہو گیا۔ منت اور خوشامد سے اس کو اپنے گھر لایا۔ یہاں اس کی عزت و تکریم اور خاطر داری کی۔ اپنے باپ سے ملایا اور ایک مدت کے بعد غور و تامل کرکے نجم النسا پر اپنا عشق ظاہر کیا اور جب نجم النسا نے اس پر اپنا مقصد ظاہر کیا تو فوراً اس کے کام آنے کے لیے تیار ہو گیا اور اس کی پوری پوری مدد کی۔

فیروزشاہ کے کردار میں کہیں تیزی اور شدت نہیں اور نہ کہیں کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے کردار میں ایک طرح کا ٹھہراؤ اور شخصیت میں متانت و وقار پایا جاتا ہے مگر ان اوصاف کے باوجود اس کے کردار میں ہمارے لیے وہ کشش نہیں جو ماہ رخ کے کردار میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماہ رخ کے کردار میں ایک خصوصیت پائی جاتی ہے۔ وہ کبھی مجسم محبت نظر آتی ہے تو کبھی مجسم نفرت، کبھی جذبہ کی آنچ سے گرم تو کبھی سرد۔

سحر البیان کا ایک اور کردار جس کے اندر حقیقت اور زندگی کا عکس پایا جاتا ہے، وہ بے نظیر کا باپ ہے۔ یہ کردار ہر جگہ اور ہر جگہ پایا جانے والا ہے۔ ایک مدت تک اولاد نہ ہونے پر فطری رنج و غم، پریشانی اور اداسی، منت و سماجت، پنڈتوں اور نجومیوں سے زائچے دکھوانا، انتہائی بے دلی سے تخت و تاج سے دستبردار ہو جانے کی خواہش کا پیدا ہونا، وزیروں کے سمجھانے سے مان جانا، مایوسی کے بعد اولاد کی دولت عطا ہونے پہ بے اختیار خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہو جانا، خوشیاں منانا، بخششیں عطا کرنا، محل میں ایک نئی زندگی اور ہما ہمی کا پیدا ہونا، پھر اولاد کی گمشدگی پر رنجیدہ اور دل شکستہ ہونا، تلاش و جستجو کے بعد مایوس ہو کر معاملہ کو خدا کے سپرد کر دینا اور اسی سے لو لگا لینا۔ یہ تمام باتیں بادشاہ کے زندہ کردار کا ثبوت ہیں۔ اس کا کردار ہماری زندگی سے بے حد قریب ہے۔ اس قسم کے جذبات، خیالات اور واقعات کا مشاہدہ ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔ اولاد سے محروم باپ کے جذبات و احساسات مایوسی کی کیفیت اور پھر لڑکے کی پیدائش کے بعد مسرت و خوشی کی کیفیات کا اظہار بادشاہ کے کردار سے بخوبی ہوتا ہے۔

★

پرنس افسر الملوک

(صفحہ ۱۵ کا بقیہ)

تکھنو تھا۔ میں بار بار ان کی نقاہت کا اندازہ کرکے رخصت ہونے کی اجازت مانگتا مگر وہ مجھے اٹھنے نہیں دیتے تھے۔ اس ملاقات میں پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ ان کے پاس لاتعداد ملازم ہیں، ہر کام کے لیے علیحدہ آدمی ہے لیکن تیمار داری یا مزاج پرسی کے لیے کوئی عزیز نظر نہیں آتا۔ عورتوں کا وجود خصوصیت کے ساتھ مفقود تھا۔ اب مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ان کے محل میں پہلے بھی میں نے کسی بچہ کو نہیں دیکھا تھا اور نہ کسی خواص یا کنیز کی کبھی آواز سنی تھی حتیٰ کہ محلدار بھی کوئی کبھی نہیں تھی۔ اتنی ملاقاتوں میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا اس لیے دبی زبان دریافت ہی کر لیا کہ "کیا سرکار کا زنان خانہ یہاں سے فاصلہ پر ہے؟" انھوں نے مسکرا کر جواب دیا کہ میرے پاس صرف یہی ایک کوٹھی ہے۔ میں نے ہمت کرکے پھر پوچھا کہ "حضور کے محلات کہاں رہتے ہیں؟" برجستہ جواب ملا کہ "میں نے کوئی شادی نہیں کی۔" مجھ سے خاموش نہ رہا گیا اور بے ساختہ کہہ گیا کہ "اہل و عیال بڑی نعمت ہوتے ہیں، بیماری میں انھیں سے دل بہلتا ہے۔" انھوں نے ایک مخصوص طرز اور اپنے متین لہجہ میں صرف اتنا فرمایا کہ "میں نے غلام پیدا کرنا پسند نہیں کیا۔" اور خاموش ہو گئے۔ میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں کہہ سکا لیکن ان کے اس فقرے کی معنویت ایک جان گداز مرثیہ تھی جواب بھی کلیجہ ہلا دینے کے لیے کافی ہے۔ میری ان سے وہ آخری ملاقات تھی۔ اسی بیماری میں انھوں نے انتقال فرمایا۔

★

رگھوناتھ سہائے وفا شاہجہانپوری

غزل

نہ پائی ساغر و مینا میں جب خوشی میں نے
تڑپ کے توڑ دیا سازِ مے کشی میں نے

بہارِ زیست لٹا دی اس ایک گل کے لیے
وہ گل کہ جس کو عطا کی شگفتگی میں نے

ملی تھی کچھ تو مسرت غموں کے سائے میں
تمھیں جو یاد کیا تھا کبھی کبھی میں نے

خوشی سے مر گئے ہوتے جو تم کو پا لیتے
تمھارے ہجر میں پائی ہے زندگی میں نے

تلاش میں ہوں کسی غمگسار کی اب تک
اسی نظر سے بڑھائی تھی دوستی میں نے

لگا کہ برق گری دل کے آشیانے پر
تمھارا نام لیا تھا ابھی ابھی میں نے

جلا کے شمع وفا آپ کے ہی آنچل میں
جفا کے گھر میں بھی کر دی ہے روشنی میں نے

▪▪

واحد پریمی

غزل

ساتھ موجوں کا چھوڑ کر دیکھو
اپنی کشتی کو موڑ کر دیکھو

خود بخود وقت سرنگوں ہوگا
تم کلائی مروڑ کر دیکھو

کب سے تم محوِ خوابِ غفلت ہو
خود کو یارو جھنجھوڑ کر دیکھو

منتشر ذہن، متحد ہوں گے
تم دلوں کو تو جوڑ کر دیکھو

سانس لوگے کھلی فضاؤں میں
سب شکنجوں کو توڑ کر دیکھو

منزلیں خود ہی لینے آئیں گی
عزم کے ساتھ دوڑ کر دیکھو

سب کو الزامِ قتل دیتے ہو
اپنا دامن نچوڑ کر دیکھو

شعرِ واحدؔ مہک اٹھیں گے خود
خونِ دل تو نچوڑ کر دیکھو

▪▪

ضمیر پیردانی

غزل

جب قلم نے مرے لفظوں کا سراپا کھولا
فکر نے نرم احساسوں کا صحیفہ کھولا
جسم ڈس جائے گی لمحوں کی سلگتی خوشبو
رات سورج نے کسی دشت میں چہرہ کھولا
آسماں چپ ہو زمیں چپ ہو خدا بھی چپ ہو
زندگی نے کبھی نہ تقدیر کا عقدہ کھولا
چند رشتوں کی طرح جوڑ لیا ہے کیا کیا
چند رازوں کی طرح وقت نے کیا کیا کھولا
آگ سینے میں دہک اٹھی تھی خواہش بن کر
دل سمندر تھا مگر خوف نے دریا کھولا
کچھ تعلق ہے ہمارا کہ ہمیں سوچنے دے
دیکھنے دے، ہمیں حالات نے کتنا کھولا
زندگی بھر مرے آگے کوئی دیوار رہی
دوستوں نے بھی وہی زخمِ تمنا کھولا
گل کھلا بھی نہ سکا شہر میں زخموں کا طلسم
صبح جاگی نہ کہیں شب نے دریچہ کھولا
کچھ بتا تو مجھے افکار و مسائل کی گھڑی
کیا کروں گا جو کسی نے کوئی لمحہ کھولا
تہہ بہ تہہ دل میں فروزاں تری تحریر ملی
جاگتے لمحوں نے جب بھی مرا سینہ کھولا
کون سی پیاس لیے پھرتی ہے دریا دریا
کس نے پرواز یہاں درد کا رشتہ کھولا

▪▪

لیلیٰ لکھنوی

(افسانہ)

فرض اور محبت

دانش نے اپنی زندگی کے سفر میں جب بھی کبھی کوئی فیصلہ کیا وہ ہمیشہ اس کا قطعی اور آخری فیصلہ ہوتا تھا اس کے بعد اُس کو کبھی کسی قسم کا کوئی افسوس یا غم نہیں ہوا۔ کبھی تنہائیوں میں چھپ کر اس نے آنسو نہیں بہائے، کبھی کسی سے اپنی تقدیر یا قسمت کا گلہ یا شکوہ نہیں کیا بلکہ ایک بہادر اور دلیر مرد کی طرح اُن کا مقابلہ کیا اور آخر وقت تک کرتا رہا ــــــ وہ کہتا تھا

"آنسو تو انسانی کمزوری کی نشانی ہوتے ہیں جو صرف عورت کی آنکھوں میں ہی پیارے معلوم ہوتے ہیں جو اس کی خوب صورتی کو اور زیادہ دلکش اور سحر انگیز بنا دیتے ہیں جیسے مے کے چھلکتے ہوئے جام یا شبنم کے لرزتے ہوئے قطرے! لیکن ایک مرد کی اشک بار آنکھیں تو اس کی بزدلی اور کمزوری ظاہر کرتی ہیں۔"

اور وہ تو ایک آرمی افسر تھا بہادر دلیر اور نڈر انسان جس کو ابتدا سے ہی سختیوں، دشواریوں اور ہر قسم کی مشکلات برداشت کرنے کی تعلیم و تربیت دی گئی تھی دھوپ ہو یا گرمی، آندھی ہو یا طوفان اس کے سامنے پہلے اس کا فرض ہوتا تھا اور اس فرض کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اس کا عمل ــــــ یہ ہی جذبہ اس کے دل کے گوشوں میں ہمیشہ کارفرما رہا ایک کیڈٹ کی حیثیت سے بھی اور ایک افسر کی حیثیت سے بھی۔

اس کی زندگی کا زیادہ تر حصہ صحراؤں، جنگلوں، ویرانوں اور اونچے اونچے برفیلے پہاڑوں پر گزرا تھا جہاں پانی کا قطرہ برف میں ڈھل جاتا تھا اور اس کو بخاریوں پر گرم کر کے استعمال میں لایا جاتا تھا۔ وہ ان سرد برفیلی پہاڑیوں پر اپنی فوج کے جوانوں کے ساتھ میلوں پیدل چلا تھا جو اس قدر بلند تھیں کہ اوپر چڑھتے چڑھتے کبھی کبھی آکسیجن لینے کی ضرورت بھی پیش آجاتی تھی ــ ان خوب صورت دلکش پہاڑوں پر پہنچ کر اس نے چشم حیرت سے گہرے نیلے آکاش کو اس قدر قریب سے دیکھا تھا کہ گمان ہوتا تھا کہ اگر وہ اور ہمت اور استقلال سے کام لے، کچھ میل اور پہاڑوں پر اوپر چڑھ جائے تو وہ نیلے آکاش کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھو لے گا، مگر وہ جس قدر بھی بلندیوں پر چڑھتا آسمان کی دوری بدستور قائم رہتی ــــــ کس قدر دل فریب دھوکا تھا! صبح سویرے جب اُن برف سے ڈھکے، ہیرے کی طرح چمکتے ہوئے پہاڑوں کے پیچھے سے سرخ دہکتے ہوئے انگارے کی طرح بڑا سا سورج ابھرتا تو اس کی گلابی ہر طرف چھا جاتی ہر شے شرابی ہو جاتی۔

سورج کی بے پایاں دلکشی اور خوب صورتی کا راز تو اُسے انھیں پہاڑوں پر پہنچ کر معلوم ہوا تھا اور اس نے برفیلی چاندنی راتوں میں سنہرے چاند کو برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں سے ہم کنار ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

جب وہ چھٹیوں پر گھر آتا تھا تو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ شہر کے ہنگاموں اور شور و غل میں اپنے آپ کو کھو دے کسی نائٹ کلب میں کسی ہیجان خیز بیلی ڈانسر کا کیبرے دیکھے اس کے تھرکتے مچلتے ہوئے جسم کے دل فریب ساے کو اپنے دل کے کسی گوشے میں محفوظ کر لے ــــــ یوں تو وہ بہت سی لڑکیوں کو جانتا تھا ان میں سے کچھ تو اس کی پرانی شناسا تھیں اور کچھ نئی جن کی خاطر تواضع میں وہ اپنا کافی روپیہ صرف کرتا تھا۔ کبھی سینما لے جا کر کبھی کلب میں مدعو کر کے کبھی قیمتی تحفوں کو نذر کر کے اور کبھی کیش دے کر۔

لیکن ایک دن ایسا آیا جب دانش کی زندگی میں ایک معجزہ رونما ہوا۔ ایک ایسا معجزہ جس نے اس کی رواں دواں زندگی کا رخ ہی موڑ دیا ــــــ اس نے زندگی میں پہلی بار اپنی آنکھوں سے ایک ایسا حسین و جمیل پیکر دیکھا جس کو دیکھ کر وہ نا

حیران اور ششدر رہ گیا ــــــ جیسے کسی نے اس کو یکے بعد دیگرے ایک ہی سانس میں کئی جام پلا دیے ہوں۔

اس کی نگاہوں نے ہزاروں فٹ کی بلندی سے طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھا تھا اس نے بھیگی چاندنی راتوں میں چاند کو ابھرتے بھی دیکھا تھا ــــــ اور برسات کی راتوں میں بارش رک جانے کے بعد زمین پر بکھرے اور ہواؤں میں اڑتے ہوئے ہزاروں جگنوؤں سے جگمگاتی ہوئی راتیں بھی دیکھی تھیں مگر اس دل کش، دلاویز حسن کا جواب تو اس نے نندا دیوی کی بلندیوں پر بھی جا کر نہیں دیکھا تھا جو زہرہ کی ایک جھلک نے اُسے روشناس کرایا تھا جس پر کائنات کا ہر حسن قربان کیا جا سکتا تھا اور اُس وقت اُس کے دل نے ایک فیصلہ کیا تھا ــــــ اگر یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی محبت "پہلی نظر" میں ہو جاتی ہے تو دانش کو زہرہ سے محبت ہو گئی تھی اُس کے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل نے چپکے سے اس سے کہا تھا:

"یہی وہ لڑکی ہے جس کی تلاش میں وہ کئی سال سے دربدر رواں دواں پھر رہا تھا۔ اسی کے قدموں میں اس کی منزل ہے ــــــ"

وہ ملاقات بھی کچھ انوکھی سی تھی۔ سالانہ چھٹیوں پر جب وہ اپنے گھر لکھنؤ آیا تو اس کی چھوٹی بہن سعیدہ کی کالج کی دوست زہرہ حسن اس کے یہاں آئی ہوئی تھی۔ وہ دونوں باہر لان پر بیٹھی ہنسی مذاق کر رہی تھیں کہ یکایک زہرہ کی نظر درختوں سے ابھرتے ہوئے چاند پر پڑی اور اس نے انبساط کے عالم میں چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "سعیدہ وہ دیکھو عید کا چاند" اور اسی وقت دانش اسی سمت سے سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر لان کی طرف آ رہا تھا سعیدہ کھلکھلا کر بے اختیار ہنس دی گویا اس کی ہنسی بتا رہی ہو کہ "زمین کا چاند یا آسمان کا چاند؟" اور دانش سیڑھیوں پر محوِ حیرت کھڑا زمین کے چاند کو تک رہا تھا جس پہ آسمان کے چاند کو ہزار بار نچھاور کیا جا سکتا تھا ــــــ دانش کے اس طرح تکنے سے جو گلابی زہرہ کے چہرے پر چھا گئی تھی اس پر تو سارا میخانہ قربان کیا جا سکتا تھا دانش کو کھڑا دیکھ کر سعیدہ نے بھائی کو بلا کر زہرہ سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا "زہرہ میرے بھائی جان میجر دانش سے ملو جن کو پہاڑوں سے والہانہ عشق ہے اور یہ ہیں میری دوست زہرہ حسن ــــــ" پھر سعیدہ بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ــــــ "بھائی جان آپ نہیں جانتے زہرہ کو آپ سے ملنے کی کس قدر آرزو تھی۔ آپ کے ماؤنٹینیرنگ اکسپیڈیشن کی کامیابی کے بعد جب آپ کی تصویریں مختلف اخبارات میں شائع ہوئی تھیں تو انھیں دیکھ کر زہرہ کو آپ سے غائبانہ عشق ہو گیا تھا۔ ایک راز کی بات بتاؤں؟ آپ کی وہ تمام تصویریں زہرہ کے پاس محفوظ ہیں" اور وہ بے اختیار ہنس پڑی زہرہ کو جھینپ کا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہ تھا۔

زہرہ کے چہرے کی گلابی اور گہری ہو گئی اس نے گھبرا کے دانش کی طرف دیکھا ــــــ "معاف کیجئے گا آپ کی بہن جھوٹ بولنے میں کافی ماہر ہیں۔ ہاں اس سے مجھے انکار نہیں کہ آپ کے "نندا دیوی اکسپیڈیشن" کی کامیابی اور آپ کے عزم اور استقلال نے صرف مجھے ہی نہیں بلکہ ہمارے کالج کی سبھی لڑکیوں کو متاثر کیا تھا ــــــ رہا عشق کا سوال تو وہ مجھ پر سراسر بہتان ہے۔" دانش مسکرا دیا اُس نے سر سے پاؤں تک زہرہ پر ایک نگاہ ڈالی۔

ابھی تک اس نے پہاڑوں کا حسن دیکھا تھا، پتھروں سے عشق کیا تھا اور اس وقت جو حسن اور دلکشی کا مجسمہ اس کے روبرو تھا وہ اُن سب سے بالاتر تھا۔ وہ شرارت آمیز لہجے میں بولا۔

"زندگی بھر پتھروں کی پرستش کرتا رہا ہوں۔ پہاڑوں سے ٹکراتا رہا ہوں مگر آج میں نے محسوس کیا کہ قدرت کا حسن صرف پہاڑوں کی بلندیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ جو حسن اس وقت میرے روبرو ہے اُس کا جواب تو کہیں بھی نہیں ملا ہے ــــــ"

جس پر وہ بے حد شرما گئی تھی ــــــ

اور دانش کو اُس کے شرمانے کی وہ ادا بہت ہی پسند آئی۔ رات بھر وہ کروٹیں بدلتا رہا اور رات بھر ایک شرمیلی لڑکی کی ادائیں اس کی نیندیں اڑاتی رہیں، بے چین کرتی رہیں۔

..... دوسرے دن عید تھی۔ شام کے وقت سعیدہ اور دانش زہرہ کے گھر عید ملنے گئے، وہ گلابی رنگ کے غرارہ سوٹ میں بے حد حسین معلوم ہو رہی تھی ایک رنگ و نور کا سیلاب پھوٹ پڑا تھا وہ مسکرائی تو اس کے رخساروں میں دو چھوٹے چھوٹے خوب صورت حلقے پڑ گئے۔ چند لمحوں کے لیے وہ اپنے وجود کو بھول گیا اور اس کو خاموش دیکھتا رہا ——— سعیدہ نے زہرہ سے عید ملی تو دانش نے اُسے عید کی مبارکباد دیتے ہوئے کہا:

"اسلام نے تو مساوات کی تعلیم دی ہے مگر آپ نے تو مجھ سے عید ہی نہیں ملی۔ آج کے دن تو لوگ غیروں سے بھی گلے ملتے ہیں اور میں تو اب آپ کے لیے اجنبی نہیں ہوں پھر یہ بے انصافی کیوں؟" زہرہ کا چہرہ شفق گوں ہو گیا گھبرا کر بولی۔ "مسٹر دانش میرے خیال میں آپ کے لیے سویاں زیادہ مناسب رہیں گی اور عید بغیر سویوں کے تو ادھوری ہوتی ہے ———"

اور واقعی وقت کے ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ اس کے طوفان کے ہر بھنور میں گھرتی چلی گئی...... پھر ایک لمحہ ایسا آیا جب زہرہ کی خاموش ——— جھکی جھکی نگاہیں اس سے کچھ کہنے لگیں:

"میرے اور تمھارے درمیان صرف سانسوں کا فاصلہ ہے۔ تمھاری قربت کی تپش اور شخصیت کے سحر نے میری نبضوں کی رفتار تیز کر دی ہے اور میں نے شرم سے اپنی نگاہیں جھکا لی ہیں لیکن میرے محبوب برا نہ ماننا ———

عورت کے اقرارِ محبت کا ایک یہ بھی انداز ہے۔ تم اپنے دل کے دریچے کھول دو ——— اور مجھے اپنے دل کے کسی گوشے میں چھپا لو ——— میرے دل کی دھڑکنیں غور سے سنو کہ تمھاری قربت نے میرے انگ انگ میں کیسا طوفان برپا کر رکھا ہے جو ہر ایک کی قربت سے پیدا نہیں ہوتا ———

اور ایک شام دانش نے اس کی آنکھوں کے خاموش پیام سن لیے اور اس کے تپتے ہوئے جسم کو اپنی باہوں میں ..... اس کی باہوں میں جنت تھی جیسے ایک نور کا حلقہ تھا اور اس کے باہر جہنم تھا۔

چھٹیوں کے دو مہینے پلک جھپکتے گزر گئے مگر ان دو مہینوں میں جو کچھ اس نے پایا تھا جو کچھ اس کے دل نے محسوس کیا اور زہرہ کی محبت نے اسے دیا تھا وہ اسے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا نہ کبھی اس نے کسی اور سے اس شدت کے ساتھ محبت کی تھی۔

یوں تو وہ ہمیشہ اپنی ماں اور بہن سے رخصت ہوتے وقت اداس ہو جاتا تھا مگر اس مرتبہ زہرہ سے جدا ہوتے وقت اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ اپنا سب کچھ یہیں چھوڑ کر جا رہا تھا اس کی روح زہرہ کے گرد چکر لگاتی رہے گی جس شدت سے اس نے زہرہ کو چاہا تھا، اقرارِ وفا کیا تھا، محبت نبھانے کے عہد و پیمان کیے تھے اسی شدت کے ساتھ زہرہ نے اپنے خاموش اشاروں سے اُس کا جواب دیا تھا۔ شرم و حیا کے پردے میں اقرارِ محبت کیا تھا ———

لکھنؤ سے جانے کے بعد دانش کے خطوط آتے رہے زہرہ کے جواب جاتے رہے اُس وقت اس کی رجمنٹ انبالہ میں تھی ——— بے قراریاں بڑھتی گئیں یہاں تک کہ ایک دوسرے کے بغیر جینا سانس لینا دشوار ہو گیا ——— جب رات آتی تو دانش کے کمرے کی تنہائیوں میں زہرہ کی یاد دبے پاؤں چپکے سے آ جاتی ——— اس کی ایک ایک بات ایک ایک ادا اس کو تڑپاتی ——— اب تو زہرہ کے بغیر جینا دشوار تھا اس نے اپنے ایک خط میں زہرہ کو لکھا تھا ———

میری اپنی زہرہ۔

تمھارے بے پناہ پیار و محبت نے مجھے دائمی خوشی سے روشناس کرایا۔ مجھے ایک ایسی نئی روشنی بخشی جس سے میری زندگی کا ویران چمن مسکرا اٹھا۔ تم نے مجھے اس قدر چاہا، میری آرزوؤں کی اتنی قدر کی اب تمھارے بغیر جینا دشوار ہے۔ نہ جانے اب میں

کب لکھنؤ آسکوں۔ نہ جانے کب چھٹی ملے۔ کیا تم میرا انتظار کروگی؟ کیا تمہیں مجھ میں یاد آتا ہوں؟ میں تو تمہارے بغیر بہت اداس ہوں۔"

"تم جب بھی کبھی آؤ گے مجھے اپنا منتظر پاؤ گے۔ سچ کہتی ہوں دانش اگر تم نہ ملے تو میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔"

لیکن اس سے قبل کہ وہ آتا شہنائیاں بجتیں، گھر سہاگ کے گیتوں سے گونج اٹھتا ۱۹۶۵ء میں جنگ چھڑ گئی۔ اس وقت دانش کی رجمنٹ کو سرحد پر آگے جانے کا حکم آگیا——— مغربی سرحد کے پاس جب اس کی رجمنٹ آگے بڑھ رہی تھی اس وقت ہوائی حملے کے دوران ایک بم اس کی گاڑی کے پاس آکر پھٹا تھا——— اس کو اتنا ضرور یاد تھا کہ ایک زور کا دھماکہ ہوا تھا اور اس کے بعد کیا ہوا اُسے کچھ معلوم نہیں تھا سوائے اس کے کہ جب اسے ہوش آیا تو وہ کمانڈ ہاسپٹل کے آئی۔ سی وارڈ میں بستر پر بے حال پڑا تھا اور اس کے جسم میں خون پہنچایا جا رہا تھا——— اس کے بعد اس پر پھر بے ہوشی طاری ہوگئی۔

کئی روز کے بعد جب خواب آور دوائیوں کا اثر کم ہوا اور اسے ہوش آیا تو دانش نے محسوس کیا کہ اس کی دونوں ٹانگیں سرحد پر رہ گئیں تھیں۔ زندگی میں پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ اس کی روح دل شکن حالات اور بے پناہ غموں کے بوجھ کے نیچے دب کر کچل گئی ہے اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ مار کر ہاسپٹل سے باہر نکل جائے مگر یہ اگنا تو در کنار اب تو وہ اپنے پیروں پر بھی کھڑا نہیں ہو سکتا تھا——— اس کی دردناک چیخوں سے سارا ہاسپٹل لرز اٹھا۔ اُسے یہ احساس بُری طرح تڑپا رہا تھا کہ اگر وہ لڑائی کے میدان میں مادرِ وطن کی حفاظت کرتے ہوئے مر جاتا تو اس کی روح کو اس کی موت پر فخر ہوتا۔ مگر ان کٹی ہوئی ٹانگوں سے نہ تو وہ اب اپنے وطن کی حفاظت کر سکتا تھا اور نہ تو ان اونچے اونچے پہاڑوں سے عشق، جن کی بلند چوٹیوں پر اب بھی اس کے قدموں کے گہرے نشان موجود تھے۔ ان کی برفیلی فضاؤں میں اس کے جسم کی مہک بسی ہوئی تھی .... اور اب وہ کس منہ سے زہرہ کے سامنے جائے گا؟ کس طرح زندگی کے سفر میں وہ زہرہ کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام کر قدم بہ قدم شانہ بہ شانہ چلے گا؟

اس نے زہرہ سے مہر و وفا کی قسمیں کھائی تھیں۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے عہد و پیمان، وعدے وعید کیے تھے مگر اب .....!!

ایسے حالات میں اُسے ایک بھولی بھالی معصوم لڑکی کی زندگی تباہ و برباد کرنے کا کیا حق تھا؟ اب تو اس کی زندگی میں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا مدہم روشنی کا بھی دور دور تک پتہ نہ تھا۔ غم ملے تو ایسے کہ اس کے وجود کو ہی لہولہان کر گئے۔ اب تو اس کی تاریک زندگی میں اُجالے کی ایک ننھی سی کرن تک نہیں چمکے گی۔ اب وہ صبح کبھی نہ آئے گی جو اس نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دیکھی تھی ..... اب تو اس کی زندگی کی شام ہو چکی تھی۔

اسی دن اُس نے ایک اٹل فیصلہ کیا مگر اس سے قبل اُسے محسوس ہوا کہ اس کے دل و دماغ میں خوشیوں کا احساس سرد ہو گیا ہے اور غموں کی تلخی اس کے وجود میں سرایت کر گئی ہے۔ کئی بار اس نے اپنی آنکھوں کو خشک کیا۔ اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالا———۔

یوں تو اس نے زہرہ کو بے شمار رومانی پیارے پیارے خطوط لکھے تھے، بارہا اپنی بے پایاں، بے پناہ محبت کا یقین دلایا تھا، اپنی تنہائیوں اور دوری کے غم کی تلخیوں کا اظہار کیا تھا مگر آج جو جذبات ایک سیلاب کی طرح اس کے دل میں امنڈ رہے تھے ان کا مضمون اُن گزشتہ خطوط سے قطعی مختلف تھا۔ اور اس کو سوچ کر وہ خود کانپ رہا تھا——— مگر اس کے اس المناک فیصلے سے ہی زہرہ کا روشن مستقبل جڑا ہوا تھا۔ اگر اس کی اپنی زندگی بے کار ہو گئی تھی تو وہ کم از کم زہرہ کی زندگی کو تو برباد ہونے سے بچا سکتا تھا——— اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زہرہ کو لکھا تھا———

میری پیاری زہرہ———

مجھے ندامت ہے کہ آج ایک مدت کے بعد تمہیں خط لکھ رہا ہوں اس طویل عرصے میں میں جن دردناک حالات سے دوچار ہوں اس کا علم تمہیں سعیدہ سے ضرور ہوا ہوگا——— اور اس

بیکراں گہرے اندھیرے کا بھی جس نے میرے مستقبل کو نگل لیا ہے اور ہمیشہ کے لیے مجھے تاریکی میں تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا۔

اب میں وہ دانش نہیں رہا جس کی شام و سحر پہاڑوں کی آغوش میں گزرتی تھی۔ جو میلوں صحراؤں اور وادیوں میں پیدل چلتا تھا جس نے نندا دیوی کی چوٹی پر بھارت کا جھنڈا لہرایا تھا۔ وہ دانش جس نے تمھارا ہاتھ پکڑ کر تا عمر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا جس نے تم سے محبت کی قسمیں کھائی تھیں۔ میری جان وہ دانش تو کب کا مر چکا ہے۔ اب جو دانش تم سے مخاطب ہے وہ تو بس ایک زندہ لاش ہے جس کو دیکھ کر تم نفرت اور حقارت سے آنکھیں بند کر لوگی۔ کاش موت کو مجھ پر رحم آ جاتا۔

زہرہ! تمھیں میری محبت کا واسطہ مجھے معاف کر دینا۔ ان حالات میں میں تمھیں اپنا نہ بنا سکوں گا۔ دیکھو نہ میری قسمت نے مجھ سے کیسی بے وفائی کی۔ اب تمھارا دانش صرف سانس لینے کا گناہ گار ضرور ہے ورنہ وہ کب کا مر چکا ہے۔

ہاں تم سے آخری بار ایک التجا کر رہا ہوں جب کبھی تم کسی کی دلھن بننا تو اپنی ہر خوشی اور چاہت کو اس پر نچھاور کر دینا اور کبھی بھولے بسرے میں یاد بھی آ جاؤں تو میری زہرہ تم مجھے بے وفا کے نام سے نہ پکارنا۔

غمگین دانش

اس کی زندگی کے اس فیصلے نے تو اس کی جان ہی لے لی۔

اس رات اسے مارفیا کا پھر انجکشن دیا گیا تھا۔

سال نو آیا۔

کمانڈ کے ہاسپٹل کے کمانڈنگ آفیسر کرنل رے نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے نئے سال کی مبارک باد دی تو دانش کو محسوس ہوا کہ ساری دنیا آنکھیں پھاڑے اسے گھور رہی ہے اور پوچھ رہی ہے۔

"یہ کون بدنصیب انسان ہے جو اپنے اور دنیا کے لیے ایک بوجھ ہے اس کی زندگی کا کیا مصرف ہوگا؟ ۱۹۶۵ء نے اس کی دونوں ٹانگیں چھین لیں۔ ۱۹۶۶ء اس کے لیے کیا لائے گا"

لکڑی کی دو بے جان ٹانگیں!! غم اور اندھیرا....

انتہائی ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

کرنل رے نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا:

"میجر دانش تم ایک سولجر ہو ـــــ بہادر اور دلیر انسان۔ مائی بوائے اُن جوانوں اور شہیدوں کے لیے سوچو جو سرحد پر جا کر واپس ہی نہیں آئے۔ ان کے بچے کبھی اپنے باپ کے قدموں کی آہٹ نہیں سنتے اور ہمیشہ کے لیے ان کی محبت اور شفقت سے محروم ہو گئے، ان کی بیویوں کی مانگیں سیندور کی لالی سے خالی ہو گئیں۔ اس جہان میں ایسے لاکھوں انسان جیتے ہیں جن کی نہ ٹانگیں ہیں نہ آنکھیں ـــــ مگر وہ پھر بھی زندہ ہیں اور زندگی کے ہر غم اور تکلیف کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ ہنستے بھی ہیں اور مسکراتے بھی ہیں۔

زندگی سب سے زیادہ قیمتی شے ہے۔ بے حد پیاری بے حد مقدس ـــــ وقت انسان کو بڑے سے بڑے سانحے اور غموں کو برداشت کرنے کی قوت عطا کرتا ہے ـــــ وقت ایک ایسا مرہم ہے جو بڑے سے بڑے گھاؤ اور ناسور کو بھی بھر دیتا ہے ـــــ تم نے تو مادر وطن کی حفاظت کے لیے یہ قربانی دی ہے۔ تمھارے ایسے نوجوانوں کی بیش بہا قربانیوں کو وطن کبھی فراموش نہیں کر سکتا ہے۔ تم کو تو فخر ہونا چاہیے کہ تمھارے جیسے سپوتوں سے ہی وطن کی آن بان قائم ہے"

اور اسی وقت وارڈ میں ہلکی سی آہٹ سنائی دی ـــــ ہلکے ہلکے قدموں کی آواز آئی ـــــ دانش نے آنسوؤں کے جھلملاتے ہوئے پردوں میں سے تین چہرے دیکھے جو ایک اس کی ضعیف بیوہ ماں کا تھا ـــــ دوسرا اس کی بہن سعیدہ کا اور تیسرا چہرہ زہرہ کا تھا ـــــ ان کے چہرے اداس، پژمردہ اور غمگین ضرور تھے۔ آنکھیں آنسوؤں سے تر ضرور تھیں ـــــ مگر ان سے محبت اور پیار کے بے پایاں سرچشمے پھوٹ رہے تھے ـــــ ان کی پرچھائیاں ہمت اور استقلال کی بلند محرابیں نظر آ رہی تھیں ـــــ

اور ان محرابوں میں سے ان تینوں کی ملی جلی آواز بازگشت سنائی دے رہی تھی۔
"دانش میرے بچے میں تم سے بے حد خوش ہوں؟"
"بھیا آپ نے خاندان کا سر اونچا کر دیا ہے؟"
"دانش میرے محبوب تم ہر حال میں میرے ہو؟"
اور اس وقت اس کمرے میں ایک کرن نمودار ہوئی ایک

پو پھوٹی اور دانش کو ایک خیال آیا ——— ایک نئے اچھوتے اور پاکیزہ جذبے نے کروٹ لی ——
وہ اپنی ماں کے لیے جیئے گا۔
اپنی بہن کے لیے ہر غم سہے گا۔
اور
سنہرہ کے لیے مسکرائے گا...

★

غزل

چندر پرکاش جوہر

زباں کا عشق میں کیا کام گفتگو کے لیے
نگاہ کم نہیں اظہار آرزو کے لیے

کسی طلب کے لیے ہے نہ آرزو کے لیے
حیات رقص میں ہے تیری جستجو کے لیے

وہ پھول ننگ ہے دنیائے رنگ و بو کے لیے
نہ آئے کام جو گلشن کی آبرو کے لیے

جہان عقل سے گزرا تو یہ ہوا معلوم
مقام اور بھی ہیں تیری جستجو کے لیے

چمن کی سیر مبارک تجھے مگر ہمدم
"سلیقہ چاہیے پھولوں سے گفتگو کے لیے"

بڑے شعور بڑے اہتمام سے جوہر
غزل کہی ہے تغزل کی آبرو کے لیے

غزل

محمد مومن الدین شیدا

زندگی ہے کوئی زندگی کی طرح
ہر خوشی دور ہے، اجنبی کی طرح

اک تری موج برق تبسم فشاں
مجھ کو نہلا گئی، چاندنی کی طرح

مائل زہد و تقویٰ نہ ہم بن سکے،
فکر جنت کریں، شیخ جی کی طرح

جانتے ہوں تو فرمائیے کون ہے،
دل کے آئینے میں آپ ہی کی طرح

تو نہ تقلید سجدہ کو ایماں سمجھ،
شیخ کر بندگی، بندگی کی طرح

حسن اخلاق شیدا بڑی چیز ہے
جب کسی سے ملو، آدمی کی طرح

غزلیں

مصطفیٰ فطرت

کوئی خطا کوئی لغزش کوئی قصور سہی
اگر بشر ہے تو پھر کچھ نہ کچھ ضرور سہی

ہزار عیش و مسرت سے دور دور سہی
ہزار رنج و غم و درد کا وفور سہی

ہمارے پاس متاعِ دلِ صبور تو ہے
زمانہ ساز نگاہوں میں بے شعور سہی

خودی کو جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں
اگر غرور یہی ہے تو پھر غرور سہی

کمالِ جبر و تشدد پہ مسکراتا ہے
غمِ حیات کا مارا غموں سے چور سہی

ادب شناس نظر ہے تو اٹھ نہیں سکتی
ہزار حسن کی مورت ہزار حور سہی

ہمیں خود اپنی نظر سے حجاب آتا ہے
زمانہ بھر کی نگاہوں میں بے قصور سہی

غمِ حیات کی لذت کچھ اور ہے فطرت
خوشی میں کیف سہی عیش میں سرور سہی

قاسم شبیر نقوی

خلوصِ غم نہ چھپا رسمِ احترام کے بعد
رکے نہ اشک بہت دیر تک سلام کے بعد

ترے فراق کے لمحوں پہ رک گئی یہ حیات
کوئی سحر نہ ہوئی تیرے غم کی شام کے بعد

بہ رنگ ربطِ گریزاں بنامِ رسمِ وفا
وہ دیکھتے ہیں مجھے کتنے اہتمام کے بعد

ہمیں نے بڑھ کے پلائی ہے حوصلوں کی شراب
کہ بزم چپ تھی صدائے شکستِ جام کے بعد

تمام ہو نہ سکی دل کی داستانِ نیاز
پھر ابتدا ہوئی ہر بار اختتام کے بعد

میں اپنے شعر بھی پڑھنے کی تاب لا نہ سکا
تری نگاہ کی کیفیتِ کلام کے بعد

متاعِ زیست ہے قاسم یہ زخمِ محرومی
اب اور چاہیے کیا حسرتِ دوام کے بعد

فخرالاسلام اعظمی

پیار کے پھولوں سے ہر بستی سجا دی جائے
جو بھی نفرت کی ہو دیوار گرا دی جائے

کتنا سجتا ہے ہر اک جسم پہ زخموں کا لباس
بازوئے قاتل و خنجر کو دعا دی جائے

شہر میں اجنبی لگتی ہے محبت کی صدا
اب سے ویرانوں میں چل کر یہ صدا دی جائے

بن گئی میرا مقدر اس جبیں کی تحریر
میرے ہاتھوں کی ہر تحریر مٹا دی جائے

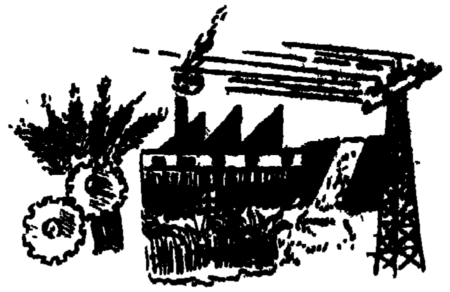
ہے گوارا مجھے اے دوستو! ہر ایک سزا
شرط یہ ہے کہ نہ جینے کی سزا دی جائے

کوئی گالی، کوئی پتھر، کوئی کانٹا، کوئی زخم
مجھ کو اے شہرِ وفا! نذرِ وفا دی جائے

سارے گلشن میں ہو جو اس سے چراغاں ممکن
آگ خود اپنے نشیمن میں لگا دی جائے

آج ہر شخص نظر آتا ہے اپنا قاتل
آج اے دوستو! کس کس کو سزا دی جائے

جسم تو ہو ہی چکا نذرِ غمِ دل نازش
روح بھی غم کی صلیبوں پہ چڑھا دی جائے



اُتّر پردیش شاہراہِ ترقی پر

● کمزور طبقوں کو مفت قانونی مشورہ اور مالی امداد ● ٹیوب ویلوں اور پمپ سیٹوں کو بجلی کی مسلسل فراہمی کے لیے یقینی بندوبست ● یو۔پی کے مختلف مرکزوں پر سیاحتی بنگلے ● اعظم گڑھ میں زمین کی تقسیم ● خشک سالی سے متاثرہ علاقوں سے متعلق پروگرام کے تحت چھ اضلاع مستفید ● یو۔پی چھیتر سمتی اور ضلع پریشد آرڈی نینس نافذ ● پسماندہ علاقوں میں صنعتوں کے قیام کے لیے مالی امداد ● صفائی مزدوروں کے لڑکوں کی پولیس میں بھرتی ● ۱۰لاکھ سے زائد خاندانوں کو رہائشی پلاٹوں کی فراہمی، ● ماہنامہ "سرِ دجنا" کے دو شمارے ضبط ● ۱۰ادی کاموں کے لیے ۳۰لاکھ ۳۲ ہزار روپیہ منظور ● خواتین کی ریاستی ڈائرکٹری کی اشاعت

عدالتوں میں دائر مقدمات کے سلسلے میں اقوام قبائل مندرجہ فہرست ڈی نیفائڈ قبائل اور بے زمین مزدوروں کو جو مالی مشکلات کے باعث مقدمات کی پیروی نہیں کرسکتے، مفت قانونی اور مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

ریاستی حکومت نے اپنے اس فیصلہ سے ضلع حکام کو مطلع کرتے ہوئے اس پر عملدرآمد کی ہدایت جاری کردی ہے۔ ضلع ہریجن اور سماجی بہبود افسروں کو بھی اس سلسلے میں جملہ ضروری امداد بہم پہنچانے کی ہدایت کی گئی ہے۔

فیصلہ کے بموجب اس شخص کو جو امداد کا خواہشمند ہو متعلقہ ضلع مجسٹریٹ سے اپنی ذات کا سرٹیفکٹ اور متعلقہ تحصیلدار سے ماہانہ آمدنی کا سرٹیفکٹ حاصل کرنا ہوگا۔ دیہی علاقے کے رہنے والے کو گاؤں سبھا کے پردھان کا سرٹیفکٹ بھی لینا ہوگا۔

ریاستی حکومت کے علم میں اس قسم کی شکایتیں لائی گئی ہیں کہ سماج کے کمزور طبقوں کو پریشان کیا جارہا ہے، ان کی زمینوں سے انہیں بیدخل کیا جارہا ہے اور ان کو الاٹ کی گئی زمینوں پر قبضہ لینے سے باز رکھا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ قرضہ نجات قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انھیں پشتینی قرضوں کی ادائیگی کے لیے بھی مجبور کیا جارہا ہے۔

❊ ❊ ❊

اتر پردیش میں آئندہ ربیع کے دوران سینچائی کے لیے مسلسل پانی مہیا کرنے کی غرض سے ۲۵، ۲ لاکھ نجی اور سرکاری ٹیوب ویلوں اور تمام بڑی اور چھوٹی پمپ نہروں کو ۲۴ گھنٹے بجلی فراہم کرنے کے پیش نظر ریاستی بجلی تنظیم کو پوری طرح چاق وچوبند بنا دیا گیا ہے۔

بجلی کی باقاعدہ فراہمی برقرار رکھنے کے لیے اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ ۵۰۰ سے زیادہ مسروقہ اور خراب ٹرانسفارمروں کی جگہ دوسرے ٹرانسفارمر لگانے کی کارروائی پہلے ہی کر رہا تھا۔ اس کے بعد جو ٹرانسفارمر اب خراب یا چوری ہوں گے ان کی جگہ پر ۲۴ گھنٹے کے اندر دوسرے ٹرانسفارمر لگا دیئے جائیں گے تاکہ آبپاشی میں کوئی خلل نہ پڑے۔

اس اثنا میں ریاست کی بجلی کی موجودہ صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے مسلسل جو کوششیں کی جارہی ہیں، پچھلے آئندہ مہینوں میں چھبرہ بجلی گھر میں ۶۰-۶۰ میگاواٹ کے دو یونٹوں، کلہل بجلی گھر میں ۱۰ میگاواٹ کے ایک یونٹ اور اوبرا بجلی گھر میں ۱۰۰ میگاواٹ کے ایک یونٹ کے چالو ہوجانے سے بجلی کی پیداواری صلاحیت میں ۲۴۰ میگاواٹ سے زیادہ کا اضافہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔

ریاست میں بجلی کی مجموعی پیداواری صلاحیت میں جو اس وقت ۲۱۴۰ میگاواٹ تک پہنچ گئی ہے، موجودہ سال کے آخر تک مزید ۲۰۲

میگاواٹ کا اضافہ متوقع ہے۔

رام گنگا پراجکٹ کے تحت رام گنگا بن بجلی گھر کا ۶۶ میگاواٹ کا یونٹ بجلی پیدا کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ جمنا ہائیڈل اسکیموں کے تحت چھبڑ بجلی گھر کا ۶۰ میگاواٹ کا چوتھا یونٹ اور کلہل بجلی گھر کا ۱۰ میگاواٹ کا تیسرا یونٹ دسمبر تک بجلی پیدا کرنے لگے گا۔

اس کے علاوہ امید کی جاتی ہے کہ ریہانڈ بجلی گھر کا کمپلکس، جسے ریہانڈ ذخیرہ آب سے جو اس سال تقریباً بھر چکا ہے، پانی ملتا ہے اوسطاً ۱۳ ملین یونٹ یومیہ بجلی پیدا کرے گا۔

ذیلی بجلی گھروں کی صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لیے حسب ضرورت ان میں ٹرانسفارمر لگانے کے لیے بھی اقدامات کیے گئے ہیں۔

٭ ٭ ٭

یوتھ ہاسٹل نینی تال کی عمارت کو جو تیار ہو گئی ہے اور اس میں بجلی اور پانی کا بھی بندوبست ہو گیا ہے، اتر پردیش کی نظامت سیاحت کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ اب ہوسٹل کو صرف بڑی سڑک سے ملانے والی سڑک بننا باقی ہے۔ ہاسٹل کی آرائش اور فرنیچر وغیرہ کے لیے ۵۰ ہزار روپیہ کی منظوری دے دی گئی ہے۔ سیاحوں کے لیے گھنگھریا میں چار کمروں پر مشتمل ریسٹ ہاؤس، بدری ناتھ ضلع چمولی میں ہوسٹل، گنگوتری میں ریسٹ ہاؤس، گنگنانی ضلع اترکاشی میں ریسٹ ہاؤس کی تعمیر اور بدری ناتھ کے ٹورسٹ ہاسٹل میں بجلی پہنچانے کا کام یا تو پورا ہو چکا ہے یا تکمیل کے قریب ہے۔

کوسانی میں لکڑی کے مکان، الموڑہ میں ہالی ڈے ہوم، پوڑی میں ٹورسٹ ریسٹ ہاؤس، مسوری میں ٹورسٹ بنگلہ اور ڈاک پتھر ضلع دہرہ دون میں ٹورسٹ ریسٹ ہاؤس اور رودر پریاگ میں سیاحوں کے لیے سائبان تعمیر کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔ اتر پردیش کے پہاڑی ترقی محکمہ سے کہا گیا ہے کہ وہ پہاڑی علاقوں میں مختلف مقامات پر ٹورسٹ بنگلوں کی تعمیر کے لیے منتخب مقامات کی ایک فہرست محکمہ سیاحت کو فراہم کرے۔

میدانی علاقوں میں بھی سیاحوں کے لیے کچھ بنگلے اور ریسٹ ہاؤس تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ بنگلے اور ریسٹ ہاؤس مہوبہ (ہمیرپور)، چترکوٹ (باندہ بند) ڈگرطہ (بستی)، اور شیشیا پور (ضلع مرزاپور) میں تعمیر کیے جائیں گے۔

٭ ٭ ٭

ضلع اعظم گڑھ میں اقوام و قبائل مندرجہ فہرست، دیہی دستکاروں اور بے زمین کھیت مزدوروں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے ۲۵۵۸۹ افراد کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمین الاٹ کی جا چکی ہے۔ اس مقصد کے لیے ۲۱۵۷ مواضعات میں تقریباً ۱۰۸۵۔۱ ایکڑ زمین الاٹ کی گئی ہے جس سے ۲۴۲۴۶ ہریجنوں اور سماج کے کمزور طبقہ ۱۳۴۳ افراد مستفید ہوئے۔

جن لوگوں کو زمین الاٹ کی گئی ان میں سے ۲۵۳ افراد کو چھوڑ کر باقی سبھی افراد کو زمین پر قبضہ دیا جا چکا ہے۔

زمین کی تقسیم سے متعلق پروگرام کے تحت اب تک ۴۲۲ مواضعات میں ۱۲۹۸۱ بے زمین افراد کو ۱۵۶۲۔۱ ایکڑ زمین الاٹ کی جا چکی ہے جس میں سے ۱۲۸۴ افراد کو زمین پر قبضہ بھی دیا جا چکا ہے۔

ضلع انتظامیہ کی جانب سے بے زمین افراد کو زمین تقسیم کرنے کی ایک زبردست مہم شروع کی گئی ہے جس کے تحت امید کی جاتی ہے کہ اگلے دو مہینوں میں ۱۵۰۰ ایکڑ زمین تقسیم کی جائے گی۔ تقسیم کے لیے جو زمین دستیاب ہو گی اس میں ضلع میں جوتوں کی چک بندی کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی ۱۰۰۰ ایکڑ فاضل زمین بھی شامل ہے۔

٭ ٭ ٭

خشک سالی سے متاثرہ علاقوں سے متعلق پروگرام کی مختلف اسکیموں کے تحت ریاست کے محکمہ آبپاشی نے مجموعی طور پر ۱ کروڑ روپیہ سے زیادہ لاگت سے اب تک چھ اضلاع میں تقریباً ۶۰۰۰ ہکٹیر مزید آراضی کے لیے آبپاشی کی سہولتیں مہیا کی ہیں۔

چھ اضلاع میں سینچائی کی جو مزید صلاحیت پیدا کی گئی ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

مرزاپور ۱۱۰۰ ہکٹیر، وارانسی ۸۳۴۵ ہکٹیر، الہ آباد تقریباً ۱۱۰۰ ہکٹیر، باندہ ۱۵۰۰ ہکٹیر سے زائد، ہمیرپور ۵۰۰ ہکٹیر اور

جالون ... ، ہیکٹیر۔ ان اضلاع میں یہ صلاحیت بندھیوں، گولوں اور چھوٹی پمپ نہروں کی تعمیر نیز قدرتی چشموں پر بجو لیڈوں کی تعمیر سے پیدا کی گئی ہے۔

ریاستی حکومت جواب اخراجات کا ۵۰ فیصد برداشت کرتی ہے ۱۲ کروڑ روپیہ کی لاگت سے موجودہ منصوبہ کی مدت کے دوران ان اضلاع میں ۱۴۱ سینچائی اسکیمیں شروع کرنے کی تجویز رکھتی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ان اسکیموں کی تکمیل سے آبپاشی کی مزید ... ۶۱ ہیکٹیر صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔

اس سال شروع کی گئی متعدد اسکیموں پر ۲ کروڑ روپیہ کی رقم خرچ کرنے کی تجویز ہے۔ زیر نظر مدت کے دوران اس پروگرام کے تحت جن کا مقصد پسماندہ اور خشک سالی سے متاثرہ اضلاع میں کمزور طبقوں کی زرعی معیشت کو ترقی دے کر ان کی معاشی حالت کو بہتر بنانا ہے بڑی تعداد میں لوگوں کو روزگار فراہم کیا گیا ہے۔

٭ ٭ ٭

گورنر اترپردیش ڈاکٹر ایم۔ چنا ریڈی نے یو۔پی چھیتر سمتی اور ضلع پریشد (ترمیمی) آرڈی نینس، ۱۹۷۵ء جاری کر دیا ہے۔

اس آرڈی نینس کی رو سے، جو فوری طور پر نافذ ہو گیا ہے، اگر کسی ضلع پریشد کا صدر اپنی عدم موجودگی یا کسی سبب سے اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتا اور نائب صدر کی جگہ خالی ہے تو وہاں عارضی بندوبست کے طور پر کوئی ایسا شخص صدر کے فرائض انجام دے گا جسے ریاستی حکومت اس مقصد کے لیے نامزد کرے گی۔

اسی طرح اگر کسی چھیتر سمتی کا پرمکھ اپنے فرائض انجام دینے سے معذور ہو اور نائب پرمکھ کی جگہ خالی ہو تو اس صورت میں ضلع مجسٹریٹ کسی شخص کو پرمکھ کے فرائض انجام دینے کے لیے مقرر کر سکتا ہے۔

٭ ٭ ٭

ریاست میں صنعتیں قائم کرنے کے لیے ریاستی صنعتی کارپوریشن نے مالی سال رواں کے دوران گزشتہ اگست تک جو مالی امداد دی تھی اس سے ۴۲۱۸ لاکھ ۸۸ ہزار روپے کی سرمایہ کاری میں مدد ملے گی جس کے نتیجہ میں ۳۱۴۱۴ افراد کو روزگار مہیا ہوگا۔ اس سلسلہ میں ۵۸۶۸۱ فیصد سرمایہ کاری ریاست کے پسماندہ اضلاع میں کی جائے گی اور وہاں روزگار کے جو مواقع فراہم کیے جائیں گے ان کا فیصد ۹۰ر۳ ہوگا۔

کارپوریشن ریاست کے پچھڑے منطقوں میں صنعتوں نیز تکنیکی صنعت کاروں کو مالی امداد دینے پر خاص زور دے رہا ہے۔ تخفیف شدہ آسان شرحوں پر قرضے دیئے جاتے ہیں جن میں [illegible] اور کم زرضمانت وغیرہ شامل ہیں۔

کارپوریشن نے اپنی کارکردگی کو بہتر بنایا ہے اور اپنی مختلف سرگرمیوں کے لیے مقررہ مدتی پروگرام وضع کیا ہے۔

٭ ٭ ٭

ریاستی حکومت کے ایک حالیہ فیصلے کے مطابق ریاست میں صفائی مزدوروں کے تقریباً ۲۵۰ لڑکوں کو پولیس میں کانسٹبل کی حیثیت سے بھرتی کیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ اس کے لیے جسمانی اعتبار سے موزوں ہوں اگر ضروری ہوا تو ان کے لیے مقررہ تعلیمی استعداد کی شرط کو ختم کر دیا جائے گا۔

حکومت نے صفائی مزدوروں کی فلاح کے لیے ہر میونسپل بورڈ میں ایک صفائی مزدور کو ممبر کی حیثیت سے نامزد کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

٭ ٭ ٭

ریاستی صدر مقام پر موصولہ اطلاعات کے بموجب اترپردیش کے ۴۲ ضلعوں میں اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمین الاٹ کرنے کا کام مکمل ہو گیا ہے۔

ریاست میں اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے ۱۱ لاکھ ۳۶ ہزار سے زیادہ خاندانوں میں سے اب تک دس لاکھ ۲۵ ہزار خاندانوں کو مکانات کے لیے زمین الاٹ کی جا چکی ہے۔

اترپردیش کے جن ۴۲ ضلعوں میں مکانات کی تعمیر کے لیے زمین الاٹ کرنے کا کام مکمل ہو چکا ہے وہ یہ ہیں — شاہجہانپور، پیلی بھیت، فتح پور، باندہ، للت پور، جونپور، اعظم گڑھ، الموڑہ، پوڑی، گڑھوال، پتھورا گڑھ، چمولی، اتر کاشی، لکھنؤ، اناؤ، رائے بریلی، کھیری، گونڈہ، بہرائچ، پرتاپ گڑھ، بارہ بنکی، نینی تال، جالون، سلطانپور اور سیتاپور۔

اسی اثنا میں ریاستی حکومت کے صدر مقام پر مرتب کردہ اعداد و شمار کے بموجب انتہائی حد بندی قانون کے نفاذ کے نتیجہ میں ۳۵۰۰۰ ایکڑ سے زیادہ فاضل قرار دی گئی زمین ریاست میں گزشتہ ستمبر کے دوران ۲۷۰۰۰ بے زمین کھیت مزدوروں میں تقسیم کی گئی۔

٭ ٭ ٭

حکومت آندھرا پردیش نے ماہنامہ "سرجنا" کے دسمبر ۱۹۷۴ء اور مئی ۱۹۷۵ء کے دو شمارے ضبط کر لیے ہیں جن کا مدیر شریمتی پی ہیم لتا ساہتی متھرو لانے کی تھی اور جو ونکٹار میں مدرا لیم، ورنگل سے طبع کیے گئے تھے۔

ان دونوں شماروں میں ایسا مواد موجود ہے جس کا مقصد ہندوستان میں قانونی طور پر قائم شدہ حکومت کے خلاف نفرت، حقارت اور بیزاری کا جذبہ پیدا کرنا اور اتحاد و ہم آہنگی کو درہم برہم کرنا ہے۔ اس قسم کے مواد کی اشاعت تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۴ اے کے تحت قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے۔

٭ ٭ ٭

ریاستی حکومت نے موجودہ مالیاتی سال کے دوران گزشتہ ۳۰ ستمبر تک امدادی کاموں کے لیے ۳۰ لاکھ ۳۲ ہزار روپے کی رقم منظور کی تھی۔ اس رقم میں سے ۷ لاکھ ریاستی محکمہ آبپاشی کو اور ۲۳ لاکھ ۳۲ ہزار روپے قدرتی آفات سے متاثر ہونے والے ۱۱ ضلعوں کو الاٹ کی گئی ہے جن کی تفصیل یہ ہے۔

مرزا پور ۔ ۹ لاکھ ۵۰ ہزار روپیہ، بہرائچ ۔ ۵۰۰۰۰ روپیہ بستی ۔ ۳ لاکھ ۵۰ ہزار روپیہ ۔ دیوریا ۔ ۵ لاکھ روپیہ، الٰہ آباد ۔ ایک لاکھ روپیہ، گورکھپور ۔ ایک لاکھ روپیہ، باندہ ایک لاکھ روپیہ، ہمیر پور ایک لاکھ روپیہ، غازی پور ۔ ۲۰۰۰۰ روپیہ، پیلی بھیت ۔ ۱۲۰۰۰ روپیہ اور نینی تال ۔ ۵۰۰۰۰ روپیہ۔

٭ ٭ ٭

خواتین کے عالمی سال سے متعلق ریاستی کمیٹی نے، آج کی ہندوستانی خواتین کے موضوع پر ایک ڈائرکٹری شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً سیاسی، سماجی، تعلیمی، صنعتی، طبی، صحافت اور فنون لطیفہ کے میدان میں کام کرنے والی تقریباً ۵۰۰ ممتاز خواتین کے حالات زندگی پر مشتمل ہوگی۔

ریاست کی برسرکار خواتین کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ متعلقہ ضلع کے ضلع ہریجن و سماجی فلاح افسر سے مقررہ فارم حاصل کر لیں اور ان کی خانہ پری کے بعد انھیں براہ راست شریمتی بی۔ کے ملا، صدر، ریاستی سماجی مشاورتی بورڈ، اترپردیش، لکھنؤ کو بھیج دیں۔

٭ ٭ ٭

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

ہاتھ ہمارے قلم ہوئے : راجندر سنگھ بیدی۔ شائع کردہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔

طبع اول مارچ ۱۹۷۴ء۔ ضخامت ۲۴۰ صفحات، قیمت: دس روپے

مختصر افسانہ اردو ادب میں ایک نئی صنف کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اسی بیسویں صدی کی ہی پیداوار ہے۔ اس کی پیدائش میں مغربی ادبیات کے اثرات سے انکار ممکن نہیں۔ اردو میں افسانہ نگاری کو کچھ عرصے قبل تک "کل کی چھوکری" کہا جاتا تھا مگر اب یہ جوان ہو کر بقول ایک ناقد "اپنی تمام تر رعنائیوں اور برنائیوں کے ساتھ ہماری توجہ کا مرکز" بنی ہوئی ہے۔ مغربی ادبیات کے مطالعے سے ہماری بڑھتی ہوئی دل چسپی اور طباعت و اشاعت کی آسانیوں کے نتیجے میں رسائل و اخبارات کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ اردو افسانہ نگاری کی توسیع و ترقی میں اہم معاون ہیں۔ افسانہ نگاری کے میدان میں آج ایک کثیر انبوہ نظر آتا ہے مگر افسانہ نگاروں کے اس جم غفیر میں جن چند گنے چنے فن کاروں نے اپنی انفرادی اور امتیازی حیثیت منوالی ہے راجندر سنگھ بیدی بھی ان میں شامل ہیں۔ بیدی اردو میں صف اول کے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے افسانہ نگاری کی تاریخ میں چند ایسے دل کش، گہرے اور روشن نقش و نگار بنائے ہیں جو وقت کی گرد اور گم نامی کی تاریکی سے یقیناً محفوظ رہیں گے۔

قبول عام کے ساتھ ساتھ بقائے دوام کے دربار میں بھی اپنا مقام حاصل کرنا آسان نہیں۔ اس کے لیے فن کار کو فن کی دشوار گزار گھاٹیوں میں ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں۔ فن پاروں کو خون جگر دینا ہوتا ہے۔ تخلیقات کو فکر و نظر کی روشنی سے معمور کرنا پڑتا ہے۔ مطالعے اور مشاہدے میں نہ صرف بصارت صرف کرنی پڑتی ہے بلکہ اس کے نتیجے میں فن کار جو اخذ و اکتساب کرتا ہے اسے اپنے فن پاروں میں پیش کرنے کے لیے بصیرت کا ثبوت بھی دینا ہوتا ہے۔ قبول عام اور بقائے دوام کا دربار صاحبان قلم سے بصارت و بصیرت کے ساتھ ساتھ جرات کا بھی متقاضی ہوتا ہے۔ اس منزل پر اظہار حق میں ہاتھ بھی قلم ہو سکتے ہیں اور فن کار پھر بھی "جنوں کی حکایات خونچکاں" لکھنے سے باز نہیں آتا۔ راجندر سنگھ بیدی بہ حیثیت افسانہ نگار قبول عام کے دربار میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں اب بقائے دوام کے دربار میں ان کو کیا مرتبہ دیا جائے گا اس کا فیصلہ اردو کے مورخین و ناقدین مستقبل میں کریں گے۔

بیدی نے اپنی نگارشات میں تعداد سے زیادہ معیار پر توجہ صرف کی ہے۔ ان کی مختلف تصانیف جن میں دانہ و دام، گرہن، اپنے دکھ مجھے دے دو، ایک چادر میلی سی، لمبی لڑکی، اور سنجوگ شامل ہیں اگرچہ یہ تعداد میں بہت زیادہ نہیں لیکن ان میں بیدی نے جگہ جگہ شعور فن کے ثبوت فراہم کر دیے ہیں۔

افسانہ نگاری میں جن فن کاروں نے اپنے فن پاروں میں خارجی واقعیت پر زیادہ توجہ دی ہے ان میں بیدی کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ زندگی کی خارجی عکاسی کرنے والے افسانہ نگار، جن میں کرشن چندر، حیات اللہ انصاری اور اپندر ناتھ اشک وغیرہ شامل کیے جا سکتے ہیں سیاسی سماجی، معاشی اور معاشرتی موضوعات پر کہانیاں لکھتے رہے ہیں اور اپنے افسانوں میں ایک فکری نظام کی تبلیغ و اشاعت کا رجحان رکھتے ہیں۔ بیدی کی کہانیاں کسی واضح سیاسی رجحان کی نشان دہی تو نہیں کرتیں لیکن ان میں سماجی، معاشی اور معاشرتی تحریکات کے نقوش نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ بیدی کے متعدد افسانوں کو اردو میں ترقی پسند تحریک کے تحت پیدا ہونے والے ادب کا قیمتی سرمایہ قرار دیا گیا ہے۔ بیدی کے افسانوں میں خارجی واقعیت ضرور ملتی ہے مگر اس واقعیت میں قطعیت نہیں ہوتی۔ ان کی حقیقت نگاری میں رومانیت اور تخیل کا امتزاج بھی اہم شے ہے جس کا اظہار و اقرار انھوں نے اپنی تصنیف گرہن کے پیش لفظ میں خود بھی کیا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی فن افسانہ نگاری میں لکیر کے فقیر نہیں رہے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کسی ایک مقررہ ڈگر پر چلنے کے بجائے اپنے ارتقائی سفر میں مختلف منزلوں اور متعدد موڑوں سے دوچار ہوتی رہی ہے۔ انھوں نے ایک زمانے میں اپنے افسانوں میں دیہاتی زندگی کو پیش کیا ہے مگر زیر تبصرہ مجموعہ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے کے افسانوں میں ماڈرن شہری زندگی بھی جلوہ گر ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں سماج کے نچلے طبقے کے ساتھ ساتھ متوسط اور اعلا طبقوں کے کردار بھی نظر آتے ہیں۔ خارجی حقیقت نگاری کے دوش بدوش ان کے افسانوں میں داخلی کیفیات کے بھی کامیاب تجزیے ملتے ہیں۔ اسی لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بیدی کا فن یک رخے پن کا شکار نہیں۔ ان کی دنیا محدود نہیں۔ ان کے فنی تجربات میں بوقلمونی ان کی افسانہ نگاری کو جمود اور ٹھہراؤ سے محفوظ رکھتی ہے۔

پیش نظر مجموعہ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے بیدی کے دس افسانوں پر مشتمل ہے۔

یہ بیدی کی ایک کامیاب افسانوی تصنیف ثابت ہوتی ہے جس کو افسانے سے دل چسپی رکھنے والے قارئین پسند کریں گے۔ بیدی اس تصنیف

کہ یہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

کتاب، کاغذ، طباعت، کتابت اور گیٹ اپ کے اعتبار سے مکتبہ جامعہ کے معیار کا تسلی بخش نمونہ ہے۔

— کاظم علی خاں

آبلے (مجموعہ کلام) مدہوش بلگرامی۔ ملنے کا پتہ: آشا بلگرامی، باندرہ، بمبئی۔

صفحات ۱۰۰

مدہوش بلگرامی کا دوسرا مجموعہ کلام "آبلے" پیش نظر ہے۔ سردار جعفری کا خیال ہے "مدہوش کا لہجہ اور تخیل بے باک ہے۔ نئی لفظی تصویروں کے ساتھ نئی ترکیبیں، اشعار کا مزاج بھی نیا ہے اور آداب شاعری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ... نمایاں ہے۔"

... اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ شاعری ہی کیا جس میں عصری مسائل کی بازگشت نہ سنی جاسکے۔ مدہوش کی شاعری میں عصری حسیت لفظی تصویروں کے ساتھ نہ صرف موجود ہے بلکہ شاعر کے احساس کی کئی سطحیں بیک وقت بے نقاب ہو جاتی ہیں۔

داخلیت پسندی اردو شاعری کا طرۂ امتیاز رہی ہے لیکن مدہوش نے "دردن خانہ" کی شاعری کو بھی "عوامیت" کے خانہ میں بٹھا دیا ہے۔ اس میں جہاں ان کی فنی پختگی کو دخل ہے وہیں ان کے فکری میلان کی بھی کارفرمائی ہے۔ وہ خود تحریر فرماتے ہیں۔

"فن کار ظلم اور جبر کا خاموش تماشائی نہیں بلکہ محبت، صداقت، حق اور انصاف کا پرجوش علمبردار ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ حقیقت کی اصل پرتوں پر ہوتی ہے۔ محنت کش طبقے کی خدمت فن کار کا منصب ہے اور آزادی تخلیق کی ضمانت بھی۔"

نظم "ایلیا کے نام" میں ہر چند شاعر کے ذاتی تجربے کا بیان ہے لیکن اس میں اجتماعی تاثر کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

میری آنکھوں کے نور لخت جگر
تو کہاں ہے مجھے یہ دے خبر
تیری یادوں کا آسرا بھی نہیں
کوئی آہٹ کوئی صدا بھی نہیں
کیسے طے ہوگا زندگی کا سفر
تو کہاں ہے مجھے یہ دے خبر

مدہوش کی غزلیں نظموں کی بہ نسبت زیادہ باوزن اور بھرپور تاثر لیے ہوئے ہیں۔ ان کی غزلوں میں مٹھاس بھی ہے اور تلخی بھی۔ اگرچہ ان کی غزل کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے لیکن جتنا بھی ہے وہ ان کو نئی نسل کے شعرا میں بہت جلد نمایاں مقام دلانے کے لیے کافی ہوگا۔

——— (سید نظر برنی)

خامۂ دل (مجموعہ کلام) ابن احمد تاب۔ ملنے کا پتہ: ادبی ٹرسٹ حیدر آباد۔ قیمت: دو روپے پچاس پیسے:۔ صفحات ۸۰

غزل بڑی کافر صنف سخن ہے۔ اس صنف سخن میں طبع آزمائی کرنا ہنسی کھیل نہیں۔ لیکن دیار دکن کے نوجوان شاعر ابن احمد تاب اس نازک مرحلے سے بڑی خوبی کے ساتھ گزر گئے ہیں۔ تاب نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن جو وقار، جو بالیدگی اور جو تفکر ان کی غزلوں میں ہے وہ نظموں میں نہیں۔ وہ ایک خوش گو، خوش فکر اور ذہین شاعر ہیں۔

تاب کے ہاں داخلی اور خارجی احساسات کے توازن کا سلیقہ نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں ایک طرف عصری حسیت ہے تو دوسری طرف کلاسیکی کا رچاؤ بھی موجود ہے۔ ان کے یہ اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں:

یہ تو ممکن ہی نہیں وقت کی رفتار رکے — وقت کے ساتھ ہمیں دوستو چلنا ہوگا
ہائے اپنوں ہی کی محفل میں ہوا دل کا لہو — خوں بہا مانگئے کس سے کسے قاتل کہیے
جو جلی بھی تو چراغوں کی محبت گئی — صبح کے ساتھ خیال شام آج بھی ہے
مسکراتا ہوں بہ انداز تصنع ہی سہی — کم سے کم دیکھنے والے تو کہیں شادوں میں
راستے ابھرتے ہیں منزل نظر ہو کر — ہم کہیں نہ رہ جائیں وقت رہ گزر ہو کر

منظومات کے ذیل میں "صبح حق"، "دیار گول کنڈہ"، "چہرے"، "شکست" اور "عید" مطالعہ کی مستحق ہیں۔

——— (سید نظر برنی)

★

نیا دور

جلد ۳۱ نمبر ۱۰

جنوری ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: روی موہن سیٹھی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن وبھاگ۔ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی،
خط وکتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

گردش لیل و نہار کے درمیان ایک سال اور ختم ہوگیا اور ہم نئے سال میں قدم رکھ رہے ہیں۔ ملک اور بیرون ملک کے واقعات اور حالات کے اعتبار سے ۱۹۷۵ء جتنا اہم اور غیر معمولی سال رہا اتنا شاید ہی کوئی اور سال رہا ہو۔ اس سال دنیا نے ویت نام کی جنگ اور پرتگال و اسپین میں ڈکٹیٹر شپ کا خاتمہ، افریقہ اور بعض دوسری نوآبادیوں کی آزادی اور زہرہ پر روسی خلائی جہازوں کو پے در پے اترتے اور آریہ بھٹ کے ذریعہ ہندستان کو خلائی دور میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ پھر ایک مرکزی وزیر کا بہیمانہ قتل، ہندستان کے چیف جسٹس پر قاتلانہ حملہ، حزب مخالف کی شہ پر بڑھتی ہوئی بدنظمی اور تشدد وانہ واقعات کے پیش نظر ملک کو انتشار اور بدامنی سے بچانے کے لیے ہنگامی حالات کا نفاذ، عوام خاص کر کمزور طبقوں کی ترقی و بہبود کے لیے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کا اعلان، وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے خلاف دائر کی جانے والی انتخابی عذرداری کے سلسلے میں الہ آباد ہائی کورٹ اور اس کے بعد سپریم کورٹ کے فیصلے، ۱۹۷۵ء کو بین اقوامی خواتین سال قرار دیا جانا، اتر پردیش میں شری ہیم وتی نندن بہوگنا اور ان کی وزارت کے استعفے کے بعد ایک بار پھر صدر راج کا قیام اس سال کے اہم واقعات ہیں۔

آہ پروفیسر مسعود حسن رضوی

علمی، ادبی اور سائنسی دنیا خاص طور سے اردو ادب اور صحافت کے لیے ۱۹۷۵ء کا سال بہت ہی منحوس ثابت ہوا۔ اسی سال ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، سردار دیوان سنگھ مفتون، علامہ حیرت بدایونی، صدیق بک ڈپو لکھنؤ کے بانی مولوی محمد صدیق جو اپنی ذات سے ایک ادارہ تھے، شمیم کرہانی، ڈاکٹر رغیب حسین، ہزار لکھنوی، محوی صدیقی لکھنوی، انیس احمد عباسی اور ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسے نامور ادیب، شاعر، صحافی، دانشور اور فلسفی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ابھی ہم ان سانحات کے دل شکن اثرات سے سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ جاتے جاتے ۱۹۷۵ء نے ایک اور زبردست صدمہ پہنچایا اور اردو کے بزرگ اور ممتاز دانشور اور ادیب ایک قدآور مصنف اور ایک بالغ نظر محقق اور ناقد پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب طویل علالت کے بعد ۲۹ نومبر کو رحلت فرما گئے۔ ان کے انتقال سے دبستان لکھنؤ کی آخری بہار بھی ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ ؏ ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

پروفیسر مسعود حسن صاحب کا آبائی وطن اگرچہ قصبہ نیوتنی ضلع اناؤ ہے لیکن بسلسلۂ ملازمت آپ کے والد بزرگوار بہرائچ میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہو گئے تھے جہاں آپ ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح آپ نے ۸۲ سال کی عمر پائی۔ آپ ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہو گئے تھے اور ۲۴ سال تک اس کے شعبۂ فارسی اور اردو کے صدر رہ کر ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ مسعود صاحب نے اردو زبان و ادب کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اس کو اردو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ پڑھنا لکھنا اور تحقیق و جستجو آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ کسی موضوع پر اس وقت تک قلم نہیں اٹھاتے تھے جب تک کہ اس کو تحقیق و تنقید کی ترازو پر تول نہیں لیتے تھے۔ یوں تو ان کے تحقیقی اور علمی کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن ان کی سب سے معرکۃ الآرا تصنیف "ہماری شاعری" ہے جو ان کو زندۂ جاوید بنانے کے لیے کافی ہے۔ "ہماری شاعری" حالی کی مقدمہ شعر و شاعری کے بعد فن تنقید پر سب سے زیادہ کامیاب اور اپنی نوعیت کی دوسری اہم تصنیف ہے۔ پروفیسر صاحب کی یہ گراں قدر تصنیف ان کی بلند انشا پردازی، وسیع مطالعہ، تلاش و تجسس اور ادیبانہ سحر نگاری کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ ان کی دوسری اہم تصانیف و تالیفات میں لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، اندر سبھا، فیض میر، روح انیس، متروکات انیس، شاہکار انیس، مرزم نامۂ انیس، فرہنگ امثال، مجالس رنگیں، دبستان اردو، دیوان فائز، آب حیات کا تنقیدی مطالعہ، متفرقات غالب وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ڈرامہ مسعود صاحب کا خاص موضوع تھا۔ میر انیس سے انھیں والہانہ عشق تھا۔ مرثیہ گوئی میں وہ میر صاحب کا ہم پلہ کسی اور کو نہیں سمجھتے تھے۔ مراثی انیس کے مخطوطوں کا جتنا بڑا ذخیرہ مسعود صاحب کے پاس تھا وہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کسی فرد واحد کے پاس نہیں تھا۔ میر انیس پر انھوں نے جو زبردست کام کیا ہے اس کے پیش نظر انھیں بجا طور پر انیس پر اتھارٹی کہا جاتا ہے۔ پروفیسر صاحب بڑے وضعدار اور نہایت شیریں زبان اور شیریں بیان تھے۔ گفتگو کرتے تو منھ سے پھول جھڑتے۔ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھیے اور پُر از معلومات باتیں سنئے کہ بعد بھی سیری نہیں ہوتی تھی اور دل یہی چاہتا تھا کہ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" مرحوم لکھنوی تہذیب کے صحیح معنوں میں علمبردار تھے۔ چونکہ ساری زندگی درس و تدریس میں گزری تھی اس لیے پیچیدہ سے پیچیدہ اور گنجلک سے گنجلک مضامین کو بھی ایسے شستہ انداز اور سلیس اسلوب میں واضح کر دیتے کہ اس کی ہو بہو تصویر قاری کے ذہن میں اتر جاتی۔ الفاظ کے بھی بڑے نبض شناس تھے۔ مختصر یہ کہ انھوں نے اپنی نگارشات سے ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔ ان کے سیکڑوں شاگرد اس وقت برصغیر ہند و پاک اور دیگر غیر ممالک میں اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت میں مصروف ہیں۔ اگرچہ اب مسعود صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے ہیں لیکن ان کے اہم تصنیفات اور ادبی کارنامے جو اردو زبان و ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں، ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

راقم الحروف کو بھی مرحوم کے ایک ادنیٰ شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی محبتیں اور شفقتیں یاد آتی ہیں تو آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں کہ علم و آگہی کے خزانے لٹانے اور ادب و تحقیق کا نور بکھیرنے والی وہ عظیم ہستی اب باقی نہیں رہی۔

● اس شمارے کی آخری کاپی چھپنے جا رہی تھی کہ ہندستان کے ممتاز اور نامور سائنس داں ڈاکٹر حسین ظہیر کے انتقال کی خبر ملی۔ ڈاکٹر حسین ظہیر ایک مشہور و معروف سائنس داں ہونے کے علاوہ ایک مجاہد آزادی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ انھوں نے قومی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اتر پردیش کے مشہور قانون داں اور اودھ چیف کورٹ کے سابق چیف جسٹس سر وزیر حسن کے بیٹے اور سابق وزیر انصاف سید علی ظہیر اور مرحوم سجاد ظہیر کے بھائی تھے۔ وہ ایک عرصہ تک لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ سائنس میں استاد رہے۔ آج کل وہ حیدرآباد میں ریجنل ریسرچ لیباریٹریز میں اعزازی مشیر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ سائنسی خدمات کے صلے میں ان کو پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ حصول آزادی کے بعد ملک کی سائنسی ترقی میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان کی موت سے ہمارا ملک ایک محب وطن اور ممتاز سائنس داں سے محروم ہوگیا۔ ادارہ اس سانحے پر مرحوم کے متعلقین اور اعزا خاص طور سے جناب سید علی ظہیر صاحب اور مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر نور الحسن صاحب سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔

خدا کرے ۱۹۷۶ء ہمارے لیے مبارک ثابت ہو اور اس میں علم و ادب کے ساتھ ساتھ دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ہمارا ملک ترقی کی منزلیں طے کرے۔

——— ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

گاندھی جی کا سماجی نصب العین

گاندھی جی کے نزدیک سماج کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ ہر فرد کو اس کی شخصیت کی تعمیر اور نشو و نما کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی اور مواقع فراہم کرے اور اُسے جسمانی راحت اور آسائش مہیا کرے۔ سماج کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ فرد کو خوشی حاصل ہو اور اس کا سماجی اور اخلاقی نشو و نما بھی ہو۔ وہ اخلاقی قوت کو روحانی قوت کے مترادف سمجھتے تھے[1]۔ وہ مادی ترقی کو کبھی بھی مقصود بالذات نہیں سمجھتے تھے اسے وہ ہمیشہ اخلاقی پابندیوں کی ماتحتی میں رکھتے تھے۔

ان کے نزدیک سماج کا خاص مقصد یہ ہونا چاہیے کہ افراد کے لیے ایسے مواقع فراہم کیے جائیں کہ وہ اخلاقی یا روحانی ترقی کر سکیں۔ یہ نہ ہو کہ وہ محض مادی ضرورتوں کو بڑھاتے چلے جائیں اور انھیں کے حصول کی فکر میں دن رات لگے رہیں ایسے سماج کی تنظیم ہو جس میں اس کے ممبروں یا افراد کو زیادہ سے زیادہ آزادی اور مواقع اپنی شخصیت کی تعمیر کے حاصل ہوں سچائی اور اہنسا کے اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے صرف اسی صورت میں یہ سماج سماجی ناانصافی اور معاشی استحصال سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

اگرچہ انھوں نے اہنسا کی بنیاد پر قائم شدہ اپنے مثالی سماج کے نظام حکومت کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی ہے لیکن انھوں نے اس کی ماہیت یا اس کی جھلکیاں ضرور پیش کی ہیں اور ان طریقوں کو بیان کیا ہے جن کے ذریعہ اس مملکت کے شہری تزکیہ نفس اور اخلاقی پاکیزگی حاصل کر سکتے ہیں۔

افلاطون کی طرح انھیں اس کا بخوبی احساس تھا کہ اگر مثالی سماج قائم نہیں ہو سکتا تو پھر اس سے کمتر جو سب سے بہتر سماج ممکن ہو اس کو قائم کیا جائے ان کے نزدیک چونکہ اہنسا کی بنیاد پر مثالی سماج کا قیام ناممکن ہے اس لیے کہ اس میں سرے سے مملکت یا سیاسی تنظیم کا وجود ہی نہ ہوگا اور اس میں ہر شخص اپنے اوپر خود حاکم ہوتا ہے لیکن اس طرح سے کہ اس کے پڑوسیوں کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے اور نہ ان کے کسی کام میں کسی قسم کی رخنہ اندازی ہو۔

انھوں نے یہ محسوس کیا کہ چونکہ انسانوں میں حیوانیت پائی جاتی ہے اور اسے اب تک اپنی نفسانی خواہشات پر مکمل کنٹرول حاصل نہیں ہوا ہے اس لیے اہنسا کی بنیاد پر مثالی سماج کا قیام ممکن نہیں۔ اس لیے انھوں نے سماج میں ایسی مملکت کا تصور پیش کیا جس میں حکومت کا کم سے کم دخل ہو اور جس میں سماج کے معاملوں کو غیر متشددانہ طریقوں سے حاصل کیا جائے۔

گاندھی جی کا خیال تھا کہ مثالی سماج میں انسانوں کو اپنی خواہشوں پر اتنا قابو حاصل ہوگا کہ ضبط و نظم اور امن و امان قائم رکھنے کے لیے کسی خارجی جماعت کی چنداں ضرورت نہ ہوگی دوسرے الفاظ میں ان کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ سب لوگ اپنی زندگی اہنسا اور سچائی کے اصولوں کے مطابق گزاریں گے اس لیے ان میں اتنا زیادہ ضبط و نظم کا جذبہ ہوگا کہ کسی سیاسی جماعت کی ضرورت نہ ہوگی جو سماجی تعلقات کو منضبط کرے یا ان پر کنٹرول رکھے۔ ایسی صورت میں مملکت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن چونکہ موجودہ حالات میں ایسے سماج کا قیام ممکن نہیں اس لیے ایسے سماج کو قائم کیا جائے جو اہنسا کے اصول پر ہو۔ اور جس میں مملکت کو کم سے کم اختیار حاصل ہو۔ ان کے نزدیک مملکت کا وجود محض اس لیے ضروری ہے کہ اس دنیا میں جرائم کا وجود ہے۔ ان جرائم کے انسداد کے لیے مملکت کا ہونا ضروری ہے اور اس کے ذریعہ شہریوں کی غیر سماجی ذہنیت کا سد باب کیا جا سکتا ہے۔ گاندھی جی دوسرے انفرادیت پسندوں (INDIVIDUALISTS) کی

[1] ہریجن ۱۵ جولائی ۱۹۴۶ء

طرح اس کے قائل ہیں کہ مملکت کے وجود کی ضرورت صرف اس لیے ہے کہ انسان میں برائیاں پائی جاتی ہیں اور ان برائیوں اور جرائم کا قلع قمع مملکت ہی کے ذریعہ انسداد کیا جا سکتا ہے۔

گاندھی جی اس وجہ سے بھی مملکت کے خلاف ہیں کہ ان کے نزدیک یہ تشدد کو منظم شکل میں استعمال کرتی ہے اور یہ اس کی منظم اور مرتکز شکل کا نام ہے اس لیے اس کو کبھی بھی تشدد سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ تشدد ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے اس لیے اس کے ذریعہ کبھی بھی انسانوں کی اخلاقی ترقی نہیں ہو سکتی لیکن وہ اس کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں کہ مملکت کی بنیاد مرضی عامہ پر ہے نہ کہ تشدد پر۔ وہ مملکت کی مخالفت اخلاقی بنیادوں پر کرتے ہیں۔

وہ مملکت کے اس لیے بھی مخالف ہیں کہ اس کی جابرانہ کارروائیوں سے یا اس کے جابرانہ اقتدار سے آزادیٔ فرد بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ فرد کو اپنی اخلاقی نشو و نما کے لیے اندرونی آزادی یعنی آزادیٔ خیال، آزادیٔ رائے اور ذہنی آزادی کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ مملکت کی خارجی قوت کی۔ غرض کہ اس باب میں وہ کروپاٹکن اور باکونن کے ہم نوا ہیں۔

غیر متشددانہ جمہوریت

گاندھی جی کو اس کا بخوبی احساس تھا کہ اہنسا کی بنیاد پر قائم کیا ہوا مثالی سماج کا قیام جس میں مملکت کا وجود نہ ہوگا، اس دنیا میں ممکن نہیں اس لیے انھوں نے انسانی کمزوریوں اور خامیوں کے لیے ایسے سماج کا تصور پیش کیا کہ جس میں غیر متشددانہ جمہوریت ہو۔ اس جمہوریت کو وہ قابل عمل سمجھتے تھے اور اس میں انھوں نے ایک حد تک سیاسی اقتدار کو جگہ دی۔ اس جمہوریت میں حکومت کا دائرہ اقتدار محدود ہوگا۔ اس کی اپنی پولیس ہوگی، اس کے اپنے جیل ہوں گے لیکن یہ پولیس اور جیل موجودہ مملکتوں کی پولیس اور جیل سے بالکل ہی مختلف ہوں گے یہ اپنا کام ترغیب اور تحریص سے کریں گے نہ کہ جبر و تشدد سے۔ پولیس اہنسا کے اصولوں پر کاربند ہوگی اور وہ عوام کی خادم ہوگی۔ قیدیوں اور مجرموں سے اخلاقی قیدیوں کا سا سلوک کیا جائے گا۔ جیلوں میں اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ ان کو اخلاقی اعتبار سے بہتر بنایا جائے۔ جیل دراصل اخلاقی بیماریوں کو دور کرنے کے اسپتال بھی ہوں گے اور درس گاہ بھی۔ یہ غیر متشددانہ جمہوریت سیاسی اور معاشی اعتبار سے لامرکزی ہوگی۔ گاندھی جی مرکزیت (CENTRALISATION) کے اس لیے مخالف ہیں کہ اہنسا سے بالکل میل نہیں کھاتی اور اس کا قیام بغیر تشدد یا قوت کے استعمال کے ممکن ہی نہیں۔ برعکس اس کے لامرکزیت فرد کی ذہنی اخلاقی اور روحانی قوت کی ترقی میں بہت زیادہ ممد و معاون ہوتی ہے۔

سیاسی لامرکزیت کے معنی یہ ہیں کہ گاؤں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہو اور گاؤں والے اپنے معاملوں کا انتظام خود کریں اور قومی یا مرکزی حکومت کا ان پر کم سے کم کنٹرول ہو۔ جہاں تک ممکن ہو مرکزی حکومت کی طرف سے قوت کا کم سے کم استعمال ہو بلکہ حکومت ترغیب سے کام لے۔

معاشی لامرکزیت کے معنی یہ ہیں کہ بھاری صنعت کاری کو ختم کیا جائے اور اس کی جگہ گھریلو صنعتوں کو فروغ دیا جائے اس کے بغیر اہنسا پر قائم شدہ حکومت یا غیر متشددانہ جمہوریت کا قیام ممکن ہی نہیں۔ گاندھی جی کے نزدیک دنیا میں اس قدر تشدد مرکزیت پسند صنعتی نظام یعنی بھاری صنعتوں کے قیام کی وجہ سے پھیلا ہوا ہے۔ مغربی تہذیب کی بہت سی خرابیاں اس میں موجود ہیں۔ مثلاً نو آبادیاتی نظام (COLONALISM) سامراج، بین الاقوامی کشیدگی اور آویزشیں۔ غیر متشددانہ جمہوریت صرف گھریلو صنعتوں والے نظام ہی میں پنپ سکتی ہے۔

لیکن وہ یہ بخوبی سمجھتے تھے کہ ان کے مثالی سماج یا خیالی سماج میں تو ریلوں اور بحری جہازوں کی گنجائش نہ ہوگی لیکن جب تک مثالی سماج کا قیام ہو نہیں جاتا اس وقت تک ایک حد تک بھاری صنعتوں کا سماج میں ہونا ناگزیر ہے۔ اس لیے وہ ریلوے انجنوں اور ریل کے ڈبوں کے بنانے کی اجازت دیتے ہیں۔ سلائی کی مشینوں کی فیکٹریاں بھی کھولی جا سکتی ہیں۔

بڑی جہاز بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ فولاد اور بھاری کیمیاوی اجزاء کے کارخانے بھی کھولے جا سکتے ہیں لیکن ان کارخانوں کو حکومت چلائے گی اس طرح سے وہ ان بھاری صنعتوں کو جن کے قیام کی وہ اجازت دیتے ہیں قومیانے کے حق میں ہیں کیونکہ ان کے خیال میں صرف اسی صورت میں منافع خوری کے جذبے کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔

نظریہ ورن دیووستھا۔

اہنسا کے اصولوں پر قائم شدہ غیر متشددانہ جمہوریت کے سماج کی ورن ویوستھا کے اصول پر تنظیم کی جائے گی یعنی سماج کا ہر ممبر اپنے روایاتی اور موروثی پیشہ کو اختیار کرے گا بشرطیکہ یہ پیشہ اخلاقی اصولوں کے منافی نہ ہو اور وہی اس کے معاش کا ذریعہ ہوگا۔ اس اصول کا خاص مقصد یہ ہے کہ معاشی زندگی سے نفع خوری کے جذبہ کو ختم کیا جائے اور سماجی استحکام کو تقویت دی جائے نیز سماج کے افراد کو مسابقت کی خرابیوں سے محفوظ رکھا جائے اس میں ہر پیشہ میں فنی مہارت کی گنجائش اس طرح رکھی گئی ہے کہ بچوں کو شروع سے اس کی ٹریننگ دی جائے گی۔ اس کی وضاحت انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے "ہر انسان اس دنیا میں کچھ خداداد فطری صلاحتیں لے کر پیدا ہوتا ہے ایک حد تک ورن کا قانون اسی سے اخذ کیا گیا ہے یہ فطری صلاحیتوں اور رجحانات پر زور دیتا ہے۔ اس سے غلط قسم کے نقصان دہ مسابقت کا خاتمہ ہو جاتا ہے ورن کا اصول چھوٹے بڑے یا اونچ نیچ میں امتیاز نہیں کرتا۔ بدقسمتی سے اس قانون کو ٹھیک سے برتا نہیں گیا اور اس کی غلط تعبیر کی گئی۔ مثالی سماجی نظام اسی وقت دنیا میں قائم ہو سکتا ہے جب اس قانون کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور اس پر عمل درآمد کیا جائے۔

ورن کے اصول کے معنی یہ ہیں کہ سب پیشے برابر ہیں یہ کچھ پیشوں کو اعلیٰ کچھ کو حقیر سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے مثلاً مدرسی پیشے کو بہت اچھا سمجھنا اور خاک روبی یا جاروب کشی کو ذلیل سمجھنا۔ سماجی نقطۂ نظر سے سارے پیشے ضروری ہیں اور لازمی۔

موروثی پیشے کو سماجی فرض سمجھنا چاہیے اور اس پیشے کو اختیار کرنے والے کو اپنی شخصیت کی پوری تعمیر کرنا چاہیے اور اس کو اپنا ذریعہ معاش سمجھنا چاہیے نہ کہ دولت جمع کرنے کا ذریعہ۔ یہ اصول اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب سب پیشوں کو اختیار کرنے والوں کی آمدنی تقریباً مساوی ہو اور ان میں زبردست تفاوت نہ پایا جاتا ہو۔

موروثی پیشے جو ہمارے ملک میں ذات پات کے نظام کی اچھی خصوصیت ہیں موجودہ مسابقت والے صنعتی نظام میں نہیں چل سکتے تھے اس لیے کہ اس میں آمدنی میں بہت زیادہ فرق اور سماجی حیثیت یا عزت میں بہت تفاوت پایا جاتا ہے۔ موجودہ نظام کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں ہر پیشہ ور زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے اور حرص ولالچ کا بے پناہ جذبہ ہر ایک میں پایا جاتا ہے لیکن اس اصول پر تب ہی عمل ہو سکتا ہے جب ہندستان میں موجودہ صنعتی نظام قائم ہو جائے اور دیہی معیشت کا نظام پورے طور پر رائج ہو جائے۔

گاندھی جی کا ورن ویوستھا کا نظریہ منو کے ورن آشرم سے بالکل مختلف ہے۔ ورن آشرم میں سماج چار طبقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور قدم قدم پر طبقہ وارانہ امتیازات قائم کر دیے جاتے ہیں برعکس اس کے ورن ویوستھا میں اکتساب معاش پر نہ کہ دولت جمع کرنے پر زور دیا جاتا ہے اور اس میں ہر پیشے کو قابل عزت اور مساوی سمجھا جاتا ہے۔

عدم ملکیت یا اپری گرہ

غیر متشددانہ سماج کا اہم ترین اصول عدم ملکیت یا اپری گرہ (NON-POSSESSION) ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی ضرورتیں کم سے کم ہوں اور وہ کم سے کم چیزوں کو اپنے پاس رکھیں۔ کوئی شخص وہ چیز اپنے پاس نہ رکھے جس کی اس کو ضرورت نہ ہو خود گاندھی جی بھی اپنے پاس کم سے کم چیزیں رکھتے تھے اور چاہتے

تھے کہ دوسرے بھی ایسا ہی کریں۔ ان کے نزدیک وہ انسان مہذب کہلانے جانے کا مستحق نہیں جس کی ضرورتیں روز بروز بڑھتی جائیں اس طرح سے یہ مستقبل کے لیے اندوختہ پس انداز کرنے کا بھی مخالف ہے کیونکہ گاندھی جی کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو خدا پر اعتقاد نہیں جو خدا آج رزق دے رہا ہے وہ کل بھی دے گا۔

نظریہ امانت

دوسرا اہم ترین اصول نظریہ امانت (TRUSTEE - SHIP) کا ہے اگر لوگ اس اصول پر چلنے لگیں کہ وہ صرف ایسی ہی چیزوں کو اپنے پاس رکھیں گے جن کی ان کو واقعی ضرورت ہو اور بقیہ چیزیں اپنے پاس نہ رکھیں تو گاندھی جی کے خیال کے مطابق امیری و غریبی کا فرق بڑی حد تک مٹ جائے گا۔ وہ اس کے مخالف تھے کہ سرمایہ داروں سے جبراً دولت چھینی جائے یا قانون کے ذریعہ ان کو ان کی دولت سے محروم کیا جائے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کو دور کرنے کا انھوں نے یہ حل پیش کیا کہ سرمایہ دار یہ سمجھیں کہ ان کی دولت دوسروں کی محنت کی بدولت حاصل ہوتی ہے اور ان کی اپنی ملکیت نہیں ہے اس لیے ان کو اس کو اپنا مالک نہیں بلکہ امین سمجھنا چاہیے۔ انھیں اس دولت کے صرف اتنے ہی جزو کو صرف کرنا چاہیے جس کی واقعی ان کو ضرورت ہو اور باقی کو وہ عام لوگوں کے لیے وقف کردیں یہ نجی اور دوسری جائیدادوں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں کرتا اگر اس نظریہ پر عمل ہو تو معاشی استحصال کا کلیتاً خاتمہ ہو جائے اور بین الاقوامی کشیدگی بڑی حد تک ختم ہو جائے۔ گاندھی جی کا یہ بھی خیال تھا کہ اس نظریہ کو اختیار کر لینے سے سرمایہ داروں کا زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر بدل جائے گا۔ وہ اپنے کو دولت کا مالک نہیں بلکہ امین سمجھیں گے اور اپنی ضرورتوں کو کم کریں گے اس طرح سے ان میں اور غریبوں میں جو معاشی نابرابری ہے وہ کم ہو جائے گی اور دولت جمع کرنے کا جذبہ ختم ہو جائے گا اس نقطۂ نظر کے اختیار کرنے سے پورا معاشی نظام متاثر ہوگا اور اس نظام میں مزدوروں کا معاشی استحصال نہ ہو سکے گا۔

جسمانی محنت

گاندھی جی جسمانی محنت پر بہت زیادہ زور دیتے تھے ان کے نزدیک بڑے بڑے سائنس دانوں اور دانش وروں کو بھی روزانہ کچھ نہ کچھ جسمانی محنت کرنا چاہیے بڑے سے بڑا دماغی کام جسمانی محنت کا قائم مقام نہیں بن سکتا جسمانی محنت سے دماغی اور ذہنی صلاحتیں بڑھتی ہیں اور اس سے محنت کش عوام اور سفید پوشوں کی تفریق دور ہوتی ہے۔

گاندھی جی کے سماجی نصب العین میں اہنسا، سچائی، سیاسی اور معاشی لامرکزیت، نظریہ امانت اور کم سے کم چیزوں کے استعمال کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور سب سے زیادہ اہمیت اس اصول کی ہے اس دنیا میں حق (RIGHT) کو نہیں بلکہ فرض (DUTIES) کو اہمیت حاصل ہونا چاہیے ان اصولوں پر کاربند ہونے سے سماج میں روحانی جمہوریت قائم ہوگی جس میں فرد کو مرکزی پوزیشن حاصل ہوگی۔ نیز اسے اس بات کی پوری آزادی حاصل ہوگی کہ وہ اپنے رجحان کے مطابق سماجی فرائض کو انجام دے۔ باوجود کٹر انفرادیت پسند ہونے کے گاندھی جی انسان کی سماجی حیثیت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ انسان صرف سماج میں رہ کر انسان رہ سکتا ہے دوسروں کی خدمت کرنے سے ہر شخص اپنے کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اور اپنی شخصیت کی صحیح تعمیر کر سکتا ہے۔

گاندھی جی کا خیال تھا کہ ان کے نصب العین پر عمل کرنے سے دنیا کے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے اور پائدار مستحکم امن قائم ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ نصب العین قابل عمل ہے اس بارے میں گاندھی جی کا کہنا ہے کہ وہ نصب العین نصب العین ہی نہیں جو پورے طور سے دنیا میں حاصل ہو۔ مشہور گاندھی بھگت مشرو والا کے الفاظ میں گاندھی جی کا نصب العین اقلیدس کے نقطے کی طرح ہے کہ اس کا تصور انسان کے ذہن میں بالکل صاف اور واضح ہے لیکن اس کا مادی نقشہ ہم پورے طور سے نہیں پیش کر سکتے۔ یہ اصول ہمالیہ کی بلند چوٹیوں کی مانند ہیں ان پر پہنچے

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

ساحر لکھنوی

غزل

ایسا تو نہیں گرمیِ بازار نہیں ہے
ہاں قدر شناسیِ خریدار نہیں ہے

تسخیرِ مہ و مہر بھی دشوار نہیں ہے
انساں اگر نقش بہ دیوار نہیں ہے

حالات سے جو برسرِ پیکار نہیں ہے
اس دور میں جینے کا وہ حقدار نہیں ہے

سچائی کا ہر شخص پرستار ہے لیکن
سچ بات کے سننے کا روادار نہیں ہے

تم اتنی محبت سے مری سمت نہ دیکھو
دل اور ستم سہنے کو تیار نہیں ہے

حالات کا تپتا ہوا سورج ہے سروں پر
رستے میں کہیں سایۂ دیوار نہیں ہے

جو صاحبِ کردار نہیں اس کی نظر میں
دنیا میں کوئی صاحبِ کردار نہیں ہے

ہے جرمِ محبت ہمیں تسلیم ہے ساحر
لیکن وہ سزا دے جو خطاوار نہیں ہے

شوکت پردیسی

رباعیات

(۱)

دیوار پہ ہے دھوپ خنداں خنداں
حالات کی زد پر ہے ہر اک شے لرزاں
اللہ رے یہ فکر و نظر کا انداز
جو چیز نمایاں ہے، وہی ہے پنہاں

(۲)

میں اور غمِ دل کا مداوا کرتا
گر ہوش بھی ہوتا تو نہ ایسا کرتا
اک زخم، جو بھر جاتا کسی صورت سے
پھر اپنے عزیزوں پہ بھروسا کرتا

(۳)

چھوڑو! سحر و شام کا غم، آ جاؤ!!
جھیلو! نہ زمانے کا ستم، آ جاؤ!
دنیا کو نہ گلزار بنا پائے تو کیا!
پہنچے تو ہیں مہتاب پہ ہم، آ جاؤ!!

(۴)

یادوں کی میں بارات لیے آیا ہوں
اور اشکوں کی سوغات لیے آیا ہوں
دنیا کے مسائل سے گزر کر تم تک
امیدِ ملاقات لیے آیا ہوں

(۵)

آنکھوں میں بسائے ہوئے سپنوں کا محل
پنگھٹ پہ وہ اک نار نویلی، کومل
ہے کب سے اس الجھن میں کھڑی بت کی طرح
گاگر کو سنبھالے کہ سنبھالے آنچل

مناظر عاشق ہرگانوی

اتحاد و یکجہتی کے علمبردار

گرو نانک جی

[وَلِکُلِّ قَومٍ ھَادْ ۔ ہر قوم میں ہادی اور رہنما بھیجے گئے ہیں]

سکھوں کے گرو نانک کی شخصیت ایک مینارۂ نور کی سی ہے جہاں سے منزل کا پتہ ملتا ہے۔ وہ اونچ نیچ ذات پات اور چھوت چھات کا خاتمہ چاہتے تھے۔ جو انسانی برادری کے دو فرقوں میں تقسیم اور پھوٹ کی اصل جڑ اور بنیاد ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ــــ خدا کے گھر میں سب ایک جیسے ہیں اور اس کی درگاہ میں ہندو اور مسلمان کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔

مذہب کے نام پر نسل، رنگ، ذات، زبان اور کھانے پینے کی بنا پر مبنی تمام جھگڑے اور اختلافات گناہ ہیں۔

اس پر عمل پیرا ہو کر آپ نے اپنے مکان میں سب سے پہلا لنگر شروع کیا جہاں ہر انسان بلا لحاظ مذہب و ملت اکٹھا بیٹھ کر کھاتے تھے۔

گرو نانک کا جنم ایک ہندو گھرانے میں ہوا۔ وہ لاہور کے قریب رائی موئی کی تلونڈی (جو اب ننکانہ صاحب کے نام سے مشہور ہے) میں بیدی کالو چند پٹواری کے گھر ۱۵ اپریل ۱۴۶۹ء / سمبت ۱۵۲۶ کو پیدا ہوئے۔

سمبت ۱۵۳۲ میں چھ سال کی عمر میں بیدی کالو چند نے نانک جی کو گوپال پنڈت کے پاس ہندی پڑھنے کے لیے بٹھایا۔ تین سال میں ہندی سیکھی۔ ساتھ ہی سمبت ۱۵۳۵ سے برج لال پنڈت نے انھیں سنسکرت کی تعلیم دینا شروع کی۔ چار سال تک وہ سنسکرت کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ جب ان دونوں زبانوں سے واقفیت ہو گئی تو تیرہ سال کی عمر میں سمبت ۱۵۳۹ میں ان کے والد نے انھیں مولوی قطب الدین کی خدمت میں فارسی کی تعلیم کے لیے بھیجا، جہاں انھوں نے تعلیم و تربیت کے ساتھ مذہبی معلومات حاصل کیں۔

اس زمانے میں محض کتابی تعلیم نہ ہوتی تھی بلکہ شاگرد استاد سے پورا اثر لے کر نکلتا تھا۔ مولوی قطب الدین کی تعلیم و تربیت سے گرو نانک نے گہرا اثر قبول کیا۔ ان ہی دنوں ان کے والد نے کچھ روپیہ دے کر آپ کو بازار سودا لانے کے لیے بھیجا۔ راستے میں آپ نے چند لوگوں کو دیکھا جو کئی دن سے بھوکے تھے۔ آپ نے سارا روپیہ ان لوگوں کو دے دیا، اور خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔ ان کے والد کو جب سارا حال معلوم ہوا تو غصہ میں انھوں نے نانک جی کی خوب ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس سے آپ کی بہن کو بہت دکھ ہوا کیونکہ انھیں اپنے بھائی سے بے حد محبت تھی۔ اسی لیے سمبت ۱۵۴۱ میں آپ کی بہن آپ کو سلطان پور اپنے گھر لے آئیں۔ یہاں سمبت ۱۵۴۲ میں دولت خاں مودی کے مودی خانہ کی نگہداشت کا کام شروع کیا۔

بچپن ہی سے آپ کے خیالات، آپ کے سوچنے کا انداز دوسروں سے الگ تھا۔ وہ تصوّف کی طرف مائل تھے اور ایک ہی خدا پر یقین و اعتماد رکھتے تھے۔ جب آپ گیارہ سال کی عمر کے تھے تو خاندانی اور سماجی روایت کے مطابق آپ کو جنیئو (زنّار) پہنانے کی رسم ادا کی جانے والی تھی۔ سارا انتظام مکمل ہونے اور پروہت کے آنے پر گھر کے سبھی لوگوں کے سامنے آپ نے جنیئو پہننے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ "دیا کپاہ سنتو کو سوت۔ جت گنڈی ست وٹ۔ ایہو جنیئو اکا ہی تان پانڈے گھت، تاں ایہہ ٹوٹے نا رڑل گئے نا ایہو جلے نہ جاے۔ دھن سو مانس نانکا جو گل چلے پائے" ــــ یعنی مہربانی کی کپاس سے صبر کا سوت کاٹ کر اور اس میں راست گوئی و پرہیزگاری کی گانٹھ لگا کر

جنیؤ بناؤ جو تمھاری روح کا سچا جنیو ہے۔ ایسا جنیؤ نہ میلا ہوتا ہے اور نہ ٹوٹتا ہے۔ نہ ہی آگ میں جلتا ہے۔ اگر ایسا جنیؤ تمھارے پاس ہے تو پہنو اور لوگوں کو پہناؤ۔

مودی خانہ میں کام کرنے کے دوران بھی وہ اسی طرح کی باتیں سوچتے رہتے تھے۔ اور استغراق اور بے خودی میں انھیں کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ ایک دن جب وہ آٹا تولنے بیٹھے جب تیرہ پر پہنچے تو گنتی بھول گئے۔ تیرہ تیرہ کہتے ہوئے سارا آٹا تول ڈالا۔ اور جب احساس ہوا تو مودی خانہ کا کام چھوڑ دیا۔ کوئی پوچھتا تو جواب میں کہتے "نہ کوئی ہندو اور نہ کوئی مسلمان"

انسانی مساوات اور یک جہتی کا یہ سبق بھائی چارہ اور خیر خواہی کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی زندگی کا مشغلہ بنا لیا وہ عوام کی اصلاح و درستی کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور ایک طویل سفر پر روانہ ہو گئے۔ ایک اس سفر میں بھی بھائی چارگی اور یک جہتی کا جذبہ پیش نظر تھا۔ انھوں نے چار طویل سفر کیے۔ ان سفروں میں آپ کے ساتھ دو ساتھیوں میں سے ایک مسلمان اور دوسرا ہندو تھا۔

پہلا دورہ ۱۵۰۱ء میں شروع کیا۔ آپ ہندوؤں کے تیرتھوں پر پہنچے اور ذات پات، اور ظاہری رسموں کی تردید کی۔ اس دورہ میں کروکشیتر کرنال، پانی پت، دہلی، متھرا، نانک متا (نینی تال کی اس جگہ پر نانک ساگر بن گیا ہے) بنارس، پٹنہ، جگناتھ پوری اور آسام تشریف لے گئے۔ ہر جگہ اصلاحی باتیں بتائیں۔ وندیاچل کی پہاڑیوں میں بھی بسنے والے کوڑے جیسی آدم خور قوم کو پیار، محبت اور رحم دلی کا سبق دیا۔ پھر رہتاس سے ہو کر پنجاب واپس پہنچے۔

دوسرا دورہ ۱۵۰۶ء میں دکھن کی جانب کیا۔ اس سفر میں بیکانیر، اجمیر، جین، مدراس اور لنکا تک گئے۔ واپسی میں دوارکا جی کے بجائے پورے کو سچ کی روشنی پہنچاتے ہوئے براہ راست سندھ جا کر ۱۵۱۰ء میں پنجاب واپس پہنچے۔ ان سفروں میں آپ نے مسلمان بزرگوں سے خصوصی ملاقاتیں کیں اور باہم مسائل تصوف پر تبادلۂ خیالات بھی کیا۔ پانی پت میں مشہور بزرگ شیخ شرف الدین سے بھی ملاقات کی۔ اجمیر اور ملتان میں بزرگان دین کی ہمنوائی میں آپ نے چلہ کشی اور خدا پرستی بھی کی۔

تیسرا دورہ ۱۵۱۴ء میں ہوا۔ اس بار سکم، تبت اور چین وغیرہ ممالک تشریف لے گئے۔

چوتھا دورہ ۱۵۱۸ء میں شروع کیا۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور بغداد کی زیارت کی مصر اور ترکی ہوتے ہوئے ایران اور افغانستان گئے۔

اتنے سارے مقامات کے سفر کے بعد آپ کے خیالات و نظریات میں جو رچاؤ پیدا ہوا اس کے پیش نظر آپ کے مقاصد کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ ہندستان کے تمام فرقوں میں اتحاد و یک جہتی پیدا کرنا۔ ان کے اعمال و کردار میں یکسانیت لانا اور ان کے عقائد و نظریات میں ہم آہنگی قائم کرنا، تاکہ ہر انسان دوسرے کو محبت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے اور اس کی خیر خواہی چاہے۔

۲۔ خالص توحید اور خالص خدا پرستی کی دعوت کو پھیلانا۔

لیکن اس کے لیے بھی انھوں نے صفات کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ مسلمانوں کی تعریف کے لیے انھوں نے یہ شرط رکھی ہے۔

"مسلمان کہاؤن مشکل جاں ہوئے تاں مسلمان کہاوے اول اول دین کو میٹھا مسلانان مال ساوے ہوئے مسلم دین مہائے مرن جیون کا بھرم چکاوے۔ رب کی رضا منے سر اُپر کرتا منے۔ آپ گنواوے تو نانک سرب جیاں مہرمت ہوئے تا مسلمان کہاوے"

(مسلمان کہلانا بہت مشکل ہے۔ اگر مسلمان ہو تو بیشک اپنے تئیں ایسا کہلاؤ۔ اولیا کے طریقوں کو اچھا سمجھو غرور کو چھوڑ دو اور خدا کے نام پر خیرات کرو۔ اس طرح اپنے مذہب پر قائم ہو کر مرنے اور جینے کا شک مٹا دو۔ خدا کی رضا پر شاکر رہ کر اپنی کاریگری اور تدبر و لیاقت کا خیال چھوڑ دو۔ سب مخلوقات پر رحم کرو تب مسلمان کہلاؤ)

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ برہم یعنی خدا اور مایا یعنی مادہ کے باہمی میل سے برہما، وشنو اور شیو جی پیدا ہوئے۔ برہما دنیا کو بناتا ہے، وشنو روزی پہنچاتا ہے اور شیو جی اعمال کی جزا اور سزا دیتا ہے۔ لیکن گرو نانک اس عقیدے کے خلاف ہیں۔ وہ اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا کا بنانے والا اور چلانے والا خدا کے سوا کوئی نہیں صرف اسی کے حکم سے دنیا کے کام چلتے ہیں، وہی روزی پہنچاتا ہے

اور وہی اعمال کی جزا و سزا دیتا ہے۔ سب کچھ اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ اچھے کام سب اسی کے ہیں ؎

کہتے ہیں جب مایا پائی — پاس خدا کے آئی ہے
دیوتا اس نے تین جنے — تینوں کے ہاتھ خدائی ہے
ایک سنسار بناتا ہے — اور اک۔ وزی پہنچاتا ہے
اک جانچے اعمال جہاں کے — وہ دیوان لگاتا ہے
لیکن سچ پوچھو تو دنیا — حکم خدا سے چلتی ہے
جیسے جیسے حکم کرے — وہ ویسے ویسے چلتی ہے
آپ بنائے آپ ہی دیکھے — سب کا سرجن ہار ہے وہ
نانک سچے کام اسی کے — ہاں سچی سرکار ہے وہ

محض ریاکاری کا روزہ۔ رکھنا، دکھاوے کے لیے نماز پڑھنا اور دھوکا دینے کے لیے کلمہ پڑھنا، کیا نتیجہ دے سکتا ہے۔ ان باتوں سے انسان جنت کا وارث نہیں ہو سکتا۔ گرو نانک کا کہنا ہے کہ سنتر کعبہ انسان کے اپنے من کے اندر ہی ہیں۔ اگر کسی کو اس کی سمجھ آ جائے اصل نماز اس کی ہے جو انصاف کو مدنظر رکھے اور کلمہ اصل میں اسی کا ہے جو ریاکاری سے الگ ہو کر اللہ کی معرفت حاصل کرے اور پانچوں حواس خمسہ کو قابو میں رکھ کر مصلیٰ بچھائے تبھی وہ دین حق کی شناخت کر سکے گا ؎

قاضی بولیا بن نہیں آئے — روزہ دھرے نماز گذارے
کلمہ بہشت نہ ہوئی! — ستر کعبہ گھٹ ہی بھیتر
جبکر جانے کوئی! — نماز سوئی جو تیاد ن بیچارے
کلمہ اکلمہ جانے — پانچوں حس مصلے بچھاوے
تب کو دین پہچانے

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ تیرتھ یاترا سے ان کے پاپ دھل جاتے ہیں اور وہ پاک صاف ہو جاتے ہیں۔ گرو نانک اس کے بھی خلاف ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ گناہ صرف خدا کی یاد اور اچھے اعمال سے دور ہوتے ہیں۔ اصلی تیرتھ انسان کے دل کی صفائی اور پاکیزگی ہے جو خدا کا ذکر سننے اور اسے دل سے ماننے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس سے پاپ دھلتے ہیں اور اسی سے نجات ملتی ہے۔ چین اور اطمینان خدا کے نام سے ہی حاصل ہوتا ہے ؎

تیرتھ کا اشنان یہی ہے — اپنے رب کے بھاؤ میں
سب کو ناپ نہ بھاؤں میں — دیر و خاک نہاؤں میں
بندہ سن سن کر جو مانے — پریم سے دل میں دھیان کرے
اپنے من کی تیرتھ میں — وہ مل مل کر اشنان کرے
نام خدا کا سننے سے — اندھے کو اس کی راہ ملے
نام خدا کا سننے میں — بے تھاہ کو تھاہ ملے
نانک بھگتی والے دائم — خوشیاں خوب مناتے ہیں
نام خدا کا سننے سے — دکھ پاپ سب مٹ جاتے ہیں
من سے جو مانے گا اس پر — در مکتی کے کھل جائیں گے
من سے جو مانے گا اس کے — بچے بالے مکتی پائیں
ایسا نام نرنجن کا ہے — کوئی جو من سے جانے گا
کوئی کوئی جانے گا — اور کوئی کوئی مانے گا

مساوات اور بھائی چارگی کی اس سے بڑھ کر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ گرو نانک ہر انسان کو ایک خیالات، ایک نظریات ایک عقائد اور ایک اعمال و کردار کے تحت دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے دنیا گھوم کر اپنے آپ کو پہلے سمجھا۔ پھر اپنے آس پاس کے لوگوں کو بے راہ روی اور لہو و لعب میں دیکھ کر اپنے مشاہدات کے تحت رہنمائی کی شمع جلائی تاکہ اس کی روشنی میں لوگ قریب آ سکیں اور ہر لحاظ سے ہم آہنگ ہو سکیں۔!

★

گاندھی جی کا نصب العین۔ ——— (صـ۶ کا بقیہ)

طور سے انسان اپنی زندگی میں عمل نہیں کر سکتا لیکن ایک حد تک ان پر عمل کیا جا سکتا ہے اگر گاندھی جی کے نصب العین کو نظر انداز کر دیا جائے اور ان کے سارے اصولوں کو خیرباد کہہ دیا جائے تو پھر سماجی زندگی ناممکن ہو جائے۔ آج کی مادہ پرستانہ دنیا میں سچائی، اہنسا اور ضبطِ نفس کے اصولوں پر کاربند ہونے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

★

محسن جلگانوی

نئی حیات کا سورج

سنہری صبح کی پہلی کرن کہ جس کے لیے
ہم اضطراب کی صدیوں کو روندآئے تھے
نظر کے سامنے مکروہ روپ میں آئی
قدم قدم پہ چھپی عصبیت کے غاروں سے
لہو اگلتے ہوئے اژدہے نکل آئے
فضا میں تیر گئی اجنبی لہو کی بُو
زمین بن گئی بے خوف موت کی وادی

غموں کے دشت، اندھیروں کے بھاگتے صحرا
ہر اک قدم پہ صلیبوں کے دیو ایستادہ
ہر ایک ذہن میں ہنگامہ ہائے دار و رسن
تباہیوں کا تسلط، تراج کا عالم
خود اپنی زخم کُھرچتی ہوئی سبھی صبحیں
خود اپنے جسم کا خوں چاٹتی ہوئی راتیں

فضا کے دوش پہ بارود کے سیہ بادل
یونہی سجاتے رہے کشت و خون کے میداں
منافرت کے مسائل زبان کے جھگڑے
سیاستوں کی رقابت، نظر نظر کا تضاد

نہ جانے کتنے مسائل، سوال، اندیشے
حوادثات نے پیدا کیے ہمارے لیے
ہم آج برف کے بڑھتے ہوئے دھندلکے سے
نئی حیات کا سورج تلاش لائے ہیں
امینِ صبح ہیں ہم، خالقِ بہار ہیں ہم

منصور قریشی

نیا سال

وقت پھر آج نئے سال کی سوغات لیے
پھر نئی صبح، نئی شام، نئی رات لیے
وادیٔ گل میں نئے پھول کھلانے آیا
پھول زخمی ہیں کہ انہیں سہلانے آیا
دورِ ماضی کے اندھیروں کو کفن پہنا کر
بزمِ مہتاب کو تاروں سے سجانے آیا
ذہنِ تاریک کو پُر نور بنانے کے لیے
بجھتے ہمدردوں کے چراغوں کو جلانے آیا
وقت پھر آج نئے عزم کے سوغات لیے
تپتے صحراؤں میں مسرت بھری برسات لیے
دشتِ بے آب کو گلزار کی صورت بخشے
لذتِ درد کہیں تڑپ کی لذت بخشے
دلِ پژمردہ کو شعلوں کی حرارت بخشے
صاحبِ لوح و قلم کو نئی عظمت بخشے
سوختہ ذہنوں کو ادراک کی دولت بخشے
وادیٔ فکر کو اک گنج علامت بخشے
کورے کاغذ کو بھی الفاظ کی حرمت بخشے
ایک کوزے کو سمندر کی سی وسعت بخشے
زندگی کرنے کی ہر ایک کو طاقت بخشے
وقت پھر آج نئے دور کے حالات لیے
پُرسکوں دور کے ہونٹوں پہ حسیں بات لیے
نئی راہوں پہ قدم اپنا بڑھاتا جائے
وادیٔ خار میں پھولوں کو کھلاتا جائے
دشت و کہسار کو گلزار بناتا جائے
پیار کا گیت زمانے کو سناتا جائے
پرچمِ امن و اماں سب پہ اڑاتا جائے
اک نئے دور کی تصویر دکھاتا جائے
اجڑے، تاریک گھروندوں کو سجاتا جائے
بستی بستی یہی آواز لگاتا جائے
عظمتِ لوح و قلم یارو بچائے رکھنا
پیار کی جوت ہر اک دل میں جگائے رکھنا
عزم بیداری کی مشعل کو جلائے رکھنا
تیرہ و تار سی راہوں کو سجائے رکھنا
اس نئے سال کو آئینہ بنائے رکھنا
خیر مقدم کو بڑھو، وقت سنور جائے گا
وقت کی قدر کرو، ورنہ گزر جائے گا

[illegible] سلیم خان

غالب کی اردو مکتوب نگاری

آغاز و محرکات (۲)

[سلسلے کے لیے دیکھیے نیا دور نومبر ۷۵ء]

غالب کی اردو مکتوب نگاری جن عوامل و محرکات کا نتیجہ محسوس ہوتی ہے اُن کے بیرونی عصری حالات کے ساتھ ساتھ ہمیں غالب کے سوانح حیات میں بھی تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ اس سلسلے میں خود غالب کی بعض تحریریں ملاحظہ ہوں۔ ۲۳ فروری ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں غالب نے قدر بلگرامی کو لکھا ہے:

"بارہ برس کی عمر سے نظم و نثر میں کاغذ مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزارے اب جسم و جان میں تاب و تواں نہیں ..... نثر فارسی لکھنی یک قلم موقوف۔ اردو سو اس میں عبارت آرائی متروک۔ جو زبان پر آوے وہ قلم سے نکلے۔ پاؤں رکاب میں ہے اور ہاتھ باگ پر کیا لکھوں اور کیا کروں"۔[۱]

۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء کے ایک مکتوب میں غالب رقم طراز ہیں:

"مجھے زندہ سمجھتے ہو جو نثر فارسی کی فرمائش کرتے ہو؟ غنیمت نہیں جانتے کہ مردہ کچھ لکھ کر بھیج دیتا ہے"۔[۲]

قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کے نام اپنے مورخہ ۸ ستمبر ۱۸۵۹ء کے ایک نامے میں غالب کا بیان ہے:

"فارسی کیا لکھوں یہاں ترک تمام ہے۔ اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود الخبر، ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں، آپ غم زدہ اور آپ غم گسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا ہر گھڑی پا بہ رکاب ہوں"۔[۳]

غلام رسول مہر کے مطابق ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۴ء کے درمیان لکھے جانے والے ایک خط (بنام عبدالرزاق شاکر) میں غالب نے یہ لکھا:

"بندہ نواز، فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب — وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں، سب دوستوں کو جن سے کتابت رہتی ہے اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے، ان میں جو صاحب الی الآن ذی حیات و موجود ہیں، اُن سے بھی عند الضرورت اسی زبان مروج میں مکاتبت و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے ..... میں اب انتہائے عمر ناپائیدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام اور بہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں ..... پس امیدوار ہوں کہ آپ اس فقیر کی نذر محقرہ یعنی تحریرات روزمرہ اردو بے سادہ دسر سری کو نذرانہ غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں اور درویش دلریش دفرو مانا

---

[۱] غالب، مرزا اسد اللہ خاں: ادبی خطوط غالب۔ مرتبہ مرزا محمد عسکری۔ ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ۔ ۱۹۷۰ء۔ ص ۱۸۰۔ [۲] بحوالۂ مرقع ادب (حصہ دوم) صفدر مرزا پوری۔ صدیق بک ڈپو، لکھنؤ۔ مطبوعہ مجتبائی پریس، لکھنؤ۔ ص ۲۴۔ [۳] غالب، اسد اللہ خاں: خطوط غالب (حصہ دوم) مرتبہ مہر غلام رسول۔ کتاب منزل، لاہور۔ طبع اول۔ ص ۲۶۲۔ [۴] ماسبق ۲۷۸۔

کشا کش معاشی سے خاطر مجموعہ رہنے کی دعا مانگیں۔"[۱]

[illegible] کے علاوہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء) کے [illegible] مکتوب (بنام رفعت بدیوانی) میں بھی بقول مولانا عرشی [illegible] قاری کا سبب غلبہ رنج و غم اور ضعف پیری کو [illegible] علاوہ مولانا عرشی کے مطابق [illegible] [illegible] بنیاد پر غالب نے غلبہ پیری کے باعث ۱۸۶۱ء [illegible] خطوط نویسی اختیار کرنے کا اقرار کیا ہے۔[۲]

[illegible] مذکورہ بالا بیانات کی بنیاد پر متعدد صاحبان قلم نے غالب [illegible] اردو مکتوب نگاری کو ان کی ضعیفی، بیماری اور کم فرصتی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ اسلوب احمد انصاری کے مطابق غالب "...... نے [illegible] میں مکتوب نگاری اس لیے ترک کی کیونکہ خود ان ہی کے بقول وہ تمیں اہتمام، التزام اور جگر کاوی اور محنت پژوہی کا مطالبہ کرتی تھی، اسے غالب اپنی زندگی کے آخری دور میں پورا کرنے کی خاطر توانائی نہ رکھتے تھے ......"[۳] شیخ محمد اکرام کا بھی یہی خیال ہے کہ جب غالب "بڑھاپے کی وجہ سے ...... اس کاوش اور دماغ سوزی کے قابل نہ رہے تو انھوں نے اردو میں مراسلت نگاری شروع کی۔"[۴] مگر راقم الحروف کے نزدیک غالب کی اردو مکتوب نگاری کو ان کی ضعیفی، بیماری اور کم فرصتی کا نتیجہ قرار دینا نیم صداقت (HALF TRUTH) کے مترادف ہے — اس سلسلے میں بعض تائیدی شواہد ملاحظہ ہوں۔

خطوط غالب کے مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ غالب نے ضعیفی، ضعف اور امراض کے باعث فارسی میں خط کتابت کے بجائے اردو مکتوب نگاری جاری رکھی۔ مگر محولہ بالا تمام تراشے غالب کے ان ہی خطوط میں ملتے ہیں جو ۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۲ء کے درمیان تحریر ہوئے تھے اور یہ وہ زمانہ ہے جب غالب ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے اردو مکتوب نگاری کی ابتدا کر چکے تھے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ غالب کی اردو مکتوب نگاری کا آغاز ۱۸۴۸ء کے آس پاس، اس وقت ہوا جب غالب کی عمر تقریباً ۵۰ سال تھی اور اس وقت تک غالب نہ تو غلبۂ پیری کے باعث نحیف و نزار تھے اور نہ ان امراض کا شکار ہوئے تھے جن سے انھیں بعد کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ غالب کے خطوط اور سوانحی حالات کا عمیق نظر سے جائزہ لینے کے بعد یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ ۱۸۵۸ء سے قبل اور ۱۸۴۸ء کے آس پاس غالب معمولی نزلہ اور زکام (۱۸۵۰ء)،[۵] ڈاڑھ کے درد (۲ جنوری ۱۸۵۱ء)،[۶] ہیجان خون (۲ مارچ ۱۸۵۱ء)،[۷] اعصابی درد (۲۵ فروری ۱۸۵۳ء)،[۸] لرزہ اور بخار (۲ مارچ ۱۸۵۴ء)[۹] جیسے معمولی امراض کے علاوہ کسی شدید اور پریشان کن بیماری میں مبتلا نہ ہوئے تھے۔[۱۰] غالب کی

۱؎ غالب، اسد اللہ خاں: خطوط غالب (حصہ دوم)، مرتبہ مہر، غلام رسول ص ص ۲۸۲/۲۸۱۔ ۲؎ عرشی، مولانا امتیاز علی خاں: مکاتیب غالب، رام پور ۱۹۴۶ء (دیباچہ ص ۱۶۰۔ ۳؎ ماسبق (دیباچہ) ص ص ۱۵۹/۱۵۸۔ ۴؎ اسلوب احمد انصاری: مضمون "خطوط غالب میں نفس کی پرچھائیاں" مشمولہ نقش غالب۔ غالب اکیڈمی، نئی دہلی۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۱۲۸۔ ۵؎ اکرام، شیخ محمد: غالب نامہ۔ احسان بک ڈپو، لکھنؤ، ص ۲۳۳۔

۶؎ غالب کا قدیم ترین مطبوعہ اردو خط (بہ نام منشی نبی بخش حقیر) ۹ مارچ ۱۸۴۸ء کو لکھا گیا تھا۔ لیکن اکتوبر ۱۹۰۵ء میں کچھ نئے خط ملے ہیں۔ غالب کے یہ نو دریافت غیر مطبوعہ اردو خطوط قومی آواز، لکھنؤ مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء (ص ۱) کے مطابق ۱۸۴۶ء میں لکھے گئے ہیں۔ اگر نو دریافت غیر مطبوعہ خطوط حقیقتاً غالب ہی کے ثابت ہوئے تو غالب کی اردو مکتوب نگاری کا آغاز ۱۸۴۶ء سے مانا جائے گا۔ نو دریافت اردو خطوط کے مندرجات سامنے آنے پر ماہرین غالبیات کے فیصلے کے بعد ہی اس کا تعین ہو سکے گا۔ انھیں امور کے پیش نظر یہاں غالب کی اردو مکتوب نگاری کا آغاز ۱۸۴۸ء کے آس پاس بتایا گیا ہے (کاظم علی خاں) ۷؎ خطوط غالب ۱: مرتبہ مالک رام انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۶۲ء (خط بنام حقیر) ص ص ۱۰۴/۱۰۳۔ ۸؎ ماسبق ص ۱۰۵ ۹؎ ماسبق ص ۱۰۶۔ ۱۰؎ ماسبق (مکتوب بنام تفتہ) ص ۱۹۔ ۱۱؎ ماسبق ص ۳۲۔ ۱۲؎ اس نظریے کی تائید ڈاکٹر عبد الجلیل کے مضمون "مرزا غالب کی بیماریاں اور مرض الموت" مشمولہ عیار غالب ص ص ۲۳۱ تا ۲۵۰ سے بھی بخوبی ہو جاتی ہے۔ (کاظم علی خاں)

پریشان کن بیماریوں کے سلسلے کا آغاز ۱۸۵۰ء اور اس کے بعد کے زمانے میں ہوا تھا۔ ان حقائق و شواہد سے یہ بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ ۱۸۴۸ء کے آس پاس جب غالب نے اردو مکتوب نگاری کا آغاز کیا تو نہ تو وہ شدید امراض کا شکار تھے اور نہ غلبۂ پیری کے ہاتھوں ایسے نحیف و نزار ہوئے تھے کہ فارسی کی جگہ اردو میں مکتوب نگاری اختیار کرنے پر مجبور ہوتے۔ لہٰذا غالب کی اردو مکتوب نگاری کے آغاز کو ان کی ضعیفی یا بیماری کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۴۸ء کے آس پاس اردو مکتوب نگاری کی ابتدا ہونے کے بعد جب غالب غلبۂ پیری اور دوسرے امراض و آلام سے دوچار ہوئے تو ان حالات میں انھوں نے اردو مکتوب نگاری کو جاری رکھا۔ مگر غالب کی اردو مکتوب نگاری کا آغاز ضعیفی اور بیماری کے بجائے بعض دوسرے محرکات کا مرہونِ منت ہے اور ان محرکات کا سراغ ہمیں غالب کے سوانحِ حیات میں مل سکتا ہے۔

غالب کے صحیفۂ حیات کی ورق گردانی کرنے پر راقم الحروف کو اس امر کے قطعی اور حتمی ثبوت ملے ہیں کہ غالب ۱۸۴۸ء کے آغاز میں شدید ذہنی کشمکش سے دوچار تھے۔ وہ اس زمانے میں بہت زیادہ ملول و رنجیدہ تھے۔ اُس وقت ان پر ایک روحانی کرب کی کیفیت طاری تھی۔ غالب کی یہ ذہنی کشمکش دراصل ان کی زندگی کے اس المناک واقعے کا فطری نتیجہ تھی جس نے ان کے قلبِ ذہن کی دنیا کو تہ و بالا کر ڈالا تھا اور جو واقعۂ قید کے عنوان سے موسوم ہے۔ غالب چھ ماہ کی قید کی سزا میں سے نصف مدت جیل میں رہ کر رہا ہو گئے تھے مگر رہائی کی صحیح تاریخ کی نشاندہی کرنے سے محقق قاصر نظر آتے ہیں۔ مولانا سید مرتضیٰ حسین کے مطابق جولائی، اگست اور ستمبر ۱۸۴۷ء کے تین مہینے غالب نے قطعاً جیل میں گزارے ہوں گے۔[۱] نثار احمد فاروقی اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

"غالب کی گرفتاری ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو عمل میں آئی تھی اور ۲ جولائی ۱۸۴۷ء کو عدالت فوجداری سے مقدمے کا فیصلہ ہوا۔ پھر غالب نے اپیل کیا۔ اس میں کم سے کم دو تین ماہ گزر گئے ہوں گے اور تین مہینے غالب جیل میں رہے[۲] گویا وہ ۱۸۴۷ء کے اواخر یا ۱۸۴۸ء کے اوائل میں قید سے رہا ہوئے۔ منشی نبی بخش حقیر کے نام ۲۲ فروری ۱۸۴۸ء کے غالب کے ایک فارسی مکتوب سے یہ پتا چلتا ہے کہ غالب ۲۲ فروری ۱۸۴۸ء سے قبل ہی رہائی پا چکے تھے۔[۳] ان حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب ۱۸۴۷ء کے اواخر یا ۱۸۴۸ء کے اوائل میں مگر ۲۲ فروری ۱۸۴۸ء سے قبل جیل سے رہا ہوئے تھے۔ ملحوظ رہے کہ غالب کا پہلا موجودہ معلوم مطبوعہ اردو خط ۹ مارچ ۱۸۴۸ء کو لکھا گیا تھا یعنی غالب کی اردو مکتوب نگاری کی باقاعدہ ابتدا غالب کی قید سے رہائی کے کچھ عرصے بعد ہی ہوئی تھی۔[۴] میرے نزدیک غالب کی اردو مکتوب نگاری جن عوامل و محرکات کا نتیجہ تھی ان میں غالب کی اسیری کا واقعہ بھی شامل ہے اور یہ واقعہ اس سلسلے میں اہم محرک کی حیثیت رکھتا ہے مگر ابھی تک اس طرف کسی اہم ناقد اور محقق کی نظر نہیں گئی ہے۔

سانحۂ اسیری غالب کی زندگی کا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ یہ ناخوشگوار واقعہ غالب کی حیات اور ادبی تخلیقات کے لیے دور رس اثرات کا حامل ہے۔ اس واقعے نے غالب کے وقار کو داغدار کر ڈالا، ان کی عزت کو ٹھیس اور شہرت میں دھبا لگا دیا۔ اس واقعے نے غالب کے قلبِ ذہن

---

[۱] مرتضیٰ حسین، بمضمون "غالب اور قید" مشمولہ گنجینۂ غالب۔ پبلی کیشنز ڈویژن۔ نئی دہلی، فروری ۱۹۶۶ء۔ ص ۱۸۵۔ [۲] فاروقی، نثار احمد، تلاشِ غالب۔ دہلی، مئی ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۳۷۔ [۳] بحوالۂ ماسبق ص ص ۱۳۴/۱۳۲۔ [۴] اکتوبر ۱۹۷۵ء میں دستیاب ہونے والے غالب کے بعض غیر مطبوعہ اردو خطوط ۱۸۴۶ء کے بتائے جاتے ہیں۔ اگر نو دریافت خطوط حقیقتاً غالب ہی کے ثابت ہوئے تو بھی ان کی حیثیت استثنائی ہو گی۔ کیوں کہ غالب کی اردو مکتوب نگاری کا سلسلہ ۱۸۴۷ء میں آگے نہیں نظر آتا۔ لیکن ۱۸۴۸ء اور اس کے بعد غالب کے اردو خطوط باقاعدگی اور تسلسل سے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے میری رائے میں غالب کی اردو مکتوب نگاری کا باقاعدہ آغاز ۱۸۴۸ء میں ہوتا ہے۔ (کاظم علی خاں)

کی دنیا ہلا کر رکھ دی۔ بہ روایت مولانا حالی و بہ قول مولانا ابوالکلام آزاد غالب کے لیے اس واقعے کا ایک نہایت تکلیف دہ پہلو یہ بھی تھا کہ اسیری کے بعد نہ صرف غالب کے بعض دوستوں اور ہم جلیسوں بلکہ عزیزوں نے بھی آنکھیں پھیر کر توتا چشمی کا ثبوت دیا یہاں تک کہ یہ بے مروت لوگ اس بات میں بھی شرمندگی محسوس کرتے تھے کہ وہ غالب کے عزیز و اقارب تصور کیے جائیں چناں چہ جب آگرے کے ایک اخبار میں مرزا غالب کا ذکر کرتے ہوئے خاندان لوہارو سے مرزا کا رشتہ ظاہر کیا گیا تو خاندانِ لوہارو نے "بہ اہتمام و تکلف اس کی تغلیط کرائی" اور اخبار میں یہ شائع کرایا کہ خاندانِ لوہارو کا کوئی نسبی تعلق نہیں بلکہ محض دور کا سببی رشتہ ہے۔[51] اقربا کی بے مہری کے برعکس غالب کے شاگرد اور دوست نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اس زمانے میں غالب کا پورا ساتھ دیا، نہ صرف رہائی کے لیے سعی و سفارش بلکہ اپیل کے مصارف بھی برداشت کیے۔ اقربا کی بے مروتی اور شیفتہ کی غم خواری کا ذکر غالب نے اپنے چوراسی اشعار کے اس فارسی ترکیب بند (جبیریۂ غالب)[52] میں بھی کیا ہے جو سانحۂ قید کی یادگار ہے۔

ب

حادثۂ اسیری کے ہاتھوں غالب جس شدید ذہنی اور روحانی کرب میں مبتلا ہوئے اس کا ذکر معاصرینِ غالب سے عہدِ حاضر تک کے صاحبانِ قلم اپنی نگارشات میں برابر کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں چند اہم بیانات ملاحظہ ہوں۔

احسن الاخبار بمبئی غالب کے واقعۂ اسیری کے تحت لکھتا ہے: "...... اس قدر مصیبت اور مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔"[53]

طبقات شعرائے ہند میں کریم الدین کا بیان ہے: "ان ایام میں یعنی درمیانِ مئی ۱۸۴۷ء کے ایک حادثہ اُن (غالب) پر جانب سرکار سے پڑا، پڑا جس کے سبب اُن کو بہت رنج لاحق ہوا۔"[54] مولانا حالی نے سانحۂ اسیری کے بارے میں لکھا ہے: "یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گزرا تھا...... وہ اس کو ایک بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے۔"[55] شیخ محمد اکرام اس سلسلے میں رقم طراز ہیں: "...... ایک مرزا اور خاندانی آدمی کے لیے اس طرح جیل جانا انتہائی توہین اور بے آبروئی کی بات تھی۔ اُن (غالب) پر اس واقعے کا بڑا اثر ہوا۔"[56] مالک رام کا بیان ہے: "اگرچہ یہ قید محض نظر بندی تھی ...... مگر پھر بھی قید تھی، اس لیے قدرتی طور پر مرزا جیسے خود دار شخص نے اُسے بہت محسوس کیا...... اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس قید سے ان کے عز و وقار کو سخت نقصان پہنچا۔"[57] مولانا امتیاز علی عرشی نے غالب کے سانحۂ اسیری کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے: "اس واقعے کی جزئیات بے حد افسوس ناک تھیں، کوتوال نے گرفتاری کے وقت اور مجسٹریٹ نے سزا کی تجویز میں ان کی وجاہت و شرافت کا قطعاً لحاظ نہ کیا۔ پولیس اور عدالت کے اس نامناسب سلوک سے ان کی حسِ غیرت سخت مجروح ہوئی، خود اپنی نظر میں شرافتِ خاندانی پر دھبا آ گیا، اور وہ اپنے آپ کو روسائے ہندستان سے ملنے جلنے کے قابل شمار کرنے میں پس و پیش کرنے لگے۔"[58] کوثر چاندپوری کا بیان ہے: "اسیری کا غالب کے دل و دماغ پر بہت زیادہ اثر پڑا تھا وہ زندگی ہی سے بیزار نظر آنے لگے، اور چاہتے تھے کہ زندہ نہ رہیں، اگر زندہ رہیں تو ہندستان میں نہ رہیں.....

---

۵۱ بحوالۂ غالب اور ابوالکلام، دہلی ۱۹۶۹ء۔ ص ص ۱۴۱/۱۴۰۔ ۵۲ جبیریہ غالب کے لیے یوسف ہندی کا قید فرنگ میں بر محسن بن شبیر۔ شائع کردہ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد اور غالب۔ مہر، غلام رسول ملاحظہ ہو۔ (کاظم علی خاں)

۵۳ احسن الاخبار، بمبئی مورخہ ۳ جولائی ۱۸۴۷ء۔ بحوالۂ غالب نامہ ص ص ۹۵/۹۴۔ ۵۴ کریم الدین: طبقات شعرائے ہند۔ بحوالۂ نادم سیتاپوری: غالب نام آورم۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۲ء۔ ص ۲۴۔ ۵۵ حالی، مولانا الطاف حسین: یادگار غالب، الہ آباد ۱۹۵۸ء۔ ص ۲۸۔ ۵۶ اکرام، شیخ محمد: غالب نامہ۔ ص ۸۹۔ ۵۷ مالک رام: ذکر غالب، دہلی ۱۹۶۴ء ص ص ۱۰۹/۱۰۸۔ ۵۸ عرشی، مولانا امتیاز علی خاں: مکاتیب غالب۔ رام پور، ۱۹۴۶ء۔ (دیباچہ) ص ص ۶۹/۶۸۔

وہ اس واقعے کو اپنے لیے "رسوائی جاوید" خیال کرتے ہیں"۔[1] ڈاکٹر سلام سندیلوی نے لکھا ہے: "اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کو جیل میں کوئی خاص تکلیف نہیں تھی..... مگر اس سزا سے غالب کی عزت خاک میں مل گئی جس کا اُن کو سخت افسوس ہوا"۔[2] پروفیسر رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں: "کلکتے سے واپسی پر بقیہ تمام عمر دہلی میں بسر ہوئی۔ زندگی کے طرح طرح کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا، فراز سے کم نشیب سے زیادہ، بہت زیادہ۔ قمار بازی کی پاداش میں قید خانے جانے کا حادثہ بڑا سخت تھا۔ اُس وقت کی دہلی کی اشراف سوسائٹی میں اس طرح کی لغزش ناقابل معافی تھی .... خاندانی مناقشے (کذا؟ مناقشے) اقربا کی بے اعتنائی ...... آمدنی حد سے زیادہ محدود کبھی مسدود، قرض کی گراں باری، غرض وہ تمام بلائیں جو خانۂ انوری کی تلاش میں آسمان سے مرغوں میں نکلتی تھیں، خانۂ غالب پر مشاعرہ بن کر نازل ہوتی رہیں اور غالب کا یہ کہنا غلط نہیں معلوم ہوتا کہ اگر ستم ہائے عزیزاں کی شرح کر دوں تو جہاں سے رسم امید اٹھ جائے"۔[3] ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق: "غالب کی زندگی کا سب سے المناک واقعہ غالباً اُن کی اسیری ہے ...... اس واقعے سے غالب کے وقار کو بھی ٹھیس لگی اور اُن کی طبیعت پر بھی اس کا بُرا اثر ہوا۔ اس واقعے کے بعد نسبت اور بھی مشکل ہو گئی اور پچپن سال[4] سے غالب جن مالی پریشانیوں کے شکار تھے اُن میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا"۔[5]

اس اہم مسئلے کے بارے میں اقتباسات کا یہ سلسلہ خاصا طویل ہو گیا ہے۔ اب محض دو مزید تراشے اور پیش کرنا ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا خیال ہے: "غالب عزت اور خوش حالی کے پیچھے جتنا بھاگتے تھے، اتنی ہی وہ اُن سے دور گریز کرتی تھی۔ پنشن کے مقدمے کی ذہنی کوفت اور مالی زیرباری کے علاوہ ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کی وجہ سے انھیں بے آبروئی کا گھاؤ کھانا پڑا۔ جو تھوڑی بہت عزت باقی تھی، وہ بھی جاتی رہی۔ .... ۱۸۴۱ء میں جوے کی علت میں انھیں سو روپے جرمانے کی سزا ہو چکی تھی۔ اس کے بعد بھی اُن کا یہ مشغلہ جاری رہا..... نتیجہ یہ ہوا کہ ...... وہ (دوبارہ) گرفتار کر لیے گئے....... غالب کو اپنی بے آبروئی اور ذلت کا سخت قلق تھا......"۔[6] ڈاکٹر سید عبداللطیف نے غالب کے حادثۂ اسیری کے بارے میں لکھا ہے: "...... انسان کو ہمیشہ چین کی زندگی نصیب نہیں ہوتی، ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں جو اُس کے دماغ کی رو کو بدل دیتے ہیں۔ چناں چہ قمار بازی کے جرم میں سزائے قید کا بھگتنا غالب کی زندگی میں اسی قسم کا ایک واقعہ ہے۔ دوسرا واقعہ ۱۸۵۷ء کا قیامت خیز غدر ہے۔ اسلامی طبقے پر یہ ایک مصیبت تھی جس کی زد میں بہت سے مسلمان آ گئے اور غالب بھی اس زد سے نہ بچ سکا۔ اس کی مالی حالت خاص طور پر اس واقعے سے متاثر ہوئی۔ ان دو واقعات میں قید ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دینی چاہیے اور اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں کہ خود غالب کو اس کا بڑا صدمہ ہوا ...... یہ واقعہ اس کی وفات سے کوئی بیس (کذا؟ بائیس) سال پہلے کا ہے اس لیے محقق کو پایانِ عمر کے کلام میں اُن واقعات کو ڈھونڈ نکالنا چاہیے جو

---

۱ کوثر چاندپوری: جہانِ غالب، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، سماپریس، لکھنؤ، ص ۵۶۔ ۲ ڈاکٹر سلام سندیلوی: غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۴۔ ۳ پروفیسر رشید احمد صدیقی: غالب کی شخصیت اور شاعری۔ شائع کردہ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی، ۱۹۷۰ء۔ ص ۲۲۔ ۴ حادثۂ اسیری (۱۸۴۷ء) کے موقعے پر غالب (ولادت ۱۷۹۷ء) کی عمر ڈاکٹر عبادت بریلوی نے پچاس کے بجائے پچپن سال درج فرمائی ہے جو کسی تسامح کا نتیجہ ہے (کاظم علی خاں) ۵ ڈاکٹر عبادت بریلوی: غالب اور مطالعۂ غالب۔ سکینہ پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ڈی لکس ایڈیشن۔ جون ۱۹۷۰ء۔ ص ص ۱۵/۱۶۔ ۶ ڈاکٹر یوسف حسین خاں: غالب اور آہنگِ غالب۔ غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ستمبر ۱۹۷۱ء ص ص ۸۳ تا ۸۵۔

کسی ردعمل کا پتا دیتے ہوں۔ قید کے زمانے میں غالب نے فارسی میں ایک ترکیب بند لکھا تھا جس سے مردم بیزاری کی بو آتی ہے"۔[۵۱]

ان تمام تراشوں کی مدد سے اس ناخوش گوار واقعے کی اہمیت بہ خوبی واضح ہو جاتی ہے۔ حادثۂ اسیری غالب کے صحیفۂ حیات کا محض ایک تاریک باب نہیں بلکہ یہ ایک ایسی مضراب ہے جو غالب کے سازِ دل کو چھیڑ کر بعض ایسے دردناک نغمے وجود میں لائی جن کی صدائے بازگشت غالب کے ادبی تخلیقات میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ غالب کی یہ الم ناک نے نظم میں بھی سنی جا سکتی ہے اور نثر میں بھی اس کے ارتعاش کا احساس و ادراک کیا جا سکتا ہے اور اس سلسلے میں فارسی یا اردو کی بھی کوئی تحدید و تخصیص نہیں دونوں ہی زبانوں کے ادبی تخلیقات میں غالب کی اُن اندوہ ناک کراہوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے جو حادثۂ اسیری کے باعث اُن کے دُکھے ہوئے دل سے بلند ہوتی رہی ہیں۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے غالب کے سانحۂ اسیری کا ذکر کرتے ہوئے درست فرمایا ہے کہ "اس کانٹے کے چبھنے سے کبھی ان کا بہت سا خونِ دل کاغذ کے صفحوں پر بہا اور ہمارے لیے متعدد شاہکار نقش باقی رہ گئے"۔[۵۲] غالب کے خونِ دل سے بننے والے ان نقوش کو اگر فارسی نظم میں دیکھنا ہو تو یہ "حبسیہ غالب" میں بھرپور جلوہ گر نظر آئیں گے مگر ان کی مختصر و متفرق جھلکیاں بھی غالب کے فارسی کلام میں مل سکتی ہیں۔ مثلاً غالب کے اس مشہور فارسی شعر کو بھی اس واقعے کی یادگار قرار دیا جا سکتا ہے۔ ؎

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

نثار احمد فاروقی کے الفاظ میں اس شعر کا اردو مفہوم یہ ہے: "بیان میں نہیں آ سکتا کہ غالب ناکام پر کیا گزر گئی۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس بندے کا خداوند نہ تھا"۔[۵۳] منشی نبی بخش حقیر کے نام اپنے مورخہ ۱۶ر ستمبر ۱۸۴۸ء کے ایک فارسی مکتوب میں خود غالب کے بیان کے مطابق یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ فارسی شعر غالب نے ۱۶ر ستمبر ۱۸۴۸ء سے دو تین روز قبل بالکل تازہ اور رقِ ایدہ[۵۴] کہا ہے۔ گویا یہ فارسی شعر غالب کے حادثۂ اسیری کے بعد وجود میں آیا ہے اور محولہ بالا فارسی خط کے بعض مضبوط قرائن کی بنیاد پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ شعر غالب کے سانحۂ اسیری کی اُن کرب ناک یادوں کا نتیجہ ہے جو اسیری کے کافی عرصے بعد تک غالب کے قلب و ذہن میں جاگزیں رہی تھیں۔

سانحۂ اسیری کی دردناک یادوں کے نقوش فارسی نظم کے علاوہ اُس اردو کلام میں بھی نظر آتے ہیں جو غالب کے واقعۂ قید کے بعد وجود میں آیا تھا اور مولانا امتیاز علی عرشی کی گراں قدر تحقیق سے جس کی توقیت بھی عمل میں آ چکی ہے۔[۵۵] غالب کے ۱۸۴۷ء کے بعد کے اردو کلام سے چند ایسے اشعار[۵۶] ملاحظہ ہوں جن میں واقعۂ اسیری کی روح فرسا یادوں کے نتیجے میں غالب کی کرب ناک کراہوں کی بازگشت محسوس کی جا سکتی ہے:

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلاؤں
اُنگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

---

[۵۱] غالب: مصنفہ ڈاکٹر سید عبداللطیف۔ مترجمہ سید معین الدین قریشی جہاں گیر بک ڈپو دہلی۔ سنہ ندارد۔ ص ص ۴۴/۴۳۔ [۵۲] عرشی، مولانا امتیاز علی خاں، دیوان غالب (نسخۂ عرشی) ص ۶۱۔ بہ حوالۂ تلاش غالب۔ فٹ نوٹ نمبر ۱۔ ص ۱۳۸۔
[۵۳] نثار احمد فاروقی: تلاش غالب۔ ص ۱۰۱۔ [۵۴] ماسبق ص ص ۹۲/۹۱۔ [۵۵] اس سلسلے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مرتبہ دیوان غالب (نسخۂ عرشی) انجمن ترقی اردو ہند طبع اول۔ ۱۹۵۸ء ملاحظہ ہو (کاظم علی خاں)۔ [۵۶] بیشتر اشعار تلاش غالب ص ص ۳۲ تا ۱۴۲ سے ماخوذ ہیں۔ (کاظم علی خاں)

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریٔ زنجیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ — کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو — کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بد خواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے
رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں — سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

ان اشعار میں مایوسی اور ناامیدی کے جذبات و احساسات سے پُر اس ذہنی فضا کی بخوبی غمازی ہو رہی ہے جو واقعۂ قید کے کافی عرصے بعد تک غالبؔ کے قلب و ذہن کو اپنی مضبوط گرفت میں لیے رہی تھی۔ غالبؔ کے سانحۂ اسیری کو پیش نظر رکھ کر اگر ۱۸۴۷ء کے بعد وجود میں آنے والی تذکرہ بالا تمام غزلوں کا مطالعہ کیا جائے تو دیوان غالبؔ اپنے دامن میں قاری کے لیے معنویت کی ایک ایسی نئی دنیا کو بے نقاب کر سکتا ہے جو کلامِ غالبؔ کے عام شارحین کی نظروں سے ابھی تک اوجھل رہی ہے اور جس کے وجود سے دیوان غالبؔ کی بیشتر شرحیں اب تک خالی نظر آتی ہیں۔ غالبؔ کے سوانح حیات اور عصری حالات کو پیش نظر رکھ کر اگر کلامِ غالبؔ کی شرحیں لکھی جائیں تو شارحین پر کلامِ غالبؔ کے معنویت سے بھرپور ایک نئے عالم کے انکشاف کے روشن امکانات کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ غالبؔ فہمی کا ایک نیا دور مستقبل کے

---

* اس غزل کے زمانۂ تخلیق کا تعین نثار احمد فاروقی کی تحقیقی کاوشوں کے نتیجے میں ۲۱ فروری ۱۸۴۸ء ہوا ہے۔ (ر۔ک۔ تلاش غالبؔ ص ص ۱۳۵/۱۳۴)۔ ملحوظ رہے کہ یہ وہی زمانہ ہے جب غالبؔ قید سے کچھ عرصے قبل رہا ہوئے تھے۔ (کاظم علی خاں)

شارحین کا استقبال کرنے کا منتظر ہے۔ "سخن فہم" اور "غالب کے طرف دار" غالب شناسی کے اس نئے عہد تک جس روز بھی ذہنی رسائی حاصل کرلیں گے وہ دن غالبیات میں تاریخی دن ہوگا۔ ہم اس روز کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔

اردو و فارسی نظم کے علاوہ حادثۂ اسیری کی تلخ یادیں غالب کی اردو و فارسی نثر میں بھی موجود ملتی ہیں۔ منشی نبی بخش حقیر کے نام ۱۰ر جنوری ۱۸۵۰ء کے ایک اردو خط میں غالب نے شدید رنجیں یادوں کو یوں بیان کیا ہے: "شفیق میرے، مکرم فرمائے، عنایت گستر میرے! تمھارے ایک خط کا جواب مجھ پر قرض ہے۔ کیا کروں، سخت غم زدہ اور ملول رہتا ہوں۔ مجھ کو اب اس شہر کی اقامت ناگوار ہے؟ اور موانع و عوائق ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نکل نہیں سکتا۔ خلاصہ میرے رنج و الم کا یہ ہے کہ میں اب صرف مرنے کی توقع پر جیتا ہوں۔ ہیہات ؎

منتہی مری نہ یہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

آج اسی ہجوم غم و اندوہ میں تمھارا اور تمھارے بچوں کا خیال آگیا۔ ......"[1]

تفتہ کے نام اپنے ۱۰ر ستمبر ۱۸۵۲ء کے ایک اور اردو خط میں بھی غالب نے اسی ناخوش گوار واقعے کی جانب اشارہ کیا ہے: "...... سرکار انگریزی میں بہت بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، پورا خلعت پاتا تھا، اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بڑا دھبا لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل نہیں کر سکتا، مگر ہاں استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں، کچھ آپ فائدہ اٹھاؤں، کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کر دوں۔"[2]

اردو نثر کے علاوہ غالب کی فارسی نثر بھی واقعۂ اسیری کی تلخ یادوں سے خالی نہیں۔ غالب کے فارسی خطوط میں بھی اس سانحے کے نقوش کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں۔ قید سے رہائی کے کچھ عرصے بعد ہی غالب نے ۲۲ر فروری ۱۸۴۸ء کو منشی نبی بخش حقیر کے نام ایک فارسی خط لکھا ہے جس میں اس ناخوش گوار واقعے کا ذکر موجود ہے جس کا اردو مفہوم ملاحظہ ہو: "اس زمانے میں جب میں بند ستم سے آزاد ہو گیا تھا اور بند غم میں گرفتار تھا تفتہ دہلی آئے اور اپنی ہم نشینی سے میرا دل بہلا کر وطن رخصت ہو گئے۔ کل ایک تیموری شہزادے نے بزم مشاعرہ منعقد کی تھی اور شعراء کو غزل خوانی کے لیے مدعو کیا تھا۔ مجھے اب شعر کہنے کا دماغ تو رہا نہیں نہ طبع اس طرف مائل تھی لیکن بندگی بے چارگی، چناں چہ عین اسی دن جب مشاعرے میں جانا تھا بلکہ اس وقت جب پالکی میں بیٹھا ہوا مشاعرے میں شرکت کی خاطر جا رہا تھا چند شعر بے طلب ذہن میں آگئے وہ تمھیں بھیج رہا ہوں۔"[3] ۲۲ر فروری ۱۸۴۸ء کے اس فارسی خط میں غالب کا سانحۂ اسیری کے الم ناک احساسات میں ڈوبا رہنا فطری امر ہے۔ وہ اس زمانے سے کچھ عرصہ قبل ہی بند ستم سے آزاد ہوئے تھے۔ مگر غالب کے قلب و ذہن کافی عرصے بعد تک بھی اس واقعے کی تلخ یادوں کی آماج گاہ بنے رہے۔ چنانچہ حقیر ہی کے نام اپنے ۱۶ر ستمبر ۱۸۴۸ء کے ایک اور فارسی مکتوب میں بھی غالب نے اسی کرب ناک سانحے کا اعادہ کیا ہے۔ اس فارسی خط کے ضروری حصوں کا اردو مفہوم ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ غالب، حقیر سے ہم کلام ہیں: "آپ نے میرا حال پوچھا ہے اور مجھ سے غزل طلب کی ہے۔ یقین کیجیے کہ دل ٹھکانے ہوتا ہے تو زبان بھی زمزمہ سنج ہوتی ہے۔ اب تو دل اتنا بجھ گیا ہے گویا مر گیا، تو جوش کہاں سے آئے جو لبوں کو جنبش ہو۔ آپ نہیں دیکھتے کہ انھیں حکام نے جو مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے مجھ پر کیا بیتی اور میری زندگی کافروں کی عاقبت جیسی ہو گئی۔ شاعری کی طرف دل کیا مائل ہو اور کیا باد پیمائی کروں۔ دو تین روز ہوئے اپنے حال کی بے رونقی کا خیال کر رہا تھا۔ ایک شعر جس میں تخلص بھی

۱؎ غالب، اسداللہ خاں: خطوط غالب (۱) مرتبہ مالک رام ص ۱۰۳۔ ۲؎ غالب، اسداللہ خاں: خطوط غالب (۱) مرتبہ مالک رام ص ۱۸۰۔ ۳؎ بہ حوالۂ تلاشِ غالب ص ص ۱۴۲/۱۴۱۔

ہے نے ارادہ زبان پر جاری ہوگیا، بس تازہ ہے تو یہی ہے ؎

گفتنی نیست کہ بر غالبؔ ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

(اردو مفہوم بیان میں نہیں آسکتا کہ غالبؔ ناکام پر کیا گزر گئی۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس بندے کا خدا نہ تھا) آلام جسمانی بھی اگرچہ بہت ہیں لیکن اندوہ روحانی اُن سے کہیں بڑھ گئے جو دل و جگر دونوں کو تباہ کر رہے ہیں (عربی): میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں یقیناً خدا بندوں کے معاملات کو دیکھنے والا ہے ..... اسد اللہ۔ لکھا ہوا۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۴۸ء۔" [1]

۱۶ ستمبر ۱۸۴۸ء کے اس فارسی خط کے بعد بھی حادثۂ اسیری کی یادوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو جب غالبؔ مغل حکمراں بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار میں باریاب ہو کر خلعت، خطاب اور شاہی ملازمت کے فرمان سے سرفراز ہوئے تو اس خوشی کے موقعے پر بھی غالبؔ کے ذہن میں حادثۂ اسیری کی روح فرسا یادیں کروٹیں بدلنے لگی تھیں۔ چناں چہ ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کے ایک فارسی خط میں غالبؔ نے شیفتہؔ کو جو کچھ لکھا ہے اُس کا اردو مفہوم ملاحظہ ہو: ..... احترام الدولہ بہادر نے ... آج ہی ..... مجھے شہنشاہ کے دربار میں بلایا اور خلعت و خطاب و فرمان سے سرفراز کیا۔ کل کوتوال شہر نے مجھے "بدمعاش" اور "سرغنہ" لکھا تھا، تو میرا کچھ نہ گھٹا تھا، آج بادشاہ دہلی نے 'نجم الدولہ' اور 'دبیر الملک' کا خطاب دیا ہے تو کچھ بڑھ نہیں گیا۔ اب فردائے قیامت میں دیکھنا ہے کہ مجھے کیا لکھا جاتا ہے، کس نام سے پکارا جاتا ہے اور وہاں میری کیا ارزش ہوتی ہے — خدا کے لیے آیئے اور جلدی آیئے تاکہ آپ شاہی فرمان اور اس روسیاہ کی تحریر دیکھیں۔" [2]

یہ خط نثار احمد فاروقی کی تحقیقی کاوش سے روشنی میں آیا ہے۔ اس خط کی توضیح کے تحت فاروقی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"......اس خلعت و خطاب اور قلعے کی ملازمت سے غالبؔ کو جو خوشی ہوئی تھی وہ اس خط سے ظاہر ہے۔ انھیں یہ احساس تھا کہ حادثۂ اسیری نے جو داغ "بدمعاشی" و "میر فساطی" کا اُن کے دامن پر لگایا تھا وہ کسی حد تک اس خلعت سے ڈھک جائے گا۔" [3]

سانحۂ اسیری کی تلخ یادوں کا بیان غالبؔ نے تفضل حسین خاں کے نام اپنے اُس فارسی مکتوب میں بھی کیا ہے جس کا اردو ترجمہ مولانا حالیؔ نے یادگار غالبؔ میں درج کیا ہے۔ مولانا حالیؔ نے یادگار غالبؔ میں حادثۂ اسیری کے بیان کے موقعے پر غالبؔ کے محض ایک فارسی خط کا اردو ترجمہ پیش فرمایا ہے۔ اختر صدیقی نے اس ایک فارسی خط کو دو خطوط سے تعبیر فرمایا ہے۔ [4] یہ موصوف کا کھلا ہوا تسامح ہے۔ مولانا حالیؔ کے ذریعے پیش ہونے والے غالبؔ کے اس واحد فارسی خط کے اردو ترجمے کے ضروری حصے ملاحظہ ہوں: "کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا اُس نے اغماض و تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سُنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم (نہیں) کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ اور وہاں سے حکم رہائی کا آ گیا ...... اگرچہ میں اس وجہ سے ہر کام

---

[1] بحوالہ نثار احمد فاروقی: تلاش غالب (فارسی خط ص ص ۹۲/۹۱) اردو مفہوم ص ص ۱۰۱/۱۰۰۔

[2] بحوالہ نثار احمد فاروقی: تلاش غالبؔ ص ۹۸ (فارسی خط ص ص ۸۹/۸۸) [3] ماسبق ص ص ۱۰۸/۱۰۷۔ [4] اختر صدیقی: غالبؔ اپنے آئینے میں۔ بھارتی پبلیکیشنز دہلی۔ اپریل ۱۹۷۰ء۔ ص ص ۷۲، ۲۱۔

کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور تقاضا اسے روا نہیں جانتا جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں مگر آرزو کرنا آئینِ عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے، یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے، دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بہ صحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ مجھ پر گزرا اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں۔"[1]

مذکورہ بالا خط کے آخری حصے میں غالب نے جن مایوسانہ خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں پیش نظر رکھ کر اگر غالب کا مندرجہ ذیل مطلع پڑھیے تو مفاہیم کے نئے گوشے منکشف ہوتے ہیں اور شعرِ غالب کے ان ارادوں کی منہ بولتی تصویر محسوس ہوتا ہے جن کا اظہار محولہ بالا مکتوب میں کیا گیا ہے۔ غالب کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

ملحوظ رہے کہ یہ شعر بھی غالب کے واقعۂ قید کے بعد کے کلام میں شامل ہے اور خود غالب نے اپنے اس شعر کی جو شرح کی ہے وہ بھی ہمارے قول کی تائید کرتی ہے۔ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کے نام اپنے مورخہ ۲۴ اگست ۱۸۶۴ء کے ایک خط میں غالب اپنے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ؎

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

اس میں کوئی اشکال نہیں جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا؟ مبہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا۔ خدا جانے کہ شہر میں یا نواحِ شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ کر پردیس چلا جائے"۔[2]

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں غالب کے سر سے موجِ خوں گزر چکی تھی مگر حادثۂ اسیری نے ان کے دل کا خون کر دیا تھا اور دل کا خون ہو جانے پر بعض ایسے تصورات بھی درہم و برہم ہو گئے جنھیں غالب متاعِ عزیز کی طرح سینے سے لگائے رہتے تھے یا جو ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں تھے۔ ان تصورات میں نسلی اور خاندانی وجاہت بھی شامل ہے جس کا غالب نہ صرف شدید احساس رکھتے تھے بلکہ برابر اس پر اظہارِ فخر بھی کرتے رہتے تھے اور بعض موقعوں پر اسی جذبے کے ہاتھوں غالب پر مالی منفعت کے دروازے کھلتے کھلتے بند ہو گئے تھے۔

نسل اور خاندان کے بارے میں غالب کے ان تصورات کے سرچشمے اس جاگیردارانہ نظام میں موجود ملتے ہیں جس میں غالب نے سانس لی اور جس کے تحت سماج میں فرد کی وقعت ذاتی صلاحیتوں سے زیادہ نسب ناموں پر منحصر ہوتی تھی۔ جاگیردارانہ نظام میں نسب ناموں کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی اس کی روشنی میں غالب کا افراسیاب اور پشنگ سے اپنا رشتہ جوڑنے کو خارجی عصری اقدار کا آئینہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی رجحان کے زیر اثر غالب اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ "میرے آباو اجداد کیا تھے اور میں کیا ہوں، نہ سلطان سنجر بن سکا نہ بوعلی۔"[3] مہر نیم روز کے دیباچے میں بھی اسی نسلی اور خاندانی تفاخر کے جذبے نے غالب سے لکھوایا ہے کہ "میرے بزرگوں کا سمرقند سے ہندوستان آنا ایسا تھا جیسے پانی اوپر سے نیچے آتا ہے۔"[4]

تنگ دستی کے باوجود غالب نے زندگی میں متعدد بار مالی منفعت کو ٹھکرا کر جس طرح خاندانی وجاہت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ جذبہ انھیں کتنا عزیز تھا۔ مفلسی کے باوجود غالب

---

[1] بحوالہ حالی، مولانا الطاف حسین: یادگارِ غالب ص ص ۲۸/۲۷۔
[2] غالب، اسداللہ خاں: خطوطِ غالب (حصہ دوم) مرتبہ مہر، غلام رسول۔ کتاب منزل لاہور۔ طبع اول ص ۲۷۵۔ [3] بحوالہ سید احتشام حسین: "مضمون غالب کا تفکر" مشمولہ تنقید اور عملی تنقید۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔ طبع چہارم ۱۹۷۴ء۔ ص ۷۵۔ [4] ماسبق ص ۷۶۔

میرے اندر کا جاسوس جاگ اٹھا۔ میں کمپاؤنڈ کے دروازے پر ہی رک کر دودھ والے کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے دودھ والے سے وہ لفافہ لے لیا۔ لفافے کی پیشانی پر زرینہ کی "عزیز سہیلی" کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ دفتر جا کر میں نے لفافہ کھولا ــــ زرینہ کی ایک تصویر اور کچھ صفحات پر مشتمل ایک محبت نامہ جو کسی "جانِ من ندیم" کے نام لکھا گیا تھا۔ اس دن مجھے زرینہ کے ہمیشہ اداس رہنے کا راز معلوم ہوا۔ ندیم اس کا محبوب تھا جسے وہ شادی کے بعد بھی نہ بھلا پائی تھی۔ اسی دن مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ زرینہ کے باپ نے میرے باپ کو پانچ ہزار روپے کیوں دیے تھے۔

پھر ایک دن جب زرینہ پڑوس کی ایک شادی میں گئی ہوئی تھی، میں نے اس کی اٹیچی کا تالا توڑ کر اس کی تلاشی لے ڈالی۔ مجھے جلد ہی مطلوبہ شے مل گئی ــــ ندیم کے خطوط کا پلندہ۔ مگر چونکہ میں شوہر نہیں بلکہ جاسوس تھا اس لیے میرا توازن بالکل نہیں کھولا۔ میں زرینہ کو چوٹی سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا راستے پر نہیں لے گیا۔ میں نے صرف ایک کام کیا۔ دور کے ایک ڈاک خانے میں جا کر وہاں سے اپنے ہی پتہ پر ایک ٹیلی گرام دیا جس میں زرینہ کے باپ کی طبیعت تشویش ناک حد تک خراب بتائی گئی تھی۔

ٹیلی گرام ملتے ہی زرینہ گھبرا گئی اس نے فوراً ہی میکے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مگر مجھے چونکہ دفتر میں "بہت ضروری کام" کرنے تھے اس لیے اسے سفر پر اکیلے ہی روانہ ہونا پڑا۔

اسی دن میں نے زرینہ کا خط ندیم کے نام اور ندیم کے خطوط زرینہ کے نام اپنے سسر کے پتے پر روانہ کر دیے۔

پریشانی کے عالم میں زرینہ اپنی ایک چھوٹی سی اٹیچی بھول گئی تھی جس میں وہ اپنے سنگار کا سامان رکھتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ایک دن میں نے اس اٹیچی کی تلاشی لی۔ اٹیچی میں دوسری چیزوں کے علاوہ مجھے دوہرے فریم کا ایک آئینہ بھی ملا۔ مگر یہ آئینہ اس آئینہ سے مختلف تھا جو زرینہ کو جہیز میں ملا تھا۔ اس آئینہ کا ایک رخ نہایت صاف اور مجلّیٰ تھا مگر دوسرا رخ ــــ بہت ہی گندہ اور گھناؤنا! وہاں زرینہ ایک دوسرے نوجوان کی آغوش میں سمٹی ہوئی تھی! شاید یہی ندیم تھا، شادی شدہ زرینہ کا محبوب! میری بیوی زرینہ کا عاشق!

پھر نہ جانے کیا ہوا؟ میرے اندر کا شوہر جاگ اٹھا۔ میری گدّی کے پیچھے ایک دھماکہ سا ہوا۔ اور پھر مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ جب میں ہوش میں آیا تو میرے چاروں طرف پڑوسیوں کے متفکر چہرے تھے۔ گھر کا کوئی شیشہ سلامت نہیں رہا تھا۔ ہر آئینہ ٹوٹا ہوا تھا۔ صرف یہی ایک آئینہ باقی رہ گیا تھا، خوب صورت دوہرے فریم والا آئینہ ــــ ایک رخ شفاف اور دوسرا گندہ کثیف اور میلا۔

پھر میں ہر اجلی چیز کا دشمن ہو گیا۔ ہر آئینہ میرا رقیب بن گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں پاگل ہو گیا تھا (دوہری بیوی کا اکہرا شوہر پاگل نہ ہو تو کیا کرے؟)۔

ان پانچ برس میں مجھے تین بار پاگل خانے میں رکھا گیا (یہ بھی لوگ کہتے ہیں) میں کل ہی دماغی امراض کے ڈاکٹروں سے مکمل فِٹ نس سرٹی فیکیٹ لے کر گھر لوٹا ہوں۔ اور آج کئی برس کے بعد میں نے آئینہ ہاتھ میں لیا ہے ــــ شیشے کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا جو سامنے پڑنے والی ہر شے کو نگل جاتا ہے ــــ ہر شے کو ــــ میری بیوی کو بھی ــــ!

★

محمد نعیم صدیقی ندوی

مرزا احسان احمد کا اسلوب نگارش

شہرت اور کمالِ فن مترادف نہیں ہیں، کیونکہ بہت سے باکمال ادب، فنکار اور صناع شہرتِ عام کے دربار میں کبھی صفِ نعال میں بھی جگہ نہیں پاتے جبکہ دوسری طرف کتنے ہی "نامور" ایسے افراد نظر آتے ہیں جن کا طائرِ شہرت آسمان کی رفعتوں میں پرواز کرتا ہے۔ لیکن وہ درحقیقت خلاقیت و کمالِ فن سے کورے ہوتے ہیں۔ اردو کے ایسے مظلوم ادیبوں کی ایک طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے، جنھیں شہرت کا وہ مرتبہ حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ اپنے کمال اور مہارتِ فن کے لحاظ سے ہر طرح سے مستحق تھے۔ مرزا احسان احمد مرحوم بھی ان ہی غیر معروف بلکہ مظلوم ادیبوں میں ہیں جن کے شعری، تنقیدی اور ادبی اکتسابات گو اپنی کمیت میں کم سہی لیکن مہدی افادی کی طرح اس پاسے اور عظمت کے حامل ہیں کہ ادبِ اردو کی تاریخ میں مرزا صاحب کے ادبی مقام کا ذکر نمایاں طور پر ہونا چاہیے۔ ان کی تحریریں بلاشبہ ادب و انشا کے بہترین نمونوں کا کام دے سکتی ہیں۔

مرزا صاحب اور مرحوم مہدی افادی میں چند باتیں بہت حیرت انگیز طور پر قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دونوں ذہانت و فطانت کا پیکرِ مجسم تھے۔ دونوں زندگی بھر اپنے اصل ذوق اور رجحانِ طبع کے خلاف مشاغل میں مصروف رہے۔ دونوں نکتہ سنج نقاد اور صاحبِ کمال انشا پرداز تھے، دونوں نے بازارِ ادب میں محض چند مقالات و تبصرے پیش کیے مگر اسی "بضاعتِ مزجاۃ" کے بل پر کتنے ہی "ادبی سرمایہ داروں" کے پہلو بہ پہلو بلکہ بعض حیثیتوں سے ان سے بلند تر مرتبہ پر متمکن ہوئے۔ مہدی افادی نے محمد حسین آزاد کے بارے میں لکھا ہے کہ "آزاد صرف اور صرف ایک انشا پرداز ہے اس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے"۔ بعینہٖ یہی بات خود مہدی اور مرزا صاحب کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

مرزا احسان احمد نہ صرف ایک قادر الکلام شاعر تھے بلکہ ایک ماہر نقاد اور بے مثل ادیب بھی تھے۔ ان کی غزلوں میں کہیں میر درد کی بکھری ہوئی تجلیاں دکھائی دیتی ہیں تو کہیں شیفتہ کے اندازِ بیان کی خوش سلیقگی و پاکیزگی، اور کہیں غالب کے خیالات کی رعنائی و شگفتگی۔ ان کی ناقدانہ نظر میں فکر کی بڑی بلندی اور گہرائی ہوتی تھی۔ وہ اپنی سخن سنجی، نکتہ رسی اور حقائق نگاری میں یگانۂ عصر تھے اس کا فیصلہ بہت دشوار ہے کہ شاعری، تنقید اور انشا پردازی تینوں میں سے مرزا صاحب کی کس حیثیت کو اولیت اور اہمیت دی جائے لیکن راقم الحروف کی رائے میں ان کی نثر ان کی شاعری کے مقابلے میں اعلیٰ پایہ کی ہے۔ خود مرحوم نے بھی اپنے دیوان کے مقدمہ میں صراحت کی ہے کہ:

"بہ نسبت شاعری کے میری طبیعت کا رجحان زیادہ تر نثر نگاری کی طرف رہا ہے"

سطورِ ذیل کا مقصد مرزا صاحب کے انفرادی اور مثالی اسلوبِ نگارش کی نمایاں خصوصیات کا اجمالی جائزہ لینا ہے۔

انیسویں صدی کے آخر کا زمانہ اردو نثر کی ترقی کا عہدِ زریں ہے۔ بیسویں صدی کا آفتاب طلوع ہوا تو اپنے جلو میں انشائے لطیف کی نت نئی بہاروں کے کارواں لایا۔ اردو نثر بجز کے عناصرِ خمسہ اپنے ادبی فتوحات کے دائرہ کو وسیع تر کر کے اردو کے افق پر درخشاں ستارے کے مانند چمک رہے تھے۔ اسی اجالے میں اردو کا رومانی دبستان بڑی آرائش کے ساتھ سامنے آیا۔ کچھ نئی شکلیں ظاہر ہوئیں۔ ان ہی میں خوش اسلوب مرزا احسان احمد بھی تھے انھوں نے ادیبوں کی انجمن میں ہر طرف نظر دوڑائی، سرسید، آزاد، حالی، نذیر احمد اور شبلی کے ادبی کارناموں سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔ مگر ان عناصرِ خمسہ میں ان کو "خوش اوصاف شبلی" سے بے پناہ عقیدت اور دلی لگاؤ رہا۔ شبلی کی صہبائے علم و فن ان کے رگ و پے میں رقص کر رہی تھی۔ اور وہ اسی بادۂ سرجوش سے سرشار اور مخمور تھے اگرچہ مرزا صاحب کا ذوقِ ادب بجز فیضِ قدرت

کے کسی استاد فن کا منت کش احسان نہ تھا۔ لیکن وہ علامہ شبلی کے سحر طراز قلم کی گہر باشیوں سے ایسے متاثر رہے اور اپنی نثری تحریروں میں ان کے طرز تحریر کا ایسا کامیاب تتبع کیا۔ جب کبھی ان کا قلم شبلی کے چمنستان نگارش میں گلگشت کرتا تو علامہ کے دل آویز فقرے اور جملے، ان کی دل نشین ترکیبیں بلکہ دل پذیر نثری ٹکڑے ان کی ذہنی نظروں کے سامنے تیرتے نظر آتے ہیں اور پھر وہ غیر شعوری طور پر ان کو اپنی تحریروں میں اس طرح لکھ جاتے ہیں کہ مرزا صاحب کے بعض نثری شہ پارے بظاہر علامہ شبلی کے جادو نگار قلم کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں جن کو پڑھ کر قاری پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے شبلی کی بارگاہ علم و فضل سے اپنی وابستگی اور تعلق کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مقدمہ دیوان میں رقم طراز ہیں:

"میرے نزدیک اردو انشا پردازی کا بہترین اور اعلیٰ ترین نمونہ علامہ شبلی مرحوم کا طرز تحریر ہے۔ میں نے اپنے مضامین میں آپ کی انداز انشا کی تقلید کی ہے اور بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے (ص ٦)

ایک دوسری جگہ بھی لکھتے ہیں:-

"میرے ناچیز قلم کو نثر نگاری کا جو کچھ سلیقہ آ گیا ہے وہ سب علامہ شبلی ہی کے عدیم المثال طرز انشا کے مطالعہ اور تتبع کا غائبانہ فیض ہے" (میں اور میری ادبی صلاحیت ص ۱۰۴)

مرزا صاحب کے طرز تحریر اور انداز بیان کا اعتراف اردو زبان کے جن بلند پایہ ادیبوں اور نقادوں نے کھلے دل سے کیا ہے۔ ان میں علامہ سید سلیمان ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، تاجور نجیب آبادی، میاں بشیر احمد (اڈیٹر ہمایوں لاہور) شیخ عبدالقادر (اڈیٹر مخزن لاہور) حکیم یوسف حسن (اڈیٹر نیرنگ خیال) یاس عظیم آبادی۔ نیاز فتح پوری (اڈیٹر نگار) رشید احمد صدیقی، سر تیج بہادر سپرو، میاں ایم اسلم اور پروفیسر سید احتشام حسین جیسے اساطین علم و فن کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

چنانچہ میاں بشیر احمد نے ایک خط میں مرزا صاحب کو لکھا "آپ کے مضامین کا میں ہمیشہ سے مداح ہوں، پر مغز ہونے کے ساتھ ادبی لحاظ سے بھی بہت بلند پایہ ہوتے ہیں" پھر ایک دوسرے خط میں لکھا "مجھے آپ کا طرز تحریر بہت پسند ہے"

نیرنگ خیال کے اڈیٹر حکیم یوسف حسن مرزا صاحب کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں "آپ کا ایک مقالہ "معارف" نظر سے گزرا، ماشاء اللہ آپ خوب لکھتے ہیں۔ انداز بیان موثر اور جاذب توجہ ہے"

علامہ نیاز فتح پوری "نگار" میں مرزا صاحب کا ایک مضمون شائع کرتے ہوئے اس پر اپنے ادارتی نوٹ میں لکھتے ہیں:

"انھوں نے جس زور قلم، حسن انشا اور حسن ترتیب استدلال سے کام لے کر لکھنؤ کی موجودہ شاعری کی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے اس کو دیکھ کر میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

مرزا صاحب کا مشہور مقالہ "علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر" جب ماہنامہ معارف کے شمارہ مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا، تو شاہ معین الدین احمد ندوی نے ادارتی نوٹ میں لکھا کہ:

"مرزا صاحب کا یہ مضمون ان کے پاکیزہ ادبی و شعری ذوق، ناقدانہ نظر اور ادبی لطافتوں کا مرقع ہے۔ امید ہے کہ اصحاب ذوق بادہ شیراز کے اس جام سے لطف اندوز ہوں گے"

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے "مقالات احسان" کے مطالعہ کے بعد مرزا صاحب کو لکھا:

"شبلی کے لکھنے اور دلائل پیش کرنے کا انداز مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا سہیل اور آپ پر ختم ہو گیا"[1]

مرزا صاحب کو مبدأ فیاض سے وہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں جو ایک ادیب، شاعر اور نقاد میں ہونی چاہئیں وہ خود ایک غزل گو شاعر تھے، ان کا شاعرانہ ذوق بلند ہی نہیں معیاری بھی تھا۔ ان کے نقد و نظر کا کمال اور شاعر، نہ ذوق کی بہار دیکھنا ہو تو "مقالات احسان" کا مطالعہ کیجیے اور گلگشت مصلیٰ اور آب

[1] مذکورہ بالا تمام اقتباسات مرزا صاحب کی کتاب "میں اور میری ادبی صلاحیت" سے ماخوذ ہیں۔ جس میں مرحوم نے اپنے ساٹھ سالہ ادبی و شعری ارتقا کو بیان کرتے ہوئے اپنے نام مشاہیر کے خطوط کو یکجا کر دیا ہے۔

وکن آباد بن کر رہ جائیے۔ مرزا صاحب نے سچ مچ اس میں لفظوں کی مینا کاری کی ہے کیا تناسب ہے۔ کیسا دروبست ہے۔ خیال و فکر کے کیسے کیسے نازک آبگینوں کو تراشا ہے اور لفظ و بیان کے کتنے دیدہ زیب نگینوں کو جڑا ہے۔ بلاشبہ "مقالاتِ احسان" کے آئینے میں مرزا صاحب کے پاکیزہ، نفیس اور ستھرے ذوقِ شعر و ادب کا عکس بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ مرحوم کے اسلوبِ نگارش میں جو صفائی و شستگی جو متانت و وقار، جو لطافت و نفاست جو رکھ رکھاؤ اور خوش سلیقگی ملتی ہے وہ درحقیقت ان کی شخصیت کا جوہرِ خاص ہے۔ اسلوب و شخصیت کی جتنی حیرت انگیز ہم آہنگی مرزا صاحب کے ادبی اکتسابات میں نظر آتی ہے اس کی مثال دوسری جگہ شاید ہی مل سکے گی۔ جن لوگوں کو مرزا صاحب سے دید و شنید کا شرف حاصل ہے وہ ان کی شخصیت کی مذکورہ بالا خصوصیات کی شہادت دیں گے۔

ہم جب انشا پرداز کی حیثیت سے مرزا صاحب کو پرکھتے اور ان کے علمی و ادبی مقالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو ان کے یہاں طرزِ تحریر کی وہ تمام نمایاں خصوصیات نظر آتی ہیں جو علامہ شبلی کا طرۂ امتیاز تھیں۔ صفائی و شستگی، فصاحت و بلاغت، روانی و برجستگی، زورِ بیان، جوش و قوت، پختگیٔ رائے، حقیقت نگاری، متانت و وقار، فارسی الفاظ و تراکیب کی آمیزش اور رنگینیٔ بیان کیا کچھ نہیں ہے جو اس سفینہ میں نہیں ہے۔ شبلی کی طرح ان کی تحریروں میں بھی اس حد تک انفرادیت ہے کہ اس پر نظر پڑتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ مرزا صاحب کی تخلیق ہے۔ کیونکہ بیان و اظہار کی جو شگفتگی ان کے یہاں ملتی ہے۔ اس کی نظیر شاید ہی کہیں اور نظر آ سکے۔

میرے نزدیک مرزا صاحب کی نثر کی نمایاں ترین خصوصیت اس کی نغمگی اور شعریت ہے جو ذہن و فکر میں سرور و نشاط کا رس گھول دیتی ہے۔ ان کے خامۂ سحر کار سے نکلے ہوئے الفاظ دُرِّ شاہوار کا گوہرِ آب دار ہوتے ہیں۔ ذیل کی عبارت پڑھیے اور شبلی کے زندہ جاوید نثری شاہکار "ظہورِ قدسی" کی یاد تازہ کیجیے :

"بزم گاہِ دہر میں صدہا انسانوں کی صدائیں اٹھیں اور خاموش ہو گئیں، ہزاروں بار نظامِ عالم درہم برہم ہو گیا۔ لاکھوں مرتبہ انسانوں کے قصرِ حیات کی بنیادیں موجِ حوادث کی زد سے ہل کر رہ گئیں خیالات و افکار میں ہمیشہ انقلاب و تغیر ہوتا رہا۔ غرض اس ذیب گاہ رنگ و بو کا کوئی منظر کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہا۔ لیکن عشق ہی کا ایک ایسا افسانہ ہے جو باوجود اعادۂ پیہم کے اب تک بے کیف نہ ہو سکا۔ یہی وہ چمن ہے جس کی بہار ہمیشہ خزاں سے نا آشنا رہی یہی وہ آتش کدہ ہے جس کے شعلہ ہائے فروزاں کی حرارت و تابانی کبھی کم نہ ہو سکی۔ یہی سازِ فطرت کا وہ نغمۂ جاں نواز ہے جس کے ذوق و لذت سے روحِ انسانی کبھی آسودہ نہیں ہوئی اور نہ آسودہ ہو سکتی ہے۔"

(مقالاتِ احسان)

مرزا صاحب لطیف و نازک تشبیہ و استعارہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ نیز الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی ساخت میں اس قدر حسنِ تناسب ملحوظ رکھتے ہیں جس سے ان کی عبارت میں نہایت دل کشی، تاثیر اور دل آویزی پیدا ہو جاتی ہے، وہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے بڑے مطالب سمو دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"مشہور ہے کہ لیلیٰ محض سیاہ فام تھی۔ لیکن یہی ظلمت کا دامن مجنوں کی نگاہِ نیاز کے لیے حسن کا گہوارہ تھا۔" (مقالاتِ احسان)

مرزا صاحب خالص جدید تعلیم یافتہ تھے اور بقول خود عربی سے قطعاً ناواقف۔ اردو اور فارسی کی تحصیل بھی محض اسکول و کالج میں کی تھی۔ لیکن بایں ہمہ انھوں نے اپنے فطری ذوق اور ذاتی محنت و مطالعہ سے عربی و فارسی میں اچھی صلاحیت پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ ان کے قلم کی گلکاریوں کا رنگ دیکھنے سے بیک نظر اندازہ ہو جاتا ہے کہ مرزا صاحب کی زبان میں اردو کا لوچ اتنا نہیں جتنا فارسی کا شکوہ اور عربی کی جلالت۔ خصوصاً فارسی الفاظ و تراکیب کا غازہ ان کی تحریروں کو چمکا دیتا ہے۔ درج ذیل عبارت میں فارسی تراکیب کی بہار ملاحظہ فرمایئے :

"ممکن ہے زمانہ کسی وقت سہیل کے ترانہ ہائے سخن کو بھلا دے۔ لیکن ان کا یہ چمنستانِ شاعری جس کے کچھ گلہائے رنگیں نذرِ ناظرین کر چکا ہوں ابدی اور لازوال تابانیوں کا حامل ہے۔ اس کا پیکرِ جمال کبھی غبار آلود نہیں ہو سکتا۔ وہ بہارِ سرمدی

کا گہوارہ ہے جس کو بادِ خزاں بھی چھو نہیں سکتی جس کو کبھی ہاتھ نہیں لگا سکتے۔" (مقالاتِ احسان)

فارسی اور اس کی خوشگوار و دل آویز ترکیبیں مرزا صاحب کے دماغ میں سرایت کر گئی تھیں۔ اس لیے ان کی آمیزش مرزا صاحب کے طرزِ تحریر کا خاصہ امتیازی بن گئیں اور غالباً کوئی سطر بھی مشکل ہی اس سے خالی نظر آئے گی۔ چند فارسی تراکیب ملاحظہ ہوں۔

"مرکزِ سطوت و جبروت، نامۂ رنگیں نگار، زمزمۂ اخلاص و عقیدت، وادیٔ ایمن کی شرر باریاں، شیشۂ نور، رباب آتشیں، نغمہ گر لب بام، مطرب خوش نوا، متاع ہائے گراں ارز، رقاصۂ بہار، گلشن قدس، بوستانِ محبت، خیابانِ آرزو"

مرزا صاحب کے اسلوبِ بیان کا ایک نمایاں وصف اس کا وہ جوش اور قوت ہے جو شبلی کی طرح ان کے احساسِ کمال اور احساسِ عظمت کی پیداوار ہے اور اس صفت نے ان کے اسلوب میں بڑے وثوق اور اعتماد کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ علامہ شبلی کی نثر میں جو توانائی ملتی ہے اور خود اعتمادی کی جو مہیب آواز سنائی دیتی ہے، مرزا صاحب نے اپنی تحریروں میں اس کا پورا تتبع کیا ہے۔ چنانچہ ان کے مطبوعہ مقالات میں قدم قدم پر اپنے کمال و عظمت سے مرعوب کرنے والے ایسے جملے ملتے ہیں۔

"مذکورہ بالا مثالوں سے تم کو معلوم ہو گیا ہوگا۔" (ص ۳۲)

"تم کو اندازہ ہو گیا ہوگا۔" (ص ۳۲)

"تم کو معلوم ہے وہ کون سی شراب ہے۔" (ص ۳۴)

"ان مثالوں پر غور کرو۔" (ص ۳۵)

"ان اشعار کو دیکھو۔" (ص ۵۳)

اسی احساسِ عظمت اور اپنے کمالِ فن پر پورے وثوق و اعتماد کا نتیجہ ہے کہ مرزا صاحب کے قلم میں زور و قوت، جوشِ بیان اور اثر آفرینی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

"ہم کو مسرت ہے کہ وہ اس میکدے میں رسوائے سربازار کی مبتذل اداؤں کے ساتھ نہیں بلکہ ایک بلند حوصلہ اور عالی ظرف رند کی حیثیت سے داخل ہوئے ہیں، جس کا ہر قدم عزتِ نفس اور خودداری کے احساس کے ساتھ اٹھتا ہے جس کو خود اپنے دستِ بازو کا نتیجہ گوشہ نشین دنیا میں سب سے زیادہ محبوب ہے جس کی غیرتِ عشق کسی حال میں حسن سے سوالِ کرم پر آمادہ نہیں ہوتی۔ جس کی ذوقِ جستجو کی ہمت منزل کو ہر قدم پر گریزاں بنا دیتی ہے جس کی موجِ رندگی و شورشِ عمل کے لیے ہمیشہ پُرخطر راہوں کی تلاش رہتی ہے جس کا غمکدۂ حیات جہاں غیر کے مہر و ماہ سے نہیں بلکہ خود اپنے ہی سوزِ دل کی تابش سے جگمگاتا رہتا ہے۔" (مقالاتِ احسان)

مذکورہ بالا اقتباسات میں ایک خاص روانی و برجستگی اور شوخی و رعنائی پائی جاتی ہے۔ اور پڑھتے وقت سامعہ کو لذت محسوس ہوتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاف و شیریں چشمہ ہے جس کی موجیں بلا کسی تکلف کے رقص کرتی ہوئی چلی جا رہی ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مرزا صاحب مرحوم کے خامۂ سحر کار کی گہر پاشیوں کے اس اجمالی تجزیہ سے یہ اندازہ لگانا کچھ دشوار نہیں کہ اگر وہ مقدمات کی سلیں دیکھنے کے بجائے مکمل طور پر اور یکسو ہو کر لیلیٰ ادب کی مشاطگی کرتے تو ہمارا ادبی خزانہ طور کی تجلیوں اور وادیٔ ایمن کی شرر باریوں سے اس سے کہیں زیادہ معمور ہوتا۔

مرزا صاحب نے ساٹھ سال شاعری کی اور تقریباً اتنی ہی مدت تک نثر نگاری بھی کی۔ نصف صدی سے زائد مدت پر محیط اپنی ادبی و شعری زندگی میں انھوں نے بڑی کثرت سے مضامین لکھے اور جولانیٔ طبع دکھائی۔ چنانچہ "پیامِ کیف" کے نام سے دو سو صفحات پر مشتمل ان کا ایک مجموعۂ کلام سنہ ۴۰ء میں شائع ہو چکا ہے جس کا ہر شعر بلاشبہ ایک جامِ کیف ہے ظاہر ہے اس کے بعد سے تا دمِ واپسیں ان کے اشہبِ فکر و شعور نے نہ معلوم کتنی وادیوں میں سبک خرامی کی ہوگی جس کا ثبوت خود مرزا صاحب کی اس تحریر سے بھی ملتا ہے کہ "پیامِ کیف کی اشاعت کے بعد وقتاً فوقتاً کچھ طبیعت موزوں ہوتی رہی۔ لیکن جو کچھ کہا ہے وہ سب پراگندہ حالت میں پڑا ہے۔" معلوم ہوا ہے کہ یہ بیاضیں مرحوم کے برادر زادہ مرزا شوکت سلطان صاحب (پرنسپل شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڈھ) کے پاس محفوظ ہیں۔ اور موصوف نے اس غیر مطبوعہ کلام کی جلد اشاعت کا وعدہ کیا ہے۔ بلاشبہ اس متاعِ گراں مایہ کی اشاعت سے شعر و ادب کے ذخیرہ میں بڑا بیش بہا اضافہ ہوگا۔

★

تاپتی پریتا بگڑھی

بنام اندرا گاندھی

عجیب موڑ پر آیا تھا کاروانِ وطن
اندھیرا ملک میں ہر آن بڑھتا جاتا تھا

صداقت اپنے ہی آنچل میں منھ چھپائے تھی
ہر ایک فرد حقائق سے منھ چراتا تھا

سفید پوشی کے پیچھے سیاہ کاری تھی
مُصر تھے لوگ اجانے کے قتل کرنے پر

بغاوتوں کا تھا طوفان ہر طرف رقصاں
مصر تھیں کتنی شر انگیزیاں مچلنے پر

ذرا بھی ڈھیل اگر شر کو مل گئی ہوتی
نہ جانے کتنے ہی فتنے یہاں بپا ہوتے

ہر آن ان کی نہ ہوتی اگر نگہ داری
تو شر پسند ہی کشتی کے ناخدا ہوتے

بہ وقت کر کے ایمرجنسی کا نفاذ مگر
وطن کو تو نے بچا کر عظیم کام کیا

پھر ایک بار کھلی تیری دور اندیشی
جہاں میں پھر تری دانشوری نے نام کیا

بُنے تھے خواب جو نہرو نے دیش کی خاطر
انھیں کبھی آج حقیقت کا روپ تو نے دیا

بندھا ہے سر پہ ترے سہرا کامرانی کا
شعور و دانش و حکمت سے ایسا کام لیا

دلیر ٹھہری ہے ہر دور میں یہاں عورت
وہ چاند بی بی رہی ہو کہ لکشمی بائی

گواہی دیتی ہے تاریخ جن کی جرات کی
شمار ان میں ہوا تیرا اندرا گاندھی

سرسوتی سرن کیف

غزل

آنکھ دل کی تسکیں پر اور بھی برستی ہے
ہائے اپنی فطرت میں کتنی غم پرستی ہے

ہر خوشی کے لمحہ پر غم کی پیش دستی ہے
کچھ ہمیں یہ ظاہر ہے جیسی اپنی ہستی ہے

چھوڑ کر ہر اک خواہش دل تو ہو گیا آزاد
دوست کہتے جاتے ہیں حوصلہ کی پستی ہے

خوش تعلقی دیکھو میری اور دنیا کی
میں بھی اس پہ ہنستا ہوں یہ بھی مجھ پہ ہنستی ہے

رو کے کر دیا جل تھل ہم نے ساری دنیا کو
اور آپ کہتے ہیں ابر سے برستی ہے

تیری بات کا ناصح اور کیا اثر ہوگا
اک سناں کلیجے میں دھیرے دھیرے دھنستی ہے

ہر نفس ہے زہر آگیں نیش زن ہے ہر لحظہ
زیست کی ہلاکت کو موت بھی ترستی ہے

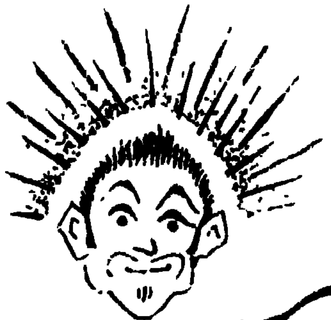
آنکھ میں کھٹکتے ہیں گل بھی خار کے مانند
جب کبھی بہاروں میں تیری یاد ڈستی ہے

عشق میں عجب سا ہے حال دل کی نگری کا
جتنی یہ اُجڑتی ہے اتنی اور بستی ہے

اہل دل کی حالت کو اور کوئی کیا سمجھے
قہقہوں میں ماتم ہے آنسوؤں میں مستی ہے

کیفؔ اس زمانے میں ہے ہر ایک شے مہنگی
ایک صرف انساں کی زندگی ہی سستی ہے

ایم۔ اے۔ حنان



نیا نوکر

مزاحیہ

اب جب کہ ہم اپنے نئے نوکر "پیرو" کا آپ سے تعارف کروانے جا رہے ہیں تو اس موقع پہ آپ ہم سے یہ ضرور دریافت کریں گے کہ بھئی پرانے نوکر کو کیوں نکالا۔ آیا وہ تھا بھی یا نہیں؟ یا زندگی میں یہ نوکر رکھنے کا پہلا اتفاق ہے۔ لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس جہانِ فانی میں قدم رکھتے ہوئے ماں باپ کے بعد جس ہستی کا دیدار ہوا تھا وہ نوکر ہی ہے۔ بلکہ ہم تو وہ خوش نصیب ہیں جنھیں اونچے گھرانے کے لوگوں کی طرح ماں باپ سے زیادہ نوکروں کا پیار ملا ہے۔ اور متعدد بھلے چنگے نوکر ہمیں روتا بلکتا چھوڑ گئے۔

دراصل اس نئے نوکر کو خوش آمدید کہنے کی وجہ ہمارے اپنے نوکر نکھٹو کا اچانک خدا حافظ کہہ دینا ہے جو دو دن کی چھٹی مانگ کر گیا تو پورے ڈھائی برس ہو گئے بالکل لاپتہ ہے۔ اور اس کی پراسرار گمشدگی ہمارے لیے معمہ بنی ہوئی ہے حالانکہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو نوکروں سے دھوبی کے گدھے کی طرح کام لیتے ہیں اور اسی طرح کا سلوک کرتے ہیں یا ان سے اتنا کام لیتے ہیں کہ صبح کو کھائی ہوئی کیسی ہی مقوی غذا ہو، آدھے گھنٹے کے اندر ہضم ہو جاتی ہے۔ یا پھر ہمارے پڑوسی لالہ کی طرح صرف ہنگامی خالات میں ایک عدد نوکر رکھ لینے کا خبط بھی نہیں ہے۔ یعنی وہ اس وقت ہی نوکر رکھیں گے جب ان کو پانچ ہزار مربع گز رقبہ پر مشتمل مخدوش حویلی کی دا غدوزی یا سفیدی کرانی ہو گی۔ یا گھر کی کوئی ماؤنٹ ایورسٹ کی مماثل دیوار کو ڈھانا اور اس کا ملبہ اٹھانا مقصود ہوگا یا پھر دو چار باؤلیاں کھدانی یا دس پندرہ موریاں کھلوانی ہوں گی۔ جس عمل سے نہ صرف نوکر بھاگ جایا کرتے ہیں بلکہ اس دن سے نوکر اور مالک میں سانپ اور نیولے کا تاثر ہو جاتا ہے۔

یہ بھی سنتے ہیں کہ نان وجیٹیرین نوکر ویجیٹیرین گھرانے میں سانس نہیں لے سکتا۔ اور ویجیٹیرین نوکر کا نان ویجیٹیرین گھر میں دم گھٹتا ہے۔ لیکن یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی ہے کہ صاحب جہاں ویجیٹیرین اور نان ویجیٹیرین کھانوں کا مضبوط اتحاد ہو وہاں بھی نوکر آج کل کے گھر آئے مہمان کی طرح دو چار ماہ کیوں نہیں رہنے پاتے اور قدیم زمانے کے مہمانوں کی طرح ایک دو ہفتوں میں رفوچکر ہو جاتے ہیں۔ اور پھر کسی نئے نوکر کو تلاش کرتے ہوئے ہم کو چکر پہ چکر آنے لگتے ہیں۔

چنانچہ اس ماہ ہمارے گھر آیا ہوا نیا نوکر بھی چھ ماہ کی لگاتار کھوج اور انتھک جد و جہد کا نتیجہ ہے جو وضع قطع اور چال ڈھال سے کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں دکھائی دیتا۔ گھوڑوں کے ایال جیسے لمبے لمبے بال، سیاہ فام چہرہ پر صبح و شام سیاہ چشمہ چڑھا ہوا، چگی داڑھی، کمر پہ تپتے ہوئے فولاد جیسا گومڑوں والا بیلٹ ہر وقت کسا ہوا، زندہ اور مردہ جانوروں کی تصویروں والا ابیل باٹم پوشاک اور کالے کالے ننگے پیر۔

اوّل تو ہم ایسے خطرناک خد و خال کے آدمی کو نوکر رکھنا تو کجا گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے جس کو دیکھ کر نہ صرف معصوم بچے ڈر جائیں بلکہ مہینوں ان کا بخار نہ اترے گا۔ لیکن وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ کہنا پڑتا ہے۔ نوکروں کی شدید قلت اور انھیں ڈھونڈنے کی اذیت سے فی الفور نجات پانے کے لیے ہم نے اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا لیکن اب پچھتا رہے ہیں ——!

کیونکہ ایک تو یہ منسٹر، کلکٹر یا کسی آئی اے ایس عہدہ دار کے ہاں کام کرنے کا قائل ہے جہاں سے معقول تنخواہ اور پیٹ بھر غذا کے ساتھ رہنے کے لیے ہمارے گھر سے بڑھیا کوارٹر مل سکتا

ہے۔ دوسرے یہ کہ جس مقصد کے لیے اُسے نوکر رکھا گیا ہے وہ ان ہی کاموں سے شدید نفرت کرتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد غیر معینہ وقت تک "قیلولہ" کرنے کا عادی ہے اور کام بھی ایسا کرتا ہے کہ دیکھنے والے کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔

یعنی اناج لانے کے لیے راشن شاپ بھیجو تو دکان کھلنے سے دو گھنٹے قبل ہی گھر سے نکل جائے گا اور دکان پر سب سے پہلے دھونی رمائے گا۔ لیکن جب دکان پر آہستہ آہستہ ہجوم ہو جائے گا تو آگے بڑھ کر غلہ لینے کے بجائے فوراً اپنی جگہ دو چار آنے لے کر کسی دوسرے گاہک کو دے دے گا، جس طرح اسٹیشنوں پر قلی کرتے ہیں اور اطمینان کے ساتھ بیڑی کے کش کھینچتا ہوا کیو میں سب سے آخر میں کھڑا ہو کر چین کی بنسی بجائے گا بلکہ یہاں بھی اس سے کھڑا نہ ہوا جا سکے گا۔ کسی کو ہمارے تھیلے مستعار دے دے گا اور کسی کو سائیکل اور دوسرے چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹا کر بیٹھ رہا لے گا۔ پھر تھیلے، سائیکل اور اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے جب دکان کا وقت ختم ہو جائے گا تو گھر آ کر بڑی ڈھٹائی سے کہے گا کہ راشن لینے والوں کے بے پناہ ہجوم اور افراتفری کی وجہ سے اسے غلہ نہ مل سکا۔

اسی طرح دودھ لانے جائے گا تو بجائے اپنا کام کرنے کے دودھ والے سے گپ شپ لڑائے گا اور اس سے دریافت کرے گا کہ یہ دودھ گائے کا ہے یا بھینس کا، جڑی بوٹی کا ہے یا علی قلی پارک کی گھاس کا؟ اس دودھ پر اس کا کمیشن کیا ہے؟ اس کی بالائی کون کھاتا ہے؟ پانی ملانے کا تناسب کیا ہے۔ اوسطاً کتنا دودھ بچ رہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر دودھ والے سے ان سوالوں کے جوابات یا گالیاں سن کر اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے قریب میں سطح زمین ڈھونڈ کر اپنی کچی نیند کو پوری کرے گا۔ پھر دھوپ کی حدت یا دودھ والے کی چیخ سے بیدار ہو کر بوتلوں سے دھویا ہوا پانی، دودھ سمجھ کر لے آئے گا۔

ترکاری کتنی ہی باسی اور کیسی ہی سڑی گلی کیوں نہ ہو پورے خشوع و خضوع کے ساتھ خرید لائے گا اور اپنی شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ہی لائی ہوئی سبزی سے آدھے سے زیادہ کچرا نکال کر پھینک دے گا اور بڑے فخر سے سینہ تان کر کہے گا کہ دیکھیے میں نے صرف ایک آلو میں سے تین کیڑے نکالے ہیں ——!!

اس کی ان بے شمار خوبیوں اور لاپروائیوں سے بدظن ہو کر جب بیگم صلواتیں سنانا شروع کر دیں تو آ کر ہم سے شکایت اس ڈھٹائی سے کرے گا کہ "صاحب بیگم صاحبہ آپ کو گھڑکیاں دے سکتی ہیں ڈانٹ ڈپٹ کر سکتی ہیں حملہ آور بھی ہو سکتی ہیں مگر اُن کو مجھے کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ میں شوہر نہیں نوکر ہوں۔!

اسے ہماری بدنصیبی ہی کہنا چاہیے کہ ہمارا نیا نوکر کام کاج کرنے سے زیادہ گپیں ہانکنے اور ڈینگیں مارنے میں ماہر ہے۔ وقت بے وقت سابق مالکوں کے قصے اور مبالغہ آمیز باتیں مزے لے لے کر سناتا ہے۔ کہتا ہے ہمارے پرانے مالک اپنے بیٹے سے زیادہ مجھے چاہتے تھے۔ دسترخوان پر اپنے ساتھ کھانا کھلاتے تھے۔ ایک صاحب تو مہینہ بھر کی تنخواہ بیگم کے بجائے اس کے ہاتھ میں لا کر رکھ دیتے تھے اور ایک پائی کا حساب تک نہ مانگتے تھے۔ نیز اُس سے مشورہ کیے بغیر کوئی چھوٹا بڑا کام بھی نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ شادی بیاہ میں بھی اُس سے سب سے پہلے صلاح لیتے تھے چنانچہ اُن کی سات شادیاں کرانے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اور انجام کار خودکشی کا مشورہ دینے والی بھی یہی ذات ہے۔ صرف یہی نہیں وہ ایک آقا کے دل پر تو اتنا چڑھا ہوا تھا کہ وہ اپنی ساری جائداد اس کے نام کرنے والے تھے لیکن عین وقت پر اُن کے ناخلف فرزندوں نے مجسٹریٹ کا سرٹیفکیٹ پیش کر کے انھیں پاگل قرار دے دیا۔

اس نئے نوکر کو ہمارے گھر آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن (مشکل) ہوئے ہیں لیکن یہ برسوں کے رفیق کی طرح بے تکلفی کی حد تک منہ چڑھا ہو گیا ہے۔ جو منہ میں آئے کہہ دیتا ہے۔ اور جدھر سینگ سمائے نکل جاتا ہے۔ حال ہی کی بات ہے جب ہم کوشیونگ کرتے ہوئے دو ایک زخم آ گئے

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

حالی کی حالیت

حالی کی فضیلت ایک صالح اور صحت مند نظریے کی آفرینش اور ساخت وپرداخت کی وجہ سے ہے۔ غدر کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی نے حالی کو خون کے آنسو رلائے۔ ان کا دل قومی درد سے تڑپ اٹھا اور انھوں نے قوم کو بے راہ روی سے ہٹا کر ایک عظیم منزل کی طرف لے جانے کی دعوت دی۔ حالی نے قوم کو جذبات سے بلند ہو کر غور وفکر کرنے کی صلاح دی اور اپنی عظمت، اقتدار و وقار کو واپس لینے کے لیے وسیع النظری، وسیع القلبی اور وسیع الدماغی سے کام لینے کی تلقین کی۔ انھوں نے قوم کو یہ بتایا کہ مذہب مذہب چلاّنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ مذہب کی روح کو اعمال میں ڈھالنا چاہیے۔ حالی ایک واعظ شاعر ہیں ان کی شاعری ایک مردِ مومن کے دل کی آواز ہے۔ غالب اور دیگر عظیم فن کاروں کی طرح ان کی قدر ان کی زندگی میں نہ ہو سکی۔ آج اس مصلح قوم کی شاعری ہماری تنقید کا نقشِ اول ہے اور ہم اس کے کارنامے سراہنے بیٹھے ہیں۔

بعد مرنے کے قدر کرتی ہے
کتنی مردہ پرست ہے دنیا

جب سرسید قومی ترقی اور انسانیت کی اصلاح کے لیے تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے تھے اسی وقت ایک دوسرا ہم نوا سر سے کفن باندھ کر میدان میں اتر آیا تھا۔ وہ تھا حالی۔ سرسید کے قلم میں بہت زور تھا لیکن وہ شاعری کی جادو بیانی سے محروم تھے۔ سرسید کا رنگ کبھی کبھی بے رنگ ہو جاتا تھا۔ حالی نے اس میں ادبیت پیدا کی۔ حالی نے سرسید کے مشورے سے ایک نظم مد و جزر اسلام لکھی۔ یہ نظم نہیں، قوم کے عروج کا قصیدہ اور زوال کا مرثیہ ہے جس میں قومی بدحالی کی عکاسی پُر درد انداز میں کی گئی ہے۔

حالی کی ذہنیت اور شعور پر اثر ڈالنے والی دوسری طاقت انگریزی اور مغربی تہذیب کی جانب داری تھی۔ پنجاب بک ڈپو لاہور میں حالی کا کام اردو کی ان کتابوں کی تصحیح کرنا تھا جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ حالی عبارت کا لب ولہجہ درست کرتے اور کتابوں پر اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ اس ملازمت نے حالی کو انگریزی ادب سے روشناس کرایا اور ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا۔ وہ فارسی کو انگریزی کے سامنے ہیچ سمجھنے لگے۔ آج سرسید اور حالی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ انگریزی تعلیم نے اردو زبان کو قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کر دیا ہے اور ذخیرۂ الفاظ، نئے تخلیقات، نئی تشبیہات، نئے نئے مضامین مناظر اور شعر کے لیے نئے نئے سامانِ زینت فراہم ہو سکے ہیں۔ حالی مغربی خیالات سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے خود کہا ہے۔

حالی اب آؤ پیرویِ مغربی کریں
بس اتباعِ مصحفی و میر ہو چکی

شیفتہ کی صحبت کا بھی حالی پر بہت اثر پڑا۔ شیفتہ مبالغہ

کو ناپسند کرتے تھے۔ سیدھی سادی بات کو محض تحسینِ بیان سے دل فریب بنانا کمال شاعری سمجھتے تھے اور حالی ان سب کے حامی تھے۔ شیفتہ نے حالی کی شاعری کو عامیانہ اور رکیک خیالات سے پاک رکھا۔

حالی اور آزاد ایک ہی گلستانِ ادب کے ہم نوا ہیں۔ ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں ایک نئے طرز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں مصرعہ طرح کے بجائے کوئی موضوع دیدیا جاتا تھا۔ حالی اس کے روحِ رواں تھے۔ حالی نے ایسے مشاعروں میں چار نظمیں پڑھیں۔ برسات، رحم و انصاف، امید، حبِ وطن اور مذاقِ شعر و سخن میں ایک انقلاب اور ترقی پسند رجحانات کے حامی ہوئے۔

حالی غالب سے ضرور متاثر ہوئے لیکن غالب کی مشکل گوئی کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ غالب کی شاعری کے مقابلے میں ان کی نثر سے زیادہ متاثر ہوئے۔ یادگارِ غالب لکھ کر وہ غالب کو عوام کے قریب لائے اور غالب کے مشکل اشعار کی تشریح لکھ کر غالب کو عوام میں مقبول کر دیا۔ دنیا میں بہت سے نیک اور اچھے کام محض اتفاق کی بدولت ہو جاتے ہیں یہی غالب اور حالی کی ملاقات کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ یہ اردو ادب کی خوش بختی ہی تھی کہ غالب جیسے باکمال استاد کو حالی جیسا ہونہار شاگرد مل گیا تھا جس نے اردو شعر و ادب کے دھارے کو سیدھے راستے کی طرف موڑ کر نئی زندگی بخشی اور استاد نے الطاف حسین کو خستہ سے حالی بنا دیا۔

حالی کا اصلی میدان غزل نہیں۔ ان کی شاعری واہ نہیں آہ ہے۔ وہ عمر کی پختگی کے ساتھ گل و بلبل کے افسانے کے جنجال سے نکل کر قوم کے ہو رہے تھے۔ وہ ہمیشہ قوم کے اقبال کا ماتم کرتے رہے۔ ان کی غزل میں تغزل کے بجائے قومی تاثرات زیادہ ہیں چوں کہ یہ ان کے دل کی آواز ہے لہذا کسک بہت ہے۔ حالی نے جذبات و واردات سے ہٹ کر غزل میں موضوعاتی شاعری کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی غزل میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ وہ نہایت سادگی اور صفائی سے بات کہتے ہیں جس سے ان کے بے ساختہ پن اور سوز و گداز کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے تغزل میں محبت کی نفسیات کو بڑی اہمیت دی ہے۔ حالی کے یہاں جام و مینا کی داستان بالکل نہیں۔ غالب کی شاگردی کے باوجود ان کی شاعری اس فیضان سے محروم رہی۔ حالی کے یہاں تشبیہات کا حسنہ نہیں کے برابر ہے۔ ان کی غزلوں میں روزمرہ اور محاورات کی بہتات ہے ان کی زیادہ تر غزلیں مسلسل ہیں۔ کچھ بھی چند غزلیں مثالی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فطرت میں تیری صوفی، گر نورِ صفا ہوتا
تو سب سے ملا ہوتا اور سب سے جدا ہوتا
ہم وقتِ وداع ان سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا
جو جان سے در گزرے وہ چاہے سو کر گزرے
گر آج تم آتے کیا جانیے کیا ہوتا
جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

حالی کی غزل میں کہیں کہیں متین شوخی، ظرافت، طنز موجود ہے لیکن متانت سب پر غالب ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

حالی عشق کی آگ سے کبھی دوچار نہیں ہوئے۔ ان کا کوئی رقیب بھی نہ تھا اور نہ انھوں نے اپنی مصروفیت کی بنا پر کسی کو رقیب بننے کا موقع دیا۔ نہ ان کو خود آرائی کا خیال آیا اور نہ عشق اور

جاتی کی ہوا لگی۔ وہ نہ وصل کی لذت نہ فراق کا مزا چکھ سکے۔ وہ بزرگ مصلح شاعر تھے ان کو ادبی مصروفیتوں سے اتنا موقع ہی نہیں ملا اس لیے حالی کی غزل میں عشقیہ عناصر بہت کم ہیں۔

حالی کی غزل میں خاک ساری وغیرہ کے مضامین بہت ملتے ہیں اور انھوں نے کبھی کبھی نازک خیالیاں پیدا کی ہیں چند اشعار پیش خدمت ہیں:

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاک ساری اپنی کام آئی بہت

آرہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

حالی نے نیچرل شاعری پر بہت زور دیا ہے اور اسی مقصد کے تحت انھوں نے چار مثنویاں لکھی ہیں جن میں نیچر کی عکاسی کی گئی ہے۔ حالی نے واقعاتی شاعری کو بھی پروان چڑھانے کی کوشش کی اور کہیں کہیں واقعات کو سادہ اور پر اثر انداز میں قلم بند کیا ہے۔ حالی کا دل وطن کی محبت سے پر تھا انھوں نے ہمیشہ اپنے ہم وطنوں کی بہبودی چاہی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تیری ایک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
اے دل اے بندۂ وطن ہشیار
خواب غفلت سے ہو ذرا بیدار

حالی نے اپنے وسعت بیان کے لیے صنف غزل کو تنگ پایا۔ ان کا اہم کارنامہ مسدس مدوجزر اسلام ہے۔ مسدس میں عرب کی جہالت۔ نبی کا نزول۔ ان کی سیرت۔ ان کی تعلیم۔ ان کے رفیقوں اور ساتھیوں کا خلوص اور جذبۂ اسلامی۔ مسلمانوں کی علم دوستی اور علم پروری۔ قرطبہ اور بغداد کی عظمت کا ذکر سادہ اور پر اثر الفاظ میں کیا ہے۔ حالی خود روتے ہیں اور دوسروں کو رلاتے ہیں۔ مسدس شروع سے آخر تک ایک داستان درد ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کا حال زار دربار رسالت میں عرض کرتے ہیں اور اصلاح حال کے لیے دعا کرتے ہیں مسدس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے
ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دور زماں میٹ رہا ہے

امت کا تعلق رسولؐ کے ساتھ ہے اور انھیں کے وسیلے سے بخشش چاہتے ہیں۔

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے
خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں
ہر فکر ترے دین کی عزت کے سوا ہے

دلی کا مرثیہ بھی حالی کی جاندار نظم ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

"مناجات بیوہ" حالی کا نامور کارنامہ ہے۔ حالی سے پہلے عورت کا شاعری میں کوئی مقام ہی نہیں تھا اور

اگر تھا بھی تو ایک طوائف سے زیادہ نہیں۔ عورت کی فطری صفات یعنی خدمت۔ محبت۔ شرافت۔ شرم و حیا۔ قربانی و ایثار۔ محنت و جفاکشی اور بلند کرداری کا کہیں ذکر بھی نہیں آتا تھا۔ حالی نے محسوس کیا کہ عورت کو سماج اور شاعری میں صحیح مقام دیا جائے۔ اسی نظم میں انھوں نے ایک بیوہ عورت کے دلی جذبات، کیفیات و احساسات کو پُراثر انداز میں بیان کیا ہے۔ پڑھ کر دل تڑپ اٹھتا ہے اور آنکھوں سے آنسو خود بخود رواں ہو جاتے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے مولوی عبدالحق سے پوچھا کہ اردو کی کون سی کتاب سب سے پہلے پڑھوں۔ انھوں نے جواب دیا۔ "مناجات بیوہ" بیوہ کی زبان نہیں۔ یہ بدقسمت ملک کی زبان ہے۔ مناجات کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

یا عورت کو پہلے بُلا لے یا دونوں کو ساتھ بُلا لے
یا یہ مٹا دے ریت جہاں کی جس سے گئی پریت یہاں کی

رہ گیا دے کر چاند دکھائی چاند ہوا پہ عید نہ آئی
رت بدلی پہ ہوئی نہ برکھا بادل گرجا اور مینھ برسا

سب کو تیرے انعام سے تھے میں ہی نہ تھی انعام کے قابل
تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں تو ان کو ترسی میں سانجھ میں

رو دیئے تو سب پڑتے ہیں گھر کے رونے نہیں دیتے جی بھر کے
سوچ میں میرے سارا گھر ہے میرے چلن پہ سب کی نظر ہے

کپڑے پہنوں میں ہوں بدلتی عطر نہیں میں پھول کے ملتی
سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی بال نہیں برسوں گندھواتی

"چپ کی داد" حالی کی معرکے کی نظم ہے اس میں انھوں نے عورتوں کی اصلاح۔ تعلیم و تربیت کا ذکر کیا ہے اور عورتوں کی فطری صلاحیتوں۔ محبت۔ شفقت۔ ہمدردی۔ خلوص۔ وفاشعاری خدمت۔ مروت۔ اور پاس ناموس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے عورتوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کو تعلیم کی طرف راغب کیا ہے۔ ہندستان میں سب سے پہلے جو آواز عورت کی مظلومی اور انصاف کے لیے بلند ہوئی وہ حالی کی آواز تھی۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں قوموں کی عزت تم سے ہے

سسرال کے افکار حالی کی زبان سے سنیے۔

بدلے نہ شوہر کی نظر، سسر کا دل میلا نہ ہو
آنکھوں میں ساس اور نند کے کھٹکو نہ مثل خار تم

مردوں نے عورت کو پوری طور سے اپنا خدمت گزار بنا کر اس کو تمام علوم و فنون سے بے بہرہ رکھا ہے۔

جب تک جیو علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آب حیات
ٹھہرا تمھارے حق میں زہر ہلاہل سر بسر

دنیا میں انقلاب عظیم ہوتا چلا آیا ہے آج کل دنیا کا حال اس درخت کا سا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی رہیں۔ حالی نے ادب میں بھی انقلاب لانا ضروری سمجھا۔ اصلاح ادب کے سلسلے میں حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" اور دیوان حالی کا دیباچہ لکھ کر ادب پر وہ احسان کیا جس سے ادب رہتی دنیا تک سبک دوش نہیں ہو سکتا۔ مقدمہ شعر و شاعری ایسی مدلل کتاب ہے کہ آج تک کوئی لکھ نہ سکا اس میں انھوں نے فن شاعری پر کافی بحث کی ہے اور بہت سے اصول مرتب کیے ہیں۔

حالی نے نثر نگاری کے میدان میں اپنے دو خاص موضوع منتخب کیے۔ ادبی تنقید اور سیرت نگاری۔

حالی کی "حیات سعدی" تذکرہ نگاری میں پہلی ادبی کوشش تھی اس تذکرہ میں حالی نے مشہور صوفی اور بزرگ شاعر شیخ سعدی معلم اخلاق کے کردار کو بے نظیر ڈھنگ سے

پیش کیا ہے۔ کتاب کا مقصد قوم اور ملت کی شیرازہ بندی تھا۔
حالی نے "یادگارِ غالب" میں غالب کے فنی کمال اور محاسن شعری پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی خوش طبعی۔ بذلہ سنجی کی مکمل تصویر پیش کی ہے۔ حالی نے سب سے پہلے ہمارے ذہن نشین کیا کہ غالب گل و بلبل۔ وصل و فراق کا شاعر نہیں ہے بلکہ وہ اردو کا سب سے بڑا رمز شناس، حقیقت آشنا اور صاحب راز شاعر ہے یہی ایک واحد کتاب ہے جو غالب کو منظر عام پر لانے کا سبب بنی اور ان تحقیقات کی محرک ہوئی جو غالب پر بعد میں لکھی گئیں۔

"حیات جاوید" حالی کی زندہ جاوید تصنیف ہے اس کتاب میں سرسید کی ابتدائی زندگی۔ ان کی تعلیمات۔ ان کے تعلقات ان کے احباب اور طریقۂ تالیف و تصنیف کے تفصیلی واقعات درج کیے گئے ہیں۔ یہ سرسید کی ذہنی۔ دماغی اور ارتقائی کیفیات کی عکاسی کرتی ہے یہ سیرت نگاری کے مغربی طرز پر لکھی گئی ہے۔ حالی نے مسلم ایجوکیشنل کے جلسوں میں شرکت کی اور نظمیں پڑھیں اور تقریریں کیں۔ سرسید کے اخبار تہذیب الاخلاق میں آپ کے اصلاحی مضامین شائع ہوتے تھے اس کے علاوہ دوسرے رسائل میں بھی حالی کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ تمام مضامین "مقالات حالی" کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔

حالی کی کاوشوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ جدید شعر و سخن کا چرچا ملک میں پھیل گیا تھا عوام و خواص جدید طرز کے شعر کو پسند کرنے لگے تھے اور اس عصر کے شعرا کے لیے جدید عمارت تیار مل گئی اور پہلا [illegible] کا دور اب گزر جانے کی وجہ سے شعرا کو کسی خاص رنگ میں بڑھنے کا موقع مل گیا۔ جدید اردو شاعری کے اس بچے کی پرورش رومانی دور نے کی۔ یہ جذبہ کبھی اقبال کو مرد مومن کے خواب دکھاتا ہے۔ کبھی جوش کو فطرت پرستی اور انقلاب پر اکساتا ہے اور کبھی حفیظ کو تیرہ سو سال پرانی عظمتوں کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔

حالی نے جو کچھ سیکھا اپنے تجربات کی بنا پر سیکھا۔ حالی کی پیشانی

کی داستان انھیں کے الفاظ میں سنیے:

"البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشتِ جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا..... جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا ... بادہ نوشی پر آئے تو خم کے خم لنڈھا دیتے اور پھر بھی سیر نہ ہوتے کفر سے مانوس رہے۔ ایمان سے بیزار رہے۔ کعبہ و مسجد کی توہین کی ..... خدا سے شوخیاں کیں ..... نبیوں سے گستاخیاں کیں۔ بیس برس کی عمر سے چالیس تک تیلی کے بیل کی طرح دس گز زمین میں پھرتے رہے اور اسے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے۔ جب آنکھیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں۔"

حالی کو ان حالات نے مجبور کیا کہ وہ اردو شاعری میں نکمّے عناصر پر کاری ضرب لگائیں۔

حالی ادب برائے ادب یا ادب برائے تفریح کے نظریے سے بیگانہ ہو کر ادب برائے زندگی کے نظریے کے حامی تھے وہ آرٹ کو آرٹ کی خاطر نہیں بلکہ اخلاق کی خاطر، زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کی خاطر اور عظمت پیدا کرنے کی خاطر چاہتے تھے۔ حالی کا عزم، ادب کو عوام یعنی زندگی کی رگ جاں کے قریب لانا تھا۔

حالی کے زمانے میں ہندستان کی معاشرت اور تمدن انتہائی تنزل کے دور سے گزر رہے تھے لذت پرستی اور "ترک دنیا" دونوں منفی پہلو شعر و ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ شاعر حقیقت کی تلخیوں سے گھبرا کر اپنے خیالی قلعوں میں محصور تھے ان حالات میں حالی نے رفارمر کا کام کیا جس کو عبدالاحد خاں خلیل اپنے الفاظ میں اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"حالی نے مروجہ خیالات سے اکتا کر نیز ان کو رفتہ رفتہ سمجھ کر غزل میں نیا انداز عشق و محبت، نیا ماحول فطرت

نیچرل شاعری سے رغبت، نیا اندازِ فکر اور نیا طرزِ سخن اپنایا گیا اور غزل کے مزاج میں معتدل ڈھنگ سے ایسی تبدیلیاں کر دیں کہ اس کی مقبولیت کو صدیوں کے لیے محفوظ کر دیا۔"

(اردو غزل کے پچاس سال ص ۱۶۳)

حالی نے شاعری کے مواد پر بہت زور دیا ہے ان کے خیال میں اسلوبِ بیان ثانوی چیز ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ اصل شے مواد ہے۔ اس میں جتنی تازگی جتنی جان اور جتنی توانائی ہوگی اتنی ہی کامیابی حاصل ہوگی۔ سانچہ صرف ایک ذریعہ ہے اور ذریعہ کبھی اصل مقصد نہیں بن سکتا۔ زندگی کے خزانے سے ہر شاعر اپنی جیب و دامن بھرتا ہے لیکن زندگی کو سمجھنے اور اس کو شعر و سخن کے کام میں لانے کی صلاحیت ہر شاعر میں نہیں ہوتی۔ شاعر اپنے فن کا سہارا لے کر الفاظ کے پردے میں مصوری کرتا ہے۔

حالی کے خیال کے مطابق شعر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ نیچرل ہو اور معنی سانچے میں ڈھلا ہوا اگر اس کے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی پائی جائے تو بہتر ہے ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ حالی نے شاعری کے عام خصوصیات پر زور نہ دے کر سوز و گداز پر زیادہ زور دیا ہے اس سلسلے میں حالی کے نمونے کے اشعار پیشِ خدمت ہیں:

اے شعرِ دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دل گداز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری
قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجے نماز تو
اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

حالی نے اردو شاعری اور ادب کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور انھوں نے عشقیہ شاعری خاص طور سے غزل پر سخت حملہ کیا ان کا کہنا تھا: "صحیح تغزل کی روح جذبات و واردات ہیں جو کیفیت ہم پر طاری ہو اور جو واقعات اور مشاہدات پیش آئیں وہی ہماری غزل کا اصل موضوع ہیں۔" غالب نے کہا ہی تھا۔

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اس میں شک نہیں غزل کا دامن تنگ ہے کیوں کہ یہ ایک مسلسل بیان نہیں اور اس میں کوئی خاص مضمون آسانی سے رقم نہیں کیا جا سکتا۔ غزل کی بے ربطی مسلّم ہے اور اسی بے ربطی کی وجہ سے غزل مغربی ادب میں مقبول نہ ہو سکی۔ حالی نے غزل پر بہت اعتراضات کیے کچھ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ غزل میں رزمیہ شاعری کا وجود نہیں۔
۲۔ غزل میں عشق و محبت کے معاملات کا مسلسل بیان نہیں۔
۳۔ غزل میں گل و بلبل، شمع و پروانہ، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں کے علاوہ کیا رکھا ہے۔
۴۔ غزل میں ہندوستانی عناصر کی کمی ہے اور اس میں غیر ملکی تلمیحات اور غیر ملکی الفاظ کی بھرمار ہے۔
۵۔ اردو غزل ہماری زندگی کے واقعات و سانحات کے مطابق نہیں۔
۶۔ غزل گو شعراء پرانے شعراء کے اشعار کی ذرا تغیر و تبدل سے نقالی کرتے ہیں۔
۷۔ اردو غزل کے عروض و قوافی کے اصول اتنے مشکل ہیں کہ مفہوم کھو جاتا ہے اور غزل الفاظ کا شعبدہ بن کر رہ جاتی ہے۔

حالی غزل کو انسانی زندگی کے مطابق اور روزانہ کے واقعات کے قریب لانا چاہتے تھے انھیں غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ حسن و عشق کے معاملات سے وابستہ ہے اور عشق عقل اور اخلاق کو خراب کرنے والی چیز ہے۔

تنقید کے میدان میں حالی نے محسوس کیا کہ ہماری شاعری صحیح راستے پر نہیں چل رہی ہے، اس میں تصنع، تکلف، مبالغہ، استعاروں اور تشبیہوں کا زور ہے۔ تمام قوت لفظی اور ظاہری صناعیوں پر صرف کی جاتی ہے۔ زندگی

سے ہمارے شعر و ادب کا کوئی رابطہ نہیں۔ حالی نے جدید شاعری اور جدید غزل کے لیے ضروری سمجھا کہ نئے مضامین تلاش کیے جائیں۔ غزل کو جدید خیالات کے اظہار کے لیے تنگ پایا اور رباعی اور قطعات پر زیادہ توجہ دی۔ وہ چاہتے تھے کہ برسات، جاڑے اور گرمی کی بہاریں۔ دریاؤں کی روانی پہاڑ دن کے خوش نما مناظر کو شاعری میں داخل کیا جائے۔ بیانیہ تاریخی۔ اخلاقی۔ پولیٹکل نظمیں شامل کی جائیں جذبات انسانی اور کیفیات قلبی کو نہایت پر اثر الفاظ میں بیان کیا جائے۔

حالی کا سب سے بڑا کارنامہ غزل کو نظم کی طرف موڑ دینا تھا اور آج ترقی پسند ادب کے سائے میں نظم کا پودا اپنی خوراک غزل سے لے کر کھلی اور صاف ہوا میں نشو و نما پا رہا ہے اور آج کے ادب کا مستقبل نظم سے وابستہ ہے۔ آج کا شاعر نظم کی طرف زیادہ بڑھتا نظر آ رہا ہے۔ پرانے شعراء میں جوش اب بھی نظم کہہ رہے ہیں نئے شعراء میں فیض۔ جاں نثار اختر۔ احمد ندیم قاسمی۔ احسان دانش۔ معین الدین جذبی۔ روش صدیقی وغیرہ کا شعری سرمایہ نظم ہی میں ہے۔ انقلابی شاعری کو سردار جعفری نے ایک نئے رخ سے پیش کیا انھوں نے سائنٹیفک اور سیاسی نظریوں ہی کو نہیں بلکہ وقتی موضوعات کو شاعرانہ وقار اور فنی ابدیت بخشی۔

حالی کا شعور ایک ترقی پسند انسان کا شعور تھا وہ سائنسی ایجادات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ بین الاقوامی ادب سے رشتہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ انگریزی تعلیم سے استفادہ کرنا چاہتے تھے اور تصور کی دنیا سے نکل کر عمل کی دنیا میں آنا چاہتے تھے۔

حالی کے یہاں ہم کو وہ دیدہ زیبی نہیں ملتی جس کی توقع عہد حاضر کے نقاد سے کی جا سکتی ہے لیکن وہ اپنی صفات کے لحاظ سے اردو کے کسی بھی بڑے نقاد سے بڑے ہیں۔ حالی کے فن کا جائزہ اور ان کے مرتبہ کا تعین ان کے عہد اور اس کے مخصوص حالات اور مسائل و وسائل کو نظر انداز کر کے ممکن نہیں ہے۔ آج تنقید کے جدید اصول مرتب ہو چکے ہیں پھر بھی حالی کا بتایا ہوا راستہ مستحکم ہے۔ آسکر وائلڈ کہتا ہے: "اگر کسی سے سچی بات کہلوانا ہو تو اسے ایک نقاب دے دو۔" حالی کا فن دراصل نقاب ہی ہے۔ انھوں نے پردے میں وہ کام کیا ہے جو شاید کھلم کھلا ممکن نہ تھا۔ سر سید پر کفر کا فتویٰ لگ گیا تھا اور اسی راہ سے حالی خراج تحسین وصول کرتے ہوئے گزر گئے۔

حالی نے ترقی پسند ادب کا پس منظر تیار کیا۔ ترقی پسند ادب قدیم ادب کو مٹانا نہیں چاہتا اور نہ اس کی اہمیت سے انکار کرتا ہے بلکہ ایسے نتائج اور نصائح اخذ کرتا ہے جس سے انسانیت کا راستہ ہموار ہو سکے۔ زندگی اور ادب کا تعلق روز روشن کی طرح ثابت ہے ادب خلا میں نہیں پیدا ہوتا بلکہ زندگی کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی آغوش میں پلتا ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ زندگی کے ساتھ ادب بھی بدلتا رہتا ہے۔ زمانہ کے ردوبدل نے زندگی کے پرانے معیاروں پر نظر ثانی کی ضرورت ناقابل انکار طور پر ثابت کر دی ہے۔ رواں دواں زندگی ہمیشہ نئے مسئلے پیدا کرتی رہتی ہے اور یہی ادب میں تبدیلی کی متحرک ہوتی ہے۔ ترقی پسند ادب کو اتنا ہی وسیع ہونا چاہیے جتنی حیات حاضرہ وسیع ہے اور صرف حال ہی سے بحث نہ کر کے مستقبل کی بھی عکاسی کرنا چاہیے۔

حالی مصلح قوم اور واعظ شاعر کے ساتھ ساتھ اردو ادب اور مزاج شعر و سخن میں تغیر کے علم بردار ہیں۔ انھوں نے غزل کو نظم کی طرف راغب کر کے نیچرل اور واقعاتی شاعری کی بنیادیں مستحکم کیں اور غزل کی خامیوں کو دور کرتے ہوئے ترقی پسند ادب کا پس منظر تیار کیا ادب کو خانقاہ اور دربار سے نکال کر کوچوں، بازاروں، دفتروں، تعلیم گاہوں اور عوام کے گھروں تک پہنچایا۔ حالی تنقید کے نقاش اول ہیں ان کی تنقید کی بنیادوں پر عہد حاضرہ کی تنقید جدید کا انحصار ہے حالی کی ادبی اصلاح آج جدیدیت کی تحریک میں تبدیل ہو چکی ہے اور ادب اور زندگی دونوں ایک چیز ہو کر رہ گئے ہیں۔

★

راج شرما

(افسانہ)

تائی نہالی

تائی نہالی نے قمیص کے بٹنوں کے کاج بناتے بناتے اپنی آنکھوں سے بہتے پانی کو صاف کیا اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے باہر کی طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر پہلے زبردست آندھی آئی تھی اور کھلے دالان میں سوکھے پتے اور کاغذوں کے چھوٹے چھوٹے پرزے بکھر گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے.....

آندھی جب بھی آتی ہے تو صاف ستھرے گھروں اور ان کے آنگنوں میں گندگی اور کوڑے کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ جھونپڑیوں کے چھپر اڑ جاتے ہیں اور بہت سے مضبوط اور تناور درخت جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک آندھی تائی نہالی کی زندگی میں بھی آئی تھی جب وہ نہالی کور تھی۔ اس کا گھر ایک چھوٹا سا بہشت تھا۔ جہاں خوشیاں ناچتی تھیں۔ نہالی کور کا شوہر ایک درزی تھا۔ جب وہ شام کو مشین اٹھا کر گھر واپس آتا اور اس کی ہتھیلی پر کھڑکھڑاتے نوٹ اور کھنکتے سکے رکھتا تو نہالی کور کو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کبھی ختم نہ ہونے والا کوئی سہانا خواب دیکھ رہی ہو۔

تب ایک بار بیماری کی آندھی اٹھی اور اس کے جیون کے آسمان پر چھا گئی اور دکھوں کی تمازت سے اس کی حفاظت کرنے والے درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک گئی۔ نہالی کور کی زندگی میں غموں کا اندھیرا چھا گیا۔ مگر جس طرح رات کے گھنے اندھیرے میں بھی منزل کی طرف بڑھنے والے راہی کے قدم نہیں رکتے، نہالی کور بھی کسی انجان منزل کی طرف بڑھتی رہی۔ ایک خواس باختہ مسافر کی طرح۔ نہالی کور روتے روتے، سوچتے سوچتے، دکھوں کو سہتی، نہال کور سے تائی نہالی ہو کر رہ گئی۔ مگر پھر بھی وہ جیتی رہی۔ اپنے بیٹے موہن اور بیٹی پریت کے لیے۔ اسے اپنی زندگی کی نامرادیوں اور مایوسیوں سے بھی سمجھوتا کرنا پڑا تھا۔

تائی نہالی کے ذہن میں کبھی کبھی بیتے ہوئے دنوں کی یاد اس طرح سے ابھرتی جیسے آندھی سے پہلے اپنے آنگن کی صفائی کا خیال۔ اس نے سوچا کہ قمیص کے کاج بنا کر اٹھے گی اور آنگن کی صفائی کرے گی، اس کی بیٹی پریت کسی سہیلی کے گھر پڑھنے گئی تھی اور بیٹا... جسے اس نے گاؤں والوں کے کپڑے سی سی کر بڑے دکھ اٹھا کر پالا تھا،... کام پر گیا ہوا تھا۔

"تائی، میری قمیص، سی دی ہے؟"

ایک پڑوسن نے کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔ تائی نہالی نے اسے آنگن پار کرتے نہیں دیکھا تھا وہ تو اپنے کام اور خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔

"آ، بہنا، بیٹھ جا" اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹھنا کیا ہے تائی، اگر قمیص سل گئی ہو تو..."

"نہیں، کل تک تیار کر دوں گی۔" تائی نہالی نے دھاگہ توڑتے ہوئے کہا۔

"تائی۔ جلدی چاہیے تھی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تم تو جانتی ہو کہ میں کتنا کام کر سکتی ہوں۔" اس نے بڑی مایوسی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مشین لے لو تائی" پڑوسن نے رائے دی۔

"کبھی تھی مشین"۔ تائی کے منہ سے ٹھنڈی آہ نکلی۔

پڑوسن کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "تائی۔ میرا مطلب یہ تو نہ تھا۔" پھر کچھ رک کر بولی۔ "اچھا تو چلتی ہوں۔"

باہر بادل چھا چکے تھے۔ آندھی کے بعد بادل، پڑوسن بھیگنا نہیں چاہتی تھی اس لیے وہ جلدی چلی گئی۔ اتنے میں بوندا باندی شروع ہو گئی۔

پڑوسن چلی گئی تو تائی نہالی نے خیالات کے تانے بانے کے تار کو پھر سے پکڑ لیا۔ کبھی سلائی مشین بھی اس کے یہاں تھی۔

اس کے شوہر نے بڑے شوق سے اسے کپڑے سینے سکھائے تھے۔ مگر مرنے والا اپنے ساتھ سبھی کچھ لے گیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد مجبوریوں، مجبوری اور غربت کی جو بوندا باندی شروع ہوئی تو تائی ہنا آئی سر سے پاؤں تک بھیگ گئی تھی۔ سلائی مشین بک گئی۔ سہاگ کے ساتھ ساتھ روزی کمانے کا ذریعہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ مگر امید نے دم نہیں توڑا تھا۔

بوندا باندی ہو رہی تھی۔ تائی ہنا آئی نے کاج بنا لیے تھے۔ اس نے دوسری قمیص اٹھا لی۔ اس میں ابھی بہت سا کام تھا۔ وہ کپڑے کے ٹکڑوں کو جوڑتی رہی سوچتی رہی اور کام کرتی رہی تھی۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ اس کی بیٹی پریت بھیگتی بھیگتی کمرے میں داخل ہوئی۔"

"ماں، ماں، میں تو بھیگ گئی۔"

وہ ہنس رہی تھی بھیگ تو تائی ہنا آئی بھی گئی تھی۔ دکھوں، غموں اور تفکرات سے بہتے ہوئے آنسوؤں سے، اس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ بھیگے ہوئے کپڑے اتار رہی تھی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر تائی ہنا بھی دکھوں سے تربتر اپنے کپڑوں کو بھی اتار سکتی۔!

"ماں، ماں، میری سہیلی نے ایک کتاب خریدی ہے۔ بڑی اچھی کتاب ہے۔"

"ہوں"۔ تائی ہنا آئی نے جواب دیا۔

"پریت ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ اس کی فیس بھی معاف تھی۔ مگر پھر بھی تائی ہنا آئی کو اس کی تعلیم جاری رکھنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ کتابوں اور کاپیوں کا خرچ بہت تھا۔ اسی وجہ سے تائی ہنا آئی اپنے لڑکے کو بھی پڑھا نہیں سکی تھی۔ اس کا لڑکا ابھی چوتھی جماعت میں ہی تھا۔ تب ہی اس کا شریک حیات اسے زندگی کی ڈگر پر اکیلا چھوڑ گیا تھا۔ کئی برس اسی طرح بیت گئے۔ تب اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے لڑکے کو نہیں پڑھا سکتی تھی۔ اس کا لڑکا اب شہر کے ایک کارخانہ میں نوکر ہو گیا تھا۔ صبح کو کام پر جاتا تھا اور شام کو واپس آتا تھا۔

پریت کہہ رہی تھی۔ "ماں جی۔ مجھے کتاب لے دو گی نا؟"

"کتنے کی آئے گی۔؟"

"دو روپے کی"۔ پریت نے پُرامید نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

"دو روپے کی؟" تائی ہنا آئی کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

"لے دو گی نا ماں؟"

"اچھا"۔ تائی ہنا آئی کے منھ سے نکلا۔

مگر دو روپے ایک سوالیہ نشان بن کر تائی ہنا آئی کے دماغ میں گھومنے لگے۔ کہاں سے آئیں گے۔ دو روپے پہلے ہی گزارہ مشکل سے ہو رہا تھا۔ لڑکے کو ساٹھ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ جن میں سے وہ پچپن روپے لا کر ماں کو دیدیتا تھا اتنے روپیوں سے کیا بن پڑتا؟ گھر کا خرچ پہلے ہی کم تھا مگر پھر بھی۔

کب لے کر دو گی ماں۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا "اچھا، رہنے دو ماں، میں کتاب مانگ کر کام چلا لوں گی۔" اس نے اپنی ماں کی پریشانی کو جیسے بھانپ لیا تھا۔

تائی ہنا آئی نے باہر کی طرف دیکھا۔ بوندا باندی ابھی جاری تھی۔ پھر اس نے پریت کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں ہی اس کی تمناؤں کا خون ہو رہا ہے۔ اس کے منھ سے نکلا۔

"نہیں بیٹی۔ میں لے دوں گی کتاب۔ جلدی ہی۔"

اتنے میں ایک اور پڑوسن آنگن سے ہوتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

"کیا بات ہے تائی۔ کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں آ بیٹھ جا۔"

"میرے لڑکے کی قمیص سی دی ہے؟" اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا وہ بارش سے بھیگی ہوئی تھی۔

"ہاں" تائی نے جو قمیص ابھی ابھی سی کر رکھی تھی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

پڑوسن نے قمیص کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر بولی۔ "تائی۔ اگر یہی کام مشین پر ہوتا تو ۔۔۔۔؟"

"مشین کہاں سے آئے گی بہن"۔ تائی بولی۔

"اب تو دا گھو رد کی کرپا سے موہن سنگھ کما تا ہے۔"

"کما تا تو ہے بہن۔ مگر گزارہ بھی تو کرنا ہے۔"

"کتنے پیسے لے آتا ہے۔ موہن سنگھ ۔؟"

"پانچ اوپر پچاس روپے۔" تائی ہنالی بولی۔

"میرے لڑکے کو تو ساٹھ روپے ملتے ہیں۔"

"ملتے تو اس کو بھی ساٹھ روپے ہیں مگر پانچ روپے وہ اپنے مالک کے اصرار پر ڈاکخانہ میں جمع کروا رہا ہے۔" تائی ہنالی نے اپنے لڑکے کی ہتک نہیں ہونے دی۔

"کیوں جمع کرواتا ہے؟" پڑوسن نے سوال کیا

"جمع کیا کرتا ہے بہنا، میں نے تو بہت شور مچایا تھا پر ساٹھ دیتو میں ہی گزارہ مشکل سے ہوتا ہے مگر اس کا مالک نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ یہ رقم کسی دن کام آئے گی "

"کب کام آئے گی؟" پڑوسن بولی۔ "آج کی ضرورت تو پوری ہونی چاہیے۔"

"میں بھی تو اسی بات کو روتی ہوں۔" تائی ہنالی نے جواب دیا۔

"ابھی آیا نہیں موہن سنگھ؟"

"نہیں۔"

تائی نے باہر دیکھا۔ بادل تو تھے مگر اب بارش رک چکی تھی۔

"چلوں پھر۔" پڑوسن اٹھ کر جانے لگی۔ اس نے قمیص کو تہہ کرتے ہوئے ایک پچاس پیسے کا سکہ تائی کی طرف بڑھا دیا۔

"پچاس ہی پیسے؟"

"تو اور کتنے؟"

"درزی تو چار روپے سے کم نہیں لیتا آج کل۔"

"درزی سلائی بھی تو مشین سے کرتے ہیں نا۔"

"پچھتر پیسے تو ہونے ہی چاہئیں۔" تائی نے منت کی۔

"نہیں پچاس پیسے ہی ٹھیک ہیں۔ تائی" پڑوسن نے کہا۔

تائی کچھ نہیں بولی۔ اس نے پچاس پیسے پکڑ لیے اور اپنی آنکھوں سے بہتے پانی کو پونچھا۔ معلوم نہیں یہ پانی تھا یا آنکھوں کی بینائی!

پڑوسن چلی گئی تو پریت ماں کے پاس آئی۔ "مشین کی سلائی کے چار روپے اور ہاتھ کی سلائی کے کل پچاس ہی پیسے!"

ہونہہ۔"

"ماں تو نے اتنے کم پیسے کیوں لیے؟ تو نے تو اس قدر محنت کی ہے۔"

"مگر بیٹی، ہماری مجبوری کا سب فائدہ اٹھاتے ہیں۔" تائی نے جواب دیا۔

تب پھر پریت کچھ سوچتے سوچتے بولی۔ "ماں، ہم مشین کیوں نہ خرید لیں۔؟"

بادل اڑ چکے تھے اور شام کی دھیمی دھیمی روشنی باہر چمک رہی تھی، آنگن کی گرد بیٹھ گئی تھی۔ کمرے میں تھوڑا تھوڑا اندھیرا چھا رہا تھا موہن سنگھ کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ تائی ہنالی اٹھی۔ اس نے کپڑوں کو ایک طرف رکھ دیا، اور چولہے میں آگ جلانے کو سوچنے لگی۔

"پریت، ذرا آنگن میں جھاڑو تو لگا دو۔ بہت کوڑا پڑا ہے۔"

پریت جھاڑو لگانے لگی اور تائی نے چولہے میں آگ جلا دی۔

اتنے میں موہن سنگھ اپنی پرانی سائیکل کو سنبھالتا ہوا دروازے سے داخل ہوا۔ اس نے سائیکل کے پیچھے ایک بڑے کپڑے میں کچھ باندھ رکھا تھا۔ تائی ہنالی اور پریت نے بڑی حیرانی سے دیکھا۔ پریت اٹھ کر سائیکل کے پاس گئی۔ اس نے سائیکل تھامتے ہوئے پوچھا۔

"ویر جی، (بھائی جان) اس میں کیا ہے؟"

تائی ہنالی بھی آگے بڑھی اور اس نے بھی موہن سنگھ سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ پوچھ ڈالا۔

موہن سنگھ سائیکل کو پریت کے حوالے کر کے پیچھے بندھی چیز کو کھول رہا تھا۔ پھر وہ اسے کمرے کے اندر اٹھا کر لے گیا اور زمین پر رکھتے ہوئے بولا۔ "ماں،

دیکھ تو ٹھیک ہے نا۔"

تائی ہنالی نے کپڑا کھولا۔ یہ مشین کا ڈبہ تھا۔ کانپتے کانپتے ہاتھوں سے اس نے ڈبہ کا ڈھکنا اٹھایا۔ اندر ایک خوبصورت

سلائی مشین تھی۔ اس کا ہاتھ مشین کے ہتھے پر جا پڑا۔ مشین چلنے لگی گھر گھر۔ تائی ہنّائی کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ مگر پھر وہ گھبرا سی گئی۔

"کیسے لے آیا بیٹے، یہ مشین؟"

تائی ڈر رہی تھی کہ یہ سب ایک خواب ہی نہ ہو۔ موہن سنگھ نے جیب سے ایک نیا بٹوہ نکالا اور اس میں سے دس دس کے نئے بیس نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"یہ یہ کیا ہے؟" تائی ہنّائی گھبرا کر بولی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں موہن سنگھ نے چوری تو نہیں کی۔ اتنے سارے روپے اور یہ مشین ....؟

"گھبراتی کیوں ہے ماں؟"

"مگر یہ آئے کہاں سے!" تائی نے پھر پوچھا۔ پریت حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔"

"ہاں، جو پچھلے پانچ برسوں پانچ پانچ روپے کی کٹوتی ہوتی رہی تھی نا، یہ اسی کی برکت ہے۔ آج جب میں کارخانے کے مالک کے پاس تنخواہ لینے گیا تو اس نے میری ڈاک خانہ والی پاس بک دیکھی اور بتایا کہ میرے پانچ سال پورے ہو چکے ہیں۔ اور اس نے ڈاک خانہ سے میرے سارے روپے نکلوا دیئے۔ پہلے تو میں کچھ خریدنا نہیں چاہتا تھا مگر پھر میں نے سوچا کہ تمہیں اچنبھے میں ڈال دوں۔"

تائی ہنّائی کی حیرانی خوشی میں بدل گئی۔ "آج کی ضرورت اگر آج ہی پوری نہ ہو تو کل کی فکر کون کرے۔" پڑوسن کے کہے ہوئے فقرے اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بات غلط تھی۔

"آج کی ضرورتیں کم کر کے کل کے منصوبے پورے ہو سکتے ہیں۔" تائی ہنّائی نے سوچا۔

تائی ہنّائی نے دیکھا، پریت آنگن صاف کر چکی تھی۔ آندھی اور بارش کی ہلکی بوندا باندی کے بعد زمین میں سے میٹھی میٹھی خوشبو سی آ رہی تھی۔ تائی ہنّائی محسوس کر رہی تھی جیسے کہ وہ چھت پر چڑھ کر اونچی آواز میں لوگوں کو کچھ کہنا چاہتی ہو.....۔"

★

نیا نوکر

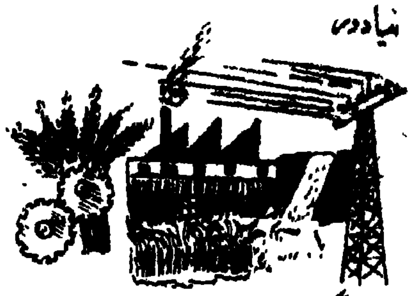
صفحہ ۳۱ کا بقیہ

تو بے ساختہ کہہ اٹھا "صاحب یہ آپ کو چرٹے کیسے لگے ہیں۔ یا آپ دن پر دن اوپن ٹاپ ہوتے جا رہے ہیں۔ یا پھر یہ کہ آپ کو محلے کے لوگ زن مرید کیوں کہتے ہیں وغیرہ۔ یہ گفتگو کوئی سن لے تو سمجھے گا کہ موصوف نوکر نہیں بلکہ ہمارے لنگوٹیا یار ہیں۔

اِس کی ایک اور بُری عادت یہ ہے کہ یہ جس رکابی میں کھلے گا اس میں چھید کرے گا۔ چنانچہ اس سے قبل وہ جن صاحب کے ہاں ملازم تھا اُن کو "چاتی ماسٹر" کے نام سے شہرت دوام بخش چکا ہے اور یہ بھی اس کی ناپاک سازش کا نتیجہ ہے کہ محلے کی ایک معزز شخصیت کا نام لوگ قریب قریب بھول گئے ہیں اور بیچارے کو "کھٹا" کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اُن کے گھر ملازمت کے دوران جب کبھی وہ پوچھتا کہ صاحب آج کیا پکائیں تو وہ فوراً کہتے رات کا خشکہ بچا ہے بس کھٹا بنا دو۔

اِس کی ان تمام خوبیوں سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود ہم اسے کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہمیں اِس بات کا خدشہ ہے کہ وہ "چاتی ماسٹر" اور "کھٹا" صاحب کی طرح ہم کو بھی کسی نئے لقب سے نہ نواز دے کیونکہ اُسے ہمارے گھریلو حالات اور معاملات کا اچھی طرح علم ہو چکا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ ہماری کوئی نوکری وغیرہ نہیں ہے۔ ہمارے خسر ہم کو ہر ماہ سو گالیاں دے کر ۵۰ روپئے روانہ فرما دیتے ہیں۔ ہم بیوی کی پرانی ساڑیوں کے بشرٹ بنا لیتے ہیں۔ ہمارے گھر میں گوشت صرف "عیدین" کو پکتا ہے آدھ پاؤ دودھ میں ہم تھوڑا سا بچے کو پلاتے ہیں ــــ کچھ چائے کے لیے رکھ لیتے ہیں اور باقی بچے ہوئے دودھ کا دہی جماتے اور گھی تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان حالات میں نوکر کے بارے میں کچھ کہنا مصلحت کے خلاف ہے کہیں یہ گھر کا بھیدی لنکا نہ ڈھا دے اس لیے خاموشی ہی بھلی ہے ــــ!

★



اتر پردیش شاہ راہِ ترقی پر

بوگس راشن کارڈ استعمال کرنے والوں کو آگاہی • • • اتر پردیش میں انتظامی اطلاعات وجائزہ نظام شروع • • • صنعتی قرضوں کی وصولی ملتوی • • • ٹہری میں ۱۴۴ مواضعات کو بجلی کی فراہمی • • • آلو کے جھلسا روگ کے خلاف آگاہی • • • کمزور طبقوں کے طلباء کو درسی کتابوں کی مفت فراہمی • • • کمزور طبقوں کے ساڑھے دس لاکھ سے زائد خاندانوں کو مکانات کے لیے زمین • • • دیگر پسماندہ طبقہ کے طالب علموں کو وظائف • • • مزدوروں کے لیے سستا ہوٹل • • • لکھنؤ میں ہندستان ایرونائکس لمیٹیڈ کے لیے معاون صنعتی بستی • • • اناؤ میں ۳۱۸۱۶ بے زمین افراد کو زمین کی فراہمی۔

حکومت نے مناسب قیمتوں پر ضروری اشیاء کی فراہمی ان کی تقسیم اور دستیابی کے لیے سخت اقدامات کیے ہیں۔

اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اتر پردیش غلہ اور دیگر ضروری اشیاء کی تقسیم سے متعلق حکم ۱۹۷۵ء نافذ کر دیا گیا ہے۔ اس حکم کے تحت کارڈ ہولڈروں، محکمہ جاتی ملازمین اور سستے غلہ کی دوکانوں کے مالکان کو خصوصی ہدایتیں دی گئی ہیں، جن کی خلاف ورزی کو قانون دفاع ہند اور اندرونی سلامتی قانون کے تحت مستوجب سزا قرار دے دیا گیا ہے۔

کوئی بھی شخص جو راشن کارڈ کے لیے درخواست پیش کرتا ہے اسے کسی ایسے شخص کو اپنے کارڈ میں شامل نہیں کرنا چاہیے جو پہلے کسی دوسرے راشن کارڈ میں شامل ہو۔ بوگس راشن کارڈوں کے استعمال کو قطعی ممنوع قرار دیا جا چکا ہے اور جعلی راشن کارڈوں کو غذائی افسر کے پاس ۱۵ر نومبر ۱۹۷۵ء تک جمع کر دینا چاہیے کارڈ ہولڈروں کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اپنے کارڈ کے فاضل یونٹوں کو پندرہ دن کے اندر خارج کرالیں۔

اس حکم کے بموجب سستے غلے کے دکاندار کو کسی بھی شخص کے راشن کارڈ کو اپنے پاس رکھنے کا اختیار نہ ہوگا۔ بوگس راشن کارڈوں کے بنوانے یا استعمال کرنے یا ریکارڈ میں غلط اندراجات کرکے راشن کی دکان سے غلہ یا دوسری ضروری اشیاء حاصل کرنے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ اس طرح بیشکر ایجنسی کو منتقل کرنے یا ضمنی کرایہ پر دینے پر بھی پابندی لگا دی گئی ہے۔

کسی بھی شخص کو جعلی راشن کارڈ بنانے یا اسے استعمال کرنے میں مدد دینے والے ملازمین کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ اس حکم پر سختی کے ساتھ عمل درآمد کرنے کے پیش نظر حکومت سستے غلہ کی دکانوں میں اسٹاک وغیرہ کا معائنہ کرنے کے لیے متعدد عوامی نمائندوں کو بھی نامزد کرے گی۔

٭ ٭ ٭

ہندستانی آبادی پراجکٹ کے تحت سردست اتر پردیش کے چھ اضلاع میں نچلی سطح پر خاندانی منصوبہ بندی کے کام کے سلسلے میں ایک نیا انتظامی اطلاعات وجائزہ نظام شروع کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے لکھنؤ، پرتاپ گڑھ، سلطان پور، رائے بریلی سہارن پور اور مظفر نگر اضلاع کا انتخاب کیا گیا ہے۔

نئے نظام کے تحت جو آبادی مرکز اور اس کے مشاورتی ادارے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ، احمد آباد کے مرتب کردہ ہیں، خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق کارگزاریوں کو معقول بنایا جاتا ہے اور صحت، زچہ بچہ کی صحت اور خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق اعداد و شمار کو اور زیادہ باقاعدہ بنایا جاتا ہے۔

ان اضلاع میں نئے نظام کی وضاحت کرنے کے لیے متعلقہ

فیلڈ کارکنوں کے جلسے منعقد کیے جا رہے ہیں جن میں انھیں بتایا جاتا ہے کہ نئے نظام سے خاندانی منصوبہ بندی نیز زچہ بچہ کی صحت سے متعلق پروگرام کو اور زیادہ کامیاب بنانے میں بڑی مدد ملے گی۔

*

اتر پردیش کے چھوٹی صنعتوں کے کارپوریشن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ریاست کے ایسے چھوٹے صنعتی واحدوں سے جنھیں بجلی کی قلت کے سبب نقصان اٹھانا پڑا ہے، گذشتہ دو برسوں کے دوران واجب الادا قسطوں کی وصولیابی ملتوی کر دی جائے۔ یہ قسطیں سالانہ نوعیت کی ہیں اور اب ان کی وصولی مجموعی قرض کی آخری دو قسطوں کے طور پر کی جائے گی۔

امید کی جاتی ہے کہ اس فیصلے سے چھوٹے پیمانے کے تقریباً ۷۰ واحدوں کو فائدہ پہنچے گا۔ ان واحدوں پر مجموعی طور پر تقریباً ۱۱ لاکھ ۵۳ ہزار روپے کی رقم واجب الادا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مذکورہ کارپوریشن نے گذشتہ دس برسوں کے دوران ریاست میں تقریباً ... ۱۲ چھوٹے صنعتی واحدوں کو تقریباً ۴ کروڑ روپے کی مالیت کی مشینیں دی ہیں۔

*

دیہی علاقوں کو بجلی کی فراہمی سے متعلق ایک مقررہ مدتی پروگرام کے تحت آئندہ پانچ سال میں ضلع ٹہری کے نریندر نگر، جون پور، اور چھپا بلاکوں کے ۴۴ مواضعات کو بجلی مہیا کر دی جائے گی۔ کچھ قصبوں کو بجلی مہیا کرنے کے علاوہ اس علاقہ میں صنعتی استعمال کے لیے ۷۴ اور گھریلو استعمال کے لیے ۵۰۰ کنکشن دیے جائیں گے۔ اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ نے گذشتہ ۳ فروری میں دیہی بجلی فراہمی کارپوریشن کی منظوری حاصل ہو جانے کے بعد یہ پروگرام شروع کیا تھا۔

اس سلسلے میں کام جاری ہے اور ۷۰ کیلومیٹر ۱۱ کے وی لائنوں کی تعمیر مکمل ہو گئی ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ مارچ ۱۹۷۶ء تک ۱۶ مواضعات اور ۲۱ ہریجن بستیوں کو بجلی مہیا کر دی جائے گی۔ اس پروگرام پر تخمیناً ۸۰ لاکھ روپے کی لاگت آئے گی، جس میں ۲۰۱ کیلومیٹر مین اور ۵۰ر۵ کیلومیٹر اسپر ۱۱ کے وی لائنوں کی تعمیر شامل ہے۔

پروگرام کے تحت چھبا میں ۵-۱/ ایوی اے/ ۶۶/ ۱۱ کے وی کا ذیلی بجلی گھر قائم کر کے رانی چوری کے پہاڑی علاقہ اور نئے قصبہ چھبا کو بجلی کی فراہمی کا کام جون ۱۹۷۷ء تک مکمل ہو جائے گا۔ چھبا علاقہ کو بجلی فراہم کرنے کے لیے ۵۵ کیلومیٹر ۳۳ کے وی کی سری نگر چھبا لائن کی تعمیر کا کام دسمبر ۱۹۷۷ء تک مکمل ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ ٹہری کے علاقوں کو بجلی فراہم کرنے کے لیے دو فیڈر بھی تعمیر کیے جائیں گے۔ اس میں سے ایک فیڈر کی تعمیر مسوری ذیلی بجلی گھر اور دوسرے کی دہرہ دون میں لکشمی روڈ ذیلی بجلی گھر سے کی جائے گی۔

*

اتر پردیش کی نظامت باغبانی نے ایک پریس نوٹ کے ذریعہ ریاست میں آلو کی کاشت کرنے والوں پر زور دیا ہے کہ وہ آلو کی فصل کو جھلسا بیماری سے بچائیں کیونکہ یہ بیماری فصل کو شدید نقصان پہنچاتی ہے۔

پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ "ریاست میں آلو کاشت کاروں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ آلو کی فصل کو جھلسا بیماری سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کبھی کبھی اس بیماری کی شدت سے پوری فصل دو تین دن میں تباہ ہو جاتی ہے۔

زیادہ رطوبت، ابر آلود موسم اور ۵۰ سے ۷۰ ڈگری تک درجہ حرارت اس بیماری کے پھیلنے میں سازگار ہوتا ہے۔ اس بیماری میں پتیوں اور تنوں پر ہلکے ہرے رنگ کے دھبے نمودار ہوتے ہیں۔

اس بیماری کی مناسب روک تھام کے لیے کاشت کاروں کو اپنی آلو کی فصل پر زنک میگنیز کاربامیٹ ۲ کیلوگرام یا ۲ر۵۰ کیلوگرام یا کاپر آکسی کلورائڈ ۳ کیلوگرام کا چھڑکاؤ فی ہیکٹر

کے حساب سے احتیاطی تدبیر کے طور پر کرنا چاہیے۔ یہ چھڑکاؤ ۱۴-۱۲ دن کے وقفے سے بار بار کیا جانا چاہیے۔

❁ ❁ ❁

ریاستی حکومت نے سائنسی تعلیم کو مقبول بنانے کے لیے یونیسف سے بطور عطیہ حاصل کردہ کاغذ پر چھپی ہوئی درسی کتابیں کمزور طبقوں کے طلباء کو مفت فراہم کرنے کے لیے ۱۰۶۴۸۰۰ روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ تعلیمی سال ختم ہونے کے بعد یہ کتابیں طالب علموں سے واپس لے لی جائیں گی اور آئندہ تعلیمی سال کے طلباء کو فراہم کر دی جائیں گی۔ محکمۂ تعلیم کو ایسے طلباء کی فہرست جنھیں یہ کتابیں فراہم کی جاتی ہیں حکومت کو بھیجنے اور اس معیار کے بارے میں مطلع کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جس کی بنیاد پر یہ کتابیں فراہم کی جا رہی ہیں۔

اس رقم میں سے طلباء کو درسی کتابوں کی مفت فراہمی کے لیے ۹۴۶۷۷۶ روپیہ، کتابوں کا ذخیرہ رکھنے کے لیے ۵۳۰۰۰ روپیہ اور ۷۶-۱۹۷۵ء میں عطیہ کے کاغذ کو بندرگاہ سے لانے اور اس کی نگہداشت کے اخراجات کے لیے ۶۵۰۰۰ روپیہ منظور کیا گیا ہے۔

❁ ❁ ❁

ریاست میں گزشتہ ۱۵ نومبر تک بے زمین مزدوروں، اقوام و قبائل مندرجہ فہرست اور دیہی دست کاروں کے ۱۰۶۲۰۵۱ خاندانوں کو مکان تعمیر کرنے کے لیے زمین فراہم کی جا چکی ہے۔ ایسے تقریباً ۷۴۵۰۰ مزید خاندانوں کو زمین حاصل ہونے پر جس کے لیے کارروائی شروع کر دی گئی ہے مکانات کی تعمیر کے لیے زمین فراہم کی جائے گی۔

ریاست کے ۴۸ ضلعوں میں مکانات تعمیر کرنے کے لیے زمین کی تقسیم کا کام پورا ہو چکا ہے اور باقیماندہ اضلاع میں یہ کام جاری ہے۔ جن اضلاع میں مکانات تعمیر کرنے کے لیے زمین کی تقسیم کا کام مکمل ہو چکا ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔ بریلی، علی گڑھ، شاہ جہان پور، پیلی بھیت، فتح پور، باندہ، للت پور، جون پور، اعظم گڑھ، الموڑہ، گڑھوال، پتھورا گڑھ، چمولی، اتر کاشی، لکھنؤ، اناؤ، رائے بریلی، کھیری، گونڈہ، بہرائچ، پرتاب گڑھ، بارہ بنکی، نینی تال، جالون، سلطان پور، سیتا پور، ٹہری گڑھوال اور ایٹہ۔

❁ ❁ ❁

ریاستی حکومت نے دیگر پسماندہ طبقہ کے ان طالب علموں کو جو موجودہ تعلیمی سال میں پوسٹ میٹرک درجات میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، وظائف اور غیر مکرر مالی امداد دینے کی غرض سے مختلف اضلاع کو ۲ لاکھ ۲۹ ہزار روپے کی مالی امداد جاری کر دی ہے۔

اسی طرح تین آشرم طرز کے اسکولوں یعنی پرگتی آشرم بالا گنج لکھنؤ، ایشور سرن آشرم (وکاس ودیالیہ) الٰہ آباد اور آشرم ٹائپ اسکول، سہارن پور کی نگہداشت کے لیے ۱ لاکھ ۹۰ ہزار روپے کی عارضی امداد بھی منظور کی گئی ہے۔

❁ ❁ ❁

حکومت نے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور دوسرے مزدوروں کو سستا کھانا فراہم کرنے کے لیے ہوٹلوں کے قیام میں عورتوں کو شریک کرنے کی غرض سے ایک مزدور فلاحی خواتین کمیٹی تشکیل دی ہے۔ اس اسکیم کے لکھنؤ میں اس قسم کا ایک ہوٹل پہلے ہی قائم کیا جا چکا ہے۔

یہ کمیٹی ایسے ہوٹل کھولنے کی خواہشمند خاتون کارکنوں کو کم شرح سود پر قرضہ مہیا کرے گی۔ یہ ہوٹل کمیٹی کی براہ راست نگرانی میں چلیں گے۔ اس سلسلے میں درخواستیں ڈپٹی ڈائرکٹر (ہریجن فلاح)، نظامت ہریجن و سماجی فلاح، یو، پی، لکھنؤ کو بھیجی جانا چاہیے۔

❁ ❁ ❁

اتر پردیش چھوٹی صنعت کارپوریشن نے ہندستان ایرو ناٹکس لمیٹیڈ کے ساتھ ایک معاون صنعتی بستی کے قیام کے انتظام کو قطعی شکل دے دی ہے جو لکھنؤ میں اس کی فیکٹری کے

قریب قائم کی جائے گی اور ۱۰ واحدوں پر مشتمل ہوگی۔ یہ معاون واحدے اپنی تکمیل پر ہندستان ایرونانکس لمیٹیڈ کو ہوائی جہازوں کی تیاری کے سلسلہ میں درکار مختلف پرزے تیار کر کے فراہم کریں گے۔

مجوزہ صنعتی بستی کے لیے زمین کے حصول اور متعلقہ تفصیلی پراجکٹ کو قطعی شکل دینے سے متعلق کام شروع کیا جا چکا ہے۔ اس پراجکٹ پر مجموعی طور پر تخمیناً ۲۰ لاکھ روپیہ کی لاگت آئے گی۔ اور امید ہے کہ آئندہ سال کے آخر تک صنعتی بستی میں پیداواری کام شروع ہو جائے گا۔ توقع کی جاتی ہے کہ یہ صنعتی بستی ۱۵۰ دیگر افراد کے ساتھ ۱۶۵ انجینیروں اور ٹکنیشینوں کو روزگار فراہم کرے گی۔

⁂

ریاست میں زمین کی تقسیم کے کام میں ضلع اناؤ نے دوسرے اضلاع پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ اب تک ضلع بھر کے سبھی دس بلاکوں کے ۹۴۷ مواضعات میں ۱۶۸۱۳ بے زمین افراد کو ۱۱۷۲۳۔ ایکڑ زمین الاٹ کی جا چکی ہے۔ اس میں سے ۲۱۴۹ ایکڑ زمین اقوام مندرجہ فہرست کے ۴۸۵۲۰۔ افراد کو الاٹ کی گئی ہے۔ زمین کی تقسیم کا کام بچھا، اور اس ، بانگر مؤ سومبیر پور بیگھا پور اور پروا بلاکوں میں مکمل ہو گیا ہے جن میں سیلاب سے متاثرہ علاقے شامل نہیں ہیں۔ یاد ہوگا کہ ضلع میں زمین کی تقسیم کا کام ۱۵۔ اگست کو شروع کیا گیا تھا۔

مراسلہ:

محترمی تسلیم!

"نیا دور" آپ کی کامیاب ادارت میں بہت گراں قدر افادیت سے معمور مواد پیش کر رہا ہے۔ نومبر ۷۵ء کے شمارے میں کاظم علی خاں کا مضمون "غالب کی اردو مکتوب نگاری۔ آغاز و محرکات" بہت سیر حاصل مضمون ہے جو نہ صرف ان کی محنت بلکہ وسعت نظر اور ذوقِ جستجو کا بھی شاہد ہے۔ میں اس مبسوط مضمون پر مضمون نگار و مدیر دونوں کی جناب میں اپنا ہدیہ تہنیت نذر کرتا ہوں۔ مضمون نگار نے موضوع کا اتنا وسیع احاطہ کیا ہے کہ ہندوستان میں فارسی کے دفتری زبان کے روپ میں استعمال و رواج اور اردو نثر کی ارتقا پر بھی اچھے خاصے معنی خیز اشارے آگئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں دہلی کالج کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچائے گئے ہیں جو بجائے خود ایک مضمون کا موضوع بن سکتے تھے یقینی طور پر اس مضمون کا استعمال مختلف موضوعات پر کام کرنے والے ارباب علم، مصدر و ماخذ کی طرح کر سکیں گے۔ بلاشبہ زیر نظر مضمون "کثیر الحوالہ" مضامین میں محسوب ہوگا اس لیے بھی کہ مضمون نگار نے اپنے ہر دعوے کے استدلال میں حوالے دیے ہیں اور اس لیے بھی کہ اس مضمون کا حوالہ دوسرے اہل قلم بھی غالباً کثرت سے دیں گے۔

مگر دو باتیں ایسی ہیں جن کی طرف فاضل مضمون نگار کی توجہ دلانے کی جسارت کرتا ہوں۔

(۱) یہ کہ فاضل مضمون نگار نے حاشیہ ۵ صفحہ ۳۱ میں یہ کہا ہے "مفتی میر عباس رحمۃ اللہ کے نام غالب کے طویل مکتوب میں تاریخ کا تعین کسی نے نہیں کیا ہے۔" یہ نامکمل بات ہے مضمون نگار نے صفحہ ۲۹ کے حاشیہ ۳ میں 'تجلیات' معیر کا حوالہ دیا ہے۔ یہ خط بھی 'تجلیات' میں شایع ہوا ہے اور تاریخ تحریر خود غالب مرحوم کے قلم کی موجود ہے "شنبہ ۱۹ صفر المظفر ۱۲۸۹ھ [غالب]" ملاحظہ فرمائیں، صفحہ ۱۹۶ ج م۔ اس حساب سے یہ خط ۱۸۷۲ء یا ۱۸۷۳ء کا ہونا چاہیے مگر چونکہ مرزا غالب ۱۸۶۹ء میں رحلت فرما چکے تھے اس لیے یہ ماننا چاہیے کہ یہ خط ۱۲۷۹ھ کا ہے اور ۱۲۸۹ھ کتابت کی غلطی ہے۔ اس طرح یہ خط یقینی طور پر ۶۱ یا ۱۸۶۲ء کا ہے اسے ۱۸۶۴ء کی قریبی تاریخ کا ثابت کرنے میں وقت لگانے سے بہتر ہوگا کہ جناب مفتی علامہ کے وارث مولانا حمید الحسن صاحب سے اصل خط حاصل کر کے اس کا عکس شائع کر دیں۔ اور یہ کام جس آسانی سے کاظم علی خاں کر سکتے ہیں کسی دوسرے کے لیے ممکن نہ ہوگا۔

(۲) غالب نے فارسی میں مکتوب نگاری کی وجہ یہ بتائی ہے کہ "پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔" نادر خطوط غالب مرتبہ رسالہ ھمدم ۲ ای ص ۲۹ — اس حوالے کے بغیر کسی تحریر کو جامع و مانع نہیں کہا جا سکتا۔ اس مصدر کی طرف فاضل مضمون نگار کی توجہ مبذول کراتا ہوں۔

راقم
سبط محمد نقوی

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

شرح طباطبائی اور تنقید کلام غالب

سید مسعود حسن رضوی ادیب

اشاعت: سنہ ۱۹ء

ضخامت: ۱۰۰ صفحات۔ قیمت: چار روپے۔ ناشر: کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ۔

کاغذ، کتابت، طباعت اور گیٹ اپ کے اعتبار سے کتاب تسلی بخش ہے۔ متن کی صحت پر خاص اہتمام پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی دوسری کتابوں کی طرح یہاں بھی جلوہ گر نظر آتا ہے اور اس مختصر سی کتاب کی یہ وہ خوبی ہے جس سے بیشتر اردو کتب محروم نظر آتی ہیں۔

غالب کے اردو دیوان کی بہت سی شرحوں میں مولانا سید علی حیدر نظم طباطبائی کی شرح کو جو امتیاز حاصل ہے وہ شائقین کلام غالب کی نظر سے مخفی نہیں ہے۔ شرح طباطبائی میں کلام غالب کی تفسیر و تشریح کے دوش بدوش نظم طباطبائی کے مختصر مگر اہم تنقیدی بیانات بھی جا بجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں جن میں کوئی تنظیم و ترتیب نہیں ہے۔ نظم کے ان اہم و مفید مگر منتشر تنقیدی بیانات کو زیر تبصرہ کتاب میں جس حسن ترتیب و تنظیم کے ساتھ جمع کیا گیا ہے وہ فاضل مولف کی سلیقہ مندی کا مظہر ہے۔ شرح طباطبائی میں نظم کے جو تنقیدی بیانات کم و بیش ساڑھے تین سو صفحات میں بکھرے ہوئے تھے وہ زیر تبصرہ کتاب میں محاسن کلام اور معائب کلام کے دو ابواب میں مناسب عنوانات کے تحت اس خوبی سے جمع کر دیے گئے ہیں کہ اب قارئین ان سے پوری طرح مستفید ہو سکتے ہیں۔

متذکرہ بالا خصوصیات کے باعث زیر تبصرہ کتاب کی افادیت اہمیت یقیناً مسلم ہے مگر کتاب کی افادیت فاضل مولف کی سلیقہ مندی تک ہی محدود نہیں۔ اس کی مدد سے ہم مولانا نظم طباطبائی کے تنقیدی شعور کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔ اور یہ مطالعہ ایک شاعر، ناقد اور عالم کے تنقیدی شعور کا مطالعہ ہونے کے باعث بجائے خود اہم شے ثابت ہوگا مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم مولانا نظم کی رہنمائی میں کلام غالب کے محاسن و معائب سے بھی بخوبی متعارف و روشناس ہو سکتے ہیں۔ ان تمام خصوصیات کا کسی ایک کتاب میں جمع ہو جانا کتاب کی افادیت کا ضامن ہو جاتا ہے۔

کتاب کا پہلا باب نظم طباطبائی کے ان تنقیدی بیانات پر مشتمل ہے جن میں مندرجہ ذیل ایک درجن محاسن کلام غالب بیان کیے گئے ہیں:

(۱) لطافت و ندرت مضمون (۲) حسن ادا (۳) حسن بندش (۴) مناسبت الفاظ (۵) محاورات برمحل (۶) مصرعوں میں بندش کی یکسانی اور الفاظ کا توازن (۷) ندرت تشبیہ (۸) وجوہ بلاغت (۹) مختلف محاسن (۱۰) اچھے شعر (۱۱) حاصل زمین یا بیت الغزل اشعار (۱۲) بے نظیر اشعار۔

اس مختصر تبصرے میں مثالیں پیش کرنا بے محل ہوگا۔

کتاب کے دوسرے باب میں مولانا نظم طباطبائی کے وہ تمام تنقیدی بیانات جمع کیے گئے ہیں جن میں چھبیس اقسام کے معائب کلام غالب کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کتاب کا یہ باب نہ صرف شائقین کلام غالب بلکہ مخالفین غالب کے لیے بھی اپنے دامن میں خاص دلچسپی کا سامان وافر مقدار میں رکھتا ہے۔ کلام غالب کے کم و بیش دو درجن اقسام معائب کا بیان اس مختصر تبصرے میں ممکن نہیں۔ اس کے لیے زیر تبصرہ کتاب کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ ضروری نہیں کہ محاسن و معائب کلام غالب کے سلسلے میں مولانا نظم طباطبائی کے ہر بیان سے اتفاق کیا جائے مگر غالباً اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پیش نظر کتاب اپنے مفید مواد کے باعث خاصی اہم شے ہے اور ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی مستحق ہے۔

بیداری وطن

بالا کرشن گوپال مغموم۔ اشاعت اول: ۱۹۴۳ء

جسامت: ۲۲×۱۲ سنٹی میٹر۔ ضخامت: ۱۱۲ صفحات۔ قیمت: دس روپے۔ مطبوعہ: یونین پریس، دلی۔ ناشر اور ملنے کا پتا: پبلی کیشنز ۴۲۳۰۔ پرتاپ اسٹریٹ، گولا مارکیٹ، دریا گنج دلی۔ ۱۱۰۰۰۶

زیر تبصرہ کتاب بالا کرشن گوپال مغموم کی منظوم تخلیقات کا پہلا مجموعہ ہے۔ مغموم گزشتہ پینتیس سال سے رومانی، نیچرل اور قومی نظمیں لکھ رہے ہیں۔ وہ محروم اور منور لکھنوی کی شاگردی سے فیض یاب ہیں۔ مغموم کی منظوم تخلیقات ملک کے اہم ادبی رسائل میں شائع ہو کر ادب کے شائقین سے داد و تحسین وصول کرتی رہی ہیں۔ مغموم کا تعلق پنجاب کی اسی سرزمین سے ہے جہاں انیسویں صدی عیسوی میں محمد حسین آزاد اور حالی نے اردو شاعری کو جدید نظم کی جس نئی منزل سے روشناس کرایا تھا، مغموم نے اپنے تخلیقی سفر میں نظم کی اسی منزل کو پیش نظر رکھا۔ مسلسل و مربوط منظومات مغموم کی مرغوب صنف سخن معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ زیادہ تر ایسے شاعروں سے ہی متاثر رہے ہیں جن کی متاع سخن میں مسلسل و مربوط نظموں کو اہمیت حاصل ہے اور جن میں سرور جہان آبادی، محروم، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، چکبست اور اقبال وغیرہ شامل ہیں۔

بیداری وطن میں مغموم کی ۳۰ مسلسل نظمیں۔ دس متفرق رباعیاں، شہید قوم لاجپت رائے پر سات رباعیاں اور چند متفرق اشعار شامل ہیں۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں مغموم کی شاعری پر تلوک چند محروم کی رائے، شری جگ جیون رام کا پیغام، اپنے قلم سے شاعر کا مختصر تعارف، مجموعے پر ڈاکٹر منوہر سہائے انور کی رائے اور عرش ملسیانی کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ ان تعارفی تحریروں میں مغموم کی حیات اور شاعری کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بیداری وطن میں شامل مغموم کی کم و بیش تمام منظومات بہ لحاظ موضوع و مواد "قومی شاعری" سے تعلق رکھتی ہیں۔ قومی شاعری اردو کے لیے کوئی نئی یا اجنبی شے نہیں۔ اردو میں قومی شاعری کی روایت نہ صرف خاصی قدیم بلکہ تعداد و معیار کے اعتبار سے بھی نہایت متاثر کن رہی ہے۔ اردو میں قومی شاعری کی اس قدیم و وقیع روایت کے تابناک نقوش علی جواد زیدی کی مرتب کی ہوئی کتاب اردو میں قومی شاعری کے سو سال میں بھرپور طور پر جلوہ گر نظر آتے ہیں جو محکمۂ اطلاعات اتر پردیش کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔ مغموم کا زیر تبصرہ نیا مجموعہ شاعری بھی اسی شاندار روایت کا ایک اچھا

نمونہ ہے اردو میں قومی شاعری کے موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لئے اس کتاب میں دلچسپ اور کار آمد مواد ملے گا۔

مجموعے میں شامل ایک نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

وہ جن کو راستہ دیتی ہے دریاؤں کی طغیانی!
جو طے کرتے ہیں ہر دشوار منزل کو بآسانی
ہلا دیتی ہے کہسادوں کا دل جن کی رجز خوانی
میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں
(میں ان کے گیت گاتا ہوں)

مقوم کے چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:-

بے اعتمادیوں کی شب تیرہ فام میں — عزم و یقیں کی شمع جلائے ہوئے ہیں ہم
اگر شریک چمن ہو نہ باغباں کا لہو — ہر ایک پھول ترس جائے زندگی کیلئے
زندگی موت کی سرحد سے ملا رکھی ہے — حد سے بڑھتی ہوئی انسان کی دانائی نے
جہاں وطن کے شہیدوں کا خون ٹپکا تھا — وہیں پہ لوٹ کے فصل بہار آئی ہے

مجموعے میں ایسے نمونوں کی بھی کمی نہیں جن پر نظر جم جاتی ہے اور قلب و ذہن کو حرارت اور روشنی ملتی۔ ہے کہیں کہیں سپاٹ اور بے لطف اشعار بھی ملتے ہیں جن کو سرسری طور پر دیکھا جا سکتا ہے مگر نشیب و فراز کہاں نہیں ہوتے اور ان سے کون بچ سکا ہے۔

کتاب کا گٹ اپ، کاغذ، رنگین گرد پوش، جلد تسلی بخش ہے، کہیں، کہیں کتابت کی ناہمواری بھلی بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن مجموعی اعتبار سے کتاب مطالعے کے قابل ہے اور امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھا جائے گا۔

— کاظم علی خاں

نام کتاب: چاند تاروں کی دنیا۔ مصنف: مرزا احسن ناصر۔
تقطیع: ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت: ۶۴ صفحات۔ قیمت: تین روپیہ۔
شائع کردہ: اردو پبلشرز۔ ۸ تلک مارگ۔ لکھنؤ

اردو زبان و ادب میں تمام تر ہمہ گیریوں کے باوصف آج بھی بہت سے شعبوں اور خصوصیت کے ساتھ سائنسی معلومات سے متعلق تصنیفات کی شدت سے کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ تحقیق و جستجو کے اس دور میں جب انسان چاند کی سطح پر اپنے نقش قدم چھوڑ چکا ہے ہر شخص خلائے بسیط کے سربستہ رازوں کو جاننے کا خواہاں نظر آتا ہے۔ مرزا احسن ناصر نے اپنی کتاب "چاند تاروں کی دنیا" کی تخلیق کے بعد یہ کمی بڑی حد تک پوری کر دی ہے۔

آزاد نظم کے انداز میں ۶۴ صفحات پر پھیلی ہوئی اس کتاب میں بہت ہی دلکش انداز سے خلا اور فلکی ماحول پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہکشاں، آفتاب اور آفتاب کا طواف کرنے والے سیارے، ماہتاب، شہاب ثاقب کے علاوہ نظام فلکی میں نظر آنے اور نہ آنے والے دلچسپ حقائق کو مرزا احسن ناصر صاحب نے اتنے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ہر اردو داں نظام فلکی سے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

اس کتاب میں فلکی نظام سے متعلق قدیم و جدید تحقیقات کے ساتھ ساتھ علم ہیئت کی معلومات سے بھی بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ کہکشاں اور نظام شمسی کے علاوہ عطارد، زہرہ، کرۂ ارض، ماہتاب، مریخ، مشتری، زحل، یورینس، نیپچون، پلوٹو، ریشٹرائڈ اور ایسے دوسرے نظام شمسی کا علاحدہ علاحدہ بالتفصیل تذکرہ ایک عام آدمی کو بھی فلکیات سے متعلق اچھی خاصی معلومات فراہم کرتا ہے۔

زہرہ ایک مشہور سیارہ ہے جو جسامت کے اعتبار سے ہماری زمین سے کچھ ہی کم ہے۔ مصنف نے اس سیارے کے بارے میں مختصر الفاظ میں جو معلومات پیش کی ہیں ان کا مندرجہ ذیل اقتباس مثال کے بطور پیش خدمت ہے۔

زہرہ، زمیں سے چھوٹا ہے ذرا سا ہی
مگر بناوٹ میں اس کی فرق ہے کافی
کرۂ باد میں اس کے، جو بہت گھنا اور بھاری ہے
آکسیجن بہت تھوڑی ہے
نمی ہے نام کو ہی
افراط کاربن ڈائی آکسائڈ کی،
اور بھری ہوئی ہے ریت سے سطح اس کی
وہاں پڑتی ہے اتنی گرمی
نہیں ممکن کسی طرح کی زندگی

لفظوں کے کینوس پر نظام فلکی کی تصویر کشی کرنے اور سیر گاہ مہ و انجم کی اک اک تفصیل سے گزرنے کے بعد وہ خلا پر انسان کی بالادستی کے بارے میں اس حد تک پر امید ہیں۔

آج انسان پہنچ کر چاند پر
چہل قدمی کر چکا ہے۔ خلا میں جی بھر کر تیر چکا ہے
ہزاروں مصنوعی چاند زمین کے گرد چھوڑ چکا ہے
اور بھیج چکا ہے خلائی طیارے
نظام شمسی کے کئی سیاروں پر دوسرے
اور اب تو کر رہا ہے تیاریاں وہ
بذات خود دوسرے سیاروں پر جانے کی
جس کے بعد شاید فتح کرے گا وہ
کئی دوسرے بھی نظام شمسی

کتاب کے آخر میں ایک چارٹ بھی شامل ہے جس میں ہر سیارے کی آفتاب کی دوری، قطر، وزن، اوسط کثافت، آفتاب کے گرد گردش کرنے کی رفتار، مدت اپنے محور پر گردش کی مدت اور ماہتابوں کی تعداد بھی دی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ چاند تاروں کی دنیا ایک ایسی گراں قدر تخلیق ہے جو اردو داں طبقے میں یقیناً مستحسن نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

— ساحر لکھنوی



اترپردیش

کے نئے وزیر اعلا

شری نرائن دت تیواری

تیرہ سال کی عمر میں ہی بلیوتی گاؤں کا رہنے والا نرائن انگریزی حکومت کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ بلیوتی اور اس کے آس پاس کے مواضعات کے ہزاروں لوگ اس نوعمر لڑکے سے متاثر ہو کر ہندستان کی جنگ آزادی میں شامل ہو گئے تھے۔ نوعمر نرائن کو وطن سے گہری محبت و عقیدت اپنے والد شری پورنانند تیواری سے ورثہ میں ملی تھی۔

شری نرائن دت تیواری ۱۸ر اکتوبر ۱۹۲۵ء کو ضلع نینی تال کے بلیوتی گاؤں میں ایک معمولی کسان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد شری پورنانند تیواری ایک زبردست محب وطن تھے۔ ان کی سرپرستی میں شری تیواری نے بچپن ہی سے آزادی کی لڑائی میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔

سن بیالیس کے اندولن میں باپ اور بیٹے نے کھل کر حصہ لیا اور انگریزی حکومت کے لیے زبردست مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ انگریزوں نے دونوں کو گرفتار کر کے الگ الگ جیلوں میں بند کر دیا تھا۔

آزادی کی جو چنگاری شری تیواری کے دل میں روشن ہوئی تھی جیل میں، شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ رہا ہونے پر انھوں نے اپنی پوری زندگی ملک کی خدمت کے لیے وقف کر دینے کا فیصلہ کیا اور حصول تعلیم کے لیے الہ آباد آ گئے۔

الہ آباد میں شری تیواری نے یونی ورسٹی میں داخلہ لیا اور جلد ہی ایک ذہین اور لائق طالب علم کی حیثیت سے ان کی شہرت پھیلنے لگی۔ انھوں نے پولٹیکل سائنس میں ایم۔ اے کا امتحان نہ صرف فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا بلکہ سب میں اوّل بھی رہے۔ ایل۔ ایل۔ بی میں بھی انھوں

نے داخلہ لیا اور پہلا سال فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ تعلیمی مشغلے کے ساتھ ساتھ الہ آباد میں شری تیواری سیاسیات میں بھی سرگرم حصہ لیتے رہے۔ وہ یونی ورسٹی یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کی رہنمائی میں پردیش کی طالب علم تحریک کو متعدد کامیابیاں حاصل ہوئیں اور اس تحریک میں قابل ذکر توسیع و ترقی ہوئی۔ الہ آباد ہی میں شری تیواری اعلا پایہ کے طالب علم لیڈر کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آئے اور انھیں ملک کے عظیم رہنماؤں کا آشیرواد ملا۔

تعلیم سے فارغ ہو کر سماج وادی دل کے رکن کی حیثیت سے اپنے گاؤں واپس آگئے۔ اور پورے طور سے سیاسیات میں داخل ہو گئے۔ شروع ہی سے سماج وادیوں کا پختہ یقین تھا یہی وجہ ہے کہ کسانوں اور مزدوروں کا مفاد ان کو سب سے پیارا تھا۔ کسانوں اور مزدوروں کے مفاد کا کوئی ایسا کام نہیں تھا جس سے شری تیواری کسی نہ کسی شکل میں متعلق نہ رہے ہوں۔

شری تیواری ۱۹۵۲ء میں نینی تال سے ودھان سبھا کے پہلی بار ممبر منتخب ہوئے۔ ان کی شادی ڈاکٹر سوشیلا تیواری سے ۱۹۵۴ء میں ہوئی اور ۱۹۵۷ء میں وہ دوبارہ نینی تال سے ودھان سبھا کے لیے ممبر منتخب کیے گئے۔

شری تیواری ۴۵ ملکوں کا دورہ کر چکے ہیں۔ وہ ان سائنسی اور کلچرل ترقیوں سے بخوبی واقف ہیں جو باہر کے ملکوں میں ہو رہی ہیں۔ وہ ۱۹۵۹ء میں پہلی بار برٹش مزدور دل کی دعوت پر لندن گئے تھے۔ وہاں سے وہ برابر مختلف موضوعات پر اپنے مضامین ہندستانی اخبارات کو بھیجتے رہے جو بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے۔

شری تیواری کے کانگریس میں شامل ہونے کے بعد سے مرکزی لیڈران کی قابلیت اور لگن کے قائل ہو گئے۔ کل ہند یوتھ کانگریس کی اس وقت کی صدر شریمتی اندرا گاندھی نے شری تیواری کو یوتھ کانگریس کا کنوینر منتخب کیا اور اس عہدے پر وہ ۱۹۵۹ء تک کام کرتے رہے۔ وزیر اعلا شریمتی سوچیتا کرپلانی نے ریاستی رورل ڈیولپمنٹ بورڈ کا نائب صدر بھی بنایا۔

شری تیواری ۱۹۵۹ء میں کاشی پور سے ودھان سبھا کے ممبر منتخب ہوئے اور شری چندر بھان گپت وزارت میں منصوبہ بندی لیبر اور پنچایت راج کے وزیر مقرر ہوئے۔ کانگریس کی تقسیم کے وقت گپتا وزارت سے استعفا دینے والے پہلے وزیر شری تیواری تھے۔ ۱۹۷۰ء میں قائم ہونے والی کانگریس اور بھارتیہ کرانتی دل کی متحدہ حکومت میں شری تیواری کو مالیات اور پارلیمنٹری امور کے محکمے سونپے گئے۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں شری کملا پتی ترپاٹھی کی وزارت میں مالیات اور پارلیمنٹری امور کے علاوہ انھیں آبکاری اور بجلی کے محکمے بھی سپرد کیے گئے۔ ۱۹۷۳ء میں وزارت میں شامل ہوئے پر شری تیواری کو مالیات، پارلیمنٹری امور، بھاری صنعتوں، شکر ملوں اور گنا ترقی کے محکمے دیے گئے۔ ۱۹۷۴ء میں وہ پھر کاشی پور سے ودھان سبھا کے لیے منتخب ہوئے۔

شری تیواری ۱۹۶۹ء ہی سے کانگریس کے چیف وہپ کی حیثیت سے اہم رول ادا کرتے رہے ہیں۔ ان کا شمار اعلا پایہ کے پارلیمینٹیرین میں ہوتا ہے۔ پارلیمنٹری امور کا انھیں نہ صرف وسیع علم و تجربہ ہے بلکہ اس میں انھوں نے کچھ قابل ذکر سدھار کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ شری تیواری مختلف ریاستی کمیٹیوں کے صدر بھی رہ چکے ہیں جس میں پبلک اکاؤنٹس خاص ہے۔ ریاست کی صنعت کاری کے لیے انھوں نے متعدد اہم قدم اٹھائے ہیں۔ مالیہ [illegible] اور سماجی [illegible] مالیات کے میدانوں میں بھی ان کی خدمات کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شری تیواری کے سپرد جو محکمے رہے ہیں انھیں انھوں نے [illegible]

شری تیواری کو پردیش کے مسائل اور عوام کی مشکلات کا بخوبی علم ہے اور وہ ہر لمحہ ان کے حل کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ [illegible] اور [illegible] ہیں لیکن محنتی اور کام کے سلسلے میں سخت ہیں۔ ڈسپلن ان کی زندگی کا جز بن گیا ہے اور وہ کسی بھی میدان میں ڈھلائی یا لاپروائی برداشت نہیں کرتے۔

★

عنوانات

(نوٹ) اس شمارے کو فروری کا شمارہ تصور کیا جائے۔ اسکے بعد مارچ کا شمارہ شائع ہوگا

جلد ۳۱ نمبر ۱۱

۲۶ جنوری ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: روی موہن سیٹھی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی
مطبوعہ گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

سرورق: قیصر سرمست

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن برانچ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

آزاد ہندستان کی تاریخ میں ۲۶ جنوری کو جو یوم جمہوریہ کے نام سے موسوم ہے، زبردست اہمیت حاصل ہے۔ یوم آزادی کے بعد یہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا قومی تہوار ہے۔ یہ وہ مبارک دن ہے جب ہندستان کو انڈین ری پبلک یا جمہوریہ ہند قرار دیا گیا اور اس روز ملک میں ایک ایسا دستور نافذ کیا گیا جس کے تحت بلا لحاظ مذہب و ملت ملک کے ہر شہری کو مساوی حقوق دینے کے ساتھ ساتھ ان کو تحریر و تقریر اور تنظیم کی پوری آزادی دی گئی۔ لیکن ادھر کچھ عرصے سے ملک میں رجعت پسندوں، مفاد پرستوں اور فسطائی طاقتوں کی مدد سے مخالف پارٹیاں اس آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر معاشی نظام کو درہم برہم کرنے کے منصوبے کو پورا کرنے میں مشغول تھیں۔ انھوں نے ملک میں انتشار اور بدامنی کی فضا پیدا کر دی تھی۔ لطف یہ کہ یہ کارروائیاں جمہوریت کے نام پر کی جا رہی تھیں۔ حالات یہاں تک بگڑ گئے تھے کہ اگر صدر جمہوریہ نے ۲۶ جون کو ملک میں ایمرجنسی کا اعلان نہ کر دیا ہوتا تو ملک کی آزادی اور جمہوریت ہی خطرے میں پڑ گئی ہوتی۔ یہ ہمارے ملک کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو شریمتی اندرا گاندھی جیسی بیدار مغز اور دور اندیش وزیر اعظم کی قیادت نصیب ہے جنھوں نے بروقت جرأت مندانہ قدم اٹھا کر ملک کو سنگین خطرات سے بچا لیا ہے۔ یہ خطرات اب بھی پورے طور پر دور نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن ہماری محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بقول "دنیا کی کوئی طاقت انفرادی یا اجتماعی طور سے ہندستان کو اس راستے سے ہٹا نہیں سکتی جو اس نے اپنے لیے چن لیا ہے۔" اسی لیے ملک میں ایمرجنسی کا اس وقت تک برقرار رہنا ضروری ہے جب تک ملک اندرونی خطرات سے پوری طرح محفوظ و ضبط نظم اور امن قانون کی صورت حال پورے طور پر مستحکم نہیں ہو جاتی۔ ملک کے عوام نے ایمرجنسی کا خیر مقدم اس لیے کیا ہے کہ اس سے نہ صرف قیمتیں گرنے لگی ہیں بلکہ افراط زر پر بھی قابو پا لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اسمگلروں، چور بازاری کرنے والوں، معاشی مجرموں اور سماج دشمن عناصر کا بھی بڑی حد تک قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کے نتیجے میں سماج کے کمزور طبقوں کو برابر راحت ملتی جا رہی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ شریمتی اندرا گاندھی کے دس سالہ وزارت عظمیٰ کے دور میں ملک نے اقتصادی، صنعتی، زرعی، سائنسی غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں ترقی کی ہے۔ اس عرصے میں ہندستان نے شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں ایسے ایسے جرأت مندانہ اور انقلابی قدم اٹھائے ہیں جن کے سبب نہ صرف ملک کی معیشت مستحکم ہوتی جا رہی ہے بلکہ ہندستان کا سر اقوام عالم میں بہت بلند ہو گیا ہے۔ آیئے چھبیس (۲۶) جنوری کے اس مبارک موقع پر ہم از سر نو عہد کریں کہ ملک کی جمہوریت کی بقا اور استحکام کے لیے ہم جمہوریت دشمن عناصر اور فسطائی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا ہر ممکن طریقے سے مقابلہ کریں گے، انھیں اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہ ہونے دیں گے اور وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔

چسنالہ کان حادثہ

بہار میں دھنباد کے قریب چسنالہ کوئلہ کی کان میں جو دردناک حادثہ ہوا وہ کانوں کی تاریخ کا غالباً بدترین حادثہ ہے۔ یہ المیہ ۲۷ دسمبر کو دن میں ایک بج کر ۳۵ منٹ پر پیش آیا۔ کہا جاتا ہے کہ کان کے اندر ایک دوسری بیکار کوئلہ کی کان میں بھرا ہوا پانی کوئلہ کی ۸۰ فیٹ چوڑی دیوار کو توڑ کر چسنالہ کی اس بدقسمت کان میں داخل ہو گیا اور سات سے دس منٹ کے اندر چسنالہ کان کے دو حصے ۱۱ کروڑ گیلن پانی سے بھر گئے۔ المیہ اتنا اچانک اور بڑا تھا کہ سارے مزدور اور حکام دو دن تک اپنے اوپر قابو نہ پا سکے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے حادثہ کے وقت کان کے اندر ۳۷۵ کان کن موجود تھے۔ موجودہ حالات میں کان میں پھنسے ہوئے کسی کے زندہ اور صحیح سلامت بچنے کی امید نظر نہیں آتی۔ پانی نکالنے کی رفتار تیز کرنے کے لیے غیر ملکی طاقت ور پمپ بھی منگا لیے گئے ہیں جو لگاتار کام کر رہے ہیں۔ حکومت نے اس حادثہ کی جانچ کے لیے ایک کمیشن مقرر کر دیا ہے۔ متاثرہ افراد کے اعزا و متعلقین کو ہر ممکن امداد بہم پہنچانے کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ اس امداد میں عارضی اور مستقل امداد کے اقدامات بھی زیر غور ہیں۔

اتر پردیش کے نئے وزیر اعلا

سابق وزیر اعلا شری ہیم وتی نندن بہوگنا کے استعفے کے بعد پردیش میں چوتھی بار صدر راج کا قیام عمل میں آیا۔ صدر راج کا قیام اس لیے ضروری ہو گیا تھا کہ فوری طور پر قیادت کا مسئلہ طے نہیں ہو سکا تھا۔ اب یو پی کانگریس لیجس لیچر پارٹی کی قیادت کے لیے شری نرائن دت تیواری کا انتخاب ہوا ہے۔ شری تیواری وزارت کا طویل تجربہ رکھتے ہیں۔ سابقہ حکومت میں بھی آپ کے پاس وزیر مالیات کا اہم قلمدان تھا۔ ادارہ نیا دور یو۔ پی کی قیادت کے لیے انتخاب پر شری تیواری کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ ان سطور کے لکھنے کے وقت تک کی اطلاع کے مطابق نئی وزارت ۲۱ جنوری کو حلف لے رہی ہے۔ آئندہ شمارے میں پوری کابینہ کے اراکین اور ان کے قلمدانوں کی فہرست پیش کی جائے گی۔

——— ایڈیٹر

جمیل مہدی

جمہوریت اور جمہوری ادارے

ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے جمہوری اصولوں کی ترویج و تشریح اور تشکیل و نفوذ کا رجحان عہدِ جدید کی خصوصیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور فرد کی آزادی کے بنیادی حق کو اولیت دینے والی انسانی آبادی کی ایک کثیر تعداد اسی نظام کے اندر اپنی دنیاوی اور روحانی تسکین کا سامان موجود پاتی ہے۔ کمانڈروں کے عہد کے بعد شاہیت اور شاہیت کے بعد جمہوری نظام سے زیادہ مقبول کوئی طرزِ حکومت اب تک سامنے نہیں آسکا ہے۔ جمہوری طرزِ حکومت کی مقبولیت اور آج کی دنیا کے ذہن پر اس کے اثر و نفوذ کا یہ عالم ہے کہ سخت ترین آمرانہ طرزِ حکومت کے علمبردار ملک بھی اپنے آپ کو جمہوری نظام سے وابستہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور اس کی تشریح اور جواز کے لیے طرح طرح کے انداز اختیار کرتے ہیں۔ پابند شہری آزادی کی حامی حکومتوں اور آمرانہ طرزِ حکومت کے علمبردار ملکوں کے سربراہ بھی اپنے ملکوں اور اپنی حکومتوں کے تعارف کے لیے بنیادی جمہوریت، عوامی جمہوریت اور علاقائی ناموں سے موسوم جمہوریتوں کی اضافی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں اور یہ اس بات کا پکا ثبوت ہے کہ جمہوری نظام سے معتبر کوئی دوسرا سیاسی نظام اس وقت تک اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔

کرامویل کے دور سے لے کر جس میں انگلستان کے اندر نمونہ کی جمہوریت قائم ہوئی نکسن کے اس عہد تک جس میں دنیا کے سب سے طاقتور اور با اختیار سربراہ حکومت کو جمہوری نظام کی قوت کے سامنے سپر ڈالنی پڑی، دو بڑے عہد آفریں واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ انقلاب فرانس اور دوسرا امریکی اعلان آزادی کے نام سے موسوم ہے۔ انگلستان میں میگنا چارٹر کے شاہی فرمان کے بعد جس نے کرامویل کو جدید جمہوریت کے بانی کی حیثیت سے روشناس کیا، جمہوریت کی تاریخ میں بڑے نام روسو والٹیر، جارج واشنگٹن اور جیفرسن کے ہیں، اور آج کی دنیا میں جہاں کہیں بھی جمہوری نظام ایک سیاسی طرزِ حکومت کی حیثیت سے رائج ہے۔ اس پر ان ہی لوگوں کے خیالات اور افکار کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ تاریخی اعتبار سے جمہوری نظام کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے تاہم تین سو برس کی یہ مدت نظر انداز نہیں کی جا سکتی جس میں جمہوری نظام نے اپنی دلکشی اور قوت کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ رفتہ رفتہ اتنی وسعت اختیار کر لی ہے کہ آج عالمی حکومت کا تصور اسی کی بنیاد پر عام ہوتا جا رہا ہے۔ اگرچہ جمہوری نظام کی تعبیر و تشریح کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے جاتے ہیں تاہم اس کے بنیادی عناصر میں — فرد کی آزادی، ریاست کی حدود میں ہر شہری کے ساتھ یکساں سلوک کی ضمانت، مساوی انصاف اور سماج کی تشکیل میں ہر فرد کے یکساں حصہ اور مساوی سطح پر شمولیت کے اصول متفقہ طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جمہوریت کے ان خصائص کو امریکی صدر ابراہام لنکن نے "عوام کے لیے عوامی حکومت عوام کے ذریعے" کے مشہور مقولے میں بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا تھا۔

یہ تو جمہوریت کی وہ تشریح ہے جو اس وقت ساری دنیا کے جمہوری ملکوں میں مقبول اور رواج پذیر دیکھی جا سکتی ہے، لیکن اسے ابھی تک مکمل نہیں کہا جا سکتا اور اس میں اضافے کی ضرورت اور اس ضرورت کا احساس روز بروز بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ عہد جدید کے وہ دانشور جو بنی نوع

انسان کی ضرورتوں اور انسانی ذہن کے فطری میلانات کا گہرا شعور رکھتے ہیں اس بات سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں کہ جمہوری نظام نے صرف حکومت کو اپنا نشانہ اور مرکز بنا رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جمہوریت ایک طرزِ زندگی کے بجائے اگر محض ایک طرزِ حکومت کی شکل میں محدود ہوتی چلی جائے گی تو انسانوں کی روحانی اور ذہنی تشنگی اپنی تسکین کے لیے دوسرے سہارے تلاش کرنے پر مجبور ہوگی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر جمہوریت کو حقیقی معنوں میں ایک طرزِ فکر کے طور پر انسانوں میں مقبول نہ بنایا جا سکا تو اس کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ جن فلسفیوں اور مفکروں نے جمہوری نظام کی احیاءِ جدید سے ہزاروں سال پہلے اس کے تصور کو پیدا کیا تھا ان کے نزدیک جمہوریت کی طرزِ حکومت کی شکل میں ایک ثانوی حیثیت تھی۔ مثال کے طور پر قدیم یونان کے مفکرین جن کی دو حریف ریاستوں اسپارٹا اور ایتھنز میں جمہوری طرزِ فکر نے سب سے پہلے جنم لیا، جمہوریت کی تشریح بالکل دوسرے انداز میں کرتے تھے، افلاطون اور ارسطو، سقراط اور وہ ڈیموکریٹس جن کے نام پر ڈیموکریسی کا فلسفہ پہلے پہل مدون کیا گیا، جمہوریت کی بنیاد عقلیت پر رکھتے تھے اور اسے حکومت کے بجائے سماج کی تشکیل اور سدھار کے ایک ذریعہ کے بطور استعمال کرنے پر زور دیتے تھے، اگرچہ اس زمانہ میں مساوی سطح پر مساوی انصاف اور مساوی سلوک کے بجائے معاشی مساوات کی بنا پر مساوی سلوک کا اصول وضع کیا گیا تھا لیکن اس کی بنیاد بے انصافی کے بجائے اس سماجی اصول پر تھی جو اس زمانے میں پایا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں غلامی کا رواج اتنا عام تھا اور زندگی کے لازمی ضروریات میں اس حد تک شامل تھا کہ وہ جمہوریت کے تصور میں غلاموں کی جگہ متعین کرنے سے مجبور تھے، ایسے افراد کو سماج میں شامل کرنے اور اس کی تشکیل میں حصہ دار بنانے کا کوئی مطلب ہی نہ تھا جو نہ اپنی مرضی کے مختار تھے نہ تعلیمی اور سماجی اعتبار سے اس قابل تھے کہ ریاست کی تشکیل جیسے نازک کام میں کوئی حصہ لے سکیں۔ پھر ایسے ماحول میں کہ گہرے سوچ بچار اور منطقی بحث و مناظرہ اور نکتہ آفرینی کے بغیر کوئی مقدمہ چاہے دونوں سے تعلق رکھتا ہو یا ریاست سے، یا سماج سے طے نہ ہو سکتا ہو غلاموں کو یکساں سطح پر لانے اور دیکھنے کی کوشش کتنی لایعنی اور غیر منطقی ہو سکتی تھی اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں، طبقۂ شرفا کی جمہوریت کے پیچھے دراصل یہی مجبوری تھی، جسے بعد کے سہل پسند نقادوں نے رجعت پسندی اور طبقہ داری استحصال کی حامی قوتوں کے گٹھ جوڑ سے تعبیر کیا اس کے برعکس حقیقت یہ تھی کہ اس دور کے یونانی فلسفی جمہوریت کے مفسروں کی حیثیت سے غلامی کے رواج کے خلاف نظر آتے ہیں اور اس حد تک جانے پر تیار دکھائی دیتے ہیں کہ پوری قوت کے ساتھ غلامی کے خاتمے کے حق میں آواز بلند کی جائے۔

البتہ وہ اس بات کے حق میں دکھائی دیتے ہیں کہ جمہوری نظام کا نفاذ ذہنی پختگی، گہرے شعور، غور و فکر اور دانش و حکمت کے بغیر صحیح معنوں میں نہیں کیا جا سکتا، وہ کھلے طور پر اس خیال کی تبلیغ کرتے ہیں کہ جو لوگ صحیح معنوں میں روحانی مطالبوں، غیر جذباتی دلائل اور شعوری تقاضوں کی ماہیت کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے انھیں ریاست اور سماج کی تشکیل کی ذمہ داریوں سے الگ رکھنا چاہیے، ایسے لوگوں کو جو پختہ شعور اور ذہنی بالیدگی کے مالک نہ ہوں وہ عوام الناس کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں، قدیم یونان کے مفکروں کے اندازِ نظر کی اس تشریح کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم ان کے خیالات سے متفق ہوں اور ان کے بنائے ہوئے قالب پر جدید جمہوریت کو ڈھالنے کی کوشش کریں، ان کی سب سے بڑی دین اس سلسلے میں یہ ہے کہ انھوں نے ہزاروں سال پہلے سیاسی نظام میں سماجی مساوات کے لیے معاشی مساوات کو شرط قرار دیا تھا اور یہ وہ ضرورت ہے جس کی اہمیت جدید جمہوری نظام کے دائرہ میں تین صدیوں کے بعد اب کہیں جا کر تسلیم کی گئی ہے۔ جمہوریت کو ایک طرزِ حکومت کے بجائے طرزِ حیات اور طرزِ فکر کے بطور قبول کرنے کا رجحان تو اب تک بھی عام نہیں ہو سکا لیکن اطمینان بخش بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کے وسط میں، کتنے ہی ملکوں اور خطوں میں جمہوریت کی ناکامی کی بدولت اس ضرورت کی طرف توجہ کی گئی ہے اور خود ہمارے ملک میں جہاں پچھلے دنوں عوامی ذہن کی ناپختگی نے ایک خطرناک صورت پیدا کر دی تھی، جمہوری شعور اور جمہوری مذاق کی عدم موجودگی تشویشناک سمجھی جانے لگی ہے اور قومی سطح پر عوامی تربیت کا رجحان نکل کر سامنے آگیا ہے۔

موجودہ ترقی یافتہ جمہوری نظام کے دائرے میں جو عمارت مبنی ہے وہ چار ستونوں پر قائم ہوتی ہے، یہ چار ستون جمہوریت کے اجزائے لازم کی حیثیت سے ساری دنیا میں تسلیم کیے جاتے ہیں، ان ستونوں کی تقسیم

اس طرح کی جاتی ہے۔ (۱) لیجس لیچر (قانون ساز ادارے)
(۲) ایگزیکٹیو (انتظامیہ) (۳) جوڈیشری (عدلیہ)
(۴) پبلک اوپی نین (رائے عامہ)

اگر قانون ساز اداروں کو دو لازمی حصوں۔ حکمراں اور اپوزیشن جماعت۔ کی حیثیت میں تسلیم کیا جائے تو ان اجزا کی تعداد چار کے بجائے پانچ ہو جاتی ہے جن کے بغیر ماڈرن جمہوریت کا تصور مکمل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے جمہوری ملکوں میں اخبارات کو چوتھی اسٹیٹ کے نام سے اسی لیے موسوم کیا جاتا ہے کہ وہ رائے عامہ پر فیصلہ کن حد تک اثر و رسوخ کے مالک ہوتے ہیں اور اسے حسب منشا بنانے یا بگاڑنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

مذکورہ ناگزیر عناصر کی اہمیت ان کی تقسیم سے ظاہر ہے کہ پہلا نمبر لیجس لیچر یا قانون ساز ادارے کا ہے، جو حکمراں اور حزب مخالف کے دو گروپوں پر مشتمل ہوتا ہے جو رائے عامہ ایک جماعت کو حکمرانی کے لیے منتخب کرتی ہے وہی حزب مخالف کی تشکیل کا سبب بھی بنتی ہے، کیونکہ الیکشن کا ناگزیر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کم تعداد والی جماعت اپنے آپ کو حکومت کی مخالف بنچوں پر بیٹھنے کے لیے مجبور پاتی ہے۔ کسی بھی ملک میں جمہوریت کی تحریک کا دارومدار حکمراں اور حزب مخالف کے صحیح رول اور صحیح کردار پر ہوتا ہے اگر حزب مخالف جاندار ہو اور بامقصد مخالفت پر اپنی توجہ کو مرکوز رکھے تو نہ صرف حکومت کے نظم و ضبط میں استحکام اور تعاون پیدا ہوتا ہے بلکہ ملک بھی سیدھی سمت کی طرف اپنا سفر جاری رکھتا ہے، اور پبلک اوپی نین یعنی رائے عامہ کی تربیت کا کام بھی اس کے ذریعہ انجام پاتا ہے اور ملک و حکومت کے سبھی شعبوں میں ہم آہنگی اور ربط قائم رہنے کی اصل ضرورت پوری ہوتی رہتی ہے، اگر قانون ساز اداروں میں ایک مضبوط، منظم اور بامقصد حزب مخالف موجود ہو تو حکومت اور حکمراں جماعت کی طرف سے غلط روی اور غلط کاری کا امکان بہت کم باقی رہ جاتا ہے اور بامقصد، باوزن اور برمحل مخالفت کا خوف اسے غلطی کرنے سے باز رکھتا ہے، اگر بدقسمتی سے یہ صورت باقی نہ رہے تو ملک میں ایک عام بدنظمی، ذہنی انتشار اور برہمی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، ملک کی ترقی کی رفتار میں نہ صرف خلل واقع ہو جاتا ہے بلکہ اس کی سمت اور منزل بھی کچھ کی کچھ بن جاتی ہے اور ملک کے ساتھ قوم بھی ڈانواڈول ہو کر ادھر ادھر بھٹکنے لگتی ہے، اور اس کے مہلک اثرات سے انتظامیہ اور عدلیہ جیسے اہم ادارے بھی محفوظ نہیں رہتے، غرضیکہ جمہوریت کا وہ سارا ڈھانچہ زیر و زبر ہو کر رہ جاتا ہے جس کی بنیاد ذہنی شعور، توازن اور فکری پختگی کے نازک رشتوں پر قائم ہوتی ہے، دنیا کے جن ملکوں میں اس وقت جمہوریت قائم ہے ایک دو کو چھوڑ کر تقریباً سبھی ملکوں میں جمہوری نظام ایک طرز حیات اور طرز فکر کے بجائے طرز حکومت کے بطور کام کر رہا ہے اور عوام کی اکثریت کم علمی جہالت اور اوہام کا شکار بنی ہوتی ہے، وہ حکومت اور سماج کی تشکیل میں افراد کے حصے، عمل دخل اور فیصلہ جیسے نازک معاملات کو سمجھنے کے ناقابل ہے اور ذرا سی کوشش سے گمراہی میں مبتلا ہو جانے پر تیار ہو جاتی ہے، عوام کی اکثریت کی ذہنی ناپختگی اور ایک ایسے نظام کی موجودگی نے جس کی کامیابی کا دارومدار ہی بالغ نظری اور شعور کی پختگی پر ہے جمہوری نظام پر عمل پیرا ملکوں میں بڑی نازک صورت حال پیدا کر دی ہے اس طرح کی صورت حال ذرا سی بے احتیاطی، جذباتیت اور ہیجان انگیز کوشش سے، متضاد عناصر کی خوفناک کشمکش میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اکثر اوقات اس کا نتیجہ تشدد آمیز واقعات، خونی انقلاب اور جانی و مالی نقصان و ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارے پڑوسی ملکوں میں یہ اندرونی تضاد کی کشمکش کتنے ہی ایسے ہولناک واقعات کو جنم دے چکی ہے جن کا نتیجہ بالآخر جمہوریت کی ناکامی کی شکل میں نکلا اور یہ ملک آمریت کے چنگل میں پھنس گئے۔ ہمارے ملک میں بھی پچھلے دنوں ایسی ہی ایک حالت جاگ پڑی تھی جس نے جمہوریت کے تجربہ کو بحرانی کیفیت سے دوچار کر دیا تھا، لیکن خوش قسمتی سے اس صورت حال پر جلد ہی قابو پا لیا گیا، اس سلسلے میں کچھ سخت قدم ضرور اٹھائے گئے اور کچھ نئی پابندیاں عائد کی گئیں، ان سخت اقدامات اور پابندیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوری نظام جس کی تباہی یقینی دکھائی دے رہی تھی مسمار ہونے سے بچ گیا۔ امید ہے کہ جوں جوں جمہوری شعور پختہ ہوگا جمہوری نظام کی جڑیں مضبوط ہوتی جائیں گی اور جلد ہی ایک ایسا وقت آئے گا کہ ہندستان میں بھی جمہوریت ایک طرز حکومت کے بجائے ایک طرز حیات کی صورت اختیار کرلے گی جس دن ایسا ہو گیا اس دن کسی پابندی اور کسی سخت اقدام کی ضرورت باقی نہ رہے گی، اور ملک نئی امنگوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ مستقبل کی طرف۔ ترقی کی بلند منزلوں کی طرف اپنا سفر شروع کرنے کے قابل بن جائے گا۔

★

اعجاز صدیقی

غزل

بڑھ جائے گا مول اور مری کم نظری کا
بازار بہت گرم ہے یاں دیدہ وری کا

ہے فاصلہ دامان و گریباں میں ابھی تک
موسم ہی نہ آیا کوئی دیوانہ گری کا

ہر چیز پہ پڑتی تھیں اچٹتی ہوئی نظریں
ایسا بھی تھا اک دورِ شکستہ نظری کا

دو چار قدم بھی تو مرے ساتھ نہ آئے
دعویٰ تھا بہت جن کو مری ہم سفری کا

پتھر تو سلامت ہیں، نہیں سر کوئی بحث
انجام بُرا تو نہیں شوریدہ سری کا

ملنے کے لیے خود سے، غنیمت اُسے جانو
اک لمحہ بھی مل جائے اگر بے خبری کا

سیفؔ بجنوری

غزل

حسنِ تدبیر سے وہ چال میں چل جاؤں گا
گردشِ بخت تری زد سے نکل جاؤں گا

میری غیرت کو نہیں کوئی سہارا درکار
مجھ کو گر گر کے سنبھلنا ہے سنبھل جاؤں گا

راہِ منزل میں بہر گام ہے کانٹوں کا حصار
پاؤں سے روند کے میں ان کو نکل جاؤں گا

سادہ لوحی مری فطرت سہی لیکن ہر بار
کیا ترے وعدۂ فردا سے بہل جاؤں گا

تم نے اے شعلہ رخو مجھ کو غلط سمجھا ہے
میں کوئی شمع نہیں ہوں کہ پگھل جاؤں گا

دوست کہہ کر انھیں بے گانہ کہوں کس لیے
میں بھی کیا ان کی نظر ہوں کہ بدل جاؤں گا

سیفؔ مجھ سے وہ کوئی بات کریں یا نہ کریں
میں سنا کر ہی انھیں اپنی غزل جاؤں گا

”میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہو“

ا۔ ہما

راوی: ”ہندستان! میں دنیا سے جاتا ہوں اور تجھ کو اس خدا کے سپرد کرتا ہوں جس نے آج تیموری سلطنت کے چہرے پر موت کا پردہ ڈھک دیا“ یہ تھا مغل اعظم شہنشاہ ہندستان، جلال الدین محمد اکبر کے جانشین ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کا وداعی پیغام جو، نومبر اٹھارہ سو باسٹھ عیسوی کو رنگون کے ایک تنگ و تاریک بنگلے میں قید فرنگ اور بند حیات دونوں سے رہائی پاتے ہوئے اس بے کس بادشاہ نے اپنے وطن کو دیا تھا۔ تاریخ گواہ ہو کہ اس کی زندگی اگر مختصر کیجئے تو ایک آہ ہے اور طول دیجئے تو ایک مرثیہ۔ اسی زندگی کا ایک ورق اس دور کے ایک دن کا نقشہ ہے، جب ہندستان کی حکومت سمٹتے سمٹتے لال قلعے کی چار دیواری میں رہ گئی تھی، اور مغلوں کے تخت پر کمپنی کا وظیفہ خوار بادشاہ پچھلے عروج کی لاج رکھے بیٹھا تھا۔

جھلملاتے تارے ماند پڑے۔ رات سمٹی، صبح ہو گئی۔ توپ گرجی، لال قلعے نے کلبلا کے انگڑائی لی، خمار اترا۔ روشن چوکی نے وقت کی راگنی چھیڑی۔ اور موتی مسجد سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔

قلماقنی: (کسی کی آہٹ پر بھاری آواز سے)“ باادب! خبردار!“

(پہچان کر) ”اچھا تم ہو“

آواز: (گھبرائی ہوئی)“ ہاں، اور کون ہوتا“

قلماقنی: ”غضب کیا صبیحہ۔ موتی مسجد میں فجر کی اذان اب سنی تم نے“

صبیحہ: ”دیر ہو ہی گئی خانم۔ پھٹکار اس نامراد چوسر پہ! ابھی سُکھ زار ہے ہیں“؟

قلماقنی: ”کیا بن بن کے پوچھ رہی ہو۔ جانتی ہو چپّی والی جب تک پپّی نہ لگائے بیدار نہیں ہوتے، سہری کے پہرے پر نہ ہوتی...“

صبیحہ: ”تو کیا کرتیں؟ تم تیغہ باندھنا جانو، چپّی کرنا ہمارا کام ہے“

قلماقنی: ”تو پھر جاؤ۔ آئیں بھی تو اتنی بدحواس، ہات پر رومال تک نہیں لپیٹا۔ جانتی ہو حضرت نامحرم کا ہات پاؤں کو لگانے کے روادار نہیں“

صبیحہ: ”سچ! ہے ہے تم نہ ٹوکتیں تو آج آ ہی گئی تھی شامت۔ لو میں چلی“ (جاتی ہے۔ لمحے بھر کے بعد)

بہادر: (نیند سے چونک کر) ”ہوں“

صبیحہ: ”چپّی والی کنیز صبیحہ“

بہادر: (ہشیار ہو کر اٹھتے ہوئے) ”الاللہ! اوہ! شمع پھیکی پڑ چکی۔ ہماری نماز قضا ہو گئی۔ کفش لا“

صبیحہ: ”کرامات! صبح کا سپیدہ ابھی نکھرا ہے“

بہادر: ”وضو کا پانی تیار ہے؟“

صبیحہ: ”قدم بوسی کے لیے آتے ہوئے لونڈی نے دیکھا تھا جو لنیاں گنگا جمنی آفتابے لیے حاضر تھیں“

بہادر: ”اچھا تو جا۔ ہم فجر کی نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کے آتے ہیں۔ غسل خانے میں حمام کا پانی سمویا جائے“

صبیحہ ”بہت خوب“ (جاتی ہے۔ دور باتوں اور ہنسی کی آوازیں)

جبولنی: میں کہتی ہوں تم لوگوں کو تیز تہذیب کبھی آئے گی بھی۔ کوئی دم میں حضور تشریف لاتے ہیں اور تمھیں باتوں سے فرصت نہیں۔ ہر وقت کا چلبلا پن اچھا نہیں ہوتا۔"

کنیز: "اے بی جھنجھلاؤ نہیں۔ حمام تیار ہے۔ یقین نہ آئے دو قدم بڑھ کے دیکھ لو۔ چنبیلی کی کھلی، شب بو، موتیا کے بھرے کنٹر ستفا میں ٹھنڈا گرم پانی اور کیا چاہتی ہو۔ جم جم تشریف لائیں۔"

جبولنی: "اوئی! زبان تو دیکھ کیسی چلتی ہے، جیسے کترنی۔ لباس محل کا داروغہ رستم بیگ بھی حاضر ہے؟"

کنیز: "اندر کی تو خبر نہیں۔ پرندہ پر مار جائے سو کس کی مجال۔ کھڑکی میں جھانک کے بیٹھک دیکھا تھا۔ بقچے چنے ہوئے تھے۔ کچھ کھلے پڑے تھے اور داروغہ جلدی جلدی صبح کی پوشاک چاندی کی کشتیوں میں سجا رہے تھے۔"

جبولنی: "اور وہ شمیم خانے کا داروغہ؟"

کنیز: (ہنستے ہوئے) "ان کی بھلی چلائی۔ بڑے میاں تو فجر سے پہلے ہی تیل کی کپیاں، اور عطردان، کنگھا آئینہ سنبھالے غسل خانے کے باہر بیٹھے اونگھا کرتے ہیں۔"

جبولنی: "چپ چپ! حضرت تشریف لا رہے ہیں۔ (اونچی آواز سے) پیر و مرشد، حضور اعلیٰ بادشاہ سلامت عمر دراز۔"

بہادر: "حمام تیار؟"

جبولنی: "خداوند۔"

بہادر: "دیکھو حمام کرکے ہم ایوانِ خلوت میں بیٹھیں گے۔ دیوان خانے کا مہتمم وہیں حاضر ہو۔ روز کا پرچہ بھی وہیں سنیں گے۔"

جبولنی: "جو حکم۔" [منظر بدلتا ہے۔ کچھ دیر بعد]

بہادر: "ہوں شیشی کی مہر توڑ دو۔ دیکھو احسن اللہ کے دستخط ہیں؟"

مہتمم: "پیر و مرشد، حکیم صاحب کے دستخط اور مہریں دونوں صاف ہیں۔ اجازت ہو تو پہلے یاقوتی پیش کی جائے؟"

بہادر: "دُ*ئے بھئی امان۔ روز کے معمول کا پوچھنا کیا۔"

مہتمم: "نوشِ جاں بسم اللہ یا شافی۔"

بہادر: (یاقوتی چاٹ کر) "آج ہمارے چنے نہیں لائے؟"

مہتمم: "فدوی بھول سکتا تھا۔"

بہادر: (مسکرا کے) "ہاں بھئی ہمارا ناشتہ یاقوتی کے دو چمچے، اور چھلکوں سمیت دو تولہ چنے ہی تو ہیں۔ لاؤ کہاں ہیں؟"

مہتمم: "خدا بندگانِ شہنشاہ کا سایہ ہمارے سروں پہ ہمیشہ قائم رکھے۔"

[گھڑیال سات کا گھنٹہ بجاتا ہے]

بہادر: "تم جانتے ہو ہم ہمیشہ اس بات کے پابند ہیں کہ جب تک شاہجہاں آباد کی رعایا ناشتے سے تہہ دل ہوکر اپنے کاروبار میں نہ لگ جائے، ان کا بادشاہ دو چمچے یاقوتی اور چنے کے چند دانوں سے بھی منہ نہیں جھٹالتا۔"

مہتمم: "کرامات۔ حضور کا فرمانا برحق ہے۔"

بہادر: "اچھا تم جاؤ۔ پرچہ نویس حاضر ہو۔" [مہتمم جاتا ہے اور پرچہ نویس حاضر ہوتا ہے]

پرچہ نویس: "قدمبوسی۔"

بہادر: "ہوں سناؤ، شہر میں خیریت ہے؟"

پرچہ نویس: "شہنشاہ کا اقبال یاور، سب طرح سے خیریت ہے۔ جان کی امان۔ پتہ چلا کہ کل شاہزادہ ولی عہد بہادر سیر کرتے ہوئے مہتاب باغ پہنچے۔ اور شاہ پسند آم کی بہت سی کیریاں تڑوا کے اپنے محل کو لے گئے۔"

بہادر: "کون مرزا فخرو؟ ارے بھئی یہ انھوں نے کیا کیا۔ ہم تو ایک ایک کیری گنتے پکنے کی راہ دیکھتے ہیں۔ ٹپکنے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ جاتے ہوئے کسی چوبدار کو ہمارا حکم دیتے جانا کہ دوپہری بجنے سے پہلے مرزا فخرو دفتر خاص میں حاضر ہوں۔ اور کچھ؟"

پرچہ نویس: "اناج سستا، شہر بیماریوں سے پاک۔ گوش ہمایونی کے لیے اب اور کچھ نہیں ہے۔" [گھڑیال بجتا ہے]

بہادر: "اچھا جاؤ۔ اپنے کام پہ مستعد رہو" دس بج رہے ہیں۔

---

* بہادر شاہ کا تکیۂ کلام

دفترِ خاص کا وقت ہے۔ علا ہمارا انتظار کر رہا ہوگا" [کچھ وقفے کے بعد]
چوبدار: (آتے ہوئے) "منشی جی" منشی جی۔ جہاں پناہ کی سواری ہوادار پر خلوتِ مبارک سے چل چکی۔ تیار رہیے"
منشی: "ہاں بھئی علا اپنے بستے تیار کر چکا۔ اور پیشی کے کاغذات میں نے بھی چھانٹ لیے ہیں۔ علا ہوشیار"
چوبدار: (بلند آواز سے) "نگہ رو برو۔ شہنشاہ سلامت۔ آداب بجا لاؤ" [لمحے بھر بعد]
بہادر: "شولال"
شولال: "خداوندِ نعمت"
بہادر: "آج کاغذات کا آتنا بھاری بستہ؟"
شولال: "پیر و مرشد۔ فدوی نے پیشی کے ہر کاغذ کا خلاصہ کر لیا ہے۔ خاطرِ مبارک پر بار نہ گزرے گا"
بہادر: "نہیں نہیں، بارکیا۔ یہ ہمارا فرض ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہم اپنی رعایا کو اپنی اولاد کے برابر سمجھتے ہیں۔ ہمارے لیے ذات پات، مذہب و ملت، ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہیں، بارکیا۔ بادشاہ عادل ہی خدا کا سایہ ہو سکتا ہے۔ ایک طرف اپنے امیروں اور رئیسوں کو نوازتے ہیں، تو دوسری طرف انھیں کبھی نہیں بھولتے جنھیں کوئی نہیں پوچھتا۔ ان کے ساتھ خلوص اور سچائی کا وہ برتاؤ کرتے ہیں کہ نہ تو آدابِ شاہی رکاوٹ بنتا ہے، نہ وقارِ خسروی آڑے آتا ہے"
شولال: "پیر و مرشد کا فرمانا برحق ہے۔ ابھی کل ہی پرسوں تھو حجام کو تین پارچے کا خلعت اور ایک رقم جواہر اور اللہ رکھا کو تین پارچے کا خلعت دستِ مبارک سے عطا فرمایا گیا"
بہادر: "ہاں بھئی دونوں ہمارے خاص تراش ہیں۔ ان کی خدمت کا کچھ تو انعام ہونا چاہیے"
شولال: "ارشادِ خداوندی برحق ہے"
بہادر: "تم خود اپنے پیہم غور کرو، دفتر کے خاص سررشتہ دار ہو۔ ہم تم پر کتنا بھروسہ کرتے ہیں اور بھئی (ہنس کر) سچ تو یوں ہے کہ حکم تمھارا چلتا ہے۔ دستخطوں کے گنہگار ہم ہوتے ہیں۔ دیکھو احسن اللہ کہنے کو وزارت کے مرتبے پر ہیں، ان کی مرضی تمھارے وسیلے سے پیش ہوتی ہے اور منظوری نامنظوری سے پہلے علا یہ کیفیت لکھتا ہے۔ لالہ شولال محررِ دفترِ خاص نے عمدۃ الملک احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں ثابت جنگ کی عرض پیش کی"
شولال: "یہ خداوندِ نعمت کی سرفرازی ہے"
چوبدار: "کرامات، شاہزادہ ولی عہد بہادر حضوری چاہتے ہیں"
بہادر: "ہاں ہماری طلبی پر آئے ہیں بلاؤ"
مرزا فخرو: "کورنش عرض ہے"
بہادر: "دے بھئی امان۔ فخرو ہمیں پرچہ گزرا، یہ مہتاب باغ میں ہمارے شاہ پسند آم کی کیریاں کس کا مال سمجھ کر تم نے تڑوائیں؟"
فخرو: "ابا حضور اپنے باپ کا مال سمجھ کر"
بہادر: "دے بھئی امان۔ ہم لاجواب ہوگئے۔ آئندہ ہم سے پوچھ لیا کرو۔
فخرو: "سرفرازی۔ اب اجازت ہے؟"
بہادر: "شولال۔ کاغذات پیش ہوں"
شولال: "یہ معظم الدولہ صاحبِ کلاں فرزندِ ارجمند سلطانی مشکاف صاحب رزیڈنٹ کا خریطہ ہے۔ شرفِ ملازمت چاہتے ہیں"
بہادر: "پھر کیا جواب لکھا تم نے؟"
شولال: "موسم گرما کو دیکھتے ہوئے عذر کر دیا۔ آگے جو حکم"
بہادر: "ٹھیک کیا اور پڑھو۔ ہاں صاحبِ کلاں کو اتنا اور لکھ دو کہ نو لاکھ کا قرضہ ہوگیا ہے۔ اس کی ادائگی کے لیے صدر میں رپورٹ کی جائے"
شولال: "مناسب۔ یہ کنور سالگ رام کی عرضی ہے۔ اپنے بیٹے گوپال سنگھ کی شادی کے باب میں عرض کیا ہے"
بہادر: "(سوچتے ہوئے زیرِ لب)" دلی کے فقیر بادشاہ کے پاس کیا رکھا ہے۔ شولال، ہم گوپال سنگھ کو کنور کا خطاب دیتے ہیں۔ حکم دیا جائے کہ اس لڑکے کی شادی ہمارے خرچ سے ہو۔ خلعت فرخ سیری، جامہ، کمر بند اور مقیش کا سہرا بھیجا جائے اور برات شاہی جلوس کے ساتھ جائے۔ اور کیا ہے؟"

شولال: "کنور جگت سنگھ عرض کرتے ہیں، میرا چھ ہزار روپیہ بیشکار میرزا تیمور شاہ بہادر کے ذمے نکلتا ہے، ان پر تاکید زبانی جائے کہ جلدی ادا کر دیں"

بہادر: "یہ سلاطین کتنے نادہند ہو گئے ہیں" (تیز ہو کر) "جگت سنگھ کو لکھ دو کہ تمسک کا کاغذ ہمارے پاس بھجوا دے اور مرزا تیمور کو الگ رقعہ بھیج کر لکھو کہ تمھارے قرض خواہ ہم کو بہت تکلیف پہنچاتے ہیں قرضہ فوراً چکا دیا جائے ورنہ تمھاری تنخواہ بند کر دی جائے گی"

شولال: "رام دیال گوجر کے بیٹے نے عرض کیا ہے کہ شاہی کارخانے کا بڑھا چرواہا فرق مبارک پر تصدق ہو گیا"

بہادر: "ارے یہ کب؟ بہت افسوس ہوا۔ شولال یہ گوجر ہمارا پرانا نمک خوار تھا۔ ماتم پرسی کے طور پر اس کی بی بی کو ایک دوشالہ بھیجا جائے اور اس کی دلدہی کی جائے۔ بس یا اور بھی ہے؟"

شولال: "قطب بخش گویئے نے عرض کیا ہے کہ الور جانے کی اجازت مرحمت ہو"

بہادر: "لکھ دو جا سکتا ہے۔ اس کی تنخواہ بے باق کر دی جائے۔ ایک ہاتی اور دو سوار اور ہرکارے ساتھ جائیں جس میں اس کی آبرو بڑھے"

(توشہ خانہ کے گھڑیال نے آٹھ بجائے)

شولال گیارہ کا گھڑیال بج رہا ہے۔ خاصے کا وقت آیا۔ باقی کاغذات کل۔ سرے کا قلم لاؤ دستخط کر دیں۔ ہوادار طلب ہو"

(وقفہ)

چوبدار: (بلند آواز سے) "پیر و مرشد، حضور عالی، بادشاہ سلامت، عمر دراز"

(زنانہ محل پر آواز)

جسولنی: "حضرت کی سواری آ رہی ہے۔ دفتر خاص برخواست ہو چکا۔ چوبدار کی صدا سنائی دے رہی ہے۔ ہوشیار ہو جاؤ۔ (بلند آواز سے) ظل اللہ، جہاں پناہ، سلامت، آداب بجالاؤ"

بہادر: "دے بھئی امان۔ ملکہ زمانی تشریف لے آئیں؟"

جسولنی: "پیر و مرشد" (بہادر شاہ آگے بڑھتے ہیں)

زینت محل: "کورنش عرض کرتی ہوں"

بہادر: "بیٹھو زینت۔ مزاج بخیر؟"

زینت: "حضور کی دعا"

بہادر: "نصیب دشمن۔ آواز پر کچھ بار معلوم ہوتا ہے۔ طبیعت ابھی تک اعتدال پر نہیں آئی"

زینت: "دوا جاری ہے۔ پرہیز بھی ہو رہا ہے۔ سنا نواب فرخ آباد نے حکیم امام الدین خاں کو واپس بلایا ہے"

بہادر: "ٹھیک ہے مگر ہم نے حکیم صاحب کو روک دیا۔ ہم نے صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ لکھوایا تھا کہ اگر حکیم صاحب چلے گئے تو ملکہ بیگم کے علاج میں مشکل پڑے گی"

زینت: "پھر مٹکاف نے کیا کہا؟"

بہادر: "لاٹ گورنر کو کلکتے لکھا۔ گورنر جنرل کی ہدایت پر فرخ آباد کے نواب نے اپنے وکیل مختار امداد علی کو دہلی بھیجا اور حکیم صاحب رک گئے"

زینت: "اچھا ہوا"

بہادر: "دے بھئی امان۔ زینت خوب یاد آیا۔ ہم نے حکم دے دیا ہے کہ جس دستاویز پر نواب زینت محل بیگم کی مہر نہ ہو گی وہ معتبر نہ ٹھہرے گی اور ہاں بھئی بخشی گری کی تنخواہیں بھی تمھارے سامنے بٹا کریں گی"

زینت: "اور میرے قرضے کی ادائگی کی کیا صورت نکالی؟"

بہادر: "معظم الدولہ کو لکھوا دیا کہ ملکہ نے محبوب علی خواجہ سرا کی معرفت دس ہزار قرض لیا تھا۔ یہ دو ہزار سالانہ کے حساب سے قسطوں میں ادا کیا جائے۔ اب تو اطمینان ہوا؟"

زینت: "خدا حضور کو سلامت رکھے"

بہادر: "ہاں بھئی وہ تم نے محل کے روزمرہ خرچ کے لیے کچھ روپے مانگے تھے ہم نے محبوب علی سے کہہ دیا ہے، وہ ہزار روپے کا انتظام کر کے بھیج دیگا"

زینت: "حضور کی توجہ سے روپیہ آ گیا"

بہادر: "بیگم ایک معاملے میں ہم تم سے معافی مانگتے ہیں۔ تمھارا شکر ادا کرنا بھول گئے۔ بات پرانی ہو گئی، اس وقت یاد آئی"

زینت: "حضور اور میرا شکریہ!"
بہادر: "ہاں بھئی۔ کوئی مہینہ بھر پہلے قاسم جان کی گلی والے مکان میں کچھ دیر کے لیے ہم تم سے ملنے گئے تھے۔ یاد آیا؟"
زینت: "جی ہاں۔ عزت افزائی کا وہ مبارک وقت بھولنے کی چیز ہے؟"
بہادر: "دیکھئی واہ۔ تم نے کس شان سے ہمارا استقبال کیا تھا۔ کمخواب اور زربفت سڑک پر بچھوایا تھا پھر لٹوا بھی دیا تھا۔ ایک سو ایک روپے سر پر نچھاور کر کے خیرات کیے تھے۔ ایک سو ایک کشتیاں شال دوشالوں اور پوشاکوں کی نذر کی تھیں۔ کئی ہاتھی گھوڑے بھی دئے تھے:"
زینت: "بے ادبی تو ہے مگر میں حضور سے پوچھ سکتی ہوں کہ آج یہ سب کیوں گنوایا جا رہا ہے؟"
بہادر: "اس لیے کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں اس نے محمد قلی خاں درانی کی بیٹی ملکہ ثانی زینت بیگم جیسی بی بی ہم کو عطا فرمائی ہے"
زینت: "جہاں پناہ مجھے لجاتے ہیں۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ حضور ہی کا تو ہے"
بہادر: "(ٹھنڈی سانس لے کر) "اور تمہارے اس حضور کے پاس آہ کے سوا کچھ بھی نہیں"
زینت: "خاصے کا وقت قریب ہے۔ اب مزاج مبارک پر گرانی فتور ہضم کا سبب ہوگی۔ (کسی کی آہٹ پر) کون مہتاب؟"
مہتاب: "لونڈی کا مجرا قبول ہو۔ دسترخوان تیار کیا جائے؟"
بہادر: "ہاں بھئی مہتاب ہم بہت خوش ہوئے کہ آج تو نے مشکی موتیا کا عطر لگایا"
مہتاب: "لونڈی کو حکم بھی تو تھا"
بہادر: "ہاں اس دن تو ہمارے پاس کھڑی تھی۔ کپڑوں سے دھوئیں کی بو آئی، ہم کھانا نہ کھا سکے، جا خاصہ چنوا"
مہتاب: "بہت خوب" [کھانے کے کمرے میں کئی زنانہ آوازیں]
مہتاب: (آتے ہوئے) تشریف لا رہے ہیں۔ دسترخوان تیار؟
کنیز: دیکھ کر بولی۔ "نیچے چمڑا۔ اوپر تیل پانی۔ اس پر تخت پر دودھ کا دھویا دسترخوان"
مہتاب: "کوئی داغ دھبا تو نہیں"
کنیز: "اے بی، چاند میں دھبا ہے دسترخوان میں نہیں"
مہتاب: (ہنس کر) "ٹھہر جا زبان دراز۔ مجھ بڑھیا پہ چوٹ کرتی ہے۔"
کنیز: "سہتی جو ہو"
مہتاب: "شمیم۔ گلاب پاش تیار ہے؟ بھول نہ جانا۔ ادھر حضرت اور ملکہ دسترخوان پہ بیٹھیں، ادھر گلاب کی پھوار پڑے۔ عطر کے کنٹر کھول دو"
شمیم: "بی کشمیرن، خاصے کی داروغہ اگر پرانی ہو تو اس شمیم نے بھی لال حویلی کی گود میں پرورش پائی ہے۔ ایک گلاب پاش ہی کیا، دیکھ لو بیسن دانیاں، چنبیلی کی کھلی، صندل کی ٹکیاں، ابٹن اپنے اپنے قرینے سے رکھے ہیں۔ پورے پچاس رومال بھی گن لو"
کنیز: "اور ہاں بی ان کی کارگزاری سن لی، یہ بھی تو دیکھو، آج ہم نے نعمت خانہ بدلوا دیا۔ پرسوں نہ جانے کیسے ایک غیبالی مکھی گھس آئی تھی، وہ تو کہیے خیریت گزری، حضرت یا ملکہ کو پتہ نہیں چلا، ورنہ کھال کھنچ جاتی بندی کی"
مہتاب: "چلو چلو بہت دیکھ لی تمہاری کارگزاری بھی" [بادشاہ اور ملکہ کی آہٹ]
بہادر: "مہمان آگئے؟"
مہتاب: "کرامات۔ بارہ دری کے سبزے پر نہیں نہیں کر کے بھی پانچ سو کنگلا الش مبارک کے انتظار میں اکٹھا ہے۔"
بہادر: (دبی زبان سے) "کنگلے! اور ان کا بادشاہ بھی کنگلا! یہ اللہ کی دی اپنی روٹی کھاتے ہیں، اور ان کا بادشاہ فرنگی کی جھوٹن! مہتاب تجھے خوب معلوم ہے کہ ان فاقہ مستوں کو ہمارے خاصے سے پہلے سات من خمیری روٹیاں اور پانچ دیگ سالن روزانہ مل جاتا ہے"؟
مہتاب: "کس کی مجال ہے کہ شہنشاہ کے حکم کی تعمیل نہ کرے۔ لونڈی روز حساب کر لیتی ہے"۔
بہادر: "اچھا بھئی۔ زینت بسم اللہ۔ مہتاب دیکھو خاصے کے آٹھ خوان

سجا کے حضرت میاں کالے صاحب کے یہاں بھجوا دو"

مہتاب: "کرامات پھیوں میں رکھوا کے ابھی بھجواتی ہوں"

چوبدار: (دور۔ بارہ دری کے باہر) "طعام مبارک!" (کھنگلوں کا شور غل)

بہادر: (شور سن کر) "الحمدللہ! لاؤ بھئی فیرنی کی قلفی اور چمچہ۔ آج بھوک نہیں کھلی۔ بشیر کا شور با اور بس۔ زینت تم بات نہ کھینچو۔ آب خاصہ؟"

جسولنی: (دور سے) "آب حیات لاؤ"

داروغہ آبدار خانہ: "تیار ہے۔ دیکھو اس صراحی میں گنگا کا اور یہ لو اس میں جمنا کا پانی ہے۔ چار پہر تک نتھار کے برف میں دبائی ہیں۔ غلافوں پر مہریں دیکھ لو"

جسولنی: "لاؤ قریب سے" "آب حیات!"

زینت: "مہریں توڑو اور کٹورہ مجھے دو" (بادشاہ پانی پیتے ہیں)

..... مزید حیات"

"آمین"

بہادر: "بیگم گلوری؟"

زینت: "یہ حاضر ہے"

بہادر "زینت تمہارے ہاتھ کی گلوری روح کو گرما دیتی ہے۔ اچھا خس خانہ تیار۔ دو گھڑی سکھ کے بعد ظہر کی نماز"

چوبدار: "آداب بجا لاؤ۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت۔ حکیم احسن اللہ خان"

احسن: "قدم بوس"

بہادر: "آؤ احسن اللہ۔ آج کئی دن کے بعد ظہر پڑھ کے جی چاہا، جھرنے ہی پہ بیٹھ گئے"

احسن: "موسم کے مناسب بھی تھا"

بہادر: "احسن اللہ، آج ہم بہت فکرمند ہیں"

احسن: "نصیب دشمناں"

بہادر: "حکیم صاحب۔ فکر دماغی نہیں روحانی ہے۔ ظہر کے بعد ہم ٹھنڈا پیتے پیتے کچھ ڈوب سے گئے۔ خیال آیا کہ ہمارے بعد دہلی کا تخت کس کی قسمت میں لکھا ہے۔ تم کہاں ہو گے۔ یہ لال حویلی کیا ہوگی۔ یہ دربار کون جمائے گا؟"

احسن: "حضور تردد نہ فرمائیں۔ غم پیچھے گرتا ہے۔ یعنی اور ملنا ہیں پہلے اکھڑ جاتی ہیں"

بہادر: "ہاں ہم سوچتے ہیں کہ فرنگی کا وظیفہ بارہ لاکھ سالانہ بھی ہم پورا نہیں پاتے۔ مرشد زادوں اور سلاطین کی تنخواہیں سب اسی میں سے جاتا ہے۔ قلعے کا جواہر بیچ بیچ کر ہم گزر کر رہے ہیں"

احسن: "فدوی سے کیا چھپا ہے۔ صاحب کلاں بہادر کو لکھا تھا کہ حضور کے اخراجات قرض لیے بغیر پورے نہیں ہوتے۔ سورج نرائن کو شاہی جاگیروں کے حوالے سے تمسک پر قرضہ لینے کی اجازت دی جائے"

بہادر: "اور تم نے دیکھ لیا کہ مٹکاف نے ہمیں بے بس سمجھ کر کیسا روکھا جواب دیا کہ گورنر جنرل کی اجازت کے بغیر ہمیں قرض نہیں دیا جا سکتا۔ دیکھو یہ زینت کے لیے ایک موتی مالا چاہیے تھا وہ تک ہم نہ لے سکے۔ ملکہ سے منہ چھپائے ہوئے ہیں"

احسن: "مالا یہ حاضر ہے۔ اسی لیے فدوی ناوقت پیشی میں آیا"

بہادر: "لاؤ لاؤ بھئی۔ کتنے کو لیا؟"

احسن: "صرف بارہ سو کو"

بہادر: "احسن اللہ یہ تمہارا احسان ہمیں یاد رہے گا۔ مغرب کا وقت آ گیا۔ اچھا رخصت ہو اور حاضر کیا جائے۔ موتی مسجد جائیں گے"

(رات۔ سازندوں کی آواز)

بہادر: "زینت۔ خاصے سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر محفلِ طرب میں ہمارے پاس بیٹھو"

زینت: "بسر و چشم"

جسولنی: (سازندوں سے) حضرت تشریف لانے کو ہیں۔ ملکہ عالم جلو میں ہوں گی۔ آپ لوگ اوٹ کے باہر ٹھہریں۔ سنگت وہیں سے ہوگی۔

سازندہ: اللہ سلامت رکھے۔ جو حکم" (جاتے ہیں)

بہادر: (آتے ہوئے) "آؤ زینت تمھیں اپنی نئی غزل سنوائیں"

زینت: جو ارشاد۔ مگر گانے سے پہلے ناچ کے دو توڑے ملاحظہ فرما لیے جائیں تو زیادہ دلچسپی ہوگی۔ سنا ہے کہ یہ جو لکھنؤ سے حاضر ہوئی ہیں نواب

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

نذرِ خسرو

شہریار پرواز

جہاں میں عام ہے پیغامِ عاشقانہ ترا
ہر ایک دین کی منزل ہے آستانہ ترا

زمینِ ہند تری عاشقی پہ نازاں ہے
کہ اس زمین سے تھا عشق والہانہ ترا

ہر ایک نغمہ ہے آئینۂ جمال و جلال
ہر ایک شعر ہے لوحِ پیمبرانہ ترا

جو حسن و عشق کی انسانیت کی دولت ہے
ہر ایک ذرے میں مدفون ہے وہ خزانہ ترا

رچی ہوئی ہے ہر اک پھول میں تری خوشبو
ہر ایک ساز میں پوشیدہ ہے ترانہ ترا

جہاں ہے بحرِ ناب عاشقی جاری
وہ نخلستانِ محبت ہے آستانہ ترا

ترا پیامِ محبت ہے آج بھی زندہ
کہ ہر زمانہ حقیقت میں ہے زمانہ ترا

تو چاہتا تھا کہ اک خاندان ہو دنیا
یہ امتزاجِ تمدن تو تھا ترانہ ترا

قبول سجدۂ پرواز بھی ہو اے خسروؔ
کہ سجدہ گاہِ غریباں ہے آستانہ ترا

کل رات کو

جلال ملیح آبادی

زینت کاشانہ تھی اک جانِ جاں کل رات کو
رقص میں تھی یہ زمیں یہ آسماں کل رات کو

وجد میں تھی اک قتیلِ شعر و نغمہ کل کی شب
کیف میں تھا اک شہیدِ دلبراں کل رات کو

یہ نظر افسانہ در افسانہ تھی ہنگامِ شب
وہ نظر تھی داستاں در داستاں کل رات کو

اُن کے شانے پر کھُلی تھی کاکلِ افشاں فروز
میری خلوت میں کھِلی تھی کہکشاں کل رات کو

تھی گلابی روشنی حُسنِ حنائی رنگ میں
تھی کوئی تزئینِ جاں تسکینِ جاں کل رات کو

عاشقی سرشار سی سرشار تھی اے ہم نفس
دلبری تھی شادماں سی شادماں کل رات کو

میں بتاؤں کون تھا وہ؟ جس کو کہتے ہیں جلالؔ
رقص فرما تھا یہی! پیرِ جواں کل رات کو

المیہ ڈرامے کے بارے میں ارسطو کے چند ارشادات

پروفیسر [illegible] افضل خان

ارسطو شاید دنیا کا واحد فلسفی ہے جس نے سائنس، ادب اور زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ آج بھی کسی چیز کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے اس کے بارے میں ارسطو کے خیالات معلوم کر لینا ضروری ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے ارسطو کے خیالات آج کے لیے صحیح یا مناسب نہ ہوں، لیکن اگر خیالات اور جوابات صحیح نہ بھی ہوں تو بھی ارسطو کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ مطالعہ شروع کرنے کا انداز اور صحیح سوالات پوچھنے کا طریقہ ارسطو سے زیادہ بہتر کہیں اور نہیں ملتا۔

آیئے المیہ ڈرامے کے بارے میں ارسطو کے کچھ خیالات کا مطالعہ کریں۔ عام طور سے "المیہ ڈرامہ" اُس ڈرامے کو کہتے ہیں جس کے اہم کردار آخر میں موت کے شکار ہو جائیں۔ مگر ارسطو کے خیال میں المیہ ڈرامے کا اختتام 'موت' پر ضروری نہیں بلکہ جو چیز ضروری ہے وہ ہے کردار اور کہانی کا 'سنجیدہ' ہونا۔ ارسطو کے خیال میں المیہ ڈرامہ، سنجیدہ کرداروں کی سنجیدہ کہانی ہے، جب کہ 'مزاحیہ'، مضحکہ خیز کرداروں کی مضحکہ انگیز کہانی ہے۔ المیہ ڈرامے کے لیے یونانی لفظ TRAGOLDIA کا مفہوم SERIOUS DRAMA ہے۔ یہ موت پر ختم ہونے والا ڈرامہ نہیں۔

انگریزی میں یہ غلط فہمی تیرھویں اور چودھویں صدی سے چلی آ رہی ہے۔ لفظ TRAGEDY انگریزی میں مختلف معنوں میں مستعمل رہا۔ ایک وقت تو ایسا بھی تھا کہ TRAGEDY کا 'ڈرامہ' ہونا لازمی نہ رہا۔ اس وقت اس کا مفہوم صرف ایک ایسی کہانی تھا جس کے کردار آلام و مصائب کا شکار ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کا تعلق پھر تھیٹر THEATRE سے ہو گیا لیکن موت پر اختتام بھی ساتھ میں منسلک ہو گیا۔

المیہ ڈرامے کے مقصد کے بارے میں ارسطو نے لفظ CATHARSIS کا استعمال کیا ہے۔ اس کے مختلف ترجمے کیے گئے ہیں۔ "صفائی"، "سدھار"، "اصلاح"۔ مگر مناسب ترجمہ "اِخراج" ہے۔ "اخراج"، یونانی اطبا کے مفہوم میں ——— یونانی اطبا کے خیال میں انسانی جسم مختلف اجزا کا مرکب ہے۔ قدرت نے ان اجزا کو ایک تناسب سے انسانی جسم میں ترکیب دیا ہے اور جب یہ تناسب بگڑ جاتا ہے تو انسانی جسم بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس تناسب کو دوبارہ قائم کرنے کا طریقہ غیر متناسب جُز کا 'اخراج' ہے۔

جذباتِ انسانی، دل و دماغ کے لازمی جز ہیں مگر جب یہ جذبات تناسب سے زیادہ ہو جائیں تو دل و دماغ مفلوج ہو سکتے ہیں۔ اس لیے وقتاً فوقتاً ان کا 'اخراج' عمل میں آنا چاہیے۔ ارسطو کے خیال میں یہی المیہ کا مقصد ہے۔ جذبات کو برانگیختہ کر کے ان کا اِخراج عمل میں لانا اور دل و دماغ پر سے اُن کا دباؤ کم کرنا اور اس طرح کثرتِ جذبات کے بُرے اثرات سے محفوظ رکھنا المیہ کا مقصد ہے۔

ارسطو کے اس خیال کے بارے میں کافی اختلافِ رائے ہے۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ انسان، کثرتِ جذبات کا شکار ہوتا ہی نہیں۔ ارسطو نے ہی POETICS میں خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ لوگ جذبات کی کمی کے بھی شکار ہو سکتے ہیں پھر لوگ

یہ بھی کہتے ہیں کہ دردناک کہانی پڑھ کر یا دیکھ کر جذبات میں ارتفاع ہو جاتی ہے۔ ان کا اخراج عمل میں نہیں آتا۔ HARDY کے ناول پڑھنے کے بعد یا ہیملٹ (HAMLET) اوتھیلو (OTHELLO) اوڈیپس (OEDIPUS) وغیرہ کا انجام دیکھنے کے بعد خوف، غم، رحم کے جذبات میں اضافہ ہوتا ہے، افاقہ نہیں۔

ارسطو کے استاد افلاطون کا بھی اعتراض تھا اور اس نے اسی لیے شاعری، ڈرامہ وغیرہ کو ممنوع قرار دیا تھا۔ انیسویں صدی کے فلسفی روسو (ROUSSEAU) نے بھی یہی بات ان الفاظ میں کہی ہے:

"(DRAMA) PURGES THE PASSIONS ONF HAS NOT AND FOMENTS THOSE ONE HAS."

ایک اور فلسفی ہیگل (HEGEL) کے خیال میں المیہ کا مقصد المیہ کی عظیم شخصیتوں پر رحم کھانا نہیں اُن کو ذلیل کرنا ہے۔ ہم ان پر صرف تحقیر کرسکتے ہیں، خوف، رحم کے جذبات کا اظہار نہیں کرسکتے۔

شوپنہار (SCHOPENHAUR) کے خیال میں المیہ کا مقصد، زندگی سے فرار اور نفرت سکھانا ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ چونکہ یونانی المیہ میں یہ فرار و نفرت نہیں پایا جاتا اس لیے یونانی المیہ پوری طرح سے ترقی یافتہ نہ تھا۔ شوپنہار کا یہ خیال، افلاطون اور روسو سے بہت مشابہ ہے اور یقیناً غلط ہے۔ کسی بھی اچھے المیہ کو پڑھنے کے بعد اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے۔ اچھے المیہ کے مشاہدے یا مطالعے کے بعد تاسف اور خوف کا جذبہ ضرور غالب آتا ہے مگر زندگی یا انسان کی تحقیر یا اُس سے گریز کا خیال نہیں آتا۔

نطشے (NIETZSCHE) کے خیال میں المیہ زندگی کی دورخی تصویر پیش کرتا ہے۔ زندگی کی عظمت، شوکت اور ساتھ میں اُس کی مایوسی اور مجبوری ـــــ ایک طرف یہ احساس دلاتا ہے کہ زندگی بہت حسین، عظیم، پرشکوہ ہے، مگر اسی زندگی کا دوسرا رخ الم اور تاسف کا مظہر ہے۔ یہ نقطۂ نظر ارسطو کے بہت قریب ہے۔ اس دورخی تصویر سے ایک طرف خوف، غم، رحم کے جذبات برانگیختہ ہو کر خارج ہوتے ہیں لیکن ساتھ میں زندگی سے گریز یا تحقیر کا احساس نہیں ہونے پاتا۔

بہرحال، ارسطو کے بتائے ہوئے المیہ کے مقصد میں کچھ جان تو ہے مگر سوال یہ ہے کہ کتنے لوگ المیہ اس مقصد سے دیکھتے یا پڑھتے ہیں۔ چلچلاتی دھوپ میں ٹکٹ خریدنے کے لیے لائن میں لگے کسی شخص سے پوچھئے کہ وہ ڈرامہ دیکھنے کیا اس لیے جا رہا ہے کہ اس کو جذبات کی فراوانی کا احساس ہے اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ المیہ کا جلاب لینے جا رہا ہے تو شاید ہی کوئی شخص اس سوال کا جواب مثبت میں دے۔

آخر ارسطو نے یہ موقف کیوں اپنایا۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ یونانی حکماء کا زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر، اور دوسری وجہ افلاطون کی شاعری اور ڈرامہ کے بارے میں تنقید ـــــ اکثر بلکہ ازل سے یہ سوال پوچھا جا رہا ہے کہ انسان اپنے جذبات کا کیا کرے۔ رہبانیوں کا ایک ہی جواب رہا ہے "ان کو کچل کر ختم کردو" ع

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا

لیکن یونانی حکماء کے خیال میں کوئی بھی شے کچلنے سے ختم نہیں ہوتی۔ ایک نہ ایک دن پھر سر اٹھاتی ہے۔ اس لیے ان کو کچلنے نہیں بلکہ ان کو معقول انداز سے بڑھنے کی اجازت دے کر قابو میں رکھیے جذبات کے پودے کو جڑ سے نہ کاٹیے۔ اس کو بڑھنے دیجیے مگر معقول حد تک۔ بے ربط اور غیر متناسب نشوونما کو ضرور تراشیے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

یونانی حکماء کا نقطۂ نظر تھا:

"NOTHING TOO MUCH, NOT EVEN RIGHTEOUSNESS."

اور اسی نقطۂ نظر کو مدِنظر رکھتے ہوئے ارسطو نے المیہ کے مقصد کے

بارے میں یہ نقطۂ نظر اپنایا۔

افلاطون حالانکہ یونانی تھا لیکن اس کا نقطۂ نظر اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے شاعری اور ڈرامہ کو ممنوع قرار دیا کیونکہ اس کے خیال میں ڈرامہ اور شاعری جذبات کی زیادتی کا باعث بنتے ہیں۔ وہ جذبات جن کو کچل ڈالا جانا چاہیے —— المیہ کا مقصد بیان کرتے وقت ارسطو کے ذہن میں اپنے استاد کی یہ تنقید ضرور رہی ہوگی اور اس طرح وہ اس تنقید کا جواب دے رہا تھا۔

المیہ کے پلاٹ اور کہانی کے بارے میں ارسطو نے PERIPETEIA کو لازمی قرار دیا ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ 'REVERSAL OF FORTUNE' کیا جاتا ہے یعنی المیہ کہانی ہے کسی شخص کی خوشحالی کی اعلیٰ منزلوں سے نیچے آن گرنے اور آلام و مصائب کا شکار ہونے کی —— مگر ارسطو کا شاید یہ مقصد نہیں۔ ارسطو نے ہومر (HOMER) کی طویل نظم ایلیڈ کے بارے میں کہا کہ اس میں PERIPETEIA نہیں ہے جبکہ ایلیڈ (ILIAD) میں عروج و زوال ہر منزل پر ہیں۔ PERIPETEIA سے ارسطو کا مقصد ہے، انسان کے اپنے مقصد و خواہش کے بالکل برعکس حالات کا رونما ہونا۔ انسان کسی مقصد کو لے کر ایک راستے پر چلتا ہے مگر وہ راستہ اس کو اس کے مقصد کے ایک دم برعکس حالات سے دوچار کر دیتا ہے۔ ارسطو کے خیال میں زندگی کا المیہ، انسان کا دشمنوں کے ہاتھوں یا کسی آسمانی آفت کی زد سے فنا ہونا نہیں عظیم المیہ ہے انسان کا خود اپنی کوششوں یا اپنے ہی خواہوں کے ہاتھوں فنا و برباد ہونا —— انسان کسی نتیجہ سے گریز کرنے کی جد و جہد کرے مگر اسی جد و جہد کے نتیجے میں وہ اس کا شکار ہو جائے جس سے وہ گریز کرتا رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے اس بات کو یوں کہا ہے:

"WHOSOEVER WILL SAVE HIS LI
SHALL LOSE IT."

انسان نادان بھی ہے۔ کم بیں بھی لیکن بزعم خود وہ بہت دانا اور بینا ہے۔ المیہ، انسان کی اس حقیقتاً نادانی، کم بینی لیکن بزعم خود دانائی و بینائی کی کہانی ہے۔ OEDIPUS ملک کے بادشاہ کے قاتل کی جستجو اس زعم سے کرتا ہے کہ وہ بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ خود اپنی قبر آپ کھود رہا ہے چونکہ اصلی قاتل وہ خود ہی ہے۔ ہیملٹ (HAMLET) ایک خون کرنے سے گریز کرتا ہے لیکن اس کے نتیجے میں نصف درجن خون ہوتے ہیں جس میں خود اس کا خون شامل ہے۔ زندگی بہت ستم ظریف ہے اور المیہ اس ستم ظریفی کی کہانی —— اس طرح PERIPETEIA کے مفہوم میں انسانی زندگی کا فلسفہ مخفی ہے۔

المیہ نگار زندگی کی اس ستم ظریفی کو اس خوب صورتی سے پیش کرتا ہے کہ کسی کو میر کے اس شعر پر یقین نہ آنے پائے۔ ؎

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خود مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

اس لیے اس تباہی یا حالات کے مخالف رخ پر اختیار کرنے کی ذمہ داری بھی انسان کے اپنے فعل پر ہی ہوتی ہے۔ کہیں نہ کہیں وہ کچھ غلطی کرتا ہے۔ ارسطو نے اس غلطی کے لیے HAMARTIA کا لفظ استعمال کیا ہے۔ HAMARTIA، کا مقصد ہے "غلطی" یا "غلط اقدام"۔ اس غلطی میں اخلاقی یا مذہبی عنصر کا قبول غیر ضروری ہے لیکن عام طور سے اس غلطی کو اخلاقی یا مذہبی رنگ دینا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح المیہ کو POETIC JUSTICE کا مظہر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ POETIC JUSTICE حقیقت کے برخلاف ہے۔ زندگی کی بنیادیں انصاف پر ہرگز نہیں بلکہ عمل ردعمل پر ہیں۔ کوئی بھی ایسا اقدام جو حالات کے تقاضوں کے برخلاف ہو، تباہی کا باعث بنے گا چاہے وہ اقدام اخلاقی یا مذہبی غلطی ہو یا نہ ہو HAMARTIA پر POETIC JUSTICE تھوپنے کا کوئی جواز نہیں اور ارسطو کے مفہوم و مقصد کے برخلاف ہے۔ شیکسپیئر کے میکبتھ MACBETH اور RICHARD III اخلاقی مجرم ہیں اور مان لیجیے وہ اسی لیے تباہ ہوتے ہیں۔ مگر کیا یہ فلسفہ BRUTUS، اور

HAMLET کے بارے میں بھی اپنایا جا سکتا ہے؟ یقیناً نہیں ـــــ HAMARTIA کا مقصد انسان کو اپنی تباہی کا ذمہ دار بتانا ہے، اس کی تباہی کا اخلاقی جواز مہیا کرنا نہیں۔

پلاٹ (PLOT) اور کردار (CHARACTER) کا تذکرہ کرتے ہوئے ارسطو نے کہا "پلاٹ ڈرامہ کی جان ہے" اور کردار ضمنی اہمیت کا حامل ہے۔ ارسطو کے اس ارشاد کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کے لیے جسم کا ڈھانچہ زیادہ اہم ہے اعلیٰ دماغ اتنا اہم نہیں۔ اعلیٰ دماغی صلاحیت کے بغیر زندگی ممکن ہے مگر بغیر جسمانی ڈھانچے کے ممکن نہیں۔ اسی طرح کہانی کے بغیر ڈرامہ کا وجود ممکن نہیں مگر اعلیٰ ترین جسمانی ڈھانچہ بھی اہمیت کے لحاظ سے اعلیٰ دماغی صلاحیت کے آگے ہیچ ہے۔ شیکسپیئر کے ڈراموں میں بیشتر کہانیاں بجائے خود بے جان ہیں۔ ان کہانیوں کی جان ہیں عظیم کردار ـــــ شیکسپیئر ہی کی طرح گولڈ اسمتھ (GOLDSMITH) ڈکنس (DICKENS) وغیرہ کے یہاں بھی کہانیوں کی اہمیت ضمنی ہے اور کرداروں کی اولین۔ ان کو پڑھنے یا دیکھنے کے بعد ہمیں جو چیز یاد رہتی ہے وہ ہے ان کے کردار ـــــ کہانیاں نہیں۔ اس طرح ارسطو کا یہ فرمان، انگریزی ادب پر تو صادق نہیں آتا ـــــ زیادہ مناسب تو یہ ہوگا کہ کہانی اور کردار کی علیحدہ علیحدہ اہمیت کی بات ہی نہ کی جائے۔

ایک اچھے ڈرامے میں وہ ایک دوسرے سے اس طرح منسلک ہوتے ہیں کہ ان کے علیحدہ وجود کا تصور ناممکن ہوتا ہے۔

یہ تھے ارسطو کے چند ارشادات المیہ ڈرامہ کے بارے میں ـــــ آج کے دور میں ادب کے بارے میں تفصیلی اور طویل مباحثے موجود ہیں مگر سب کو پڑھنے کے بعد بھی ارسطو کی اہمیت کا احساس اور زیادہ ہوتا ہے، کم نہیں ہوتا۔

★

غزل

حمید عظیم آبادی

تو ذرا آ کے یہاں حالت بیمار تو دیکھو کیسا ہے لگا دل کو یہ آزار تو دیکھو
پھر شوخ نظر سے مجھے اک بار تو دیکھو مانگے ہو یہ کیا تم سے مرا پیار تو دیکھو
اظہار محبت پہ بصد ناز وہ بولے اللہ ری! یہ جرأت اظہار تو دیکھو
رہ جائے گا تشنہ ہی مرا ذوق نظر پھر الجھے ہے یہ کیوں گیسوئے خمدار تو دیکھو
سینے پہ سجے زخم یہ گلہائے ارم ہیں آؤ یہ چمن زار یہ گلزار تو دیکھو
ہنس ہنس کے کیا کرتے ہیں انکار وہ لیکن در پردہ محبت کا یہ اقرار تو دیکھو
اب گریۂ پیہم ہے غم ہجر میں دن رات دیکھو یہ مری چشم گہر بار تو دیکھو
ہو جائے کسی طرح تو زخموں کا مداوا تم ایک نظر سوئے دل افگار تو دیکھو
آؤ بھی چلے تم کہ اٹھے پردۂ ظلمت کتنی ہے بھیانک یہ شب تار تو دیکھو
اب جان کی بازی کوئی مقتل میں لگا کر کس شان سے بیٹھا ہے سر دار تو دیکھو
دیوانۂ الفت کو کہاں پاؤ گے گھر میں ہوگا کہیں بیٹھا پس دیوار تو دیکھو
تم حسن مجسم ہو کہے کیوں نہ زمانہ اے اہل نظر حسن کا شہکار تو دیکھو
ہر شہر حمید اب تو ہے اک شہر نگاراں چل پھر کے ذرا کوچہ و بازار تو دیکھو

جعفر عسکری

نئی علامت

فصیلِ صوت و صدا ست باہر زباں کی صورت چمک رہی ہے
زباں کے بیکراں ذخیرے سے لفظ و معنی نکل رہے ہیں
زباں سے فکر و نظر کے بہتے عمیق دریا میں ہے روانی
زباں کی چوکھٹ پہ سارے الفاظ سر بہ زانو کھڑے ہوئے ہیں
زباں ہے اظہار کا وسیلہ
زباں کی بت گری ہی لفظوں کے پتھروں سے علامتوں کے حسین پیکر تراشتی ہے!

اُدھر شعور و نظر سے عاری علامتوں کی ہے حکمرانی
علامتوں کا وسیع صحرا بجز سرابِ فکر و نظر نہیں کچھ
جہاں پہ لفظوں کے ڈھیر اپنی سیاہ بختی پہ رو رہے ہیں
علامتوں کے کثیف دریا میں غرق ہوتے ہوئے معانی سسک رہے ہیں
نئی علامتوں کی شاہراہوں پہ پا شکستہ سبھی معانی بھٹک رہے ہیں
نئی علامت کی قتل گاہوں کی سولیوں پر سبھی معانی لٹک رہے ہیں
نئے علامت نگار طوبیٰ کی شاخِ عریاں پہ مثلِ عنقا چہک رہے ہیں!!

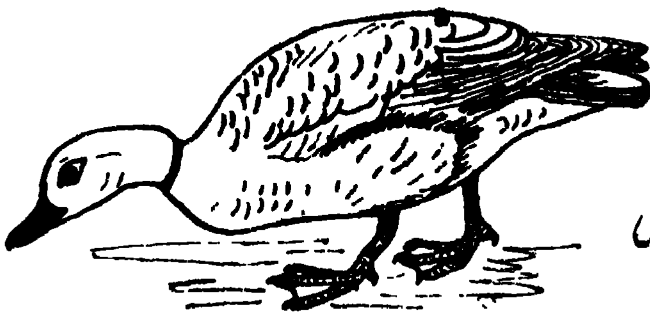
عارف نجمی

یہ بھارت

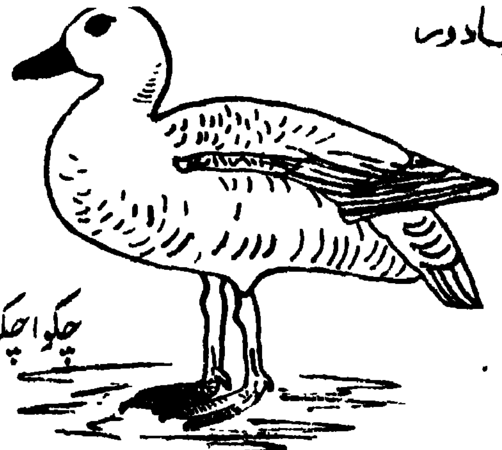
یہ بھارت
جسے آپ کہیے
محبت کا مرکز
زبانوں کا سنگم
اخوت کا درپن

یہ بھارت
جسے آپ کہیے
ادیبوں کا بھارت، سخن ور کا بھارت
فراقؔ اور ساحرؔ کا بھارت
پریم اور منٹو کا بھارت
تقی میرؔ غالبؔ رویندر کا بھارت

یہ بھارت
جسے آپ کہیے
دلیروں کا بھارت شہیدوں کا بھارت
یہ اشفاق بسمل کا بھارت
یہ بوس اور شیکھر کا بھارت
حمید و بھگت جیسے ویروں کا بھارت
جنھیں دنیا کہتی ہے گاندھی جواہر
یہ بھارت ہے ان رہنماؤں کا بھارت
ہمالے سے اونچے تھے کردار جن کے
یہ ہے ان اَمر آتماؤں کا بھارت
یہ بھارت
جہاں
ایکتا دھرم ہے ہر کسی کا
اہنسا جہاں نام ہے زندگی کا
ہم اس دیش کے اک نواسی ہیں نجمی
ہمیں فخر ہونا ہے ہم بھارتی ہیں

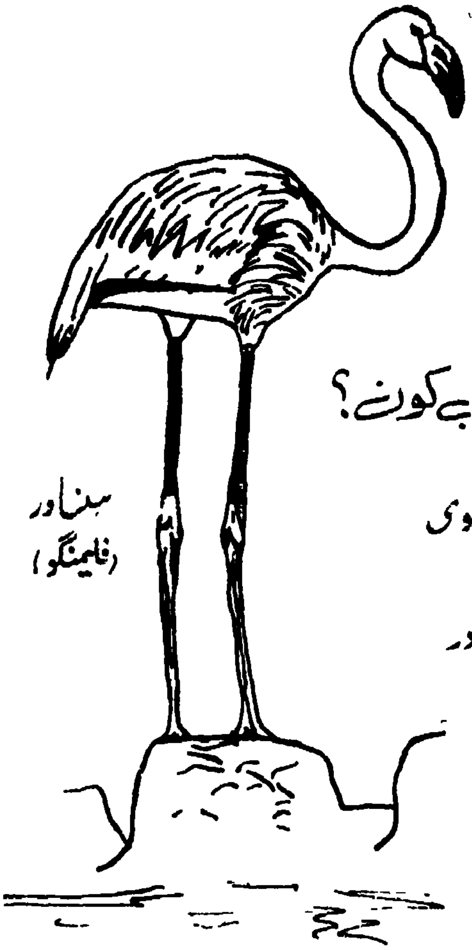


چکوا چکوی



سرخاب کی حقیقت

[illegible]



سرخاب کون؟

ہنس اور (فلیمنگو)

چکوا چکوی
یا
ہنس اور

جب کوئی شخص امتیازی سلوک کی فرمائش کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ کیا تمھارے سرخاب کے پر لگے ہیں؟ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرخاب کے پر نہایت قیمتی ہوتے ہیں اور کمیاب۔ اگرچہ ہمارے ملک میں اب کوئی بھی ان پروں کا استعمال نہیں کرتا لیکن یہ محاورہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ کبھی ضرور سرخاب کے پر طرّہ امتیاز کے طور پر استعمال کیے جاتے ہوں گے۔ تو آئیے دیکھیں وہ کون سی خوشنما چڑیا تھی یا ہے جس کا پر لگانے والا دوسرے سے ممتاز ہو جاتا تھا۔

اُردو کی مشہور لغت فرہنگ آصفیہ[1] میں سرخاب کے بارے میں لکھا ہے:

"ایک آبی پرند کا نام جو رات بھر اپنی مادہ سے جدا رہتا اور ایک دوسرے کو پکارتا اور اس کی آواز کے پیچھے جاتا مگر ملاقات سے محروم اور نہایت مضطرب رہتا ہے۔ اس کا رنگ سرخ ہوتا اور مادہ کو بعض کے قول کے موافق حیض بھی آتا ہے۔ اس کی محبت مشہور ہے۔ جب دونوں میں سے کوئی بچھڑ جاتا ہے یا مر جاتا ہے تو پھر جوڑا نہیں لگتا۔ اگر دونوں میں سے ایک آگ میں ہو تو دوسرا بھی فوراً جا پڑتا ہے۔ اس کو عربی میں نحام، فارسی میں خرچال، ہندی میں چکوا چکوی کہتے ہیں۔" جلد سوم، صفحہ ۶۶

---

[1] مؤلفہ مولوی سید احمد دہلوی (چار جلد) مطبوعہ رفاہِ عام پریس لاہور، مئی ۱۹۰۸ء

کم و بیش یہی باتیں نور اللغات[1] میں درج ہیں اور ثبوت میں چند اشعار بھی پیش کیے ہیں:

شام سے تا صبح دیتے ہو مجھے رنج فراق
کیا ہا اب آدمی میں فرق او سرخاب میں
(ناسخ)

آئی خزاں ہزار کا دل آب ہو گیا
روزِ وصالِ گل شبِ سرخاب ہو گیا
(بحر)

فرہنگ آصفیہ کا یہ خیال نہایت مہمل ہے کہ "مادہ کو بعض کے قول کے موافق حیض بھی آتا ہے۔" اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ گویا سرخاب کی وجہ تسمیہ یہی ہے۔ غالباً سرخاب کے نام کی بنا پر یہ قیاس آرائی کی گئی ہو گی کیونکہ فارسی میں سرخاب کے معنی لال پانی کے علاوہ خون کے بھی ہیں[2]۔

یہ صحیح ہے کہ جس پرند کو چکوا چکوی کہتے ہیں اس کو سرخاب بھی کہا جاتا ہے لیکن اصل میں یہ دونوں مختلف پرند ہیں جن کی خوبیوں کو یکجا کر کے کسی کی پروازِ فکر نے شاعری کے سرخاب کو جنم دیا ہے۔

میں نے چڑیوں کے بارے میں کئی کتابیں دیکھیں[3] تو معلوم ہوا کہ سرخاب یا چکوا چکوی بطخ کی وہ قسم ہے جسے انگریزی میں براہمنی ڈک (BRAHMINY DUCK) یا رڈی شیلڈریک (RUDDY SHELDRAKE) کہتے ہیں۔ اس کی تصویریں بھی دیکھیں اور منڈی میں جا کر اصل کو بھی دیکھا تو مجھے اس کے پر اس قابل نظر نہ آئے کہ کوئی انھیں آرائش کے لیے پگڑی یا ٹوپی میں لگائے۔ اگر واقعی یہی سرخاب ہوتا تو اس کے پر بہت قیمتی فروخت ہو جاتے، حالانکہ بازار میں کوئی ان کا خریدار نظر نہیں آتا۔ یہ بطخ بھی سرخاب نہیں ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے پر سرخ نہیں ہوتے بلکہ سر اور گردن کے پر بادامی اور باقی جسم کے نارنجی بھورے ہوتے ہیں، گردن کے نیچے بسا اوقات سیاہ طوق ہوتا ہے، بازوؤں کے پر سیاہ و سفید اور چمکدار ہرے ہوتے ہیں۔ دُم سیاہ ہوتی ہے۔ مادہ بھی ایسی ہی ہوتی ہے لیکن اس کے سیاہ طوق نہیں ہوتا اور سر اور گردن کے پر ہلکے بادامی ہوتے ہیں، جبکہ سرخاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لال رنگ کی سرخ اور پانی کی کوئی چڑیا ہے۔

یہاں "شب سرخاب" کے بارے میں جو روایت مشہور ہے اس کا جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا، اگرچہ یہ محض شاعری ہے۔

بہت پرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک نوجوان ایک لڑکی سے بہت محبت کرتا تھا اور لڑکی بھی اسے بہت چاہتی تھی لیکن دونوں کے ماں باپ شادی کے مخالف تھے۔ ایک رات وہ لڑکی بھاگ کر اپنے عاشق کے پاس پہنچ گئی لیکن ان کا ملاپ عارضی ثابت ہوا۔ برہما جی نے ناراض ہو کر دونوں کو بطخیں بنا دیا اور کہا اب تم دونوں

---

[1] مولفہ مولوی نور الحسن نیر (چار جلد) جلد سوم صفحات ۳۲۱ — ۳۳۰ مطبوعہ نیر پریس لکھنؤ۔

[2] "صاحب غیاث اللغات و برہان قاطع نے لکھا ہے کہ عورتوں کی طرح اس کی مادہ کو بھی حیض آتا ہے صاحب غیاث اللغات نے اسی سبب کو وجہ تسمیہ بھی قرار دیا ہے۔" مہذب اللغات مولفہ حضرت مہذب لکھنوی جلد ششم صفحہ ۲۹۰ (مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۶۹ء)۔

[3] THE BOOK OF INDIAN BIRDS BY SALIM ALI,
BOMBAY NATURAL HISTORY SOCIETY, BOMBA
(6th Edition 1961) PAGE 109 NO. 217

POPULAR HAND BOOK OF INDIAN BIRDS by HUGH WHISTLER,
GURNEY & JACKSON, LONDON AND EDINBURGH (14th Ed) 1949)
Pages 524-25 Plate XXIV Fig. 3 Opp. Page 506

INDIAN DUCKS AND THEIR ALLIES by E.C. STUART BAKER,
BOMBAY NATURAL HISTORY SOCIETY, BOMBAY (1908) PP. 114-122,
Plate VI.

رات بھر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ ایک دریا کے ایک کنارے اور دوسرا دوسرے کنارے۔ ایک دوسرے کو آواز دو گے لیکن مل نہ سکو گے۔ چنانچہ دن بھر تو وہ ساتھ ساتھ کھڑے یا بیٹھے نظر آتے ہیں لیکن رات کو ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور بڑی بے تابی سے ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں۔ ایک کہتا ہے "چکوی میں آؤں؟" دوسرا جواب دیتا ہے "چکوا تم نہ آؤ۔" اس روایت کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ چکوا چکوی جوڑے بنا کر دریا کے کنارے رہتے ہیں، عام طور پر دن میں آرام کرتے ہیں اور رات کو کھانے کی تلاش میں نکلتے ہیں اور اکثر بچھڑ جاتے ہیں۔ ان کی آوازیں کچھ ایسی ہوتی ہیں جیسے وہ کہہ رہے ہوں "چکوا میں آؤں؟" ...... "چکوی تم نہ آؤ۔"

چکوا چکوی کی وفاداری کی روایت میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے اور غالباً یہ خیال سارس سے ماخوذ ہے جو پرندوں کی دنیا میں نہایت وفادار ہوتا ہے۔ جو جوڑا بنا کر رہتا ہے اور اگر نر یا مادہ میں سے کوئی مر جاتا ہے یا مار دیا جاتا ہے تو دوسرا زندگی بھر تنہا رہتا ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی شکاری ایک کو مار دیتا ہے تو دوسرا اس کا پیچھا کرتا ہے یا وہیں سر پٹخ پٹخ کر مر جاتا ہے اسی لیے بہت سے شکاری سارس کو نہیں مارتے اور اگر مارتے ہیں تو دونوں کو۔

میرے خیال میں وہ پرند جو بجا طور پر سرخاب کہا جا سکتا ہے، اسے ہندی میں راج ہنس، لگ ہنس یا ہنساور اور انگریزی میں فلیمنگو (FLAMINGO) کہتے ہیں۔ یہ پرند سارس سے مشابہ ہوتا ہے۔ اس کی اونچائی پانچ چھ فٹ ہوتی ہے۔ بڑی سی چونچ، ہنس کی ایسی لمبی گردن اور سرخ رنگ کی لمبی پتلی ٹانگیں اس کی خصوصیت ہیں۔ اس کے پر سفید ہوتے ہیں، جن میں گلابی رنگ کی جھلک ہوتی ہے۔ بازوؤں کے پر اندر سے گہرے گلابی ہوتے ہیں۔ جب یہ پرند ہزاروں کی تعداد میں پر پھیلا کر، گردن اور ٹانگیں لمبی کر کے اڑتے ہیں تو پروں کی سرخی سے آسمان کچھ دیر کے لیے لال ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شفق نکلی ہو۔ یہ منظر اتنا حسین ہوتا ہے کہ اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ پانی کی چڑیا اور سرخ پر۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ کوئی دوسرا پرند سرخاب کہے جانے کا مستحق نہیں۔

اس کے انگریزی نام سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ فلیمنگو (FLAMINGO) دراصل پرتگیزی زبان کا لفظ ہے اور لاطینی فلیما (FLAMMA) سے نکلا ہے جو انگریزی فلیم (FLAME) کا ماخذ ہے، جس کے معنی ہیں "شعلہ" گویا فلیمنگو کی وجہ تسمیہ اُس کے شعلے کی طرح کے سرخ پر ہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ وسطی امریکہ کی ایک قسم کی چڑیا کے سارے جسم کے پر گہرے لال یا گلابی رنگ کے ہوتے ہیں اور بعض نے اسے سیندور کے رنگ کا بتایا ہے[1]

ہنساور کی چھ قسمیں ہوتی ہیں جو دنیا کے گرم خطوں میں پائی جاتی ہیں۔ اسے آپ عجائب گھروں میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ہمارے ملک میں بھی پایا جاتا ہے لیکن ایک خاص موسم میں اسے آپ مانسون ختم ہونے پر رن کچھ میں دیکھ سکتے ہیں۔ جہاں یہ ہزاروں کی تعداد میں غول کے غول انڈے دینے کے لیے جمع ہوتے ہیں ہنساور کا گھونسلہ مٹی کا گھروندا ہوتا ہے جس کی اونچائی ۱۲ سے لے کر ۱۴ انچ تک ہوتی ہے۔ اسے بنانے کے لیے ہنساور اپنی چونچ سے ڈوئی کا کام لیتا ہے اور پانی کے اندر سے مٹی نکال نکال کر جمع کرتا ہے۔ اس کے پنجے بطخ کے جیسے پاؤں کپی کا کام دیتے ہیں۔ گھونسلہ بنانے کے

---

[1] ARTICLES ON 'FLAMINGO' IN ENCYCLOPEDIA BRITANNICA VOL 9 P. 354.
ENCYCLOPEDIA AMERICANA (1963) VOL. II P. 330.
COLLIERS' ENCYCLOPEDIA VOL. 7. P. 509.
CHAMBERS' TWENTIETH CENTRURE DICTIONARY (1953) P. 403.

بعد اُس کی مادہ اس گھونسلے میں ایک یا دو انڈے دیتی ہے جنھیں نر اور مادہ باری باری سیتے ہیں۔ اس کے لیے انھیں دو زانو ہوکر اپنے تودہ نما گھونسلہ پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ پانی سے گھرا ہونے کی وجہ سے انڈوں کے دشمن اس کے گھونسلے تک نہیں پہنچ پاتے اور پانی کے جانور اس کی خوفناک چونچ دیکھ کر دور رہتے ہیں۔

میں نے اپنے قیاس کے بارے میں عالمی شہرت یافتہ پرندوں کے ماہر ڈاکٹر سالم علی صاحب کی رائے جاننا چاہی اور یہ معلوم کرنے کے لیے ایک خط لکھا کہ ہندستانی زبانوں میں سرخاب کے کیا کیا نام ہیں۔ کیا اُسے کہیں سرخاب بھی کہا جاتا ہے اور کیا اس کے پر جسمانی آرایش کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں؟ انھوں نے اپنے مکتوبِ گرامی مورخہ ۸ر جون ۱۹۷۱ء میں مطلع فرمایا کہ "سرخاب (نام) عام طور پر براہمنی ڈک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جسے چکوا چکوی بھی کہتے ہیں۔۔۔۔ جہاں تک مجھے علم ہے سرخاب نام عام طور پر فلیمنگو کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ اگرچہ کبھی کبھی اسے سرخاب کہتے سنا ہے۔ جن آرایشی پروں کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ فلیمنگو کے ہو سکتے ہیں لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے بڑے پرندوں کے سفید پر مصنوعی طور پر رنگ لیے جاتے ہوں۔ مجھے علم نہیں کہ فلیمنگو کے پر زیبائش کے لیے بڑے پیمانے پر یا تجارتی طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔" (انگریزی سے ترجمہ)

جہاں تک مجھے علم ہے اُردو والے طبقے میں غالباً میں پہلا شخص ہوں جس نے چکوا چکوی کے سرخاب ہونے پر شک و شبہ کا اظہار کیا اور ایک ایسے پرند کی نشاندہی کی جسے بجا طور پر سرخاب کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سالم علی صاحب کے جواب میں یہ بات امید افزا ہے کہ انھوں نے بعض لوگوں کو فلیمنگو کو سرخاب کہتے سنا ہے۔ بہرحال اس خط و کتابت کے بعد میں اس دلچسپ مسئلہ کو نظر انداز کرکے دوسرے مشاغل میں لگ گیا لیکن مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور تقریباً دو سال بعد مجھے اپنے قیاس کی صحت کا ناقابلِ تردید ثبوت مل گیا اور وہ تھا اُردو ڈائجسٹ شبستان (نئی دہلی) کے فروری ۱۹۷۳ء کے شمارے میں حمید آرمودی صاحب کا مضمون "سرخاب" (صفحات ۳۳، ۳۰) جس میں انھوں نے فلیمنگو کا سرخاب کے نام سے ذکر کیا ہے۔ یہ مضمون اتنا دلچسپ اور پر از معلومات ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس کے چند اقتباسات پیش کروں:

"سرخاب ایک آبی پرندہ ہے جو گروہ پسند ہوتا ہے اور ٹکڑیوں کی شکل میں اڑتا پھرتا ہے۔ ایک ٹکڑی میں کئی ہزار سرخاب ہوتے ہیں۔ جب یہ ٹکڑی کسی دریا، جھیل اور تالاب پر جمع ہو جاتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے پانی میں آگ لگی ہے۔"

"سرخاب جب اپنے پنکھ کھولتا ہے تو اس کی بغل میں گہرے گلابی یا سرخ دھبے (SHADES.) آنچ کی طرح چمکتے ہوئے بڑے بھلے لگتے ہیں۔ پرواز کے دوران ہر لمحہ اس کی کیفیت (PATTERN.) بدلتی رہتی ہے۔ البتہ جب وہ اپنے پروں کو سمیٹ لیتا ہے تو بگلے کی طرح سفید نظر آتا ہے۔"

"وہ ہر سال مانسون کے اختتام پر نقل مکان کرتے ہیں۔ ہندستان میں عظیم رن آف کچھ (RANN OF KUTCH) ان دنوں سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بن جاتا ہے جب کہ یہ پرند وہاں ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ اور جہاں تک نظر جاتی ہے ایک سرخ جھیل سی نظر آتی ہے۔"

"سچ تو یہ ہے کہ سرخاب کو سرخاب بنانے والے اُس کے یہی پر ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے اُس کی شہرت میں چار چاند لگے اور ان خوب صورت شاندار پروں ہی کی بدولت وہ تمام پرندوں میں ایک ممتاز و منفرد مقام رکھتا ہے۔ سفید پر میں گہرا گلابی یا سرخ رنگ آنچ کی مانند چمکتا ہوا بڑا ہی سندر لگتا ہے۔ یہ پرند جب کسی دریا یا جھیل کی سطح پر ہوا کے جھونکوں سے ہلکورے لیتا ہوا ادھر ادھر بہتا ہے تو ایک ناقابلِ بیان دلکش منظر پیش کرتا ہے۔۔۔"

"اردو ادب میں سرخاب کا پر محاورے میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر عہدِ قدیم میں یہ پر شاہوں کے تاجوں کی زینت

ہوا کرتا تھے نائٹس (KNIGHTS) اور فوجی اعلیٰ افسروں کو ان کی شجاعت و بہادری کے صلے میں یہ اعلیٰ اعزاز کے طور پر عطا کیے جاتے تھے۔ آج بھی یوروپین اور امریکن اسے اپنی ولایتی ٹوپیوں میں بڑے فخر سے لگاتے ہیں۔"

"بیرونی منڈیوں میں بھی سُرخاب کے پروں کی بڑی قدر ہے۔ مگر اس کا حصول بڑا مشکل ہے۔ کہر، برابر دلدل اور گہری جھیلوں میں اتر کر سُرخاب پر دھاوا بولنا ہر شکاری کے بس کا روگ نہیں۔ یہ پرندہ اتنا ہوشیار اور چالاک ہوتا ہے کہ بڑی مشکل ہی سے شکاریوں کے دام فریب میں آتا ہے تب ہی تو اس کے پر بہت ہی بیش قیمت ہوتے ہیں اور منہ مانگے داموں بکتے ہیں۔"

حمید آرموری صاحب کے مضمون کے بعد ایک دوسرا مضمون نظر سے گزرا "سُرخاب کے بچے" (دھرم یُگ' انک ۲۱، ۹/۲۶ ستمبر ۱۹۷۴ء، صفحہ ۴۳، مضمون نگار آر کے، راؤ)۔ مضمون چھوٹا ہے، اس لیے اس کا ترجمہ بے محل نہ ہوگا:

"بچو۔ تم نے ایک محاورہ سرخاب کے پر تو ضرور سُنا ہوگا۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کوئی خاص بات ہونا۔ سُرخاب کے گلابی رنگ کے پر بڑے دلکش ہوتے ہیں۔ اگر تم سرخاب دیکھنا چاہو تو چڑیا گھر میں جا کر دیکھ سکتے ہو لیکن احمد آباد کے چڑیا گھر میں تو سرخابوں نے اپنا گھر بنا لیا ہے۔ ابھی تک کئی طرح کے سرخابوں کو یورپ اور شمالی امریکا کے چڑیا گھروں میں تو بچے دیتے سنا گیا تھا[1]۔ لیکن احمد آباد کے اس چڑیا گھر میں بھی سرخابوں نے بچے دیے ہیں۔ کسی ایشیائی چڑیا گھر کے لیے یہ پہلا واقعہ ہے۔ پچھلے کئی سال سے احمد آباد کے چڑیا گھر میں سُرخابوں کے بچے ہوتے رہے ہیں۔ اصل میں چھوٹی نسل کے سُرخاب بڑی نسل کے سُرخابوں کے مٹی کے تودہ نما گھونسلوں پر قبضہ کر کے ان کے انڈوں اور بچوں کو ضائع کر دیتے تھے۔ جب دونوں کو الگ کر دیا گیا تو بڑی نسل کے سُرخابوں کا خاندان بڑھنے لگا۔ بھارت میں کچھ کے رن میں بڑی تعداد میں سُرخاب آکر بچے دیتے ہیں۔"

ان مضامین کو پڑھنے کے بعد مجھے پورا یقین ہو گیا کہ اصلی سُرخاب ہنساور (فلیمنگو) ہے اور چکوا چکوی کو سُرخاب کہنا غلط ہے یہ بالکل ممکن ہے کہ زمانۂ قدیم میں پیشہ ور شکاری کچھ کے رن سے اس کے پروں کو لا کر اُمرا کے ہاتھ فروخت کرتے رہے ہوں اور دریافت کرنے پر پرند کا نام "سرخاب" بتا دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ جب کسی نے یہ پرند دیکھا ہی نہ ہو تو وہ اس کے پر کہاں سے لاتا۔ ایسی حالت میں ان پروں کے منہ مانگے دام مل جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اس طرح سرخاب کے پر نے طرۂ امتیاز کی شکل اختیار کر لی جس کا حاصل کرنا ہر کس و ناکس کے لیے ممکن نہ تھا۔

سُرخاب کے بارے میں میں اپنی تحقیقات کو نامکمل سمجھتا ہوں اور چند شبہات اب بھی برقرار ہیں میں نے آج تک کسی بھی قدیم یا جدید تصویر میں کسی کے تاج یا ٹوپی میں سُرخاب کے پر لگے نہ دیکھا۔ اگر آپ نے دیکھا ہو تو مجھے ضرور بتائیے کہ وہ تصویر کہاں دیکھنے کو مل سکتی ہے۔ سُرخاب کے پروں کی تجارت کے بارے میں یا ہنساور (فلیمنگو) کے لیے سُرخاب نام استعمال کیے جانے کے بارے میں اگر کوئی صاحب مزید معلومات فراہم کریں تو یہ ایک بڑی علمی و ادبی خدمت ہوگی۔

★

[1] یہ جملہ اصلاح طلب ہے مطلب ہے انڈے دیتے اور انڈے سے کر بچے نکالتے۔

غزل

شاداں بارہ بنکوی

سورج کی طرح روشن یہ ایک حقیقت ہے
کردار ہی انساں کا، انسان کی عظمت ہے

گرنے کو ہے اے شاداں دیوارِ عداوت بھی
بس ایک محبت کے تیشے کی ضرورت ہے

اے کاش محبت کا ایک چاند نکل آئے
ہر سمت زمانے میں پھیلی ہوئی ظلمت ہے

واللہ عجب شے ہے یہ دردِ محبت بھی
ہے ان کی خطا، مجھ کو احساسِ ندامت ہے

وہ ہجر کا عالم ہو یا کوئی بھی موسم ہو
اے دوست ہمیں تیری ہر وقت ضرورت ہے

اخلاص کا پیکر ہے ہر فصل مرا شاداں
پھر بھی مرے یاروں کو مجھ سے ہی شکایت ہے

خان اختر

غزل

اشکِ غمِ ہستی کی قوت کو بڑھاتا ہے
بیدادِ زمانہ کی دیوار گراتا ہے

مشکل ہے بہت لیکن یہ کر کے دکھانا ہے
جاتے ہوئے لمحوں کو مٹھی میں دبانا ہے

ظلمات کے پردوں کو ہر گھر سے ہٹانا ہے
سورج کی شعاعوں کو قندیل بنانا ہے

سرحد کا محافظ ہے ہر حسنِ عمل اپنا
جو دیش کے دشمن ہیں ان کو یہ بتانا ہے

اس دور کے انساں کا عالم ہے عجب عالم
سوچو تو حقیقت ہے دیکھو تو فسانا ہے

محتاج جو کل تک تھے کھیت اور زمینوں کے
ان سب کو بہر صورت مختار بنانا ہے

صدمات کی موجوں سے ہم اس لیے کھیلے ہیں
اک روز مسرت کے دریا میں نہانا ہے

کہتے ہیں جو دنیا میں دعویٰ خود آگاہی
ان سب کو اہنسا کا پھر پاٹھ پڑھانا ہے

ٹھکراؤ نہ تم اس کے ماتھے کے پسینے کو
مزدور کی قوت سے خوش حال زمانا ہے

ہے ناز اگر اختر مہتاب نشینوں کو
ہم کو بھی جہاں اپنا تاروں پہ بسانا ہے

ترجمے کے چند اہم پہلو

عابدہ فاطمہ

پروفیسر رشید احمد صدیقی سے کسی نے پوچھا کہ PARASITE کا اردو ترجمہ کیا ہوگا؟ انھوں نے ذرا دیر تامل کیا اور فرمایا: طفیلی کیڑے۔

رشید صاحب نے اس انگریزی لفظ کے ترجمہ میں جو اصول برتا ہے وہ نہایت اہم ہے اور تمام ترجمہ کرنے والوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ اس میں دو جانے بوجھے لفظوں کو ملا کر ایک نیا لفظ بنایا گیا ہے۔ جس وقت فرائڈ کے ترجمے جرمن زبان سے انگریزی میں کیے گئے تو یہی اصول برتا گیا مثلاً FIXATION بمعنی ذہنی تعین یا UNCONSCIOUS بمعنی غیر شعوری۔ استعمال سے ان لفظوں کی اجنبیت جاتی رہی اور اب وہ انگریزی زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔

اردو کے بعض معترضین جب ترجمہ کو پڑھتے ہیں تو مترجم پر خفا ہوتے ہیں۔ ان کی ناراضگی مترجم سے زیادہ ترجمہ کی اجنبیت پر ہوتی ہے۔ اگر ہم ایک مضمون مثلاً معاشیات سے ناواقف ہیں تو اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے جو زبان بھی اختیار کریں گے وہ نئی اور اجنبی معلوم ہوگی۔

اردو میں نئے الفاظ روز بروز داخل ہو رہے ہیں اس لیے کہ زندگی ایک نامیاتی حقیقت ہے۔ وہ برابر رواں دواں ہے اور پھیلتی اور بڑھتی رہتی ہے۔ ان نئے الفاظ میں سے جو لفظ اردو زبان کے مزاج کے مطابق ہیں وہ زندہ رہیں گے باقی مرجائیں گے۔ اردو کی یہ خوبی لائق ردیے کی ہے کہ وہ نئے لفظوں کو خوش آمدید کہتی ہے۔ وہ الفاظ چاہے کسی زبان اور کسی ملک سے بھی آئے ہوں اردو ان کو حقیر یا برا نہیں جانتی یہی وجہ ہے کہ اردو میں اسی فی صدی سے زیادہ الفاظ سنسکرتی ہیں[1] باقی پندرہ فی صدی فارسی، انگریزی، پرتگالی، ترکی، عربی وغیرہ سے آئے ہیں[2] انگریزی میں دیسی یا اینگلو سیکسن ANGLO SAXON الفاظ کی تعداد اس سے بھی کم ہے۔ اس میں زیادہ تر الفاظ باہر سے آئے ہیں یعنی لاطینی، یونانی، اور فرینچ وغیرہ سے اور یہی اس کی قوت کا اصلی راز ہے۔

۱۹۱۹ء کے بعد مشرقی یورپ میں نئی حکومتیں وجود میں آئیں اور ان ہی کے ساتھ وہ زبانیں ابھریں جو اب تک صرف کسانوں اور مزدوروں کی بولیاں تھیں مثلاً LITHUANIAN اور ESTONIAN- یہی کیفیت آئرش زبان کی تھی لیکن اس نے نئے الفاظ کے بنانے یا لینے پر اعتراض نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آئرش انگریزی کے برگد کے نیچے زیادہ پھول پھل نہیں سکی۔ سوویت دیس کی بہت سی زبانوں نے جن کے پاس حروف ہجا بھی نہیں تھے ترجمہ کے ذریعہ اپنے آپ کو خزینہ دار بنایا ہے اور اب وہ بیسویں صدی کے مطالب و مسائل

---

[1] جواہر لال نہرو: تلاش ہند (انگریزی) طبع لندن ۱۹۶۰ ص ۱۵۸

[2] رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو انگریزی ایڈیشن ص ۵

کو ادا کرسکتی ہیں۔

ترجمہ کے ذریعہ ادب میں نئے خیالات، نئے جذبات اور نئے اسالیب شامل ہوتے ہیں اور وہ پہلے سے زیادہ مالدار ہوجاتا ہے۔ ٹالسٹائے نے اپنی ۱۸۵۱ عیسوی کی ڈائری میں ایک جگہ لکھا ہے:

"مجھے دوسری زبانوں سے روسی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیے تاکہ میرا حافظہ اور طرزِ انشا بہتر ہوسکے۔"

اردو میں ڈاکٹر سید عابد حسین اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے شیوۂ نگارش میں جو دلکشی ہے اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ان دونوں کو ترجمے کے کام سے دلچسپی رہی ہے۔

ترجمہ کے کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ روس میں تو اسے اصل تصنیف پر ایک قسم کی برتری حاصل ہے[۱] اور اس کا شمار ادبی صناعت میں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ "مترجم کو دوسروں کے خیالات و تصورات کے لیے جسم و لباس اور نئے الفاظ تلاش کرنا پڑتے ہیں۔" گویا ترجمہ کرنے والے کو مصنف کی تخلیق کی دوبارہ تخلیق کرنا پڑتی ہے بقول مغیث الدین صاحب فریدی ؎

بیاں کے رنگ، لفظوں کی قبا کے بانکپن بدلے
زباں تک آتے آتے دل نے کتنے پیرہن بدلے

اور یہ کام معمولی نہیں ہے۔

اطالوی ضرب المثل ہے کہ ترجمہ اصل کے ساتھ ایک قسم کی غداری ہے۔ اس لیے کہ زبان تک آتے آتے دل کے پیرہن بدل جاتے ہیں۔ اسی لیے آج اس پر زور دیا جاتا ہے کہ ترجمہ میں اصل کی خوشبو باقی رہے اور وہ نئے لباس میں اجنبی نہ معلوم ہو۔ بہت کچھ انحصار اس بات پر ہے کہ ہم ترجمہ کیوں کر رہے ہیں اور اس کے مخاطب اصلی کون ہیں؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ "مترجم، ماضی کو پوری تفصیل سے دیکھ سکے۔ اس فرق کو محسوس کرسکے جو ماضی اور حال میں ہے اور پھر وہ ماضی کو اس طرح پیش کرسکے جیسے کہ حال اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے[۲]۔"

اردو میں ترجمہ کی روایت قدیم ہے۔ میر تقی میر نے تذکرہ نکات الشعرا میں لکھا ہے کہ حضرت سعد اللہ گلشن نے ولی دکنی کو یہ نصیحت کی تھی:

ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اند، در ریختہ خود بکار ببر[۳]

اس کے بعد سے بقول مصحفی شعر ریختہ میں فارسی کا تتبع ہونے لگا اور طالب آملی اور شفائی کے طرز پر شعر کہے جانے لگے۔ متاخرین شعرائے فارسی کے دل انگیز اشعار کا ترجمہ مرزا مظہر، میر، قائم اور راسخ عظیم آبادی وغیرہ نے اردو میں کیا ہے۔ سودا نے تو فارسی سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ ان پر "توارد صاف" اور "سرقۂ صریح" کا الزام ہے[۴]۔

اردو میں میر و میرزا سے لے کر ترقی اردو بورڈ تک ترجمہ کی ایک سیدھی لکیر اور مسلسل روایت ہے۔ ان میں اچھے اور برے سب طرح کے ترجمے ہیں جن کو زمانہ خود چھانتا اور پھٹکتا ہے۔ لطیف الدین احمد اکبرآبادی نے روسی مضمون کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ آرمینیا کے دیہاتوں میں یہ بات ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے کہ برا ترجمہ فوراً خارج از ادب ہوجاتا ہے۔ یونانی زبان میں ٹرانس لیشن کے معنی ہیں ایک قبر سے نکال کر دوسری قبر میں دفنانا۔ یہ بات کہیں صحیح ہو نہ ہو برے ترجمہ پر ضرور صادق آتی ہے[۵]۔

★

---

[۱] ل احمد اکبرآبادی مترجم: بین الاقوامی مترجمین کی تیسری کانفرنس کانفرنس ماسکو ۱۹۶۳ء، ترجمہ اور ثقافت۔ شاعر فروری ۱۹۷۶ء
[۲] ELIOT: SELECTED ESSAYS, 1932: P 64.
[۳] نکات الشعرا مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی ص ۹۱۔
[۴] ل احمد: شاعر فروری ۷۶ء، مضمون مذکورۂ صدر

عمل کا سورج

علی عباس امید

صبح کے گاؤں پہ بکھرا تھا شبوں کا آنچل
درد میں ڈوبی تھی ماحول کے ہونٹوں کی غزل
پھیلنے ہی کو تھا ہر آنکھ کے دل میں کاجل

زندگی کیا تھی بس اک زخم بنی جاتی تھی
دل کے جذبات فقط آنکھ سے برساتی تھی
سچ یہ ہے اپنے ہی حالات پہ شرماتی تھی

تو کہ اک شمع ہے آباد اندھیروں کے لیے
تو کہ اک سانس ہے بے روح سویروں کے لیے

زندگی تیرے اصولوں سے درخشاں ہے بہت
تیرگی تیرے خیالوں سے فروزاں ہے بہت
صبح کیا اب تو ہر اک شام ہی تاباں ہے بہت

صبح کے گاؤں پہ بکھرا تھا شبوں کا آنچل
اور اجالوں میں تھا آوارہ اندھیروں کا عمل
ہاں مگر آج ترے حسنِ عمل کا سورج
یوں فروزاں ہے کہ راتوں کا جگر پھٹتا ہے
صبح کے گاؤں سے اب ان کا دھواں چھٹتا ہے

قدم بڑھا رواں دواں

نظر برنی

ہر اک قدم رواں دواں
مسرتوں کے رازداں
امینِ دل رہینِ جاں
نقیبِ شوقِ بیکراں
ندیمِ روحِ گلستاں
قدم بڑھا رواں دواں
نگاہ و دل کے رازداں
نظر میں داستان رکھ
خیالِ گلستان رکھ
ارادے اب جوان رکھ
سجا لے عزم کارواں
ہر اک قدم رواں دواں
روش روش جوانیاں
گلوں کی ہیں کہانیاں
کسی کی مہربانیاں
شگفتگیِ گل کی جاں
ہر اک قدم رواں دواں
خرد کا نام تازگی
بسا نظر میں بندگی
سمجھ رموزِ زندگی
سنبھل کہ جانِ کارواں
قدم بڑھا رواں دواں
خیال اور باوقار!
زمانہ ہوگا سازگار!
ہر ایک موڑ ہوشیار!
نگاہ لطفِ داستاں
ہر اک قدم رواں دواں
صبا کی باگ تھام لے
مسرتوں کا جام لے
پیام لے سلام لے
چمن کا بن کے پاسباں
قدم بڑھا رواں دواں

لرزتی دیواروں کے سائے

(افسانہ)

[illegible]

الفاظ اتنے دھندلے ہوگئے ہیں کہ کچھ بھی پڑھا نہیں جاتا۔

میں حویلی کے قد آدم پھاٹک پر لگی تختی کے الفاظ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جانے عبارت کس زبان میں ہے اور کس زمانے کی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ دیواروں پر کائی جم چکی ہے پھاٹک کا رنگ و روغن کب کا مٹ چکا ہے۔ وقت کے تیزاب نے اس حویلی کی ساری خوب صورتی پر کیمیائی عمل کیا ہے۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔ پھاٹک پر لگا ہوا وزنی تالا زنگ آلود ہو چکا ہے۔ میں چھید میں چابی ڈال کر گھمانے کی کوشش کرتا ہوں۔ پوری طاقت صرف کرتا ہوں تو تالا ایک کھٹاک کی آواز کے ساتھ کھل جاتا ہے۔ میرا دل زوروں سے دھڑک رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اچھل کر حلق میں آپھنسے گا۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میں بھاری بھرکم دروازوں کو دھکا دیتا ہوں۔ چرچراہٹ کی آواز آتی ہے — خاموشی کے پنچھی پر پھڑپھڑا کر اڑ جاتے ہیں۔

اندر اندھیرا ہے میں ٹارچ روشن کرتا ہوں۔ روشنی کے ہالے میں مجھے فرش سیلا ہوا نظر آتا ہے۔ بدبو کے زوردار بھبکے ناک میں گھس جاتے ہیں۔ بہت سی چمگادڑیں زوروں کا شور کرتی ہوئی ہال کا چکر کاٹنے لگتی ہیں۔

جلدی جلدی میں اپنے حواس درست کرتا ہوں اور لرزتے ہوئے قدم چوکھٹ کے اندر رکھ دیتا ہوں۔

وقت ہر چیز کو کس طرح چاٹ کر ختم کر دیتا ہے۔ کبھی یہ عمارت بے حد عالیشان رہی ہوگی۔ آج اس پہ وحشت برس رہی ہے۔ میں یہاں اپنے بزرگوں کی عظمت رفتہ تلاش کرنے آیا ہوں۔ وہ عظمت جو کہیں گہرے دھندلکوں میں گم ہو گئی ہے۔ ماضی کی چھاؤں میں پناہ لے کر انسان کو کبھی بڑے سکون کا احساس ہوتا ہے میں ہمیشہ سے ماضی پرست رہا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ میں حال سے آنکھیں چراتا ہوں بلکہ اس لیے کہ ماضی میں جھانکنے والی آنکھیں حال اور مستقبل کے دریچوں پر دستک دیتی رہتی ہیں۔

چمگادڑیں مسلسل چیخ رہی ہیں۔ انھیں اپنی عمل داری میں کسی دوسرے کی دخل اندازی گراں گذر رہی ہوگی۔ انسان بھی تو ہر جگہ صرف اپنی عمل داری دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن یہاں تو کوئی انسان نہیں ہے۔ بس میں ہی تو ہوں۔ تنہا اور واحد میں۔

چھتوں اور دیواروں سے لٹکتے ہوئے لمبے لمبے جالے بھی ماضی کی داستان سناتے ہیں۔ ان جالوں سے لپٹے ہوئے لمبے لمبے پیروں والے فریبی مکڑے ہر وقت شکار کی تاک میں بیٹھے رہتے ہیں۔ جال سے کہیں بھی مفر نہیں ہے۔ خواہ وہ سمندر اور جھیل میں ڈالا گیا پُر فریب جال ہو، تارِ عنکبوت ہو یا مایا جال۔ سب کا مقصد ایک ہی ہے۔ کسی کو الجھانا۔

میں جلدی سے ایک راہداری میں مڑ جاتا ہوں۔ میرے ہی پیروں کی چاپ میرا تعاقب کر رہی ہے۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکن بھی صاف سنائی دے رہی ہے۔

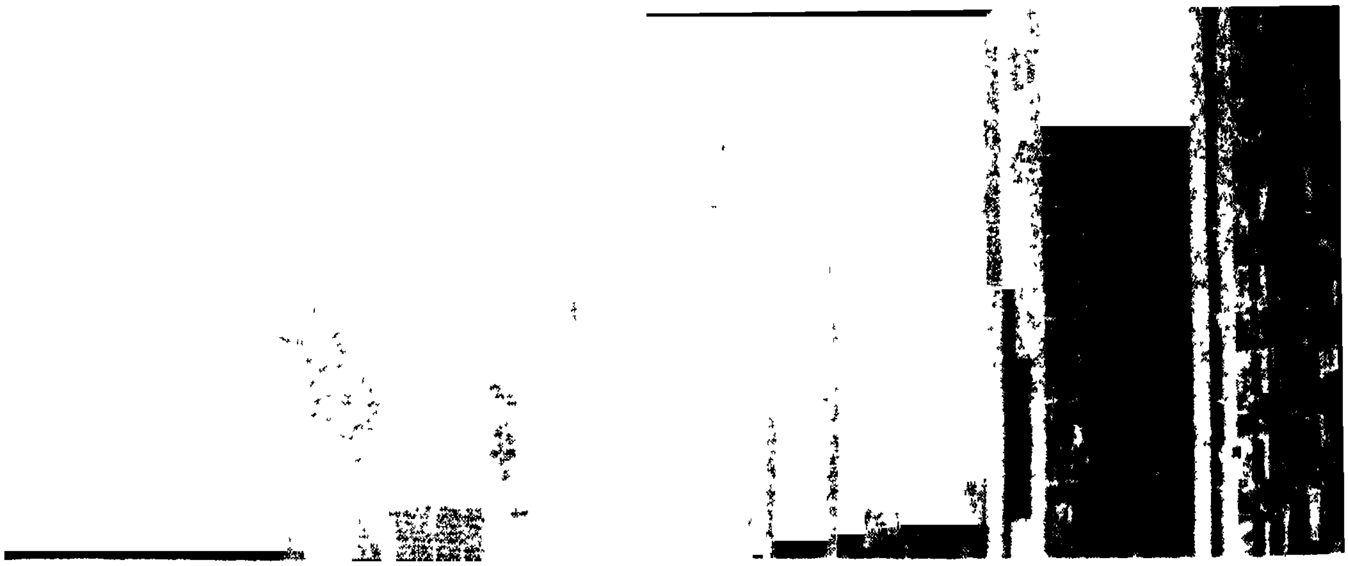
میں ایک بار پھر سوچتا ہوں عظمت رفتہ کی تلاش میں اپنے کارواں سے بچھڑ کر میں کہاں سے کہاں آگیا ہوں۔ کھوئے ہوؤں کی جستجو کرنا پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے اور میں انھیں کھوئے ہوؤں کی تلاش میں جانے خود کہاں کھو گیا ہوں۔



گورنر اتر پردیش ڈاکٹر ایم چنا ریڈی جب یکم دسمبر ۱۹۷۵ء کو
صدر راج کے قیام کے بعد پہلی بار ودھان بھون تشریف لائے
تو چیف سکریٹری شری محمود بٹ نے ان کا استقبال کیا۔ یہ
تصویر اسی موقع کی ہے

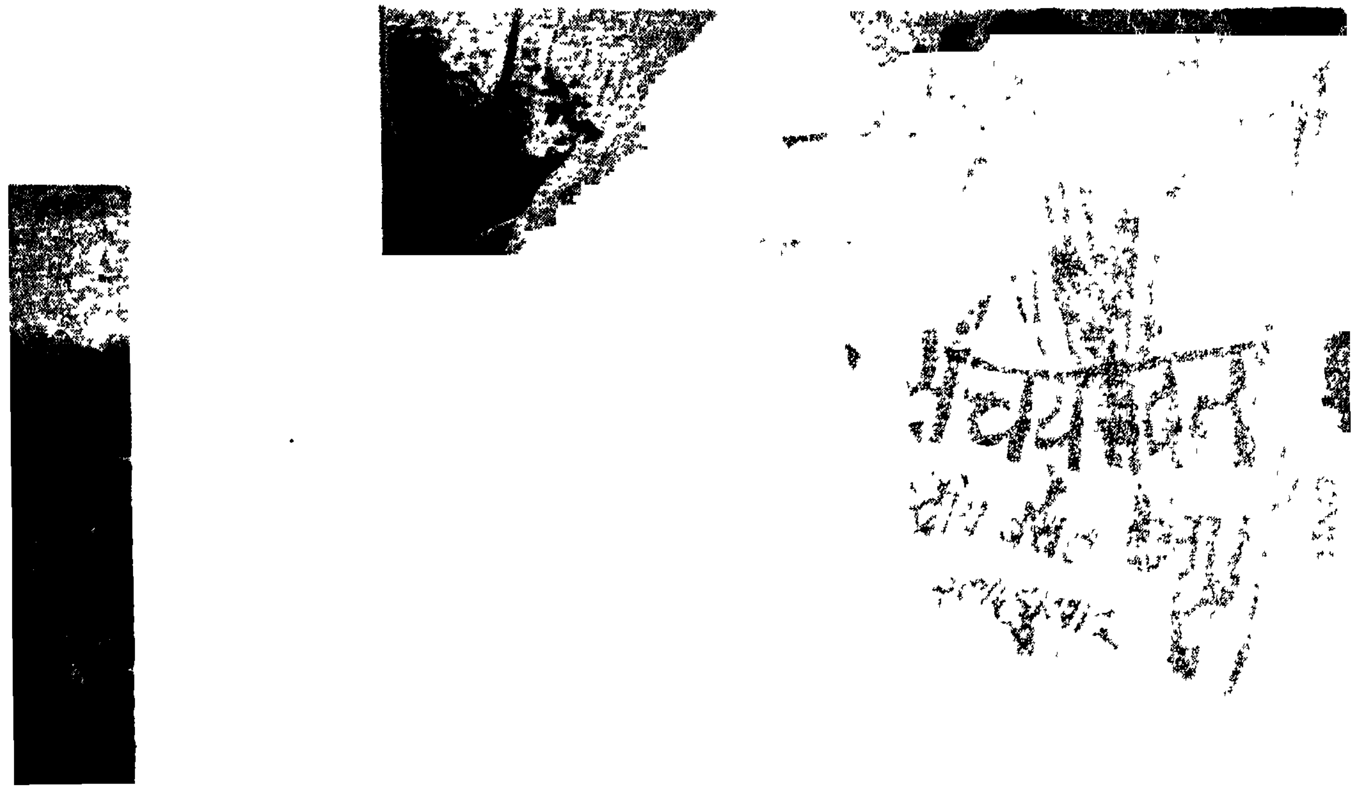
گورنر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی محمود آباد ضلع سیتا پور میں کسانوں کو زمینوں کے پٹے تقسیم کرتے ہوئے

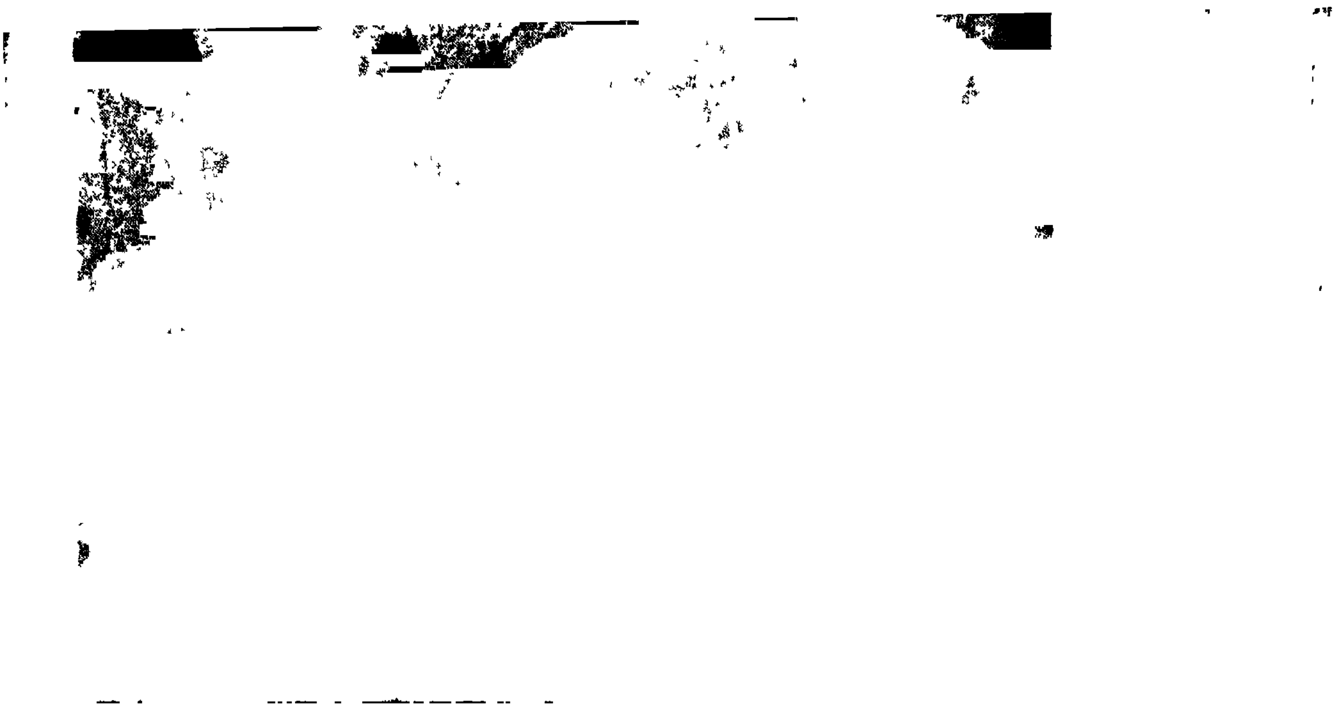




گورنر اترپردیش ڈاکٹر ایم چنا ریڈی، ۲؍دسمبر ۱۹۷۵ء کو علی گڑھ میں نو تعمیر شدہ ٹیلیفون ایکسچینج کا افتتاح کر رہے ہیں

گورنر اترپردیش ڈاکٹر ریڈی الہ آباد میں ۲۲؍دسمبر ۱۹۷۵ء کو قومی بچت اسکیم کے
تحت تعمیر شدہ "سنچے بھون" کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے





گورنر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی "کشٹ سیوا آشرم" جھانسی میں ۱۸ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو
جذام کے مریضوں سے بات چیت کرتے ہوئے

گورنر اتر پردیش ڈاکٹر ایم. چنا ریڈی ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو رائے بریلی میں فیروز گاندھی ڈگری کالج کے
یوم تاسیس کے موقع پر تقریر کر رہے ہیں



گورنر اتر پردیش ڈاکٹر ایم چنا ریڈی، ۸ دسمبر ۱۹۷۵ء کو کانپور میں گرو تیغ بہادر کی ۳۰۰ سالہ برسی کے موقع پر منعقدہ ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے

گورنر اتر پردیش ڈاکٹر ایم۔ چنا ریڈی، رویندرالیہ میں منعقدہ میونسپل نرسری اسکول کے سالانہ جلسے کے موقع پر بچوں کا کلچرل پروگرام دیکھ رہے ہیں



مجھے اچانک ایک زوردار ٹھوکر لگتی ہے اور میں گرتے گرتے سنبھل جاتا ہوں۔ یہ ایک بڑا سا بکس ہے۔ میرا جذبۂ تجسس پھر جاگ اٹھتا ہے۔ میں اس کا ڈھکن کھول دیتا ہوں، ایک بوسیدہ بو اڑتی ہے اور میں ایک ایک چیز نکالتا ہوں۔

بہت سے کپڑے برآمد ہوتے ہیں جن سے کینگی کی بو آ رہی ہے ان پر خون کے بہت سے پرانے دھبے ہیں۔ جلدی جلدی میں پھر انھیں واپس بکس میں ڈال دیتا ہوں۔ مجھے خیال آتا ہے کہ میں اس جگہ سکون کی تلاش میں آیا ہوں لیکن افسوس ماضی کے دریچوں میں جھانکنے سے بھی وہی خوفناک مناظر نظر آ رہے ہیں؟ اب کہاں جاؤں، کدھر جاؤں؟

آگے دیواروں پر آلاتِ حرب لٹکے ہوئے ہیں۔ تلواریں، بندوق ڈھال، زرہ بکتر، کارتوس کی پیٹیاں ــــــــ نہیں نہیں یہ سب نہیں۔ میرے دماغ میں آندھی کے جھکڑ چلتے ہیں اور میں ان کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہوں۔ کہیں میری سوئی ہوئی وحشت اور درندگی پھر سے نہ جاگ جائے۔ میں اسے سلائے ہی رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ بڑی مشکل سے تھپکیاں دے کر سلایا ہے۔ میں ایک بار سختی سے آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ کہیں یہ سارے مناظر آنکھوں کے راستے داخل ہو کر میرے حواس پر قابض نہ ہو جائیں۔ پھر سارے سوئے ہوئے جذبوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیں اور میری ساری تپسیا بھنگ ہو جائے۔

میں ایک دوسرے راستے میں مڑ جاتا ہوں۔ اندر سے کچھ آہٹ آ رہی ہے۔ لیکن یہاں تو میرے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ پھر یہ آہٹ کیسی ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں ایک ایسا منظر دیکھتا ہوں کہ میرے حواس تخ بستہ ہو جاتے ہیں اور چیخ حلق کے پنجرے میں پھڑپھڑا کر رہ جاتی ہے۔ ــــــــ بہت سے انسانی پنجر رقص کر رہے ہیں۔ میں خاموش بت بن جاتا ہوں۔ ایک لمحے کے لیے رقص تھم جاتا ہے۔ پھر ایک زوردار آواز کمرے کی چہار دیواری سے سر ٹکرانے لگتی ہے۔

"اے ماضی میں پناہ تلاش کرنے والے انسان کیا تمھیں نہیں معلوم کہ تم نے جس چیز سے فرار حاصل کیا ہے وہی سب کچھ ماضی میں بھی ہے لیکن تم فرار حاصل کرکے اپنی بزدلی کی پردہ پوشی کرنا چاہتے ہو۔ جاگی آنکھوں کے سپنے ہمیشہ ادھورے رہتے ہیں۔"

پتہ نہیں یہ آواز کس پنجر سے آ رہی تھی وہ سب مجھے ایک ٹک گھور رہے تھے جیسے میں نے اس حویلی میں داخل ہو کر کوئی بڑا جرم کیا ہے۔

"میں بزدل نہیں ہوں" میں نے اپنے حواس کو دلیری کی حرارت سے پگھلانے کی کوشش کی۔

حال سے فرار ہمیشہ بزدلی کی علامت ہوتا ہے۔ حال سے منہ چرانے والے ہمیشہ ماضی میں پناہ لیتے ہیں اور ماضی میں نظر آنے والے قصر محض ریت کی دیواریں ہیں۔ ان لرزتی دیواروں کے سائے میں پناہ تلاش کرنے والے ہمیشہ ادھورے اور نامکمل رہتے ہیں۔

میں خاموشی سے بت بن جاتا ہوں۔

"میں نے تمھاری ساری بربریت اور وحشت کو ماضی کے دبیز پردوں میں چھپا لیا ہے" یہ کہہ کر پنجر پھر رقص کرنے لگتے ہیں۔

میں اپنے زنگ آلود پیروں کو حرکت دیتا ہوں۔ مجھے سخت گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ راہداری سے گزر کر لمبے زینے نظر آتے ہیں۔ ماضی کے زینے شاید حال یا مستقبل کی فصیلوں تک چلے جاتے ہوں۔

میں جلدی جلدی زینے طے کرنے لگتا ہوں ادھر وقت کی کڑی دھوپ لپٹی ہوئی ہے۔ ساری چھت میرے قدموں سے لرز رہی ہے۔

بہت سے گدھ فضا میں پرواز کر رہے ہیں۔ ان کی آوازوں میں مسرت کا نغمہ ہے۔ شاید انھوں نے میرے جسم کی بوٹیوں کو گن لیا ہے لیکن میں اپنے جسم کی بوٹیاں ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ میں آہنی ارادوں کے ساتھ اپنے ہاتھ میں ایک لکڑی تھام لیتا ہوں اور ہر قریب آنے والے گدھ کا مقابلہ کرتا ہوں۔

میں فرار حاصل نہیں کروں گا۔ میں جدوجہد کروں گا۔ مجھے

حال کی دیواروں کو مستحکم بنانا ہے۔ ماضی کی لونا کھائی اور لرزتی دیواروں کا سہارا کیا۔ کس وقت دھم سے زمین بوس ہو جائیں۔ میں ان حالات میں بھی نئی عمارت کی تعمیر کا نقشہ ذہن میں اتارتا ہوں۔

وحشی گدھوں کی اڑانیں تیز ہو جاتی ہیں میری جد وجہد اور تیز ہو جاتی ہے۔ اچانک مجھے دور سے ایک قافلہ آتا ہوا نظر آتا ہے اور میں دیوانہ وار زینے طے کر کے نیچے اترتا ہوں نیچے تک وحشیانہ رقص جاری ہے۔ چمگادڑیں پھر چیخ چیخ کر سر کے اوپر سے گزرنے لگتی ہیں۔ میں پوری قوت سے دوڑ رہا ہوں یہاں تک کہ عمارت سے باہر آ کر اپنے پھیپھڑوں میں بہت سی تازہ ہوا داخل کر لیتا ہوں۔

اب مجھے ایک بار پھر سے کھلی فضا میں آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوں۔ مجھے پہلی بار اپنے پیروں کی مضبوطی کا احساس ہوتا ہے۔

تازہ دم ہو کر میں پھر اپنے سفر کا آغاز کرتا ہوں۔ نئے کارواں کے ساتھ نئی منزل کی طرف۔

★

میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہو ـ (صفحہ ۱۲ کا بقیہ)

وزیر کی مجرئی ہیں۔

بہادر: "تمہاری خوشی۔ کیا نام تمہارا۔ شروع کرو۔ (ناچ شروع ہو کر ختم ہوتا ہے) اچھا ناچتی ہے۔ زینت پسند آیا"

زینت: "جی ہاں۔ پاؤں کی سبک ہے۔ نے کی پکی ہے"

بہادر: "اچھا بھئی اب ہماری غزل" (ساز چھڑتا ہے۔ گانا شروع ہوتا ہے)۔

گائن: نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا، مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا، میں اسی کی فصلِ بہار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں، میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

بہادر: (بھرائی آواز سے) "بس زینت اب اور سننے کی طاقت نہیں۔ اللہ بس باقی ہوس۔ آدھی رات ہونے آئی۔ آٹھ پہری بج رہی ہے"

★

غزل

ایسا بھی زندگی میں ہوا ہے کبھی کبھی
زہرِ غمِ حیات پیا ہے کبھی کبھی

میری وفا پہ حرف نہ آ جائے اس لیے
میں نے لبوں کو اپنے سیا ہے کبھی کبھی

اکثر نگاہِ لطف سے دیکھا ہے آپ نے
احساسِ زندگی بھی ہوا ہے کبھی کبھی

شاید مجھے بھلا نہیں پائے وہ آج تک
ان کی زباں سے نام سُنا ہے کبھی کبھی

کاوش شبِ فراق کی تنہائیاں نہ پوچھ
تاروں نے ساتھ چھوڑ دیا ہے کبھی کبھی

کاوش سیتاپوری

جشنِ جمہوریہ

نیاز سلطانپوری

مبارک جشن کہ چھبیس جنوری آئی
تھے انتظار میں جس کے وہ گھڑی آئی
نظامِ کہنہ میں پُرزور تھرتھری آئی
ہمارے کام بزرگوں کی رہبری آئی
نیا زمانہ نئی صبح ہے نئی باتیں
نہ فکرِ جاں ہے کوئی نہ دل میں ہیں گھاتیں

زمیں سے تا بہ فلک روشنی کا پھیرا ہے
شعاعِ مہر نے ہر چار سمت گھیرا ہے
لباسِ نور میں لپٹا ہوا سویرا ہے
نظر سے دور بہت ظلمتوں کا ڈیرا ہے
قدم قدم سے نظر سے نظر ملا کے چلو
ہے زندگی کا تقاضا کہ سر اُٹھا کے چلو

بڑھو بڑھو کہ وطن کا وقار تم سے ہے
خزاں رسیدہ چمن میں بہار تم سے ہے
وطن کی خاک پہ یہ لالہ زار تم سے ہے
یہ گنگناتا ہوا آبشار تم سے ہے
تمہیں وطن کے محافظ تمہیں وطن کے خطیب
تمہیں سلام مرا امن و آشتی کے نقیب

دیارِ ہند کو جنت نشاں بنا ڈالو
اس ارضِ پاک کو دارالاماں بنا ڈالو
نئی زمین نیا آسماں بنا ڈالو
ہے اختیار تمہیں بے گماں بنا ڈالو
زمانہ تم سے لے خود صلح و آشتی کا سبق
ہو جائے دورِ جہالت کا پھر تو چہرہ فق

جمہوریت

علی شبّر حسینی کرہانی

جمہوریتِ ہند جو موضوعِ سخن ہے
جو لفظ ہے ہونٹوں پہ وہ آوازِ وطن ہے
جو خواب کبھی تھا وہ ہے اب امرِ حقیقت
ہر دل کی یہ آواز ہے ہر لب کا سخن ہے
اس دیش کی دھرتی میں ہیں پوشیدہ جواہر
ہر ذرہ یہاں دُرِّ عدن لعلِ یمن ہے
وہ کوہ ہمالہ جسے دھرتی کا کہیں تاج
دامن میں ندی جس کے یہاں گنگ و جمن ہے
جمہور کی ہے روح وزیرِ اعظمِ بھارت
اعزاز جو اس کا ہے وہ اعزازِ وطن ہے
قانون بنانا ہو کہ قانون پہ چلنا
اب اپنی ہی تحویل میں تقدیرِ وطن ہے
تعلیم کی خوشبو سے فضائیں ہیں معطر
خوشبو سے چمن رشکِ دہِ مشکِ ختن ہے
غربت کا کہیں نام بھی اب رہ نہ سکے گا
ہر گام ہے تدبیر تو ہر سانس جتن ہے
سب ایک تھے سب ایک ہیں سب ایک رہیں گے
جو فرد ہے وہ شانِ وطن جانِ وطن ہے
یک رنگ ہیں ہر رنگ میں ہم عزم و عمل سے
یہ عہد ترنگے سے یہاں جلوہ فگن ہے
ہم ہم وطن ہم وطن ہم وطن ہیں
سب کا ہے یہی قول یہی سب کا بچن ہے
دشمن سے بچانے کے لیے اپنے وطن کو
ہر ایک مجاہد ہے ہر اک سر بہ کفن ہے
ہر دن سے نہ کیوں بڑھ کے ہو دن آج حسینی
آج اپنے لیے دل کا ملن جاں کا ملن ہے

غالب کی شاعری اور ان کا اسلوب مزاح

[illegible]

غالب کی شاعری کی عام مقبولیت اور ہمہ گیر تاثیر کا راز اُن کے اسلوب مزاح اور طرز بیان میں پوشیدہ ہے۔ جب کسی واقعہ سے متاثر ہو کر شاعر کے جذبات میں تموج پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے احساسات کا اظہار ایسے پیرائے میں کرتا ہے جو ترکیب و بندش الفاظ کے لحاظ سے عام طریقہ بیان سے ممتاز ہوتا ہے۔ طرز ادا اور کلمات کی یہ عجیب نوعیت ادب میں ایک مخصوص حیثیت رکھتی ہے جس کو مزاح کہتے ہیں۔ مزاح کے لغوی معنی ظرافت یا خوش طبعی کے ہیں لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ظرافت کا تعلق زیادہ تر الفاظ و عبارت سے ہوتا ہے اور مزاح کا رابطہ معنی اور طرز ادا کے ساتھ۔

مزاح و طنز کے لیے اسالیب بیان سے پوری واقفیت اور اظہار خیالات پر کامل قدرت ہونا ضروری شرط ہے۔ حالات اور واقعات کے مضحک پہلوؤں کی تصویر کشی، مشاہدۂ جزئیات، اور ایہام و تعریض میں مہارت ایک اچھے مزاح نگار کی لازمی صفات ہیں۔ عربی کی ایک مشہور مثل ہے "المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام" یعنی کلام کو خوشگوار بنانے میں مزاح کو وہی دخل ہے جو نمک کو کھانے کے لذیذ بنانے میں۔ جن شاعروں کو ذوق مزاح فطری طور پر قدرت سے عطا نہیں ہوا ان کے کلام میں ایک قسم کی اکتا دینے والی یک رنگی اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ غالب کے حریف و معاصر ذوق کے دیوان کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ جس کا مطالعہ کرنے والا یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ سب شعر ہی شعر ہیں شاعری کہیں نہیں۔ دوسری طرف غالب سے پہلے کے چند شاعروں کی مزاح گوئی حد اعتدال سے گزر کر ہزل و تمسخر کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ اس کی مثالیں مرزا سودا، میر ضاحک، میر انشاء اللہ خاں انشا، اور جرأت وغیرہم کے کلام میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں جب غالب کے اسلوب مزاح کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے کلام کی شوخی و ظرافت عامیانہ اور مبتذل قسم کی نہیں بلکہ خاص چیز ہے جو ندرت بیان سے پیدا ہوتی ہے جس کا مقصد محض نزہت خاطر اور تفریح طبع ہوتا ہے۔

زاہدان ریائی اور شیخ و واعظ پر کھلی چوٹیں فارسی و اردو شعرا کا ایک مرغوب موضوع شاعری رہا ہے لیکن غالب یہاں بھی متانت و اعتدال کی حد سے تجاوز نہیں کرتے اور کھلی چوٹ کرنے کے بجائے ایک معنی خیز اشارہ کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں :—

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ آتا تھا کہ ہم نکلے

غزل کا موضوع حسن و عشق کی داستان ہے جس میں معشوق کی ادائے دل ربائی، اس کی بے مہری، ستم شعاری اور عاشق کی ستم شعار وفاداری اور رشک و رقابت وغیرہ کے مضامین عموماً بیان کیے جاتے ہیں۔ غالب نے ان ہی مضامین کو اس نوعیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ شاعر کا روئے سخن بہ ظاہر ایک فرضی محبوبہ کی طرف ہوتا ہے مگر درحقیقت اُن کا مخاطب ہر فرد بشر ہو سکتا ہے جس میں کسی شخص کی تخصیص نہیں۔ غالب کی شاعری کا بیشتر حصہ حُسن و عشق کا افسانہ نہیں بلکہ حقائق زندگی کا ایک بصیرت افروز تبصرہ ہے۔ تغزل کے پیرائے میں انھوں نے اکثر نفسیاتی اور اخلاقی مسائل پر ایک

لطیف مزاحیہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کے اشعار انسانی زندگی کے مختلف احوال کی ترجمانی کرتے ہیں۔ زندگی میں پیش آنے والے اکثر واقعات سے متعلق غالب کا کوئی نہ کوئی شعر بطور سند یا مثال پیش کیا جا سکتا ہے اور حقیقی شاعری وہی ہے جو زندگی سے قریب ہو۔ غالب کے اصلی رنگ شاعری اور ان کی افتاد طبیعت کی نمائندگی ایسے ہی اشعار سے ہوتی ہے جن میں فطرت انسانی بے نقاب نظر آتی ہے۔ مثلاً یہ عام انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی کمزور شخص کسی ظالم و طاقت ور حریف سے انتقام لینے کی قدرت نہیں رکھتا تو وہ اپنے سے کمزور اور بے گناہ شخص کو اپنے عتاب کا نشانہ بناتا ہے اور دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ اسی مضمون کو غالب بطور تمثیل اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

اس مضمون کو کہ مصیبت میں تسلی و تشفی کے بجائے نصیحت کرنا زخم پر نمک پاشی کے مرادف ہے۔ ایک حرماں نصیب شخص کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ شعر بطور ضرب المثل کے مشہور ہو گیا ہے ؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

یہ بات کہ کسی کی بے سبب رنجش و کشیدگی پر عذر و معذرت کرنا خودداری اور وقار کے منافی ہے اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو

یہ مسئلہ کہ جو شخص جس چیز کا مستحق ہے وہ اس کو بے طلب و تقاضا حاصل ہونا چاہیے۔ اس کے لیے سوال کرنا موجب ذلت اور بغیر مانگے نہ دینا سخاوت اور فیاضی سے بعید ہے کنایۃً کس خوبی سے بیان کیا ہے ؎

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ایک اور شعر میں اسی مضمون کی وضاحت کرتے ہیں ؎

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

یہ خیال کہ انسان کو عزت اور بلند مرتبہ اس کی ہمت و استعداد کی مناسبت سے حاصل ہوتا ہے ایک تمثیل کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں ؎

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

یعنی پانی کے جس قطرے نے اپنی عالی ہمتی سے سمندر میں موتی بننا پسند نہ کیا اس کو یہ رتبہ ملا کہ اشک کا قطرہ بن کر اس نے آنکھوں میں جگہ پائی۔

مزاح کا ایک بلیغ اسلوب یہ ہے کہ شعر میں وہ تمام الفاظ جو اظہار مضمون کے لیے عام طور سے ضروری سمجھے جاتے ہیں شاعر ان میں سے بعض کو حذف کر دیتا ہے مگر یہ محذوف الفاظ شاعر کے پیرایہ بیان اور قرینہ سے خود بخود ذہن میں آ جاتے ہیں۔ غالب کی ظریفانہ شاعری کی یہ امتیازی خصوصیت ہے۔ چند مثالیں غالب کے اشعار سے حسب ذیل ہیں :—

زہر غم نے کیا تھا میرا کام   تم کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ میرا کام تمام کر دینے کے لیے غم عشق ہی کافی تھا پھر تم نے مجھے قتل کر کے اپنے سر رسوائی کیوں مول لی؟ دوسرے مصرعے میں بدنامی کا باعث یعنی قتل عاشق مذکور نہیں ہے مگر قرینے سے ذہن خود بخود اس کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

خلاف عادت ساقی کی مہربانی پر شراب میں زہر آمیزی کے شبہ کا ذکر اور "پھر آج جو خلاف معمول مجھ کو جام شراب عطا کیا گیا ہے" یہ باتیں شعر میں بیان نہیں کی گئی ہیں مگر قرائن سے معلوم ہو جاتی ہیں۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

جام و صراحی کو دیکھ کر ایک حریف بادہ نوش کو جو راحت و لذت حاصل ہوتی ہے اس کی صراحت شعر میں مذکور نہیں ہے مگر

"آنکھوں میں تو دم ہے" والا فقرہ اس مضمون پر دلالت کرتا ہے۔ اس قسم کے حذف و ایجاز کے بلیغ نمونے غالب کے یہاں پائے جاتے ہیں

غزل میں محبوب کی کج ادائی اور جفا جوئی کا بیان ایک پامال مضمون ہے مگر جب اس کے ساتھ اس کی ستم ظریفی اور حاضر جوابی بھی شامل کر دی جائے تو شعر میں عجیب لطف و تازگی پیدا ہو جاتی ہے

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنۂ و فساد نہیں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھنا
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف دربان ہو گئیں

اس شعر کی اصل خوبی اور لطافت یہ ہے کہ شاعر اپنی سادہ لوحی کی بنا پر محبوب کی گالیوں کے جواب میں دعا دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اس خیال کی بنا پر ہر شخص سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ ان کی گالیوں کے جواب میں کیا کہوں گا جبکہ دعائیں سب دربان کے لیے صرف کر چکا ہوں۔ حسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ اور محبوب کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی غالب کے ذوق مزاح کے اظہار کے لیے ایک مناسب و موزوں ترین مضمون ہے جس کو انھوں نے بڑے لطیف اور شوخ انداز سے ادا کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کہو جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے — تمہی کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا — دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن — جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
ہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب — کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال
کہ یہ کہے کہ سر رہ گزر ہے کیا کہیے

اب بارگاہ حسن میں عشق کی بیباکی اور شوخ بیانی کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں:-

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے — قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
لو ہم مریض عشق کے تیمار دار ہیں — اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج؟

رشک و رقابت کے جذبات کے اظہار میں غالب کے یہاں جو مزاحیہ اسالیب پائے جاتے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہیں۔ محبت کا تو ذکر ہی کیا ہے عداوت میں بھی ان کو شرکت غیر منظور نہیں ؎

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

محبوب کے گھر کی تلاش میں در بدر پھرنا گوارا ہے مگر رشک کے مارے کسی کے سامنے اس کا نام لینا منظور نہیں ؎

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

رشک کی شدت کے باعث محبوب کے نظارہ جمال سے شاعر خود اپنے آپ کو محروم رکھنا چاہتا ہے ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل — میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

مرزا غالب کو فارسی زبان سے فطری مناسبت اور ان کو فارسی نظم و نثر لکھنے میں دستگاہ کامل حاصل تھی۔ ان کا ذوق فارسی ان کی اردو شاعری میں نہایت آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ فارسی ضاحتوں ترکیبوں اور بندشوں سے ان کا اردو کلام مزین ہے۔ نادر تشبیہات جدید استعارات، اور جدت اسلوب ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں جن کے لحاظ سے وہ تمام دوسرے شعرائے اردو میں منفرد ہیں۔ عامیانہ اور مبتذل تشبیہوں سے ان کا کلام پاک ہے۔ مثال میں ان کا مشہور

قطعہ پیش کیا جاتا ہے جس میں رفعت تخیل، ندرت تشبیہات، حسن بیان اور فارسی ترکیبوں کی تراش خراش زیور کلام میں آب دار نگینوں کی طرح اپنی چمک دمک دکھا رہی ہیں:۔

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامان باغبان و کف گلفروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ — یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

غالب جذبات انسانی کے ایک کامل مصور ہیں۔ ان کی شاعری کیفیات اور واردات قلبی سے لبریز ہے۔ ان کے اشعار ان کے خیالات کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں وہ اپنے اشعار میں اپنی دلی کیفیات کو اس مؤثر طریقہ سے پیش کرتے ہیں کہ وہ ان کے خیالات کا صحیح عکس معلوم ہوتی ہیں۔ حیات انسانی کے حقائق و رموز کی ترجمانی جس طرح غالب نے کی ہے ویسی کسی دوسرے اردو شاعر کے یہاں پائی نہیں جاتی۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

شاعر بارگاہ ایزدی میں عرض کرتا ہے کہ اگر کیئے ہوئے گناہوں پر سزا کا مستحق ہوں تو جو گناہ تیرے خوف یا اپنی عدم استطاعت کے باعث میں نہیں کر سکا اور جن کی حسرت میرے دل میں باقی رہ گئی ہے ان کی بھی داد یعنی ثمرۂ نیک مجھے ملنا چاہیئے۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

یہ ایک راست گو پشیمان گنہ گار کا بیان ہے۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حساب سے بچنا چاہتا ہے۔ مگر در پردہ کہتا ہے کہ ارتکاب شدہ گناہ جن کا حساب مانگا جا رہا ہے ان سے کہیں زیادہ وہ گناہ ہیں جو میں نہیں کر سکا اور جن کی حسرت کے داغ میرے دل میں باقی رہ گئے ہیں انکی بھی جزا یا سزا ملنی چاہیے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تقریر کی دل پذیری کا اس سے بہتر کیا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ قائل کی بات سن کر مخاطب یہ سمجھے کہ یہ میرے ہی دل کی بات کہی گئی ہے۔

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

حرص مے نوشی کی یہ انتہا ہے کہ جام و صراحی کو دیکھ کر آنکھوں کو جو لطف و لذت ح[illegible] ق[illegible] اس کے خیال سے شاعر نہیں چاہتا کہ شراب سے سیر ہونے کے بعد بھی اس کی نظر کے سامنے سے ساغر و مینا کو ہٹا کر اس کی تسکین ذوق کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے۔

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب کا

غالب نے واردات عشق و محبت اور محبوب کے شیوۂ دل ربائی اور ادائے دلنوازی کا بیان اس رندانہ شوخی و شگفتگی کے ساتھ کیا ہے کہ ان کا دلنواز نغمہ پیرانہ سری میں بھی عہد شباب اور دور نشاط کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

سیاق کلام کا تقاضا ہے کہ غالب کے رنگ تغزل اور جذبات نگاری کی مزید وضاحت کے لیے ان کی ایک غزل کا اقتباس یہاں پیش کیا جائے۔ ذیل کی غزل میں تجدید شوق کا مضمون کیسے والہانہ انداز میں بیان ہوا ہے!:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے — جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

رشید الدین

ہندستان کا قومی دستور

یوں تو دستور ہند کے کئی اردو تراجم ہو چکے ہیں جن میں حکومت ہند کا سرکاری مسلمہ ترجمہ بھی شامل ہے لیکن ایک تو ہمارا دستور بہت ضخیم ہے اور دوسرے یہ قانونی نوعیت کا ہے اس لئے عام آدمی کو اس کے مطالعے سے پہلے تو دلچسپی پیدا نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو قانونی نوعیت عام فہم سے بالاتر ہوتی ہے۔ پھر اس کی طوالت بھی ایک عام قاری کے لیے بارگراں ثابت ہوتی ہے۔ ویسے بھی آج کے مصروف آدمی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ ہر چیز کو اس کے حقیقی اور طویل فارم میں پڑھ سکے۔ اس لیے جمہوریہ ہند کی چھبیسویں سالگرہ پر جو ہمارے دستور کے نفاذ کی بھی ۲۶ ویں سالگرہ ہے اردو قارئین کو نیا دور کی وساطت سے ہمارے دستور کے اہم خد و خال سے مختصراً طور پر واقف کرایا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہندستان کا قومی دستور ایک ضخیم اور عظیم دستور ہے اور اس کے مرتبین نے اسے مرتب کرکے بلاشبہ ایک چیلنج کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ دراصل ہندستان جیسے وسیع و عریض ملک کے لیے جہاں ہر صوبے کی الگ زبان اور ایک الگ روش ہے اور جہاں کئی مذاہب اور مکاتب خیال کے لوگ بستے ہیں ایک مکمل اور جامع دستور بنانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن ڈاکٹر امبیڈکر آنجہانی اور ان کے ساتھی دستور ساز کمیٹی کے ارکان قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے کئی برس کی محنت اور جانفشانی کے بعد ایک ایسا دستور مرتب کیا جو اس ملک کے حالات کے عین مطابق تھا۔ اسے بڑے غور و خوض اور سوچ بچار کے بعد مرتب کیا گیا۔ اس کے ہر ہر لفظ اور ہر ہر فقرے پر کئی کئی دن تک بحثیں ہوتی رہیں۔ اس کی ہر دفعہ اپنے اندر خاص معنی اور مقام رکھتی ہے اور اس لئے ہندستان میں رائج اونچ نیچ، ذات پات اور نسل و مذہب کے فرق کو یکلخت ختم کر دیا۔ یہ جتنا ضخیم ہے اتنا ہی لچکدار بھی ہے اور جتنا فطری ہے اتنا ہی عملی بھی ہے۔ اس میں دنیا کے تمام دساتیر کی روح موجود ہے اور یہ صحیح جمہوری خطوط پر مرتب کیا گیا ہے۔

دستور کی ترتیب سے پہلے دستور ساز کمیٹی کے ارکان نے دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کیا اور وہاں کے دساتیر کا تفصیلی طور پر مطالعہ کیا اور انھیں عملی طور پر رائج بھی دیکھا۔ اس کے بعد طول طویل مباحثہ اور کافی غور و خوض کے بعد جو باتیں ان دساتیر میں اچھی تھیں اور جو ہندستان کے لیے موزوں ہو سکتی تھیں انھیں اس دستور میں شریک کر لیا گیا۔ چنانچہ ہمارے دستور میں امریکہ، برطانیہ، سوئیزرلینڈ، فرانس اسپین، آسٹریلیا اور کینڈا اور روس کے دساتیر کی اچھی چیزیں جمع ہیں دوسرے الفاظ میں ہندستان کا دستور ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں ہر قسم کے پھول موجود ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اپنی انفرادیت بھی رکھتا ہے۔

جونہی ہم اپنا دستور کھولتے ہیں سب سے پہلے ہمیں ایک تمہید نظر آتی ہے۔ گویا ایک مختصر سی عبارت ہے لیکن اگر ہم اسے اپنے دستور کی روح کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں صاف الفاظ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ ہندستان ایک مقتدر عوامی جمہوریہ ہوگا۔ دستور کی بنیاد انصاف، حریت، مساوات اور آزادی جیسے زرین اصولوں پر رکھی گئی ہے نیز تمہید میں یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ اقتدار اعلا کے اصل مالک عوام ہوں گے اور یہی فقرہ ہندستان کے دستور کو ایک عوامی دستور بناتا ہے۔

ہندستان کا دستور وفاقی ہے۔ یعنی یہاں ایک وفاقی طرز مملکت قائم ہے اور سارا انتظام مرکز اور ریاستوں میں منقسم ہے۔ ہندستان ایک وسیع و عریض ملک ہے اور جتنی چیزیں ایک وفاقی ڈھانچے کے لیے ضروری ہیں۔ وہ سب یہاں پائی جاتی ہیں اور حق تو یہ ہے کہ یہاں اس سے زیادہ موزوں اور کوئی طرز حکومت نہیں ہو سکتا تھا ملک کا سارا نظم و نسق ریاستوں اور مرکز کے درمیان اس طرح تقسیم ہے کہ مرکز کا پلہ

کچھ جاری ہے اور اس کی وجہ وہ مخصوص حالات ہیں جن سے ہندستان کو آئے دن سابقہ پڑ رہا ہے۔ مرکز کے تحت ۹۷ امور، اور ریاستوں کے تحت ۶۶ امور ہیں۔ جب کہ ۴۷ امور مشترکہ ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کچھ امور ہوں گے تو وہ مرکز کے تحت رہیں گے۔ اس طرح ہندستان ایک وفاقی مملکت ہے۔ جہاں مرکز ریاستوں کے مقابلہ میں طاقتور ہے۔

ہندستان کا دستور عام حالات میں تو وفاقی ہوگا لیکن ہنگامی صورت حال کے تحت یہ کسی بھی وقت عارضی طور پر وحدانی طرز میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ ہنگامی صورت حال بیرونی حملے یا اندرونی خلفشار کی بھی صورت میں نمودار ہو سکتی ہے۔ جس کے بعد پارلیمنٹ اور اسمبلیاں معطل ہو کر صدر جمہوریہ کو ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے وسیع اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہ دفع بظاہر جمہوریت اور آزادی پر ایک ضرب نظر آتی ہے لیکن ملک کی سلامتی اور بہبودی کے لیے یہ ضروری ہے۔ مکمل ایمرجنسی کے علاوہ جزوی ایمرجنسی بھی نافذ کی جا سکتی ہے جس میں پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کو اپنا کام انجام دینے کی اجازت ہونے کے باوجود مرکزی حکومت کو زیادہ اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۶۲ء میں چین کے حملے کے بعد ایسی ہی جزوی ایمرجنسی نافذ کی گئی تھی۔ گزشتہ سال ملک میں ایسے حالات پیدا ہو گئے جن سے اندرونی استحکام اور ہماری ایکتا کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے بھی جزوی ایمرجنسی نافذ کی گئی جو اب تک جاری ہے اور اس کی وجہ سے نہ صرف سیاسی حالات بہتر ہوئے ہیں بلکہ معاشی میدان میں بھی ہمارے ملک نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔

کوئی بھی دستور حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتا۔ بلکہ حالات کے لحاظ سے اس میں ترمیمات کی جا سکتی ہیں۔ ہندستان کا دستور جتنا ضخیم ہے اتنا ہی لچکدار بھی ہے۔ اس میں بآسانی ترمیم کی جا سکتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت سے کوئی بھی ترمیم کی جا سکتی ہے۔ البتہ بعض دفعات میں ترمیم کے لیے ۵۰ فی صدی ریاستوں کی بھی رضامندی ضروری ہے۔ پچھلے ۲۶ سال کے عرصے میں ہندستان کے دستور میں کوئی ۴۰ مرتبہ ترمیمات ہو چکی ہیں۔ جن میں بعض ترمیمات بے حد اہمیت کی حامل تھیں اور جو پارلیمنٹ سے لے کر اخبارات تک موضوع بحث بنی رہیں۔

ہندستان میں جہاں امریکہ کی طرح صدارتی طرز مملکت رائج ہے وہیں انگلستان کی طرح پارلیمانی جمہوریت قائم ہے۔ ہندستان کا صدر جمہوریہ امریکہ کے صدر کی طرح طاقتور نہیں بلکہ انگلستان کے "صدر" مملکت (بادشاہ یا ملکہ) کی طرح آئینی اور اعزازی ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انگلستان کا "صدر" مملکت موروثی ہوتا ہے جب کہ ہندستان کا صدر پانچ سال کے لیے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ارکان کی جانب سے منتخب کیا جاتا ہے۔ انگلستان کی طرح ہندستان میں ذمہ دار طرز حکومت رائج ہے اور برسر اقتدار جماعت ہر وقت پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے اور اس کی میعاد عہدہ اس کے اعتماد پر منحصر ہوتی ہے۔ حکمراں پارٹی یہاں حزب مخالف کے سامنے ہر لمحہ ذمہ دار ہوتی ہے۔

امریکہ کی طرح ہندستان بھی ایک وفاقی مملکت ہے۔ لیکن وہاں کی طرح یہاں شہریت کا دہرا طریقہ رائج نہیں ہے۔ امریکہ میں وقت واحد میں ایک شخص کو دو شہریت کے حقوق حاصل رہتے ہیں۔ یعنی ایک تو وہ اپنی متعلقہ ریاست کا شہری ہوتا ہے اور دوسرے مرکزی حکومت کا۔ مگر اس کے برخلاف ہندستان میں مرکز اور ریاست کے لیے ایک ہی شہریت ہے جو یقیناً ایک عمدہ اور سہل چیز ہے۔

"بنیادی حقوق" ہندستان کے دستور میں خاص اہمیت کے حامل ہیں جنھیں ہم شخصی آزادی کا محضر بھی کہہ سکتے ہیں۔ بنیادی حقوق کے تحت ہندستان کے شہریوں کو چند خاص حقوق دیے گئے ہیں اور کوئی حکومت یا عدالت انھیں ان سے محروم نہیں کر سکتی۔ ان پر عمل مرکزی اور اور ریاستی حکومتوں کا فرض ہے۔ اگر کہیں ان پر عمل نہیں ہو رہا ہے تو کوئی بھی شہری اس سلسلے میں کسی بھی عدالت سے داد رسی حاصل کر سکتا ہے۔ بنیادی حقوق میں حق آزادی، حق مساوات، حق آزادی عقیدہ، حق جائیداد، حق تعلیم اور حق تمدن وغیرہ شامل ہیں۔ ان حقوق سے ہندستانی شہری کو کوئی حکومت، کوئی قانون اور کوئی عدالت محروم نہیں کر سکتی۔

بنیادی حقوق کی طرح ہندستان کے دستور میں چند "ہدایتی اصول" بھی شامل ہیں۔ یہ اسپین اور سوئزرلینڈ کے دساتیر سے اخذ

کیے گئے ہیں لیکن ان میں اور بنیادی حقوق میں فرق یہ ہے کہ بنیادی حقوق پر عمل پیرائی ہر حال میں لازمی ہے جب کہ ہدایتی اصولوں کا اطلاق لازمی نہیں۔ ان کے روبعمل نہ لانے پر متعلقہ حکومت کے خلاف کسی عدالت میں مقدمہ دائر نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کا مقصد صرف حکومت کو مشورے دینا ہے کہ اگر ایسا کیا جائے تو اچھا ہے۔ یہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے مرتب کئے گئے ہیں اور حکومت اور عوام کی باہمی مفاہمت پر منحصر ہے۔ ویسے ہر نیک نیت حکومت اپنے طور پر ان پر یقیناً عمل پیرا ہوتی ہے۔ بشرطیکہ حالات اس کا ساتھ دیں۔ چند ہدایتی اصول حسب ذیل ہیں:

حکومت کو چاہیے کہ ہر شہری کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام کرے۔

حکومت کو چاہیے کہ وہ اپنے ہر شہری کو روزگار فراہم کرے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ ہر شہری کے لیے روٹی کپڑے اور مکان کا انتظام کرے۔

زبان کا مسئلہ ہندستان میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ آزادی سے قبل یہاں کی سرکاری زبان انگریزی تھی۔ جب کہ ریاستوں میں مختلف زبانیں رائج تھیں۔ جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو وہ اپنے جلو میں بہت سے مسائل اور الجھنیں بھی لائی۔ جن میں سے ایک زبان اور دوسرا اقلیتوں کا موقف تھا۔ دستور ساز اسمبلی نے بڑی خوش اسلوبی سے ان دونوں مسائل کو حل کیا۔ دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ہندی کو ہند کی سرکاری زبان قرار دیا گیا اور اقلیتوں کو ان کی مادری زبانوں میں تعلیم کے حصول کی سہولت کے ساتھ ساتھ دیگر مراعات کا انتظام کیا گیا۔ ریاستوں کو ان کی متعلقہ زبانوں میں نظم و نسق چلانے کی آزادی دی گئی۔ جب زبانوں کا کوئی علاقہ یا حکومت نہیں تھی انھیں بھی دستوری تحفظ دیا گیا ہے۔ جن میں سنسکرت اور سندھی کے ساتھ اردو بھی شامل ہے۔

غالب کی شاعری اور ان کا اسلوب مزاج - (صفحہ ۳۵ کا بقیہ)

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا ۔۔۔ جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس ۔۔۔ زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو ۔۔۔ سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ ۔۔۔ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

ایک دوسری غزل جو مسلسل مزاحیہ رنگ کی ہے ملاحظہ ہو۔ ساری غزل کا حاصل بجز تفنن طبع اور تفریح خاطر کے اور کچھ نہیں اور یہ مسلّم ہے کہ شعر و شاعری کی ایک خاص غرض و غایت انبساط نفس ہے:

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

اس شعر میں خواب کا لفظ مزاح کی جان ہے یعنی حالت بیداری میں تو ان کا آنا اور تسلی دینا ایک امر محال ہے۔ صرف عالم خواب میں اس کی توقع کی جا سکتی ہے وہ بھی دل کی بیقراری اور بے خوابی کی وجہ سے ممکن نہیں ہے لطف یہ ہے کہ شاعر نے محبوب کی بے التفاتی کے بجائے اپنی ہی کوتاہی قسمت کی شکایت کی ہے۔

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا ۔۔۔ تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو ۔۔۔ نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے ۔۔۔ پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے غالب نے اردو غزل کو بہت وسعت دی ہے، عاشقانہ مضامین کے دوش بدوش انھوں نے فلسفہ کے حقائق اور تصوف کے رموز و نکات بھی بڑی وضاحت و سادگی سے بیان کیے ہیں۔ باوجود اس جامعیت کے شاعر نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اردو غزل کی محدود فضا اس کے خیالات کی بلند پروازی کے لیے کافی نہیں ہے ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

مندرجہ بالا اقتباسات اس کا ثبوت ہیں کہ غالب کی شاعری جذبات فطرت اور نوادر افکار کا ایک مرقع ہے جس کی رنگا رنگ تصاویر میں شاعر کے حسنِ طبع اور ذوقِ مزاج نے رنگ آمیزی کی ہے:

یوم جمہوریہ

ایم۔ ایل۔ سکینہ

چمن چمن بہار ہے　　روش روش سنگار ہے
کلی کلی نکھار ہے　　نظر نظر خمار ہے
نسیم مشک بار ہے　　سُرور میں ہزار ہے
نہ ہے! یہ صحن گلستاں　　بہار ہی بہار ہے

چھبیس جنوری کی ہے　　اسی کی یہ بہار ہے
مصیبتوں کو جھیل کر　　یہ دیس کامگار ہے
یہ رہبرانِ قوم کے　　دکھوں کی یادگار ہے
دیا جو خوں شہیدوں نے　　وہ اس کا اب سنگار ہے
فرنگیوں کے جال کا　　نہ اب کوئی شکار ہے
بلند و پست ہند کی　　یہ سچی یادگار ہے
ہر ایک سمت ہے خوشی　　ہر ایک سو بہار ہے
سرور کیوں نہ ہو ہمیں؟　　زمانہ سازگار ہے
ہر ایک فرد ہند کا　　وطن کا جاں نثار ہے
بہارِ اندرا وفا
چمن سے آشکار ہے

غزل

انعام حنفی

پرتوِ حُسنِ ازل ہو تو غزل ہوتی ہے
سامنے خود ہی غزل ہو تو غزل ہوتی ہے
کسی پہلو بھی نہ کل ہو تو غزل ہوتی ہے
ہجر تصویرِ اجل ہو تو غزل ہوتی ہے
حُسن اس راز سے واقف ہے جنوں شاہد ہے
زندگی عشق میں شل ہو تو غزل ہوتی ہے

ابر ہو، بادہ ہو، ساقی ہو، وہ ہوں، مطرب ہو
اور حافظ کی غزل ہو تو غزل ہوتی ہے
میر کے رنگ تغزل کی قسم پیش نظر
کوئی غالب کی غزل ہو تو غزل ہوتی ہے
شام رنگیں ہو، کوئی یا ہو کوئی صبح حسیں
کوئی برجستہ محل ہو تو غزل ہوتی ہے
صرف الفاظ کی بندش کا غزل نام نہیں
خونِ دل لفظوں میں حل ہو تو غزل ہوتی ہے
یوں تو ہونے کو غزل ہوتی ہے لیکن انعام
زندگی خود ہی غزل ہو تو غزل ہوتی ہے

مزاحیہ

دیکھنے ہم بھی گئے تھے

احمد جمال پاشا

ہمیں یاد نہیں کہ دن چڑھے، جب کبھی بازار سے گذرے ہوں تو دفتر جانے والے دوستوں نے ہمیں گپ کے لیے نہ روکا ہو، ہم لاکھ انھیں ٹالنے کی کوشش کرتے کہ "دفتر کا وقت کبھی کا ہو چکا، کیوں بے فائدہ اپنے آپ کو لیٹ کر رہے ہو۔ خواہ مخواہ میں نام کے آگے اگر "کراس" لگ گیا تو کیا حاصل ۔۔ ؟"

ہمارے بے فکرے دوست سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہتے تھے "ابھی تو کوئی مائی کا لال 'کراس' لگانے والا پیدا نہیں ہوا۔"

بدقت اگر پنڈ بھی چھوڑتے تھے تو اس وعدے پر کہ "دوپہر کو یا دفتر کے اوقات میں گپ لڑانے ضرور آنا۔ کینٹین میں بیٹھک رہے گی ۔۔"

دفتری اوقات میں، دفتری احباب کی گپ کے چکر نے ماضی میں نہ جانے کتنی بار ہماری گھریلو زندگی ایک مار دھاڑ والی فلم میں تقریباً تبدیل کر دی تھی۔ کبھی لینے تو نکلے دوا، دفتری گپ کے بعد پہنچے منی آرڈر فارم لیے ہوئے ۔۔ راشن لینے نکلے تو پان کی ڈھولی لیے ہوئے گھر میں گھسے ۔ زیادہ تر خالی ہاتھ لوٹتے اور یہ معلوم ہونے پر بڑی حیرت کا اظہار کرتے کہ ہم سے کچھ منگایا بھی گیا تھا۔

یہ بات نہیں کہ ہم کوئی بے کار انسان ہوں اور بالکل لاخیرے یا اٹھاؤ ڈھلو قسم کے واقع ہوئے ہوں ۔۔ خیر سے ہم سو فیصد گھر گرہست آدمی ہیں اور فخریہ کہہ سکتے ہیں کہ "وہ دن گئے کہ نوکر نہیں تھے ہم۔!" مگر نوکری رات کی بھی ہے۔ رات کو کام کرنے کے باوجود اس کا تعلق نہ جرائم سے ہے نہ جرائم کی روک تھام سے۔ بلکہ صرف دونوں کی تشہیر سے۔ اسی لیے عام طور پر ہم دن کو گھر میں پائے جاتے۔ دن میں کسی نہ کسی کام سے ہمیں گھر سے نکلنا ہی پڑتا۔ گھر سے نکلتے ہی دفتری احباب ایسا چھاپ لیتے کہ کام تو پس منظر میں غائب ہو جاتا۔ معاملہ زبانی گپ شپ، کسی قریبی ریسٹوراں میں چائے وائے، کسی پان کی دکان پر پان سگریٹ، کسی بند دکان کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر حالات حاضرہ پر تبادلۂ خیالات پر ختم ہو جاتا۔ اس کے بعد ہماری گھر واپسی نت نئی پیچیدگیاں پیدا کر دیتی۔ مجبوراً ہم دن میں گھر سے نہ نکلنے کی قسم کھاتے ۔ ان دفتروں کو کھری کھری سُناتے جو اپنے عملے کو خلق خدا کو آزار پہنچانے کے لیے ان کی رسیاں ڈھیل کیے ہوئے ہیں

دفتری احباب کی گپ سے پیدا ہونے والے مسائل نے اس وقت سنگینی اختیار کر لی جب نکلے تو ایک عزیز کو مٹی دینے مگر چھوٹے بابو کو بڑے بابو کی سیاست سے بچانے کا مشورہ طلب کیے جانے کے بعد مسئلہ فنا و بقا کو بھول کر ایک چائے خانے میں گھس گئے۔ چھوٹے بابو کو بڑے بابو کو چت کرنے کے اتنے داؤں بتائے کہ نہ صرف لوگ مٹی دے کر لوٹ آئے بلکہ ہماری باقاعدہ تلاش شروع ہو گئی۔ جب گھر واپس پہنچے تو ہماری وہی حیثیت تھی جو دفتر میں ان چھوٹے بابو کی ان کے بڑے بابو کے مقابلے میں ہو گی۔

قبل اس کے کہ گھر والے ہم سے بے تعلق ہو جاتے، ہم اپنے ان بازاری دوستوں سے دست بردار ہو گئے۔ اور گھر والوں کو سمجھا دیا کہ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے مگر ہم دن میں ہرگز گھر سے نہ نکلیں گے ۔۔"

عرصے تک ہم اپنے عہد سے ایسے چپکے رہے جیسے چیونٹا گڑ سے۔ آخر ہم بھی انسان ہیں۔ عہد کیا اسی لیے کیا ہے کہ اسے توڑا جائے۔ وہ عہد کیا جو پاپ کے گھڑے کی طرح ٹوٹے نا — !

ایک دن گھر میں کوئی نہ تھا۔ چھٹی تھی، کوئی کام بھی نہ تھا۔ اس لیے صبح ہی گھر سے نکل پڑے کہ — "چلو احباب کی خیر صلاح ہی لے لیں آخر وہ بھی کیا یاد کریں گے کہ دوست رکھتے تھے۔"

سب سے پہلے ہم اپنے لنگوٹیے پانڈے کے پاس پہنچے دیکھا پانڈے جی کھڑے کھڑے ایک ہاتھ سے شیو بناتے اور دوسرے ہاتھ سے چائے پیتے جاتے ہیں۔ گھر سے باہر نکلنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ انھوں نے ہم پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور بے رخی سے بولے۔

"اس وقت تو دفتر کی جلدی ہے۔ پھر آنا" پانڈے کی بے مروتی پر جی جل کے کباب ہو گیا۔ آواز بھر آگئی۔ مری ہوئی آواز میں کہا۔

"دوست اگر ہم تم کو کھلنے لگے ہیں تو اب نہ آئیں گے —"

پانڈے نے گھر سے نکل کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا —

"بھئی معاف کرنا! آج کل معاملہ ہی کچھ ایسا ہے کہ بقول 'باس' دوست تو پھر بھی مل جائیں گے پر نوکری نہ ملے گی۔

وہ پھٹ پھٹاتے ہوئے نکل گئے اور ہم اپنا منھ نوچتے ہوئے باہر نکل آئے۔

دل نے کہا "مرزا کے کاشانے میں چل —"

پانڈے کی شکایت لے کر مرزا کے یہاں پہونچے تو وہ گھر سے نکل رہے تھے۔ ہاتھ میں ٹفن باکس تھا۔ سائیکل پر اُچک کر بیٹھنے کے لیے اپنا بے ڈول جسم تول رہے تھے — ہم نے چلا کر کہا۔

"مرزا — !"

مرزا نے ایک سرسری نگاہ ہم پر ڈالی، اُچکے اور ہاتھ لہراتے ہوئے ہوا کے جھونکے کی طرح نکل گئے۔

مرزا کی گلی ایک جلتا ہوا جہنم معلوم ہونے لگی۔ دوڑ کر باہر نکل آیا محلے کی پان کی دوکان جہاں اس وقت عام طور پر دفتری احباب کا میلہ لگا رہتا تھا، بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ پان والا اونگھ رہا تھا۔

اس کی دوکان اونگھ رہی تھی اس نے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے میں بھاگا ہوا ہوں۔ جلدی سے سڑک پر نکل آیا۔ برابر سے لڈن تیز تیز قدم سے گزر گیا۔ وہی لڈن جس سے بڑے بابو کو چت کرانے میں میرا مردہ نکل گیا تھا۔ میں نے اسے لپک کر پکڑ لیا اور کہا۔

"آؤ یار، چائے پئیں — !"

لڈن نے اپنی رفتار جاری رکھتے ہوئے میرا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"یار! ایمرجنسی میں یہ کیسے ممکن ہے۔ شام کو آؤں گا —"

میں نے کہا۔ "اماں ایک کپ میں کیا ہو جائے گا —؟"

لڈن بولا۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ اگر ذرا بھی دیر آفس کی ہو گئی تو غضب ہو جائے گا —"

میں نے کہا۔ "ایمرجنسی ... نوکری —؟" — وہ بولا۔ جی ہاں! ایمرجنسی کے معنی صرف یہ ہیں کہ ہر کام اپنے ٹھیک وقت پر بالکل ٹھیک طریقے سے ہو اس لیے بندہ تو چلا" — اور لڈن بھی چلا گیا۔

سامنے ریلوے اسٹیشن تھا۔ باہر دورے پر جانے کے لیے بمبئی کا ریزرویشن کرانا تھا۔ میں پہلے تو سمجھا کہ ریزرویشن آفس بند ہے کیونکہ نہ تو لمبی لمبی راتوں کی نیند حرام کرنے والی لائنیں تھیں نہ کوئی بھیڑ بھاڑ میں نے ڈرتے ڈرتے ریزرویشن کلرک سے پوچھا۔

"ایک ہفتہ بعد کا بمبئی کا ریزرویشن ہو جائے گا؟ —"

ریزرویشن کلرک نے انتہائی خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

"بالکل ہو جائے گا صاحب! بمبئی کلکتہ دلی مدراس جہاں آپ جس ٹرین سے جانا چاہیں آج کا کہیے آج کا ریزرویشن کر دوں — یہ کہہ کر اس نے ریزرویشن فارم میری جانب بڑھا دیا جیسے ہی میں نے اسے فارم بھر کر دیا اس نے کھٹ سے خانہ پری کر کے ٹکٹ برتھ ریزرویشن اور باقی پیسے تھما دیے۔

باہر نکل کر ایک بڑی دکان میں اس امید سے داخل ہوا کہ شاید بے بی فوڈ اور گھی مل جائے۔ دکان دار نے کہا۔ ڈبے کا دودھ گھی، شکر، مٹی کا تیل ہر چیز جتنی چاہیے۔ مل جائے گی۔

خدا کا شکر ادا کرتا ہوا باہر نکلا۔ والد صاحب کو منی آرڈر کرنا تھا مگر ڈاکخانے کی لمبی لمبی بلکہ شیطان کی آنت سے لمبی لائن اور منی آرڈر

کلرک کے خونخوار تصور کے خوف سے منی آرڈر کرانے کیا ڈاکخانے میں گھسنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ پھر بھی میں نے سوچا لاؤ کوشش تو کر دوں شاید چار پانچ گھنٹے میں کامیابی ہو جائے۔

ڈاکخانے کے منی آرڈر کاؤنٹر پہ کلرک جیسے میرا ہی منتظر نظر آرہا تھا۔ اس نے فارم پر مہر لگاتے ہوئے اسے رجسٹر پہ چڑھایا اور رسید تھمادی ایمان کی بات تو یہ تھی کہ پسینے بھی نہ دے پایا تھا کہ منی آرڈر ہو چکا تھا۔ انتہائی حیرت سے ہنستے مسکراتے منی آرڈر کلرک کو دیکھا اور ڈاکخانے کو دعائیں دیتا باہر نکل آیا۔

بازار میں حد نگاہ تک کوئی دفتری دوست نظر نہ آرہا تھا سامنے ایک دفتر تھا جسے نہ جانے کب سے بطور چائے خانے کے استعمال کرتے چلے آرہے تھے۔ اس میں جانے کے لیے بڑھا۔ مگر وہاں ایک پہرے دار تھا جس نے روک کر کہا۔

"دفتر میں بلا سرکاری کام کے نہ تو کسی سے ملاقات ہو سکتی ہے اور نہ کوئی باہری آدمی دفتر کی کینٹین میں چائے پی سکتا ہے۔ کینٹین میں سوائے چائے بنانے والے کے کوئی نظر بھی نہیں آرہا تھا۔

واپسی میں اپنا پرانا دوست پیٹر مل گیا۔ بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"نہ کوئی سیدھے منہ بات کر رہا ہے۔ نہ گپ کے لیے رک رہا ہے۔ نہ کوئی نظر آرہا ہے۔ جسے دیکھو اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ آخر دم بھر میں یہ کیا ماجرا ہو گیا۔؟

بس کی لائن میں آگے بڑھتا ہوا پیٹر بولا۔

"دوستی کا ٹائم ٹیبل ایمرجنسی نے بدل دیا ہے۔ دوست اب بھی گپ کے لیے مل سکتے ہیں مگر دفتر کے بعد ایمرجنسی کی وجہ سے نہ صرف سب وقت پر دفتر جاتے ہیں بلکہ پورے وقت واقعی کام کرتے ہیں۔ اگر تم کسی دفتر میں جاؤ تو فائلوں کو واقعی چلتے ہوئے دیکھ سکتے ہو۔۔۔!"

اتنے میں بس آگئی۔ پیٹر سر کے اشارے سے گڈ بائی کرتا ہوا بس میں داخل ہو گیا۔

معاملہ سمجھ میں آتے ہی دفتری احباب کے لیے دل میں جو انجانا غبار آگیا تھا وہ مسکراہٹ نے صاف کر دیا اور ایمرجنسی کے جادو اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کی برکتوں پر غور کرتا ہوا گھر واپس آگیا۔

سانیٹ

منوہر لال ہادی

گیا چمن میں تو دیکھا عجیب تھا منظر   ہوا میں آگ تھی شعلے اگل رہے تھے لوگ
عداوتوں کے الاؤ میں جل رہے تھے لوگ   غرض کہ حدِ نظر تک مہیب تھا منظر

ضمیر و عقل کی لاشیں جلا رہے تھے لوگ   جو صبح و شام اہنسا کا نام لیتے تھے
وہی عمل میں تشدد سے کام لیتے تھے   نگر نگر نئے فتنے جگا رہے تھے لوگ

اتر کے آئی فلک سے فلاح کی دیوی   سکون و امن جھلکتا تھا جس کی آنکھوں سے
ٹپک رہے تھے ترقی کے قطرے باتوں سے   دیار و دشت میں ہونے لگی ضیا پاشی

گیا چمن میں تو دیکھا بدل گئے ہیں لوگ
سمجھ گئے ہیں حقیقت سنبھل گئے ہیں لوگ

کنول دھامپوری

ایمرجنسی کا استقبال

اب نہ مزدور کو لوٹے گا لٹیرا کوئی
خون پیتے تھے جو کل تک وہ درندے بھاگے
رام کے دیش میں سکھ چین کی مرلی باجی
عیش کی نیند سے انصاف کے بندے جاگے

رحم سرمایہ پرستوں نے رکھا تھا گروی
کس کے دل میں تھی غریبوں کی محبت پہلے
کتنے بچوں نے بلکتے ہوئے جانیں دیدیں
کس کی آنکھوں میں تھی انسان کی قیمت پہلے

اب وہ انسان نما بھیڑیے روپوش ہوئے
اندرا جاگ اٹھی ہے تو وطن جاگا ہے
مسکراتی ہوئی پھر امن کی دیوی آئی
لہلہاتا ہوا گاندھی کا چمن جاگا ہے

مردہ جسموں میں نئی روح نے ڈیرا ڈالا
خشک آنکھوں میں مسرت کے شگوفے پھوٹے
خونِ مزدور پیئے گا نہ درندہ کوئی
قید سے فاقہ و افلاس کے قیدی چھوٹے

صرف نعروں سے غریبی نہ مٹے گی یارو
ہم پہ جو فرض ہے اس کو بھی نبھانا ہوگا
جتنی بنجر ہے زمیں ہاتھ میں تیشہ لے کر
مادرِ ہند کو گلزار بنانا ہوگا

اثر سلونوی

ایمرجنسی

چاند بی بی، لیلیٰ خالدہ لکشمی بائی کہیں
نازِ زہرہ یا جواہر لال کی بیٹی کہیں
بیرو گاندھی کہیں یا اندرا گاندھی کہیں
توڑ دی ہے آپ نے ہمت سے ہر رسمِ کہن
اے وزیرِ اعظمِ ہندوستاں فخرِ وطن

آج پھر آئی وطن کے کام ہمت آپ کی
ہے یقینِ اہلِ دانش ہے یہ حکمت آپ کی
کر رہی ہے ساری دنیا اب حمایت آپ کی
آج ہم آواز ہے ہر قافلہ ہر انجمن
اے وزیرِ اعظمِ ہندوستاں فخرِ وطن

آپ کا ہر فیصلہ مثلِ ہمالہ ہے اٹل
قابلِ تعریف ہے یہ آپ کا طرزِ عمل
ہے ایمرجنسی یقیناً حق بجانب برمحل
تھا لباسِ راہبر میں قافلے کے راہزن
اے وزیرِ اعظمِ ہندوستاں فخرِ وطن

امن کے خواہاں کی خاطر ہے یہ پیغامِ بہار
خارِ پژمردہ ہوئے پھولوں پہ آیا ہے نکھار
بن رہے ہیں ہر طرف فرقہ پرستی کے مزار
سب ہیں اک دل جس طرح سنگم میں ہوں گنگ و جمن
اے وزیرِ اعظمِ ہندوستاں فخرِ وطن

مفلس و نادار کے خوابوں کی اک تعبیر ہے
نامکمل ہی سہی لیکن حسیں تصویر ہے
ہاں غریبی کے مٹانے کی یہی تدبیر ہے
ظلمتِ شب میں ہے اک امید کی روشن کرن
اے وزیرِ اعظمِ ہندوستاں فخرِ وطن

قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

مثنوی سحرالبیان میں معاشرت

مثنوی سحرالبیان اگرچہ کلاسکی انداز پر لکھا گیا ایک منظوم قصہ ہے لیکن اس میں قدیم روایت قصہ گوئی کی ٹکنیک بھی موجود ہے اور ماحول بھی عام طور پر ایسی کہانیوں، قصوں یا داستانوں جو دیومالائی یا اساطیری انداز کی نمائندہ ہوتی ہیں، معاشرتی تصویر کے خد وخال نکالنا اور پھر اُن کو پہچاننے کی سعی کرنا کارِ شیشہ گری سے کم نہیں ہوتا کیونکہ اس طرح کے قصے عموماً اپنی نوقِ فطری اور آدرشی (IDEAL) ٹکنیک کے سبب زمانی و مکانی تسلسل کے بار کو اٹھانے کے سزاوار نہیں ہوپاتے، مثنوی سحرالبیان میں بھی ایسے مواقع جگہ جگہ موجود ہیں جہاں عقل اپنی شکستہ پائی کا جواز ڈھونڈنے لگتی ہے اس لیے کہ قصے کا ٹمپو (TEMPO) ہی بنیادی طور پر کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ اپنا رشتہ مادیت کے بجائے ماورائیت اور حقیقت کے بجائے طلسم سے استوار کرلیتا ہے لیکن پھر بھی یہاں معاملہ قدرے آسان ہے۔ قصے کے ارگرد اور اس کے ماحول کا مرکزی پتھر وہ معاشرہ ہے جس میں جگہ جگہ شگاف پڑ چکے ہیں بس قریب ہے کہ اس پتھر کو ذرا حرکت دی جائے اور پوری عمارت زمین بوس ہو جائے۔

مصنف نے روایتی انداز میں اس قصے میں جاگیردارانہ زندگی، اس کے رسم و رواج اور دوسری تفصیلات و جزئیات پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے لیے اس نے جہاں زبان و بیان کو ادبیت دینے کی کوشش کی ہے وہیں پر اس نے سہواً بھی شاہی ایوان میں کسی بے ادب کو داخل نہیں ہونے دیا ہے اور حرم محترم کے ترانے اس انداز میں گاتا رہا ہے کہ قدسیوں کو بھی وجد آئے بغیر نہ رہے۔ اس کے باوجود جہاں بھی موقع ملا ہے شیطنیت نے اپنی بساط بچھادی ہے، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں قدم قدم پر جہاں ثنویت کا رقص ملتا ہے وہیں پر معاشرتی سطح پر بھی حرم و مکیدہ باہم دست و گریباں نظر آتے ہیں جس میں مصنف کی ہزار ہا منشا کے خلاف معاشرہ کے انھیں افراد کو برتری اور فوقیت حاصل ہوتی ہے جو عوام کے نمائندہ ہوکر ابھرتے ہیں۔ ان کی تصویریں بھی اتفاق سے زیادہ شوخ و شنگ، متحرک، زندہ اور توانا نظر آتی ہیں جبکہ دوسری طرف بادشاہ اپنے تمام اقتدار اور اختیار کے علی الرغم زندگی کی انفعالی سطح پر سانس لیتا معلوم ہوتا ہے جس میں نہ تو زندگی کے چیلنج کا جواب دینے کا حوصلہ ہے اور نہ وہ خود کسی طرح کی رزم آرائی کا متحمل ہوسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اودھی تہذیب کی فنا کو مسلم کرنے کے سلسلے میں ایک زبردست ناسور بن کر ابھرتا ہے جو بتدریج رستا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی زہرناکی پورے معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کرجاتی ہے اس لیے کہ مرض بھی ایک معاشرتی اصول کا پابند ہوتا ہے۔ اس کا رشتہ فرد اور سوسائٹی سے یکساں ہے۔ فرد کا باطنی حزن معاشرے کے اندرون میں جاگزیں ہوتا ہے۔ عمل اور ردِ عمل کا یہ سلسلہ برابر چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک فرد کا جرم پورے معاشرے کو سزا دلائے بغیر نہیں رہتا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مثنوی سحرالبیان کے قصے کا تانا بانا نواب آصف الدولہ کے گرد تیار کیا گیا ہے اور وہی اس کے اصل محرک

ہیں۔ ان کا جو خصوصی لطف و کرم میر حسن پر رہا ہوگا اس کا بدلہ میر حسن نے یہ مثنوی لکھ کر چکا دیا۔

مثنوی لکھ کر میر حسن نے نواب آصف الدولہ کی ستائش کا ایک بہانہ ڈھونڈا تھا جسے اتفاق سے ادبی و تاریخی دستاویز کی اہمیت حاصل ہو گئی، بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ میر حسن نے ایک نواب کو بادشاہ عالم پناہ کے مرتبے تک پہنچا کر جہاں تاریخ کی گردن زدنی کی ہے وہیں پر انھوں نے بے جا غلو سے کام لے کر خود بادشاہ کو ایک مسخرآمیز چیز بنا کر پیش کیا ہے لیکن جو لوگ ایسا کہتے ہیں انھیں شاید یہ نہیں معلوم ہے کہ میر حسن کے پیش نظر مثنوی لکھ کر نہ تاریخ میں اضافہ کرنا تھا اور نہ ہی وہ کسی حقیقی قصے کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرنے کا اہتمام کر رہے تھے۔ بنیادی طور پر بادشاہ یعنی نواب آصف الدولہ کی ستائش ہی ان کے پیش نظر تھی جس کے لیے وہ غلوآمیز زبان استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ اس قصے میں روایت کو اس قدر دخل ہے کہ بعض جگہ افرادِ قصہ کی اہمیت ضمنی و ثانوی رہ جاتی ہے۔ پھر اس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں حقیقی عیش و طرب کی لَے درد و الم اور داخلی کرب کے سخت پتھر تلے دب کر کچل گئی ہے جس کا اندازہ افرادِ قصہ کے بیشتر شاہی کرداروں کی بے بسی و بے دست و پائی سے ہوتا ہے۔ وہ جس باطنی حزن کے شکار ہیں اس کا واگزاشت ہر مرحلے پر ہوتا ہے۔ ان کے ذہنوں پر جمود و تعطل اور نامرادی کے سائے کالے دھن کی مانند چھائے ہوئے ہیں، انھیں مستقبل سے کوئی امید باقی نہیں رہی ہے اس لیے وہ زندگی کے شریان سے آخری قطرہ تک کشید کر لینا چاہتے ہیں۔ ایسا دراصل کیوں ہے اور اس داخلی کرب کے اسباب کیا ہیں؟ یہ مسائل سراسر تاریخی ہیں اس لیے ادب کے ایوان میں زیب نہیں دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کی سرزمین میں انگریزوں کے کامل تسلط کے بعد جو علاقے مقامی راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں کو بطور تحفہ کے دیے گئے تھے اس سے ان کی پیاس نہیں بجھ سکتی تھی جبکہ انھیں ہر لمحہ یہ خوف بھی لاحق رہا ہو کہ انگریزی سامراج کا دستِ ستم نہ جانے کب ان کا گلا گھونٹ دے۔ حالانکہ اودھ کے حکمرانوں کو ملکی مسائل و معاملات سے بے دخل کر کے انھیں زیادہ پرسکون ماحول دے دیا گیا تھا لیکن یہ بھی صحیح معنوں میں ان کو راس نہ آیا۔ آخر وہ بھی تو انسان ہی تھے۔ جب وہ زندگی کے صرف ایک ہی رخ کے اسیر کر دیے گئے تو اس کا فطری ردعمل سامنے کب تک نہ آتا۔ تعیش اور روحانی جمود ان کی سرشت کا جزِ لاینفک بن گیا۔ یہ دونوں چیزیں باہم دگر ہو کر سامنے آئیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ عملی سیاست سے الگ اور ایک زاویے کے لیے وقف کر دیے گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا تصورِ حیات یک رُخا (UNI-DIMENTIONAL) ہو کر رہ گیا۔

اس دور کی معاشرتی زبوں حالی کا صحیح اندازہ ادبی سطح پر بقول علامہ اقبال مثنوی سے کم مرثیہ سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے کہ مرثیہ ایک پژمردہ روح اور کھوکھلی تہذیب کے لیے مناسب ترین میڈیم ثابت ہوتا ہے جس کے آئینہ خانے میں ہر تصویر ہراساں اور کھوئی ہوئی سی نظر آتی ہے لیکن اس کا تھوڑا بہت اظہار اس مثنوی میں بھی ہوا ہے خصوصاً ایسے موقعوں پر جہاں ہیرو کے سلسلے میں کی جانے والی رسم و رواج کا ذکر ہوا ہے وہاں عوامی ذہنیت صاف جھلکتی نظر آتی ہے اور پوری سوسائٹی کا نقشہ نظر میں گھوم جاتا ہے۔

جاگیردارانہ ذہنیت چونکہ عیش پرستی اور نشاط کی خوگر ہو چکی ہے اس لیے خواص کے ساتھ ساتھ عوام بھی انھیں راہوں پر محو خرام نظر آتے ہیں چنانچہ اس معاشرے میں عیش پسندی اور خصوصاً جنسی بے راہ روی ایک اہم ترین نقطۂ محور بن کر ابھری ہے یہ ایسا (PIVOT) ہے جس کے گرد ہر خاص و عام گردش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ زندگی کی تمام دلچسپیوں کا سلسلہ آکر یہیں ختم ہوتا ہے اس کو مزید تقویت ملنے کے لیے فحاشی کے اڈے بھی جگہ جگہ موجود ہیں طوائف کی ذات اس سوسائٹی میں محترم سمجھی جاتی ہے اور اس کی محفلوں میں شرفا، زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں، جنسی سطح پر انفعالیت ایسے مرض کی صورت میں ڈھلی ہے کہ اس سوسائٹی میں مرد بھی زنانی خصوصیات سے مزین نظر آتے ہیں۔ چنانچہ شاہزادہ بے نظیر کے

سلسلہ میں لفظ "نازنیں" کا استعمال خود اس امر کی وضاحت کے لیے کافی ہے ؎

عجب عالم اس نازنیں پر ہوا　　اثر گرد گدی کا جبیں پر ہوا
لب بام پر جب یہ سوے صنم　　کریں سورۂ نور کو اس پہ دم

اس قسم کی مردانہ صفات کے حامل نوجوان جس سوسائٹی میں موجود ہوں وہاں پر کس بات کی کمی ہو سکتی ہے اس معاشرہ میں بادشاہ کی حمایت کے سبب جہاں جنسی کجروی عام ہوئی ہے وہیں پر عریانیت نے بھی شہ پائی ہے۔ چنانچہ میرحسن کو جہاں بھی موقع ہاتھ آیا ہے انھوں نے ہر اخلاقی وسماجی بندھن کو نظر انداز کرکے یونانی بتوں کی طرح نسوانی حسن کو عریاں کرنے کا اہتمام کیا ہے چنانچہ شہزادی نجم النسا کے سراپا میں انھوں نے بڑی دیدہ دلیری سے ایسے دستِ راہ کو توڑ دیا ہے۔

ان ایام بازاری اور فحاشی کا منفی پہلو یہ ہے کہ اس سماج کے افراد کی زندگیاں مفلوج ہوکر رہ گئی ہیں اور وہ ایسے جانور کے مثل ہیں جو اعصابی تناؤ کے مرض میں مبتلا ہے اور ہر دوسری صفات سے محروم ہے خصوصًا شاہی کرداروں میں جمود و تعطل مردگی اور اضمحلال انھیں زندگی کی ہر امنگ سے محروم کرکے انھیں صرف درِ جاناں کا اسیر کر دیتا ہے جس سے سر ٹکرا ٹکرا کر وہ اپنے دلوں رزہ براندام دیکھ لیتے ہیں ؎

گئے بے نظیر اور بدر منیر　　گئے دونوں آپس میں ہوکر اسیر
رہا کچھ نہ تن من کی سُدھ بدھ اسے　　نہ کچھ اپنے تن کی رہی سُدھ اسے

اس سے قطع نظر اس معاشرہ میں ادب و احترام کا بھی تصور محض روایتی اور مصنوعی ہے یہاں تک کہ خود شاہی کرداروں میں عاشقانہ جذبات کے اظہار کے لیے بھونڈے قسم کے الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہے، یہاں تک کہ خادم مخدوم سے آپسی گفتگو میں بے حد بے باک ہو جاتا ہے۔ بدرِ منیر کی خادمہ نجم النساء کو ملاحظہ کیجیے ؎

گلابی کو لا اس کے آگے دھرا　　پیالے کو پھر جلد اس سے بھرا
کہا شاہزادی کو بیٹھی ہے کیا　　پیالہ تو اس بت کے منہ کو لگا

پھر یہ مشورے بھی ؎

مجھے جو چلے تو خوش آتے نہیں　　ترانے نازبے جا یہ بھاتے نہیں
مری طرف ٹک دیکھ تو ہائے ہائے　　مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے
کیا ہے اگر تو نے گھائل اسے　　تو مت چھوڑ اب نیم بسمل اسے
ٹک اک حظ اٹھا زندگانی کا تو　　مزہ دیکھ اپنی جوانی کا تو
مئے عیش کا جام اب نوش کر　　غم دین و دنیا فراموش کر
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں　　گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

جہاں تک ذہنی افلاس، جمود و تعطل اور بے حسی و شکستہ پائی کا تعلق ہے یہ عمومًا شاہی کرداروں ہی کا وصف خاص بن گیا ہے ورنہ عام آدمی اس سپاٹ انداز میں بسی ہوئی زندگی کا شکار نہ رہ کر حیات و کائنات کے دوسرے مظاہر سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کے باوجود عوام شہنشاہ وقت ہی کے ساز عشرت کا ایک حصہ ہیں۔ بہرحال ان کی فعالیت اور تحرک کا سراغ اس مثنوی میں متعدد جگہ ہوتا ہے، خود ابتدا میں نجومیوں اور رمّالوں کی زندگی، دوسری شہنشاہی جشن کے موقع پر عوام و خاص کا ذہنی تعاون، طوائفوں کی مقبولیت اور ان کے انداز و ادا سبھی اس حقیقت کے غماز ہیں، اس تحرک کا تھوڑا سا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے ؎

بجاتے ہوئے شادیانے تمام　　چلے آگے آگے ملے شادکام
سوار اور پیادے صغیر و کبیر　　جلو میں تمامی امیر و وزیر
سجے اور سجائے سبھی خاص و عام　　لباسِ زری میں ملبّس تمام
طرق کے طرق اور پرے کے پرے　　کچھ ادھر ادھر کچھ دھرے کچھ پرے
تماشائیوں کا جدا تھا ہجوم　　ہر اک طرف تھی ایک عالم کی دھوم
رعیت کی کثرت ہجوم سپاہ　　گزرتی تھی دب دب کے ہر جا نگاہ
نہ پہنچا جو اک مرغ قبلہ نما　　سو وہ آشیانے میں تڑپا کیا

جنسی بدعت کے بعد اس مثنوی میں شراب و کباب کے بھی جابجا دور چلتے رہتے ہیں جو صرف شاہی افراد تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس سے عوام کا بھی تعلق تر ہے اور وہ اس شغل میں برابر کے شریک ہیں، کوئی بھی تقریب و رسم، وظیفۂ مے گساری کے بغیر ادا نہیں ہوتی چنانچہ اس مثنوی میں ساقی و شراب کی اتنی بھرمار ہے گویا یہ سسکتے ہوئے طبقاتی سماج کے زخموں کا بہترین مداوا ہے۔

اس مثنوی میں مصنف نے اپنے طور پر اگرچہ یہی کوشش کی ہے کہ مسرت و انبساط کے لمحات پر کبھی آرام کے سائے نہ منڈلا سکیں لیکن ایسا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی خوشی۔ غم کے بغیر مکمل ہوتی ہے اس لیے مثنوی میں ایسے حالات پیدا ہو ہی گئے ہیں جہاں مصنف خود بھی رو دیا ہے اور ہمیں بھی اپنا ہمنوا بنا لیا ہے۔ ان حقائق کو اس لیے بھی گرفت میں لینا ضروری ہے کہ ان کے وسیلے سے ہمیں فرد اور معاشرہ کی زندگی کا دوسرا رخ دیکھنے کو میسر آجاتا ہے جو اتفاق سے زیادہ گہرے تاثر کا حامل ہے اس کے تحت ہم اس ذہنی زندگی کا مطالعہ کر سکتے ہیں جن کے تحت الشعور میں ایک انجانا خوف، ایک نامرادی کی خلش اور کھوکھلے پن کا احساس تحتی رَو (UNDER - CURRENT) کے طور پر اپنا کام کر رہا ہے۔ ذیل کے اشعار تصویر کا دوسرا رخ پیش کرتے ہیں ؎

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی — کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلاتی سی پھرنے لگی — کوئی ضعف ہو ہو کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو — گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
سنی شہ نے القصہ جب یہ خبر — گرا خاک پر کہہ کے ہائے پسر
اٹھا شہر میں ہر طرف شور و غل — کہ غائب ہوا اس چمن سے وہ گل
نہ غنچہ نہ گل نے گلستاں رہا — فقط دل پہ اک خارِ ہجراں رہا

اس طرح ایک اور تصویر ملاحظہ ہو ؎

دوانی سی ہر طرف پھرنے لگی — درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب — لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
تپ ہجر گھر دل میں کرنے لگی — دُرِ اشک سے چشم بھرنے لگی

جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے — محبت میں دن رات گھٹنا اسے
نہ کھانے کی سدھ اور نہ پینے کا ہوش — بھرا اس کے دل میں محبت کا جوش

یہ اشعار معاشرے کے جن افراد کی زبوں حالی کے آئینہ دار ہیں ان میں ہزار سطوت و جبروت کے باوجود اتنی سکت باقی نہیں ہے کہ وہ اٹھ کر پانی پی سکیں۔ شاہزادے کے باپ کا جو عالم ہے وہ ایک عام باپ کے حال زار سے بھی ابتر ہے اسی طرح شاہزادی خود عشق کا اس طرح نخچیر بن چکی ہے کہ اس نے سارے سماجی و معاشرتی آداب و احترام کو یک سخت خیر باد کہہ دیا ہے اور ایک عام عورت کی مانند دردِ عشق کا اظہار کرنے پر آمادہ ہے۔

اس مختصر سے مطالعہ سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مثنوی سحر البیان بنیادی طور پر ایک مخصوص تہذیب، ماحول و معاشرہ کا بے حد دلکش آئینہ ہے جس میں وہ تہذیب پیش کر دی گئی ہے جس کے گرد افراد قصہ گردش کرتے ہیں، اس مثنوی میں ایسا بہت ہی کم ہوا ہے کہ عوام کی حالت، اس کے مزاج اور افتادِ طبع کو [illegible] سے کوئی اہمیت دی گئی ہو، شاید ایسا اس لیے بھی نہیں کیا گیا کہ عوام کی زندگیاں اس قابل نہ سمجھی گئیں۔ اس وجہ سے ہم ان کی ذہنی و روحانی زندگی کا گہرا مطالعہ نہیں کر سکتے اور آخری فیصلہ یہ کر سکتے ہیں کہ وہ بھی بتدریج زوال آمادہ تہذیب کے سنگ و خشت تلے دب کر کچل گئے ہیں۔ ان کی صورتیں مسخ شدہ ہیں جنھیں ہم علاحدہ نہیں پہچان سکتے لیکن پھر بھی ان کی زندگیوں میں عمل اور حیات کی ایسی چنگاریاں اب بھی موجود ہیں جو شاہانہ کر و فر سے معمور زندگیوں کے خرمن خس و خاشاک کو خاکستر کرنے کے لیے کافی ہیں۔

★

مرزا عباس بیگ محشرؔ بنارسی

[illegible] غازی پوری

کل کے بنارس اور آج کے وارانسی کو اگر مذہبی لحاظ سے "کعبۂ ہندستان" ہونے کا فخر حاصل ہے تو ادبی اور علمی زاویۂ نگاہ سے بھی اس قدیم شہر کی انفرادیت مسلّم ہے۔ اس کی خاک پاک سے آغا حشرؔ کاشمیری، مرزا محمد حسن فائزؔ، حضرت فرخؔ، میر ریاضؔ علی جیسے صاحبانِ نقد و نظر پیدا ہوے۔ جن کے فیوض سے بنارس کا ادبی کارواں ارتقا کی راہوں پر دوسرے علاقوں کے دوش بدوش نظر آتا ہے۔

گذشتہ نصف صدی میں جن شخصیتوں نے اس انجمن میں علم و ادب کی شمعیں روشن کی ہیں ان میں مرزا عباس بیگ محشرؔ بنارسی مرحوم نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ محشرؔ مرحوم کی زندگی کے جتنے اوراق میرے پیش نظر ہیں انھیں پڑھنے کے بعد بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ محشرؔ کا وجود دنیاے شعر و ادب کے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھا۔

مرزا صاحب نے جس ادبی ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ تمام تر "غزل گوئی" کا ماحول تھا۔ اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ مرزا صاحب بھی اسی ڈگر پر چل پڑتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ان کی حقیقت پسند فطرت اس "نیم وحشی صنفِ سخن کے ناز بہت دیر تک نہ اٹھا سکی جس کی ساری عمارت ہی خیال آرائی، تصنّع اور مبالغہ پر کھڑی ہے۔ انھیں فریبِ الفاظ کے خول میں چھپ کر جینا پسند نہ ہوا۔ اور ہوتا بھی کیسے جبکہ ان کی رگوں میں ان بزرگوں کا خون دوڑ رہا تھا جنھوں نے اپنے سپاہیانہ عزائم سے انقلاب کے راستوں پر کچھ غیر فانی نقش و نگار بنائے تھے۔ ان کی افتادِ طبع بھی ان بزرگوں سے الگ نہ تھی۔ ملکی حالات یکسر بدل چکے تھے اور انگریزی حکومت ہندستان کا مقدر بن چکی تھی اس لیے آہنی تلوار اٹھانے کا تو مقدور نہ رہا تھا پھر بھی محشرؔ مرحوم کی رگوں میں دوڑنے والا بزرگوں کا سپاہیانہ خون نچلا نہ بیٹھ سکا۔ اس نے محشرؔ سے قلم کی شمشیر اٹھوا ہی لی۔

مرزا مرحوم کے مورثِ اعلا ایران سے ہندستان آے تھے۔ محمد شاہ رنگیلے کے دربار میں ملازمت مل گئی تھی۔ ان کے پردادا مرزا رضا بیگ صاحب کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں عملی اشتراک، آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر سے وفاداری کے جرم میں پھانسی کو گلے لگانا پڑا تھا۔ مرزا مرحوم کے دادا مرزا علی بیگ اس واقعہ کے بعد بنارس چلے آے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ یہیں مرزا عباس بیگ محشرؔ دسمبر ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔

یہ کہنا تو درست نہ ہوگا کہ محشرؔ نے شاعری ورثہ میں پائی تھی کیونکہ ان کے بزرگوں میں کوئی شاعر نہیں ملتا یہی نہیں بلکہ ان کے والد مرزا حیدر بیگ صاحب تو شعر و شاعری کے معاملے میں بے انتہا سخت گیر تھے۔ پھر بھی یہ ضرور ہے کہ شاعری مرزا صاحب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ انھوں نے آٹھ نو سال ہی کی عمر میں شعر موزوں کرنے شروع کر دیے تھے اور وہ اشعار "غزل" کے سوا کوئی اور شکل و صورت بھی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مرزا صاحب کا منفرد انداز فکر اس صنف سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ ان کے جمالیاتی ذوق کو غزل کے دامن میں تسکین کا سامان نہ مل سکا۔ چنانچہ تجربات کی وادیوں سے گزرتے ہوے جب ان کی جولانیٔ فکر نے مناظرِ قدرت اور مظاہرِ فطرت سے اپنا رشتہ جوڑ لیا تو انھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو نظموں کی تخلیق

کے لیے وقف کر دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مرزا صاحب نے غزلیں نہیں کہیں۔ مرحوم نے غزلیں کہیں جن میں خوب سے خوب تر اشعار بھی ملتے ہیں:

تو نے تو آ کے مرجع عالم بنا دیا
یوں کون جانتا تھا ہمارے مزار کو

شکستہ اور ناہموار گورستاں کی دیواریں
بتاتی ہیں کہ حدِ عالمِ فانی یہاں تک ہے

مجھ کو مت دیکھ ان نگاہوں سے
آرزوئے حیات ہوتی ہے

ان کا یہ خط نہیں سندِ التفات ہے
لکھ لکھ کے میرا نام مٹایا گیا تو ہے

سب جسے روزِ حشر کہتے ہیں
ہم غریبوں کی رات ہوتی ہے

اس طرح سے گزرا نہ کرو راہگزر سے
اب لوگ تمھیں دیکھتے ہیں اور نظر سے

لیکن محشر کی بیباک اور صداقت پرست فطرت، حشر و قہر، وصل و فراق، زلف و رخسار، رشک و رقابت کی شعبدہ بازیوں سے کسی طرح میل نہیں کھاتی تھی۔ لہٰذا ــــ "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے" کہتے ہوئے بزمِ غزل سے نکلے تو مناظرِ فطرت کے وسیع میدان میں جا کر ہی دم لیا۔ اور سچ پوچھیے تو محشر مرحوم کے فن کی پیاس فطرت کے حسین نظاروں سے برسنے والی رنگینیوں نے بجھا دی۔ جس کا جیتا جاگتا ثبوت نگارِ فطرت ہے۔

ہر چند کہ محشر نے "از بنارس نہ روم" کے مصداق ساری زندگی بنارس میں گزاری اور بالآخر اس سرزمین کو اپنی ابدی آرام گاہ بھی بنا لیا لیکن سحر کی رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی ان کی آواز اس کعبۂ ہندستان اور وادیٔ گنگ و جمن سے آگے بڑھ کر چناب، جہلم اور راوی کی نقرئی لہروں پر رقص کرتی ہوئی "دیارِ اقبال" تک پہنچی اور نگارِ فطرت بن کر پنجاب کے ادبی ماحول پر چھا گئی۔

نگارِ فطرت کے نام سے محشر مرحوم کی منتخب نظموں کا مجموعہ پنجاب اکیڈمی لاہور نے اس وقت شائع کیا جبکہ ملک کی گردن پر تقسیم کا آرہ چل چکا تھا، برصغیر کی مقدس تہذیبی روایات نیلام ہو چکی تھیں، نفرت و عصبیت کے عفریت کو کھلے عام ننگا ناچ دکھاتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ حالات کی اس تبدیلی نے کاشی سے لاہور کے فاصلے کو سات سمندر پار کے قدیم تصوراتی فاصلے سے بھی کہیں زیادہ بڑھا دیا تھا۔ ایسے ناسازگار اور ناخوشگوار ماحول میں لاہور اور بنارس اتنا نزدیک کیسے آ گئے؟ یہ ایک سوال ضرور اٹھتا ہے۔ لیکن اس کے تسلی بخش جواب کے لیے سر رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک خط کافی ہے جو انھوں نے ڈاکٹر محمد عباس علی لمعہ حیدرآبادی کو، ر فروری ۱۹۳۳ء کو لکھا تھا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"بارہا مجھے اس بات نے تکلیف پہنچائی ہے کہ نقادوں کی ایک جماعت میری اور سر محمد اقبال کی ادبی کوششوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ رویہ اس ادب کے لیے بالکل غلط ہے جو انسانی دل و دماغ کے عالمگیر پہلو سے بحث کرتا ہے اور اس طرح تمام ملکوں اور زبانوں کے شعرا اور اہلِ فن کو ایک برادری میں منسلک کرنے کا سامان پیدا کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سر محمد اقبال اور میں ادب میں صداقت اور حسن کی خاطر کام کرنے والے دو دوست ہیں اور اس جگہ یکجا ہو جاتے ہیں جہاں انسانی دماغ اپنا بہترین ہدیہ جاودانی انسان کے حضور پیش کرتا ہے۔"

ٹیگور کے ان جملوں میں اقبال کی عظمت کی تائید کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا اعلان عام بھی ہے کہ انسانی دل و دماغ کے عالمگیر پہلوؤں اور زندگی کی ابدی اور آفاقی قدروں کی ترجمانی کرنے والے ادب کو ملکوں اور زبانوں کی زنجیروں میں نہیں جکڑا جا سکتا۔ اس طرح یہ بات کسی حد تک صاف ہو جاتی ہے کہ محشر اور اقبال کے درمیان یقیناً کوئی قدرِ مشترک موجود تھی جس نے اس فاصلے کو ختم کر کے ان کے لیے اقبال کے وطن میں بھی جگہ بنا لی۔ اس معنوی قرب یا ہم آہنگی کی طرف اشارے سے دونوں شاعروں کا موازنہ مقصود نہیں بلکہ پنجاب کے عوامی شعور کے اس دھارے کی طرف توجہ منعطف کرانا مقصود ہے

جس نے ہر دور میں نت نئی ادبی تحریکوں کی آبیاری کی ہے اور فکر و فن کے ارتقا کی رفتار اور سمت کا تعین کیا ہے۔ اقبال بطن پنجاب سے آفتاب تازہ کی طرح نمودار ہوئے اور عروج کی منزلوں کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے قاری اور سامع کو ہلکی پھلکی نظموں کے ماحول اور غزلوں کی عام روایتی ڈگر سے ہٹا کر طویل نظموں کی اس شاہراہ تک لے آئے جہاں صدق و صفا کی بے شمار قندیلیں جگمگا رہی تھیں ایسے میں جب مرزا محشر کی وہ نظمیں جن میں انھوں نے فطرت کے حسین چہرے سے نقاب اٹھا کر بساط کائنات پر پھیلے ہوئے لامحدود حسن کو الفاظ کے دامن میں سمیٹ لیا تھا، اقبال کے قارئین و سامعین کے سامنے آئیں تو انھوں نے مناظر فطرت کے اس عظیم عکاس کو اپنا لینے میں دیر نہیں کی۔ اقبال نے یہ کہہ کر اردو ادب کے سر پر تاج رکھا تھا۔ ؎

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسمان سے اڑ کر کوئی ستارا
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

محشر نے اس تاج میں ایک اور ہیرا جڑ دیا۔ ؎

جگنو یہ نہیں فلک سے ہے بارش نور
یا دوش نسیم پر رواں شعلہ طور
یا ساغر ماہ سے چھلکتے قطرے
یا برق کے ذروں سے فضا ہے معمور

اقبال کے شبستان تصور کی خوشبو "پھولوں کا تحفہ عطا ہونے پر" یوں ہم تک پہنچتی ہے۔ ؎

وہ مست ناز جو گلشن میں آ نکلتی ہے
کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے
الٰہی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے
کلی سے رشک گل آفتاب مجھ کو کرے

محشر کی خلوت میں "گلاب کا ہار" یوں مہک کر اقبال کے قاری کے لیے توجہ کا مرکز بنتا ہے :

ترے گلے میں یہ ہنستا ہوا گلاب کا ہار
فروغ آتش گلنار سے جو ہے گلنار
ستارۂ سحری میں شفق کا ہالا ہے
گلوئے سرخ میں پھولوں کی سرخ مالا ہے
مہک رہا ہے تنفس کی عطر بیزی سے
گلوں کی اور بھی رنگت بڑھا کے تیزی سے
سکون ہے دل شاعر کی بیخودی کے لیے
حیات نو ہے محبت کی زندگی کے لیے

اس طرح کے سیکڑوں مقامات ہیں جہاں محشر نے احساسات کی ان بلندیوں کو چھو لیا ہے جہاں اسرار کائنات اور رموز قدرت کے تمام پردے بہ یک نظر اٹھ جاتے ہیں۔ ان کی نیچرل شاعری کا ہر شعر ہمارے اس خیال کی تائید کرے گا۔ بطوں کا قافلہ، تبکدہ آباد، نسیم بہار سے عشق پیچاں کا شرابی، شکستہ پر مرغابی وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو اردو ادب کی بہترین تخلیقات میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔ چند شعر "نسیم بہار" سے ملاحظہ ہوں۔ :

مجھے بھی ساتھ لیتی چل فضائے بوستانی میں
گلوں کی بادشاہت، طائروں کی حکمرانی میں
جہاں سرشار ہو کر تو ستارا بجاتی ہے
جہاں تو رقص کرنا شاخساروں کو سکھاتی ہے
جہاں نوخیز شاخیں دیکھتی رہتی ہیں مڑ مڑ کر
تری نازک خرامی کی ادائے دل ستاں اکثر
جہاں ندی کے آئینے پہ تصویریں بناتی ہے
جہاں سوئی ہوئی موجوں کے جادو کو جگاتی ہے
جہاں بوسوں سے تیرے نئے کے جنگل گنگناتے ہیں
کبھی نغمے سناتے ہیں کبھی سیٹی بجاتے ہیں
مرے دل کی تمنا ہے کہ تیرا ساز بن جاؤں
ترا ہم راز بن جاؤں تری آواز بن جاؤں

نگار فطرت کا شعری سرمایہ بہت زیادہ تو نہیں لیکن یہ کیا کم ہے کہ ان کی یہ کاوش اردو کی بہترین تخلیق کے بطور آکسفورڈ یونیورسٹی

کی لائبریری کی زینت بنی۔ ساتھ ہی ان نظموں کی شعری قوت ہی تھی
جس کی قدردانی کرتے ہوئے حکومت ہند نے محشر کے لیے ۲۵۰ روپیہ
ماہانہ تاحیات وظیفہ مقرر کیا۔

محشر مرحوم غزل کی زلفوں سے چھوٹ کر بنیر کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں گم ہو جانے کے باوجود اپنی رگوں میں دوڑنے والے بزرگوں کے خون کے اثرات نہیں مٹا سکتے تھے۔ انھیں بھی انگریزوں سے جنھوں نے وطن دوستی کے جرم میں ان کے پردادا کو تختہ دار تک پہنچایا تھا اتنی ہی نفرت تھی جتنی کسی بھی دوسرے محب وطن ہندستانی کو ہو سکتی تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

بڑھا دی ہے یہاں تک شوق نے وارفتگی دل کی
نظر آتی ہے ہر تصویر میں تصویر قاتل کی

ہماری بھی ترقی کس قدر اچھی ترقی ہے
زباں اپنی بھلا دی جب زبانِ غیر حاصل کی

تم اپنی ترقی کے سامان کیے جاؤ
بیکاریِ مشرق کا اللہ نگہباں ہے

غلامی کی فضا میں پل رہے ہیں
ہماری ابتدا کیا انتہا کیا

اور پھر یہ شعر تو مرزا صاحب کی بے پناہ شدت احساس کا ترجمان ہے:

فضا میں اڑنے والے طائرِ آزاد سنتا جا
کبھی قسمت نے بخشی تھیں یہی آزادیاں مجھکو

انگریزوں کی لڑاؤ اور حکومت کرو والی پالیسی کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ سہ

خاک ہوگا اتحاد باہمی اس ملک میں
جب ذرا چونکے کوئی فتنہ نمایاں ہوگیا

محشر مرحوم نے کسب معاش کا ذریعہ "مختاری" کو بنایا تھا۔ اس قانونی پیشہ میں ہونے کے باعث وہ انگریزوں کے بنائے ہوئے قوانین کے تمام نشیب و فراز سے واقف تھے۔ اس لیے انھوں نے بھی انگریزوں سے نفرت کے اظہار کے لیے وہی راستہ اپنایا جسے اکبر الہ آبادی نے۔ (سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے) اختیار کر رکھا تھا۔ محشر جانتے تھے کہ سنجیدگی سے ہر بزم میں کام نہیں لیا جا سکتا۔ برخلاف اس کے ہزلیات ہر لحاظ سے اظہار جذبات کا بہترین ذریعہ بن سکتی ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار میرے اس خیال کی تائید کرتے ہیں جن میں ضمیر فروش "رہنما" آج بھی ہیں اور کل بھی تھے۔ ان کی نبض پر انگلی رکھتے ہوئے کہتے ہیں :

یہ واقعات ہیں انھیں کیونکر غلط کہوں
صاحب میں اور آپ میں کچھ سازباز ہے

آزادیٔ وطن میں بھی کوشاں ہیں شیخ جی
تسمے بھی کھولتے ہیں حکومت کے بوٹ کے

گم کردہ راہ ہوں مجھے چلنے سے کام ہے
لے جائیں جس طرف بھی مرے رہنما مجھے

محشر نے "ہزل کی بے مزہ صنف شاعری کا سہارا لے کر وقتاً فوقتاً انگریز دشمنی کے شدید جذبات کا اظہار تو کیا لیکن "مزاح" کی اس وسیع چادر میں بھی ان سے اپنی فطری سنجیدگی نہ چھپائی جا سکی اور ظرفِ تنگنائے غزل کو بقدر ذوق نہ سمجھتے ہوئے ہزل شاعری کو اپنا مرکز توجہ بنا لینے کے بعد بھی وہ صنف غزل کی افادیت سے دامن نہ بچا سکے۔ ورنہ ان کی بیاض کے "گوشہ ہزلیات" میں ہزل کے درمیان ایسے اشعار ہرگز نہ ملتے :

وہ جبین جس سے طلوع صبح لیتی ہو مدد
کس نے شکوہ کرکے اس کو شبستاں کر دیا

رنگینیاں کہاں یہ گلستاں کی خاک کی
آنچل ترا نچوڑ دیا ہے بہار نے

عالم کیف میں مصروفِ غزل خوانی ہے
دے کے محشر کو اب آواز یہ آواز نہ چھیڑ

اسی طرح محشر کے جذبے کی صداقت، احساس کی شدت، سچائی، اخوت اور ہمدردی کے ساتھ بہتر اور خوشگوار تہذیبی ماحول کی تمنا ان کو غیر سنجیدگی میں بھی سنجیدگی کا دامن چھوڑنے نہیں دیتی، جبھی تو تفننِ طبع کا سامان فراہم کرتے کرتے وہ کہہ اٹھتے ہیں :

زندگی اس طرح تو سب کچھ ہے   دیکھیے جب بغور کچھ بھی نہیں

خدایا کتنی حسرت خیز ہیں بربادیاں میری
زمانہ خونِ دل سے لکھ رہا ہے داستاں میری

مجھے تو اے زمانے دیکھ عبرت کی نگاہوں سے
کہ اپنی خود کشی کی داستانِ خونچکاں ہوں میں

نئی تہذیب اب مت چھیڑ کر لے فیصلہ میرا
میں راضی ہو گیا اس پر خودی تیری خدا میرا

تسکین دل کے واسطے ہیں طاعتیں مری
میں خوب جانتا ہوں کہ تو بے نیاز ہے

محشر مرحوم کی صلاحیتیں صرف شاعری پر ہی ختم نہیں تھیں۔ یہ ضرور ہوا کہ ان کی کچھ نظمیں۔ نگارِ فطرت کی شکل میں یا چند نادلیں مثلاً خوبصورت ناگن، حکیم گلباز، سراب نیلش وغیرہ کی صورت میں لباس طباعت و اشاعت پا سکیں۔ ورنہ ابھی علاج و معالجہ، سراگ راگنی، تسخیر و عملیات اور شکاریات، کے متعلق الگ الگ رسالوں اور مذہبی نظریات کے قطعات، رباعیات، سلام اور مرثیوں کے علاوہ ان کا سب سے بڑا ادبی اور تاریخی کارنامہ "تذکرۂ شعرائے بنارس" ہے۔ جسے مرحوم بڑی جانفشانیوں سے مرحلۂ تکمیل تک لائے تھے۔ اور جو ہنوز تشنۂ اشاعت و طباعت ہے۔ بلاشبہ ان مضامین کی اشاعت اپنے موضوع کے لحاظ سے معلومات میں اضافہ کا سبب بن سکتی ہے۔

مرزا صاحب پر ۱۹۴۶ء میں فالج کا پہلا حملہ ہوا۔ کوشش اور مسلسل علاج سے جان تو بچ گئی لیکن صحت کو گھن لگ گیا۔ ہائی بلڈ پریشر کے عارضے نے ایک مستقل مرض کی شکل اختیار کر کے زندگی کی طرف سے مایوسی میں اضافہ کر دیا۔ اپنی اس بے بسی اور بے چارگی کا انھیں شدت سے احساس تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے بعض اشعار میں انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

تھکی ہوئی زندگی لیے ہے شباب رفتہ کا جام رنگیں
شراب تھوڑی سی بچ گئی ہے، اب اس میں آنسو ملا رہا ہوں
یہ شور کیسا مچا رہی ہے، کہیں نہ احباب میرے سن لیں
بلا اشاروں سے موت مجھ کو میں تیرے نزدیک آ رہا ہوں

اس کے باوجود ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۵ء تک محشر نے "ہولی ملن" کی گل افشانیوں سے مشاعرہ شاعرات کی رنگا رنگ دل فریبیوں تک بہت کچھ ادبی سماجی اور سیاسی خدمات انجام دیں اور تلاش عافیت میں بھی کوشاں رہے اور پھر اپنے ہی اس شعر کے مطابق کہ ؎

تلاش عافیت میں جب کبھی نکلا ہوں اے محشر
صدائیں گور سے آئیں یہاں آ تا یہاں ہوں میں

بنارس کے ادبی افق کا یہ ماہ تمام ۲۵ ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو عافیت کے اسی گوشے میں غروب ہو گیا۔

٭

غزل

شاہین بنارسی

پتھر کے پگھلنے میں ذرا دیر تو ہوگی
اس رات کے ڈھلنے میں ذرا دیر تو ہوگی

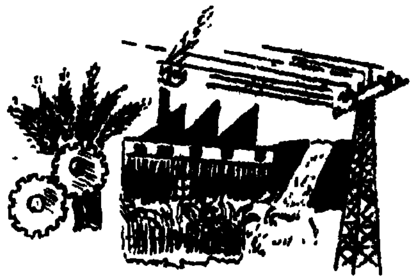
آخر شب آلام سے گھبراتے ہیں کیوں لوگ
سورج کے نکلنے میں ذرا دیر تو ہوگی

ہم برگ خزاں جیسے بھٹکتے ہیں ابھی تک
طوفاں ہے سنبھلنے میں ذرا دیر تو ہوگی

ہر نقش در و بام کا یہ سوچ رہا تھا
حالات بدلنے میں ذرا دیر تو ہوگی

سچائی کو سولی پہ چڑھا دیتے ہیں یہ لوگ
یہ رسم بدلنے میں ذرا دیر تو ہوگی

اے بدرؔ امڈ آئی ہے آنکھوں میں کوئی یاد
پھر دل کے بہلنے میں ذرا دیر تو ہوگی



اتر پردیش شاہ راہ ترقی پر

ہریجنوں کو زمین پر قبضہ دلانے کے لیے گورنر کی افسروں کو ہدایت ●●● اتر پردیش میں سرکاری اخراجات میں کفایت شعاری ●●● خاندانی منصوبہ بندی پروگرام میں سرگرمی پیدا کرنے کے لیے اقدامات ●●● کمزور طبقوں کو قانونی امداد دینے کے لیے دو لاکھ روپیہ منظور ●●● دیہی علاقوں میں غیر معیاری ناپ تول کے خلاف مہم پر زور ●●● سیاحت کی ترقی کے لیے اسکیمیں ●●● آلو اور ترکاری کی فصلوں کے لیے احتیاطی تدابیر ●●● لکھنؤ کی تاریخی عمارتوں کو خوبصورت بنانے کے لیے اقدامات ●●● چکوں کے الاٹمنٹ کے ساتھ ٹیوب ویلوں کے لیے قرضے ●●● میرٹھ میں کھیل کود کے سامان کے لیے صنعتی بستی کے قیام کی تجویز

گورنر ڈاکٹر ایم. چنا ریڈی نے کل ضلع حکام سے کہا کہ وہ اس بات کا یقین کر لیں کہ بے زمین ہریجنوں اور دوسرے لوگوں کو جنھیں زمین الاٹ کی گئی ہے پٹہ کا سرٹیفکیٹ، زمین پر قبضہ اور مالی امداد موقع پر ہی فراہم ہو گئی ہے اور انھیں اس کے حصول کے لیے پولیس تھانوں، تحصیلوں اور بینکوں تک نہ دوڑنا پڑے۔

انھوں نے کہا کہ زمین کی تقسیم کے کام سے متعلق افسروں کو اپنا کام واقعی خدمت کے جذبات کے ساتھ زمین پانے والوں کی خودداری اور وقار کا خیال کرتے ہوئے انجام دینا چاہیے۔ تاکہ وہ یہ نہ محسوس کر سکیں کہ انھیں زمین خیرات کے طور پر دی جا رہی ہے۔

گورنر محمود آباد ضلع سیتا پور میں کھیت پٹے اور پٹہ داروں کو دو سو سے ایک ہزار روپیہ تک رقم تقسیم کرنے کے بعد ایک جلسہ عام کو خطاب کر رہے تھے۔ کھیتی باڑی کا کام شروع کرنے کے لیے یونائیٹڈ کمرشیل بینک نے نقد رقم بطور قرض فراہم کی ہے۔ ڈاکٹر ریڈی نے زمین کی تقسیم کے سلسلے میں ضلع حکام کی کوششوں اور پٹہ داروں کی حقیقی مدد کرنے پر بینک کے افسران کے جذبۂ خدمت کی تعریف کی۔

انھوں نے کہا کہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت ریاست میں زمین کی تقسیم کو اولین ترجیح دی گئی ہے اور گاؤں سماج کی غیر متنازعہ زمین کی تقسیم کا کام مکمل کر دینے کے لیے آخری تاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۷۶ء اور دوسری زمینوں کی تقسیم کے کام کے لیے فروری ۱۹۷۶ء مقرر کی گئی ہے۔

گورنر نے اعلان کیا کہ جو ضلع مجسٹریٹ یا مجسٹریٹ تقسیم کے کام کو ہر نہج سے سب سے پہلے مکمل کریں گے انھیں ریاستی اعزاز سے نوازا جائے گا۔

وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کے تحت اتر پردیش میں موجودہ مالیاتی سال کے دوران غیر ضروری اور غیر ترقیاتی زمروں کے مصارف میں زیادہ سے زیادہ کمی کر کے سرکاری اخراجات میں ۵۲ کروڑ روپیہ کی بچت کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ریاست میں سرکاری زمرہ کے اداروں میں بھی بچت کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ اس قسم کے اقدامات کا مقصد ریاست کے محدود وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا اور ترقیاتی کاموں بالخصوص زراعت، آبپاشی، بجلی اور صنعت جیسے اہم زمروں کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم مہیا کرنا ہے۔

چیف سکریٹری شری محمود بٹ کی سربراہی میں تمام غیر ترقیاتی مدوں پر ہونے والے اخراجات کا جائزہ لینے کے لیے جو "عملدرآمد کمیٹی" قائم کی گئی تھی اس نے غیر منصوبہ جاتی زمرہ میں ۲ کروڑ ۹۳ لاکھ روپیہ کی بچت کرنے سے متعلق تجاویز کو آخری شکل دیدی ہے۔ اس کے علاوہ مزید ۲۰ کروڑ روپیہ کی بچت بھی زیرغور ہے اور اس سلسلہ میں تفصیلی جانچ کا کام ہو رہا ہے تاکہ بعض پرانی اور فرسودہ غیر منصوبہ جاتی اسکیموں کو ختم کر کے یہ بچت کی جاسکے۔

اس طرح منصوبہ جاتی زمرہ میں بھی ہر ممکن طریقہ سے بچت کرنے کے لیے بھرپور جانچ کی جارہی ہے۔

کفایت شعاری کے اقدامات کے تحت غیر ترقیاتی اخراجات مثلاً اتفاقیہ مصارف، کاغذ اور اسٹیشنری، ٹیلی فون اور اسٹاف کاروں کے استعمال، سفر بھتہ، بجلی اور پیٹرول کے خرچ اور سرکاری عمارتوں کی مرمت پر ہونے والے اخراجات میں بچت کی جائے گی۔ نئی موٹر گاڑیوں کی خریداری اور استعمال میں نہ آنے والی عمارتوں کی تعمیر پر بھی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

کفایت شعاری اقدامات کے تحت یہ تجویز بھی ہے کہ نئی آسامیاں قائم نہ کی جائیں اور نئی آسامیوں کی تشکیل اسی وقت کی جائے جب ایسا کرنا قطعی ناگزیر ہو حتیٰ کہ خالی آسامیاں بھی عام طور سے پر نہیں کی جارہی ہیں اور اگر کسی دفتر میں فاضل عملہ ہے تو اسے ترقیاتی پروگراموں میں لگایا جارہا ہے۔

ریاست میں گزشتہ سال کفایت شعاری کی جو زبردست مہم شروع کی گئی تھی اس کے نتیجہ میں حکومت کو نسبتاً کم اولیت والے کاموں کے اخراجات نیز ایسے مصارف میں کمی کر کے جن سے بچا جا سکتا تھا، ۷۵، ۱۹۷۴ء کے دوران تقریباً ۲۲ کروڑ روپیہ کی بچت ہوئی۔

* * *

ریاستی حکومت نے ۲۰ نکاتی پروگرام کی روشنی میں اتر پردیش بھر میں خاندانی منصوبہ بندی پروگرام پر عملدرآمد میں سرگرمی پیدا کرنے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی محکمہ کے علاوہ دیگر محکموں کو بھی اس سے وابستہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس فیصلہ کے بموجب تمام محکموں کو خاندانی منصوبہ بندی اور زچہ بچہ فلاحی پروگرام کے تحت ہر محکمہ کے لیے مقررہ نشانے کی تکمیل کے لیے سرگرم تعاون دینا ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک رننگ ٹرافی رکھی گئی ہے جو اس محکمہ کو دی جائے گی جس کی کارگزاری سب سے اچھی رہے گی۔

چیف سکریٹری نے علاج و صحت نیز خاندانی منصوبہ بندی نظامت کے ڈائرکٹر اور ریاستی خاندانی منصوبہ بندی افسر کے نام اپنے ایک خط میں اس بات پر زور دیا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی محکمہ کو پرچار کے مختلف طریقوں کے ذریعہ اس پروگرام کے لیے سازگار ماحول تیار کرنا چاہیے۔

ٹیچروں کو، جن کی تعداد ملازمین میں سب سے زیادہ ہے، یہ ہدایت کی جانا چاہیے کہ وہ بھی مانع حمل طریقوں کے استعمال اور نس بندی میں نہ صرف آگے بڑھیں بلکہ اس سلسلہ میں عوام کو بھی آمادہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح پولیس تنظیم اور پی۔ اے سی کے لوگوں کو بھی بھرپور تعاون دینا چاہیے۔ لوکل باڈیز کے ملازمین کی مدد سے زردہ کی تقسیم کے انتظامات بھی کیے جانا چاہئیں۔

اس کے علاوہ انھیں اپنے ماتحت ملازمین کو بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کے لیے بڑے پیمانہ پر انتظامات کرنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔

* * *

ریاستی حکومت نے اقوام و قبائل مندرجہ فہرست، سابق جرائم پیشہ قبائل اور بے زمین کھیت مزدوروں کو قانونی امداد مہیا کرنے کی غرض سے دو لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔ یہ رقم جو ۲۷۰۰ روپیہ سے ۴۸۰۰ روپیہ کے درمیان ہے ضلع ججوں کی تحویل میں دیدی گئی ہے۔ یہ مالی امداد ان افراد کو دی جائے گی جو دوسروں کی غیر قانونی کارروائی کے خلاف انصاف حاصل کرنے کے لیے مقدمہ کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

ریاست کے تمام ضلع ہریجن و سماجی فلاح افسروں کو یہ ہدایات بھی جاری کی جاچکی ہیں کہ وہ طالب علموں کے وظائف کی بلا تاخیر ادائیگی کریں اور یہ بھی بندوبست کریں کہ انھیں اس سلسلہ میں کسی قسم کی دشواری

پیش نہ آئے۔

ریاستی محکمہ ناپ تول نے وزیراعظم کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کے تحت اتر پردیش کے دیہی علاقوں خاص طور پر دیہی بازاروں، میلوں اور بعض بھاڑ کے دیگر مقامات پر ناپ تول کے پیمانوں کے غلط استعمال کے خلاف ایک بھرپور مہم شروع کر دی ہے۔

اس سلسلے میں محکمہ ناپ تول کے ڈویژن اور ضلع کی سطح کے تمام ماتحت دفتروں کو ضروری ہدایات بھیجی جا چکی ہیں۔ پیٹرول پمپوں پر کم پیٹرول فراہم کرنے، گنا ملوں کے مالکوں کے گٹھے باندھنے کے لیے استعمال کیے جانے والے سامان کے سلسلہ میں فی کوئنٹل دو سے چار کلوگرام تک کی کٹوتی کرنے اور گنا خریداری مرکزوں پر غیر معیاری تول کے باٹوں کے استعمال سے متعلق بعض بے قاعدگیاں علم میں آئی ہیں جن کے خلاف ناپ تول کے پیمانوں سے متعلق قانون کے تحت قانونی کارروائی کی جا رہی ہے۔ گنا کمشنر سے بھی درخواست کی گئی ہے کہ وہ گنّے کے گٹھے باندھنے کے لیے استعمال ہونے والے سامان کے سلسلے میں کی جانے والی کٹوتی کے سلسلے میں مناسب توازن پیدا کرنے کے لیے ضروری کارروائی کریں۔

اسی طرح شہری علاقوں میں بھی بیوپاریوں اور سناروں کے غیر مصدقہ اور بعض مہر لگے ہوئے باٹوں کے استعمال کے خلاف گزشتہ ستمبر سے ۱۵ دسمبر تک ایک خصوصی مہم کے دوران ۲۵۱۳ معاملات پکڑے گئے۔ ۱۴۷ معاملات ۱۸۷۴۶۵ روپیہ کے جرمانے وصول کر کے نپٹائے گئے، ۶۰ معاملات میں سزا دی گئی اور عدالتوں نے ۶۰۴۴۶ روپیہ کے جرمانے کئے۔ اس جانچ کے دوران روزمرّہ کے استعمال کی اشیاء پر صحیح ٹریڈ مارک لگانے پر بھی خاص دھیان دیا گیا۔

✤ ✤ ✤

شمالی مشرقی ریلوے حکام نے سیاحتی اہمیت کے حامل ریلوے اسٹیشنوں پر برائے نام کرایہ پر سیاحتی مراکز قائم کرنے کے واسطے سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اپنی رضامندی دے دی ہے جس میں چائے وغیرہ کی فراہمی بھی شامل ہے۔ اسی طرح اہم ہوائی اڈوں اور شمالی ریلوے کے اہم ریلوے اسٹیشنوں پر بھی سیاحتی مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔

شمالی ریلوے افسران لکھیم پور کھیری میں واقع دودھوا کے جانوروں کی پناہ گاہ تک سیاحوں کے واسطے گاڑیوں کا بندوبست کرنے کے لیے بھی رضامند ہو گئے ہیں۔ یہ فیصلہ لکھنؤ ڈویژن کی سیاحتی مشاورتی کمیٹی کے ایک جلسہ میں کیا گیا جس میں ڈویژن میں سیاحت کی ترقی کے لیے اسکیموں پر غور کیا گیا۔ لکھنؤ ڈویژن کے کمشنر شری پی این چترویدی نے اس جلسہ کی صدارت کی۔

ریاستی محکمہ سیاحت مذکورہ ڈویژن میں دوسرے سیاحتی اہمیت کے حامل مقامات کا پتہ لگانے کی غرض سے ایک سروے کر رہا ہے۔ لکھنؤ کی بعض تاریخی عمارتوں کو سدھارنے اور ان کے گرد و پیش کو خوبصورت بنانے کے لیے ریاستی محکمہ سیاحت ایک معینہ مدتی پروگرام شروع کرنے کی بھی تجویز رکھتا ہے۔ اس جلسہ میں شہر میں سڑکوں پر نقل و حرکت پر پابندی عائد کرنے کی تجویزوں پر بھی غور کیا گیا۔

اسی طرح شہر میں چلنے والی ٹیکسیوں اور آٹو رکشہ میں میٹر لگانے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا۔ سیاحوں کے لیے سڑک کے کنارے مختلف قسم کی سہولتیں فراہم کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا جس میں روڈ سے کم سے کم ۱۰۰ گز کے فاصلہ پر رستورانوں کا قیام بھی شامل ہے۔ جلسے میں بتایا گیا ہے کہ انڈین آئیل کارپوریشن، مسافروں کو سہولتیں اور ضروری اشیاء فراہم کرنے کے لیے اپنے ڈیلروں کو آمادہ کرے گا۔ غیر ملکی سیاحوں کے لیے لکھنؤ کے بازاروں کو مزید دلکش بنانے کے معاملہ پر غور و خوض کرنے کے لیے لکھنؤ کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔

✤ ✤ ✤

اتر پردیش کے محکمہ باغبانی نے ریاست میں ترکاریوں کی کاشت کرنے والے کسانوں کو مطلع کیا ہے کہ ماہو، کیڑا آلو، گوبھی، شلجم اور مولی کی فصلوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ کیڑے، خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے، پودے کے سبھی نرم حصّوں سے رس چوستے ہیں جس سے پودوں کی نشوونما رک جاتی ہے اور وہ زرد اور کمزور ہو جاتے ہیں۔ یہ کیڑا آلو کی فصل میں بھی مختلف بیماریاں پھیلاتا ہے۔ اس کیڑے سے فصلوں کو بچانے کے لیے

ترکاری کی کاشت کرنے والوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ میتھائل ۔ او ۔ ڈیمیٹان ۰.۵ لیٹر، ڈائمیتھوئیٹ ۔۲ لیٹر، فاسفامیڈان ۲۵۰ ۔ ۰ لیٹر یا تھائیوڈان ۱۰ لیٹر کا چھڑکاؤ فی ہیکٹر کی شرح سے احتیاطی تدابیر کے طور پر کریں۔

٭

حکومت ہند کا محکمہ آثار قدیمہ شہر لکھنؤ کی تاریخی عمارتوں مثلاً بڑا اور چھوٹا امام باڑہ وغیرہ کی مرمت اور ان کے گرد و پیش کے علاقوں کو خوبصورت بنانے کے لیے رضامند ہو گیا ہے۔ ان عمارتوں کی ثقافتی اہمیت کے بارے میں نوٹس بورڈ تیار کیے جا رہے ہیں اور انھیں ان عمارتوں کے مشہور مقامات پر لگایا جائے گا۔ شہر کی یہ خوبصورت تاریخی عمارتیں لکھنؤ کی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں لیکن یہاں کے باغات اجڑ جانے کی وجہ سے ان کی خوبصورتی میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ مذکورہ اقدام کے نتیجہ میں یہ عمارتیں اپنی اصلی شان و شوکت پھر حاصل کر لیں گی اور لکھنؤ ملک کے سیاحتی نقشے میں اپنا نمایاں مقام حاصل کرلے گا۔

لکھنؤ میں عجائب گھر اور ریزیڈنسی کے تہہ خانوں میں روشنی کا بندوبست کرنے کی بھی ریاستی محکمۂ سیاحت کی تجویز ہے۔ محکمۂ سیاحت نے حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ سے لکھنؤ کی ان تاریخی عمارتوں کی پوسٹ کارڈ سائز کی تصویریں اور کتبے بھی مذکورہ تاریخی مقامات پر فروخت کیے جانے کی درخواست کی ہے۔ فی الحال پوسٹ کارڈ سائز کی تصویروں کا ایک سیٹ فروخت کیا جاتا ہے۔ یہ مشورہ بھی دیا گیا ہے کہ پورے سیٹ کی جگہ الگ الگ تصویروں کو بھی فروخت کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ تاکہ سیاح صرف اپنی پسند کی پوسٹ کارڈ سائز کی تصویریں خرید سکیں۔

٭ ٭ ٭

ریاستی حکومت نے زرعی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کے لیے آبپاشی کی سہولتوں کی فوری فراہمی کے پیش نظر ان علاقوں میں جہاں چک بندی ہو رہی ہے، کسانوں کو نجی ٹیوب ویلوں کی تعمیر کے لیے قرضے منظور کرنے کے ساتھ ساتھ نئے چک بھی الاٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ قرضہ کی پہلی قسط چک پانے والوں کو چک الاٹ کرتے وقت دی جائے گی۔

اس اسکیم کے تحت ٹیوب ویلوں کی تعمیر کے لیے کسانوں کی قرضے کی درخواستیں جمع کی جائیں گی اور ان پر چک بندی عملے کے صلاح و مشورہ سے کارروائی کی جائے گی۔ جیسے ہی چک بندی افسران چک کے الاٹمنٹ کی تجویز کے سلسلے میں قطعی فیصلہ کر دیں گے۔ ٹیوب ویل کی تنصیب کے لیے جائے وقوع کا انتخاب کر لیا جائے گا اور قرضہ کی درخواست متعلقہ بینک کو بھیج دی جائے گی۔ متعلقہ بینک کسانوں کو چک الاٹ ہو جانے کے بعد ان کی درخواستوں پر غور کریں گے اور اس سلسلہ میں ضروری کارروائی کریں گے۔ کسانوں کو چکوں کے قطعی الاٹمنٹ کے بعد تصدیق کی جائے گی۔

بہرحال بلاک کا تکنیکی عملہ حسب دستور پمپ سیٹ کی تنصیب کے لیے بورنگ کی تصدیق کرے گا اور ٹیوب ویل کے مکمل ہو جانے کی رپورٹ تیار کرے گا۔ اس اثنا میں عالمی بینک بغیر بورنگ کے پمپ سیٹوں کے لیے قرضے منظور کرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔

جس علاقوں میں چک بندی کا کام ہو رہا ہے وہاں گوروں وغیرہ پر ناجائز قبضوں کو ہٹا دیا جائے گا اور جہاں ضروری ہو گا نئے گوروں کی تعمیر کے لیے معاوضہ کی بنیاد پر زمین حاصل کی جائے گی۔

اتر پردیش برآمدی کارپوریشن نے ٹریڈ ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے تعاون سے کھیل کود کا سامان بنانے اور اس کو برآمد کرنے کے لیے میرٹھ میں صنعتی بستی کو ترقی دینے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس صنعتی بستی میں روایتی یا غیر روایتی سامان تیار کرنے کے لیے صنعتی واحدے قائم کرنے والوں کو زمین، تعمیر شدہ شیڈوں، مشینوں، کاروباری سرمایہ اور خرید و فروخت سے متعلق سہولتوں کی شکل میں مدد دی جائیگی۔

اس بستی میں تقریباً ۲ کروڑ روپیہ کی مجموعی سرمایہ کاری متوقع ہے جس میں بیشتر رقم مالیاتی اداروں سے حاصل کی جائے گی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ کھیل کود کا سامان تیار کرنے سے متعلق صنعت نے، جو بنیادی طور پر میرٹھ میں قائم ہے، ۱۹۷۴-۷۵ کے دوران ۱۴ء۲۳ کروڑ روپیہ کی مالیت کا کھیل کود کا سامان تیار کیا۔ جس میں سے ۱ء۳۶ روپیہ کی مالیت کا سامان برآمد کیا گیا۔

٭

نیا دور

جلد ۳۱ نمبر ۱۲

مارچ ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: روی موہن سیٹھی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

سرورق:
تصویر شمیم کرہانی

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ۔ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش اُن سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

ہماری محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے دورِ وزارت عظمیٰ کو دس سال پورے ہو گئے ہیں۔ اس عرصے میں ملک کو کن کن آزمائشوں تجربوں اور بحرانوں سے گزرنا پڑا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن ہم نے دیکھ لیا کہ شریمتی اندرا گاندھی نے ان سب طوفانوں کا جس ہمت، استقلال اور پامردی سے مقابلہ کیا نیز ملک کی آزادی اور جمہوریت کو برقرار رکھنے اور امن کو سنگین خطرات سے بچانے کے لیے جو جرات مندانہ اقدامات کیے ہیں ان کی وجہ سے وہ دنیا کے سامنے ایک تاریخ ساز شخصیت بن کر ابھر آئی ہیں۔ کسی ملک کی تاریخ میں ایک دہے کی مدت بہت ہی مختصر سمجھی جاتی ہے لیکن گزشتہ دس برسوں میں متعدد ایسے تاریخی اور انقلابی فیصلے اور اقدامات کیے گئے جو ہمارے ملک کی تاریخ کا نہ صرف جزو بن چکے ہیں بلکہ ان سے ملک کی خوش حالی اور ترقی اور اس کے سیاسی استحکام میں بھی بڑی مدد ملی ہے۔ پہلی بار وہ ۱۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو کانگرس پارلیمانی پارٹی کی لیڈر منتخب ہوئی تھیں اور ۲۴ جنوری کو انھوں نے اپنی پہلی مجلس وزرا کی تشکیل کی تھی۔ پھر ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات کے بعد کانگرس پارلیمانی پارٹی نے ان کو متفقہ طور پر اپنا لیڈر منتخب کیا۔ ۱۹۷۰ء میں انھوں نے صدر جمہوریہ ہند کو پارلیمنٹ توڑنے کا مشورہ دیا اور اس کے بعد ملک میں درمیانی مدت کے عام انتخابات ہوئے۔ اس بار تمام مخالف پارٹیوں نے برسر اقتدار پارٹی کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا لیا تھا لیکن شریمتی اندرا گاندھی نے ملک کا طوفانی دورہ کرکے اس متحدہ محاذ کو شکست فاش دی۔ اس قلیل مدت کے اہم ترین واقعات میں بنکوں کا قومیایا جانا، سوویت یونین سے دوستی اور خیر سگالی کا معاہدہ، پاکستانی حملہ کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ اور بنگلہ دیش کا قیام، پوکھارن (راجستھان) میں زمین دوز ایٹمی تجربہ، مصنوعی سیارے آریہ بھٹ کی خلا میں روانگی، کشمیر میں سیاسی استحکام کے لیے گفتگو اور مفاہمت اور ادھر حال میں ملک میں ہنگامی حالات کا نفاذ اور ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کا اعلان ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب شریمتی اندرا گاندھی نے ملک کی وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا تھا اس وقت ملک اقتصادی پریشانیوں، روز افزوں مہنگائی اور آئے دن کی تحریکوں کا شکار تھا۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ اندرا گاندھی نے ان سب آزمائشوں اور طوفانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور جو بھی قدم اٹھایا اس کے نتائج ملک اور قوم کے مفاد کے لیے خاطر خواہ برآمد ہوئے۔ انھوں نے عوام سے جو کچھ کہا وہ کر کے دکھا دیا اور غیر ملکی ریشہ دوانیوں کو کسی طرح سے بھی کامیاب نہیں ہونے دیا۔ گزشتہ سال انتخابی عذر داری میں الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد مخالف جماعتوں نے غیر ملکی طاقتوں کی شہ پر ملک میں ایک طوفان مچا رکھا تھا۔ اگر شریمتی اندرا گاندھی کے مشورے سے ملک میں صدر جمہوریہ نے ایمرجنسی کا اعلان نہ کر دیا ہوتا تو ملک کی آزادی ہی خطرے میں پڑ گئی ہوتی۔ ملک کے عوام نے اس ایمرجنسی کا نہ صرف خیر مقدم کیا بلکہ اس کو اپنے لیے ایک نعمت قرار دیا۔ اس ایمرجنسی کے سبب ملک میں ڈسپلن کا دور دورہ شروع ہو گیا ہے۔ فرقہ پرستی، رشوت خوری، چور بازاری اور اسمگلنگ جیسی لعنتوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ نظم و نسق چاق و بند ہو گیا ہے۔ بیس نکاتی معاشی پروگرام پر عمل درآمد کیے جانے کے سبب غریب اور کمزور طبقوں کی معاشی حالت روز بروز بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ ہڑتالوں مظاہروں اور تالہ بندیوں کا سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ دس سال کے اس قلیل عرصے میں شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں ملک ترقی کے راستے پر تیزی سے گامزن ہو گیا ہے اور ان کی قیادت میں سماجی انقلاب تیزی سے آ رہا ہے۔

آہ جوش ملسیانی

پنجاب کے مردم خیز خطے نے اردو کے ایسے بلند پایہ شاعر اور ادیب پیدا کیے ہیں جو شاعری اور ادب کے افق پر آفتاب اور ماہتاب بن کر چمکے ہیں۔ انھیں میں جوش ملسیانی کی ایک ہستی تھی۔ وہ بھی ۲۷ جنوری کو اپنے آبائی وطن نکودر (ضلع جالندھر) میں رحلت فرما گئے۔ حضرت جوش موجودہ دور میں اردو کے بزرگ ترین شاعر تھے۔ وہ یکم فروری ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح انتقال کے وقت ان کی عمر ۹۲ سال کی تھی۔ وہ داغ دہلوی کے شاگرد تھے اور اپنے استاد کی سحر نگاری، شوخ بیانی، فصاحت، بلاغت اور معاملہ بندی کے بڑے مداح تھے۔ اسی لیے ان کی غزلوں میں اپنے استاد محترم داغ دہلوی کی چھاپ نظر آتی ہے۔ جوش کو بچپن سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا۔ ذوق سلیم اور موزونی طبع کی خداداد صلاحیت کے باعث انھوں نے بہت جلد شہرت دوام حاصل کر لی۔ فارسی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈسٹرکٹ بورڈ جالندھر کے شعبۂ تعلیم سے منسلک ہو گئے تھے۔ اگرچہ انھوں نے نظمیں اور رباعیات بھی کہی ہیں لیکن ان کا اصل میدان غزل تھا۔ غزل گوئی میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ان کا کلام فصاحت، رنگینی اور سادگی کا آئینہ دار ہے ادارہ نیا دور مرحوم کے پسماندگان خاص طور سے ان کے صاحبزادے جناب عرش ملسیانی سے جو خود بھی اردو کے ایک ممتاز شاعر اور ادیب ہیں دلی تعزیت پیش کرتا ہے۔

میلا رام وفا کو صدمۂ جانکاہ

اردو کے مشہور اور بزرگ شاعر پنڈت میلا رام وفا کے اکلوتے صاحبزادے شری سورج پرکاش بھاردواج کا ایک حادثہ میں زخمی ہونے کے بعد گزشتہ ۷ فروری کو انتقال ہو گیا۔ پنڈت میلا رام وفا کو اس ضعیف العمری میں اولاد کا جو غم اٹھانا پڑا ہے اس کا تصور کرکے دل کانپ جاتا ہے۔ شری بھاردواج انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ سے عرصے سے منسلک تھے۔ طبیعتاً وہ بہت ہی نیک ملنسار اور خوش اخلاق تھے۔ خدا ان کی روح کو سکون اور ان کے پسماندگان خاص طور سے پنڈت میلا رام وفا کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ادارہ نیا دور پنڈت میلا رام کے اس غم میں ان کا برابر کا شریک ہے۔

——— ایڈیٹر

غزل

نشورؔ واحدی

مرے غم کی کسک کچھ قلبِ شب میں پائی جاتی ہے
غزل میری ستاروں کے چمن میں گائی جاتی ہے

ہے تہذیبوں کا کچھ ایسا تصادم عصرِ حاضر میں
کہ جیسے روشنی سے روشنی ٹکرائی جاتی ہے

اِدھر سے التجائیں سیکڑوں تک جا پہونچتی ہیں
اُدھر سے اک ادھوری گفتگو فرمائی جاتی ہے

نہ عزمِ کوشش پیہم نہ ذوقِ شعلہ و شبنم
یہ جینا کیا ہے اک جینے کی عادت پائی جاتی ہے

سرک کر آ گئیں زلفیں جو اُن مخمور آنکھوں تک
میں یہ سمجھا کہ میخانے پہ بدلی چھائی جاتی ہے

نشورؔ اک رات بھی بیدارِ غم رہ کر کوئی دیکھے
سحر کے فیض سے ٹوٹی ہوئی نیند آئی جاتی ہے

گذشتہ لکھنؤ کی وضعداریاں

مرزا جعفر حسین

قدیم لکھنؤ کے باشندوں میں حسن اخلاق، تہذیب و شائستگی، نفاست و نزاکت اور فنون لطیفہ کے ذوق و شوق کے ساتھ راہ و رسم میں ایک چلن وضعداری کا بھی تھا جو پرانے سماج کا ضروری قابل قدر اور اہم جز تھا۔ وضعداریاں نباہنے کے لیے حسن اخلاق، خوش گفتاری، بلند حوصلگی، پابندیِ اوقات اور مہر و وفا کے محاسن کی ضرورت ہوتی تھی اسی لیے وضعداری بلندیِ کردار کی فضیلت سمجھی جاتی تھی غریب یا رئیس یا متوسط طبقہ کوئی فرد جس قدر زیادہ وضعدار ہوتا تھا اتنا ہی اس کا احترام زیادہ ہوتا تھا اور محافل و مجالس میں اس کی اتنی ہی زیادہ قدر کی جاتی تھی۔ اس طرح وضعداری لکھنؤ کے مخصوص کلچر میں اتنی رچ بس گئی تھی کہ اس وصف کے حامل ہر طبقہ، ہر درجہ اور ہر صنف میں ملتے تھے چھوٹی چھوٹی وضعداریوں میں سارے شہری اپنی آپ مثال تھے لیکن بڑے اور اونچے طبقوں میں وضعدار لوگ مثالاً پیش کیے جاتے اور ان کے چرچے ہوتے تھے۔ اس کے برعکس بدوضع اور [illegible] وہ رئیس ہوں یا غریب مطعون تھے اور ان کی صحبت سے بھی لوگ احتراز کرتے تھے۔ قبل اس کے کہ اس موضوع پر کسی قدر تفصیل سے حالات پیش کیے جائیں وضعداری کے مفہوم و مطلب کی صراحت کر دینا بھی ضروری ہے۔

"وضع" کے معنی "ترتیب" ہیں اس لیے وضعدار اس شخص کو کہنا چاہیے جو اپنی زندگی کے تمام کاروبار، رہن سہن، میل ملت میں ترتیب پیدا کرکے ہم [illegible] توازن ایام گذاری کرے۔ یہ ترتیب فقر و فاقہ، اور تنگدستی و عسرت میں بھی اسی طرح ممکن ہے جس طرح دولت و ثروت اور امارت و فراغی میں لیکن انسان اپنی خواہشات اور بوالہوسی میں مبتلا ہو کر "ترتیب" کا رجحان کھو بیٹھتا ہے اور اگر صاحبان حیثیت اس ترتیب کے اپنے ذاتی امور اور ذاتی ماحول میں خوگر بھی ہو جاتے ہیں تو دوسروں سے تعلقات میں اس ترتیب کا لحاظ بہت کم کیا جاتا ہے۔ یہ لحاظ اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ انسان خود غرضیوں میں مبتلا ہو کر دوسروں کے حالات پر ہمدردانہ توجہ نہیں کرتے اور ان کے کردار سے انسان نوازی کا جوہر مفقود ہو جاتا ہے۔ اس عہد کے بعد یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے پرانے شہری سب کے سب کردار کے محاسن کی تمام بلندیوں پر فائز تھے یا یہ کہ ہر شخص انسانیت اور انسان نوازی کا مجسمہ تھا، لیکن اتنا ضرور تھا کہ ان کا ظاہری برتاؤ، ان کا ظاہری رکھ رکھاؤ اور ان کی ظاہری میل ملت کی تعمیر کچھ اس طرز پر ہو گئی تھی کہ ان میں ترتیب کی خوبی از خود نمایاں ہو جاتی تھی اور اس خوبی کی قدر کرتے ہوئے انھوں نے بہتر سے بہتر وضعدار ہونے کی کوشش کی، یہاں تک کہ پورا سماج اس صفت سے متصف ہو گیا۔ چنانچہ ہم نے یہ دیکھا کہ اس شہر کی پست آبادی یعنی سودے والے، بلند ترین طبقہ یعنی رؤسا و عمائدین اور ان کے متعلقین و متوسلین جن میں طوائفیں بھی شامل تھیں اور شرفاء و عوام سب ہی وضعدار تھے اور وضعداری کی قدر کرتے تھے۔

یوں تو وضعداری کے لیے خوش اخلاقی، خوش گفتاری، خوش پوشاکی، پابندیِ اوقات اور مہر و وفا کے اوصاف سے متصف ہونے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہمارا تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان

خوبیوں میں کسی ایک خوبی کا بھی بدرجۂ اتم مالک ہو جانا وضعداری کی خصلت کو بیدار کر دیتا ہے۔ لکھنؤ کا سارا پرانا ماحول شعر و ادب میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے کا مزاج شعریت میں سرشار تھا یا سرشار ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ ہمارے حافظے میں ایسی مثالیں اب تک تازہ ہیں جب یہاں کے ترکاری اور پھل بیچنے والے ککڑیوں کو لیلا کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیوں سے تشبیہہ دے کر فروخت کرتے تھے۔ کلچے اور نہاری فروش نہاری اور کلچوں کو من و سلویٰ قرار دے کر خریداروں کو اپنی طرف راغب کرتے تھے۔ دلّی کا مشہور بورے کے لڈو والا یہ کہہ کر کہ "جو کھائے وہ پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ پچھتائے" راہ گیروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا تھا۔ لیکن لکھنؤ والوں کی لغت میں پچھتانے کا لفظ ہی نہ تھا۔ وہ اپنے حسن کلام اور شیریں زبانی سے خریداروں کو ترغیب دیتے اور مطلب براری کر لیتے تھے۔ اس کی غالباً یہ وجہ تھی کہ ان کی دکان داری میں دیانت داری شرط تھی لہٰذا اپنے مال پر اعتماد تھا اور خریدار کو مطمئن کرنے کا بھی یقین تھا۔ اسی ترتیب سوداگری میں انھوں نے اتنی وسعت پیدا کر لی تھی کہ وہ اپنے خریداروں کا پاس و لحاظ کرتے تھے اور اگر خریدار ان کے قدردان تھے تو وہ بھی ان کی اتنی قدر کرتے تھے کہ اپنا مال غیر کے ہاتھ خواہ زیادہ قیمت ہی کیوں نہ مل رہی ہو ہرگز فروخت نہیں کرتے تھے۔ وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے گھر آنے ہوئے خریدار کو واپس کر کے اپنا مال اپنے خریدار کے گھر جا کر دے آتے اور قیمت کے کم و بیش ہونے کا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے۔ سامان کی فراہمی میں وقت کی پابندی بھی ملحوظ رکھی جاتی تھی تاکہ ان کے خریدار کو زحمت نہ ہو۔ سوداگری کا یہی طور طریقہ وضعداری کہلاتا تھا جس میں امرا و غربا سب برابر کے شریک اور بقید مقدرت باشعور رہتے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پرانے رؤسا و عمائدین لکھنؤ کے کلچر کے معمار تھے غذائیں ہوں یا ملبوس، آداب محفل ہوں یا لحاظ خلوت، عیش و عشرت کے سامان ہوں یا غم و الم کے دوران میں گریہ و سینہ زنی، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں ان میں سے کوئی رئیس نئی چیلن ایجاد کرتا جو پہلے خود اسی کے حلقۂ متعلقین اور زمرۂ متوسلین میں رائج ہوتی اور آہستہ آہستہ سارے شہر پر چھا جاتی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ہر رئیس اور ہر معتدر ہستی کا اپنا ایک مخصوص شعار بھی تھا جو اس کی وضعداری کہلاتا تھا۔ مثلاً تحسین گنج کے محمد نواب صاحب گالوں پر گل مچھے رکھتے تھے اور سر پر انتہائی چھوٹی دیوار کی ٹوپی پہنتے تھے جو اپنی جگہ پر بمشکل قرار پاتی تھی۔ وہ اس ٹوپی کو پہننے کے لیے بہت سی تیلیاں جو آلپین کی ایسی تپلی ہوتی تھیں استعمال کرتے تھے اور یہی دونوں ظاہری اطوار اُن کی وضعداری تھی۔ اسی طرح بعض عمائدین نے جن میں شیش محل کے نواب رضا حسین خاں بھی شامل تھے، کوٹ پر صدری پہننے کا چلن اختیار کیا تھا اور یہی ان کی وضعداری تھی۔ اس زمانے کا کوٹ آج کی اچکن کی طرح ہوتا تھا اس کے دامن چونکہ کم چوڑے ہوتے تھے اور چکن کی طرح جو رائج الوقت لباس تھا، اس کی آستینیں تنگ نہیں ہوتی تھیں اس لیے اس ملبوس کو کوٹ کہتے تھے حالانکہ موجودہ کوٹ کی کوئی قدر اس میں مشترک نہ تھی۔

لکھنؤ کے پرانے رؤسا بے حد لذیذ، ثقیل اور مرغن غذائیں کھاتے تھے۔ اُس زمانے کے معمولی کھانے بھی اس قابل تھے کہ اُن کی تفصیلات تاریخ کے اوراق میں درج کر دی جائیں چوٹی کے رئیسوں کو جو غذائیں مرغوب تھیں اور برابر ان کے دسترخوانوں پر موجود رہتی تھیں ان میں بادام کا قورمہ، تال مکھانے کا سالن، چقوشتہ پلاؤ، اناناس کا مزعفر، متنجن اور شش رنگہ وغیرہ قسم کے لذات قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان تمام مخصوص کھانوں کے علاوہ ہر رئیس کے دسترخوان پر اس کی پسندیدہ ترین دو چار چیزیں ایسی ہوتی تھیں جن کی شہرت اُسی رئیس کے نام سے وابستہ ہوتی تھی اور اسی رئیس کے دسترخوان کی چیز کہلاتی تھی۔ مثلاً میرے جد مرحوم کی دسترخوان کی سلطانی دال، بادشاہ پسند دال اور کوفتہ معلاے عجمی مشہور تھے۔ یہ تذکرہ اپنے اجداد کی ستائش میں نہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ دال کی ایسی معمولی چیز کو بھی ایجاد و اختراع نے سربلندی عطا کر دی تھی۔ اشیاء کے نام رکھنے میں بھی فصاحت کا اتنا لحاظ تھا جیسا تذکرہ بالا کباب کے نام سے ظاہر

ہے۔ بہر حال جب کسی مخصوص عزیز، دوست یا معتدر مہمان کی دعوت ہوتی تھی تو ہر رئیس کے دستر خوان پر اس کے یہاں کی تمام مخصوص چیزیں ضرور فراہم کر دی جاتی تھیں۔ اسی کا نام وضعداری تھا۔

لکھنؤ کے رؤسا، وعمائدین کی تمام معاشرت یوں تو ایک خاص ترتیب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی لیکن کبھی کبھی کسی افتاد یا غیر معمولی واقعہ کے سبب سے وہ ترتیب بگڑ جاتی تو اس بگڑی ہوئی عادت کو وہ اس طرح اپنا لیتے تھے کہ وہی ان کی مخصوص وضعداری قرار پاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ نواب حیدر حسین خاں مرحوم جن کا عظیم الشان پھاٹک اب تک چوک میں موجود ہے شام کے وقت کپڑے پہن کر محل سے برآمد ہوئے اور اپنی گھوڑا گاڑی پر روانہ ہونے والے ہی تھے کہ محلہ کا ایک شناسا ان کو سلام و آداب بجالا کر مسکرا بھی دیا۔ نواب مرحوم نے جواب سلام دے کر اپنی وضع قطع کا جائزہ لیا تو سوء اتفاق کہ ان کے انگرکھے کا تکمہ کھلا ہوا تھا۔ اُن کو بڑی خفت محسوس ہوئی۔ مگر اس خفت کا ازالہ انھوں نے اس طرح کیا کہ پھر کبھی زندگی بھر انگرکھے کا تکمہ نہیں لگایا اور یہی کھلی ہوئی گردن اور بلا تکمہ لگا ہوا انگرکھا ان کی وضعداری قرار پا گئی۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کلچر کی تعمیر میں اتفاقات کو بھی دخل تھا اور وہی اتفاقات کبھی کبھی بے ترتیبی کو عمداً قبول کرنے کا ذریعہ بن جاتے تھے۔ اور پھر وہی بے ترتیبی ترتیب قرار پا کر وضعداری کہلاتی تھی۔

ریاست و امارت کے ساتھ پرانے زمانے میں وضعداری توام تھی۔ دوستوں سے ملنے، عزیزوں سے ملاقات کرنے، نئی راہ و رسم پیدا کرنے، پرانے برتاؤ نباہنے، ملازموں سے رفق و مدارا، غربا و مساکین کے ساتھ حسن سلوک، غیروں اور اجنبی لوگوں سے حسن واخلاق ان تمام خصائل کے یہ لوگ عادی تھے اور انھیں خصائل میں امتیازی شان اُن کی مخصوص وضعداری تھی جس کو نباہنے میں وہ وقت، مقدار اور تمام تفصیلات پر نظر دقیقہ رس نگاہ رکھتے تھے۔ نواب جعفر علی خاں مرحوم رئیس شیش محل کی بارگاہ میں جس روز پہلی بار مجھے شرف حضوری حاصل ہوا تھا اور میں نے شاہانہ رسم و رواج کے مطابق ان کی خدمت میں نذر پیش کی تھی اور انھوں نے اس نذر پر ہاتھ رکھ کر اسے قبول کیا اور مجھے گلے لگایا تھا وہ وقت مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس لیے کہ اُس محبت و شفقت میں جو خلوص تھا اس نے میرے دل کی گہرائیوں میں اتر کر مجھے متاثر کر دیا تھا۔ اسی روز شام کو موصوف نے مختلف پر تکلف غذاؤں کے پانچ خوان مجھے بھجوائے تھے جو ہمیشہ اسی روز اور اسی وقت اُن کی حیات تک برابر آتے رہے۔ یہ سلوک اُن کی وضعداری تھی اور میری بدذوقی جو جدیدیت کی پیداوار تھی اس حد تک مجھ پر حاوی رہتی تھی کہ غالباً دو برس کے بعد میں ہمیشہ اُس دن کو اس وقت یاد کرتا تھا جب وہ خوان آجاتے تھے۔ نواب صاحب مرحوم کے یہاں جملہ کاروبار اور انتظام قمری کلنڈر کے تحت ہوتا تھا اس لیے مجھے اس گراں قدر نوازش کی یاد صرف اُس کے موصول ہو جانے کے بعد آیا کرتی تھی۔

رؤسا و عمائدین کی ثقافت سے اور سب کے مقابلہ میں اُن کی طوائفیں متاثر ہوتی تھیں۔ ہمارے رؤسا جس طرح وضعداری کا مجسمہ تھے اسی طرح ان عورتوں کی جماعت میں بھی زیادہ تر ہستیاں وضعداری کا پتلا تھیں۔ ان طوائفوں کو ڈیرہ دار کہتے تھے اور قریب قریب ہر طوائف کسی نہ کسی معتدر رئیس کے دامن سے متمسک رہتی تھی اور اس تعلق کو جنسی خواہشات سے بہت کم لگاؤ ہوتا تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ بعض رئیسوں سے ایسی طوائفوں کا تیس چالیس برس تک دوستانہ اور بے تکلفانہ ربط و ضبط ہونے کے باوجود کوئی جنسی تعلق نہیں ہوا۔ یہ طوائفیں اخلاق اور متانت و شائستگی، بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی میں کمال رکھتی تھیں اور شعر و ادب سے انھیں زبردست شغف رہتا تھا۔ چودھرائن جو ان تمام طوائفوں کی سربراہ تھیں ان کمالات میں سب سے بہتر تھیں۔ ان کی صاحب زادی زشک منیر کو مرزا غالب کا پورا اردو دیوان حفظ تھا اور وہ مرزا کے اشعار دوران گفتگو میں برمحل پڑھ دیا کرتی تھیں۔

ڈیرہ دار طوائفوں کا لباس بیسویں صدی کی پہلی دہائی تک معزز گھرانوں کی بیگمات کا ایسا ہوتا تھا یعنی بڑے لمبے چوڑے گھیر کا پائجامہ اور کرتی مشلوکہ اور سر پر دو پٹہ اوڑھتی تھیں۔ ڈوپٹہ اس طرح اوڑھتی تھیں کہ سر اور گردن پوری طرح مستور رہتی جسم کا کوئی حصہ چہرہ اور گٹوں تک ہاتھ پاؤں کے علاوہ کبھی کھلا نہیں رہتا تھا۔ اپنے گھروں میں بھی اسی طرح نشست کرتی تھیں۔ کوٹھوں کے چھجوں پر کبھی نہیں بیٹھتی تھیں اور نہ پا پیادہ سڑکوں پر نکلتی تھیں۔ گھر سے نکل کر کہیں جانا ہوا تو یا تو اپنے گھر کا جو بہلا ہوتا تھا یا کرایہ کی شکرم گاڑی ہوتی جو اُس زمانے میں رائج تھی۔ بعض اونچی طوائفوں کو رئیسوں کے محل میں جانے کی اجازت تھی ایسے مواقع پر اُن کا لباس زرق برق نہیں ہوتا تھا بلکہ سر سے پاؤں تک سادگی کے زیور میں آراستہ ہوکر جاتی تھیں۔ رفتار، گفتار، طور طریقوں میں بھرپور سادگی رہتی تھی۔ البتہ اپنے صاحب کے حضور جن کی ملازم ہوتی تھیں یا مجرا کرنے کے لیے پوری آرائش و زیبائش سے جاتی تھیں۔ لیکن رئیس کی خلوت گاہ ہو یا رقص و نغمہ کی محفل، ہر جگہ تہذیب و اخلاق ملحوظ رہتا تھا۔ اس زمانے میں حاضرین بزم جملے کستے تھے تو ضلع جگت کی صنعت میں فی الفور جواب دیا جاتا تھا۔ طنز و مزاح میں بھی آداب کا خیال رہتا۔ رئیس کی بزم میں بھی جس سے گفتگو ہوتی حفظ مراتب کا خیال رکھا جاتا۔ رئیسوں کے بچے آداب سیکھنے کے لیے ان طوائفوں کے گھر بھیجے جاتے تھے۔ شادیوں اور تقریبات کے مواقع پر بھی وہی رکھ رکھاؤ رکھتی تھیں جو شرفار کا شعار تھا۔ ان طوائفوں کے تمام رسم و راہ اور تعلقات ہی وضعداری کہے اور سمجھے جاتے تھے۔

شرفار کی وضعداریاں مشہور زمانہ تھیں۔ ان کے طور طریقے یہ تھے کہ سر برہنہ یا کپڑوں کے بٹن کھول کر کبھی باہر نہیں نکلتے تھے۔ سر ڈھکا ہونا اور سب بٹن بند یا تکمے لگے رہنا بیحد ضروری تھا۔ چکن کے اندرونی بند بھی بندھے رہتے تھے تاکہ پوشاک ڈھیلی نظر نہ آئے۔ رؤسا اپنے گھر کے درباروں میں سرتاپا ملبوس ہوکر برآمد ہوتے تھے۔ اسی طرح شرفار بھی اپنی ڈیوڑھی میں کسی سے ملاقات کرنے باہر نکلتے تو سروں پر ٹوپی ضرور ہوتی تھی۔ عموماً انتہائی صاف و شفاف کپڑے پہن کر سڑکوں پر نکلتے تاکہ سفید پوش ہونے کی فضیلت پر حرف نہ آئے۔ سر جھکائے آہستہ آہستہ راستہ چلتے۔ راہ میں کسی سے بات کرنا یا کوئی چیز خرید کر منہ میں رکھ لینا ناقابل عفو گناہ تھا۔ رئیسوں کی بارگاہ میں زور سے بات کرنا یا قہقہہ لگا کے ہنسنا اہم ترین عیب بلکہ گناہ تھا۔ مشاعروں میں شعراء سر شام سے صبح تک ایک ہی پہلو سے بیٹھتے تھے۔ شرفار حاضرین بھی قریب قریب یہی آداب ملحوظ رکھتے تھے۔ نجی صحبتوں میں ادب و تہذیب کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ دوستوں اور عزیزوں سے خلوص تھا اور جس سے جتنے درجہ کے تعلقات تھے وہ بدستور زندگی بھر ہر حال میں نباہے جاتے تھے۔ فقر و فاقہ میں ایام گزاری ہوتی تو وہ اپنا حال زار زبانی نہیں بلکہ تحریراً اپنے آقا کہ جس کے ملازم ہوتے اُس کی خدمت میں پیش کردیتے "تھوڑا کھانا بناؤ سے رہنا" تکیہ کلام تھا اور یہی تعلیم اولاد کو دیتے تھے۔ خدا ترسی مسلک تھا اور انسان دوستی شعار تھا۔ تنگ نظری اور عصبیت سے ذہن پاک صاف رہتا تھا اور اپنے اس طور طریقے کو وضعداری کی طرح نباہتے تھے۔ وضعداری کے معنی ہی یہ تھے کہ جو ترتیب دے لیا اسی پر عمل پیرا رہنا چاہیے۔ اور اس وضعداری میں دوستانہ تعلقات کو بہت اہمیت تھی

خوش حال اور فارغ البال حضرات جن کا تعلق براہ راست شاہی گھرانوں سے نہیں تھا یا وہ گراں قدر ہستیاں جو دور جدید کے ضروریات سے باخبر اور حالات حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگئے تھے وہ بھی ان وضعداریوں کے پابند تھے اور انھیں طور طریقوں کے دلدادہ تھے۔ یہ لوگ قریب قریب اپنے آخر دم تک وضعداریاں نباہ لے گئے۔ شہر کے ممتاز وکیل شیخ علی عباس مرحوم بڑے آن بان اور رئیسانہ شان و شوکت سے زندگی گزار گئے۔ اُن سے ہمارے خاندانی تعلقات تھے۔ میری خوش دامن صاحبہ کو جو میری چچی بھی تھیں ہر سال مٹر پلاؤ کی ایک بہت بڑی ڈش بھیجا کرتے تھے۔ یہ پلاؤ اُن کے دسترخوان کا بہت مشہور تھا۔ مجھے اچھی

(باقی صفحہ پر)

غزل

نذیر بنارسی

گل بدن گل پیرہن غنچہ دہن یاد آگیا
جس چمن میں بھی گئے اپنا چمن یاد آگیا

دھوپ کھائی گیسوے سایہ فگن یاد آگیا
جب ہوئی تکلیف غربت میں وطن یاد آگیا

سامنے سے کوئی گزرا آج اس انداز سے
زندگی کو اپنا کھویا بانکپن یاد آگیا

گر گئی میری نگاہوں سے بہارِ رنگ رنگ
ایک ایسا حسنِ سادہ پیرہن یاد آگیا

اٹھ گیا اس دشت سے بھی آب و دانہ ساتھیو
دیکھ کر چشمِ غزال اپنا ختن یاد آگیا

شہر میں رہ کر بھی دیوانہ سنبھل جاتا مگر
شہریوں نے وہ ستم ڈھائے کہ بن یاد آگیا

کل تلک تو دوسرے سے ہو رہا تھا عہدِ نو
آج کیسے تم کو پیمانِ کہن یاد آگیا

آئینے میں اپنے بالوں کی سفیدی دیکھ کر
یاد کرتا تھا جوانی کو کفن یاد آگیا

ایک پردیسی سے تم نے آج کرلی دوستی
کیا کروگے کل اگر اس کو وطن یاد آگیا

کیا کہیں دستار اور زنار کے رشتے کی بات
شیخ سے مل کر جو پلٹے برہمن یاد آگیا

چوکڑی بھرتے نہیں دیکھا کئی دن سے نذیر
بھیڑیوں کو کیا کوئی زخمی ہرن یاد آگیا

غزلیں

رضا نقوی واہی

جب سے تیری یاد میرے دل سے ہم آغوش ہے
آرزوؤں کا یہ صحرا وادیٔ گل پوش ہے

تیری چشمِ ملتفت میخانہ در آغوش ہے
رس ترے ہونٹوں کا اک موسیقیٔ خاموش ہے

دل کے ٹوٹے ساز پر رکھ دی ہیں کس نے انگلیاں
زندگی خود محوِ حیرت ہے سراپا گوش ہے

پھر تصوّر میں کوئی افسوں طراز آنے لگا
پھر دلِ دیوانہ شاید امتحانِ ہوش ہے

دے کے رندوں کو خود اپنی پُرخمار آنکھوں کی مے
"خندہ زن ساقی ہے" ساری انجمن بے ہوش ہے

موسمِ گل کے جلو میں ہے خزاں کا کارواں
قافلہ فصلِ خزاں کا گلستاں بردوش ہے

درد سے بے تاب ہے نامحرمِ رازِ دروں
جو اداؤں سے تری واقف ہے وہ خاموش ہے

تیرے ہر ہر شعر پر اٹھتی ہے محفل کی نگاہ
جانِ محفل کی نظر لیکن رضاؔ خاموش ہے

بشیر فاروقی

خون کو رنگِ حنا زخم کو گلزار کہا
دل سے بے بس ہیں کہ قاتل کو بھی دلدار کہا

اب اسی آنکھ میں آنسو ہیں ہماری خاطر
جس نے ہم اہلِ محبت کو اداکار کہا

برق چمکی تو اسے تیرا تبسم جانا
شاخِ گل جھومی تو اس کو تری رفتار کہا

پارسا وہ ہیں جو انساں کا لہو پیتے ہیں
آگ پی ہم نے تو سب نے ہمیں میخوار کہا

آپ تو ہم سے زیادہ ہی پریشاں نکلے
ہم نے حالِ غمِ دل آپ سے بیکار کہا

صاف دل آپ ہیں لیکن یہ زمانہ تو نہیں
سب سے ہنس کر نہ ملا کیجیے سو بار کہا

ایک مرکز پہ کبھی آپ ٹھہرتے ہی نہیں
آج ہم کو تو کل اوروں کو وفادار کہا

یہ مری بات ہے میں کس سے ملا کیسے نبھی
یہ مرا ظرف ہے پتھر کو بھی شہکار کہا"

مرزا دبیر کے مجموعۂ کلام دفترِ ماتم کی بیس جلدیں

—— کاظم علی خاں ——

اردو مرثیے کی ارتقا میں مرزا سلامت علی دبیر (ولادت بہ مقام محلہ بلی ماران دہلی ۱۱ر جمادی الاول ۱۲۱۸ھ مطابق ۲۹ر اگست ۱۸۰۳ء۔ وفات بہ مقام نخاس لکھنؤ ۲۹ر محرم ۱۲۹۲ھ مطابق مارچ ۱۸۷۵ء)[۱] کی گراں قدر خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ اردو مرثیے کی کوئی بھی تاریخ ذکرِ دبیر کے بغیر نامکمل رہے گی۔ وہ اردو مرثیے کی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں۔ دبیر سے قبل اور بعد مرثیہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد نے مرثیے کے میدان میں قابلِ قدر خدمات سر انجام دی ہیں مگر اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اردو کے کسی بھی مرثیہ گو کے مرثیوں کی مطبوعہ جلدیں مراثی دبیر کی مطبوعہ جلدوں سے تعداد میں زیادہ نہیں۔ راقم السطور کو تلاش کے باوجود کوئی ایسا مرثیہ نگار نہیں مل سکا جس کے مطبوعہ مراثی کی جلدیں اگر مراثی دبیر کی مطبوعہ جلدوں سے تعداد میں زیادہ نہیں تو دبیر کے برابر ہی ہوں۔ فراق گورکھپوری نے غلط نہیں کہا ہے کہ "دبیر کا ذخیرۂ کلام اتنا بڑا ہے کہ عام پڑھنے والے اس بحرِ ذخار کی پیراکی نہیں کر سکتے۔"[۲] دفترِ ماتم کے نام سے دبیر کا کلام ۲۰ جلدوں میں شائع ہوا تھا لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ۲۰ جلدیں ان کے تمام و کمال کلام کو محیط ہیں۔ دفترِ ماتم کے علاوہ بھی متعدد جلدوں میں دبیر کا کلام شائع ہو چکا ہے۔ اس مختصر مضمون میں کلامِ دبیر کی تمام مطبوعہ جلدوں کا ذکر کرنا مقصود نہیں۔ سرِدست محض دفترِ ماتم کے بارے میں بعض اہم امور کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

دفترِ ماتم کی جلدیں اب اس حد تک کمیاب ہو چکی ہیں کہ نہ صرف عام لوگوں بلکہ محققین کی دسترس سے بھی باہر نظر آتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اپنے ڈی فل کے تحقیقی مقالے کے آخر میں ضمیمہ (۱) کے تحت چند سطروں میں دفترِ ماتم کی پندرھویں جلد کا ذکر تو ضرور کیا ہے مگر حیاتِ دبیر کے حوالے کے بغیر نہیں۔ ڈاکٹر عقیل تحریر فرماتے ہیں:

"دبیر کی مثنویاں۔ (۱) مثنوی احسن القصص۔ یہ مثنوی دفترِ ماتم کی پندرھویں جلد میں شامل ہے۔ افضل حسین ثابت نے حیاتِ دبیر میں اس کا تذکرہ کیا ہے مثنوی بحرِ متقارب میں ہے۔ (۲) معراج نامہ حیاتِ دبیر میں اس مثنوی کا بھی حوالہ ملتا ہے۔ یہ مثنوی بھی بحرِ متقارب

---

[۱] مرزا دبیر کی ولادت و وفات کے لیے مندرجہ ذیل کتب ملاحظہ ہوں: (الف) حیاتِ دبیر جلد ۱: سید افضل حسین ثابت لکھنوی، سیوک اسٹیم پریس لاہور۔ ۱۹۱۳ء۔ ص ص ۲۰، ۱۲۹ (ب) دبستانِ دبیر۔ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی) ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ مئی ۱۹۶۶ء۔ ص ص ۱۳۸، ۱۴۳۔ (ج) اردو مرثیے کا ارتقا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں۔ کتاب نگر، لکھنؤ۔ ۱۹۶۸ء۔ ص ۳۷۷۔ [۲] بہ حوالۂ کلامِ دبیر۔ شائع کردہ ادارہ یادگارِ دبیر (رجسٹرڈ) لکھنؤ۔ اگست ۱۹۶۵ء۔ ص ۳۶۔

میں ہے: [1]

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنے ڈی۔ لٹ کے ضخیم تحقیقی مقالے میں دبیر کی مثنویوں پر روشنی ڈالتے ہوئے دفتر ماتم کی پندرہویں جلد کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"بہت کم شائقین ادب کو یہ بات معلوم ہوگی کہ مشہور مرثیہ گو مرزا دبیر نے بھی دو مثنویاں (فٹ نوٹ (۱) = احسن القصص میں نے پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں دیکھی۔ معراج نامہ کے بارے میں تمام معلومات موصوف نے فراہم کیں) لکھی ہیں جو شائع بھی ہوئیں۔ دونوں مراثی دبیر یعنی دفتر ماتم کی پندرہویں جلد میں شامل ہیں۔ حیات دبیر حصہ اول ص ۲۷۷ پر بھی ان کا ذکر ہے۔" [2]

دفتر ماتم کے سلسلے میں متذکرہ بالا بیانات سے یہ خود واضح ہوتا ہے کہ اس کی جلدیں نایاب ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک نے اپنے پی ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے میں اس کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ "موجودہ زمانے میں یہ جلدیں نایاب ہیں۔" [3]

دفتر ماتم کی جلدوں کی نایابی نے ادھر کچھ عرصہ سے ایک دل چسپ صورت حال پیدا کر رکھی ہے یعنی مرزا دبیر کا مطبوعہ کلام "غیر مطبوعہ" کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ شائع کیا جانے لگا ہے۔ اس سلسلے میں چند دل چسپ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کی نگرانی میں پندرہ روزہ کاروان حیات بمبئی کا ایک خصوصی شمارہ "شہید اعظم نمبر" شائع ہوا ہے اس خصوصی نمبر میں مرزا دبیر کے اس مرثیے کے چند بند شائع کیے گئے ہیں جس کا مطلع ہے "جب رن میں یا ذوالفقار علم کی حسینؑ نے" اس مرثیے کے بارے میں ادارہ کاروان حیات بمبئی نے مندرجہ ذیل ادارتی نوٹ شائع کیا ہے:

"ادارہ کاروان حیات جناب ہنر رضوی لکھنوی کا انتہائی ممنون و متشکر ہے کہ انھوں نے سرتاج شعرا، مداح اہل بیتؑ، نغز گوے بے نظیر حضرت سلامت علی دبیر اعلی مقام کے ایک غیر مطبوعہ مرثیے کے چند بند بطور تبرک عنایت فرمائے۔ مرزا دبیر مرحوم کا یہ مرثیہ ۹۲ بند پر مشتمل ہے، اور اس کا مطلع ہے:

جب رن میں ذوالفقار علم کی حسینؑ نے" [4]

لیکن اس مرثیے کے بارے میں ادارہ کاروان حیات بمبئی کا "غیر مطبوعہ" ہونے کا دعوی درست نہیں ہے کیوں کہ کاروان حیات کے "شہید اعظم نمبر" سے ایک مدت قبل یہ مرثیہ دفتر ماتم کی تیرھویں جلد میں شائع ہو چکا ہے [5] اس کے علاوہ اسی مرثیے کے چند بند کاروان حیات کے "شہید اعظم نمبر" سے برسوں قبل شائع ہونے والی کتاب المیزان میں بھی مطلع سمیت شائع ہو چکے ہیں۔ [6]

رسالہ کاروان حیات بمبئی کے ایک اور خصوصی شمارے "مولا علی نمبر" میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے: "مرزا دبیر صاحب کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی ممتاز نامہ" [7]

اس مضمون میں "دبیریات" کے موضوع پر تحقیق کرنے والے فاضل محقق ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے ممتاز نامہ کے عنوان سے دبیر کی جس مثنوی

---

[1] اردو مثنوی کا ارتقا۔ شمالی ہند میں ڈاکٹر سید محمد عقیل۔ شائع کردہ الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد ۱۹۶۵ء۔ ضمیمہ (۱) ص ۱۲، ۴۔

[2] اردو مثنوی شمالی ہند میں: ڈاکٹر گیان چند جین۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ ۱۹۶۹ء۔ ص ۵۸۲۔

[3] مرزا دبیر۔ سوانح و کلام۔ (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی): ڈاکٹر مظفر حسن ملک۔ (غیر مطبوعہ ٹائپ شدہ نسخہ) فٹ نوٹ۔ ورق ۱۱۹۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک کا یہ تحقیقی مقالہ پاکستان میں لکھا گیا ہے اور یہ وہاں ابھی تک شائع ہوا یا نہیں راقم الحروف کو اس کا علم نہیں۔ (کاظم علی خاں) [4] کاروان حیات بمبئی (جلد ۲۔ شمارہ ۲) "شہید اعظم نمبر" محرم ۱۳۹۱ ہجری ص ۵۔ [5] دفتر ماتم جلد ۱۳، [6] المیزان: مولفہ چودھری نظیر حسن فوق رہابنی طبع اول مطبوعہ مطبع فیض عام علی گڑھ ص ص ۲۷۹/۲۷۸ [7] پندرہ روزہ کاروان حیات بمبئی (جلد ۲۔ شمارہ ۱۳-۱۴) "مولا علی نمبر" ص ۳۳۔

کا "غیر مطبوعہ" ہونا تحریر کیا ہے وہ معراج نامہ کے عنوان سے مدت ہوئی کہ دفترِ ماتم کی پندرھویں جلد میں شائع ہو چکی ہے[1]

ڈاکٹر سید صفدر حسین (مقیم پاکستان) صنفِ مرثیہ پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنی مرتب کردہ کتاب نادراتِ مرزا دبیر میں دبیر کے پانچ مرثیے "غیر مطبوعہ" کے دعوے کے ساتھ شائع فرمائے ہیں جن میں مرثیہ:

"سبطینِ علی رونقِ میدانِ دغا تھے"

بھی شامل ہے[2]۔ لیکن راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق یہ مرثیہ نادراتِ مرزا دبیر (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء) سے تقریباً ۸۰ سال قبل ۱۸۹۷ء میں شائع ہونے والی دفترِ ماتم جلد نمبر ۱۴ میں چھپ چکا ہے[3]۔ البتہ ڈاکٹر سید صفدر حسین کے نسخے میں دفترِ ماتم کے مقابلے میں تعداد بند میں اضافہ ہے اور مرثیے میں بعض اختلافِ نسخ بھی نظر آتے ہیں۔ بہرحال دبیر کے مطبوعہ کلام کی "غیر مطبوعہ" کے دعوے کے ساتھ اشاعت کی یہ افسوسناک روایت دفترِ ماتم کی جلدوں کی نایابی ہی کا نتیجہ ہے۔

پیشِ نظر مختصر تحقیقی مضمون میں دفترِ ماتم کی انہی "نایاب" جلدوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دفترِ ماتم بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان بیس جلدوں میں سے جلد نمبر ۱ تا جلد نمبر ۱۴، میں مراثیِ دبیر شامل ہیں۔ جلد نمبر ۱۵ میں دبیر کی دو مثنویاں شامل ہیں۔ دفترِ ماتم جلد نمبر ۱۶، جلد نمبر ۱۷ اور جلد نمبر ۱۸ سلاموں پر مشتمل ہیں۔ اِن سلاموں میں مرزا دبیر کے علاوہ بعض تلامذۂ دبیر کے سلام بھی شامل ہیں۔ دفترِ ماتم جلد نمبر ۱۹ میں مخمس ہیں۔ اور آخری یعنی بیسویں جلد رباعیات، نوحہ جات و قطعات وغیرہ متفرق کلام پر مشتمل ہے۔

دفترِ ماتم کی مختلف جلدیں مختلف اوقات میں بار بار مختلف مطبعوں سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ دفترِ ماتم کی بعض جلدوں کی ایک سے زیادہ اشاعتیں راقم السطور کے پیشِ نظر رہی ہیں۔ دفترِ ماتم کی بیسوں جلدوں کے بارے بعض ضروری امور ذیل میں ملاحظہ ہوں۔

(۱) دفترِ ماتم جلد نمبر ۱، طبع سوم، جنوری ۱۹۱۰ء مطبع محمد تیغ بہادر لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبد الحسین تاجر کتب محلۂ درگاہ کوٹھی سردار باغ لکھنؤ۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات۔ تعداد مراثی ۲۵۔ جسامت ۱۸x۲۷ سینٹی میٹر۔

(۲) دفترِ ماتم۔ جلد نمبر ۲، طبع دوم، ۱۳۲۳ھ۔ مطبعِ دبدبۂ احمدی لکھنؤ، بہ فرمائش سید عبد الحسین۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ تعداد مراثی ۲۵۔

(۳) دفترِ ماتم جلد نمبر ۲، طبع سوم [سرورق پر مہر مرزا محمد جعفر اوج (فرزندِ مرزا دبیر) میں ۱۳۰۸ھ درج ہے۔ سنہ اشاعت ندارد] مطبوعہ فیضِ احمدی پریس لکھنؤ۔ ضخامت ۱۸۹ صفحات۔ تعداد مراثی ۲۵۔

(۴) دفترِ ماتم جلد نمبر ۳۔ طبع دسمبر ۱۸۹۶ء، مطبع دبدبۂ احمدی مشک گنج، لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبد الحسین۔ تعداد مراثی ۲۹۔

(۵) دفترِ ماتم جلد نمبر ۳۔ طبع دوم۔ فروری ۱۹۱۳ء۔ مطبع شاہی لکھنؤ۔ ضخامت ۲۱۲ صفحات۔ تعداد مراثی ۲۹، جسامت ۱۸x۲۷ سینٹی میٹر۔

(۶) دفترِ ماتم جلد نمبر ۴ (مہر اوج میں ۱۳۰۴ھ درج ہے) مطبع شمس العلوم لکھنؤ۔ بہ فرمائش حسن مرزا و مرزا امام الدین۔ ضخامت ۲۲۲ صفحات۔ تعداد مراثی ۲۷۔

(۷) دفترِ ماتم جلد نمبر ۴۔ طبع دوم۔ دسمبر ۱۹۰۹ء۔ مطبع دبدبۂ احمدی لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبد الحسین تعداد مراثی ۲۷

(۸) دفترِ ماتم۔ جلد نمبر ۵ راقم الحروف کو اصل جلد کے بجائے زیدپور

---

[1] دفترِ ماتم۔ جلد نمبر ۱۵ بیرونی سرورق مطبوعہ احمدی پریس لکھنؤ۔ جلد مطبوعہ مطبع جعفری نخاس لکھنؤ (سنہ اشاعت ندارد) ص ص ۱۶۳ الغایت ۱۹۵۔ (دفترِ ماتم جلد نمبر ۱۵ کے بارے میں پیشِ نظر مضمون میں ضروری امور آگے ملاحظہ ہوں) کاظم علی خان[2] نادراتِ مرزا دبیر۔ مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۵ء[3] دفترِ ماتم جلد ۱۴، طبع ۱۸۹۷ء مطبوعہ مطبع دبدبۂ احمدی لکھنؤ۔

ضلع بارہ بنکی۔ یو۔ پی کے ایک علم دوست خانوادے سے جلد کی قلمی نقل بہ قلم سید آغا حسن زید پوری برادرم سید دلشاد حسین صاحب زید پوری کی عنایت سے مل سکی ہے جلد کے اس قلمی نسخے کے علاوہ ریاست پیرپور (یو۔ پی) کے گراں بہا کتب خانے سے اس جلد کے مراثی کے مطلعوں کی فہرست بھی برادر مکرم جناب محمد رشید صاحب کی عنایت سے ملی تھی۔ تعداد مراثی ۲۷۔

(۹) دفترِ ماتم جلد ۹ (سنہ اشاعت ندارد) مطبع جعفری، نخاس جدید، لکھنؤ۔ بہ فرمائش حسن مرزا۔ ضخامت ۲۵۴ صفحات تعداد مراثی ۲۹۔

(۱۰) دفترِ ماتم جلد ۱۰۔ طبع دوم۔ جون ۱۹۱۰ء۔ مطبع دبدبۂ احمدی لکھنؤ۔ ضخامت ۲۳۶ صفحات۔ فہرست مراثی میں مطلعوں کی تعداد ۲۹ درج ہے مگر مرثیہ "مصروفِ نگہداشتِ شہنشاہ قلم ہے" جلد میں شامل نہیں ہے۔ لہٰذا مرثیوں کی اصل تعداد جو اس جلد میں شامل ہیں ۲۸ قرار دی جائے گی۔

(۱۱) دفترِ ماتم جلد ۱۱ طبع دوم۔ فروری ۱۹۱۲ء۔ مطبع شاہی لکھنؤ۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ جلد میں مطلعوں کی مطبوعہ فہرست میں ۲۶ مرثیے درج ملتے ہیں لیکن جلد میں غلطی سے ایک مرثیے کے ایک ضمنی مطلع کو علاحدہ مرثیہ مان لیا گیا ہے۔ اس طرح جلد میں مرثیوں کی صحیح تعداد ۲۵ رہتی ہے۔

(۱۲) دفترِ ماتم جلد ۸۔ طبع دوم۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء۔ مطبع شاہی لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبد الحسین ضخامت ۲۱۶ صفحات۔ جلد میں مطلعوں کی مطبوعہ فہرست میں ۲۸ مرثیے درج ہیں لیکن اس فہرست میں دو مرثیے شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ اس طرح جلد میں مرثیوں کی صحیح تعداد ۳۰ ہوتی ہے۔

(۱۳) دفترِ ماتم جلد ۹۔ طبع دوم۔ جولائی ۱۹۱۲ء۔ مطبع شاہی لکھنؤ۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ تعداد مراثی ۲۶۔

(۱۴) دفترِ ماتم جلد ۱۰۔ کوشش کے باوجود راقم الحروف اصل جلد نہ دیکھ سکا۔ برادرم دلشاد حسین صاحب زید پوری نے ازراہِ کرم اس جلد کی بھی ایک قلمی نقل فراہم کی جس میں تعداد مراثی ۲۶ ہے لیکن کتب خانہ ریاست پیرپور سے حاصل کردہ مطلعوں کی فہرست میں مرثیوں کی تعداد ۲۰ درج ملتی ہے۔ حیاتِ دبیر کے مطابق بھی یہ جلد ۲۰ مراثی پر مشتمل ہے[۱]

(۱۵) دفترِ ماتم جلد ۱۱۔ [مہر اوّل میں ۱۳۱۴ھ درج ہے]۔ مطبع دبدبہ احمدی مشک گنج لکھنؤ۔ تعداد مراثی ۲۷۔

(۱۶) دفترِ ماتم جلد ۱۲۔ طبع جنوری ۱۸۹۷ء (سرورق نہ ہونے کے باعث ناقص الاوّل۔ مطبع کا نام معلوم نہ ہو سکا) بہ فرمائش سید عبد الحسین ضخامت ۲۱۴ صفحات۔ تعداد مراثی ۲۹۔

(۱۷) دفترِ ماتم جلد ۱۳۔ (ناقص الاوّل۔ سنہ اشاعت اور مطبع نامعلوم)۔ بہ فرمائش سید عبد الحسین ضخامت ۲۱۴ صفحات۔ تعداد مراثی ۲۳۔ اس جلد میں شامل مرثیوں کے مطلعوں کی دو قلمی فہرستیں بھی راقم السطور کے پیشِ نظر رہی ہیں۔ ایک فہرست کتب خانۂ ریاست پیرپور سے بہ توسط برادر مکرم محمد رشید صاحب ملی جس کے لیے راقم الحروف راجہ صاحب پیرپور عالی جناب احمد مہدی صاحب اور جناب محمد رشید صاحب کا ممنون ہے۔ دوسری فہرست ریاست محمود آباد (اتر پردیش) کے نادر الوجود کتب خانے سے بہ توسط مہاراج کمار۔ ریاست محمود آباد عالی جناب امیر حیدر خاں صاحب ملی۔ علمی ذوق اور علم دوستی کے لیے ریاست محمود آباد عرصۂ دراز سے مشہور ہے۔ موجودہ راجا صاحب اور مہاراج کمار صاحب کی ذات والاصفات سے آج بھی ریاست محمود آباد کی علم دوستی کی قدیم روایت قائم و برقرار ہے جس کا اعتراف نہ کرنا احسان فراموشی ہوگی۔ ریاست محمود آباد اہلِ تحقیق کی بھی محسن رہی ہے۔

(۱۸) دفترِ ماتم جلد ۱۴۔ طبع مارچ ۱۸۹۷ء۔ مطبع دبدبۂ احمدی مشک گنج لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبد الحسین۔ ضخامت ۲۱۸ صفحات۔ تعداد مراثی ۱۹۔

---

[۱] حیاتِ دبیر جلد ۱۔ ص ۲۷۷۔

(۱۹) دفترِ ماتم جلد ۵ (سنہ اشاعت ندارد)۔ بیرونی سرورق پر مطبع کا نام دبدبۂ احمدی پریس لکھنؤ درج ہے لیکن اندرونی ٹائٹل پر یہ عبارت درج ہے: "در مطبع جعفری واقع لکھنؤ نخاس جدید مطبوع گردید"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلد اور سرورق کی طباعت دو الگ الگ مطبعوں میں ہوئی ہے۔ کتاب حسن مرزا اور مرزا امام الدین کی فرمائش پر شائع ہوئی ہے۔ ضخامت ۱۹۶ صفحات۔ جسامت ۱۷ × ۲۵ سینٹی میٹر۔ کتاب میں دبیر کے مراثی کے بجائے ۲ عدد مثنویاں ہیں جن میں مجموعی طور پر کم و بیش چار ہزار اشعار ہیں

(۲۰) دفترِ ماتم جلد ۱۶ (مجموعہ سلام حصہ اول)۔ نمبر اور ج میں ۱۳۱۴ھ درج ہے۔ مطبع دبدبۂ احمدی مشک گنج لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبدالحسین ضخامت ۴۰۲ صفحات۔ کتاب میں ردیف وار دبیر و تلامذۂ دبیر کے ۱۱۰ سلام ہیں۔

(۲۱) دفترِ ماتم جلد ۱۷ (مجموعہ سلام حصہ دوم)۔ طبع ۱۸۹۷ء۔ مطبع دبدبۂ احمدی مشک گنج لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبدالحسین ضخامت ۴۵۲ صفحات، کتاب ردیف وار دبیر اور ان کے تلامذہ وغیرہ کے ۱۲۴ سلاموں پر مشتمل ہے۔

(۲۲) دفترِ ماتم جلد ۱۸۔ (مجموعۂ سلام حصہ سوم) طبع جون ۱۸۹۷ء۔ مطبع دبدبۂ احمدی مشک گنج لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبدالحسین ضخامت ۴۱۸ صفحات، جسامت ۱۷ × ۲۵ سینٹی میٹر کتاب میں مطلعوں کی مطبوعہ فہرست کے مطابق ۹۸ سلام ہیں جو دبیر و تلامذۂ دبیر کی فکر کا نتیجہ ہیں۔

(۲۳) دفترِ ماتم جلد ۱۹ طبع مئی ۱۸۹۷ء (ناقص الاول مطبع کا نام معلوم نہ ہوسکا) ضخامت ۴۳۰ صفحات۔ کتاب میں فضل حسین ثابت کے مطابق ۴۶ مخمس ہیں[۱] جن میں فصیح، سلطان اور ضمیر وغیرہ کے سلاموں پر تخمیس شامل ہیں۔

(۲۴) دفترِ ماتم جلد ۲۰۔ طبع ۱۸۹۷ء۔ مطبع دبدبۂ احمدی مشک گنج لکھنؤ۔ بہ فرمائش سید عبدالحسین ضخامت ۴۸۲ صفحات کتاب کے سرورق پر "رباعیات و نوحہ جات" درج ہے۔ مگر جلد میں رباعیوں اور نوحوں کے علاوہ چند مسدس و مخمس بھی شامل ہیں۔ افضل حسین ثابت کے مطابق کتاب میں واقعات، تضمینیں، مناجات و قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔[۲] جلد متفرق کلام پر مشتمل ہے۔ اشعار کی تعداد حیاتِ دبیر (۱) کے مطابق ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔[۳]

دفترِ ماتم جلد ۱ طبع سوم۔ جنوری ۱۹۱۰ء کے آخر میں صفحہ ۲۲۲ کے بعد اندرونی ٹائٹل پر سید عبدالحسین کی جانب سے ایک اشتہاری اعلان شائع ہوا تھا۔ جس کے مطابق دفترِ ماتم کی بیسوں جلدوں کی قیمت دس روپے تھی اور ڈاک سے طلب کرنے پر تمام جلدیں گیارہ روپے آٹھ آنے میں مل سکتی تھیں۔ افسوس کہ اب یہ جلدیں نایاب ہو چکی ہیں۔

متذکرۂ بالا فہرست میں مندرج تفصیلات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ دفترِ ماتم کی الگ الگ جلدیں مختلف اوقات میں کسی ایک مطبع کے بجائے متعدد مطبعوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ دفترِ ماتم کی جلدوں اور دیگر اڈیشنوں کے بارے میں صورت حال یہ رہی ہے کہ جلد ۲ کا دوسرا اڈیشن ۱۳۲۳ھ میں مطبع دبدبۂ احمدی لکھنؤ سے شائع ہوا۔ جلد ۳ کا دوسرا اڈیشن فروری ۱۹۱۳ء میں مطبع شاہی لکھنؤ سے چھپا۔ جلد ۴ کا دوسرا اڈیشن دسمبر ۱۹۰۹ء مطبع دبدبۂ احمدی لکھنؤ سے نکلا۔ دفترِ ماتم جلد ۶ کی اشاعت دوم مطبع دبدبۂ احمدی لکھنؤ میں جون ۱۹۱۰ء میں انجام پائی۔ ساتویں جلد کا دوسرا اڈیشن ۱۹۱۲ء میں مطبع شاہی لکھنؤ سے نکلا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح دفترِ ماتم کی مختلف جلدوں کے دوسرے اڈیشن مختلف مطبعوں میں الگ الگ اوقات پر شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر رشید حسن خاں کا یہ قول درست نہیں ہے کہ "دبیر کے مراثی کا کوئی اچھا مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ شاہی پریس لکھنؤ سے دفترِ ماتم کے نام سے ان کے مراثی کا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اس کا دوسرا اڈیشن پیش نظر ہے جو ۱۹۱۲ء کا مطبوعہ ہے[۴]۔"

---

[۱] حیاتِ دبیر جلد ۱۔ ص ۲۷۸ [۲] حیاتِ دبیر جلد ۱ ص ۲۷۸۔ [۳] ایضاً [۴] انتخاب مراثی (انیس و دبیر) مکتبہ جامعہ دہلی۔ جنوری ۱۹۷۰ء۔ تعارف از رشید حسن خاں (تعارف میں صفحات پر نمبر درج نہیں ہیں کاظم علی خاں)

دفترِ ماتم جلد نمبر ۱ لغایت نمبر ۱۴ میں چہاردہ معصومین کے حالات میں مراثی شامل ہیں۔ مرثیے کے میدان میں یہ مرزا دبیر کی ایجاد قرار دی جاتی ہے۔

دبیر کی قائم کردہ اس روایت کا لحاظ آگے چل کر دوسرے مرثیہ نگاروں نے بھی رکھا ہے۔ چناں چہ سید سرفراز حسین خبیر لکھنوی (شاگرد مرزا اوج فرزندِ مرزا سلامت علی دبیر) نے بھی چودہ معصومین کے حال میں مرثیے کہے ہیں جو شائع بھی ہوئے ہیں[1]

مراثی پر مشتمل دفترِ ماتم کی جلد نمبر ۱ لغایت نمبر ۱۴ میں مرثیوں کی تعداد کیا ہے؟ یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ افسوس ہے کہ محققین نے اس جانب اب تک نہ کوئی توجہ کی ہے اور نہ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ افضل حسین ثابت لکھنوی نے دفترِ ماتم کی جلد نمبر ۱ لغایت نمبر ۱۴ میں مراثی کی مجموعی تعداد ۳۶۶ درج کی ہے[2]۔ اسی تعداد کو ڈاکٹر مظفر حسن ملک نے اپنے پی ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے میں مزید تحقیق فرمائے بغیر قبول فرما لیا ہے اور اس ۳۶۶ مراثی کی تعداد کے لیے حیاتِ دبیر کا حوالہ نہ دے کر غلطی کا بار بلا وجہ اپنے سر لے لیا ہے[3]

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی بھی اپنے پی ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے میں حیاتِ دبیر کا حوالہ دیئے بغیر رقم طراز ہیں کہ "دفترِ ماتم میں ۳۶۶ مراثی طبع ہوئے ہیں"[4]۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین نے بھی حیاتِ دبیر کا حوالہ دیے بغیر دفترِ ماتم کی جلدوں میں مراثی کی مجموعی تعداد ۳۶۶ بتائی ہے[5]

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہ مسئلہ مفصل بحث اور تحقیق کا متقاضی ہے۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق دفترِ ماتم کی جلد نمبر ۱ لغایت نمبر ۱۴ میں دبیر کے مراثی کی صحیح تعداد ۳۶۶ نہیں ثابت ہوتی۔ اس کا واضح سبب یہ ہے کہ اوّل تو خود افضل حسین ثابت کے قول کے مطابق دفترِ ماتم کے بعض مرثیے دبیر کے کلام کے بجائے الحاقی کلام کی حیثیت رکھتے ہیں (حیاتِ دبیر جلد نمبر ۱ ص ۲۷۹)

دفترِ ماتم کی جلدوں میں بعض مرثیے مکرر شائع ہو گئے ہیں۔ مکرر شائع ہونے والے مرثیوں میں بہ طور مثال وہ مرثیہ پیش کیا جا سکتا ہے جس کا مطلع ہے:

"اے مومنو کرلو علی اکبر کی زیارت"

جو دفترِ ماتم جلد نمبر ۶ اور جلد نمبر ۱۲ دونوں میں موجود ملتا ہے۔ اس کے علاوہ دفترِ ماتم کی جلدیں ایسی مثالوں سے بھی خالی نہیں ہیں کہ کسی جلد میں کوئی مرثیہ چھپ چکا ہے اور اسی مرثیے کو ایک ضمنی مطلعے کے تحت کسی دوسری جلد میں علاحدہ اور نئے مرثیے کی حیثیت سے شائع کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ "ضمنی مطلعے" کے تحت دوبارہ شائع ہونے والے مرثیے علاحدہ مرثیے قرار نہیں دیے جا سکتے اور دفترِ ماتم کے مرثیوں کی مجموعی تعداد ان حالات کے تحت ۳۶۶ درست نہیں رہ سکتی۔ یہ مسئلہ مزید تحقیق اور مفصل بحث چاہتا ہے کہ دفترِ ماتم میں مراثی کی صحیح تعداد کیا ہے؟ اس مختصر مضمون کے دامن میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اس مسئلے پر راقم الحروف کی دبیر سے متعلق زیرِ تسوید کتاب میں مفصل گفتگو کی جا رہی ہے۔ دفترِ ماتم کی جلد نمبر ۱۵ لغایت جلد نمبر ۲۰ پر بھی اس مختصر

---

[1] ملاحظہ ہو بدرِ کامل حصہ اوّل و حصہ دوم: مصنفہ سید سرفراز حسین صاحب رضوی خبیر لکھنوی۔ لکھنؤ، ۱۳۱۳ھ۔ کتاب کے دونوں حصوں کے لیے راقم الحروف خبیر صاحب کے فرزندگان کا ممنون و متشکر ہے کہ ان حضرات نے دونوں جلدیں عنایت فرمائی ہیں (کاظم علی خاں)

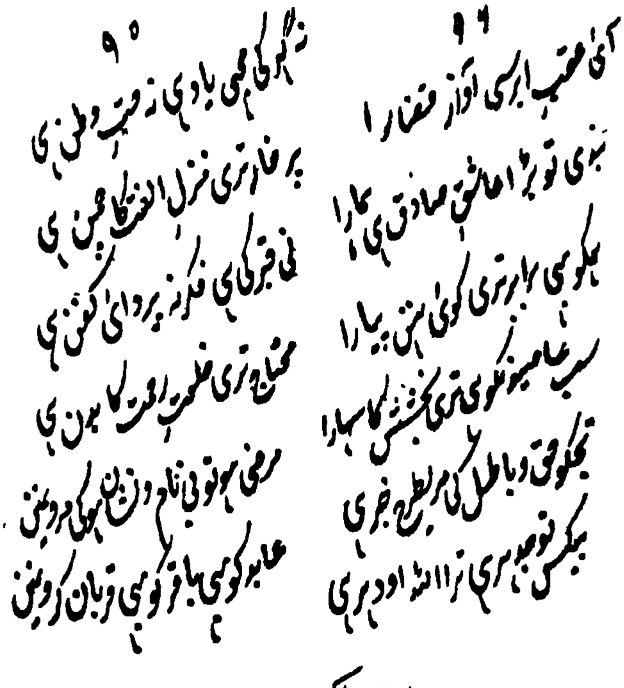
[2] حیاتِ دبیر جلد نمبر ۱ ص ۲۷۷، [3] مرزا دبیر سوانح و کلام (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی) از ڈاکٹر مظفر حسن ملک (غیر مطبوعہ ٹائپ شدہ نسخہ) ورق ۱۲۰/۱۱۹ [4] دبستانِ دبیر ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی۔ لکھنؤ ۱۹۶۶ء ص ۱۵۶ [5] نادراتِ مرزا دبیر: مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۵ء "آئینہ احوال" ص ۱۱۔ اس کے علاوہ "آئینہ احوال" ہی کے عنوان سے ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنے مضمون مطبوعہ ماہ نامہ پیامِ عمل لاہور (مئی، جون اور جولائی ۱۹۷۵ء مشترک شمارہ) "دبیر نمبر" (ص ۱۰) میں بھی دفترِ ماتم کے مراثی کی تعداد ۳۶۶ بتائی ہے۔
(کاظم علی خاں)

مضمون میں کسی مفصل بحث کی گنجائش نہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں آئندہ کچھ عرض کیا جا سکے گا۔

حال ہی میں راقم الحروف کو زید پور (ضلع بارہ بنکی۔ اتر پردیش) کے ایک علم دوست خانوادے سے دبیرؔ کے ایک مرثیے کا ایک قدیم مخطوطہ دست یاب ہوا ہے جو دبیرؔ ہی کی تحریر میں بتایا جاتا ہے۔ یہ نو دریافت مخطوطہ دبیر پر تحقیق و تنقید کرنے والوں کے لیے بعض اہم انکشافات کے روشن امکانات کا حامل ہے۔ علمی، ادبی اور تحقیقی حلقوں کی دلچسپی کے لیے اس نو دریافت مخطوطے کے سرِ ورق دو بند کا عکس شائع کیا جا رہا ہے تاکہ صنفِ مرثیہ اور کلام و کمالِ دبیر پر نظر رکھنے والے محققین نو دریافت مخطوطے کا نمونہ ملاحظہ فرما سکیں اور اس کے بارے میں اپنے خیالات و نظریات کا اظہار فرما سکیں۔

عکسِ تحریر

مرزا سلامت علی دبیر



استدراک

اس مضمون کے آغاز میں مرزا دبیرؔ کی تاریخ وفات کا مجملاً ذکر کیا گیا ہے۔ مرزا صاحب کی تاریخ وفات کے سلسلے میں ایک اہم ماخذ کا علم بعد میں ہوا۔ اس لیے اس کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

محمد حسین آزادؔ اور نظامی بدایونی کے مطابق دبیرؔ کی وفات تاریخ "۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ" ہے۔ [ر۔ک: (۱) آبِ حیات: مولانا محمد حسین آزاد۔ رام نرائن لال پبلشرز الٰہ آباد ۱۹۶۲ء ص ۵۲۰۔ (۲) قاموس المشاہیر: مرتبہ نظامی بدایونی۔ نظامی پریس بدایوں۔ ۱۹۲۴ء۔ ص ۲۳۶]۔ شادؔ عظیم آبادی کا بیان ہے کہ مرزا دبیرؔ نے "ربیع الاول یا ربیع الثانی ۱۲۹۲ھ" میں رحلت کی [ر۔ک فکرِ بلیغ: مؤلفہ شادؔ عظیم آبادی۔ مرتبہ نقی احمد ارشاد۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ اگست ۱۹۷۴ء۔ ص ۱۸۲]۔ لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید جلد سوم۔ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۱۷ء (ص ۱۵۸) میں دبیرؔ کی تاریخ وفات "۳ محرم ۱۲۹۲ھ" درج فرمائی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے اپنے پی ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے دبستانِ دبیرؔ۔ لکھنؤ طبع اول (ص ۱۴۳) میں دبیرؔ کی تاریخ وفات "۶ مارچ ۱۸۷۵ء" بتائی ہے۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین نے اپنی کتاب "نادراتِ مرزا دبیرؔ۔ لاہور ۱۹۷۵ء۔ (آئینۂ احوال ص ۱۰) میں مرزا دبیرؔ کی تاریخ وفات کے تحت "۶ مارچ ۱۸۷۵ء" درج کیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ دبیرؔ کی وفات کے سلسلے میں درج ہونے والی متذکرۂ بالا تمام تاریخیں غلط ہیں۔ مرزا دبیرؔ کی وفات جیسا کہ مضمون کے آغاز میں عرض کیا جا چکا ہے۔ ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ کو واقع ہوئی تھی۔ تقویم ہجری و عیسوی مرتبہ ابو النصر خالدی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۳۹ء کی مدد سے ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ راقم الحروف کے حساب سے ۸ مارچ ۱۸۷۵ء کے مطابق نکلتی ہے مگر تقویم سے بھی مطلوبہ تاریخ میں ایک دن کی غلطی نکلتی ہے۔ لیکن اودھ اخبار لکھنؤ کا ایک شمارہ ہماری الجھن کو حل کر سکتا ہے۔ اودھ اخبار لکھنؤ کے اس شمارے پر ۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء مطابق یکم صفر ۱۲۹۲ھ درج ہے۔ اس شمارے کی تاریخوں سے ہم بخوبی معلوم کر سکتے ہیں کہ ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ۔ ۹ مارچ ۱۸۷۵ء کے مطابق ہے۔ اس طرح ہمیں ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۹ مارچ ۱۸۷۵ء مرزا سلامت علی دبیرؔ کی صحیح تاریخ وفات دستیاب ہو جاتی ہے۔

—— کاظم علی خاں

ہولی

نصر قریشی

تو دو رنگ کے متوالوں نے گائی ہولی
آگ اور راگ کے سنگم پہ جلائی ہولی
رنگ اور نور کی سوغات کا موسم آیا
سات رنگوں کی قبا پہنے پھر آئی ہولی
سازو آواز کا آہنگ، نئی گیت کی لے
پیار کی ڈولی سجائے ہوئے لائی ہولی
بستی بستی میں مچی دھوم، اُڑا رنگ، گلال
رنگ کے پھولوں سے لوگوں نے سجائی ہولی
کھیت، چوپال، چمن، کوچہ و بازار بنے
شاہراہوں کے رگ و پے میں سمائی ہولی
گنگنائی ہے فضا، گیتوں کی گاگر چھلکی
پیار کے رنگ سے ہر دل پہ ہے چھائی ہولی
آگ میں پھول، نظاروں میں کنول جاگ اُٹھے
تیرگی مٹ گئی، سورج نے جگائی ہولی
نفرت و بغض و عداوت کا وہ ماحول کہاں
رنگِ اخلاص نے پُرکیف بنائی ہولی
فکر کی آنچ، غمِ دوراں کی شدت بھولے
من کے آنگن میں سبھوں نے ہے منائی ہولی
صبح کے ہاتھوں میں پچکاری ہے رنگوں سے بھری
نازنینوں کی مروڑے ہوئے کلائی ہولی
شام آئی ہے مسرت کے خزانے لے کر
رنگ سے دھولی گئی داغِ جدائی ہولی
رنگ اور نور کی چوکھٹ پہ جلے پیار کے دیپ
سب کے ملتے ہیں گلے، پیار کی جائی ہولی
دوستو! پیار کی قندیل جلائے رکھنا
سرخرو ہوتی ہے رنگوں میں نہائی ہولی
یوں تو ہر سال نئے رنگ لیے آتی ہے
نصر اس سال تو کچھ اور ہی لائی ہولی

غزل

ذکی کاکوروی

جب ان سے بات ہو گئی ہے
تجدیدِ حیات ہو گئی ہے

ساقی بھر بھر کے جام دے دے
اب تشنۂ حیات ہو گئی ہے

اُف آنکھ کی دل کشی بھی اکثر
آئینۂ ذات ہو گئی ہے

تخریبِ حیات ان دنوں میں
تعمیرِ حیات ہو گئی ہے

نا وقت ہے جاؤ گے کہاں تم
رہ جاؤ رات ہو گئی ہے

ہارے ہیں تو جیت سے گئے ہیں
جیتے ہیں تو مات ہو گئی ہے

اخلاق و اصول اب کہاں ہیں
آزادیٔ ذات ہو گئی ہے

پُرساں نہیں کوئی اب کسی کا
اغراض کی بات ہو گئی ہے

سائنس کی روشنی کے آگے
تہذیب کی رات ہو گئی ہے

اس قلب کی وسعتوں میں اکثر
غم کائنات ہو گئی ہے

اس دور میں شاعری ذکی کیا
فرصت کی بات ہو گئی ہے

(افسانہ)

خوشحالی کی گنگا

رتن سنگھ

"خوشحالی کی گنگا کیلاش پربت سے اتری ہے۔" ایسا وشواس تھا سیدھے سادے کرمو کو۔

جب ملک میں آزادی آئی تو گاؤں میں صرف دو ایک ہی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ان سے جب کرمو لوہار نے آزادی کے آنے کا مطلب جاننا چاہا تو انھوں نے دھرم کرم میں وشواش رکھنے والے کرمو کو دھرم کی ہی زبان میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا "خوشحالی کی گنگا آکاش سے اتر آئی ہے کرمو دادا۔ اب سارے دیش واسیوں کا جیون پھلت ہو گا۔"

"تب تو ہم اس گنگا کا اشنان کرنے جاوے۔ ہمرا جیون سپھل ہوئی جائے"

یہ فیصلہ کرنے کے بعد کرمو دادا گاؤں کے بڑے زمیندار کے ہاں گیا۔ سفر خرچ کے لیے اس سے کچھ پیسے ادھار لیے، تھوڑے سے ستو اور چبینا پلے باندھا اور تیرتھ یاترا پر چل پڑا۔

وہ تیرتھ یاترا پر نکل تو پڑا لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ گنگا اس دھرتی پر کس جگہ اتری ہے اور کدھر کو بہتی ہے۔ اس نے سوچا کوئی بات نہیں۔ پوچھتے پوچھتے تو سداماں بھگت کرشن بھگوان کے محل تک پہنچ گیا تھا اور وہ کیا گنگا تک نہ پہنچ سکے گا۔ اسے اپنے جسم کی طاقت اور پیروں کی رفتار پر بڑا بھروسہ تھا۔ ایک دفعہ تحصیل سے گاؤں آتے ہوئے اس کے ساتھی گاڑی لیٹ ہونے کی وجہ سے دیر سے گھر آئے تھے اور وہ پیدل ہی بیس کوس کا فاصلہ طے کر کے ان سے پہلے پہنچ گیا تھا۔

لیکن پاؤں میں طاقت تے ہوئے بھی اگر آدمی کی آنکھوں میں عقل کی روشنی نہ ہو تو کبھی کبھی زندگی کے راستے اتنے لمبے ہو جاتے ہیں، اتنے لمبے ہو جاتے ہیں کہ وہ کہیں ختم نہیں ہو پاتے اور مسافر کو کبھی اپنی منزل نہیں مل پاتی۔

یہی ہوا اس بیچارے کرمو کے ساتھ۔

اب اس سیدھے سادے ان پڑھ دیہاتی کو نہ تو یہ معلوم تھا کہ خوشحالی کی گنگا کے معنی کیا ہیں۔ نہ یہ معلوم تھا کہ یہ کیا ہوتی ہے۔ اس کے تصور میں تو یہ گنگا بھی اسی قسم کی گنگا تھی جو ہزاروں سال پہلے گنگوتری کے استھان پر اتری تھی اور پھر ہردوار، کاشی، پٹنہ ہوتی ہوئی دور کہیں سمندر میں جا کر مل گئی تھی۔

اس لیے یہ کرمو بیچارہ کندھے پر لوٹا لٹکائے، اس دیش کے کونے کونے میں گھوم آیا، اوپر پہاڑوں میں گنگوتری جا کر اس نے وہ استھان بھی دیکھا، جہاں ہزاروں سال پہلے شیوجی مہاراج نے گنگا کو دھرتی پر آنے سے پہلے اپنے کنڈلوں میں چھپا لیا تھا۔ اس نے وہ کتھا بھی سنی کہ کس طرح ساری کی ساری گنگا شیوجی مہاراج کے کنڈلوں میں کھو کر رہ گئی تھی۔ وہ تو جب راجہ بھاگیرتھ نے شیوجی مہاراج کو اپنی تپسیا سے پرسن کیا تب کہیں جا کر انھوں نے گنگا کو اپنے کنڈلوں سے آزاد کیا اور پھر آگے آگے راجہ بھاگیرتھ چلے اور پیچھے پیچھے گنگا چلی اور اس دھرتی پر بہنے لگی۔

یہ کتھا سن کر کرمو کے دل میں آیا تھا کہ اگر خوشحالی کی گنگا کہیں پر اٹکی ہوئی مجھے مل گئی تو میں بھی راجہ بھاگیرتھ کی طرح اس کے آگے آگے چلتا ہوا دیش کے کونے کونے میں جاؤں گا۔ اس طرح یہ گنگا دیش کے ہر حصے میں پہنچ جائے گی۔ اسی لیے کرمو گنگوتری سے لے کر راس کماری

تک اور ادھر کشمیر سے لے کر بنگال آسام تک گھوم آیا لیکن خوشحالی کی گنگا اسے کہیں دکھائی نہ دی۔

اس بیچ اپنی روٹی چلانے کے لیے اس نے جگہ جگہ مزدوری کی۔ کئی شہر کے شہر اس نے نئے بنتے ہوئے دیکھے۔ ان کی لمبی چوڑی سڑکوں کے کنارے عالیشان عمارتیں اور دکانیں دیکھ کر کبھی کبھی اسے احساس ہوتا کہ یہ شہر یقیناً خوشحالی کی گنگا کے کنارے بسا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس کے تھکے ہوئے قدموں میں جان آجاتی۔ وہ اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے پیتل کے خالی لوٹے کو ٹٹولتا ہوا تیز چلنے لگتا، تاکہ وہ گنگا میں اشنان کر سکے، اس کے جل سے اپنا لوٹا بھر سکے اور اس گنگا کے آگے آگے چلتا ہوا اسے اپنے گاؤں لے جا سکے۔

لیکن ہر بار راستے لمبے ہو جاتے۔ کرمو کی منزل اسے کہیں دکھائی نہ دیتی۔ اور پھر رات کو چبینا چبا کر یا پھر نمک کے ساتھ ستو کھا کر اور ٹھنڈا پانی پی کر وہ کسی دکان کے برآمدے کے نیچے لیٹا ہوا نئی صبح کا انتظار کرنے لگتا۔

کرمو کو اپنے گھر سے نکلے ہوئے ستائیس اٹھائیس سال ہو رہے تھے۔ اس بیچ میں اس نے محنت مزدوری کی تو اسے پہلے کی نسبت پیسے زیادہ بھی ملے۔ لیکن جتنے پیسے زیادہ ملتے اتنی ہی چیزیں زیادہ مہنگی ملتیں اور وہ زیادہ کمانے کے باوجود اپنے آپ کو اسی جگہ پر پاتا، جہاں اس کے لیے چبینے، ستو اور پیتل کے لوٹے کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

مایوسی کے ان لمحوں میں کئی مرتبہ اس کے دل میں آتا۔ ہو سکتا ہے آزادی آئی نہ ہو، خوشحالی کی گنگا دھرتی پر اتری ہی نہ ہو اور اسکے گاؤں کے بڑھا کو لڑکوں نے اس کے ساتھ کہیں مذاق ہی نہ کیا ہو لیکن جب دوسرے لوگ اسے بتاتے کہ آزادی واقعی آگئی ہے تو اس کے شکوک مٹنے لگتے اور وہ اسی عزم کے ساتھ اپنی منزل کی تلاش میں نکل پڑتا۔

پھر ایک دن اس نے سنا کہ بڑے بڑے لوگوں کی تلاشیاں ہو رہی ہیں اور ان کے گھروں سے لاکھوں کروڑوں روپے نقد اور زیورات کی شکل میں نکل رہے ہیں تو وہ حیران رہ گیا۔

کرمو جیسے جیسے یہ خبریں سنتا ہے ویسے ویسے اسے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ آزادی کے ساتھ ہی خوشحالی کی گنگا تو دھرتی پر اتری تھی لیکن پیشتر اس کے کہ وہ بہتی ہوئی اس دیش کے گاؤں گاؤں بستی بستی میں پہنچتی، ان کالے دھن کے بیوپاریوں نے مل کر اس گنگا کو اپنی تجوریوں میں بند کر لیا تھا اور اسی لیے ہم غریب اس کی ایک ایک بوند کو ترس گئے۔

اب کرمو اتنے برسوں کی بھارت یاترا کرنے کے بعد واپس اپنے گاؤں لوٹ آیا ہے، جہاں نہ صرف اس کا زمیندار سے لیا ہوا قرضہ معاف کر دیا گیا ہے بلکہ تین بیگھے زمین بھی اسے جوتنے بونے کے لیے دے دی گئی ہے۔

اپنی دھرتی پر اپنی محنت سے فصل اگانے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے گاؤں کے بچوں کو اپنی یاترا کی کہانی سناتے ہوئے بتاتا ہے کہ خوشحالی کی گنگا اب تجوریوں سے نکل کر باہر دھرتی پر بہنے لگی ہے۔ اب اس گنگا کا پانی ہمارے کھیتوں کو بھی سیراب کرے گا اور ہمارے گھروں کے ارد گرد ہری بھری فصلیں لہلہائیں گی۔

★

دس سالہ دورِ زرّیں

جوہر ہاشمی

ہر سمت اجالوں کا بلند ہو گیا اقبال
ہے نور سے ظلمات کے ایوانوں میں بھونچال
لمحاتِ طرب فتح و ظفر کے جلو میں
اندرا کی وزارت کے مکمل ہوئے دس سال
اس دور نے لوگوں کے مقدر کو جگایا
اور فرقِ غریبی و امیری کو مٹایا
وہ ملکیت قوم بنے بینک ہمارے
اور مستحقِ زر بھی غریبوں کو بنایا
اب دُور اندھیرا ہوا اور نور سے چھایا
دھن کالا جو تھا آج وہ باہر نکل آیا
عورت ہے مگر ہمت و جرأت کی سبب سے
جو فیض کا دریا تھا وہ بھارت میں بہایا
دس برسوں میں اب بھر گیا امیدوں کا دامن
اندرا جو کروڑوں ہی دلوں کی ہتی دھڑکن
اس دورِ وزارت کے ہیں برکات بہت کچھ
فردوسِ نظر اس سے بنا ہند کا گلشن
اندرا ہے کہ بھارت کا ہے انمول خزانہ
ہے فخرِ سیاست میں، تدبر میں یگانہ
جو کام کیے اس نے وہ تاریخ بنیں گے
خود معترفِ حسنِ فراست ہے زمانہ
غربا نے زمیں پائی تو بے گھر کو ملا گھر
بجلی سے ہیں اب سینکڑوں دیہات منور
مسرور ہیں اب آجر و مزدور یہاں کے
جاگے ہیں اسی فیض سے بھارت کے مقدر
کمزوروں کو حکمت سے بنایا گیا شہ زور
اندرا کی وزارت کا درخشندہ ہے یہ دَور
اُن سے ہے گزارش جو کیا کرتے ہیں تنقید
جو کارِ نمایاں ہیں کریں اس پہ بھی کچھ غور

کردارِ اندرا گاندھی

تکمیل رضوی

عمل کی عزم کی اخلاصِ نیت کی ضرورت ہے
وطن کے نام پر محنت مشقت کی ضرورت ہے
ضرورت ہے کہ اک دل اور اک آواز ہو جاؤ
حقیقت تو یہی ہے اب حقیقت کی ضرورت ہے
کہاں تک ملتوں کے اختلافات آئے دن ہوں گے
ہر اک ملت سے اب تو میل ملت کی ضرورت ہے
زمانہ کروٹوں پر کروٹیں لیتا رہے لیکن
تمھیں کانٹوں کے بستر پر بھی راحت کی ضرورت ہے
ترقی ایسی تو ہو کہہ دے دنیا ہے ترقی بھی
ہمیں ہندوستاں کے علم و حکمت کی ضرورت ہے
زبانی خادمِ ملک و وطن بننا تو ہے آساں
اگر مخدوم بننا ہے تو خدمت کی ضرورت ہے
تمھارا ہر عمل کردار اندرا کا نمونہ ہے
مروت کی صداقت کی حمیت کی ضرورت ہے
خیالی جنتیں بنتی رہیں بزمِ تصور میں
عمل سے جو بنے اب ایسی جنت کی ضرورت ہے
زباں سے جو کہو اپنی وہی دل کا ترانہ ہو
ہم آہنگی کو بھی سازِ حقیقت کی ضرورت ہے
فقط پھولوں کی خوش رنگی سے اے تکمیل کیا حاصل
جو دنیا کو بسانا ہے تو نکہت کی ضرورت ہے

گوشۂ شمیم

لطافت احساس کا شاعر شمیم کرہانی

ڈاکٹر محمد حسن

غزل گوئی کے میدان میں کامیابی کی مختلف منزلیں قرار دی جاتی رہی ہیں۔ خوش گوئی سے نغز گوئی تک کے مرحلے غزل گو شاعر کے لیے ہمیشہ ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے آئے ہیں۔ ہر لمحہ وہ روایت اور انفرادی تجربے کے دوراہے پر کھڑا پایا تو مضمون کے انوکھے پن کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے یا انداز بیان کی انفرادیت کی تلاش میں لیکن ہر انفرادی تجربے میں بھی اجتماعی تجربات اور روحِ عصر کی جھنکار ہوتی ہے۔ اس لیے ہر صاحب طرز شاعر روایت اور تجربے انفرادی اور اجتماعی احساسات اور انداز بیان کے انوکھے پن اور کلاسیکی رچاؤ کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ سعادت ان چند ہی صاحب طرز شاعروں کو نصیب ہوتی ہے کہ وہ روایت کے خزانے کو بھی نہ ہاتھ سے جانے دیں اور اپنا انفرادی لہجہ بھی قائم رکھیں۔

شمیم کرہانی انھیں چند شاعروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ اُن کی غزل کی توانائی کا راز عمق فکر سے کہیں زیادہ احساس کی تازگی میں مضمر ہے جسے وہ اپنے ذاتی تجربات کی تہہ داری سے برابر تابناکی اور چمک بخشتے رہے ہیں۔ شمیم کرہانی نے اپنے آخری مجموعے حرف نیم شب کے دیباچے میں اپنے شعری رویے کے بارے میں خاصے بلیغ اشارے کیے ہیں جن سے ان کی نغز گوئی کے راز کا سراغ پایا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں اگر داخلی محسوسات میں کوئی انفرادیت اور استعجاب نہیں اور خارجی اکتسابات میں لائق اظہار متعجب کن تاثر نہیں تو ایسی تخلیق اہم مضمون پر مبنی ہونے کے باوجود بھی شعر کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ کبھی شاعر کا لہجہ اسی استعجاب نگاری کے باعث انفرادیت اختیار کرتا ہے اور کبھی مواد کی ندرت سے اسلوب میں تنوع کا احساس ہوتا ہے۔"

فن کار اور اس کی شخصیت کے باہمی رشتے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شاعر زندگی اور عوام کی زبان ہے جو اپنے معاشرے کے داخلی اور خارجی مطالبات کو اپنے ذاتی نقطۂ نگاہ کے اشتراک و شمول کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ بنیادی چیز انسانی فطرت کی وہ زنجیر ہے جس کی کڑیاں تمام نوع بشر کی صورت میں روئے زمین پر بکھری ہوئی ہیں۔ کسی کڑی کو چوٹ پہنچی کہ دوسری کڑی درد سے تڑپ اٹھتی ہے مگر جھنکار پیدا ہوتی ہے زنجیر میں اور وہی زنجیر ہے ذاتِ شاعر جو اپنے تمام حلقوں کی نمائندہ زبان ہے۔"

(حرف آغاز ص۱۳)

غزل کی ریزہ خیالی کی مدافعت میں شمیم کرہانی لکھتے ہیں:

"نزول اشعار کی لمحاتی وحدت مختلف العنوان جذبات کے اظہار کی قطعی اجازت دیتی ہے۔ لمحۂ حیات بشری کا ابھرتا ہوا زینہ ہے جو انسانوں کو نطق کی منزل فرش

سے بلوغِ فکر کے عرش تک پہنچاتا ہے۔ لمحہ ایک ہے مگر اپنے دامن میں ہزاروں محشرِ خیال سمیٹے ہوئے ہے۔ لمحہ ایک سماوی منظر ہے جس میں بے شمار فکری یا تی علائم کی دھنک پھوٹتی چلی جاتی ہے۔"

(حرفِ آغاز صفحہ)

شمیم کرہانی کا کلام اپنے ہی لمحات کا مجموعہ ہے۔ یوں تو ان کی شعری تخلیق کا سلسلہ روشن اندھیرا جیسی سیاسی نظموں سے لے کر وجد آفریں غزلیات تک پھیلا ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شمیم کرہانی بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔ وہ غزل کے مزاج داں بھی ہیں اور رمز شناس بھی۔ وہ زندگی کے تہہ در تہہ تجربات کو داخلی کیفیت اور مستی کے ساتھ غزل میں سمو دیتے ہیں۔

حرفِ نیم شب۔ کی اکثر غزلیں ایک عجیب و غریب تجربے کے نشانات سے معمور ہیں۔ ان تجربات میں انفرادی احساس اور داخلی سرگوشت کا انداز ہے لیکن ان کے پیچھے اجتماعی زندگی کے درد و داغ و جستجو کا جہان آباد ہے۔ پچھلے ستائیس برس میں ہندستانی سماج کی سیاسی اور تہذیبی کروٹوں کی داستان کے خاصے دلدوز ٹکڑے ان غزلیات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں تہذیب پر جو سخت وقت گزرا، حق گوئی اور بے باکی کی جگہ مصلحت کوشی اور منافقت کا جس طرح رواج ہوا اس نے شاعر کے دل کو بری طرح مجروح کیا ہے اس کی آنکھوں نے دیکھا کہ جن لوگوں نے اپنے خون سے آزادی کے چراغ جلائے تھے ان کے لیے فضائے حیات تنگ نظر آنے لگی، حق گوئی، مصلحت کوشی کے بازار میں سنگسار کی جانے لگی۔ ذہن کی جودت اور فکر کی روشنی مادی منفعت کے لیے دھڑکتے ہوئے دلوں سے ٹکرانے لگی اور کبھی کبھی ایسا لگا جیسے مستقبل کا خواب دیکھنے والے شاعر کے لیے یاس کے اندھیرے اور غموں کی صلیب کے علاوہ اور کچھ نہیں رہ گیا ہے، یہی دردِ شمیم کرہانی کی غزلوں میں ایک لطیف کسک بن کر سما گیا۔ انھوں نے اپنے اشعار کے بارے میں لکھا ہے۔ ؎

ہر ایک شعر پہ اشکوں کی مہر کردی ہے
کہ یہ چراغ، چراغوں میں گم نہ ہو جائیں

اشکوں کی یہ مہر اس درد کی پہچان ہے۔ جسے زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح ادا کیا گیا ہے۔ ؎

کون لکھے وقت کی درد بھری داستاں
جادوے شب چل گیا، اہلِ قلم سو گئے
ظلمتِ وقت سے کہو، حسرتِ دل نکال لے
ظلمتِ وقت کے لیے آج کی رات اور ہے
اور بڑھے گا دردِ دل رات جو بھیگ جائے گی
دیکھ نہ وقت کی طرف، وقت بھی چارہ گر نہیں

لیکن شمیم دردمند ہیں، یاس پرست نہیں۔ ان کی غزلیات میں تاریخ کا ایک واضح شعور ملتا ہے۔ وہ ماحول کے اندھیروں سے ہار نہیں مانتے اور اس بات کا واضح شعور رکھتے ہیں کہ وقتی اور ہنگامی مایوسی کے باوجود اندھیرے کی عمر ابدی نہیں ہے اور آخر کار تاریخ، ظلمتِ وقت کو دفن کر کے نئی سحر کی منزل کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ اور ایک ایک ظلم کا بدلہ وقت گن گن کر لیتا ہے ؎

سکوتِ وقت مورخ ہے، لکھ لیا اس نے
جو تجھ دلوں نے کہا بے خطا جبینوں سے
کام آئے گی یہ دولت کل جشنِ بہاراں میں
دامن کو بچا لینا خوشبو جو صبا مانگے
شمیم آشفتگانِ منزل عجیب دیوانۂ طلب ہیں
قدم بڑھاتا ہے کام ان کا صلیب دیکھیں نہ دار دیکھیں

یہ تاریخی شعور شمیم کرہانی کو یاس کی منزلوں سے نکال کر حوصلہ مندی اور صلابتِ فکر کی راہوں تک لے جاتا ہے اور ان کی شاعری میں لطافت اور نرمی کے ساتھ ساتھ استقامتِ فکر اور توانائی کا احساس بھی پیدا کر دیتا ہے۔ انھیں علم ہے کہ خطرات بہت ہیں اور ظلمت کی طاقتیں بر سرِ دست اس قدر مضبوط ہیں کہ حق پرستی کی بے نوائی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پھر بھی اس غیر مساویانہ مقابلے میں انھوں نے اپنی شانِ قلندری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ وہ جان بوجھ کر حق گوئی اور سلامتی احساس کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں لیکن مصلحت کوشی اور دنیاوی کامیابی

کے لیے اس کا سودا کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ؎

وہ صاحبِ علم و حکمت ہوں، یا پیکرِ عقل و دانائی
اک میرے دلِ ناداں کے سوا سب تیری قسم بک جاتے ہیں

کسی جیبِ دل میں دیکھی نہ متاعِ عشق میں نے
مرے شہر میں لٹا دو مرا دردِ بے نوائی

شمیمؔ کرہانی کے اشعار کی ایک خصوصیت انفرادی اور اجتماعی تجربات کی یہی ہم آہنگی ہے جس کی وجہ سے ان کی آواز میں سماجی معنویت اور عصری حسیت پیدا ہوئی ہے۔ آزادی کے بعد جن لوگوں نے لال قلعے کے مشاعروں میں ان کو غزل پڑھتے ہوئے سنا ہے انھیں اس بات کا احساس ہوگا کہ ان کی غزلوں کے کامیاب اشعار اپنے زمانے کے مسائل کو بڑی دردمندی کے ساتھ سمیٹ لیتے ہیں۔ مثلاً اقلیت کشی کے دور میں جب ہندو مسلم فسادات عروج پر تھے اور آزادی کے لیے اقلیتوں کی خدمات کو فراموش کر دیا گیا تھا انھیں کیفیات کی عکاسی جب ان کے اشعار میں غزل کی معروف علامتوں کے ذریعے ہوتی تھی تو مجمع بے اختیار ہو جاتا تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے زمانے کے بہت سے دکھے ہوئے دلوں کی ترجمانی کر رہے ہوں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں یہ تہہ داری بہت نمایاں ہے ؎

عشق کی ایک زبان پر لاکھ طرح کی بندشیں
آپ تو جو کہیں بجا، آپ کی بات اور ہے

گلوں کے چہرۂ رنگیں پہ گردِ ماتم ہے
ہماری صبحِ بہاراں کا خیر مقدم ہے

یہ تختِ گل، یہ تاجِ زر، یہ شانِ خسروی توبہ
شمیمؔ اب صورتِ فرہاد پہچانی نہیں جاتی

جس دور کا منشا ہو، پیاسوں کو نہ ملے دریا
پھر تشنہ لبی میری اس دور سے کیا مانگے

کم نگاہوں کا ہے فرمان کہ اے دیدہ ورو
کس لیے تم کو ملا دیدۂ بینا نہ کہو

رکھ دو الزام کسی موجۂ معصوم کے سر
ناخداؤں نے ڈبویا ہے سفینہ نہ کہو

یہی وجہ ہے کہ شمیمؔ اپنی غزلوں میں اہلِ اقتدار اور اہلِ جنوں کی کشمکش سے کبھی غافل نہیں رہے۔ اسی بات کو انھوں نے اپنے شعر میں اس طرح ادا کیا ہے۔ ؎

زباں کو حکم ہی کہاں، کہ داستانِ غم کہیں
ادا، ادا سے تم کہو، نظر نظر سے ہم کہیں

اجتماعی آہنگ سے یہ گہری وابستگی ہی ان کی غزلوں کا نشانِ امتیاز ہے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ جو مدتوں سننے اور پڑھنے والوں کو متاثر کرتی رہتی ہے، یہ ہانٹنگ (HAUN TING) " کیفیت غزل کے اشعار کی سب سے بڑی کامیابی ہے اور اس کی وجہ محض کامیاب اور صحیح شعر لکھ لینا نہیں ہے بلکہ اجتماعی تجربے کو حسن اور کیفیت کے ساتھ شعر میں ڈھال لینا ہے۔

شمیم کرہانی اس تجربہ کو شعر کا روپ دیتے وقت دو باتوں پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ ایک ترنم جس کی بنا پر ان کے اشعار کا ہر لفظ، اشعار کے الفاظ کا دروبست، مصرعوں کا مجموعی آہنگ سب کچھ اسی ترنم کا پابند تھا۔ دوسرے شعر میں ایسے مناظر کا بیان جو حواس اور خصوصاً بصارت کو آسودگی بخشنے والی تصویریں پیش کر سکیں۔ ان تصاویر میں انھیں انتہائی نازک اور لطیف کیفیات ہی عزیز ہیں اور اس لحاظ سے ان کی " امیجری " نزاکتِ احساس اور لطافتِ خیال کے اعتبار سے منفرد ہے۔ وہ جو تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتے ہیں۔ ان میں چراغِ میکدہ، شبنم، پھول، خوشبو، چاندنی، نسیمِ سحری، نیم شب، گل، شفق، چراغاں جیسے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار سے ان کی " امیجری " کی کسی حد تک نمائندگی ہوسکتی ہے :

ہے رات کا آنچل بھی پھولوں میں لبا لیکن
روٹھی ہوئی نیند اپنی، دامن کی ہوا مانگے

رنگ، خوشبو، صبا، چاند تارے کرن، پھول شبنم شفق آبجو چاندنی
ان کی دلکش جوانی کی تکمیل میں حسنِ فطرت کی ہر چیز کام آگئی

شعر پاشکوں کی مہر کرنے والا اور اپنے چراغوں کو دوسروں سے الگ کرنے والا شاعر محض تشبیہ، استعارے اور "امیجری" سے ہی کام نہیں لیتا بلکہ ادا بندی اور طرز ادا کے مختلف پیرایوں سے بھی نئے رخ پیدا کرتا ہے اور غزل میں ڈرامائی عنصر اور مکالمے کا مزا پیدا کر دیتا ہے۔ سہ

دل کے تعلقات سے کون سا دل کو چین ہے
آؤ کسی سے توڑ لیں، رشتۂ دل، مگر نہیں!
بھولے بھٹکے جو قریب دل برباد آئے
آج تم یاد بہت آئے بہت یاد آئے۔

شمیم کرہانی کو لفظوں کے اندرونی ترنم اور سرشاری کا شدید احساس تھا۔ ان کی غزلیں مترنم، رواں، چھوتی ہوئی کیفیت سے معمور الفاظ کا مجموعہ ہیں اور یہ الفاظ محض رنگ اور آواز کا کھیل نہیں بلکہ ان کے پیچھے فرد اور اس کے دور کے ان دلدوز تجربات کی آواز ہے جن میں شکستِ ساز کی صدا بھی ہے اور نئی موسیقی کی تخلیق کی تڑپ بھی۔

شمیم صاحب کے لیے شاعری زندگی تھی اور زندگی شاعری انھوں نے زندگی کو اس انداز سے گزارا کہ تجربات کی شدت اور خلوص کو احساس کی لطافت کے ساتھ محسوس کر سکیں اور احساس کی اس لطافت کو قائم کرنے کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کو مادی آسائشوں کی دوڑ اور دنیاوی جاہ و حشمت حاصل کرنے کی تگ و دو سے اس طرح الگ رکھا کہ وہ بنیادی طور پر تخلیقی فنکار کے تقاضے پورے کر سکیں۔ شمیم صاحب کے لیے شاعری ایک ڈسپلن تھی۔ جوشؔ کا شعر ہے۔ سہ

دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقائق کی تلخی
اور ہم نے حقائق کے سانچے میں رنگ بھرا افسانوں کا

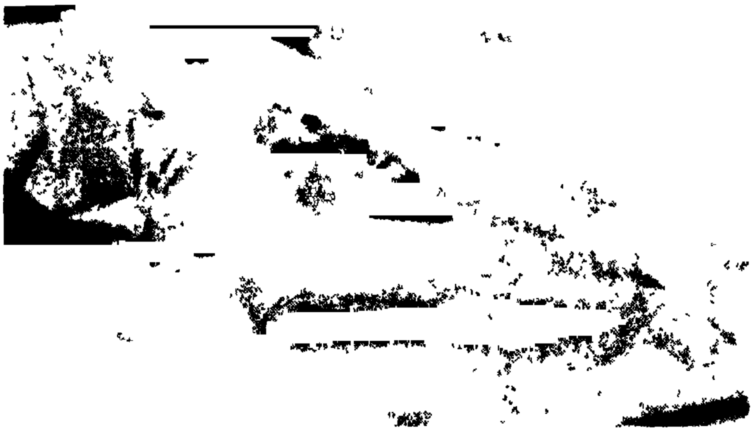
افسانوی طرز سے زندہ رہنا، اس طرح زندہ رہنا کہ زندگی کی اچھائیاں زندگی کی کثافتوں سے آلودہ نہ ہونے پائیں اور زندگی کی عظمت کا احساس نہ صرف ان الفاظ سے جنھیں شاعر استعمال کرتا ہے بلکہ اس کی زندگی اور اس کی شخصیت سے بھی ہو، یہ ان کا کمال تھا۔

شمیم صاحب نے اس لطافتِ احساس کو زندگی بنا لیا۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت سے الگ نہیں تھی۔ انھوں نے شاعری کے سانچے میں اپنی شخصیت کو ڈھال دیا تھا۔ ان کی شاعری میں خاص طور پر غزلوں میں ایک ایسی شخصیت کا نکھار اور جمال ہے جو احساسِ لطافت سے ہم کنار ہے۔ شمیم صاحب کی غزلوں میں خاص طور پر، نہ صرف ان کا اپنا احساس ہے بلکہ اس پورے دور کا احساس اس طرح مجسم ہو گیا ہے جس کو ایک مدت تک یاد رکھا جائے گا۔ غزل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ غزل نئے دور کے تقاضوں کو اپنے انداز اور اپنے خاص آہنگ کے ساتھ نظم کرتی ہے شمیم صاحب نے اپنی غزلوں کے ذریعے اس کا بہت بڑا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس دور میں جو بڑے مسائل، طرح طرح کے نئے درد اور نئی الجھنیں ہمارے ذہنوں میں آئی ہیں ان سب کا احاطہ بڑی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ شمیم صاحب کی غزلوں میں ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جو گزری ہے اس کو انھوں نے دو مصرعوں کے پیمانوں میں اسیر کر دیا ہے اور اس انداز سے سمیٹ لیا ہے کہ ان کی شخصیت کی مہر ایک ایک لفظ پر موجود ہے۔ ان کے احساس میں گویا پورے دور کا احساس گونج رہا ہے اور بول رہا ہے۔ ان کی سب سے بڑی یادگار ان کا کلام ہے۔ اس کلام کو محفوظ رکھنا اور اس کو نئی نسل تک پہنچانا ہم سب کا فرض ہے۔

شمیم صاحب کا جب خیال آتا ہے تو کسی کے اس قول کی طرف توجہ مبذول ہو جاتی ہے کہ جب میں دنیا میں نہ رہوں تو میرے دوست یہ افسوس نہ کریں کہ میں نہیں رہا، یہ سوچیں کہ کبھی ایسا آدمی اس دنیا میں موجود تھا۔ شمیم صاحب بھی ایسے ہی اچھے آدمیوں میں تھے جن کی یاد کے ساتھ خوشبو کا، پھولوں کا، حسن کا زندگی کی لطیف چیزوں کا خیال آتا ہے۔

★

آخری سفر



جنازہ گھر سے باہر آرہا ہے



لب شیریں سخن ہوئے خاموش



نماز جنازہ



آخری آرام گاہ



اعظم گڑھ کے
قیام میں
ماسٹر سید منور حسین رضوی
کے ساتھ





شمیم

تصویروں کے آئینے میں





ے ایک مشاعرہ
م سناتے ہوئے

پروفیسر
احتشام حسین
کے
ساتھ



ران کے ساتھ
تصویر ۱۹۷۴ء

بہ یادِ شمیم کرہانی

ڈاکٹر کرشن گوپال مغموم

مارچ انیسویں کی صبحِ بہار بن گئی ایک شامِ جورِ خزاں
اک گلِ بے نظیرِ باغِ سخن پردۂ خاک میں ہوا پنہاں

شعراء اور جملہ دانش ور نقشِ حسرت ہیں جس کے ماتم میں
جس کو پاتے ہیں زیدی[1] و خورشید[2] آہ پیہم میں، چشمِ پُرنم میں

آئینہ لکھنوی تمدن کا اور اک وضع دار اعظم گڑھ[3]
علم و فضل و کمال میں جو تھا سربسر اعتبارِ اعظم گڑھ

وہ مغنّیِ انقلابِ وطن قوم کے گیت جس نے گائے تھے
سرفروشانِ ملک کے قصّے جس نے ہر بزم میں سنائے تھے

جس کا پیرایۂ بیاں گلبار جس کے جذبات انجمنتانی
جس کے افکار، مہر و ماہِ سخن جس کی صبحِ امید، نورانی

جس کی شعلہ نوائیوں کے طفیل غیرتِ قوم ہو گئی بیدار
جس کے جامِ وطن پرستی سے سبھی اہلِ وطن ہوئے سرشار

وہ جو سرگشتۂ محبت تھا ذات میں جس کی تھا خمیرِ غزل
وہ رموز آشنا تغزّل کا جس کے لہجے میں تھی نفیرِ غزل

جس کے الفاظ تھے ترنم ریز دعوتِ فکر تھے معانی بھی
شرر افشاں رہا قلم جس کا جس کا حصہ تھی گل فشانی بھی

جس کے افکارِ نو بہ نو کی ضیا مشعلِ جادۂ سخن ٹھہری
جس کی طبعِ رسا کی جولانی اک نیا اوجِ فکر و فن ٹھہری

شعر در اصل شعر تھے جس کے شاعری جس کی سحر پرور تھی
جس کے الفاظ کی حسیں ترتیب حسن و تابش میں سلکِ گوہر تھی

جس کا رنگِ سخن جدا سے، صاحبِ طرز جو سخن ور تھا
لفظ و معنی کی تھی پرکھ جس کو علم کے بحر کا جو گوہر تھا

دلِ بسمل تھا جس کے سینے میں کھا گیا جس کو احتشام[4] کا غم
جس کے شعروں میں آنسوؤں کی نمی جس کی نظموں میں تھا عوام کا غم

جس کی جدت طرازیاں بے مثل حقِ فن کر دیا ادا جس نے
اپنے خونِ جگر کی سرخی سے شعر کو دی نئی قبا جس نے

خاص اندازِ شعر خوانی تھا سحر آگیں تھی دل نشیں آواز
جانِ ہر محفلِ سخن تھا جو جس کے انفاس، روحِ سوز و ساز

اپنے شعری مقام کے باعث جو فراموش ہو نہیں سکتا
جس کا سازِ لطیف و کیف آگیں ابھی خاموش ہو نہیں سکتا

ادب و شعر و فن کی دنیا سے
اٹھ گیا وہ شمیمِ کرہانی

جسم اس کا فنا نصیب ہوا
شعر اس کے مگر ہیں لافانی

---

[1] حضرت علی جواد زیدی سے مراد ہے۔ [2] شمیم مرحوم کے چچا زاد بھائی جناب خورشید احمد، مدیر ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ [3] شمیم صاحب کا زادبوم کرہاں، ضلع اعظم گڑھ تھا۔ [4] پروفیسر (سید) احتشام حسین مرحوم۔ مغموم

امیر حلقۂ ارباب فکر اپنا شمیم

[illegible] لکھنوی

وہ ایک شاعرِ فطرت، وہ اک ادیب عظیم
امیرِ حلقۂ اربابِ[1] فکر، اپنا شمیم
رواں تھی راہ سخن میں یوں اس کی طبع سلیم
کہ جیسے صحنِ گلستاں میں موجزن ہو نسیم
ہر ایک شے کا وہ لفظوں میں کھینچتا نقشا
قلم پہ اس کے گماں موقلم کا ہوتا تھا

کلید علم و ادب۔ رمز آشنائے سخن
جہاں میں آیا تھا پہنے ہوئے قبائے سخن
نہیں تھی اس کے سخن میں ذرا بھی جائے سخن
غلط نہیں جو کہیں اس کو ہم خدائے سخن
بلا کا ذہن ملا تھا کمالِ فن کے لیے
نکالتا تھا نئی راہیں وہ سخن کے لیے

بلیغ اس کے مضامیں، سلیس طرزِ ادا
تھا اس کا حسنِ بیاں شاعروں میں سب سے جدا
کیا تھا اس کو خدا نے دلِ گداز عطا
لقب مصورِ فطرت کا اس پہ تھا زیبا
پسندِ خاطرِ اہلِ نظر تھا اس کا کلام
رہے گا زندہ جہانِ ادب میں اس کا نام

عجب طرح کی تھی شوخی مزاج میں اس کے
اچھوتے ڈھونڈتا مضمون وہ غزل کے لیے
ادب کے پیاسے جہاں تشنگی بجھاتے رہے
وہ ایک چشمہ تھا جس کے ہزار تھے دھارے

نئے خیال، نئی بندشیں، نیا اسلوب
شمیم اہلِ ادب کا تھا شاعرِ محبوب

وہ اس کی سحر بیانی، وہ اس کا طرزِ بیاں
کہ سننے والوں کو ساحر کا اس پہ ہوتا گماں
سنوارتا تھا سخن کی وہ کاکلِ پیچاں
تھا اپنی جا پہ ہر اک شعر اس کا اک دیواں
تھی عکسِ گل[2] کی اسے جستجو بیاباں میں
کیا تلاشِ سحر[3] اس نے برقِ باراں میں

مشاعروں کی وہ زینت تھا، بزم کی زیبا
بندھی تھی چار طرف اس کے فکر و فن کی ہوا
دلوں کو کھینچتی تھی اس کی شاعرانہ ادا
تھا اس کے سخن میں قند و نبات گویا گھلا
تھا گرم اس کے کمالاتِ علم کا بازار
وہ ایک گوہرِ یکتا تھا، مشتری تھے ہزار

بدیشی راج بہت ہی گراں گزرتا تھا
فرنگیوں سے جہادِ قلم وہ کرتا تھا
رجز کا زور وہ نغموں میں اپنے بھرتا تھا
وطن سے عشق تھا اس کو وطن پہ مرتا تھا

سند یہ لکھ گیا نہرو[4] سا رہنمائے عظیم
کہ گیت گاتا تھا آزادیِ وطن کے شمیم

قطعہ تاریخ وفات

کلام و حسنِ بیاں کی کرشمہ سازی سے
کھلیں ادب کے شگوفے جو وادیِ دل میں
تو نا قدرانِ ہنر ہیں، دعائے خیر کے ساتھ
شمیم شاعرِ فطرت کو آپ یاد کریں

۱۹۷۵ء

---

[1] دہلی کی مشہور ادبی انجمن جس کی بنیاد شمیم صاحب نے تیس سال قبل ڈالی تھی اور جس کے موصوف صدر رہے۔ (ساقی) [2][3] شمیم صاحب کی مشہور تصنیفات۔
[4] پنڈت جواہر لعل نہرو۔

شمیم کرہانی

—— شارب ردولوی ——

شاعری ایک ایسا فن ہے جو صداقت و حقیقت، تجربہ و مشاہدہ تفکر و گہرائی، خلوص و دیانت اور جولانیٔ طبع کے ساتھ کچھ جمالیاتی و فنی مطالبات بھی رکھتا ہے جس کا نبھانا اور ان سب میں ایک توازن کا قائم رکھنا مشکل کام ہے۔ بڑے اور زندہ رہنے والے شاعر کی یہی ایک شناخت ہے کہ وہ ان میں ایک معیار اور توازن قائم رکھنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ خالص فنی مہارت نے نہ جانے کتنے عروض داں شاعر پیدا کیے جن کے کسی لفظ پر فنی طور سے گرفت کرنا تقریباً ناممکن ہے لیکن وہ کوئی اہمیت نہ حاصل کر سکے، کہیں تفکر و گہرائی اور جمالیاتی حس کی کمی نے تجربے و مشاہدے اور صداقت و حقیقت کے باوجود شعر میں کوئی کیف و اثر نہ پیدا ہونے دیا اس لیے ایسے لوگ اپنے عہد سے آگے نہ جا سکے۔ اینٹ اور گارے سے عمارت کی تعمیر تو سب کر سکتے ہیں لیکن ایسی عمارت کی تعمیر بڑے مشاق ہاتھوں کا کام ہے جو ہر پہلو سے دلکشی و رعنائی کے معیار پر پوری اترے۔ شاعری الفاظ، جذبات، تجربات، مشاہدات اور فن و جمالیات سے تعمیر کی جانے والی ایک عمارت ہے جس میں بہ یک وقت خوبصورتی، دلکشی اثر آفرینی اور افادیت کی تلاش کی جاتی ہے اور انھیں عناصر کا توازن اسے اعلیٰ معیار عطا کرتا ہے۔

کسی بھی شاعر کی تخلیقات کے معیار و اقدار کے مطالعہ کے سلسلے میں اس کے نظریۂ شاعری کو دیکھنا ضروری ہے اسی سے اس بات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ کہاں تک اس نے ان اقدار کا خیال رکھا ہے جو شاعری کو صرف اظہارِ ذات، کے احاطے سے بلند کر کے وسیع انسانی مطالبات، احساسات اور مشاہدات کی تصویر بناتے ہیں۔ شاعری صرف اظہارِ ذات نہیں۔ ذات کا اظہار یا المیہ اس کی وسیع و بسیط دنیا کا ایک معمولی سا گوشہ ہے جہاں اس سے بدرجہا اہم چیزیں موجود ہیں جس میں ذات کا اظہار اس طرح شیر و شکر ہو جاتا ہے کہ ایک کا قصہ سب کا قصہ اور ایک عہد کی کہانی ہر عہد کی کہانی بن جاتی ہے اور اسی اظہار میں وہ اصلی مسرت ہے۔ اسی لیے کسی نے شاعری اور ادب کو زندگی کی تنقید، کسی نے زندگی کی ترجمانی اور کسی نے زندگی کا آئینہ کہا ہے۔ زندگی اور سماج سے ادب کے اس رشتے کو توڑ کر نہ اعلیٰ شاعری اور ادب کا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ اس سے حاصل ہونے والی مسرت کا۔ شمیم کرہانی نے ادب کے اس رشتے پر بار بار زور دیا ہے۔ وہ کسی 'ازم' کے مبلغ نہیں لیکن زندگی اور ادب کے اقدار شناس ضرور تھے اسی لیے اپنی شاعری میں انھوں نے ہر اس نظریے سے گریز کیا جو زندگی اور اس کی اعلا قدروں کی نفی کرتا تھا۔ انھوں نے حرفِ شمیم شبنم کے حرفِ آغاز میں بڑے واضح الفاظ میں اپنے نظریۂ شاعری کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اس بات کے اظہار میں کوئی ہرج نہیں ہے کہ میں اپنی شاعری کو زندگی اور سماج سے قریب تر رکھنے کی سعیٔ بلیغ کرتا رہا ہوں میرے نزدیک ایسی شاعری جو مقصود بالذات یا داخلیت محض ہو، شاعری نہیں ہے بلکہ حصولِ لذت کا ایک بھونڈا طریقہ ہے۔"

انھوں نے آگے چل کر پھر لکھا ہے کہ:

> "شاعر زندگی اور عوام کی زبان ہے جو معاشرے کے داخلی و خارجی مطالبات کو اپنے ذاتی نقطۂ نگاہ کے اشتراک و

شموں کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔"

حونیم شمیمکے یہ دو اقتباسات ان کے نظریۂ شاعری کی وضاحت کے لیے کافی ہیں۔ انھوں نے داخلیت، خارجیت یا ذات کے اظہار کو غلط نہیں قرار دیا ہے بلکہ ان میں توازن پر زور دیا ہے۔ جہاں یہ توازن نہیں ہوگا وہاں شاعری مقصود بالذات اور داخلیت محض ہوکر رہ جائے گی یا بعض نظریات کا خشک اور بے جان اظہار بن جائے گی۔ شاعری کے لیے داخلیت محض بھی اتنی ہی مضر ہے جتنی سپاٹ مقصدیت۔ شاعری کا حسن زندگی کی بہتر تصویر، حسن کی معرفت، رنگین تخلیق، بیان کا خوبصورت انداز تجربات اور مشاہدات کے پُراثر اظہار میں پوشیدہ ہے اس میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی۔ لیکن ذات کائنات کا ایک جزء ہے کُل نہیں۔ اس توازن کو جو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اس کی تخلیقات ہر عہد میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

شمیم کرہانی اس عہد کے ان چند ممتاز شاعروں میں ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے زندگی کی بہترین قدریں اور اس کے حسن کی خوبصورت تصویریں شاعری میں پیش کی ہیں۔ شاعری میں خیال آرائی اور رومانویت کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن یہ خیال آرائی اور رومانویت اسی وقت تک اہم ہے جب تک وہ ماورائیت کی حدوں تک نہیں پہنچتی۔ تخیل کی ماورائیت شاعری کے اثر اور زندگی سے اس کے تعلق کو کمزور کر دیتی ہے۔ اسی لیے فکر، تجربے، خلوص اور حقیقت پسندی کی ضرورت ہوتی ہے۔

شمیم کرہانی کی غزلوں کی یہی خصوصیت ہے کہ ان کے پاس غزل کی روایتی آن بان بھی ہے۔ اس کا کلاسیکی رچاؤ، آراستگی اور شائستگی بھی اور نئی غزل کا تیکھاپن، جدید حسیّت اور عصری آگہی بھی۔ انھوں نے اپنی شاعری کو کبھی خیالی دنیا کی جنت نہیں بننے دیا۔ اس میں خوبصورتی، حسن، دلکشی اور رعنائی سب ہے لیکن وہ اسی دنیا، اسی ماحول اور اسی زندگی سے حاصل کی ہوئی ہے اور اس کی بنیاد تفکر اور گہرائی، مشاہدے اور تجربے پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا انفرادی لب لہجہ، سنجیدہ اور متین آواز، پراثر اور شیریں طرز بیان ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس انفرادیت کو انھوں نے ہر جگہ قائم رکھا ہے کہیں چراغوں پر اشکوں کی مہر لگا کر، کہیں لہجۂ پُرخلوص لہجے سے اور کہیں ہجوم دردمیں قہقہے لگا کر ؎

ہر ایک شعر پہ اشکوں کی مہر کر دی ہے — کہ یہ چراغ چراغوں میں گم نہ ہو جائیں

وہ شعر سادہ سہی سن کے دل بھر آئے شمیم — جو پُرخلوص ہو لہجہ تو بے اثر کیوں ہو

ہجوم درد میں خنداں ہے کون میرے سوا — حریف گردش دوراں ہے کون میرے سوا

شمیم کرہانی کی نگاہ میں فن کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ فن کا پودا خونِ جگر سے ہی شاداب ہوتا ہے۔ اس کے فروغ کے لیے خلوص اور لگن کی ضرورت ہے۔ جب تک خلوص لگن اور ندرت فکر نہیں ہوگی، جب تک چراغ فن کی لو کو تیز کرنے کے لیے خونِ جگر نہیں صرف کیا جائے گا، اس میں وہ تازگی نہیں پیدا ہوگی جو اس کی رنگینی، نکہت اور بہار کو دائمی رنگ عطا کرتی ہے۔ وہ اس راز سے اچھی طرح واقف تھے کہ گل و بلبل، لب و رخسار اور جام و مینا کے قصے فن میں عظمت پیدا نہیں کرتے، فن میں عظمت فکر، تجربے، مشاہدے اور زندگی کو خوبصورت اور پر مسرت بنانے کے احساس سے آتی ہے ؎

صرف مینا سے نہ ذکر لب و رخسار سے ہے — عظمت اہل قلم ندرت افکار سے ہے

آؤ شمیم رکھ دیں جلا کر نئے چراغ — تاریک ہو چلی ہے تغزل کی خانقاہ

جلا کے خونِ تمنا فروغ فن کے لیے — چراغ ہم نے بھی کچھ شام زندگی کو دیے

شمیم کرہانی کی غزل روایتی غزل نہیں ہے نہ وہ غزل کے روایتی عاشق کی طرح چاک گریباں اور نالاں کناں ہیں نہ ان کا محبوب ستم پیشہ و جفاکار ہے۔ ان کی شاعری میں روایتی عشق و عاشقی کا کہیں ذکر نہیں ملتا ان معنوں میں انھوں نے اپنی شاعری میں روایت سے پوری بغاوت کی ہے۔ اردو غزل عشق و عاشقی کے معاملے میں سب سے زیادہ بدنام ہے۔ اس بدنامی نے خاص و عام میں اسے مقبولیت بھی بخشی ہے۔ لیکن شمیم کرہانی کے یہاں اس کا ایسا مہذب اور شائستہ انداز ملتا ہے جو عام طور پر اردو شعرا کے یہاں نہیں ملتا۔ انھوں نے غزل کی روایت اور اس روایت کی دولت مندی (Richness)، رچاؤ، تہذیب اور شائستگی کو اپنا فن بنایا ہے۔ اور یہی ان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ انھوں نے روایت سے بغاوت بھی کی ہے اور اس کے حسن و دلکشی سے اپنی شاعری کی کڑیاں بھی جوڑی ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں نئی تشبیہات، استعارات اور کنایوں کا حسن بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی۔ ان کے یہاں زندگی حسین

پُر مسرت دلکش اور پُر امید ہے۔ ان کا رجائی لب و لہجہ ان کی شاعری پر محیط ہے۔ لیکن زندگی کا ایک حقیقی پہلو تڑپ، غم، ناکامی اور شکست بھی ہے۔ زندگی کا اصلی حسن ان دونوں پہلوؤں کی وجہ سے ہے۔ شمیم کرہانی کی غزلوں میں یہ دونوں پہلو ملتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں شکست ہے شکست خوردگی نہیں، غم ہے غم پرستی نہیں۔ آنسو ہیں مایوسی نہیں۔ اس لئے انھیں یہ دنیا صرف عزیز ہی نہیں بلکہ بہشت سے زیادہ حسین ہے۔ وہ غموں میں منھ نہیں بسورتے، شکست سے مایوس نہیں ہوتے بلکہ اسے بھی زندگی کی ایک دولت سمجھ کر دامن میں رکھ لیتے ہیں۔ وہ حُسن سے محبت کرتے ہیں اور چونکہ زندگی ان کے لیے سب سے زیادہ حسین ہے اسلیے وہ انھیں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ ان کی شاعری کا یہی پہلو ان کی خصوصیت ہے جو ان کی شاعری میں توانائی اور حسن و مسرت کی ایسی تہہ نشیں لہریں پیدا کرتا ہے جن کا اثر ذہنوں پر دیر تک قائم رہتا ہے۔ ان کے یہ چند شعر ان کے فن کی خصوصیات کے اظہار کے لیے کافی ہیں۔

کام آئے گی یہ دولت کل جشنِ بہاراں میں
دامن کو بچا لینا خوشبو جو صبا مانگے

گرا تھا جام نہ ٹوٹا تھا کوئی آئینہ
شکستِ دل کی بھلا آپ کو خبر کیوں ہو

اس آگ کا اک شعلہ دنیا کے لیے کافی
اک عمر سے جلتے ہیں جس آگ میں ہم تنہا

ہر ایک ذرے نے روکا تھا گفتگو کے لیے
خموش اٹھ کے چلے تھے جو کوئے جاناں سے

نگاہِ دوست نے کچھ رنگ بھر دیے ورنہ
حیات اک ورقِ سادہ رہ گئی ہوتی

اک بات کا جواب ملا بھی تو کیا ملا
کتنے سوال تھے جو نگاہوں میں رہ گئے

تم نے پورے نہ کیے شام و سحر کے وعدے
تم پہ کچھ وقت کے الزام ابھی باقی ہیں

کیا کریں جا کے ستاروں کی فضاؤں میں شمیم
اس زمیں پر بھی بہت کام ابھی باقی ہیں

بیٹھے ہیں آج دشتِ جنوں میں شکستہ پا
کل رہ گزارِ گل میں رفیقِ صبا تھے ہم

یادِ ماضی، غمِ امروز، امیدِ فردا
کتنے سائے مرے ہمراہ چلا کرتے ہیں

تمام خار ہی گل ہیں کہ دشتِ غربت ہے
بہار کچھ اور ہیں اس جانِ نوبہار کے نام

بہشت سے بھی زیادہ حسیں نظر آئی
وہ سرزمیں جو مآلِ گناہِ آدم ہے

جنوں سہی دل کی یہ تمنا مگر تمنا ہے کیا کریں ہم
کہ تیری سادہ ہتھیلیوں پر حنا کے نقش و نگار دیکھیں

کوئی تو شکوہ کریں اپنی تیرہ روزی کا
چلو کہ دھوپ میں رکھیں جلا جلا کے دیے

شمیم کرہانی کی غزل کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سکون نہیں، بلکہ حرکت اور نمو پذیری ہے۔ اپنے عہد کے احساس و شعور، شکست و ریخت اور بدلتی ہوئی قدروں کو اس نے اپنے اندر جذب کیا ہے اور اس کی اچھائیوں کو پیش کیا ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس جب اردو شاعری میں جدیدیت، فرد کی تنہائی، شناخت، داخلیت اور اظہار کا چرچا اور شاعری میں نئی علامتیں اور ذاتی کرب کا اظہار بڑھا تو

انھوں نے بھی اس رجحان کا مطالعہ ہمدردی سے کیا۔ ہر نئی چیز نوری طور پر نہ کلیتاً قابلِ قبول ہوتی ہے اور نہ قابلِ مذمت۔ وقت کے نشیب و فراز ہی اس کی کسوٹی ہیں جس پر چڑھ کر کھرا اور کھوٹا الگ ہو جاتا ہے۔ شمیم کرہانی نے زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں اور نئے احساس و شعور میں جو باتیں زندگی اور حقیقت سے تعلق رکھتی تھیں اور جو ہماری سماجی قدروں کے ایک جز کی حیثیت یا تبدیلیوں کی شکل میں آئی تھیں انھیں قبول کیا اور جو باتیں محض داخلیت پر مبنی اور مصنوعی تھیں ان کی مخالفت کی۔ ان کی غزلوں میں نیا لب و لہجہ، انداز اور جدید حسیت کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن زندگی کی حقیقتوں اور مسائل کے سلسلے میں ان کا APPROACH بیمار ذہنوں کا نہیں ہے۔ وہ ایک کھلا ہوا ذہن، وسیع نگاہ اور گہرا مشاہدہ رکھتے تھے۔ آج کے مسائل کو انھوں نے کس طرح دیکھا اور محسوس کیا تھا ان کے ان اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے ؎

کبھی کرو تو اندھیری گلی کا نظارہ
نہ جانے کتنے اجالے ملیں گے آوارہ

نہ پرسشِ غمِ دوراں نہ شرکتِ غمِ دل
ملا ہجومِ بشر میں بھی ہر بشر تنہا

کتنی مصروف ہے اس دور کے شہروں کی حیات
ساتھ رہ کر بھی رہا کرتے ہیں تنہا ہم لوگ

ہوائے صبح سے خاطر شگفتہ ہوتی ہے
پڑے ہیں لوگ مگر کھڑکیوں کو بند کیے

ان اشعار میں ہماری آج کی شہری زندگی کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آج بڑے شہروں میں جو مصروفیت وہاں کی زندگی میں جو بھاگ دوڑ اور تناؤ ہے، انسان کی فکریں اور زندگی کا جہاد جتنا بڑھ گیا ہے، وہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کا اظہار ان اشعار میں بھی ملتا ہے لیکن حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے اور نہ زندگی کو صرف اداسی، کرب اور تنہائی تک محدود کیا جا سکتا ہے جس کا اعتراف اور جس کی مثال شمیم کرہانی کی پوری شاعری ہے۔

★

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ "نیا دور" کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجۂ ذیل تفصیلات شایع کیے جاتے ہیں

(۱) مقامِ اشاعت	لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت	ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری اشوک ڈر۔ ہندوستانی۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ اترپردیش، الٰہ آباد۔
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ	شری روی موہن سیٹھی۔ ہندوستانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش۔ لکھنؤ۔
(۵) اڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری خورشید احمد۔ ہندوستانی۔ اڈیٹر، نیا دور، محکمۂ اطلاعات۔ لکھنؤ۔
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔	نیا دور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کے ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں روی موہن سیٹھی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) روی موہن سیٹھی (پبلشر)

جعفر عسکری

درخشندہ ستارہ

(مرحوم خالو جان کی یاد میں)

بجاتا تھا شعر و سخن کا نقارہ
اجالوں کا رہبر درخشاں ستارہ
جو شاخِ سخن سے جنوں خیز اصوات و نغمات کے حرف کو دے رہا تھا معانی
جو دریائے فکر تغافل کی امواج کو دے رہا تھا شعور و نظر، فکرِ نو کی روانی
وہ امن و اماں کا پیمبر شرافت، متانت، شجاعت کا ہادی
وہ دورِ غلامی میں جس نے اسیرانِ حق کو ہر اک مورچے سے صدا دی
جو افکارِ تازہ کی موجوں پہ تھا موج زن آگہی کے سفینے کی صورت
جڑا تھا جو احساس و جذبات کی انگشتری میں درخشاں نگینے کی صورت
عطا جس نے کی ذہن کی سرد مہری کو جذبے کی شدت، عقیدت کی گرمی
زمینِ سخن سخت تھی اس نے بخشی تفکر کی دولت، تغزل کی نرمی
تھی کی جس نے رخشِ زبان و بیاں پر شب و روز شعر و سخن کی سواری
رہا زیست کے آخری مرحلوں تک جو اک باعمل فکر و فن کا پجاری
کیا انجمن ہائے تیرہ کو جس نے درخشاں خیالات سے پارہ پارہ
اجالوں کا رہبر درخشاں ستارہ

عابد کرہانی

سفر تمام ہوا اور ہم رکے بھی نہیں

[گھر سے جامعہ ملیہ کے قبرستان تک والدِ مرحوم حضرت شمیم کرہانی کے آخری سفر کا ایک تاثر]

سفر عجیب تھا، چل تو رہے تھے لوگ مگر
یقیں کسی کو نہیں تھا کہ وہ سفر میں ہے
سمجھ رہے تھے سبھی، خواب اک نظر میں ہے

سفر کی شرط" : کہ کاندھوں پہ بوجھ اٹھائے چلو!
وہ بوجھ جس نے ہزاروں کے بوجھ اٹھائے ہیں
جسے اتارنے سب لوگ آج آئے ہیں"

ہماری قطعِ مسافت میں ایسی تیزی تھی
کہ یاد ہی نہیں آتا ہے راہ میں کیا تھا
ہمارے ذہن تھے ساکت کہ فاصلہ ہی نہ تھا

ابھی چلے بھی نہیں تھے کہ ہم پہنچ بھی گئے
قدم رکے بھی نہیں تھے کہ پھر پکارا گیا
کوئی یہ زور سے چیخا" سفر تمام ہوا"

سفر تمام ہوا اور ہم رکے بھی نہیں!

حضرت شمیم کرہانی

سید علی شبّر حسینی

کیا کہوں کرب و درد پنہانی
ہے خموشی بھی مرثیہ خوانی
جان ہے تن میں جیسے زندانی
رُوح تک اب ہے دل کی ویرانی
ہوئے رخصت شمیم کرہانی

جن سے رفعت مدار تھی دلّی
مرکزِ اعتبار تھی دلّی
کل کہ جشنِ بہار تھی دلّی
آج ہے محوِ اشک افشانی
ہوئے رخصت شمیم کرہانی

کیا بجھے لطف و التفات کی پیاس
دل پریشاں ہے مضطرب ہیں حواس
سارا ماحول ہے اداس اداس
غم سے نبضوں میں خون ہے پانی
ہوئے رخصت شمیم کرہانی

عکسِ گل[1] میں لیے بہارِ چمن
برق و باراں[2] میں زندگی کی پھبن
جیسے اک حرفِ نیم شب[3] وہ سخن
وہ تلاشِ سحر[4] وہ سیرانی
ہوئے رخصت شمیم کرہانی

امرِ حق کا سرور ساتھ لیے
صبحِ فاراں[5] کا نور ساتھ لیے
بوئے ترابی[6] شعور ساتھ لیے
ذوالفقار[7] اس کا جوشِ ایمانی
ہوئے رخصت شمیم کرہانی

امن تھا صلح و آشتی تھا وہ
تنِ مردہ میں زندگی تھا وہ
گھپ "اندھیرے"[8] میں روشنی تھا وہ
روشنی اس کی اس کی تابانی
ہوئے رخصت شمیم کرہانی

خدمتِ فکر و فن نہ بھولیں گے
تیرا ذوقِ سخن نہ بھولیں گے
کبھی اہلِ وطن نہ بھولیں گے
تیرا عزم و شعورِ قربانی
ہوئے رخصت شمیم کرہانی

صاحبِ دل تھا باخبر تھا وہ
اہلِ بینش میں دیدہ ور تھا وہ
مردِ فن کار و باہنر تھا وہ
اس کی رگ رگ میں دردِ انسانی
ہوئے رخصت شمیم کرہانی

بیقراری سی بیقراری ہے
فکرِ لفظ و بیاں پہ بھاری ہے
ایک سکتہ زباں پہ طاری ہے
کیا غزل اور کیا غزل خوانی
ہوئے رخصت شمیم کرہانی

ہر نفس راہِ زیست میں ہے وبال
باقر[9] و عابد[10] و مراد[11] کا حال
جیسے ہوں کشتۂ غمِ پامال
لٹ گیا گھر بسی ہے ویرانی
ہوئے رخصت شمیم کرہانی

شاعرِ نکتہ داں خموش ہوا
نازِ فکر و بیاں خموش ہوا
اعتبارِ زباں خموش ہوا
کیا کرے آہ اب غزل خوانی
۱۹۷۵ء
ہوئے رخصت شمیم کرہانی

---

۱ تا ۸ حضرت شمیم کی تصانیف ۹ تا ۱۱ صاحبزادگان

شمیم کرہانی ـــــ کی ..... قومی شاعری

ـــــ وسیم اعظمی ـــــ

اردو میں قومی شاعری کا تصور کوئی نیا نہیں۔ لیکن سن ستاون کی تحریک آزادی کی ناکامی نے اس تصور کو ایک نیا شعور و احساس ایک نگ و آہنگ اور ایک نئی سرمستی و سرشاری عطا کر دی۔ اس تحریک کی ناکامی کے بعد ہندستانی عوام انگریزوں کی نظر میں غدار ہو گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں انھوں نے ہر قسم کے مظالم کے دہانے ہندستانیوں پر کھول دیئے تھے اور خود ہندستانیوں نے بھی انگریز حکومت کے خلاف اپنی تحریک تیز کر دی تھی۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں قومیت، وطنیت اور انگریزوں سے بیزاری کا صحت مند تصور لے کر حسرت، چکبست، ظفر علی خاں، سرور اور محروم آئے۔ ان لوگوں نے اس وقت کے سیاسی حالات سے متاثر ہو کر بہت سی سیاسی نظمیں لکھیں جس سے لاشعوری طور پر قومی شاعری کو ایک نیا حسن و نکھار ملا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جلیان والا باغ کے حادثہ جانکاہ سے متاثر ہو کر ادیبوں اور شاعروں کا ایک نیا گروہ ابھرا۔ یہ گروہ سیاسی طور پر اپنے پیش روؤں کا پرتو تھا لیکن جدوجہد یا تحریک کا جذبہ اس میں ان لوگوں سے کہیں زیادہ تھا۔ جوش، سہیل، فراق، صفی، اور سیماب وغیرہ اس گروہ کے نمائندہ شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں انگریزوں نے ہندستانیوں کے خلاف اپنے مظالم اور بھی تیز کر دئیے۔ اس سے متاثر ہو کر ہماری قومی شاعری کو مجاہد ادیبوں اور سرفروش شاعروں کا ایک اور گروہ ملا، یہ گروہ اپنی فکری اور تخئیلی صلاحیتوں کے اعتبار سے تحریک آزادی اور قومی شاعری کا سب سے اچھا اور کامیاب گروہ تھا، اس دور کے نمائندے شاعروں اور ادیبوں میں شمیم، زیدی، جعفری، مجاز، مخدوم اور فیض وغیرہ شمار ہوتے ہیں۔ یہ گروہ نظر اور نظریئے میں اتنا سخت تھا کہ قید و بند کی صعوبتیں بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں بلکہ حشر و نشر کی لذت آشنائی اور فکر و نظر میں مزید پختگی ہی دے گئیں۔

تحریک کے اس دور میں ہمارے قومی شاعروں اور ادیبوں نے دولت کی مساویانہ تقسیم کا مطالبہ کیا اور سرمایہ داری و جاگیردارانہ نظام کے خلاف نعرہ جہاد بلند کرنا شروع کیا۔ شمیم نے بھی اپنے منفرد طرز فکر اور اچھوتے اسلوب سے اس مطالبے کی حمایت کی اور بہت جلد اپنا ایک مقام بنا لیا۔ نظر اور نظریے کی پختگی، زبان و بیان پر مکمل ندرت و اسلوب نگارش کے اچھوتے پن کا ہی نتیجہ ہے کہ شمیم نے تحریک آزادی کی مکمل تاریخ بالخصوص پہلی جنگ عظیم کے بعد کی تحریک آزادی کے تمام مرحلوں کو شاعری کے تمام رموز و نکات کے ساتھ اپنی شاعری میں جذب کر لیا ہے اور اپنی قومی شاعری کو تحریک آزادی کی شاعری بنا دیا ہے۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں انگریزوں نے ایک مرتبہ پھر قوت کے زور پر تحریک آزادی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح ہندستان کی تحریک آزادی کے لیے یہ دور نہایت ہی اہم اور بعض اعتبار سے نازک ترین تھا۔ اسی دور میں اتحادی طاقتوں کے طرز فکر سے متاثر ہو کر ہمارے بہت سے تحریک کے حامی ادیبوں اور شاعروں کی فکری صلاحیتیں مجہول ہونے لگی تھیں اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی قومی دھارے سے الگ ہو گئے تھے۔ تحریک کے اس نازک ترین مرحلے میں بھی تحریک کی حامی اگر کوئی آواز فضاؤں میں جدوجہد کے نغمے بکھیر رہی تھی تو وہ شمیم کی آواز تھی، شمیم کی یہ آواز اس لئے اور

بھی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ دور جہاں تحریک کی کارکردگی کے نقطۂ نظر سے اہم تھا وہیں ادب، ادیب یا ادبیت کے لئے بھی پرآشوب تھا کیونکہ اس دور میں ادیبوں کے ایک مخصوص گروہ میں شامل ہونا ہی ترقی پسندی اور فکری بلندی کی ضمانت تھا، بہر حال شمیم پامردی سے اس پرآشوب دور کا مقابلہ کرتے رہے اس دور میں انھوں نے اپنے نظریے، تجربے، مشاہدے اور منفرد اسلوب کا مکمل فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز بیزاری کا ایک نیا تصور پیش کیا اور ایسی اندوہناک و تیز و تند نظمیں کہیں کہ جنھیں قابل ضبطی سمجھا گیا۔ اس دور میں شمیم کا انگریز بیزاری کا تصور اتنی وسعت اختیار کر چکا تھا کہ مذہبی تقاریب پر لکھی گئی نظمیں بھی اسی بیزاریت اور تلخی و تندی میں ڈوبی ہوئی ملتی ہیں۔ ان کی نظم "پاک ہولی" اسی قبیل کی ایک نظم ہے۔

تحریک کے ایک موڑ پر بعض سمتوں سے تقسیم ہندستان اور قیام پاکستان کا تصور پیش کیا جانے لگا، اور دو قومی نظریے کی تبلیغ کی جانے لگی شمیم کو قومیت کے اس تصور نے بہت ہی کربناک بنا دیا، اس موقع پر انھوں نے پاکستان جانے والوں سے مخاطب ہو کر ان کی سیاسی غلطیوں اور دو قومی نظریے کی فریب کاریوں کو ان پر آشکارا کیا یہی وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے شمیم کو قومی شاعری میں "ایک اضافہ" کے درجہ سے نکال کر معماروں کی صف میں لا کھڑا کیا

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے بعد کی قومی شاعری کی نمائندگی بعض اعتبار سے شمیم کو حاصل ہے۔ شمیم بھی کرہان کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ضرور ہوئے مگر انھوں نے بھی دیہاتی زندگی کو بہت نزدیک سے دیکھا اور دیہاتیوں اور مزدوروں کے کراہتے چہروں کو قریب سے پڑھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تر ہمدردیاں مزدوروں اور سماج کے نچلے طبقے کے ساتھ ہیں وہ مظلوم کے جھونپڑوں کو تنکے فراہم کرتے ہیں اور مظلوم کے ہاتھوں میں تیشہ و کدال دیتے ہیں۔ اس طرح شمیم نے جہاں غیر ملکی اقتدار کے خلاف آواز بلند کی وہاں ملک کی غربت اور افلاس پر بھی ان کا دردمند دل تڑپ اٹھا اور دبے کچلے انسانوں کے دکھ درد کو انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

یوں تو شمیم کی ساری نظمیں انتخابی شان رکھتی ہیں مگر ذیل میں ان کی بعض نظموں کے منتخب اشعار پیش کیے جا رہے ہیں۔ شمیم صاحب اپنی ایک نظم "جگادا" میں نئی نسل سے مخاطب ہیں ؎

جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال
جشن بپا ہے موت کے بن میں
حشر عیاں ہے صحن چمن میں
آگ لگی ہے باغ وطن میں
امن کی راہ نکال
جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال
ٹوٹ پڑا ہے ظلم کا لشکر
گرم ہے قتل و غارت گھر گھر
کیسے بچے گی عصمتِ مادر
کھلتے ہیں سب کے بال
جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال
دھوپ میں مزدوروں کے دل ہیں
چین میں کیسے اہل دول ہیں
عرش سے اونچے شیش محل ہیں
ہاتھ میں تول کدال
جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال
قوم کا دم بھرنا ہی دوا ہے
فرض ادا کرنا ہی وفا ہے
دیش سہیجے مرنا ہی بقا ہے
میان سے تیغ نکال
جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال

"قومی گیت" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم کام کے نغمے گاتے ہیں، بیکار ترانہ کیا جانیں
جو صرف عمل کے بندے ہیں وہ بات بنانا کیا جانیں
رگ رگ میں لہو کو گرماتے، جاتے ہیں وطن کی جے گاتے
ہم عہد جوانی کے ماتے، بوڑھوں کا زمانہ کیا جانیں
طوفان میں کشتی کھیتے ہیں، کہساروں سے ٹکر لیتے ہیں

ہم جنگ میں سر دیتے ہیں، ہم پاؤں ہٹا ناکیا جانیں
افلاس کے مارے بندوں کے، کس طرح بلکتے ہیں بچے
جو دیکھ رہے ہیں آنکھوں سے، وہ جشن منا نا کیا جانیں
بے خوف چلے سنگینوں پر، اور روک لی گولی سینوں پر
لکھا ہے ہماری جبینوں پر، ہم سر کو جھکا نا کیا جانیں

تحریک آزادی کے آخری دور میں ۱۹۴۲ء میں جب مہاتما گاندھی کی گرفتاری سونی رات میں عمل میں آئی تھی تو شمیم نے اس وقت "کچھ دیر ذرا سو لینے دو" کے عنوان سے ایک نظم کہی تھی۔ آپ بھی اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

تم جس جسے لے جاتے ہو، وہ درد کا مارا ہے دیکھو
مظلوم اہنسا کا حامی ہے بے بس دکھیارا ہے دیکھو
بے چین سا اس کی آنکھوں میں، پچھلے کا تارا ہے دیکھو
کچھ دیر ذرا سو لینے دو

آیا ہے عمل کی وادی سے، دن بھر کا تھکا ماندہ ہارا
افکار کے کانٹوں کا چھیڑا، آلام کی آندھی کا مارا
وہ جلتی ریگ تھی صحرا کی، لیٹا ہے ابھی یہ دکھیارا
کچھ دیر ذرا سو لینے دو

کچھ خاک پڑی ہے ماتھے پر، کچھ گرد جمی ہے ماتھے پر
تشویش کی نیلی شکنیں ہیں، سنولائے ہوئے گالوں پر
ٹھنڈک بھی نہیں آنے پائی، تلوؤں کے تپکتے چھالوں پر
کچھ دیر ذرا سو لینے دو

ایک اور نظم جو سن ۱۹۴۲ء کی تحریک سے متاثر ہو کر جو نظم "طوفان" کے عنوان سے لکھی گئی تھی اس کے چند بند بھی ملاحظہ ہوں:۔

تھی آس ہمیں جس طوفان کی، لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا
مظلوم کی آہوں کا بادل، ظالم کے جہاں پر چھا ہی گیا
پربت سے راس کماری تک خونی پرچم لہرا ہی گیا
...... لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

سوئی ہوئی ہلچل جاگ اٹھی، مجبور کے دل کی آہ لیے
کھوئی ہوئی بجلی کوند پڑی، مزدور کی تلخ نگاہ لیے
انساں کا ستم سہتے سہتے، انسان کا دل گھبرا ہی گیا
...... لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

مدت سے فضا چپ چپ سی تھی، آخر کو وہ سناٹا ٹوٹا
سینوں سے نیا کہرام لیے، جذبات کا فوارہ چھوٹا
اک خون کا بادل لہرایا، لہرا کے لہو برسا ہی گیا
...... لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

ہنگامۂ محشر کے ساغر میں، تسکین دل و جاں کی مے لے کر
اک زہر سے دھوئے پیالے میں، امرت سی گلابی شئے لے کر
وہ کالا ناگ بغاوت کا، بانبی سے نکل کر آ ہی گیا
...... لو آج وہ طوفاں آ ہی گیا

"روشن اندھیرا" کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بن گئی تھی سرزمین ہند میدان قتال
زندگی نے زندہ رہنے کا اٹھایا تھا سوال
تھا زبانوں پر یہ نعرہ آشیاں کو چھوڑ دو
چھوڑ دو اے غاصبو، ہندوستاں کو چھوڑ دو
اس صدا نے چوٹ پہنچائی ستم کے ناز پر
چھا گئیں توپیں گرج کر درد کی آواز پر
موت کا پرچم فضا کے دوش پر لہرا گیا
زندگی کے صحن میں غم کا اندھیرا چھا گیا
اس اندھیرے میں گھروں کی روشنی لوٹی گئی
موت نے خوشیاں منائیں زندگی لوٹی گئی
چھاؤنی ظالم لٹیروں کی پڑی تھی سامنے
لاج ستیا کی جھکائے سر کھڑی تھی سامنے
بے ردا تھی عزت مسلم ہجوم عام میں
سر برہنہ کارواں جیسے دیار شام میں
آبرو کا چاند عیب آشوب کے ہالوں میں تھا
اپنا بھائی بھی تماشا دیکھنے والوں میں تھا
تھا وطن آفت میں یاران وطن دیکھا کیے
آشیاں لٹتا رہا اہل چمن دیکھا کیے

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

نذرانۂ عقیدت

درشن سنگھ دُگّل

تھا شمیم نکتہ داں، خوش خلق، خوش دل، نیک خو
اس نے ہر ظلمت میں کی صبحِ وفا کی جستجو

لالہ و گل کا تبسم اس کے شعروں سے عیاں
"برق و باراں"[1] کا تلاطم اس کے نغموں میں نہاں

برق و باراں ہی کی حاجت تھی سخن کے واسطے
"برق" شاہی کے لیے "باراں" وطن کے واسطے

دیکھ لی اس نے غلامی کی سیاہی میں سحر
اس لیے آیا اندھیرا بھی اسے روشن نظر

نغمے وہ گائے، شبِ غم کا سویرا ہو گیا
عزم یوں محکم رہا، "روشنی نے اندھیرا"[2] ہو گیا

اور جب ہندوستاں کو صبحِ دل شادی ملی
مسکرانے کے لیے پھولوں کو آزادی ملی

خندۂ صبحِ بہاراں، بجامِ مُل آیا نظر
اس لبِ شعر آفریں پر "عکسِ گل"[3] آیا نظر

حاصلِ عرفان و مستی اس کا "حرفِ نیم شب"[4]
وجد میں آتے ہیں جس کو پڑھ کے خاص و عام سب

اس کی تخئیلِ جواں میں رفعتِ کوہ و دمن
اس کے افکارِ حسیں میں جلوۂ گنگ و جمن

یوں تو ہر اک دل وطن کے عشق سے لبریز تھا
اس کے مینا میں یہ بادہ کچھ زیادہ تیز تھا

تھا وہ شیدائے وفا، اخلاص کا دیوانہ تھا
اس کا دل مہر و محبت کا عبادت خانہ تھا

ٹوٹتا اس کے سخن سے کیوں کسی کے دل کا جام
وہ خیالِ خاطرِ احباب رکھتا تھا مدام

صلحِ کل پیغام اس کا، آشتی اس کی نوا
اس کا دل تھا وحدتِ دیر و حرم سے آشنا

شمعِ مسجد تھی کہ مندر کا چراغِ شام تھا
ہر دیے سے روشنی لینا اسی کا کام تھا

باوجود علم و دانش خاکساری اس قدر
سرخمیدہ ہی رہا کرتی ہے شاخِ باردر

وقت سے محوِ سخن، ہنگامہ آرائی سے دور
وہ رہا کرتا تھا تنہائی میں تنہائی سے دور

بندۂ حضرت علی تھا، صاحبِ ایمان تھا
جو مکمل تھا ہر اک پہلو سے وہ انسان تھا

وہ مرا استاد، میرا ہم نوا، بندہ نواز
جس نے مجھ پر وا کیے شعر و سخن کے لاکھ راز

واقفِ اسرارِ دل، رمز آشنائے شعر و فن
زمزمہ اس کا تھا افکار و معانی کا چمن

اس کی بزم آرائیاں تھیں اک طلسمِ رنگ و بو
دل نشین و دل نواز و دل رُبا، ہر گفتگو

ہے رضا افسردہ خاطر، اور آزردہ خمار
رنج میں استاد کے ہیں سب کی آنکھیں اشکبار

ہے لبوں پر درشن و جاوید کے اس کا ہی ذکر
فکر میں ڈوبا ہوا ہے "حلقۂ اربابِ فکر"[5]

ہو سدا درشن میسر اس کو جنت کی نسیم
نکہت افشاں سارے عالم میں ہوں افکارِ شمیم

---

[1] تا [4] حضرت شمیم کرہانی کے شعری مجموعے [5] دہلی کی ایک ادبی انجمن جس کے حضرت شمیم صدر تھے (دُگّل)

شمیم کرہانی

فن اور شخصیت

ایس۔ایم۔عباس

تجھ سے خفا ہیں نکتہ چیں تو نے شمیم نکتہ داں
بارش سنگ و خشت میں شیش محل بنالے کیوں

اور بارش سنگ و خشت "میں "شیش محل" بنانے والا شمیم زمانہ کی ستم ظریفیوں اور حالات کی کرم فرمائیوں سے تنگ آکر آخر یہ کہتا ہوا رخصت ہوا ہے

شمیم غنچۂ دل کھلا، نہ ملی حیات کو روشنی
یہ سحر تو اور کسی کی ہے، یہ سحر ہماری سحر نہیں

اعظم گڑھ کی سرزمین پر قدرت کے عظیم فیضان کا ذکر کرتے ہوئے اقبال سہیل نے بجا طور پر یہ فخر فرمایا ہے ؎

اس خطۂ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلّی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں کا ہوتا ہے وہ نیرّ اعظم ہوتا ہے

ان عظیم، بلند اور مقدس ہستیوں میں جو اس خطۂ ارض پر ابھریں اور آسمانِ علم و ادب پر جگمگا اٹھیں انھیں میں شمیم کرہانی بھی اپنا ایک بلند و ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

یقینی طور پر شمیم ان خوش قسمت شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اپنی عظمت اور بلندیوں کے نشانات دیکھے ہیں۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں پنڈت نہرو نے ان کی ڈائری میں یہ عبارت تحریر کی تھی:

" شاعر کی زندگی بھی شعر کی مانند ہونی چاہیے۔ شمیم کرہانی نے ہند کی آزادی کا نغمہ گایا ہے، امید ہے کہ یہ نغمہ جاری رہے گا اور شاعر اس آزادی سے لطف اندوز بھی ہوگا"[1]

بلاشبہ شمیم نے جی کھول کر آزادی کے نغمات گائے اور ان سے محظوظ ہوئے، انھوں نے وزیرِ اعظم کی فرمائش پر آزادیٔ ہند کا رزمیہ قلم بند کیا۔ کرہانی آزادی کی نعمت کو جانتے ہیں وہ اپنے ملک و قوم کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں، وہ وطن کی خاطر سب کچھ قربان کر دینا چاہتے ہیں، وقت پڑنے پر راستے کی ہر محفلِ عیش و طرب کو ٹھکراتے ہوئے وہ "میدان" میں نکل آتے ہیں:

ناگنوں نے کالے کالے بال لہرائے بہت
مہ وشوں نے گورے گورے گال دکھلائے بہت
مغبچوں نے گورے گورے جام چھلکائے بہت
جا بجا تو دیدہ و دل خود بھی للچائے بہت
سب کو ٹھکرا کر مگر میں آ گیا میدان میں

شمیم ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا ننہال پارہ ضلع غازی پور اور دادیہال کرہان ضلع اعظم گڑھ ہے۔ انھیں اپنے وطن کرہان سے بے پناہ عقیدت ہے۔ گو ان کی زندگی مختلف مقامات پر گزری اور عمر کا ایک طویل حصہ دلّی میں بسر ہوا مگر وہاں کی بارونق محفلیں بھی شمیم کے دل سے وطن عزیز کی محبت کم نہ کر سکیں۔ دلّی نے ان کی قدر فرمائی، انھیں وہاں "سکون کی چھاؤں" ملی، "بہاروں کی رنگ سامانی" میسر آئی مگر "جنوں" کو "بیاباں" یاد آتے رہے اور

---

[1] اصل عبارت انگریزی میں ہے، ترجمہ علی جواد زیدی نے کیا ہے۔

ان کا دل وطن کی محبت میں تڑپتا رہا۔ یہ کسک، یہ درد اور تڑپ شمیم کی زبان سے سنیے ؎

چمن ہے اور بہاروں کی رنگ سامانی
مگر جنوں کو بیابان یاد آتے ہیں
سکوں کی چھاؤں میں ساحل نشیں تو ہوں لیکن
گزر گئے ہیں جو طوفان یاد آتے ہیں
شمیم دل نہیں لگتا دیار دلی میں
غزال وادیٔ کرمان یاد آتے ہیں

ارسطو نے اپنی تصنیف بوطیقا میں لکھا ہے:

"شاعری کا محرک یا تو ایک خداداد فطری عطیہ ہوتا ہے یا دیوانگی کا ہلکا سا اثر۔ اگر پہلی صورت ہو تو انسان ہر طرح کی سیرت کی نقالی کر سکتا ہے اگر دوسری صورت ہو تو اپنی خودی سے اوپر اٹھنا چاہتا ہے اور تصور میں جو چاہے بن جاتا ہے[1]"

شمیم کو قدرت نے شاعری کا فطری جذبہ عطا کیا تھا، بچپن سے ہی ان کے اندر شعر و سخن کا ایک لطیف و پاکیزہ جذبہ موجزن تھا اور یہ شعور وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا گیا، اس سلسلے میں اگر شمیم کی اپنی شاعرانہ طبیعت و مزاج کو کچھ دخل تھا تو بہت کچھ اس کا سہرا اس ماحول کے سر بھی ہے جس میں انھوں نے آنکھ کھولی اور پرورش پائی۔ یہی وہ پہلا اسکول تھا جس نے شمیم کے ذوق کو جلا بخشی اور شعور و آہنگ عطا کیا۔

شمیم ایک شگفتہ دماغ اور سنجیدہ مزاج انسان تھے ان کا ذہن پاکیزہ تھا، ان کی نظر میں بلندی اور دل میں وسعت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شمیم کے یہاں ہمیں نازک و لطیف احساسات ملتے ہیں۔ ان کے اندر فکر و نظر کی گہرائی و گیرائی کا پتہ چلتا ہے۔ انھیں پاکیزہ شعور، انھیں نئے اور صحت مند ذہنی رجحانات کی وجہ سے وہ مختصر سے وقفہ میں عزت و شہرت کے بام عروج تک پہنچ گئے۔ ہند و پاک کے عوام نے شمیم کے کلام کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور معتدد رسائل نے انھیں اپنے دامن میں بڑی عزت سے جگہ دی۔ شمیم نے وقت کے بڑھتے ہوئے قدموں کا ساتھ دیا، زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات اور حالات کے تقاضوں کا ہمیشہ خیال رکھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں نئی ندرت، نئی شگفتگی و سلیقگی، نئی خوبصورتی اور پختگی آتی چلی گئی، یہ فنکارانہ انداز ملاحظہ ہو ؎

شب غم گزار دی ہے ترے غم کی روشنی میں
نہ بجھے چراغ دل کا تو اندھیری رات کیا ہے

شمیم نے بہت سے رازہائے حیات و کائنات کو بھی سمجھا اور ان پر غور کیا ہے۔ انھیں تعمیر و ترقی کے کارواں کو آگے بڑھانے کی جستجو ہے۔ وہ ایک خوش آئند و مطمئن "کل" کے آرزومند ہیں۔ وہ مایوس و تھکے ہوئے قدم کو بھی سہارا دے کر آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ کش مکش حیات سے ذرا بھی ہراساں نہیں ہوتے بلکہ وہ "غم روزگار کی راہ" میں آگے ہی بڑھتے رہنے کا سبق یوں دیتے ہیں ؎

غم روزگار کی راہ میں یہ مقابلے کا اصول ہے
کہ جو دل کہے کہ پلٹ چلیں تو قدم کو اور بڑھائیے

شمیم نے فن کی قدر و منزلت کرنا سیکھا ہے۔ فن ان کے یہاں تمام تر نزاکتوں اور لطافتوں سے گزرا ہے۔ ان کے یہاں نہایت اچھوتے انداز میں فن اور زندگی کی نشانیاں ساتھ ساتھ ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شمیم کی فنکارانہ چابکدستیوں نے اور ان کے پاکیزہ و پختہ ذوق نے ان کے کلام میں بڑا ہی جذب و کیف پیدا کیا ہے اور ان کے ہمعصروں میں انھیں ایک منفرد مقام بخشا ہے ؎

حسن تو حسن لامکاں، قید مکاں میں آئے کیوں
تو نے جبین آرزو، دیر و حرم بنائے کیوں

شمیم نے "حیات" و "ممات" ایسے خشک، سادہ و فلسفیانہ مسائل کو بھی اپنے لطیف انداز بیان میں پیش کیا ہے لیکن ایسے موقع پر وہ ایک عجیب سا تاثر، عجیب سا لمحۂ فکریہ چھوڑ جاتے ہیں۔

حیات سے لے کر موت تک کے طویل سلسلے کو چند الفاظ، دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں شمیم نے کتنی خوبصورتی سے انجام تک پہنچایا ہے۔

---

[1] بوطیقا۔ ترجمہ عزیز احمد

یہ اچھوتا اور دلکش انداز، یہ تاثر و کیفیت، یہ سوز و گداز ان کے فن کا اعجاز ہے ؎

جشنِ حیات ہو چکا، جشنِ ممات اور ہے
ایک برات ہو چکی، ایک برات اور ہے

یہ صحیح ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے مگر ادب کے اندر جہاں حال کی عکاسی ہو وہیں ماضی کا پرتو اور مستقبل کی جھلک بھی دکھائی دینا ضروری ہے، جہاں ادب کو قدم قدم پر زندگی سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے وہیں اس کے اندر تخلیت، واقعیت، جمالیت، واقادیت ، اجتماعیت و انفرادیت کا عنصر بھی ہونا لازمی ہے۔ ایک مفید، صحتمند اور پاکیزہ ادب کی تخلیق تب ہی ممکن ہے جب شاعر و ادیب کی نگاہ اپنے ماضی، حال اور مستقبل سبھی پر ہو اور اس نے عصری میلانات ، وقت کے اہم تقاضوں کو بہت نزدیک سے دیکھا اور محسوس کیا ہو۔ ایک صحت مند اعلا اور پاکیزہ ادب کی خصوصیت یہی ہے اس نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہو، زندگی کے گوناگوں مسائل، حالات کے تقاضوں اور گرد و پیش کے حقائق کو مکمل طور پر اپنے اندر سمویا ہو، حیات کی دھوپ چھاؤں کا جائزہ لیا ہو اور انسانی محسوسات و تجربات کو اجاگر کیا ہو جس کے ساز پر انسانی قہقہے اور سسکیاں دونوں سنی جا سکتی ہوں۔ شمیم نے ادب کے ان بنیادی اصولوں کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے۔ ان کی نگاہ میں ماضی کی عظیم الشان روایتیں بھی ہیں اور حال کی پراگندگیاں بھی۔ انھوں نے ہمیں ادب کی صالح روایتیں بخشی ہیں اور کچھ ایسے اصول بتائے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہم اس مادہ پرستی کے بھیانک عفریت سے نجات حاصل کر سکتے ہیں اور نہ صرف اس پراگندہ معاشرہ کو سکون و اطمینان بخش سکتے ہیں بلکہ ایک پرسکون، پرعظمت مستقبل بھی لا سکتے ہیں۔ "ڈگمگائیں تو قدم اور سنبھل جاتے ہیں" والی بات کو شمیم یوں بتاتے ہیں:

مل جل کے جو پرواز یہ دن رات کریں گے
ایک روز ستاروں سے ملاقات کریں گے
آکاش کی دنیا کو ہمالہ سے چلے ہیں
یہ لوگ جو آندھی میں دیا لے کے چلے ہیں

شمیم انسانی اصولوں کے علمبردار ہیں۔ وہ انسان کی تعمیر و ترقی کے کوشاں ہیں اس لیے وہ انسان کو انسانیت کے اصول اور طور طریقے یاد دلاتے ہیں۔ وہ ہمیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ انسانیت کا کارواں کس قدر دشوار راہوں سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے ارتقا کے "مسافر" سے وہ کہتے ہیں ؎

کون کون کو بھگو یا گیا ہے اشکوں میں
کہ جاوداں تو بنے عہدِ نو بہار کا پھول

شمیم کو انسانی عظمت و سربلندی بھی پیاری ہے وہ انسان کو عزم و عمل کی تلقین کرتے اور اس کے اندر چھپے عظیم امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں گو آلامِ روزگار سے ان کا سینہ بھی داغ دار ہے، لیکن وہ غمِ حیات کی تلخیوں سے منہ نہیں موڑتے بلکہ وہ حالات کے زہر کو جامِ شیریں بنا کر پی لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ زندگی کی مشکلوں، الجھنوں اور زحمتوں سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ ان کا ذوقِ جمال، ان کی ہمت کی بلندی آندھیوں کے سامنے نور کی شمع روشن رکھنے کا عزم رکھتی ہے، وہ بہر حال خوش ہیں اور دنیا کو بھی ہر حال میں مسکرانے کا سبق دیتے ہیں، شمیم کو وہ "دردِ دل" خوشی سے قبول ہے جو ان کو محوِ خواب تمنا کے دل کو دھڑکا دے ؎

جو محوِ خواب تمنا کے دل کو دھڑکا دے
وہ دردِ دل ہے تو وہ دردِ دل خوشی سے قبول

شمیم کے اندر بے پناہ جوشِ عمل ہے وہ حالات کے مہیب اندھیروں میں گم کو بھی تمنا کی شمع جلائے رکھتے ہیں۔ زندگی سے فرار یا بیزاری ان کے نزدیک گناہ ہے۔ وہ تمناؤں کے دامن کو چھوٹا نہیں کرتے انھیں یقین ہے کہ غمِ دوراں کا "اندھیرا" ختم ہوگا اور "منزل" کا سویرا جگمگائے گا۔ یہ عزمِ مستقل کی تلقین، یہ ضبط و تحمل کا انداز ملاحظہ ہو ؎

غمِ دوراں کا اندھیرا ہی پتہ دیتا ہے
اک نہ اک دن مری منزل کا سویرا ہوگا

شمیم کے اندر جذبات کی صداقت و احساس کی گرمی موجود ہے۔ یہ اشاراتی و ایمائی اسلوبِ بیان، یہ عملِ پیہم کی تلقین، یہ حیات

کی ثبت ورجائی پہلوؤں کی نشاندہی ان کی انفرادیت ہے:

چمن کی بات، چمن تک پہنچ نہیں پاتی
کہ آشنا نہیں موسم کے درد سے ہر پھول
گذر ہی جائیں گے جشن خزاں کے دن یارو
ملے گی چھاؤں جنوں کو بھلے ہی ہو ببول
لبوں کو آکے تبسم جگا سا جاتا ہے
قریب ختم ہے شاید غم حیات کا طول

شمیم اخلاق و محبت کا آئینہ ہیں۔ انھیں ہر انسان سے پیار ہے ظلم و جور، تعصب و نفرت، خود غرضی و بیگانگی سے انھیں دلی نفرت ہے۔ ان کی نگاہ فرضی دیواروں کے اس پار بھی دیکھتی ہے۔ وہ دشمن کے ساتھ بھی اخوت و ہمدردی، انسانیت و رواداری کا سبق دیتے ہیں۔ دنیا کے ہر مظلوم کا درد شمیم کا اپنا درد و غم ہے۔ سہ

ہنسو نہ تم رخِ دشمن جو زرد ہے یارو
کسی کا درد ہو، اپنا ہی درد ہے یارو

اس کے ساتھ ہی ساتھ شمیم کے یہاں قومی یکجہتی، مذہبی رواداری اور ملک و قوم کے درمیان مختلف باہمی رشتوں کے استوار کرنے کا ایک عظیم آہنگ بھی سنائی پڑتا ہے۔ شمیم کو پیار و محبت کی باتیں پسند ہیں، وہ امن و آشتی کے دلدادہ ہیں۔ سہ

آؤ چلیں میخانے ہم تم، جام محبت چھلکائیں
شیخ و برہمن کے جھگڑوں میں کیوں ضائع اوقات کریں

شمیم بہت ہی حساس ہیں۔ ان کے نازک آبگینوں پر جب کبھی ٹھیس لگتی ہے تو وہ چھلک چھلک پڑتا ہے۔ آج کی پرہنگام زندگی نے شاعر کو بڑے دکھ پہنچائے ہیں۔ حالات کی مستقل نشتر زنی سے ان کے نازک دل میں نہ جانے کتنے زخم لگائے ہیں کہ باوجود ضبط کے شمیم کے دل کی بات زبان تک آجاتی ہے اور ان کے لہجہ میں بلا کا سوز، بلا کا درد گھل جاتا ہے۔ سہ

سارے جہاں کی شام غم صبح بہار بن گئی
میری سحر کا مسئلہ آج بھی زیر غور ہے

یہ حسرت و یاس بھی ملاحظہ ہو۔ سہ

جس دور کا منشا ہو پیاسوں کو نہ مے دینا
پھر تشنہ لبی میری اس دور سے کیا مانگے

لیکن ان باتوں سے یہ مطلب نہیں کہ شمیم نامساعد حالات سے گھبرا کر صبر و تحمل کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ نہیں شمیم کبھی حالات سے مایوس نہیں ہوتے۔ وہ تو ایک آزاد مرد ہیں۔ انھیں سود و زیاں کی بھی پروا نہیں۔ یہ سیدھی سادی دل میں اتر جانے والی بات ملاحظہ ہو۔ سہ

خیالِ سود نہ اندیشۂ زیاں کوئی
شمیم بھی کوئی آزاد مرد ہے یارو

شمیم نے غزل بھی لکھی اور نظم بھی، ان کی شروع کی نظموں میں بلا کا جوش، تڑپ اور سوز و گداز ہے۔ ان نظموں میں قومی جذبہ کا بے پناہ اثر چھایا ہوا ہے۔ شمیم نے مشاہیر قوم کو اپنا پُرخلوص نذرانہ عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ گاندھی جی کی موت پر ان کی شدتِ غم و الم میں ڈوبی ہوئی نظم۔

"جگاؤ نہ باپو کو نیند آگئی ہے"

ہر حساس دل کو آج بھی خون کے آنسو رلاتی ہے۔ اسی طرح پروفیسر احتشام حسین پر ان کی نظم "جانِ برادر" سادگی و پرکاری، خلوص و محبت کا ایک مرقع ہے جو جذب و کیف۔ درد و غم میں ڈوبا ہوا ہے یہاں شمیم کی ایک نظم "چاندنی" جو میرے پاس عرصے محفوظ ہے اور جسے میں اکثر پڑھ کر محظوظ ہوتا ہوں۔ اس کے چند بند پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ نظم کیا ہے لگتا ہے سلکِ گہر ہے نادر تشبیہ و استعارے، مختلف کیفیات کا رچاؤ اور ندرتِ بیان ملاحظہ ہو:

خشک پتوں کو ہوا چھیڑ کے سو جاتی ہے
میں سمجھتا ہوں کہ قدموں کا ترنم جاگا
ٹوٹتا ہے کوئی تارا تو یہ آتا ہے خیال
جیسے اشکوں کی فضاؤں میں تبسم جاگا
چاند جھاڑی سے ابھرتا ہے تو ہوتا ہے خیال
لے کے اٹھا ہے چھلکتی ہوئی چھاگل کوئی

چھوٹ پڑتی ہے جو تاروں کی تو پھولوں کے قریب
جھلملا اٹھتا ہے رنگین سا آنچل کوئی
اور جب ہاتھ بڑھاتا ہوں میں آنچل کی طرف
تو وہ آنچل شبِ مہتاب میں گھل جاتا ہے
دور بہتی ہوئی ندی کی حسیں موجوں میں
بادباں جیسے کسی ناؤ کا کھل جاتا ہے

اور یہ اختتام دیکھیے:

تھک کے گر پڑتی ہے ویران اندھیرے میں نگاہ
شوق آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے آنسو بن کر
چاند نظروں سے کہیں دور چلا جاتا ہے
چاندنی ذہن میں رہ جاتی ہے جگنو بن کر

کہتے ہیں شمیم مر گئے۔ لیکن وہ ایک فنکار تھے اور فن کار کو کبھی موت نہیں چھو سکتی۔ شمیم نے اپنے فکر و فن سے ادب کو کچھ امانتیں سونپی ہیں زندگی کو کچھ پیغام دیئے ہیں۔ ایسی امانتیں جو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا ہے، ایسے پیغام جسے زندگی کبھی بھلا نہیں سکتی ہے۔ ساحر لدھیانوی کے الفاظ میں۔ ؎

ہونٹ ختم ہو جانے سے پیغام نہیں رک جاتے
جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

★

شمیم کرہانی کی قومی شاعری: (صفحہ ۳۵ کا بقیہ)

بے خبر کہتے تھے غم کی تاب کیا لاؤ گے تم
آگ وہ دہکی ہے جل کر خاک ہو جاؤ گے تم
ان سے کہہ دو بات وہ جن کی ہوا میں کھو گئی
تپ کے سونا بن گئے ہم آگ ٹھنڈی ہو گئی

پاکستان جانے والوں سے شمیم کا اندازِ تخاطب ملاحظہ کریں۔

ہم کو بتلاؤ تو کیا مطلب ہے پاکستان کا
جس جگہ اس وقت ہیں مسلم نجس ہے کیا وہ جا؟
وہ ہمارے پیشوا جو فرد تھے ایمان میں
ان کے مدفن بن گئے کیا غیر پاکستان میں؟
نیش تہمت سے ترے چشتی کا سینہ چاک ہے
جلد بتلا کیا زمیں اجمیر کی ناپاک ہے؟
کفر کی وادی میں ایماں کا نگینہ کھو گیا
ہائے کیا خاک نجس میں شاہ مینا سو گیا؟
گلشن گردوں رہے جس سبز پھلواری کی دھاک
کیا نجس ہے اس کی خاک پاک تیرے منہ میں خاک
دین کا مخدوم جو کلیئر کی آبادی میں ہے
آہ اس کا آستانہ کیا نجس وادی میں ہے؟
ہیں اماموں کے جو روضے لکھنؤ کی خاک پر
بن گئے کیا تو بہ توبہ خطۂ ناپاک پر؟
بات یہ کیسی کہی تم نے کہ دل نے آہ کی
کیا زمیں طاہر نہیں درگاہ نور اللہ کی؟
آہ اس پاکیزہ گنگا کو نجس کہتا ہے تو
جس کے پانی سے کیا مسلم شہیدوں نے وضو
نام پاکستاں نے گر تجھ کو پاس دین ہے
یہ گزشتہ نسل مسلم کی بڑی توہین ہے
ٹکڑے ٹکڑے کر نہیں سکتے وطن کو اہل دل
کس طرح تاراج دیکھیں گے چمن کو اہل دل

تحریک آزادی کا یہ عظیم شاعر اپنے نغموں سے تحریک آزادی کو ایک نیا حوصلہ، نیا شعور اور نیا مفہوم دیکر اور جد و جہد کو نئے بال و پر اور قومی ادب کو تعمیری سمت عطا کر کے ۱۹ مارچ ۱۹۷۵ء کو ہم سے جدا ہو گیا......
.....حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

★

الفاظ بہ یاد شمیم

سعد احمد نقوی

غزل کہے کوئی کیسے اداس ہیں الفاظ
غمِ شمیم میں خود بے حواس ہیں الفاظ

نہ مرثیہ، نہ تغزل، غبار ہے دل کا
وفورِ رنج میں دل کی بھڑاس ہیں الفاظ

تمہارے غم میں سیہ پوش ہے عروسِ سخن
تمہارے ہجر میں تصویرِ یاس ہیں الفاظ

تمہاری فکر تمہاری نظر کہاں سے ملے
تمہاری طرح کے اب کس کے پاس ہیں الفاظ

عظیم شخص کہیں تم کو یا بڑا شاعر
تمہارا ذکر ہے اور کم اساس ہیں الفاظ

کہاں سے لائیں تمہیں کس سے پائیں دادِ سخن
اداس ہے دلِ شاعر اداس ہیں الفاظ

سلام کہتے ہیں آنسو شمیم کو نقوی
زبان دل سے اگر ناشناس ہیں الفاظ

شاعرِ فطرت شمیم کرہانی

ضیا امروہوی

وہ شمیم نکتہ داں، وہ شاعرِ فطرت شمیم
وہ سراپائے ترنم، وہ محبت کی نسیم
وہ کلیدِ آگہی وہ نغمۂ امید و بیم
وہ مجسم علم و دانش، صاحبِ خلقِ عظیم
جامعہ کی نمناک میں سویا ہوا ہے وہ بشر
جس کی نقد و فکر سے آگاہ ہے ہر اک نظر

وہ شمیم عکسِ گل، وہ نکہتِ گل کا سفیر
جس کی طینت، جس کی فطرت کی نہیں کوئی نظیر
وہ سحر کا رازداں وہ برق و باراں کا امیر
پیکرِ حسن و نزاکت، درس گاہِ دل پذیر
دلکشش آواز کشتی. دھڑکنوں کی رازدار
شخصیت جس کی رہی ہر عہد میں باغ و بہار

ہو گیا روشن اندھیرا آج حرفِ نیم شب
غفلتِ ہستی سے اہرد کو ملی فرصت ہی کب
چند لمحوں کے لیے آجاؤ افسردہ ہیں سب
کب دلوں کو تھا یقیں ہو جائے گا ایسا غضب
چل دیے کس طرح یوں ہر ایک سے منہ موڑ کر
آپ کہتے ہی نہ تھے تنہا کبھی کوئی سفر

کاظمی بانو کو کب معلوم تھا اپنا نصیب
ہے مراد و عابد و سلمان کی حالت عجیب
شاعرِ رنگیں نوا جاددرقم، شہ کے خطیب
آخرش ناکام ہو کر رہ گئے سارے طبیب
دو گل و جاوید کے چہروں پہ ہے گردِ ملال
اب کہاں حلقہ میں باقی رہ گیا حسنِ کمال

السلام اے تاجدارِ فکر و فن شیریں بیاں
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ وطن ڈھونڈیں کہاں
السلام اے صاحبِ ایثارِ بزمِ دوستاں
رو رہا ہے دل مگر خاموش ہے ہر اک زباں
میں عقیدت کے گہر لایا ہوں اے عالی مقام
آپ کی روحِ مقدس کو عقیدت کا سلام



اُتر پردیش شاہراہِ ترقی پر

نئی حکومت عوام کی فلاح کے لیے کام کرے گی ●●● عوام کی شکایتوں کو دور کرنے کے لیے حکومت پُرعزم ●●● کمزور طبقوں کی امداد کے لیے مزید پانچ اسکیمیں ●●● چیف میڈیکل افسروں اور محرکوں کو نقد انعامات

گورنر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے امید ظاہر کی کہ ریاست کی نئی حکومت جس نے پوری لگن اور جوش خروش کے ساتھ کام شروع کیا ہے، عوام کے اشتراک و تعاون سے اپنے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ بروئے کار لائے گی اور ریاست ترقی اور خوش حالی کے راستہ پر تیز رفتاری سے آگے بڑھے گی۔

ڈاکٹر ریڈی نے جو یوم جمہوریہ کے موقع پر آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ اسٹیشن سے ریاست کے عوام کے لیے اپنا پیغام نشر کر رہے تھے، گذشتہ سال کی کامیابیوں اور اہم واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ ملک کو مستحکم بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہر شہری میں خود اعتمادی پیدا کی جائے تاکہ وہ ملک کو ترقی اور خوش حالی سے ہم کنار کرنے کے عظیم کام میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی یہ خوش قسمتی ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی اس کی وزیر اعظم ہیں جنھوں نے بڑے عزم و حوصلہ کے ساتھ ہماری رہنمائی کی ہے اور ہمیں اپنی منزل کی طرف بڑھنے کے لیے روشنی دکھائی ہے۔

ڈاکٹر ریڈی نے کہا کہ وزیر اعظم کے بنیادی پروگرام نے سماج کے تمام طبقوں کو پورے خلوص اور لگن کے ساتھ مادر وطن کی خدمت کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں پرانی بدعنوانیوں اور غلط کاریوں سے اجتناب کرنا چاہیے اور سماج کے پسماندہ اور اب تک نظر انداز کیے جانے والے طبقوں کی مدد کرنا چاہیے۔

گورنر نے کہا کہ ہمیں اصلاحات آراضی، زرعی پیداوار اور

اس کی توسیع و ترقی سے متعلق ضروریات کی حتی المقدور زیادہ سے زیادہ تکمیل کے لیے یقینی طور پر بندوبست کرنا ہے۔ ہمارے مزدوروں کو پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کے سلسلہ میں بھرپور تعاون کرنا چاہیے اور مالکوں کو مزدوروں کے معیار زندگی کو بہتر بنانے میں ان کی مدد کرنا چاہیے تاکہ پیداوار میں اضافہ کی رفتار بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہ سکے۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم اور سائنس کی توسیع و ترقی اس طرح عمل میں آنا چاہیے کہ طلبا کو اپنی زندگی مفید اور تعمیری بنانے میں اس سے مدد مل سکے۔

گورنر نے کہا کہ حکومت نے گرام سبھا، ترقیاتی بلاک، تحصیل اور ضلع کی سطح کے تمام محکموں کے ملازمین کو اپنے اپنے دائرہ کار میں اپنی پوری صلاحیت کے ساتھ عوام کی خدمت کرنے کی ہدایت کی ہے۔ انھیں ایسا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے کہ وہ اپنے فرائض پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دے سکیں۔

حکومت نے ایک ٹیوب ویل کارپوریشن کی تشکیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے گولوں کی تعمیر کو اولیت دینے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ کچھ ٹیوب ویل بغیر گولوں کے ہیں۔ ایسے چھوٹے کسانوں کے فائدہ کے لیے جنھیں زمین دی گئی ہے، چھوٹے ٹیوب ویل بھی تعمیر کیے جائیں گے۔

گورنر نے کہا کہ اب بھی بہت سے ایسے مسائل ہیں جنھیں ہمیں حل کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج بھی بہت سے ایسے کارخانے ان کے مالکوں کی کمزوریوں کی وجہ سے بند پڑے ہیں۔

بجلی کی قلت صنعتوں کی ترقی میں حائل ہوگئی ہے۔ اگر وقت پر امتحانات نہ ہوئے تو طلبا کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے مسائل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نئی حکومت ان مسائل کو حل کر سکے گی۔

گورنر نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ ہم اس رفتار سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں جس رفتار سے ہم بڑھنا چاہتے تھے۔ پھر بھی یہ ایک اطمینان بخش امر ہے کہ ہم دستیاب وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر ریڈی نے کہا کہ اتر پردیش کا نظم و نسق عوام کے قریب سے قریب تر آنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ حال ہی میں سماج کے ہر طبقہ کا ضلع انتظامیہ کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے لیے کچھ فیصلے کیے گئے ہیں تاکہ نظم و نسق اور عوام کے درمیان کوئی خلیج حائل نہ ہو۔ انھوں نے یوم جمہوریہ کے مبارک موقع پر ریاست کے عوام کو اپنی نیک خواہشات پیش کیں۔

❁ ❁ ❁

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے اتر پردیش کے ان آٹھ افراد کو مبارک باد پیش کی ہے جنھیں قومی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ وزیر اعلا نے یوم جمہوریہ کے موقع پر اعزازات پانے والوں کو ریاست کے عوام کی جانب سے اور اپنی جانب سے تار کے ذریعہ فرداً فرداً مبارکباد کے پیغامات بھیجے ہیں۔

اتر پردیش میں اعزازات حاصل کرنے والوں میں سے ڈاکٹر کے۔ ایل۔ شریمالی، وائس چانسلر، بنارس ہندو یونیورسٹی کو پدم وبھوشن سے اور ڈاکٹر دکماری لال۔ ٹی انجینئر، شری نند کمار اوستھی (لکھنؤ)، شری بشمبھر ناتھ پانڈے، ایم۔ ایل سی (الہ آباد) شریمتی گرہ ڈا ایمرسین (الموڑہ)، شری محمد شفیع خاں، بکل تاجی (بلرام پور گونڈہ)، حکیم سیف الدین احمد (میرٹھ) اور پروفیسر سید بشیر الدین (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کو پدم شری سے سرفراز کیا گیا۔

❁ ❁ ❁

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے یہاں کہا کہ حکومت عوام کی شکایتوں کو فوری طور پر دور کرنے کا تہیہ کر چکی ہے اور اس سلسلہ میں سرکاری ملازمین کی طرف سے فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی تساہلی یا غفلت نہیں برداشت کی جائے گی۔ ریاست کے تمام سرکاری افسروں اور ملازموں کو ہدایا جاری کر دی گئی ہیں کہ وہ عوام کی دشواریوں کو فوراً دور کرنے کا یقینی بندوبست کریں۔

وزیر اعلا نے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے دیہی پروگرام کے تحت یوم جمہوریہ کے موقع پر اپنا پیغام نشر کرتے ہوئے کہا کہ عوام کو اپنی دشواریاں، خواہ وہ لیکھ پال سے تعلق رکھتی ہوں یا پولیس سب انسپکٹر، لائنس مین یا اورسیر یا ٹیوب ویل کے آپریٹر سے، پورے اعتماد کے ساتھ ان کے سامنے پیش کرنے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیے اور اگر یہ افسران ان کی بات کو قابل توجہ نہ سمجھیں تو انھیں اس سلسلہ میں اعلا ذمہ داروں سے رجوع کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ اس پر بھی انصاف حاصل کرنے میں ناکام رہیں تو پھر آپ مجھ سے ملاقات کر سکتے ہیں۔

شری تیواری نے کسانوں کو ان کی پیداوار کی مناسب قیمت دلانے کے سلسلہ میں حکومت کی پیہم کوششوں کا یقین دلاتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ حکومت گنے کی قیمت کے تعین کے ضمن میں مرکزی حکومت، شکر مل مالکوں اور گنا کاشت کاروں سے پہلے سے ہی گفت و شنید کر رہی ہے۔ اور امید ہے کہ آئندہ ۱۰، اور ۱۵ دن کے اندر اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل نکال لیا جائے گا۔ ریاست کی نہروں اور ٹیوب ویلوں کو رات دن چلانے کے لیے احکامات جاری کیے جا چکے ہیں تاکہ کسانوں کو ربیع کی آبپاشی کے لیے کافی پانی دستیاب ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے بجلی کی پیداوار میں بھی اضافہ کیا جا رہا ہے۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی رہنمائی میں گزشتہ دس سال کے عرصہ میں ملک نے جو نمایاں ترقی کی ہے اس کا

ذکر کرتے ہوئے وزیر اعلا نے کہا کہ غیر ملکی جارحیت تباہ کن سیلاب اور سنگین خشک سالی کے سلسلے کے باوجود آج ملک کی معیشت روشن تر ہے اور ہمارا ملک ایک طاقت ور ملک کی حیثیت سے ابھرا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اسی طرح ہماری ریاست نے بھی متعدد کامیابیاں حاصل کی ہیں یعنی آب پاشی کا رقبہ جو ۱۹۶۶ء میں صرف ۷۷ لاکھ ہیکٹر تھا، بڑھ کر ۱۴۷ لاکھ ہیکٹیر، غلّہ کی پیداوار ۱۲۴ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۱۶۴ لاکھ ٹن اور بجلی کی پیداوار ۹۱۰ میگا واٹ سے بڑھ کر ۲۲۱۰ میگا واٹ ہو گئی ہے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت کے دوران اتر پردیش کے لیے مخصوص کردہ مختلف پراجکٹوں کا ذکر کرتے ہوئے شری تیواری نے کہا کہ شاید ان کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے اندر ایک نیا اعتماد اور ایک نیا حوصلہ پیدا کیا ہے جو کسی قوم کی تیز رفتار اور صحت مند ترقی کے لیے اشد ضروری ہے۔

وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کا ذکر کرتے ہوئے شری تیواری نے کہا کہ اس کے تحت چند بنیادی پالیسیاں وضع کی گئی ہیں۔ پروگرام میں بے زمین افراد میں زمین کی جلد از جلد تقسیم، پابند مزدوری کے خاتمہ، دیہی قرضوں کی معافی اور کھیت مزدوروں کی کم سے کم اجرتوں میں اضافہ کا بندوبست کر کے دیہی عوام کو راحت پہنچانے پر خاص زور دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ زمین کی تقسیم کے پروگرام کے تحت ۱۱ لاکھ بے زمین افراد میں دس لاکھ ایکڑ زمین تقسیم کی جا رہی ہے اور حکومت اس قسم کا یقینی بندوبست کرنے کا تہیہ کر چکی ہے کہ زمین پانے والوں کو الاٹ کی گئی زمین کے ہر ایکڑ پر دائمی قبضہ مل جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک خصوصی مہم چلائی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ حکومت نے زمین پانے والوں کو زرعی مقاصد کے لیے قرضہ دینے کی بھی کوشش کر رہی ہے۔ وزیر اعلا نے ان لوگوں سے اپیل کی ہے کہ وہ زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے ان قرضوں کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

شری تیواری نے متنبہ کیا کہ جو افسران اور ملازمین وزیر اعظم کے پروگرام پر عمل درآمد کے سلسلہ میں غفلت کے مرتکب ہوں گے ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔ ایسے ملازمین کو جن کے خلاف اصلاحات آراضی کے عمل درآمد میں جان بوجھ کر کوتاہی کرنے کا ثبوت موجود ہے معطل کیا جا رہا ہے۔

وزیر اعلا نے کہا کہ عوام کے حالات بہتر بنانے کے لیے مرتب کردہ پالیسیوں اور پروگراموں کے بارآور ہونے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ان کو کامیابی اور تیز رفتاری کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کے لیے لوگ آگے آئیں اور اپنا بھرپور تعاون دیں۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ریاستی حکومت نے وزیر اعظم کے معاشی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے سرکاری رقومات (واجبات کی وصولی) ایکٹ کے تحت سماج کے معاشی اعتبار سے کمزور طبقوں کی مدد کرنے کے لیے مزید پانچ اسکیموں کا اعلان حکومت کی چلائی ہوئی اسکیموں کی حیثیت سے کیا ہے تاکہ ادارہ جاتی سرمایہ فراہم کر کے ان طبقوں کی معاشی حالت کو بہتر بنایا جا سکے۔ ان اسکیموں میں بینک آف بڑودہ کی ایک اسکیم اور پنجاب نیشنل بینک کی چار اسکیمیں شامل ہیں۔ بینک آف بڑودہ کی اسکیم کے تحت ضلع شاہ جہاں پور میں دو سال کی مدت میں ۱۵۰۰ قالین بنکروں کو چار فیصد شرح سود پر ۸۰۰ روپیہ کا کاروباری پونجی قرضہ دیا جائے گا۔

پنجاب نیشنل بینک کی چار اسکیموں میں سے ایک اسکیم کے تحت وارانسی شہر میں بینک کی دو شاخیں ریشم کے کرگھوں پر کام کرنے والے ۱۲۰۰ بنکروں کو پانچ سال کی مدت میں سرمایہ فراہم کریں گی۔ اس اسکیم کے تحت ہر بنکر کو ۲۵۰۰ روپیہ کا کاروباری پونجی قرضہ دیا جائے گا۔

ایک دوسری اسکیم کے تحت مذکورہ بینک پانچ سال کی مدت میں وارانسی اور مرزا پور میں قالین سازی کا کام کرنے والے ۲۰۰۰ بنکروں کو ۱۵۰ لاکھ روپیہ کا سرمایہ بھدوہی، مہاراج گنج

مادھوسنگھ اور مرزاپور میں واقع اپنی شاخوں کے توسط سے فراہم کرے گا۔

پنجاب نیشنل بینک کی تیسری اسکیم کے تحت وارانسی میں سنگتراشی کا کام کرنے والے کاریگروں کو بینک کی دو شہری شاخوں کے توسط سے سرمایہ فراہم کر دیا جائے گا۔ اس اسکیم کے تحت تین سال کے عرصہ میں ۳۶۰ کاریگروں کو ۱۰ لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ کا سرمایہ مہیا کرنے کی تجویز ہے۔

بینک کی چوتھی اسکیم کے تحت وارانسی میں کھلونے بنانے والے ۱۰۰۰ کاریگروں کو پانچ سال میں ۳۰ لاکھ روپیہ کا سرمایہ فراہم کیا جاوے گا۔ وارانسی میونسپل حدود میں رہنے والا ہر کاریگر اپنی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لیے ۳۰۰۰ روپیہ کے قرضہ کا مستحق ہوگا۔

ریاستی حکومت نے اب تک مذکورہ بالا ایکٹ کے تحت اتر پردیش میں کام کرنے والے آٹھ لیڈ بینکوں کی ۵۵ اسکیموں کا اعلان ریاستی حکومت کی جاری کردہ اسکیموں کی حیثیت سے کیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ان اسکیموں کے تحت مختلف قسم کی گھریلو اور دستکاری صنعتوں میں لگے ہوئے ۵۸۶۲۰ افراد کو ایک سے پانچ سال تک کی مدت میں ۸۹ ؛ ۱۹۰۶ لاکھ روپیہ فراہم کر کے مستفید کیا جائے گا۔

سماج کے کمزور طبقوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے بینک مزید اسکیمیں تیار کر رہے ہیں جن کا اعلان حکومت کی چلائی ہوئی اسکیموں کی حیثیت سے کیا جائے گا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

وزیر صحت شری پربھو نرائن سنگھ نے یہاں چار میڈیکل افسروں اور دو محکموں کو ریاست میں ۱۵ دن کی خاندانی منصوبہ بندی مہم کے دوران ان کی شاندار کارگزاری پر توصیفی سرٹیفیکٹ اور ۵۰۰۰ روپے کے نقد انعامات دیے۔

سرٹیفیکیٹ اور ایک ایک ہزار روپے کے نقد انعامات پانے والوں کے نام یہ ہیں

ڈاکٹر بی سی جوشی (لکھنؤ) ڈاکٹر کے۔ ڈی مشرا (رائے بریلی) ڈاکٹر ایس بی چترویدی (وارانسی) اور ڈاکٹر چندر وتی (لکھنؤ) اس کے علاوہ محرکوں کو بھی ۵۰۰ روپیہ فی کس کی شرح سے انعامات دیے گئے۔

وزیر موصوف نے اعلان کیا کہ آئندہ ڈپٹی چیف میڈیکل افسروں (خاندانی منصوبہ بندی) کو بھی ان کی نمایاں کامیابی پر ترغیبی انعامات دیے جائیں گے۔ اسی طرح ضلع مجسٹریٹوں کو بھی خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلہ میں بہترین کارکردگی پر انعامات دیے جائیں گے۔ ★

گزشتہ لکھنؤ کی وضعداریاں: (صفحہ ۷ کا بقیہ)

طرح یاد ہے کہ یہ ڈش اس موقع پر بھی آئی تھی جب وہ مرض الموت میں مبتلا تھے اور اسی بیماری میں انتقال فرمایا۔ اسی طرح سید شہنشاہ حسین مرحوم بھی شہر کے کامیاب ترین وکیلوں میں تھے گران کا جامدانی کا انگرکھا، پیچوان حقہ، وسیع دسترخوان اور دو چار مصاحبوں کی حاضرداری اور ان سب کے ساتھ اُن کے انعام و اکرام، خلوص و تواضع اور رفق و مدارات برابر جاری رہے جو لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کے خصوصیات تھے۔ سر وزیر حسن مرحوم شہر لکھنؤ کے باشندہ نہیں تھے مگر انھوں نے بھی آکر اسی شہر کی وضعداری اپنالی تھی۔ وہ دن یاد آتا ہے جب وہ اودھ چیف کورٹ میں چیف جج کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے اور وزیر گنج میں ایک شادی کی تقریب میں تشریف لائے۔ ان کا احترام اسی طرح کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔ اتفاقاً کچھ فاصلے پر سید محمد تقی صاحب نظر آ گئے۔ ان کو دیکھ کر چیف جج نے اپنے وقار و عظمت کو بھلا دیا اور بے تابانہ گلے مل کر اپنے پاس بٹھا کر اسی انداز میں اور اسی طرز کی گفتگو فرمائی جیسی ان دونوں میں اُن کے عہد شباب میں ہوا کرتی تھی۔ ایسی بکثرت مثالیں لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرت کے بارے میں اب تک حافظ میں محفوظ ہیں ان کو یاد کر کے کلیجہ منہ کو آجاتا ہے کہ اب وہ وضعداریاں خواب و خیال ہو گئیں۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

روشنی کے مینار مرتب شہباز حسین شائع کردہ۔ ڈائمنڈ پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔ صفحات ۱۶۰ قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے۔

ہم ایک ایسے وسیع و عریض ملک کے رہنے والے ہیں جو اپنی تاریخ کے ساتھ ساتھ اپنی ان تہذیبی روایات پر بھی فخر کرتا ہے جو صدیوں کا سفر طے کر کے دور حاضر کو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوئی ہیں۔ ان تہذیبی روایات کی تعمیر و تشکیل میں مختلف شعبہ ہائے حیات کے اکابرین نے حصہ لیا ہے۔ کسی نے ہمارے ادبی سرمایے میں اضافہ کیا ہے تو کسی نے سماجی فلاح و بہبود کا علم بلند کیا ہے۔ یہ عمل فنون لطیفہ، دینیات اور علم و دانش کے میدانوں میں بھی جاری رہا ہے۔ اور زندگی کے ان شعبوں میں ذات سے بالاتر ہو کر مادر وطن کے سپوتوں نے ہماری اس تہذیبی اور ثقافتی میراث میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ روشنی کے مینار ایسے ہی تیس اشخاص کے سوانحی خاکوں اور اکتسابات پر مشتمل ہے جنھیں شہباز حسین نے سادہ و سلیس زبان میں ہائی اسکول کے طلبا اور طالبات کے مطالعہ کے لیے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں جن اشخاص کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے ان میں اگر ایک طرف گوتم بدھ، شنکراچاریہ، معین الدین چشتی، نظام الدین اولیا اور گرونانک جیسے مذہبی رہنما شامل ہیں، تو دوسری طرف امیر خسرو، بھگت کبیر، حبہ خاتون، مرزا غالب اور رابندر ناتھ ٹیگور جیسے شعرا و ادبا کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مہاتما گاندھی، سردار پٹیل، ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو کے ساتھ ساتھ سر سید احمد خاں، راجہ رام موہن رائے، بال گنگا دھر تلک، اور دادا بھائی نوروجی جیسے سیاسی رہنما اور مصلحین کے افکار و عمل کو بھی آئینہ دکھلایا گیا ہے۔ یہ سوانحی خاکے باوجود اس کے کہ تشنہ و نامکمل ہیں، اختصار اور تشنگی کے الزام سے اس لیے بری ہو جاتے ہیں کہ یہ ان طلبا کے لیے لکھے گئے ہیں جن کی علمی استعداد ہائی اسکول سے زیادہ نہیں ہے۔ نصابی ضروریات کے پیش نظر کتاب کی زبان سادہ و سلیس رکھی گئی ہے اور حالات و واقعات کی ترتیب و تنظیم اس انداز میں کی گئی ہے کہ آسانی کے ساتھ وہ طلبا کے ذہن نشین ہو جائیں۔ اور وہ اپنے ملک کی تاریخ و تہذیب کے اہم موڑوں سے خاطر خواہ واقف ہو جائیں۔ دور حاضر کے نصاب تعلیم کو اس طرح کی کتابوں کی شدید ضرورت ہے۔ شہباز حسین لائق صد تحسین و مبارکباد ہیں کہ انھوں نے مقتضائے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ایک ایسی کتاب مرتب کی ہے جو قومی اور جذباتی یک جہتی کی طرف ایک مثبت زاویہ نگاہ رکھتی ہے اور آزاد ہندوستان کی موجودہ نسل کو صحت مند نقطہ نگاہ عطا کرتی ہے۔

——— (ملک زادہ منظور احمد)

اکابر تعلیم مصنف: سعید انصاری، شائع کردہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر، نئی دہلی، تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی، صفحات: ۲۴۰ قیمت: بارہ روپے

"تاریخ تعلیم" کے آغاز و ارتقا پر غیر ملکی زبانوں میں تو اچھا خاصا مواد مل جاتا ہے مگر اردو میں اس موضوع پر بہت ہی کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ تھوڑا بہت جو سرمایہ ہمارے پاس تھا وہ ممکن ہے کہ اپنے زمانے کی نصابی ضروریات کو پورا کرنے پر قادر رہا ہو، مگر دور حاضر کے تقاضوں کے ساتھ انصاف کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ ایک جامع اور مکمل تصنیف منظر عام پر آئے جو داستان ماضی بھی ہو اور سرگزشت حال بھی۔ جناب سعید انصاری نے 'اکابر تعلیم' لکھ کر اس کمی کو پورا کرنے کی ایک بہت ہی مبارک اور کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کا آغاز قدیم یونان کے سب سے بڑے معلم افلاطون کے افکار و خیالات کی تعبیر و تفسیر، توضیح و تشریح اور تعریف و تنقید سے کیا ہے۔ اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ مناسب سیاق و سباق میں اس کے تعلیمی نظریات کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے۔ تاریخ تعلیم کا یہ ارتقائی سفر افلاطون سے شروع ہو کر مارٹن لوتھر، جان کومی نیس، لاک، روسو، پیتالوزی، فروبل، جان ڈیوی کے سنگ میل کو چھوتا ہوا، ہندستان کی طرف اپنے رخ کو موڑ دیتا ہے اور رابندر ناتھ ٹیگور اور مہاتما گاندھی کے معتقدات و نظریات پر تمام ہو جاتا ہے اور اس طرح پوری کتاب جستہ جستہ واقعات کے بجائے تاریخ تعلیم کی ایک مسلسل داستان بن جاتی ہے، جس کی ہر کڑی ایک دوسرے سے مربوط نظر آتی ہے۔ مصنف نے ہر چند کہ اس کتاب کا مواد درس و تدریس کے لیے اکٹھا کیا تھا، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ نصابی ضروریات سے بالاتر ہو کر یہ ان قارئین کے مطالعہ کا بھی کام انجام دے سکتی ہے جو امتحان و اسناد کی لعنتوں سے محفوظ ہیں۔ اور حصول علم کو اپنے جذبۂ شوق کی آسودگی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ مواد و معلومات فراہم کرنے میں یہ "تدریسی اور نصابی" زبان استعمال کرنے کے بجائے "علمی اور ادبی" لب و لہجہ استعمال کرتی ہے اور ہمارے دماغ کے ساتھ ساتھ ہمارے دل کو بھی متاثر کرتی ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں "تشریحات" اور "کتابیات" کے ضمیمے خاصے کی چیزیں ہیں۔ جو عام قارئین کو نہ صرف مصطلحات و مسائل کے سمجھنے میں مفید و معاون ثابت ہوتی ہیں بلکہ لغت گردانی سے بھی محفوظ رکھتی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کتاب صرف توضیحی و تشریحی نہیں ہے بلکہ تنقیدی اور تجزیاتی بھی ہے۔ یہ صرف معلومات فراہم کرنے پر قناعت نہیں کرتی بلکہ ان معلومات کا تجزیہ کر کے انھیں تنقید کی کسوٹی پر پرکھتی بھی ہے اور علم و دانش کے معیار و میزان پر ان کی قدر و قیمت کا تعین بھی کرتی ہے۔

——— (ملک زادہ منظور احمد)

پروفیسر ہارون خاں شروانی کی اردو خدمات (ایک جائزہ)

مصنف۔ صادق نوید۔
ملنے کا پتہ: ادبی ٹرسٹ، عابد روڈ حیدرآباد صفحات: ۱۹۶
قیمت۔ پانچ روپے

زیرِ نظر کتاب صادق نوید کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے ایم۔اے (اردو) کے امتحان کے سلسلے میں عثمانیہ یونی ورسٹی کو پیش کیا تھا۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی ملک کے مایۂ ناز مورخ، ادیب اور سیاست داں کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں اس کتاب میں شروانی صاحب کے سوانح، کارنامے اور علمی خدمات کو شرح و بسط کے ساتھ سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی کے آبا و اجداد شمالی ہند کے متمول روشن خیال اور دانش ور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ سرسید کو بھی اس خاندان سے گہرا ربط تھا۔ جب سرسید احمد خاں نے ایم اے او کالج کی بنیاد ڈالی تو ہارون خاں شروانی کے ایک بزرگ موسیٰ خاں شروانی کو اس کا ٹرسٹی مقرر کیا۔ نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی، جو مولانا ابوالکلام آزاد کے مقرب خاص تھے، ہارون خاں شروانی کے رشتے کے چچا ہوتے تھے۔ بہرحال کتاب کے شروع میں مقالہ نگار نے ہارون خاں شروانی کے بزرگوں کے حالات زندگی، ان کی شادی اور اہل و عیال کی تفصیل، عثمانیہ یونی ورسٹی سے وابستگی نظام کالج اور اینگلو عربک کالج سے وابستگی کا حال تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اینگلو عربک کالج کی پرنسپلی کا ذکر کرتے ہوئے مقالہ نگار لکھتا ہے:

"ستمبر میں اینگلو عربک کالج نئی دہلی کے پانچ سال کے لیے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ملک آزاد ہوا تو ملک میں ہر طرف فتنہ و فساد برپا ہوا اور کالج بند ہو گیا۔ ان ناخوشگوار حالات کے تحت ان کو حیدرآباد واپس ہونا پڑا۔" (صفحہ ۳۷ اور ۳۸)

لیکن ص ۳۷ پر ہی نظام کالج سے وابستگی کا بیان کرتے ہوئے مقالہ نگار تحریر کرتا ہے:-

"نظام کالج کی صدارت اور حیدرآباد میں اپنی خدمات سے وہ جون ۱۹۴۶ء میں سبکدوش ہوئے لیکن پھر بھی وہ آرام نہ لے سکے۔"

ان دونوں بیانات میں تضاد نظر آتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جنوبی اور شمالی ہند کے دور افتادہ اداروں میں بیک وقت خدمات انجام دیتا رہے۔ دوسرے لفظوں میں شیروانی صاحب یا تو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک دلی کالج میں تھے یا نظام کالج حیدرآباد میں۔

دوسرے باب میں شیروانی صاحب کے بحیثیت مترجم، بحیثیت مصنف اور بحیثیت مضمون نگار کارناموں کی تفصیل درج ہے۔ اس باب کے بالکل آغاز میں پروفیسر صاحب کی مطبوعات اور مطبوعہ اردو مضامین کی فہرست دی گئی ہے۔ پروفیسر روانی سلاست انگریزی کتب کو اردو کا جامہ پہنایا۔ موصوف کے ترجموں میں سے پہلو تہی کرتے ہیں اور بے حد قربت پائی جاتی ہے۔ وہ ثقیل الفاظ و تراکیب پر قدرت رکھتے ہیں۔ مقالہ جگہ جگہ انگریزی کے عام فہم الفاظ بلا تکلف استعمال کرتے ہوئے تجویز کیا ہے کہ بجائے منسٹری کے ترجمہ پارلی منٹی پر حرف گیری کیا جاتا تو اردو زبان کے مزاج کے ص ۱۷ پر "پارلیمنٹ کا" یا "پارلیمنٹ کے" کا عام ترجمہ "پارلیمانی" کافی رواج پا چکا ہے لیکن میرے خیال میں پارلیمنٹری متبادل الفاظ تجویز کرنا مناسب نہیں۔ اب اس لفظ کے نئے

مقالہ نگار نے پروفیسر شیروانی کی تقاریر اپنے کے لیے پیش کیے ہیں جو فضول اور غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں

کتاب علمی کم ہے اور صحافتی زیادہ۔ شرما

کتاب کی کتابت اور طباعت اوسط درجے کی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر ہارون خاں شروانی کی سوانح لکھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہرحال ضروری ہے۔

(نظر برنی)

نجات کے بعد (مجموعۂ کلام)۔ یوسف ندیم۔

لائبریری ایڈیشن، مجلد ۵ روپے۔ صفحات: ۱۰۸
قیمت: تین روپے۔ ملنے کا پتہ: سرج پبلشرز، حیدرآباد۔

یوسف ندیم حیدرآباد کے نوجوان شاعر، صحافی اور قومی کارکن کی حیثیت سے معروف و مقبول ہیں۔ ان کی شاعری میں ہم کو روایت سے بغاوت عصری مسائل کی ترجمانی اور چونکا دینے والا لہجہ ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر خلیق انجم یوسف ندیم اردو کے ان باشعور اور ذہین شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے جذباتی شاعری کا حصار توڑ کر زندگی سے آنکھیں ملانے کی کوشش کی ہے۔

مجموعہ کی تمام تر نظمیں حب الوطنی، بین الاقوامی بھائی چارہ، قومی ہم آہنگی اور بنگلہ دیش کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ یوسف ندیم کی شاعری کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اردو کی نئی لفظیات، نئے علائم اور تلازموں اور نادر تلمیحات استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں جذبات کی گرمی اور بیان کی نفاست دونوں میں شدت کا احساس ملتا ہے۔ "اندرا گاندھی" "بنگلہ دیش کا مورخ" "بھیڑ" "تعصب" "علی گڑھ یونیورسٹی" "میں" اور "ایل ایس ڈی" منظومات میں شاعر کے قومی اور سماجی نظریات کی بھرپور عکاسی ہے۔

نظر برنی